

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

بچہ حکمران

اُم ریہ

[WWW.PAKSOCIETY.COM](http://WWW.PAKSOCIETY.COM)



# مجھے حکمِ انسانی

ام مریم

خاموش فضا تھی کہیں سایہ بھی نہیں تھا

اس شہر میں ہم سا کوئی تنہا بھی نہیں تھا

اونچی سی حویلی میں اترتا رہا شب بھر

کٹیا میں میری چاند نے جھانکا بھی نہیں تھا

تم میرے پاس رہو

میرے قاتل میرے دلدار میرے پاس رہو

جس گھڑی سیاہ رات چلے

آسمانوں کا لہو بی کے سیاہ رات چلے

بین کرتی ہوئی ہستی ہوئی گاتی نکلے

درد کی کاسنی پازیب بجائی نکلے

پھر نا آسودگی مچلے تو منائے نہ منے

جب کوئی بات بنائے نہ بنے

جب نہ کوئی بات چلے

جس گھڑی مانگی سنسان سیاہ رات چلے

تم میرے پاس رہو!

میرے قاتل میرے دلدار میرے پاس رہو!

سیاہ تارکول کی سڑک پہ گاڑی سبک رفتاری سے آگے

بڑھتی بلا خراک جگہ رک گئی۔ مگر ونڈ اسکرین پر ہونے والا

بوندوں کا رقص جاری تھا۔ نندنی نے بہت چوتک کے نگاہ

اٹھائی۔ سڑک سے کچھ پرے سرسبز گھاٹیوں اور پتھریلے

راستوں سے تیزھی میڑھی پگڈنڈی کسی پراسرار کہانی کی

طرح خاموش اور ویران نظر آئی تھی۔ اس پگڈنڈی کا

اختتام ایک اونچی پہاڑی پہ جا کے ہوتا تھا۔ جس پہ وہ کالی

ماتا کا مندر آباد تھا۔ سیاہ پہاڑی پہ استادہ مندر کی عمارت

اس پل دھندلے غبار میں گھری کسی جادو کی بٹھکے کی طرح

دکھائی دیے رہی تھی۔ عام دنوں میں بھی یہ راستے

گزار تھے مگر اس پل گویا برستے امبر نے ان کی خوفناک

پکچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔ پھسلن خطرناک حد تک بڑھ

تھی۔ اونچی پہاڑی پہ واقع مندر میں داخل ہونے

لیے پہاڑی کے گرد گھومتے اس راستے کو عبور کیا جاتا تھا

پہاڑی کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ یہاں کے لوگوں کا عقیدہ

اتنی کھٹنایاں عبور کر کے جو حاجت مند کالی ماتا کے

چھوتا ہے وہ من کی مراد پائے بغیر نہیں رہتا۔ وہیں

کے احاطے میں ایک گھنٹہ بھی نصب تھا جسے چھونے

کے اندر جا بجا لگی گھنٹیاں بج اٹھتی تھیں۔ یہ بھی وہیں

عقیدت مندوں کا خیال بلکہ راسخ یقین تھا یہ گھنٹیاں

کے ہاتھ لگنے یہ گنگلتا ہیں جس کی مراد برآئی ہو یہ

معلومات نندنی کو اس کی دوست سنجانے پہنچائی تھیں۔

نندنی وہاں جانے کو بے قرار ہو اٹھی تھی مگر می کی اجازت

کے بغیر اس کا وہاں تک پہنچنا مشکل تھا اور می اسے

اجازت نہیں دے سکتی تھیں ان سے اجازت لینے کا

انہیں ساری بات بتلانا تھا جو نندنی کو ہرگز گوارا نہیں

جیسی اس نے اس وقت کا انتخاب کیا تھا جب می اور

طور پر دیو گھر پر نہ ہوں۔ دیو تو صحیح معنوں میں اس کا



بن جانا چاہتا تھا بہت محبت کا دعویٰ تھا لیو کو اس سے جبکہ وہ اسی قدر اس سے چڑتی تھی۔

”میم پلیز آپ یہیں رک کر دیوی جی سے پراتھنا کر لیں۔ راستہ بہت.....“

”تم شوفر ہو ہمارے شوفر ہی رہو۔ سمجھے؟“

نندی نے ڈرائیور کو جھڑکا۔ نندی دروازہ ایک جھٹکے سے بند کر کے آگے بڑھ گئی۔ راستہ دشوار گزار اور خطرناک تھا وہاں اکا دکا عقیدت مند نظر آ رہے تھے ان میں بھی زیادہ تعداد مردوں کی تھی۔ نندی بلیو جینز کے اوپر پنک کارڈیکس پہنے ہوئے تھی۔ اس کے لیے ریشمی بال پتھر میں جکڑے ہوئے تھے جو ہلکی سی جنبش پہ بکھر بکھر کر سمٹتے تو اس نے اٹھنے والی نگاہ ٹھنک جاتی۔ وہ مشرق و مغرب کی حسن کا بے مثل شاہکار تھی۔ ساڑھے پانچ فٹ قد نازک سراپا اور بے تحاشا اجلی دودھیارنگت اسے ہزاروں نہیں لاکھوں کے مجمع میں بھی ممتاز رکھتی تھی اس پہ اس کی کم عمری اس حسن اور جاذبیت کو مزید بڑھا دیتی۔ یہ مندر شہر سے ہٹ کر تھا یہاں عموماً امیر فیملیز پراتنا کے لیے نہیں آیا کرتی تھیں یہ متوسط اور غریب قسم کے لوگوں کا مندر تھا۔ نندی جیسی لڑکی کو وہاں موجود لوگوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تھا۔ نندی ایسی نگاہوں کی کسی حد تک عادی تھی۔ اس کا غیر معمولی حسن اس کو ہمیشہ مرکز نگاہ بناتا تھا۔ مگر ایسی جسم کے آر پار ہوتی نظریں نندی کو ناگوار محسوس ہوئی تھیں۔ اسے اپنے اکیلے آنے کے فیصلے پہ ملال ہوا مگر یہ لمحاتی احساس تھا اگلے پل وہ اس جذبے سے سرشار پھر سر دھیاں عبور کرنے لگی۔ راستہ میں پھسلن تھی وہ تین مرتبہ پھسلے اور چوتھی مرتبہ گرتے گرتے پچی تھی اور بلا آخر جب اوپر مندر میں پہنچی تو اس سرد موسم میں بھی اس کی صبح پیشانی پسینے کے ننھے ننھے قطروں سے جگمگا رہی تھی اور سانس پھولی ہوئی تھی۔

مندر کا سارا ماحول نیم تاریک تھا۔ سامنے کالی مانتا کا بھیا تک مجسمہ نصب تھا۔ جس پہ نگاہ پڑتے ہی اس کے اندر عقیدت و احترام کی بجائے ٹھن اور خوف کا احساس

جاگتا تھا مگر اس نے جھبر جھری لے کر اپنے اس احساس اگلے ہی لمحے جھٹک دیا۔ وہاں موجود لوگوں کے انداز میں اس نے پراتھنا کی تھی پھر دونوں ہاتھ پیشانی سے ٹیک صدق دل سے گویا ہوئی تھی۔

”میرے من کی مراد پوری ہو میں اسے پاؤں جے ڈھونڈنے کی خواہش میں میں نے خود کو گم کر ڈالا ہے۔ بہت تھک گئی ہوں۔“ جانے کتنی دیر تک وہ سسک سسک کر التجائیں اور روتی رہی۔ اسے احساس تک نہ ہوا کہ وقت جیتا گیا آس پاس موجود لوگ کچھ حیرت کچھ عقیدت بھرے انداز میں اسے اتنی عاجزی سے پراتھنا کرتے دیکھ رہے تھے جب چمکتی ہوئی ٹنڈوالے پنڈت جی نے آکر بہت شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

”کالی مانتا کے در پہ آ کے کوئی خالی نہیں جاتا۔ سندوی تو بھی من کی مراد پالے گی بس ایک تھوڑا سا صبر کر لے۔“ ”کتنا صبر پنڈت جی؟“ ”کتنا صبر..... تین سال ہو چکے ہیں اسے دیکھے اسے گنوائے۔“ وہ کچھ اس طرح سے بکھر گئی تھی کہ زار و قطار رو پڑی۔ پنڈت نے بغور اسے دیکھا۔ بھنویں سکیر کر آنکھیں چند ہی کر کے کچھ گھمبیر آواز میں بولا۔

”اگر زیادہ جلدی چاہتی ہے تو کل کی ساری رات یہاں گزار دیوی مانتا کے چرن چوم کر وہ خوش ہوگی تو کام جلدی بن جائے گا۔“ نندی نے بہت چونک کر پنڈت کو دیکھا اس کا بے قرار دل ایک لمحے کو سمٹا۔

”واقعی آپ سچ کہہ رہے ہیں پنڈت جی؟“

”ہاں سندری سچ بولتے ہیں ہم.....“ پنڈت کی چمک دار نگاہوں نے بہت حریصانہ انداز میں نندی کے شکرینی وجود کو ٹکا تھا نندی ایک دم سے کچھ ٹھنک گئی۔ اندھن والا جوش یکجہت دھیمہ پڑ گیا۔ اس نے ہونٹ بھیجنے کو سرکوا ثبات میں جنبش دی تھی۔

”پھر تم آؤ گی تا سندری کسی رات کو؟“ وہ پلٹی تو پنڈت نے سرعت سے سوال کیا تھا۔

”آج تو شاید نہیں میں کل ضرور حاضر ہوں گی پنڈت

جی۔“ نندی نے آستنی سے کہا تھا اور باغلات مندر سے نکل گئی۔ باہر فضا میں بنوز دھند بھی مگر نندی کو لگا تھا وہ جیسے بربخ سے نکل آئی ہو ایک لمحہ لگا تھا اسے پنڈت کی غلیظ نظروں کی ہوس پڑھنے میں۔ اس کے اٹھتے قدموں کی رفتار بڑھ گئی۔ اس کا دوبارہ لوٹ کر یہاں آنے کا ہرگز ارادہ نہیں تھا۔



ہاتھ لے کر وہ باہر آیا تو بیڈ پہ لا پرواہی سے پڑا ہوا اس کا سیل فون مسلسل واہیریت کر رہا تھا۔ عباس نے تو لیے سے گیلے بال خشک کرنے کا کام موقوف کیا اور ہاتھ بڑھا کر سیل فون اٹھایا۔ عین اسی پل کال ڈسکنٹ ہو گئی تھی۔ عباس نے مسڈ کالز چیک کیں۔ پچیس مسڈ کالز تھیں اور ساری کی ساری عریشہ کی۔ اس کے ہونٹوں کی تراش میں دل آویز مسکان بکھر گئی۔ عریشہ کا نمبر پیش کر کے اس نے ہینڈ فری سیٹ کیا اور موبائل جینز کی پاکٹ میں ڈال لیا۔

”ہیلو جان عباس!“ پہلی کے بعد دوسری کوشش پہ عریشہ نے کال پک کی تو عباس نے مسکرا کر بات کا آغاز کیا۔

”مجھ سے بات بھی مت کرو تم۔“

”ہائیں مگر وہ کیوں؟“ وہ ٹھنکا اور سخت احتجاجی انداز اپنالیا۔

”کہاں تھے اب تک؟ فون کر کر کے پاگل ہوتی رہی مگر بردا نہیں تمہیں۔“ وہ بے حد خفا تھی۔ عباس کو اس کی خفگی بھی پیاری لگتی تھی۔ صحیح معنوں میں جان دیتا تھا اس پر۔

”جان من نہار ہاتھ۔ اگر حکم ہو تو سیل وہاں بھی ساتھ لے جایا کروں؟“ فدویانہ انداز بے حد متاثر کن تھا۔

عریشہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”عباس تم بھی نا۔“

”صرف تم یہ مارتا ہوں۔“ عباس فی الفور روٹینک ہوا اور عریشہ خط لے کر منٹے لگی۔

”اتنی دور رہ کر اتنی پیاری ہنسی بنسوی تو جبر کی آگ میں جل کے خاک ہو جاؤں گا۔ کب مکمل طور پر ملاوگی ظالم لڑکی۔“ وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا۔ عریشہ کی ہنسی زندگی کا احساس بن کر اس کی سماعتوں میں اتری۔

”اگر اتنی آسانی سے تمہارے ہاتھ آگئی تو پھر تمہاری محبتوں کی شدتوں اور گہرائیوں کا اندازہ کیسے ہوگا؟“ اس کی بات سن کر عباس نے طویل تر سانس کھینچا تھا۔ پھر بد مزگی سے گویا ہوا۔

”یہ بھلا کیا بات ہوئی۔ محبت کی شدتوں کا اندازہ

قربتوں سے بھی تو لگایا جاسکتا ہے۔“

”لیکن ہر پریڈ کا الگ چارم ہوتا ہے عباس۔“ عریشہ اپنی منطق پہ ڈٹی رہی۔ پھر جیسے کچھ یاد آنے پہ چونک کر بولی۔

”عباس تم نے بتایا نہیں کیا فیصلہ کیا تم نے؟“

”کون سا فیصلہ؟“ عباس اب ڈرینک ٹیبل سے ہٹ کر بیڈ تک آ گیا تھا۔ بستر پر لیٹ کر اس نے ریہموٹ سے ٹی وی آن کر لیا مگر اس کا دھیان اور توجہ عریشہ کی باتوں میں ہی تھی۔

”بس یہ اہمیت ہے تمہارے نزدیک میری باتوں کی بھول بھی گئے۔“ وہ فوراً ناراض ہوئی اور عباس حیدر کو اسے ممانے کے لیے اگلے سات منٹ اس کی منت کرنا پڑی تھی۔ تب وہ احسان جتلاتے ہوئے مانی اور اٹھلا کر بولی تھی۔

”میں نے کہا تھا تا فلموں میں کام چھوڑ دو۔ عباس مجھے تمہارا غیر عورتوں کے نزدیک رہنا بالکل پسند نہیں

#### اعتذار

نازیہ کنول نازی ناسازی طبیعت کی باعث سے اس بار ”جھیل“ کنارہ کنکر“ نہ لکھ سکیں ہے۔ اس لیے اس ماہ ان کا ناول شامل اشاعت نہیں ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ آپ ناول پڑھ سکیں گی۔



ہے۔" عباس نے اس کی بات کو سنا اور زور سے ہنس پڑا۔  
"جیلنس ہو رہی ہو؟" وہ گویا اسے چھیڑ رہا تھا۔ عریشہ نے اعتراف میں تامل نہ کیا۔

"ہو رہی ہوں پھر....."  
"گڈ! پھر یہ کہ میں آپ کے حکم کو سر آنکھوں پہ رکھتا ہوں مادام!"

"یعنی تم عباس تم واقعی سچ کہہ رہے ہو تم اب منوویز میں کام نہیں کرو گے؟" عریشہ حیرت و خوشی سے جیسے بے قابو ہو کر چیختی تھی۔ عباس آہستگی سے مسکرا دیا۔

"اگر یقین نہیں آئے باتو کل اخبار میں پڑھ لینا۔"  
"تھینک یو عباس تھینکس فار دس آزر۔" عریشہ کی آنکھیں اس اہمیت اس محبت کے مظاہرے پہ بے اختیار چھلک اٹھیں۔

وہ ایک عام سی لڑکی تھی۔ جس میں کچھ بھی خاص نہیں تھا۔ نہ غیر معمولی حسن نہ دولت نہ ذہانت نہ ہی تعلیم کچھ بھی تو ایسا خاص نہیں تھا کہ عباس حیدر جیسا خاص بے حد حسین اور شاندار لڑکا اس پہ اس انداز میں فریفتہ ہو جاتا، مگر ایسا ہوا تھا تو اس میں کمال عریشہ کے نصیب کا تھا۔ عباس سے اس کی ملاقات اپنی دوست کی برتھ ڈے پارٹی میں ہوئی تھی جو انہوں نے ایک ہوٹل میں سیلیریت کی تھی۔ یہ ایک حادثاتی ملاقات تھی جس میں عباس کو جانے عریشہ میں ایسا کیا نظر آیا تھا کہ وہ اس سے محبت کر بیٹھا۔ عریشہ کی منگنی اپنے کزن سے ہو چکی تھی مگر جب عباس نے اس کے ہاں جا کر شادی کی خواہش ظاہر کی تو عریشہ کے ابا نے صاف لفظوں میں انکار کر دیا تھا کہ عریشہ ان کے بھتیجے سے منسوب ہے۔ مگر عریشہ اور اس کی والدہ نے اس رشتے کو قبول کر لیا تھا ایک بڑے جھگڑے کے بعد عریشہ کی امی نے عریشہ کا رشتہ اس کے چچا کے بیٹے سے توڑ کر عباس سے طے کر دیا تھا تو اس کے پیچھے عباس حیدر کی سحر انگیز شخصیت ہی نہیں اس کا مضبوط بیک گراؤنڈ اور شہرت و دولت اہم تھیں۔ عریشہ بھی ماں کی طرح مفاد پرست تھی

مگر اس کی ماں تو بے حد لالچی تھی وہ اس شہرے موہر گز گنوانے کے حق میں نہیں تھیں چاہے اس بڑھاپے میں انہوں نے شوہر سے منہ موڑ لیا تھا تو ان کے خیال میں وہ پھر بھی گھانے میں نہیں رہی تھیں اور یہ خیال ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ وہ اب تک عریشہ کے ذریعے ہی مال عباس سے حاصل کر چکی تھیں اور انہی مزید حاصل کرنے کا ارادہ تھا۔ عباس حیدر کی آنکھوں پہ عریشہ کی محبت نے پٹی باندھ دی تھی وہ گویا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا۔ اسے ہر سمت صرف عریشہ نظر آتی تھی۔ یا پھر عریشہ کی خوشی اسے عزیز تھی۔ عریشہ کے سے نکلی بات چاہے وہ کیسی ہی ہو اس کے لیے حکم کا پتہ رکھتی تھی۔ یہی وہ کام تھا جس کی خاطر عباس نے فیملی کو چھوڑ دیا تھا اور اب عریشہ نے شوہر سے علیحدگی مطالبہ کیا تو عباس نے لمحے کی تاخیر کے بغیر فلموں بطور ہیر و کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اپنے سر کے دور میں یہ فیصلہ اگر اس نے کیا تھا تو اس سے عریشہ کو جتلا رہا تھا کہ وہ اس کی محبت میں کس حد تک آ جا گیا تھا۔

عباس کے حوالے سے شائع ہونے والے اس سے اخبارات اور ٹی وی پہ ایک ہلچل مچ گئی تھی۔ وضاحتیں پوچھی جا رہی تھیں مگر عباس کی طرف سے خاموشی تھی۔ اس کے لاکھوں شائقین بے قرار تھے ان اصرار تھا عباس حیدر کو ہرگز بھی یہ فیصلہ نہیں لینا چاہیے عباس کی جو فلمیں ابھی تکمیل کے مراحل میں تھیں جنہیں وہ سائن کر چکا تھا ان کے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر اس کے اس فیصلے کے بعد پریشان ہو گئے تھے مگر ان برعکس عریشہ بے حد مطمئن سرشار اور مغرور ہو گئی تھی۔

ملکوال گاؤں کے گدی نشین پیر کرامت علی شاہ کی اولاد میں ہیں۔ بڑا بیٹا وقاص حیدر جو خالصتا جاگیردار سوچ رکھنے والا ایک جڑھا مغرور اور فطرتا اوباش انسان ہے۔ وقاص کے بعد ایک بیٹی ہے پھر عباس حیدر

جس کا بے تحاشا حسن اور شائستگی خاندان بھر میں بے مثل ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وہ تین سال پہلے واپس ملکوال آیا تو بڑی کے بعد اس سے چھوٹی بہن کی شادی کی تیاریاں بھی عروج پہ تھیں۔ شادی کی اس تقریب میں عباس حیدر پہ یہ عقدہ کھلا کہ اس کے چچا عنایت علی شاہ کی بڑی بیٹی ایمان کی نسبت وقاص سے جبکہ بھتیجی لاریب کی اس سے ان کے والدین نے ان کے بچپن میں ہی طے کر دی تھی۔ عباس حیدر کو یہ بات کچھ بھائی نہیں ہے جبکہ وقاص البتہ ایمان میں خوب دلچسپی لیتا ہے۔ شادی پٹیا کر عباس گاؤں سے شہر کا رخ کرتا ہے اور وہیں کی رنگینیاں اسے گرویدہ کر لیتی ہیں۔ عباس حیدر کی سحر انگیز و غیر معمولی وجاہت کی وجہ سے ہی اسے شوہر سے آفر ہوئی ہے جسے عباس اپنی خوش بختی تصور کرتا ہے اور شوہر کا حصہ بن جاتا ہے۔ عباس کی پہلی فلم ہی باکس آفس پہ سابقہ تمام فلموں کے کامیابی کے ریکارڈ توڑ کر شہرت حاصل کرتی ہے تو وہ ایک دم شہرت اور پسندیدگی کے بام عروج پہ جا پہنچتا ہے۔ یہ بات اس کے لیے جتنی خوشی اور فخر کا باعث بنتی ہے حویلی میں موجود گدی نشین پیر کرامت علی شاہ کے غیظ و غضب کو آواز دیتی ہے۔ پیر صاحب عباس کو انڈسٹری یا انہیں چھوڑنے کے آپشن دیتے ہیں اور عباس انڈسٹری کی بجائے انہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ پیر صاحب عالم جلال میں اسے عاق کرنے اور مرتے دم تک اس کی شکل نہ دیکھنے کا اعلان کرتے ہیں جس کے سب سے زیادہ اثرات لاریب اور عباس کی والدہ پر ہی پڑتے ہیں یا پھر اس کی بہنوں پہ البتہ وقاص حیدر پر اس سے قطعاً کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ وہ پیر صاحب کے فیصلے پہ دل میں ایک کینہی خوشی محسوس کرتا ہے۔

عباس کا فیصلہ لاریب کو توڑ کے رکھ دیتا ہے مگر وہ ہرگز امید نہیں ہے اس کی تمام دعاؤں میں عباس کو پانے کی حاجت ہے اس کے لوٹ آنے کی گزارش ہے۔ وہ عشق کی حد تک اس کی محبت میں ڈوبی ہوئی ہے مگر عباس تک شاید اس کے جذباتوں کی آج نہیں پہنچ پائی جیسی وہ ہنوز اس

سے بے نیاز اور لاتعلق ہے۔



اگر یہ جان جاؤ تم.....  
کوئی کیسے اجڑتا ہے کوئی کیسے بکھرتا ہے  
تو میرے پاس آنا تم  
میری بنجر ہوئی آنکھوں میں جلتے خواب کو تکنا  
اور ان کا مرثیہ سننا  
اگر ایسے نہیں ممکن!  
تو میری زندگی کی ڈائری کو کھول کر پڑھنا.....!  
کہ اس کے ہر ورق پہ آنسوؤں سے مات لکھی ہے  
جو تم سے کہہ نہیں پائی وہی ہر بات لکھی ہے  
تمہاری چاہتوں کے نام اپنی ذات لکھی ہے  
اگر یہ ڈائری پڑھ کے بھی تم انجان رہتے ہو  
تو اس کا ہے یہی

مطلب میری سب التجائیں بس ہواؤں میں معلق ہیں  
ابھی کچھ وقت باقی ہے بدل جاؤ پگھل جاؤ  
کہیں ایسا نہ ہو یہ وقت ہاتھوں سے پھسل جائے  
رستہ ہی بدل جائے  
ابھی بھی لوٹ آؤ تم  
ابھی تیری وفاؤں پہ میرا یقان زندہ ہے  
یہی یقان تو اب تک میرے جیون کا حاصل ہے  
اگر یہ کھو گیا تو پھر بھی کچھ چھوٹ جائے گا  
مقدور روٹھ جائے گا  
تو پھر تم جان جاؤ گے

کوئی کیسے اجڑتا ہے کوئی کیسے بکھرتا ہے!  
ابھی کچھ دیر قبل اس کے سیل پر میسج ٹون بجی تھی۔ اس نے سیل اٹھا کر دیکھا کسی اجنبی نمبر سے بھیجی گئی یہ خوب صورت نظم تھی جسے وہ ایک ٹرانس کی کیفیت کے زیر اثر پڑھتی چلی گئی۔ مگر آخر میں بریکٹ میں لکھا ہوا دیو کا نام اسے بچھو کے ڈنگ کی طرح لگا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات یگانگت تبدیل ہوئے اور سیل فون اس نے اسی بد مزگی کے ساتھ بستر پہ پینچ دیا۔ کچھ دیر ہونٹ بھیجنے بڑی



رہی پھر کچھ سوچ کر انھی اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔  
گلاس وال کے باہر سبز لان، ہلکی دھند کے حصار میں گھرا  
دھندلا نظر آتا تھا۔ اس نے وہیں ٹھہر کر کچھ توقف کیا پھر  
لان کی سبز ہیاں اتر کر لان کے آخری حصے میں سنگی بیچ پہ  
ہاتھ میں کافی کا بھاپ اڑاتا مک لیے گرد و پیش سے لاطلق  
نظر آتے دیو کے سامنے جارکی۔ وہ چونکا اور اسے روبرو  
پاکے جیسے ایک دم خوشگواریت کے احساس میں گھر گیا۔  
”نندنی.....!“

”میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ تم مجھے طیش مت  
دلایا کرو۔“ وہ بھڑک کر زور سے چلائی۔ دیو ایک دم  
پزل ہو گیا۔

”سوری وہ پوٹری مجھے پسند آتی تھی۔ تو.....“  
”تو اپنے تک رکھتے مجھے اپنے سستے اور سطحی جذبات  
پہنچانے کی ضرورت نہیں، تمہیں اندازہ بھی ہے کہ میں  
تمہیں سخت ناپسند کرتی ہوں۔“

”نندنی پلیز! اس طرح سے میری توہین مت کیا  
کرو۔ جانتی ہوں امی ہماری شادی کرنا چاہتی ہیں اور انہیں  
تمہاری نہیں میری ہاں کا انتظار ہے۔ میں اگر آج ہاں  
کردوں تو وہ کل ہی سگائی کر دیں۔“ دیو نے گویا اس پہ  
اس کی اوقات ظاہر کی تھی۔ نندنی کا صبح چہر ایک دم دھواں  
دھواں سا ہو گیا۔ توہین کے ساتھ بے مائیگی کا احساس بھی  
بے حد شدید تھا۔ جس نے اسے روہانسا کر دیا تھا۔ دیو نے  
اس کے چہرے کے اڑتے رنگوں کو دیکھا تو اپنے الفاظ کی  
سنگینی کا احساس اسے ہونٹ بھینچنے پر مجبور کر گیا۔ بلاشبہ اس  
کے سامنے کھڑی لڑکی اس کے لیے پوری زندگی میں  
سب سے اہم تھی۔ اس کا جی چاہا تھا وہ نندنی سے معذرت  
کرے مگر کچھ سوچ کر وہ دانستہ خاموش رہا تھا۔

”یہ تمہاری بھول ہے میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں  
گی۔ یاد رکھا کرو کہ امی ہی نہیں میرے فادر بھی میرے سر  
پرست ہیں۔ امی میری اور میرے ڈیڈ کی رضا مندی کے  
بغیر ہرگز ایسا نہیں کر سکتیں۔“ نندنی نے خود کو کیوز کیا اور  
گویا اسے آئینہ دکھایا۔ دیو اس کی بات سن کر مسکرا دیا یہ

مسکراہٹ ایسی ہی تھی جیسے کسی بچی کی کم عقلی کو پاک کر  
کی گئی ہو۔ نندنی کو مزید آگ لگ گئی۔

”اگر تمہیں یہ زعم ہے تو بہت غلط ہے نندنی۔ تمہارے  
ڈیڈ نے تمہیں امی کے حوالے کر کے تمہارے بھائی کو  
پاس رکھ لیا تھا اس کا مطلب کیا ہوا۔؟“ دیو نے  
توقف کیا نندنی کے چہرے کو دیکھا جو ہونٹ بھینچنے جا  
کتا ضبط کیے کھڑی تھی اور پھر گویا ہوا۔

”مئی تمہاری زندگی کا فیصلہ کرتے ہوئے تمہارے  
ڈیڈ کی مجاز نہیں ہوں گی کیونکہ وہ تمہیں ان کے حوالے  
کر کے گویا تم سے تمہارے ہر فیصلے سے دستبردار ہو  
چکے ہیں اور.....“

”مگر میں بالغ ہوں میں اپنی زندگی کا خود فیصلہ کر  
ہوں اور میرا یہ فیصلہ ہے کہ تم مجھے کسی بھی صورت  
نہیں ہو سکتے۔“ وہ ہڈیالی انداز میں چلانے لگی۔ دیو  
شپٹا کر کچھ ناگواری سے اسے دیکھا۔

”کیوں؟ کیا کی ہے مجھ میں بتاؤ کم صورت  
جابل ہوں یا پھر بے کار؟ آرمی میں بہت اچھی پوس  
رکھتا ہوں۔ خوش شکل ہوں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کیا چا  
تمہیں اپنی ڈیمانڈ بتاؤ۔“ دیو آج زندگی میں پہلی  
نندنی سے اس انداز میں بات کر رہا تھا۔ نندنی  
آنکھوں میں تپش اتر آئی۔ اس نے تیوری چڑھا کر  
نظروں سے اسے گھورا۔

”اس کے باوجود تم مجھے پسند نہیں ہو۔ میں تم  
شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ اس مرتبہ اس کا لہجہ دھیمہ  
برسکون تھا مگر دوسرے کو آگ لگا دینے والا۔ دیو کی  
پٹھکی پڑنے لگی۔

”تم کسی اور کو پسند کرتی ہو نندنی؟“ وہ جیسے کسی  
کے زیر اثر بولا تھا۔ نندنی چونکی اور سنجھل گئی۔ اس بات  
بھنک بھی وہ گھر میں کسی کو پڑنے نہیں دینا چاہتی تھی۔  
”تم جانتے ہو تم کتنے پرسنل ہونے کی کوشش کر  
ہو دیو؟“ اس نے ترشی سے سوال کیا تھا۔ دیو کو ایک  
ہونٹ بھینچنے پڑے۔ نندنی نے اسے تیز اور تنبیہی نظر

گھورا اور پلٹ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ دیو  
کی نگاہیں اس کے اٹھتے ہوئے قدموں میں الجھ کر رہ گئیں  
جو ہر لمحہ فاصلے بڑھا رہے تھے۔



سریتا دیو اور جارج کی پہلی ملاقات یونیورسٹی میں  
ہوئی تھی۔ جارج مقامی تھا جبکہ سریتا دیوی باغرض تعلیم  
دہاں گئی ہوئی تھیں۔ پہلے دونوں میں دوستی ہوئی تھی پھر  
محبت اور اس احساس نے دونوں کو ایک دوسرے کے  
نزدیک کر دیا۔ جارج بہت مضبوط بیک گراؤڈ نہیں رکھتا  
تھا جبکہ سریتا دیوی کے پتا کی انڈیا میں کئی ملیں تھیں۔

جارج نے سریتا کے اصرار پہ اس کے ساتھ اس کا  
اپارٹمنٹ شیئر کیا تھا اس کے بعد دونوں نے باہم فیصلہ کیا  
کہ انہیں ایک ہو جانا چاہیے مگر بیچ میں مذہب دیوار بن  
کر کھڑا تھا۔ سریتا دیوی اگر ہرگز ہرگز اپنے مذہب کو  
چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی تو جارج بھی اپنے مذہب پہ  
قائم رہنا چاہتا تھا۔ ادھر محبت کی شوریدہ سری تھی کہ  
دوریوں کو گوارا نہیں کرتی تھی۔ طے یہ پایا کہ دونوں اپنے  
اپنے مذہب کے پیروکار رہتے ہوئے شادی کے بندھن  
میں بندھیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ جارج نے سریتا کی تسلی  
کی خاطر منڈت میں اس کے ساتھ پھیرے لیے جبکہ  
سریتا کو چرچ جا کے جارج کے ساتھ شادی کی رسومات  
دا کرنا پڑیں۔ محبتوں کی شدتیں اپنی جگہ مگر سریتا دیوی  
والدین کی جانب سے اٹھائے جانے والے  
عتراضات نے سریتا کو مضطرب کرنا شروع کر دیا۔ سریتا  
مذہب کا شکار رہنے لگی۔ یہی وہ وقت تھا جب ان کے  
میں ایک بیٹے نے جنم لیا تھا اور یہاں پہلی بار دونوں کا  
خٹاف ہوا۔

جارج بیٹے کا نام اپنی پسند اور مذہب کے مطابق جان  
لنا چاہتا تھا جبکہ سریتا اسے ہندو بنانے پہ تلی ہوئی تھی۔ وہ  
سے ارجن کا نام دینے پہ مصر تھی۔ خاصی بحث و تکرار کے  
بعد بالآخر یہ طے پایا کہ بیٹے کا نام جان ہوگا البتہ اگلے  
بیٹے کا نام رکھنے کا مکمل اختیار سریتا کو حاصل ہوگا۔ سریتا کو

جارج سے محبت تھی جیسی وہ اس محبت کی وجہ سے یہ ناگوار  
کام کرنے پہ مجبور ہو گئی۔ مگر اس کے بعد تو گویا قدم قدم پہ  
ان کے جھگڑے بڑھنے لگے۔ تین سال بعد جب بیٹے کو  
اسکول میں ایڈمٹ کرانے کا مرحلہ آیا تو جارج نے ایک  
بار پھر اپنی چلائی۔ یہی نہیں بلکہ سریتا نے جب جان کو اپنے  
مذہب کے مطابق گیتا کی تعلیم دینا چاہی تو جارج ایک بار  
پھر دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا اصرار بلکہ ضد تھی کہ جان  
گیتا نہیں سیکھے گا البتہ وہ انجیل پڑھے گا اور چرچ بھی  
جائے گا۔ جارج کا یہ حکم سریتا کو آگ لگانے کے لیے  
کافی تھا۔ ایک بڑا جھگڑا ہوا مگر جارج اپنی جگہ سے ایک  
انچ بھی سرکنے کو تیار نہیں ہوا تھا۔ اس نے کہا سریتا اپنی  
دوسری اولاد کے معاملے میں ہر قسم کے فیصلے کی مجاز ہوگی۔  
سریتا کو یہ فیصلہ پسند نہیں آیا مگر اسے ایک بار پھر چپ  
سادھنا پڑی تھی تو وجہ اب جارج کی محبت نہیں اپنے  
والدین کی بے اعتنائی تھی جنہوں نے اس سے ناراضگی  
کے اظہار کے طور پر قطع تعلق کر لیا تھا۔ ایک سال مزید  
گزر گیا۔ جان چار سال کا تھا جب سریتا ایک بار پھر  
پریکٹس ہوئی تو اس کی آنکھوں میں خواب سجے گئے۔  
اس کے دل پہ بہت بوجھ دھرا تھا۔ اس نے اپنے تئیں یہ  
سمجھ لیا تھا بھگوان اس سے روٹھ گیا ہے۔ وہ بھگوان کو منانا  
چاہتی تھی جیسی اپنے اگلے بچے کی دنیا میں آمد کی شدت  
سے منتظر تھی مگر اس وقت اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا  
جب بچی کی پیدائش پہ جارج اس سے کیے اپنے وعدے  
سے مکر گیا اور بڑے ٹھسے سے اس نے اپنی بیٹی کا نام  
کیتھرائن تجویز کیا۔ یہ ایسی بات ہرگز نہیں تھی کہ سریتا  
اسے برداشت کر لیتی۔ اس مرحلے پر اس نے اپنی زندگی  
کا دوسرا بڑا فیصلہ کیا اور جارج سے علیحدگی اختیار کر لی۔  
جارج کا مسلط کر دینے والا اجارہ داری کا انداز سریتا کے  
اس فیصلے کی وجہ بنا تھا۔ وہ ہر صورت جارج سے اپنے بچے  
چھین لینا چاہتی تھی۔ جارج کی بھی یہی خواہش تھی۔  
دونوں کے بیچ مذہب سے بڑھ کر انا آ گئی تھی وہ ایک  
دوسرے سے جتنا جانتا تھا اتنا جانتا تھا کہ



جان جارج کو جبکہ کیتھرائن یعنی نندنی سریتا کو مل گئی۔ سریتا نے اس کو غنیمت جانا یوں بھی پانچ سالہ جان سریتا سے زیادہ جارج سے اسیج تھا۔ سریتا تمام تعلق توڑ کر واپس انڈیا آ گئی۔ اپنے ماما پتا کے سامنے رو دھو کر اس نے ان کا دل پیسنے پر مجبور کر دیا وہ ان کی اکوٹی اولاد تھی۔ جیسی معافی ملنے میں بھی آسانی رہی۔ ماما پتا نے اس کی شادی کر دی۔ کرن کو گھر داماد بنایا لیا گیا۔ کرن پہلے سے شادی شدہ تھا ایک بیٹے (دیو) کا باپ۔ طے یہ پایا تھا کہ سریتا دیو کو جبکہ کرن نندنی کو قبول کرے گا یوں زندگی ایک نئے ڈھب پہ چل نکلی۔ ادھر جارج نے بھی دوسری شادی کر لی مگر اس نے سریتا کا سکون پھر بھی درہم برہم کیے رکھا۔ کورٹ آرڈر کے تحت وہ نندنی سے ملنے چلا آتا جو کرن کے علاوہ سریتا کے ماما پتا کو بھی ناگوار گزرتا تھا۔ انہی تینوں افراد کے متفقہ فیصلے کے تحت جارج کو وہاں آنے سے روکنے کی غرض سے جب جارج کو نندنی سے ملنے کی خواہش ہوتی نندنی کو اس کے پاس امریکہ بھیج دیا جاتا۔ برس ہا برس اسی طرح بیت گئے وہ مین اتج میں تھی جب انہی تین بستہ فضاؤں میں اس نے پہلی بار دیو مالائی کہانیوں کے سب سے حسین کردار اپالو جیسے اس اجنبی لڑکے کو دیکھا تھا جس کی مردانہ سحر انگیز سنائی صحیح معنوں میں نندنی سے اس کا چین قرار سب کچھ چرا کر لے گئی تھی۔ وہ کم عمر تھی مگر محبت کے معاملے میں بہت پختہ نکلی ایک نگاہ کے بدل میں اپنا سب کچھ وار دیا۔ پندرہ سے اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچتے اس نے کسی مندر کسی جرج کو نہیں چھوڑا تھا جہاں اس نے اس اجنبی شخص سے ملاپ کی دعا مانگی ہو۔

عشق آتش تھی دن رات جلاتی تھی سلگاتی تھی بھر و نارسائی لمحہ لمحہ تڑپاتا مگر وصال رت کی بارش تھی کہ مائل بہ کرم نہ تھی۔ وہ اب مایوس ہونے لگی تھی نا امید اور شکستہ.....! سوچتی تو خود حیران رہ جاتی بھلا یقین کرنے والی بات تھی بھی کہاں۔ محض ایک جھلک ایک نگاہ اور اپنا آپ گروی رکھ دیا۔

یہ پاگل پن نہیں تھا تو اور کیا تھا۔ یہ دیوانگی نہیں تو اور کیا تھا..... وہ سراب کے پیچھے بھاگ رہی تھی حماقت ہی تو کر رہی تھی نا ممکن کو ممکن بنانا چاہتی تھی جی ہر چھ ماہ بعد اس کا اصرار باپ کے پاس جانے کا بڑھ لگتا۔ کیا ضروری تھا کہ وہ دوبارہ وہاں مل جاتی۔ حالانکہ وہ اگلے دن اس سے بھی اگلے کئی دن اس جگہ نہیں پورے نیویارک میں قریہ قریہ بھٹک کر پاگلوں کی طرح اس کی شاہت کھوجتی رہی تھی مگر وہ نہیں ملا تھا اتنے دنوں بعد.....! مگر اس کی وحشت تھی کہ سکون ہی لینے دیتی۔

اس پہ می کا ارادہ جان کر اسے لگتا تھا کوئی اس کا دھول پہ چڑھا رہا ہو۔ وہ اپنے ڈیڈی کی طرح سے تھی ان کی طرح اپنی بات منوا کر دم لیتی۔ اس تین کے عرصے میں وہ آٹھ چکر امریکہ کے لگا آئی تھی۔ ہر وہاں سے دکھ سمیٹ کر واپس لوٹی تھی۔ ڈیڈی کا رویہ اس ساتھ نارمل ہوتا مام کو اس کی سرے سے پروا نہیں تھی صرف لڑا (اس کی سوتیلی بہن) کے ناز اٹھاتی تھیں۔ جان سے بھی بے نیازی برتا کرتی تھیں۔ جان کو کہاں تھی۔ وہ خود انہیں جوتے کی نوک پہ رکھتا تھا۔ نندنی بھائی کو دیکھتی تو انوکھی خوشی اور فخر محسوس کرتی۔ کتنا خوش وہ۔ چھ فٹ قد مضبوط آہنی سراپا، تیکھے نقوش اور سبز آنکھیں۔ لڑکیاں اس کی وجاہت پر مرقی تھیں مگر جان بھی نندنی سے لگاؤ نہیں تھا حالانکہ نندنی نے کتنا چاہا اس کے نزدیک ہو اس سے باتیں کرے، دکھ سکھ بتلا مگر جان کے پاس تو بھی اس کے لیے وقت ہوتا ہی تھا جبکہ وہ بھی کما آس بھری نگاہوں سے نکا کرتی۔

”جان تم نے کبھی محبت کی ہے.....؟“ ایک بار نندنی بہت افسردہ تھی اور اس کا جی چاہا تھا کہ کسی کاندھے پہ سر رکھ کے سارے آنسو بہا دے کہ اس کی تلاش کی ناکامی نے اسے بہت نڈھال کر دیا تھا رات گئے تک اکیلی لاؤنج میں پڑی روتی رہی تھی برستے آسمان کی طرح چپ چاپ۔ تب جان پاؤں

ٹھوکر سے دروازہ کھولتا اندر چلا آیا تھا اور نندنی کا جی چاہا تھا وہ بھاگ کر جائے اور اس کے کشادہ سینے پہ سر رکھ کے اندر ماسا راجع شدہ غبار نکال دے مگر اس کی جان سے اتنی اندر اسینڈنگ نہیں رہی تھی جیسی وہ جھجک کر وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔ جان کے جوتے کچھڑ میں لھڑے ہوئے تھے اور خوب صورت کارپٹ پہ اس کے جوتوں کے نشان ثبت ہو گئے تھے مگر وہ لا پرواہی سے صوفے پہ گر کر سگریٹ کے کش لینے لگا جب اچانک نندنی نے اس سے سوال کیا تھا۔ جان چونکا اور سراونچا کر کے اسے دیکھا بلکہ ٹھوڑا۔

”تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ اس کا لہجہ کڑا تھا وہ کسی حد تک بد مزاج بھی تھا۔ نندنی گڑبڑا گئی۔

”تم کچھڑ سے بھرے جوتے کارپٹ تک لے آئے ہو جان مام خفا ہو سکتی ہیں۔“ اس نے دانستہ بات بدل دی تھی۔ جان کی کشادہ پیشانی پر ناگواری شکنوں کی صورت ابھرائی۔

”یہ کارپٹ اس کے باپ نے یہاں نہیں بچھوایا اور میں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں۔“ نندنی کا رنگ مام کو دروازے پہ دیکھ کر پیلا پڑ گیا تھا۔ مام بد اخلاق تھیں وہ جان سے نا جڑ بھی تھیں اور اسے سوتن کی اولاد سمجھ کر سخت ناپسند ہی نہیں بلکہ نفرت بھی کرتی تھیں۔ اس وقت تو لڑائی کا بہانہ تھا سو وہ خوب چلا گئیں۔ انہیں مفت خورے اور بد تہذیب کہا وہ ایشین تھے اور ان کے نزدیک قابل نفرت۔ یہ جھگڑا کبھی ختم نہ ہوتا اگر ڈیڈی نہ بچ میں کودتے کہ جان مام کو متواتر جواب دے رہا تھا۔

ڈیڈی نے جان کو ڈانٹا اور مام کو بازو کے حلقے میں سمو کر دھیرے سے سمجھاتے ہوئے کمرے سے چلے گئے۔ جاتے سے جوتا تھانہ مسکراہٹ مام کی آنکھوں میں نظر آئی تھی اس نے جان کو آگ لگا دی تھی۔ وہ پیر پختارہ میں آئی چیزوں کو ٹھوکر میں مارتا اپنے کمرے میں جا گھسا تھا نندنی اپنی تمام آسودہ خواہشوں کے ساتھ وہاں ایک بار پھر تہارہ لگی تھی۔

معصوم محبت کا بس اتنا فسانہ تھا کاغذ کی حویلی ہے بارش کا زمانہ ہے کیا شرط محبت ہے کیا شرط فسانہ ہے آواز بھی زنجی سے اور گیت بھی گانا ہے اس پار اترنے کی امید بہت کم ہے کستی بھی پرانی ہے طوفان کو بھی آنا ہے سمجھے یا نہ سمجھے وہ انداز محبت کا اک شخص کو آنکھوں سے حال دل سنانا ہے معصوم محبت کا بس اتنا فسانہ ہے اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے ناز سلوش ڈشے..... آزاد کشمیر

اس کے نام سے لفظوں میں چاند اترے ہیں وہ ایک شخص کہ دیکھوں تو آنکھ بھرا آئے جو کھو چکے ہیں انہیں ڈھونڈنا تو ممکن ہے جو جا چکے ہوں انہیں کوئی کس طرح لائے لاریب اپنے سامنے کھلے میگزین پر نظریں گاڑے ساکت بیٹھی تھی۔

اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے تصویر کے نیچے موجود عبارت کو پڑھا اور پھر سے عباس کے پہلو میں ہنستی مسکراتی ہوئی اس لڑکی کو دیکھا جس کے چہرے پہ گویا دنیا فتح کر لینے کا احساس خمار بن کر چھایا نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی جلن یکنخت بڑھ گئی اور دل خون ہونے لگا۔ شکست و توہین بے مائیگی اور لا چاری۔ کتنے احساسات تھے جنہوں نے اسے مغلوب کر ڈالا تھا۔ ایک آس تھی جو ٹوٹی تھی ایک انتظار تھا جو مایوسی کا شکار ہوا تھا۔ وہ تو اپنی ہتھیلیاں دعا کی چوکھٹ پہ ہر لمحہ رکھے بیٹھی ہوئی تھی۔ عباس کو کھونے کا احساس پاگل کر دینے کو کافی تھا۔ اس کے حواس جیسے جھنجھٹا اٹھے تھے۔ طیش کا ایک منہ زور ریلا اس کے اندر سے اٹھا اور اس نے میگزین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے جیسے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔



”تم نے مجھے رد کیا عباس! مجھے یعنی لاریب شاہ کو؟“ اس نے سوچا تو تن بدن تو ہیں کے احساس سے سلگ اٹھا۔

”آئی ہیٹ یو عباس! آئی ہیٹ یو! تم مجھے کیا ٹھکراؤ گے میں خود تمہیں ٹھکرا دوں گی۔ تم کیا سمجھتے ہو لاریب کو تم چھوڑ دو گے تو اسے کوئی نہیں اپنائے گا۔ میں تمہیں بتاؤں گی مسٹر عباس کہ لاریب کو بھی تمہاری ضرورت نہیں ہے۔“ اس کی سوچیں تک سلگ اٹھی تھیں مگر دل کا ماتم اپنی جگہ تھا اور آنکھیں دل کے درد پہ ازلی وفاداری کا ثبوت فراہم کرتے چھما چھم برسنے لگیں۔ لاریب نے گالوں پر نیکی کا احساس پا کر انتہائی بے دردی سے گال اور آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

”میں تمہاری وجہ سے اپنی آنکھوں کو آنسو بہانے کی اجازت بھی نہیں دے سکتی عباس حیدر۔ یہ میری آنکھیں ہیں ان پر تمہارا بھلا کیا حق اگر انہوں نے تمہارا غم منانے کی کوشش کی تو میں انہیں لمحے کی تاخیر کے بغیر پھوڑ ڈالوں گی۔“ وہ ہذیبی کیفیت میں مبتلا زور سے چیختی تھی۔ تبھی دروازے پر مدھم سروں میں دستک ہوئی اور آہستگی سے دروازہ کھول کر سکندر نے اندر قدم رکھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب وحشتوں کے دریا میں ڈوبتی ابھرتی لاریب نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

سر مئی کھدر کا عوامی سوٹ، سانولی رنگت، گھنے سیاہ بال، لمبا قد، نارمل نقوش مگر بے تحاشا کشش کی حامل بڑی بڑی سحر طراز آنکھیں۔ یہ تھا سکندر حویلی کا ملازم خاص بابا سائیں کا چہیتا بلکہ وہ تو اسے ملازم کا درجہ دیتے ہی نہ تھے۔ وہ ان کا بے حد خاص بندہ تھا۔ وہ جانے کس خیال کے تحت اسے ایک ٹک دیکھنے لگی۔

”بی بی جی! بابا سائیں کہہ رہے ہیں شہر سے آپ کو جو بھی چیزیں اپنی ضرورت کی منگوانی ہیں لسٹ بنا کر دے دیں۔“ جھکا ہوا سر فرمانبردار سا انداز وہ خود کو ہر گز بھی ملازم سے بڑھ کر اہمیت نہیں دیتا تھا۔ عجیب غریبانہ عاجزانہ سا انداز تھا۔

”بجو کہاں گم ہو گئی ہیں؟ سکندر کچھ کہہ رہا ہے آپ سے۔“ امامہ اسی پل وادش روم سے باہر نکلی تو لیے میں پال لپٹے ہوئے تھے۔ چہرے پہ پانی کی بوندیں گلاب پہ شبنم کے قطروں کی طرح ٹھہری بے حد بھلی لگ رہی تھیں۔ جتنی پیاری تھی اس سے کہیں بڑھ کر خصوصیت کے باعث انریکٹو لگا کر نی۔ لاریب نے چونک کر سر جھٹکا اور نخوت سے منہ پھیر لیا۔

”مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے بابا سائیں سے کہہ دو۔“ اس نے تنفر سے جواب دیا اور دھڑا دھڑا سر ہٹیاں چڑھ کر اوپر چلی گئی۔ امامہ نے ٹھنڈا سانس بھر کے سکندر کو دیکھا جس کے چہرے پہ عجیب سی چارگی تھی۔

”سکندر سوری! تم ایسا کرو پلیز بجو کے پاس چلے جاؤ وہ تمہیں منٹوں میں لسٹ بنادیں گی۔ ویسے شہر تم جارہے ہونا؟ پلیز میرے لیے اشفاق احمد کی کوئی اچھی سی بک لے آنا دے۔“ سکندر کو تاکید کرنے کے بعد امامہ نے گنگناتے ہوئے تالیہ ہٹا کر بال جھٹک کر موچر اتر کر بوتل اٹھائی اور اپنے ہاتھوں پہ لگانے لگی۔ سکندر واپسی پر پلٹا تو اس کے چہرے پہ یہی نہیں قدموں میں بھی وادش ٹکستی تھی اور کون جانتا تھا یہ ٹکستی کسی کی بے نیازی کے سبب تھی۔

اس طرح میری رات کو چمکاؤ کسی دن میں اپنی جہراک سانس اسی رات کو دے دوں سر رکھ کے میرے سینے پہ سو جاؤ کسی دن اس غزل کو پڑھتے ایمان کے چہرے پہ لمحوں میں آتے ہی آگ اترے تھے۔ خفیف سی خفگی دھنک کی برسات حیا آمیز مسکان، جھینپ اور گھبراہٹ ہر احساس اپنی جگہ اہم تھا وہ ہونٹ بھینچے مسکراہٹ مضبوط کر رہی تھی جب اسی وقت اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیل فون واہریت کرنے لگا۔ جلتی بجھتی اسکرین پہ شرجیل علوی کا نام جگمگا رہا تھا۔ ایمان یکدم شٹنا گئی۔ سیل فون ہاتھ میں دبوچے اس نے سب سے پہلے بھاگ کر دروازہ لاک کیا پھر آ کر بستر پہ بیٹھی تو سیل فون ہنوز واہریت کر رہا تھا۔

”السلام علیکم!“ اس نے جیسے ہی کال پک کی شرجیل کی شرارتی کھنک دار آواز اس کی سماعت میں رس گھول گئی۔

”کیوں فون کیا ہے شرجی؟“

”یہ کیا سوال ہوا؟ کتنی مرتبہ کہا ہے مجھ سے اس طرح مت بلایا کرو۔“ شرجیل کا موڈ بگڑا اور ایمان کی جان پہ بن گئی۔

”شرجیل پلیز! ابھی یونیورسٹی میں ہم ساتھ ہی تو تھے نا؟ پھر یہ فون کال تمہیں پتا ہے نا میں پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہوں اور۔۔۔۔۔“

”یہ سب تمہیں پہلے بھی پتا تھا میری طرف بڑھنے سے قبل ان باریکیوں پہ کیوں غور نہیں کیا؟“ وہ جانے کیوں بے تحاشا بھڑک اٹھا۔ ایمان ہونٹ ہونٹے لگی۔ شرجیل خود اس کی سمت مائل ہوا تھا۔ اور اس وقت تک جان نہیں چھوڑی تھی جب تک ایمان نے اس کی محبت کو قبول نہیں کر لیا۔ عجیب جنونی قسم کی محبت تھی اس کی بے اعتنائی کو دیکھتے ہوئے اس روز سب کے سامنے شرجیل نے اپنی کائی بلیڈ سے کاٹ لی تھی اور پتا نہیں ایمان نے اس کی محبت قبول کی تھی یا اس کی شدت کے سامنے خوفزدہ ہو کر گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ مگر وہ اس سے حقیقت نہیں

چلے آؤ

کسی بھی خوب صورت شام میں ملنے چلے آؤ مجھے ایک نظم لکھنی ہے

سنہری دھوپ کے جیسا ترانگ روپ اجلا سا دھلے بارش سے دیکھو تو حسیں پیارے نظارے ہیں فلک کے استعارے ہیں

یہ تیری آنکھ جیسے ہیں مجھے ایک نظم لکھنی ہے

تری زلفیں ہیں گہری جھولتی پھرتی گٹھاؤں سی نشلی آنکھ میں تیری شرابوں کی سی مستی ہے تمہاری نرم پلکوں پر جو روشن سے ستارے ہیں مجھے ان کو بھی چھونا ہے

تیرے ان بند ہونٹوں میں چھپی جو مسکراہٹ ہے یہی تو شاعری ہے بس مجھے ایک نظم لکھنی ہے

تری آنکھیں بہت کچھ بولتی ہیں تیری باتیں شہد سا گھولتی ہیں یہ پھولوں پر گر کر شبنم تیرے گالوں کے جیسی ہے چمکتی چاندنی جیسی تری روشن جبین پر بھی مجھے ایک نظم لکھنی ہے

گھنی شاخوں کے پتوں میں چھپا وہ چاند پیارا سا تیرے چہرے کے جیسا ہے تیرے اک چاند چہرے پر مجھے ایک نظم لکھنی ہے

کسی خوب صورت شام میں ملنے چلے آؤ شاعر: ارشد ملک: پسند: صبا نواز بھٹی۔۔۔۔۔ ساگھڑ

چھپا کی تھی۔ صاف بتا دیا تھا وہ اپنے تایا زاد سے منسوب ہے لہذا وہ کوئی امید نہ پالے۔

”تم اسے پسند کرتی ہو؟“ شرجیل نے تیوریاں چڑھا کر پوچھا تھا۔

”کسے؟“ ایمان اس کے تاثرات سے خائف ہونے لگی۔



”اپنے تایا زاد کو؟“ شرجیل کی تیوری کے بل گہرے ہونے لگے تھے۔

”اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ اسے پسند کیا جائے ایک نمبر کا لفٹا ہے ایک آنکھ نہیں بھاتا مجھے۔“ ایمان نے ناک چڑھا کر اپنی رائے دی تھی مگر شرجیل پھر بھی مشکوک رہا تھا۔

”یہی سچ ہے یا اکی؟“ ایمان نے اسے دیکھا پھر ایکدم سے ہنس پڑی تھی۔

”تمہیں یقین کیوں نہیں آتا شرجیل شاید اگر تم میری زندگی میں نہ آتے تو میں تب بھی اس جیسے اجڑا اور بدتمیز انسان سے شادی نہ کرتی۔“ ایمان کے لہجے میں وقاص کے لیے جتنی تلخی اور نخوت تھی اس نے شرجیل کو مطمئن کر دیا تھا۔

”او کے فائن! آئندہ اس کا کوئی ذکر نہیں ہوگا تم بس میری بیوی بنو گی۔“

”مگر شرجیل.....! بابا سائیں..... وہ شاید ایسا کبھی نہ ہونے دیں۔ یونو ہمارے ہاں برادری سے باہر تو کیا خاندان سے باہر بھی شادیاں نہیں کی جاتیں۔ بہت سخت اصول ہیں ہمارے۔ میں تو پھر لڑکی ہوں وہاں تو عباس جیسے ہر دل عزیز اور لاڈلے کے لیے بھی قوانین اور اصولوں میں ترمیم نہیں کی گئی۔“ وہ خائف ہونے لگی تھی مگر شرجیل کے انداز میں اطمینان تھا جو قابل رشک تھا۔

”یہ تمہارا نہیں میرا ہیڈک ہے ایمان کہ مجھے تمہیں اگر حاصل کرنا ہے تو کیسے کرنا ہے۔“ اس نے ایک فقرے میں معاملہ پنپا دیا۔ پچھلے ایک سال میں ایمان اس سے اتنی انبج ہو گئی تھی کہ اب اس کے لیے بھی جدائی کا تصور محال تھا۔ شرجیل کی طرف سے اسے اکثر خدشات گھیرنے لگتے۔

”شرجیل تم مجھے چھوڑ تو نہیں دو گے نا؟“ وہ وہمی نہیں تھی مگر محبت نے اسے وہمی بنا دیا تھا۔

”میں نے کہا نا میری جان عرف دھان پان کہ یہ میرا مسئلہ ہے۔ میں اپنی فیملی کو تمہارے گھر بھیجوں گا۔“

”اگر بابا سائیں نہ مانے تو.....؟“ وہ سہم جاتی۔ پہلے کبھی ایسا ہوا تھا پھر عباس کی مثال سامنے تھی وہ کس ٹھیت کی مولی تھی۔

”نہ مانے تو ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔“ ”بھاگ کر.....؟“ وہ ششدر ہونے لگتی۔ شرجیل کا ندھے اچکا دیتا۔

”اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہو گا نا۔“ ”لیکن بھاگی ہوئی لڑکی کا معاشرے میں مقام.....“ ”معاشرے پہ لعنت بھیجو۔ البتہ اپنی فیملی سے تمہاری عزت کروانا میری ذمہ داری ہے۔“

”خدا کرے بابا سائیں ہی مان جائیں۔ معجزہ ہو جائے۔“ وہ دل کی تمام تر گہرائیوں سے دعا مانگا کرتی تھی۔

”شرجیل..... شرجیل.....“ لائن ڈس کنیکٹ ہو گئی تھی۔ شرجیل نے یقیناً غصے میں فون بند کر دیا تھا۔ ایمان نے فی الفور کال بیک کی بیل ہوتی رہی۔ کال پک نہیں کی گئی۔ ایمان نے اس کے نام نیکسٹ بھیجا۔

”شرجیل پلیز میرا فون پک کرو۔ پلیز۔“ اس نے دوبارہ ٹرائی کیا اس مرتبہ پھر کال کاٹ دی گئی تھی۔ ایمان روہا ہسی ہونے لگی۔

شرجیل کا رویہ ہمیشہ بہت شدید ہوا کرتا تھا۔ اس کی چھوٹی سی خطا کو بھی وہ ناک سے لکیریں نکلو اسکے معاف کیا کرتا تھا۔ ایمان نے ہونٹ کاٹ کر آنسو روکے اور پھر اس کا نمبر ٹرائی کیا۔ دوسری بیل پر کسی نے کال ریسو کر لی تھی۔

”ہیلو شرجیل میری بات.....!“

”میں شرجیل نہیں فراز ہوں۔ آپ کون؟“ دوسری جانب سے آتی آواز نے ایمان کے وجود میں برف بھردی۔ اس نے آہستگی سے فون بند کر دیا۔ فراز نے جان ہو جانے والے سیل فون کو کا ندھے اچکا کر گھورا واپس صوفے پہ اچھال دیا۔ تبھی شرجیل کچن سے چائے لگ اٹھائے باہر آیا تھا۔



”بھائی عیاشی اور اکیلے اکیلے...“ وہ جو لچائی نظریں اس کے بھاپ اڑاتے تھے۔ شرجیل صاف نظر انداز کر گیا۔

”بھائی یہ ایمان صاحبہ کون ہیں؟“ شرجیل کاریموٹ سے نیوی آن کرتا ہاتھ اسی زاویے پہ چند لمحوں کو ساکن رہ گیا۔ مگر اگلے لمحے وہ نارمل تھا۔

”کہیں ہماری ہونے والی بھابی صاحبہ تو نہیں؟ ویسے آواز تو بہت متاثر کن ہے۔“ وہ اس کے ساتھ جڑ کے بیٹھ گیا۔ شرجیل کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔

”بیچھے ہو میں تمہاری گرل فرینڈ نہیں ہوں سمجھے۔“ وہ بد مزاجی سے چیخا۔ فراز کھسیا ہٹ کا شکار ہو کر رہ گیا۔

”میں نہ سہی مگر وہ ایمان صاحبہ تو گرل فرینڈ ہیں نا۔“ ”بکومت فراز جاؤ یہاں سے۔“ شرجیل کی پھٹکار کا بھی اس پر اثر نہیں ہوا تھا۔

”مجھے اس کے بارے میں بتائیں نا۔“ ”کس کے بارے میں؟“ شرجیل نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔

”اپنی گرل فرینڈ ایمان کے بارے میں۔“ ”وہ میری گرل فرینڈ نہیں ہے۔“

”تو پھر میری بھابی ہے کیا؟“ فراز دانت نکوس کر بولا تو شرجیل غصے کے باوجود آہستگی سے مسکرا دیا۔

”ہاں ہے تو نہیں بن جائے گی۔“ ”واؤ..... ارادے تو بہت نیک ہیں مگر نظم آپ نے خاصی بے باک قسم کی نہیں بھیجی اسی پہ تو جھگڑا گزرا نہیں ہو گیا وہ..... گرل اور آپ.....“

”ہاں میں لچا لنگا ہوں ہے نا؟“ وہ بھڑک کر چیخا۔ فراز نے کچھ حیرانی سے اس کا یہ شدید رد عمل دیکھا تھا۔

”میرا یہ مقصد تو نہیں تھا بھائی۔“ وہ منمنایا۔ ”تمہارا جو بھی مقصد ہو تم اٹھو یہاں سے۔“ شرجیل نے بھرپور درشتی سے کہا تو فراز کا چہرہ سرخ ہو کر رہ گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ شرجیل نے پہلے ہاتھ میں پکڑ لگ ٹیبل پہ رکھا پھر ریموٹ

کوئی دیوار ہے نہ درسا میں ہم فقیروں کا کیا ہے گھر سا میں آبلے پڑ گئے ہیں پیروں میں ختم ہوتا نہیں سفر سا میں کون رہتا ہے اس خرابے میں ڈھونڈتی ہے کسے نظر سا میں اک قیامت گزر گئی مجھ پہ اور مجھ کو نہیں خبر سا میں اک بھٹکے ہوئے مسافر کو اور رہنا ہے در بدر سا میں

بارش برس کے کھم چکی تھی۔ نیم پختہ اونچے نیچے فرش جگہ جگہ پانی کھڑا تھا۔ جس میں چڑیاں پر پھڑپھڑا کر نہانے میں مشغول تھیں۔ ان کی چچہاٹ ماحول دلفریب سا شور برپا کر چکی تھی دیوار سے لپٹی گلابی پھول کی تیل کے پتوں سے ابھی تک پانی قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ جس پہ نگاہ جمائے بظاہر وہ کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ لاریب کے کتنے مختلف اور دلنشیں سے روپ اس نگاہوں میں آن سائے تھے۔ وائٹ یونیفارم میں دوپٹے سے شانوں پہ پھیلائے ناگن کی مانند بل کھانچوٹی سے نکلتی لٹوں کو جو گستاخانہ انداز میں گاؤں کو باجوہ چومتی تھیں سر کی ہلکی سی جنبش سے جھٹک کر دور بٹھائی کانوں میں پڑے ٹاپس کا ڈائمنڈ جگمگا اٹھتا۔ سکندر نے فیصلہ کرنا دشوار ہو جایا کرتا۔ زیادہ آب تاب اس ٹاپس کے ڈائمنڈ کی ہے یا اس کے صبح چہرے کی کردینے والی چمک میں کبھی جب وہ کسی بات پہ کھلکتا ہنسی تو اس کی ہنسی کی جلتنگ کے ساتھ ساتھ وہ جیسے دانت کیسے حسین لگا کرتے تھے۔ وہ نرم و نازک گڑیا تھی۔ کرشل سے بنی بے حد حسین گڑیا جس کی پلکیں شکرنی ہونٹ موسی سراپا کی خوب صورتی اور

### فاطمہ شہزادی

سوٹ سے قارئین آنچل! آپ سب کو میرا بھرپور سلام۔ کہیے کیسے مزاج ہیں آپ لوگوں کے؟ یقیناً اچھے ہوں گے۔ میرا نام فاطمہ نواز منگل ہے۔ سبھی گھروالے خوشی سے غصے سے اور پیار سے فاطمہ بی کہہ کر بلاتے ہیں میرا کوئی تک نیم نہیں ہے۔ پاکستان کے خوب صورت شہر لاہور میں پیدا ہوئی لیکن اب گوجرانوالہ میں رہتی ہوں، ہم چھ بہن بھائی ہیں دو بھائی اور چار بہنیں۔ سب مجھ سے بڑے ہیں اور بہت پیار کرتے ہیں۔ میں نے 10th کلاس کے پیپر دیئے ہیں اور مجھے بڑھنے کا بہت تھوڑا ہے۔ 29 دسمبر کو اس خوب صورت اور پُر رونق دنیا میں قدم رکھا اس لحاظ سے میرا اشارہ جدی ہے مجھے کائنات کی خوب صورتی بہت متاثر کرتی ہے مگر اس کائنات میں بسنے والے لوگوں کے حالات زندگی دیکھ کر بہت دکھ اور رنج ہوتا ہے میرا بس نہیں چلتا کہ سارے لوگوں کے دکھ سمیٹ کر اپنے دامن میں بھریوں اور اپنے حصے کی تمام خوشیاں ان لوگوں کے نام کر دوں۔ اب آتے ہیں اپنی خوبیوں اور خامیوں کی جانب! خوبیاں یہ ہیں کہ کسی کی دل آزاری نہیں کرتی اور خوش اخلاق اور خوش مزاج ہوں۔ خامیوں میں بہت انا پرست ہوں اور اکثر اس انا کے ہاتھوں نقصان اٹھاتی ہوں اپنا دکھ کسی سے شیئر نہیں کرتی۔ گھر کے کاموں میں بالکل دلچسپی نہیں ہر ایک پر بہت جلد اعتبار کر لیتی ہوں یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر کوئی قابل اعتبار نہیں ہوتا۔ اب کچھ پسند نہ پسند کے بارے میں مجھے شلوار قمیض ساڑھی اور جینز بہت پسند ہے۔ کھانے میں دال چاول بریانی اور بھنڈیاں پسند ہیں۔ رنگوں میں سرخ کالا گلابی اور سفید رنگ پسند ہے۔ مجھے تنہائی اچھی لگتی ہے سردیوں کا موسم بہت متاثر کرتا ہے برستی ہوئی بارش ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں اور دھندل کو بھائی ہے۔ سیر و تفریح کرنے کا بھی بہت شوق ہے پسندیدہ ممالک میں پاکستان سعودیہ عرب دہلی ہیں۔ میرے دل کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ میں حج کروں اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کروں۔ اللہ کرے سب کی یہ جائز اور نیک تمنا پوری ہو آمین۔ میری بیسٹ فرینڈ کا نام فرزانہ ہے جو بہت پیاری ہے۔ اب آتے ہیں آنچل کی طرف آنچل تو میں نے 9th کلاس سے بڑھنا شروع کیا تھا اور اس مختصر عرصہ میں میں نے آنچل کو اپنے بے حد قریب پایا۔ اس میں بہت اچھی اچھی کہانیاں ہوتی ہیں ہمارے گھر میں میری آپلی عاصمہ بہت شوق سے بڑھتی ہیں۔ میں نے آنچل میں بہت ساری لڑکیوں کے تعارف پڑھے جیسا کہ ماثرہ ملک طاہرہ ملک مدیحہ شاہ اور خصوصاً شامہ انکرام کے تعارف نے مجھے بہت متاثر کیا اس لیے میرا بھی دل چاہا کہ اپنا تعارف بھیجوں۔ آنچل کی وہ رائیٹرز جن کی کہانیاں میرے دل کو چھو گئیں ان میں اقراء صغیر احمد نازیہ کنول سمیرا شریف راحت دفا اور عفت سحر طاہر شامل ہیں۔ میرے پسندیدہ ناٹرز میں یہ چاہتیں یہ شہتیں بھیکلی پلکوں بڑ زندگی دھوپ تم گھنا سائیہ پتھروں کی پلکوں پر اور ”جان جاں تو جو کہے“ شامل ہیں۔ سب رائٹرز بہت اچھا لگتی ہیں مجھے بھی لگنے کا بہت شوق ہے۔ میری زندگی بہت زیادہ خوشیوں میں گزر رہی ہے اس سے پہلے کہ آپ مجھ سے بور ہوئے لکھیں میں جلدی جلدی اپنا تعارف ختم کروں لیکن اپنا پیغام دینا چاہتی ہوں کہ ہمیں اپنی زندگی کی قدر کرنی چاہیے کیونکہ یہ زندگی خدا کی طرف سے بہت بڑا اور حسین تحفہ ہے ہر انسان کے لیے۔ کبھی کسی کا دل مت دکھائیں ہمیشہ سب کو خوش رکھنا چاہیے مجھ سے ملاقات کر کے آپ لوگوں کو کیسا لگا رہا ہے ضرور دیجیے گا اللہ حافظ۔

ایک بھی کہ نگاہ خیرہ ہو جائے۔ وہ جتنی حسین اور جاذب نظر تھی پتا نہیں اسی قدر بے حس مغرور اور بے نیاز کیوں تھی۔ سکندر نے زیادہ تر اسے سب سے خفائی دیکھا تھا اسے تو خاص طور پر کسی قابل نہیں سمجھتی تھی۔ اس احق سے انسان کو جو شاید لڑکپن سے نوجوانی میں قدم رکھتے ہی اس کے حسن خوب صورتی اور معصومیت کا اسیر ہو گیا تھا۔ حالانکہ جب وہ کتنی چھوٹی تھی پورے دس سال کا فرق تھا دونوں کی مڑوں میں۔ سکندر نے میٹرک کا امتحان دے رکھا تھا جب بابا اسے اپنے ساتھ حویلی لے آئے تھے۔ ان دنوں بابا کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی اور زمینوں کا حساب کتاب تو ضروری تھا نا جیسی ان کے حصے کا کام سکندر کو سنبھالنا پڑ گیا۔ اگرچہ اس کی تعلیم متاثر ہوئی مگر گھر کا چولہا بھی تو جلاتا تھا نا۔ تب اس نے پہلی بار گلابی نیٹ کے فرائک میں تکیوں کے پیچھے بھاگتی اس بچی کو دیکھا تھا جو گر کر چوٹ لگوا بیٹھی تھی اور حلق پھاڑ پھاڑ کر روتے ہوئے اس نے بابا سائیں کو بوکھلا کے رکھ دیا تھا۔ سکندر نے جانا تھا وہ بابا سائیں کی لاڈلی ہی نہیں خاصی سر جڑھی بیٹی تھی۔ حالانکہ



# اس کو صرف بے اولاد حضرات پڑھیں

بے شک اولاد صرف خدا کے ہاتھ میں ہے مگر آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ اولاد کی نعمت کروڑوں روپے میں بازار سے نہیں ملتی۔ گھر قبر سے بدتر ہے جو اولاد نہیں ہے۔ شادی کو چاہے 20 بیس سال ہو چکے ہوں خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ خواتین کے اندرونی پوشیدہ مسائل ہوں یا مردانہ کمزوری، مردانہ تولیدی جراثیم کا مسئلہ ہو۔ ہم نے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کر لیا ہے۔ جس کے استعمال سے آپ کے آئٹن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں۔ آپ آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بے اولادی کورس بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوا سکتے ہیں۔ ہمارا علاج انتہائی سستا آسان اور مختصر ہے۔

## دارالشفاء المدنی

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0334-9392646

0300-7522987

فون دوپہر 12 بجے سے شام 6 بجے تک کرس

گھماتے ہوئے کسی قدر جرأت سے کہہ ڈالا۔ برسوں بیت گئے تھے اسے سکندر کے طرف آس مندانہ نظروں سے تکتے مگر وہ ایسا جامد تھا کہ کبھی بھولے سے اشارہ نہ دیتا تھا کسی بھی قسم کا حالانکہ اماں کی بھی دلی خواہش تھی کہ اس کا بیاہ سکندر سے ہو پر اماں سکندر سے زبردستی پہرگز آمادہ نہ تھی۔

”کیا مطلب ہے اس بات کا؟“ سکندر نے اچھنے میں سر کرنا یہ کی سانولی سلونی صورت دیکھی جس کی ملاحظت دل موہتی تھی۔

”جتنے اس بات کا مطلب بھی نہیں پتا سکندر ہے۔“ ثانیہ کی نگاہوں کا شاکی پن کچھ اور بھی گہرا ہونے لگا مگر سکندر کا تحیر اپنی جگہ سلامت رہا۔

”اب میں تیری سکھیوں کی باتیں بھلا کیسے سمجھنے لگا؟“ وہ سارا دن تیرے کانوں میں کھسر پھسر کرتی ہیں نہ کہ میرے اور نہ ہی مجھے کبھی کوئی الہام ہوا ہے۔“ سکندر نے کسی قدر جھلا کر کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ارادہ جانے کا تھا۔ ثانیہ بے تاب سی ہونے لگی۔

”بیٹھ نا..... اتنی جلدی کیوں رہتی ہے تجھے حویلی جانے کی؟“

”جتنے پتا ہے ثانیہ! لاریب اور امامہ بی بی کو مجھے ہی کالج چھوڑنے جانا ہوتا ہے۔ دیر مناسب نہیں۔“ (اور تجھے کیا پتا ثانیہ میرا کتنا جی چاہتا ہے میں ہمیشہ لاریب بی بی کو آنکھوں کی سامنے رکھوں مگر.....)

”جا پھر.....“ ثانیہ نے منہ پھلایا تو سکندر مسکرا دیا تھا اس کا سر تھپکا اور نرمی سے گویا ہوا۔

”میں نے تو تجھے بھی کہا تھا میٹرک کے پیپر دے لے میں تیاری کرادوں گا۔ اب تو بھی کالج جاری ہوئی لاریب بی بی سے دو سال بڑی ہے تو یعنی ایمان بی بی کی ہم عمر مگر گھر بیٹھ گئی ہے ایمان بی بی یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں۔“

”ہمارا غریبوں کا ان شاہوں سے کیا مقابلہ سکندر! ہمیں تو ساری عمر چولہا چکی ہی کرنی ہے۔“

دیوانے کا خطاب نہیں دیتے۔

لاریب کے حوالے سے عباس حیدر کی نسبت آگاہی تو تکلیف دہ امر تھا ہی مگر عباس حیدر کی کسی انجام لڑکی سے منگنی کی خبر پہ لاریب کے چہرے کے بچھے رنگ اور اذیتیں بھی تو سکندر کے دل میں پھانس بن کر گزرتی تھیں۔ کیسی انوکھی کیفیات کا نام ہے محبت بھی محبوب کی خوشی ہی سب کچھ لگتی ہے۔ وہ بھی اس کی ادا سیوں افسردہ تھا۔

”سکندر! چاہی لے۔“ ثانیہ کی آواز پہ وہ خیالات کی نگری سے چونک کر باہر آیا۔ ثانیہ اس کے سر پر آکھڑی ہوئی تھی۔ سبز کناری والی پیالی میں گرما گرم چائے تھی جس کی سنہری رنگت اور دلفریب خوشبو بہت خاص تھی۔

”شکریہ ثانیہ!“ اس نے پیالی تھام لی۔

”رسک لا دوں ساتھ یا پراٹھا لو گے۔“ ثانیہ کی سوجھ بوجھ نگاہوں میں اس کے لیے کیسی انوکھی سی خوشی اور چاہت رنگ تھا۔ ایسا رنگ جو سکندر کو کبھی نظر نہیں آسکا تھا اور ان کے لبوں پہ حیا کے قفل پڑے رہتے تھے۔ یہ بھی بات تھی نا وہ اس بات پہ اکثر شاکی ہوا کرتا کیسے ممکن اس کی محبتوں کی پیش لاریب تک نہ پہنچی ہو اتنی چاہت اتنی محبت بے اثر کیسے ہو سکتی ہے؟ تو ثانیہ بھی ایسا سوچتی تھی اس کے متعلق اس پہ ثانیہ کے جذبے اثر پہ ہو سکے تھے تو اس کے لاریب پہ اور لاریب کے عباس پہ یہ تو ایک چین بن گئی تھی مگر اپنی جگہ ہر کوئی نا صرف مظلوم سمجھ رہا تھا بلکہ حق بجانب بھی۔ بس ایک عباس ہی تھا ایسا خوش بخت جس نے جو چاہا تھا پا بھی لیا تھا۔

”سکندر! کہاں کھو جاتا ہے تو بیٹھے بٹھاتے

”میری سکھیاں کہتی ہیں سکندر کے قریب کی بہت کمزور ہے۔“ ثانیہ نے چاندی کا چھلا اپنی انگلی

اس سے چھوئی تھی امامہ مگر اس کے مزاج میں بہت تحمل رسائی اور ٹھہراؤ تھا جبکہ لاریب جذباتی غصیلی اور جلد باز تھی۔ انہی دنوں اماں (لاریب کی والدہ) کی وفات ہو گئی تھی اور بابا سائیں بچپن کے معاملے میں کچھ زیادہ حساس ہو رہے تھے۔ پھر جب بابا صحت مند ہو کے واپس اپنی ڈیوٹی پہ آگئے تب بھی بابا سائیں نے سکندر کو حویلی سے جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔

”سکندر! ہمیں اپنی اولاد کی طرح سے عزیز ہے۔ احسان بخش ہماری بچیوں کو بالکل بھائیوں کا سا پیار دیا ہے امامہ تو اس سے بہت مل گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں سکندر ایسے ہی یہاں رہے۔“ بابا سائیں کی بات پہ بھلا بابا کو کیونکر انکار ہو سکتا تھا۔ سکندر کے وہاں رہنے کی سب سے زیادہ خوشی امامہ کو ہوتی تھی۔ امامہ اور ایمان سکندر سے واقعی بڑے بھائیوں کا سا رویہ رکھتی تھیں مگر سکندر خود کو اپنے مخصوص دائرے سے آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا وہ جانتا تھا وہ ان کا بھائی نہیں بہر حال ملازم ہی ہے البتہ لاریب کا رویہ اس سے دھوپ چھاؤں جیسا ہوتا وہ اس سے صرف تب ہی بات کرتی تھی جب اس سے کام ہوتا وہ ہر ایرے غیرے کو منہ لگانا پسند نہیں کرتی تھی جب ذرا بڑے ہونے پہ اس پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ عباس حیدر کا اس سے خجوک ہو چکا ہے لاریب کا دماغ کچھ اور بھی عرش معلیٰ پر جا پہنچا تھا۔ عباس حیدر جیسا شاندار لڑکا ہی اس کا شریک حیات ہونے کا حقدار تھا جبکہ سکندر جو جانے کب لاریب کے معاملے میں دل کے ہاتھوں افسردہ تھا عباس حیدر سے اس کی نسبت کے متعلق جان کر کچھ اور بھی ملول رہنے لگا۔ گو کہ وہ جانتا تھا لاریب کو پانا دیوانے کے خواب کے مترادف تھا اس کے باوجود اسے کسی اور کے حوالے سے سوچنا بھی تو اذیت میں بڑھاوا دیتا تھا۔ سکندر جس کے رات دن اس کی سوچوں اور خیالات سے تابندہ تھے وہ اس کی سوچوں سے کتنی لاعلم تھی اور صحیح ہی تو تھا ورنہ وہ اس گستاخی پر سکندر کا حشر بگاڑنے سے بھی نہ چوکتی۔ محبت کرنے والے بھی عجیب ہوتے ہیں لوگ یونہی انہیں



ثانیہ جانے کیوں افسردہ و غمگین نظر آنے لگی۔ سکندر نے  
عبدالاساس کو کھینچا تھا۔

”کہتی تو تھیک ہے ثانیہ مگر یہ جو دل ہے نا یہ  
مہر تے اور مقام نہیں دیکھتا۔ اس کی ضد بھی عجیب اور  
فرمائش بھی.....“ وہ جیسے کہیں دور کھو گیا ثانیہ نے  
چونک کر اسے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ جیسے ہراساں ہوئی۔

”ہر بات کا مطلب مت پوچھا کرو۔ میں بھی کوئی  
اتنا عالم فاضل نہیں ہوں جو سمجھانے میں کامیاب  
ہو جاؤں۔ دیکھا باتوں میں لگا کر دیر کرا دی ابھی مجھے اماں  
سے دواؤں کا پرچا بھی لینا ہے شہر سے لیتا آؤں گا۔“ وہ  
کلائی پر بندھی گھڑی پہ نگاہ ڈالتے ہی بڑبڑایا اور تیز  
قدموں سے اندر چلا گیا ثانیہ گہرا سانس بھر کے اپنے  
ہاتھوں کی لکیروں کو یوں گھورنے لگی جیسے مستقبل میں  
جھانکنے کی کوشش کر رہی ہو۔

.....

ہاتھ بالوں میں پھیرے تو میں سو جاؤں گا

کوئی قصہ وہ سناے تو میں سو جاؤں گا

اسے کہنا کہ مجھے نیند نہیں آتی ہے

اپنی بانہوں میں وہ سلائے تو میں سو جاؤں گا

میری پلکوں پہ سجے ہیں کئی راتوں کے دیے

کوئی پلکوں سے بجھائے تو میں سو جاؤں گا

آخری سانس مجھے موقع دے یہ ذرا

میرا وعدہ ہے کہ وہ آئے تو میں سو جاؤں گا

بعد کی بعد میں دیکھیں گے ابھی اس سے کہو

آج کی رات نہ وہ جائے تو میں سو جاؤں گا

پچھلے دو گھنٹوں سے وہ مسلسل عرشہ سے فون پہ جو گفتگو

تھا۔ محبت کی ایسی شدت اتنی چاہت اور اہمیت کبھی کبھی تو

عرشہ بے یقین سی ہو جاتی اکثر مغرور رہتی مگر کبھی عباس

کی یہ دیوانگی یہ دیوانہ پن خوفزدہ کر دیا کرتا۔ اس وقت بھی

وہ خائف ہو گئی تھی۔ جیسی عباس کو سونے کا مشورہ دیا تھا۔

خس کے جواب میں عباس نے اسے یہ غزل سنا دی تھی۔

عرشہ کچھ جھینپی اور کچھ تفاخر سے ہنستی چلی گئی۔ پھر جب  
اس کی یہ ہنسی تھمی تو بولی۔

”ایسا کیا ہے مجھ میں عباس کہ اتنا چاہتے ہو۔“

”یہی تو بتانا اور سمجھانا چاہتا ہوں یار شادی تو ہونے

دو۔“ وہ پھر ہڑی سے اترنے لگا۔ عریشہ جھینپ گئی تھی۔

”مجھے تو بیچ پوچھو تمہاری محبت خوفزدہ کرنے لگی ہے

عباس۔“ وہ واقعی متاثر لگ رہی تھی۔ عباس ہنسنے لگا پھر

وضاحت دینے کو بولا تھا۔

”عرشہ تمہیں پتا ہے تم سے پہلے میں نے کبھی کسی

سے محبت نہیں کی تھی ماسوائے اپنی ذات کے اماں بابا

سائیں مجھے کسی سے بھی کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا جیسی تو

میں نے اپنی خوشی کو اولیت دی اور بہت آسانی سے سب

کچھ چھوڑ دیا وہ بہت خاص لڑکی بھی جسے بابا سائیں نے

مجھ سے منسوب کیا تھا سب نے کتنا کہا تھا اس جیسی لڑکی

مجھے دوبارہ نہیں مل سکتی مگر مجھے پروا نہیں رہی اب میرا جی

چاہتا ہے تمہیں سب کے سامنے کھڑا کر کے کہوں دیکھو

مجھے ویسی لڑکی ملی ہے جیسی میں چاہتا تھا۔“ وہ ایک ٹرانس

میں بولتا چلا گیا تھا۔

”عباس کبھی کبھار مجھے بہت ڈر لگتا ہے یونو ہم

دونوں نے ہی ایک دوسرے کی خاطر اپنی اپنی نسبتیں توڑ

ڈالی ہیں یعنی دو دلوں کا خون کیا ہے عباس کہیں ہمیں

اس کی سزا.....“

”اللہ نہ کرے عریشہ۔ پلیز ایسی باتیں مت کرو۔“

عباس واقعی دہل گیا تھا اور کتنی دیر اسے سمجھا تا رہا جب فون

بند کر کے وہ شاور لینے کے خیال سے اٹھا عین اسی بل

ملازم نے اس کے دروازے پہ دستک دی تھی۔

”یس کم آن!“ عباس نے گردن موڑ کر دروازے کی

جانب دیکھا جہاں فضل دین کھڑا تھا۔

”صاحب رجبہ صاحب تشریف لائے ہیں۔ آپ

سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”اس وقت؟“ انہیں کیا ضرورت بلکہ مصیبت آپڑی

ہے صبح نہیں ہونی تھی کیا؟“ اس نے بارہ بجائی گھڑی

ایک نگاہ ڈال کر بے حد آف موڈ کے ساتھ کہا۔  
”صاحب میں نے بھی کہا تھا وہ صبح آجائیں مگر  
کہنے لگے صبح آپ کے صاحب ہمیں دستیاب نہیں  
ہوتے۔“ فضل دین کی وضاحت پہ اس کا مزاج کچھ

اگر ہر ہم ہو گیا۔

”انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ آتا ہوں میں۔ اور

سنو چائے بھی بنا کر لے جاؤ۔“

”جی صاحب!“ فضل دین مستعدی سے پلٹ گیا تو

عباس نے دانتوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے خود کو کمپوز

کیا۔ وہ رجبہ صاحب کی آمد کے مقصد سے بخوبی آگاہ

تھا۔ کچھ سوچا پھر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ رجبہ صاحب

بہت تپاک اور گرمجوشی سے اس سے اٹھ کر بغلگیر ہوئے۔

ایسا تپاک اور گرمجوشی جس میں چاہلوسی اور غرض پوشیدہ

تھی۔ حالانکہ وہ ملک کے جانے مانے ڈائریکٹروں میں

شمار ہوتے تھے۔

”بیٹھے رجبہ صاحب!“ عباس نے صوفے پہ بیٹھتے

ہوئے انہیں مخاطب کیا۔

”معذرت چاہتا ہوں عباس صاحب اس وقت

زحمت دینے پہ مگر.....“

”اٹس اوکے فرمائیے کس سلسلے میں زحمت فرمائی۔“

عباس کا انداز لیا دیا تھا۔ وہ عام ایکٹرز کی طرح پروڈیوسر

اور ڈائریکٹرز کے آگے پیچھے نہیں پھرا کرتا تھا۔ اس کا

مزاج شاہانہ بے نیازی لیے ہوئے تھا۔ ایسے فلم میں کام

کرنے کی آفر ہوتی تھی تو اس نے شوق اور تجسس میں کام

کر لیا تھا مگر فلم کی مقبولیت دیکھ کر تمام فلم میکرز خود اس کے

پیچھے پھرنے پہ مجبور ہو گئے تھے اور اب عباس کا یہ اچانک

فیصلہ تمام فلم بینوں کو متفکر و پریشان کر گیا تھا۔ اس وقت

رجبہ صاحب کی آمد بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

”آپ کو معلوم تو ہے عباس صاحب ہم آپ کے

فیصلے سے کتنے اب سیٹ ہو گئے ہیں۔ لاکھوں کا سرمایہ

لگایا ہے جس فلم پہ کیا وہ ڈوب جائے گا؟“ ان کے انداز

میں مسناہٹ تھی عباس کو خفت نے آن لیا۔

غزل

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے

کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

خطاوار سمجھے گی دنیا تجھے

اب اتنی زیادہ صفائی نہ دے

ہنسو آج اتنا کہ اس شور سے

صدا سسکیوں کی سنائی نہ دے

غلامی کو برکت سمجھنے لگیں

اسیروں کو ایسی رہائی نہ دے

ابھی تو بدن میں لہو ہے بہت

قلم چھین لے روشنائی نہ دے

مجھے ایسی جنت نہیں چاہیے

جہاں سے مدینہ دکھائی نہ دے

خدا ایسے احساس کا نام ہے

رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

کامران خان..... کوہاٹ KPK

”مجھے افسوس ہے رجبہ صاحب آپ پریشان نہ ہوں

میں آپ کا ایڈوائس آپ کو واپس کر دوں گا۔“

”ارے کیسی بیگانوں والی باتیں کرتے ہیں جناب!

بس آپ معاہدے کے مطابق ان فلموں کی شوٹ تو

کمپلیٹ کرائیں نا۔ ویسے ایسی کون سی وجہ ہے آپ کے

اس اتنے بڑے فیصلے کے پیچھے؟“ وہ اب کے لجاجت

سے بولے تو عباس نے ہونٹ چیخ لیے تھے۔

”میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے کہ میں

آئندہ کیا کروں گا۔ ویسے آپ پریشان نہ ہوں میں

آپ کی دونوں موویز کی شوٹ جو رہتی ہے کمپلیٹ

کرادوں گا۔“ عباس کو ایک دم ہی ان پر ترس آ گیا

تھا۔ عریشہ کو وہ کسی نہ کسی طریقے سے منالے گا۔ آخر

اصول بھی کسی چڑیا کا نام تھا۔

”اوہ ریکی عباس صاحب! جیوندے رہو سو ہنریو۔“

رب لمبی حیاتی دے۔“ رجبہ صاحب کو تو گویافت اقلیم کی



دولت مل گئی۔ بے ساختہ دانت نکوس کر زبردستی عباس سے معاف کرنے میں مشغول ہو گئے عباس کھپا کر مسکرا دیا۔  
”جائے تو پی لیں راجہ صاحب۔“ انہیں جانے کو تیار دیکھ کر عباس نے ٹوکا اسی وقت فضل دین چائے لے کر آیا تھا۔

”ارے نہ جی نہ اب چائے پی تو رات کو الو بن کر جاگوں گا۔ اب چلتا ہوں رب راکھا! بس ذرا اپنے وعدے کو یاد رکھنا عباس صاحب۔“ راجہ صاحب اس سے ایک والہانہ سا مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ تو فضل دین نے بے بسی سے ہاتھ میں پکڑی چائے کی ٹرے کو دیکھ کر عباس کو دیکھا تھا۔

”اب چائے کا کیا ہوگا صاحب!“  
”تم پی لو فضل دین اگر رات کو جاگنا ہے تو۔“ وہ مسکرا کر کہتا ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ فضل دین منہ لٹکا کر ٹرے سمیت کچن کی طرف جا رہا تھا۔

.....

گاڑی سبک رفتاری سے راستہ طے کر رہی تھی جبکہ اس کا ذہن جیسے ماضی میں الجھا ہوا تھا۔ چار سال قبل جب وہ اعلیٰ ڈگریوں سمیت واپس حویلی آیا تھا تو لاریب نے ہوش سنبھالنے کے بعد پہلی مرتبہ اسے بغور دیکھا تھا۔ کتنا حسین تھا وہ کتنا چارمنگ کہ دیکھو تو دھڑکنیں زیر و زبر ہونے لگیں۔ وہ ایک سنہرا خواب بن کر اس کی آنکھوں میں بس گیا تھا۔ اس کا لمبا قد اس کا کسرتی وجود اس کی غضب کی اساتیس اس کے مغرور تکیے نقوش پورے چہرے پر حکمرانی کرتی سحر طراز گہری جادو اثر آنکھیں وہ جتنا حسین اور خوبو تھا اس سے بڑھ کر مغرور تھا۔ کتنی وضاحت کتنی فرصت سے سوچنے لگی تھی وہ اسے۔ جی چاہتا سارا کام چھوڑ کر بس اسے ہی سوچتی جائے اور دل تھا کہ بھرتا ہی نہ تھا۔ پھر آپا کی شادی کی تقریب میں بارہا اس کا عباس سے سامنا ہوا تھا۔ وہ جتنی مقناطیسی کشش کے تحت اس کی جانب کھینچی عباس اسی قدر لاطعلق نظر آتا تھا وہ مایوں کی رات تھی جب لاریب نے اور بیچ کلر کا

بہت خوب صورت سوٹ پہنا ہوا تھا آپا کو جانے کیا سوچھی تھی کہ عباس کے حوالے سے اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ وہ بیرہوئی کی طرح سے سرخ پڑ گئی تھی۔ پھر اس کی یہی شرماہٹ جھینپ اور چہرے کے حسین رنگوں کو دیکھتے ہوئے ہی آپا کے ساتھ باقی لڑکیاں بھی مل گئی تھیں اور چھیڑ چھیڑ کر لاریب کا ناک میں دم کر چھوڑا تھا۔ یہی وہ موقع تھا جب عباس کسی کام کی غرض سے وہاں چلا آیا تھا۔

”اس بات کو چھوڑو عباس یہاں بیٹھو لاریب کے پاس۔“ اس کی بات کے جواب میں آپا نے عباس کا ہاتھ پکڑ کر ایک انوکھی فرمائش کی تھی۔

”یہاں بیٹھنے کے لیے کیا یہ ضروری شرط ہے؟“ وہ لاریب کے بجائے آپا کے مقابل بیٹھ گیا تھا۔ لاریب کے چہرے پر ایک خفیف سا سایہ لہرا گیا۔ پتا نہیں وہ کیا تھاڑ کے تو ایسے بہانے ڈھونڈا کرتے ہیں۔

”بھئی وہ منگیتر ہے تمہاری! ہم دیکھنا چاہتے ہیں وہ تمہارے ساتھ کسی لگتی ہے؟“ آپا کی وضاحت یہ جہاں لاریب سرخ پڑ گئی تھی عباس ایک دم بے حد سنجیدہ نظر آنے لگا۔  
”آپا پلیز آپ اتنی سی بچی کے سامنے اس قسم کی باتیں مت کریں۔“

”اتنی سی بچی پورے پندرہ سال کی ہے۔ ہو سکتا ہے سال ڈیڑھ سال میں بابا جان تمہاری شادی کرادیں آپا نے جیسے اس پر حقیقت آشکار کی مگر وہ جھنجھلا گیا تھا۔  
”خواتواہ ہی مجھے نہیں کرنی اتنی جلدی شادی۔ اور پلیز اس نایک کو فی الحال کلوز کریں میں نے کہا ہے ناں لاریب کی ابھی عمر ہی کیا ہے؟“

”ہمارے ہاں چھوٹی عمر میں ہی شادیاں ہوتی ہیں عباس۔“ آپا نے جیسے باور کرایا تھا۔  
”مگر میں خود پہ ایسے تجربے نہیں ہونے دوں گا۔ لاریب مجھ سے بہت چھوٹی ہے اور.....“  
”اور کیا؟“ آپا اس کے ہونٹ بھیج جانے پہ چپکے

انداز میں بولیں۔ باقی سب بھی خاموش اور فکر مند نظر آتی تھیں مگر لاریب کا چہرہ تو دھواں ہو رہا تھا۔  
”اور کچھ نہیں.....“ وہ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا مگر لاریب کے اندر تو خدشے اور واہے در آئے تھے۔ چھوٹی سی عمر بچی محبت کا نوخیز سا احساس اس پر بھی فکر مندی اور نظرات کی کڑی دھوپ وہ تو جیسے کلا کے رہ گئی۔ وہ ویسے کی تقریب تھی جب وہ تیار ہو کر بڑی حویلی آئی تو سب سے پہلا سامنا عباس سے ہی ہوا تھا۔ حویلی میں بھی غیر معمولی خاموشی تھی وہ کچھ گھبرا سی گئی۔

”سب لوگ کہاں ہیں؟ مجھے تیاری میں کچھ دیر ہوگئی تھی بچو نے کہا تھا میں یہاں آ جاؤں اکٹھے چلیں گے مگر لگتا ہے وہ مجھے چھوڑ گئیں۔“ وہ آن کی آن میں روہاٹی ہو گئی تھی۔ عباس جو اسے بغور دیکھ رہا تھا آہستگی سے مسکرا دیا پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

”چھوڑ کر وہ واقعی چلی گئی ہیں مگر میری وجہ سے وہ چاہتی ہیں کہ تم میرے ساتھ وہاں آؤ۔“ وہ اپنی بات کہہ کر سوالیہ نگاہوں سے اسے تنکے لگا۔ لاریب کے دل کی حالت غیر ہو گئی دھڑکنیں کیسے شور مچانے لگی تھیں مگر اتنے اسے مسکرانے خوش ہونے کی اجازت نہیں دی۔

”میرے کچھ چاہنے سے کیا ہوتا ہے بات تو آپ کے چاہنے سے بنتی ہے۔“ وہ منہ پھلا کر زور ٹھٹھے پن سے بولی تو عباس نے چونک کر بغور اسے دیکھا۔ وہ کم عمر تھی۔ اس عمر کا مخصوص بانگین نوخیزی اور معصومیت اس کے چہرے پر ملاحظہ کی صورت بکھری تھی مگر وہ اپنی عمر سے کچھ آگے نظر آ رہی تھی زرق برق لباس میک اپ اور جیواری کے بے تحاشا استعمال کی وجہ سے۔

”اس دن جو باتیں آپا نے کہیں شاید تم نے ان کا برا مانا ہے لاریب؟“

”ان کی نہیں آپ کی باتوں کا مانا ہے اور مجھے ماننا بھی چاہیے۔“ وہ خاصی خفگی سے جتلا رہی تھی۔ عباس نے ٹھنڈا سا نس کھینچ لیا۔

حمد شریف

دل مغموم کو مسرور کر دے  
دل بے نور کو پرنور کر دے  
فروزاں دل میں شمع طور کر دے  
یہ گوشہ نور سے معمور کر دے  
مرا ظاہر سنور جائے الہی  
میرے باطن کی ظلمت دور کر دے  
مئے وحدت پلا مخمور کر دے  
محبت کے نشے میں پور کر دے  
نہ دل مائل ہو میرا ان کی جانب  
جنہیں تیری ادا مغرور کر دے  
ہے میری گھات میں خود نفس میرا  
خدایا اس کو بے مقدر کر دے

مدیحہ شبیر..... شاہ نکلڈر

”یہ ایسی باتیں نہیں ہیں کہ تم کر دیا سنو۔ یونوا بھی تم چھوٹی ہو..... ایسی عمر.....“

”میں کوئی چھوٹی نہیں ہوں۔ میں نے میٹرک کے ایگزام کیسے کر لیے ہیں۔“

”اچھا میں سمجھا تم ماسٹرز کر چکی ہو۔“ عباس نے آنکھیں پھیلا کر مسکراہٹ ضبط کی تو لاریب کا پارہ ہائی ہونے لگا تھا۔

”آپ میرا مذاق نہیں اڑا سکتے سمجھے آپ۔“ وہ بد مزاجی سے چیخ پڑی تھی مگر عباس کی مسکراہٹ بدستور اس کے ہونٹوں پہ لہرائی رہی تھی۔ لاریب ایک نظم یاد آئی ہے مجھے سناؤں؟ تمہارے حسب حال ہے۔“ پھر اس کی اجازت ملنے سے قبل ہی وہ بہت دھیمے اور پرتا شیر لہجے میں سنانے لگا تھا۔

سنوے چاندی لڑکی!

ابھی تم تتلیاں پکڑو.....!

یا پھر گڑیوں سے کھیلو!

یا پھر معصوم سی آنکھوں سے ڈھیروں خوابوں کو دیکھو



فرار و فائز و محسن کی کتابیں مت ابھی پڑھنا!  
یہ سب لفظوں کے ساحر ہیں تمہیں الجھا کے رکھ دیں گے  
تمہیں معلوم ہی کب ہے!

محبت کے لبادے میں ہوس اور حرص ہوتی ہے  
انسانوں کی دنیا ہے  
مگر اس سے کہیں بڑھ کر یہاں وحشی درندے ہیں  
وہ وحشی جن کی آنکھوں میں.....!

مچلتے پیار کے پیچھے ہوس اور حرص ہوتی ہے  
اتھلی پتلی کلی ہوتی تمہیں کانٹوں سے مت کھیلو  
ابھی اپنی تھیلی پہ کسی کا نام مت لکھو  
ابھی اپنی کتابوں میں گلابی پھول مت رکھو  
ابھی تم تئلیاں پکڑو!

ابھی گڑیوں سے کھیلو تم!  
”یہ نصیحت ہے یا حکم؟“ وہ جیسے ہی خاموش ہوا  
لاریب نے کسی قدر تھکے چوتھوں سے اسے دیکھ کر سوال  
داغا۔ عباس آہستگی سے مسکرایا تھا۔  
”حکم کیوں دوں گا نصیحت سمجھ سکتی ہو۔“ لاریب  
بے دردی سے ہونٹ کھینچنے لگی۔

”آپ مجھے پسند نہیں کرتے ہیں نا وہاں امریکہ میں  
کوئی.....“

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے لاریب!“ وہ عاجز ہو گیا۔  
”تو پھر.....!“ لاریب کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب  
ہونے لگی تھیں۔

”ہم اس موضوع پہ پھر کبھی بات کریں گے ابھی اٹھو تم  
دیر ہو رہی ہے۔“ عباس نے جیسے اسے ٹال دیا تھا۔  
لاریب نے سمجھا جانا اور دکھی ہو گئی۔

”تب شاید آپ کے پاس وقت نہیں ہوگا۔“ اس نے  
شکوہ ضروری سمجھا مگر عباس دانستہ نظر انداز کر گیا۔ آج  
واقعی وہ وقت تھا وہ بڑی ہو گئی تھی اور کہنے والا اپنی بات بھلا  
کراپنے راستے منتخب کر چکا تھا مگر وہ کیا کرتی کہاں جاتی  
اس کا دل دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ گاڑی حویلی کا  
گیٹ کراس کر کے گیراج میں آ کر رکی تب وہ چونکی تھی

اور اپنا بیگ سنبھالتی دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ امامہ کے  
ہمراہ جب وہ لان عبور کر کے برآمدے میں آئی تو جاٹے  
کس سمت سے نکل کر وقاص ایک دم اس کے راستے میں  
آ گیا۔ اگر وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں اپنا بڑھا ہوا قدم  
پیچھے نہ ہٹا لیتی تو یقیناً اس سے ٹکراؤ ہو چکا ہوتا۔ اس نے  
اونچے پورے گرائڈیل وجود سمیت مونچھوں کو تار دیتا ہوا  
خباثت زدہ مسکان لیے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا اور ان  
نگاہوں میں ایسا کیا ہوتا تھا جو لاریب کی ساری بہادری  
ساری بولڈنیس ہوا کر دیا کرتا تھا۔ اسے آج تک سمجھ نہ  
آ سکی تھی۔ وہ ایمان کا منگیتر تھا اس کی یہ نظریں اگر ایمان  
کے لیے ہوتیں تو وجہ سمجھ بھی آتی وہ ایمان کے ساتھ  
لاریب پہ ایسی نظریں کیوں ڈالتا تھا وہ ہمیشہ سمجھنے سے  
قاصر رہی۔ جتنا ہی ہونی طنز آمیز نگاہیں جن میں عجیب سی  
تپش ہوتی اور ایسا تب سے ہوا تھا جب سے عباس نے  
ہمیشہ کے لیے حویلی کو چھوڑا تھا۔

کیا یہ مجھے مفت کا مال سمجھتا ہے؟ لاریب نے کئی بار  
سلگ کر یہ بات سوچی تھی اور بہت گڑبڑ تھی عباس کے  
حوالے سے۔ نئی اور نفرت اس پل بڑھتی ہوئی محسوس  
ہونے لگتی۔

”میں کبھی تمہیں معاف نہیں کروں گی عباس۔“ اس  
پل بھی وہ وقاص کو گالیاں دینے کے بعد ایک بار پھر عباس  
کے تصور سے مخاطب ہوئی تھی۔ اور اپنے کمرے میں آ کر  
بیگ اور چادر اتار کر صوفے پہ پھینک دی۔

”گھٹیا ذلیل کمینہ انسان جی چاہتا ہے آنکھیں ہی  
پھوڑ ڈالوں۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے فریج کھول کر  
پانی کی بوتل نکالی کمرہ سے لگالی معا اپنے علاوہ کسی اور کی  
موجودگی کے احساس کو پا کر اس نے بے ساختہ نظر گھمائی  
ہیٹر کے پاس ہاتھ میں کوئی اوزار پکڑے سکندر کھڑا تھا۔  
صم مہبوت اس نے پہلی مرتبہ لاریب کو یوں بغیر دوپٹے  
کے دیکھا تھا۔ وہ تو جیج معنوں میں ہوش گنوا بیٹھا تھا اس  
کے حسن کی آب تاب کے آگے۔

”تم کیا کر رہے ہو یہاں؟“ وہ تیوری چڑھا کر بولی

سکندر پٹنسا سا گیا۔

”وہ بی بی جی ہیٹر خراب ہے بابا سائیں نے کہا تھا  
چیک کر لوں تو.....“

”ہاں میں نے ہی کہا تھا انہیں کرو تم اپنا کام۔“  
لاریب نے کچھ نخوت کچھ بے نیازی سے کہا اور غنا غٹ  
پانی پینے لگا۔ سکندر نے سکھ کا سانس بھرا کجا اسے خواہ مخواہ  
ڈانٹ نہیں دیا۔ پتا نہیں لاریب سے سخت سن کر  
اسے اچھا کیوں نہیں لگتا تھا۔ دل دیوانہ نادان پاگل شیدائی  
کیوں اس سے نرمی رسان اور شاید محبت کا طلب گار تھا۔ چیچ  
چیچ محبت! اس کا جی چاہا خود اپنا مذاق اڑا کر ہنسے مگر اتنی  
تاب کہاں تھی۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔

”اگر تمہیں اس کی رمز سمجھ نہ آئے سکندر تو شہر سے  
ملکینک بلو لینا گاؤں کی سردی ناقابل برداشت ہے۔ کل  
ساری رات مجھے نیند نہیں آ سکی مارے ٹھنڈ کے۔“ خالی  
بوتل لاپرواہی سے کارپیٹ پہ لڑھکا کر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے  
سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ ارادہ بال سلجھانے کا تھا اس  
نے چوٹی کے بل کھولے تو سیاہ مخملیں بالوں کا آبشار پوری  
پشت پہ پھر گیا۔ سکندر کن اکیوں سے اسے تکتا رہا۔ وہ  
نئی بے نیاز تھی اس کی موجودگی سے۔ گویا اس کا ہونا نہ  
ہونا ایک برابر تھا۔ کیا وہ ایک بھر پور جوان مرد نہیں تھا یا پھر  
لاریب کے نزدیک اس کی اہمیت ہی نہیں تھی۔ دوسری  
بات سن چکی تھی جس نے سکندر کو کچھ اتنا ذہنی طور پہ اپ سیٹ  
کیا کہ وہ وہاں مزید ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکا تھا۔

”کیا ہو گیا ٹھیک؟“ لاریب نے قدرے چونک کر  
اسے باہر جاتے دیکھا۔

”نہیں.....“ وہ مختصر ابولا تھا۔  
”پھر.....؟“

”میں ملکینک کو بلواؤں گا۔“ سکندر کی آواز ایک دم  
بھاری ہونے لگی۔ پتا نہیں کیوں۔

”اوکے فائن! تم سکھاں سے کہہ کر مجھے چائے بھجوا  
دینا۔“ لاریب نے کاندھے جھٹک کر کہا تھا سکندر تیزی  
سے نکلتا چلا گیا۔

.....

ہماری کشتیاں تو بے یقینی کے کھنور میں ہیں محسن!  
چلو اچھا کیا ہم سے کنارہ کر لیا تم نے.....!

”شرجیل پلیز!“ وہ اس کی بے اعتنائی کو سہتی رو ہانسی  
ہو گئی تھی۔ صبح سے مجال ہے جو ایک کلاس بھی اینڈ کی ہو  
پہلے اس کی تلاش میں مارے مارے پھر کے وقت برباد  
کیا اب اسے منامنا کر ہاری تھی تو جیسے ضبط کھو بیٹھی۔

”آخر کہا کیا تھا میں نے تم سے جو تم نے اتنا برامانا  
لیا۔“ شرجیل نے چپ کا روزہ توڑ دیا تھا۔ ایمان کی کچھ  
کچھ سانسیں بحال ہوئیں۔

”آئی ایم سوری..... ریلی سو سوری شرجیل۔“ اس  
نے باقاعدہ دونوں ہاتھ جوڑ لیے۔ شرجیل کچھ دیر اسے  
یونہی دیکھتا رہا پھر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں  
لے لیے۔

”اوکے فائن میں اس سوری کو ایک سیٹ کر لیتا ہوں  
مگر ای میری بھی ایک شرط ہے بولو مان لو گی؟“  
”کیا شرط.....؟“ وہ خائف ہونے لگی کچھ کچھ  
جانتی بھی تو تھی نا۔

”اگر تمہارے بابا سائیں نہ مانے تو ہم بھاگ کر  
شادی کر لیں گے۔“ شرجیل کے منہ سے نکلنے والی بات  
نے ایمان کا چہرہ تاریک کر ڈالا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)





# مجھے حکمِ انسانی

ام مریم

جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی  
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے  
جو آگ لگائی تھی تم نے، اس کو تو بچھایا اشکوں نے  
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے، اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

## گزشتہ قسط کا خلاصہ

یہ کہانی ہندی گریو وال سے شروع ہوتی ہے جس کا تعلق دو مختلف مذاہب سے ہے باپ کرپن جبکہ ماں ہندو ہے۔ ہندی اپنی ماں کے ساتھ انڈیا میں مقیم ہے جبکہ سا کا بھائی اپنے باپ کے ساتھ امریکا میں مقیم ہے۔ برسوں پہلے امریکا میں ہندی کی ایک شہین سے ملتی ہے اور اس کا دل اس اجنبی کی نسوں خیز شخصیت کا اسیر ہو جاتا ہے۔ انڈیا واپس آنے کے کئی برس بعد بھی وہ اسے اپنے دل سے نہیں نکال پاتی اور ہر جگہ اسے ڈھونڈتی رہتی ہے اور ہر مندر میں جا کے اس کے ملنے کی پراسننا کرتی ہے۔ کہانی کا دوسرا بڑا کردار عباس ایک جاگیردار گھرانے کا چشم و چراغ و وسیع جائیداد کا مالک ہے۔ اس کے والد بچپن میں اس کی نسبت اپنے چھوٹے بھائی کی بیٹی لاریب سے جبکہ اس کے بڑے بھائی وقاص کی نسبت لاریب کی بڑی بہن ایمان سے ملے کر چکے ہیں۔ ایمان اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف اپنے یونیورسٹی فیلو شریل کو پسند کرتی ہے جبکہ عباس انگلینڈ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد شوبز کی فیملی جوائن کر لیتا ہے جس کی مخالفت کرتے ہوئے اس کے گھر والے اسے قطع تعلقی اختیار کر لیتے ہیں۔ جس کا سب سے زیادہ اثر لاریب پر ہوتا ہے جو بچپن سے عباس کے خواب اپنی آنکھوں میں سجائے بیٹھی ہے۔ عباس فلم انڈسٹری کی ایک مقبول ترین شخصیت بن جاتا ہے اور لاریب کی بجائے عریضہ کو منتخب کرتا ہے۔ جس سے اس کی ملاقات اتفاقیہ طور پر ہوتی ہے مگر مختصر سی وہ ملاقات اس کے دل میں عریضہ کی محبت بٹھا دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ فلم انڈسٹری تک چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ سریتاد یوی (ہندی کی ماں) کے دوسرے شوہر کا پہلا بیٹا ہندی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے مگر وہ اس کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں۔

اب آپ آگے بڑھیں

”میں جانتا ہوں ایسی یہ سب کچھ تمہارے لیے سان نہیں ہے۔ کسی بھی شریف اور خوددار لڑکی کے لیے یہ مرحلہ آسان نہیں ہو سکتا مگر... ذرا سوچو اگر تمہارے با سائیں نے انکار کر دیا جو کہ وہ ہر صورت کریں گے ہی تو تم میرے بغیر رہ سکو گی؟ شاید وہ لو مگر ایسی میں ہرگز تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا یا رکھنا اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو میں خودکشی کر لوں گا۔ میری بات کو مذاق مت سمجھنا ایمان!“ شریل کا تند و تیز لہجہ اس کے اندرونی غمناکی

وہ عجیب مشکل میں گرفتار ہوئی تھی۔ یعنی وہی ڈھاک کے تین بات! شاید شریل خود بھی جان گیا تھا اس کے بابا سائیں کبھی نہیں مانیں گے۔  
”ایسی پلیز ٹیل می؟“ شریل نے اس کے ہاتھوں کو آہستگی سے دبا کر گویا اسے بولنے پر اکسایا۔ وہ مضطرب ہے جین سی، دیکھو اسے تم آنکھوں سے پکٹنے لگی۔ کچھ کہنے سے گریزاں تھی یا اس کے غم سے خائف تھی مگر یہ بات بھی تو ایسی نہ تھی کہ وہ مان لیتی۔



واضح ہو گا کسی کر رہا تھا ایمان کا دل دہل سا گیا۔

”ایسی باتیں مت کرو شرجیل! میں آل ریڈی بہت پریشان ہوں۔“ وہ عاجز ہونے لگی۔

”تمہیں صرف اپنی پریشانی کی پروا ہے میرا خیال نہیں اور سنو میں آئندہ ایسی بات بھی نہیں کروں گا اگر تم مجھ سے میرا ساتھ نبھانے کا وعدہ کرلو۔“

”تم مجھے کچھ سوچنے کا موقع تو دو شرجیل ہو سکتا ہے کوئی راہ نکل آئے۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔“ ایمان نے کسی قدر رساں سے کہا۔ شرجیل نے گہرا سانس بھر کے اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔ ایمان نے خائف نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔

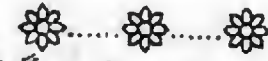
”تم نے اپنے گھر والوں سے بات کی؟“

”تم نے کی؟“ شرجیل نے طنزیہ نگاہیں اس پر جمائیں ایمان بے ساختہ نظریں چراگئی۔ وہ زہر خند ہوا۔

”پلیز اپنے گھر والوں سے بات کرو۔ انہیں ہمارے ہاں بھیجو پھر دیکھتے ہیں بابا سائیں کیا کہتے ہیں۔“ ایمان ایک اکی جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گئی۔ بہر حال یہ طے تھا کہ اسے وقاص حیدر سے شادی نہیں کرنا تھی۔ وہ جس کی نظروں میں اس نے کھلی ڈھلی ہوس دیکھی تھی جس کے چہرے پر ہر دم ایک شیطانیبت رقص کرتی تھی۔ اس کی محبت اچھی نہیں تھی وہ جانتی تھی ایک ایسے سطحی سوچ کے مالک انسان کو وہ شریک حیات کے طور پر ہرگز بھی قبول نہیں کر سکتی۔ جس کی نگاہوں میں اس کے لیے یا اس کی بہنوں کے لیے عزت ہونہ احترام۔ اس نے کئی بار وقاص کی نگاہوں کو لاریب کے علاوہ امامہ کا بھی پوسٹ مارٹم کرتے دیکھا تھا۔ کیا فرق پڑے گا اگر میں وقاص سے منگانی توڑ دوں گی۔ اس سے پہلے عباس بھی تو یہ روایت قائم کر چکا ہے۔ پھر لاریب میں تو کوئی کمی بھی نہیں تھی۔ اس نے جیسے خود کو دھار سے دلا دی تھی۔

”اور اگر وہاں سے انکار ہو گیا تو؟“ شرجیل نے غصے سے پوچھا۔ ایمان اپنے خیالات کی پورش سے ابھرنی اور پچھوتہ گفت سے اس کی بات کا غہوم بھی۔

”اس صورت میں پھر وہی ہوگا شرجیل جو تم چاہتے ہو۔“ ایمان نے بات ختم کر کے اس کے چہرے کی جانب نہیں دیکھا وہ جانتی تھی شرجیل کے لیے یہ بات کتنی خوشی کا باعث ہے۔



عباس حیدر کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی۔ اس کی کوشش تھی اس سے پہلے پہلے شوٹ مکمل کر دے مگر یہ کام لمبا ہوتا جا رہا تھا ادھر عریضہ کی جھنجھلاہٹ اور خفگی بھی۔ بلا آخر عباس کو اس نے فون پر سخت سست سنائی تھیں۔

”یہ ہے تمہاری محبت عباس! بہت شور مچاتے تھے محبت عشق جنوں شادی میں چند دن رہ گئے اور تمہیں اتنی بھی فرصت نہیں کہ میرے ساتھ برائینڈل ڈریس ہی پسند کرنے چل سکو۔“ وہ غصے میں بولتی چلی گئی تھی۔ عباس کو مان اور استحقاق بھرا یہ انداز بہت بھایا تھا۔ جیسی دل سے مسکرایا تھا۔

”تم کچھ بولتے کیوں نہیں ہو؟ میں پاگل ہوں جو بکواس کر رہی ہوں؟“ وہ جھنجھلا کر اس پر الٹ پڑی۔

”میری جان تم چپ کیوں ہو بولو تو مجھے تمہیں سننا اچھا لگ رہا ہے۔“ وہ ہنسنے لگا۔ جبکہ عریضہ کا موڈ کچھ اور خراب ہو گیا تھا۔

”عباس تم اگر آج شام تک میرے پاس نہیں پہنچے تو پھر اپنا حشر دیکھنا۔“ عریضہ نے دھمکی دینے کے بعد فون بند کر دیا۔ عباس وہ اہم شوٹ ادھوری چھوڑ کر ڈائننگ کمر کی منت کی پروا کیے بغیر چلا گیا تھا۔

اسی رات عباس عریضہ کے ساتھ شاہنگ مال میں اس کا برائینڈل ڈریس چپ جوڑ کر رہا تھا تو ایک اخباری رپورٹر کی اس پر نظر پڑ گئی تھی۔ اگلی صبح کے اخبار میں دونوں کی تصویر چھپی تھی۔ شہ سرنی سمیت۔

”مشہور اداکار ساحر عباس حیدر اپنی منگیتہ کے ساتھ شادی کا جوڑا پسند کرتے ہوئے۔ انہوں نے اس جوڑے کی خریداری کے چکر میں اپنی شوٹ ادھوری چھوڑ دی۔ ڈائریکٹر کالاکھوں کا تیار کر لیا سیٹ بے کار گیا۔ ساحر اپنی

منگیتہ کی خوشی کے آگے ہر کام کو غیر اہم سمجھتے ہیں۔“ لاریب نے یہ خبر اور اس کی تفصیلات اپنے کانچ کی لاجریری میں پڑھی تھیں اور اس کے اندر جیسے بول اگ آئے تھے۔ ایک آگ کا دریا تھا جس میں اس کا وجود غرق ہو گیا تھا۔ دل و دماغ کچھ بھی تو قابو میں نہیں رہا تھا۔ اس رو ہونے ٹھکرائے جانے کا ایک ایسا اذیت انگیز احساس تھا جس کا کوئی انت تھا نہ حساب اسے نہیں خبر ہو سکی وہ کانچ سے حویلی تک کیسے پہنچی اگلے دو دن تک بخار نے اس کی سدھ بدھ بھلائے رکھی تھی۔ تیسرے دن کہیں جا کے وہ حواسوں میں آئی تھی۔

”کیا ہو گیا تھا تمہیں لاریب؟ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کوئی ذہنی شاک پہنچا ہے۔“ ایمان کی نگاہوں میں الجھن کے ساتھ پریشانی بھی تھی۔ وہ نظریں چراگئی۔ جب سے عباس حیدر نے فلم انڈسٹری جوائن کی تھی دونوں حویلیوں میں اخبار یا میگزین کبھی گھسنے نہیں دیا گیا تھا۔ بہت سخت پابندی تھی کاغذ کے ان ٹکڑوں پر وہ اس کے متعلق خبر لا سکتے تھے پھر بھلا عباس کے لیے کوئی گنجائش کہاں تھی۔ پیر کر امت علی شاہ اپنے اسواو کے اتنے ہی سخت تھے اور بلحا میں تو ان کے بھائی تھے۔ ان کے ہر کام میں چاہے وہ جائز ہو یا ناجائز ان کا ساتھ دینے والے۔

”لاریب میری جان کیا دکھ ہے تمہیں؟ مجھے بتاؤ؟“ ایمان نے اس کی دہکتی آنکھوں میں پچلتی کمی دیکھی تو بے اختیار رپ پڑی۔

”باجو پلیز مجھے تنہا چھوڑ دیں۔“ اس نے التجا کی تھی۔ ایمان اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس سے قبل کہ سر ہانے منٹھی امامہ کو لگی اٹھنے کا اشارہ کرتی اور واہ مدھن مڑوں میں بیٹھ اٹھا۔

”کون ہے آ جاؤ۔“ ایمان نے گردن موڑ کر دیکھا کہ کچھ دروازہ وا ہوا اور سکندر کی صورت نظر آئی۔ بڑھی ہوئی آنکھوں میں بڑی بڑی آنکھوں میں

ایمان بی بی بابا سائیں نے گاڑی تیار کرانی ہے کہہ رہا تھا۔ لاریب بی بی کو لے آئے۔“ سکندر نے ایک

مختصر مگر بے حد خاص قسم کی نگاہ لاریب کے سہ سے ہوئے چہرے پر ڈال کر ایمان کو مخاطب کیا تو وہ جیسے کچھ یاد آنے پر ایک دم الرٹ ہو گئی۔

”انہو میں تو بھول گئی تھی بالکل! لاریب اٹھو ہری اپ آج تمہارا چیک اپ ہوگا۔“

”مگر کیوں؟“

”بھی تمہارا بخار نہیں اتر رہا بابا سائیں نے شہر کے ڈاکٹر سے ٹائم لیا ہے۔ اسپتھلسٹ ہے چلو چلو کم آن۔“

”مگر میں اب ٹھیک ہوں پلیز باجو بابا سائیں کو منع کریں میں کہیں نہیں جا رہی۔“

”اونہہ لاریب اس طرح نہیں کرتے جانو۔ اٹھو۔“ ایمان نے اسے اٹھا کر ہی دم لیا تھا۔ اگلے دن جب وہ کانچ جانے کو تیار تھی تو ایمان نے بھی اسے منع کیا تھا مگر وہ کب کسی کی سنتی تھی۔ اس کے اندر تو ایک بیجان برپا تھا۔ بس نہ چلتا تھا کہیں سے عباس حیدر سامنے آ جائے اور وہ اس انسٹ کا بدلہ لے لے ایسا ممکن نہیں تو پوری دنیا کو آگ لگا دے۔ یہ بھی کہاں ممکن تھا۔ ہاں..... ایک اور حل تھا ایک اور طریقہ عباس کو جتلانے کا اسے بتانے کا کہ وہ اس کی راہ میں تک رہی اسے کوئی کمی نہیں ہے وہ اس سے پہلے شادی کرے گی مگر کس سے اس کی تیز گام ٹرین کی طرح بھاگتی دوڑتی سوچیں اس مرکز پر آ کے ٹھکیں۔ بے خیالی ہی بے خیالی تھی۔ اس کے ہاتھ پر گلاب توڑتے ہوئے کانچا چھ گیا تھا۔

”سکندر سکندر۔“ ایمان بڑا مدے کے آخر میں کھڑی پکار رہی تھی اس نے چونک کر اس سمت دیکھا۔ سکندر جانے کس کونے سے نکل کر تیز قدموں سے اس کی جانب آیا تھا۔

سفید کھدر کا عوامی سوٹ اونچا پورا قد جوڑے مضبوط شانے سیاہ گھنیرے بال سادہ سے سیاہ چپل۔ وہ اتنا برا تو نہیں تھا بلکہ اچھا خاصا تھا اس نے سوچا اور بے خیالی میں سوچتی چلی گئی۔ وہ اپنی پرائیڈ سوچوں منظر پر خیالوں اور بے ارادہ فیصلوں میں اتنی بے دھیان تھی کہ یہ



بھی خیال نہ رہا وہ سکندر جسے وہ اس حوالے سے سوچ رہی ہے جا بے ٹھکرائے جانے کے بعد ہی عباس حیدر کے ہانگ نہیں بھی نہیں ہے وہ ان کا ملازم ہے جسے کل تک وہ خود بھی جوتے کی نوک پر رکھتی آئی تھی۔ یہ اس کی ذہنی تباہی اور خیالات کی ہچان آمیزی ہی تھی کہ اس نے سکندر کے لیے ایسا سوچا اور اس فیصلے پر عمل کی مہر ثبت کر دی تھی۔

”سکندر.....!“ اس نے ایمان کے حکم کی تعمیل میں تیزی سے کچن کی سمت جاتے سکندر کو بے ساختہ پکارا۔

”جی لاریب بی بی؟“

”گاڑی نکالو مجھے کالج جانا ہے۔“

”مگر بی بی آپ تو.....“

”سٹ اپ سکندر! تم جانتے ہو مجھے سوال جواب سے کتنی نفرت ہے جو کہا ہے وہ کرو۔“ وہ اس پر برس پڑی۔

سکندر نے خائف سی نگاہ اس کے لال بھوکا چہرے پر ڈالی اور اثبات میں سر ہلایا۔ پاس سے گزرتی سکھاں کو روک کر ایمان کے لیے فریش جوس بھجوانے کا کہا اور خود پورٹیکو کی جانب چلا گیا۔ لاریب کمرے میں آئی بیگ اٹھایا اور کسی سے بھی کچھ کہے بغیر چپ چاپ آ کے سکندر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”تمہیں بائی کورٹ کا راستا تو معلوم ہوگا سکندر۔ اثر زمینوں کے کیس کے سلسلے میں آتے جاتے ہو گے۔“

”جی مگر آپ.....!“ معاوہ بات ادھوری چھوڑ گیا۔

شاید اپنی حیثیت کا خیال سوال کرنے سے باز رکھ گیا تھا۔ مگر اب جس ہنوز تھی جسے لاریب نے اگلے لمحے دور کر دیا تھا۔

”وہیں چلو ہم کالج نہیں وہاں چلیں گے۔“ وہ بہت رسائیت سے کہہ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ جبکہ سکندر کے اعصاب کو جھٹکا لگا تھا۔

”آپ کو وہاں کیا کام ہے آپ مجھے بتائیے پلیز میں خود آؤں گا۔“ چھوڑ دینے کی خاموشی کے بعد سکندر نے کسی قدر لجاجت سے کہا تھا۔ وہ عجیب سے انداز میں مسکراتی۔

”یہ کام میری موجودگی کے بغیر نہیں ہو سکتا سکندر۔“

”ایسا کون سا کام ہے؟ آپ بتائیے تو.....“ سکندر نے الجھ کر بلکہ پریشان ہو کر اسے دیکھا۔

”نکاح کرانا ہے مجھے تمہارے ساتھ بولو ہو جائے گا یہ کام میری موجودگی کے بغیر؟“ وہ خود پر سکون رہ کر بھی گویا سکندر کو کسی طاقت ور بم کے دھماکے سے اڑا چکی تھی۔

سکندر کو اپنی سماعتوں پر شبہ محسوس ہوا تھا گاڑی ایک دم لہرائی اور پھر یکنخت رک گئی۔ ایک زور کا جھٹکا لگا تھا..... سکندر کے چہرے پر جیسے تاریکیوں کا سایہ تھا وہ ہنوز اپنے آپ کو فضا میں معلق محسوس کر رہا تھا۔ اگر یہ لاریب کا مذاق تھا تو نے حد بھیا تک! جس کی تاب نہ لاتے ہوئے سکندر کا دل دھڑکنیں بھول گیا تھا۔

”کیا ہوا شاک کیوں لگا ہے تمہیں؟“ لاریب ہنوز پرسکون تھی۔ اس نے بہت طنزیہ نظروں سے سکندر کو دیکھا جس کا چہرہ دھواں دھواں تھا۔

”بی بی صاحبہ یہ بہت گھٹیا مذاق ہے۔ میں جانتا ہوں میں ایک حقیر انسان ہوں مگر.....“

”سکندر بند کرو یہ اپنی تھرڈ کلاس جذباتی تقریریں مذاق نہیں کر رہی۔“ وہ بے ساختہ قسم کی ناگواری سمیت اسے ٹوک گئی۔ سکندر نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا۔

”آپ.....“

”تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں سو فیصد بخیدہ ہوں۔“ سکندر کے ہونق چہرے کو ٹکتے ہوئے لاریب کا جی سر پیٹ لینے کو چاہا تھا۔ اف یہ احساس کتہ می کے شکار اوک!

”آپ کو یقین دلانے کی ضرورت نہیں ہے میرا خیال ہے ہمیں اب پس چلنا چاہیے۔“ ایسے آج تو فرسٹ اپریل بھی نہیں کہ میں خود کو بول بنائے جانے کا یقین کر لوں۔“

”سکندر۔“ بکو اس مت کرو تمہارا کیا خیال ہے میں یہ مذاق کر رہی ہوں؟“ وہ یکا یک مشتعل ہو کر چیخا۔

”گاڑی چلاؤ کورٹ پہنچو جب میں نکلتا ہے پیچھے پر سائن کروں گی تمہیں از خود یقین آ جائے گا۔“ لاریب کے اگلے الفاظ نے سکندر کو فضا میں معلق کر دیا۔ وہ

بچھیں پھاڑ کر یوں لاریب کو ٹکنے لگا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ کا گمان ہو۔ لاریب کو بمشکل غصہ ضبط کرنا پڑا۔

”لاریب بی بی! اگر آپ سرلیس بھی ہیں نائب بھی سن لیں مجھے اپنی اوقات بتا ہے مجھے نہیں بتا آپ یہ بھیا تک مذاق مجھ سے کیوں کر رہی ہیں۔ بہر حال میں آپ کا اس میں مزید ساتھ نہیں دے سکتا اور.....“ اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی اگلا لمحہ قیامت تھا۔ لاریب نے ایک دم ہسٹریک ہوتے ہوئے پہلے اس کے منہ پر بھر پور تمانچہ مارا پھر اس کا گریبان پکڑ کر بہت زور کا جھٹکا دیتے ہوئے ہڈیانی انداز میں پیچ کر بولتی چلی گئی تھی۔

”تمہیں اندازہ ہے تم کیا کہہ رہے ہو! تمہیں پتا ہے تم کسے ٹھکرارہے ہو؟ لاریب علی شاہ کو..... جس کے پیچھے ایک دنیا دیوانی ہے جو کسی کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی اور تم..... تم..... اسے ٹھکرارہے ہو اس کی بات کو؟“

وہ یقیناً حواسوں میں نہیں رہی تھی۔ ایک بار پھر غیر ارادی طور پر بھی سکندر کے الفاظ اس کے سسکتے جلتے احساسات کو رنجنے کی اذیت سے دوچار کر گئے تھے وہ اذیت جس کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ یہ اتنا بڑا اسٹیپ لے رہی تھی جذباتیت میں۔ جو بھی تھا بہر حال وہ ایک بار پھر بکھر گئی تھی۔ سکندر کے تو اوسان خطا ہونے لگے وہ خود اس توجہ میں چکرا کر رہ گیا تھا۔ پہلے تو اسے خود کو سنبھالنا پڑا پھر لاریب کو بڑی دقتوں سے وہ یہ مرحلہ سر کر پایا۔

”آئی ام سوری! رینی ویری سوری بی بی صاحبہ اگر آپ کو میرے الفاظ سے تکلیف پہنچی میں خود کو کسی بھی واسطے سے اس مرتبے کے قابل نہیں پاتا بس یہ وجہ تھی۔“

وہ حضانتوں پہ وضاحتیں دیتا اپنے لگا۔ پانی کی بوتل کا پھس کھول کر اسے چلایا تاکہ وہ کچھ حواسوں میں آوے۔

”مجھ آج ابھی یہ نکاح کرنا ہے۔ بہر صورت میں اسے جلا کر کھاؤ گی! وہ اکیلا ہی اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں میں بھی کر سکتی ہوں اس سے پہلے کروں گی۔“

وہ بھٹکنا انتظار نہ سمجھے اس نے مجھے ٹھکرایا نہیں میں

اسے بتاؤں گی میں نے اسے ٹھکرایا ہے۔“ وہ واقعی حواسوں میں نہیں تھی جیسی تو وہ باتیں سکندر سے کہہ رہی تھی جن کا سامنا اس نے سالہا سال تک خود بھی نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ نظریں چرائی تھیں کترائی تھیں سکندر نے سنا سمجھا اور جیسے اندر تک تھک گیا۔ تو یہ وجہ تھی اس کا دل گہرے سمندر میں ڈوبنے لگا۔ اتنی ناقدری ایسی بے مائیگی۔

”تم مجھے بتاؤ کرو گے مجھ سے نکاح یا نہیں۔“ انکار کرنے سے قبل جان لینا سکندر کے میں حویلی واپس نہیں جاؤں گی! یہیں اپنی جان دے دوں گی۔“ وہ ایک بار پھر ہسٹریک ہونے لگی۔ سکندر نے دیکھا اس کی آنکھوں میں وحشت ہی وحشت تھی۔ وہ عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا۔ جبکہ وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

”یہ دیکھو میں خود کشی کا سامان ساتھ لے کر چلی تھی اور تمہاری جرات نہیں کہ مجھے روک سکو۔ اگر میری بات ماننا ہے تو گاڑی کا رخ کورٹ کی طرف موڑ لو ورنہ گاڑی سے باہر نکل کر کھڑے ہو جاؤ! میں ابھی اسی وقت اپنی کلائی کی رگ کاٹ لوں گی۔“ وہ اس بیجانی کیفیت کے زیر اثر اسے سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولی۔ سکندر ہونٹ بھینچے کچھ دیر اسے تکتا رہا پھر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے کورٹ جانے والی شاہراہ پر ڈال دیا۔ لاریب کے تنے ہوئے چہرے پر ایک آسودہ قسم کی مسکراہٹ بکھر گئی۔ ابھی وہ اتنی ارزاں تو نہیں تھی کہ کوئی اسے نہ پانتا۔



اس نے اپنے سامنے کانغہ کے پرزے پر درج نمبر مسکراتے ہوئے ڈائل کیا اور دوسری جانب مدھر سروں میں بجنے والی نیل کی آواز سنی اپنی دھڑکنیں شمار کرنے لگی۔ دھڑکنیں جن کا غیر معمولی شور اسے جزیرہ کر گیا تھا۔ بھلا! اب کیوں؟ اس نے تو عباس حیدر کو نیچا دکھا دیا تھا۔ اس نے تو عباس حیدر کو اس کی محبت کو اپنے دل سے نوج کر پھینک دیا تھا پھر یہ دل اس سے بات کہنے اس کی بات سننے کے خیال سے اتنا اتنا ڈلا اور وہیں کیوں ہوا جاتا تھا؟ اسے اپنے سوالوں کے جواب نہیں ملے تھے کہ دوسری جانب سے



کال ایک کر لی گئی۔  
 ”اسلام علیکم! عباس حیدر اسپیکنگ۔“ ریسور سے  
 بھاری گمبھیر آواز اس کی سماعتوں میں اتری اور اسے جیسے  
 اس کا مقصد ہی نہیں زمان و مکان بھلا گئی۔ وہ جتنا خود  
 ڈشنگ اور ہینڈسم تھا اسی لحاظ سے اس کی آواز کا جادو بولتا  
 تھا۔ اسے لگا وہ گنگ ہو گئی ہے جبکہ عباس دوسری کچھ دیر  
 پکارنے کے بعد جھنجھلا کر رابطہ منقطع کر چکا تھا۔ وہ جیسے  
 ہڑبڑا کر گہری نیند سے جاگی اور ششدر ہو کر رہ گئی۔  
 ”یہ مجھے کیا ہوا تھا؟“ اس نے خود سے شپٹا کر سوال  
 کیا؟

”کیا میں اسے بھلا پائی ہوں جبکہ اس کی آواز نے  
 مجھے میری ہستی فراموش کر ڈالی۔“ وہ گم گم سی اپنی کیفیت کو  
 پرکھتی رہی پھر کچھ سوچ کر پھر سے نمبر ڈائل کیا۔ بیلز جاتی  
 رہیں مگر کسی نے کال ریسپونڈ نہیں کی مگر وہ بھی ڈھیٹ بن  
 گئی۔ آج ہی تو اس سے بات کرنا تھی۔ آج ہی تو اسے  
 جتلا نا تھا سب کچھ وہ کسی سے کم نہیں وہ عباس سے کم  
 نہیں۔ تیسری کے بعد چوتھی مرتبہ ٹرائی کرنے پر کال ریسپو  
 نہ کر لی گئی۔

”بیلو! کون ہیں آپ؟ کیوں اپنا اور میرا وقت برباد  
 کر رہی ہیں؟ اگر کچھ بولنا نہیں تو فون کرنے کا مقصد؟“  
 اس مرتبہ وہ جھنجھلا کر بولتا چلا گیا تھا مگر لہجہ اس خفگی میں بھی  
 دھیمپا اور سبک ہی رہا تھا وہ کتنا ڈیسنٹ کتنا شاندار تھا۔ چار  
 سال قبل لاریب یونہی تو اس پر دل و جان نہیں ہار گئی تھی۔ وہ  
 سنبھلی اور بے ساختہ مسکرائی۔

”مجھے آپ سے بات کرنی ہے جی کال کی ہے اور  
 سنیں میں آپ کی طرح بے کار نہیں ہوں جو اپنا نام نسیان  
 کرتی پھروں سمجھتا ہوں؟“ اس نے نخوت سے ناک چڑھا  
 کر گویا جتلا نا ضروری سمجھا۔ عجیب شاہانہ انداز تھا دوسری  
 جانب یقیناً عباس ششدر ہوا ہو گا مگر اسے بھلا کب پروا  
 تھی۔

”آپ ہیں کون؟ کیوں بات کرنا چاہتی ہیں مجھ  
 سے؟“ عباس کے لہجے میں خفیف سی جھنجھلاہٹ در آئی۔

تقریباً آدھا گھنٹہ قبل راجہ صاحب کی کال آئی تھی کہ ایک  
 لڑکی بار بار اصرار کر رہی ہے کہ اسے ساحر کالینڈ لائن نمبر  
 چاہیے۔  
 ”یار صبح سے سرکھایا ہوا ہے میرا پلیر دے دوں بتاؤ؟“  
 اور عباس کے لیے یہ نئی بات نہ تھی لینڈ لائن نمبر پر لڑکیاں  
 اکثر اسے کال کرتی تھیں البتہ وہ موبائل نمبر کسی کو نہیں دیتا  
 تھا۔ جیسی اس نے سرسری انداز میں ہاں کر دی تھی۔ مگر اس  
 کال کا انداز و اطوار سابقہ کالرز سے یکسر مختلف تھا۔ اس کا  
 چونکنا فطری تھا۔

”یہی بتانے والی تھی میں آپ کو اگر آپ مجھے اپنی کوئی  
 فین سمجھنے جا رہے ہیں تو اس خیال کو دل سے نکال دیں میں  
 ہرگز بھی اتنی احمق نہیں ہوں کہ ان فضولیات میں پڑوں۔“  
 عباس کو اپنی پیشانی تپتی ہوئی محسوس ہوئی مگر وہ خود پہ جبر  
 کیے اس کی اگلی بات کا منتظر ہوا تھا۔

”جی فرمائیے کیوں کال کی آپ نے؟“ اس کی ازلی  
 رواداری اور تربیت اسے ہمیشہ ہر کسی کے ساتھ سجاؤ وقار  
 اور شائستگی سے ملنے پر اکساتی تھی۔

”میں لاریب ہوں لاریب علی شاہ! آپ کو اپنی وہ علم  
 زادیات تو ہوگی جسے آپ کے بزرگوں نے آپ کی مرضی کے  
 بغیر آپ سے منسوب کر دیا تھا۔“ اس نے لمحہ بھر کا توقف کیا  
 جبکہ عباس حیدر یکدم سکت ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے سان  
 ولمان تک بھی نہیں تھا لاریب اسے اس طرح کال بھی  
 کر سکتی ہے۔

”میں نے محض یہ بتانے کے لیے آپ کو جست دی  
 ہے مسٹر عباس حیدر کہ لاریب علی شاہ اتنی گہری پڑنی نہیں تھی  
 کہ آپ نے اسے قبول نہیں کیا تو وہ آپ کے نام پر بھیجی رہ  
 گئی۔ آپ کی شادی تو جانے کب ہو مگر میں اللہ کے فضل  
 سے کسی کی متاوجہ ہوں۔“ اس کا ٹھنڈا ٹھنڈا انداز اپنے  
 اندر بہت ترش قسم کی کاٹ لیے ہوئے تھا۔ عباس حیدر یہ  
 سمجھنے سے قطعی قاصر رہا کہ لاریب آخر اسے یہ سب کیوں  
 بتا رہی ہے جبکہ اسے اس کے رو کر دینے سے کوئی فرق بھی  
 نہیں پڑا۔

”جی کیوں ہو گئے؟ آپ کو اچھا نہیں لگا کیا کیا آپ  
 کی دنیا کی کسی اور کی بیوی بن گئی ہے۔ کیا آپ کی سوچ بھی  
 عام روایتی جاگیرداروں کی طرح ہے؟“ وہ اسی تنفر سے  
 اسے پیٹ پیٹ کر طنز کے تیر مار رہی تھی۔ عباس کو ناگواری  
 کے شدید احساس نے گھیر لیا۔ اسے اپنا دفاع کرنا پڑا تھا۔  
 ”ایک اسٹ ایزی لاریب علی شاہ! میں ہرگز بھی ایسی  
 روایتی سوچ نہیں رکھتا میں نے ہرگز بھی کبھی یہ نہیں سوچا کہ  
 آپ میرے نام پہ جوگ لے لیں۔ میں آپ کی زندگی  
 کے لئے سفر پر آپ کے لیے نیک تمنائیں اور دعائیں کرتا  
 ہوں۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے آمین۔“ اس نے جیسے  
 بات ختم کی لاریب کو شاید اس سے ایسی توقع نہیں تھی وہ تو  
 اسے خفت کا شکار کرنا چاہتی تھی ایسا تو کچھ بھی نظر نہیں آیا  
 تھا اسے بتانا بے کار گیا تھا۔ اب اسے کچھ اور بولنا تھا کہ  
 جس سے اس کی اپنی خفت کم ہو سکے۔ جیسی وہ گلا کھنکار کر  
 گویا ہوئی تھی۔

”اوکے اگر آپ کو اتنی ہی خوشی ہوئی ہے تو پھر اس خوش  
 قسمت انسان کے متعلق کسی قسم کا کوئی سوال نہیں کریں  
 کے مظلوم کون ہے کیا نام ہے کیا کرتا ہے؟“ اسے اندازہ  
 نہیں ہوا عباس کو نیچا دکھانے کی کوشش میں وہ خود اپنے  
 پھیلائے جال میں سمٹنے جا رہی ہے۔ عباس اس کی بات  
 کو رد اداری سے مسکرا دیا۔ جی ضرور اگر آپ بتائیں تو  
 مجھے خوشی ہوگی۔ اونہہ جھوٹا فریبی۔ ماسک چڑھا کر اپنے  
 جذبے مجھ سے چھپاتا ہے اندر سے جل تو لازمی رہا ہوگا۔  
 آہستہ سوچ لی انتہا پہ جا کے سوچا اور بے ساختہ ہنسی۔

”سکندر نام ہے اس کا اور۔“  
 معاف اسے ایک دم بریک لگ گیا تھا۔ کیا کرتا تھا سکندر؟  
 بولنے کی نوکری۔ کون تھا وہ؟ اس کے گے ایک سوالیہ نشان  
 تھا یہ تو سکندر خود بھی نہیں جانتا تھا کیونکہ اسے منشی  
 کے گھر تک لانے والی وہ ملازمہ کب کی مر گئی تھی  
 اس کا نام نشان وہ تو شاید منشی صاحب سے بھی کم  
 معلوم تھا۔  
 لاریب کو جیسے اسی پل ہوش آیا۔ لاریب میری میں عباس

کی ہونے والی شادی کی خبر پڑھ کر عباس کو فون ملانے تک  
 وہ جیسے واقعی حواس گنوائے ہوئے پھر رہی تھی یہ بھجان یہ  
 وحشت یہ اضطراب یہ رد ہونے کی اذیت اس سے کیا کروا  
 چکی ہے اسے کیسے پابند اور محصور کر چکی ہے اس کا اندازہ  
 اسے اسی پل ہوا تھا۔ یہ کیا کر دیا تھا اس نے؟ کیسے کیوں؟  
 وہ ششدر بھونچکی سی چکراتے سر کے ساتھ خود سے سوال  
 کیے گئی۔

سکندر..... سکندر اس کی حویلی کا ملازم یہ تھا اس کا  
 انتخاب؟

عباس حیدر کا نعم البدل؟ جو کسی بھی لحاظ سے اس کے  
 پاسنگ بھی نہیں تھا۔ یہ اس نے کیا کیا تھا؟ کیسے؟ یہ بھجان  
 اس سے بھاری قیمت چکا گیا تھا۔ کیسی تھی یہ وحشت جس  
 نے اس کی عقل سمجھ بوجھ سب ضبط کر ڈالی تھی۔ نقصان ہی  
 نقصان تھا۔ اذیت ہی اذیت تھی۔ اسے درود یوار کرتے اور  
 چھت اپنی جانب لپکتی محسوس ہوئی۔ یہ حقیقت اتنی تلخ اتنی  
 ناقابل یقین تھی کہ برداشت سے باہر وہ اپنی بے جان  
 ہوتی ناگلوں سمیت وہیں نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ اس کے ہاتھ  
 سے چیوٹ کر لٹک جانے والے ریسور سے عباس کی بیلو  
 ہیلو کی پکارت آتی رہی پھر ریسور بھی خاموش ہو گیا مگر لاریب  
 کے دماغ میں برپا قیامت نہیں سمجھی اس کا پتھر جانے والا  
 وجود حرکت نہیں کر سکا تھا۔

☆☆☆.....

اے جذبہ دل گر میں چاہوں  
 ہر چیز مقابل آ جائے  
 منزل کی طرف دو گام چلوں  
 اور جامنے منزل آ جائے

اے جذبہ دل گر میں چاہوں  
 سکندر بہت فریش لگتا ہے ہوئے انداز میں گھر میں  
 داخل ہوا تھا۔ چوبیس کے گے منٹھی پھونکنی سا گ جاتی  
 تانیہ نے اس کی گنگناہٹ سنی تو اپنا کام ادھورا چھوڑ کر سر اٹھا  
 کر اس کی شکل دیکھی سرشاری و سر مستی کو محسوس کیا اور مسکرا  
 دی۔



و ما بھی کرواؤں گی۔ پر یہ تو بتا ہے کیا خوشی کی خبر؟“ وہ اس سوال پر ایک دم سڑبڑایا بلکہ تھا وہ تو جواب دینے والا ہی تھا؟ اب ایسے بات چیتی بھی نہیں ہاں سکتی تھی۔ جتنی اسے کوئی نہ کوئی تو بھانہ گھڑنا تھا۔

”اماں وہ میں نے سواہویں جماعت کے پرچہ دے رکھے تھے تاہیں اسی امتحان میں کامیابی ملی ہے۔ پر تو لوگوں کو نہ بتانا اٹھائیں سال کی عمر میں ایم اے کرنے پر مجھے اپنی ہنسی نہیں اڑوانی۔“ وہ حفظ ماتقدم کے طور پر بولا تو اماں نے برا منا لیا۔

”اے ہائے اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے پتر؟ اٹھائیں دروں میں بی کیا کیا تو یہاں تو آس پاس کے سارے منڈے ہی نکمے اور جاہل ہیں۔“ اماں کے لہجے میں انوکھا سا فخر دہرایا۔ تو سکندر نے مسکرا کر گویا بات ان کی مرضی پہ چھوڑ دی۔

”اماں میں پلیٹیں لے آؤں اندر سے نئی ڈنریٹ کی اس میں مٹھائی بانٹ آتی ہوں۔ سب سے پہلے اپنی پہلی رجو کے گھر دوں گی۔ اماں اس میں ذرا دولد و زیادہ ڈال دینا۔ میری بہت گڑی ٹیلی ہے وہ۔“

”چل نی رہن دے۔ آرام سے بیٹھ۔ ڈنریٹ کا ڈبہ کھولنے کی ضرورت نہیں۔ تام چینی کی پلیٹ لے آؤں اور یہ لڈو نہیں گلاب جامن ہے۔ چار چار سے زیادہ نہیں دوں گی۔“ اماں نے جھاڑ کر رکھ دیا ثانیہ کا منہ لٹک سا گیا۔

”دیکھ سکندر رے تیری اتنی بڑی خوشی کے موقع پر بھی اماں مجھے نوی پلیٹیں نہیں نکالنے دے رہی۔“ اس نے جیسے سکندر سے شکایت جڑی۔ سکندر جولاریب کے متعلق کچھ سوچتے ہوئے دھیمے سے مسکرا رہا تھا ایک دم ہڑبڑا کر چونکا اور سوالیہ نگاہیں ثانیہ پہ جمائیں۔

”کیا کہہ رہی ہوتانی؟“

”کچھ نہیں پتر نمائی ہے اسے پتا ہی نہیں اس کے چہرے کے لیے خریدا ہے پورے بارہ سو کا۔ اب نکالوں گی دیکھ کر خراب نہ ہوگا؟ دل چھوٹا کرتی ہے کملی جھلی نہ ہو۔“ بھلا کنج سمجھاواں بعد دج وی تے دونوں ہی استعمال

”کیا بات ہے سکندر۔ بہت خوش لگ رہا ہے؟“

”نہ خوش نہیں ہے۔ سب حساب خوش ہوں۔ مجھے تو لگ رہا ہے میں نے دنیا فتح کر لی۔“ وہ بے سادہ کھٹکھٹایا۔ پیچھے فاصلے پر کتنی صاف کرتی اماں نے نظریں اٹھا کر بغور اسے دیکھا۔ وہ بہت کم مسکرایا کرتا تھا کھٹکھٹانا تو بہت دور کی بات۔

”ماشا، اللہ اللہ خوش شاد رکھے میرے پتر کو ہمیشہ پُر کوئی خوشی کی خبر ہے تو ہمیں بھی بتا۔“ اماں کے چہرے پر اشتیاق درآیا۔

”مجھے تو لگتا ہے اماں اس کی کوئی بڑی لاٹری نکل آئی ہے۔ دیکھو ذرا پانچ گلو کا مٹھائی کا ڈبہ ساتھ لایا ہے۔“ ثانیہ نے نگاہ ابھی ابھی مٹھائی کے ڈبے پر لگی تھی جسے سکندر نے اماں کے سر ہانے لاکر رکھا تھا۔

”لاٹری نہیں پرائز بانڈ نکل آیا ہے سمجھ لے اماں میں ساواں سے صرف اس کی دعا ہی مانگتا تھا بلکہ میں تو اپنی حیثیت سے بڑھ کر دعا مانگتے بھی ڈرتا تھا۔“ وہ جیسے کہیں کھوسا گیا۔ کل وہ سارا دن ملول رہا تھا یہ احساس ذلت اور تکلیف کے احساس کو بڑھاوا دیتا رہا تھا کہ لااریب نے جوش جذبات میں محض عباس کو نیچا دکھانے کو یہ قدم اٹھایا ہے ورنہ وہ ہرگز ہرگز بھی اس کا انتخاب نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر پھر اسے لگا تھا جیسے وہ رب کی اس اتنی بڑی نعمت کی ناشکری کا مرتکب ہو رہا تھا۔ کیسے دل کے نہاں خانوں میں چھپی خواہش کو رب نے پورا کیا تھا اور وہ مسبب الاسباب ہے اسی نے تو یہ سبب پیدا فرمایا تھا۔ یہ خیال یہ سوچ اس کا سارا اضطراب بہا کر لے گئی تھی۔ وہ کتنا ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔ جو بھی تھا جیسے بھی تھا اس کے لیے تو مقام شکر مقام عاجزی تھا پھر کیوں وہ خوش محسوس نہ کرتا۔

”اماں سارے گاؤں میں مٹھائی بانٹنا اس لیے تو اتنی ساری لایا ہوں۔“ وہ چار پائی پران کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اماں نے مسکرا کر اس کی صورت شمار ہونے والی نظروں سے دیکھی۔

”ضرور پتر میں تو سب سے تیری مزید کامیابیوں کی



کر دے۔" اماں مسکرا مسکرا کر انوکھی بات کر رہی تھیں جس نے ثانیہ کو شاد کیا تو سکندر کے سر کے دوٹ اوپر سے گزر گئی۔ بھلا ثانیہ کے جہیز کی چیزیں سکندر نے کہاں استعمال کرنی تھیں۔ خیر اماں یہ نہیں چاہتی کہ ابھی نکالی جائیں تو خیر ہے۔

"ثانیہ تم ویسا ہی کرو جیسے اماں کہہ رہی ہے۔ سیانے غلط نہیں کہا کرتے اچھا پتر!" کچھ فاصلے پر حقہ گڑ گڑاتے بابا نے بھی مداخلت کی ثانیہ نے سر اثبات میں ہلا دیا ویسے بھی جو بات اماں نے کہی تھی ابانے تائید کی تھی وہ ایسی یاد پر فل ٹانگ کا کام دیتی تھی کہ ثانیہ کا ملال جاتا رہا۔ وہ خوشی خوشی اندر سے پرانی تام چینی کی پیٹیں ہی اٹھالائی۔

"اے ثانی! تجھے آخر آئی ہے مٹھائی وڈن کی پہلے سکندر سے کوروٹی نکر تو دے دے۔" اماں کو گلاب جاسن پلیٹ میں نکالتے خیال آیا تو پھر سے ثانیہ کے لئے لیے۔ ثانیہ کا اشتیاق ایک دم سے دھیم پڑا۔

"جاتو ثانیہ میں کھانا خود نکال لوں گا۔ یہ بھی کوئی کام ہے۔" سکندر نے اس کا بھٹتا چہرہ دیکھ لیا تھا۔

"کیوں کام نہیں ارے سارے دن کا کھپا ہے۔ اب اتنا سا کام بھی نہیں ہم کر سکتے۔" بابا نے فوراً سکندر کی حمایت کی وہ مسکرا دیا۔

"ارے نہیں بابا جانے دیں اسے پھر اندھیرا ہو جائے گا تو اماں کہاں نکلنے دے گی اسے۔" اس کی طرف داری پر اماں اور بابا دونوں کو خاموش ہونا پڑا۔ ثانیہ بڑے سے تانے کے تھال میں پلیٹیں رکھ کے دسترخوان سے ڈھک کر چلی گئی تو اماں سکندر کے منع کرنے کے باوجود اسے خود کھانا گرم کر کے دیے لگیں۔

"جاء پئے گا سکندر؟ ساتھ میں یہ مٹھائی بھی کھالے خود تو نے تو منہ میٹھا کیا نہیں۔" جس وقت اماں نے یہ بات کہی قریبی مسجد سے مغرب کی اذان کی صدا بلند ہوئی تھی۔

(اکیلا کیسے کھا لوں یہ مٹھائی تو اس کے ساتھ کھانے کا مزا آئے گا) اس کے چہرے پر ایک خوش کن سا احساس

بکھرنے لگا۔

"بولتا نہیں ہے بنادوں چاء۔۔۔۔۔؟" اماں کے سوال پر اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"اوہو گلاں کرتی رہنا پوچھتی کیوں ہے بنادے پی لے گا۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا بابا نے اماں کو ڈپٹ دیا تھا۔

"بابا آپ بھی تو منہ میٹھا کریں نا آپ نے بھی نہیں چکھی۔" سکندر نے باری باری پلیٹ دونوں کتا گے گی۔

"میں تو اپنے پتر کے ویاہ کی مٹھائی رنج رنج کر کھاواں گی۔ اپنی بیماری کی پروا کیے بغیر۔" اماں کو شوگر بھی میٹھا ختی سے منع تھا انہوں نے چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا سکندر مسکرا دیا۔ (آپ کو کیا خبر اماں یہ میرے ویاہ کی مٹھائی ہے)۔

"اماں ذرا جلدی چائے پیالی میں نکال دو۔ مجھے نماز پڑھنے جانا ہے۔" سکندر کے فقرے پر اندر آئی ثانیہ نے فی الفور گرفت کر لی۔

"اے ہائے کچھ۔۔۔۔۔ رب پے پیار نہیں آ گیا۔ سکندر نے نمازیں پڑھنے لگا ہے ساری۔" وہ کلکھاکر ہنسی۔ سکندر جھینپ سا گیا۔ (تجھے کیا پتا ثانیہ مجھے میرے سوئے رب نے کتنا اور کیسا نواز دیا ہے۔ اتنا شانت ہوا ہوں کہ جی چاہتا ہے عمر بھر جدے سے سرنہ اٹھاؤں)

"بابا آپ بھی نماز پڑھنے چلیں میرے ساتھ۔" سکندر نے بڑے بڑے چند گھونٹوں میں پیالی خالی کر کے رکھی اور اٹھتے ہوئے بولا۔

"او پتر میں صبح سے پڑھوں گا اللہ نے چاہا تو" بابا نے کھیا کر کہا تھا سکندر سر ہلاتا باہر نکل گیا۔ نماز سے فراغت کے بعد جی بھر کے دعا مانگی کچھ دیر قرآن کی تلاوت کرتا رہا رات کو جب گھر کو لوٹا تو عشا میں تھوڑی ناظم باقی تھا۔ اماں اور ثانیہ اسے گھر کے باہر ہی کچھ پریشانی کے عالم میں نظر آ گئیں۔

"اماں خیریت؟ یہاں کیوں کھڑی ہیں باہر؟" وہ تنہ قدموں سے نزدیک آتا ہوا بولا تھا۔ دونوں کے چہروں

سنا اندازہ تو بہر حال لگا لیا تھا کہ کچھ لڑ بڑ ہے۔ "سکندرے خیر نہیں ہے پتر حویلی سے تیرے لیے بند پسا یا تھا۔ لاریب بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" سکندر ہسپتال لے جاتا ہے۔ جلدی جا۔ خبرے کی ہویا جی بی کو؟" اماں کی بات پہ سکندر کا رنگ لمحہ بھر کو اڑ سا گیا ان کی پوری بات سنے بغیر ہی سکندر اندھا دھند حویلی کی سمت بھاگ کھڑا ہوا تھا۔



"نندنی۔۔۔۔۔ نندنی بیٹا! ماں اسے پکارتی ہوئی آرہی تھیں۔ اس نے سرعت سے پہلے نم گال رگڑ کر آنسوؤں کے نشان مٹائے پھر کتاب بند کر کے تکیے کے نیچے رکھ دی یہ سیدی ہوٹھی۔ ماں نے اندر آ کے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"باؤ آ رہو سوئی؟" "فائن ٹھیکس۔" اس نے مختصر ترین جواب دیتے گویا ان کے حوصلے پست کرنے چاہے مگر وہ اسی طرح مسکراتی رہیں۔

"بنادو کیسا لڑکا ہے؟" چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اپنے مقصد کی طرف آئیں۔ نندنی کا حلق کڑوا ہونے لگا۔

"وہ آپ کا بیٹا ہے ماں! مجھ سے زیادہ آئی جھینک آپ کو اس کے بارے میں پتا ہونا چاہیے۔" اس کا لہجہ کاٹ دار تھا اس کا مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"مجھے تو پتا ہے وہ اچھا شریف لڑکا ہے سب سے بڑھ کر مجھے یہ نہیں چاہیے ماں ماسٹڈاٹ۔" اس کا ضبطا

ناب دے گیا وہ چیخ پڑی۔ سرتا دیوی نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"بات کرنے کا کون سا انداز ت نندنی؟" ان کے منہ سے نکلتی ہوئی لہجہ نندنی نے بمشکل خود کو کمپوز ہونے کی کوشش کی۔

"آپ میری پسند اور مرضی کے بغیر میری شادی کر رہے ہیں بہر حال۔"

"کیا کمی ہے دیو میں؟" ماں نے بگڑ کر سوال کیا۔ نندنی نے ہونٹ بھیجنے لیے۔ وہ رخ بول کر ماں کا مزاج مزید برہم نہیں کرنا چاہتی تھی کہ پھر مشکلات بھی اسے ہی سہنا پڑتیں۔ وہ سخت مزاج تھیں۔

"وہ مجھے پسند نہیں کسی کمی کا ہونا ضروری نہیں ہے ماں۔" اس نے رسانیت سے سمجھانا چاہا مگر ماں بھڑک اٹھی تھیں۔

"کون پسند ہے تمہیں؟ اور سنو یہ تمہارے باپ کا ملک نہیں ہے یہ انڈیا ہے یہاں ماما پتا کی مرضی سے شادیاں ہوا کرتی ہیں مجھیں۔"

"ہوئی ہوں گی میری کوئی مجبوری نہیں ہے ماں کہ میں ایسا کرتی پھروں۔ آپ مجھے ڈیڈ کے پاس بھجوا دیں میں وہیں رہ لوں گی۔" وہ پسند والی بات کو جان کر گول کر گئی۔

اس کے باوجود انہیں جیسا گ لگ گئی تھی۔ "کیوں بھجوا دوں تمہیں اس خطبے کے پاس؟ تاکہ وہ تمہیں بھی اپنے رنگ میں رنگ لے۔"

"ماسٹڈو لور لیڈنگو جج ماں! آپ کا ان سے رشتہ ختم ہو گیا ہوگا مگر میرے وہ ڈیڈ ہیں اور رہیں گے۔" نندنی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ سرتا نے زور سے سر جھٹکا۔

"خیر اعنت بھیجو میں اس ناپک کو کلوز کر چکی۔ تم بتاؤ کیا اعتراض ہے دیو سے۔"

"ماں میں یہ شادی کبھی نہیں کروں گی چاہے آپ کچھ کر لیں۔" نندنی نے شدید قسم کے اشتعال کا مظاہرہ کیا تو سرتا بھی آپے سے باہر ہونے لگیں۔

"تو پھر ٹھیک ہے تم جو کر سکتی ہو کر لینا میں تمہاری سگائی فکس کر چکی ہوں۔" انہوں نے اپنی بات کہہ کر نندنی کو حیران کر دیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر غیر یقینی سے انہیں تنقے لگی۔

"مجھ سے پوچھئے بغیر؟" اس کا لہجہ سخت احتجاجی ہو گیا۔ "میں نے کہا نا یہ انڈیا ہے یعنی ایشیا یہاں ایسی شادیاں عام ہیں۔" انہوں نے بے نیازی سے کہا اور اٹھ کر باہر نکل گئیں۔ نندنی نے فٹیش میں آتے ہوئے ہاتھ



مار کر نیبل پر دھرا کر شل واز فرش پر پھینک دیا۔ ایک مبین سا چھٹا کا ہوا اور دواز کرچیوں کی صورت ٹھہر گیا۔  
 ”میں مرجاؤں گی مگر آپ کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہونے دوں گی۔“ کچھ دیر تک اس نے بکھرے کانچ کو دھندلائی نظروں سے نکا پھر جھک کر کانچ کا ایک نوکیلا ٹکڑا اٹھایا اور بے دردی سے اپنی کلائی کو کاٹ ڈالا۔ بھل بھل بہتا خون تیزی سے اس کے لباس کو نہ صرف رنگین کرنے لگا بلکہ اس پر نقابست بھی طاری کرتا جا رہا تھا۔ وہ ہونٹ بھیجنے یہ ناقابل برداشت درد سہتی رہی پھر اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئی تھیں۔



اگر میری محبت نہیں تو کوئی بھی نہیں  
 اس نے مکمل طور پر غافل ہونے سے قبل بڑبڑانے کے انداز میں جیسے سریتا دیوی سے مخاطب ہو کر کہا تھا مگر وہ تو کیا وہاں تو دور دور تک بھی کوئی نہیں تھا۔

وہ ایک معصوم سی چاہت وہ اک بے نام سی الفت وہ میری ذات کا حصہ وہ میری زیست کا قصہ مجھے محسوس ہوتا ہے وہ میرے پاس ہے اب بھی وہ جب جب یاد آتا ہے نگاہوں میں سامتا ہے زباں خاموش ہوتی ہے مگر یہ آنکھ روئی ہے میں خود سے پوچھ لیتا ہوں اتے کیا پیار تھا مجھ سے؟  
 فراز نے اس کے کمرے میں قدم رکھا تو پہلی نگاہ نیبل پر رکھی ڈائری پر پڑی۔ صفحات کے درمیان قلم کھلا پڑا تھا مگر شرجیل خود کہیں نہیں تھا۔ فراز نے صفحات پر نگاہ ڈالی پھر کاندھے اچکا دیئے۔ اسی بل شرجیل واش روم سے باہر آیا تھا۔

”یہ تو کسی گم گشتہ محبت کا فسانہ لگتا ہے۔ ایمان صاحبہ کا کیا ہوا؟“  
 ”تم میری اتنی سی آئی ڈی کیوں رکھتے ہو؟“ شرجیل نے قہر بار نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ ہر وقت مجھ سے غصے میں بات کیوں کرتے ہیں۔“ وہ مشکاکی ہوا شرجیل نے ہونٹ بھیجنے لیے۔ پھر برش

اٹھا کر بال بناتے ہوئے بولا تھا۔  
 ”کبھی پڑھائی بھی کر لیا کرو۔“

”آپ نے ڈبل ڈبل ماسٹرز کر کے کون سے تیر مار لیے جو میں مار لوں گا۔ جب جاب ہی نہیں ملنی تو فائدہ دماغ خراب کرنے کا۔“

”جواب ضروری تو نہیں ایم بی اے کیئر کر لو پاپا اور تاؤ جی کے ساتھ بزنس کرنا۔“

”مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ دو اور دو جمع چار کرنے کا۔“ وہ ناک چڑھا کر نخوت سے بولا تو شرجیل نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

”جواب نہیں کرنی بزنس نہیں دیکھنا پھر کیا کرتا ہے۔“  
 ”نام کماتا ہے۔ مشہور ہوتا ہے ٹھٹھا سے رہنا ہے۔“ وہ مستی میں آ کر جھوم کر گنگنانے لگا۔ شرجیل نے تڑپتے انداز میں اسے گھورا۔

”تم شیخ چلی کب سے بن گئے؟“  
 ”بھائی مذاق مت اڑائیں۔ یہ نہ ہو کل مجھ سے آٹو گراف لینے والی قطار میں آپ بھی شامل ہوں۔“ وہ کالر کھڑے کر کے اترا یا تو شرجیل کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”کون سی فیلڈ میں جھک مارنے کا ارادہ ہے۔ بھائی اگر کرکٹ کا ارادہ ہے تو رننے دو یا صرف ورلڈ کپ کی ٹور ہے اب تو وہ بھی اگر پاکستانی ٹیم کو ورلڈ فائنل جیت جائے تو... باقی بیچ کے چار سال کھلاڑیوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں اور ورلڈ کپ چار سال بعد آتا ہے واضح رہے۔“

”میں آپ کو اجنبی لگتا ہوں۔ مجھے شو بزنس جانتا ہے۔ اپنا شہزادہ ہے نا وہاں مائی موسٹ فیورٹ سرحرہاس! فراز کی آنکھیں چمکنے لگیں تھیں تو شرجیل کی حیرت سے پھٹ سی گئیں۔

”تم شو بزنس جو ان کر دے؟ تاؤ اور چاچا کا پتا ہے۔ تمہیں اتنے چھتر ماریں گے کہ سر گھنجا کر دیں گے۔“ شرجیل نے گویا ذرا غور فرما کر فرمایا۔ ”تم بھی ازادی چاہتی ہو۔“

”بھائی آپ بھائی کو بلانے آئے تھے یا یہاں بیٹھ کر

”جیسے ہاتھ؟ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ تبھی شہاء چلی آئی خفا خفا۔ فراز نے کھسیا کر سر پر ہاتھ مارا۔

”سوری مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ چلیں بھائی۔“ وہ یکدم اٹھ گیا۔

”کیا پکا ہے شہاء؟“ اس کے انداز میں بے دلی کی کیفیت نمایاں تھی۔

”برائی اور کو فتنے ہیں ساتھ میں ٹرائفل کباب بھی فراں کیے ہیں۔“ شہاء نے مینو بتا کر اس کی شکل دیکھی جس کی بے زاری ہنوز تھی۔

”پھر تو آج تاؤ جی کی سوج لگی ہے صحیح معنوں میں۔ میں بہت اسپاکی کھانے پسند نہیں کرتا۔ تم سونے سے قبل ایک گلاس دودھ دے جانا مجھے اور ہاں جب ماما اور پاپا اپنے کمرے میں چلے جائیں تب بتانا مجھے اوکے۔“

”آپ کھانا نہیں کھائیں گے بھائی؟“ شہاء کو فوری تشویش ہوئی۔ تاؤ جی کو گھر کے ایک بھی فرد کی کھانے کی بھل سے غیر موجودگی سخت برہم کر دیا کرتی تھی۔ شرجیل سے تو انہیں ویسے ہی بہت ساری شکایات تھیں۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”بھائی میں آپ کے لیے آلیٹ یا جو آپ پسند کریں بنا دیتی ہوں لیکن پلیز رات کا کھانا مت چھوڑا کریں۔“ شہاء اس کی سگی بہن نہیں تھی چاچو کی بیٹی تھی مگر شرجیل سے خصوصی لگاؤ تھا اسے۔ شرجیل یہ بات جانتا تھا جیسی بے ساختہ ہی چہرے پر ایک مشفق سی مسکان بکھر گئی۔

”خواخواہ زحمت کرو گی مائی سسر! مجھے واقعی بھوک نہیں۔“

”بھائی تاؤ جی خفا ہوں گے پلیز چند نوالے لے لیجئے گا۔“ وہ ہنسی ہوئی تو شرجیل کو ہاں کرنی پڑی تھی۔

”اوکے تم اور کچھ مت بنانا میں سلاڈا چر رلیوڈ ڈال کر کھائی کھاؤں گا اس سے مرچیں کم ہو جائیں گی۔“ شرجیل نے راکر کہتے ہوئے اس کا مرتچہ کا تو وہ یکدم پر سکون

”صاحبزادے کو وقت مل گیا فیملی کے لیے؟“ وہ

غزل

جیسے کبھی دریا کے کنارے نہیں ملتے ایسے ہی تو جاں بخت ہمارے نہیں ملتے کھل جائے نہ تم پر یہ کہیں وصل کی خواہش ہم تم سے اسی خوف کے مارے نہیں ملتے وہ پیار ہی کیا اٹک جو آنکھوں کو نہ بخشنے وہ عشق ہی کیا جس میں خسارے نہیں ملتے جب ضبط کے بندھ ٹوٹنے لگتے ہیں میری جاں آنکھوں کے کناروں کو کنارے نہیں ملتے لگتا ہے کہ وہ شام بھی ہے شام غریباں جس دن تیرے ملنے کے اشارے نہیں ملتے اسے دل تیری فریاد یہاں کون سنے گا ٹوٹے ہوئے پتوں کو سہارے نہیں ملتے ملنے کو تو ہم روز ہی مل لیتے ہیں سید لیکن یہ مقدر کے ستارے نہیں ملتے

شمینہ سید: انتخاب: سیدہ شوال رضا..... لاہور

ڈانٹنگ ہال میں آیا تو وسیع و عریض میز کی تمام کرسیاں پر بوچھلی تھیں ماسوائے اس کی چیئر کے۔ اس طنز کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سو خاموشی سے نشست سنبھالی۔ تاؤ جی کا اپنا مزاج تھا۔ برہمی چھلکا تا متکبرانہ وہ کچھ کچھ متم مزاج بھی تھے۔ شرجیل بہت لم ان سے الجھا کرتا البتہ فراز موقع تلاش کیا کرتا پتا نہیں کون کون سے بدلے چکانے تھے اسے ان سے۔ ماما پاپا کی ناراضی کی پروا کیے بغیر ٹھونک بجا کر جواب دیتا۔

”بابا کی جانب سے میں سوری کرتی ہوں شرجی! ان کی بات کا برا نہ مانا کرو۔“ صالحہ کی کرسی اس کے مقابل تھی۔ وہ اس کی سمت جھک کر سرگوشی میں بولی۔ شرجیل نے ہونٹ بھیجنے لیے۔ بھوک تو بالکل نہیں تھی۔ اب تو گویا کھانے سے جی ہی اچاٹ ہو گیا۔ صالحہ صاحبہ اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں مگر وہ شاید اسے دونوں آنکھوں سے پیارا تھا جیسی تو اسے دیکھتے ہی چہرے پر رونق اتر آتی۔ واجبی سے نفوش بھاری بھر کم سراپا وہ جتنی عام تھی اسی قدر



رنگ رنگ کہانیوں کے آراستہ دلچسپ جریہ

aanchal.com.pk

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے



مسلسل اشاعت کے 36 سال

سچ بیتیاں اور جگ بیتیاں ایک دلچسپ سلسلہ دنیا بھر سے منتخب کردہ تحریروں کا مجموعہ جنہیں پڑھ کر آپ کا دل و ذہن روشن ہو جائے گا۔ نسلوں کو متاثر کرنے والا پاکستان کا واحد صاف ستھرا اور تفریحی جریہ وقت کے ساتھ ساتھ نئے آہنگ نئے رنگ اور نئے انداز میں قدیم اور جدید ادب کا امتزاج لیے ہر ماہ آپ کی دہلیز پر

تاریخ کی دلچسپی کیلئے خوبصورت سلسلے

خوشبوخن، منتخب غزلیں، نظمیں۔ ذوق آگئی اقتباسات، اقوال زریں احادیث وغیرہ معروف دینی اسکالر حافظ شبیر احمد سے اپنے دنیاوی مسائل کا حل جانے

پہنچنے کی صورت میں دفتر سے بلا کر۔ فون 35620771/2

اپریل 2013ء (129)

”شیہر وائی ناٹ بھائی بی کوڑ چاچی نے وہ الم ہی نہیں دیا سارا باقی کا سامان اسی بکس میں پھر سے ڈال دیا تھا۔“  
”مگڑا پھر میں ضرور دیکھوں گا اور کون کون دیکھنا پسند فرمائے گا؟“ فرراز نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا کتنے ہی اچھے کھڑے ہوئے۔ فرراز کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔  
جب سمیعہ روپائی ہو گئی تھی۔

”بھائی دیکھیں ذرا فرراز بھائی کو میرا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”کوشش! ارے احمق میں تمہارا مذاق اڑا رہا ہوں۔“  
”اچھا۔“ اس سے پہلے کہ شرجیل کچھ کہتا فرراز نے نخوت زدہ انداز میں کہہ کر سمیعہ کو اور چڑایا۔ اس نے آنسو بھری آنکھوں سے سخت احتجاجی انداز میں پہلے شرجیل کو دیکھا وہ کسی گھری سوچ میں مستغرق تھا پھر فرراز کو جس کے ہونٹوں پر دل جلاتی مسکراہٹ تھی وہ انھی اور پیر پختی ہوئی واک آؤٹ کر گئی۔ فرراز نے کاندھے اچکائے اور ریموٹ ٹیبل سے جھپٹ کر اپنی پسند کا چینل منتخب کیا اور آواز بڑھا دی۔  
انصاف کو کشیدہ کر دینے والا میوزک سماعتوں پر ناگوار ہو چکا بن کر گرا وہ سب ایک ایک کر کے اٹھنے لگے ٹیبل بھی اٹھا گیا اس سے ایک تھا۔ اپنے کمرے کی جانب جاتے دے کچن کے دروازے سے اسے دھانی آچل کی جھلک اکٹلی پڑی تو ارادہ ملتوی کرتا اسی سمت آ گیا۔ وہ رخ پھیرے اپنے کام میں مصروف تھی۔ نرم و نازک گداز سرپا ٹھیکس باکسٹن حسن، جاذ بیت اور بے تماشیا معصومیت وہ جماعی ہر رنگ میں وہ گم صم سا ایک ٹک اسے دیکھے کیا شام نے بھی چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”ٹیبل بھائی! کچھ چاہیے۔“ وہ کم عمر اور نوخیز تھی۔ جبھی شام اس کی آنکھوں میں مچلتے جذبوں سے مکمل آگاہی حاصل نہیں کر پائی تھی۔

”بھائی!“ ٹیبل کا حلق اس ایک لفظ سے کڑوا سا ہو

نہا۔ اس وقت بھی اچھا بھلا ڈیٹا غارت ہو گیا۔  
”کیا کر رہی ہو؟“ وہ گہرا سانس بھر کے بولا۔ (ذرا اور ناہو جاؤ میڈم پھر سب سے پہلا کام تمہیں اس جذبے

”نہیں نا بھائی! دادا اور دادی کے علاوہ۔“  
ایک چاچو۔۔۔۔۔ اور ان کی مسز۔“

”واٹ؟“ فرراز زور سے چیخا۔ باقی سب کے بھی منہ کھلے رہ گئے۔

”پھر اب وہ کہاں ہیں؟“ یہ سوال شام نے اٹھایا تھا باقی سب بھی گویا سر ہلا کر تائید کر رہے تھے۔

”ان کی ڈیٹھ ہو گئی ہے۔ دونوں کی ہی مگر بھائی سوچنے کی بات یہ ہے اگر وہ پایا اور تاؤ چاچو کے گئے بھائی تھے تو پھر ان کا گھر میں کبھی تذکرہ کیوں نہیں ہوا؟ کبھی ان کا نام کیوں نہیں لیا گیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان سے وابستہ چیزوں کو اتنا غیر اہم جان کر اسٹور میں کیوں پھینک دیا گیا۔“ سمیعہ کے لہجے میں اسرار تھا۔ بے چینی و اضطراب تھا فرراز نے کچھ کہے بغیر اس کے سر پر ایک چپٹ لگا دی۔  
”میں نے کہا تا تم خود کو جاسوسی کہانی کا کردار سمجھنا چھوڑ دو۔“

”فرراز تم چپ کرو۔ سنی مجھے بتاؤ گڑیا تم نے چچی جان سے یہ سوال کیا؟“ شرجیل فرراز کی نسبت اس معاملے کو سرسری نہیں لے رہا تھا۔ وہ سنجیدہ تھا، جبھی اس نے فرراز کو بھی جھڑک دیا۔

”پوچھے تھے بھائی مگر انہوں نے صرف مجھے یہی بتایا کہ یہ ہمارے چچا تھے اور بس، بلکہ میں نے تو محسوس کیا وہ یہ بتا کر بھی جیسے پشیمان ہو گئی ہوں کچھ گھبراہٹ بھی میں نے محسوس کی ان کے انداز میں۔ یوں جیسے منہ سے بات نکل جانے پر بندہ شپٹا جائے۔“ سمیعہ کے تفصیلات پر فرراز نے دانت پیس لیے۔

”بھائی آپ بھی کس کی باتوں میں آ رہے ہیں۔ آپ کو پتا ہے یہ اکثر ہانکتی ہے۔ رائی کا پہاڑ بنانا کوئی اس سے سیکھے۔“

”اس وقت وہ اسٹپس مل سکتی ہیں سچی آئی میں میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ شرجیل نے فرراز کو صاف گھونٹنے پر اتفاق کرتے ہوئے سمیعہ کو مخاطب کیا جو یہاں تک پر جوش نظر آنے لگی۔

ایڈاؤں سے بھر پور تھی۔ امی کی ہی نہیں تائی ماں کی بھی بھر پور کوشش تھی کہ وہ شرجیل کو اپنی طرف مائل کر لے۔  
”آہم آہم بھائی ذرا یہ چکن روست کی ڈش تو پکڑائیں۔“ فرراز نے صالحہ کو اس کی جانب جھکتے اور سرگوشی کرتے دیکھ لیا تھا۔ انداز میں شرارت تھی اس کے برعکس شرجیل کے چہرے پر ناگواری و برہمی کا تاثر نمایاں تھا۔ اس نے چکن روست کی بجائے سبائی ڈش فرراز کو پکڑائی نہیں بلکہ پنچنی تھی۔

”کل میں نے اور چچی جان نے اسٹور کی صفائی کی ایک بہت پرانا سا ٹرنک بھی نکالا رنگ آلود سا۔ جس میں پرانے زمانے کے بہت خوب صورت سی ساڑھیاں کچھ زیوروں کے خالی ڈبے اور ایک تصویروں کا اہم تھا۔ چاچی بیگم نے ہی سب سے تعارف کروایا تھا مگر دو شخصیات ایسی تھیں جنہیں میں سرے سے نہیں جانتی تھی آپ کو پتا ہے بھائی وہ دو لوگ کون تھے؟“

”کھانے کے بعد جب وہ سب نو جوان پارٹی ٹی وی لاؤنج میں اکٹھے بیٹھے تھے تب سمیعہ (فرراز شرجیل اور ٹیبل کی بہن) نے اچانک کچھ یاد آنے پر تجسس پھیلاتے ہوئے کہا۔ اس کا بالخصوص مخاطب شرجیل نہیں تھا اس کے باوجود وہ چونک کر اسے تنکے لگا تھا۔

”کس کی تھیں؟“ ٹیبل نے ریموٹ سے ٹی وی کی آواز دھیمی کی اور حیران ہو کر سوال کیا۔

”آپ کو کیا لگتا ہے بھائی کہ ہمارے خاندان کے تمام افراد بس اتنے ہی تھے؟“ سمیعہ نے کچھ اور بھی تجسس کری ایت کیا تو فرراز کو غصے آنے لگا۔

”تم سیدھی طرح سے بات کیوں نہیں کرتی ہو؟ جاسوسی رسالے پڑھ پڑھ کر خود کو بھی انہی کا ایک کردار سمجھنا شروع کر دیا ہے۔“ وہ جھلا اٹھا تھا۔ شرجیل نے خفیف سا اسے گھبراہٹ چھوٹی بہن کی سمت متوجہ ہوا۔

”نہیں ہمارے خاندان کے دو افراد اور تھے دادا اور دادی جان۔ تم نے انہی کی تصویریں دیکھی ہوں گی۔ میں اور فاقی بھائی ہی تھے تب جب ان کا انتقال ہو گیا۔“

اپریل 2013ء (128)



آگاہی بخش کر دوں گا۔ باہ وہ بھی کیسا حسین پل ہوگا۔ حیران سے چہرے پر خوب صورت رنگوں کی برسات کا لمحہ

”شرجی بھائی کے لیے دودھ میں اودھن ملا رہی ہوں۔ آپ پیئیں گے؟“ ادھر وہی معصومیت اور بے خبری تھی۔

”نہیں البتہ اگر ایک کپ چائے مل جائے بہت اسٹرائنگ قسم کی تو.....“

”کیوں نہیں بھائی میں ابھی لاتی ہوں۔“  
”نہیں میرے کمرے میں مت لانا میں ٹی وی لاؤنج میں ہوں اوکے۔“

”جی بھائی۔“ وہ مسکرا کر فرمانبرداری سے بولی تو نیل آہستگی سے پلٹ گیا تھا۔ ثناء اپنے کام میں مصروف پھر سے مصروف ہو گئی تھی۔



اس نے آنکھیں کھولیں تو بند پلکوں کے پیچھے جمع گرم سیال بہت سرعت سے کنپٹیوں سے ہوتا تکیے میں جذب ہونے لگا۔ ایمان جو پاس ہی تھی اسے روتے دیکھ کر تڑپ اٹھی۔

”لاریب میری جان! ایسے مت کرو پلیز۔“ ایمان نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا اور جھک کر اس کی پیشانی چومی۔

”کیوں بچایا آپ لوگوں نے مجھے کیوں؟ نفرت ہے مجھے خود سے اس زندگی سے نہیں جینا چاہتی میں۔“ وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر روتی تکیے پر سر تھکنے لگی۔ ایمان سے اسے سنبھالنا دشوار ہونے لگا۔

اس کھینچا تانی اور مزاحمت کے باعث اس کی کلائی میں لگی ڈرپ کی سوئی اپنی جگہ سے ہٹ کر وین کو پھاڑتی باہر آنکلی ساتھ ہی خون بھی جاری ہو گیا۔

”سکندر سکندر! پلیز ڈاکٹر کو بلاؤ۔“ ایمان نے ہراسہ سا ہوتے ہوئے چیخ کر دروازے سے باہر کھڑے سکندر کو پکارا تھا۔

”سکندر.....! وہی تو تھا اس بے زاری کا باعث۔“ لاریب کے اعصاب پر جیسے کسی نے ایک کوزا بہت بے دردی سے برسایا تھا۔ وہ گویا بلبلا اٹھی۔ اور بہت بے دردی سے ہونٹوں کو کچلا۔

”باجو فارگا ڈسک کسی کو مت بلائیں مجھے کسی قسم کی مدد کی ضرورت نہیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“ وہ یونہی ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان بولی تھی۔ ایمان نے پلٹ کر دھندلاؤ نظروں سے اسے دیکھا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں لاریب! کیوں یہ سب کر رہی ہو؟ تمہیں بابا سائیں کی پریشانی کا اندازہ ہے؟ کسی ایک شخص پر آپ کے زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔ عباس جیسے ہزاروں ملیں گے۔“ ایمان کا لہجہ تندی اور شدت لیے تھا۔ لاریب ساکت ہونے لگی۔ (انہیں کیسے پتا چل گیا اتنا چھپانے کے باوجود۔۔۔ آہ مگر وہ رنجشیں وہ اذیت اور آپ کو کیا پتا باجو! عباس پوری دنیا میں صرف ایک تھا ایک ہے کوئی اور اس جیسا نہیں۔ یہ تو ناقابل تلافی نقصان ہے۔ آپ کو کیا پتا؟ آپ نے محبت نہیں کی۔ آپ کو کیا پتا آپ نے ہجر نہیں جھیلی۔ آپ نے نارسائی کا عذاب نہیں سہا۔) وہ اذیتوں کے بل صراط طے کرتی رہی۔ بھی سکندر ڈاکٹر کے ساتھ اندر چلا آیا۔ پریشان، مضطرب اور بے کُل بے کُل سا اس نے ایک محتاط قسم کی خائف سی نگاہ لاریب پر ڈالی اتنا تو بہر حال وہ بھی جان گیا تھا اس طرح جان پر کیوں تیلی ہے وہ۔ ساری خوشی ساری سرشاری دھری رہ گئی تھی۔ پھر سے احساس کتری احساس ندامت کا شکار ہونے لگا۔

”بابا سائیں کہاں ہیں؟“ ڈاکٹر کونز کے ساتھ لاریب کو ٹریٹمنٹ دیتے دیکھ کر ایمان کو خیال آیا تو سوال کیا۔ سکندر سب کچھ بھلائے لاریب کو دیکھ رہا تھا جو آنکھیں موندے منہ حال ہی پر تھی اس سوال پر سنبھلا۔

”نماز پڑھنے مسجد گئے ہیں۔“ مختصر سا جواب بہت دھیمے انداز میں دے کر وہ پھر سے ہونٹ بچھینچ گیا۔ لاریب کے معاملے میں بہت احتیاط برتی گئی تھی۔ خاص طور پر بڑی حویلی پیر کرامت علی شاہ کی فیملی سے۔ وہ صرف بھائی

نہیں بیٹیوں کے سر بھی تھے اور اس نازک معاملے میں رازداری کی وجہ بھی یہی تھی۔ باہر کے لوگوں میں سے اگر کوئی اور اٹو تھا تو وہ صرف سکندر سے تو کبھی بھی کوئی بات پوشیدہ رکھی ہی نہ گئی تھی۔

ایمان بی بی ان کا خیال رکھیے خلاف مزاج فی الحال کوئی بات مت کیجیے گا۔ نقصان کا باعث ہو سکتی ہے۔“ ڈاکٹر کونز کے ساتھ کمرے سے گیا تو سکندر نے گویا ایمان سے التجا کی تھی۔ ایمان نے ایک گہرا سانس بھر کے نشا اور دافوں کے زیر اثر غافل ہو جانے والی لاریب کو دیکھا اور ہمدردی سے مسکرا دی۔

”ہاں سکندر مجھے پتا ہے تم فکر نہ کرو۔“  
”ٹھیک ہے میں چلتا ہوں بابا سائیں نے صدقے کے کمرے کا کہا ہے آپ کو کچھ کام ہے تو بتادیں۔“ وہ مددگی سے استفسار کرتا سوالیہ نگاہوں سے اسے تنکٹے لگا۔

”اے نازک موقع پر تو صرف دعاؤں کی ضرورت ہے سکندر مگر ہو سکے تو.....“  
”آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں ہے ایمان بی بی! اس قسم کی عزت پریشانی سب میں میرا حصہ ہے۔“ وہ ایمان کی آواز کی بھراہٹ کو محسوس کر کے نرمی سے بولا۔ ایمان کے چہرے پر طمانیت اور تشکر بکھر گیا۔ اس نے ممنون و مشکور نگاہوں سے سکندر کو دیکھا اور آہستگی سے سر ہلا دیا۔



مشہور و معروف شخصیت تھا جسہی اس کی شادی کی خبر جات کو خصوصی کورج دی گئی تھی۔ عباس نے عریشہ کی شہر پر کورسائل اور میگزین کی زینت بنانا پسند نہیں کیا تھا بلکہ اچھی کیفیٹو گرافرز اور مودی میکرز کی رسانی عریشہ تک پہنچانے کی تھی۔ البتہ ان کی شادی کا خصوصی چرچا ضرور تھا۔ عریشہ کی جینیل لمبے لمبے کی خبر ناظرین تک پہنچا رہی تھی۔ عباس حیدر نے اپنی وہ نئی خوشی مہر میں عریشہ کو شامل کیا وہ اسے بیاہ کر لایا تھا۔ عریشہ کی قسمت پر کھانسنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی تو حسد اور

### نایاب سید

چپ چاپ گزر جاتی درد کی منزل جو تم راستے سے بلا نہ لیتے تو

آداب عرض ہے ہم نایاب سید ہیں پہچان لیا نا ہاں کیوں نہیں پہچانیں گے دوست ہوں آپ کی سب سے جدا ہے نا۔ میں اکلوتی ہوں میرا سارا حمل ہے بہت خوش مزاج ہوں ہر وقت ہنستی رہتی ہوں۔ دوست بنائے بہت مگر کوئی راس نہیں آیا۔ بس جی اپنی زندگی اب کیسے آپ کے سامنے رکھوں میں بی بی اے کی اسٹوڈنٹ ہوں خواب تو بہت سارے ہیں لیکن ایک خواب جس کی جستجو ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے آخر عقل مند جو ٹھہرے۔ رنگوں میں مجھے سفید رنگ بہت پسند ہے۔ سادہ سادل ہے ہمارا کسی کودکھ میں نہیں دیکھ سکتی لیکن اوگ ہمیں چوٹ ضرور دیتے ہیں۔

ہماری مسکراہٹ ہی چھین لی اس بے وفا زمانے نے کوئی غور سے دیکھے بھی تو رونا آ جاتا ہے

جلن کا شکار لوگ بھی کم نہیں تھے مگر وہ دونوں ہر قسم کے احساس سے بے نیاز بہت خوش گمن اور سرشار تھے۔ عباس تمام رسموں کی ادائیگی کے بعد اپنے کمرے میں آیا تو ایئر فریشر اور گلابوں کی ملی جلی خوشبو نے اس کا استقبال کیا تھا۔ ہزاروں روپے عباس نے صرف بیڈروم کی ڈیکوریشن پر صرف کر دیئے تھے۔ ایسی ڈیکوریشن اور آرائش کہ شاید ہی اس سے قبل کی گئی ہو۔ اس رات کو حسین تر بنانے کے لیے عباس نے شہر کے سب سے مہنگے اور مشہور انٹریز سے اپنا ویدنگ روم ڈیکوریٹ کروایا تھا جبکہ لاکھوں کا فریج پھر اس کے علاوہ تھا۔ جب عریشہ بیڈروم میں داخل ہوئی تو دروازے کے اندر سے خود بخود گلاب کے پھولوں کی اس بارش ہونے لگی اور جب وہ گلاب اور چینیلی کے اصلی پھولوں سے بھرے بیڈ پر بیٹھی تھی تو اطراف میں ٹھنڈی ٹھنڈی گلابی پردے جن پر خوب صورت گلاب کی گلیاں تھیں چھپنے لگیں اور مسہرئی چہرہ کت میں بدل گئی تھی۔

ان کا ڈریسنگ روم انتہائی خوب صورتی سے سجا تھا۔ شیشے کا



حیرت کدہ بنایا گیا تھا چاروں دیواریں شیشے کی تھیں۔ یہ سب کچھ عریضہ پہ اس کی اہمیت اور خاصیت کو خوب اجاگر کر رہا تھا۔ عباس حیدر جب کمرے میں آیا تو اس کی شوخ نگاہوں کے بے باک مچلتے تقاضوں سے عریضہ نے گھبرا کر شرما کر اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے مگر عباس کی شوخ جسارتوں پہ بند باندھنا اس کے بس سے باہر ہی تو تھا۔ عباس حیدر کی شدتوں اور وارفتگیوں نے ہی تو اسے باور کرایا تھا وہ اس کے نزدیک کس قدر اہم خاص اور ضروری تھی۔

عباس حیدر نے اسے جو رونمائی گفٹ دیا تھا اسے دیکھ کر تو عریضہ سچ معنوں میں مغرور ہوا بھی تھی۔ بے حد خوب صورت اصلی ہیرے کا برسلیٹ اور لاکٹ سیٹ جیسے عباس نے اپنے ہاتھ سے پہنائے تھے۔ عباس نے وائٹ گولڈ میں ڈائنمنڈ اور بریل رکھوائے تھے۔ عریضہ کی آنکھیں ان چاہتوں کو پا کر بھینگنے لگی تھیں۔ عباس نے اس کی آنکھوں کی نمی کو محسوس کیا تو بے چین ہوا اٹھا تھا۔

”واٹ سپنڈ عریضہ!“

”تھنگ!“ وہ بھنگی پلکوں سمیت مسکرائی۔

”تم روئیں کیوں؟“

”عباس مجھے تمہاری محبتوں کی شدتیں خوفزدہ کرنے لگی ہیں۔ دامن تنگ پڑتا محسوس ہوتا ہے۔ تمہیں پتا ہے عباس! مجھے چند سال پہلے کسی نے ایک بات کہی تھی۔“

”کیا بات؟“ عباس نیکی کے سہارے نیم دراز تھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”یہی کہ میں بہت لمبا عرصہ تک خوشیاں نہیں پاسکوں گی۔“ وہ افسردہ تھی۔ عباس کی پیشانی پہ ناگواری شکنوں کی صورت سمٹ گئی۔

”یہ کیا فضول بات ہے۔ یونو غیب صرف رت جانتا ہے اور“

”عباس میں بھی تو ہم پرست نہیں ہوں مگر مجھے“

”ہر فضول بات اپنے ذہن سے جھٹک دو۔ ہم ان شاء“

اللہ ہمیشہ ساتھ رہیں گے اور خوش بھی چلو اب مسکراؤ۔“ عباس نے اس کا گال نرمی سے سہلا کر کہا تو عریضہ ہنسی سے مسکرا دی مگر اس کا دل بھاری ہی رہا تھا۔

.....

آنکھوں پر بازو رکھتے وہ ساکن لیٹی تھی۔ آنکھوں پر دھرا بازو بھی گویا ایک آڑ ایک پردہ تھا ان آنسوؤں کو چھپانے کی غرض سے جو روکے نہ رکھتے تھے۔ دل تھا کہ ٹوٹ ٹوٹ کر وجود میں بکھرتا تھا کیسی بے کاٹھی کیسی بے چینی! اضطراب ایسا گویا وجود کو کند چھری سے کاٹا جاتا ہوا ہوا بے بسی سی بے بسی آنسوؤں پہ اختیار تھا سوچی بھر کے بہائے تھے مگر جانے یہ غم کا کیسا سورج چڑھا تھا جسے زوال ہی نہ تھا۔ مام اس سے سخت خفا تھیں یہ ان کی خفگی کی شدید ترین انتہا تھی کہ انہوں نے موت کے منہ سے واپس لوٹ آنے والی نندنی سے کلام کرنا بھی گوارا نہ کیا تھا۔

”ایسا مت کریں مام! اسے ایسی پھونشن میں آپ کی توجہ محبت کے ساتھ آپ کے جذباتی سہارے کی بھی ضرورت ہے۔“ انہیں ایسی باتیں سمجھانے والا دیو کے ہوا کون ہو سکتا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ بندہ اس کے لیے اتنا مخلص تھا حالانکہ نندنی نے اس کی تحقیر اس کی ذلت میں کبھی بھی کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی مگر اس کا ضبط اس کا استقلال اسے جھنجھالانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ شاید اس میں عزت نفس ہے ہی نہیں۔ وہ اکثر سوچتی اور سمجھتی یہ جان نہ پانی محبت یونہی بے بس بے کس کر دینے والا جذبہ ہے۔ ”میں اسے معاف نہیں کر سکتی دیو۔“ مام نے اب اس کی طرح اس نے بھی مجھے ڈسا تھا نا آج اس نے بھی.....

”مام پلیز! ایسی باتیں مت کریں۔“

”تم مجھ سے فی الحال کچھ مت کہو دیو۔“ انہوں نے لجاجت سے کہا مگر دیو بانہیں آیا اور بات خردہ جیتا۔ مام نے اس سے بات کی تھی پیار بھی کیا مگر کون جانتا تھا نندنی کو کیا

چاہیے تھا وہ تو کسی کے بھی بس کی بات نہ تھی شاید۔

”میں کیا کروں؟ کیا کروں میں ایسا کہ وہ مجھے مل جائے۔“ اس کا جی چاہا اپنے بال نوج ڈالے اپنے نقصان پہ لہذا آواز سے بین کرے محبت کی گمشدگی سے بڑھ کر بھی کوئی نقصان ہے؟ نہیں یہ نندنی سے بڑھ کر کون جان سکتا تھا۔

”ہم آپ جاگ رہی ہیں؟“ مہین نیوانی آواز پر وہ جوفیات کی خارزار وادی میں بھٹک رہی تھی چونک کے حوجہ ہوئی۔ پیازی کلر کا عبایا ہرنگ بڑے سے اسکارف میں سر ہٹا بلخوف وہ ڈاکٹر زینب خان تھی۔ اس کی معالج جس کے ہاتھوں تک پر سیاہ کلوز ہمہ وقت چڑھے رہتے تھے۔

”کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“ نندنی کو اپنی سمت حوجہ پا کر وہ نرمی سے گویا ہوئی تھی۔ نندنی اسے دیکھے گئی۔ آف وائٹ اسکارف سے جھانکتی ان آنکھوں اور سیاہ رنگی پلکوں کی بازو میں اتنا حسن سمٹا ہوا تھا کہ بے اختیار نندنی کا جی اس کا چہرہ دیکھنے کو پھل گیا۔ اپنی خواہش کی اس شہید مہری نے خود نندنی کو بھی ششدر کر دیا تھا۔

”مجھے حق تو نہیں ہے نندنی گریو ال مگر کہنا چاہوں گی کہ ایسا کیا تھا جس کی وجہ سے آپ نے خود زندگی جیسی خوب صورت نعمت کو ٹھکرا دیا تھا۔ سوسائیز تو کسی مذہب کی بھی اچھا نفل نہیں ہے نا؟“ اس کی شخصیت کی طرف اس کی آواز بھی بے حد متاثر کن تھی اور اب دلچسپ کافسوں تو گویا دلوں پر سحر طاری کرتا تھا۔ جانے کیوں نندنی کا دل ڈاکٹر زینب خان نے اس کی آنکھ کی پور سے نکلتی کود نکھا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے گال کو سہلایا۔

”نندنی گریو ال!“ نندنی نے جانے کس جھبیل سے مغلوب ہو کر ڈاکٹر زینب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

”مسلم ڈاکٹر زینب؟“

”ڈاکٹر زینب نے نرمی سے“

”نندنی سمجھنے سے قاصر رہی۔ ڈاکٹر زینب کو سر ہٹا کر ہلا کر پڑا تھا۔“

دعہ

دعہ یہ تم وفا کرنا جاناں  
بس مجھ سے ہی وفا کرنا جاناں  
میں بس تجھ سے ہی محبت کرتی ہوں  
تو زندگی بھر حق محبت ادا کرنا جاناں  
یہ زمانہ تو جتنا ہے پیار کرنے والوں سے  
تو اس زمانے کی پروا نہ کرنا جاناں  
گر آتی ہے موت تو تیری بانہوں میں آئے  
میری حیات ہے تیری بانہوں میں مرنا جاناں  
تجھے پا کر جہاں بھر کی خوشی پائی ہے  
تھی ہر سو اداسی و گرنہ جاناں  
تیرے بھی دل میں بس میرا خیال رہے  
اپنے دل سے مہناز کو بھی جدا نہ کرنا جاناں  
مہناز نجم شہزاد..... حیدر آباد

”میرے فادر کرپچن جبکہ مام ہندو ہیں۔ میں نے دونوں مذاہب کے مطابق اپنی خواہش کی تکمیل مانگی مگر.....“ وہ بات مکمل نہیں کر سکی۔ اس کی ہچکیاں بڑھنے لگی تھیں ڈاکٹر زینب نے آہستگی اور نرمی سے اس کا ہاتھ سہلایا۔ گویا ڈھارس بندھائی۔

”مجھ پر ایک احسان کر دیں ڈاکٹر زینب! مجھے زندگی کی قید سے آزاد کرادو پلیز مجھے یہ زندگی نہیں چاہیے۔“ وہ ایک دم سے ہلک کر بولی۔ تو ڈاکٹر زینب کچھ مضطرب ہونے لگی۔

”نندنی گریو ال! خود کو سنبھالیں ابھی آپ جذباتی ہو رہی ہیں ورنہ زندگی میں آپ کے لیے یقیناً بہت کچھ ہے۔“

”مم مگر میں..... میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ وہ کچھ اور شدتوں سے رو پڑی۔

”کس کے بغیر؟“ ڈاکٹر زینب نے پرسکون آواز میں سوال کیا۔

”وہ جو مجھے صرف ایک بار نظر آیا تھا۔ جسے میں نے بہت ڈھیونڈا بہت کھوجا مگر مجھے اس سے محبت ہے“



بہت محبت مگر وہ مجھے نہیں ملتا ایک بار بھی نہیں۔۔۔۔۔“ وہ وحشت زدہ ہی نہیں تھی بے ربط بھی تھی۔ ڈاکٹر زینب نے اپنے ہمراہ موجود نرس کو اشارہ کیا جسے سمجھتے ہوئے نرس نے انجکشن میں دوا بھری اور تیار انجکشن ڈاکٹر زینب کے اشارے پر اس کی بے خبری کے عالم میں نندنی کے بازو میں لگا دیا۔ مسکن دوا کے اثر سے وہ اگلے چند لمحے بعد پرسکون نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

”اب یہ چند گھنٹے بعد انھیں گی تو پرسکون ہوں گی ڈونٹ وری۔“ ڈاکٹر زینب خان نے سریتا دیوی کو مخاطب کیا جو نندنی کی زبان سے ہونے والے انکشافات سے ساکن و صامت کھڑی تھیں۔ اللہ جانے ڈاکٹر زینب کی بات بھی انہوں نے سنی تھی یا نہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

”لاریب یوں کب تک چلے گا؟“ ایمان نے اس کے مقابل بیٹھ کر بہت محبت سے اس کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ لاریب کی آنکھیں جو ضبط کی کوشش میں سرخ تھیں۔ بہت تیزی سے بھٹکتی چلی گئیں۔ ایمان نے اس کی بدلتی کیفیت دیکھی اور ہونٹ بچھینچ لیے تھے۔

”یہ سب کچھ نیا تو نہیں ہے لاریب! چار سال بیت چلے ہیں تم چار سالوں سے جانتی تھیں کہ وہ تمہارا نہیں رہا تمہیں نہیں مل سکتا پھر اب۔۔۔۔۔؟ اب نیا کیا ہوا؟“

”وہ شادی کر چکا ہے باجو! اس آس کو توڑ دیا ہے اس نے جو میرے دل نے سمجھی ٹوٹے نہیں دی تھی۔ میری ساری دعا میں عرش سے بغیر قبولیت کے لوٹا دی گئیں عمر بھر کی نارسائی نصیب ٹھہری ہے اور۔۔۔۔۔ وہ ایک دم یوں خاموش ہو گئی جیسے بروقت خود پہ قابو پایا ہو۔ ایمان اسے بغور دیکھ رہی تھی جس کے چہرے پر وحشت اور ہراس کی کیفیت گہرا ہو گیا تھا جو یقیناً کسی سوچ کسی خیال کی غماز تھی۔

”اور کیا؟“ لاریب اس ایک نقصان کے علاوہ اور کون سا نقصان ہوا ہے تمہارا کیا کھویا ہے تم نے مجھے بتاؤ دل کا بوجھ بکا ہو جائے گا۔“ لاریب کے چہرے پر لمحہ بھر کو تاریکیاں

چھا گئیں۔ اس نے بوکھلا کر ایمان کی صورت دیکھی وہاں بے خبری تو تھی مگر جاننے کی بے قراری کے ساتھ۔ اس کا بے اوسان پھڑ پھڑاتا دل ذرا سا سنبھلا۔ یہ ایسی بات ہرگز نہیں تھی کہ کسی کو شریک راز کیا جاتا۔ ابھی تو شرمندگی اور پچھتاوے کے کرب سے وہ خود بار نہیں آسکتی تھی۔

”جتنا بڑا بھی دکھ ہو اس کا احساس عمر بھر ساتھ نہیں چلتا۔ وقت ہر زخم پر مرہم رکھتا ہے۔ تم بھی اسے بھول جاؤ گی ڈونٹ وری۔“ ایمان نے گویا اسے سمجھایا تھا وہ کچھ نہیں بولی۔ خاموش پر ملول سی سر جھکائے ناخن سے نیل کی سطح کھرچتی رہی۔

”تم نے دوا لی۔۔۔۔۔ کھایا بھی یقیناً کچھ نہیں ہوگا؟“ ایمان کو خیال آیا پھر کھانے کی ٹرے جوں کی توں دیکھ کر اس نے شاکی نظریں اس پر جمائیں۔

”لاریب تمہیں کیا لگتا ہے اس طرح کر کے تم صرف خود کو نقصان پہنچا رہی ہو؟ بابا سائیں کی پریشانی کا نہیں اندازہ ہے؟ بہانہ بنایا تھا میں نے کہ وہ سلپنگ پلزم نے غلطی سے پھانک لی تھیں۔ اب تمہارے یہ اندازہ اطوار ان پہ کیا ثابت کر رہے ہیں تم سمجھ تو سکتی ہو۔“

”باجو آپ مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا نہیں چھوڑ سکتیں۔“ اس نے عجب بے کسی بے چارگی سے کہا تو ایمان کی آنکھوں میں حدت سمٹ آئی۔

”نہیں ہرگز بھی نہیں۔ میں تمہیں تمہارے حال پہ نینا چھوڑ سکتی سنا تم نے۔“ اس سے قبل کہ لاریب جواب میں کچھ کہتی بابا سائیں کے ساتھ سکندر اور کمرہ دار دروازہ ناک کر کے اندر چلے آئے۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی بیٹا؟“ ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر سوال کیا۔ لاریب کے اعصاب سکندر کی آمد کے ساتھ ہی کشیدہ ہو گئے تھے۔ سکندر کی بہت مختاطہ انداز میں انھی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی جی رہ گئی تھی۔ محض تین چار دنوں میں ہی وہ کیسے پتھر کر رہ گئی تھی۔ سحر طراوت آنکھوں کے چوڑے بوجھل اور دم آلود تھے آنکھوں کے نیچے سیاہ گہرے حلقے ستا، واچہرہ پھڑکی زدہ ہونٹ سکندر

سے جیسے دل پہ گھونسلہ لگا تھا۔ وہ کتنی بے دردی سے ہونٹ چپا رہی تھی جیسے خود پر جبر کر رہی ہو اور یہ جبر یقیناً سکندر کی ہی موجودگی تھی۔ احساس ہوتے ہی وہ اٹنے قدموں

سکندر کہاں جا رہے ہو؟ ڈاکٹر صاحب جو دوائیں لکھیں گے وہ نسخہ لے کر جانا پتر! بابا سائیں اس سے نہیں تھے۔ سکندر کو ناچاہتے ہوئے بھی ٹھہرنا پڑا۔ پھر نظر بھر کے لاریب کی بے بسی کو اس سے دیکھا نہیں گیا تھا۔ شہر کے کیمسٹ سے دوائیں لے کر وہ واپس لوٹا تو بھی اسی کیفیت کے زیر اثر تھا۔

”سکھاں یہ دوائیں بی بی صاحبہ کو پہنچاؤ اور سنو ان سے پوچھا تا مزید کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔“ وہ اس وقت خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ جی اب گھر لوٹ جانا چاہتا تھا۔ سکھاں نے اس کا بڑھایا لفاظی تھا منے سے اجتناب برتنا تھا اور جلدی سے بولی تھی۔

”سکندر سائیں بڑی بی بی صاحبہ نے کہا تھا آپ آؤ تو آپ کو ہیں ان کے پاس بیٹج دوں۔ شاید کچھ کام ہو جی۔“ سکھاں کے پیغام نے سکندر کے اندر سرسراہٹ تھکن کو یکدم مٹا دیا۔ وہ ڈھیلے قدموں سے گریزاں سا ایمان کے کمرے کی جانب آیا۔ حالانکہ جانتا تھا آج کل ہر پل ایمان لاریب کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ پھر بھی وہ جیسے کسی صورت حال سے فرار چاہ رہا تھا۔ ایمان کمرے میں نکلی گئی البتہ ملازم۔ اس کے کمرے میں موجود تھی اور وہاں جبر رہی تھی۔ اسی نے بتایا تھا ایمان لاریب کے کمرے میں ہے۔ سکندر گہرا سانس بھرتا اسی سمت ہولیا

”آ جاؤ سکندر۔“ دستک کے جواب میں ایمان لیٹ گیا۔ آواز ابھری گویا اس کی آمد کی منتظر تھی۔ سکندر کھول کر اندر قدم رکھا۔ ایمان امام اور لاریب کے ساتھ موجود تھیں ایمان غرور کی باسکٹ سامنے رکھے

سائیں میڈلسن بہت دیر لگا دی تم نے؟“

”آپ کو کچھ کام تھا بی بی صاحبہ!“ سکندر کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس نے دواؤں کا لفافہ میز پر رکھ دیا تھا۔

”تمہارے جانے کے بعد مجھے یاد آیا تھا سکندر کہ میرے کچھ سوٹ ٹیلر کے پاس ہیں۔ خیر یہ کارڈ رکھ لو جب شہر جاؤ تو یاد سے لیتے آنا۔“ ایمان نے سیب کی چھلی ہوئی قاش پلیٹ میں رکھ کر بیڈ کی دراز سے کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھا۔ جسے سکندر نے ذرا سا جھک کر اٹھا لیا تھا۔

”ابھی آپ کو ضرورت ہے تو میں ابھی لا دیتا ہوں۔“ شاب کھلی ہوئی۔ یہ سعادت مندی اس کی حیثیت کی متقاضی تھی۔ ایمان مسکرا دی۔

”نہیں بھئی اب ایسی خاص ضرورت بھی نہیں۔“

”جی بہتر میں۔۔۔۔۔“

”تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ کیوں آرہے ہو بار بار؟ میری بے بسی کا تماشا دیکھنے؟“ سکندر کی بات مکمل نہیں ہو سکی تھی اپنے دھیان میں واش روم کا دروازہ کھول کر باہر آتی لاریب کی نظر اس پہر پڑی تھی اور وہ جیسے غم و غصے اور نفرت کے ملے جلے احساسات سمیت اسے رو برو پاتے ہی یا گل ہو انہی تھی۔ سکندر کو دیکھنا اس کا سامنا کرنا اس وقت گویا دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔ وہ اس کی شکست اس کی انا و خود داری اور نقصان کا سب سے بڑی وجہ تھا۔ اور اب بار بار اس کا سامنا گویا اسے اپنے منہ پر اپنی بار محسوس ہو رہی تھی۔ ضبط چھایا تھا اور وہ بیچانی ریلے میں بہہ کر ایک بار پھر حواس گنوا چکی تھی۔ سکندر کا گریبان اس کے ہاتھ میں تھا جو اس کے ایک ہی جھٹکے سے دامن تک چرتا چلا گیا۔ ٹوٹتے بٹن یہاں وہاں بکھرے تھے۔ سکندر اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایمان اور امامہ بھی شاکہ رہ گئیں۔

(جاری ہے)





مجھے حکمران لگتی



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ ٹمبلر پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، سپر سڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ آر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ویڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1







نہیں رہ گئی تھی۔ امامہ اور ایمان کی حیرت و غیر یقینی پر بدحواسی غالب آئی اور دونوں افتان و خیزاں اٹھ کر گرنی پڑی ان کی جانب بھاگی تھیں۔

”لاریب..... لاریب چھوڑو اسے۔ پاگل ہو گئی ہو۔ چھوڑو۔“ ایمان نے ہاشکل اس کے ہاتھوں سے سکندر کا گریبان چھڑوایا۔ اس کوشش میں وہ جیسے ہلکان ہو گئی تھی۔ خود لاریب کی حالت بھی بہتر نہ تھی۔ دھولکی کی مانند چلتی سانس اور اہل پتھل دھڑکنیں آنسوؤں سے دھندلائی آنکھیں جن کی حدتیں اور سرخیاں بے پناہ تھیں۔

”اسے یہاں سے نکال دیں، بجورنہ میں اسے شوٹ کر دوں گی یا خود کو..... اسے یہاں سے بھیج دیں۔“ وہ اب زور زور سے دہرائی تھی۔ ایمان کو اس پریش کے ساتھ رحم بھی آیا۔

”سکندر پلیز تم جاؤ۔“ ایمان نے کچھ الجھے اور شرمندہ سے انداز میں سکندر سے نظریں چا کر کہا۔ سکندر جوختی سے ہونٹ جھینچے بالکل خاموش کھڑا تھا بونکی لب بستہ پلٹ گیا۔ ایمان نے بستر پر گر کر زار و قطار روئی ہوئی لاریب کو متاسفانہ نظروں سے دیکھا تھا۔ امامہ اسے سنبھالنے میں مشغول تھی۔ ایمان کچھ دیر اسے سختی رہی پھر وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔

لاریب کا شدید ترین رویہ اب اسے ٹھٹکا چکا تھا۔ وہ ہرٹ عباس کی وجہ سے تھی مگر اس کا اشتعال سکندر سہہ رہا تھا۔ کیوں؟ اگر وہ یہ کہہ کر دل کوڑھارس بھی دے لیتی کہ پانی بہہ کر ڈھلان کی سمت ہی جاتا ہے تب بھی سکندر کا خائف انداز اسے مشکوک بنانے لگتا تھا۔ کیا سکندر بھی اس معاملے میں انوالو تھا؟ وہ جتنا سوچتی اسی قدر الجھ رہی تھی۔

”باجوآ بوجو کو سنبھالیں تا یہ روئے جارہی ہیں۔“ امامہ گھبرا کر اس کے پاس آئی۔ ایمان نے چونک کر اسے دیکھا پھر ٹھنڈا سا بس بھرا۔

”رونے سے نصیب اگر بدلا کرتے تو دنیا میں شاید کوئی بھی نامراد نہ ہوتا۔ کچھ وقت لگے گا اسے بھی اس حقیقت کو سمجھنے میں۔“ اس نے رنجیدگی و تاسف سے کہا اور اٹھ کر لاریب تک آ گئی۔

”عباس حیدر کی زیادتی معاف کرنے کے لائق نہیں ہے لاریب اور میں نے سوچ لیا ہے کہ میں اپنے طور اس کا بدلہ ضرور لوں گی۔“

”کیا کریں گی آپ؟ کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔“ وہ

چیخ پڑی۔

”یہ آنے والا وقت بتائے گا میں کیا کروں گی لیکن پلیز لاریب تم خود کو سنبھالو۔ تمہیں بہت اسٹرانگ بننا ہے۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

”میں بہت ٹوٹ گئی ہوں باجوآ“ وہ پھر سے سسکیاں بھرنے لگی۔ ایمان نے بڑھ کر اسے خود سے لپٹا لیا۔ لاریب تو جیسے سہارے کی منتظر تھی بے ساختہ پھر سے ہلک اٹھی۔

”آج ایک ہی بار سارے آنسو بہا لو لاریب۔ میں دوبارہ تمہیں بھی عباس کے لیے روتے نہ دیکھوں۔“ وہ نرمی و آہستگی سے اس کا سر تھکتے ہوئے بولی۔

(اس شخص نے تو میری ساری زندگی کو آنسو بنا دیا ہے باجوآ آپ کو کیا بتاؤں میں کیا کر رہی ہوں۔ عباس نے ایسی شکست سے دوچار کیا ہے کہ خود سے نگاہیں ملاتے بھی شرم آتی ہے کہ وہ اس کے کاندھے سے لگی ہچکیاں بھرتی رہی۔

.....

”کیا سوچا تم نے اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں؟“ دیو کے منع کرنے کے باوجود بھی سریتا دیوی اگر نندنی کے پاس آ کر اشتعال میں یہ سوال کر رہی تھیں تو اس کا مطلب یہی تھا اس انکشاف نے جو آگ ان کے من میں بھڑکائی تھی اس کی تپش کم نہیں ہوئی بلکہ انہیں وہ بڑھ کر لاؤ میں تبدیل ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ نندنی نے ایک نظر ان کے تھے ہوئے نقوش والے سخت چہرے کو دیکھا جس پر کسی قسم کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی اور جیسے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ سر جھکا لیا۔

”کچھ پوچھا ہے میں نے تم سے؟“ اس کی خاموشی نے گویا صبح معنوں میں انہیں آگ لگادی تھی جیسی وہ بھڑک کر بولی تھیں۔

”جب آپ سب کچھ جان چکی ہیں تو پھر مجھ سے یہ سب جاننے کا مقصد؟“ نندنی کی خاموشی ٹوٹی۔ اس کا لہجہ گہری کاٹ لیے طنز آمیز تھا۔ سریتا دیوی کو جیسے سر پر لگی تھی۔

”تم بہت بدتمیز ہو گئی ہو۔ بالکل اپنے ضدی اور اجڑ پتا رہ گئی ہو۔“ وہ پھنکار کر بولیں۔ نندنی نے تیوری چڑھا کر انہیں دیکھا۔

”آپ کو میرے ڈیڈ سے اتنی ہی نفرت تھی تو پھر ان کا کوئی حوالہ اسے ساتھ کیوں چکا لیا تھا۔ خواجواہ خود بھی جلا کرٹی ہیں اور مجھے بھی اذیت کا شکار کر رکھا ہے۔ اپنی کوکھ سے

جہنم دی گئی اولاد سے بڑھ کر آپ کو اپنے شوہر یعنی سوتن کے بیٹے سے محبت ہے۔ میں تو ایک بے کار فضول شے سے بڑھ کر حیثیت نہیں رکھتی نا آپ کے نزدیک۔“

”جو اس مت کرو۔ تم بہت بولنے لگی ہو۔“ یہ تلخ سچ ہے جسے برداشت کرنا شاید آپ کے بس کی بات نہیں؟“ وہ جولبا چلائی تو سریتا دیوی کا غیظ اور بڑھا کہ کسی طرح بھی وہ خود کو اس پر ہاتھ اٹھانے سے باز نہ رکھ پائیں۔

”تمہاری یہ سرکشی و بدتمیزی از خود جھلی کھا رہی ہے کہ وہ جو کوئی بھی ہے اس کی شہہ پر تم یہ یہودی کے مظاہرے کر رہی ہو۔“ نندنی کو ان سے اس انتہائی رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ اس کے نازک گال پر ان کی پانچوں انگلیوں کے نشان ثبت ہو گئے تھے وہ گال پر ہاتھ رکھے ایک سکتے کی حالت میں تھی کہ ان کے الفاظ کی سنگینی نے گویا اسے بھک سے اڑا کر رکھ دیا۔ اتنی بدگمانی اور شک نندنی کو لگا کہ وہ بیٹھے بیٹھے گڑھ گئی ہے۔

”میں آپ سے ڈرتی نہیں ہوں کہ جھوٹ بولتی پھروں اور میں مجھے افسوس ہے کہ آپ کا اندازہ غلط ہے کاش وہ مجھے ملا ہوتا اور میں اس کی شہہ پر یہ سارا کچھ کر رہی ہوتی۔ اسی کی وجہ سے میں یہ گھر چھوڑ کر بھاگ گئی ہوتی تب آپ کی پیام نہاد عزت داؤ پر لگتی تو آپ کو پتا چلتا سچ اور جھوٹ میں کیا فرق ہوتا ہے۔“ رنج سکتے اور ڈھکی کیفیت سے نجات ملی تو وہ ایک دم ہسٹریک ہو کر چلانے لگی۔

”میں اس کی نوبت آنے سے قبل ہی تمہارا اپنے ہاتھوں سے خاتمہ کر دوں گی سمجھیں تم؟“ سریتا دیوی نے اس کی بے جوابی اور بغاوت کو دیکھتے ہوئے غضب سے پھر کر اسے زور کا دھکا دیا۔ ان کا لہجہ اتنا سنگین اور سفاک تھا کہ کچھ محسوس کو نندنی کو اپنا وجود سن ہوتا محسوس ہوا۔

”کیا کریں گی آپ؟ مار ڈالیں گی مجھے؟ میں آپ کو اس زحمت کا موقع نہیں دوں گی۔ میں خود یہ کام کر سکتی ہوں۔“ وہ غرائی۔ اسے ساری زندگی کا غصہ جیسے انہی لمحوں میں آ گیا تھا۔ اس سے قبل کہ سریتا دیوی کچھ سمجھیں کچھ کر باتیں وہ اٹھ کر اندھا دھند بھاگی اور ٹیرس کا دروازہ کھول کر بالٹی میں چلی آئی۔ سریتا دیوی کچھ بدحواس ہو کر اس کے پیچھے لپکیں مگر جب تک وہ ٹیرس کے دروازے پر پہنچیں نندنی بالکونی کی چھت سے خود کو نیچے گرا چکی تھی۔ سریتا دیوی نے خود کو خوف اور غیر یقینی سے فضا میں محسوس کیا۔ وہ گویا شاگرد کھڑی

جہنم دی گئی اولاد سے بڑھ کر آپ کو اپنے شوہر یعنی سوتن کے بیٹے سے محبت ہے۔ میں تو ایک بے کار فضول شے سے بڑھ کر حیثیت نہیں رکھتی نا آپ کے نزدیک۔“

”جو اس مت کرو۔ تم بہت بولنے لگی ہو۔“ یہ تلخ سچ ہے جسے برداشت کرنا شاید آپ کے بس کی بات نہیں؟“ وہ جولبا چلائی تو سریتا دیوی کا غیظ اور بڑھا کہ کسی طرح بھی وہ خود کو اس پر ہاتھ اٹھانے سے باز نہ رکھ پائیں۔

”تمہاری یہ سرکشی و بدتمیزی از خود جھلی کھا رہی ہے کہ وہ جو کوئی بھی ہے اس کی شہہ پر تم یہ یہودی کے مظاہرے کر رہی ہو۔“ نندنی کو ان سے اس انتہائی رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ اس کے نازک گال پر ان کی پانچوں انگلیوں کے نشان ثبت ہو گئے تھے وہ گال پر ہاتھ رکھے ایک سکتے کی حالت میں تھی کہ ان کے الفاظ کی سنگینی نے گویا اسے بھک سے اڑا کر رکھ دیا۔ اتنی بدگمانی اور شک نندنی کو لگا کہ وہ بیٹھے بیٹھے گڑھ گئی ہے۔

”میں آپ سے ڈرتی نہیں ہوں کہ جھوٹ بولتی پھروں اور میں مجھے افسوس ہے کہ آپ کا اندازہ غلط ہے کاش وہ مجھے ملا ہوتا اور میں اس کی شہہ پر یہ سارا کچھ کر رہی ہوتی۔ اسی کی وجہ سے میں یہ گھر چھوڑ کر بھاگ گئی ہوتی تب آپ کی پیام نہاد عزت داؤ پر لگتی تو آپ کو پتا چلتا سچ اور جھوٹ میں کیا فرق ہوتا ہے۔“ رنج سکتے اور ڈھکی کیفیت سے نجات ملی تو وہ ایک دم ہسٹریک ہو کر چلانے لگی۔

”میں اس کی نوبت آنے سے قبل ہی تمہارا اپنے ہاتھوں سے خاتمہ کر دوں گی سمجھیں تم؟“ سریتا دیوی نے اس کی بے جوابی اور بغاوت کو دیکھتے ہوئے غضب سے پھر کر اسے زور کا دھکا دیا۔ ان کا لہجہ اتنا سنگین اور سفاک تھا کہ کچھ محسوس کو نندنی کو اپنا وجود سن ہوتا محسوس ہوا۔

”کیا کریں گی آپ؟ مار ڈالیں گی مجھے؟ میں آپ کو اس زحمت کا موقع نہیں دوں گی۔ میں خود یہ کام کر سکتی ہوں۔“ وہ غرائی۔ اسے ساری زندگی کا غصہ جیسے انہی لمحوں میں آ گیا تھا۔ اس سے قبل کہ سریتا دیوی کچھ سمجھیں کچھ کر باتیں وہ اٹھ کر اندھا دھند بھاگی اور ٹیرس کا دروازہ کھول کر بالٹی میں چلی آئی۔ سریتا دیوی کچھ بدحواس ہو کر اس کے پیچھے لپکیں مگر جب تک وہ ٹیرس کے دروازے پر پہنچیں نندنی بالکونی کی چھت سے خود کو نیچے گرا چکی تھی۔ سریتا دیوی نے خود کو خوف اور غیر یقینی سے فضا میں محسوس کیا۔ وہ گویا شاگرد کھڑی

لمحوں میں بدل جانے والی صورت حال میں اپنا نقصان سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ معاہدہ سکتہ ٹوٹا اور وہ سر اسیمہ ہو کر آگے بڑھیں بالکونی کی ریلنگ پر لڑتے ہاتھ جما کر انہوں نے نیچے جھانکا اور پختہ فرش پر نندنی کا خون میں تیزی سے نہا تا سا گن وجود کچھ کر وہ بے اختیار چنچنی چلی گئی تھیں۔

.....

فلک تک چل ساتھ میرے فلک تک چل ساتھ چل! یہ بادل کی چادر پر تاروں کے آچل میں چھپ جائیں ہم چل! فلک تک چل ساتھ میرے فلک تک چل ساتھ چل! عباس حیدر نے گنگنا تے ہوئے اسے دیکھا پھر ایک دم ہنس پڑا۔

”چلو گی نا!“ عریشہ جھینپ گئی۔ اس کی نگاہیں ایسی ہی تھیں شوخ متبسم اور بے باک!

”ہمارا ساتھ جنموں کا ہے عباس! آپ کی محبتیں میرا سب سے قیمتی سرمایہ ہے کہاں رہ پاؤں گی ان کے بغیر۔“ اس نے پوری سچائی سے اعتراف کیا تو عباس جیسے شانت ہونے لگا۔

”تمہیں پتا ہے عریشہ میں نے ہنی مون کے لیے کہاں جانے کا سوچا ہے؟“ اس کے لہجے میں اتنا اشتیاق تھا کہ عریشہ کو دلچسپی ظاہر کرنا پڑی۔

”کہاں آپ بتائیں؟“

”پاکستان کے شمالی علاقہ جات۔ ریلی عریشہ پاکستان میں اتنی خوب صورتی ہے کہ میں الفاظ میں بیان کر ہی نہیں سکتا۔ قدرت نے بہت فراخی سے ہمیں ہر شے سے نوازا ہے۔ میں نے یورپ میں بھی وقت گزارا ہے ان لوگوں نے بلاشبہ بہت ترنی کی ہے مگر پھل بیوی کی بات ہی الگ ہے۔ میری ایک فلم کی مکمل شوٹ سوات اور کشمیر میں ہوئی ہے۔ تب مجھے اندازہ ہوا تھا اور میں نے تب ہی سوچا تھا میں شادی کے بعد وہیں جاؤں گا۔ عالم جب اتنا رومان پرور علاقہ ہے کہ وہاں تو انسان کا جی بے ساختہ اپنی من پسند سماج کی قربت کے لیے چل جائے بس ہم وہیں جائیں گے۔“

”او کے ڈن! مگر اس وقت تو ہمیں ڈنر کے لیے جانا ہے یاد ہے آپ کو کہ بھول گئے ہیں؟“ وہ ناز سے اٹھلا کر بولی تو عباس نے نرم لہجہ میں نگاہوں سے جی بھر کے اسے دیکھا تھا۔

.....

فلک تک چل ساتھ میرے فلک تک چل ساتھ چل! یہ بادل کی چادر پر تاروں کے آچل میں چھپ جائیں ہم چل! فلک تک چل ساتھ میرے فلک تک چل ساتھ چل! عباس حیدر نے گنگنا تے ہوئے اسے دیکھا پھر ایک دم ہنس پڑا۔

”چلو گی نا!“ عریشہ جھینپ گئی۔ اس کی نگاہیں ایسی ہی تھیں شوخ متبسم اور بے باک!



”کیسے بھول سکتا ہوں جان عباس!“ دھیما مخمور سرگوشیاں انداز اور نگاہوں کا دلہانہ پن سب کچھ اس کے لیے تو تھا وہ مغرور ہونے لگی۔

”تم تیار ہو جاؤ اور سنو وہ میرون ساڑھی پہننا تمہیں پتا ہے نا مجھے کتنی پسند ہے؟“ عباس نے اٹھتے ہوئے بالخصوص تاکید کی تو عریشہ نے منہ نہ لیا تھا۔

”عباس شادی کے اس ایک ہفتے کے بعد آپ چار مرتبہ مجھے یہ ساڑھی پہنا چکے ہیں۔“

”یار وہ پسند جو ہے مجھے۔“ عباس نے پیار سے کہا وہ ناز سے مسکرائی پھر نخوت سے بولی۔

”مگر میں اکتانگنی ہوں اب مزید نہیں پہن سکتی اور یہ جو اتنے ڈھیر کپڑوں کے جمع کیے ہیں وہ کب پہنوں گی؟“ اس کی بات پر عباس نے فداوانہ انداز میں اسے دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر اس کی کمر کے گرد جال کر دیا۔

”اس میں خفا ہونے والی کیا بات ہے جو تمہارا دل چاہے وہ پہن لو۔“ عریشہ نے سر ہلایا اور ڈرنگ روم میں چلی آئی مگر جب وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو اسی میرون ساڑھی میں بلوس تھی۔ عباس نے خود پر پرفیم اسپرے کرتے لمحہ بھر کو نگاہ اٹھائی اور اگلے لمحے اس کے چہرے کے تاثرات میں یکا یک خوشگواریت لہرائی۔ خیر آئینہ مسرت اور شوق کے عالم میں وہ والہانہ انداز میں اس کی جانب لپکا۔

”عریشہ اگر میں کہوں کہ تم سے بھی بڑھ کر خوب صورت تمہاری ادا میں ہیں تو یہ غلط نہیں ہوگا۔“ اس کی نظروں میں اتنی چمک اتنا بھرپور تاثر تھا کہ عریشہ کی پلکیں بے ساختہ حیا آمیز انداز میں لرز کر جھک گئیں۔

”مجھے بھی آپ سے بڑھ کر آپ کی خواہش عزیز ہے۔“ اس کا متبسم لہجہ شوخی و شرارت کی کھنک سے لبریز تھا۔ عباس زور سے ہنسا اور پھر اسے شانوں سے تمام کر اپنے مقابل کرتے ہوئے اس پر جھکا۔

”کیا خیال ہے ڈنر کینسل نہ کر دیں؟“ اس سے پہلے سنجیدگی سے عباس نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ عریشہ کی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ میں شرم کا غلبہ چھانے لگا۔

”پلیز عباس یہ بڑبڑ بہت اہم ہے امی نے بلوایا ہے ہمیں وٹ کر رہی ہوں گی۔“ اس کی جسارتوں پر بے اوسان ہوتی

وہ لجاجت سے بولی۔ عباس نے ٹھنڈا سا نس بھرا۔

”اوکے فائن چلو۔“ عباس اسے چھوڑ کر فاصلے پر ہوا تب عریشہ کی جان میں جان آئی۔ عریشہ کی ٹیکلی میں اس کی والدہ بھی تھیں والد کی حیثیت ایک بے کار پرزے کی سی تھی۔

اس وقت سے خاص طور پر وہ ہر معاملے سے الگ ہو گئے تھے جب عریشہ کی ٹیکلی ان کے پیچھے سے توڑی گئی ظاہری سی بات تھی وہ عباس کو اتنا پسند نہیں کرتے تھے ڈنر کے دوران عباس عریشہ کی امی سے رنجی سی بات چیت کرتا رہا تھا۔

عریشہ کے برعکس عباس کو عریشہ کی امی کے انداز و اطوار اکثر ناگواری کا احساس بخشتے تھے مگر عباس کو عریشہ سے مقصد تھا جیسی عباس کا رویہ ان سے ہمیشہ لیا دیا رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ کھانے کے بعد زیادہ رکنے پر آمادہ نہیں تھا اور عریشہ کو لے کر نکل آیا۔

”آپس کریم کھاؤ گی عریشہ؟“ وہ اپنی پسند کی کیسٹ منتخب کر کے کیسٹ پلیئر آن کر رہی تھی جب اس نے عباس کی آواز سنی۔

”نیکلی اور وہ بھی پوچھ پوچھ۔“ جواباً وہ خوشدلی سے چمکی۔ عباس نے گاڑی آؤٹسکرم پارکر کے سامنے پارک کی۔ اس کے ہمراہ وہ اندر آیا تو اندر امی اپنی ٹیلیفون کے ہمراہ بیٹھے لوگوں کی نگاہیں ان کی سمت اٹھ گئی تھیں۔ ان نگاہوں میں شوق و دلچسپی ستائش سمجھی کچھ تھا مگر دوسری جانب عباس جیسے بے نیاز تھا اور عادی بھی جیسی وہ بے پروائی سے عریشہ کے ہمراہ خالی ٹیکلی تک آیا اور ویٹر کو اسٹرابیری اور فالوڈ آؤٹسکرم آرڈر کر دیا تھا۔

”سر پلیز آؤٹسکراف!“

”سر میں آپ کی بہت بڑی فین ہوں۔ آپ نے میوزک میں کام کرنا کیوں چھوڑ دیا؟“

”سر پلیز آپ پھر سے شوپز جوائن کر لیں نا۔“ اگلے چند لمحوں کے اندر کچھ لڑکھو جو ان طرح دار قسم کی لڑکیوں اور لڑکوں کے گروپ نے عباس کو گھیرے میں لے لیا۔ عباس جزبہ ہونے لگا جبکہ عریشہ کے ماتھے پر واضح ناگواری چھا گئی۔

”آئی ایم ساری عریشہ! مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس قسم کی مصدات حال بھی پیش آ سکتی ہے۔“ ان لڑکے لڑکیوں سے جان چھڑا کر عباس عریشہ کی طرف متوجہ ہوا گویا اس کا موڈ بحال کرنا چاہا۔

”کیوں آپ کو اپنی مقبولیت پر شک تھا یا اپنی سحر انگیز شخصیت کے چارم پر؟“ عریشہ کا لہجہ تند تھا اس کے موڈ کی طرح عباس بے ساختہ ہنس پڑا۔

”کسی پر نہیں مجھے بس تمہارے سوا سب بھولا ہوا ہے آج کل۔“ وہ بہت خاص لہجے میں گویا ہوا نگاہوں میں سچائیاں رقم تھیں مگر عریشہ متاثر ہونے کے موڈ میں نہیں تھی جیسی اس کی بات پر سر جھٹک دیا۔

”بھئی آپ نے مجھے اچھے سے یاد رکھنا انہیں آؤٹسکراف دیے ہوئے۔“ وہ گہرے طنز سے بولی عباس کی یہ لہجہ بھرکی بھی جیسی تو جاس پیس برداشت نہ ہوئی تھی وہ اس کے معاملے میں اتنی ہی باز رہی تھی۔

”میں تم سے غافل تو نہیں ہوا تھا عریشہ! مگر یہ بھی تو سوچو کتنا آؤٹسکراف اگر میں ان لوگوں کو انور کر دیتا۔“ وہ بہت خل سے اسے سمجھا رہا تھا۔

”آپ کچھ بھی انوکھا تو نہ کرتے عباس! سارے مشہور لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔“ وہ تنک کر بولی۔ عباس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”تو اس کا مطلب وہ صحیح کرتے ہیں۔ عریشہ پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ می۔“

”انہیں مجھے گھر چلنا ہے۔“ عریشہ نے بد مزاجی اور نخوت کی انتہا کر دی۔

”آؤٹسکرم تو کھا لیا۔“

”اب میرا دل نہیں کر رہا ہے بس انہیں۔“ وہ بگڑ کر بولی۔ عباس کو ناچاہتے ہوئے بھی اٹھنا پڑا۔

اس کا پورا وجود گویا لکڑی کی دھکی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جو ہر چی پرچی اذیت سے روشناس ہوتا تھا۔ وہ مغرب کی نماز کے بعد مسجد سے واپس نہیں آیا تھا۔ دل کی لے گئی ان دنوں ایسی تھی کہ اس سے نجات کے لیے وہ ذکر اللہ کی کثرت کرنے لگا تھا۔ عشا کی نماز سے فراغت پانے تک گاؤں کی گلیاں حسب سابق سونی ہو گئی تھیں۔ اس کے گمان تک میں یہ بات نہیں تھی وہ گھر پہنچے گا تو لاریب وہاں اس کی منتظر ہوگی۔ ثانیہ اسے بیٹھک میں بٹھا کر اس کے لیے شربت لینے چلی آئی تھی اور جب ٹرے اٹھائے ثانیہ نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا اسی بل سکندر بھی آ پہنچا تھا۔ اپنے دھیان میں وہ

بیرونی دروازہ بند کر کے پلانا تو ثانیہ کو دیکھ کر چونکا۔

”خیریت؟ کوئی آیا ہے کیا؟“

”ہاں لاریب بی بی آئی ہیں تم سے ملنے۔ کہہ رہی تھیں ان کی آمد کا کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔“ ثانیہ کا انداز سرگوشیانہ تھا۔ سکندر ٹھٹک گیا۔

”حیران ہو گئے نا۔ میں بھی بہت حیران ہوئی تھی انہیں دیکھ کر۔“ سچ پوچھو تو انہیں یہاں دیکھ کر میرے ہاتھ ہیر پھول گئے تھے۔ سمجھ ہی نہ آئی تھی کیسے بات کروں کہاں بٹھاؤں۔“

”اکیلی آئی ہیں؟“ سکندر نے خود کو سنبھال کر پوچھا۔

”بالکل اکیلی ہیں شاید تم سے کچھ ضروری کام ہے۔“ ثانیہ کے لہجے میں سادگی تھی مگر سکندر اندر سے ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ لاریب کی آمد بے وجہ نہیں تھی۔ اس نے اشارے سے ثانیہ کو اندر جانے کا کہا۔

”سکندر نہیں آیا.....؟“ ثانیہ کے اندر جاتے ہی سکندر نے وہیں کھڑے لاریب کی مدھم مگر جھنجھلائی ہوئی آواز سنی تو قدم بڑھا دیے۔

”آگیا ہے جی بس.....“ اسے جواب دیتی ثانیہ سکندر کو دیکھ کر خود بخود چپ ہو گئی۔ سکندر نے ایک نگاہ لاریب کے چہرے کو دیکھا جو اسے دیکھتے ہی غلٹ میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”تم میرے ساتھ چلو۔“

”جی کہاں؟“ وہ بوکھلایا اس غیر متوقع مطالبے پر۔

”تم چلو میں بتاتی ہوں۔“ لاریب نے اسے گھومتے ہوئے برہمی سے کہا اور قدم بیرونی دروازے کی جانب بڑھا دیے۔ سکندر کو طوعاً و کرہاً اس کے پیچھے قدم بڑھانے پڑے۔

”کب تک جاؤ گے سکندر.....؟“

”میں اسے ہمیشہ کے لیے ساتھ نہیں لے جا رہی بے فکر رہو۔“ سکندر کی بجائے لاریب نے بھڑکے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ثانیہ دیک گئی جبکہ سکندر نے ہونٹوں کو باہم جھپٹ لیا تھا۔

”وہ نکاح نامہ کہاں ہے میری حماقت اور ٹھکست کی سب سے بڑی نشانی!“ سکندر کے ساتھ نسبتاً تاریک اور سنسان جگہ پر آ کر ٹھہرتے ہوئے لاریب نے پھٹکارنے کے انداز میں پوچھا تو سکندر اس کی احتیاط پسندی اور مصلحت پر قائل ہو کے کہہ گیا تھا۔



”سکندر تم بولتے کیوں نہیں ہو؟“ اس کی خاموشی نے لاریب کو بھڑکا دیا۔ سکندر نے سرخ مگر جلتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

”جسٹ شٹ اپ سکندر۔ تم یہ سوچو کیا تمہاری اوقات اتنی ہے کہ یہ سوال مجھ سے کر سکو؟“ شدید غصے کی لہر نے اس کا دماغ دھکا دیا۔ سکندر نے دیکھا اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگی تھیں۔

”مجھے اپنی حیثیت اور اوقات بہت اچھی طرح سے ازیر ہے۔“ وہ بھاری لہجے میں بولا تو لاریب گہرے طنز سے ہنس پڑی۔

”اچھا اگر ہاتھی تو تم نے مجھے اس وقت کیوں نہ بتلائی۔ میں تو حواسوں میں نہیں تھی تم نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی۔ ویل.....“

”میں نے آپ کو بتانا چاہا تھا مگر.....“

”مگر کیا ہاں مگر کیا؟ میں مر جاتی تمہارے انکار سے؟ مرنے دیتے یہ ذلت تو نہ سہتی۔“ وہ ایک ایسی پھٹ پڑی۔ سکندر کو اس کے الفاظ سے بڑھ کر اس کے لہجے کی تعجبیک حقارت اور مسخرے اذیت بخشی تھی۔ وہ ہونٹ بچھتے کھڑا مضبوط آزماتا رہا۔

”مجھے وہ پیروز چاہئیں ابھی اور اسی وقت۔“ لاریب اپنے تنفس پر قابو پائے بغیر بولی۔

”وہ میرے پاس نہیں ہیں گھر پر ہیں۔ آپ میرے ساتھ گھر چلیں میں.....“

”تم سچ آتے ہوئے انہیں لے تا میں خود لے لوں گی تم سے۔“ لاریب نے ایک دم لہجہ ڈھیلا کر لیا۔ سکندر کا مسکین قسم کا انداز جھکا ہوا سر گریزاں نگاہیں فرمانبردار قسم کا لہجہ کچھ بھی تو تبدیل نہیں ہوا تھا۔ وہ شاید خوفزدہ ہو گئی تھی مگر خود کو تسلی دے رہی تھی۔

”جی بہتر۔“ سکندر نے اسے تابعداری سے جواب دیا پھر جیسے کچھ جھجکا کر بولا۔

”آپ اکیلی آئی تھیں؟“ لاریب جو واپسی کے ارادے سے پلٹ رہی تھی اس سوال پر چونکی۔

”تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ سوال در سوال شاید سکندر کی بات کا جواب دینا اس

کے نزدیک اہم نہیں تھا۔

”رات بہت ہو گئی ہے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔“ لاریب کے چہرے پر کٹاوت دار مسکراہٹ بکھری۔

”مگر اس کا کیا ہو کہ مجھے تمہاری یہ عارضی رفاقت بھی گوارا نہیں اسی قدر ناقابل برداشت ہو تم میرے لیے۔“ لاریب نے انداز اپنے اندر سرسبز تیز لیل کا پہلو کیے ہوئے تھا۔ سکندر ساکن رہ گیا۔ وہ پلٹ کر دوڑ رہی تھی۔ سکندر واپس لوٹا تو ہزاروں خدشات اس کے سر اڑتے۔

”کیا کام تھا لاریب بی بی کو تم سے؟ کہاں لے گئی تھیں وہ تمہیں؟“ ثانیہ اس کی منتظر تھی۔ اسے سامنے پاتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ سب سوالوں کو نظر انداز کرتا اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ نگاہیں اس جگہ پر ساکن ہو گئیں جہاں اس نے لاریب کو بیٹھے دیکھا تھا۔ بیٹھک کی فضا میں اس کے لمبوس کی ڈھیریب مہک ابھی تک باقی تھی۔ سکندر کی آنکھیں جانے کس احساس کے ہمراہ چل اٹھیں۔

”تو کھانا بھی کھائے گا کہ نہیں سکندر؟“ ثانیہ پھر اس کے سر پر آ چڑھی تھی اس نے شام کو کھانے سے انکار کر دیا تھا کہ عشاء کے بعد کھاؤں گا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے ثانیہ مجھے سونے دو پلیز۔“ وہ بے زاری سے کہتا کروٹ بدل گیا۔ ثانیہ اپنا سامنہ لے کر چلی گئی۔

”کیا کریں گی وہ نکاح نامہ لے کر؟ محض ثبوت ختم کرنا مقصد ہے یا کچھ اور.....“ اگر انہوں نے مجھ سے طلاق کا مطالبہ کر دیا؟“ آخری سوچ ایسا خدشہ ثابت ہوئی جس نے

صرف نیند نہیں اڑائی تھی جسم و جان میں بے چیدیاں بھر کے وحشتوں کے صحرائوں میں لاٹھا۔ وہ ساری رات اس نے سگریٹ پھونکتے اور محن میں ٹھہل کر سرد ہواؤں کا مقابلہ کرتے گزاری۔ صبح وہ اتنا غافل تھا کہ بستر پر گرے ہی خود سے بھی غافل ہو گیا۔ بابا اسے نماز کے لیے جگانے آئے تو اس کا بدن انگارے کی طرح دکھتا محسوس کر کے پریشان ہو گئے اس کی طبیعت نہ سنبھلنے کی صورت میں اطلاع حویلی تک پہنچانا پڑی تھی۔ بابا سائیں خود اس کی خبر گیری کٹائے اور ڈاکٹر کو کئی فون کر کے چیک اپ کرایا۔ ڈاکٹر نے بخار کی وجہ ذہنی اضطراب بتائی تھی۔ دوا علاج کے باوجود اگلے دو دن تک وہ بستر سے نہیں اٹھ سکا تھا۔

”ایسا کیا کہہ گئی ہیں لاریب بی بی تم سے سکندر کے کہ تم بول چاروں شانے چت ہو گئے ہو؟“ ثانیہ کے دل میں یہ بات کسی پھانس کی طرح اٹکی ہوئی تھی۔ سکندر اس بیماری اور نقاہت کے باوجود جھٹک کر رہ گیا۔

”یہ بات تم نے کیسے سوچی؟ آئندہ تمہارے منہ سے نہ سنوں۔“ وہ کسی طرح بھی خود کو اسے ڈانٹنے سے باز نہیں رکھ سکا تھا۔

”پھر تم مجھے بتا دو وہ کیوں آئی تھیں؟“ ثانیہ بھی غصے میں آ گئی۔ سکندر کو مضبوط کرنا محال ہونے لگا۔

”بھئی انہوں نے مجھے کچھ نوٹس فوٹو کاپی کرنے دیئے تھے۔ ان کے انگریزیم ہو رہے ہیں نا ضروری چاہئے تھے تو لینے آ گئیں۔ اس میں اتنا کریدنے والی کیا بات ہے؟“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”وہ شاہزادی ہیں حویلی کی سکندر۔ اڈمیرروں کو کہیں ان کی خدمت کو تمہارا شمار بھی انہی میں ہوتا ہے وہ ایک فون بھی کرتی تو تمہیں جانا پڑتا۔“ ثانیہ کی باتوں نے سکندر کو سن کر کے رکھ دیا۔ اذیت اور جھجھکاؤ کا احساس ایسا تھا کہ اس نے کرب سے گزرتے ہوئے آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ یہ حالات کس ڈگر پر چل پڑے تھے کہ اسے اس کی کم حیثیتی طبعی کی صورت یاد کرانی جانے لگی تھی۔ کیا یہ کوئی سزا ہے؟ کیا واقعی اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا؟ یا لاریب نے تب اس کے لیے فرار کے راستے مسدود کر دیئے تھے۔ قسمت کی اس ستم ظریفی پر اس کا جی چاہا کہ وہ جی بھر کے آنسو بہائے مگر وہ روتا کیسے یہ ممکن نا تھا۔

”تم مجھ پر رشک کر رہی ہو ثانیہ یا لاریب بی بی یہ.....؟ ہم دونوں کی حیثیت اور مقام روز روشن کی طرح تم پر اچھی طرح عیاں ہیں پھر تمہاری اس قسم کی باتوں کا مقصد؟“ سکندر خامی دیر خاموشی کے بعد گویا ہوا تھا۔ ثانیہ کچھ کچھ شرمندہ نظر آنے لگی۔

”سکندر میری بات کا برا مت مان! دیکھ میں نے تجھ پر شک کر رہی ہوں نہ لاریب بی بی پر زمین آسمان کا ملاپ بھی بھلا بھی ممکن ہوا مگر سکندر نے مجھے بہت ڈر لگتا ہے حالات اور قسمت کے پھیر سے..... میں تمہیں کھونٹے سے ڈرتی ہوں تمہیں کیا پتا سکندر کے تم کتنے سوہنترے ہو۔ عباس صاحب کے بعد اس پاس کے علاقوں میں تیرے جیسا گھبرو

اور کوئی جوان نہیں ہے۔ لڑکیاں بالیاں صبح شام تیری رلہ دیکھتی ہیں تو اسی ہنڈ کی تکی آنکھوں کا خواب ہے تو کیا جانے؟“ ثانیہ نے پہلی مرتبہ مکمل کر اس کے سامنے اپنی پسندیدگی ظاہر کی تھی اور خدشات رکھے تھے وہ سمجھتی تھی سکندر پر سب سے زیادہ اس کا حق ہے۔ یہی سوچ کتا آج اس نے سکندر پر اپنی حیثیت واضح کی تھی مگر سکندر تو جیسے سناٹوں کی زد پر آ گیا تھا۔ اس نے ثانیہ کی ساری بات بھی بھلا کہاں سنی تھی وہ تو اسی ایک فقرے میں اٹک گیا تھا۔

”زمین آسمان کا ملاپ بھی بھلا بھی ممکن ہوا ہے؟“ اسے لگا تھا کسی نے اچانک اسے برزخ میں دھکیل دیا ہو۔ ہوتا ہے نہ بھی ایسا بھی ایک ایسی بات جس کی حقیقت بہت اچھی طرح سے ہم برا شکار ہوئی ہے ہم اس سے بخوبی واقف ہوتے ہیں..... مگر اس کے باوجود کسی کے منہ سے سن کر خود کو ریزہ ریزہ ہوتا سمجھنا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم اپنی ذات میں خود سے آنکھیں چرائے ہوتے ہیں بلکہ کہنے والے کو اپنے الفاظ کی سنگینی کا احساس نہیں ہوتا۔ سکندر بھی اسی طرح سمجھ گیا تھا۔ بلاشبہ لاریب اور اس کی حیثیت میں بہت واضح فرق تھا مگر ثانیہ کے الفاظ نے اسے ناقابل برداشت حد تک کرب سے دوچار کر دیا تھا۔ وہ خود وہاں سے جا چکی تھی مگر سکندر اسی کرب اسی اذیت سے نبرہا ہوتا رہا تھا۔

.....

”میں نے آپ سے کہا تھا مام ہاتھ ڈھیلارکھیں۔ کیا کیا تھا آپ نے کس نے اتنا شدید ری ایکشن دیا؟ ذرا سوچیں اگر اسے کچھ ہو جاتا؟“ آج پورے ایک ہفتے بعد یوں نے ان سے بات کی بھی تھی تو کٹھنرے میں کھڑا کر کے۔ وہ اتنا سعادت مند بیٹا ثابت ہوا تھا کہ سریتا دیوی کو کچھ معنوں میں جان کی یاد بھلا دی تھی۔ مگر آج وہ بے حد خفا تھا۔ کیا وہ زندگی سے اتنی محبت کرتا تھا؟ انہوں نے حیران ہو کر سوچا اور شل کی نظروں سے اسے دیکھا۔

”تم بھی مجھے قصور وار سمجھ رہے ہو یو؟“

”بات یہ نہیں ہے مام! پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈی! اگر وہ ایک بات کو پسند نہیں کرتی تو اس کا مطلب ہمیں وہ بات نہیں کرنی چاہیے۔ مام میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں وہ بھی زندگی کے لیے۔ مجھے اس کی خوشی عزیز ہے۔“



”چاہے وہ خوشی تم نہیں کوئی اور ہو؟“ انہوں نے خراب موڈ کے ساتھ استفہار کیا۔ دیو کے چہرے پر ایک سایہ سالہرا کر معدوم ہو گیا۔

”میں نے کہا نام مجھے نندنی کی خوشی عزیز ہے۔“  
”یہ کیسی محبت ہے تمہاری دیو کہ تم اسے مسکرا نہجان آدی کو سوچنے پر آمادہ ہو۔“

”یہ نندنی کی خواہش ہے ماما!“ وہ آہستگی سے بولا لہجہ افسردہ اور ٹوٹا ہوا تھا۔ انہیں اس پر بے تحاشا ترس آیا۔

”ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ میری مثال سامنے ہے۔ جارج نے کتنے دکھائے مجھے اور بلا خرہ۔۔۔۔۔۔“

”نندنی کی قسمت آپ جیسی ہو ضروری نہیں۔“ دیو نے ان کی بات قطع کی۔ وہ ہونٹ بھیچلے دیکھے گئیں۔

”ہمیں کیا پتا وہ کون ہے کیسا ہے؟“

”ہمیں وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔ جو ہوگا بھلا ہوگا۔“

دیو نے رسانیت کا مظاہرہ کیا اس کے بھاری لہجے میں گھبراؤ تھا۔

”دیو تم اسے سر چڑھا رہے ہو۔ تم نے دیکھا وہ مجھ سے زیادہ اس مسلکی ڈاکٹر کو اہمیت دے رہی ہے۔ مجھ سے بات نہیں کرتی، مگر اس سے چمکی رہتی ہے۔“ سریتا دیوی کے لہجے میں نفرت تھی کسی زہریلی ناگن کی سی بھونکار۔

”یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے مام ریٹیکس۔ وہ اسے اپنا دوست سمجھتی ہے۔“

”وہ عورت مسلمان ہے اور مسلمان ہمارے سب سے بڑے دشمن ہیں۔“ سریتا دیوی نے جیسے اسے باور کرایا۔

دیو آہستگی سے مسکرا دیا۔

”مام وہ ایک مسیحی بھی ہے۔ نازک سی عورت ہے۔ بے ضروری آپ کی چینک وہ نندنی کو اس لیے اہمیت دے رہی ہے کہ نندنی مینٹلی اپ سیٹ ہے اور اس کے زیر علاج بھی۔“

”تم بہت سادہ ہو دیو۔ مجھے حیرت ہوتی ہے تم ایک آری آفسر ہو کر بھی ہر کسی کے معاملے میں اتنے سو فٹ اور سینے کیوں ہو؟“ سریتا دیوی اب صحیح معنوں میں جھنجھلا گئی تھیں۔ دیو نے ایک گہرا سانس بھرا۔

”میں ایک انسان بھی ہوں ماما سننے میں ایک دل بھی رکھتا ہوں بلکہ اگر میں کہوں کہ اس آری کی وجہ سے میں ایسا ہو گیا ہوں تو کچھ ایسا غلط نہیں ہوگا۔“ دیو کی غیر معمولی سنجیدگی

اور رسان لہجہ سریتا دیوی کو پہلے حیران پھر پریشان کرنے لگا۔ ”مطلب کیا ہے تمہارا؟“ انہوں نے بے ساختہ نظر میں چرائیں۔ دیو کے ہونٹوں پر زہر خند پھیل گیا۔

”آپ بھی آری آفسر کی مسز ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو جانتی ہیں۔ مام کیا ضروری ہے جوائنٹین ہو اور فوج میں ہو وہ جانور ہی ہو وحشی اور بے حس ہو اگر ایسا ہے بھی تو میں ایسا نہیں ہوں۔ میں نے کشمیر میں اسی لیے اپنی پوسٹنگ رکوالی کہ مجھ سے بربریت ظلم اور سفاکی کے مظاہرے نہیں سرزد ہو سکتے تھے میں اپنے ان سور ماسا تھیوں کا ساتھ دینا تو دور کی بات وہ سب دیکھ کر برداشت بھی نہیں کر سکتا۔“

”لیو ویس دیو پلیز!“ سریتا دیوی نے ناگواریت سے اس کی بات قطع کر دی۔ دیو کے چہرے پر عجیب سی کیفیت پھیل گئی۔

”کیا میرے اس موضوع کو چھوڑ دینے سے حقیقت بدل جائے گی مام! ہمارا نام ظلم و جبر کی لسٹ سے خارج ہو جائے گا؟“ وہ کسی قدر تاسف سے سوال پر سوال کرنے لگا۔

”تم انڈین ہو دیو؟ مجھے تو آج شک ہونے لگا ہے معذرت کے ساتھ۔“ سریتا دیوی نے گویا اسے ملامت کی تھی۔ وہ آہستگی سے ہنس دیا ایسی ہنسی جو دکھ اور تاسف کے احساس سے نم لگتی۔

”کاش میں اپنی ذات کے ساتھ لگایہ حوالہ دے سکتا۔“  
”تو پھر تم آری چھوڑ دو۔“

”اس سے کیا ہوگا؟ حقیقت بدل جائے گی؟“ وہ بے حد تلخ ہوا۔ سریتا دیوی کا دماغ جھٹکنے لگا۔

”دیو تم مجھے پاگل کر دو گے مجھے نہیں پتا تھا تمہارے اندر اتنا زہر بھرا ہوا ہے۔“ انہوں نے قہر بار انداز میں کہا۔ دیو ہونٹ بھیچنے نہیں دیکھتا ہر سانس پر

”پلیز مام! آپ آئندہ بھی مجھے نندنی کو میرے حوالے سے فورس نہیں کریں گی اوکے۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ وہاں سے چلا گیا۔ سریتا دیوی ابھی تک سر جھٹک رہی تھیں۔

سکندر کا بخار تو اتر گیا تھا مگر نقاہت بہت زیادہ تھی آج صبح بھی بابا سائیں اس کی عیادت کوائے تھے اور اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ اس کی جگہ بابا حویلی جاتے تھے آج

اس کی طبیعت بہتر تھی تو لماں بھی بہت دنوں بعد کمر سے نکلیں۔ لنگھا کی بہو کے ہاں شادی کے بیس سال بعد بچے کی پیدائش ہوئی تھی۔ لماں اسے مبارک باد دینے گئی ہوئی تھیں۔

سکندر اپنے لحاف میں دبکا ہوا تھا کچھ غنودگی کی سی کیفیت تھی۔ جب ثانیہ نے اندھا کر اسے پکارا۔ تیسری آواز پر وہ خفیف سا ہنکارا بھر سکا۔

”بابا ہر پڑے میں بڑی چنگی دھوپ لگتی ہے کہو تو وہاں بستر لگا دوں کچھ دیر دھوپ میں لیٹ جاؤ۔“ ثانیہ کی کچھ لاہوری سی بات اس کے پلے پڑ سکی اس نے محض سر کوئی میں جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

”اجھا ٹھیک ہے تیری مرضی! یہ بتا کچھ کھائے گا؟“  
”اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے کیا؟“ اندر داخل ہوتی ایمان نے یہ سوال کیا۔ ثانیہ چونک کر پلٹی اور حسب سابق انہیں دیکھ کر بدحواسی و گھبراہٹ کا شکار ہونے لگی۔

”بی بی صاحب! آپ؟“ ثانیہ یوں جی۔ بی بی نہیں بیٹھیں۔“  
”بوکھلا کر کبھی وہ بستر کی چادر درست کرنے لگی۔ پھر موڑھے اٹھانے کو بھاگی۔ خود سکندر بھی حیران حیران سا اٹھ بیٹھا۔ ایمان اور امامہ کے ساتھ فنا خفا سی چمکی چمکی سی وہ بھی تھی۔ سکندر کا دل دھڑکنیں منتشر کر بیٹھا!

”ہمارے کام بہت بھاری لگے تھے سکندر جو بستر سنبھال کر بیٹھ گئے ہو؟“ ایمان کے چہرے پر بہت نرم سی مسکان تھی۔ سکندر بوکھلا گیا۔

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں بی بی صاحب!“  
”مذاق کر رہی ہوں لگے گھبرا کیوں جاتے ہو؟“ ایمان کی مسکراہٹ ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔ سکندر خفیف سا ہو گیا۔

”بھی مستعد اور الرٹ سی ثانیہ دنوں ہاتھوں میں دو موڑھے اٹھائے اندھا آئی۔“

”بی بی صاحبہ تشریف رکھیے۔“ ایمان تو سکندر کی چار پائی کے ایک کونے پر ہی ٹک گئی تھی۔ امامہ اور لاریب گھڑی تھیں امامہ نے موڑھا قبول کر لیا جبکہ لاریب بیٹھنے کے موڈ میں نہیں لگتی تھی۔ اس کی پریش نگاہیں سکندر کے چہرے کو جھلسا رہی تھیں۔

”آپ نے کیوں زحمت کی بی بی صاحبہ! میں اب ٹھیک تھا خود خدمت میں حاضر ہو جاتا۔“ سکندر تکیہ کمر پر نکلا کراہ

نیم دراز تھا۔ لاریب نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ بڑھی ہوئی شیو اس کے سانولے چہرے کی سیاسی کو بڑھا رہی تھی اسے وہ اور بھی برا لگا عام دنوں سے کہیں بڑھ کر یہ صرف اس کی نفرت تھی ورنہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ بہت ساری لڑکیاں اس کے ڈارک کمپلکشن کی وجہ سے ہی اس پر جان دیتی تھیں۔

”ارے بابا اتنے کاشش مت ہو۔ ہم بھی تمہارے جیسے عام سے انسان ہیں۔“ ایمان نے نرمی کا ہتھیار سے کہا تو لاریب کے اندر کتنی آگ یکلخت بھڑک اٹھی۔

”ملازموں کے ساتھ نرم اور بہتر سلوک کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ملازم خود کو مالک کے مقابل سمجھنے لگیں! اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو غلطی کر رہے ہوتے ہیں۔“ اس کے اندر کی آگ اس کے لہجے سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی برسی تھی۔

سکندر کا چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا جبکہ ایمان نے چونک کر لاریب کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں سرزنش اور فہمائش تھی۔

”بجو پلیز! سکندر کو ایسے مت کہیں۔ اسے بابا سائیں بھی اپنی اولاد کی طرح سمجھتے ہیں اور ہم بھی انہیں بھائی سے کم نہیں درجہ دیتے۔“ امامہ کا انداز سخت احتجاجی تھا۔

”تم چپ رہو۔ بڑوں کی باتوں میں مت بولا کرو بچی ہو ابھی۔“ لاریب نے بعد لہجے امامہ کو جھاڑا اس عزت افزائی پر وہ بھی برائی جگہ امامہ کا منہ بن گیا اس نے شکایتی نظروں سے ایمان کو دیکھا تھا۔

”تم بھی عقل کل نہیں ہو اچھا! آمام سے بیٹھو۔“ اب ایمان کا بولنا ناگزیر تھا۔ لاریب نے سختی سے ہونٹوں کو باہم جھینچ لیا۔ اسے جانے کیوں بہت شدتوں سے رونا آ رہا تھا۔

سکندر اس ساری گفتگو کے بیچ خاموش تماشائی رہا تھا۔ چار نفوس کی موجودگی کے باوجود کمرے کی فضا میں خاموشی کا راج تھا۔ یہ خاموشی اس وقت ٹوٹی جب ثانیہ ٹرے میں پیچی کے گلاس سجائے چلی آئی ساتھ بسکٹ اور نمکونے بھی تھا۔

”اگرے اس تکلف کی بھلا کیا ضرورت تھی ثانیہ! ہم کوئی بہت دور سے تو نہیں آئے۔“ ایمان نے نوکا تو ثانیہ مسکرا دی۔

”ننھی اس پنڈ کے سب سے خاص مہمان بھی تو ہوا آپ ہمارے بیڑے کی تو گویا قسمت جاگ اٹھی۔“ وہ واقعی اتنی ہی متاثر نظر آ رہی تھی ایمان خفیف سی ہو کر مسکرا دی۔

”آپ نے کیوں زحمت کی بی بی صاحبہ! میں اب ٹھیک تھا خود خدمت میں حاضر ہو جاتا۔“ سکندر تکیہ کمر پر نکلا کراہ

”آپ نے کیوں زحمت کی بی بی صاحبہ! میں اب ٹھیک تھا خود خدمت میں حاضر ہو جاتا۔“ سکندر تکیہ کمر پر نکلا کراہ

”آپ نے کیوں زحمت کی بی بی صاحبہ! میں اب ٹھیک تھا خود خدمت میں حاضر ہو جاتا۔“ سکندر تکیہ کمر پر نکلا کراہ

”آپ نے کیوں زحمت کی بی بی صاحبہ! میں اب ٹھیک تھا خود خدمت میں حاضر ہو جاتا۔“ سکندر تکیہ کمر پر نکلا کراہ

”آپ نے کیوں زحمت کی بی بی صاحبہ! میں اب ٹھیک تھا خود خدمت میں حاضر ہو جاتا۔“ سکندر تکیہ کمر پر نکلا کراہ

”آپ نے کیوں زحمت کی بی بی صاحبہ! میں اب ٹھیک تھا خود خدمت میں حاضر ہو جاتا۔“ سکندر تکیہ کمر پر نکلا کراہ

”آپ نے کیوں زحمت کی بی بی صاحبہ! میں اب ٹھیک تھا خود خدمت میں حاضر ہو جاتا۔“ سکندر تکیہ کمر پر نکلا کراہ

”آپ نے کیوں زحمت کی بی بی صاحبہ! میں اب ٹھیک تھا خود خدمت میں حاضر ہو جاتا۔“ سکندر تکیہ کمر پر نکلا کراہ

”آپ نے کیوں زحمت کی بی بی صاحبہ! میں اب ٹھیک تھا خود خدمت میں حاضر ہو جاتا۔“ سکندر تکیہ کمر پر نکلا کراہ



”سکندر دواتو لے رہا تھا وقت پہنچا۔“  
”کہاں جی سنا کہاں ہے میری یہ سکندر۔“  
”کیا مطلب دوا نہیں لیتا؟“ ایمان کو فوری تشویش ہوئی۔ ثانیہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”نہ خوراک پر تو چند روز بھی تو اتنا مارا ہو گیا ہے۔“  
”تمہارے پاس کوئی اور بات نہیں کرنے کو تو خاموش ہو جاؤ۔“ سکندر کو موضوع گفتگو بننا پسند نہیں آیا۔ جیسی ثانیہ کو جھڑکا۔

”ثانیہ تم پہلے سکندر کے کھانے کو کچھ لاؤ۔ پھر دوا لے آنا دیکھتے ہیں کیسے نہیں کھاتا۔“ ایمان کے لہجے میں دھونس ہی نہیں مان و استحقاق بھی تھا۔ جہاں ثانیہ محفوظ ہوئی سکندر بوکھلا اٹھا۔

”ایمان بی بی یہ فضول بولتی ہے آپ فکر نہ کریں میں دوا بھی لیتا ہوں اور.....“

”اب میں تم سے کہوں گی تم جیپ رہو۔“ ایمان نے اسے نرمی سے ٹوکا تو وہ ٹھنڈا سانس کھینچ کر رہ گیا۔

لاریب کو یہ اپنائیت یہ یگانگت کا مظاہرہ ایک آنکھ نہیں بھار پاتا تھا۔ وہ ایمان کے ساتھ اس کی عیادت کھانے پر کسی طور بھی آمادہ نہ تھی مگر سکندر کی جانب سے اس کے مطالبے کی تاخیر اب اس کا ضبط چھلکا گئی تھی۔ جیسی وہ ذرا اس کی طبیعت صاف کرنے کے ارادے سے آئی تھی نہ کہ اس کی عیادت کو مگر یہاں آ کے اس پر انکشاف ہوا تھا اسے اندر کا لاوا نکالنا اتنا آسان نہیں۔ امامہ ایمان اور سکندر کے گھر والوں کی موجودگی میں وہ ہزار چاہنے کے باوجود بھی اپنا مطالبہ اس کے آگے نہیں دہرائی تھی۔ مگر اس کی نگاہ سکندر کے سر ہانے پڑے اس کے سیل فون پر گئی۔ اس کے ذہن میں ایک خیال بہت سرعت سے جاگا۔ اس نے بیگ میں ہاتھ ڈال کر اپنا سیل فون نکال لیا۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے اکیلے میں ابھی اور اسی وقت سمجھنے کیسے یہ تم جانتے ہو گئے لاریب۔“ اس نے ٹیکسٹ لکھ کر سکندر کے ممبر پر سینڈ کر دیا۔ اگلے لمحے بیج ٹون بجی۔ سکندر امامہ اور ایمان کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا یونہی من رہا۔ بیج ٹون پر اس نے فطعی تو جھپٹ دی۔ لاریب جبر بڑھونے لگی۔ اس کا جی چاہا سکندر کا سر پھاڑ دے۔ اس نے ہونٹ بھینچے اور اس کا نمبر ڈال کیا اور مس کال کی بیل کی آواز پر سکندر

چونکا اس نمبر پر اسے سب سے زیادہ فون بابا سائیں ہوا کرتے تھے اس نے سیل اٹھایا اس وقت لاریب نے سیل منقطع کر دیا۔ سکندر نے مس کال چیک کی نمبر انجان تھا۔ لاریب کے نمبر سے وہ آگاہ نہیں تھا۔ اس نے کاندھے اچکائے اور سیل واپس رکھتے رکھتے یونہی بے ارادہ بیج کھول لیا۔ عبارت پر نگاہ پڑتے ہی اس کے اعصاب کو ہزاروں ولٹ کا جھٹکا لگا۔ بالکل غیر شعوری طور پر اس کی نگاہ لاریب کی سمت اٹھی جو اس کی سمت متوجہ تھی۔ اس سے نگاہیں چار ہوتے ہی لاریب نے فی الفور نظر کا زاویہ بدل ڈالا۔ انداز میں غصہ تھا بے زاری تھی۔ سکندر الجھا ہوا تو تھا ہی کم صدمہ بھی ہو گیا۔

”کیا بات ہے سکندر کس کی کال تھی؟“ ایمان کو اس کا یہ انداز بہت محسوس ہوا تھا۔ سکندر ہڑبڑاسا گیا۔

”نہ..... نہیں تو بی بی صاحبہ کچھ نہیں۔“

”اچھا یہ بتاؤ یہ بستر کب چھوڑ رہے ہو؟“ وہ مسکرانے لگی۔ سکندر نے گہرا سانس کھینچا۔

”میں خود آتا گیا ہوں بی بی صاحبہ! اللہ نے چاہا تو کل ضرور حویلی آ جاؤں گا۔“

”ارے نہیں مہل آرام کرو۔ ورنہ پھر سے بیمار پڑ جاؤ گے۔“ ایمان نے ٹوکا بھی ثانیہ بخنی کا پیالہ لیتے گئی اور سکندر کو وہاں سے اٹھنے کا بہانہ مل گیا۔

”میں ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔“

”بیٹھارہ سکندر! میں نہیں پانی لا دیتی ہوں دھو لینا جتہ“ ثانیہ نے اپنی خدمات پیش کیں جنہیں سکندر نے فی الفور رد کر دیا۔

”اب اتنا بھی کمزور نہیں ہو گیا کہ اتنا سا کام کر کے تھک جاؤں۔“ وہ اٹھا اور چپل پہن کر باہر نکل گیا۔ البتہ اٹھتے ہوئے اس نے لاریب پر ایک جھجکتی ہوئی گریز پانظر پھر سے ضرور ڈالی تھی۔ لاریب جس نے ہاتھ میں پکڑے گلاس سے ایک گھونٹ بھی نہیں لیا تھا دانستہ چھلکا دیا اور ہڑبڑانے کی ایک ٹنگ کی۔

”افوہ! وہ دانستہ زور سے جھلائی۔“

”کیا ہوا بی بی صاحبہ! بوتل گر گئی لائیں میں آپ کا دوش دھو دیتی ہوں۔“ امامہ اور ایمان سے سکندر کی باتیں جوش و خروش سے کرتی ثانیہ نے اٹھتے ہوئے کہا تو لاریب نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کر دیا۔

”نہیں میں خود کر لیتی ہوں۔ سکندر باہر ہی ہے نا وہ مجھے ہیلپ کر دے گا مینٹلس۔“ اس کے تھکمانہ لہجے میں اتنی قطعیت تھی کہ ثانیہ کو مزید کچھ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ لاریب اٹھ کر باہر آئی تو محسن کے آخری سرے پر تل کے پاس اسے سکندر نظر آیا۔ کچھ بے خیال سا مگر آنکھوں میں واضح فکر لیے۔

”بی بی صاحبہ آپ نے اس طرح سے کیوں بلایا مجھے؟“ وہ واقعی پریشان تھا۔ اس کی بے چین نگاہیں بار بار بیرونی دروازے اور کمرے کی جانب اٹھتی تھیں۔ لاریب کے توجہ معنوں میں سر پر گئی تھی۔

”شٹ اپ! تم کیا سمجھتے ہو میں تم سے اکیلے میں ملنے کو مری جا رہی ہوں؟ اپنی شکل بھی غور سے آئینے میں دیکھیں ہے تم نے؟“ وہ غصے میں بھڑک اٹھی۔ اس کا چہرہ اس کے اندر دلی جذبات کا عکاس بن گیا تھا۔ جبکہ سکندر اس درجہ توہین پر بھونچکا رہ گیا۔

”کچھ کہا تھا تم سے میں نے بیماری کا ڈرامہ رچا کر کب تک چھپ سکتے ہو مجھ سے ہاں؟“ لاریب بگولہ ہوتی وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر جس قدر بخنی سے کہہ سکتی تھی کہہ گئی تھی۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے بی بی صاحبہ میں.....“

”مجھے تمہاری کوئی فضول وضاحت نہیں چاہئے۔ تم مجھے وہ پیپر دے رہے ہو ابھی اور اسی وقت۔“ بلیو سوٹ میں اکھڑے اکھڑے تاثرات اور بگڑے انداز ورتور لیے پیشانی پر تل ڈالے کھڑی وہ لڑکی اپنے اندر ایسا کیا کرتی تھی کہ اس ساری بدتمیزی حوصلہ شکنی کے باوجود دل کے نزدیک بے حد نزدیک محسوس ہوتی تھی۔ سکندر نے خود کو اس کے سامنے بے حد پس لا جا کر محسوس کیا۔

”اب ایسے کیا حقوں کی طرح مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔ جاتے کیوں نہیں ہو؟“ وہ دے ہوئے لہجے میں بخنی۔ اس کا ضبط گویا جواب دیئے جا رہا تھا۔ بیج معنوں میں اسے سکندر کی نگاہیں ابھن و بے زاری کا شکار کرتی تھیں۔ عجیب دل تھا اس کا کسی سے محبت کی انتہا پر جا کے بھی کسی دوسرے انسان کے احساسات و جذبات سمجھنے سے قاصر۔ سکندر جیسے گہری نیند سے جاگا اور یونہی بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ پلٹ کر ایک کمرے میں جا کھسا!

”ہو گیا تمہارا دوش پہنہ واش؟“ اگلے لمحے ایمان امامہ اور ثانیہ کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی اس کے سوال نے لاریب کو شیشا کر رکھ دیا۔ وہ تو باہر آنے کے بعد گویا بھول ہی گئی تھی۔

”نہیں باہر آئی تو سکندر نہیں تھا۔ ہاں نہیں کہاں چلا گیا۔“

اس نے خود کو سنبھال کر بہت اعتماد سے جھوٹ بولا۔

”کیا مطلب کہاں چلا گیا۔ وہ تو ہینڈ واش کرنے آیا تھا نا؟ اندر اس کا سوپ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ ایمان واقعی الجھ گئی تھی۔ ثانیہ نے تو باقاعدہ پریشان ہو کر سکندر کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ لاریب نے اپنی مخصوص بے نیازی کا مظاہرہ ضروری سمجھا۔ بلکہ اسے ایمان کے اتنی جلدی سب کے ساتھ باہر آ جانے پر تاؤ آیا تھا۔ کیا تھا اگر یہ لوگ کچھ دیر اور رک جائیں۔

”ارے کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ سکندر کو کوئی پری اڑا کر لے گئی ہو؟“ امامہ نے اپنی اتج کے حساب سے بات کی تھی اور لطف لے کر خود ہی ہنس پڑی۔

”اے نقوش اور رنگت کے جن و دیو کی پرستان میں بھی کی تو نہیں ہوگی ڈیر سس!“ لاریب نے دانستہ کہا۔ ثانیہ کا چہرہ تو بالکل اتر گیا۔ ایمان نے پھر اسے تنبیہ نظروں سے گھورا۔

”اب لسی بھی کوئی بات نہیں ہے بھو! یونو ڈارک کمپلکشن میل میں کتنا ان جا رہا ہے۔“ امامہ نے بھرپور تردید کی تھی۔ لاریب کے چہرے پر مسخر پھیل گیا۔

”تمہاری معلومات کی حد تک ایسا ہوگا ورنہ حقیقت اس کے کچھ برعکس ہے۔“

”لایئے بی بی صاحبہ! میں آپ کا دوش دھو دیتی ہوں۔“ ثانیہ نے اندر کمرے سے برآمد ہوتے سکندر کو دیکھ کر جو اطمینان محسوس کیا اس کے بعد اس نے لاریب سے کہا تھا۔ ”نہیں اتنی اہم بات بھی نہیں ہے یہ اب واپس چلتے ہیں چلو لاریب۔“ ایمان کی مداخلت پر لاریب کی جان چل گئی۔ ”اتنی جلدی کیوں ہے آپ کو بھو! ذرا سارک جائیں مجھے اس داغ سے ابھرن ہو رہی ہے۔“ وہ بظاہر غصہ لگی تھی دراصل وہ سکندر سے نکاح نامہ لیے بغیر ہرگز جانے پر آمادہ نہیں تھی جیسی اس نے اپنا دوش پہنہ اتار کر ثانیہ کے حوالے کر دیا۔ ”ذرا جلدی واش کر دو بھو آپ اندر چل کر بیٹھیں نا“



اسے خنک ہونے میں بھی کچھ وقت لگے گا۔“ وہ اب ایمان کے پیچھے بڑی بھی مقصد واضح تھا۔

”نہیں یہیں ٹھیک ہے۔ تم دوپٹہ لو اپنا بس۔“ ایمان کو درحقیقت اس کا یوں بے تکلفی سے دوپٹہ اتار دینا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اس کی نگاہ غیر شعوری طور پر سکندر کی سمت اٹھی تھی۔ جو دانستہ یا نادانستہ لاریب کی سمت متوجہ تھا۔ ہاف سلیو جدید تراش خراش کی شرٹ میں وہ صحیح معنوں میں اپنے زہد شکن سراپا کے ساتھ سکندر کیا کسی کے بھی حواس ضبط کر لینے کی صلاحیت سے ملا مال تھی۔ سکندر کی نگاہ کا یوں بہک جانا کچھ اتنا بھی قابل اعتراض نہیں تھا۔ جبکہ بے حجابی کا مظاہرہ کرنے والی بھی لاریب خود بھی۔ سکندر نے ایمان کی نگاہ کی گری محسوس کر کے اسے دیکھا اور اتنا جھل ہوا اپنی چوری پکڑے جانے پر گویا خود کو زمین میں گڑا محسوس کرنے لگا۔ اس سے وہاں ٹھہرا نہیں گیا تو کچھ نہ سوچنے پر خفت زدہ چہرے سمیت اندر چلا گیا۔

”اب اتنی جلدی کیوں پڑ گئی ہے آپ کو واپسی کی وہ اندر ہے نا آپ کا چہیتا جا کر اس کا دل پشوری کریں۔ کہانا میں دوپٹہ لے کر آئی ہوں۔“ لاریب جو ایمان کی کیفیات سے یکسر بے خبر تھی اور سکندر کے پھر سے منظر سے غائب ہو جانے پر جھنجھلا اٹھی تھی بے حد غلطی سے بولی۔

”تم اپنا دوپٹہ لو ہمارے یہاں کھڑے ہونے پر تمہیں کسی قسم کا اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“

”مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا بھلا؟“ لاریب کو ایمان کی خفگی کا اندازہ ہوا تو وہ جھلی پڑی۔ اگلے چند لمحوں میں ثانیہ نے لاریب کا دوپٹہ اس کے حوالے کر دیا تو گویا آخری آس بھی جالی رہی۔ لاریب نے دروازے سے نکلنے سے قبل دانت پیسے تھے اور ایک زور دار ٹھوکر چوکھٹ کو ماری۔ اب آنے والے وقت میں وہ سکندر کی کیسے درگت بنانے والی تھی یہ تو وقت دیکھتا۔



خبر رسید اشب کنگار خواہی آدم  
سرمں فدائے راسے کہ سوار خواہی آدم  
بہ کم رسیدہ جانم تو بیا کد نہ نام  
پس اڑاں کہ من غام بہ چکار خواہی آدم  
یار من بیا یار من بیا یار من بیا

ترجمہ:- مژدہ سنا ہے کہ آج رات تو آئے گا۔ میرا ہر ان راہوں پر قریان ہو جس سے تیری سواری گزرے گی۔ میری جان کیوں پر آگئی ہے تو آ کر میں زندہ ہو جاؤں۔ میرے مرنے کے بعد یا تو تیرا آنا کس کام کا۔ میرے بیا آ جا تو آ جا میرے بیا تو آ جا!

نندی نے آہستگی سے کتاب بند کی۔ مزید پڑھنے کی اس میں تاب نہ تھی۔ اس کی نگاہ آنسوؤں کی زیادتی سے دھندلا گئی تو دل جیسے درد کا رستا ہوا چھوڑا بن گیا تھا۔ اسے پانا تو درکنار اس سے بھی دیکھ بھی سکوں گی؟ اس نے خود سے سوال کیا اور نگاہوں میں مایوسی کے اندھیرے اتر آئے۔ کتنی بے رنگ ہو گئی تھی اس کی زندگی اس ایک بے ارادہ اٹھی ہوئی نگاہ کے نتیجے میں۔ یہ کیسا ظلم انجانے میں وہ خود اپنے اوپر کر رہی تھی۔ محبت کی بے بسی اس کے وجود میں کر لانے لگی تار سالی کا ہو کتا ہوا احساس روح میں ٹھکن بھر گیا۔

کیا کروں گی میں؟ کیسے گزرے گی زندگی؟ پھر یہ موت یہ بھی تو مجھے قبول کرنے کو تیار نہیں۔ دوسرے منہ موڑنا چاہا اس سے مگر..... نف کیا کروں میں۔ وہ اتنی وحشت زدہ ہوئی کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے بال نوچ لیے۔ قریب تھا کہ اپنی جنون میں کوئی اور لٹی سیدھی حرکت کرنی کمرے کی وحشت انگیز خاموش فضا میں اس کے سیل کی ہپ بجتی چلی گئی۔ اس نے ہر اس بھری بگناہ کی نظروں سے اپنے دانے جانب پڑے سیل فون کی اسکرین کو گھورا۔ زینب خان کا لنگ کے الفاظ نگاہ کے رستے دل و دماغ پر جادو کے انداز میں اثر پڑ رہے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھ لیا اور فون اٹھا کر کال پیک کی۔

”ہیلو!“

”السلام علیکم!“

”سوری مجھے نہیں پتا اس کے جواب میں کیا کہتے ہیں؟“ اس کی بھرائی ہوئی آواز میں خفت نمایاں تھی۔ دوسری جانب لائن پر موجود زینب مسکرا دی۔

”اس کا جواب وعلیکم السلام ہے۔ یعنی تم پر بھی سلامتی ہو۔ یہ بتائیے کیسی ہیں آپ؟“ نندی گریواں۔ ”زینب خان نے اصل موضوع کی سمت آتے ہوئے اس کی خیریت دریافت کی۔

”آپ کی کال آنے سے قبل بہت اب سیٹ تھی۔ بس پاگل ہونے کو بھی سمجھ لیں۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا تو

زینب پریشان ہو اٹھی۔

”ایسا کچھ مت سوچا کریں نندی جو آپ کو اپ سیٹ کرتا ہے۔“

”میرے پاس اچھا سوچنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے میری بد نصیبی کہہ لیں۔“ وہ پھر سے اسی مایوسی کے دائرے میں قید ہونے لگی۔

”آپ کو میرا مشورہ ہے نندی کہیں مصروف ہو جائیں۔ کیا آپ پڑھتی ہیں؟“

”میں نے کالج پچھلے سال چھوڑ دیا ہے۔ میرا پڑھائی میں دل نہیں لگتا۔“ اس کا لہجہ پھر سے بھینکنے لگا۔ دوسری سمت چند لمحوں کو خاموشی چھا گئی۔

”آپ نے بتایا تھا آپ کے فادر پو کے میں ہوتے ہیں اور غالباً بھائی بھی آپ ماحول کی تبدیلی کی غرض سے وہاں کیوں نہیں چلی جاتیں؟“ نندی نے خود کو ایک کرب و اذیت کا شکار ہوتے محسوس کیا۔

(جہاں بھی چلی جاؤں میری بد نصیبی میرے ساتھ رہتی ہے۔ میں اسے نہیں پاسکتی شاید)

”خاموش کیوں ہیں نندی؟ آپ کو میرا مشورہ پسند نہیں آیا؟“ ڈاکٹر زینب نے بیکار تو وہ آہستگی سے ہنس دی۔

”مجھے لگ رہا ہے ڈاکٹر زینب میں نے آپ کو کچھ زیادہ ہی تنگ کر دیا۔ کہیں آپ مجھ سے پیچھا تو نہیں چھڑانا چاہتیں۔“ وہ یقیناً خود ترسی کا شکار ہونے لگی تھی۔ دوسری جانب ڈاکٹر زینب ایک دم بے حد سنجیدہ ہو گئی تھیں۔

”ایک بات بتاؤں آپ کو نندی گریواں! آپ کے ساتھ میری جو انوائمنٹ ہوئی ہے میں اس کے باعث شعوری یا لا شعوری طور پر آپ کا تذکرہ اپنے ہر بینڈ عثمان سے کرتے لگی ہوں۔ مگر پتا ہے کل انہوں نے مجھے ٹوک دیا۔ کہنے لگے مجھے آپ سے پیچھے ہٹ جانا چاہیے۔ میں ہمدردی یا محبت میں بھی اگر آپ کی جانب بڑھ رہی ہوں تب بھی ہمارے درمیان موجود مذہب کا فرق اس محبت کو بھی آگے نہیں بڑھنے دے گا۔ انہوں نے مجھے سمجھایا یہ اٹھایا ہے اور بھلے تمہیں برا لگے نندی مگر میں سچ کہوں گی درحقیقت یہاں کے لوگ بہت متعصب ہیں۔ یہ مسلمانوں کے خلوص محبت اور دیانت کو پانے کے باوجود نہ تو ان پر اعتبار کرتے ہیں بلکہ موقع ملنے پر ڈسنے سے بھی باز نہیں آتے۔ ۱۹۲۷ء

کے تقسیم ہند کے واقعات گواہ ہیں مگر میں نے جو بیا نہیں کہا نندی لکھی نہیں لگتی اور ویسے بھی میں بہر حال تمہیں اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کر رہی ہمارا تعلق انسانیت کے تانے استوار ہوا ہے۔ تم میری پیشکش رہی ہو۔ تمہاری خبر گیری گویا میرا فرض ہے۔“ اتنی لگی پٹی رکھے بغیر ایسی صاف گوئی سے بات چیت کرنا زینب کی عادت ٹھہری ہوئی مگر نندی کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ اسے ایک لمحے کے لیے اپنے مذہب اپنے حوالے پر ندامت محسوس ہوئی تھی۔ اگر وہ اس روز مام اور دیو کی گفتگو نہ سن چکی ہوتی تو وہ یقیناً اب تک زینب کے خیالات جان کر اس سے بدگمان ضرور ہو جاتی۔

”سوری نندی تم نے شاید میری بات کا برا مانا مگر.....“

”ہر گز نہیں بلکہ مجھے اچھا لگا کہ آپ نے میری حیثیت میرے مقام سے خائف ہو کر اپنے جذبات مجھ سے نہیں چھپائے۔ اس سے بھی زیادہ مجھے یہ جان کر اچھا لگا کہ آپ کو میری پروا ہے۔ ٹھیکس اے لاٹ! ویسے ڈاکٹر زینب اگر میں ایک بات کہوں تو آپ برا تو نہیں مانو گی؟“ نندی نے کسی قدر گریزاں انداز میں سوال کیا۔

”ارے کیسی باتیں کرتی ہو نندی! پلیز پوچھو کیا بات ہے؟“

”میں آپ سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔ اچھی آپ مجھے اچھی لگی ہو۔ پتا نہیں کیوں آپ سے بات کر کے میں ریلیکس ہو جاتی ہوں۔ ایسا سکون جو مجھ سے مجھ سے روٹھ گیا ہے۔ میں بھی کبھانا آپ سے بات کر لیا کروں؟“

”کم آن نندی“ کیوں نہیں تم جب چاہو مجھے کال کر سکتی ہو۔ بلکہ میں جب فری ہوا کروں گی تم سے بات کر لیا کروں گی۔“

”ٹھیکس..... ٹھیکس اکیں۔“ نندی بے اختیار ممنون ہوئی۔ جانے کیوں اسے لگا جیسے دونوں جہان کی دولت مل گئی ہو۔



”السلام علیکم!“ وہ اسے پوری یونورٹی میں جب ڈھونڈ کر تھک گئی تب وہ اسے بالکل الگ تھلگ گوشے میں نظر آ گیا۔ دونوں بازو دوسرے کے نیچے رکھے آنکھیں موندے گویا دھوپ سینک رہا تھا۔ اس کے سلام کے جواب میں خاموشی اور بے نیازی تھی۔ ایمان خائف سی ہونے لگی کہ یقیناً اس کی



نکلی کو سہنا آسان نہیں تھا۔  
 ”شرجیل پلیر جواب تو دیتے ہیں نا؟“ وہ اس کے برابر  
 کھٹنے فیک کر بیٹھ گئی۔ انداز احتجاجی نہیں ملتجیانہ تھا۔ شرجیل  
 نے آنکھوں سے بازو ہٹایا۔  
 ”میں آپ کو جانتا ہوں۔ یا پھر مجھے یہ پوچھنا چاہیے  
 آپ مجھے جانتی ہیں؟“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ایمان کی جان پر  
 بن آئی۔  
 ”آئی ایم ساری میں جب بتاؤں گی میرے ساتھ اس  
 دوران کیا ہوتا رہا ہے تو.....؟“  
 ”یہ سب تو تب ہوگا جب میں کچھ سنوں گا۔ مجھے آپ  
 سے کچھ نہیں سننا س.....!“  
 ”شرجیل.....!“ وہ اتنی بے بس ہوئی کہ آنکھیں  
 آنسوؤں سے چھلک گئیں اس بے بسی کے مظاہرے پر۔ وہ  
 جانتی تھی اس دوران اپنی پریشانیوں میں گھر کردہ اسے بری  
 طرح سے نظر انداز کر چکی ہے مگر وہ کچھ سننے پر آمادہ ہوتا تب  
 صفائی بھی پیش کرتی، شرجیل ایک جھٹکے سے اٹھا اور اپنی  
 کتابیں اٹھا کر قدم بڑھائے تھے جب ایمان نے پہلی مرتبہ  
 یہ جسارت کی اور اپنے نازک ہاتھوں سے اس کا ہاتھ مضبوطی  
 سے پکڑ لیا۔ شرجیل نے تھملا کر اسے گھورتا جاہل مگر ان نظروں  
 میں اتنی بے بسی اور لجاجت تھی کہ وہ دل کو پھٹل کر موم ہونے  
 سے نہیں روک پایا۔  
 ”آئی ایم ساری شرجیل قسم لے لے لے آئندہ جوابیا کروں؟“  
 ایمان نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اپنے کان پکڑ لیے۔ شرجیل  
 ہونٹ بیچنے لگا۔  
 ”تمہیں اندازہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اتنے دن کی تمہاری  
 لاعلمی و بے بسی نے مجھ پر کیسی قیامت ڈھائی ہوگی۔“  
 ”اکیس سوری۔“ ایمان نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں  
 رگڑ کر صاف کیں پھر پکڑے جھاز کر اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”جیسے ہی حالات ٹھیک ہوئے مجھے سب سے پہلے تمہارا  
 خیال آیا..... نہیں بلکہ اس بیچ کے عرصے میں بھی تمہاری وجہ  
 سے پریشان ہوئی رہی۔“ شرجیل کی شاکی نظروں پر گڑبڑا کر  
 اس نے خود ہی اپنے فقرے کی تصحیح کی مگر زبان پھسل چکی تھی۔  
 ”تو آگے گھٹن سج وہی ہوتا ہے جس میں بے ساختگی پائی  
 جائے۔“ اس نے پھر منہ پھلا لیا۔ ایمان نے سہم کر اسے  
 دیکھا تو شرجیل اس کے خوف کو محسوس کر کے ہنسا۔

”تم مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہو ایمان؟“  
 ”آپ سے نہیں آپ کی ناراضگی سے۔“  
 ”وہی..... وہی..... کیوں ڈرتی ہو؟“  
 ”شرجیل یہ جو بدگمانی اور ناراضگی ہوتی ہے جس  
 محبت کی بہت بڑی دشمن ہے۔ میں محبت کو کھونے سے  
 خائف ہوں۔“  
 ”فلسفی کب سے ہو گئیں تم؟“ شرجیل نے چھیڑا تو وہ  
 ہنسنے لگی اور قدموں کا رخ کینٹین کی طرف موڑ لیا۔  
 ”بھوک لگی ہے؟“  
 ”میں ناشتہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔“  
 ”ہوا کیا تھا ایمان؟“ شرجیل کو خیال آیا تو سوالیہ نگاہیں  
 اس پر جمادیں۔ ایمان ایک ایسی سنجیدہ ہو گئی اور آہستگی سے  
 اسے بتانے لگی۔  
 ”یہ تو واقعی برا ہوا کیا تمہارا کزن آئی میں عباس لاریب  
 کو پسند نہیں کرتا تھا؟“  
 ”یہ بات نہیں ہے شرجیل عباس اگر ہمارے خاندان کا  
 سب سے بیٹ اور خوب صورت لڑکا تھا تو لاریب بھی  
 خاندان کی تمام لڑکیوں میں حسین اور پیاری ہے بس قدرت  
 کو شاید یہ ملن منظور نہیں تھا۔“  
 ”اتنی شاندار ہیں سالی صاحبہ تو پھر ہمیں بھی ملنے کا  
 اشتیاق ہو گیا ہے۔ بتائیے کب تشریف لائیں ہم؟“ شرجیل  
 نے بہت خوب صورتی سے بات کا رخ اپنی جانب موڑ لیا۔  
 ایمان کے حلق میں برگر چھنسنے لگا۔  
 ”شرجیل ابھی حالات.....“  
 ”میں مزید انتظار نہیں کر سکتا ایمان! مجھے اس تذبذب کی  
 کیفیت سے نکال دو اگر تمہیں میرے ساتھ چلنا پسند نہیں تو  
 ٹھیک ہے تم بہت آسانی سے وقاص کے سنگ رخصت  
 ہو سکتی ہو۔“ ایمان کی تو آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ عجیب انداز تھا  
 شرجیل کا تنفر سے بھر پور لہجہ مار قسم کا۔  
 ”اب ایسے کیا دیکھ رہی ہو میں نے کچھ غلط کہہ دیا کیا؟“  
 شرجیل کو مزید غصے نے لگا۔ ایمان نے پیپی کاٹن اور برگر  
 واپس ٹیبل پر رکھ دیئے۔ آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں وہ  
 مسلسل ہونٹ کاٹ رہی تھی۔  
 ”شاید مجھ میں وہ اہلیٹی نہیں ہے کہ میں تمہیں خوش رکھ  
 پاؤں۔“ وہ کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہمیں اپنے راستے الگ کر لینے چاہئیں۔“  
 ”شرجیل! مت دو مجھے اپنی محبت کی اتنی کڑی سزا۔  
 مجھے ایک بار ہی مار ڈالو۔“ وہ اپنے وجود کی پوری قوت  
 صرف کر کے چلائی۔  
 ”دھیرے..... تم خود میرے ساتھ کیا کر رہی ہو  
 تمہیں اندازہ ہے؟“ وہ غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں  
 سرخ بڑنے لگا۔  
 ”کیا..... کیا ہے؟ لو کے فائن آپ میرے گھر آنا  
 چاہتے ہیں ٹھیک سے آجائے۔“ ایمان نے جیسے ایک دم ہر  
 مملکت سے نگاہ چرائی۔  
 ”اور اگر تمہارے گھر والے نہ مانے تو.....؟“  
 ”یہ آپ کا نصیب ہے۔“  
 ”تمہیں میرے ساتھ بھاگنا ہوگا۔“ شرجیل نے اپنا  
 مطالبہ دہرایا۔ اس کے آگے اس کی کمییر چپ ہی نہیں  
 خدشات میں لپٹا دھندلا سا مستقبل کا خاکہ تجا جس میں اس  
 نے جب بھی جھانکنا چاہا وہ بہت جلد تھک گئی تھی۔  
 کچھ رات کی آنکھیں بھکی تھیں اور چاند بھی روٹھا روٹھا تھا  
 کچھ یادیں اس کی باقی تھیں اور چاند بھی روٹھا روٹھا تھا  
 کس موڑ پر پھٹا یاد نہیں ہونٹوں پر کوئی فریاد نہیں  
 اس وعدے کی بھی خبر نہیں وہ سچا تھا یا جھوٹا تھا  
 ہر لمحہ آہیں بھرتے ہیں نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں  
 بس ایک دعا یہ کرتے ہیں وہ لوٹ کے واپس آ جائے  
 گئی دیر تک وہ کھڑکی میں کھڑی اپنے سفر کی منازل  
 طے کرتے چاند کو اس خیال سے کتنی رہی کہ وہ بھی کہیں نہ  
 کہیں شاید چاند کو دیکھتا ہو۔ مگر وہ بھلا اتنا فارغ تھوڑی  
 تھا نہ ہی اسے بھر لاحق تھا یہ تو بھر..... والوں کا مشغلہ ہوا  
 کرتا ہے۔ اس سوچ نے اس کے ہونٹوں پر زخمی  
 مسکراہٹ بکھیر دی۔  
 ”لاریب تم سوچی نہیں ابھی تک؟“ ایمان اپنے  
 دھیان میں اندر آئی تھی۔ اسے درتچے کے ساتھ لگے  
 کھڑے دیکھا تو چونکی۔  
 ”آپ کا ویٹ کر رہی تھی۔“ اس کے جواب نے ایمان کو  
 خائف کر دیا۔  
 ”چلو آؤ شاباش سو جاؤ رات بہت ہو گئی ہے۔“ وہ آگے

بڑھ کر امامہ پر کھل صحیح کرنے لگی۔ یہ اس کی خواہش تھی کہ وہ  
 تینوں ایک ساتھ ایک بیڈ پر سو رہی تھیں بلکہ لاریب نے تو  
 احتجاج بھی کیا تھا۔  
 ”اتنی محبت کو رہنمائی باجوئے کسی کے ساتھ سونے کی  
 عادت نہیں ہے۔“  
 ”اپنی عادتیں بدل لوڑکی کل کو تمہاری شادی بھی ہوئی ہے۔  
 پھر کیا شوہر کو کمرے سے نکال دو گی؟“ ایمان نے بات کو  
 مذاق کا رخ دیا مگر یہ ایک مذاق لاریب کے زخم پھیر گیا تھا۔  
 کیا کیا کچھ یاد نہ آیا تھا اپنی حماقت احقانہ ضد اور سب سے  
 بڑھ کر سکندر۔ اس کا دل ایک دم گھبرانے لگا۔ سکندر کے تو  
 تصور سے ہی اس کا دل متلانے لگتا۔ لکسی ہی نفرت محسوس  
 کرنے لگی تھی وہ اس سے۔  
 ”کہاں کھو جاتی ہو لاریب بار بار! بھول جاؤ سب کچھ  
 میری جان!“ ایمان نے اسے کم مہم دیکھا تو پیار سے سمجھایا۔  
 لاریب نے ٹھنڈا سا اس کہینچا۔  
 ”کچھ نہیں بھول سکتی کچھ بھی..... خیر دفع کریں آپ یہ  
 بتائیں آج جو مہمان آپ کا پروپوزل لائے تھے یہ کون  
 تھے؟“ لاریب نے ایک ایسی بات کو بدلا تھا ایمان کچھ جزیر نظر  
 آنے لگی۔  
 ”میرے یونیورسٹی فیلو ہیں شرجیل علوی!“ وہ نظر چرا کر  
 بولی۔ لاریب نے دھچکی سے اسے دیکھا۔  
 ”پھر تو آپ شرجیل صاحب کو جانتی ہوں گی۔ کیسے  
 ہیں وہ؟“  
 ”اچھے ہیں۔“  
 ”صرف اچھے؟ وقاص سے تو بہت اچھے ہوں گے۔  
 آپ سے محبت کرتے ہیں؟“ اس کے لہجے میں اشتیاق کے  
 ساتھ شوخی کا عنصر بھی نمایاں تھا۔ ایمان گڑبڑا گئی۔  
 ”ہاں نہیں وہ کرتے ہوں گے۔“  
 ”خیر اب نہیں نہیں۔ ابویں وہ گھر تک تو نہیں پہنچ  
 گئے۔“ لاریب نے اسے چھیڑا تھا۔ ایمان نے ہونٹ بیچ  
 لیے۔ پھر کچھ توقف سے بو جھل آواز میں بولی۔  
 ”قابل ذکر بات یہ نہیں ہے لاریب کہ وہ مجھے کتنا پسند  
 کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ انہیں انکار کر دیا گیا ہے  
 صاف نکال۔“ لاریب سنائے میں آ گئی۔  
 ”کیوں بچو.....؟“



”میں آل ریڈی انکبذ ہوں نا۔“ وہ دکھ اور ناکامی کے احساس سے چور ہو کر کہی۔ لاریب کا صدمہ گہرا ہو گیا۔  
”وقاص اس قابل نہیں ہے بجو کساپ کو ڈیزر کرے آپ انکار کر دیں پلیز۔“

”پتا نہیں مجھے کیا کرنا ہے؟“ ایمان طول ہوئی۔ اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ اس کے بعد دانستہ یا نادانستہ اس نے لاریب سے کوئی بات نہیں کی۔ لاریب کا دکھ جیسے اس احساس نے گہرا کر دیا تھا اس کی نیند بھی قدرے بے چین رہی تھی۔ اگلی صبح وہ کانچ جانے کو تیار ہو رہی تھی جب امام نے اسے مخاطب کیا۔

”مجھے نہیں جانا بجو میری طبیعت کچھ اپ سیٹ ہے۔ آپ بھی مت جاؤ۔“ لاریب نے کچھ چونک کر اسے دیکھا پھر شانے اچکا دیئے۔  
”میں تمہاری وجہ سے چھٹی نہیں کر سکتی۔ ویسے تمہیں کیا ہوا ہے؟“

”شپر پچر ہے۔“ امام کے جواب پر وہ سر ہلاتی باہر آ گئی۔ اس کا ذہن ایک دم بیدار ہو گیا تھا۔ آج وہ ہر قیمت پر سکندر سے دور وہاں تک کہنے کو تیار تھی۔  
”سکھاں سکندر سے کہو گاڑی نکالے میں دس منٹ میں آ رہی ہوں۔“

”میں اور امام تو نہیں جارہے تم بھی مت جاؤ لاریب۔“ ایمان کچن سے نکلی۔ لاریب نے منہ نہ لایا۔  
”باجو میرے ایگزیم سر پر ہیں۔ سوری چھٹی نہیں کر سکتی۔“

”اوکے فائن۔“ ایمان نے کانٹھے اچکا دیئے۔ لاریب نے ناشتے کا گویا تاثر دیا تھا محض چند نوالے لے کر اٹھ گئی۔ چادر اور بیگ سنبھالے اور پورٹیکو میں آ گئی تو سکندر گویا اسی کا منتظر تھا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھ کر کھٹاک سے دروازہ بند کیا۔

”اب چلتے کیوں نہیں ہو؟“ سکندر کو اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے ساکن بیٹھ کر کہہ رہا تھا۔

”وہ بی بی صاحبہ امام بی بی؟“  
”وہ نہیں جارہی ہے تم چلو۔“ لاریب نے ناگواری سے جواب دیا۔

”گاڑی روکو!“ حویلی سے چند فرلانگ کا فاصلہ طے

### سیدہ مدحت آصف

اسلام علیکم! جی تو میرا نام مدحت آصف ہے۔ مئی کے مہینے میں پاکستان کے شہر کراچی میں تشریف لائی، ہم تین بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ سب سے بڑے بھائی کا نام طلحہ ان کے بعد بہن نمرہ ان کے بعد اسامہ پھر مابدولت اور آخر میں چھوٹا بھائی حبیب ہے۔ امی اور ابو ماشاء اللہ سے دونوں حیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ ہمیشہ ہم پر سلامت رکھے جی تو جناب آپ آئے ہیں ہماری پسند ناپسند پر جہاں تک کھانے کی بات ہے تو مجھے چاولوں کی ہر ڈش اس کے علاوہ چکن کاسائن وغیرہ پسند ہے۔ پسندیدہ کلرز میں ہر اور سفید رنگ پسند ہے۔ خوشبو مجھے سوتھے اور مٹی کی پسند ہے۔ کپڑوں میں مجھے ساڑھی اور فراک پسند ہے جب کہ جیپری میں مجھے چوڑیاں پسند ہیں۔ سگرز میں عاطف اور راحت فتح علی خان پسند ہیں۔ اداکاروں میں خاں اور اداکارہ کل علی پسند ہیں۔ رائٹرز میں عمیرہ احمد نازیہ کنول نازیہ نمرہ احمد فرحت اشتیاق آمنہ مفتی اور عشاء کوثر سردار پسند ہیں۔ ناٹلز میں ”قراقرم کا تاج محل“ نیلی راجپوتانے کی ملکہ سفال گزیر کال مصحف امزیل ہم سفر وغیرہ پسند ہیں۔ خامیاں بہت سی ہیں غصہ کی تیز منہ پھٹ ہوں اور دوسروں کی باتوں میں آ جلی ہوں۔ خوبیاں اب اپنے منہ سے اپنی کیا تعریف کروں۔ اس کے ساتھ ہی اب اجازت دیں بہت وقت لے لیا آپ کا آپ سب مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا اللہ حافظ۔

### مہوش کون

اسلام علیکم! آج کل کے تمام رائٹرز کو میرا سلام میرا نام مہوش ہے میں 22 اکتوبر کو اس دنیا میں آئی میں نے بی اے کیا ہوا ہے آج کل میں نے 2002ء میں پڑھنا شروع کیا۔ میں نے ستمبر کے شمارہ میں شمارہ کا تعارف پڑھا شمارہ جی! مجھے آپ کا نام بہت پسند آیا۔ رائٹرز میں سیرا شریف طور کا سلسلے وار ناول ”یہ چاہتیں یہ شدتیں“ پسند ہے۔ اس کے علاوہ راحت وفا کا ”جانب جاں تو جو کہے“ اور نازیہ کنول نازی کا ”پتھروں کی پلکوں پر“ بہت پسند ہے۔ کتنوں ناول بہت اچھے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی رائٹرز بھی اچھا لگتی ہیں میرے علاوہ میرے گھر میں سب ہی آج کل پڑھتے ہیں۔ میری زیادہ فریڈ ز نہیں ہیں آج کل سے ہی دوستی ہے کوکنگ کا شوق ہے جو میں کرتی بھی ہوں اور سب کو پسند بھی بہت آتی ہے۔ باقی آج کل سے وابستہ بہنوں کے سارے تعارف پڑھتی ہوں اللہ تعالیٰ سب کو خوش رکھے اور آج کل ہمیشہ ترقی کی راہوں پر گامزن رہے اسی کے ساتھ اللہ حافظ۔

ہونے پر وہ تحکم سے بولی تو سکندر کا پیر بے ساختہ بے یک پر جا پڑا۔

”میرا کام کیا؟“ وہ اسے تکیے چوتھوں سے گھور کر بولی۔  
”ک..... کون سا بی بی صاحبہ؟“

”شٹ اپ سکندر میں اس بدتمیزی پر تمہارا سر بھاڑ سکتی ہوں۔“ وہ آگ بگولہ ہونے لگی۔ انداز بے حد سفاکی لیے ہوئے تھا۔ سکندر نے اس کی کوہداشت کیا۔

”نکاح نامہ لائے ہو؟“ وہ بگڑ کر بولی۔ لہجہ بے حد درشت اور لہانت آمیز تھا۔ سکندر نے جواب میں کچھ کہے بغیر بغلی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نکاح نامہ نکال کر خاموشی سے اس کی جانب بڑھا دیا۔ لاریب نے جھپٹا اور سلکتی آج دی جی نکا ہوں سے کچھ دیر تک اسے گھورا پھر سکندر کو دیکھ کر اسی متنفر انداز میں بولی۔

”لائسنز تو ہوگا تمہارے پاس؟“ سکندر نے ایک بار پھر حکم کی تعمیل کی۔ ”چند دن قبل میں نے ایک غلطی کی تھی اور تم نے ایک خواب دیکھا تھا۔ غلطی اگر بھی ایک ہو اور خواب بھی تو اسے بھول جانا بہتر ہوتا ہے۔ میں تو بھول گئی ہوں تم بھی بھول جانا۔ یہ ثبوت تھا نا اس کا اب نہیں رہا۔“ لاریب نے لائسنز جلایا اور نکاح نامے کو اس کی لو کے نیچے کر دیا حاسد لونے لحوں میں سکندر کے خواب کا سارا سنہرا پن جاٹ ڈالا۔ وہ ششدا آنکھیں پھاڑے جیسے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔



چلو کچھ پرہشتے ہیں محبت پر عنایت پر کسے بنیاد باتیں ہیں سبھی رشتے سبھی ناتے ضرورت کی ہیں ایجادیں کہیں کوئی نہیں مرتا کسی واسطے جاناں

کہ سب سے پھر لفظوں کا ہے سارا کھیل حرفوں کا نہ ہے محبوب کوئی بھی سبھی جملے سے لگتے ہیں جسے ہم زیست کہتے تھے کہ لینا سانس بن جس کے ہمیں اک جرم لگتا تھا کہ سنگ جس کے ہر اک لمحہ خوش و غم لگتا تھا جسے ہم زندگی کہتے جسے ہم شاعری کہتے غزل کا قافیہ تھا جو لہزم کا جو عنوان تھا وہ لہجہ جب بدلتا تھا جو سایہ بن کے ہوتا تھا جد اب اس کے دستے ہیں

چلو کچھ پرہشتے ہیں محبت پر عنایت پر اس نے لہزم ٹائپ کی اور ایمان کے نمبر پر سینڈ کر دی۔ وہ نظریں اسکرین پر جمائے ایمان کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ گو کہ اسے توقع تھی اس انکار کی۔ بڑی منت سماعت کے بعد بیچے گئے پاپا ماما اور تاؤ جی منہ لٹکائے بلکہ غصے میں بھڑکے ہوئے واپس آئے تو تاؤ جی کے ولولے نے ایک حشر اٹھا دیا تھا۔ پاپا نے بھی تھوڑی بہت ان کی ہاں میں ہاں ملائی مگر ماما کا غصہ تو کچھ ایسا گھمبیر قسم کا تھا کہ شرجیل پر ایک سنگین و شاکی نگاہ ڈال کر اسے کمرے میں چلی آئی تھیں اور حال ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ یہ معرکہ شرجیل نے کس طرح سے سر کیا تھا یہ ایک بکسرا لگ داستان تھی۔ اس کے منہ سے من پسند لڑکی سے شادی کی بات سن کر ہی گھر میں بھونچال اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”دیکھیں ذرا صاحب یہ دن بھی ہمیں دیکھنے تھے۔ گھر میں موجود جوان بچیوں کو چھوڑ کر یہ باہر آنکھ منکا کر س گے باہر شادیاں کریں گے۔“ سب سے زیادہ ہوا اس بات کو بتائی ماما نے دی تھی۔ وہ تو اسے تین سالہ کے لیے شرجیل کو منتخب کر چکی تھیں۔ شرجیل کی ہنسی نکل گئی تھی انہوں نے اعتراض ہی ایسا اٹھایا تھا۔

”یار بھائی تائی ماں سے پوچھو گھر کی لڑکیوں سے آنکھ منکا کرنے کی اجازت ہے؟“ سب سے زیادہ باجیس نیل کی کھلیں تھیں۔ فراز کے کان میں مسم کر بولا۔ فراز نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھونے پر اکتفا کیا تھا۔

اعتراضات کی بوچھاڑ ہر سمت سے ہوئی تھی مگر شرجیل کے گھر چھوڑ جانے کی دھمکی اور سبھی شادی نہ کرنے کی برہنوں سے خائف ہوئی ماما نے ہی پاپا پر زور دیا تھا اور پاپا یہ مقدمہ تاؤ جی کے پاس لے آئے یہ پاپا جانتے ہیں یا رب جانتا ہے مگر وہاں سے بغیر کسی گئی پکی رکھے ملنے والے جواب نے سب کے منہ لٹکا دیئے تھے ماسوائے تائی ماں اور صالحہ کے۔

”بہت بے عزتی ہوئی ہے جی ہمارے صاحبزادے کی وجہ سے۔“ پاپا نے شرجیل کو مقدور بھر گھور کر اپنی بات کا آغاز کیا۔

”بھائی حسین تو بہت ہوں گی۔ ایویں تو بھائی سدھ بدھ نہیں بھول گئے۔“ فراز نے اپنے دماغ میں پہل چاتا



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ ملکہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ریڈیو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ویڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، سپر ہائیڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فرمی لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

تمہارا کیا خیال ہے مجھے اپنی زندگی میں عشق و محبت کے علاوہ اور کچھ نہیں کرنا؟

”آپ تین تین ماسٹرز ڈگریاں لیتے ستائیس سال کے ہوئے ہیں واضح رہے۔“ فراز نے اچھا خاصا براہ منہ کر جواب دیا۔

”ساتھ میں عشق بھی بھگتایا ہے بارے۔“  
”یعنی آپ کتنے سالوں سے عشق بھگتا رہے ہیں؟“  
”پچھلے تین سالوں سے۔“ شرجیل کا حساب کتاب بڑا پختہ تھا اس معاملے میں۔

”اتنی گوری محبت کو بھول جائیں گے؟“ فراز کو گھر لاحق ہوئی۔  
”کون کا فر بھولنا چاہے گا۔“

”پھر کیا شاعری کریں گے ہجر میں بیٹھ کر جوگ لیں گے؟“ فراز نے آ نکھیں پھیلائیں۔ (اف میرا تھاپنڈ سم اتنا ڈھنگ بھائی اور شاعر؟ چلو خیر ان پر مرنے والی لڑکیوں کی تعداد میں یہ شہرت اضافہ ہی کرے گی۔)

”شاعری کریں ہمارے دشمن اور جوگ بھی وہی لیتے پھریں۔“

”آپ کے دشمنوں کی فہرست میں تو سب سے بڑا نام ایمان صاحبہ کے والد محترم کا ہے اور یہ دلوں کا مہلک ہتھیار ہے۔“ فراز نے شرات سے سر مچھایا اس کی آنکھوں میں شوخی ناچ رہی تھی۔

”بیٹی کے غم میں بستر پر پڑے تو اچھے لگیں گے؟“  
شرجیل نے کیسٹ پلیئر بند کر دیا۔ فراز نے ٹھنک کر اسے دیکھا۔

”کیا مطلب ہے؟“  
”مطلب یہ کہ ان کی بیٹی جب ان کے فیصلے سے بغاوت کرتے ہوئے گھر سے بھاگے گی تو جتنے بھی اکڑدھول بہر حال اس صدمے سے غم حال تو ضرور ہوں گے۔“ وہ اطمینان سے کہہ رہا تھا جبکہ فراز کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں تھیں۔

(جاری ہے)

سوال پوچھا اور پاپا نے اسے سرخ سرخ آنکھوں سے گھور کر جڑ بڑ کر دیا۔

”وہ بھائی گدھر سے ہوگئی تیری ہاں؟ نہ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام۔“ وہ جس قدر جھنجھلائے ہوئے تھے اس حساب سے ملامت کی۔

”ویسے یہ رشتہ ہو جاتا تو اچھا تھا دیکھا نہیں کیا تھا؟“  
”ہاں شاہ صاحب کے آس پاس کے جانے کتنے گاؤں بھی انہی کی ملکیت ہیں۔ جوہلی کی شان و شوکت الگ۔“

”دفع کریں بھائی صاحب! ہمارے پاس بھی اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ خیر نہیں دیکھا تھا پیر صاحب کا آپ نے۔“  
”کتنے غوت سے بات کر رہے تھے۔“ پاپا کا غم دھندہ ہنوز قائم دائم تھا جیسی کچھ بھڑکے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

”جو کچھ بھی ہے میں تو یہ کہوں گا لڑکے نے ہاتھ اچھا مارا ہے۔“ تاؤ جی کی لاپٹی فطرت صحیح معنوں میں مسحور ہو کر رہ گئی تھی جوہلی کو دیکھ کر۔

شرجیل جو اس کا نفرنس کے آغا سے ہی اٹھ کر چلا گیا تھا فراز نئی تازہ رپورٹ کے ساتھ اٹھ کر اس کی جانب بھاگا تو شرجیل کمر بند کیے ایمان کے جواب سے مایوس ہونے کے بعد.....

شام کے سرمئی اندھیروں میں یوں میرے دل کے داغ جلتے ہیں

جیسے پرست کے بزمِ بڑوں پر شام کے بعد وہ بڑھکتی ہے سنتے ہوئے گویا اپنا غم غلط کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ فراز اندھا آیا تو اس کا سوجا ہوا منہ دیکھ کر دانت کھونسنے شروع کر دیئے۔ شرجیل بری طرح سے جھلا اٹھا۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ؟“  
”بھائی آپ کے لیے ایک گڈنوز ہے۔“ اس نے تجسس پھیلا لیا مگر شرجیل کے چہرے کے بگڑے زوہیے بگڑے ہی رہے۔

”تاؤ جی کتاب کا رشتہ یہاں نہ ہونے پر فحسوس ہے۔“  
”تو میں کیا کروں؟“

”پوستہ رہ ہجر سے امید بہار رکھ“ فراز نے شاعری کی زبان میں ہمت بندھائی۔ شرجیل کے ہونٹوں پر بھولی بھگی سی مسکان بکھری۔

”میں اتنا ویلا تو نہیں ہوں ستائیس سال کا ہو گیا ہوں۔“



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ ملے پاکستان سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں لیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، سپر ہائیڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✦ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ویڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

مجھے حکم الائن  
امرم



برف کی سل بھی تو حدت سے پکھل جاتی ہے  
کیوں نہ اس شخص کو سینے سے لگایا جائے

تجھ سے بچھڑے ہیں قیامت تو نہیں ٹوٹی ہے  
اک ذرا سی بات پہ کیوں حشر اٹھایا جائے

### گزشتہ قسط کا خلاصہ

یہ کہانی نندنی گریوال سے شروع ہوتی ہے جس کا تعلق دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد سے ہے باپ کرچن جبکہ ماں ہندو ہے۔ نندنی اپنی ماں کے ساتھ انڈیا میں جبکہ اس کا بھائی باپ کے ساتھ امریکا میں مقیم ہے۔ برسوں قبل امریکا میں نندنی کسی ایشیئن مرد سے ملتی ہے جس کی شخصیت کا سحر اس قدر طاری ہو جاتا ہے کہ وہ ہر جگہ اسے پاگلوں کی طرح تلاش کرتی رہتی ہے نندنی کی ماں سریتا دیوی کے دوسرے شوہر کا بیٹا نندنی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے سریتا دیوی نندنی کو دیو سے شادی کرنے پر مجبور کرتی ہے جس پر نندنی دلبرداشتہ ہو کر اپنی جان لینے کی کوشش کرتی ہے کہانی کا دوسرا اہم کردار عباس حیدر جس کی نسبت بچپن ہی سے اپنے چچا کی بیٹی لاریب سے ملے ہے اپنی خاندانی روایت کی پاسداری نہ کرتے ہوئے شوہر جو ان کو لیتا ہے جس پر سارا خاندان اس سے قطع تعلقی اختیار کر لیتا ہے عباس کے جانے کا سب سے زیادہ اثر لاریب پر ہوتا ہے وہ اندر سے ٹوٹ جاتی ہے دوسری طرف عباس ایشیہ سے شادی کرتا ہے اس کی شادی کی خبر سن کر لاریب شدید صدمے سے دوچار ہوتی ہے اور حویلی کے خاص ملازم سکندر جو گھر کے ایک فرد کی طرح ہے اسے شادی کے لیے خود پر پوز کرتی ہے سکندر لاریب کو چپکے چپکے دل میں پسند کرتا ہے اور لاریب کی ذہنی حالت اور صدمے کے آگے ہار مانتے ہوئے اس سے کورٹ میرج کر لیتا ہے لاریب عباس کو اپنی اور سکندر کی شادی کی خبر فون پر سناتی ہے جس پر وہ حسد کرنے کے بجائے مبارک باد دیتا ہے جب ہی لاریب کو شدت سے اپنی غلطی اور سکندر کی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے جس پر وہ اپنی جان لینے کی کوشش کرتی ہے کہانی کا تیسرا اہم کردار شرجیل جس کا تعلق جو اٹنٹ ہسپتال سے ہے خاندان میں اسے بے حد اہمیت حاصل ہے اس کی چچا زہرا علیہ جو دارجی شخصیت کی مالک ہے شرجیل کو دل ہی دل میں پسند کرنے لگتی ہے لیکن شرجیل پہلے سے ہی ایمان کو پسند کرتا ہے جس کی نسبت پہلے سے ہی وقاص سے ملے سے لاریب خوش قسمت سے بچ جاتی ہے جب کہ سکندر اس کے انتہائی قدم پر ششدر ہو جاتا ہے لاریب کے گھر آنے کے بعد سکندر اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ اس کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں اور ایمان کے سامنے ہی اس پر بکڑ پڑتی ہے۔ دیو کے بارہا منع کرنے کے باوجود سریتا دیوی ایک بار پھر نندنی سے دیو کے متعلق بات کرتی ہیں جس پر شدید طیش میں آکے بالکونی کی چھت سے کود جاتی ہے مگر ایک بار پھر وہ بد قسمتی سے بچ جاتی ہے جس پر دیو اور سریتا دیوی شکر کا سانس لیتے ہیں ڈاکٹر زینب نندنی کو پیار سے سمجھاتی ہیں نتیجہً وہ ان کے قریب سے قریب تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ دوسری جانب عباس عریشہ کے ساتھ نئی زندگی میں گمن ہے جب کہ لاریب اپنی کی گئی حماقت پہ سکندر سے مزید نفرت کرنے لگتی ہے اس کی بیماری کا سن کے ایمان اور امامہ سکندر کے گھر ملنے جاتی ہیں وہ بھی نکاح نامہ لینے کی غرض سے ان کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ نکاح نامہ سننے کے باعث وہ شدید رنج میں مبتلا ہو جاتی ہے سکندر کچھ دن بعد جب لاریب کو ڈراپ کرنے جاتا ہے لاریب اس سے نکاح نامہ لے کے جلا دیتی ہے جب کہ سکندر ششدر رہ جاتا ہے۔ دوسری جانب شرجیل ایمان کے گھر رشتہ بھیجتا ہے جو تو قعات کے عین مطابق رد کر دیا جاتا ہے جب کہ تایاجی حویلی کے درمیان رکھاؤ و دہشت سے بے حد متاثر ہوتے ہیں شرجیل فراز کو ایمان

کے بھانجے کا لائحہ عمل بناتا ہے جس پر وہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے  
اب آگے پڑھیے

☆☆☆.....

”یعنی یعنی آپ.....؟“

”ہاں میرا یہی مطلب ہے اور سنو اب تم جاؤ مجھے نیند آ رہی ہے۔“ شرجیل کے اطمینان و سکون میں ذرا برابر بھی جو فرق آیا ہو۔ جبکہ فراز کیج معنوں میں مل کر رہ گیا تھا۔  
”یہ زیادتی ہے بھائی!“  
”شٹ اپ فراز! تم جاسکتے ہو۔“

”بھائی میں آپ سے صرف ایک بات کہنا چاہوں گا۔ اگر آج آپ کسی کی عزت سے کھیلو گے تو کل خدا خواستہ کوئی آپ کی عزت کی طرف بھی میلی آ نکھ سے دیکھ سکتا ہے۔“  
”بس کہہ چکے تم جو کہنا تھا۔ اب جاؤ ناں سنس! پہلی بات تو یہ کہ میں اس سے نکاح کروں گا دوسری یہ اہم اطلاع ہوگی تمہارے لیے کہ وہ خود میرے ساتھ بھاگنے پر آمادہ ہے۔“  
شرجیل کا لہجہ طنزیہ تھا۔ فراز نے حیرت سے ساکن ہو جانے والی نگاہ سے شرجیل کے بے حد وجہ بہ چہرے کو دیکھا اور دیکھتا رہا پھر افسردگی سے مسکرایا۔

”ہاں شاید وہ بیماری آپ کے خوب روئی وجاہت اور اسائنس پر مرگئی ہوگی۔“ اس نے گہرا سانس کھینچا اور واپسی کو پلٹ گیا۔ شرجیل نے اٹھ کر دروازہ لاگ کیا پھر بستر پر گر کر سوچنے لگا اب اسے ایمان سے ایسا کیا کہنا ہے کہ وہ سب کچھ فراموش کر کے اس کے ساتھ بھاگنے پر آمادہ ہو جائے۔

☆☆☆.....☆☆☆

تیرا بننا سنو رتا مبارک تمہیں  
کم سے کم اتنا کہا تو مانا کرو  
یہ ادا دیکھنے والے لٹ جائیں گے  
یوں نہ ہنس ہنس کے دلبر اشارہ کرو  
چاند شرمائے گا چاندنی رات میں  
یوں نہ زلفوں کو ایسے سنو رتا کرو  
وہ تیار ہو کر جوتے کے اسٹریپ بند کر رہی تھی جب عباس نے اسے پیچھے سے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ گنگناہٹ کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری تھا آج کل اس کے انگ انگ سے سرشاری چھلکتی تھی۔  
”آف عباس اتنی تعریفیں نہ کیا کریں۔ رگلی میں شرمندہ پائیں گے۔“

ہونے لگتی ہوں۔“  
”شرمندگی کی وجہ؟ جان سن میں شوہر ہوں تمہارا۔“ عباس نے مسکرا کر اس کے رنگی بالوں میں منہ چھپایا اور عریشہ کو لگا گویا چودھویں کے چاند پر گھنیرے بادل چھا گئے ہوں۔ وایت چٹ کوٹ میں ملبوس عباس حیدر اپنی سحر انگیز شخصیت سے اکثر دین شتر عریشہ کو احساس کتری کا شکار کرنے لگا تھا۔ وہ دونوں اکٹھے جب بھی کہیں باہر نکلتے عباس پر اٹھنے والی نگاہوں میں جتنی ستائش اور توصیف کے رنگ ہوتے لوگ اسے دیکھ کر اسی قدر حیرانی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ عریشہ ان چند ذہنوں میں متعدد بار اپنے احساس کو افسردگی سمیت عباس تک پہنچا چکی تھی اس وقت بھی عباس نے بہت سرعت سے اس کی کیفیت کو پالیا تھا جسمی بہت خوب صورتی سے موضوع تبدیل کر دیا۔  
”یار پیکنگ تو کروائی ہے نا اپنی نگرانی میں؟ یلو ہماری کل شام کی فلائٹ ہے۔“  
”جی کروائی ہے کچھ اور تھوڑی ابھی رہتی ہے۔“  
”گڈ پھر چلیں اب.....؟“ عباس نے کوٹ کی جیب میں سیل فون اور والٹ دیکھتے ہوئے کہا۔  
”جی چلیں میں تو تیار.....“ معاہدہ بات ادھوری چھوڑ کر منہ پر ہاتھ رکھ کے واش روم کی سمت بھاگی۔ عباس نے ٹھیک کر اسے دیکھا۔ اور جب وہ اس کے پیچھے آیا عریشہ ابکائیوں کی شدت سے بے حال ہو چکی تھی۔  
”عریشہ واٹ ہیپنڈ؟“ عباس نے بہت نرمی و محبت سے اسے شانوں سے تمام کر اڑ حد تشویش میں گھر کر سوال کیا۔ عریشہ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ منہ پر پانی کے چند چھپکے مارے اور عباس کے سہارے واپس روم میں چلی آئی۔  
”چلو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ ایکدم سے کیا ہو گیا تمہیں؟“ عباس کی گھبراہٹ پریشانی میں ڈھلنا شروع ہو چکی تھی۔  
”ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے عباس میں ٹھیک ہوں۔“ عریشہ کے دسانیت سے کہنے پر عباس نے اسے مصنوعی شکل سے گھبرا۔  
”کیوں ضروری نہیں ہے؟ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں کل ہمیں جانا بھی ہے۔“  
”عباس مجھے لگتا ہے ہم ہنی مون کے لیے نہیں جا



اچکائی تو عباس نے سسکا کر اس کی بات قطع کر دی۔  
 ”بیٹا.....“

محبت کے جذبات اب بھی وہی ہیں۔“ اس کے دونوں کنداز پر  
 مئی 2013ء

آپ اپنے اللہ سے دعا کریں ذالکرز عیب کہ مجھے  
جائے جس کے ملنے کی آس بھی میرے ہاں اللہ سے ختم ہو گئی۔

قسم لے لو تمہارے بعد کسی کا خواب دیکھا ہو  
کسی کو ہم نے چاہا ہو کسی کو ہم نے سوچا ہو

آپنی 194 منی 2013ء



کسی کی آرزو کی ہو کسی کی جستجو کی ہو  
کسی کی راہ دکھی ہو کسی کا قرب مانگا ہو  
کسی کو ساتھ رکھا ہو کسی سے آس رکھی ہو  
کوئی امید باندھی ہو کوئی دل میں اتارا ہو  
کوئی تم سے بھی پیارا ہو کوئی دل میں بسایا ہو  
کوئی روٹھا ہو تو ہم نے اسے رو رو منایا ہو  
دسمبر کی حسیں رات میں کسی کا ہجر جھپٹا ہو  
کسی کی یاد کا موسم میرے آنکھن میں کھپلا ہو  
کسی سے بات کرتی ہو کبھی یہ ہونٹ ترستے ہوں  
کسی کی بے وفائی پر کبھی یہ نین بدم سے ہوں  
کبھی راتوں کو اٹھ اٹھ کر تیرے دکھ میں نہ روئے ہوں  
قسم لے لو تمہارے بعد ہم اک پل کو سوئے ہوں  
قسم لے لو کبھی جگنو کبھی تار کبھی ماہتاب دیکھا ہو  
قسم لے لو تمہارے بعد کسی کا خواب دیکھا ہو  
ایمان نے یہ طویل لطم لکھی اور شرجیل کے ہنسر پر سینڈ کردی۔  
جو بھی ہوا تھا بہر حال اسے اس سے محبت تھی اور اس محبت کا ہی  
یہ ثبوت فراہم کرنے کی ادنیٰ سی کوشش کی تھی۔

"اس ساری جان کاری کی ضرورت نہیں تم بہت سہولت  
سے وقاص صاحب کی لہن بن جانا۔ یاد رکھنا تمہاری بے وفائی  
اور کج ادائی کا مظاہرہ کرنے کو میں یہاں بیٹھا نہیں رہوں گا۔"  
اگلے ہی لمحے اسے شرجیل کا خفگی سے بھرپور میچ موصول ہوا  
تھا۔ جسے پڑھ کر ایمان کے اوسان خطا ہونے لگے۔ وہ جتنا  
جذباتی تھا اس سے کسی بھی حرکت کی توقع کی جاسکتی تھی۔  
"شرجیل پلیز ایسی فضول باتیں کر کے مجھے ہولاؤ مت  
میں آل ریڈی ڈسٹرب ہوں۔" اس نے بہت عجلت میں اسے  
جواب لکھا تھا۔

"میں اپنی زندگی کی صرف اس صورت میں تمہیں ضمانت  
دے سکتا ہوں ایمان کہ تم مجھے اپنے ساتھ کا یقین بخشو تمہیں کیا  
پتہ گھر میں کس انداز میں میری ذلت ہوتی ہے۔"  
"اسی گھر میں مجھے لے کر جاؤ گے شرجیل تو زندگی مجھ پر  
کس قدر تنگ ہوگی تمہیں اندازہ ہے؟" ایمان صحیح معنوں میں  
روہا ہونے لگی۔

"میں تمہیں الگ گھر میں رکھاؤں گا۔ تم میرا ساتھ دینے کی  
جانی تو بھرو۔" وہ اصل مقصد کی طرف آیا۔ محبت کے علاوہ ایک  
انا بھی تو تھی جو بری طرح سے مجروح ہوئی تھی۔

"شرجیل میں تمہارے ساتھ ہوں مگر پلیز مجھے کچھ وقت  
دو یہ بات تو طے سے مجھے وقاص سے شادی نہیں کرنی۔" شرجیل  
کے چلتے دل پر جیسے کسی نے رخ ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو۔ اس کے  
ہونٹوں کو فائنڈ مسکان نے چھو لیا۔  
"کتنا ٹائم! ایسا نہ ہو کہ خاک ہو جائیں ہم تجھ کو خبر ہوئے  
تک.....؟"

"مجھے اپنی ساری کشتیاں جلا کر آنا ہے شرجیل! اللہ  
لاریب بابا سائیں یہ وہ اپنے ہیں میرے جن سے میں نے  
زندگی میں سب سے زیادہ محبت کی ہے۔ ان رشتوں کا ہمیشہ  
کے لیے چھوٹ جانے کا خیال بہت جان لیوا ہے۔ مجھے ان  
کے ساتھ اچھا وقت گزار کر کچھ یادیں بھر لو کر لینے دو پلیز۔"  
"لو کہ فائن!"

"تھینک یو شرجیل!" اس نے آخری میچ ٹائپ کر کر سیل  
فون رکھ دیا۔ شرجیل نے بھی سرشاری کی کیفیت میں گنگنا تے  
ہوئے سیل فون سائیڈ پر اچھال دیا۔ وہ زندگی کے بہت اہم  
مقام پر جیتے جا رہا تھا۔

احساس زیاں ہر پل اس کے ساتھ لگے رہتے تھے مگر  
جب سے نیا موضوع زیر بحث آیا تھا اس نے بھی ہر خیال کو  
جھٹک کر خود کو کمین کرنا چاہا۔ بابا سائیں اب ایمان کی شادی کے  
خواہش مند تھے۔ چند دن قبل بڑی حوصلی سے بڑے بابا  
سائیں باقاعدہ تاریخ لینے آئے تھے۔ ناکی..... دونوں بیاہتا  
بیٹیوں کے بچوں شوہروں اور تو اور وقاص حیدر بھی ساتھ تھا۔  
لاریب کی روح سب سے زیادہ اسی کو ہمراہ رکھنے کے چلی تھی۔

"اف یہ یا جوتے برے تادی کے ساتھ کیسے رہ پائے گی  
بیچاری!" اسے صحیح معنوں میں ایمان پر ترس آیا تھا۔ وقاص  
دوران تقریب چھوڑ کر تیس کرتا رہا۔ بہانے بہانے سے کبھی  
ایمان تو کبھی لاریب کے نزدیک ہونے کی کوشش کرتا۔ ایمان  
کی حد تک تو پھر بھی قابل برداشت تھی مگر لاریب کو خود ہراس کی  
توجہ ہر لگ رہی تھی۔ جیسی وہ چہرے پر ناگوار تاثرات لیے وہاں  
سے ہٹ گئی تھی۔

"کیا سمجھتا ہے یہ لفنگا مجھے؟ اس کے بھائی نے مجھے چھوڑ  
دیا تو میں مفت کا مال ہوں۔" اس سوچ نے آنکھوں میں  
مارے ذلت اور سبکی کے آنسو بھر دیے۔ وہ کس کس کر آدمی  
سے زیادہ جان جلا چکی تھی۔ جب سکندر بابا سائیں کے پیغام

کے ساتھ آیا تھا۔  
"بی بی صاحبہ! بابا سائیں کہتے ہیں ایمان بی بی کو ہال میں  
لے آئیں رسم شروع کرنی ہے۔" اف ایک یہ تھا چلتا پھرتا اپنے  
نقصان کا اشتہار۔ لاریب نے تپتی نظروں سے اسے گھورا اور  
کچھ حیران ہوئی۔ وہ لٹھے کے سفید کلف شدہ کھڑکھڑاتے لباس  
میں تھا سلیقے سے بنے بال چمکتے جوتے تیاری خصوصی تھی غالباً  
تقریب کے باعث۔

"تمہیں سفید کھڑکیں پہننا چاہیے سکندر بندہ اپنی رنگت  
دیکھ کر لباس کی سلیکشن کرے تو بہتر ہوتا ہے۔" اس نے تاک کر  
نشانہ لگایا تو سکندر کا چہرہ دھواں ہو گیا۔  
"کہاں جا رہے ہو؟" اسے چپ چاپ پلٹتے دیکھ کر  
لاریب نے بے حد سختی سے ٹوکا۔

"آپ کو کچھ کام ہے کیا؟" اس نے دیکھا سکندر کی نگاہیں  
بدستور جھکی ہوئی تھیں اس دوران اس نے شاید ہی ایک مرتبہ بھی  
نگاہ بھر کے اسے دیکھا ہوا۔ اسے ایک دم بے ضرر لگا۔

"کام ہو یا نہ ہو بہر حال میں نے تمہیں جانے کا نہیں کہا  
ابھی اپنی اوقات مت بھولو سکندر۔" وہ بگڑ کر بولی لہجے میں کئی خوشفر  
کے ساتھ ساتھ تضحیک کا بہت واضح پہلو تھا۔ سکندر نے بے بسی  
سے اسے دیکھا اور کچھ کہے بغیر سر جھکا لیا۔ تب اس کی حالت  
سے لطف کشید کرتے لاریب کو کچھ اور ہری ہری سوچیں گئی۔

"ایسا کرو شور یک سے میری ہینک سینڈل نکال لاؤ۔ یہ  
میرے ڈریس کے ساتھ کچھ اتنے بیچ نہیں کر رہے۔" سکندر  
نے جواب میں کچھ کہے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی اور جس پل  
وہ اس کے سامنے جھک کر جوتے اس کے پیروں کے برابر رکھ  
رہا تھا لاریب نے کتنی کیسینی سی خوشی محسوس کی تھی یہ اس کے  
چہرے پر دم تھا۔

(یہی تمہاری اوقات ہے سکندر! میں نے اگر غلطی سے  
پیروں کی دھول کو سر پر ڈال لیا تھا تو اس دھول کو وہاں اس کے  
مقام پر پہنچانا بھی میرے لیے مشکل نہیں ہے۔)  
"گند اب تم جاؤ۔" اس کی انا کو اچھی طرح تسکین مل گئی  
تھی۔ جیسی وہ نخوت سے بولی تھی۔ سکندر یوں پلٹ کر بھاگا  
جیسے عقوبت خانے سے رہائی کا پیغام ملا ہو۔ لاریب بہت  
طمینان بھرے انداز میں سینڈل پہن رہی تھی اور اسی رات  
جب وہ تینوں اکٹھی ہوئیں تو لاریب نے اپنے دل میں پھل  
بچاتا سوال ایمان سے پوچھ لیا۔ باجوا آپ نے شرجیل بھائی کو

بھلا دیا ہے یا پھر وقاص کو ذہنی طور پر قبول کر چکی ہیں؟ اس کے  
سوال پر ایمان کے چہرے پر تاریک سائے لرز گئے تھے۔ اس  
سے پہلے کہ وہ جواب دیتی دروازہ پر دستک ہونے لگی تھی۔

"نہیں کم ان! اس وقت کون آ گیا؟" لامبہ نے اجازت  
دیتے ہوئے کچھ حیران ہو کر خود گھامی کی۔ سکندر کوڑے اٹھائے  
انداز سے دیکھ کر لامبہ اور ایمان نے بہت عجلت بھرے انداز میں  
اپنے دوپٹے اٹھا کر شانوں پر پھیلانے تھے جبکہ لاریب جو  
خاصے بڑھتے انداز میں کھڑکی ہوئی تھی اس کی پوزیشن میں فرق  
آیا نہ اس نے دوپٹے کے تکلف میں پڑنے کی ضرورت محسوس کی  
تھی۔ ایمان نے لاکھ کھرا مگر وہ اس کی سمت متوجہ نہیں تھی۔

"سکندر تم گھر نہیں گئے؟ اور چائے تمہیں لانے کی کیا  
ضرورت تھی سکھاں کہاں ہے؟" ایمان نے اعتراض کیا۔

"آج کچھ کام زیادہ تھا بی بی صاحبہ! بابا سائیں نے ہی  
مجھے روکا ہے۔" وہ جھک کر ٹرے رکھ رہا تھا دوسرے سوال کو  
سرے سے نظر انداز کیے۔

"میں نے پوچھا ہے سکھاں کہاں ہے؟ وہ چائے لاسکتی  
تھی۔ تم کب سے اس قسم کے کام کرنے لگے؟" اب کے ایمان  
کے لہجے کی ناگواری اور سختی واضح تھی۔

"افوہ باجو! کیا طوفان آ گیا ہے میں نے ہی کہا تھا سکندر  
سے کہ چائے وہ دے جائے۔ یہ ہمدردی سکھاں کے لیے بھی  
دکھا دیا کریں وہ بھی صبح سے کام کر کے ہلان ہو رہی ہے۔"  
لاریب نے ایک جھٹکے سے سیدھے ہوتے ہوئے غصے سے کہا۔  
"یہاں کام کرنے والی سکھاں اکیلی نہیں ہے۔ لاریب اور  
دوسری بات یہ کہ سکھاں کا کام یہی ہے مگر سکندر کا نہیں۔ تم نے  
ایسا کیوں کہا؟" وہ دوتے سخن لاریب کی سمت کر چکی تھی لہجے بے  
حد کڑا تھا۔

"آپ کو لگتا ہوگا یہ فرق مجھے تو کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا  
لوں میں۔" لاریب نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا تھا۔ اس کے  
چہرے پر گویا آگ برس رہی تھی۔ ایمان نے بہت حیرانی کی  
نگاہ سے لاریب کو دیکھا پھر جیسے خود پر ضبط کرتے ہوئے اسے  
نظر انداز کر کے سکندر کو مخاطب کیا۔

"سکندر تم جاؤ یہاں سے اور سنو! سکندر اس قسم کا کوئی فضول  
حکم ماننے کی ضرورت نہیں۔ بہر حال تم یہاں ملازم نہیں ہو۔"  
"یہ کہیں نہیں جائے گا۔ جب تک کہ اس پر اس کی حیثیت  
واضح نہیں ہو جاتی۔" ایمان کے ٹھکانہ انداز نے لاریب کے



بھڑکے ہوئے دل پر جیسے تل چھڑک کر آگ لگا دی۔ اس نے تلملا کر ضدی انداز میں کہا اور بیڈ سے اتر کر سکندر کے قریب آئی اور اسے روکے رکھنے کی غرض سے اس کا بازو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر صوفے کی جانب دھکیلا۔

”بیٹھو یہاں میں دیکھتی ہوں تم میری بات ٹالنے کی ہمت رکھتے ہو۔“ سکندر بیٹھنا نہیں چاہتا تھا اور وہ اسے بٹھانے پر کمر بستہ تھی۔ اس کوشش میں وہ اس کے بے حد بزدلی کی گئی تھی اور صحیح معنوں میں سکندر آزار میں پڑ گیا۔ اس کے چہرے پر بے بسی کا اظہار بہت واضح طور پر ابھر ا تھا۔ جبکہ ایمان تو لاریب کی ایسی ضد اور اوٹ پٹانگ حرکتوں پر بھونچکی رہ گئی تھی۔ لاریب کا اتنا شدید رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ خود لاریب کو بھی سکندر کو نیچا دکھانے کے چکر میں اپنی پوزیشن اپنی حیثیت کا احساس گویا بھول چکا تھا۔

”لاریب پاگل ہو گئی ہو؟ کیا فضول حرکت ہے یہ؟“ ایمان نے پھری ہوئی لاریب کو ڈانٹا اور ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے سکندر سے دور کھینٹا۔

”ہاں کیا پاگل نہ ہوں؟ آپ نے کتنی اسلٹ کی ہے میری اس..... اس دو کلمے کے آدے کے سامنے۔“ وہ بھڑک کر درشتی سے چبئی۔ ایمان کا دل نہ بیٹ لینے کو جا با اس کی صداقت پر مگر اپنے غصے اور طیش پر قابو پا کر نہ سہایت سے بونی۔

”او کے آئی ایم سوری آئندہ ایسا نہیں کروں گی فائن۔“ اس نے اپنے ہاتھ سے لاریب کی چھلک جانے والی آنکھوں کو پونچھا پھر سکندر سے بولی۔

”تم جاؤ پلیز!“ سکندر جو گم سم سا کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا ہڑبڑا کر چونکا اور پھر پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ ایمان کو لاریب کا سوڈ بھال کرنے کے لیے خاصی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ اس نے لاریب کو تو پرسکون کر دیا تھا مگر خود اس کے اپنے ذہن میں اس کے کئی سوال پھل مچاتے رہے تھے اس نے کل سکندر سے بات کرنے کا سوچا تھا۔

اس کی آنکھ بارش کی آواز سے کھلی تھی۔ کچھ دیر کھل میں لیٹے رہ کر اس نے اس کن کن برتی بوندوں کے مدھر شور کو سنا پھر اٹھ کر در سے نکل آ گئی۔ پردہ ہٹا کر سلائیڈ کھولی تو غم بھیکے ہوئے ہوا کے جمونکے کے ساتھ بارش کی پھوار اس کے بالوں اور چہرے کو بھگونتی چلی گئی۔ ٹھنڈک کا بھرپور احساس اس کے

جسم و جاں کو لطیف احساس سے روشناس کرا گیا۔ ہتھیلی پھیلی س نے لہر رحمت کو اپنی اوک میں جمع کرنا چاہا بھی دروازہ بند پھر سردوں میں دستک ہوئی۔ نندنی نے پلٹ کر دیکھا تو لائٹس آف تھیں۔ بس آتش دان میں جلتی آگ کی تاریکی روشنی کا دم غم عکس دیواروں پر لرزاں تھا۔

”دروازہ کھلا ہے۔“ نندنی نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ وہیں کمرے کمرے پشت پر بکھرے بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں لپیٹنے لگی مگر دیو کو انداز آتے دیکھ کر اس کے چہرے پر بے زاری چھانے لگی۔

”آئی ایم سوری! میں شاید غل ہوا ہوں۔“ دیو اس کی چہرے کے تاثرات کو پا کر بے ساختہ بھل ہو گیا۔

”کیسے آئے تھے؟“ نندنی نے گہرا سانس بھر کے سوالیہ نگاہیں اس پر جمائیں اور مردانہ انداز سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دیو کے لیے اتنی عزت افزائی ہی بہت تھی اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ ”ٹھنڈکس فار دس آفر۔“ دیو نے پہلے لائٹ آن کی پھر صوفے پر بہت پر تکلف انداز میں بیٹھ گیا۔ نندنی واپس بیڈ پر آ گئی اور کھل اٹھا کر اپنے گرد لپیٹ لیا۔

”میں کسی خاص مقصد کے تحت تو نہیں آیا نندنی۔ بس تمہاری تنہائی کا خیال آیا تو باتیں کرنے چلا آیا۔ ہم دوست تو ہوتے ہیں نا نندنی!“ اس نے بہت آس بھری نظروں سے نندنی کو دیکھا۔ نندنی نے یوں نگاہ چھائی جیسے جواب نہ دینا چاہتی ہو۔

”اس او کے! تم اپنے ذہن پر کسی قسم کا بھی بوجھ مت لو۔ یقین چالو میری خواہش صرف تمہیں خوش دیکھنے کی ہے۔ تم گھر سے باہر نکلا کر دل بہل جائے گا۔ وہ تمہاری نئی دوست کیا نام ہے ان کا؟ ہاں ڈاکٹر زینب ان کے ہاں چلی جایا کرو۔“ وہ مسک رہی تھی۔ نندنی نے گہرے طنزیہ انداز میں اسے جتلیا یا۔

”سو واٹ نندنی!“ ”میں نہیں چاہتی اس میل میلاپ کے نتیجے میں انہیں کل کوئی مشکل برداشت کرنی پڑے۔“ اس نے برہمی سے کہا دیو کچھ لمحوں کو چپہ گیا۔

”اس بات کی تم فکر مت کرو نندنی! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پھر ضروری تو نہیں ہے تم انہی سے ملو۔ تم شملہ چلی جاؤ وہاں آج کل برف باری ہو رہی ہے تمہیں پسند ہے نا؟ کچھ

وقت وہاں گزرا لو۔“

”تم میرے اتنے ہمدرد کس چکر میں ہو رہے ہو؟“ نندنی نے مشکوک ہو کر سوال کیا تو دیو دل شکنگی سے ہنس پڑا۔

”تمہیں اندازہ ہے نندنی تمہارا اصل ہمدرد کون ہے؟“ نندنی نے ہونٹ بھینچ لیے تو دیو نے اپنی بات کی وضاحت ضروری سمجھی۔

”میں تم پر طنز کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا نندنی۔“ ”مجھے تمہاری سسیرٹی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ وہ پھٹ پڑی۔ دیو نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”چلتا ہوں۔ تمہیں شاید میں کبھی یقین نہ دلا سکوں کہ میں تمہارے لیے بہت مخلص ہوں۔“ نندنی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ہونٹ بھینچے خاموش سر جھکائے بیٹھی رہی۔ دیو وہاں سے نکلا تو شدت غم سے اس کا گلارندہ گیا۔ اس نے بہت دلیری سے سوچا۔ جو قسمت میں ہوتے ہیں وہ دل میں نہیں ہوتے اور حوصلہ میں ہوتے ہیں وہ قسمت میں نہیں ہوتے۔



وہ کچھ دیر تک بونہی اسٹیرنگ پر ہاتھ دھرے کالج گیٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ کالج تقریباً سارا خالی ہو چکا تھا مگر لاریب کی اس نے جھلک ابھی تک نہیں دیکھی تھی۔ اس نے گہرا سانس بھرا اور جیب سے سگریٹ کیس اور لائٹس نکال کر سگریٹ سلگایا۔ گہرا کش لے کر ایک نگاہ اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ سیاہ بادل آسمان پر بہت تیزی سے جمع ہو رہے تھے۔ ہواؤں کے مزاج بھی کچھ براہم لگتے تھے۔ سردیوں کی سسپہر تھی مگر آسمان پر بادلوں کا قبضہ جم جانے کے باعث ڈھلتی ہوئی شام کا گمان ہوتا تھا۔ امام آج پھر کالج نہیں آئی تھی۔ جبکہ لاریب کے ایگزیم اشارت ہو گئے تھے۔ وہ چھٹی کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ سکندر نے دھواں اڑاتے ہوئے ایک بار پھر گردن موڑ کر گیٹ کی طرف دیکھا۔ اب کی مرتبہ وہ اسے نظر آ گئی۔ وائٹ یونیفارم پر مہردن اسٹائش سی گرم شال لپیٹے کاندھے پر لٹکتے بیگ میں مصروف سے انداز میں کچھ ڈھونڈتی وہ خود میں گمن تھی تو سکندر اس کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر اس میں گمن ہونے لگا۔ جب تک لاریب نے سروا نہ کیا سکندر اسے جی بھر کے دیکھ چکا تھا۔

”پہلے ذرا مار گیٹ چلتا مجھے کچھ کتابیں لینی ہیں۔“ اس کا کھلا ہوا دروازہ نظر انداز کر کے وہ فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھی سکندر کے تو صحیح معنوں میں چھکے چھوٹ گئے اس کے برابر بیٹھ کر

غزل

آنچل کے کچھ لوگ ہوتے ہیں خاص بہت دل میں ہوتے ہیں ان کے جذبات بہت اکثر چھپونی سی بات پر رنخہ جاتے ہیں۔ لوگ ہوتے ہیں نازک مزاج بہت ان کے اندر بھی کچھ دکھ سر اٹھاتے ہیں۔ خود کو کرتے ہیں ظاہر خوش باش بہت مانا کہ سیرت و صورت کے اچھے ہیں ان کو باتوں میں بھی حاصل ہے کمال بہت میری دعا ہے خدا آنچل والوں کے مقدر بر نعمت کر دے ہادی۔ رب پاک کا ہوگا مجھ پر احسان بہت (خدیجہ بھٹی.....)

ڈرائیو کرنے کے خیال سے۔

”موسم ٹھیک نہیں ہے بی بی صاحبہ میرا خیال ہے کتاب کتابوں.....“ سکندر نے اپنی بات اس کے چہرے کے کھڑکتے زاویوں کو دیکھ کر اچھوری چھوڑ دی مگر وہ اسے معاف کرنے پر پھر بھی آمادہ نظر نہیں آئی تھی۔

”تم اپنی اوقات مت بھولا کرو سمجھے۔“ اس نے بے دریغ جھاڑ پلائی۔ سکندر چپکا ہو رہا۔ پھر محض اسے زچ کرنے کی خاطر لاریب نے مار گیٹ میں دیر لگائی۔ صرف کتابیں نہیں خریدیں بوتیک میں گھوم پھر کے بہت سلی اور اطمینان سے اپنے لیے ایک سوٹ بھی پسند کیا۔ اس دوران ایمان کی دو اور بابا سائیں کی ایک کال آ چکی تھی کہ وہ اب تک گھر کیوں نہیں پہنچے۔ سکندر کیا جواب دیتا لاریب نے بھی وضاحت ضروری نہیں سمجھی۔ اور جب لاریب سوٹ پیک کر دے بوتیک سے باہر آئی تب آسمان سے بوندیں اترنا شروع ہو چکی تھیں۔ سکندر کی تشویش لکھت بڑھ گئی۔ لاریب اس کے ہمراہ تیز قدوں سے گاڑی تک پہنچی تو اسے ایک دم بھوک کا احساس ہوا تھا۔

”تم ایسا کرو سامنے شاپ سے میرے لیے سینڈوچ اور کوک لے آؤ۔ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو ہے جس تب تک بھوک نہیں رہ سکتی۔“ اس کے لہجے کی بے نیازی اور انداز کے شاہانہ پن کو سکندر نے ٹھنڈی سانس بھر کے دیکھا اور حکم کی تعمیل کو پلٹ گیا۔ جس وقت وہ واپس آیا لاریب اپنے سیل فون پر ہیڈ سیٹ کے ذریعے میوزک انجوائے کرنے میں مصروف تھی۔



”اب ذرافاسٹ ڈرائیو کرنا سمجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔“ اس سے کوک اور سینڈوچ لیتے ہوئے اس نے نخوت سے کہا اور بے نیازی سے میوزک کے ساتھ ساتھ کوک اور سینڈوچ بھی انجوائے کرنے لگی۔ مگر اس وقت اس کا پارہ ہائی ہوا جب سبک انداز میں گرتیں بوندوں نے موسلا دھار بارش کا روپ دھار دہ اوپن جیبلانے پر سکندر کو سخت سنار ہی تھی۔

”بہت شوق ہے تمہیں شیخیاں بھگوانے کا۔ ذرا موسم بھی دیکھ لیتے۔ سارا ستیاناس ہو رہا ہے جیپ کا بھی اور میرا بھی۔ اگر مجھے ٹھنڈ لگ گئی تو طبیعت خراب ہو جائے گی۔“ اسے اب بھی اپنی ہی پروا تھی۔

”لینڈ کروزر کے انجن میں فالٹ تھا سروس کو بھجوا رکھی ہے۔ دوسری گاڑی دقاہ سائیں لے گئے ہیں۔“ سکندر نے منمننا کر اپنی صفائی پیش کی۔

”دقاہ کیوں لے گیا ہے؟ اس کے پاس اپنی گاڑیاں نہیں ہیں۔ ضرور کسی مشکوک سرگرمی کے لیے چاہیے ہوگی بابا سائیں نے منع کیوں نہیں کیا؟ تم باجوکی گاڑی لے آتے۔ اور ذرا جلدی چلاؤ اب۔“ تحقیق، تشویش غصہ جھنجھلاہٹ، خفگی ایک پل میں اس کے کتنے رنگ عیاں ہوئے تھے سکندر پر اور وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر گویا اس کی سمت متوجہ تھا۔ جسیان بٹا تو اسٹیرنگ پر ہاتھ بہک گیا۔ جیپ ایک دم ڈولی تھی۔ لاریب توازن کھو کر ڈیش بورڈ سے ٹکرائی تھی۔ ایک پل کو تو آنکھوں تلے اندھیرہ چھا گیا۔

”اندھے ہو گئے ہو سکندر دھیان کہاں ہے تمہارا؟“ وہ بے دریغ اس پر برس پڑی۔ سکندر نے ہونٹ بھیجے اور دانستہ اس کی سمت دیکھنے سے گریز کیا۔ موسلا دھار بارش بہت فراخ دلی سے انہیں بھگو رہی تھی۔ بلکہ کچھ سردی کچھ بارش اور کچھ کھلی جیپ سے سرسراہٹ ہوئی گزرتی ہواؤں کے جھکڑوں کے باعث لاریب اب کپکپانے لگی تھی۔

”جیپ روکو سکندر!“ وہ غصے میں بولی۔ سکندر نے متحیر ہو کر اسے دیکھا اور بریک لگائے۔ جیپ اس پل شہر کے مضافات کو چھوڑ چکی تھی۔ یہاں سے گاؤں کا راستہ شروع ہو چکا تھا۔ درمیان میں نہر بھی جیپ نہر کے پل پر پہنچ کر ہی رکی تھی۔ لاریب جیپ سے نکل کر بھاگتی ہوئی نہر کے ساتھ کچی سڑک پر قطار در قطار کھڑے درخت کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ درخت کی شاخیں گھنیری تھیں وہاں وہ بارش سے محفوظ تھی۔ سکندر الجھا

ہو اساتر کراس کے پاس آیا تو سیاہ پڑتے آسمان کے کناروں بجلی کی چمک دکھائی دی۔

”خوبی فون کر کے کسی ملازم سے باجو والی گاڑی منگوا۔“ اب میں مزید اس میں بیٹھ کر سفر کرنے کی ہمت نہیں رہتی اس کی آواز آسمان پر گرج اٹھنے والے بادلوں کی گرج میں گرج کر رہ گئی تھی۔ اس کے انی شال کا پلو نچڑتے ہاتھ اسی درخت پر ساکن ہو گئے۔ اس کام کو ترک کر کے وہ غیر محسوس انداز میں سکندر کے نزدیک ہوئی تھی۔

گہری ہوئی شام چھا جو برستا آسمان آس پاس موج تہائی من پسند دل فریب لڑکی کی قربت سکندر کے دل و دہلیز میں جیسے ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ آخرا انسان تھا۔ اس کے دل کی بے ایمان ہوئی دھڑکنیں من مانی برا کساری تھیں مگر وہ خود پر ضبط کھوتا نہیں جاتا تھا جیسی ہونٹ جھنجھٹا فاصلے پر ہوا لہر جب سے میل فون نکال کر نمبر پیش کرنے لگا مگر اس کی کوشش مسلسل ناکامی کا شکار ہو رہی تھی۔ موسم کی خرابی کے باعث مواصلاتی نیٹ ورک صحیح کام نہیں کر رہا تھا۔ سکندر براہ کرم اس کی طرف سے یہاں لاریب کو سخت گراں گزری تھی۔

”تم کال کیوں نہیں کر رہے ہو؟ کیا مسئلہ ہے؟ خرتہا رہا ہے ساتھ؟“ اس کے ہر انداز میں بے گانگی رکھائی اور جھنجھلاہٹ تھکی۔

”کامیٹ نہیں ہو پارہا ہے بی بی صاحبیا۔“ جواب دہ نرمی اور حجل سے بولا تھا۔ لاریب نے تیوری تڑپا کر اسے دیکھا۔

”مجھے تو یہ سب تمہاری اپنی ہی گھنیا سازش کا شاخسانہ محسوس ہو رہا ہے۔ جب موسم خراب تھا تو تمہیں ضرورت کیا پڑی تھی یہ جیپ لانے کی؟“ چبا چبا کر بولتے ہوئے اس نے ٹیکسی نگاہوں سے اسے گھورا۔ سکندر مصر کے ٹھونٹ پی کر رہ گیا۔ اب وہ اپنے میل کوثرانی کر رہی تھی مگر وہی ڈھاک کے تین پات! اب تیج معنوں میں لاریب کو تشویش نے آن گھیرا۔ صورت حال کی گھمبیر تا کو محسوس کر کے اس کا دل گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا۔ اس نے چور نگاہ سکندر پر ڈالی۔ چھنٹ سے نکلتے ہوئے قد کے ساتھ کسرتی مضبوط وجود وہ چاق و چوبند اور زور آور نظر آتا تھا۔ پھر اس کا وہ کانغذی تعلق۔ جسے بھلا وہ جتنا مرضی نام نہاد گردانے قائم تو ہوا تھا۔ اگر وہ اس کی سابقہ بدتمیزیوں اور تمام بے عزتیوں کا بدلہ چکانے بیٹھ گیا تو... آخر میں تو وہ کمزور ہی نا چاہے حیثیت میں بہت اوپر کسی۔ اس سوچ کے ساتھ ہی اس کا دل بیٹھنے لگا۔

”میرا خیال ہے ہمیں یہاں رک کر ٹائم ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ اپنی سوچوں سے اتنی خائف ہوئی کہ فی الفور چلنے کو تیار ہو گئی۔ سکندر نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بظاہر پرسکون نظر آتی تھی۔ سکندر کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا اس نے شانے اڑکائے اور اس کے ہمراہ محتاط قدموں سے چل دیا۔ اس کے باوجود وہ مرتبہ پھسلتی ہوئی سڑک پر کچھڑا اور پھسلنے بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ کچھ اور محتاط انداز میں قدم اٹھانے لگی مگر اس احتیاط کے باوجود وہ تیسری مرتبہ پھسلتی تو سنبھل نہیں سکی سکندر اگر بروقت سہارا نہ دیتا تو یقیناً وہ اب تک کچھڑ بھرے راستے پر منہ کے بل پڑی ہوئی ہو کہ سکندر نے اسے سنبھال کر سیدھا کھڑا کرتے ہی اپنے ہاتھ ہٹا لیے تھے اس کے باوجود اس کی جسارت نے لاریب کو دم بخود کرنے کے بعد گویا بری طرح سے بھڑکا ڈالا تھا۔

”تم..... تمہیں جرأت کیسے ہوئی کہ تم مجھے ہاتھ لگاؤ.....“ اس نے وہ طوفانی بارش کی پروا کیے بغیر لڑنے مرنے پر آمادہ تھی۔ سکندر اس بے مروتی اور نخوت کے مظاہرے پر پوری جان سے سلگ تو سکتا تھا مگر کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

”خوب جانتی ہوں میں تم جیسے حریص فطرت مردوں کو خبردار جو آئندہ تم نے مجھے اس طرح چھونے کی کوشش کی گورای تھی نا گرنے دیتے۔“ پھٹکار پھٹکار کر اس پر اپنی تلملاہٹ نکالتی رہی۔ سکندر ہونٹ بھیجے اپنا طیش دبا تا رہا۔ بدتمیزی اور انسٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ وہ ہر حد پار کیے رہے رہی تھی اور گویا اس کا ضبط آزارتی تھی۔ سکندر نے ایک سکتی نگاہ اس کے لال بھوکا چہرے پر ڈالی اور اسے وہیں چھوڑ کر خود لیے ڈگ بھرتا گاڑی میں جا بیٹھا۔ لاریب کو بھلا اس سے ایسی توقع کہاں تھی ایک پل کو تو وہ غیر نشانی سے آنکھیں پھاڑ کر تکتی رہی پھر بائشکل گاڑی تک آئی۔

”تم خود کو کچھ سمجھ رہے ہو غالباً!“ وہ آتے ہی اس پر الٹ پڑی۔ سکندر نے یونہی بھیجے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ گاڑی اسٹارٹ کی اور فل اسپید پر چھوڑ دی۔

”نندنی! نندنی بیٹا!“ وہ ٹکیوں میں منہ چھپائے گویا خود سے غافل پڑی تھی جب سر تادیوی اسے پکار لی چلی آئیں۔ اس نے اگر تباہی تو نظر انداز کر دیا۔

”نندنی طبیعت ٹھیک ہے تباہی!“ سر تادیوی نے اس کے

سر ہانے بیٹھ کر اس کا سراپا پی گود میں رکھا۔ نندنی کو نا چاہے ہوئے بھی آنکھیں کھولنا پڑی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی سرخیاں سر تادیوی کے دل کو چیر گئے کھ گئیں۔

”کوئی اس طرح سے بھی خود کو تباہ کرتا ہے نندنی؟“ اس کا یہ رویہ اندازاً آج ان کے دل کو بھی پکھلا گیا تھا۔ نندنی نے اپنا سر ان کی گود سے اٹھالیا۔

”مجھے بتاؤ کون تھا وہ؟ میں خود اسے دھونڈوں گی تم دیو سے شادی نہیں کرنا چاہتی ہو نہ کرو مگر خود کو یوں برباد مت کرو نندنی پلیز!“ وہ جیسے ضبط کھو گئی تھیں۔ وہ ان کی اولاد کی اسے اپنی آنکھوں کے سامنے لمحہ لمحہ کھلتے کیسے برداشت کر سکتی تھیں۔ آج وہ اپنی کوکھ کی جتنی سے ہار تسلیم کر گئی تھیں۔

”بولو نندنی بتاؤ مجھے۔“ اس کی جامد چپ ان پر اذیت کے کچھ اور زور داکر کرنے لگی۔

”اچھی طرح سوچ لیں مام! عین ممکن ہے آپ کو اپنے الفاظ سے پھرنا پڑ جائے۔“ نندنی کا لہجہ طنزیہ نہیں تھا اس کے باوجود اس میں کچھ ایسا تھا جس نے سر تادیوی کو چونکا ڈالا۔

”میں بھی نہیں نندنی تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ ان کی نگاہوں کی الجھن محسوس کر کے وہ گہرا سانس کھینچ کر بولی۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے ماموہ مسلم ہو؟“

”واٹ!“ وہ زور سے چلئیں۔ پھر نندنی کے تسخرانہ اثرات کو پا کر ایک دم اپنا غصہ ضبط کیا۔

”تمہیں اس سے محبت نہیں عشق ہے نہ بھی جنونی قسم کا اور تمہیں یہ تک نہیں پتہ کہ وہ ہے کون؟ یہ کیسی محبت ہے جس میں تم زندگی چھوڑ بیٹھی ہو اور تمہیں اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔“ ان کا لہجہ ہی نہیں ان کی آنکھیں بھی آج دے رہی تھیں۔ نندنی بہت حجل سے انہیں تکتی رہی۔

”اس لیے مام کہ محبت یہ سب کچھ دیکھ کر نہیں کی جاتی۔ نہ ہی یہ جاننا شرط ہوتی ہے کہ سامنے والے بندے کا نام نسب کیا ہے یہ تو دل کا معاملہ ہوا کرتا ہے مام دل کے معاملے ان تقاضوں سے ماوراء ہوتے ہیں آپ کو اندازہ تو ہو گا آپ نے ہندو دھرم سے تعلق رکھتے ہوئے ایک اہل کتاب کرچن سے کیسے محبت کر لی۔ دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کی اولاد کو بھی تو ایک تیسرے مذہب کے پیروکار سے محبت ہو سکتی ہے نا؟“ اب کے اس کا لہجہ صاف طنزیہ تھا کاٹ دار نظروں سے وہ گویا انہیں بہت کچھ جتا رہی تھی۔ سر تادیوی کو نظریں چراتا



پڑی تھیں۔

”تم یہ بات اتنے دھوکے سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ ایک مسلم ہی ہے؟ اس سے پہلے تو تم اسے ایشین سمجھتی تھیں۔“ انہوں نے جتیز ہو کر اپنا سوال پھر دو بدل سے دہرایا۔

”وہ ایشین ضرور ہے مگر وہ انڈین نہیں ہے یہ تو طے ہے۔ انڈیا کے لوگ درحقیقت میالے ہوتے ہیں ان کی رنگت اتنی فیمر اور شائیننگ نہیں ہوتی۔ جانے کیوں میرا دل مانتا ہی نہیں ہے کہ وہ انڈین ہوگا۔“

”یعنی وہ پاکستانی ہے؟“ سریتادیوں نے بھیجے ہوئے سرد انداز میں پوچھا۔

”آئی تھینک سو۔“

”تو پھر تم اسے پاکستان میں ڈھونڈو..... جاؤ..... جاؤ نا۔“ وہ ایک دم ہسٹریک ہو کر چلائے لگیں۔ ان کا انداز جارحانہ تھا۔ ایک لمحے کو ہندی کو وہ جنوبی محسوس ہوتی تھیں ایک لمحے کو ہندی کو ان پر ترس بھی آیا۔

”مام! امام پلیز کنٹرول یور سیلف۔“ وہ بھرپور ہمدردی سے ان کی جانب بڑھی مگر انہوں نے اسی وحشت میں اسے خود سے دور رکھنے کو پوری قوت سے دھکا دیا۔ وہ سنبھلتے سنبھلتے بھی گرمی۔ اس کی کہدیاں سنگھار میز سے ٹکرائی اور سر اسٹول سے وہ خود کو سنبھال کر آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مام بکئی جھکتی جا چکی تھیں۔ اسے چند دن قبل پڑھا وہ اقتباس یاد آ گیا جو بالکل اس کے حسب حال تھا۔

”موت اور محبت دونوں ہی بن بلائے مہمان ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے محبت دل لے جاتی ہے اور موت دھڑکن!“ کاش اس کے دل کے ساتھ دھڑکن بھی چلی جاتی تو آج اس کے اپنے رشتے بھی اسے طنزیہ نگاہوں سے تو نہ دیکھ رہے ہوتے۔ وہ بھی کچھ غلط تو نہ تھے۔ ایسی محبت بھی تو شاید ناممکن تھی جس کو وہ نبھاتی چلی آ رہی تھی۔ کوئی سنتا تو یقین کرتا بھی کیسے؟

وہ گھر لوٹا تو دس بجے کے بعد کا عمل تھا۔ پورا گھر اگرچہ روشنیوں سے منور تھا مگر خاموشی کا گہرا راج تھا وہ جانتا تھا یہ کھانے کا وقت ہے گھر کے بھی افراد اس وقت ڈائننگ ہال میں جمع ہوں گے۔ اس نے بھی اسی طرف کارخ کیا تھا۔

”لیجیے صاحبزادے آوارہ گردی سے اکٹا کر بلا خر گھر

تشریف لے گئے۔“ تاؤ جی نے حسب عادت اپنے مخصوص کے فقرے سے اس کا استقبال کیا۔ وہ اب دل چھوٹا کرنا چکا تھا جان گیا تھا انہیں بولنے اور فغا ہونے کا مرض لاحق ہے۔ ”یہ کہا ب لے پتر صالحہ نے خود بنائے ہیں ایسے حربے کے کہ جتنے مرضی کھا جاؤ جی نہ بھرے۔“ تائی ماں تاؤ جی کے برعکس اس کے صدفے داری ہوتے نہ ٹھکتی تھیں۔ امید جو بک سے ہری ہو گئی تھی۔ وہ تو دل ہی دل میں لڑکی کے باب دعائیں دیتے نہ ٹھکتی تھیں جن کے انکار نے انہیں پرانی کر دیا تھا۔

”شکریہ تائی ماں مگر میں تیز مسالے نہیں کھاتا سادہ کھانا پسند کرتا ہوں۔“ اس نے تائی ماں کی امیدوں پر لچر بھر میں پانی پھیر دیا اور اپنی پلیٹ میں کدو گوشت کا سالن نکال لیا۔ سلاوی پلیٹ اپنے نزدیک کھسکا لی اور نوالے لینے لگا۔

”بزنس میں تو تم نے ہاتھ بٹانا نہیں آوے نوکری ہی ڈھونڈ لے اب پتر۔“ تاؤ جی نے نیا شوٹا چھوڑا۔

”جی ڈھونڈ رہا ہوں۔“

”کیا؟ نوکری کہ چھو کری؟“ فراز اس کے کان میں غسلا انداز شوخ و شنگ قسم کا تھا۔

”دونوں۔“ اس نے کمال اختصار سے کام لیا۔ فراز کو پانی پیتے اچھولک گیا۔

”نوکری ڈھونڈیں چھو کری تو پٹالی ہے آپ نے؟“ اس کا لہجہ نوز سرگوشیاں تھا۔

”اب شادی بھی کر رہی لے۔ وہاں سے تو چٹا انکار ہوا ہے۔ تیری ماں اور تائی سے کہتا ہوں کوئی اور لڑکی دیکھیں۔“ تاؤ جی کو پتہ نہیں اس کی اتنی فکر کیوں تھی۔ (اپنا آفاقہ بچھلے چار سالوں سے سوویہ میں مقیم تھا اس کی شادی کا خیال تو بھی نہیں آیا تھا۔) وہ کلےسے لگا اور اس وقت تک کلےسار ہا جب تک تاؤ جی پیٹ پوچھا کے بعد نیبل سے نہ اٹھ گئے۔

”اک بات پوچھوں ماں جی!“ اسے جب زیادہ لاڈ چاہا تو وہ ماما کو اسی طرح سے مخاطب کرتا تھا۔ ماما خاموشی سے کھانا کھا رہی تھیں اسے از خود مخاطب نہ کر کے گویا وہ اس سے ناراضی کا اظہار ضروری خیال کرتی تھیں۔

”تاؤ جی اور الیاں چاچو کے علاوہ بھی ہمارے کوئی اور چاچو تھے؟“ اس نے کئی دنوں سے ذہن میں گردش کرتا سوال بلا خر کیا۔ ماما کے چہرے کا رنگ یکنخت بدلا۔ انہوں نے گہرا کر

رے اختیار تائی ماں کو دیکھا جو ٹھنک کر رہ گئی تھیں چچی جی کچھ شینا کر نظر میں چڑھ رہی تھیں کہ یہ بات جیسے بھی انہی کے ذریعے بچوں تک پہنچ گئی۔

”نہیں یہ لوگ تین ہی بھائی ہیں تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ ماما نے کچھ جتیز ہو کر کہا۔ شرجیل بغور ان تینوں بزرگ خواتین کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ پاپا اور چاچو تاؤ جی کے ساتھ ہی نیبل سے اٹھ کر جا چکے تھے۔

”میری اطلاع کے مطابق یہ بات سچ نہیں ہے ماما۔ ہمارے ایک اور چاچو تھے بھلے وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے مگر ان کا حوالہ چھپانے کا مقصد سمجھ سے باہر ہے آپ بتانا پسند فرمائیں گی؟“ وہ ایسا ہی تھا جس بات کے پیچھے پڑ جاتا اس سے بھر کوئی مائی کالا ل اسے ہٹا نہیں سکتا تھا اور جس کام کو چھوڑ دیتا جا ہے کتنا ہی نقصان ہو دوبارہ ہاتھ نہیں لگاتا۔ اب بھی چاچو نیگم کے اشارے سمجھنے کی گھبراہٹیں اور شاکی بوکھلاہٹ کچھ بھی اسے باز نہیں رکھ پاتی تھی۔

”یہ بات تمہیں کہاں سے پتہ چلی ہے؟ مجھ سے بات کرو تم۔“ تائی ماں کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ وہ لگاوٹ وہ شیرینی کہاں جا کھوئی تھی اس بل جو شرجیل کے لیے مخصوص تھی۔ اس وقت بھی وہ شرجیل سے ہی بات کر رہی تھیں مگر لہجہ بے حد کڑوا اور خوفناک تھا۔

”چلیں آپ کر لیں بات آپ تو ویسے بھی سب سے زیادہ معلومات رکھتی ہوں گی۔“ شرجیل کا لہجہ از خود طنز سمیٹ لایا۔

”کس نے بتایا تمہیں یہ سب کچھ؟“ تائی کا لہجہ پھنکار زدہ ہو گیا۔ شرجیل نے محسوس کیا سمجیہ اور چچی نیگم کے چہرے خوف سے سفید پڑ گئے ہیں۔ اتنے بڑے ڈائننگ ہال میں موت کی خاموشی دہرائی تھی۔ جو کھانا کھا رہے تھے وہ بھی چھوڑ بیٹھے تھے۔ اس نے گہرا سانس کھینچا اور رسانیہ سے گویا ہوا۔

”اصل بات یہ نہیں ہے زیر بحث بات یہ ہے کہ اگر ایسا تھا تو اس بات کو کیوں چھپایا گیا؟ کیا ان کا حوالہ اتنا ہی شرمناک تھا؟“ وہ لہجہ بھر میں گویا انہیں شہرے میں کھڑا کر چکا تھا۔ تائی ماں کی آنکھوں سے چنگاریاں برس رہی تھیں۔

”ہاں وہ حوالہ شرمناک تھا، جسمی اسے آشکار کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا مجرم تھا وہ قاتل تھا پھانسی چڑھ گیا۔ ہم نے تو خدا خدا کر کے اس کے ذکر کو دفنایا تھا۔ اب ہرگز برداشت نہیں کریں گے کہ اس بد بخت کا نام بھی دوبارہ لیا جائے۔“ تاؤ جی جانے

لوری

ماں! مجھے نیند نہیں آتی

رت جگے مقدر ہیں اب تو میری پلکوں کے غیندائے تو لے آتی ہے بغداد کی یاد آنکھ لٹکتے ہی کوئی بیوہ اٹھادیتی ہے پیٹ کتنا ہی بھروں بھوک نہیں مٹتی ہے جلتے بصرہ کی مجھے پیاس جگاوتی ہے کوئی قندھار کی وادی سے بلاتا ہے مجھے ذکر قندوز کا آئے تو مجھے لگتا ہے

کاٹ کر سر کوئی ہنستا ہے چلاتا ہے مجھے ہم کی آوازیں مجھے کچھ نہیں کہتی ہیں مگر زخم ان بچوں کے سونے نہیں دیتے ہیں مجھے ماں! میری آنکھیں تو پتھر کی ہوتی جاتی ہیں تو جوان لاشے یہ روئے نہیں دیتے ہیں مجھے

میرے سینے پر رکھو ہاتھ

رُلا دو ناں مجھے

ماں! مجھے لوری سناؤ ناں

سُلا دو ناں مجھے

ماں مجھے نیند نہیں آتی ہے

اک مدت سے مجھے نیند نہیں آتی ہے

شاعر..... سید وحی شاہ

انتخاب: شمیمہ طاہر بیٹ..... لاہور

کب آئے تھے اور کیا کچھ سن چکے تھے۔ بھڑک کر بولتے چلے گئے۔ شرجیل ان کی آواز پر خفیف سا چونکا پھر دانت بھیج کر چہرے کا رخ پھیر گیا۔ جبکہ فراز کی نگاہوں سے تائی ماں لٹا اور چچی کے چہروں کی حیرت اور پھر اطمینان مخفی نہیں رہا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں لمحہ بھر بھی نہیں لگا کتاؤ جی نے ابھی جو بات کہی ہے اس کا حقیقت سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

پھر حقیقت کیا ہے؟ اس بات کو سوچتا اس کا ذہن الجھتا جا رہا تھا۔

.....

ایمان کی شادی کے سلسلے میں حویلی کو نئے سرے سے رنگ و روغن کروایا جا رہا تھا۔ اور ظاہر ہے یہ ساری ذمہ داری



سکندر کے ہی کاغذوں پر تھی۔ ٹھیکیدار اور مزدوروں کے سر پر کھڑے ہو کر کام کرانا ان کے لیے کھانے چائے وغیرہ کا انتظام دیکھنا اور بیچ کے اور ہزاروں کام اسے سر کھانے کی بھی فرصت نہیں تھی مگر دھیان کے کبھی پیچھے تھے کہ اس کی سمت نحو پرواز رہتے تھے۔ کل شام بھی وہ مزدوروں کو رخصت کر کے اندر آیا تو لاریب جیسے اس کی منتظر تھی مگر وہ اس کے نزدیک سے دانستہ انجان بن کر گزر گیا۔ تب لاریب نے اسے آواز دے ڈالی۔

”سکندر بات سنو۔“ سکندر نے مگر اس کی کھینچا اور ہتھکی سے مڑا۔

”تم فرمائیے۔“

”تم.....“ معاہدہ ایک دم ختم ہو گیا تھا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر چائے کے خالی گلوں کی ٹرے اٹھائے سکھاں کھڑی تھی۔

”تم میرے کمرے میں آؤ کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ احتیاط کا دامن تھا وہ بے نیازی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ سکندر کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ اس کی اقلید کرتا۔

”تم سے بابا سائیں یا باجو جتنا بھی سختی سے کبھی یہ بات پوچھنا چاہیں خبردار لگنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے لگتا ہے باجو کو شک ہو گیا ہے۔“

”کوئی بات؟“ سکندر نے ناہم نگاہوں سے اسے دیکھا تو لاریب نے ٹھنک کر تپتی نظروں سے اسے گھورا۔

”اس کا مطلب تم بھول بھی گئے؟“ وہ ناک چڑھا کر تنفر سے بولی تو سکندر جیسے کچھ کتا ہتھکی سے بولا۔

”آپ کو اس بات کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔“ اس کے لہجے کے اعتماد اور مضبوطی نے لاریب کو عجیب سی شکست سے دوچار کر دیا۔

”تم جتنے قابل اعتماد ہوتا میں جانتی ہوں۔ یہ شادی ہو لینے دو پھر میں بیٹوں کی تم سے۔ بہر حال اب تم جاؤ تجھے اور کچھ نہیں کہنا تم سے۔“ رخ پھیر کر وہ برہمی سے کہہ رہی تھی۔ سکندر نے سر آہ بھری اور جس دم پلٹا چوٹ پر ایمان کو ایستادہ دیکھ کر ایک بل کو وہ شپٹا گیا۔ ایمان نے ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر اس کا راستہ چھوڑ دیا۔ سکندر تیر کی طرح سے ٹھٹھا چلا گیا۔ اسے نہیں خبر تھی ایمان نے کس حد تک کچھ سنا تھا یا کیا بات بعد میں لاریب سے کی تھی۔ البتہ وہ متشکر ضرور ہو گیا تھا۔ بلکہ غیر شعوری طور پر

ایمان کی طرف سے باز پرس کا بھی خطر تھا مگر کل کی رات آج کا سارا دن گزر گیا ایمان سے اس کا متعدد بار سامنا ایمان نے کوئی بات نہیں کی اور اب جبکہ وہ کسی حد تک قناعت ہی ایمان نے اسے بلوایا۔ سکھاں اس کا پیغام لا سکندر کے دماغ میں خطرے کا الارم بجھنے لگا۔

”جاؤ تم آتا ہوں میں۔“ سکھاں کو ٹال کر وہ کچھ دیر بیٹھا وہیں کھڑا رہا۔ جانے رات ایمان نے لاریب سے کس بات کی تھی اور کیا کچھ اگلوایا تھا۔ وہ یکسر لاعلم تھا۔ ایک جی چاہا ایمان کے پاس جانے سے قبل لاریب سے حال معلوم کرے مگر لاریب اس جسارت کو گستاخی سے کرتی اور جانے کیا سلوک کرتی سو وہ اس خیال کو جھٹک کر ہی دل میں اللہ کو یاد کرتا ایمان کے کمرے کی جانب آ گیا۔

”آ جاؤ سکندر۔“ ایمان گویا اسی کی منتظر تھی۔ دستک کے جواب میں فوری جواب آیا۔ سکندر نے سمجھتے ہوئے انداز میں اندر قدم رکھا تھا۔ ایمان آتش دان کے پاس پڑی راکنگ چیمے پر چھوٹ رہی تھی۔

”بیٹھ جاؤ سکندر۔“ ایمان نے جھولنا بند کیا اور ہاتھ سے اپنے سامنے موجود صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ سکندر ست قدموں سے آگے بڑھا اور صوفے پر پر تکلف انداز میں ٹک گیا۔

”تم جانتے ہو سکندر لاریب کچھ آپ سیٹ ہے عباس والے معاملے کو لے کر آج کل کچھ روڈ زیادہ دور ہی ہے آئی ڈونٹ نو کہ اس کابی ہیو بر تمہارے ساتھ اتنا باہر لی کیوں ہوتا ہے مجھے تم سے۔ یہ کہنا تھا پلیز اس کی باتوں کا ہر امت مانا کرو۔“ ایمان کی بات پر سکندر کا جانے کب کا رکا ہوا سانس بحال ہوا تھا۔ وہ ہتھکی سے سر کو جنبش دینے لگا۔

”آپ فکر نہ کریں ایمان بی بی! مجھے ان کی کوئی بات ہری نہیں لگتی۔“

”صرف اس کی بات؟“ ایمان نے کسی قدر گہری نظروں سے اسے دیکھا اور سکندر کو خود کو کمپوز رکھنا دیکھ رہا تھا۔

”نہیں آپ امامہ بی بی اور بابا سائیں کی بھی میرے لیے آپ سب قابل احترام قابل قدر ہیں۔“ اس نے فی الفور معاملہ سنبھالا بہر حال ابھی خطرہ ٹلا نہیں تھا۔

”لیکن میں چاہتی ہوں سکندر تم ہم سب سے زیادہ لاریب کا خیال رکھو۔ میں نے بچپن سے ایک بات نوٹ کی

بچپن سے شعوری یا لاشعوری طور پر تم سے انچ رہی ہے۔ انچ منٹ ضروری نہیں ہے اپنا امانیت محبت اور احترام کی کنٹرولی میں ہی رکھ دو۔“ اس کی ایک اور کنٹرولی ہے وہ ہے مقناطیسی کشش سکندر ہر انسان ایک ایسے دوست کا لاشعوری طور پر ضرورت مند ہوتا ہے جو اتنا کولڈ ہو کہ انسان اپنی ہر فیلنگ اس پر آشکار کر دے چاہے غصے میں ہی کئی وہ اس پر گرے برے اپنا پیش نکالے اور پرسکون ہو جائے۔ سکندر میں نے غصوں کیا ہے تم لاریب کے۔ لے ایسے ہی دوست ثابت ہوئے ہو۔ وہ جو انہیں ہم سے نہیں کر سکی ہے مادہ بھی اس نے تم پر آشکار کر دی ہوں گی یہ میرا یقین نہیں میرا شک ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے انسان جوش غصے اور طیش میں مصلحت سے دامن چھڑا لیتا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو سکندر میں کیا کہہ رہی ہوں؟“ دھیمے سروں میں بولی ایمان ایک دم اس سے سوال کر گئی اور ایک ٹرائس کی کیفیت میں اسے سنتا اس کے قیافوں کی درستی پر دل ہی دل میں سر دھنتا ہوا سکندر ہڑبڑا سا گیا اسے فوری طور پر سمجھ نہیں آئی اب یہاں اسے کیا کہنا چاہیے کہ ایمان مطمئن ہو سکے۔

”سکندر تم مجھے بتاؤ پلیز کیا میں تم سے یہ توقع رکھ سکتی ہوں؟“

”آپ بالکل بے فکر ہو جائیے ایمان بی بی! میں ان کا ہمیشہ بہت خیال رکھوں گا۔“ سکندر نے یہ بات بہر حال دل کی پوری سچائی سے کہی تھی جی ایمان کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی اس نے ممنونیت سے سکندر کو دیکھا۔

”جھینک یو سوچ سکندر تم نے میرے دل کا بہت بڑا بوجھ ہلکا کر دیا۔ میں ہمیشہ تمہاری ممنون رہوں گی۔ بابا سائیں کے لیے ہمیشہ یونہی ہی مقدم اور امامہ کے لیے بھائی کا کردار نبھاتے رہنا۔“

”ایمان بی بی آپ دل چھوٹا کیوں کرتی ہیں؟ آپ کہیں دور نہیں جائیں گی جب جی چاہے ملتا جایا کیجیے گا۔“ سکندر اس کی آنکھوں میں چلتی نمی دیکھ کر گویا اس کی ڈھارس بندھانے کو بولا۔ ایمان نے ہونٹ سمجھ کر انڈی سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش میں سرخ چہرہ اجمکایا۔ سکندر دل گرفتہ سا تھا کہ کمرے سے جا رہا تھا۔ جبکہ ایمان کے آنسو گالوں پر اتر آئے تھے۔

اسے جیسے بٹھائے جانے کیا سوچھی کہ ڈاکٹر زینب سے ملنے کا پروگرام بنالیا۔ ابھی کچھ دیر قبل نہائی تھی۔ بال ڈرائیر سے

خٹک کرنے کے بعد یونہی سیٹ کر کچر لگا دیا۔ ایک تنقیدی نگاہ اپنے لباس پر ڈالی۔ دھنک کے رنگوں جیسا یہ لباس اسے اس کی برتھ ڈے پر مام نے گفٹ کیا تھا۔ جسے آج پہنی مرتبہ اس نے زیب تن کیا تھا تو گویا یہ لباس اس کے وجود پر آ کر خود پر نازاں ہو گیا تھا۔ اتنا ہی جاتا تھا اسے یہ لاٹک شرٹ ٹراؤزر اور بڑا سا روپے کی جسم کی آرائش کی اسے کبھی بھی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ اسے قدرت نے بہت فیاضی سے حسن کی دولت سے مالا مال کیا تھا پھر یہ تو اس کا لوجوانی کا دور تھا۔ نو خیزیت اور عنایت اس پر ٹوٹ کے بری تھی۔ سیل فون اپنے بیگ میں ڈال کر اس نے بیگ کاغذ سے پڑا اور کمرے سے نکل آئی۔

”نستے جی!“ سب سے پہلے اسے گھر کی ملازمت سے دیکھا اور فوری طور پر ہاتھ جوڑ کر نسکار کیا۔ مندی نے اسے نظر انداز کر لی راہداری عبور کر لی لان کی جانب آ گئی۔ وہیں سریتا دیوی دیو اور دھرمیندر کے ہمراہ شام کی چائے پینے میں مصروف تھے۔ دونوں پتی پتی نے حیرت جبکہ دیو نے خوشگوار حیرت میں جھٹلاہو کر اسے دیکھا۔ درنہ وہ لوگ تو اسے گھر میں اس کے کمرے کے علاوہ کہیں دیکھنے کو ہی ترس گئے تھے۔ دھرمیندر باپو نے اسے دیکھ کر مسکراہٹ اچھائی جس میں شفقت و محبت نہیں عجیب سی چالو سانس سی ریا کاری تھی۔ مندی نے یہاں بھی نظر اندازی کا حربہ اپنایا اور سریتا دیوی سے بولی۔

”مام! میری گاڑی کی چابی آپ کے پاس ہے؟“

”ہاں! تم بھی گاڑی استعمال نہیں کرتی تھیں تو.....“

”مجھے چابی چاہیے۔“ مندی نے اس کی بات کاٹی۔

”مگر بیٹا وہ.....“

”آپ میری گاڑی لے جائیے۔“ دیو نے فی الفور اپنی گاڑی کی چابی پینٹ کی جیب سے نکال کر اس کی سمت بڑھائی۔

”تو ٹھیکس میں کسی کا احسان لینے کی عادی نہیں ہوں۔ مام مجھے گاڑی کی چابی دیں۔“ اس نے رکھائی سے کہہ کر پھر سے سریتا دیوی کو مخاطب کیا۔

”مگر تم جا کہاں رہی ہو اکیلی؟“ انہوں نے پہلے ملازمہ کو کمرے سے چالی لانے کا کہا پھر مندی سے پوچھا۔

”کیا میں اکیلی نہیں جا سکتی یا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں رہا؟“

”مندنی فضول باتیں مت کرو۔ جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“ سریتا دیوی نے اسے ڈانٹا۔



”آپ کی اس بات کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔“ ان کے تنک اور پھرے ہوئے انداز نے نندنی کے خوابیدہ سرکش جذبول کو جگادیا۔

”ٹھیک ہے تمہیں جہاں کہیں بھی جانا ہے دیو تمہارے ساتھ جائے گا۔“ انہوں نے ہنوز اسی لہجے میں کہا۔

”سوری میں آپ کی یہ شرط نہیں مان سکتی۔“ نندنی نے دوبارہ جواب دیا اس کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔

”تو پھر ٹھیک ہے تم گھر سے باہر نہیں جا سکتیں۔“ ان کے لہجے کی نئی نندنی کے اندام گم بھر کا دی۔ اس سے قبل کہ وہ جواب میں کچھ کہتی اور جھگڑا طویل پکڑتا تب ہی مصلحتاً خاموشی اختیار کیے ہوئے دیو نے چپ کو توڑا۔

”پلیز مام نندنی کو جانے دیں۔“

”مام میں نے کہا نا نندنی کو جانے دیں۔ آپ کو بہر حال اس کا حق نہیں ہے کہ آپ اسے گھر میں قید کریں۔ نندنی جانیے آپ اور یہ یقین رکھیے گا پلیز کہ یہاں آپ کے ساتھ نہ تو کسی قسم کی زبردستی ہوگی۔ نہ آپ نے یا کسی۔ نہ پال کیا جائے گا۔“

دیوہ جب مام سے بات کرتے ہوئے تھا تو نندنی کو مخاطب کرتے ہی اس کی آنکھیں جانی رہیں۔ نندنی نے جواب میں کچھ کہے بغیر سر و نظروں سے اسے دیکھا اور گاڑی کی چابی مام کے ہاتھ سے اچک کر پورے ٹیکو کی جانب بڑھ گئی۔

”تم نے اچھا نہیں کیا دیو! مام کا لہجہ احتجاجی تھا۔“

”مام نندنی زر خرید غلام نہیں بنی ہے آپ کی۔ اپنی محبتیں تو اس سے چھین ہی چکی ہیں اب اس کے جائز حقوق مت چھینیں ورنہ شاید آپ ہمیشہ کے لیے اسے کھودیں۔“ دیو زری ورساں سے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا رہا جسے پتہ نہیں وہ سمجھی بھی یا نہیں۔

نندنی نے گاڑی ڈاکٹر زینب کے گھر کے سامنے پارک کی۔ گھر کے باہر موٹر سائیکلیں اور کچھ گاڑیاں پہلے سے کھڑی تھیں وہ سمجھنے سے قاصر رہی کہ یہ رش کس سلسلے کی کڑی ہے۔ اپنی گاڑی دیگر گاڑیوں کے ساتھ کھڑی کر کے وہ اپنا بیگ اور دوپٹہ سنبھالتی باہر نکلی اور ڈاکٹر زینب کے گھر کے دروازے پر آن رکی۔ گیٹ سے ملحق ڈرائنگ روم کا ڈبل دروازہ تھا۔ جالی دار دروازہ بند جبکہ دوسرا کھلا تھا۔ اسی کھلے ہوئے دروازے کے

باعث اسے یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ اندر بہت سے لوگ مکرانے نفوس کی موجودگی کے باوجود وہاں خاصا سا شور مچا رہے تھے۔ صرف ایک بھاری بارعب مردانہ آواز گونج رہی تھی۔ نندنی ابھمن کا شکار ہوئی جیسی صدمت حال سمجھنے کی کوشش میں رک گئی۔

عزیزان من! ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ ایک بار گزرے وہاں ایک نوجوان باغ کو پانی دے رہا تھا۔ آپ سے کہا۔ آپ اللہ سے عشق کا ایک ذرہ بھی کراؤ بیجیے۔ عیسیٰ نے فرمایا۔

”وہ بہت زیادہ ہے تم اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔“ نے کہا اچھا آدھا ہی سہی۔ حضرت عیسیٰ نے دعا فرمائی کہ میں نے عطا فرما دیا۔ آپ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ایک گزرنے کے بعد پھر وہاں آئے تو دیکھا کہ نوجوان جانے

ہے۔ آپ نے دعا کی ”اے اللہ اس نوجوان سے میری ملاقات کراؤ بیجیے۔“ وہ نوجوان آیا اور آسمان کی طرف ہلکا ہوا آپ کے سلام کا جواب دیا نہ گفتگو کی اور خاموش رہا۔

جب وہی الٹی آئی۔

”آپ نے حضرت علی اور حضرت ابراہیم کا واقعہ بھی سن رکھا ہوگا۔ یہ عشق حقیقی ہی ہے جو انسان کو محفوظ کر لیتا ہے۔“

نندنی کو لگا تھا اس کے وجود کے روٹنے کھڑے ہونے ہوں۔ یہ کیسی داستان سنی تھی ابھی اس نے۔ عشق حقیقی؟ کیا عشق ہے؟ ایک عشق ایک محبت تو اس نے بھی سنی تھی۔ اس کی کیفیت بھی کچھ اس سے مختلف تو نہیں تھی۔ وہ بھی تو ہر احساس ہر خوشی سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اسے اپنا دل پانی بن کر بہت محسوس ہوا۔

بعض اوقات عشق مجازی بھی عشق حقیقی کا باعث بن کر رہتا ہے۔ اللہ کریم جب کسی دل میں قیام فرمانا چاہتا ہے تو پہلے وہاں کسی اور کو ٹھہرا کر دیکھتا ہے آیا یہ زمین میری محبت کے لیے نئی زرخیز ہے۔

”بی بی صاحب! آپ؟ اندر تشریف لے چلیے۔ بیگم صاحبہ

اندر ہیں۔“ وہ یونہی اطراف سے بیگانہ گم مگر ہی تھی جب اپنی دھیان میں زینب کی ملازمہ باہر آئی تھی اسے دیکھا تو گویا اس کی راہنمائی کی۔ نندنی چونکی پھر خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کرتی آگے بڑھ گئی۔ وہ ابھی دالان کے آغاز پر تھی جب زینب ٹرے اٹھائے لیکن سے اپنے دھیان میں باہر آئی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی خوشگوار قسم کی حیرت میں مبتلا ہو کر رہ گئی۔

”نندنی تم؟ آؤ نا! زینب نے ٹرے سے بیس ٹبل پر رکھی اور بڑھ کر بہت تپاک سے اسے گلے لگایا۔

”زینب! نندنی تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے کتنا اچھا لگ رہا ہے بتاؤ نہیں سکتی۔“ نندنی نے دیکھا اس کی آنکھیں اس کے ہونٹوں کی طرح سے مسکرائیں تھیں۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ نندنی نے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھیں پھٹکتی جا رہی تھیں۔

”میرا آپ سے ملنے کو جی چاہا بس چلی آئی۔“

”بہت اچھا کیا آؤ اندر چلتے ہیں۔“ زینب نے پہلے ملازمہ کو لیکر کمرے ڈرائنگ روم میں پہنچانے کی تاکید کی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

”آئی تھنک میں کچھ غلط وقت پر آئی ہوں۔ آپ کے ہاں گیٹ آئے ہیں نا؟“ نندنی قدم بڑھاتے کچھ ہچکچاتی تھی۔

زینب کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

ایسا ہے تو نندنی تم یہ گیٹ عثمان لے جی۔ میں نے کافر تو ختم ہو چکا۔ انچولی ان لے تمام لوٹیں جو مسلم بھی ہیں ویسکی وعظ سننے آتے ہیں۔ عثمان کو خود بہت شوق ہے دعوت اسلام کا تو.....“

”کیا یہ آپ کے اسلام سے ری لینڈ گفتگو تھی جو میں نے ابھی سنی؟“ نندنی کے سوال پر زینب کی مسکان کچھ اور گہری ہو گئی اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی پھر اس کا متغیر چہرہ دیکھ کر بولی۔

”مجھے تمہاری طبیعت اچھی نہیں لگ رہی ہے خیریت؟“ وہ اسے کمرے میں لے آئی۔ نندنی تھکے تھکے سے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

”میں جب یہاں آئی تو میرا موز بہت بہتر تھا گو کہ گھر سے نکلتے ایک بار پھر مام سے ٹکرا رہی تھی مگر میں نے ان کی بات کو سر پر سوار نہیں کیا تھا مگر.....“

”مگر کیا؟“ ڈاکٹر زینب نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو نندنی کے چہرے پر کچھ اور اضطراب بکھر گیا۔

”آپ کے ہر جینڈ عثمان صاحب کی باتیں سن کر مجھے عجیب لگا میں کچھ سمجھنے سے قاصر رہی ہوں۔“

”کیا بات سمجھ نہیں آئی نندنی؟“

”آپ نے اپنے اللہ کو دیکھا نہیں ہے پھر اس سے محبت کیسے کر لیتے ہیں؟ اتنی شدید محبت کہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”نندنی اس کا بہت سادہ اور آسان فہم جواب ہے۔ دکھائی تو خوشبو بھی نہیں دیتی مگر احساس میں کس درجہ اثر پذیر ہے۔ درد اور تکلیف بھی نظر نہیں آ سکتی مگر اس کا احساس اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ صحیح معنوں میں زمان و مکان کو فراموش کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مالک کائنات اور ایک عام انسان میں یہی فرق تو ہے۔ وہ نظر نہ کر بھی ہر جگہ اپنا احساس دلاتا ہے دکھائی نہ دے کر بھی کائنات کے ذرے ذرے سے عیاں ہے انسان جب کبھی خود کو تنہا پاتا ہے اللہ کو اپنے نزدیک محسوس کر لیتا ہے لیکن بات ساری ایمان کامل اور بھروسے کی ہے۔ اگر بھروسہ نہیں تو کوئی احساس نہیں۔“ ڈاکٹر زینب نے اپنی بات مکمل کی اور نندنی کو دیکھا وہ جیسے الجھے ہوئے رہ گئے مگر اس نے ہنوز نا کام تھی۔

”تم نے یہ نہیں سمجھا ہے لے جائے الٹی جہاں.....“

چلی گئی۔ نندنی وہاں پہنچنے لگی۔ یہاں سے وہ تھا۔ انے اتے کہیں کا بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ڈاکٹر زینب کی تمام باتیں گویا اس کی سمجھ سے بہت اوپر سے پرواز کر گئی تھیں۔

اس نے سخت جھنجھلا کر درتے کچے کا پردہ چھوڑا اور کمرے کے وسط میں ٹپکتے ہوئے بے دردی سے ہونٹ کپکپے کسی بلی جھین نہیں تھا۔ سکندر کب کا بابا سامنے کے کمرے میں گھسا ہوا تھا وہ اس کی منتظر تھی اس سے پوچھنا چاہتی تھی ایمان نے کیا بات کی اس سے مگر وہ ہتھے ہی نہ چڑھ رہا تھا۔

”میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی عباس حیدر کہ محض تمہاری وجہ سے میں ایک معمولی انسان سے خائف رہنے لگی ہوں۔“ اس نے ایک بار پھر عباس کے تصور سے شکوہ کیا اور آنکھوں کی نمی صاف کر کے درتے کچے کی جانب آ گئی۔ پردہ ہٹایا تو سکندر بابا سامنے کے کمرے سے نکل کر اپنے دھیان میں راہداری عبور کر رہا تھا۔

”سکندر!“ وہ کانٹوں پر پھیلی براؤن مردانہ گرم چادر کی

207

آپٹل 207 مئی 2013ء

206

آپٹل 206 مئی 2013ء



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ ٹھکانہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور ایچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سلیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ویڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، سپر ایڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسی کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety7

باعث لگی تھی۔

”یہ اکٹھے سونے والا آئیڈیا باجو کا تھا بہت زبردست مجھے کتنا اچھا لگتا ہے نارات کو اکٹھے سونا ایسا وقت تو ہم اتنے سالوں میں کبھی نہیں گزارا۔ باجو جب شادی کے آپ یہاں رہنے لگا یا کریں گی جب پھر ہم اکٹھے ہو کر سو یا کریں گے ٹھیک ہے نا۔“ امامہ نے ایمان کے گلے میں بازو دھار کر دیئے تھے۔

”اور وہ جو جن صاحب ساتھ آیا کریں گے بھلا وہ انہیں ہمارے ساتھ سونے کی اجازت کیوں دیں گے۔“

”دقاس بھائی کی بات کر رہی ہیں؟“ امامہ نے ٹھٹھک کر پوچھا تو لاریب کچھ اور سلگ گئی۔

”تو اور کس کی کروں گی؟“

”اچھا چھوڑو ان باتوں کو اب سو جاؤ۔“ ایمان نے ٹوکا امامہ چل گئی۔

”ہرگز نہیں باجو آج ہم بہت ساری باتیں کریں گے رات بھر جاگ کر۔“ امامہ اس سے لپٹ گئی ایمان نے جھک کر اس کی پیشانی چومی تو ہزار مضطرب کے باوجود آٹھ کھ کی نمی اس کے چہرے پر بھگو گئی۔ امامہ چونک گئی۔

”باجو آپ دور ہی ہیں؟ بٹ وائے؟“

لاریب میری جان ادھر آؤ میرے پاس۔“ ایمان نے امامہ کی بات کو نظر انداز کیا اور لاریب کو دیکھ کر بازو پھیلائے۔

لاریب کچھ کہہ بغیر سرک کر اس کے نزدیک ہو گئی۔ ایمان کے آنسو دیکھ کر خود اس کا اپنا دل بھی پگھل گیا تھا۔ رات گئے تک وہ تینوں باتیں کرتی رہیں۔ اپنے بچپن کی اپنی ماں کی پھر امامہ اور لاریب نیند کی آغوش میں اتر گئیں جیسے جبکہ ایمان کی آنکھوں سے نیند کو سوں دور تھی۔ اس کے سیل پر شرجیل کا بیج آیا۔

”میں حویلی کے باہر تمہارا منتظر ہوں۔ ایسی جلدی باہر آؤ پلیز۔“ ایمان کسی معمول کی طرح آگئی۔ باری باری لاریب اور امامہ کو ڈھیر سا راپا کر کیا اور درود دیوار پر حسرت زدہ نگاہ ڈال کر آنسو پونچھتی باہر نکل گئی۔ اس کا سیل فون وہیں ٹیبل پر پڑا رہ گیا تھا۔

(جاری ہے)

بکل مارتے ہوئے اس آواز پر ٹھٹھک گیا۔ خائف سی نظروں سے پلٹ کر دیکھا وہ اپنے کمرے کے درتے میں کھڑی اشارے سے بلا رہی تھی۔ سکندر نے بے بسی سے لمبریز طویل سانس کھینچا اور احتیاطاً اس کے کمرے کی جانب بڑھنے سے ہل اطراف میں نگاہ کی۔ رہبرداری سنسان پڑی تھی۔

”آؤ۔“ اس کی دستک سے بھی پہلے لاریب نے دروازہ کھول دیا تھا۔ سکندر نے بھاری دل سے اندر قدم رکھا اب یہ پیشی جانے کس سلسلے کی کڑی تھی۔ وہ حج معنوں میں اس سے خائف رہنے لگا تھا۔ یہ تنہائی یہ قربت اور سب سے بڑھ کر اس پر موجود استحقاق اسے اس کے دل کو بے قابو کرنے لگتا تھا۔ وہ خود پر جبر کرتے خود پر پھرے بٹھاتے ہار جاتا مگر وہ کسی بے نیاز تھی کہ پرواہی نہ کرتی تھی۔ عجیب لڑکی تھی نہ اس کی خلوت سے گھبرائی نہ تنہائی سے شاید وہ اسے کسی قابل سمجھتی ہی نہ تھی یا پھر اس پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ کسی اس کے سامنے آنکھ نہیں اٹھا سکے گا۔ سکندر یہی اعتماد قائم رکھنا چاہتا تھا۔

”باجو نے بلوایا تھا تاہمیں؟ کیا پوچھ رہی تھیں؟“

”ایسی کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے آپ حوصلہ رکھیں۔“ سکندر اسے دیکھنے سے دانستہ گریز کر رہا تھا کہ خود کا زماںش میں ڈالنا اور پھر اس آزمائش سے نبرد آزما ہونا آسان نہیں تھا مگر لاریب نے اس کا کچھ اور ہی مطلب لیا جیسی ڈانٹ کر بولی۔

”بھرموں کی طرح سے نظریں جما کر بات کیوں کر رہے ہو؟ میری طرف دیکھ کر کہو یہی بات تاکہ میں تمہارے حق اور جھوٹ کو سمجھ سکوں۔“

”میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا بی صاحبہ؟“ وہ جیسے ذرا ہوا۔ لاریب نے ہونٹ سمیٹ لیے۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی کچھ اس میں مجھے آپ سب کا بہت خیال رکھنے کی تاکید کرنی رہی۔“

”لو کے فائن تم جاسکتے ہو۔“ اسے کچھ دیر تک تیز نظروں سے گھومتے رہنے کے بعد لاریب نے کہا تو سکندر گویا سر پر پیر رکھ کے بھاگا۔ سکندر کے کمرے سے جانے کے چندہرے منٹ بعد امامہ اور ایمان وہاں آئی۔ امامہ چپک رہی تھی جبکہ ایمان معمول سے کہیں زیادہ خاموش کم صم اور اس نظر آتی تھی۔ کل سے مہمانوں کی آمد کے ساتھ گھر میں شادی کی تقریبات بھی شروع ہو جاتیں۔ لاریب کو اس کی اداسی اسی جدائی کے



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ نادر پاکستانی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نادر کوالٹی، سپر سڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ویڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

## WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

مجھے حکایتیں  
ام مرتبہ





غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا کیا اب تم سے بیان کریں  
غم بھی راس نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں  
ایک ٹھکانہ آگے آگے پیچھے پیچھے مسافر ہے  
چلتے چلتے سانس جو ٹوٹے منزل کا اعلان کریں

### گزشتہ قسط کا خلاصہ

یہ کہانی نندی گریوال سے شروع ہوتی ہے جس کا تعلق دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد سے ہے باپ کرچن جبکہ ماں ہندو ہے نندی اپنی ماں کے ساتھ انڈیا میں جب کہ اس کا بھائی باپ کے ساتھ امریکا میں مقیم ہے۔ برسوں قبل امریکا میں نندی کسی ایشین مرد سے ملتی ہے جس کی شخصیت کا سحر اس قدر اس پر طاری ہو جاتا ہے کہ وہ ہر جگہ اسے باگلوں کی طرح تلاش کرتی رہتی ہے نندی کی ماں سریتا دیوی کے دوسرے شوہر کا بیٹا دیونندی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ سریتا دیوی نندی کو دیو سے شادی کرنے پر مجبور کرتی ہیں جس پر نندی دلبرداشتہ ہو کر اپنی جان لینے کی کوشش کرتی ہے کہانی کا دوسرا اہم کردار عباس حیدر جس کی نسبت بچپن ہی سے اپنے چچا کی بیٹی لاریب سے ملے ہوئے اپنی خاندانی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے شوہر جو ان کر لیتا ہے جس پر سارا خاندان اس سے قطع تعلقی اختیار کر لیتا ہے۔ عباس کے جانے کا سب سے زیادہ اثر لاریب پر ہوتا ہے وہ اندر سے ٹوٹ جاتی ہے دوسری طرف عباس اریشہ سے شادی کر لیتا ہے اس کی شادی کی خبر سن کر لاریب شدید صدمے سے دوچار ہوتی ہے اور حویلی کے خاص ملازم سکندر جو کہ گھر کے ایک فرد کی طرح ہے اسے شادی کے لیے خود پر پوز کرتی ہے سکندر لاریب کو چپکے چپکے دل میں پسند کرتا ہے اور لاریب کی ذہنی حالت اور صدمے کے آگے ہار مانتے ہوئے اس سے کورٹ میرج کر لیتا ہے لاریب عباس کو اپنی اور سکندر کی شادی کی خبر فون پر سناتی ہے جس پر وہ حسد کرنے کے بجائے مبارک باد دیتا ہے جب ہی لاریب کو شدت سے اپنی غلطی اور سکندر کی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے جس پر وہ اپنی جان لینے کی کوشش کرتی ہے کہانی کا تیسرا اہم کردار شرجیل جس کا تعلق جوائنٹ فیلٹی سے ہے

خاندان میں اسے بے حد اہمیت حاصل ہے اس کی چچا اور اعلیٰ جو واجبی شخصیت کی مالک ہے۔ شرجیل کو دل ہی دل میں پسند کرنے لگتی ہے لیکن شرجیل پہلے سے ہی ایمان کو پسند کرتا ہے جس کی نسبت وقاص سے ملے ہے۔ لاریب خوش قسمتی سے بھی جاتی ہے جب کہ سکندر اس کے انتہائی قدم پر ششدر رہ جاتا ہے لاریب کے گھر آنے کے بعد سکندر اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ اس کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں اور ایمان کے سامنے ہی اس پر بگڑ پڑتی ہے دیو کے بار ممانع کرنے کے باوجود سریتا دیوی ایک بار پھر نندی سے دیو کے متعلق بات کرتی ہیں جس پر شدید طیش میں آ کے وہ بالکونی کی چھت سے کود جاتی ہے مگر ایک بار پھر وہ بد قسمتی سے بچ جاتی ہے جس پر دیو اور سریتا دیوی شکر کا سانس لیتے ہیں۔ ڈاکٹر زینب نندی کو بیمار سے سمجھاتی ہیں نتیجتاً وہ ان کے قریب سے قریب تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ دوسری جانب عباس عریشہ کے ساتھ نئی زندگی میں مگن ہے جب کہ لاریب اپنی کی گئی حماقت پر سکندر سے مزید نفرت کرنے لگتی ہے۔ اس کی بیماری کا سن کے ایمان اور امامہ سکندر کے گھر ملنے جاتی ہیں وہ بھی نکاح نامہ لینے کی غرض سے ان کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ نکاح نامہ نہ ملنے کے باعث وہ شدید رنج میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ سکندر کچھ دن بعد جب لاریب کو ڈراپ کرنے جاتا ہے لاریب اس سے نکاح نامہ لے کے جلا دیتی ہے جب کہ سکندر ششدر رہ جاتا ہے۔ دوسری جانب شرجیل ایمان کے گھر رشتہ بھیجتا ہے جو توقعات کے عین مطابق رد کر دیا جاتا ہے جب کہ تایاجی حویلی کے دکھ دکھاؤ و دولت سے بے حد متاثر ہوتے ہیں شرجیل فراز کو ایمان کے بھانجے کا لاکھ عمل بتاتا ہے جس پر وہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ عباس عریشہ کے ساتھ اپنی مومن پر جانے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے جب ہی اسے باپ بننے کی خوش خبری ملتی ہے جس

پر وہ خوش سے جھوم اٹھتا ہے جب کہ عریشہ اس کی اس قدر دیوانگی کو فک کر کر جھپ جاتی ہے۔ شرجیل تائی جی سے اپنے گمشدہ چچا اور چچی سے ملنے کا مقصد بتاتا ہے جس پر تائی جی غصے سے جھوٹی کہانی سنانے لگتی ہیں۔ نندی ڈاکٹر زینب سے ملنے ان کے گھر جاتی ہے جہاں نندی کے شوہر وین اسلام کے متعلق دوسرے دوسرے ہوتے ہیں ان کی باتوں کا نندی پر بہت اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنے گھر جاتی ہے جس کا تذکرہ ڈاکٹر زینب سے بھی کرتی ہے۔ دوسری جانب حویلی میں ایمان اور وقاص کی شادی کی تیاریاں شروع ہو رہی ہیں جب کہ ایمان شرجیل کے ساتھ اپنی آگے کی زندگی آنے کے ساتھ گزراؤں کا تہیہ کرتے ہوئے رات کی باتوں کی باتوں میں اپنے گھر کی دہلیز پار کر جاتی ہے۔

### اب آگے پڑھیں

.....☆☆☆.....  
"فراز تمہارا آج ایڈیشن تھا ناں؟ کیا رہا۔" وہ مایوس و دل گرفتہ بیٹھا تھا جب ہی صالحہ نے اندر جھانک کر فراز سے پوچھا تو فراز کی جان ہی جل کر رہ گئی۔  
"ہیلے ایک گلاس پانی پلاؤ پھر بے حد اسٹراٹک قسم کی چائے پیش کر دو گی تو بتا سکتا ہوں۔" یہ بھی جان چھڑانے کا ایک طریقہ تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا صالحہ کام کی لٹنی چورے مگر صالحہ بھی گویا اسے حیران کرنے پہ تلی ہوئی تھی۔ فراز کی آنکھیں اس وقت پچنی کی پچنی رہ گئیں جب وہ دس منٹ کے وقفے سے ٹرے میں اس کی دونوں مطلوبہ چیزوں کے ساتھ حاضر تھی۔  
"چلو بولو اب فٹ۔" ٹرے میز پر رکھنے کے بعد خود اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی۔ فراز اچھا خاصا جڑ بڑ ہو گیا تھا۔  
"تم اس بات کو چھوڑ دو مہات کرسٹ جس کے لیے یہ مشقت کاٹی ہے میری ذات میں تمہیں اتنی دلچسپی کب سے پیدا ہو گئی ہے۔" فراز کے برعکس است جملہ پر صالحہ کی کھسیا ہٹ دیکھنا لگی تھی۔  
"تم بہت بکواس ہو فراز؟"  
"نئی اطلاع میرے لیے۔" فراز نے اطمینان سے کہتے ہوئے گلاس خالی کر کے چائے کا گام اٹھالیا۔  
"وہ فراز..... تمہیں شرجیل کا کچھ پتا ہے؟ بالکل ہی غائب ہے کتنے دنوں سے۔" سوال ثابت کر چکا تھا کہ صالحہ کی برداشت اس سے زیادہ نہیں۔ فراز کے چہرے پر معنی خیز مسکان ٹھہری۔  
"میری جہاں تک معلومات ہیں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر گئے ہیں۔"

"کب تک آئے گا؟"

"کیوں..... تمہارا دل نہیں لگتا ان کے بغیر؟" فراز کے اکتا کر پوچھ گئے چکے سوال پر وہ جھپ گئی۔  
"بہت بدتمیز ہو فراز تم بھی۔" فراز نے اس کا اٹھلا نادیکھا اور حیران رہ گیا۔

"میں بدتمیز ہوں؟ نام نہاد بکھیں محترمہ! آدھی سے زیادہ رات گزر چکی اور آپ میرے کمرے میں اطمینان سے بیٹھی ہیں بھلا کون ہوا بے حجاب؟ خود فیصلہ کرو۔" وہ گویا جھلا اٹھا۔

"تم بہت....."

"بدتمیز نہیں ہوں کم از کم جائے سو جائے جا کر اور محترم کی فکر چھوڑ دیجیے وہ آپ کے دامن میں آنے والے نہیں خواںخواہ اندر جی ویسٹ کرنے کا فائدہ۔" فراز نے نخوت سے کہا اور اسی ناگوار موڈ کے ساتھ کپ پختا ہوا واش روم میں جا گھسا۔



نیم غنودگی کی کیفیت میں لاریب نے کروٹ بدلی پھر کسمسلا کر آنکھیں کھول دیں امامہ اس سے کچھ فاصلے پر نیچے میں منہ گھسیڑے سردی سے سکڑی سو رہی تھی۔ لاریب نے یونہی لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھایا اور اس پر کبل کھینچ دیا ایمان بغیر پر نہیں تھی اس نے انگریزی لے کر اٹھتے ہوئے نیم و آٹکھوں سے دواں روم کی سمت دیکھا دروازہ کھلا ہوا تھا وہ لباس درست کرتی بستر سے اتر گئی۔ بالوں کو جوڑنے کی شکل میں لپیٹے اس نے آگے بڑھ کر ٹیرس کا دروازہ کھولا تو دھند کے بگولوں اور سرد ہوا کے جھونکوں نے جسم میں پھریری سی دوڑا کے رکھ دی اس نے جلدی سے دروازہ بند کرتے ہوئے قدم پیچھے ہٹا لیے۔

"باجو اتنی جلدی کیسے اٹھ گئیں؟" وہ بڑبڑاتی اور انٹر کام کی سمت آ کر ریسور اٹھالیا۔ ایمان کے کمرے میں رابطہ کیا مگر گھنٹیاں بجتی رہیں ایمان نے رسپانس نہیں دیا تھا۔ وہ قدرے جھنجھلائی اور ریسور رکھ کر واش روم میں چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر اسٹینڈ سے تولیہ کھینچا اور منہ پونچھتے باہر آئی تو امامہ کو بستر پر بیٹھے بچوں کی طرح دونوں آنکھیں مسلتے دیکھ کر گہرا سانس بھرا۔  
"باجو کہاں ہیں؟" امامہ نے اس پر نگاہ پڑتے ہی کسمندی سے سوال کیا۔

"انہیں ہی بلانے جا رہی ہوں تم فریش ہو جاؤ پھر اسٹینڈ پر بیٹھ کر بیٹھ کے سر ہانے دو پتہ اٹھا کر کاندھے پر ڈالتی وہ لے لے لے لے خود باہر نکل گئی ایمان کا کمر لہلہادی کا خری سرے



پر تھا شفاف بلندی میں دھند اور سردی کا احساس غالب تھا۔ لاریب نے تاب گھما کر باؤں اور دھند سے بچاؤ رکھنا چلا گیا۔  
 ”باجو کہاں ہیں آپ؟“ اس نے اندر قدم رکھتے ہوئے پکارا  
 جواب نہ ملا تھا اور کمرانم ہار یک لاریب نے آگے بڑھ کر لائش  
 آن کی تھیں کمرانہلی تھا اور بسترے شکن وہ حیران سی کھڑی رہ گئی۔  
 ”یہ باجو اتنی صبح کہاں چلی گئیں؟“ اس نے خود کلائی کے  
 انداز میں کہا اور لائے قدموں باہر نکلی تو سب سے پہلا سامنا  
 سکندر سے ہوا۔

”سکندر بات سنو ذرا۔“ اس نے بے اختیار اسے ہی زور  
 سے پکارا تو سکندر چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا اور رک کر  
 سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا کیسی نظریں تھیں اس کی ہمیشہ کی  
 طرح نرم لودنی گدزی۔

”تم نے باجو کو دیکھا..... وہ اپنے کمرے میں نہیں ہیں؟“  
 ”تو کہیں اور ہوں گی۔ لان میں یا پھر کچن میں وہاں  
 دیکھا؟“ سکندر نے اس کی پریشانی اور اضطراب کو کچھ تحیر آمیز  
 نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”تم لان میں دیکھ کر آؤ میں کچن کے علاوہ لاس کے کمرے  
 میں بھی چیک کر کے آتی ہوں۔“ لاریب نے اسی نظریں گھبراہٹ  
 اور تشویش زدہ انداز میں کہا اس کے لڑتے قدم کچن کے دروازے  
 پر آ کر رکے ملازما میں ناشتے کی تیاری میں مصروف خوش گئیں  
 گرہری تھیں اسے دیکھ کر یکدم مستعد ہو گئیں۔

”کچھ چاہے بی بی صاحبہ؟“ لاریب نے غائب دماغی کی  
 کیفیت میں سر کوئی میں جنبش دی اور واپس ہوئی۔ جب وہ امامہ  
 کے کمرے سے نکلی تو اس کا دماغ صحیح معنوں میں سن تھا۔

”ایمان بی بی وہاں لان میں نہیں ہیں۔“ سکندر نے اسے  
 اطلاع پہنچائی تو لاریب نے آنکھوں میں اترتے اندھیروں کو  
 واضح محسوس کیا تھا۔

”آپ نے ان کے کمرے میں دیکھا؟“ سکندر اب خود بھی  
 بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔  
 ”ہر جگہ دیکھ چکی ہوں۔“ اس کی آواز بھرتی لوت آنکھوں میں  
 نمی اترنے لگی۔

”ہو سکتا ہے جب آپ نے دیکھا ہو وہ دھند میں ہوں  
 جا کہاں سکتی ہیں؟ آئیے پھر دیکھتے ہیں۔“ سکندر نے رسائییت  
 سے کہتے اسے سلی دی تو لاریب ایک لفظ کہے بغیر وحشت زدہ  
 دل کے ساتھ اس کے ساتھ ہوئی۔ سکندر نے اندازاً کر پہلے

میرس اور ڈرائنگ کے کھلے دروازوں سے جھانکا پھر وائش ریم کا  
 بند دروازہ چھتیا کر یا قاعدہ آواز دی۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ یہ واقعی  
 قابل تشویش بات تھی ایمان یوں بنا اطلاعات کہاں جاسکتی تھی وہ  
 بھی اتنی صبح کہاں بھی سورج بھی پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا۔  
 لاریب تو بے جان ہوتی ٹانگوں سمیت وہیں بیڈ پر گر گئی کے  
 انداز میں بیٹھ گئی۔ اس کا رنگ ہرگز رستے لمحے کے ساتھ بے پروا  
 جا رہا تھا کسی انہونی کا احساس اس قدر گہرا تھا جو دل کو بے پروا  
 سے سسٹا تھا اب تو سکندر بھی اس صحت حال پر اپنے اضطراب  
 پر کنٹرول کھتا بے حد زور نظر آ رہا تھا اس نے اسی بے چینی میں  
 نظریں گھما کر کمرے کا جائز لیا ہر شے سلیتے۔ اپنی جگہ پر  
 تھی کوئی کی بیشی تھی نہ بے ترتیبی۔ اس نے کسی خیال کے تحت  
 آگے بڑھتے ہوئے ڈرائنگ ٹیبل کی درازیں کھول کر دیکھیں  
 ان میں جیولری باکس کا سٹیکس کی چیزیں ازلی ترتیب سے نظر  
 آئیں۔ بیڈ کے سر ہانے رکے اس نے جھک کر تکیہ اٹھا یا تب  
 اس کے ہاتھ اور نظریں اک ساتھ ساکن رہ گئی تھیں۔ تکیہ جتنے ہی  
 اک تہہ شدہ کاغذ سامنے آ گیا۔ اس نے پھینچتے ہوئے ہونٹوں  
 کے ساتھ وہ کاغذ اٹھا یا اس کے خدشے کی تصدیق ہو چکی تھی۔  
 لاریب جو ابھن آمیز نظروں سے اس کی حرکات و سکنات دیکھ  
 رہی تھی اسے اس کاغذ کو اٹھاتے دیکھ کر لمحہ بھر کو بخمد رہ گئی۔ اگلے  
 لمحے وہ بے حد تیزی سے اٹھی اور تقریباً جھپٹ لینے کے انداز میں  
 اس سے وہ کاغذ کا ٹکڑا چھین لیا۔ سکندر نے اس حرکت کے جواب  
 میں کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں دیا۔ لاریب نے کانٹے ہاتھوں کے  
 ساتھ کاغذ کھولا اور خدشات سے لرزتی نگاہ کو ہاشکل تحریر پر جمایا۔  
 ”باباجان از زندگی کے کسی مرحلے پر مجھے اس طرح بھی آپ  
 سے مخاطب ہونا پڑے گا میں نے سوچا نہیں تھا۔ میں نے بہت  
 دماغ کھایا مگر مجھے اس سوال کا جواب نہیں مل سکا کہ آپ نے  
 اسی طرح ہمیں ہمارے بچپن میں طے کیے اپنے فیصلوں کی  
 سچینٹ جڑ جانا تھا تو ہمیں تعلیم کا شعور کیوں بخشا۔ کیوں زندگی کی  
 طرف کھلنے والے درجوں کے پٹ ہم پر دیا کیے کہ ہمارے دل  
 دماغ فہم و فراست کی آگاہی حاصل کر کے پھر سے بنا آسویگی کے  
 بھند میں چمکاتے پھرتے ہیں۔ آپ کو شاید نہیں پتا باباجان  
 آپ کے اس فیصلے کی بدولت لاریب کس قدر نا آسودہ ہے ایک  
 ایسا شخص جس نے میری ہر لحاظ سے مکمل اور پرفیکٹ بہن کو بغیر  
 کسی وجہ کے ٹھکرا دیا میں اسی کے بھائی کو عمر بھر کے لیے اس اہم  
 بندھن میں اپنا آپ کیسے سوچ دوں جس کی اطاعت اللہ نے

لازم کر دی ہو۔ پھر دل بھی تو آلودہ ہو دھماں مجھے اس حوالے سے  
 کبھی پسینہ نہیں رہا۔ شریل میر لودیت ہے مجھے سب کا دعوے  
 دار باباجان وہ تو جائز طریقے سے مجھے حاصل کرنے کا خواہش  
 مند تھا مگر آپ نے ایسا نہیں ہونے دیا تو مجھے مجھ لایہ قدم اٹھانا پڑا  
 میں آپ کو آپ کی حویلی کو اس لیے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہی  
 ہوں کہ اس کی لوچی فیصلوں میں مجھے اپنا دم گھٹا محسوس ہوتا ہے۔“  
 کانڈ کاغذ لاریب کے کانٹے ہاتھوں سے چھوٹ گیا آنکھوں  
 میں چھائی دھند نے آنسوؤں کی شکل اختیار کر لی ہاتھوں میں چہرا  
 دھانپہ اتنی وحشت سے مدنی کہ سکندر کو کھانا اس سے دیکھتا رہا۔  
 (یہ آپ نے اچھا نہیں کیا بابا جو آپ کو کیا پتا اس حویلی کا اور باباجان  
 کا پسینہ اتنی کتنا نقصان ہو چکا ہے)

سوچیں اسے بالکل بنادینے کے درپے تھیں۔ سکندر جو کسی  
 حد تک سمجھتا حال مجھے چکا تھا اس کے نزدیک آ کر جھکا اور گرا  
 ہوا کاغذ کا پرزہ ہاتھ کی ٹمٹھی میں سمیٹ کر بوجھل قدموں سے باہر کی  
 سمت ہولیا۔

نظر جب اس سے ملتی تھی میں خود کو بھول جاتی تھی  
 بس اک دھڑکن دھڑکتی تھی میں خود کو بھول جاتی تھی  
 اسے ملنے سے پہلے میں بہت بستی سنو رہی تھی  
 مگر جب وہ سنو رہا تھا میں خود کو بھول جاتی تھی  
 میں اکثر یہ ہی کہتی تھی میں تم سے پیار کرتی ہوں  
 مگر جب وہ یہ کہتا تھا میں دنیا بھول جاتی تھی  
 عباس حیدر اپنا پروڈکشن ہاؤس بنانے میں اس قدر مصروف  
 تھا کہ اسے عریشہ کے لیے بھی ٹائم نکالنا مشکل ہو رہا تھا۔ رات کو  
 بھی انتالیس آتا کہ عریشہ سوچ چکی ہوئی۔ عریشہ متعدد بار شکوہ کر چکی  
 تھی وہ ہر بار آئندہ جلدی آنے کا وعدہ کرتا مگر مصروفیت یہ وعدہ  
 ایفانہ ہونے دیے رہی تھی۔ بزنس میں عباس کو نہ تجربہ تھا نہ  
 انٹرسٹ۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اس فیلڈ کا انتخاب کیا یوں عریشہ  
 کی بات بھی رہ جاتی اور روزگار کا سلسلہ بھی چلتا رہتا اس وقت  
 بھی وہ بے حد مصروف تھا جب اس کے سیل پر بیج ٹون بھی پہلے تو  
 اس نے نظر انداز کیے رکھا مگر جب ذرا فرصت نصیب ہوئی تو  
 سیل فون نکالا۔ میج کھولتے ہوئے وہ فریش جوس کے سب لے  
 رہا تھا۔ عریشہ کے نمبر سے آئی اس غزل نے اس کے عنابی  
 ہونٹوں کی تراش میں مسکراہٹ کی الوہی کرنیں بکھیر دیں اس  
 نے اسی وقت عریشہ کا نمبر ڈائل کیا۔

”کہاں ہیں آپ؟“ وہ چھوٹے ہی ٹھنک کر بولی۔  
 ”پچھڑی کی زبان میں بات کی ہے تو میرے جذبات بھی سن  
 لو۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا اور اپنے مخصوص دلنشین لہجے میں بے حد  
 جذب سے گویا ہوا۔

اگر تم پاس ہوتے کرم کی انتہا کرتے  
 تمہیں پلکوں پر رکھتے تمہیں دل میں بٹھاتے  
 اگر تم روٹھ جاتے تمہیں کتنا مناتے  
 تمہاری لغزشوں کو بھی ہنسی میں ہم اڑا دیتے  
 اگر اپنی خطا ہوئی تو خود کو ہی سزا دیتے  
 مگر یہ سب جیسی ہوتا اگر تم پاس ہوتے  
 ”آپ کو ہری ہری سوجھ رہی ہے میں واقعی اس ہوں۔“ وہ

جیسے ہی خاموش ہوا عریشہ نے منہ پھلا کر کہا۔ عباس کو جیسے چو کا لگا۔  
 ”بجیہ یہ مذاں نہیں ہے۔“ وہ صفائی دیئے بغیر نہیں رہ سکا کہ  
 عریشہ کی نفلی جان پر ایسے ہی بتا رہی تھی۔

”تو پھر ان فاسلوں کی وجہ عباس؟ کیوں نہیں آ جاتے  
 میرے پاس۔“ عریشہ کی آواز میں آنسوؤں کی کمی کھلنے لگی۔ اسے  
 روتے پاتر عباس بے کل ہو۔

”اب کام کہاں کر پاؤں گا تھوڑا سا اور انتظار ابھی آ رہا  
 ہوں۔“ وہ اسی پلٹا تھا اور عریشہ اس کا لڑوہ جان کر بھول گئی۔  
 ”اگرے لمبے نہیں پلیر دو دن رہے ہیں رات کے شہر کے  
 حالات پتا ہیں نا آپ کو۔“

”کچھ نہیں ہو گا مجھے میری جان! تم بلاؤ اور میں ناؤں ایسے  
 تو کبھی نہیں ہو سکتا۔“ وہ بڑی ترنگ میں آ کر بولا تو عریشہ جھینپ  
 کر ہنسنے لگی خود پرنازاں اور بے تحاشا فخر کر کے۔

”بھئی کر لیا آپ کی محبتوں اور سچائی کا یقین۔ بس آرام سے  
 بیٹھے صبح آئیے گا۔“ اس کے لہجے میں ٹھکانہ پیار بھری دھول تھی  
 عباس نے منہ نہالیا۔

”ظالم لڑکی! میرے سوتے ہوئے جذلوں کو جگا کر اب  
 پابندیاں لگانا شروع کر دیں۔“ جواب میں پھر عریشہ کی کھنک دار  
 ہنسی تھی جو عباس کے کانوں میں رس گھولی رہی تھی وہ خود بھی  
 مسکرا لیا زندگی مکمل تھی اور بے حد حسین۔ وہ اتنا مطمئن تھا جیسے  
 یزندگی ہمیشہ ایسے ہی تو رہی ہے۔

رخ بستہ ستون سے ٹپک لگائے موسم کی ساری تندہی اور  
 شدت کو سہتے ہوئے جب اس نے فضا میں ابھرنے والی فجر کی



اذان کی پہلی پکار کو سنا تو جلتی ہوئی آنکھوں کو کرب آمیزی کی کیفیت میں بند کر لیا۔ ماحول میں غضب کی ٹھنڈک بھی مگر وجود کے اندر الاؤ دے رہے تھے۔ پچھتاوا اور احساس زیاں مل جل کر اس کے اعصاب کو ٹھنڈے کر چکے تھے۔ خدشات تیز دھار کواری کی صورت سر پر لٹے ہوئے تھے۔ بابا سائیں پر بات چلی تو آنے والے مہمانوں کو روکنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔ حقیقت حال سے آگاہ کرنے کو چاہی بھی شرمندگی اور سبکی سے کبھی مگر بابا سائیں خود گئے تھے بڑی جویلی بڑے بھائی۔ معافی مانگنے مگر پلٹ کر واپس نہیں آ سکے۔ تایا سائیں کو جس بل شرمندگی اور دکھ کی اتھاہ میں ڈوبے وہ صورت حال بتا رہے تھے وقاص حیدر ایک دم کتنا بھروسہ کیا تھا۔ اس نے عادت کے مطابق بے لگائی اور گستاخی کی انتہا کر ڈالی اور طنز کے نشتر چلاتے ہوئے کہا تھا۔

”کیسے مان لوں میں کہو آپ کی ایما کے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھا سکتی ہے چاچا سائیں! چلیں مان بھی لیں کہ ایسا ہوا ہے تو بھی اس میں سب سے زیادہ قصور وار آپ ہی ہیں۔ منع بھی کیا تھا آپ کو اتنی آزادی دینے سے تب آپ کو میری باتیں بڑی لگتی تھیں اکیلی جاتی تھی نا گاڑی میں یونورسٹی پڑھنے وہیں کسی کے ساتھ ساز باز کر لی تو کیا حیرت۔ آپ نے انہیں یہ کھیل رچانے کو پورا ماحول فراہم کیا تھا۔“ باب کے درمیان میں جھڑکنے کو خاطر میں لائے بغیر وہ اپنی بھڑاس طیش زدہ انداز میں نکالتا رہا اور غم کی شدت سے پہلے سے نڈھال بابا سائیں شرمندگی کے اس مقام پر آ کے دل کے کٹا گئے تمام ہمتیں ہار گئے۔ انہیں پہلا ایک ہی بہت شدید قسم کا ہوا تھا سکندروہیں سے انہیں شہر کے اسپتال لے کر بھاگا تھا تو تایا سائیں بھی ساتھ ہی روانہ ہوئے تھے۔ سکندر نے اسپتال پہنچ کر فون پر بہت مختصر سے انداز میں بابا سائیں کی خرابی طبیعت کی اطلاع کے بعد فون بند کر دیا تھا ابھر سے کچھ سے بغیر ہی اور پہلے سے مضطرب پشیمان اور بے قرار لاریب پر جیسے حج معنوں میں قیامت ٹوٹ پڑی تھی اس کے بعد اس کی انگلیاں سکندر کا نمبر ڈال کر تھیں ٹل ہونے لگی تھیں۔ جویلی کے دودھ یوار پر جیسے شام غم نے اتر کر ڈیرے جما لیے۔ المہ کو پتا چلا تو اس نے باقاعدہ رو رو کر خود کو ہلکان کر رکھا تھا۔ حیرت تو لاریب کو اپنے اعصاب پر تھی جو پے در پے پڑنے والے غموں کے بعد بھی کام کرنا نہیں چھوڑ رہے تھے حالانکہ وہ ہمیشہ سے سب سے نازک مزاج رہی تھی۔

”ب کیا ہوگا بھو! بابا جان ٹھیک تو ہو جائیں گے نا؟“ گاماسکی

آنکھوں میں ہر لمحہ ہراس کا اک نیارنگ اتر رہا تھا وہ آنکھیں جو ازلی بے فکر اور دلچسپ و دم سے نا آشنا تھیں ان میں اضطراب گروٹھیں لیتا اور آنسوؤں پر اڈل چکے تھے۔

”تم قادر نہیں کرو المہ! بابا جان بالکل ٹھیک ہو جائیں گے مجھے یقین ہے اللہ پر۔ وہ اپنے بندوں کو ان کی بساط سے بڑھ کر کبھی نہیں آزما تا۔ وہ جانتا ہے اچھی طرح ہم اتنے دکھوں کا بار ایک ساتھ نہیں اٹھا سکتے۔“ اس نے المہ کو اپنی آنکھوں میں سمیٹتے ہوئے ہمت بندھائی۔ وہ جیسے لکھت بڑی ہوئی تھی۔ اتنی بڑی اتنی پلٹ کر جیسے لکھوں میں عمر کے کئی برس کی سیڑھیاں پھلانگ گئی ہو۔

”باجو کیوں چلی گئیں اس طرح ہمیں چھوڑ کر؟“ المہ نے سوجھ بوجھ انداز میں سوال کر رہی تھی اس کے بالوں میں گروٹھیں اتر رہی تھیں لاریب کا ہاتھ ساکن ہو گیا۔

”اک بات سن لو المہ! آج کے بعد ان کا ذکر نہیں کرنا مجھ کو بس ہم دو ہی ہمیشہ ہیں۔“ اس کا لہجہ کتنی سرد مہری و بے گامگی سیٹھ ہوئے تھا۔ المہ نے تڑپ اٹھنے والے انداز میں اسے بے حد شاک کی ہو کر دیکھا مگر اس کے سنگھار چہرے پر کوئی رعایت کی گنجائش نہ پا کر بے ساختہ رو پڑی۔ لاریب نے اسے جب کرانے کی کوشش نہیں کی اور گہرا سانس پھینچ کر سیل فون اٹھا کر ایک بار پھر سکندر کا نمبر ٹرائی کیا۔ اس مرتبہ نکل جا رہی تھی وہ قدرے سارٹ ہوئی۔

”اسلام علیکم بی بی صاحبہ!“ سکندر کی دھیمی مگر پشیمردہ سی آواز سنائی دی۔

”سکندر کے بچے ایک مرتبہ میرے سامنے تو آؤ دیکھنا کیا حشر کرتی ہوں تمہارا۔“ اس کا سارا طیش سا مارا اشتعال بلا روک اس پر ٹپکنے لگا۔ اس بات سے بے نیاز کہ دوسری جانب وہ کتنا بوکھلایا ہوا ہوگا۔

”آئی ایم سوری بی بی صاحبہ میں.....“

”بکواس بند کرو آخر تم ہوتے کون ہوتے خود بخود کہہ خود انہیں لے کر اسپتال پہنچ جاؤ اور ہمیں سرسری بتا کر پھر فون بھی بند کر دو۔“

”بی بی صاحبہ ان کی طبیعت بہت خراب تھی ذمہ داری بھی ناخیر.....“

”کچھ نہیں سننا مجھے تمہیں تو میں وہاں آ کے پوچھتی ہوں۔“

مجھے بس اسپتال کا نام بتاؤ۔“ اک بار پھر اس کی پھٹی بات سننے بغیر وہ اسے جھڑک کر بولی تو سکندر نے ٹھنڈا سانس بھر کے

اسپتال کا نام بتا دیا۔ لاریب نے مزید کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر فون بند کر دیا۔

”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی بھو! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

”میں اس کے پیچھے بھاگی آئی۔ لاریب کو رکنہ ہوا۔

”کہاں خوار ہوئی پھر وہی المہ! یہاں خیر و میں فون پر رابطہ رکھوں گی تم سے۔“ اس نے بالکل بچوں کے انداز میں المہ کو بہلا تا چاہا۔ اس سے قبل کہ المہ کوئی رد عمل ظاہر کرتی وقاص حیدر اپنے مخصوص انداز میں زمین روندتا ہوا ان کے سر پر آ چڑھا۔

”کہاں گئی ہے ایمان!“ اس کی بے تحاشا سرخ ہو کر دکھائی آ نکھیں لاریب کے چہرے پر گڑی گئیں۔

”یا بکواس ہے یہ ہم کیوں بھیجنے لگے انہیں بھلا۔“ لاریب کا بھی غصے سے منہ حال تھا۔

”جہاں بھی گئی ہے جہاں بچے کی ہرگز نہیں مجھ سے یاد رکھنا میں لسنہ میں کی سب سے بچی تھیں بچی نکال دیں گا۔“ وقاص حیدر کی بے عزتی کرنے والا اتنی آسانی سے نہیں بچ سکتا۔ ماتھے پر بل ڈالے وہ آنکھوں سے ٹپکتے شعلوں سے اسے بھسم کرتا آگاہ کر رہا تھا۔ لاریب نے تنفر بھرے انداز میں ہر جھڑک۔

”جودل چاہے کرنا ہمارا اب تم سے کوئی تعلق ہے نہ ان سے لہذا چلتے پھرتے نظر آؤ۔“ لاریب کا لہجہ و انداز اس درجہ تشویش آمیز اور عنوت بھر تھا کہ وقاص جیسا خود پسند انسان اس تذلیل کو محسوس کر کے ہی آگ بگولا ہو گیا۔

”بہت غرور ہے نا تمہیں خود پر؟ دیکھنا کیا کرتا ہوں میں تمہارے ساتھ۔“ غصہ میں پھر کر وہ دھمکیوں پر اتر آیا۔ لاریب کی آنکھوں میں جوبلا تسخیر لانے لگا۔

”تم کچھ نہیں کر سکتے سمجھتے نہ ہی میں تم سے خائف ہونے والوں میں سے ہوں۔ یہ مت بھولا کرو کہ میں تمہاری رعایا میں شامل نہیں ہوں۔ اب تم یہاں سے چلتے نظر آؤ۔“ وقاص کے وجود پر اس کے تنفر اس کی حقارت اور جدوجہد نے جیسے کوزلوں کی برسات کر دی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اترنے والی سرخی میں انتہا درجے کی تشویش تھی۔ مزید اک لفظ کہے بغیر وہ اسے گھور کر چلا گیا۔ المہ البتہ اس دوران تھر تھر کا پتی لاریب کی لوٹ میں چھپی رہی تھی لاریب اسے ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی مگر وہ وقاص کے چلے جانے کے بہت دیر بعد بھی کبھی ہوئی رہی تھی۔

سر پٹی آنکھوں والے سنا ہے تیری آنکھوں میں

سر پٹی آنکھوں والے سنا ہے تیری آنکھوں میں

سر پٹی آنکھوں والے سنا ہے تیری آنکھوں میں

بہتی ہیں نیندیں اور نیندوں میں سنے کبھی تو کنارے پر اتر میرے پہنوں میں آ جاز میں پاؤں جا کہیں پہ مل جا کہیں سے سے پرے تو بھی آنکھوں سے کبھی میری آنکھوں کی سن

عباس حیدر پچھلے کچھ کئی دنوں سے مکمل طور پر اس کے ساتھ وقت گزار رہا تھا۔ اس کا پروڈکشن ہاؤس مکمل ہو چکا تھا اب افتتاح کے بعد کام کا باقاعدہ آغاز ہوتا تھا مگر اس سے پہلے وہ عریشہ کے ساتھ بھر پور وقت گزارنا چاہ رہا تھا۔ کتنی طویل زندگی آسودگی خوشی محبت اور رنگ۔ عریشہ کے جذبات و احساسات کا انداز لکھتے تبدیل ہو کر رہ گیا یہ خیال کہ وہ اس کے لیے بہت اہم ہے ہرگز معمولی نہیں تھا اسے یقین ہوا وہ اس دنیا کی وہ خوش قسمت ترین عورت ہے جسے وہ شاندار مرد اس کی محبت حاصل ہوتی ہے جس کی خواہش میں لاکھوں دل دھڑکتے ہیں۔

عباس پر ایک خدار اک نشہ طاری تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کے لائنڈر لگے پھر رنگ تھیں ان دنوں میں لسی شدت تھی دو تمام شدتوں کی گولہ بھی وہ یہ بھی جانتی تھی وہ اس سے کتنی محبت کرتا ہے جیسی اظہار کے نت نئے طریقے آزما کر جتن کے ذوق پر انداز ہمیشہ اسے موہ لیتے اور شانت و سرور رکھتے اس بل بھی وہ مغرور تھی۔ عباس خاموش ہوا تو اس کی آواز کا سحر بھی ٹوٹ گیا مگر عریشہ ہنوز مبہوت تھی۔ عباس نے شریر انداز میں اس کی آنکھوں کٹا گئے ہاتھ لہراتا تب وہ چونکی اور اسے گھونٹنے لگی۔

”ہائیں کیا ہوا؟“ عباس کو اس ظالم لدا کی خاک سمجھ نہیں آئی بجائے داد و تحسین کے یہ خفگی۔

”کس کی منت ساجت کی جا رہی ہے۔“ وہ خطرناک تیور لیے بولی تو بدگمانی کے اس مظاہرے پر عباس کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

”خوف خدا کروڑ کی! میں تو گوڑے گلوں تک تمہارے عشق میں ڈوبا ہوا ہوں یہ الزام کیوں بھلا؟“

”میں تو آپ کے سامنے بیٹھی ہوں ہر بل پاس ہوں آپ اسے نا جانے کہاں ڈھونڈ رہے ہیں۔ خیر وہ آپ کی فیاسی ہے یا پھر شوبز میں کوئی.....“

”عریشہ! عریشہ.....“ عباس اتنا بھڑکا کہ اس پر کشن اٹھالیا۔

عریشہ بے تحاشا خنسنے لگی۔

”تم ایسا جملہ بھگتی ہو مجھے؟“



"مذاق کر رہی ہوں بھئی دل پر نہیں لیا۔ اچھا بتائیں کل ڈاکٹر کے پاس جانا ہے چیک اپ کے لیے؟" عباس نے محض کانڈھنچا دیکھ کر گویا آدمی کا رخ کر دیا۔

"جائے نہیں گئے؟"

"ہوں مگر تمہارے ہاتھ کی....."

"میں ابھی لاتی ہوں۔" وہ اٹھ کر چلی گئی۔ عباس سب فون پر نمبر پر نہیں کر رہا تھا انداز بے حد مصروف تھا۔

وہ ڈرائیور کے ساتھ اسپتال پہنچی تو بتایا سائیں کے ساتھ وقاص حیدر کو بھی وہاں پا کر اسے خود پر بہت ضبط کرنا پڑا۔ اندر موجود نفرت یکفخت گہری ہونے لگی تھی۔ دروینے والے مسیحا کب ہوتے ہیں مگر کچھ کہنے کی پوزیشن کہاں تھی۔ بابا سائیں کو آئی سی یو سے برائیوٹ دوم میں منتقل کر دیا گیا تھا اور پرکے کاموں کے لیے سکندر کی بھاگ دوڑ جاری تھی وقاص حیدر حکم دینے والوں میں شامل تھا لاریب نے اس صورت حال کو محسوس کیا تو جیسے آگ سی تن بدن کجلا کر خاکستر کرنے لگی۔

"تم تو کر نہیں ہو اس کے جو ہر حکم بجالا رہے ہو۔" وقاص کے لیے سکندر کو سگریٹ اور بان لاتے پا کر لاریب تلملاتی اس کے سر آچھی لورٹا نکھیں نکال کر غریبی سکندر نے البتہ اچھے میں گھر کر اسے دیکھا قدم قدم پر اسے اپنی غلامی کا احساس دلانے والی لاریب کی یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل اسپتال پہنچنے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام سکندر کی جی بھر کے بے عزتی کرنے کا ہی کیا تھا وہ اسے اس غلطی پر معاف کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتی تھی کہ سکندر نے بابا سائیں کو اس سے پوچھے بغیر اسپتال لے جانے کا حتی قدم خراٹھایا کیسے اسے اس بات سے غرض نہیں تھی کہ بابا سائیں کی طبیعت کسی گھنٹے پہلے اسے وہ تکلیف نہیں بھوتی تھی جو بابا سائیں کی فکر کرتے اس نے پل پل کانٹوں پر سر کر کے محسوس کی تھی۔

"خبردار جو میں نے تمہیں اس کتے کے پیچھے پھرتے دیکھا ہو۔" تنبیہی انداز میں انگلی اٹھائے وہ گویا حکم دے رہی تھی۔ سکندر کے چہرے پر واضح بے بسی نظر آنے لگی۔

"بی بی صاحبہ! میں انکار کی پوزیشن میں نہیں ہوں وہ مالکوں میں سے ہیں۔" سکندر کی بات سن کر اسے جیسے پتے لگ گئے۔

"تمہاری یہ جرات کہ تم میری بات سے انکار کرو۔" وہ بھڑک کر پھٹ پڑی۔ سکندر عاجز سا ہوا۔

"کسی بات ہرگز نہیں ہے بی بی صاحبہ! میں صرف آپ کو اپنی حیثیت سے آگاہ....."

"شب اب سکندر! میں تم صرف وہ کرو گے جو میں کہوں۔"

اس نے سختی سے کہا اور وہاں سے پلٹ گئی کہ وقاص فاصلے کے باوجود ان پر لگا ہوا مرکز کے بیٹھا تھا۔ لاریب نے سکندر کو صرف حکم نہیں دیا گویا خود بھی اس کی نگرانی شروع کر دی اور وقاص کو بھی شاید سن گئی تھی جیسی کچھ توقف سے سکندر کو پکارا۔ لاریب نے نظریں چرا لیں سکندر وقاص کی جانب سے چلا گیا اور اس کے حکم کی تعمیل میں لاریب سے نگاہیں چار کیے بنا وہاں سے نکل گیا۔ لاریب تو بین سکی اور ذلت کے شدید احساس سمیت سر ہی جھکی رہ گئی۔ اسے صاف لگا کہ سکندر نے اس کے سر پر بھرے بازو میں طمانچہ دے ملا ہوا۔ وہ جانے کتنی دیر بیٹھی چھٹی رہی تھی اک نرس نے آ کر چونکا دیا۔

"پیشہ شاہ صاحب کے ساتھ جو سکندر صاحب ہیں وہ کدھر ہیں؟"

"وہ نہیں ہیں آپ مجھ سے کہیں۔ میں بیٹی ہوں ان کی خیریت پتا؟"

"جی خیریت ہے یہ دوائیں ابھی چاہئیں۔" نرس نے بے نیازی سے کہا اور نسخہ اسے تھا کر پیشہ دارانہ جگت کا مظاہرہ کرتی چلی گئی۔ اس نے دیکھا وقاص اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا البتہ بتایا سامنے صوفے پر تقریباً نیم دراز لوٹ گئے نظر آ رہے تھے۔ ان کا گارڈ کمن سنبھالے چوک کر اٹھا۔ لاریب نے گہرا سانس کھینچا اور ریپشن کی سمت آگئی۔ ارادہ وہاں سے فارمی کے متعلق جان کر دوائیں لانے کا تھا مگر بے ارادی طور پر اسی نگاہ نے جو منظر دیکھا وہ اسے یہاں آنے کا مقصد ہی نہیں خود اس کی ذلت سے بھی فراموش کر گیا۔ بلیک ٹوپس سوٹ میں اپنی غضب کی مردانہ وجاہتوں کے ہمراہ وہ عباس حیدر کے علاوہ کون ہو سکتا تھا جو اسے زمان و مکان کے فرق بھلا کر اپنی ذات میں گم کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ جس کی محض ایک جھلک اسے کسی پتھر کی موٹی میں ڈھالنے کی صلاحیت سے ملا مال تھی وہ غیر یقین شدہ ایک ٹک اسے تک رہی تھی جو اس کی موجودگی اور جاہ کن حد تک غیر حالت سے بے نیاز اک نگاہ ڈالنے بغیر آگے بڑھ گیا تھا۔ دونوں اک دوسرے میں گن اور کسی بات پر ہنس رہے تھے خوش باش آسودہ چکنے ماربل پر چلتے اس کی شریک ستر کا پیر پھلا تو پوری جان سے اس کی جانب متوجہ عباس نے اسے سہلا دیا۔

گویا ایک طرح سے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ لاریب اس سکتے منظر کی تاب لانے کی ہمتیں کہاں رکھتی تھی جیسی بے حیثیتانہت میں مبتلا ہوتے آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ اذیت سے بے گناہ اسے سندروں سے ڈوب کر ابھری تو عباس حیدر اسے ایک بار پھر بے انت نفسی سے دوچار کرنے کے بعد جا چکا تھا لاریب ایک بار پھر تکی دست تکی داہاں کھڑی رہ گئی تھی۔

اس نے گھبرا کر عباس کو بدحواس نظروں سے اطراف میں کھوجا پھر جیسے اندر سے لٹنی سر اسٹیمکی اور وحشت کے زیر اثر چہرہ اطراف میں پھیلی رہا دیووں میں دیوانہ وار دوڑتی اسے ڈھونڈنے کی خواہش میں بلکان ہوتی خود پر سختی لوگوں کی حیران نظروں سے بے نیاز تھی۔ آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی روئی اور متوحش انداز لیے اس کی حالت بہت قابل رحم محسوس ہوتی تھی۔

"بی بی صاحبہ! کیا ہوا ہے آپ کو کسے ڈھونڈ رہی ہیں؟ سب خیریت ہے نا۔" وہاں سے گزرتے سکندر کی نگاہ اس کے بے لسان انداز پر پڑی تو وہ تیزی سے لپک کر نزدیک آیا اور تشویش بھرے انداز میں سوال کیا۔

"وہ..... وہ تھا ابھی یہاں..... نہیں تھا..... میں نے خود دیکھا پھر..... پھر جانے کہاں چلا گیا۔" وہ زار و تظار روٹے ہوئے بے ربط سے جملے بول رہی تھی۔ سکندر کی خاک سمجھ میں نہیں آیا البتہ وہ لاریب کے وجود میں اترے طوفان کے جھکے ضرور اپنے اندر محسوس کر رہا تھا۔

"ک..... کون..... کس کی بات کر رہی ہیں؟" اس نے نرمی سے استفسار کرتے اس کا دکھ سے دھندلاتا ہوا چہرہ دیکھا۔

"عباس..... اسے ڈھونڈ سکندر! وہ یہیں ہے کہیں اسے ڈھونڈو اسے پتہ ہے کہ میں اس سے کتنی محبت کرتی ہوں میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ رہنا ہی نہیں چاہتی اسے مناد میرے لیے اسے دھوکا لگا کر پہلے کی طرح مجھے چھوڑ کر نہ جائے۔"

وہ واقعی حواسوں میں نہیں تھی بالکل پاگل اور جنونی لگ رہی تھی۔ اک ہر اس کے عالم میں تھر تھر کانپتی سکندر کا دل کٹ سا گیا۔ ایسا الہانہ بے خود جنونی اعتراف وہ اس کے بازو سے اپنا مریک جھکی تھی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ سکندر جیسے سکتہ وہ اس کا جنون دیکھتا رہا وہ دہری اذیت کا زماش کا شکار ہو رہا تھا۔ کرب کا اک بے گناہ سمندر جس میں وہ بے دست و پا دھکیل دیا گیا تھا کیسی بد نصیبی تھی وہ پہلی بار اس سے اس درجہ نزدیک ہوئی تھی تو اس طرح کہ حواسوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

جس کی وجہ سے ہوئی تھی وہ بھی کوئی اور شخص تھا۔ سکندر نے اتنی شدتوں سے دانتوں سے ہونٹوں کو کاٹا کہ منہ میں خون کا ذائقہ گھلنے لگا۔ اس نے چاہا تھا کہ بولے اور کچھ نہیں تو اپنے ساتھ لگی کھڑی سسکتی بلکتی لاریب کو ہی خود سے الگ کر دے مگر وہ خود کو برف کی لسی سل پاتا تھا جس کے سب احساس جامد ہوں۔ خاصی تاخیر سے لاریب خود سنبھل گئی اور اس سے نگاہ چار کیے بنا وہاں سے چلی گئی وہ تب بھی شکستہ دھول کھڑا رہا جیسے اس پل کی عظیم ترین نقصان سے دوچار ہوا ہو۔

ایمان نے ہال سمجھانے کا کام مقوف کیا اور گردن موڑ کر شرجیل کو دیکھا وہ بستر سے اٹھ کر اس کے مقابل آ گیا تھا۔

"دیکھا کتنی حسین ہو گئی ہو میری محبتوں کو پا کر۔" اس کے کانڈھنچے پر اپنا مضبوط ہاتھ جما کر وہ مسکراتے ہوئے کتنے یقین سے کہہ رہا تھا ایمان کے دل کا بوجھ بڑھنے لگا تھا نہیں من پسند خواہش کی تکمیل کے بعد بھی دل اتنا رقت آمیز کیوں تھا۔

شرجیل نے اسے کوئی دھوکہ نہیں دیا تھا اسلام آباد آنے کے بعد پہلا کام انہوں نے نکاح کرنے کا کیا تھا۔ ایک سات اسلام آباد میں گزارنے کے بعد وہ لوگ ایویہ تھیلا کی سمت نکل آئے تھے۔ رہنمائی میں شرجیل نے اسے سونے کا بہت خوب صورت سیٹ دیا تھا اس کی محبت میں بھی بظاہر کوئی کمی نہیں تھی۔ احساس جرم تو اسے اپنے پیچھے رہ جانے والے رشتوں کے حوالے سے گھیرتا تھا۔

"لاریب! لامہ اور بابا جان کتنے اہول تھے یہ دشتے جو ہرگز اس سلوک کے مستحق نہ تھے۔ لامہ اور لاریب نے کیا سوچا ہوگا اس کے متعلق؟ بابا جان نے اس کو کھوکھو کیسے سہا ہوگا؟" کتنی جلدی اسے اپنی زیادتی اپنی خود غرضی کا احساس ستانے لگا تھا۔

"نہی تیار ہو جاؤ یا رہا رہ چلتے ہیں۔ دیکھو موسم کیسا قاتل ہو رہا ہے۔"

"سرور بہت ہے شرجیل مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔" اس کی بےزاری کے جواب میں شرجیل نے اسے گھوندا۔

"ہم روز یہیں نہیں آنے والے ہو لڑکی! انجوائے کرو۔"

شرجیل کے اٹھانے پر ایمان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا گویا اس امر سے دوکا۔

"آپ نے اپنے گھر والوں سے بات کی؟" اس کے انداز میں فطری اضطراب اور گھبراہٹ تھی۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



”کیا بات؟“ شرجیل نے دانستہ تجاہل برتا۔ مقصد ایمان کو تنگ کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔

”یہی کہ آپ نے مجھ سے شادی کر لی ہے۔“ وہ نظریں جما کر بولی تو شرجیل ہنسنے لگا۔

”بتادیں گے یا! اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ دراصل میں نہیں چاہتا وہ لوگ اپنی جلی کٹی سنا کر ہمارا ہنی مون خراب کر دیں۔“

”شرجیل! وہ لوگ قبول تو کر لیں گے نا مجھے؟“ وہ ایک با عزت اعلیٰ خاندان کی بیٹی ہو کر بھی ایک غلط فہمی ہوئے قدم کے نتیجے میں بے ایمان ہوتی خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

”کرنا تو چاہیے سوٹ ہارٹ! ورنہ وہ اپنے بیٹے سے بھی ہاتھ دھولیں گے۔“ شرجیل نے اپنے تئیں اسے تسلی دی مگر اس کی تسلی ہو نہیں سکی۔

”اگر ان سب نے مل کر آپ کو مجھے چھوڑنے پر فورس کیا تو شرجیل آپ.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی آنکھیں کیسے لکھوں میں پانیوں سے چھلک پڑی تھیں۔ شرجیل نے مضطرب ہوتے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر بے حد نرمی اور محبت سے اسے دیکھا تھا۔

”تم زندگی ہو میری ای! اور زندگی سے منہ کون موڑتا ہے۔ کبھی بھول کر بھی ایسی بات نہ سوچنا۔“ ایمان کا بے کل بے قرار سادل ذرا سا سنبھلا مگر جہر الونہی ستر ہاتھا۔

”یقین نہیں آ رہا میری بات کا؟“ شرجیل سے اس کی بے دلی مخفی نہیں رہ سکی۔ ایمان خود کو سنبھال کر دانستہ مسکرا دی۔

”ایسی بات نہیں ہے شرجیل! مجھے اگر اعتبار نہ ہوتا آپ پر تو یہ قدم کیوں کرا اٹھاتی۔“ اس جواب نے شرجیل کو بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کر دیا ایمان اسے سختی رہی کہ وہ ہنسنے ہوئے نظر لگ جانے لگی حد تک حسین نظر آ رہا تھا۔ اس سے قبل کہ شرجیل اس کی نظروں کے اڑکاز کو محسوس کر کے اس پر گرفت مضبوط کرتا اس کے سیل فون کی مدھر گنگناہٹ نے دونوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ شرجیل نے سیل فون اٹھا کر اسکرین پر چمکتے فراز کے نمبر کو دیکھا تو ایک بے اختیار قسم کی مسکان نے اس کے چہرے کو مزید روشن کر دیا۔

”ہاں بولو فراز؟“ سر کے پیچھے پکیر رکھتے ہوئے خود کو آرام دہ پوزیشن میں لاتے ہوئے وہ جیسے خوشگوار ست کے موڈ میں بولا۔

”کہاں ہیں بھائی آپ؟“

”جنت میں ہوں اک حور کی قربت میں زندگی کا لطف کشید

کر رہا ہوں۔“ اس نے شریر انداز میں کہتے ایمان کو دیکھ کر عکس دہائی۔ ایمان کانوں کی لودوں تک سرخ پڑی لانی پلکیں جھٹکا گئی۔

”اچھا امیزنگ! آپ شیر کا شکار کرتے خود شکار ہوئے ہوں گے اور فوت ہونے کے بعد جنت پالی ہے ناں؟“ فراز بھلا کسی سے کم تھا ترکی بہ ترکی بولا اور کھلکھلا کر اپنی بات کی تصدیق چاہی۔

”بکومت ہم گئے تو شکار کرنے ہی تھے ایک پھری ہوئی مگر بڑی حسین اور نوخیز شیرنی شکار کی ہے۔ دیکھو گے تو بہادری کی دیو دیئے بغیر نہیں رہ سکو گے۔“ شرجیل ہنوز غیر سنجیدہ تھا جیسی فراز عاجز سا ہو گیا۔

”بھائی پلیز“ میں سیریس ہوں۔“ اس کے ٹوکے پر شرجیل نے گہر سا سس کھینچا۔

”میں بھی مذاق ہرگز نہیں کر رہا۔“ اس کے دھوک جھلاتے انداز پر فراز کیا خاک سمجھتا۔

”جہاں بھی ہیں بہر حال جلدی گھر آ جائیں۔ یہاں آپ کی طویل غیر حاضری غم و غصے کا باعث بن چکی ہے۔“

”میں آ جاؤں گا یا! چند دن انجوائے کرنے دو پھر تو جانے کیا کچھ سہنا ہے۔“ وہ جس انداز میں سر داہ بھر کے بولا تھا فراز کا کھٹکھٹانا لازماً تھا۔

”کیا مطلب؟ کیا کر بیٹھے ہیں خدا خواستہ۔“ اس نے ہول کر کہا تو شرجیل کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”مگناہ تو کوئی نہیں کیا بس اک پیاری سی خاتون کو تنہائی بھائی بتا دیا ہے۔“ دوسری جانب فراز کے لیے یہ بات اتنی غیر متوقع اور اچانک تھی کہ وہ ساکن رہ گیا جیسی فوری جواب بھی نہیں دے سکا۔

”آپ مذاق کر رہے ہیں بھائی؟“ وہ ٹھٹکا۔

”یا گل ہوں کیا؟ یہ لو بات کر لو اپنی بھابی سے آ جائے گا یقین۔“ شرجیل نے مسکرا کر کہا پھر سیل فون کان سے ہٹا کر اپنی سمت متوجہ ایمان کی جانب بڑھایا وہ ہچکچائی اور گھبرائی۔

”کرنا یا! فراز ہے۔“

”نہ..... نہیں پلیز مجھ سے نہیں ہوگی۔“ وہ بوکھلائی۔

”ارے کچھ نہیں ہوتا کرو ناں۔“ شرجیل کے اصرار کے آگے اس نے سیل فون لیا اور سی ہچکچاہٹ امیز انداز میں کان سے لگا لیا اس بل اس کا ازیں اعتماد اس کا ساتھ چھوڑنے لگا تھا۔

”اسلام علیکم! اس نے تھوک نکل کر حلق تر کیا۔

”وعلیکم اسلام! خوش رہیے آبا سے دھوئیں نہائیں پتوں



پھلیں۔“ جواب میں فرہز کی شوخ کھنک دار اور بے حد شریا دانہ  
بہاعتوں سے ٹکرائی اس کا چہرہ مہرخی ہو کر انکار ہو گیا اے  
قطعی نہیں ہو جواب کیا بولے تو گھبرا کر شرجیل کو بکنے لگی۔  
”کچھ اور بات کریں نا؟“ فرہز نے استیاق ظاہر کیا تو وہ ہٹنا  
سی گئی۔

”ہس..... کیا.....؟“ اس کی ہیکھا ہٹ عروں پر جا پہنچی تھی۔  
 ”رشتے میں آپ سے چھوٹا ہول کوئی اچھی سی دعا آپ بھی  
 دے دیں نا مجھے۔“ اس کا ارادہ اسے صاف چھیڑنے کا تھا۔  
 خاص تنکھا انداز اختیار کیا۔ ایمان اسی تنکھے پن سے گڑبڑائی اور  
 سیل فون شرجیل کی سمت بڑھ لایا۔

”کیا کہا تم نے میری بیوی سے کہ بے جاری اچھی خاصی پریشان ہو گئی۔“ شرجیل نے مصنوعی خشکی سے فراز کوڈانسنے کا آغاز کیا البتہ لودیتی نظروں کا مرکز ایمان کا دلنشین چہرہ تھا جس پر گھبراہٹ اور حیا کا سنگم بہت حسین لگ رہا تھا۔

”مائی گاڈ..... میری مجال!“ دلوں کتنی دیر ابھرا دھر کی باتیں کرتے رہے پھر شرجیل نے فون بند کر دیا۔

”آئی تمہیں فرار بھائی سے خاصی انڈر سٹینڈنگ ہے آپ کی۔“ ایمان شرجیل کے اشارے پر سیل فون چار جنگ پر لگاتے ہوئے قیاس آرائی کر رہی تھی شرجیل مسکرا دیا۔

”ہاں! فرزا بہت تالس ہے مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ حق اور انصاف کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار رہتا ہے۔ مجھے تو قلق ہے یہ جرنلزم کی بجائے شوبز کو کیوں اختیار کر رہا ہے؟ ویسے میرے بعد علوی لاج میں اگر تمہیں موہل سپورٹ ملے گی تو فرزا اور سمیعہ سے۔“

”سمیعہ کون ہے؟“ ایمان فون چار جنگ پر لگا چکی تھی  
صوفی پر بیٹھتے ہوئے تجسس ہوئی۔

”کزن ہے میری! چاچو کی بیٹی۔ مجھ سے فراز کی طرح بے حد اسپر لیس۔“ شرجیل کے انداز میں شرارت دلائی۔ ایمان نے اسی آخری بات پر چونک کر بغور اسے دیکھا جیسی شرجیل کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔

”کتنے فاصلے پر بیٹھنے کی کیا تک ہنتی ہے“ شرجیل نے کہا اور ہاتھ بڑھا کر اس نے مقابلے لایا ایمان پھر بھی کم صم ہی رہی شرجیل نے اسے لغو نہ کیا۔

”وہ فراز کی طرح مجھے بڑا بھائی سمجھتی ہے اور ویسی ہی محبت کرتی ہے جیسی فراز کرتا ہے۔ مجھ سے اسی لیے اتنی پریشان ہو گئی

تھیں تاہم؟“ اس کا جواب اور اٹھائے شرجیل نے اسے مجبوراً  
ایران نہ صرف بلکی پہنکی ہوئی بلکہ جینے ہوئے اسے گھونٹ لگی  
مگر شرجیل کی نظموں کے تقاضے اسے شوخ و گستاخ تھے کہ  
بے اختیار شہزادی چلیں جو کئی تھی۔

اس سناٹے کو ان پر بیٹے ایک ہفتے سے زیادہ گزر گیا زندگی جیسے تیسے معمول پر آ رہی تھی۔ تمام تر ذلت سبکی اور شرمندگی اٹھا لینے کے باوجود بھی بہر حال وہ ضروریات زندگی سے نظریں نہیں چرا سکتے تھے۔ بابا سائیں ڈسچارج ہو کر حویلی آ چکے تھے انہیں ایک چپ سی لگی ہوئی تھی جو مستقل جان کا روگ تھی۔ جیسے وہ خود سے بھی نظریں چرا لے پھر رہے تھے۔ سندھ سائے کی طرح ان کے ساتھ لگا رہتا اب تو اس نے راتوں کو بھی گھر جانا چھوڑ دیا تھا۔ بابا سائیں کے ساتھ دلایا کمر اس کے ایسے مستقل مخصوص ہو گیا۔ شاوی تو ملتی ہوئی گئی مگر عزیز رشتہ دار وجہ پوچھنے لگے تو بتایا سائیں نے یہ احسان کیا کہ کسی کو چھوٹی حویلی تک پہنچنے نہ دیا۔ لاریب ذہنی طور پر اتنی پریشان تھی کہ اس نے اگزیزم نہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ بابا سائیں تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے اسے اپنے پاس بلوایا۔

”جی بابا سائیں؟“ وہ ان کے کمرے میں آئی تو سکندر انہیں  
 اخبار پڑھ کر سنا رہا تھا اسے دیکھ کر اخبار پیٹ لیا اور نظریں ڈالنے  
 اپنے پیروں پر نکالیں۔ وہ خود پر ضبط کے کٹے پہرے بٹھانے  
 میں ماہر تھا۔

”سکندر بتا رہا تھا آپ کا لجن نہیں جاری ہو کیوں بیٹھے؟  
آپ کے تو انگیزیم ہونے والے ہیں۔“ لاریب نے سر قلم بھر  
کے اک نظر انہیں دیکھا جس پر یوں زدہ ملول چہرہ محض چند لمحوں  
میں کتنے بڑے نظر آنے لگے تھوڑے۔

”سہی بابا جان! میں پڑھیںس پادری نسل ہونے سے بہتر ہے  
کہ..... اس کا گلا بھرا یا جسمی بات سہی چھوڑ کر ہونٹ کھلے گی۔  
(اگر بابا جان کو ہوتا لگ جائے ان کے اعتقاد کو صرف بابا جوہی  
نے نہیں نہیں پنہائی بلکہ.....)

”یہ تو بہت غلط بات ہے بیٹے! چودہ سالوں کی محنت کو اس طرح ضائع نہیں ہونا چاہیے پھر میں نہیں چاہتا کہ آپ یہ سمجھو میں اک بیٹی کی سزا دوسری کو دے رہا ہوں۔ میں تم پر تہمیداری رہا ہوں کو کھوٹا نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ کتنے تحمل و برداشت کا مظاہرہ کر رہے تھے! ارب یکدم آبدیدہ ہو کر رہ گئی۔

(یا جو کتنا غلط سمجھا آپ نے یا جان کو کاش آپ نے جلدی کی ہوگی)

۳۰۔ ایسا مت سوچیں بابا جان! میں ایک کریم کبوتر کرلوں  
 گی۔ اپنا دھبہ جھلا کر اس نے بابا سائیں کو تسلی دی تو انہوں نے اپنا  
 کمرہ لڑنا دوا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

”جیت جی رہو بیٹے! خدا نصیب اچھا کرے تمہارا۔“ لاریب نے آنسوؤں کو ان سے چھپانے کی غرض سے ہی تیزی سے پلٹ کر باہر نکل آئی اور دوڑتی ہوئی رہبراری کے موٹر پر آنکھیں ملوان کی طرح آتے وقاص حیدر سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گئی۔

”تو دیکھ کر چل لیا کرو۔“ وہ جتنی بد مزہا ہوئی تھی اسی قدر  
کسی وقاص فضول انداز میں بے ہنگم ہنسا۔

”دیکھ کر چلیں تو تم جیسی پھولوں کی ملکہ سے کیسے ٹکرائیں۔“  
اپنے دُشمنوں خبیث بے باک انداز میں کہتا وہ موچکھوں کو بل  
دے رہا تھا لاریب کا حلق تک کڑوا ہو گیا چہرے پر بے زاری  
اکتاہٹ اور ناپسندیدگی کے سارے رنگ اتر آئے۔

”اب کیا لینے آئے ہو؟“ وہ خاصی بدتمیزی سے ٹوک کر بولی۔ یہ انداز وقاص کو براہم کرنے کے لیے کافی تھا۔ مگر سامنے وہ شخص جس کی موجودگی اس کی آنکھوں میں تراوٹ اور روح تک میں خمار بھر جاتی تھی۔ اس حوبلی میں اس کے علاوہ بھی دو اور

تقاضے کا جھکاؤ شروع سے لاریب کی جانب تھا تو وجہ یہی تھی کہ

آقاؤں جیسا قطعی و حتمی پن اس کے انداز سے اہل اہل کر پہتا  
پڑتا تھا۔ وہی اس کے لیے چیخ بن گیا تھا وہ اتنی اثر کیونھی  
کدوہ سب کچھ بھول گیا تھا یہ بھی کدوہ اس کے چھوٹے بھائی کی  
منگ ہے۔

”میرے چاہے کا گھر ہے جب جی چاہے گا آؤں گا اور یہ طے ہے کہ اس گھر کا دلاؤ بھی بنوں گا۔“ اس پر نظرس کاٹھے وقاص نے اپنے مخصوص پرزعم افلاطونی انداز میں اپنے امدادوں کو واضح کیا تو لارےب کا دل یک دم دھک سے رہ گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ وقاص کے ہونٹوں پر پُر اسرار مسکراہٹ اتر آئی اس نے اس وقت تک لارےب کو دیکھا جب تک وہ اسے نظر آ سکی پھر گنتا تے ہوئے بابا سائیں کے کمرے کی جانب ہولہا۔

نندنی کی خوب صورت محراب گریز آنکھیں ساکن تھیں سکتہ زدہ غیر یقینی تحیر و استعجاب لیے تھیں۔ اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سچ ہے اگرچہ تھا تو دل تسلیم کیوں نہیں کر رہا تھا۔ اتنا بچھڑاؤ؟ کرب اور بے کلمی دل میں اتر آتی تھی کہ کس میں فرار نہیں تھا۔ وہ خوش شکل ڈاکٹر عثمان خان اس کا میا اور اس کا محسن اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ یہ خیال ہی رگ جاں میں نوکیلے نیزے گاڑ رہا تھا۔ صبح ہسپتال جانے کی غرض سے گھر سے نکلنے والا ڈاکٹر عثمان بھلا کب جانتا تھا کہ پلٹ کر واپس اپنی بیوی اور بچے کے پاس نہیں آ سکے گا کبھی کبھار موت کتنا سفاک وار کرتی ہے کدوئوں زخم مندمل نہیں ہو پاتے۔ یہ بھی ایسا ہی زخم تھا زینب کی صورت کی ویرانی یا سیت اور وحشت کو دیکھتی وہ سوچوں میں غلطیاں تھیں۔ کتنا خاص اور متحمل مزاج تھا وہ اپنی عادتوں میں کس درجہ نفیس اور شاندار کہ نندنی چند ملاقاتوں میں ہی اس کے لیے کتنی اپنائیت محسوس کرنے لگی تھی۔ کتنا احترام ہوتا تھا اس کے لیے عثمان کی جھکی نظروں میں وہ اس سے سوال کیے جاتی ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا۔ وہ اس محل اور نرمی سے جواب دیے جاتا حالانکہ نندنی کے سوالوں میں اکثر کاٹ ہوتی مگر وہ کبھی نہ جھنجھلاتا نہ غصہ کرتا کتنا رसान ہوتا تھا اس کے لہجے میں ہمیشہ نندنی نے کبھی اسے غصہ میں دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے ٹھہراؤ اور رसान کے ساتھ شفقت نرمی و محبت کو دیکھتے ہوئے ہی نندنی نے یہ بات ذہن سے کہی تھی۔

”آپ شوہر کے معاملے میں بہت کئی ثابت ہوئی ہیں ڈاکٹر زینب!“ اور زینب جو اب الحمد للہ کہتے شر میلے انداز میں مسکراتے لگ جاتی۔

”آپ تو پاکستانی ہیں عثمان بے کیسے شادی ہو گئی آپ کی؟“  
 ”عثمان میرے کزن ہیں، عہدہ، تقسیم ہند کے موقع پر میرے

دہلا پاکستان چلے گئے تھے جب کہ عثمان کے دہلا جان نہیں رہے  
گئے تھے۔ دونوں بھائیوں کے درمیان یہ دھریاں بڑھیں تو اس  
رشتے کے باعث یہ فاصلے کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ویسے بھی یہ  
خانان بہت مختصر رہ گیا تھا صرف عثمان اور ان کے بابا تھے اب  
کی وفات کے بعد تو صرف عثمان ہیں۔“ نندنی کی زینب سے  
دوستی اتنی بڑھی تھی کہ وہ اکثر اس سے ملنے زینب کے گھر آ جاتی  
تھیں۔ وہ اک دوسرے کو بہت اچھی طرح جان گئی تھیں۔ نندنی کو  
زینب کے بیٹے عبداللہ سے بھی خصوصی لگاؤ ہونے لگا تھا ایک  
مرتبہ وہ آئی تو عثمان نے دس سالہ بیٹے کو نعت پڑھنی سکھا رہا تھا اس



کے لہجے میں اتنا گداز آتی تاثر تھی یا نعت کے الفاظ کچھ ایسے دل پذیر تھے کہ نندنی بھی سیکھنے کو کھل اُٹھی۔

تصور کمال محبت تنویر جمال خدائی  
یا محمد نور مجسم یا حبیبی یا مولائی

عثمان نے کچھ تامل کے بعد اسے ان اشعار کو طرز کے ساتھ پڑھنے کا طریقہ ازبر کر دیا تھا۔ جنہیں وہ بار بار گنگنا نے کے انداز میں پڑھتی تھی مگر تب نندنی کے گمان تلک بھی یہ بات نہیں تھی کہ سریتا دیوی جو اس کا زینب سے میل میلاپ پسند نہیں کرتی تھیں اس کے منہ سے یہ نعتیہ اشعار سن کر نفرت کے ساتھ غم و غصہ میں انسانیت کی سطح سے گر کر کیسا گھناؤنا سوچنے لگی تھیں۔ مسلمانوں کے لیے جواز لی نفرت تھی وہ اس موقع پر غور کرتی اور اس نفرت کی زد پر ایک ہنسنا ہستا گھرا جزا اور اک بے گناہ انسان موت کی سرد آغوش میں جا ترا کو کہ یہ کام تمام تر راز داری سے کروایا گیا تھا۔ عثمان خان کا جو ایکسیڈنٹ ہوا تھا وہ بظاہر ٹریفک حادثہ تھا مگر اس کے پیچھے باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ سریتا دیوی کی بیٹی کو اپنے مذہب کی ترغیب دینے والوں کی معمولی سزا تھی۔ جس میں وہ خود کو حق بجانب سمجھتی تھیں حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ زینب یا عثمان دونوں نے ہی نندنی کو اسلام میں داخل کرنے کی شعوری کوشش نہیں کی تھی بلکہ اس کے سوالات کے مناسب اور درست جوابات ضرور دیا کرتے تھے جو نندنی اکثر و بیشتر ان سے کرتی رہتی تھی۔ کسی غیر مسلم کو مسلم کرنا ان کا مشن نہیں تھا یہ زبردستی کے سودے ہوا بھی نہیں کرتے مگر یہ سریتا دیوی کو کون سمجھاتا۔ نندنی سے پہلے انہیں عثمان کے ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہونے کی اطلاع فون پر موصول ہو چکی تھی اور وہ اپنے منصوبے کی کامیابی پر خاصی مطمئن تھیں کہ اب ان کے اندازے کے عین مطابق زینب بھی یہاں نکلنے والی نہیں تھی مگر غلط وہاں ہوا تھا جہاں دیو پران کا بے رازا شکار ہو گیا اور اس نے ان پر گرفت کرنے میں بھی دیر نہیں کی تھی۔

”آپ نے بالکل بھی اچھا نہیں کیا مام! عثمان خان ایک بے ضرر انسان تھا۔“ دیو کا متاسفانہ لہجہ دکھ کی شدتوں سے بھر تھا۔ سریتا دیوی محض اک لمحے کو گڑبڑا میں پھر اپنی مخصوص ڈھٹائی کے مظاہرے کے ساتھ کاندھے جھٹک دیتے۔

”اس کی پتی بھی تو اچھا نہیں کر رہی تھی میرے ساتھ ہرم کے معاملے میں کوئی کپیر و ماتر نہیں اس مقام پر آ کر تو میں نے اپنی محبت کی بھی نہیں سنی تھی جاہل سے غلطی کی وجہ بھی ہر تھا۔“

”ذرا سوچیں! اگر نندنی کو سب پتا چل جائے تو...“  
تاسف ڈھلتا ہی نہ تھا اس نے انہیں ڈرانا چاہا مگر وہ ڈرے کی بجائے ہڈیانی انداز میں قہقہے لگانے لگی تھی۔

”کون بتائے گا اسے تم؟“ اور دیو کی آنکھیں بند جذب سے سرخ پڑ گئیں کچھ کہے بغیر وہ ہونٹ جھپٹے جھپٹے پلٹ گیا تھا۔



ایمان نے اس غزل کو ٹائپ کیا اور شرجیل کے فہرر پریدہ کردی۔ شرجیل نے مری میں جہاں اسے بہت سی شاہجگہ گزرتی تھی وہیں ایک خوب صورت اور مہنگا ترین سیل فون بھی اسے گفٹ کیا تھا۔ اس وقت وہ نیچے کسی کام کی غرض سے گیا ہوا تھا۔ سرسبز اونچے نیچے اطراف میں پہاڑوں سے گھرے دلستے پر خوش گوار موڈ میں چلتے اس کے سیل فون پر بیچ ٹون گنگنا لٹی تو شرجیل نے ریست ہاؤس کی جانب بڑھتے ہوئے سیل فون اپنی لیدر کی جیکٹ کی جیب سے نکال لیا۔ اسکرین کو چھوا تو منہ بند لفاظی بڑے ڈر بار انداز میں کھل گیا الفاظ کی دل نشینی نے اسے مسکرانے پر مجبور کیا تھا گویا عہد چاہا جا رہا تھا۔

”ڈونٹ وری! ہمیشہ دل سے لگا کر رکھیں گے اپنی مہلت جاں کو“ اگلے دس پندرہ منٹ میں وہ اس کے روبرو ہوا تو اپنے زبانی یقین سونا اور پیچھے سے بازوؤں کے آہنی جھار میں بند کر لیا۔ ایمان کپڑے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی اس کے روٹینک موڈ پر بوکھلائی۔

”خیر... کیا ہو گیا؟“ وہ اس کی جانب رخ پھیر کر زروں ہوتی ہوئی مسکرائی۔

”یقین دلا رہے ہیں ہمیں کتنا خیال ہے آپ کا۔“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا ایمان جیسے سمجھ کر جھپٹ گئی۔

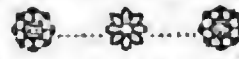
”ہمیشہ خیال رکھیے گا۔“  
”ہمیشہ خیال رکھیں گے چاہے ہم دس بچوں کے ہاں لبا ہو جائیں۔ چاہے بڑھے کیوں نہ ہو جائیں۔“ وہ اس کی ہوشربا خوشبودار قربت میں آ کر بیٹھنے لگا تو ایمان ہٹانے لگی۔

”شرجیل پلیز... بیکنگ کرنی ہے مجھے۔“ وہ منمنائی لہجہ دبا احتجاج کیا۔  
”دفع کرو بار! ساری عمر تمہیں کام ہی کرنے ہیں! تمہیں کا موقع تو ابھی ہے مگر جا کے تو...“ شرجیل نے بات لاٹھی چھڑ کر اس کے بالوں سے کچر نکال دیا۔ جس کی بدولت ایمان کے

مٹاؤں جیسے بال اس کے چاند چہرے کو نازک کر کے گرد حصار باندھتے اس کی سحر انگیزی میں یکلخت اضافہ کر گئے۔ شرجیل بے خود ہونے کا ٹکرا ایمان کی جان اس کے ادھر سے فہرے سے انک محو در دل جھڑکنے لگا۔ اس کی آئندہ زندگی کا دار و مدار اسی لاچرے فہرے میں ملفوف تھا غیر واضح غیر مطمئن۔

”سیا بھر جا کے... بولیں نا۔“ اس کا دل گھبرانے لگا مگر شرجیل کی ساری توجہ اس کے سحر انگیز دل نشیں چہرے پر مرکوز تھی جیسی اس کے ہونٹوں پر نرمی سے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”پلیز خاموش رہو! بس مجھے خود کو محسوس کرنے دو! یہ ایسی اہم نم ہے جسے کاشے کا صاف پانی دیکھا ہے؟ تمہیں دیکھ کر مجھے اس کا خیال آتا ہے۔“ اس کی آواز پر بھی خمار چھا رہا تھا۔ ایمان لب بستہ رہ گئی اس کا دل ہر لمحہ خدشات کی دلدل میں جھنستا جا رہا تھا۔



جتنے دن وہ ایگزیم میں مصروف رہی ہر احساس کو دانستہ فراموش کیے رکھا مگر یادوں پر بھلا پیرا اٹھایا جاسکتا ہے۔ ان کی کئی اور کاٹ اپنی جگہ بدرجہ اتم موجود تھی اس کے باوجود کہ حالات اپنی جگہ مزید معمول پر آ گئے تھے۔ وہ کئی راتوں کی جا گئی تھی وہ جی بھر کے سونا چاہتی تھی مگر امامہ کی خواہش تھی کہ وہ اس کے ساتھ سوئے۔ یہ بھی عجیب بچوں والی ضد تھی اس کے باوجود لاریب اسے ڈانٹ کر اس کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی۔

”ٹھیک ہے تم رات کو میرے کمرے میں آ جایا کرتا۔“ لاریب نے اس کا من پسند جواب دیا تو امامہ گلاب کے نو خیز پھول کی مانند کھل اُٹھی۔ امامہ کی فرمائش پر سندھی بریانی بنی تھی اور بہت دلوں بعد بابا سائیں نے بھی ان کے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا۔

”مجھے باجو بہت یاد آتی ہیں بجوا! انہیں سندھی بریانی کتنی پسند تھی۔“ رات کو وہ کمرے میں آئی تو امامہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔ لاریب چپ کی چپ رہ گئی۔ وہ بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھی ورنہ حقیقت یہ تھی کہ لاریب بھی ایمان کی یاد سے بے کھل ہوئی ٹیبل سے بھوکی آگئی تھی مگر امامہ کو اس نے بے دریغ ڈانٹ کے رکھ دیا تھا۔

”میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ تم اب دوبارہ ان کا ذکر نہیں کرو گی۔“

”کسی کا ذکر نہ کرنے سے کوئی دل سے نہیں نکل جایا کرتا۔“ امامہ نے بگڑ کر کہا اور لاریب کے دل پر وار ہوا تھا۔ غلط کب کہہ رہی تھی وہ بھلا عباس کو دل سے نکال پائی تھی یا ایمان کو بھولنے

میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ محبتیں کھو کر بھی کہاں اثر کھوتی ہیں۔ کہاں مرنی ہیں بلکہ پھٹری محبتیں تو دلوں کے تاسور ثابت ہو کر ہر لمحہ اذیت کی کک سے دو جا کر مرنی رہتی ہیں۔

”مجھے وہ یاد آتی ہیں، تجھے وہ نہیں بھولتیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ پھر آپ سوچیں اگر میں آپ سے بھی ان کی باتیں نہ کروں تو کس سے کروں؟“ وہ ہچکیاں بھر بھر کے رو رہی تھی لاریب کو البتہ اس پر رحم آنے کی بجائے تازہ آ رہا تھا۔

”تم اگر یہ چہرے کھو نہیں کر سکتیں تو اٹھ جاؤ یہاں سے۔“ وہ پھنکاری اور ہاتھ میں موجود سیل فون پیش میں بستر پر پڑ گیا۔ امامہ نے آنسوؤں سے جل تھل ہوئی آنکھوں میں حیرانی لیے اسے دیکھا پھر یک دم پھری گئی۔

”ٹھیک ہے میں چلی جاتی ہوں یہاں سے۔“ اپنے اس غم کا میں اکیلی ہی ماتم کر لوں گی آپ اگر پتھر ہو گئی ہیں تو میں پتھر نہیں ہوں۔“ وہ روتے ہوئے چیخی اور اٹھ کر کمرے سے بھاگ گئی۔ لاریب عجیب پر طال احساسات کا شکار وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔ امامہ کا یوں ٹوٹ کر ٹھکرا اور روتا اس کا دل کتنے لاتعداد ٹکڑوں میں تبدیل کر گیا تھا۔ کون جانتا تھا مگر ایک اتانھی جو اسے امامہ کے پاس جانے اور منانے سے باز رکھے تھی پر دل بے تاب تھا۔ اسی بے چینی نے ملا خراسے اسے بھجور کر دیا۔ اس سے پہلے کہ دروازے تک پہنچتی بجلی اچانک ٹپٹ ہو گئی۔ کمرایکھت تاریک قبر کا منظر پیش کرنے لگا۔ وہ اپنی جگہ پر جم جی کھڑی تھی جب امامہ کی دلدوز چیخیں اسے بوکھلا کر رکھ گئیں۔ وہ اندھوں کی طرح دیواروں کو ٹوٹتی آواز کی سمت بھاگی کہ امامہ کی ہڈیانی چیخوں میں مزید شدت آتی جا رہی تھی اس کی چیخوں سے لاریب اندازہ لگا چکی تھی وہ اس کے کمرے سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔

”چھوٹی بی بی... چھوٹی بی بی! کیا ہوا؟“ اس سے پہلے سکھاں ہاتھ میں ایمر جنسی لائٹ لیے گئی پڑتی امامہ تک آ پہنچی تھی۔ لاریب نے بے قراری سے اسے جاتے ہی خود سے لپٹا لیا۔ امامہ سر تاپا خزاں زدہ پتے کی طرح کانپتی اور وحشت زدہ نظر آرہی تھی۔

”کیا ہوا امامہ؟ اندھیرے سے ڈری ہو؟“ لاریب نے اس کے بال سہلا کر آنسو پونچھے۔

”ن... نہیں... بجوا! میں اپنے کمرے میں گئی تو لائٹ چلی گئی مجھے اندھیرے سے ڈر لگا تھا میں دوبارہ آپ کمرے میں آ رہی تھی کہ مجھے... مجھے کسی نے پکڑ لیا۔“ امامہ آتی خوف زدہ



روایات میں جکڑے اس کے بے بس باپ کے پاس کوئی رہنمائی بھی نہیں ہے انہیں یہ قربانی دینی تھی مگر امامہ نہیں وہ اتنی عزیز تھی اسے کہ وہ اسے ہرگز بھیشت نہیں چڑھا سکتی تھی۔ اس کے خیال میں وقاص جیسے وحشی سے شادی خودکشی کے مترادف تھی۔ انتقام اور رجحان کے احساس سے بھرا ہوا مردانا کی تسکین کی خاطر ایمان کی بہن کی زندگی اجیرن کرنے کا پورا حق محفوظ رکھتا تھا پھر کیا فرق پڑتا تھا اگر عباس نہیں تو وہ کوئی بھی ہوتا۔ میں تو ویسے بھی مر رہی تھی ہوں۔

غم و غصے اور رنج کی شدید کیفیت میں وہ ایک بار پھر ایک جذباتی قدم اٹھانے کو تیار تھی۔ اسے یقین تھا وقاص بابا سنا میں کے سامنے اس کا نام لینے والا ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ سکندر سے نجات حاصل کرنے جیسی دوران ایگزیم پر صبح اس کے ساتھ کالج جاتے ہوئے وہ اسے یاد دہانی کرتی رہی تھی اور سکندر جانے کیا ٹھانے تھا کہ ہر بار سن کر بھی اُن سنی کرتا تھا اس کی بے نیازی کے اسی مظاہرے نے لاریب کو اتنا آگ بگولہ کیا کہ اس روز وہ اس سے بھڑگئی اور اس پر چلانے لگی۔

”تم پاگل ہو یا پھر تم نے مجھے بے وقوف سمجھا ہوا ہے؟“  
”میں کچھ سمجھا نہیں بی بی صاحبہ!“ جواباً سکندر اس کے اشتعال کے اپنی چل مزا جی کا شلہ مظاہرہ کر رہا تھا۔  
”کیا کہہ رہی ہوں میں اتنے ذوں سے نہیں؟“ لاریب کی رنگت بھی اس کی آنکھوں کی طرح دکنے لگی۔

”کیا کہہ رہی ہیں؟“ اس کا یہ گریز جو سر اسر دانت تھا لاریب کو بیخ پر کر گیا۔

”طلاق دو مجھے اس طوق کو میں مزید گلے میں نہیں لٹکا سکتی۔“ ضبط کھوکھوہ چلا پڑی۔

”اسے گلے میں ڈالنے پر میں نے آپ کو مجبور نہیں کیا تھا یاد کریں آپ نے فورس کیا تھا مجھے حالانکہ تب میں نے اس کے متوقع نقصانات کے متعلق آگاہی بھی دینی چاہی تھی مگر.....“

”مگر کیا.....؟“ سکندر نے پہلی مرتبہ اس کے سامنے اس انداز میں بات کی تھی اس کے تو جیسے انداز آگ دہک اُٹھی۔ غصے کی شدید لہر نے اس کا دماغ دھکا دیا وہ طعنہ دے رہا تھا اسے۔

”ہاں کیا تھا میں نے فورس تب میرا دماغ خراب ہوا تھا مگر اب پچھتا رہی ہوں۔“ اس کا لہجہ حقارت زدہ اور انداز میں رعوت تھی بے نیازی تھی نخوت تھا۔ سکندر نے اک نظر اسے دیکھا اور

ایک دم گاڑی روک دی پھر سرخ چہرے کا رخ اس کی جانب موڑ دیا۔

اور سر اسیمہ تھی کہ تب کچھ بول نہیں پائی تھی لاریب کے سکھاں کو واپس بھیجنے کے بعد خود امامہ کو لیے کمرے میں آ گئی۔ امامہ بہت دیر اس سے لپٹی رہی تھی اور حواس بحال ہونے پر جو کچھ اس نے بتایا وہ لاریب کے حواس سب کرتا پوری جان سے بلا کر رکھ گیا تھا۔ وہ حق دق ہی اسے نکلنے لگی۔

”کسی نے پکڑ لیا؟ کیا مطلب امامہ! کون تھا وہ؟“ وہ سوال پر سوال داغنے لگی صحیح معنوں میں اس کی جان منٹھی میں آ گئی تھی۔  
”وہ کوئی مرد تھا بچو! بہت پسینا بہت طاقت ور شاید وہ مجھے کھینچ کر کہیں لے جانا چاہتا تھا بھی میں ڈر کر چینی تھی اس سے اپنا آپ چھڑوانے کی کوشش میں میں نے اسے نوچا بھی تھا یہ دیکھیں میرے ناخنوں پر ابھی تک خون لگا ہوا ہے اس کا۔“  
امامہ نے ایمر جنسی لائٹ کے نزدیک اپنے ہاتھ لے جا کر دکھائے۔ لاریب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی گلابی پوروں اور ناخنوں پر اترتی خفیف سی خون کی سرخی کو دیکھے گئی۔ اس کا دماغ جیسے لمحوں میں شل ہو کر رہ گیا تھا۔ حویلی کے اندر خالفتا زنان خانے میں اس قسم کی واردات کا امکان ہی ناگزیر تھا کہ ادھر تو ملازم مردوں کا گزر بھی نہیں ہوتا تھا سوائے سکندر کے اور سکندر کا نام ذہن میں درآتے ہی لاریب کے دل نے غوطہ سا کھایا اور جو سرد پڑتا چلا گیا۔

”تو کیا سکندر؟“ اس نے سوچا اور دماغ میں جیسے انگارے چٹختے محسوس کئے۔

”کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا سکندر کی جرأت اتنی بڑھ سکتی ہے۔“ اس نے خود سے سوال کیے اور جواب میں شکوک سر اٹھانے لگے پچھلے کچھ ذوں سے وہ اس کے رویے میں کتنی تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ جب سے وقاص نے اپنی خواہش کی تکمیل کا طوفان اٹھایا تھا سب سے زیادہ بے قرار لاریب ہی تھی۔ وقاص کسی بھی صورت ایمان کی غلطی معاف کرنے پر آمادہ نہیں تھا اس نے صاف لفظوں میں بابا سائیں کو جتلا دیا تھا۔

”ایمان نہ سہی آپ کو نہیں بھولنا چاہیے کہ آپ کی دو بیٹیاں اور بھی ہیں۔“

”اگر تم ایمان کی بجائے امامہ یا لاریب میں سے کسی کو قبول کر سکتے ہو تو مجھے ہرگز کوئی اعتراض نہیں ہے بیٹے! مجھے اندازہ ہے کہ میں تمہارا مجرم ہوں۔“ یہ ساری بات چیت لاریب کی موجودگی میں ہوئی تھی گو کہ بابا سائیں کی اس ڈھیل نے لاریب کو دی کرب اور تکلیف سے دوچار کیا تھا مگر وہ بھی جانتی تھی۔



کر بچان زدہ لہجہ میں بولا۔

”مگر میں اب ایسا نہیں کرنا چاہتا اس لیے کہ نہ تو میں آپ کی طرح پاگل ہوا ہوں نہ بچکتا دے کا شکار۔“ کیا تھا اس کے لہجہ میں اس کے انداز میں کہ لاریب پہلے سکتہ زدہ ہوئی پھر اس نے اپنے روٹنے کھڑے ہوتے محسوس کئے۔ اسے لگا تھا وہ زمین آسمان کے درمیان شدید خوف کے عالم میں معلق ہے۔ سکندر کے یکسر تبدیل ہونے تیرا اسے ہولانے کو کافی تھے۔ سکندر کے بدلے ہوئے انداز و مزاج کا مطلب تھا لاریب کی جاتی۔ صرف لاریب کی نہیں امامہ اور بابا سائیں کی بھی۔ اس کے ہاتھ پیر سرد پڑنے لگے مگر وہ اندر سے جتنی بھی خائف تھی بظاہر ہلکا سا ہنسی کی طرح شاید وہ اپنا بھرم رکھنا چاہتی تھی۔

”تمہیں اندازہ ہے سکندر تم کیا کہہ رہے ہو یا دوسرے لفظوں میں تم اپنی اوقات بھول رہے ہو؟“ اس کی بات کے جواب میں سکندر زہر خند سے ہنسا پھر جلتالی تاؤ دلالی نظروں سے اسے جی بھر کر دیکھا اور پھنکارنے کے انداز میں بولا۔

”بہت اچھی طرح اندازہ ہے اور سزا سکندر صاحب! میری اوقات اس وقت بھی یہی تھی جب آپ نے پیروں سے مجھے اٹھا کر اپنے سر پر رکھا تھا۔“ ماتھے کی تیوریوں اور آنکھوں سے نکلتے شعلوں نے لاریب پر اس کے آنکھوں کی فشانی موڈ اور اس کے ارادوں کی سنگلاخی کو بہت اچھی طرح آشکار کیا تو وہ اندر ہی اندر دہل گئی۔

”تم بہت غلط کر رہے ہو اپنے ساتھ میں ہرگز نہیں چھوڑ دوں گی تمہیں۔ کجا کسی بھول میں رہو۔“ لاریب کو اپنی کمزوری کا احساس ہوا تو دانت کچکچائی دھمکیوں پر اتر آئی۔ جو باوہ کتنے سکون سے مسکرایا تھا۔

”اچھا..... مثلاً کیا کریں گی آپ میرے ساتھ؟“ وہ بے نیازی اور نخوت سے پوچھ رہا تھا اور لاریب غصہ سے بھرپور تھی اس کی آنکھوں میں غصے کی سرخیاں جھلکیں سکندر کا مسخرانہ انداز اسے آگ لگا کر رکھ گیا تھا۔

”یہ آنے والا وقت ہی تمہیں بتائے گا کہ میں کیا کر سکتی ہوں۔“ اس نے نفرت زدہ انداز میں ہونٹ سکڑے جب کہ سکندر نے بے پروائی سے سر جھٹک دیا اس کے بعد اس نے دانستہ سکندر کے منہ لگنے کی کوشش نہیں کی مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ اس بات پر سوچتی اپنا بے تحاشا خون جلا چکی تھی اور اب یہ نیا واقعہ اس کا شک یقین میں بدلنا شروع ہوا۔

”تو کیا وہ اندھیرے کی وجہ سے امامہ پر میرا گمان کر چکا ہوگا۔“ اس نے سوچا مگر اس سے اگلی سوچ اس کی ریزہ چکی پڑی میں سر طبرہ ڈالنے لگی۔

”کیا مقاصد ہوں گے اس گھٹیا حرکت کے پیش نظر اس کے؟ کہاں لے جانا چاہ رہا ہوگا؟ اور جب امامہ چھٹی تو حقیقت کھلنے پر چھوڑ کر بھاگ گیا.....“ اُن خدا لایا! وہ لڑائی اور سب سے بستر پر کمر بستہ رہی۔

”اس کو امامہ نے زخمی تو کیا تھا نشان تو ہلکا ہے۔“ اس سوچ کے دماغ میں دو آتے ہی وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی امامہ اس کے بستر پر خبر سو رہی تھی۔

”مجھے اسے پکڑنا چاہیے ثبوت ہے تاہم بے پاس اور اس وقت موقع بھی مناسب ہے۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح جذباتیت سے سوچا اور جذباتیت سے فیصلہ کیا اور اس کی نزاکتوں اور باریکیوں پر حیاں دیئے بغیر بستر سے اتر گئی۔ لائٹ آچکی تھی اس نے ٹیبل لیسپ آن کر کے باقی تمام لائٹس بجھا دیں شال اوڑھ کر احتیاط سے دروازہ کھول کر باہر قدم رکھ دیا رہبرانی نیم تاریک اور سنسان تھی۔ آخری سرے پر اک آرائی بلب روشن تھا رات کے مخصوص سنائے میں کتوں اور چھینکروں کی آوازیں وقفے وقفے سے گونجتی تھیں۔ وہ بے آواز قدموں کو اٹھاتی رہبرانی کے سرے پر آ گئی۔ آگے بڑھا تھا پھر دوسرے کمرے کو جانی رہبرانی..... اس رہبرانی کے اختتام پر پہلے بابا سائیں کا کمر تھا پھر سکندر کا رات بارہ بجے کے بعد کمال تھا اور یہاں زیادہ سے زیادہ دس بجے تک ملازم تمام کام ختم کر لیتے کواٹروں میں چلے جاتے تھے اس نے سکندر کے دروازے پر دھک کر آہستگی سے دستک دی سکندر جو ابھی کچھ دیر قبل ہی بابا سائیں کے پاس سے آیا تھا اس دستک پر بری طرح چونک کر تیزی سے دروازے پر آیا کہ شاید بابا سائیں کی طبیعت خراب ہو مگر دروازہ کھولتے ہی نیم تاریک رہبرانی کسی فانوس کی مانند جگمگاتی لاریب کو اپنے سامنے موجود دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔

”آپ..... اس وقت.....؟“ حیرت کی زیادتی کے باعث وہ احتیاط کا دامن بھی چھوڑ بیٹھا جسمی آواز خامی بلند ہوئی تھی جس پر جھلانی لاریب اسے غصے میں دھکیلتی اندھا دھکی لور اپنے پیچھے بہت سرعت سے کاندھے کی ٹھوک سے دروازہ بند کر دیا۔ سکندر کی تو آنکھیں پھٹی پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

”مگر کوئی کام تھا مجھ سے تو آپ صبح آ جاتیں اس وقت.....“

”بہت مہذب ہونم یہی ثابت کرنا مقصود ہے نا؟“ وہ دبے ہوئے انداز میں غرائی۔ سکندر نے ٹھٹک کر اس کو دیکھا۔ لاریب کے چہرے کے تاثرات میں برہمی اور کبیدی کو پا کر اس نے سرد آہ بھری۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا“ وہ واقعی الجھا تھا آنکھوں میں کتنی تشویش درآئی تھی۔ لاریب نے اسے بھی سکھ کا سانس نہ لینے دیا تھا نہ شاید وہ کبھی اسے لینے دے گی۔ اس نے ہونٹ جھنجھکیے۔

”ابھی سمجھاتی ہوں مقصد شرٹ اتار دینی۔“ وہ اسی سابقہ انداز میں غرائی۔ آنکھوں سے برہمی مترشح تھی سکندر تو اس کو کھینچا زور پر چکر اٹھا تھا۔

”ک..... کیوں..... آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“ وہ اتنا بولکھلایا کہ بکا سا گیا۔ لاریب کو اس کا یہی انداز سب سے آگے گیا تھا۔ اس کے گریز کو وہ اس کے جرم پر پردہ پوشی سمجھ کر ہی برہم ہوتی تھی۔

”میں فارسی میں بات نہیں کر رہی سیدی طرح کہا ہے شرٹ اتار دینی۔“ وہ کچھ اور پھری اور اس مرتبہ تلملا ہٹ اتنی بڑھی کہ ایک قدم آگے ہوتے اسے زور سے دھکا بھی دیا۔ سکندر کا چہرہ اہانت اور سبکی کے زیر اثر سرخ پڑتا چلا گیا کچھ کہے بغیر اس نے ہونٹ جھنجھکیے اور شرٹ کے منہ کھولنے لگا پھر اسی رخ تاثر سمیت شرٹ اتار کر بستر پر پھینک دی۔ لاریب جو اس کی سمت متوجہ تھی تیزی سے نزدیک آن رکی۔ اس کی گردن اس کا سینہ ہر قسم کی کھردر و نچول سے مبرا تھا وہ ششدر ہونے لگی اس نے ایک غیر یقینی کی کیفیت میں آنکھیں پھاڑ کر از سرے نو جائزہ لیا اور باقاعدہ ہاتھ سے چھو کر تادیبہ زخم کھوجنے چاہے سکندر حق دق سا اس کی حرکات ملاحظہ کر رہا تھا۔ لاریب کی نرم پوروں کا سر سر اٹا لمس اس کے اندر سنسنی پھیلاتا خوابیدہ جذلوں کو جگانے لگا۔ سارا غصہ ساری اتاحسن کی شعاعوں کے آگے جل کر خاک ہوتے دیر نہیں لگی۔

بلیک اینڈ وائٹ پرنٹ کا کرتا شلوار اور میروں لٹا کش شال میں ملبوس دو دو حیا چاند کی روشنی میں نہائی وہ لڑکی اتنی طاقتور تھی کہ اس کا موڈ بدل پانی اپنی تمام تر بے نیازی لا تعلقی اور بے حس کے باوجود آخروہ انسان تھا۔ بشری تقاضوں سے بے نیاز کیسے ہو سکتا تھا اس کی کیفیات بدلنے لگیں غصہ ناراضگی کی جگہ سرشاری نے سر اٹھایا لمس اور اس کی قریت کی مددوش کن دقتی ہوئی آج دی خوشبو نے اپنا جادو جگانا شروع کر دیا وہ کم مہم بے

خود سا کھڑا اس کا یہ لہر سا روپ نگاہ کے رستے دل میں اتارے لگا۔ قتی طور پر وہ ہنر اموش کر گیا تھا اس ماحول اور اس کی وجوہات کو بھی۔ یہ بے حد مغرور اور خاص لڑکی جو اس کی رگ جال میں ہستی تھی جسے اتنی شدتوں سے چاہا تھا کہ اپنی شدتوں کے باعث قدرت کے انعام کے طور پر وہ معجزانہ طور پر کسی اس کے نام لکھ دی گئی تھی۔ جو اتنی بے نیاز اور لا تعلقی تھی کہ کبھی اس کی قربتوں اور خیالوں سے خائف نہ ہو سکتا تھا اس کی بہادری اس مقام پر تھی کہ سکندر کو اپنی مردانگی غلامی کی زنجیروں میں پھنسا پھنسی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کی انہی بے نیاز حرکتوں کی بدولت ہی وہ اکثر اس سوچ کے ساتھ چل اٹھا تھا کہ کسی روز اس کی بے نیازی اور بے حس کو اپنی جرأت کے مظاہرے سے پارہ پارہ کر ڈالے اور اس کی حیرتوں سے لطف اٹھائے۔

دوسری سمت اس کی سوچوں کے برعکس لاریب کو اپنے اندازے کی غلطی اگر خجالت سے دوچار نہیں بھی کر سکتی تب بھی بھڑکانے کا باعث ضرور بن گئی تھی وہ کسی طور بھی ہار تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی۔

”سکندر وہاں آئیے میں کھڑے ہو کر دیکھو تمہارے سینے پر گردن پر کوئی نشان ہے؟“ اس نئی ہونے والی فرمائش نے سکندر سے بھی احتیاط اور احترام کا دامن چھڑا دیا۔ وہ پہلے مسکرایا پھر جب بولا تو لہجہ بھی نظروں کی طرح بے قابو اور بہکا ہوا تھا۔

”یہ تمام تقاضے بہت معنی خیز ہیں بی بی صاحبہ! بہر حال اگر مجھ سے کوئی گستاخی سرزد ہوگئی تو آپ انرا سونے کی پوزیشن میں نہیں رہیں گی۔“ لاریب پہلے تو اس کی بات سمجھی نہیں جب بھی تو شرم اور غیض سے منجمد ہوئی کتنی دیر پھٹی پھٹی نظروں سے اسے کتنی رہ گئی۔ انداز سکتہ زدہ تھا یہ صدمہ ٹوٹا تو قہر برپا ہو گیا تھا جسمی وہ اگلے لمحے اس پر جھپٹ پڑی تھی تو ہیں سے بڑھ کر شرم اور بے مائیگی کے احساس نے اسے نیم پاگل کیا تھا۔

”دو ٹکے کے ذلیل کیسے انسان..... تمہاری یہ جرأت کہ تم مجھ سے اس قدر تھروڈ کلاس گفتگو کرو۔“ سکندر نے بروقت خود کو پیچھے ہٹا کر اس کے حملے سے بچایا اور اس سے پہلے کہ وہ پھر اس پر ہاتھ اٹھاتی سکندر نے اس کے دلوں ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکے سے نیچے کیے مگر چھوڑنے نہیں تھا صحت حال اس قسم کی تھی کہ وہ اس کے حصار میں جکڑی ایک طرح اس کے سینے سے لگی کھڑی تھی مگر بے بسی کی انتہا تھی یہ کہ ہاتھ سکندر کی بے رحم سنگ دلانہ گرفت میں جکڑے ہونے کے باعث نہ تو فاصلہ بڑھانے پر







# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ تمام پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کے پیشکش کیے گئے ہیں

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے
- ✧ کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف
- ✧ سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، سپریمڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز اور مظہر کلیم اور
- ✧ ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے
- ✧ کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”شاید آپ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھے اب یہاں سے چلے جانا چاہیے“ اس کی بات کے جواب میں اعلیٰ اور بے حسی کا سامنا تھا۔ فرار نے اپنی جگہ جبراً ہونے پر ہلکا بدلا اور ہونٹ بیچنے لگی۔

”اپنی زندگی کے ہر فیصلے میں تم خود مختار ہو رہے ہو اور میں یہ کیوں کہوں۔“ پایا کے جواب نے سب سے زیادہ تاؤ جی حوصلہ بڑھایا تھا جب کہ شرجیل کو ان کی بات پر دلی صدمہ ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایمان کا لرزتا ہوا مگر سرد پڑ جانے والا ہاتھ تھما لیا۔

”چلو ایسی! میں غلطی سے یہاں آ گیا“ مجھے ایمان نہیں تھا میرے لیے یہاں جگہ نہیں رہی۔“

”رک جائیں بھائی! آپ کہیں نہیں جائیں گے یہ کہ صرف تاؤ جی کا نہیں ہے ہمارا بھی ہے اگر آپ یہاں نہیں رہیں گے تو پھر میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔“ فرار نے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے فیصلہ کن انداز اختیار کیا تو جیسے وہاں ہر سو ایک بار پھر سناٹا چھا گیا تھا۔

لاریب بستر پر اوندھے منہ لیٹی آنسو بہا رہی تھی۔ ساری رات اس نے یہی کام کیا تھا سکندر پر اتنا تاؤ اور غصہ تھا کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ وہ سوچ سوچ کر گھٹتی رہی تھی کہ وہ اس سے اتنی گستاخانہ گفتگو کا مرتکب آخر کس برتنے پر ہوا پھر اپنی غلطی اپنا قصور اسے پاگل بنانے لگتا۔ اس وقت بھی وہ بے چارگی کی انتہاؤں کو چھو رہی تھی جب امامہ اسے پکارتی ہوئی اندھا آئی تھی۔

”بھو! یہ دیکھیں یہ پاک ثبوت ملا ہے مجھے اس آدی کا۔“ امامہ کے لہجے میں دبا دبا جوش محسوس کر کے لاریب نے الجھ کر تکیے سے منہ اٹھایا اور اسے ناہم نظروں سے دیکھا۔

امامہ نے اپنی بند ٹٹھی اس کے سامنے کھول دی جس پر غصی بلیکٹر کا بٹن نمایاں تھا۔

”مات جب میں اس سے اپنا آپ چھڑا رہی تھی اس کی شرٹ کے بٹن ٹوٹنے کی آواز میں نے خود سنی تھی۔“ امامہ کا لہجہ یقین تھا۔ لاریب کا دماغ جھنجھٹا اٹھا۔

(جاری ہے)

”اس طرح کی واقعات راہ چلتے ہزاروں ملتی ہیں مگر انہیں گھر میں نہیں اٹھا لاتے۔“ تاؤ جی اس سکتے سے باہر آئے تو گرجے تھے ان کا لہجہ تضحیک آمیز تھا اور سرد بھنکار سے بوجھل بھی۔ ایمان کو لگا اسے کسی نے بے خبری کے عالم میں اٹھا کر چلتے تندور میں پھینک دیا ہو۔ اس کا دھواں بالوں سے اٹ گیا اور روح جھلس اٹھی۔ کسی نے سچ کہا ہے الفاظ کے ناخن نہیں ہوتے مگر یہ زخمی کر دیا کرتے ہیں۔

”تاؤ جی پلیز! اس از نوؤج یہ ایمان ہے شاہ صاحب کی بیٹی! جس کا پروپوزل لے کر گئے تھے آپ۔“ شرجیل نے ناگواری سے ٹوکتے ایمان کا تعارف بھی پیش کیا۔ تاؤ جی زہر خند ہنستے اپنے بھائیوں کو ٹکٹے لگے جواب بستے تھے اور سر جھکائے بیٹھے تھے۔ یہ جانے کب سے ملے ہوئے ایمان بھائیوں کے سچ کہ چھوٹا بڑا ہر معاملہ تاؤ جی ملے کر س کے باقیوں کو کسی معاملے میں بولنے کی اجازت نہیں۔ چاہے وہ معاملہ اولاد کا ہی کیوں نہ ہو۔ فرار کو باپ کی جامد چپ نے شدید ناگواری میں جھٹلایا۔

”باپ نے رشتہ نہیں دیا بیٹی بھاگ کر آئی۔ یہ ہے اس کی اصلیت اس کی اوقات۔“ تاؤ جی کا لہجہ وانداز ہنوز تھا۔ شرجیل کا رنگ بے تحاشا سرخ ہوا۔

”بس تاؤ جی..... اور پایا یہ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ ایمان کی نہیں میری بے عزتی ہے آپ کچھ بولتے کیوں نہیں؟“ وہ گویا سراپا احتجاج تھا مگر تاؤ جی کسی کو کہاں خاطر میں لاتے تھے اسے بھی بد رنج جھڑک کر رکھ دیا۔

”لوئے بولی! انگلش نہ جھاڑ میرے آگے سمجھا۔“ شرجیل نے سخت برامانے پھر والدین کو دیکھا جواب بستے بیگانہ تیور لیے یہ مکالمہ ملاحظہ کر رہے تھے۔

”پاپا میری بے عزتی ہو رہی ہے آپ اتنے تعلق کیسے بیٹھے ہیں؟ میں برداشت نہیں کر سکتا۔“ وہ ضبط کھو کر چیخا۔

”تو مت کرو کس نے مجھ کو کیا ہے تمہیں؟“ جواب میں انہوں نے لا تعلقی اور بے نیازی کی انتہا کر دی۔ شرجیل کو اپنے چہرے سے مادے کی کے بھاپ نکلی محسوس ہوئی جب کہ ایمان کے آنسو اس انتہا و جہ کی سکی کو پا کر گالوں پر اتر آئے تھے۔ وہ سر تپا کا نپ رہی تھی اور ہرگز رستے لمحے کے ساتھ زرد پڑتی جا رہی تھی۔ شرجیل نے ایک خفت زدہ نظر ایمان پر ڈالی پھر سر راہ بھر کے باپ کو مخاطب کیا۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### مجموعہ خاص کیوں ٹھیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، سپر ہائیڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسی کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ام ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ویڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1





ترک مصیبت کر بیٹھے ہم ضبط مصیبت اور بھی ہے  
اک قیامت بیت چکی ہے اک قیامت اور بھی ہے  
ہم نے اس کے درد سے اپنی سانس کا رشتہ جوڑ لیا  
ورنہ شہر میں زندہ رہنے کی اک صورت اور بھی ہے

#### گزشتہ قسط کا خلاصہ

یہ کہانی نندی گریوال سے شروع ہوتی ہے جس کا تعلق دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد سے ہے باپ کریم جیکہ مال ہندو ہے نندی اپنی ماں کے ساتھ انڈیا میں جب کہ اس کا بھائی باپ کے ساتھ امریکا میں مقیم ہے۔ برسوں قبل امریکا میں نندی کسی ایشین مرد سے ملتی ہے جس کی شخصیت کا سحر اس قدر اس پر طاری ہو جاتا ہے کہ وہ ہر جگہ اسے پاگلوں کی طرح تلاش کرتی رہتی ہے۔ نندی کی ماں سریتا دیوی کے دوسرے شوہر کا بیٹا دیونندی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ سریتا دیوی نندی کو دیو سے شادی کرنے پر مجبور کرتی ہیں جس پر نندی دلبرداشتہ ہو کر اپنی جان لینے کی کوشش کرتی ہے۔ کہانی کا دوسرا اہم کردار عباس حیدر جس کی نسبت بچپن ہی سے اپنے چچا کی بیٹی لاریب سے ملے ہے اپنی خاندانی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے شوہز جوائن کر لیتا ہے جس پر سارا خاندان اس سے قطع تعلقی اختیار کر لیتا ہے۔ عباس کے جانے کا سب سے زیادہ اثر لاریب پر ہوتا ہے وہ اندر سے ٹوٹ جاتی ہے دوسری طرف عباس اریبہ سے شادی کر لیتا ہے اس کی شادی کی خبر سن کر لاریب شدید صدمے سے دوچار ہوتی ہے اور حویلی کے خاص ملازم سکندر جو کہ گھر کے ایک فرد کی طرح ہے اسے شادی کے لیے خود پر پوز کرتی ہے سکندر لاریب کو چپکے چپکے دل میں پسند کرتا ہے اور لاریب کی ذہنی حالت اور صدمے کے آگے ہار مانتے ہوئے اس سے کورٹ میرج کر لیتا ہے لاریب عباس کو اپنی اور سکندر کی شادی کی خبر فون پر سناتی ہے جس پر وہ حسد کرنے کے بجائے مبارک باد دیتا ہے تب ہی لاریب کو شدت سے اپنی غلطی اور سکندر کی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے جس پر وہ اپنی جان لینے کی کوشش کرتی ہے۔ کہانی کا تیسرا اہم کردار شرجیل جس کا تعلق جوائنٹ فمیلی سے ہے خاندان میں اسے بے حد اہمیت حاصل ہے اس کی چچا زاد علیہ جو واجی شخصیت کی مالک

ہے۔ شرجیل کو دل ہی دل میں پسند کرنے لگتی ہے لیکن شرجیل پہلے سے ہی ایمان کو پسند کرتا ہے جس کی نسبت وقاص سے ملے ہے۔ لاریب خوش قسمتی سے بچ جاتی ہے جب کہ سکندر اس کے انتہائی قدم پر ششدر رہ جاتا ہے لاریب کے گھر آنے کے بعد سکندر اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ اس کی شکل تک دیکھنے کی بھی روادار نہیں اور ایمان کے سامنے ہی اس پر ٹک پڑتی ہے۔ دیو کے بارہا منع کرنے کے باوجود سریتا دیوی ایک بار پھر نندی سے دیو کے متعلق بات کرتی ہیں جس پر شدید طعنہ ملتا ہے آگے وہ بالکونی کی چھت سے کود جاتی ہے مگر ایک بار پھر بد قسمتی سے بچ جاتی ہے جس پر دیو اور سریتا دیوی شکر کا سلسلہ لیتے ہیں۔ ڈاکٹر زینب نندی کو پھارت سے کھاتی ہیں بیچتا وہ ان کے قریب سے قریب تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ دوسری جانب عباس عریبہ کے ساتھ نئی زندگی میں گمن ہے جب کہ لاریب اپنی کئی حماقت پر سکندر سے مزید نفرت کرنے لگتی ہے۔ اس کی بیماری کا سن کے ایمان اور امامہ سکندر کے گھر ملنے جاتی ہیں وہ بھی نکاح نامہ لینے کی غرض سے ان کے ساتھ چلی آتی ہے۔ نکاح نامہ نہ ملنے کے باعث وہ شدید رنج میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ سکندر کچھ دن بعد جب لاریب کو ڈراپ کرنے جاتا ہے لاریب اس سے نکاح نامہ لے کے جلا دیتی ہے جب کہ سکندر ششدر رہ جاتا ہے۔ دوسری جانب شرجیل ایمان کے گھر رشتہ بھیجتا ہے جو توقعات کے عین مطابق رد کر دیا جاتا ہے جب کہ تایاجی حویلی کے رکھ رکھاؤ و دولت سے بے حد متاثر ہوتے ہیں شرجیل فراڈ اور ایمان کے بھاگنے کا لائحہ عمل بتاتا ہے جس پر وہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ عباس عریبہ کے ساتھ ہنی مون پر جانے کی تیاری کر رہا ہے جب ہی اسے باپ بننے کی خوش خبری ملتی ہے جس پر وہ خوشی سے جموم اٹھتا ہے جب کہ عریبہ اس کی اس قدر دیوانگی کو دیکھ کر کر جھینپ جاتی ہے۔ شرجیل تائی جی سے اپنے گمشدہ چچا کی چچی کے متعلق استفسار کرتا ہے جس پر تائی جی غصے سے چھٹا

کہانی سنا کے انہیں خاموش کر دیتے ہیں۔ نندی ڈاکٹر زینب سے ملنے ان کے گھر جاتی ہے جہاں نندی کے شوہر دین اسلام سے متعلق درس دے رہے ہوتے ہیں ان کی باتوں کا نندی پر بہت اثر ہوتا ہے وہ الجھ کر رہ جاتی ہے جس کا تذکرہ وہ ڈاکٹر زینب سے بھی کرتی ہے۔ دوسری جانب حویلی میں ایمان اور وقاص کی شادی کی تیاریاں عروج پر ہیں جب کہ ایمان شرجیل کے ساتھ اپنی آگے کی زندگی گزارنے کا تہیہ کرتے ہوئے رات کی تاریکی میں اپنے گھر کی دلیں پار کر جاتی ہے۔

☆☆☆.....

اس نے سوتے ہوئے چہرے اور بے خواب آنکھوں کی سرخیوں کے ہمراہ امامہ کی جانب دیکھا۔ انداز سوالیہ تھا۔  
”کہاں سے ملا یہ تمہیں؟“ اس کے لہجے میں بے دلی کے ساتھ اکتاہٹ کا بھی رنگ تھا۔ رات بھر سکندر آف وائٹ شرٹ میں تھا دیسے بھی لباس کا کیا ہے کبھی بھی بدلا جاسکتا ہے۔ دھوکہ دینے کو جرم مٹانے کو مگر وہ خراشیں وہ کہاں گئیں؟“ اس کا متغیر پوچھل ڈھن پھر اس نقطے پر آ کر ٹھہرا تو اندر کیلا دھواں بھرنے لگا جھجلاہٹ مچی اور بے بسی مل جل کر اس کے اعصاب کو توڑنے پھوڑنے لگی عقل جیسے خطہ ہو رہی تھی۔

”وہیں کارڈر کے فرش سے“ امامہ کے جواب نے اس کے ہونٹوں کی تراش میں زہر بھری مسکان کو جگہ دی۔  
(یہ قریب ہی ہو سکتا ہے عین ممکن ہے کسی نے کسی کو پھسانے کی خاطر دانستہ وہاں.....) اس نے سوچا اور ٹھٹک گئی۔  
دل و دماغ میں اتنی نفرت اور کڑواہٹ تھی سکندر کے خلاف کہ وہ اسے اس جرم سے بری کرنے پر آمادہ نظر ہی نہیں آتی تھی حالانکہ وقاص حیدر کی موجودگی اور اس کی فطرت کو سامنے رکھتے ہوئے پہلا ٹھٹک اس پر جانا چاہیے مگر اس کا متغیر سے بھر ہوا ذہن سکندر کو رعایت دینے پر آمادہ ہوتا تو ہی بات بنتی۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھٹک ہے نا بھو!“ امامہ اس کے چہرے کے انضمام کو خاموشی سے دیکھتی بلکہ خرم سوال کر گئی تھی اور اس کا ہاتھ ہمدردانہ انداز میں پکڑا مگر اس کے اعصاب اگلے لمحے شدید کشیدگی سمیٹ لائے تھے۔ لاریب شدید بخار میں پھنک رہی تھی۔

”ہائیں! آپ کو اتنا تیز بخار ہے بھو اور آپ نے مجھے بھی نہیں بتایا۔“ امامہ تل بھر میں حراساں ہو گئی تھی۔  
”تم کیا کر لیتیں؟“ لاریب کے مسخرا میز روکھے لہجے نے امامہ کو ششدر ہی نہیں کیا وہ شاکی بھی ہونے لگی۔

”میں بابا جان کو گاہ کرتی ڈاکٹر کو بلاتے ہیں۔“ امامہ کے لہجے میں تشویش کے ساتھ آنسوؤں کی کمی کا احساس بھی غالب تھا۔ لاریب کو اس کی آواز کی بھراہٹ نے ہی اپنے رویے کی شدت کا احساس بخشتا تھا۔ جیسی پلٹ کر جاتی امامہ کا بازو نرمی سے تھام لیا۔

”سوری امامہ میں کچھ آپ سیٹ ہوں جانو۔“ اتنی ہی بات کرتے اس کی آواز غم ہو گئی تھی۔ آنکھیں آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں دھک کر سرخ ہو رہی تھیں۔ امامہ نے دکھ بھری نظروں سے اسے کچھ دیر دیکھا پھر بے اختیار اس کے گلے لگ گئی۔

”کیوں ڈسٹرب ہوتی ہیں۔ جو ہوتا تھا ہو گیا وہ بھول جائیں سب۔“ اسے محبت سے چٹکتی اس کی ڈھارس بندھاتی اس بل وہ خود اس سے بڑی بن گئی۔ لاریب کے اندر جیسے جنموں کا اضطراب اور وحشت پھیلنے لگا دل ہوک سے بھر گیا۔

(کیا بھول جاؤں امامہ؟ عباس حیدر کے انکار کو یا اس کی محبت میں نارسائی کا اذیت انگیز روح کو کچھ کے لگتا ہوا احساس جو مجھے کسی تل بھی چھین نہیں لینے دیتا۔ تمہیں کیا پتا یا رام وہ پر آسائش زندگی کانٹوں کی جگ بن چکی ہے میرے لیے اور خود فریبی و خود اذیتی کا یہ عالم کہ میں اتنے دن اسپتال میں محض اس کی ایک جھلک دیکھنے کو دن رات پلکیں فرش راہ کیے رہی ہوں۔ جانتی تھی وہ نہیں آئے گا۔ جانتی تھی یہ پاگل پن ہے پھر بھی ایسا کیا ہے میں نے۔ میری جذباتیت کی انتہا ہے یہ کہ ابھی بھی اسے بانے کی خواہش مند ہوں۔ اب بھی جبکہ نہ صرف وہ راہیں تبدیل کر چکا بلکہ میں نے بھی انتقام اور جبراً کسی مگر کسی کو اپنا آپ سونپ دیا۔ سکندر سے نکاح کے بندھن کی حماقت سے بڑھ کر بھی کوئی نا عقلی کی بات ہو سکتی ہے۔ صرف یہی نہیں اب اس کا تبدیل ہو جانے والا رویہ مجھے کانٹوں پر گھسیٹتا ہے خوف پریشانی اور وحشت میں خود کو سنبھالوں تو کیونکر میں بھولوں تو کیسے؟)

امامہ نے اس سے الگ ہو کر اسے بے دردی سے ہونٹ کھینچتے پلکیں جھپک کر نمی اندر اتارتے دیکھا اور اندر تک دھکی ہو گئی۔

”مجھے پتا ہے بھو آپ کو وقاص اچھے نہیں لگتے۔ اگر بابا جان کچھ کہیں آپ سے تو آپ انکار کر دیجیے گا۔“ امامہ نے اپنی سوچ کے مطابق اس کی پریشانی کا حل پیش کیا۔ لاریب کے چہرے پر مجرد غم بکھر کر معدوم ہو گیا۔

”میں اس وجہ سے پریشان نہیں ہوں ڈونٹ یووری۔“  
”پھر کیا ہے بھو؟“



”امامہ پلیز مجھے سونا ہے۔“ امامہ کی بات کاٹتے ہوئے اس نے ہنسی کھینچا اور اس پر سر رکھ لیا۔ مطلب صاف ظاہر تھا وہ تنہائی چاہتی ہے۔ امامہ سر نہ ہٹا کر اٹھ گئی تو لاریب ایک بار پھر اپنی انہیں سوچوں کے ہمراہ تیار ہو گئی۔

”کیسے پتا چلے کون تھا وہ؟ کس نے کی اتنی جرات؟ سکندر کاش میں تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑ سکتی۔“ اس کی وحشت اور اضطراب ہیجان کی طرف بڑھنے لگا۔ کس عذاب میں جان جا پڑی تھی صرف عباس حیدر کی وجہ سے ذہنی و قلبی اذیت کا دھارا اس رخ پر بہہ رہا تھا کہ اس کے روم روم سے عباس کے لیے بد دعائیں پھوٹنے لگتیں۔ صرف بد دعائیں نہیں آئیں اور کراہیں بھی۔

اس نے سالن کے قیلے میں جھج چلا کر ڈھکن بند کیا اور جھک کر چولہے کی آگ قدرے دھبی کر دی۔ پھر مڑ کر کنگ بورڈ کی طرف آ گئی۔ جہاں سلا کی سبزیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ وہیں کھڑی ہو کر وہ سر جھکائے کھٹ کھٹ سبزیاں کاٹنے لگی۔ وہ اپنے دھیان میں مگن تھی جیسی شرجیل کے قدموں کی آہٹ بھی محسوس نہ کر سکی۔ زرد اور نیچ اور ریڈ کے خوشنما پرنٹ ٹیبل دوپٹے اور آف وائٹ ٹراؤزر میں اس کی ہانٹ اور نازک فکر بے حد دلکشی سمیٹے ہوئے تھا۔ لمبے بھورے سیدھے چمکدار بال شانوں سے پھسل کر کمر پر گر رہے تھے۔ اس کا ازلی پرائیڈ مضبوط اور دو ٹوک انداز یہاں آنے کے بعد دھیرے دھیرے خوف اور احساس کمتری کے لپیٹ میں آتا جا رہا تھا۔ جیسی وہ شرجیل کی پکار پر گھبراہٹ کا شکار ہو کر مڑی شرجیل نے اس کی شیشائی ہوئی صورت دیکھی اور گہرا سانس بھر لیا۔

”یار کیا ہو گیا ہے میں ہوں۔“ وہ عاجز ہوا۔ ایمان نے سرد آہ بھرنے کے انداز میں محض سر ہلایا۔

”جائے بنا کر کمرے میں دے جاؤ مجھے۔“ وہ نرمی سے کہتا واپس مڑ گیا۔ ایمان نے اپنا کام ادھورا چھوڑا اور چائے کی تیاری کرنے لگی۔ فریج سے دودھ کا پلٹ نکال کر ساس پین میں ڈالا اور اسے چولہے پر چڑھا دیا۔ شرجیل تھوڑے والی چائے نہیں پیتا تھا۔ اسے دودھ پتی پسند تھی۔ بہت اسٹرائنگ قسم کی۔ اب وہ صرف شرجیل کی نہیں ہر کسی کی پسند کا خیال رکھنے کی پابند تھی۔ اس گھر میں اسے تو کیا وہ مقام ملتا تھا جو ایک بھوکا ہوتا ہے الٹا شرجیل کو بھی گویا برداشت کیا جانے لگا۔ یہ تو فرما تھا جس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے وہ اس رات وہاں ٹھہر پائے تھے اور اس کے ساتھ ماما کی فیور بھی۔ ایمان نے اتنے سخت اور مشکل حالات

کے باوجود جو بات شدت سے محسوس کی تھی وہ فرار کی بغاوت کو دبانے کی تاؤ جی کی غیر محسوس کوشش تھی۔ فرار کے سراٹھاتے ہی وہ دھبے پڑتے چلے گئے تھے۔ مگر جو بات یہاں اس کے علاوہ زیادہ تکلیف کا باعث تھی وہ یہ تھی کہ شرجیل کے لیے بھلے تھوڑی بہت گنجائش کھل آئی تھی دل میں نہ سہی گھر میں سہی گھر ایمان کے ساتھ تو ماما کا رویہ بھی جھک آ میز ہی تھا۔ شروع کے دنوں میں تو وہ کچھ اس طور حواس باختہ اور عدم اعتماد کا شکار ہوئی تھی کہ خود کو کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ یہ شرجیل ہی تھا جس نے اسے رات دکھائی تھی۔

”اس طرح تو قیامت تک بھی کوئی تمہیں قبول نہیں کر سکتا۔ ایمان! دلوں میں جگہ بنانا تو بہت دو کی بات کچھ پانے کو کچھ کھانے بھی پڑتا ہے۔“ اور ایمان نے جان لیا تھا وہ کچھ پانے نہ پائے کھانے والی ضرور بن گئی ہے۔ عزت بھرم محبت وقار اور جلنے کیا کچھ ایک غلط اٹھاؤ قدم اسے لا تعداد پچھتاوے دے گا تھا۔ ہر پہل ساتھ بھانے کا عہد بھانے والا اپنے گھر والوں کے دل شکن رویے سے مایوس اس کے دکھ کو محسوس کرنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھا۔ ایمان کا افسردگیوں کی گھاؤں میں چھپا چہرہ اسے ہسٹریک کرنے لگتا۔

”ہر وقت رونی صورت بنا کر یہ ثابت کرنا چاہتی ہو کہ تمہیں اپنے عمل پر پچھتاوا ہے۔“ وہ سوال نہیں کرتا تھا الزام لگایا کر رہا۔ ایمان کی ہراسی اور بوکھلاہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتا کرتی۔ وضاحتوں اور یقین دہانیوں کی اتنی لمبی فہرست ہوتی جس کی آخر میں بھی وہ ہمت ہی نہ کر پاتی کہ شرجیل سے بھی پوچھ لے کہ وہ کیوں بدل گیا ہے۔

”کیا ہو رہا ہے بھائی؟“ شزر نے پچن میں قدم رکھتے سوال کیا اور آگے بڑھ کر قیلے کا ڈھکن اٹھایا۔ بھاپ کا بڑا سا مرغولا پلاؤ کی دلفریب مہک لیے سرعت سے اوپر اٹھا اور پچن کی فضا میں چادلوں کی اشتہا انگیز خوشبو پھیل گئی۔ ایمان نے جانے چھانے ایک نظر اسے دیکھا۔ فرار اور سمیچہ کے بعد ایک دہی کی جو اس سے سیدھے منہ بات کر لیا کرتی تھی شاید وجہ لالچے بھائی کی من پسند بیوی قرار پانا تھا۔

”چائے کا کہا تھا تمہارے بھائی جان نے یہ بے آؤکی انہیں۔“ ایمان نے کرشل کی چھوٹی خوب صورت قمیض میں بھاپ اڑاتا چائے کا گم رکھا۔ شزر اسکرانے لگی۔ ”بھائی چائے کے بہانے آپ کے منہ پر ہوں گے۔ مجھے بیچ کر انہیں مایوس تو نہ کریں۔“ شزر کی کھٹکتی کے جواب میں ایمان کے مسخ چہرے پر سایہ سالہرا گیا۔

”مجھے یہ کام کرنا ہے پلیز لے جاؤ۔“ اس نے جبری مسکان میں اپنا بھرم رکھا اور نہ شرجیل کا رویہ تو اتنی غفلت اور بے مہری میٹ لایا تھا کہ اسے اب خود کو یہ یقین دلانا پڑتا کہ یہ دہی پرجل ہے جو اس پر جان دارا کرتا تھا یہ سوچ کر آٹھکھیں بھیگ بائیں۔ حالات کی تبدیلی نے کیسے کیسے رنگ دکھانے شروع کر دیے تھے۔

”آپ کو اتنی مہارت سے پچن کے سب کام کرتے دیکھ کر مجھے اکثر حیرت ہوا کرتی ہے بھائی۔ آپ تو حویلی میں سنا ہے بہت شانہ و شوہ کی زندگی گزار رہی تھیں۔ آگے پیچھے نوکر چاکر ہوں گے۔“ شزر اب بے حد اشتیاق سے سوال کرتی گویا اپنی نادانی کے باعث اس کے زخم کرید رہی تھی مگر اسے اب خود پر کمال کا منہ حاصل ہو چکا تھا۔

”مجھے ونگ کا شوق تھا اکثر کچھ نہ کچھ بناتی رہتی تھی۔ کورسز کے تھے باقاعدہ۔“

”جیسی کام آرہے ہیں۔ معدے کے رستے دل میں اتر جائیں گی بلا خر سسرال کے۔“ شزر نے مسکرا کر کہتے ہوئے زبانی اٹھ لی۔ جبکہ ایمان کے دل میں گویا تیر پوستان ہو گیا۔ وہ بائیک بے تحاشا تھکان محسوس کرنے لگی۔ اسے لگا اس نے اپنے لیے بہت مشکل راستے کا انتخاب کر لیا ہے۔

”دیکھا کہا بھی تھا میں نے اب بلا رہے ہیں شرجی بھائی“ جائیں نہیں ان کی بات۔ ”چند لمحوں کے توقف سے ہی شزر اٹھ بھاگی ہوئی پھر پچن میں آ گئی۔ ایمان نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”لائیں میں بنالوں آپ کے کام۔“ شزر نے اسی پر غلوں مسکراہٹ کے ساتھ چھری اس کے ہاتھ سے لے لی۔ ایمان پچن سے نکل کر راہداری عبور کرتی اپنے کمرے کی جانب آئی تو اس کے قدم دروازے پر ہی ٹھم گئے۔ اندر ماما شرجیل کے ساتھ قیسم اور غصے میں زور زور سے بولنے کے باعث ان کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔ ایمان کی ہمت اور حوصلہ یہیں جواب دینے لگا۔ اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ان کے تاثرات میں حیرت اور نفرت کا احساس اٹھ آیا۔

”آگے پوچھو اس سے ایک تمہارا چائے کا کپ یہاں پہنانے میں کون سے بل جوتے تھے جو کام کا بہانہ بنا کر شزر کو بھاپ بھجا۔ کیا ثابت کرنا مقصود تھا آخر کہ ہمارے سارے کام ٹھیک کرتی ہے؟“ ان کے لہجے کا تنفر اور کڑواہٹ دہی ایمان کے لیے تکلیف دہ تو تھی مگر اس سے زیادہ اس کی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ کا باعث بنی وجہ یہی تھی کہ اس نے اس قسم کے رویوں کو سامنا بھی نہیں کیا تھا۔ جیسی اسے انہیں برتتے اور سہنے کا سلیقہ

بھی نہیں تھا۔ جس ماحول میں اس کی پرورش ہوئی تھی وہ تو اپنی راجدھانی کی ملکہ تھی۔ بہنوں میں پہلے درجے پر ہونے کے باعث شعوری و لاشعوری طور پر اس کی اہمیت خود بخود بڑھ گئی تھی۔ بابا سائیں کا رویہ بھی اس کے ساتھ خصوصیت لیے ہوتا تھا مگر یہ سب ماضی بعید کا قصہ تھا۔ اب صورتحال تبدیل ہو چکی تھی۔ جس دن سے اس نے اس گھر میں قدم رکھا تھا اسے قدم قدم پر تذلیل سنی پڑ رہی تھی۔ خاص طور پر تائی ماما اور ماما تو اسے کسی بھی لحاظ سے بخشے اور رعایت دینے پر تیار نہیں تھیں۔

”ایمان سوری کرو ماما۔“ وہ ہرٹ ہوئی ہیں تمہاری اس حرکت پر۔ ”شرجیل کی سنجیدگی سے بھرپور آواز اس نے یونہی جھکے ہوئے سر کے ساتھ سنی تھی۔ اس نے حیرانی کے عالم میں شرجیل کو دیکھا۔ گویا جاننا چاہا ہو کہ اس نے ماما کو ہرٹ آخر کیسے کر دیا۔ چائے انہیں نہیں بلکہ شرجیل کو شزر کے ہاتھ بھیجی تھی۔

”یہ کیوں آخر معافی مانگنے کی مجھ سے۔ عزت نہ گھٹ جائے گی مہارانی صاحبہ کی بہت زعم ہے محترمہ کو اپنے اسٹرائنگ بیک گراؤنڈ کا۔ مگر بی بی تم اپنی کشتیاں جلا کر آئی ہو گھر سے بھاگنے والیوں کو دنیا ایسے ہی ٹھوکر دے کر رکھا کرتی ہے۔“ ان کا لہجہ زہر خند تھا اپنے عناد اور رویے کی وجہ بھی انہوں نے خود ظاہر کر دی تھی۔ ایمان کو نئے سرے سے یہ طعنہ سن کر اس کی ذلت اور وحشت و اذیت کے احساس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جیسے پہلی بار ملنے والے اس طعنے نے دوچار کیا تھا۔ پھر اس نے صرف ان سے معذرت نہیں کی بلکہ آئندہ کے لیے محتاط رہنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ ذلت و سبکی کے اس دور لیے میں ایمان نے دانستہ شرجیل کی جانب اس لیے بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ اس کی نظروں کو کوئی غلط رنگ نہ دے دے۔ وہ نہیں چاہتی تھی شرجیل یہ سمجھے کہ اسے شرجیل سے یہاں اس موقع پر فیور کی ضرورت تھی۔ وہ کیا جانے ایسی باتیں کہنے کی نہیں سمجھنے کی ہوا کرتی ہیں۔

اگر شرجیل انہیں سمجھا کر نہیں سکا تو جیسا کہ بات گنوانے اور عزت گھٹانے والوں میں اس کا شمار نہیں ہوتا تھا۔ ماما کی آنکھوں اور چہرے پر فتح مندی کے تاثرات اٹھ آئے۔ مگر ایمان انہیں دیکھنے کو رکھی نہیں تھی۔

اس نے گاڑی کو لا کر زینب کے گھر کے آگے روکا تو اس کی آنکھوں کی جلن اور اضطراب میں تب بھی کی نہیں آ سکی تھی۔ مگر کایہ روپ یہ چہرہ ناقابل برداشت تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے نفرت نہیں کی تھی مگر اسے می سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یاد تھا اس نے اک بار زینب سے سنا تھا۔



”ایک انسان کا قتل اس کے اللہ کے نزدیک پوری انسانیت کا قتل ہے۔“ مئی گناہ عظیم کی مرتکب ہوئی تھیں محض دھرم کے تعصب میں جھلا ہو کر انہوں نے کتنا گناہ نا کھیل کھیلنا تھا۔ وہ ڈیڈی کو چھوڑ کر مئی کے پاس آئی تھی۔ مگر اب اسے مئی کے ساتھ رہنا ان کا سامنا کرنا دنیا کا دشوار ترین کام لگا تھا۔ جیسی اس نے ایک بار پھر ڈیڈی کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ یہ فیصلہ کر کے ہی زینب سے آخری بار ملنے اور اس سے معافی مانگنے آئی تھی۔ اس گناہ اور غلطی کی جو اس سے سرزد نہیں بھی ہوئی تھی مگر وہ اس کی وجہ ضرور بن گئی تھی۔ زینب اور عثمان خان کو نندنی سے میل جول بڑھانے کی ہی اتنی کڑی سزا دی گئی تھی اور دوسری جانب وہ تلاش وہ کھوج جو اس کا مقصد حیات تھی اس کے لیے روگ بن کر رہ گئی تھی مگر کامیابی شاید اس کے نصیب میں نہیں تھی۔ اسے ناکام ہی رہنا تھا اور ساری عمر ان وحشتوں کے صحراؤں کی خاک چھانٹے اک دن نامراد ہی اس دنیا سے منہ موڑ لینا تھا۔ حالانکہ دیو اس کی واپسی کا سن کر کسی درجہ مضطرب لگنے لگا تھا۔ وہ چاہتی تو زندگی کی جانب کھٹنے والے اس روزن سے خود کو زندگی کے رنگوں سے روشناس کرا سکتی تھی مگر اسے زندگی جینے کی خواہش تھی زندگی پوری کرنے کی نہیں جیسی دیو کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی اس کے پاس۔

”مئی کو معاف کر دو نندنی اور پلیز واپس مت جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم سے دوبارہ تمہیں بھی شادی کا بھی نہیں کہوں گا۔“ کتنی بے بسی تھی اب اس کی آنکھوں میں اس کی آواز میں۔ محض ایک لمحے کو نندنی کو دیو کی دیوانگی بھری محبت کی لاچاری کا احساس ہوا۔ وہ خود بھی تو اس اذیت کا شکار تھی مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ دیو سے ہمدردی رکھنے کے باوجود اس کے لیے کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔

”مجھے تم سے کوئی پرابلم نہیں ہے دیو اور مجھے روکو بھی مت مجھے بہر حال واپس جانا ہے۔“ اس نے شاید زندگی میں پہلی بار دیو سے نرم انداز میں بات کی تھی لیکن دیو کی بد نصیبی یہ تھی کہ یہ نرمی کا سلوک بھی اسے کوئی خوشی دینے سے قاصر تھا۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

”آؤ نندنی کیسی ہوتی؟“ کال بیل کے جواب میں دروازہ زینب نے کھولا تھا۔ نندنی نے دیکھا اس کی آنکھوں تلے سیاہ حلقے تھے اور وہ چند دنوں میں صحت کے اعتبار سے آدھی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ پا کر کھونے والوں میں شامل ہوئی تھی اور یہ دیکھ کر زیادہ گہرا اور شدید ہوا کرتا ہے۔ نندنی کو وہ سلگتی ہوئی کیلی گٹری کی طرح لگی جو اندر ہی اندر سلگتی اور ختم ہوتی رہتی ہے۔ صدمہ یقیناً

بہت بڑا تھا مگر زینب کا حوصلہ بھی کمال تھا۔ وہ داویلا نہیں کر سکتی تھی اس نے مبر سے یہ نقصان برداشت کیا تھا اور خود کو جبراً رکھا تھا۔

”آپ کہیں جا رہی ہیں؟“ زینب کا سامان جگہ جگہ پھیلا دیکھ کر نندنی کو حیرت نے آن گھیرا۔ زینب کے حزمین چہرے پر طالع سا ابھرا۔

”اب یہاں رہنے کا جواز بھی تو ختم ہو گیا ہے نندنی! پھر دلوں میں مجھے واپس اپنے بیزنس کے پاس جانا ہے۔“

”آپ پاکستان جا رہی ہیں؟“ وہ ششدر تھی زینب نے سر تانہ بھری اور اثبات میں ہلادیا۔ نندنی گم مسم ہو کر اسے دیکھ گئی۔ اللہ جانے کیسا احساس دل سے اچانک اٹھا جو روح کو نکلی کر رہا تھا۔

”میں آپ کے ساتھ چلوں زینب؟“ اس نے جانے کس کیفیت کے زیر اثر کہا تھا انداز خود کلامی کا سا تھا مگر زینب ٹھک کر رہ گئی۔

”میرے ساتھ.....؟“ اس نے چہرے اٹھا کر استعجاب سے نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔

”ہاں آپ کے ساتھ زینب میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں بھی آ سکتی ہوں تو پاکستان بھی جانا چاہیے ایک آخری کوشش۔ آگے جو میری قسمت.....! وہ جیسے کسی خواب کی کیفیت میں بات کر رہی تھی۔ زینب متحیر اور ہنوز غیر یقین تھی۔ دونوں کے درمیان خاموشی کا ایک طویل وقفہ گیا۔ اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر سوچوں میں غلطیاں تھیں۔

”تمہاری مئی تمہیں اس کی اجازت دے دیں گی؟ پھر یہ بھی تو سوچو نندنی! جانے وہ کون تھا؟ یہ بھی ممکن ہے وہ پاکستانی نہ ہو تمہیں تو اس کا نام تک معلوم نہیں ہے۔ میری بات سے یوں نہ سمجھنا کہ میں تمہیں ساتھ لے جانے سے انکار کر رہی ہوں۔ نندنی تم ایک لڑکی ہو۔ ہمارے دشمن معاشرے میں لڑکی کی عزت کو بہت نازک سمجھا جاتا ہے۔ پھر اتنے غیر معمولی حسن کی مالک لڑکی کے لیے تو اس عزت کی حفاظت اور بھی مشکل اور دشوار ہو جاتی ہے۔ مجھے نہیں لگتا تمہاری مئی تمہیں اس کی اجازت دے دیں گی۔“ زینب نے اپنی آنکھیں اس لیے بھی اس کے سامنے رکھی تھیں کہ اسے سمجھاتا اس کا فرض بنتا تھا اس کے خیال میں تو کسی اجنبی کی خاطر اس قسم کا جذباتی قدم اٹھانا حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ بھی اس صورت جبکہ یہ محض ایک آس آس کا اختیار کیا جانے والا سفر ہو۔ نندنی نے اس کی بات کو مکمل سے

پھر کا دھم جھٹک دیے۔

”مجھے آپ کی بات سے ہرگز اختلاف نہیں ہے زینب۔ اپنی ایگری دیو۔ میں تو آپ سے یہاں آخری بار ملنے آئی تھی تاکہ کیوں؟ میں واپس جا رہی تھی ڈیڈی اور بھائی کے پاس مگر اب میں نے اپنا ارادہ یکدم بدل لیا ہے۔ میں پاکستان جانا چاہتی ہوں۔ مجھے اپنی تلاش کو ادمورا نہیں چھوڑنا۔ آپ اگر مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر متاثر ہیں تو اس اوکے۔ میں اپنے طور پر چلی جاؤں گی۔ مئی کوئی نہیں ہوتی مجھے روکنے والی۔ میں بالغ ہوں اپنے فیصلے خود کرنے کا مجھے قانونی اختیار مل چکا ہے۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ کی نہیں تھی۔ زینب اسے واپس جاتے دیکھ کر بوکھلا گئی۔

”کو تو سہی نندنی! ابھی تو تم نے کافی بھی نہیں پی۔“ نندنی نے ختم کر پھر بے حد نرم مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔ وہ جان سکتی تھی زینب اس کی غلطی یا دل شکنی کے خیال سے پریشان ہے۔

”فیک اٹ ایزی زینب! جن لوگوں کے خلوص اور محبت پر مجھے تعلق نہیں تمہارا شمار انہی میں ہوتا ہے۔ میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ پلیز۔“ زینب کے ہونٹوں پر مجروح قسم کی مسکان نے لہجہ کا قیام کیا تھا۔ سادیت اور حزن نے اس کے حسن کو سو کواری بنے کر کچھ اور بھی پرکشش بنادیا تھا۔

”جراک اللہ کچھ دیر تو بیٹھو میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔“ زینب کے اصرار پر نندنی نے انکار مناسب نہیں سمجھا اور آ کر مونس پر بیٹھ گئی۔ عبداللہ سامنے ہی بستر پر سو رہا تھا۔ نندنی نے اسے پیار کیا پھر بیگ سے اپنا سیل فون نکال کر مین پش کرنے لگی۔

”تم جہاں بھی ہو مگر پہنچو مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ اس نے ٹیکسٹ دیو کے نمبر پر بھیجا تھا۔ زینب کافی مٹانے کچن میں جا چکی تھی۔ وہ کھڑکی سے اندر اترتی غروب ہوتے سورج کی زرد اداس اور مرجھاتی ہوئی کرنوں کو فرش پر لڑنے دیکھنے لگی۔ بھی اس کا سیل منگھٹانے لگا۔

”اوکے میں ابھی آتا ہوں۔“ آنے والا سیج دیو کا ری پلائی تھا۔

نندنی کے چہرے پر اطمینان کا تاثر جھلکا۔ اس نے جھٹکنس کا ٹیکسٹ بھیج دیا۔ چند سیکنڈ کے توقف سے پھر اسکرین چمکی۔ لہجے جواباً اسے مسکراتے چہرے کی تصویر بھیجی تھی۔ اس نے گہرا سانس بھرا اور تمام میسجز ڈیلیٹ کرنے کے بعد سیل فون کو بیگ میں ڈال دیا۔ وہی دوران زینب کافی سمیت آ چکی تھی۔

”اگر تم اپنی مئی کی اجازت سے پاکستان جاؤ تو مجھے تمہیں ساتھ لے جا کر روحانی خوشی ہوگی۔ میرے لیے یہ بہت اچھا احساس ہوگا اگر میں تمہارے کچھ کام سکوں۔“ کافی کا گم اس کی جانب بڑھاتے وہ نرمی سے اس سے مخاطب تھی۔ نندنی نے خوشگوار تاثر کے ساتھ اسے دیکھا۔

”میں آج مئی سے اس ٹاپک پر بات کروں گی زینب! مجھے بھی اچھا لگے گا اگر میں تمہارے ساتھ جا سکوں۔“ وہ وہاں سے اٹھی تو اسے اس بات کا ہرگز ملال نہیں تھا کہ وہ ایک جھوٹ زینب سے بول چکی ہے۔ وہ مئی کو ہوا بھی لگنے نہیں دینا چاہتی تھی ایک جھوٹ اسے مئی سے بھی بولنا تھا۔ یہ ضروری تھا اس کے خیال میں۔ وہ مگر پہنچی تو دیولان میں ٹہلتے ہوئے اس کا منتظر تھا۔ اسے رو برو پا کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پیشانی سے ٹکاتے ہوئے بہت عاجزانہ نمسکار کیا تھا۔ دیو کی اس کوکتی نظروں میں اک عقیدت مندانہ اپنائیت کے ساتھ کسی خیال سے وابستہ دبا دبا جوش بھی ہلکورے لیتا تھا۔ یقیناً وہ اس کی پیش رفت کے باعث مستقبل کے حوالے سے خوش فہم ہو رہا تھا۔

”مغموم انسان۔“ اک پل کو نندنی کو اس پر واقعی رحم آیا تھا۔ محبت کے روگی جوگی بن کر بھی محبوب کے در سے آس نہیں چھوڑ پاتے۔ کتنا بے بسی میں جھلا کر دینے والا خیال ہے یہ بھی۔

”پہلو کیسے ہو دیو؟“ اس نے محض اس کا دل رکھنا چاہا تھا۔ ورنہ دیو بھی جانتا تھا اسے دیو سے یا دیو کی خیریت سے کتنی دلچسپی تھی مگر وہ اتنے میں بھی خوش ہو چکا تھا اور بہت مسرور انداز میں اسے اپنی خیریت بتا رہا تھا۔

”تمہیں کچھ کہنا تھا نا مجھے۔“ وہ ہم ہمیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ موسم بھی اچھا ہو رہا ہے۔“ دیو نے اپنے مخصوص نرم انداز میں کہا۔ نندنی نے فی الفور سر کوٹھنی میں ہلادیا۔

”نہیں مئی دیکھ لیں گی۔ میں نہیں چاہتی جو بات میں تم سے کرنے والی ہوں مئی کو اس کا پتا لگے۔“ وہ حد درجہ محتاط تھی۔ دیو نے چونک کر اسے دیکھا پھر اس کی خوش گمانی نے چہرہ کچھ اور روشن کر دیا تھا۔

”ڈونٹ یووری نندنی۔ تم جو بھی کہنا چاہ رہی ہو کہہ دو مئی اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔“ دیو کے جواب پر نندنی واقعی ری ایکس ہوئی اور پر سوچ نظروں سے اسے دیکھتی قدم بڑھا کر رنگین چھتری کے نیچے چیر ز میں سے ایک پتا بیٹھی۔

”مجھے تمہاری ہیلپ چاہیے دیو مگر راز داری کے مکمل وعدے کے ساتھ۔“ مئی من تم مئی کو نہیں بتاؤ گے۔“

”تمہارا یہ اعتماد اور بھروسہ بھی نہیں ٹوٹے گا۔“ دیو کے پر



خلوص لہجے میں سچائی بھی تھی اور یقین تھا۔ نندنی نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اسے جا چلتی نظروں سے دیکھا اور محض ہنکارا بھرا۔ دیوانستہ اس کے شعاعیں بکھرتے روپ سے نگاہیں چرائے ہوئے تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے دیکھے تو نظریں ہٹنے محبت عشق کے مرتبے پر فائز ہو جائے جو قانع اور نئی تو ہوتی ہی ہے ساتھ میں پاکیزگی کا جذبہ بھی سمیٹ لایا کرتی ہے۔ وہ محبت کو بوجا کا درجہ دیتا تھا۔ پھر اس میں آلائش نفسانی کا احتمال بھی کیسے گوارا کر لیتا۔

”مجھے پاکستان جانا ہے دیو پاسپورٹ تم بناؤ گے اور ٹکٹ بھی تم لاؤ گے۔ کیوں جانا چاہتی ہوں یہ سوال نہیں کرنا مجھ سے۔“ مئی کو یہی پتا چلنا چاہیے کہ میں یو کے جا رہی ہوں ڈیڈ کے پاس۔“ اس نے کہا اور دیو لب بستہ رہ گیا۔ منجھ سیکن اور دل برداشتہ جدائی ایک بار پھر عشق کا نصیب بننے والی تھی اور چارہ سوائے صبر کچھ نہیں تھا۔ اس نے بوجھل اور پڑ مردہ انداز میں سانس بھرا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

”آپ کا کام ہو جائے گا نندنی“ مئی کو بھی پتا نہیں چلے گا۔“ دیو کا جواب یہی ہو سکتا تھا نندنی مطمئن ہو کر اٹھی اور دیو کے خوش گمان دل میں شام غم اتر آئی تھی۔ اس کی پیاس بھری تشنہ نظریں تب تک نندنی کے قدموں سے لپٹی رہیں جب تک وہ اس کی نگاہ کی زد میں سما سکے۔ پھر اس کی آنکھوں میں ابھرتی دھند میں ہر منظر دھندلا گیا۔



”یہاں بیٹھو کچھ دیر پہلے سانس بحال کرو۔“ عباس نے رک کر عریضہ کو سہارا دے کر کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کی ڈیویری نزدیک تھی اور عباس اسے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق چہل قدمی کرانے میں مصروف تھا ایسی حالت میں جبکہ عریضہ اپنے آپ سے بھی بے زار تھی۔ عباس سے بات بے بات ابھتی جھنجھلائے جاتی عباس نے پھر بھی اسے چھٹی کا چھلا ہٹایا ہوا تھا۔ اس کے باوجود جب بھی وہ اس پر خواہواہ برستی عباس شرمسار ہونے لگتا۔ عریضہ زندگی اتنی جلدی پابند نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اولاد کی خواہش عباس کی تھی اس شرمندگی کی وجہ بھی یہی تھی۔

”بس کچھ دن ہیں تمہارا صبر کر لو اس کے بعد میں تمہیں دوبارہ اس مشقت میں نہیں ڈالوں گا۔“ اس کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے عباس سرگوشی میں کہہ رہا تھا عریضہ نے گردن موڑ کر اس کے بے پناہ کشش کے حامل خوب رو چہرے کو دیکھا پھر آہستگی سے مسکرا دی۔

”ایک بچے سے گزرا ہو جائے گا آپ کا؟ وہ جو ڈھیر

سارے بچوں کا شوق تھا۔“

”تم سے بڑھ کر میری کوئی خواہش اہم نہیں ہے میرے لیے۔ ہمیشہ کے لیے نوٹ کر لو۔“ عباس کے لہجے میں سب سے زیادہ خاصیت کا رنگ تھا۔ اس نے عریضہ کی ناک پر شرارت سے ہلکی جھمی وہ قافرانہ احساس میں گھرتی ہنس پڑی تھی۔

”ہمارے ہاں تو تنز بے بیز ہوں گے عباس! مجھے اس مرحلے پر اسٹراؤنڈ کے بعد بتایا ہے ڈاکٹر نے۔“ وہ شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔ عباس پہلے حیران ہوا پھر بے ساختہ ہنس پڑا۔

”اودہ رنگی پھر تو یہ میرے لیے خوشخبری ہے۔ اللہ کو کچھ پریم آیا اللہ کو پتا تھا میری بے چارگی کا۔ بیوی نہ اور بچے پرانا مادہ بھی نہ ہی مجھے دوسری شادی کرنے دے گی اس لیے ہوا ہے یہ انتظام۔“ اس کے ٹھنک دار لہجے میں گھیسرتا بھی تھی اور خوشی کا رنگ بھی۔ عریضہ جھپک کر اسے گھونسنے لگی۔

”بہت بد تمیز ہیں۔ اپنا خیال ہے میرا نہیں ایک ساتھ دو بچے سوچیں کتنا تنگ کریں گے مجھے نیند کو ترسوں گی۔“ وہ دھڑکھڑاتی ہوئی بولی۔

”بھئی اس کی فکر کرنے کی تمہیں ضرورت نہیں میں گھبراؤ انتظام کر دوں گا۔ نیندیں تمہاری خراب کرنے کا پرہیز صرف ہمیں حاصل ہوا ہے اس گستاخی کی تو ہمارے بچوں کو بھی ہلا نہیں ہوگی۔“ وہ جس انداز میں کہہ کر آ نکھ مار کر ہنسا تھا۔ عریضہ کانوں کی لوؤں تک سرخ پڑتی چلی گئی تھی۔



سردی کی تیز لہر نے کائنات کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔ وقت دھند چھائی رہتی تھی۔ ایسا شدید موسم اس کی طبیعت پر چڑھا گراں گزرتا تھا۔ گو کہ وہ اب اتنی نازک مزاج نہیں رہی تھی مگر موسم اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہا۔ نزلے زکام کے ساتھ ساتھ چھینکوں نے بھی بری طرح گھیرا ہوا تھا۔

”یقیناً آپ کو کوئی یاد کر رہا ہوگا۔“ وہ کچن میں کھڑی مسلسل چھینک رہی تھی جب سمیچہ نے اندازاً اس کی سرخ ہونٹوں پر اور آنکھوں سے بہتے پانی کو دیکھتے ہمدردی سے زیادہ شرارت آمیز انداز میں کہا مگر یہ شرارت بھی طوق بن کر اس کے گلے میں ایک جائے گی اگر سمیچہ کو ذرا سی بھی خبر ہوئی تو وہ بھی اٹھ اٹھ نہ کہتی۔

”اسے کون یاد کرے گا؟ اودہ! اس قابل کسی کو چھوٹا ہے۔ یاد کرے کوئی اسے لعنت بھیج چکے وہ سب کے سب اس پر ایسے ہی چہروں پر کالک مل کر آنے والیوں کے راستوں میں کھنکھاتے آتے ہیں۔“ ماما کچن کے دروازے پر کھڑی تھیں۔

ان کی آنکھوں سے چنگاریوں کی صورت پھوٹ رہی تھی۔ ایمان کا بخار کی حد توں سے دھکا ہوا چہرہ کچھ اور بھی سرخ پڑ گیا۔ ہونٹ چھینچتے ہوئے اس نے تنزی سے رخ پھیر کر یقیناً آنسوؤں کو چھپانا چاہا اور گوشت کے سالن کے اوپر سے ڈھکن ہٹا کر چٹیلی میں جھانکا۔ بھاپ کا ایک مرغولا اٹھا تھا جس نے اس کے پہلے سے جلتے چہرے کو کچھ اور جھلسا ڈالا اس کے اندر اتنی پیش تھی کہ یہ ذرا سی بھاپ اس کا کچھ بگاڑنے میں ناکام رہی تھی۔

”ہاتھ ذرا جلدی چلانا سیکھو تاکہ کھانا ٹائم ریل سکے کب سے گھر کے مرد انتظار میں بیٹھے ہیں۔“ ماما کا لہجہ مخصوص قسم کی حقارت اور طنز سے بھرپور تھا۔ وہ خواہواہ کی جھانک کے بعد پلٹ گئیں۔ سمیچہ بے حد خفت زدہ اور نمجندہ کھڑی تھی۔

”آئی ایم سوری بھابی۔ مجھے ہر گز بھی اندازہ نہیں تھا چچی جان یہاں آ کر میری سیدھی بات کا بھی الناء!۔“ وہ منمننا کر بولی۔ خفت و خالت اسے زمین میں گاڑ رہی تھی۔ ایمان نے دھندلاؤ اور نم آنکھوں سے اسے دیکھا اور مجرد انداز میں مسکرا دی۔

”فاریٹ اٹ..... اس او کے۔“ وہ نہیں سمجھتی تھی اس میں سمیچہ کا کیا کسی اور کا کوئی قصور تھا۔ ہر گز نہیں یہ اس ہی کا قصور و غلطی تھی وہ کسی کو الزام کیوں دیتی۔ اس نے خود اپنی قسمت کھوئی کی تھی۔ اس نے اپنے پیروں پر اپنے ہاتھوں سے کلہاڑی ماری تھی۔ یہ تو تھا ہی رسک جو اس نے بڑے بے فکر انداز میں لے لیا تھا۔ اب جو بھی ہونا تھا تنہا اپنی جان پر سہنا تھا۔ اس کی آنکھیں نمٹنیں پانیوں سے بھرنے لگیں جبکہ سر درد سے پھنسا جا رہا تھا مگر اسے کام کرنا تھا جیسا کہ وہ لگی رہی تھی۔ کھانا بنانے سے لے کر ٹیبل پر لگانے تک اہل خانہ کے کھانا تناول کرنے کے دوران تک اس کی ڈانٹنگ ہال سے کچن تک کتنی دوڑیں لگا کر تھیں۔ اس کی آمد سے پہلے تک جو کام ملازموں کے سپرد تھے اب اس کے گناہ کی پاداش میں اس پر ڈال دیے گئے تھے۔ ماما اور تائی ماں کی کوششیں رنگ لائی تھیں اور وہ ملازمہ سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکی تھی۔ اس کا مقام اس کا درجہ یہاں دھروں کے ہاتھوں ملے پاتا رہا اور شرجیل کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ اسے ایک بار بھی اس کے حقوق اس کی ذمہ داریوں کو نبھانے کا خیال نہیں آ سکا۔ بیڈ روم سے باہر وہ اس کے وجود سے ایسے غافل ہوتا جیسے سرے سے اس سے شناسائی نہ رکھتا ہو یا پھر شاید وہ اپنی ماں کو مزید اس حوالے سے دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ صرف اسے نہیں سب جانتے تھے ماما کو اس کی ایمان پر دی گئی توجہ سے

کیسا خفتان ہونے لگا ہے۔ ایمان نے تو شرجیل کے ساتھ بھاگ کر اپنا ہر حق ہی نہیں شکایت دنگلے کا حق بھی گنوا دیا تھا۔ کتنا گھائے کا سودا تھا یہ بھی اگر کوئی سمجھ پاتا۔

”مجھے دودھ نہیں کافی پنی تھی یا پوچھ تو لیا کرو پہلے۔“ برتنوں کے ڈھیر سے نبرتا رہا ہونے کے بعد خود کھانا کھانے سے پہلے وہ اس خیال سے شرجیل کے لیے دودھ کا گلاس لیے چلی آئی تھی کہ وہ سونہ جائے۔

”میں کافی لاؤ دیتی ہوں۔“ شرجیل کے غرے کے جواب میں کوفت دے زاری کا شدید احساس اس کے بیمار نقاہت زدہ وجود پر بہت سرعت سے غلبہ پا گیا مگر بہر حال اسے کوفت ظاہر کرنے کا بھی حق حاصل نہیں تھا۔

”رہنے دو ابھی! مشکل سے تو دستیاب ہوتی ہو میرا موڈ نہیں ہے پھر سے تمہیں کھونے کا۔“ اس کے ٹپٹنے سے قفل وہ ایمان کی کلائی تھام چکا تھا۔ ایمان نے دیکھا اس کی آنکھوں میں محبت کا وہی بچا کچا احساس تھا جو اسے اب بیڈ روم کی تنہائیوں میں ہی دیکھنے کو ملتا تھا۔

”اپنا خیال رکھا کرو ابھی! کتنی کمزور ہو رہی ہو۔“ اسے اپنے مقابل بستر پر بٹھانے کے بعد شرجیل اسے بغور نکتا ہوا بولا۔ انداز کی توجہ اور اپنائیت ایمان کے اندر غم آلود دھواں بھرنے لگی۔ وہ اسے بتا نہیں سکی اس وقت اسے کتنی جھجک لگی ہوئی ہے۔ صبح چند سلاکس لیے تھے اس کے بعد مصروفیت نے کچھ ایسا جکڑا تھا کہ کچھ کھانے کا ٹائم میسر نہیں آیا تھا۔ اپنی ذات سب سے پیچھے دھکیل کر بھی وہ عزت جیسی انمول شے کو ترستی رہ جاتی تھی۔ اس وقت طبیعت کی خرابی اور بدن کی ٹوٹ پھوٹ تمام ضبط جیسے بہا کر لے جا رہی تھی۔ اس کا بدن جیسے کا بجھکا ہوا تھا جو توجہ کی حد توں کو پا کر ترخنے کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔

”میں جانتا ہوں ابھی ماما کافی ہو بیڑ تمہارے لیے بہت تکلیف دہ ہے مگر میں مجبور ہوں کچھ عرصہ گزرنے دو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اس کی تائید کا فخر تھا اور تائید ہی وہ بھاری پتھر تھی جس کا بوجھ ناقابل برداشت تھا ایمان کے لیے۔ کبھی وہ سوچتی تو حیران رہ جاتی کیسی شاہانہ طبیعت تھی اس کی! محض نکاح کے چند بول کیا پڑھے تھے کہ وہ کچھ سے کچھ بھرتی چلی گئی تھی۔ سارا لحظہ اپنی ذات کا زعم حاضر جوابی بے ساختگی سب کچھ بھول گئی تھی۔ وہ صرف مفتوح نہیں ہوتی تھی ہمال بھی ہو گئی تھی۔ کچھ بھی بولنے سے پہلے دس بار سوچتی اور بولنے کے بعد بھی دم سادھے سامنے والے کا رد عمل دیکھنے لگتی۔ کیا شادی کے بعد ہر عورت کو ایسے ہی ان دیکھی زنجیریں پڑ جاتی ہیں۔ خود



بخود وہ لحاظ مروت اور مفاہمت کے سارے سبق پڑھ جاتی ہے۔  
 ”اتنی خاموش کیوں ہو؟ کچھ بولو نا؟“ شرجیل اس کی لمبی چوٹی کو ملامت سے اپنے ہاتھ میں لپیٹ رہا تھا۔ اسے ساکن اور منجمد پا کر ذرا سا مسکرایا۔  
 تب ایمان نے غم پلکوں کو اٹھایا تھا کچھ دیر اسے دیکھا پھر ایک دم سے رو پڑی۔ شرجیل تو جیسے بوکھلا گیا۔  
 ”کیوں روئی تم یوں ایک دم کوئی بات بری لگی میری؟“ وہ سوال پر سوال کر رہا تھا ایمان نے شرمندہ قسم کے تاثرات کے ساتھ سر کوئی میں جنبش دی۔  
 ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے شرجیل اور..... اور میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ اس وقت مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ اسے لگا وہ اس سے زیادہ صبر اور جبر نہیں کر سکے گی خود پر۔  
 وہ بھی اس کے سامنے جو اس کا محرم رازوں اس کا ہدم اس کا محبوب ہی نہیں شوہر بھی تھا۔ اس کی ذرا سی توجہ نے اسے جیسے پھر سے شرجیل سے اپنائیت کا احساس بخش دیا تھا۔ جسی وہ اپنی کیفیت نہیں چھپا سکی تھی۔ دوسری جانب شرجیل کو اس کی بات نے شدید دھچکا پہنچایا تھا۔  
 ”کیوں نہیں کھایا تم نے کچھ؟ ایسی اگر طبیعت خراب تھی تو بتاتیں مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا۔“ وہ مضطرب لگنے لگا تھا۔ ایمان کے دل کو اسی اپنائیت آمیز توجہ نے ڈھارس اور تقویت دی تھی۔ اس کا مطلب تھا محبت ابھی بالکل فنا نہیں ہوئی تھی۔ اس کے خدشات بے جا تھے۔ وہ سب کچھ بھول کر آنسو پونچھتے ہوئے مسکرائی۔  
 ”اتنی بھی خراب نہیں کہ ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے۔ آپ رکیں میں کچھ کھانے کو لے آؤں۔“ وہ اٹھنے لگی تھی جب شرجیل نے سر کوئی میں جنبش دی اور اس کے کاندھے پر دباؤ ڈال کر واپس بٹھا دیا۔  
 ”میں لے کر آتا ہوں۔“ اگلے لمحے وہ تیزی سے پلٹ کر باہر چلا گیا تھا۔ ایمان کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی پھر اس خوب صورت احساس کو محسوس کرتی آہستگی سے مسکرا دی۔ احساس دلا کر لی گئی محبت اسے بھی گوارا نہیں رہی تھی کہ یہ محبت سے بڑھ کر خیرات لگا کر لی تھی اسے۔ مگر اب معاملہ اور تھا وہ شرجیل تھا اس کی اولین چاہت اس کے سہارے کے بغیر وہ بہت تیزی سے ٹھکنے لگی تھی اور اسے ٹھکانا نہیں تھا۔ اسے سروایو کرنا تھا تو طاقت تو ضروری تھی اور اس کی طاقت اس کی ہمت شرجیل تھا۔ اسے شرجیل کی محبت اس کی توجہ چاہیے تھی چاہے احساس دلا کر ملتی یا لڑ جھگڑ کر ہی۔  
 ”ہاں چاہے لڑ جھگڑ کر بھی۔“ اس نے سوچا اور مسکرا دی۔

نہیں جانتی جو چیز نصیب میں نہ ہو وہ لڑ جھگڑ کر تو کیا چھین کر بھی لینا چاہیں تو نہیں ملا کر لی لیکن ابھی وہ جانتی ہی تو نہیں تھی۔  
 .....  
 نندنی نے ایک گہرا سانس کھینچا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ابھی کچھ دیر قبل دیو اسے پاسپورٹ بننے کی خبر فون پر سنا چکا تھا۔ وہ اگر پورے طریقے سے خوش نہیں ہو سکی تھی تو اس کی وجہ مقصد میں ناکامی اور منزل پر نہ پہنچ پانے کا خدشہ ہی تھا جو اس کے اندر کسی سانس کی طرح کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اب تک کی ساری تلاش کا حاصل بھی کیا نکلا تھا آگے بھی پتا نہیں کچھ ہاتھ آتا تھا یا اس نے عمر بھر یونہی ہی داماں رہنا تھا۔ اس مایوسی کو گلے لگا کر وہ تک کر بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ محبت کا آغاز جتنا بھی خوش فہم اور سہل کیوں نہ ہو یہ غم کے آنسو ضرور مقدر کیا کرتی ہے۔ اسے تو آغاز سفر سے ہی آبلہ پانی کو مقدر کرنا پڑا تھا۔ بہت ٹھن اور دشوار گزرا سفر طے کر کے وہ یہاں پہنچی تھی۔ اگر امید اس دل میں بندھی تھی تو خوف کے گہرے سائے بھی لہراتے تھے مگر یہ طے تھا کہ اسے ہر حال میں سفر جاری رکھنا تھا۔  
 ”گڈ نوون زینب شاہاؤ آریو؟“ زینب سے فون پر رابطہ کرنے کے بعد وہ اس کی آواز سن کر خوشدلی سے بولی۔ پھر اسے حالیہ ملنے والی کامیابی کے متعلق بتا کر اگلا پروگرام طے کرنے لگی۔ زینب کی عدت اگلے ہفتے پوری ہوتی تھی اس نے اسے اگلے ہفتے کی روادگی کا ہی مژدہ سنایا تھا اور ٹھیک ایک ہفتے بعد زینب کے ہمراہ دہلی اتر پورٹ سے پاکستان کے لیے نکلائی کرنے والی تھی دیو اسے آف کرنے گیا تھا۔  
 وہ جتنا بے قرار تھا اس پر اس بے قراری کو عیاں کیے بغیر اسی خوشدلی سے اسے رخصت کرنے کا خواہاں تھا۔ حالانکہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس سے جدائی کا احساس دیو کے اندر جو اس بھرنا جا رہا تھا وہ زمین پھروں تلے دلدل میں تبدیل ہو رہی تھی اور وہ دھشتا جانا تھا اور جس بل وہ بے پناہ آفتوں کا شکار تھا نندنی لمحہ بھر کو اس کی سمت متوجہ ہوئی تھی اور الوداعیہ کلمات میں اسے مخاطب کیا۔  
 ”گڈ بائے دیو اینڈ فیک کیئر۔ مجھے تم سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ تم می کو کچھ نہیں بتاؤ گے ہے نا؟“ اپنی بات کے اختتام پر وہ جیسے مسکرائی اور اس کی طرف تائید طلب انداز میں نظریں اٹھائیں۔ دیو نے یاسیت آمیز انداز میں سر جھٹکا اور آنکھوں کے غم کو شے صاف کیے۔  
 ”ہاں بالکل نہیں..... لیکن آپ جلدی لوٹ تو آؤ گی نا؟“ کتنی بے قراری تھی اس کے سوال میں۔ حالانکہ نندنی کے دل میں نے ہمیشہ اس کی امیدوں کو توڑا تھا مگر محبت سے لبریز بے بسی

دل اتنا ذلیل و خوار ہو کر بھی محبوب کے در سے آس جوڑنا نہیں چھوڑ سکا تھا۔  
 (میں نہیں چاہتی دیو کہ اس کی نوبت آئے۔ جس کی تلاش مجھے وہاں لے کر جا رہی ہے اگر وہ مجھے وہاں مل گیا تو پھر وہاں ہی کا جواز ختم ہو جاتا ہے زندگی کا کیا اور کیسا ڈھب ہو گا اس کے بعد سے غرض مقصد تو اس کی دید اور اس کے حصول کی لگن ہے) نندنی نے سر تآد بھر کے سر کوئی میں ہلایا۔  
 ”نی الحال کچھ نہیں کہہ سکتی۔“  
 ”میں رابطے میں تو رہ سکتا ہوں نا نندنی۔“ اسے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتی وہ کچھ فاصلے پر اپنی منتظر زینب کی جانب دیکھا تھا جو سیاہ لبادے میں ملبوس تھی جس نے اسے سرتا پا ڈھانپ رکھا تھا۔ ہاتھوں پر گلوڑ پھروں میں موزے اور جوتے عورت لفظ کی بالکل درست عکاسی تھی وہ۔ نندنی کو رکتا پڑا اور دیو کے چہرے پر اک نگاہ ڈالتی وہ نفی میں سر ہلاتے رک گئی۔  
 ”ٹھیک ہے میں کرلوں گی خود بات تم سے۔“ دیو کا چہرہ چمک اٹھا وہ اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا نندنی نے رسانییت آمیز انداز میں اسے دیکھا اور زینب کے پاس چلی آئی۔  
 ”دیو مجھے تمہارے لیے بہت سٹسیر لگتا ہے نندنی بالفرض تمہیں وہ شخص نہ ملا تو تم اس.....“ زینب کو بات ادھوری چھوڑ لی پڑی تھی تو وہ نندنی کے چہرے دا آنکھوں میں اٹھانے والی وحشت کا احساس تھا جو اتنا گہرا و شدید ہونے کے ساتھ اتنی مراسمتی سے لبریز تھا کہ زینب حق دق رہ گئی تھی۔  
 ”فار گاڈ سیک زینب آگے کچھ مت کہنا۔ اس سے آگے زندگی کی گنجائش ختم ہوتی ہے۔ میں مزید بڑھنا اور سکنا نہیں چاہتی۔ سمجھ لو مجھ میں مزید ہمت نہیں ہے اب اگر وہ مجھے پاکستان میں بھی نہیں ملا تو بلیوی میں اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ دوں گی۔ خود کشی کا یہ طریقہ جتنا بھی سفاکانہ سمجھی مگر اثر بہت پادفل رہے گا۔ میں اگلا سانس بھی نہیں لے سکوں گی۔ میں اب مزید خود کو تسلی اور دلاسون سے نہیں بھلانا چاہتی کہ میری ہمتیں جواب دے گئی ہیں۔“ اس کے لہجے میں دہکی ہی شدت تھی جیسی کسی بیجان زدہ مریض کی مایوسی و اضطراب کے ساتھ دیوانگی کی انتہا پر پہنچ کر ہو سکتی ہے۔ زینب ساکن اور ششدر رہ گئی۔ نندنی کا ہر لہجہ تیز ہوتا تھا اسے تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔  
 .....  
 موسم شدید تھا اس کے آس پاس دھندھی۔ صرف آس پاس ٹھیک آنکھوں میں بھی چہرے پر بھی غم کی دھندھی جو چھٹی ہی نہ تھی اس کا محض ایک قدم غلط پڑا تھا پھر وہ راستہ درست کرنے

چال سیدھی کرنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔ مصائب اور آزمائش نے جیسے اس کا درد کچھ لیا تھا عباس کا چھن جانا ہی کم سانچہ نہیں تھا کہ اس کے بعد سکندر سے نکاح جیسی حرکت پھر وہیں پر اکٹھا نہیں ہو گیا ایمان کا گھر چھوڑ کر جانا اور بابا سائیں کی بیماری کا ش معاملہ یہیں سے سدھر جانا سکندر کا ٹکسر بدلا ہوا رویہ اس کے حواس سلب کرنے کو کافی تھا کہ وقاص حیدر نے ایک اور شو شا چھوڑ کر اس کی ہنسی کھٹی تو تیس بھی چھین لی تھیں۔  
 رات بابا سائیں نے اسے یہ بتا کر اس کے وجود میں زہر بھرا نیزہ گاڑ دیا تھا کہ وقاص امامہ سے شادی کا خواہاں ہے۔  
 ”امامہ.....!“ اسے لگا تھا اس کی سماعتوں کو دھوکا ہوا ہو۔ امامہ تو بہت چھوٹی تھی ابھی۔ محض سترہ اٹھارہ سال کی پھر وقاص کی ساری نفرت تو ایمان اور لاریب کے لیے تھی۔ امامہ کو نشانے پر کیوں رکھ لیا تھا اس خبیث نے۔  
 ”نہیں ہرگز نہیں میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی امامہ تو بہت چھوٹی ہے بابا جان اور وقاص.....!“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر دانت کچکچائے۔  
 ”یہ بات میں نے بھی وقاص کو سمجھانا چاہی تھی بیٹے مگر وہ نہیں مانا ہم اب اس کے آگے بولنے کی بھی پوزیشن میں نہیں رہے ہیں۔ ایمان نے ہمیں نظریں اٹھانے کے قائل نہیں چھوڑا۔“ بابا سائیں کا گلا بھرانے لگا انتہائی مضبوط کے باوجود لاریب ساکن انہیں تکی رہ گئی۔  
 ”وہ فوری شادی چاہتا ہے ایک مہینے کے اندر اندر۔“ بابا جان کا لہجہ مدغم تھا اور لاریب کے قدموں تلے زمین سرکنے لگی تھی۔ اس نے حق چہرے کے ساتھ بابا جان کو دیکھا جو اس بل اتنے متفکر تھے کہ اس فکر کے احساس نے ہی ان کی آنکھوں کو بھی گھبرا کر دیا تھا۔  
 ”آپ اسے منع کر دیں بابا جان سمجھائیں اسے ابھی تو امامہ بہت چھوٹی ہے اور.....!“ وہ کتنی بدحواس تھی بابا سائیں نے بے بسی چھلکائی نظروں سے اسے دیکھا۔  
 ”آپ کو کیا لگتا ہے لاریب بیٹے۔ ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ ایسی کوئی بات کر سکیں؟“ انہوں نے الٹا اس سے سوال کیا اور دکھ کی جس کیفیت سے دوچار ہو کر کیا وہ خود لاریب کو شرمندگی و اذیت کی انتہا گہرائیوں میں اتار گئی تھی۔ بابا جان کے پاس سے وہ خاموشی سے اٹھ آئی تھی مگر اس کے اندر جو بار بھائے اٹھ رہے تھے۔ جیسا کہ کچھ سوچے سمجھے اس نے اپنا سیل فون اٹھایا اور وقاص سے رابطہ کرنے لگی۔  
 ”مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے وقاص آ سکتے ہو



ہمارے ہاں؟“ اس کے لائن پر آتے ہی لاریب نے سرد مہری چھپائے بغیر کاٹ دار لہجے میں مخاطب کیا۔ جواب میں اس کا طویل قہقہہ سنائی دیا جس نے لاریب کے حلق تک زہر بھرا نفرت انگیز احساس بھر دیا۔

”مجھے امید تھی کہ تم مجھ سے رابطہ ضرور کرو گی مگر اتنی جلدی یہ توقع نہیں تھی مجھے۔“ مسلسل ہنستے ہوئے وہ مکروہ انداز میں سنگ باری سے باز نہیں آیا۔ یہی فطرت تھی اس کی لاریب خاموش رہی۔ جیسی وہ پکار کر جتلانے والے انداز میں بولا۔

”لگتا ہے والد محترم نے بڑی جلدی کی تم تک اطلاع پہنچانے میں۔ ظاہر ہے وہ بے چارے بھی کیا کر سں دودھ کے جلے کو چھانچہ بھی پھونک پھونک کر پینا پڑتا ہے۔ جی کو رخصت کرنے میں یہ عجلت ماننے اور سمجھنے میں بھی آتی ہے۔“

”تم کیا چاہتے ہو وقاص مقصد کی بات کرو۔“ لاریب کی پیشانی پر تل پڑنے لگے۔ یہ وہ شخص تھا جسے وہ اتنا ناپسند کرتی تھی کہ کبھی اسے کسی قابل نہ سمجھتے ہوئے منہ نہ لگاتی تھی مگر وقت اور حالات کے تغیر نے اسے اس کے آگے بھی بے بس کر دیا تھا تو اس میں اس کی پسپائی وہاں بے حد واضح تھی۔

”کم از کم تمہیں نہیں چاہتا۔ یہ تو جان ہی گئی ہو گی تم۔“ جواب میں وقاص کا لہجہ صرف طنز یہ نہیں حقارت آمیز بھی تھا۔ لاریب کا رنگ پھیکا پڑا اس نے اس ہل جانا تھا۔ توہین کا بھی ایک انداز نہیں ہوتا۔ یہ مختلف رنگ اور انداز میں کی جاسکتی ہے۔

”امامہ بہت چھوٹی ہے ابھی تم سے تو بہت زیادہ.....!“

”سب جانتا ہوں اس کے باوجود میں اس سے شادی کروں گا۔ اس فیصلے میں نہ کوئی گنجائش ہے نہ رد و بدل۔ اگر تم اس ٹاپک پر بات کرنا چاہتی ہو تو رہنے دو۔“ اور لاریب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ وقاص کا منہ توڑ ڈالے۔ وہ کہینہ اس کی سوچ سے کہیں بڑھ کر گھٹایا اور ذلیل انسان تھا۔

”تمہیں امامہ سے شادی کرنا ہے تو ابھی کچھ سال انتظار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ ابھی اس کی اسٹڈی بھی ان کمپلیٹ ہے اور.....!“

”یہ فیصلہ کرنے والی تم کون ہوتی ہو میں چا چا سائیں سے بات کر چکا ہوں شادی کب کرنی ہے یہ بھی ڈسکس کر چکا ہوں۔“ وہ ایک بار پھر اس کی حیثیت اس کی اوقات جتلا رہا تھا۔ لاریب جھلس کر رہ گئی۔ اس نے ہونٹ بھیجنے اور مزید کچھ کہنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔ یہ احساس بہت تکلیف دہ تھا کہ وہ مکمل طور پر مار چکی ہے اسے خبر تک نہ ہو سکی اور آنکھوں کی نمی گالوں پر اترتی چلی گئی۔ بے خبری کا یہ عالم تھا سیاہ گرم سوٹ پر مردانہ

براؤن شال کا ندھوں پر لپیٹے سکندر اس کے عین سامنے آن کھڑا ہوا۔

”یہاں کیوں بیٹھی ہیں اتنی سردی میں آپ کی طبیعت مجھے پہلے ہی ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ سکندر کی نظر میں اس کے چہرے پر رنجی ہوئی تھی۔ لاریب چونک کر متوجہ ہوئی اور اسے رد بردہا کر اس کے ماتھے پر تل پڑتے چلے گئے۔

”میرے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے اپنا کام کر دو جا کے۔“ اس کے لہجے میں سرد پھنکار تھی اگلے لمحے اس نے نفرت زدہ انداز میں رخ پھیر لیا۔ سکندر نے گہرا سانس بھر لیا اور بھاپ کا بگولہ اس کے منہ سے نکل کر لہجہ بھر میں فضا میں پھیل گیا۔

”کسی کے لیے فکر مند ہونا بس کی بات نہیں ہوتی لاریب بی بی یہ بے اختیار جذبے ہوتے ہیں جو.....!“

”شٹ اپ سکندر تم کیا کہنا چاہتے ہو آخر؟“ تپ کر کہتی وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور اس کے مقابل آ کر اسے خونخوار نظروں سے گھورنے لگی۔ سکندر بہت سکون سے مسکرایا اور جواباً بہت دل آویز اور گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔

”اس دنیا میں صرف ایک خواہش رکھتا ہوں اور وہ آپ کے حصول کی خواہش ہے جو کسی حد تک تکمیل پا بھی چکی مگر.....!“

”شٹ اپ دل پوشٹ اپ تمہاری یہ جرات کہ.....!“ وہ اتنا بھڑکی تھی اتنا بھڑکی تھی کہ اسی اشتعال و کشش میں اس کا ہاتھ سکندر پر اٹھ گیا جسے سکندر اگر بروقت نہ تمام لیتا تو لازماً وہ اس کے چہرے پر نشان چھوڑ جاتا۔

”یہ بدتمیزی آخری مرحلہ برداشت کر رہا ہوں لاریب شہناز یاد رکھنا اس کے بعد کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ سوئی کیئر فل نیکیسٹ ٹائم اوکے؟“ اس کا ہاتھ نہایت جارحانہ انداز میں نیچے کرتے ہوئے وہ پھنکارتے ہوئے تنبیہ کر رہا تھا۔ لاریب اس قدر شاک میں آئی کہ زبان کو حرکت دینے پر بھی قادر نہیں رہی۔ آنکھیں بے بسی اور سبکی کے احساس سمیت میکینڈ کے ہزاروں حصے میں شفاف پانیوں سے چھلک گئیں۔ سکندر کا انداز ہی اس قدر سخت اور امانت آمیز تھا کہ وہ یقین نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ اس طرح بھی نفرت زدہ انداز میں بات کر سکتا ہے۔ دل تو پہلے ہی دکھا ہوا تھا یہ تو جیسے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔

”اندر جائیں ورنہ یہاں سے آپ کو زبردستی اپنے کمرے میں لے جانا بھی مشکل کام نہیں ہے میرے لیے محض ایک بار باا سائیں کے سامنے آپ کے کارنامے کا اظہار کرنے کی ضرورت ہے۔“ سکندر وہیں کھڑا اسے وارننگ دے رہا تھا۔ لاریب کو

چہرے کھڑے کھڑے سر تا پا جل اٹھی ہو۔ کچھ کہے بغیر وہ تیزی سے پلٹ کر اندر چلی گئی جبکہ سکندر شکستہ انداز میں وہیں کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

(یہ تعلق اور بندھن جتنی بھی مضبوطی لیے ہو یہ احساس بے مداخلت انگیز ہے لاریب کہ تمہارا دل میرا نہیں ہے۔ تم میری نہیں ہو تو یہ رشتہ خود بخود اپنی اہمیت کھودیتا ہے۔ تمہیں اندازہ ہے نہیں ہے تمہارا یہ قدم مجھے کن کانٹوں پر گھسیٹا رہتا ہے۔ اس سے ہزار درجہ بہتر تھا میں عمر بھر آس بھر ادا لیے تمہارے حصول کی دعا میں مانگتا رہتا۔)

جلتی آنکھیں موندے وہ ساکن بیٹھا تھا خاصی تاخیر کے بعد بھی خود کو سنبھالنے میں ناکام رہا تو ایک عرصے بعد گھر کا رخ کیا۔ دروازہ مانیہ نے کھولا اسے رو رو پا کر مانیہ کے ہونٹوں کی تراش میں اٹیلی مسکان جبکہ آنکھوں میں گہری جھنجھکی چمک اُبھر آئی۔ جسے ہمیشہ کی طرح نگاہ بھر کے دیکھے اور محسوس کیے بنا وہ سرسری انداز میں اس سے بات چیت کرتا اندر بابا اور اماں کے پاس کمرے میں آ کر چار پائی کی پانکٹی پر ٹپک گیا جس پر ہاتھ

”آج بہت دنوں بعد آیا پتر۔“ وہ کونکوں کی آنکھیں پر ہاتھ سینک رہا تھا کمرے میں دھوئیں کی بو پھیلی ہوئی تھی ایک کھمبے سے کچھ فاصلے پر موگ پھلیوں کے چھلکوں کی چھوٹی سی ڈھیری تھی۔ اس کی آمد سے قبل یقیناً مانیہ اسی شغل میں مصروف رہی تھی۔

”آج واپس جانے کا ارادہ نہیں ہے بابا اسی لیے دیر سے آیا ہوں۔“ اماں نے اس کی پشت پر تکیہ رکھ دیا تھا۔ وہ نیم دراز ہو گیا۔ اس کے وجود سے ہی نہیں روح سے بھی تھکن لپٹی ہوئی تھی۔ دل پر کھرسا چھار ہا تھا۔ نیچے پر سر رکھتے وہ آنکھیں موند چکا تھا۔ لہجہ معمول سے مدھم اور بوجھل محسوس کر کے بابا نے اسے تشویش زدہ نظروں سے دیکھا۔

”کیا ہوا پتر؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا خیر صلاً۔“ سکندر نے محض سر کو اٹھاتی سے اثبات میں ہلانے پر اکتفا کیا اس کے دماغ پر اس بل مکمل طور پر شکست خوردگی کا غلبہ تھا۔

”جائے لے لے سکندر۔“ مانیہ بھاپ اڑاتی جائے کی پالی لیے کھڑی تھی۔ سکندر نے نا چاہتے ہوئے بھی آنکھیں کھولیں تو نگاہ مانیہ کے دیکھتے گالوں پر بھی پڑی۔ جو آگ کی تپش سے نہیں اس کی معمولی قربت کی آغ سے دھک کر لو دینے لگے تھے۔ وہ اپنے متعلق اس کی پسندیدگی سے اچھی طرح آگاہ تھا وہ اور ایک لاریب تھی مجال ہے جو کبھی خائف ہوتی ہو اس سے یا اس کی قربت سے شاید حسرت ہی نہیں تھی اسے اس کا سینہ ملتا جلتا تھا۔ اس کی نرم پوروں کی سرسراہٹ کا احساس کتنا

گہرائی لیے تھا۔ (عورت ہمیشہ اسی مرد کی قربت میں کنفیوژ ہوا کرتی ہے جس کے متعلق وہ خاص انداز سے سوچتی ہے جس کو اہمیت نہیں دیتی اور سوچوں میں جس کا گزر نہیں ہوتا اس سے خائف ہونے اور شرمانے کی اسے کبھی ضرورت پیش نہیں آتی) سکندر کو کبھی کی کبھی اماں کی بات یاد آتی۔ وہ جانتا تھا لاریب کے نزدیک اس کی اہمیت سرے سے نہیں تھی اور مانیہ کے نزدیک وہ کیا مقام رکھتا تھا۔ بات درجاء اور حیثیتوں کی بھی تھی۔ کاش وہ اپنے مقام سے اور درجے سے آگاہ رہتا اور سورج کی چاد میں منہ اٹھا کر آسمان کی جانب نہ دیکھتا تو آج سورج کی تماز میں اسے سر تا پا جلا کر خاکستر نہ کر رہی ہوتیں۔

”مجھے چائے نہیں پینی۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور اگلے لمحے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکل گیا۔ اس کا کمر اس کی غیر موجودگی کے باوجود صاف ستھرا رہتا تھا اور جیسے اس کی واپسی کا خطر بھی۔ نواڑی پلنگ جس پر سفید چادر چھپی تھی جس کی جھالیں اور کڑھائی کا رنگ ہلکا گلابی تھا۔ دوسری جانب میز کرسی تھی۔ میز پر بھی سفید کڑھائی کا میز پوش تھا اور پرٹائم پیں رکھا ہوا تھا لیکن سیل نہیں تھے جیسی سویاں ساکن تھیں۔ سکندر نے پانکٹی میں پڑے ہوئے لحاف کی تہہ کھولی لیٹنے سے قبل اس نے حسب سابق قمیص اتار دی تھی۔ بھی دروازے پر کھٹکا ہوا۔ سکندر نے گردن موڑ کر سرسری نگاہ کی۔ مانیہ دیکھتے کونکوں کی آنکھیں اٹھائے اندر آئی کمرے کی فضا میں دھوئیں کی بو پھیلنے لگی۔

”اس کی ضرورت نہیں تھی۔“ سکندر نے چونکہ قمیص اتار دی تھی جیسی عجلت میں لحاف ہی سینے تک کھینچ لیا مانیہ نے اسے دیکھا پھر عجیب سے انداز میں مسکرا دی۔

”تمہیں تو شاید ہمارے سمیت کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں رہی ہے سکندر مگر ہمیں پھر بھی تمہارا خیال رکھنا اچھا لگتا ہے۔“ سردی بہت ہے نیند گہری آئے گی اس کی حدت کی وجہ سے۔

”جانتے ہوئے دروازہ بند کر جانا۔“ سکندر نے کروٹ بدلنے سے قبل قدرے نرمی سے کہا۔ مانیہ جو اس کی غفلت کے باعث اسے نگاہ کے رستے دل میں اتار رہی تھی گہرا سانس کھینچ کر رہ گئی۔

”ایک بات بتا سکندر نے کیا محبت ہونے کے لیے بہت زیادہ حسن کا ہونا بہت ضروری ہے؟ پر ایسا لازم ہوتا تو لگتی سے کیوں محبت کرتا مجنوں سنا ہے کالی شاہ بھی وہ۔“ مانیہ کی صرف آواز ہی نہیں آنکھیں بھی بھرا گئی تھیں۔ سکندر سناٹے میں گھر گیا تھا۔







اتر کر سرخوشی بخشنے لگا۔ فتح و کامرانی ایسی جو سنبھالے نہ سنبھلتی تھی۔ بلاخر اس کا سفر اس کی تلاش رائیگاں نہیں گئی تھی۔ وہ بے شک فاصلے پر تھا پر ایسے کہ دوری لمحوں میں فاصلے پائی نہ ہونی قربت کا امکان نئی کھڑی تھی۔ حیرت بھرے احساسات مسرت خیز احساس پر حاوی تھے۔

”نندنی.....“ زینب گھبرائی وہ دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی مگر اسے دیکھ کر کھکھلا دی۔ زینب نے اسے خائف ہوتے ہوئے دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

”یہ..... کون ہے زینب..... جانتی ہو؟“ اس نے مسکراہٹ ربائی اور شوخ و خشک انداز میں کہتے ڈسک کے کور پر جھکتے چہروں میں سے اک پر انگشت شہادت رکھ کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کتنی روشنیاں جھللا رہی تھیں۔

”پتا نہیں کوئی فلم ایکٹر ہی.....!“ معاوہ قہقہہ سی گئی اور کسی خیال کے تحت بہت چونک کر اس کے جوش جذبات سے چپکتے چہرے کو دیکھا۔

”یہ.....؟“ اس کی زبان لڑکھرائی تھی۔ نندنی زور سے ہنس پڑی۔

”یہ وہی ہے ہنڈرڈ پرنسٹ وہی..... میری نظریں دھوکہ نہیں کھا سکتیں..... میرے دل کی دھڑکنیں آج پورے چار سال بعد پھر اس انداز میں شور کر رہی ہیں۔ زینب جیسے پہلی بار اسے دیکھنے پر.....!“ وہ خوشی و مسرت سے بے حال لڑکھرائی پر جوش آواز میں کہہ رہی تھی زینب ساکن لب بستہ اسے دیکھے گئی۔

”تو یہ کشش تھی جو مجھے پاکستان پہنچ لائی۔ زینب میں بہت خوش ہوں۔ بے حد۔“ وہ اس سے لپٹ کر خوشی سے لڑنی آواز میں گنگنائی۔

”کتنی احمق تھی میں، کبھی اس طرف دھیان ہی نہ جاسکا۔ حالانکہ دیوا اکثر پاکستانی مودیوز دیکھتا تھا سا حرام نام ہے نا ان کا؟ دیوانہ ہے وہ ان کا۔ مجھے بھی اکثر اصرار کرتا مگر میں اپنی قنوطی تھی کہ کبھی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ نیٹ ٹی وی اور مودیوز سے بالکل کنارہ کیا ہوا تھا تب سے۔ ورنہ بہت پہلے کھوج لگ سکتا تھا اس کا۔“ اس کی ہنسی بات بے بات چٹک رہی تھی۔ زینب آہستگی سے مسکرا دی پھر اس کا کاندھا تھپکا۔

”ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے بہر حال تمہیں بہت مبارک ہو۔ اللہ تمہیں کامیابی سے نوازے۔“ زینب نے اسے بے حد اپنائیت آمیز انداز میں دس کیا۔ نندنی نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ ہنوز اسی چہرے کر دیکھ رہی تھی اور جیسے اپنی خوش بختی کا خود کو یقین سوچ رہی تھی۔

”میں یہ مودیوز دیکھنا چاہتی ہوں زینب لے جاؤں اسے کمرے میں۔“ نندنی کے ہر انداز سے بے چینی و جھلٹ جھلٹ لگی۔ اس سے قبل کہ زینب کچھ جواب دیتی دستک دیتا حسن انداز گیا۔ اس کی بات سن کر مسکرایا۔

”اصولاً تو آپ کو مجھ سے پریشانی لینی چاہیے خیر آپ لے جاسکتی ہیں۔ میں بعد میں دیکھ لوں گا۔“ اس کے انداز میں خفیف سی شرارت تھی۔ نندنی بری طرح جھپٹی اور اسے منکھور نظروں سے نکتی پلٹ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

”بہت خوش تھیں محترمہ جیسے یگانگت قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔“ حسن خاصا حیران نظر آ رہا تھا۔ زینب نے مسکرائے پر استغفا کیا۔ دوسری جانب نندنی اسے رہائی کمرے میں آ کر سی ڈی پلیئر میں ڈسک لگا کر ریموٹ کنٹرول سنبھال کر بیٹھ گئی کچھ وقت گزرا اور اسکرین پر وہ اپنی تمام تر حشر سامانوں اور دلکشی کے ساتھ جلوہ افروز ہو گیا۔ اس کی عقیدت چھلکانی اس کے خدو خال سے لپٹی ہوئی تھیں۔ وہ مبہوت تھی مگر خوش خیال بھی۔ تصویر سے تصویر اور تصویر سے حقیقت بننے میں اب یقیناً زیادہ وقت نہیں تھا۔ گیان سے یقین کا عنصر جا بے کتنا ہی پر خطر ہوتا اسے پر نہیں تھی۔ یہ اس کی دیوانگی ہی تھی کہ اس مودیوز کو اس نے بار بار صرف وہاں سے ریو اسٹڈ کر کے دیکھا جہاں ساحر موجود تھا۔ اس شغل میں رات بیت گئی اور اسے خبر تک نہ ہو سکی۔ صبح کسی خیال کے تحت وہ کمپیوٹر کے آگے بیٹھ گئی۔ اس کی انگلیاں کی بورڈ پر حرکت کرتی ساحر کی ویب سائٹ کھول چکی تھیں۔ وہ اس کے متعلق ہر طرح کی آگاہی حاصل کرنے کو بھل رہی تھی۔ اس بات پر دھیان دیے بغیر کہ ہر آگاہی خوش بختی اور خوشی کا باعث نہیں بنتی۔

لڈی ہے جہالو پاؤ لڈی ہے جہالو  
کھلے نے وال میرے رہنا میں نال تیرے  
دعدہ ہے پہلی ملاقات  
لڈی ہے جہالو پاؤ لڈی ہے جہالو  
شرجیل نے اندر قدم رکھا تو ڈیک فل والیوم میں چٹکلا اٹھا  
تھا اور فراز کی دھمال میں جوش و خروش تھا۔ میوزک کی تیز آواز کانوں کے پردے پھاڑنے کے درپے تھی۔ اس کے پہلے کھیدہ اعصاب کچھ اور بھی کشیدگی سمیٹ لائے۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈیک بند کیا تو فراز کا جھومنا ڈولنا وجود بھی جیسے جھٹکا کھا کر ختم گیا۔

”یہ کیا کیا بھائی؟“ فراز نے خفا نظروں سے اسے دیکھا مگر

شرجیل کے تاثرات اس سے بھی زیادہ کڑے اور خوفناک تھے۔

”ایک تم اور ایک تمہارا یہ بیہودہ شوق فراز تم اپنے ساتھ ہمیں بھی پاگل کر دو گے۔ ناں سنیں یہ گھر ہے اسٹوڈیو نہیں وہاں جا کر کر دو یہ پریکٹس۔“ وہ سوتے سے اٹھ کر آیا تھا۔ ساری بدنمزی و چڑچڑاہٹ اس پر نکال دی۔ سرخ آنکھیں، بکھرے بال شاید طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔

”ساحر کی نئی آنے والی مودیوز میں آڈیشن دینے والا ہوں۔ اگر میری سلیکشن ہوگی جو کہ یقینی بات ہے تو آپ بھی میرے پیچھے پھرنے والوں میں شامل ہوں گے آؤ گراف کے لیے۔“ کاوچ پر گر کر چہرے و گردن سے پسینہ صاف کرتا وہ کتنے زعم سے گویا تھا۔

”آئی ایم سیریس فراز پلیز والیوم کم رکھنا۔ سر درد سے پھٹ رہا ہے میرا۔“ شرجیل ہنوز بیزار تھا۔

”یہاں قدر رہی کہاں ہے کسی کو میری اور میرے ٹیلنٹ کی۔ خیر آنے والے وقتوں میں آپ بھی مجھ پر فخر کریں گے اور لوگوں کو یہ بتا کر خوشی حاصل کریں گے کہ مشہور و معروف ایکٹر فراز علوی میرا بھائی.....!“ اس کی بات ادھوری رہ جانے کے باعث شرجیل کا کمرے سے نکل جانا تھا۔ وہ بے حد سکی محسوس کر کے رو گیا۔

”یعنی حد ہے تو ہین کی بھی یار۔“ اس نے خجالت دور کرنے کو سر جھٹکا اور اٹھ کر پھر سے ڈاس کا موڈ بنار ہا تھا جب صالح نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

”ہیلو بیک بوائے۔“ وہ اسے دیکھ کر چپکی فراز نے ہراسا منہ بنالیا۔

”کیا کرنے آئی ہو تم یہاں؟ جاؤ کام کرنے دو مجھے اپنا۔“

”ہاں تو کرو تا میں دیکھوں گی تمہیں اور داد دوں گی۔“ وہ کہاں ماننے والوں میں سے تھی۔ آ کر کرسی پر ٹپک گئی۔ کیسٹ سلیکٹ کرتے فراز کا ہاتھ تھا۔ اس نے گردن موڑ کر چھٹی نظریں صالح پر جمائیں۔ اس کی آنکھوں میں چھین کے ساتھ تنبیہ بھی تھی۔

”تم ویسے تو عمر میں مجھ سے بھی بڑی ہو صالح مگر تمہیں سمجھانے کی ضرورت مجھے پیش آتی ہے وہ کیا کہتے ہیں کہ عقل عمر کی محتاج نہیں ہوتی تو.....!“

”تمہارا مطلب کیا ہے؟“ وہ غصے سے آؤٹ ہوتے ہوئی چلی۔

”یہی کہ تمہیں ایک جوان جہاں لڑکے کے کمرے میں کسی بھی وقت یوں منہ اٹھا کر نہیں آنا چاہیے۔“ فراز نے اسے گھورا

اور واضح ملامت کی۔ صالح کی جیسے آنکھیں ملگ انھیں۔

”اور تم تو جیسے بڑے نیک اور بارسا کام کر رہے ہو۔“ اس کے بھڑک اٹھنے پر فراز نے کاندھے جھٹکے۔

”یہ ایک الگ بحث ہے تم فی الفور یہاں سے جاؤ کیونکہ میں تمہاری موجودگی برداشت نہیں کر سکتا۔“ فراز کا لہجہ گو کہ انسٹنگ نہیں تھا بس اسے صالح کی بے پردائی پر غصہ آنے لگا تھا۔ اس کے خیال میں عورت کی یہی بے پردائی معاشرے میں بگاڑ اور برائی کے پھیلاؤ کا باعث بن سکتی ہے کیا وہ نہیں جانتی تھی مرد و عورت کی تنہائی میں تیسرا شیطان ہوا کرتا ہے۔ اسے بھی اپنی بار سائی کا دعویٰ نہیں تھا۔ وہ بہر حال فرشتہ نہیں تھا۔ نہ خود پر اسے کوئی دعویٰ تھا۔ احتیاط بہر حال لازم ہونی چاہیے مگر صالح کو اس کی ڈانٹ میں اپنی توہین کا عنصر نظر آیا جیسی اس کا برتاؤ اور نئی دیکھنے والی تھی۔

”تم سمجھتے کیا ہو خود کو فراز..... یعنی میں مر رہی ہوں تم پر؟“ وہ بچے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑی۔

”میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ صرف تمہیں یہاں سے جانے کا کہا ہے۔ بہت مہربانی ہوگی اتنا سا کرم کر دو۔“ فراز کے انداز میں کتنی دے بے زاری کے ساتھ اکٹاہٹ بھی شامل ہونے لگی۔ صالح کچھ دیر اسے کینہ تو نظروں سے دیکھتی رہی پھر مٹھیاں بچھنے جھٹکے سے پلٹ کر چلی گئی۔ فراز سر جھٹک کر رہ گیا۔ وہ ساری رات اس نے جاگ کر بے چینی میں گزاری۔ سلیپر ٹی بننا اس کا اولین خواب تھا۔ شو بیز کا روشن چمکتا ہوا ستارہ ساحر نے اس فیلڈ میں جتنی تیزی سے ترقی و کامیابی حاصل کی تھی وہ بھی اس کا خواہاں تھا۔ اس فیلڈ میں ساحر ہی اس کا آئیڈل تھا اور اب جبکہ ساحر کی نئی بننے والی مودیوز میں نئے چہروں کی کاسٹ کے لیے آڈیشن کا اعلان کیا تھا اس سے مذاق کا نشانہ بننا پڑا۔ خاص طور پر اطہر اور عالیشان نے زل کر خوب اس کا ریکارڈ لگایا تھا۔

”کبھی زندگی میں کمرے کا سامنا کر کے نہیں دیکھا اور محترم کردار ہیرو کا ادا کریں گے۔ وہ بھی ساحر کی مودیوز میں ہا ہا۔“ فراز کا جتنا بھی فشار خون بڑھا مگر اس نے خود پر کنٹرول ہی رکھا تھا۔

”ایسی بہت سی مثالیں زندہ سلامت موجود ہیں شو بیز میں ابھی بتا لو جتنی باتیں بنانی ہیں۔ پھر تم لوگوں نے ہی آگے پیچھے پھرنا ہے میرے اور میں نے لفٹ نہیں کرائی۔“ وہ انہیں چڑاتا چاہتا تھا مگر وہ سارے الٹا اسے زچ کرنے میں لگے رہیں پھر اگلی صبح جب وہ مایوس دل شکستہ اسٹوڈیو سے لوٹا تو اس کا چہرہ دیکھ کر نا کامی کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔



”آڈیشن میں ناکامی کی وجہ ڈارک کا مپلیکشن۔ ساحر نے کہا ہوگا ہمیں فیئر ہیر دیا جائے ہے نا؟“ اظہر نے پھر اسے گھیرا اور تاک کر نشانہ لگا یا سب بننے لگے۔

”بکواس مت کرو تم لوگ.....“ فرار کا آگ لگ گئی تھی۔

”یار رنگت تمہاری واقعی شب و بجور جیسی ہے کچھ اور ثرائی کرو۔ تم ویسٹ انڈیز یا پھر سری لنکا کی کرکٹ ٹیم میں کیوں قسمت نہیں آزماتے۔ شوہر تمہارے جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔“ اظہر نے مبالغہ آرائی کی حد کر دی۔ وہ سانولا تھا مگر کالا نہیں۔ لیکن کہنے والوں کی زبان پکڑنے کا فن آج تک ایجاد نہیں ہو سکا تھا۔ فرار کا سارا اعتماد ان لمحوں میں ہمیشہ کی طرح زائل ہو چکا تھا۔ دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ وہ وہیں کھڑا تھا جب نیبل نے وہاں جا کر اظہر اور عالیشان کی اس بدتمیزی کے جواب میں زبانی کلامی دھلائی کی تھی۔

”نیک تو مجھے یہ سمجھ نہیں آتی آپ کو ضرورت کیا ہے ان فضول لوگوں کے منہ لگنے کی۔ بات تک کرنے کی جنہیں تمیز نہیں۔“ ان دونوں کے واک آؤٹ کے بعد نیبل اس کی جانب متوجہ ہوا تو اس پر بھی بے دریغ برس پڑا تھا۔

”کیا میرا کمر واقعی بہت ڈارک ہے نیبل؟“ وہ آہستہ آہستہ سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ ہرگز رتے لمبے پھیکا پڑ رہا تھا۔ نیبل نے ٹھنڈا سا ناس بھرا۔

”آپ کو یہ کام کیس کیوں ہے بھائی اچھے خاصے ہیں آپ اچھا یہ بتائیں کیا بنا..... آپ آڈیشن کے لیے گئے تھے نا؟“ نیبل نے صوفے پر بیٹھنے کے بعد سائیڈ پر دھرا میگزین اٹھا کر ورق گردانی شروع کی اور موضوع بدل دیا۔

”کچھ بھی نہیں۔ آڈیشن نہیں ہو سکا۔ عین ٹائم پر ساحر صاحب کی مسز کی طبیعت خرابی کا فون آیا تو انہیں ادھر جانا پڑ گیا۔ یہ کام پھر التوا کا شکار ہو گیا۔“ وہ یاسیت و مایوسی میں گھرا کہہ رہا تھا۔ نیبل نے اس کے نیچے ہوئے چہرے پر نگاہ کی پھر اس کا کاندھا زور سے تھپکا۔

”کم آن بھائی ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے۔“ نیبل کا میل فون وائبرٹ کرنے لگا تو اسے اٹھنا پڑا۔ فرار وہیں کاؤچ پر سیدھا لیٹ گیا۔ (مجھے تو لگتا ہے میں زندگی بھر کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکوں گا)

مایوسی اور ناامیدی نے اس کے اندر بچے گاڑنے شروع کیے۔ اس وقت وہ بھول گیا تھا ہر کوشش اور محنت کا صلہ ضرور ملا کرتا ہے۔ کوشش و محنت عمل خیر کی ہو یا بد کی۔ اللہ ہمیں وہی دیتا ہے جو ہم اللہ سے مانگتے ہیں اور یہ ہدایت و توبہ تو ایسی اُصول اور

خصوصی نعمتیں ہیں جو خدا بھی بنانا نکلے عطا نہیں فرماتا۔ جو مانگے نا جو چاہے نہ کرے۔ ایسے ناقدروں کو یہ دولت کہاں مل پاتی ہے۔

عباس حیدر نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا۔ نگاہ بستر پر نیم دراز عریضہ پر جا کر ٹھہر گئی۔ گو کہ اس کی پارٹیل ڈیویری تھی پھر بھی وہ جیسے ان چند ٹخنوں میں ہی خنجر کر رہ گئی تھی۔ زرد پڑتی رنگت آنکھوں تلے گہرے ہوتے حلقے۔ ریشمی بھڑکے ہوئے بالوں کے ساتھ بھی وہ عباس حیدر کے لیے گل کائنات تھی۔

”کیسی طبیعت ہے عریضہ؟“ عباس نے قریب آئے کے بعد بہت محبت سے کہتے اس کے بال سمیٹ کر سائیڈ پر رکھے عریضہ نقاہت بھرے انداز میں مسکرائی اس کا بڑھایا ہوا خوب صورت پھولوں کا گلہ ستا، ہنسی سے تھا۔

”آپ نے بچوں کو دیکھا؟ اتنے چھوٹے ہیں دونوں کہ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کیسے اٹھاؤں گی انہیں۔“ اس کی آنکھیں خوشی کے بے پایاں احساس سمیت جھمک رہی تھیں۔ عباس نے جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ ثبت کیا۔

”میں تو ابھی اپنی بیوی کو دیکھ رہا ہوں۔ حالانکہ جانتا ہوں وہ بہت فسی ٹینک ہے مگر دل کہاں بھرتا ہے اسے دیکھ کر۔“ عباس کے لہجے میں محبت کا لودھیا احساس تھا۔ بے خودی کی سرشاری تھی جتنی دیر عریضہ لیبر روم میں رہی تھی اس نے خود کو مل ضرط پر محسوس کیا تھا خوف دھڑکاؤا ہمدردی اسے کھونے سے ڈرتا تھا۔ اتنا دہی ہو رہا تھا عریضہ کی خاطر کہ بچوں کی دنیا میں آمد کی خوشی باب بن جانے کا الوہی احساس اس خوف کی چادر میں کس مدم ہو گیا تھا مگر اب وہ ریلیکس تھا لیکن یہ خوشی عریضہ کی صحت یابی کی تھی بچوں کی جانب ابھی ابھی اس کا دھیان آیا تھا عریضہ کے کہنے پر اتنا ہی دیوانہ تھا وہ عریضہ کے لیے یہ لگاؤ یہ محبت عجب سی جنوں خیزی اور وحشت رکھتی تھی اپنے اندر کے اس کے آگے اسے کچھ اور بھائی ہی نہ دیتا تھا۔ وہ اس محبت میں اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ ہر قسم کی قربانی باخوشی دے ڈالتی تھی۔

عریضہ اس کے والہانہ پن پر نقاخر محسوس کرتی فیس پڑی۔ پھر جیسے ٹھنکی تھی۔

”دیکھیں نا بچوں کو..... بہت پیارے ہیں بالکل آپ جیسے۔“ عباس اٹھا اور کاٹ کی سمت آ گیا۔ دونوں برابر اپنے اپنے کاٹ میں بچے گلابی کپلوں میں لپٹے دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔

”ہیں نا پیارے..... عباس ہمیں رحمت و رحمت اللہ نے ایک

ساتھ عطا فرمادی۔“ عریضہ کا مدھم لہجہ استا سے مغلوب تھا۔ عباس کی آنکھوں میں شرارت اترنے لگی۔

”مجھ پر رحم آیا ہے اللہ کو۔ اللہ جانتا تھا میری بیوی کو دوبارہ ایسا مشکل کام کرنا پسند نہیں۔“ عباس نے اس کی پریشانی کے دوران کی بے زاری کو نشانہ بنا کر اسے چھیڑا۔

”یہ تمہارے لیے ہے عریضہ اس خوب صورت تحفہ کے جواب میں ایک حقیر سا نذرانہ۔“ عباس نے نکلیں دل شیب کیس اس کی جانب بڑھایا۔ جسے عریضہ نے اشتیاق آمیز خوشی سے تھا تا اور بڑی بے مبری سے کھولا۔ ہلکی سی ٹھٹھ کی آواز ابھری۔ اگلے لمحے کیس کا ڈھکن یکدم اوپر اٹھ گیا اور عریضہ کی آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔ کیس کے اندر سیاہ نکلیں کپڑے کے اوپر ایک تازک سائیکس شاعیں بکھیر رہا تھا۔ سیکس کیا تھا پلاٹینم کی ایک زنجیر تھی جس پر ہر دو کڑیاں چھوڑ کر نئے نئے ہیرے لٹک رہے تھے۔ زنجیر کے عین وسط میں ہیرے کے بجائے ڈیڑھ انچ کی تین کڑیاں لٹک رہی تھیں۔ جن کے آخری سرے پر ایک ایک سفید موتی بڑھایا ہوا تھا عریضہ بالکل مبہوت ہو کر اس بیش قیمت جگمگاتے سیکس کو دیکھ رہی تھی۔

”بائی گاڈ! اتنا پیارا۔“ معا اس کے ہونٹوں سے ستائش پھوٹی اور عباس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”کون سیکس..... کہ دینے والا.....؟“ اس کا شوخ و شگ انداز شرارت بھی سمیٹ لایا۔ عریضہ چونک سی گئی۔ عباس نے اس کی نظروں کا خود پر اٹھنا محسوس کیا اور اپنی شرارت کو طول دیا۔

”کیا فیصلہ کرنا مشکل ہے؟“

”ہرگز نہیں یہ تو بہت آسان ہے۔“ عریضہ نے کاندھے جھٹکے اور سیکس کو اپنی گردن سے لگا کر دیکھنے لگی۔

”تو پھر بتاؤ نا؟“ اب اشتیاق اور شوق کا سمندر عباس کی آنکھوں میں ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

”آف کورس سیکس۔“ اس نے شرارت بھرے انداز میں کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی جبکہ عباس نے مصنوعی خشکی کے ساتھ سر ہٹا لیا تھا۔

”میں سمجھا تم مجھے کہو گی۔“

”اگر آپ یہ گفت کسی اور لڑکی کو دیتے تو لازماً یہی کہتی مگر میں آپ کی بیوی ہوں۔ خواہ مخواہ سر چڑھانا نہیں چاہتی حسن کی تحریف کر کے۔“ وہ ناک چڑھا کر ازی نخوت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ عباس ٹھنڈا ہوا۔

”میں کسی اور کو کیوں دوں گا بھلا؟“ عباس نے جیسے برا مایا۔

”کچھ پتا بھی نہیں ہوتا وقت کا اچھا یہ بتائیں یہ کیسا لگ رہا ہے؟“

”اگر تمہاری بجائے کوئی اور حسین لڑکی پہنچتی تو زیادہ اچھا بھی لگ سکتا تھا مگر.....؟“ عباس نے شریر انداز میں کہہ کر گویا بدلہ چکا یا جبکہ عریضہ جھینپ کر اسے کہے مارنے لگی۔ عباس نے اس کی جھنجھلاہٹ کو محسوس کرتے اسے تھام کر خود سے لگا کر محبت سے تھپکا۔

”ہمیشہ کے لیے نوٹ کر لو میری آنکھوں میں تم سے بڑھ کر خوب صورتی اور کہیں نہیں سے اؤ کے؟“

”اؤ کے۔“ عریضہ نے مسکرا کر آسودگی سے کہا اور اس کے کاندھے سے سر کاٹ کر آنکھیں موند لی۔

.....

شام کا وقت تھا چائے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ ٹیرس کی گرین پالش کی رینگ پر دونوں ہاتھ جمائے اس نے جھک کر نیچے دیکھا۔ بے حد خوب صورت وسیع لان پورچ کی طرف جاتی سرخ ٹائلوں کی روش جس کے ایک طرف باؤنڈری وال تھی اور دوسری جانب لان۔ لان کے ساتھ ہی مردان خانہ تھا۔ جس کا ایک دروازہ حویلی کی جانب جبکہ دوسرا باہر مرکزی چھانک کی طرف کھلتا تھا۔ بابا سائیں سے ملاقات کاتے والے نہیں سے مردان خانے میں جایا کرتے۔ چھانک کے ساتھ الگ سے چھوٹا کیراج تھا۔ جس کے گول ستونوں سے سبز بیلین لپٹی ہوئی تھیں جن سے گہرے آتش پھول وقفے وقفے سے ٹوٹ کر گرتے تو یوں لگتا جیسے ہو اخوشی میں آنے والوں پر پھول نچھادر کر رہی ہو۔ کچھ دیر قبل اس نے تایا سائیں اور وقاص کی لینڈ کرہز کو یہاں آنے دیکھا تھا اور تب سے بے چین تھی۔ جو کچھ ہونے جا رہا تھا وہ کم از کم اس کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں تھا۔ وقاص کی آنکھوں کی وحشیانہ خوفناک جھک نے اس کا چین و قرار چھین لیا تھا گو کہ اس نے لاریب کو دم کی نہیں دی تھی۔ مگر ان نگاہوں کی عجیب سی تکی اور بے اعتنائی ہی جیسے از خود اپنے ارادوں کی غماز تھی۔ مسلسل سوچنے کے باعث اس کا دماغ عمل ہونے لگا تھا کہ آخر امامہ کو اس انتقام میں پھرے وحشی انسان سے کیسے بجائے۔ یہ بات وہ دعوے سے کہہ سکتی تھی کہ وقاص کو امامہ سے محبت نہیں ہو سکتی تھی اس فیصلے کے پیچھے محبت کا نہیں انتقام کا ہی جذبہ پرورش پاسکتا تھا۔

.....

”بجو.....؟“ امامہ کی مدھم آواز پر لاریب کے اضطرابی کیفیت میں اٹھتے پاؤں ٹھم گئے۔ اس نے گردن موڑ کر محفل نظروں سے امامہ کو دیکھا۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش  
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے  
ہم خاص کیوں ہیں :-

✧ عری ای بک کا ڈائریکٹ اور ریٹریوم ایبل لنک ✧  
 ✧ واؤنڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پریو ✧  
 ہر پوسٹ کے ساتھ  
 ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیننگ اور اچھے پرنٹ کے ✧  
 ساتھ تبدیلی

✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج  
✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن  
✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ  
✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ویڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہے

← **واؤ ٹلوؤنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں**

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

ایسے دوست احباب کو ویب سائٹ کا ٹکٹ دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan



Like us on  
**Facebook**

fb.com/paksociety



011117.001/20150115

سپاہی کی سی تھی جو میدان جنگ میں بغیر اسلحہ کے بیکسی کی حالت میں دشمن کے وار سہتا سسک کر مرنے کے قریب ہو۔

”جی انہوں نے کبھی فون بھی کرتے ہیں مجھے اور کئی بار جب یہاں آئے تو میرے کمرے میں بھی مجھ سے مل کر جاتے تھے۔“ امامہ نے گویا تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ لاریب بے جان ہوتی بے ساختہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے اطراف میں سرد ہواؤں کی شوریدہ سری تھی۔ ان ہواؤں کی سسکیوں کے ساتھ کوئی اور بھی ماتم کتنا تھا۔ کون..... شاید اس کا دل وقاصی نے بہت مہارت سے اپنا داؤ کھیلنا تھا۔ ناکامی کے سارے اسرار و رموز کو ذہن میں رکھ کر وہ ہارنے کو میدان میں اترا ہی نہ تھا۔ مگر اس کا مقصد لاریب سمجھنے سے قاصر تھی۔ آخر وہ ایسا کیوں چاہتا تھا؟

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا بجو؟“ امامہ کو اس کی جانب سے تشویش ہوئی تو گھبرانے لگی۔ لاریب نے گہرا سا س بھرتے ہوئے لمحہ بھر کو اسے دیکھا اور سر کو اثبات میں ہلایا۔

”ہاں..... مجھے کیا ہونا ہے؟“ اس کا لہجہ زہر خند تھا۔

”بجو مجھے پتا چلا ہے آپ بابا جان کو فوری شادی سے منع کر رہی ہیں۔ م..... میں یہی کہنا چاہ رہی تھی آپ سے پلیز یہاں مت کیجیے۔“ امامہ نے قدرے جھجک کر کہا۔ لارے نے سر نہیں اٹھایا۔ وہ نہ بھی یہ بات کہتی تو اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ پہلے ہی شکستہ تھی مگر وقاص حیدر کی یہ سازش تو جیسے اسے لے ڈوبی تھی۔ بالکل گھائل کر ڈالتا تھا اسے۔

ہر طرف تاریکی تھی ہولناک ساٹا۔ امید کی ایک منہمی سی کرن بھی کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مایوسی اور حوصلے ایسی کہ اس کا دل بے انت و حشتیں سمیٹ لایا تھا اور کچھ نہیں سوچتا تھا تو ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ اماں جا چکی تھی۔ وہ اپنے دکھوں و اہموں خدشات اور ناامیدی کے احساسات کے ہمراہ تنہا تھی۔ بالکل اکیلی.....!!

(جاری ہے)

”آپ پریشان ہیں بھو؟“ سوال ایسا تھا کہ یارِ یب آہ بھر کے بھینچی نگاہ کا زوایہ بدل گئی۔ اب وہ اسے کیا بتانی اپنی پریشانی کی وجہ۔

”آئی تھمک آپ وقاص کے پروپوزل کی وجہ سے آپ سیٹ ہیں۔ مجھے اسی سلسلے میں آپ سے بات کرنی تھی۔“ امامہ کی اگلی بات نے لاریب کی جان ہنسی میں لے لی۔ اس نے خائف ہوتے ہوئے امامہ کو دیکھا۔ جس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ جیسے اپنی بات کہنے کو حوصلہ اور ہمت مجتمع کر رہی ہو اور ہمتیں تو لاریب کی بھی جواب دے گئی تھیں۔

”آپ پریشان نہ ہوں بھو! مجھے وقاص پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آئی مین وہ اچھے لگتے ہیں مجھے۔“ لاریب نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تحیر و استعجاب کا رنگ بے حد گہرا تھا تو منہ غیر یقینی کے باعث ذرا سا مکمل گیا۔ پہلے تو اسے یقین نہیں آ سکا تھا پھر جیسے اس کے اعصاب شدید تناؤ کا شکار ہوئے چٹختے کے عمل سے گزرنے لگے۔ امامہ کے چہرے پر جو سرخی تھی وہ گھبراہٹ یا پریشانی کی نہیں حجاب کی لالی کا دل فریب رنگ تھا لاریب کی آنکھیں جلنے لگیں۔

”تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“  
 ”بجو..... وقاص مجھ سے محبت کرتے ہیں اور..... اور مجھے  
 لگتا ہے کہ میں بھی.....!“ لاریب کو لگا آن واحد میں کمرے کی  
 چھت اس کے سر پر آن گری ہو۔ وہ ساکن کھڑی اپنے سامنے  
 موجود معصوم اور نوجیز نظر آتی المہمہ کو کتنی اس کے چہرے کی شرمیلی  
 مسکان کو فوج چہرے کے ساتھ دیکھتی رہی۔

”وقاص محبت کرتا ہے تم سے یہ بات تمہیں کیسے پتا؟“ آواز  
لااریب کے حلق میں پھنس کر نکلی۔ اسے لگا وہ ہاری تو مھی ہی مگر  
اب کہ وقاص کی اس گھناؤنی سازش کے باعث چاروں شانے  
جیت گری ہے۔

”وقاص نے خود بتایا ہے مجھے ایک بار نہیں بار بار مجھ کو یہ کہہ رہے تھے ایمان باجو کے ساتھ اگر ان کی شادی ہو بھی جانی مجبوری میں تب بھی وہ خوش نہیں رہ پاتے کیونکہ انہیں شروع سے میں پسند تھی۔“ امامہ دھیمی مسکان کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ جھکی کانپتی پلکوں پر حجاب کا بوجھ دھرا تھا مگر لاریب کے قدموں تلے سے زمین ہلکتی جا رہی تھی۔ اس کا گلا خشک ہو کر اس کی ہبہ رگ کو بھینچنے لگا۔

”یہ بات اس نے کب کہی تم سے؟ کیا وہ ملنے آیا تھا تم سے؟“ مگر کب؟“ امامہ کی پلکوں کی لرزش لاریب کی آواز میں اتر آئی۔ اس کی آنکھیں اس عجیب سی چوہنیشن پر جم گئیں۔ حالت ایسے



اپنی مرضی مگر ثابت یہ کرنا ہے جسے تم نے مجھے بڑی مشکلوں سے منت سماجت کر کے منایا ہے۔ اگلی شب پایا نے مہما سے کہا تو وہ قدرے مطمئن ہوئی اور سرگرمی سے لگنے لگتا تھا۔ پایا یہ سوچ رہے تھے آخر بھائی صاحب کو فراز میں ایسے کیا جن بھوت نظر آتے ہیں جن سے وہ خائف ہو کر اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں یہ سچ تھا اگر تاؤ جی نہ کہتے تو وہ کسی فراز کو فلموں میں کام کرنے کی اجازت نہ دیتے۔

اس نے اپنے پیچھے کمرے کا دروازہ آہستگی سے بند کیا اور آگے بڑھ کر زینب کے کمرے کے دروازے کو آہستگی سے ٹاک کیا۔

”آ جاؤ نندی۔“ زینب کی مدھم آواز سن کر اس نے دروازے پر دیاؤ ڈالا تو دروازہ کھلتا چلا گیا تھا۔ زینب کہیں جانے کو تیار ہو رہی تھی۔

”آپ کو کیسے پتہ میں ہی ہوں؟“ نندی اس کا صبیح چہرہ تنکے لگی۔ جس پر ایک مستقل حزن پسرا کر چکا تھا۔ اس سوال پر وہ رواداری سے مسکرا دی۔

”میں تمہاری دستک پہچانتی ہوں۔ نہ ٹھوٹا۔“ زینب کی مدھر مسکان اور مدھم آواز سب میں یاسیت کا رنگ آ بسا تھا۔ عثمان خان نے اس سے بچ کر شاید ہمیشہ کے لیے اسے اٹھوا کر دیا تھا۔

”شاید آپ کہیں جا رہی ہیں زینب؟“ نندی نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ اس وقت وہ گلابی لمبی فراک میں ملبوس تھی۔ یہ لباس جو اس کے پیروں کو چھو رہا تھا بہت اسٹائلش تھا۔ اس کے دامن پر گلابی دھلتا ہوا کام تھا جس کی جگہ گاہٹ اس کے صبیح چہرے کو انوکھی تابناکی عطا کر رہی تھی۔

”ہاں میں آج سدر سے جوائن کر رہی ہوں نندی! پیدر سے یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں میں آج سے قرآن پاک کی تعلیم دیا کروں گی۔ تمہیں مجھ سے کچھ کام تھا۔“ اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے زینب کچھ خیال آنے پر جیسے چونک کر بولی۔ نندی نے بے خیالی میں سرگوشی میں ہلایا۔ حالانکہ حسن نے اسے بتایا تھا کہ آج وہ اسے ساحر سے ملوا سکتا ہے۔ ایک کنسرٹ میں عباس کو بھی انٹری دی گئی تھی۔ حسن وہیں اسے لے کر جا رہا تھا اس کی ساحر کے متعلق دلچسپی دیکھتے ہوئے وہ تیار ہوا تھا بلکہ نندی نے اس سے ملنے کی فرمائش خود کی تھی حسن سے مگر نندی اکیلی حسن کے ساتھ جانے پر متائل تھی۔ اس کی خواہش تھی

اس نے راستہ غلط بیانی کرتے ہوئے بہت آگے کا معاملہ ظاہر کیا مگر پایا جیسے کوئی اثر دکھائی نہیں دیا۔

”ایڈوائس واپس کر دو۔“ پیسے کی یہاں کوئی کمی نہیں ہے جتنا وہاں سے لیا ہے اس سے دو گنا میں دے دوں گا تمہیں۔“ ان کی بے نیازی اور شاہانہ پن قابل دید تھا۔ فراز پر البتہ جھلا ہٹ غلبہ پانے لگا تھا۔

”ٹاٹ..... واپس کر دوں؟ پایا آپ کو اندازہ نہیں ساحر اور اس کے ہم نام کی ویڈیو کا لوگ رشک کر رہے ہیں میری قسمت پر۔“ لاکھوں امیدوار تھے اس چانس کے مگر کامیابی میرا نصیب بنی ہے۔“

مجھے زیادہ باتیں نہ سناؤ فراز! میت اس چیز کی ہوتی ہے جسے ہم غلام سمجھیں۔ میرے نزدیک اس کام کی کوئی اوقات نہیں۔ یہی فرصت میں انکار کر دو اسے۔“ اب کے ان کا لہجہ سرد ہی نہیں تھا بلکہ کئی درشتی بھی لیے ہوئے تھا۔ فراز نے ہونٹ سخت سے بچھ کر اپنی سرخ ہوتی آنکھوں سے دیکھا پھر اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”آپ کے نزدیک میری خواہش سے زیادہ اہم تاؤ جی کی ناراضی ہے۔ کیوں ڈرتے ہیں آپ ان سے اتنا اور ان کی ہر جائز ناجائز باتیں میں نہیں جانتا مگر پایا میں بتا دوں آپ کو میں ان کی خاطر اپنے کیریئر کی قربانی نہیں دے سکتا۔ اب مرضی ہے آپ کی کتاب مجھے اس نافرمانی کے بعد گھر میں رکھتے ہیں یا نہیں۔“ فراز نے اپنی بات مکمل کی اور کمرے سے نکل گیا۔ پایا کے ساتھ مہما بھی بھونچکی بیٹھی رہ گئیں تھیں۔ ان کی خائف ہوئی نظریں شوہر سے گھرا میں جو بے حد عجیب انداز میں انہیں دیکھ رہے تھے وہ کچھ اور گڑبڑا میں کہ پایا اس صدماتی کیفیت سے نکل کر ان پر برس پڑے۔ ان کا خیال تھا یہ انہی کی کوتاہی ہے۔ اس میں ایسا کچھ غلط بھی نہیں تھا وہ خود بھی اس کوتاہی سے خارج نہیں تھے۔ بچوں کو صرف مہنگے اسکولوں میں پڑھانے سے ہی تربیت کا حق لوٹ نہیں ہو جاتا۔ بچوں کو ان کی بے ہودگیوں اور ہرج مرج غلط بات کو بے دھڑکی سے منہ پر کہہ دینے کی عادت پر یہ کہنا لہجہ اور خود اعتمادی ہے ان کے ساتھ ہی نہیں معاشرے اور ملک کے ساتھ بھی بہت بڑی زیادتی ہے۔

مہما کے تہہ دلکے کر ہی بھائی صاحب سب سے زیادہ فکر مند ہیں انہیں اس میں مرضی کا احساس پوشیدہ نظر آتا ہے اس معجز جیل ولسے معاشرے پر دیکھا کیسے بولا تھا۔ اسے کہنا کر لے



مجھے ہے حکم از ان

ام مریم



زینب بھی ساتھ چلے اس کے

”آپ ڈاکٹر ہیں زینب کلینک جو ان کرنے کی بجائے آپ نے مدرسہ میں جوائننگ کر لی کیوں؟ میرا نہیں خیال کہ یہاں سے اتنی سیلری ملے کہ آپ.....“ اس نے اچنبھے سے کہتے بات ادھوری چھوڑ دی۔ زینب رواداری سے مسکرائی۔

”بلاشبہ مسجانی بھی بہترین شعبہ ہے نندنی اور اس میں پیسہ بھی بہت ہے مگر قرآن پاک کی تعلیم دینا اور علم کو سکھانا سب سے بہترین عمل ہے میں اس کام کو فی سبیل اللہ کرنا چاہتی ہوں اس کا اجر اللہ ہی بہتر دینے والا ہے تم چلنا کبھی میرے ساتھ میں دکھاؤں گی تمہیں وہ جگہ۔“ نندنی نے کانڈھے اچکائے پھر اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

”مجھے آپ کی یہ باتیں کچھ اتنی سمجھ میں نہیں آتی میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ ساحر سے ملنے کا چانس مل گیا ہے۔ پلیز برے فاری ابھی میں حسن کے ساتھ جانے ہی والی ہوں۔“ وہ ایکسائینڈ ہوتے زینب کے ایکدم گلے لگ گئی۔ زینب نے محسوس کیا وہ دھیرے دھیرے کانپ رہی ہے۔ جی بھی اس نے نرمی سے ہانسی سے اسے تھکا تھا۔

”بیسٹ آف لک انڈ کرے جو بھی ہو ہر لحاظ سے تمہارے حق میں بہترین ثابت ہو۔ مجھے بھی خوشی ہے کہ تمہیں تمہاری تلاش کا حاصل مل رہا ہے..... گڈ لک۔“ نندنی کا دل گداز ہوتا چلا گیا اس سے الگ ہو کر اس نے آہستگی سے آنکھیں پونچھیں اور سر جھکا لیا۔ انداز میں اتنی دلگیری اس درجہ یا سیت تھی کہ زینب کا دل دھک سے رہ گیا۔

”زینب میں اسے پا کر کھودینے کے خوف سے ہراساں ہوں اگر اس تلاش کا حاصل نارسائی پر ہوا تو.....“

”تم اچھا بھی تو سوچ سکتی ہو نندنی۔“ زینب نے اس کا گال تھپکا وہ مسکرائی۔ (اچھا سوچنے کی ساری ہمتیں ہی سلب ہو گئی ہیں زینب! میں بہت دیر کر چکی ہوں۔ وہ شادی شدہ ہی نہیں دو بچوں کا بھی باپ ہے۔ یہ ایسی حقیقت منکشف ہوئی ہے جس نے جسم میں بول اگادیے ہیں۔ لیکن میں پھر بھی قسمت آزمایا جاتی ہوں تو اس کی وجہ وہ بے بسی ہی ہو سکتی ہے جو ہجر و نارسائی کی صورت مجھے سنہا پڑے گی۔ اسی سے خائف ہوں سب سے زیادہ) دروازے پر ہونے والی دستک پر نندنی اپنی سوچوں سے چونی زینب کی پر تشویش نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں البتہ کرپڈ نے اور اصرار کرنے کی اسے عادت نہیں تھی اتنی

ہی روادار اور باوقار تھی وہ۔ دروازہ کھول کر حسن اندھا یا اور دھڑکے کھنکرایا یہ بھی متوجہ کرنے کا ہی ایک انداز تھا۔ نندنی نے سنبھل کر کھڑی ہوئی حسن کی جو محتاط نگاہ اس پر اٹھی وہ ٹھنکی ہی نہیں مہبوت بھی رہ گئی۔ اتنی ہی دلکشی اور سحر انگیزی اتر آئی تھی اس کے سراپا میں۔

”آئیے دروازہ پھر ہمیں دیر ہو جائے گی۔“ زینب نے بھائی کی تنبیہی انداز کا غیر محسوس ٹھوکا دیا تھا۔ وہ زور سے گڑ بڑایا اور فی الفور خود کو سنبھالا۔ نندنی متوجہ نہیں تھی۔ اپنا بیگ لے کر اٹھی تھی۔ زینب نے حسن کو نظروں میں ہی شامل کیا اور تہذیب کا پتہ پتہ پتہ پتہ پتہ۔

”آئی دس آپ بھی چلتیں میرے ساتھ۔“ نندنی بیک زپ بند کر کے سیدھی ہوئی اور گہرا سانس بھر کے اسے دیکھا۔ زینب نے اس کا گال نرمی سے تھپھپایا اور کہا۔

”میں ایسی جگہوں پر نہیں جاتی نندنی! مائنڈ مت کر پلیز اوکے؟“

”جی میں سمجھ سکتی ہوں اس اوکے۔“ نندنی نے جیسے سحر کو اثبات میں بلایا اور اپنی منزل کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ منزل جس کا اختتام ایک ہی مقام پر ہوتا تھا لیکن یہ بات دونوں کو معلوم نہیں تھی کہ گس نے اپنا راستہ اور اپنا مقصد چھوڑنا تو ایک منزل ایک مقام پر اکھٹا ہونا تھا۔



راہی رلاں مائی مائی مائی کر اس تیرے ہجر دی میں سولی چڑھاں دل نال غماں دے لا کے میں اپنی ہوش پلا کے..... وچ رب نوں وسا کے میں رانجن لبدی پھر اس میں رانجن لبدی پھر اس

آج ریگلسز کی بھرپور عکاس حدیث کیانی اسے مخصوص طے میں نغمہ سرا تھی کنسرٹ میں کچھ بھی انوکھا یا نیا نہیں تھا نندنی کے لیے وہ ایسے شوژنی وی کے علاوہ لائیو بھی دیکھ چکی تھی لیکن یہاں کا اصل تھریل ساحر کی ذلت تھی۔ رنگ برنگ تیز روشنی اور اس کے بے حد روشن ماحول کی سروں کی فلش لائٹس میں نندنی اپنی بے چینی چھپائے بار بار دست و پا کر رہی تھی۔ اتنا انتظار کیا تھا اب یہ معمولی وقت کا ٹاٹا بے حد شوق تھا۔ ایک ایک لمحہ جیسے اک صدی پر بھاری پڑنے لگا۔ تقریب

کی اختتام پر ایوان کی تقریب ہونا تھی۔ ساحر بھی ایوان کی تقسیم کے لیے میں بلایا گیا تھا۔ مہمان خصوصی کے طور پر پھر بلا خیر یہ من انتظار اپنے اختتام پر پہنچا اور اناؤنسر اس کی آمد کا اعلان ہوئے خوب صحت الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کے سراپا میں۔

”ساحر کو دیکھ کر لوگ یونہی مہبوت ہو جاتے ہیں۔ ان کا فانی ہونے کا بلکل ان کی شخصیت کے لحاظ سے پرفیکٹ لیکن آپ دیکھ کر سحر ہو جائیں گی مجھے یقین نہیں تھا۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”آپ کو گراف تو لیں گی نا ان سے؟“ بات ایسی تھی کہ نندنی کی توجہ اسے حاصل ہو گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اب نندنی کو گراف لینے والے اس کے فیز نے اسے اس طرح گھیرا تھا کہ اس کی ایک جھلک بھی دیکھنا ممکن نہیں رہی تھی حسن کی بات پر نندنی نے ہنس مچائی۔

”مگر وہ بہت رش ہے اور میرے پاس آنو گراف نہیں لے سکتی۔“ اس کے لہجے میں یاسیت تھی۔ حسن کی لٹنی آنو گراف جب پریشان تو گراف نہیں لیا جاتا اور رش سے

آپ پریشان نہ ہوں ہم وٹ کر لیتے ہیں آئیے پلیز۔“ وہ اٹھا تو نندنی نے اس کی تقلید کی۔ کرسیوں کے بیچ میں سے جوا کثرت خالی ہو چکی تھیں راستہ بناتے دھڑوں آگے پیچھے چلتے آج پر پہنچے تھے۔ جہاں دھکم پیل جاری تھی۔ نندنی گھبرا کر دوں تھم گئی۔ عباس سے ملنے کی خواہش جتنی بھی شدید تھی مگر اس کا گریز اسے نوجوان لڑکوں کے بیچ گھس جانے پر آمادہ نہیں کر سکا۔

”ہم ہمیں وٹ کر لیتے ہیں۔“ وہ ہچکچائی۔ اس سے قبل کہ حسن جواب میں کچھ کہتا ساحر کو گھیرے کھڑے مجمع میں یکدم ہلچل ہی مچ گئی۔ گھبراؤ نا اور مجمع منتشر ہوتا چلا گیا۔ نندنی کی نظرس حیرانی کے عالم میں اٹھی تھیں مگر یکدم ہی ساری حسیات سمیٹ لائیں۔ وہ دور سے دیکھنے میں جتنا حسین اور خوب رنگ تھا نزدیک کی یہ جلوہ گری تو جسے قیامت تھی۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکی۔ پلکیں نیم دا آنکھوں کے ساتھ کستہ زدہ تھیں۔ عباس مجمع کو چیرتا تیزی سے باہر آ رہا تھا۔ سیل فون اس کے کان سے لگا ہوا تھا اور چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

”ڈونٹ وری عریضہ میں بس پہنچ رہا ہوں لوکے۔“ نندنی نے جلد و ساکن کھڑے اس کی بے حد بھاری اور دلکش مگر متعطل آواز سنی تھی۔ لوگ اس کے پیچھے لپکے رہے تھے مگر وہ نظر انداز کیے آج سے اترنے کو سیڑھیوں کی جانب آیا مگر اس سے نیچے قدم رکھتے ہی وہ یکدم ٹھٹھکا تھا نندنی اس سے کچھ فاصلے پر ہی تھی جسے کی مانند ساکن مگر بلا کی دلربائی اثر یکشن اور طلسماتی کشش سمیٹے اپنے قیامت خیز حسن سے بے خبر کھڑی اس میں گن دبو تھی۔ عباس نگاہ نہیں ہٹا سکا وہ چاندنی میں نہائی ہوئی کوئی الہرا تھی عباس کو اپنی نگاہوں کی بے اختیاری پر اختیار نہیں رہا تھا۔ عباس کا ٹھٹھکانا اور پھر رکنا بھلا کس کی نگاہوں سے پوشیدہ رہا تھا۔ وہ ہر نگاہ کا مرکز تھا پھر اس کی نگاہ کا جو مرکز ٹھہری تھی وہ کیسے پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ نندنی بھی اس مسمرانہ کیفیت سے اگر نکلی تھی تو وہ عباس کی دل دھڑکا دینے والی توجہ اور پیش قدمی تھی۔ یہ صورت حال جتنی حیران کن تھی اس سے کہیں زیادہ گھبراہٹ وغیرہ یعنی میں جتلا کر دینے والی۔

وہ اپنے طور پر ساحر کو مخاطب کرنے کے متوجہ کرنے کے لاکھوں طریقے سوچ چکی تھی۔ کہاں گمان تھا وہ بھی اسے دیکھ کر عام لوگوں جیسا ہی ری ایکشن دے گا۔ وہ غیر یقینی اور حیرانی کے باعث ہی اب گنگ ہو رہی تھی۔ ساحر نے بے تپے چند قدم اٹھائے اور اس کے روہقا کر از خود اسے مخاطب کیا اور مسکرایا غیر



یقینی سی غیر یقینی تھی۔ نندی اس کی بات کیا سمجھتی اس پر تو جیسے مارے خوشی کے عشی طاری ہونے لگی تھی۔ اس درجہ عزت افزائی و پذیرائی کا اس نے خوابوں میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔

”ہلے..... آئی ایم ساحر..... ہاؤ آریو؟“ وہ اس سے مخاطب ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ نندی کو اپنی خوش بختی کا یقین نہیں آسکا۔ اسے یقین ہوا یہ کوئی خواب ہے جو بس ٹوٹنے والا ہے وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہوئی۔ ایسا بھلا کہاں ممکن تھا وہ اتنی خوش بخت تھی بھلا؟ اس کے وجود میں ہر سوسنا ہٹ دوز رہی تھی۔

”اس وقت میں کچھ جلدی میں ہوں۔ یہ میرا کارڈ رکھ لیں میں آپ سے کھینک کر لوں گا..... لو کے؟“ عباس اس کی کیفیت اور اندرونی خلفشار سے بے خبر اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ڈیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی جانب بڑھا چکا تھا۔ گرے خوب صورت چکنے کارڈ پر چمکیلے الفاظ میں ساحر کا نام اور فون نمبر درج تھا۔ اس پاس موجود کتنی نگاہوں میں نندی کے لیے رشک و حسد تھا۔ جبکہ نندی وہ تو جیسے ہنوز سکتہ زدہ تھی۔ اس خوش بختی کا ہی تو یقین نہیں آ رہا تھا اسے کہ اک عمر وہ بھر کے صحراؤں میں آبلہ پا بھٹکتی ہوئی صرف نامرادی و مایوسی سے نیردا ز مار رہی تھی۔ عباس نے اس سے جواباً اس کا کھینک نمبر مانگا۔ شاید وہ کسی بھی صورت اسے گولانے کا تصور نہیں رکھتا تھا۔ نندی کے دل میں کتنے دلکش خیال کا احساس ابھر آکر آنکھوں میں ہنوز تحیر و استعجاب تھا۔ تب حسن نے بوکھلاتے ہوئے کسی مگر خود اسے نندی کا نمبر نوٹ کر لیا اور کارڈ بہت احترام آمیز انداز میں اس سے لیا۔ عباس نے مسکرا کر اسے وٹس کیا اور پلٹ کر چلا گیا۔ تب نندی پر چھایا یہ غیر یقینی و حیرت کا سکوت بھی چھانکے سے ٹوٹ گیا۔

”آپ ساحر صاحب کی مداح ہیں میں جانتا تھا مگر آپ ان کے سامنے اتنی کنفیوژ ہو جائیں گی مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا۔ لوگ تو باقاعدہ رشک کر رہے تھے آپ پر۔“ جس وقت حسن نے گاڑی اشارت کی اسے سر جھکائے اسی کیفیت میں پا کر مسکرا کر گفتگو کا آغاز کیا۔ نندی کچھ نہیں بولی اس کا سر ہنوز جھکا ہوا تھا۔

”آئی ایم سوری مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہی اگر آپ ساحر صاحب کو اتنا پسند کرتی تھیں تو ان سے آپ نے بات کیوں نہیں کی۔ بجائے خوش ہونے کے آپ مجھے لو اس لگ رہی ہیں۔“ حسن اپنی حیرت کا اظہار کے بغیر نہیں رہ سکا۔ لانی مگر جھکی پٹکوں والی یہ لڑکی اتنی اٹریکشن رکھتی تھی اپنے اند کہ وہ اسے نظر انداز کر ہی نہیں سکتا تھا۔ نندی کا دل بھرا یا وہ خود اپنی کیفیات سمجھنے سے

قاصر تھی۔ بجائے خوش ہونے کے وہ یاسیت کے سمنے کیوں ڈوڈتی جا رہی تھی۔ پھر ساحر کا رویہ جو صلا فز بات تھی (وہ مجھ سے پہلے کسی اور کا ہو چکا یہ ہار کوئی معمولی چیز نہیں ہے خیال کرو کہ کسی اور کا ہے جنون کی سرحدوں سے کیا نہیں گزر رہی؟) مسلم ہے نا وہ ملا تھا آج تمہیں؟“ زینب آگے کا مقام ہے میں پاگل ہوئی رہی تھی اس رات جب اسے یہ انکشاف ہوا اس خوشی پر یہی نقصان اپنا غلبہ جمار ہا ہے پوری طرح کیسے خوش ہو جاؤں۔

اس کے آنسو دل پر گرنے لگے۔ معا کسی نئی سوچ نے اس کے دل کو ہلکا کر دیا تھا۔ (مجھے لگتا ہے کہ وہ اس کی دوا ہے جو مجھے سالہا سال تک جھلساتی رہی ہے اس کا اثر میرے غیر معمولی حسن سے انہما ہو چکا ہے۔ کیا وہ بھی کچھ نہیں جانتا؟) اس نے قیاس کیا اور دل اتنی تیزی سے دھڑک اٹھا جیسے اس نے اپنا ڈیٹنگ کارڈ مجھے دیا ہے۔ صرف یہی نہیں مجھ سے پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔

”مجھے اسے یہ بتانا ہی نہیں چاہیے کہ میں نان مسلم ہوں۔“ زینب سے کہتی ہوں مجھے پہلی فرصت میں اس نے خوشگوار انداز میں دھڑکتے دل کے ساتھ ملنا چاہتا ہے آئی ایم شیور وہ مجھے پرپوز کرے گا شادی کے لیے گمانی کی انتہا پر جا کر سوچا تھا۔ حسن نے حیرت بھرے انداز میں اس لڑکی کو دیکھا جس کا چہرہ کچھ لمحوں قبل سے مختلف کینڈا ہو چکا تھا۔ آئی ایم شیور وہ مجھے پرپوز کرے گا شادی کے لیے آسکار کر رہا تھا۔ اب آنکھوں وچہرے پر بیک وقت اتنی لالچ ایک خوش باش خوش فہم اور زندگی کے تمام حسین رنگوں سے آگاہ کس کی خوب صورتی دکھانے ہوئے لگی تھی۔

”وہ..... کارڈ دے دیں مجھے حسن صاحب!“ گاڑی کے سامنے آ کر وہ کسی انچکی ہٹ کے مطالبہ کو کوکھ نہ کیا پھر عیاں اتار کر رکھنے لگی۔ اس دوران عبداللہ بھی حسن نے بنا کچھ کہے کوٹ کی جیب سے کارڈ نکال کر اسے دیا۔ نندی نے کارڈ تھام لیا۔

”میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں زینب! مجھے اس کے کرنا ہوگا؟“ اس شام وہ بہت بے چینی سے زینب کی طرف تھی۔ اسے رو برو پاتے ہی جس طرح چھوٹے مدعا بیان کرنے نے زینب کو تحیر میں مبتلا کر ڈالا تھا۔

”اتنا اچانک اور غجالت میں فیصلہ کیوں کیا تم نے زینب کی حیرت تمام نہیں ہوئی تھی۔“

”آپ کو تو خوش ہونا چاہیے شاید ہی اس سے قبل مجھ نے اسلام قبول کیا ہو۔“ نندی نے بات اڑانا چاہی مگر زینب سنجیدگی ہنوز تھی۔

”اسلام ایسا مذہب نہیں ہے نندی کہ اسے بنا سوجھ اختیار کر لیا جائے اس سے متاثر ہو کر اسے سمجھ کر قبول کر

لیے اختیار نہ کرنا۔“ زینب کا ملائم لہجہ نندی کو جھنجھلاہٹ اور غصے سے دوچار کرنے لگا۔ اسے لگا زینب اس کی پہلی کامیابی کی راہ میں روڑے ٹانگانے کا باعث بن رہی ہے۔

”آپ کا خراسم فرض کیوں ہے زینب؟ عجیب بات ہے یہ بجائے خوش ہونے کے آپ منع کر رہی ہیں مجھے۔“ زینب نے ایک نگاہ اس کے فنگلی چھلکاتے سرخ ہوتے چہرے پر ڈالی اور نرمی سے مسکرائی۔

”اس لیے کہ تم اسلام کو اللہ کے لیے نہیں اللہ کی محبت میں نہیں ایک فانی انسان کے حصول اس کی محبت کی خاطر اختیار کر رہی ہو۔ نندی میں نے کہا نا اسلام کو اختیار کرنے اور اسے قبول کرنے میں بہت واضح اور بنیادی فرق ہے۔ اختیار کرنا کسی چیز کو اپنا لینے کا نام ہے۔ اپنا نا تو زبردستی اور جبر میں بھی آ جاتا ہے جبکہ قبولیت جسمانی و ذہنی اور قلبی تسلیم و رضا کے احساس کا نام ہے۔ یہ کام خالص اللہ کے لیے ہی کیا جاسکتا ہے۔ اللہ کی محبت میں اور جب کوئی کام اللہ کی محبت کے بغیر ہو تو وہ بوجھ کی طرح ناگوار اور بے زار کن بھی لگنے لگتا ہے بوجھ ہمیشہ نہیں سہا جاسکتا میں نہیں چاہتی تم مذہب اسلام کو بوجھ سمجھو یا اس سے ناگواری محسوس کرو جلدی کا ہے کی ہے؟ تم وقت کا انتظار تو کرو اگر اللہ تمہیں اس راستے پر چلانا چاہتا ہے تو اس نے اپنا لائحہ عمل بھی ترتیب دیا ہوگا۔“ زینب نے کہا۔

نندی نے اب کے جواب نہیں دیا۔ اس کے خوب صورت چہرے میں ایک کھنکھار سا آ گیا تھا یہاں اس مقام پر ڈالی گئی رکاوٹ نے اسے بدگمان کرنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کی اسے لگا زینب کو اس کا ساحر سے ملنا ساحر کا اسے یوں اہمیت دینا اچھا نہیں لگا۔ یقیناً وہ اس کی خوشیوں سے جلیس ہو گئی تھی۔

”او کے ایز یو ڈن! میں ساحر سے مل لوں پھر ہی کوئی فیصلہ کروں گی۔ شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں۔“ وہ یکدم کتنی روڈ ہو گئی تھی۔ اس نے بے تاثر لہجے میں کہا اور پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ زینب کچھ متحیر ہو کر ہلٹے پردے کو کھینچ رہی تھی۔ نندی کی بدگمانی کا تو اسے اندازہ نہیں ہو سکا تھا البتہ نندی کی یہ رکھائی اسے محسوس ہوئی تھی مگر اس نے اس بات کو اعصاب پر سوار نہیں کیا۔ اس نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لی تھی کہ وہ نندی کو پھر سے قائل کرے گی بلکہ اسلام کے متعلق کچھ کتابیں دے گی شاید نہیں یقیناً اسے یہ فیصلہ دل سے کرنے کے ساتھ دماغ سے بھی قبول کرنے میں مدد ملے گی اسے یقین تھا سو وہ مطمئن تھی۔

نندی نے اب کے جواب نہیں دیا۔ اس کے خوب صورت چہرے میں ایک کھنکھار سا آ گیا تھا یہاں اس مقام پر ڈالی گئی رکاوٹ نے اسے بدگمان کرنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کی اسے لگا زینب کو اس کا ساحر سے ملنا ساحر کا اسے یوں اہمیت دینا اچھا نہیں لگا۔ یقیناً وہ اس کی خوشیوں سے جلیس ہو گئی تھی۔



”تم بھی ساتھ چلو نا امامہ! اپنی پسند سے لینا جو لینا ہوگا۔“  
 لاریب شکل سے ہی بند لگ رہی تھی کتنے دن بیتے تھے شادی  
 کی تاریخ طے ہوئے اس کے اندب سکتی ہوئی زندگی کا احساس  
 تھک کر نڈھال ہو رہا تھا کوئی بھی غم کہاں تک منایا جاسکتا ہے  
 بے آنسو آنکھوں کو لور دل درد سب سے روح کو بلا خرویران کر رہی دیا  
 کرتا ہے اس پر بھی عیب سی ویرانی و سنانے کا راج تھا۔ نہ ماں  
 تھی نہ بڑی بہن اب ہر جگہ کو لاریب کے وجود نے پرکھنا تھا سو  
 اس نے چپ چاپ یہ ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اٹھالی۔ پچھلے  
 ایک ہفتے سے اس نے کالج سے چھٹیاں لی ہوئی تھیں پور روز کبھی  
 بابا جان کے ساتھ تو کبھی امامہ کے ساتھ شاپنگ پر جا رہی تھی مگر آج  
 بابا سائیں کے ساتھ امامہ نے بھی انکار کیا تو لاریب گڑبڑانے لگی  
 بابا سائیں کی تو طبیعت بہتر نہ تھی البتہ امامہ کو قائل کیا جاسکتا تھا  
 سکندر کے آج کل جو تھوڑے تھوڑے میں تنہائی بہت خطرناک ہو سکتی  
 تھی۔ بابا سائیں باپھر امامہ کی موجودگی میں وہ شرافت کے جاے  
 میں تو رہتا تھا کالج بھی وہ پچھلے ایک مہینے سے سکندر کی بجائے  
 ڈرائیور کے ساتھ جاتی تھی۔ اس میں سکندر کی بے پناہ مصروفیات  
 نہیں لاریب کی کوششوں کا عمل دخل تھا۔ وہ بے حد محتاط تھی اور  
 سکندر کے سائے سے بھی بدکنے لگی تھی۔ اس رات کی سکندر کی  
 باتیں اس کی حرکات و سکنات کچھ بھی تو نظر انداز کرنے والا نہیں  
 تھا۔ وہ جب بھی سوچتی نظر اور گھبراہٹ چھانے لگتی۔

”بہت تھک جاتی ہوں بجو! پلیز مجھے نہ لے کر جائیں مجھے  
 آپ کی پسند پر بھروسہ ہے۔“ اس کے اصرار کے جواب میں امامہ  
 کی معصومیت قابلِ دید تھی۔ لاریب دل ہی دل میں جزبہ ہونے  
 کے سوا کچھ نہیں کر پاتی۔

”بابا جان حاکم چا چا چلے جائیں گے میرے ساتھ۔“ اس  
 نے پہلو تھپی کا ایک اور حل نکالنا چاہا اور ڈرائیور کا نام لیا مگر بابا  
 سائیں نے فی الفور تجویز رد کر دی۔

”بیٹے کہاں اس بیچارے کو اس عمر میں بازاروں میں خوار  
 کرو گی سکندر ہی ٹھیک ہے۔ میں بھی سکندر کی تمہارے ساتھ  
 موجودگی کے باعث مطمئن رہتا ہوں۔“ انہوں نے گویا بات ہی  
 ختم کر دی اور لاریب پر فرار کے سارے مدار سے بند ہو گئے۔

(کھا نہیں جائے گا مجھے وہ اور میں اسے سر پر اتنا آخر سوار  
 کیوں کر رہی ہوں؟ اونہہ..... اسے جرات نہیں کہ مجھے آنکھیں  
 دکھا سکے وہ آج بھی میرا ادنیٰ ملازم ہے۔ میری کوئی لغزش بھی

لسنڈ مین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھانے میں ناکام ہو گئی  
 نے خود کو حوصلہ دیا پھر جس وقت وہ تیز گلابی لور آگ  
 صورت پر نٹ کے شلوار دوپٹہ پر آف وائٹ ٹراؤنڈ میں  
 ہینڈ بیگ سنبھالے سیل فون پر کچھ نمبر پیش کرتی رہی  
 نیازی و غفلت سمیت پورج کی جانب آئی گاڑی کا  
 کھولے اس کا منتظر سکندر جیسے اپنی آنکھوں کی چٹکی  
 میں نہاتا محسوس کرنے لگا۔ دل فریب تو وہ ہمیشہ سے تھی  
 ہر گزرتے دن کے ساتھ جیسے کچھ اور گھبراتی جا رہی تھی۔

”سکھاں بابا جان کو ٹائم رکھنا دینا اور دو اکھلا اور دل  
 خیال رکھنا میں شام سے پہلے لوٹ آؤں گی میرے پاس  
 پہلے رات کا کھانا تیار کر لینا لو کہ۔“ سکندر کا کھولا ہوا  
 نظر انداز کیے اس نے ملازمہ کو جو اس کے ہمراہ آئی تھی  
 ہدایات دیتے کھٹاک سے پچھلا دروازہ کھولا اور اندر  
 سے بند کر دیا۔ سکندر نظر اندازی کے اس اعلیٰ مظاہرے  
 اٹھا تھا۔ جانے کس احساس کے تحت اس کی آنکھوں کی  
 سرخی دوڑ گئی۔ فرنٹ ڈور دھماکے سے بند کر کے اس  
 ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور بے حد خراب موڈ کے ساتھ  
 اشارت کی تھی۔ ایک دو جگہ تو ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے  
 سکندر کی اس ریش ڈرائیونگ کی وجہ سے اس کا سر درد  
 شدت سے سامنے سیٹ پر جا لگا تھا۔

”تمہارا دماغ درست ہے سکندر آہستہ چلاؤ گاڑی  
 اسے منہ نہ لگانے کا سوچ کر بیٹھی تھی اتنا بھڑکی کہ برے  
 سکی۔ وہ پرہم نظروں سے اس کی پشت کو گھورنے لگی مگر چل  
 اس پر کسی قسم کا اثر ہوا ہوا۔ النار قار اتنا بڑھی کہ گاڑی ہوا سے  
 کرنے لگی۔ ایک گاڑی کو اس نے اتنے خطرناک انداز  
 اور فیک کیا تھا کہ وہ ننھی سی گاڑی کچلتے رہ گئی۔ لاریب  
 اوسان خطا ہونے لگے۔

”اگر تمہارا مرنے کا ارادہ ہے تو برائے مہربانی مجھے بھی  
 دو۔“ وہ قہر بھری کیفیت میں غرا گئی۔ جواب میں اس نے  
 عجیب ہڈیانی قبچہہ سنا تھا۔

”تمہارے ساتھ ہی تو مرنے کا ارادہ ہے جان میں  
 مر کے کیا کروں گا۔“ اس کا لہجہ و انداز جنونی ہو رہا تھا۔ لاریب  
 دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اسے واقعی ایسا محسوس ہوا  
 اپنے ساتھ ساتھ اس کے بھی خون کا پیاسا ہو رہا ہو۔  
 ”سکندر..... گاڑی روکو پلیز.....“ جب اس نے ایک



بہت خطرناک انداز میں موڑ کاٹا تو صرف ٹائروں کے زور سے چرچر کرنے کی آواز نہیں گونجی تھی لینڈ کروزر بھی فضا میں اچھل کر دوبارہ لہرا کر زمین پر آئی تو لاریب نے فقی چرے کے ساتھ تقریباً چپختے ہوئے کہا تھا۔ اس کی آواز میں واضح لڑش تھی۔ وہ جیسے رو دینے کو تیار تھی۔ موت کو سامنے پا کر ساری تلخیاں و نفرت اسے بھول چکی تھیں۔ جان کتنی پیاری ہوتی ہے یہ اسے اندازہ ہوا تھا سکندر جو اس بل وحشی ہو رہا تھا لاریب کی پانچی اور سرسری آواز نے اس پر ایسی کیفیت میں بھی حیران کن انداز میں اثر پزیری کی تھی اور اگلے لمحے گاڑی کو لکھوت بریک لگے تھے ایک زوردار جھٹکا لگا اور جسے کوئی قیامت آتے آتے رہ گئی۔ مگر لاریب کے حواس ابھی تک بکھرے بکھرے تھے۔ سکندر نے بیک ویو مرر سے اسے ختم آلودہ کی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”اتنی جلدی ڈر گئیں؟ کتنی ظالم ہو تم لاریب! جی تو سکتی نہیں میرے ساتھ مرنے پر بھی آمادہ نہیں۔“ اس نے بھیجیا ہوا سانس کھینچا لاریب کا ریسکی دوپٹہ ڈھلک کر گود میں آگرا تھا۔ سیاہ مخملیں بال کچر کی نرم گرفت سے پھیسل کر لٹوں کی صورت میں کانٹھے گردن اور چہرے پر پریشان نظر آنے لگے سکندر نے سر آہ بھری۔

جدائی سے تو بہتر تھا تم زہر دے دیتے تمہارا نام ہو جاتا ہمارا کام ہو جاتا

بالوں کو دونوں ہاتھوں سے کھینچتے ہوئے لاریب نے اس کی مخموری آواز سی تو دل دھک سے سد گیا۔ وہ بیک ویو مرر سے کتنے اطمینان سے دیکھ رہا تھا۔ بال اس کے ہاتھوں کی بے جان ہوتی گرفت سے چھوٹے اور پھر سے چہرے و گردن پر لہرانے لگے سکندر نے عاشقانہ سی آہ بھری تھی۔

تیرا خیال بھی تیری طرح کھل ہے وہی شاب و بی دل شہی وہی انداز

لاریب کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سکندر کا یہ روپ تو اس نے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ سو اسی سکندر سے خوف آنے لگا۔ وہ یکدم کتا بے باک ہو چکا تھا۔ اس کی گھبراہٹ سراپا سنگی میں بدلنے لگی۔ اس نے دوپٹہ اٹھا کر سرعت سے اپنے گرد لپیٹا اور خائف ہوتے ہوئے نگاہ کا زلویہ بدل لیا۔ عجیب سی بے بسی اس کا احاطہ کرنے لگی تھی۔

”سکندر..... اس سے پہلے کہ سکندر کو پتا وہ پھٹ پڑی۔“ جی جان سکندر؟ وہ الفاظ اہولہ لاریب نے دھواں ہوتے

چہرے پر جھلکتی نظروں کے ساتھ بے حد تنگی سے لکھ لکھا۔ ”کیا بکواس ہے یہ گاڑی کیوں روکی ہوئی ہے؟“ اس میں بالکل آؤٹ ہونے لگی۔ لیکن سکندر کی نظرس اتنی تیز تھیں۔ لاریب کے وجود میں ناگواریت کے ساتھ جھنجھلاہٹ کا بھی احساس بکھرتا چلا گیا۔

”گاڑی چلاؤ۔“ اس کے حکمانہ لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔ سکندر نے اب کی مرتبہ گردن موڑ کر براہ راست اسے اور پھر پٹکارا سا بھر کے کانٹے اچکا دیئے۔

”یہ گاڑی اس وقت تک نہیں چلے گی جب تک یہاں..... میرے پاس آ کر نہیں بیٹھ جاتیں۔“ سکندر تقاضے اور فرمائش نے لاریب کا دماغ تھما کے رکھ دیا۔ اس کے خیال میں وہ حد سے بڑھ رہا تھا۔

”آر یومیڈ؟ تمہیں اندازہ ہے تم کہہ کیا رہے ہو؟“ اس نے لہجے میں چلا اٹھی۔ جواباً سکندر نے اس کو طنزیہ نظروں سے حصار میں لیا تھا۔

”بالکل اندازہ ہے شاید تم یہ بات بھول گئی ہو کہ تم میری میری تو تمہاری جگہ یہی ہے۔“ وہ پھری تھی تو سکندر بھی اسے نظر آنے لگا۔ شاید اس کا یوں ہٹکا میز انداز میں جھٹلایا جاتا تاؤ دلانے کا باعث بنا تھا۔ لاریب کا چہرہ جانے کس کس جذبہ اور احساس کے تحت سرخ ہوا۔ ہونٹ چوٹی وہ بے حد خجیدہ لٹول نظر آنے لگی۔

”تم جو بات کرنا چاہتے ہو سکندر اس کا تمہیں دلی بھی لا حاصل ہونے والا نہیں سمجھو۔ میں کتنی مرتبہ تمہیں یہ بار بار کہتا ہوں کہ وہ محض میری ایک حماقت تھی جسے میں کسی بھی لمحے ختم بھی کر دوں گی فی الحال میرے مسائل اور مجبوریوں کا لکڑی کس میں ایسا کرنے سے قاصر ہوں۔ مگر تم.....“

”مگر تم مجھے اتنی پسند ہو کہ میں اس مختصر عرصے میں تمہاری اس حماقت سے بھرپور خراج وصول کر لینا چاہتا ہوں۔“ اس نے کچھ تو مجھے بھی حاصل ہونا چاہیے نا لاریب بیگم۔“ سکندر بات کاٹ کر پھنکارتے ہوئے بولا۔ اس کا لہجہ شدید تھا۔ اس کے کاٹ دار احساس نے لاریب کا چہرہ ایسے سرخ کر دیا کہ کسی نے وہاں آگ دہکادی ہو۔

”مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ تم اس قدر گھٹیا اور سلطی رکھتے ہو گے ورنہ.....“

”ورنہ تم لازماً مجھ سے نکاح نہ کر سکتے۔“ سکندر

پھر اس کی بات کاٹ کر طنزیہ لقمہ دیا۔ لاریب نے جواب نہیں دیا۔ اس نے انتہائی برہم نظروں سے اسے گھورا۔ سکندر نے البتہ اس کے سر پر بے پھر پورا اور متحی خیز نگاہ ڈالی تھی پھر مسکراہٹ دبا کر کہہ رہا تھا۔

”اب جبکہ تم ایسا کر چکی ہو تو موقع سے فائدہ نا اٹھانا میری سب سے بڑی حماقت ہوگی اور میں اس حق نہیں ہوں سمجھیں؟“ وہ آخر میں پھر غریبا دکھ بے بسی اور لا چاری و تضحیک کا احساس لاریب کی آنکھیں چھلکا گیا تھا مگر جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں فطری تلخ اور نخوت قائم دائم تھا۔

”تم جو بھی بکواس کرو مگر یہ طے ہے کہ میں تمہاری گھٹیا فرمائش پہلی کرنے والی نہیں ہوں۔ میں واپس جا رہی ہوں۔“ بیٹھے ہوئے یہاں۔ ”خود کو سنبھال کرو وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلے تو کسی کہ سکندر نے بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آتے اس کی کوشش کہ کھلیے کھائی دیوچ کرنا کام بنایا کہ وہ پوری کی پوری اس کے کانٹے گر پھڑ پھڑانے لگی۔

”بہت غلط خیال ہے محترمہ کہ اب تم مجھے لاریب میری خواہشوں کو ٹھکرانے کی جاؤ گی۔ نکاح نامہ کی ایک کاپی ابھی میرے پاس ہے۔ کہو پیش کروں؟“ اس کا لہجہ جتنا بے حس اور سنگین تھا اس قدر تیزی سے لاریب پر اثر انداز ہوا تھا۔ سکندر کی گرفت میں عقید اس کا ہاتھ اپنی مزاحمت ترک کر گیا اور تن بدن میں ٹھنڈک اترتی ہوئی تھی۔ موت جیسی خطرناک اور سفاک ٹھنڈک۔

بے بسی و واضح شکست کے مظہر آنسو پھیل کر دائیں بائیں گرنے لگے۔

”لو کہ..... چھوڑو مجھے آ رہی ہوں میں فرنٹ سیٹ پر۔“ اس نے اپنی ہد تسلیم کرتے ہوئے غلطی سے کہا اور فرنٹ سیٹ پر چھوڑ سکندر کے لمحوں پر ایک شوخ مسکان ابھری تھی۔

اس کی نظرس پل فون میں سینڈ ہو جانے والے ساحر کے سر پر تھی ہوئی تھی اور دونوں پر ایک مستقل مسکان کا بسیرا تھا۔ گہری بات کا دل مجاہد تھا کہ وہ ساحر سے رابطہ کرے محبت میں عملیاتی کیا کیسا عرصہ مگر ہر بار وہ چاہنے کے باوجود ایسا نہیں کر سکتی۔ ہر بار سکندر کی ڈانٹ باز نشستہ دکھ لیا کرتی تھی۔ یہ تمہیں کی حاجت کا بہت طویل سفر اختیار کر چکی ہیں نندنی! لاریب نے چپکے سے کہیں اور کچھ بھی جیسا کہ تم کہتی ہو کہ وہ تمہاری جانب سے ملتا ہے اسے ملتا ہے۔ اس نے دوا میں تمہاری بھلائی

اور بہتری ہے نندنی۔ وہ سر اسٹار رہ چکا ہے بلکہ اس کی مقبولیت و نامداری میں ابھی ابھی کوئی کمی نہیں لڑکیوں لڑکیوں اس کی تمنائی ہیں وہ سب بھی کچھ کم حسین نہیں ہوں گی مگر اس نے ان سب میں سے تمہیں اہمیت دی ہے اس اہمیت کو پورا بڑھنے دو کم از کم اتنا کہ وہ تم سے خود رابطہ کرے۔“

”آپ کو اندازہ ہے جذ بہب میں اس کی خاطر کتنا تر پی ہوں؟ اب وہ میرے سامنے ہے تو میں پھر سے صبر کیسے کرے رکھوں؟ کیسے جبر کروں اور اس کی پیش رفت کی منتظر بنی رہوں۔“ جواب میں نندنی کس قدر بے قراری سے سسک اٹھی تھی۔

”یہ ہر مرد کی سانس لگی ہوئی ہے نندنی! کہ وہ اس عورت کو اپنی زندگی اپنے دل میں کبھی کوئی خاص مقام نہیں دیتا جو بچے ہوئے پھل کی طرح ہے اس کی جمہولی میں گرنے کو بے تاب رہتی ہو۔ مرد کو دریافت کا پیچھی ایسے ہی نہیں کہا گیا۔ وہ ہمیشہ ناقابل رسائی شے کی جانب لپکتا ہے۔ اسے یہ احساس دلا کر اپنی قدر و قیمت اور سوانحیت کو زیر نہ کر نندنی کہ تم خود اس پر جان دینے کو تیار ہو۔ میں جانتی ہوں تمہارے جذبول کی بے قراری کا عالم چاہے جانے کی خواہش مگر نندنی جذبات کو خاص طور پر ایک عورت کے جذبات کو پھر سے سمندر کی طرح نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ساحل پر سرخ کر اپنا وجود بے مایا کر لے عورت کی مثال فضا میں لہریں پتنگ کی طرح ہوتی ہے جو کردار کی دور کے سہارے آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرتی ہے مگر تب تک جب تک یہ کردار کی دور مضبوط رہتی ہے وہ رفعتوں پر بسیرا کرتی ہے مگر جیسے ہی دور کمزور پڑی یا ٹوٹی تو وہ ہوا کے دوش پر پستی کی طرف رخ کر لیا کرتی ہے۔“ نربب نے اسے سمجھاتے ہوئے کچھ لمحوں کا توقف کیا پھر مگر سانس بھر کے اسے بغور دیکھا اور نرمی و محبت بھرے انداز میں اس کا گال تھپک کر مسانیت سے بولی۔

”اور میں نہیں چاہتی کہ میری اتنی پیاری دوست کو کبھی کسی کی نظروں سے گرنے کی اذیت سہنی پڑے۔ خاص طور پر اس شخص کی نظروں میں جو اس کے لیے پوری دنیا سے زیادہ اہم اور خاص ہے۔“ بات جتنے خوب صورت انداز اور پیرائے میں کی گئی تھی اتنی ہی آسانی اور سہولت سے نندنی کو سمجھا گئی تھی۔ اس نے لمحہ بھر میں جان لیا کہ وہ اس نقصان کی محفل نہیں ہو سکتی۔ وہ اگر مغربی ذہن و دل رکھتی تھی تو ساحر ضرور مشرقی مرد تھا اور مشرقی مرد بہت ٹیپیکل ہوتے ہیں۔ یہ تو وہ بھی جانتی تھی۔

”میں اس وقت کا ہی انتظار کروں گی ساحر جب آپ خود



میری جانب آئیں گے۔ اس انتظار کے انعام میں مجھے جو جگہ چاہیے اس کا مرکز آب کا دل ہے۔ میں نے سب کے لیے اللہ سے دعا کروں گی وہ اس ناممکن نظر آنے والی بات کو ممکن بنا دے۔“ سِل فون والوں رکھتے وہ پر امید اور خوش گمان تھی۔ ایک امید ایک امنگ اسے توانائی بخش رہی تھی۔

.....

”کنیزاں نے جہیز کے تمام جوڑے پیک کر کے سوٹ کیس میں رکھ دیے؟“ سکندر بابا سائیں کے کمرے سے باہر آیا تو لاریب کو رہنمائی کے سرے پر کھڑے ملازمہ سے محو کلام پا کر اس کے قدموں کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی۔ آج مایوں کی رسم کی ادائیگی ہونا تھی حویلی کی آرائش کا تقریباً سارا کام مکمل تھا۔ مہمانوں کی آمد بھی سہ پہر سے شروع ہو چکی تھی۔ خود لاریب اس وقت گہرے سبز رنگ کے لباس میں اپنی بے حد روشن اور اجلی رنگت کے ساتھ بے حد باری لگ رہی تھی مگر اس سے ہمیشہ کی طرح غافل بے نیاز اور لائق..... سکندر تر کے دل نے اک سرور آہ بھری۔

”لاریب.....!!!“ جس پل وہ ملازمہ کو جانے کا اشارہ کرتی اپنے کمرے کی جانب مڑی سکندر بے اختیاری کی کیفیت میں اسے پکار اٹھا لاریب کے قدم ٹھٹھکے مگر اسے اہمیت دیئے بغیر سرے سے نظر انداز کیے وہ اپنے کمرے میں جا بسکی۔ سکندر چند ثانیوں کو ساکن کھڑا رہ گیا تھا پھر جانے کیا دماغ میں سہلی تھی کہ کسی بھی نزاکت کا خیال کیے بغیر اس کے پیچھے دنگنا ہوا کمرے میں چلا آیا۔

”تم.....؟“ لاریب جوتاہینے کتا گے کھڑی بال سلجھاری تھی۔ اسے دو برو پاکے اس کے ہاتھ سے برش چھوٹ گیا۔ ”تمہیں بلایا تھا میں نے بات کیوں نہیں سنی؟“ لاریب جتنی بھی جزبہ اور خائف تھی مگر صورت حال کسی سمجیر تا سے بے خبر نہیں تھی، جسمی اسے بھرانے کی بجائے جبر انری اختیار کی اور کل ورساں کا دامن بڑی دقت سے تھاما۔ اس کا دماغ درست کرنے یا پھر اس کے متعلق انتہائی فیصلہ کرنے کے کام کو اس نے امامہ کی شادی کے بعد پڑا ل دیا تھا۔ یہاں اس نازک موقع پر وہ کسی قسم کا کوئی ہنگامہ نہیں چاہتی تھی، جسمی سکندر کی بد معاشی اور بدتمیزی کو برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ سکندر چونکہ اس کے خیالات سے آگاہ نہیں تھا جسمی اس فرمانبرداری و عمل پر کسی قدر حیران ہو کر یوں اسے تکتے لگا جیسے

اند کا بھید پانے کا متمنی ہو۔

”تمہیں کچھ کام تھا مجھ سے؟“ لاریب کے لیے موجودگی کو برداشت کرنا اس کی نظروں کو سہنا بلاشبہ کھنکھناتے سکندر چونک سا گیا پھر سرگوشیاں میں ہلا کر کمرے کی جبر ہاتھ ڈالا اور کوئی چیز باہر نکالی پھر اس کی جانب بروہادی سال کی حیرانی سے تھکی نگاہوں نے استعجاب کی کیفیت میں کیس کو دیکھا جو اس کی چوڑی تھیلی پر دھرا ہوا تھا۔

”تمہارے لیے ہے یہ لاریب..... مجھے اندازہ ہے تمہارے شایان شان نہیں مگر میں اس سے زیادہ افرور نہیں تھا۔“ لاریب کی آنکھیں زدہ سوالیہ نگاہوں کے جواب میں نے جھجک کر وضاحت پیش کی۔ لاریب کا چہرہ متغیر ہوا اور اس میں کئی رنگ بدل گیا۔ البتہ کچھ کبے بغیر اس نے ہونٹ ہونٹے ہوئے ہاتھ بڑھا کر وہ کیس اٹھا لیا۔ فرمانبرداری کے مظاہرے نے سکندر کو سرشار کر ڈالا۔ اسے لاریب سے توقع نہیں تھی۔

”اب جاؤ کوئی آجائے گا۔“ لاریب کے انداز میں بھی ناگواری ہو مگر مصلحتاً لہجہ و انداز متوازن تھا مگر یہی سکندر کے اندر کی دنیا زبرد بر کرنے لگا۔ وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے مدھم سا مسکرایا۔

”کھول کر دیکھو نا لاریب بلکہ مجھے بہن کر دکھا دو گی“ زیادہ اچھا لگے گا۔“ اس نئی فرمائش نے لاریب کا دماغ سٹکا رکھ دیا۔ اس کا دل چاہا سکندر کا تھکا اس کے منہ پر وہ بے بسی اسے دکھا دے کہ یہاں سے نکال دے مگر اسے خود کو قابو میں پڑا سکندر کو طیش دلا کر وہ اپنا ہی نقصان کرتی آئی تھی اب بھی پھر اس وقت تو صورت حال اور بھی نازک تھی۔ سکندر کو پتا نہ رہی تھی تو کیا وہ بھی فراموش کر دیتی نقصان تو طے تھا اسے جسے میں آتا تھا۔

”دیکھو سکندر..... اس وقت یہاں مہمانوں کی آمد ہے کوئی بھی کسی وقت.....“

”یہ تاخیر آپ کی جانب سے ہے لاریب صاحب ایک کام ہے اتنی بے ضرر خواہش ہے میری۔“ وہ اک دم جی جتانے سے باز نہیں آیا کہ وہ اپنی منوائے بغیر وہاں سے جائے گا۔ لاریب نے ہونٹ بجھتے اس کی اندوئی کیفیت کی سرخ ہوتی رنگت سے عباس ہونے لگی کچھ کبے بغیر دباتے اس نے چھوٹا سا نیس کیس کھولا اور بے حد خراب

سے پلٹ گیا۔ لاریب سکتے زدہ سی کھڑی رہ گئی۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے چہرے پر تغیر لگنے لگا وہ گرنے کے انداز میں وہیں کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

.....

عباس نے گہرا کش لیتے ہوئے نگاہ بھر کے بچوں میں مصروف عریشہ کو دیکھا۔ اسامہ کو گویہ میں لٹائے دیا کی جانب دیکھتی وہ جانے کس بات پر مسکرا رہی تھی۔ عباس کتنا چاہتا تھا کہ بچوں کو گورنس سنبھالے مگر عریشہ کو یہ بات پسند ہی نہیں تھی۔

”ہرگز نہیں عباس میں اپنے بچوں کو اپنی توجہ اور محبت سے محروم نہیں کر سکتی۔“

”لیکن اس طرح ہر وقت ان کے ساتھ دن رات جاگ کر تمہاری صحت بہت تیزی سے متاثر ہو رہی ہے۔“ عباس کے ٹوکے پر وہ مسکراتے لگی۔

”اچھا ہے جو اتنی موٹی اور بھدی ہو رہی ہوں تو پھر سے اسارٹ ہو جاؤں گی۔“ اور عباس اسے خفا نظروں سے گھورنے لگا تھا۔ پھر اس کے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی عریشہ نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا تھا۔

”آپ نے اپنی اماں سے بات کی عباس؟“ اسامہ بھی سو گیا تو عریشہ نے اٹھ کر اسے کاٹ میں لٹانے کے بعد عباس کو دیکھا۔ عباس چونکا تھا۔ وہ عریشہ کے اس معاملے میں شدید اصرار کرتا کہ بے بس اور لاچار ہونے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا عریشہ کی یہ خواہش کتنی بڑی ہے۔ بہو کی حیثیت سے اس کی ٹیلی سے اپنا آپ منولنے کی شادی کے شروع دنوں کے اصرار کے بعد جب عباس نے اسے اپنی مجبوری بتلائی تھی تو وقتی طور پر عریشہ خاموش ضرور ہو گئی تھی مگر اب بچوں کی پیدائش کے بعد وہ پھر سے عباس پر دباؤ ڈالنے لگی تھی۔ حویلی رابطہ کر کے بچوں کے متعلق بتا کر صلح کرنے پر زور دے رہی تھی۔ اس کا خیال تھا یہ جھگڑا بھی روایتی جھگڑا ہوگا جو بیٹے کی نسل کی امین بننے والی عورت کو بلاخر قبول کر لے گا۔ مگر عباس صرف خاندانی رویات سے بغاوت ہی نہیں کر چکا تھا بابا جان کی حکم عدولی کر کے ان کی منتخب کردہ لڑکی کو ٹھکرانے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حویلی کے دروازے خود پر بند کر دیا تھا۔

”کس سوچ میں ہیں عباس..... میں پوچھ رہی ہوں کچھ؟“ عریشہ اس کے برابر آئی تھی۔ وہ ہمیشہ سے من مانی کرتی آئی تھی اسے عباس پر مکمل کنٹرول تھا۔ وہ ماتھے پر شکن بھی نہیں

ساتھ سفید پل کے موتیوں سے سجے گولڈ کے بندے ہاتھ پر اٹھا لیے اس کا ذہن منتشر تھا اور دل میں بغاوت و جھنجھلاہٹ کا احساس مدھماتا کرتے کو کافی تھا۔ جسمی اس عدم توجہی کے باعث کیس کھلتے پر معمولی بے احتیاطی کی بدولت ایئر رنگ اس کی گرفت سے چھوٹا اور پھسل کر اس کے اور سکندر کی درمیان کارپٹ پر جا گر۔ اس نے ساکن نظروں سے سرخ کارپٹ پر دیکھتے منہ بندے کو دیکھا اور بغیر کسی تاثر کے اٹھانے کو تھکی۔

اس طرح کھٹکتے پر اس کی پشت پر ترتیب سے پڑے سیاہ مخملیس بالوں کا آبشار یوں اوجھرا پھر پھیل کر کھڑ گیا جیسے کسی نے ریشم کے تھان کو ہولے سے چھو کر اس کی گرہ کو کھول دیا ہو اور وہ ہولے سے اوجھرا چلا گیا۔ سکندر مہوت اور بحر زدہ سا کھڑا تھا۔ پہلے کیا کم قیامت خیز منظر تھا جواب یہ افتادوئی تھی۔ وہ تو پہلے ہی اسیر تھا اس کا ایک عام سا سادہ سا انداز ہی رات کو اس کی نیندیں حرام کیے رکھتا تھا۔ لاریب اس کی کیفیات سے بے خبر اپنے کام میں مگن تھی اس نے اپنے کانوں میں پہلے سے پڑے ڈائمنڈ ٹاپس اٹھائے پھر سکندر کے لائے ہوئے ایئر رنگ بہن لیے دیکھا جاتا تو یہ پڑا مشینی سا عمل تھا۔ جس میں جذبات و احساسات کی ہلکی سی آمیزش نہیں تھی مگر سکندر کی مردانہ انا کو اسے اپنے آگے دیکھ کر کتنی بڑی احقیت کا احساس مل رہا تھا۔

”بہو کی نا تمہاری خواہش پوری؟ اب جاؤ۔“ لاریب کا لہجہ پہلے سے کہیں بڑھ کر سرد تھا۔ سکندر جو دم خود سا کھڑا تھا خفیف اغلا میں چونکا اور جھینپ کر مسکراتا ہوا ہوا تھا۔

”تم کتنی سادہ ہو لاریب کسی مرد کی خواہشات کا دائرہ اتنا محدود نہیں ہوا کرتا۔“ وہ بھی اس مرد کا جو اتفاق سے شوہر بھی ہو گیا تھیں؟“ اس کا لہجہ معنی خیز و معینیت لیے ہوئے تھا لاریب کی ہارنگ بے حسی ساری لائق اس ایک لمحے میں عارت ہو کر رہ گئی تھی اس نے بے حد ہراساں ہو کر اسے دیکھا۔

”ک..... کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہے ہو؟“ اس کی صبر لہٹ دیکھا ہٹ کا حاکم بھی قابل دید تھا۔ جس نے اسے مزید حسین جبکہ سکندر کو اس قدر بے بس کر ڈالا۔

”اگر مطلب کی تفصیلات سے آگاہ کرو یا جیسے صاحبہ تو فوری امید ہے آپ جب نہیں لاپائیں گی۔ اس کام کو کسی مناسب وقت سے لے کر رکھتا ہوں فی الحال تو بس اتنا جان لیں کہ آپ کی برہمچری میرے لیے قیامت سے کیا کم ہوگی چلتا ہوں۔“ وہ جھنجھکتے لہجے میں جلتا کر کہتا اس کا کال ٹپک کر آہستہ



لاپاتی تھی کہ عباس اس کی منشا کے مطابق کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا کرتا تھا مگر یہ معاملہ ایسا تھا کہ اسے عباس کی خاموشی گراں گزرنے لگی تھی۔

”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے یا رتایا تو تھا تمہیں۔“ عباس کا لہجہ ہم تھا۔ کسی حد تک شکستہ یہ منسلکی رشتوں کے چھوٹنے کی نہیں تھی وہ اس خیال سے مضطرب ہوتا تھا کہ عریشہ کی خواہش وہ پوری کرنے سے قاصر تھا۔

”تم آنٹی کو بلو لو ناں کچھ دنوں کو تمہارا دل بہل جائے گا۔“ عباس نے دانستہ اس کا دھیان دینا چاہا عریشہ اپنے کسی خیال سے چونکی پھر سر جھٹک کر رہ گئی۔

”آپ کیوں نہیں سمجھتے ہیں عباس ہر شے کی اپنی اہمیت ہوا کرتی ہے میری ماں بھی آپ کی ماں کی جگہ نہیں لے سکتی آپ لوگ دو ہی بھائی تھے اس طرح جاگیروں میں آپ کا حصہ بھی گیا آپ کو یہ قدم اٹھاتے ہوئے کم از کم سوچنا تو چاہیے تھا۔ ہمارے بچوں کا بھی حق غصب ہوا ہے آپ کے ساتھ ساتھ۔“ عریشہ کے انداز میں صرف ناگواری نہیں تھی برہمنی دینی کا تاثر بھی تھا۔ عباس تو حیران رہ گیا تھا گویا۔

”تمہیں بچوں کی فکر کیوں ہے عریشہ؟ میرے پاس تمہیں کس چیز کی کمی محسوس ہوئی بھلا؟ الحمد للہ میں اپنے بچوں کو بہترین معیار زندگی فراہم کر سکتا ہوں تم بتاؤ تمہیں اپنی زندگی میں کمی لگتی ہے کوئی؟“ عباس نے نرمی و محبت سے کہتے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ عریشہ کو خود کو سنبھالنا پڑا تھا۔ اس نے غمی و غصے پر یاسیت کا لبادہ ڈال دیا۔

”اس سے بڑی کمی کیا ہوگی عباس؟ کم آپ کے خاندان میں مجھے بہو کی حیثیت نہیں ملی۔ سسرال کے چاؤ عورت کا کتنا مان بڑھاتے ہیں آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہوگا۔“ عباس اس کی چالاکی کو سمجھے بغیر اس کی ظاہری یاسیت کو محسوس کرتا بے چین ہونے لگا۔ عریشہ صرف اس کی محبت نہیں تھی وہ اس کے لیے رگ جاں کی حیثیت رکھتی تھی اس کی ذرا سی تکلیف کا احساس بھی سانس روکنے لگتا تھا۔ جیسی وہ ایک دم فیصلہ کر گیا تھا۔

”ٹھیک ہے تم پریشان نہیں ہو میں اماں جان اور بابا جان سے رابطہ کرنے اور انہیں منانے کی کوشش کروں گا۔“

”جی.....؟“ عریشہ نے غیر یقینی میں گھر کر اسے دیکھا پھر بے ساختہ خوشی اس کے چہرے پر چھلکے لگی۔

”ہوں..... مجھے تم سے بڑھ کر کچھ عزیز نہیں ہے عریشہ۔“

اپنی اتانہ ہی اپنی ضد حالانکہ تب میں نے سوچ لیا تھا پلٹ کر نہیں دیکھوں گا بلکہ اگر زندگی میں کبھی ایسا موقع آیا کہ مجھے گیا تو بھی اس پکار پر کان نہیں دھروں گا۔ لیکن تمہاری خوش خاطر میں خود جھک جاؤں گا۔“ عریشہ نے جولبا مسکراتے ہوئے اس کے گلے میں بازو جھانک لیے اور اس کے ساتھ لگ کر بیڑی اسے مقصد نکالنا آتا تھا جیسی وہ آج عباس حیدر کی بیوی کی تھی۔ ورنہ اس میں ایسا کچھ بھی غیر معمولی نہیں تھا کہ وہ اپنی ترین مہمیت کو چھوڑ کر اسے اپنا لیتا۔ اصل بات یاور کی ہوتی۔ یاور اس کی اداؤں میں تھی اس کی قسمت میں تھی اور اندازہ میں تھی جو جکڑ لیتا تھا اور پلٹے نہیں دیتا تھا۔

عباس حیدر کا فون تسلسل سے واہیرٹ کرنے لگا۔ عباس نے چونک کر سیل فون کی جانب نگاہ کی۔ اس کے بیکر کا فون تھا اور وہ بلا ضرورت کبھی کال نہیں کرتا تھا۔ ”السلام علیکم سزا! آپ نے اس سے بات کی جسے آپ بطور ہیروئن پسند کیا ہے؟ یوں سو ہمارا کام اسی وجہ سے ہے جیسے ہی یہ اوکے ہوتا ہے ہم سہرل کا آغاز کریں گے یہ تاخیر مزید مناسب نہیں ہے۔ یوں سو زیادہ شارٹس سنوڈز کے ہیں اور موسم سرما اختتام پذیر ہونے کو ہے۔“ عاصم صدار کی یہی خراب عادت تھی کہ وہ بہت تفصیلی بات کرتے تھے اس ساری تفصیل کا خود عباس کو بھی علم تھا مگر عاصم نے اصرار کر شاید اس پر اس کی کوتاہی واضح کرنا چاہی تھی۔

”اچھا کیا عاصم آپ نے یاد دلایا یہ واقعی بہت اہم ہے۔ میں ابھی بات کرتا ہوں ان محترمہ سے۔ مگر.....“ وہ ان سے ان کا نام نہ ہو چکا ہے۔ ”وہ یوں خاموش ہوا جیسے پروردگار کی یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”نندنی..... نندنی گریو ال سر۔ وہ انڈین ہیں اوتا۔“ کہا تھا آپ ان کا نمبر بھی لے چکے ہیں۔“ عاصم صاحب سرعت سے پھر اس کی رہنمائی کی عباس بے ساختہ ان کا ہوا تھا اور الوداعی کلمات ادا کرنے کے بعد کال ڈراپ کر دی۔ سرج کر کے اس نے نندنی کا نمبر ڈائل کیا دوسری منٹ جاری تھی۔ پہلی سے دوسری منٹ پھر تیسری اس کے بعد ریسو کر لی گئی۔ دوسری جانب ہنوز سناٹا تھا سوائے سانس سربراہٹ کے۔

”نندنی گریو ال اسپیکنگ؟“ عباس کا لہجہ سوالیہ تھا۔ اسے بہت دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ عباس اس کی

”جی..... جی.....“ عباس نے ایک بولکھائی ہوئی مگر بے حد محکم دلاؤ دینی تو اسے وہ چاندنی میں نہایا دلکش پیکر رکھنے والی غیر معمولی حسن کی مالک لڑکی کا شپٹایا ہوا انداز یاد آنے لگا۔ میں سحر ہوں کنسرٹ میں ملاقات ہوئی تھی آپ سے۔“ عباس نے یوں توقف کیا جیسے دوسری جانب سے روک لگا تھا۔

”کیا نکل مجھے یاد ہے اور آپ نے کہا تھا میں پھر رابطہ کروں گا تو یہ ہے کہ میں خطر تھی۔“ لب کی مرتبہ اس کے لہجے میں خوشی کھٹک بھی تھی اور اعتماد بھی۔ عباس کو اس درجہ حوصلہ افزا دیا کہ اس نے ایک گونہ سکون دیا تھا۔

”نندنی کی بات ہے اس طرح دیکھنے کا مطلب جانتی ہیں؟“ اس کا انداز بے حد شیر تھا۔

”یہ نندنی گریو ال کون ہے جس سے ڈیٹ ملے ہو رہی ہے وہ بھی میرے سامنے۔“ عریشہ نے اس کا سوال نظر انداز کر کے اپنی بات باہر نکال۔ عباس ہنستے ہوئے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

”نندنی..... نندنی گریو ال سر۔ وہ انڈین ہیں اوتا۔“ کہا تھا آپ ان کا نمبر بھی لے چکے ہیں۔“ عاصم صاحب سرعت سے پھر اس کی رہنمائی کی عباس بے ساختہ ان کا ہوا تھا اور الوداعی کلمات ادا کرنے کے بعد کال ڈراپ کر دی۔ سرج کر کے اس نے نندنی کا نمبر ڈائل کیا دوسری منٹ جاری تھی۔ پہلی سے دوسری منٹ پھر تیسری اس کے بعد ریسو کر لی گئی۔ دوسری جانب ہنوز سناٹا تھا سوائے سانس سربراہٹ کے۔

”نندنی گریو ال اسپیکنگ؟“ عباس کا لہجہ سوالیہ تھا۔ اسے بہت دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ عباس اس کی

عامانہ طور سٹی لگے تھے۔ انداز اس سے بھی زیادہ ناگوار محسوس ہوا۔ مگر وہ عریشہ تھی جس کی بڑی سے بڑی بات بھی وہ سہنے کا حوصلہ رکھتا تھا کہ کسی حد تک اس کی فطرت سے آگاہ ہو چکا تھا مگر محبت کے آگے اس کی خامیوں کو نظر انداز کرنا آسان تھا عریشہ کی انتہا دے جی محبت نے اسے اپنی ظریفی عطا کی تھی۔

”حسین تو وہ بہت ہے نوڈ اوٹ.....“ بٹ عریشہ میں نے اسے اپنی فلم کے لیے سلیکٹ کیا ہے۔ گھائل تو میں تمہارے حسن سے ہوا ہوں۔“ وہ روٹھ گیا۔ وہ رولنگ ہونے لگا مگر عریشہ کا موڈ بگڑا ہی رہا تھا۔

”کب ملیں گے اس سے آپ؟ میں بھی تب آپ کے ساتھ چلوں گی عباس آپ کو پتہ ہے نا مجھے کتنا برا لگتا ہے آپ کا کسی اور لڑکی سے ملنا۔“ عریشہ روہا ہنسی ہونے لگی۔ عباس بے بسی سے اسے تنہ لگا۔

”یہ میری فیلڈ کا حصہ ہے عریشہ میں ہرگز کسی سے متاثر نہیں ہوا کرتا۔ محبت ہمیں زندگی میں صرف ایک بار ہوتی ہے اور وہ تم سے کر چکا ہوں۔ اگر میں حسن پرست ہوتا تو لاریب کو چھوڑ کر کبھی تمہارے پاس نہیں آتا اتنی ہی حسین تھی وہ۔“ عباس کے لہجے میں خفیف سی سہمی مگر جھنجھلاہٹ اتر آئی تھی۔ عریشہ ساکن ہو کر رہ گئی۔

”کون لاریب..... آپ کے چچا کی بیٹی؟“ اس نے ہونٹ سکڑ لیے اس کے انداز میں حد درجہ تعارت تھی۔

”ہاں اور میری فیائسی بھی تھی وہ۔ عریشہ تم اس قسم کی پریشانیاں کیوں پالتی ہو؟ میں صرف تمہارا ہوں اور یقین رکھو صرف تمہارا ہوں گا ہمیشہ۔“ اس کا ہاتھ پکڑ کر عباس نے اسے جذب سے کہا تھا کہ عریشہ کی بدگمانی ختم ہونے لگی۔

”چاہے سہمی آپ کے ساتھ نہ رہوں تب بھی؟“ وہ جھینپ کر مسکراتے لگی۔ عباس آہستہ سے ہنس دیا۔

”ہاں تب بھی جب میں شوٹ پر ہوتا ہوں تب تو خاص طور پر اتنی حسین طرح دار لڑکیاں ہوتی ہیں میرے بارگرو اور تم میرے سامنے بھی نہیں ہوتیں عریشہ میں پھر بھی تمہیں سوچتا ہوں۔“

”بددیانتی کی میرے نزدیک محبت میں گنجائش نہیں نکلتی اوکے۔“ اس نے بے حد خوب صورت انداز میں کہتے اپنا کانداھا اس کے کانڈے سے ٹکرایا تو عریشہ ہلکی ہلکی ہو کر ہنس پڑی۔

اس نے خود پر ہنس کی پھول برسائی لوٹا سینے میں دکھائی



دیتے اپنے عکس کو دیکھ کر تفریح بھرے انداز میں مسکرا دی۔  
(مجھے تو کبھی اپنی خوب صورتی اور دلکشی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ جیسی اسے اہمیت دینے سے سنوارنے اور نکھارنے کا خیال ہی نہ آ سکا۔ تمہاری نگاہوں نے مجھے سراپا تو مجھے اندازہ ہوا میرے لیے کتنا اہم اور کس درجہ ضروری ہے اگر میں اتنی حسین نہ ہوتی تو تمہاری نظر اس انداز میں مجھ پر پڑتی نہ تم از خود چل کر میرے پاس آتے)

اس نے بلیک پیروں تک آتا لباس پہنا تھا۔ جس کے گلے پر بہت اسٹائلش کام بنا ہوا تھا۔ دوپٹے کا بس ایک ٹکلف برتا گیا تھا۔ اس نے جی جان سے تیاری کی تھی ایسے کہ ساحر اسے دیکھتا تو بس اس کے وجود کی سحر انگیزوں میں گم ہو جاتا۔ اس کے دو دھیا جگمگاتے بازو اس لباس میں ایسے دک رہے تھے جیسے سیاہ رات میں موی شمعیں روشن ہو کر روشنی پکھیرتی ہیں۔ راج اس جیسی لمبی گردن میں بیش قیمت نیپکس تھا جس نے اس کی صراحی وار گردن کی خوب صورتی کو اور بھی اجاگر کر دیا تھا۔ کانوں میں پرل کے ٹاپس تھے۔ پیروں میں اتنی نازک پازرب تھی کہ جس کی جھٹکار نہ ہونے کے برابر تھی۔ غرض اس نے سر کے بالوں سے لے کر پیروں کے ناخنوں تک خود کو سنوارا اور اجاگر کیا تھا۔

زینب جو اپنے دھیان میں اندھا تھی اس کی یہ تیاری دیکھ کر ٹھٹکتے ہوئے اس کے حسین جلوے کی جگلیوں کے آگے دم بخود رہ گئی۔

”کیسی لگ رہی ہوں میں زینب؟“ وہ بہت ترنگ میں اس کے سامنے ایزیوں کے بل کھوی اور بے حد زعم سے مسکرائی۔ گویا اپنی سحر انگیزی و دلکشی پر فخر کر رہی ہو۔ جیسے جو اسے دیکھے گا تاب نہیں لائے گا۔ خاص طور پر ساحر اتنا ہی اعتماد آتا تھا اس کے اند۔ ساحر کی پیش رفت پر اس کی اہمیت پر۔

”بہت پیاری ماشاء اللہ تم ویسے ہی اتنی حسین ہو کہ تمہیں اس آرائش کی ضرورت نہیں۔ اس وقت تو میرے پاس الفاظ نہیں کہیں جا رہی ہو کیا؟“ زینب کے لہجے میں محبت بھی تھی اور خلوص بھی۔ نندی سرشار سے انداز میں ہنسنے لگی۔

”جی ساحر سے ملنے انہوں نے خود بلوایا ہے مجھے بات کرنے کے لیے۔“ زینب کے چہرے پر لڈتے تذبذب کے آثار کو دیکھتے اس نے بالخصوص جتلا یا اور یہ جتلاتے اس کا سراں کی گردن بہت تفریح بھرے انداز میں اٹھ گئی تھی۔

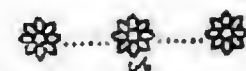
”اکیلی جاؤ گی؟ یہ.....“

”جی اکیلی..... مجھے ساحر سے ملنے تو اس وقت اکیلی رہنا ہی کا کام تھا ساتھ میں مہرون چولی جس کے گلے کے چاہیے۔“ زینب کو قدرے گم صمم اور خاموش محسوس کر کے نندی نے نخت بھرے انداز میں جتلا یا۔ جب سے ساحر والا موقع سے پھیلا کر شانوں پر سیٹ کر لیا تھا۔ مگر اس طرح لہنگ شروع ہوا تھا زینب اور نندی کے بیچ ایک ان دیکھا فاصلہ اور ساتھ دوپٹے کے پلو بھی زمین پر آ رہے تھے اور اس کے مہری خود بخود جگہ پانے لگی تھی اور یہ نندی کی وجہ سے ہی تھی۔ وہ اب بھی اس کی جھنجھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس پہل بھی اس کا گریز اور احتیاط کا واس نہیں تھا ماننا چاہتی تھی۔ زینب کنز پر ابھی تھا کہ وہ ہری طرح ڈرگائی۔

تھی وہ نہیں تھی سب سے بڑھ کر یہ کہ قسمت نے اس کا در کھنکڑا دیا۔ رے دھیان سے جناب۔“ وہ اپنے خیالوں تھا کہ کیوں خود کو محتاط اور محدود کر کے اس دستک پر دروازہ نہ کھولیں اتنی گم تھی یا پھر دوپٹے کا ہی کوئی دوش تھا کہ میڑھیوں کے موڑ زینب اس کی اس درجہ آرائش کے بعد تمہا ساحر سے ملنے کی بارگاہی کرتے تھی اس سمت آتے سکندر نے بروقت سنبھال کر بے چین تھی مگر نندی اس احتیاط کو سمجھنے بغیر من مانی پر اڑا دیا۔ وہ لگا تھا جیسے ایسے ہی کسی موقع کا منتظر تھا۔

”جلدی آ جانا نندی آج میرا ارادہ تھا تمہیں جامدہ جانے کا اپنے ساتھ تم کہہ رہی تھیں نا مسلم ہونا چاہتی ہو۔“ خیر پھر سہی۔ بیسٹ آف لک ٹی امان اللہ۔“ زینب نے رسا نرمی سے کہا اور بات ختم کر دی۔ نندی نے بھی کاندھے جھٹک دیئے۔ وہ دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔

نظاہر مخالف اور مختلف راستوں پر چلنے کے لیے مگر مختلف راستے کسی ایک منزل کی جانب لے جانے والے تھے۔ کون جاننا نہیں کہ کس کے حصے میں ہدایت آتی تھی یا پھر کس نے ہدایت سے موڑ لینا تھا۔



وہ تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلی اور اپری منزل پر جانے غرض سے میڑھیوں کی جانب آ گئی۔ ایک ایک میڑھی اس سے چڑھتے بھی اس کا لہنگا بار بار اس کے پیروں تلخا جاتا۔ وہ جھنجھلا سی گئی۔ یہ لباس اسے ہرگز پسند نہیں تھا نہ وہ پہننا چاہتی تھی مگر صرف امامہ کا دل رکھنے کی خاطر اسے پہننا پڑا تھا۔ امامہ کی فرمائش پر اس نے منع کیا کیسے لمحوں میں اس کا چہرہ نہ گیا تھا۔

”آپ پر بہت سوٹ کرتا ہے بھو! میری شادی میری ایک بات تو ماننی چاہیے۔ پھر یہ نہیں نصیب میں کہ ہو۔“ ان دنوں وہ بات بات پر جذباتی ہو رہی تھی۔ وہ الگ دکانے کا گناہ نہیں کرتا چاہتی تھی۔ جیسی مزاج اور پسند کے یہ لباس پہن لیا تھا۔ جھلملاتا ہوا شوخ پیلے زرد کلر کا لباس جس پر

سامنے جا کھڑی ہوگی اور کہوگی اسے قبول کر لیں بطور داماد۔“ وہ انس رہا تھا۔ مگر لاریب تضحیک اور ہنسی کے احساس سے بھی پارہ پارہ ہوتی چلی گئی۔

”مزار بنے گا تمہاری ساری وہابیات حسرتوں کا سن لو تم میں تمہیں کبھی کسی مجبوری میں بھی قبول نہیں کروں گی یہ طے شدہ امر ہے نہ تم کبھی میرے قابل تھے نہ بن سکتے ہو۔ وقت مانتے کا مطلب عزت اور سکون سے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا ہے۔ جو ماننا چاہتے ہوئے بھی آپڑی ہیں مجھ پر اس کے بعد میں خود کو تمہارے حوالے کرنے کی بجائے خود کشی کر لوں گی۔“ کتنا شفر اور اشتعال تھا اس کے لہجے میں کہ سکندر کا ہنستا مسکراتا خوش باش چہرہ اچھا سا گیا۔ جبکہ لاریب اسی نفرت اسی طیش زدگی کے عالم میں اسے سامنے سے دھکیلتی باقی ماندہ سر دھیاں پھلانگ گئی۔ اوپر آئی تو اس کا سانس پھول رہا تھا۔ امامہ اسے میڑھیوں کے اختتام پر دینگ کے ساتھ لگی کھڑی نظر آئی۔

”تیار ہو گئیں تم؟ اچھا کیا نام بھی بہت ہو گیا ہے۔ آؤ نیچے سب رسم کے لیے تمہارے منتظر ہیں۔“ گو کہ وہ خود کو کسی حد تک سنبھال چکی تھی۔ اس کے باوجود اس کی آواز بے حد بوجھل ہو رہی تھی۔ رسم کا انتظام لان میں تھا اس وقت کبھی مہمان وہیں جمع تھے۔ جیسی سکندر کو کبھی کھل کر اس برحق جتلانے کا موقع میسر آ گیا تھا۔

”بجواب بہت پیاری لگ رہی ہیں۔“ امامہ نے مسکرا کر اس کا یہ انوکھا اور دلربا رویہ دیکھا تھا۔

”پیاری تو تم لگ رہی ہو گڑیا! بالکل اتار کلی کی طرح۔ لاریب کا دل پھر سے بھرا یا تو اسے گلے لگا لیا۔

”بجواب صرف ہم دونوں ہیں باجو پتہ نہیں.....“ لاریب نے کچھ کہے بنا اس کی جانب دھی نظروں سے دیکھا تھا۔ امامہ کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔

”بابا جان کو چاہیے تھا وہ جا جو کی بات مان لیتے۔ انہیں دلہن بنا کر خود رخصت کر دیتے۔ اس طرح وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے نہ چھینتیں..... ہے نا بجو؟“ امامہ کو تو جیسے رونے کا بہانہ چاہیے تھا۔ لاریب کا جیسے دل پھٹنے کے قریب جا پہنچا۔ کچھ کہے بنا اس نے امامہ کو گلے لگا کر تھپکا تھا۔

”سوری میں نے تو آپ کو بھی افسردہ کر ڈالا بھو! کیا آپ میڑھیوں سے آتے ہوئے گر گئی تھیں؟“ امامہ نے اس کی یاسیت کو محسوس کیا تو خود کو سنبھالتے ہوئے بات بدل دی۔

”نہیں بچ گئی کرتے کرتے۔ اسی لیے تو یہ لباس نہیں پہننا



چاہ رہی تھی۔ "لاریب کے منہ مٹانے پر اس نے شرارت چھلکائی نظروں سے سانس دیکھا تھا۔

"اب پہن لیا ہے تو میں سکندر بھائی کو آپ کا گارڈ مقرر کیے دیتی ہوں۔ ٹھیک ہے؟" لاریب نے بری طرح چوسکتے ہوئے امامہ کے شریر چہرے اور شوخ آنکھوں کو دیکھا اور جیسے اس کا ماتھا ٹھنکا۔

"کیا مطلب..... میں سمجھی نہیں؟" اس کی تیوری چڑھی۔ دل میں عجیب سے انداز میں پکڑ دھکڑ ہونے لگی۔ اگر دل میں چور ہو تو انسان معمولی اور بے حد عام باتوں پر بھی ٹھنک کر ان کی معنی خیزیت کو جانچنا رکھنا شروع کر دیتا ہے۔

"افوہ بھئی! آپ گری نہیں تو آپ کو پکڑا تو سکندر بھائی نے ہی تھا ناں؟ ویسے جو ایک بات ہے۔ سکندر بھائی آپ کے اتنے نزدیک کھڑے ہو کر مجھے اور بھی زیادہ اچھے لگے۔ آپ جتنی فیئر نازک اور دلکش ہیں نا وہ اسی قدر وجہہ اسٹرائنگ اور شاندار ہیں۔ آپ کا کپل بہت پرفیکٹ ہوگا اگر بابا جان آپ کی شادی سکندر بھائی....."

"امامہ..... جسٹ شٹ اپ اوکے..... خبردار جو تم نے یہ فضول بات سوچی بھی۔" وہ اتنی مستعل ہوئی تھی کہ کسی طرح بھی خود کو امامہ پر چبھنے سے نہیں روک سکی۔ امامہ کا رنگ اڑ سا گیا۔ وہ یوں ہونٹ پیچھے کھڑی تھی جیسے آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں ہلکان ہو اس کے باوجود بھی ٹپ ٹپ آنسو برس پڑے تھے۔

"آئی ایم ساری امامہ! مگر تم نے بات ہی لکی کی کہ..... مجھے بتاؤ تمہیں ایک یہی فضول آدی ملا تھا میرے متعلق سوچنے کے لیے۔ عباس حیدر کا اور اس کا کیا مقابلہ بھلا؟" ہزار ہاضب کے باوجود لاریب کے چہرے پر انداز میں حقارت سمٹ آئی۔ امامہ کی نظر آنے لگی۔

کو میری بات اچھی نہیں لگی تو....."

"افوہ..... اس لو کے امامہ مان لیا تمہارے بھائی ہیں۔" لاریب نے جھلاتے ہوئے کہا۔ امامہ بے ہوشانہ مسکراتے لگی۔

"صرف ٹاس نہیں ہینڈ سم بھی اچھے خاصے ہیں۔ بھائی کے بھلے پاسنگ بھی نہ ہوں مگر ہمیں عباس صاحب لینا دینا کیا ہے اب؟ ہمیں تو سکندر بھائی اچھے لگتے ہیں امامہ کے ساتھ تو....."

"اچھا بس زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے سب نیچے انتظار کر رہے ہیں۔" لاریب نے اسے ٹوک دیا اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گئی۔ امامہ مسکراتے لگی تھی۔ لاریب کے دل میں تیر سا پیوست ہو چکا تھا۔ اس کا عباس سکندر کو ترجیح دینا اچھا نہیں لگا تھا۔

(ساری دنیا بھی تم پر سکندر کو ترجیح دے دے گی عباس! تب بھی اسے قبول نہیں کر سکتی وہ کبھی تمہارا غم البدل نہیں کبھی نہیں) اس کی سوچیں شدت لیے ہوئے تھیں۔

.....

وہ بہت مہنگا اور شاندار ہوٹل تھا۔ پرسکون رومینک مہنگی ہوئی فضا سب کچھ قابل ستائش تھا مگر نندنی کا ہرگز رتنے لمحے کے ساتھ بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ اسے ٹائم دے بلانے کے باوجود ساحر خود ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ حالانکہ یہاں انتظار کرتے ایک گھنٹے سے زیادہ ٹائم ہونے لگا تھا۔ کادل بھڑانے لگا۔ ساری انگلیں سارے خواب جیسے بولیاں یاسیت کے ساتھ مایوسی کا پیرا ہن اوڑھ رہے تھیں۔

اس نے ٹیبل پر رکھی اپنی کلائی پر کہنی کے مقام پر جسے تھک کر سر رکھا اسی بل عباس حیدر نے گلاس ڈور کے باہر کمرے باہر دی گارڈ کے دروازہ کھولنے پر قدم اندر رکھا۔ نندنی کو اس اندر داخل ہونے کے بعد ہی مخصوص ٹیبل پر بیٹھ دیکھ لیا تھا۔ وہ سیدھا اسی جانب آیا اور کرسی پیچھے کر بیٹھنے سے قبل دانت کھینچ کر نندنی پر دانستہ نگاہ ڈالے بنا وہ اپنی سمت آ جانے والے جانب متوجہ ہو گیا۔ اپنے لیے فریش اپیل جوس آرڈر کرنے نے بہت پرسکون مگر سوالیہ انداز میں اپنی پرسش آنکھیں کھینچ کر سمت اٹھایا جو اسے رو بہ پا کے اتنی کنفیوز ہو چکی تھی کہ نظروں کا مقبوم سمجھ لینے کے باوجود کچھ کہنے سے قاصر رہا۔ "چلیں آپ ان کے لیے بھی اپیل جوس لے لیں۔"

پاپے ہر آپ کو محنت دے لیں مگر۔" عباس نے شائستگی سے اپنے دیر کھانے کیا۔ پھر کرسی سنبھال کر بیٹھنے کے بعد بھی اس کی ہر طرف دانت تاخیر سے متوجہ ہوا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اسے دیکھ کر دل کرنے کا موقع فراہم کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ اچھی طرح آگاہ تھا کہ اس کے رویہ کے اسی رعب حسن کی بدولت اپنا فطری بھائی کے بھلے پاسنگ بھی نہ ہوں مگر ہمیں عباس صاحب لینا دینا کیا ہے اب؟ ہمیں تو سکندر بھائی اچھے لگتے ہیں امامہ کے ساتھ تو.....

"نندنی مس! آپ کو انتظار کی محنت اٹھانا پڑی۔" اچھوٹی لنگلا ٹونے پر بری تھا مگر راستے میں ٹریفک جام ہونے کے باعث تاخیر ہوئی۔ بٹ ایسی ہاؤ کیسی ہیں آپ؟" اس نے اپنے مخصوص بے نیاز مگر متاثر کن انداز میں کہا۔

"نندنی..... جی..... میں ٹھیک ہوں۔" اس نے ہاتھ مسلے اور اپنی آنکھیں عادت کے مطابق جھکا لیں۔ شاید اس طرح اس کا کچھ نہ بھال ہو جاتا۔

"آپ مجھے کیوں بلوایا ہے؟ میں یہی سوچ رہی تھی۔" نندنی نے اس سوال پر عباس نے جوس کا گلاس اٹھا کر بہت سلیقے سے لپکے کھیت لینے کے بعد اسے دیکھا۔ میز پر چلتی ہوئی کینڈل کی ٹھمری لو کے پار اس نیم تاریک خوابناک ماحول میں اس کی جیسے کوئی پرستان کی پری لگ رہی تھی۔

"آپ جانتی تو ہوں گی میرا تعارف میں آج کل ایک نئی فلم ہونے لگا ہے۔ وہاں اس کی کاسٹ کے لیے مجھے نئے چہروں کی تلاش کی۔ ہیر وہم سلیکٹ کر چکے تھے ہیر وہم کے لیے مجھے آپ کی فوٹو لکس۔ آئی ایم شیور کتاب کام کرنا پسند کریں گی ہمارے ساتھ۔" نندنی حواس باختہ بیٹھی رہ گئی عباس نے جتنی آسانی اور محنت سے اپنی بات کہی تھی اسے اتنی ہی دشواری سے سمجھا آئی۔

اس کے لیے جتنا آسان تھا یہ کہنا اس کے لیے اس بات کو قبول کرنا کہ اس کی زندگی بھر وہ ان کیلئے اسے بونہی لگا تھا اسے کسی کیلئے اسے اٹھا کر زمین پر پڑھ دیا ہو اس شخص کے نزدیک یہ تھا اس کی حیثیت اس کی اہمیت اس نے کتنے زعم سے سارا کر دیا ہے حسن کو سدا تھا۔ ہل کر یڈ ٹو اب بھی حسن کو تھا کیا تھا سب سے زیادہ انسان محبت میں ہی دھوکے کھاتا ہے۔

حال ہی میں جڑواں بچے ہوئے تھے۔ بیٹا اسامہ بیٹی دبا۔ اس کی بیوی کا نام عریض تھا اور وہ اپنی بیوی کو کبھی میڈیا کے سامنے نہیں لایا تھا۔ وہ جاگیر دار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اندر سے ڈیرا ہی تھا۔ غیرت مند اور پوزیٹو ایسا مشرقی مرد جو اپنی بیویوں اپنی عورتوں کے لیے بے حد کڑھوتے ہیں۔ وہ جانتی تھی مگر وہ پھر بھی جانے کس خوش فہمی کا شکار ہو گئی تھی۔

انتاسب کچھ جان لینے کے باوجود محض اپنے حسن کے زعم میں جلا ہو کر چلی آئی تھی۔ اس خیال کے ساتھ کہ وہ اسے جیت لے گی۔ عباس اس سے شادی کر لے گا۔ تف ہی تو ہوا تھا اسے اپنی سوچ پر۔ کیا ہر مرد ہر امریری غیرتی عورت کو بنا سوچے سمجھے اپنے دل میں اپنے گھر میں جگہ دے دیا کرتا ہے۔ ہرگز نہیں.....

اس کے چہرے پر کچھ ایسا اجازت بن اور وحشت بھی کہ عباس حیران پریشان سا رہ گیا۔ جیسی اس نے اپنے انداز میں اسے سلی دینی چاہی تھی۔ اس خیال کے مطابق جو وہ قیاس کر رہا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں ہمارا کام بہت صاف ستر ہوتا ہے۔ آپ کا چہرہ غیر معمولی طور پر حسین اور سحر انگیزی کی حد تک معصوم اور نوخیز ہے ہماری ہیر وہم کی بیٹی ڈیمانڈ ہیں جن پر کم از کم انڈسٹری کی کوئی ایکٹریس پوری نہیں اترتی تھی۔ آپ کو دیکھ کر میں آپ سے ریکوریسٹ کیے بغیر نہیں رہ سکا لیکن اگر آپ نے مائنڈ کیا ہے تو پھر بھول جائیں کہ میں نے ایسا کچھ کہا بھی ہے آپ سے۔" وہ اسے ہرٹ ہوتا محسوس کر چکا تھا جیسی بے حد نرمی سے کہہ رہا تھا۔ نندنی نے نمناک آنکھوں کو اٹھا کر لمحہ بھر کو اسے دیکھا اور پھر سے پلکیں جھکاتے ہوئے ہونٹ پیچھے کے تمام آنسو اندر اتار لیے۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہیے۔" کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے اس نے مدھم دواز میں کہا۔ عباس جو بے حد اچھن و حیرت میں مبتلا اسے دیکھ رہا تھا پہلی بار کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ شاید یہ ہمدردی کا ایک احساس تھا کہ وہ خود بھی اس کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"لو کے..... ایز پوڈش آئیے میں ڈراپ کر دوں آپ کو۔" نندنی کو بھلا کہاں یہ توقع تھی اس نے یکدم چوسکتے ہوئے اسے دیکھا مگر آنکھوں میں دھندلاتی اتری ہوئی تھی کہ اس کا وجہ یہ سہرا اس کی نظروں میں دھندلایا ہوا نظر آنے لگا۔

"تو مہنگس! میں خود چلی جاؤں گی۔" اس نے ہاشکل جواب دیا اور قدم بڑھا دیے۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ تمام پاکستانی ڈاٹ کام کے پیشکش کیلئے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ام ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پڑھو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ویڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے
- ✧ کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف
- ✧ سائٹوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، مارل کوالٹی، سپر سڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✧ ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فرمی لنکس، لنکس کو میسج کرنے
- ✧ کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

➔ واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

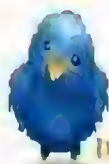
اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

آنے اور چائے پینے کی آفر بہت اپنائیت سے دی تھی۔  
نے تب اسے قدرے دھیان سے دیکھا اور سر کوٹھنی میں  
دستی۔

”سوری مجھے کسی کام سے جانا ہے اس لیے رک نہیں  
کیا اب آپ خود کو بہتر محسوس کر رہی ہیں؟“ دوسرا اور آخری  
اس نے جیسے رسماً مروت بھانے کو کیا تھا۔ مروت کا کسی  
سہی مگر تعلق تو تھا۔ نندی بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔  
”جی اب میں بہتر ہوں۔ آپ کا شکریہ اور اب نہیں تو  
پھر جب مجھ سے ملیں گے تو لازمی چائے پیس گے۔“ اور  
اس بات پر چونک اٹھا تھا۔

”پھر.....؟“ اس کا انداز سوالیہ و استغہابی تھا۔  
”آف کورس پھر..... اگر میں آپ کی آفر کو نہیں کر  
لازماً ہم دوبارہ ملیں گے۔“ نندی کے مسکرا کر دیئے جو  
عباس کے سر سے جیسے کوئی بوجھ اتار دیا۔ یہ حقیقت تھی کہ  
کی خاموشی کو اس کا انکار سمجھتے ہوئے وہ خاصا پریشان ہو چکا  
”لوہ..... سہیلی امیزنگ۔ میں تو سمجھا آپ واقعی انکار  
کی مجھے ٹھنکس آلاٹ۔“ وہ بہت صاف گوئی سے کہہ  
نندی سر جھکائے کھڑی رہی۔ اس طویل اور بے مکلی سی۔  
انکار کرتی میں ساحر صاحب؟ ہماری تمنا ہماری آقا ہوتی ہے  
جتنا زور آور ہو غلام کو اتنا ہی تابعدار ہونا پڑتا ہے۔ ورنہ میں  
اتنی بے بس لاچار نہ ہوتی۔ نہ اس تھوڑے پر راضی بارضا ہوتی  
اس کے سوا چارہ نہیں ہے محبت میں دل تو بڑا کرنا پڑتا ہے۔  
(جاری)

”کلف مت کریں مس نندی! آپ کی طبیعت مجھے  
بالکل ٹھیک نہیں لگتی، اگر آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ آپ کے اس  
معمولی سے کام سے مجھے زحمت ہوگی تو یہ خیال بہت غلط ہے  
آپ کا۔“ عباس حیدر لمبے ڈگ بھرتا اس کے مقابل آ کر اتنے  
رسان اتنے وقار سے بولا تھا کہ نندی انکار کرنے کی ہمت نہیں  
کر سکی۔ اس نے اسی پہل جانا تھا وہ شخص اتنا باور فل ہے کہ نندی  
جیسی اس کی محبت میں پوری طرح سے غرق ہوئی اس کے آگے  
تردد کی تاب رکھتی ہی نہیں ہے۔ چاہے وہ معاملہ کتنا ہی معمولی  
ہو یا کسی بڑی نوعیت کا۔ وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے باہر آئے اور  
اس حسین جوڑے کو کتنی نگاہوں نے تو مٹمی و ستائشی انداز میں  
دیکھا اور سراہا تھا۔

”آپ کا شکریہ مس نندی کساپ نے اعتماد کیا مجھ پر۔“  
عباس نے اس کے لیے گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا تھا۔ اس کے  
بیٹھنے کے بعد عباس نے سحر انگیز مسکان کے ساتھ نہایت شائستگی  
سے تشکر کا اظہار کیا۔ نندی مسکوری بیٹھی رہ گئی اس کا دل بیک  
وقت غم و انبساط کے درمیان ڈولتا رہا تھا۔ اک لہر شدید غم کی بھی تو  
دوسری فخر و ناز کی کہ عباس نے کسی طور بھی سہی اسے اہمیت سے تو  
نوازا تھا۔ اس طرح نہ سہی اس طرح سہی۔ یہ اب اس کی قسمت  
تھی کہ اس کی زندگی میں اس کی حیثیت اس کی جگہ اس درجہ  
معمولی نوعیت کی قرار پائی تھی۔ مگر پائی تو تھی تا یہی بہت تھا کس  
درجہ وحشت اور بے قراری تھی اس وقت جب اس کی زندگی میں  
وہ کہیں نہیں تھا اب کیا اس تلاش کا حاصل یہ فیصلہ ہونا چاہیے تھا  
کہ وہ اسے خود کھو دیتی۔ پھر اس کے سامنے رہتے ہوئے اس  
سے کٹ کر رہنا آسان نہیں تھا۔ وہ کسی طرح بھی اب خود کو اس  
سے الگ اور لا تعلق نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس وقت جتنا بھی دکھ اور  
ملاں تھا مگر یہ حقیقت اہل تھی کہ وہ اس کی زندگی میں ٹانگ کا کام  
کرتا تھا اس نے جانا وہ خود کو اس کے دائرے سے نکالنے پر قادر  
نہیں ہے تو اس نے باخوشی اپنی ساری ڈیریاں اسے تھمانے کا  
فیصلہ کر لیا۔

ہوٹل سے گھر تک کا فاصلہ طے نہیں ہوا تھا۔ اس کی آئندہ  
زندگی کا لائحہ عمل ترتیب پایا تھا۔ اس کی زندگی کے اہم ترین فیصلے  
ہوئے تھے۔ عباس نے جس پہل اس کے بتائے گئے اپڈریس  
کے مطابق زینب کے گھر کے سامنے گاڑی روکی نندی پوری  
طرح خود کو سنبھال کر اس اذیت کے سمندر سے باہر نکل آئی تھی۔  
جیسی اترنے سے پہل اس نے جمکی نظروں کے ساتھ عباس کو اندر



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ تمام پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ویڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](http://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](http://twitter.com/paksociety1)

محکمہ کتب خانہ

امم



ہوائیں سرد ہو جائیں یا لہجے برف ہو جائیں  
ہم اس کی یاد کی چادر خود پہ تان لیتے ہیں  
اگر وہ روٹھ جاتا ہے ہماری جان نکلتی ہے  
یہ سانس جاری رکھنے کو ہم اُس کی مان لیتے ہیں

#### گزشتہ قسط کا خلاصہ

فرز کو ساحر بطور ایک شراپہی فلم میں کاسٹ کر لیتا ہے لیکن جب وہ ماما پاپا سے اس حوالے سے بات کرتا ہے تو وہ اس پر سخت برہم ہوتے ہیں اور قطعی انکار کر دیتے ہیں جس پر وہ بغاوت پر اتر آتا ہے بعد ازاں تاؤ جی کے سمجھانے پر وہ اسے فلموں میں کام کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ نندی حسن کے ساتھ ایک کنسرٹ میں شرکت کرتی ہے جہاں اس کا مقصد ساحر سے ملاقات ہے مگر جیسے ہی ساحر کنسرٹ میں آتا ہے وہ اس کے سحر میں جکڑتی چلی جاتی ہے ساحر کے پاس لوگوں کا جھوم بڑھتا چلا جاتا ہے وہ بھی حسن کے ساتھ اس کا آؤ گراف لینے کے لیے انتظار کرنے لگتی ہے جب ہی ساحر کو عریضہ کی کال آ جاتی ہے اور وہ کنسرٹ اور حورا چھوڑ کر جانے کی کرتا ہے جب ہی اچانک اس کی نظر نندی کے سواگوار اور مبہوت کردینے والے حسن کو دیکھ کر ٹھنک جاتی ہے اور وہ اسے اپنا وزینٹنگ کارڈ دیتا ہے جس پر وہ کالی خوش گمانی کا شکار ہو جاتی ہے۔ واپسی پر نندی زینب سے کہتی ہے کہ وہ مسلمان ہونا چاہتی ہے جس پر زینب اسے سمجھاتی ہے کہ اسلام کو سمجھ کر ہی اسے قبول کرنا چاہیے نہ کہ نام کے لیے جس پر وہ زینب کی طرف سے بدگمانی کا شکار ہو جاتی ہے۔ لاریب سکندر کے ساتھ شاپنگ کی غرض سے جاتی ہے اور فرنٹ سیٹ کے بجائے پیچھے بیٹھ جاتی ہے جس پر سکندر اشتعال میں آ جاتا ہے اور گاڑی کی اسپڈ خطرناک حد تک بڑھا دیتا ہے جس پر لاریب ہراساں ہو کر اس کی ضد مان لیتی ہے۔ لاریب سکندر کے رویے سے اور پریشان ہو جاتی ہے مگر کچھ سوچ کے امامہ کی شادی تک دمک جاتی ہے اور سکندر کی جانب سے دیا گیا ایئر کنڈرنگ کا تحفہ قبول کر لیتی ہے۔ عریضہ عباس پر اپنی فیملی کو منانے کے لیے دباؤ ڈالتی رہی ہے اور اب اس کا دباؤ بڑھ جاتا ہے جس پر عباس ہمیشہ کی طرح اس کی خوشی کے آگے سر جھکا لیتا ہے جب ہی اس کے سیکرٹری کا فون آتا ہے اور وہ اس کی یاد دہانی پر نندی کو اپنی فلم میں کام کرنے کی غرض سے آفر دینے کے لیے کال کر کے ملنے کا

☆ ☆ ☆

”ہماری تمنا ہماری آقا ہوتی ہے آقا جتنا زور آور ہو غلام کو اتنا ہی تابعدار ہونا پڑتا ہے۔ ورنہ ہم ہرگز اتنے کمزور اتنے بے بس نہ ہوں۔ وہ اس تھوڑے پر بھی راضی بارضار رہنے پر مجبور تھی۔ اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ محبت میں دل تو بڑا کرنا ہی پڑتا ہے اگر لینے والے نہ بن سکیں تو خود بخود دینے والوں میں شمار ہو جایا کرتے ہیں لیکن اگر محبت ہو شرط ہی محبت ہے اور یہاں کیا شک تھا کہ محبت تھی بلکہ عشق جنوں خیز تھا۔

”میں آپ کا شکر گزار ہوں مس نندی“ ورنہ ہمیں بہت مشکلات کا سامنا ہوتا تھیں گے۔“ عباس حیدر واقعی ریلیکس تھا اس کا لہجہ بھی پہلے کی نسبت اب بے تکلف تھا نندی کے ہونٹوں پر موجود پھٹکی مسکان کچھ اور گہری ہوئی۔

(مجھے پتا چل گیا تھا ساحر صاحب کہ میں اگر تمہاری آفر ٹھکراؤں گی تو کبھی تم سے پھر نہیں مل سکیں گی۔ جبکہ مجھے میں اس سے

حوصلہ ہے نہ ہمت اس انکشاف کے بعد کیا گنجائش بچی تھی کہ میں اپنی من مانی کروں)۔  
”مگر میں نے اگر ہاں نہیں کی تھی تو انکار بھی نہیں کیا تھا۔“ وہ جس طرح مغموم سی لگتی تھی کے ساتھ بولی عباس بے ساختہ ہنستا چلا گیا مگر کتنی خوب صورت تھی اس کی ہنسی نندی تو جیسے اس سحر میں گم ہونے لگی تھی۔

”مگر یہ بھی سچ ہے کہ آپ کا انداز انکار کرنے والا تھا۔ اپنی ویز مجھے بہت اچھا لگا کہ آپ نے انکار نہیں کیا کیونکہ میں کچھ لوگوں سے پورے یقین کے ساتھ کہہ چکا تھا کہ میں اپنی مودی کے لیے ہیروئن سلیکٹ کر چکا ہوں۔ آپ کا انکار مجھے شرمندگی میں ہی نہیں بڑی خواری میں بھی ڈال سکتا تھا۔“ نندی نے جھکی پلکیں اٹھا کر ایک لمحے کو دیکھا اور پھر سے نہ صرف نظریں جھکا نہیں بلکہ سر بھی جھکا لیا۔ وہ اپنی اہمیت اپنی قدر و منزلت سے آگاہ نہیں تھا۔ ورنہ وہ جانتا کہ بھر حال اس جیسے شخص کو انکار کرنا کم از کم نندی کے بس کی بات نہیں تھی۔

”تھینکس مس نندی! فی الحال میں جلدی میں ہوں۔ آپ سے ان شاء اللہ پھر بات ہوتی ہے۔ میں جلد ہی آپ سے آئندہ کا لاکھ عمل طے کروں گا بلکہ میرا اسٹینڈ آپ سے سارا معاملہ طے کرے گا۔“ وہ اسے دس کرتا ہوا چلا گیا تو نندی نے اس وقت تک وہیں کھڑے ہو کر اسے دیکھا تھا جب تک اس کی گاڑی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے دروازے سے پھٹتے سر کے ساتھ کروٹ بدل کر منہ کو پھر سے ٹیکے میں چھپا لیا۔ عجیب سی وحشت رگ دے میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ اتنے بڑے کمرے میں آج وہ بالکل تنہا تھی۔ اس سے قبل کتنے دنوں تک امامہ مستقل اس کے ساتھ سوئی تھی مگر یہ ساتھ کوئی ہمہ وقت کا بھی نہیں تھا نہ وہ اس کی اتنی عادی تھی کہ اس کی کمی کو محسوس کرتی۔ دکھ تو اسے اس کا وقاص کے سنگ رخصت ہونے کا راز رہا تھا۔ پچھتاوا غم پاس۔ وقاص کی آنکھوں میں جو جلتا ہی ہوئی کیفیت تھی جیت لینے کا طنز یہ احساس تھا۔ اچھی بھلی شکل کے باوجود وہ اسے کسی جانور سے مشابہہ لگنے لگا تھا اس کے برعکس امامہ بلڈ ریڈ بے حد انکسش جوڑے میں دلہنا پے کے روپ کے ساتھ اس کی نو خیزیت اور معصومیت بھرے حسن پر نگاہ نہیں کرتی تھی۔ اسے وقاص کے پہلو میں دیکھ کر لاریب کے سارے زخم پھر سے تازہ ہو گئے تھے برسوں قبل ہوئی اماں کی وفات اتنی تازہ دل پر ہونے والی واردات اپنی رنجشیں عباس حیدر کی بے حس اس دکھ میں جتا ہو کر اس کا اپنا دشتوں کی انتہاؤں کو

چھوٹے ہوئے اٹھایا گیا قدم ایمان کی کج ادائی کا سنگین مظاہرہ۔ وہ بھلا کس غم کو چھوڑ کر کس پتا نسو بہانی۔

امامہ کی رخصتی کے وقت جب وہ خود پر ہر قسم کا ضبط تو ذکر بری طرح سے بلکے جا رہی تھی تب سکندر جانے کس سمت سے نکل کر غیر محسوس انداز میں اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”رونے سے مسائل کا حل نہیں نکلا کرتا لاریب بی بی! ہر مشکل و پریشانی کا حال اللہ پاک کے پاس ہے آپ دعا کریں اللہ سبجہ الدعا ہے۔“ اور لاریب روتا بھول کر اسے تنگنے لگی تھی۔ وہ اس کی سمت متوجہ نہیں تھا۔ بظاہر سامنے دیکھتا ہوا مگر درحقیقت اس کی پریشانی سے بے چین اور مضطرب تب لاریب کو محض ایک لمحے کو لگا تھا اس وقت اس کے پاس جو بچی کچھی بچی ہے ان میں سکندر کا شمار بھی ہوتا ہے۔ اس رات لاریب نے جانے کتنے عرصے کے بعد عشاء کی نماز ادا کی تھی اور پوری شدت اور دلی آمادگی کے ساتھ امامہ اور ایمان دونوں کی خوشیوں کے لیے خلوص دل سے دعا کی تھی۔ امامہ ٹھیک ہی تو کہتی تھی وہ بھلے نہیں چھوڑتی تھی مگر اس سے دل کا تعلق تو ٹٹنے والا نہیں تھا۔

وہ بابا سائیں کو کھانا کھلا کر دوا دے آئی تھی۔ گوکہ یہ کام سکندر کی ذمہ داری تھا مگر وہ اپنی موجودگی میں کروائی تو تسلی رہتی تھی۔ مزید کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد بھی جب نیند نہ آئی اور نہ ہی سردی میں افاقہ ہوا تو ٹیبل لیپ آن کر کے چین کمرز ڈھونڈنے لگی۔ دروازہ میں نہیں تھی۔ اس نے ٹھنڈا سانس بھر اور اٹھ کر دروازہ کھولتی باہر آ گئی۔ راہداری سنسان تھی۔ لاریب کچن کی سمت آئی تو کچن کی لائٹ جلتی دیکھ کر اس نے یہی قیاس کیا کہ اندر کوئی ملازم ہوگی۔ مگر کچن کے دروازے سے قدم رکھتے ہوئے سکندر سے ہونے والا سامنا لاریب کو جزیرہ سا کر گیا۔

بلیک ڈرگس پیمنٹ پر سفید براتی شرٹ پہنے جس کی آستینیں فولد تھیں اور گریبان کے اوپری بوشن کھلے ہوئے جو لمبے کٹے کھڑا چائے بنانے میں مصروف تھا آہٹ محسوس کر کے بے اختیار پلٹا اور اسے روہو پا کر اس کی آنکھوں میں یکا یک کتنی چمک اور جگمگاہٹ اتر آئی تھی۔

”آئیے..... آئیے آپ کو بھی بھینا جائے کی طلب کھینچ لائی ہے۔“ وہ خواہ مخواہ چپکا لاریب نظر انداز کیے آگے بڑھ کر فریج کا دروازہ کھول کر کھڑی ہوئی۔

”طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟“ اسے کیبنٹ سے دولی کی شیشی سے چین کمرز نکالتے دیکھ کر سکندر کو اسے تشویش لاحق ہوئی۔ لاریب نے اسے نظر انداز کیا اور اپنا کام جاری رکھتے ہوئے ریک سے گلاس اٹھا کر سنگ سے پانی لیا اور کھڑے کھڑے دوا پچانک



گلاس منہ سے لگایا۔

”تھیں مجھ سے؟“ چائے کی طلب ہونے کے باوجود وہ محض اس وجہ سے خود پر جبر کر گئی کہ سکندر کے پاس ٹھہرنا اسے گوارا نہیں تھا۔ مگر سکندر اسے بلتے دیکھ کر اور خاموشی کو محسوس کرنا اچھا خاصا پریشان ہو چکا تھا۔ جیسی ہاتھ پکڑ کر دو کا اور بے حد اپنائیت آمیز انداز میں کہا تھا۔ لاریب ہم ہی گئی اس کی نظریں اس کے سانولے ہاتھ میں دبے اپنے بے حد سفید اور نازک ہاتھ پر پڑی تھیں پھر سرد مہر انداز میں سکندر کے چہرے پر جارہیں۔

”ہاتھ چھوڑو میرا سکندر“ اس کا لہجہ بھی اس کی نظروں جیسا تھا۔ سرد اور ٹھہرا ہوا۔ سکندر نے بغیر کسی رد و کد کے اس کا ہاتھ اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ پھر بہت سرعت سے چائے کا گنگ اٹھا کر اس کے گے کیا تھا۔

”پلیز لے لیجیے میں جانتا ہوں آپ کو اس کی ضرورت ہے۔“ اس کا انداز بے حد اپنائیت اور کسی حد تک لجاجت لیے ہوئے تھا۔ لاریب نے خاموشی سے اسے دیکھا تو سکندر کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکان نظر آئی۔

”یقین مانیں میں نے اس میں ایسا کوئی تعویذ نہیں کھولا جس کے اثر سے آپ کو مجھ سے محبت ہو سکتی ہے۔“ آخر میں اس کا لہجہ بنا چاہتے ہوئے بھی خفیف سی شوخی و شرارت سمیٹ لایا تھا۔ لاریب بری طرح جھنجھلائی۔

”تم اپنا یہ شوق بھی پورا کر کے دیکھ لینا مجھ پر اثر ہونے والا نہیں۔“ وہ آنکھیں نکال کر غرائی اور گنگ اس کے ہاتھ سے چھپت لیا۔ سکندر بے اختیار ریٹیکس ہوا اور ہلکے پھلکے انداز میں مسکراتے ڈانٹنگ ٹیل کی میز کے گرد موجود کرسیوں میں سے ایک کو کھینچ کر اس کی جانب کیا۔

”بیٹھ کے پی لیں۔“ لاریب پتا نہیں کس رو میں تھی کہ بے خیالی بیٹھ گئی۔

”تم اکثر شہر جاتے رہتے ہو سکندر کبھی باجو نظر نہیں آئی تمہیں؟“ سوال ایسا غیر متوقع تھا کہ سکندر نے چونک کر اسے دیکھا پھر عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

”نہیں ویسے آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟ آپ کے لیے تو یہ ذکر ممنوع تھا۔“

”اگر کبھی وہ پلیس تو انہیں بتانا ضرور کہ ان کا بھگتان ان کی سب سے لاڈلی بہن کو بھگتنا پڑا ہے۔ وہی جس کو انہوں نے لولا کی طرح پالا اور سنبھالا تھا۔ سکندر وہ اتنی مفاد پرست تو کبھی نہیں تھیں۔ وقاص نے امامہ کو جھانسنے دینے کو جیسے بھی خواب دکھائے مگر اس کے باوجود میں نے آج امامہ کی آنکھوں میں جو ہراس دیکھا وہ غیر محفوظ

مستقبل کا ہے۔ ہم سب بہنیں کتنی عجیب قسمت لے کر پھیل ہوئیں۔ چاہے وہ باجو ہوں میں یا پھر امامہ۔ ہمیں کچھ بھی پورا نہیں ملا۔ سب کا سب ادھورا اور نامکمل۔“ آنسو قطرہ قطرہ اس کی سرخ راز آنکھوں سے گر رہے تھے اور سکندر کتنی بے بسی کی کیفیت سے دو چار تھا۔

”مجھے تمام تر کوشش کے باوجود نیند نہیں آ سکتی اور ایسا ہمیشہ اس وقت ہوا ہے جب باجو یا پھر امامہ تکلیف میں ہوں۔ تم بتا سکتے ہو ان دونوں میں سے اس وقت کون کرب یا آزمائش سے دو چار ہے۔“ اس کی آنکھوں میں جا بجا وحشتوں کا رقص جاری تھا۔ سکندر تو جیسے بولنے کے قائل نہیں رہا۔

”آپ حد سے زیادہ حساس ہو رہی ہیں لاریب بی بی سردرد کے بجائے آپ کو نیند کی گولی لے کر سونا چاہیے تھا۔ بہت زیادہ سوچنے کے باعث آپ فرسٹیشن کا شکار ہو رہی ہیں۔ آرام کریں پلیز۔“ سکندر نے صرف کہا نہیں تھا زبردستی اسے تمام کمر اس کے کمرے تک لے آیا۔ ایک گولی نیند کی اسے کھلائی پھر بستر پر لٹا کر جس وقت اسے کنبل اوڑھار ہاتھ لاریب نے اسی اضطرابی کیفیت کے زیر اثر اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”تم انہیں ضرور ڈھونڈنا سکندر۔ انہیں بتانا کہ امامہ ان کی وجہ سے اب تک بہت روٹی ہے۔ لاریب کو اس کے بعد سے نیند نہیں آئی اور بابا۔۔۔۔۔ بابا تو اب سونے سے بھی ڈرنے لگے ہیں۔ اس بے خوابی نے انہیں بیمار کر دیا ہے سکندر۔ تم بتانا انہیں تم بتاؤ گے نا انہیں؟“ نیم غنودہ کیفیت میں وہ مسلسل بولے جا رہی تھی اور سکندر کا دل اس بے حد حسین لڑکی کے کساتے گہرے سادھ کو محسوس کرتا خون ہوتا جا رہا تھا۔

(نہیں لاریب میں تمہیں زور زبردستی سے نہیں پیار اور محبت سے حاصل کروں گا۔ مجھے تمہیں مزید نہیں توڑنا۔ مجھے تمہیں بہت سینت سینت کر رکھنا ہے) اس نے خود سے عہد باندھا تھا۔ مگر کچھ عہد بندہ تھے ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں۔ سکندر نہیں جانتا تھا مگر یہ سچ تھا اس کا یہ عہد بھی ٹوٹ جانا تھا۔

اگلی صبح بہت ٹھہری اور روشن تھی۔ مگر لاریب ہنوز اب سیٹ اور مضطرب تھی۔ سکندر مختلف کاموں میں الجھا بھی اس کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ جیسے ہی اسے ذرا فراغت نصیب ہوئی وہ بلا تھجک اس کے کمرے کی جانب آ گیا۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ اس نے لاریب کا چہرہ بہت دھیان سے دیکھا تھا۔

”مجھے کیا ہوتا ہے ٹھیک ہی ہوں۔ امامہ کا کوئی فون وغیرہ آیا؟“ اس نے بالوں کو سیٹے بغیر بے زار سے انداز میں پشت پر ڈال دیا

تھا۔ سکندر بے اختیار نظریں چڑا گیا۔ وہ اسے یہ بتا کر مزید پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا کہ بابا سائیں کے بار بار کہنے پر اس نے جتنی مرتبہ بھی امامہ یا پھر وقاص کا نمبر ملایا ہر بار کال کاٹ دی گئی تھی۔ لینڈ لائن بھی بند پڑا تھا۔

”جی۔۔۔۔۔ بابا سائیں نے کی ہے بات آپ ناشتا کر لیں پھر ولیمہ پر بھی جانا ہے آپ کو۔“ سکندر نے دھیمے لہجے میں نرمی سے جواب دیا۔ لاریب کے چہرے پر سکون کا ایک رنگ اتر ا مگر یہ عارضی ثابت ہوا کہ کچھ دیر بعد وہ پھر سابقہ پریشانی کے ساتھ اس کے سامنے تھی۔

”امامہ کا سیل آف ہے۔ وقاص بھی کال اٹینڈ نہیں کر رہا، وائے؟“ اور سکندر کی وضاحتیں دیتی جان مصیبت میں آنے لگی تھی۔ لاریب کے اندر بے چینی گھر کرنی جا رہی تھی۔ جیسی وہ غلت میں تیار ہو کر تیا سائیں کے ہاں جانے کو روانہ ہو گئی۔ یہاں سے بابا سائیں کے علاوہ سکندر بھی ہمراہ تھا کہ ان کی طرف تو مہمان دیے ہی کم تھے۔ جو آئے تھے وہ بھی دلہن کی رخصتی کے ساتھ ادھر چلے گئے کہ رشتہ داری تو دونوں جانب ایک جیسی تھی۔ سواب دلیمہ میں شریک ہونے کو یہی تین لوگ تھے۔ سکندر ہمیشہ بڑی حوصلی آنے سے کتراتا تھا کہ یہاں وقاص ہی نہیں تیا سائیں کا انداز بھی اس کے لیے تحقیرانہ اور تضحیک آمیز ہوتا تھا۔ تیا سائیں بابا سائیں کے بالکل برعکس تھے۔ ان میں رعوت بھی تھی اور تکبر بھی وہ دوسروں کو خود سے حقیر اور کمتر سمجھتے تھے۔ سکندر دل ہی دل میں دعا گو تھا یہ چند گھنٹے بغیر کسی بد مزگی کے گزر جائیں۔



حاکم شہر بتاؤقت کے شکستوں نے خواہشوں کے پھولوں کو فوج فوج توڑا ہے کیا یہ ظلم تصور ہے؟ درد کے جزیروں نے آرزو کے جیون کو مقبروں میں ڈالا ہے ظلمتوں کے دریا میں لوگ سب لیرے ہیں موت دھڑکی بٹھکی ہے جذبات ریزہ ریزہ ہے تار تار آج کل بے درد درد جیون ہے شبنمی سی پلیس ہیں قرب ہے سندری ہے زندگی ادھوری ہے

اب یقین آیا ہے موت بھی ضروری ہے اس نے سبتے آنسوؤں کو بے دردی سے رگڑ کر صاف کیا اور چہرہ گھٹنوں پر رکھ کر پھر سے سسکنے لگی۔ ابھی کچھ دیر قبل زینب اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تھی۔ وہ اسے ہرگز خوش نہیں لگتی تھی۔ نندنی

کے فیصلے نے اسے شاک میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے نندنی کا ساحر کی بات مان لینا پسند نہیں آتا تھا۔

”تم جانتی ہو نندنی یہ سوویز بنانا ان میں کام کرنا کتنا بڑا گناہ ہے؟“ وہ کتنی متاسف تھی آواز اس کے حلق سے جیسے پھنس کر نکل رہی تھی۔ شاید وہ اپنے طوط پر اسے مسلمان بنا کر ہی خوشی محسوس کر سکتی تھی۔ وہ اسے اس رات سے پرانا ناچا ہتی تھی مگر اسے ٹریک بدلتے دیکھ کر ہرٹ ہوئی تھی۔

”یہ گناہ و ثواب تمہارے مذہب کا حصہ ہیں زینب! مجھے ان سے کیا سروکار۔ میرے لیے تو سب کچھ ساحر کی ذات ہے۔ مجھے اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کا وجود روشنی کا وہ جگنو ہے جو اس پوری تاریکی میں ڈوبی کائنات میں میرے لیے امید زندگی اور اس کا باعث ہے۔ کہیں کیا پتا میں نے اس وقت کے حصول کی خاطر کیسے کیسے کشت کائے ہیں۔ زمین میرے قدموں کے نیچے ہمیشہ دلدل بنی رہی ہے۔ جس میں میرا وجود دھنسا جاتا تھا۔ یہ لہجہ لہجہ کی موت کس قدر اذیت انگیز ہوتی ہے تم نہیں جان سکتیں۔ میں زمین پر پیر جمانے کی خواہش میں ترس گئی تھی۔ تم جانتی ہو تم مجھ سے یہ سکون بھی چھین لو۔ یہ ادھوری خوشی بھی لے لو۔ جس سے میں نے خود کو با مشکل بہلایا ہے اس سے ملنے کا کوئی یقین کامل تھا میرے اندر۔ جو مجھے حوصلہ اور ہمت کی پھکی دے کر ہمیشہ ان وحشتوں سے بچا کر نکال لایا کرتا تھا۔ ورنہ اب تک تو پاگل ہو چکی ہوتی میں۔ محبت کوئی ہار یا جیت نہیں ہوتی زینب۔ میں محبت کی بات کر رہی ہوں واضح رہے پیار اور جاہت کی نہیں یہاں کوئی چور دروازے نہیں ہوتے۔ یہاں جتنا آگے بڑھتے جائیں نہ پیچھے سراب آتے جاتے ہیں۔ واپسی ممکن نہیں۔ میں واپس لوٹنا بھی نہیں چاہتی اب تو جو بھی ہے جیسا بھی ہے کی بنیاد پر مجھے قول ہے۔ وہ میرا نہیں بناساں سے پہلے کسی اور کا ہو گیا۔ یہ احساس جتنا بھی جان لیوا ہے مگر اس وحشت کے احساس سے بہر حال کم جو ساحر سے دوری میں ہے۔ میں اس سے الگ ہو کر دور ہو کر نہیں جی سکتی زینب اب وہ اگر مجھے کہے گا یہ دن نہیں رات ہے تو میں ہاں کہوں گی۔ آقا کے حکم کے آگے غلام کو ناں“ زینب نہیں دیتی ہے پھر میں ولی آباد کی کے ساتھ کروں گی یہ سب۔ کوئی مجبور ہی نہیں ہے تم یقین کرو۔“ وہ بات کے اختتام تک ہچکچوں سے رو پڑی تھی گویا پردہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی حق تلفی کا احساس ابھی بھی باقی تھا۔ جس کا اظہار بھلے زبان سے نہ ہوتا تھا مگر دل تو کرتا تھا۔ زینب کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس میں کیا شک تھا کہ وہ اسے بہت عزیز تھی۔ اس نے بے اختیار نندنی کو خود سے لپٹا لیا پھر محبت سے تھکنے لگی۔

”تم غلط سمجھتی ہو نندنی کہ تمہاری خوشی نے مجھے ایسا کیا ہے



ایسا نہیں ہے۔ لیکن مجھے لگتا ہے تم خود کو دھوکے دینے کی کوشش کر رہی ہو۔ تمہاری آنکھوں میں جو دیرانہ پہلے آدھا آج بھی جوں کا توں ہے۔ اگر تم اس طرح خوش رہ رہی ہو تو پھر تمہاری آنکھیں اس خوشی کا اظہار کرنے سے قاصر کیوں ہیں؟ ہم محبت کو انڈر اسٹینڈنگ سے زیادہ اہمیت دے کر غلطی کر رہے ہوتے ہیں۔ انڈر اسٹینڈنگ محبت کی طرف لے جاتی ہے مگر انڈر اسٹینڈنگ کے بغیر محبت کو دیمک لگ جاتی ہے۔ تم نے اس سے محبت کی اور اسے ہمیشہ اچھے انداز میں سوچا ہے لیکن اس کی اہمیت اس کے انداز سے عیاں ہے تمہاری پہلی ہی توقع بہت برے طریقے سے ٹوٹ چکی ہے۔ تم صبر کرنا جانتی ہو مگر کب تک یہ طنائیں ٹوٹ بھی سکتی ہیں۔ ان کی قوت مضبوطی کو مست آزاؤ۔ ایسا نہ ہو تمہیں اس محبت سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائیں۔ ”زیب کے لہجے میں خلوص تھا مگر نندنی کے دل میں بدگمانی آنے لگی تھی اور بغض سر اٹھانے لگا تو وجہ یہی تھی کہ وہ اسے ساحر کی جانب بڑھنے والے راستوں پر اندھا دھند دوڑنے سے روک رہی تھی۔

”میں نے آپ سے مشورہ تو نہیں مانگا ہے زیب مانند اٹھ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ یاد کر س ساحر کی خاطر میں نے اپنے سیکے رشتوں کو چھوڑ دیا۔ اب اگر اس کی طرف جاتے رہتے کھلے ہیں تو میں آپ کی باتوں پر کیوں کان دھرنے لگی۔ میں بہت جلد آپ کا گھر چھوڑ کر کہیں اور شفٹ ہو جاؤں گی تاکہ آپ کی روک ٹوک نہ سہی پڑے۔“ اس کا لہجہ کافی بد لحاظ تھا۔ زیب کے گلابی چہرے پر سرخی ہی چھا گئی وہ بیٹھے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”تم نے ٹھیک کہا نندنی تم اپنی مرضی کی مالک ہو ہر فیصلہ کرنے کا حق محفوظ ہے تمہارے پاس۔ دوست اور ہمدرد ہونے کی حیثیت سے میں نے سمجھانے کا فریضہ ادا کر دیا۔ میری بات کسی طرح بھی تم پر لاگو نہیں ہوتی لیکن نندنی تم یہیں رہو گی تو مجھے خوشی ہوگی۔“ اس کے چہرے کی کیفیت کے برعکس اس کا لہجہ متوازن تھا اور معقول تھا مگر نندنی پھر بھی اسی جنونی اور شدید بیجان کے عالم میں تھی۔ جس سے اسے جوابا گھورنے لگی۔

”یہاں رہوں تاکہ آپ واعظ و نصیحت کا شوق پورا کرتی رہیں۔ مسلم ایسے ہی ہوتے ہیں زبردستی اپنے دین میں داخل کرنے والے انتہا پسند۔“ وہ حقارت سے کہہ رہی تھی۔

”تم ابھی غصے میں ہو نندنی، ہم پھر بات کریں گے۔“ زیب کے چہرے کا وہی عالم تھا مگر نندنی مزید بھڑک گئی۔

”لیکن مجھے آپ سے اب کوئی بات نہیں کرنی۔۔۔۔۔ ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ آپ میری خوشیوں سے اس طرح جلیس ہو جائیں گی۔“ وہ حلق کے بل چیخنے لگی۔ زیب نے سنا تھا مگر نظر انداز کیے

پلٹ کر چلی گئی۔ نندنی بعد میں بھی کتنی دیر تک بکلتی اور تڑپتی رہی تھی۔ عجیب سی وحشت تھی جو اسے اپنے جنونی جنوں میں جکڑ کر بے حال کر رہی تھی۔

”میں اب کسی کی بھی نہیں سنوں گی ہرگز نہیں۔ مجھے صرف ساحر کا حصول درکار ہے۔ چاہیے کیسے بھی ممکن ہو۔“ اس کی آنکھوں کی وحشت ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ساحر کی شادی اور پھر بچوں کے متعلق آگاہی نے اسے وحشت کے صحرائیں رخ دیا تھا یہ وحشت اور جنون کی ہی کیفیت تھی کہ وہ اپنی فطری حیا اور واداری سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ کچھ غم ایسے ہوتے ہیں جو حرام حلال کا فرق بھلا دیتے ہیں۔ انسان کی سوچ پر ایسے لمحوں میں ہی شیطان اپنا قبضہ جمالیا کرتا ہے۔ اس کے ذہن کی سلیٹ پر ہر تحریر انہیں لکھتا ہے اور انسان بڑھ کر عمل کرتا ہے۔ جب شیطان انسان کے نفس پر قابض ہو جاتا ہے تو منفی خیالات اس کے ذہن کی آماجگاہ بن جاتے ہیں۔

وہ محبت بھرا دل رکھنے والی لڑکی محبت کے حصول کی خاطر درود بھیجتی تھی مگر محبت کی کمی نہ سکون۔ بلاشبہ سکون تو اللہ کی یاد میں پوشیدہ ہے۔ اگرچہ اس نے اس بات کو بھی سمجھا نہیں تھا۔ لیکن جان تو سکتی تھی اور شیطان کو یہی گوارا نہیں تھا اس سے قبل کہ وہ رب کی طرف راغب ہوئی شیطان نے اسے گناہ کا راستہ پوری طرح آراش کے ساتھ دکھانا شروع کر دیا۔ یہ شیطانی سوچ ہی تھی کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر ہر جائز ناجائز کا فرق بھول بیٹھی۔ وہ ساحر کی زندگی میں داخل ہو کر اس کے دل میں داخل ہونے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ اس کے خیال میں یہ مشکل نہیں تھا۔ اس کے خیال میں یہ غلط نہیں تھا۔

کچھ روزہ شام نے انتہائی سست روی سے رات کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ عجیب ٹھنڈی سی فضا تھی۔ کمرے کی کھڑکی کے پار شہوت کے درخت کے پتے جانے کب سے ساکن تھے۔ لاریب شام سے ہی اپنے کمرے میں سک سک کر بے حال تھی جو چوٹی کی فضاؤں میں گھٹا گھٹا سوگ تھا۔ سکندرا آتش دان میں سکتی پختی لکڑیوں کے ساتھ خود بھی سلگ رہا تھا۔ پھر اٹھا اور کھڑکی میں کھڑا ہو کر سگریٹ پھونکنے لگا۔ اس کے وجود میں دھواں ہی دھواں تھا۔ جسے باہر نکلنے کو راستہ نہ ملتا تھا وہ ساری رات قیامت جیسی تھی۔ اس حویلی کے نصیب میں پہلے بھی ایک ایسی رات آچکی تھی جب ایمان نے وہ غلط قدم اٹھایا تھا اور آج۔۔۔۔۔ گو کہ سکندر نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ نہیں جانتا تھا اس پر کیا جتی تھی جس نے لاریب کا چہرہ قرار اس انداز میں لوٹ لیا تھا اس شام وہ معمول سے زیادہ جلدی سب کاموں سے فراغت پا کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا محسن ہی

ہی تھی کہ بدن ٹوٹا محسوس ہوتا تھا۔ ابھی غنودگی کی پہلی منزل تھی جب اسے کسی احساس کے تحت آنکھیں کھولنی پڑ گئی تھیں۔ اگلے لمحوں کے سارے حواس ہی جھنجھٹا گئے۔

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے صرف تمہاری وجہ سے اگر تم مجھے طلاق دے دیتے اور وہ خبیث مجھ سے شادی کر لیتا تو میری لامہ تباہی سے بچ سکتی تھی۔“ سکندر نے حواس باختگی کی کیفیت میں دیکھا۔ لاریب اپنا زخمی وجود لیے اس کے اوپر جھکی ہوئی سر اپا تھر نظر آ رہی تھی اس کی سفید رنگت میں غضب کی سرخی نمایاں تھی اور چہرہ آنسوؤں سے پوری طرح بھیگا ہوا۔ وہ اسے جھجھکا کر ہی اپنا غصہ نہیں نکال رہی تھی بلکہ غم و غصے میں انتہائی ناز یا الفاظ بھی کہہ رہی تھی وہ پھر شدید غم و غصے کی کیفیت میں سکندر کی خلوت میں کل ہو کر اس کی مردانگی اس کی غیرت اس کی انا کو ڈسٹرب اور مشتعل کر گئی تھی۔ ایسا ڈسٹرب جو اس کے جذبات کو وحشی بنا جاتا تھا مگر لاریب کو بھی احساس تک نہ ہوسکا تھا کہ وہ اسے کس مشکل میں ڈالتی ہے۔ احساس نہ ہونے کی وجہ بہت واضح اور صاف تھی۔ وہ اسے کبھی اس لحاظ کی اہمیت دینے کو تیار نہیں تھی جو اس رشتے کا تقاضا تھا یا پھر جو ایک عورت کو ایک مرد سے بچاؤ اور تحفظ کو اپنانے چاہیے۔ وہ اسے کوئی اہمیت دیتی تو ہی ان باریکیوں پر بھی غور کرتی۔ سکندر کو مشتعل کرنے کی وجہ یہی تو ہیں بھرا احساس تھا جی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کیا بدتمیزی ہے؟“ آپ کی زندگی میں جتنے بھی مسائل ہیں ان کی وجہ میں ہی کیوں لگتا ہوں آپ کو؟ حد ہے یعنی بے حسی اور بدگمانی کی بھی۔ اب اگر وقاص سائیں نے امامہ بی بی کو رسم کے مطابق آپ کے ساتھ نہیں آنے دیا تو میں کیسے مجرم بن گیا؟“ وہ اتنا تڑپا رہا تھا کہ اس سے لڑنے کھڑا ہو گیا۔

”وہ انسان نہیں کہلایا جاسکتا۔ جانور ہے امامہ کو نہیں دیکھا نا تم نے۔ پتا نہیں کون کون سے بدلے چکائے ہیں اس نے۔ بابا جان تک اگر یہ بات پہنچ گئی تو سہا نہیں سکیں گے اس غم کو؟“ لاریب کے آنسوؤں میں شدت آنے لگی۔ سکندر یکدم ساکت ہو گیا۔ اسے لگا وہ اس سے لڑنے نہیں ایک بار پھر اپنا دکھ بیان کرنے روئے اور دل بھلائے آئی ہے۔ شاید نہیں بھینا وہ اس غم کو تنہا سہتے تھک گئی تھی۔

”کچھ کہا آپ سے امامہ بی بی نے۔“ سکندر کی پریشانی اور اضطراب بالکل فطری تھا۔ امامہ کو اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اتنا بڑا ہوتے دیکھا تھا۔ وہ اسے چھوٹی بہن یا پھر اولاد کی طرح عزیز کی۔ سوال ایسا تھا کہ لاریب کی نظریں جھک گئیں۔

”مجھے کچھ تو بتائیں پلیز۔“ سکندر کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”کچھ جاننے کے لیے ضروری نہیں کہ باپ سے داستان غم سنی جائے۔ سکندر اس کی خاموش نظریں بھی اپنی بربادی کے ساتھ ویرانی کی گواہ بنی ہوئی تھیں۔ اسے بہت شدید پھر پھر تھا۔ میں نے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہا تو وقاص نے سختی سے انکار کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا امامہ پر ہمارا اب کسی قسم کا کوئی حق محفوظ نہیں رہا۔ وہ جان بوجھ کر ہمیں ٹارچر کرنے کو امامہ کو اس طرح لے گیا ہے وہ مار ڈالے گا امامہ کو۔“ لاریب تمام ضبط گنوا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سکندر کی آنکھوں کی سرخیاں کچھ اور گہری ہوئی چلی گئی تھیں۔ بڑی دقتوں سے اس نے لاریب کو سمجھا بھجا کر اس کے کمرے میں بھیجا پھر خود اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ یعنی اس کا خدشہ درست تھا۔ وقاص سے اسے یہی خوف لاحق تھا۔ اس کی بے مہر آنکھوں میں سکندر نے نفرت کے لالہ دیکھتے دیکھتے تھے۔

بھی بھی زندگی کے کچھ مقام انسان کی بے بس جھولی میں ڈال دے جاتے ہیں کہ وہ مولے لاچار محسوس کرنے کرب سہنے کے علاوہ کوئی طور پر کچھ کر سکنے میں ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔ سکندر کو لگا تھا حالات کے گھیرے میں مقید لاریب کی زندگی میں یہی مقام آچکا تھا۔

اس نے اپنی چلتی ہوئی آنکھوں کو بند کر کے پھر کھولا اور آہوں کا گلا گھونٹنے کے لیے سختی سے ہونٹ پیچنے لگے۔ اس وقت وہ تنہا تھی اور ٹیرس کی ریلنگ سے ٹیک لگائے سر دھواؤں کی بجائے کواٹے وجود پر سہم رہی تھی۔ فراز نے آج اپنی کامیابی کی خوشی میں سب کو بہترین ٹرے شادی تھی۔ سب گھر والے اس سلسلے میں اس کے ساتھ ریسیورنٹ جا چکے تھے۔ وہی نہیں گئی تھی بس۔ یہ نہیں تھا کہ اسے کسی نے کہا نہیں تھا فراز اور سمیعہ کے علاوہ خود شرجیل نے بھی اصرار کیا تھا۔ لیکن وہ اپنی مزید ہنگ و تددلیل نہیں چاہتی تھی۔ جیسی انکار کر دیا۔ جانتی تھی کہ ماما کے ساتھ ساتھ تائی ماں بھی خاص طور پر اس کو گیدنے کا موقع نہیں جانے دیں گی۔ ابھی بھی جب فراز نے اس کے انکار کے جواب میں اصرار کرنا شروع کیا تو ماما نے اپنے مخصوص زہر خندا انداز میں مداخلت کی تھی۔

”کیوں مجبور کیے جا رہے ہو فراز۔ ہوگی کوئی مجبوری اس کی۔ سمجھا کرو ناں۔ ہمیں اس شہر میں پھرے اڑانی پھری ہے۔ پتا نہیں کس کس کے ساتھ مشکلا کیا ہوگا۔ یہ الگ بات میرا بیٹا ہی اتنا احسن نکلا کہ ہاتھ پکڑ کر گھر میں گھس لایا۔ اسے گھر پر ہی رہنے دو یہ ڈھکی چھپی ہی بہتر ہے۔ کجا ہاں کوئی پرانا آشنال گیا تو ہماری عزت تو لگی نا داؤ پر۔“ ایمان کے لیے اس درجہ اہانت آمیز سلوک پر بس زمین میں گڑھنے کی کسبانی رہ گئی تھی اسے لگا تھا کسی نے اسے تیز



دھاتا لے سے لکھت دو ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا ہو۔ وہ وہاں مزید ٹھہر نہیں سکی۔ لیکن کمرے سے نکلنے ہوئے اس نے ضرور سنا تھا۔ فراز ماما سے الجھ رہا تھا اس کی عادت اور فطرت تھی کہ کسی سے زیادتی ہوتے دیکھ کر چپ نہیں رہ سکتا تھا اس کا اپنا مزاج تھا۔ وہ حق بات کر دیا کرتا تھا۔ اس بات کی مطلق پروا کیے کہ کس کو کتنی بری لگی۔ مگر اس وقت ماما تھیں اس کے سامنے جو بدگمانی نفرت اور اب داؤ چلنے میں تائی اماں کے زیرِ رینگ تھی۔ ایک کے بعد دوسرے بیٹے کو اسی حسین ناگن کی وجہ سے اپنے منہ کو آتے دیکھ کر برداشت نہیں کر سکیں۔ جی ہاں پر جو نفسیاتی حملہ کیا وہ اتنا شدید تھا فراز رنج اور غیر یقینی کے دکھ سے شق ہونے لگا۔

”خیر تو بے جا پتھر جی؟ کس قسم کی امید لائی ہے اس نے تمہیں؟ یہ بے جا حماقت تو نہیں سکتی۔ آخر ایک دنیا دکھی ہے ہم نے بھی۔ اور اس جیسی نفس پرست مفاؤزہ عورتوں کی عزت کوڑیوں کے مول بکتی ہے۔ اسے اگر یہ احساس نہیں رہا کہ تم اس کے دیور ہو تب بھی تمہیں ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ وہ حرافہ تمہارے بڑے بھائی کے نکاح میں ہے۔“ حملہ اتنا شدید اور کڑا تھا کہ فراز کے جواس سلب ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ شاک سے نکلا تو ایسی ملاحتی اور زخمی نظروں سے انہیں دیکھا کہ جن سے کلیجہ پھٹ جائے مگر ماما کو تائی اماں کی زبان بولنے اور انہی کی نظروں سے دیکھنے کی عادت ہو چکی تھیں۔

”یہی بھروسہ ہے آپ کو اپنی اولاد پر؟ آپ سمجھیں اگر تو آپ نے بھائی پر نہیں مجھ پر اصرار کیا ہے۔ کسی کو نیچا دکھانے کی خاطر ہم خود کتنی پستیوں میں جا گرتے ہیں ہمیں اس کا اندازہ ہی نہیں ہو پاتا۔ ابی دے آج کے بعد میں کوشش کروں گا اس معاملے میں نہ بولوں۔ یہی چاہتی ہیں نا آپ؟“ اس کے لہجے میں ٹوٹے ہوئے کارج کی کھینچ کا احساس تھا۔ اعتماد اور بھرم ٹوٹنے کا کرب تھا مگر انہیں پروا کہاں تھی۔ انہیں تو اس بات سے بھی فرق نہیں پڑتا تھا کہ فراز کو انہوں نے کس بری طرح سے ہرٹ کیا ہے۔ وہ تو نیل اور سمیعہ کی اتنی مغز ماری کے بعد کہیں جا کر یہ معاملہ سلجھا تھا کہ ماما نے بھی فراز سے معذرت کی تھی۔ تمام تر کئی و تنفر کے باوجود یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اپنے بیٹے کھوتا نہیں چاہتی تھیں۔ چاہے وہ شریل ہو فراز ہو یا پھر نیل مشکلوں سے سبھی مگر فراز کا موڈ بحال ہو گیا تھا۔ فراز بیٹا تھا ان کا اس لیے انہیں اس کی پروا تھی۔ ایمان کی لگتی تھی ان کی کہ انہیں اس کی دل جوئی اس کے احساسات کی پروا ہوتی۔ اب تو وہ مسیحا بھی نہیں رہا تھا جس پر اعتماد کرتے ہوئے ایمان نے اتنا بڑا قدم اٹھالیا تھا۔

رات بھر بھی وہ بے خواب رہی تھی۔ بے چینی سے کروٹیں بدلتی ہوئی مضطرب اور صبح دم جو اس نے خواب دیکھا تھا وہ امامہ کے متعلق

تھا اور اتنا بھیاں تک تھا کہ اسے یاد کر کے بھی ایمان کا دل کانپ اٹھتا تھا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد بھی وہ یونہی رینگ کے سہارے کھڑی آنسو بہاتی رہی۔ دھیان کے تمام ارکان کا حویلی اور وہاں کے کیمینوں سے جا لگے تھے۔ کتنی بار اس کا دل چلا تھا حویلی فون کرے مگر ہر بار ہی اس نے خود کو روک لیا تھا۔ ان کے زخموں کو تازہ کرنے کا اسے کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ مری تو گئی تھی وہ ان کے لیے؟ لیکن دل کی بے قراری ایسی تھی جسے کسی پل بھی قرار نہیں تھا۔ وہ خود کو روک نہیں سکی۔ موقع بھی مناسب تھا۔ وہ فون استعمال کر سکتی تھی آزادی سے کیونکہ گھر پر کوئی نہیں تھا۔ کچھ دن پہلے شریل نے جس طرح بہانہ کر کے اس سے سیل فون لے لیا تھا اور پھر واپس نہیں کیا تھا وہ سمجھ سکتی تھی شریل کو اب اس پر اعتماد نہیں رہا۔ اس نے چپ سا دھکی۔ کسی قسم کا کوئی احتجاج نہیں کیا۔ اب اسے خود کو یہ پور کرانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ اپنے گھر والوں کا ہی نہیں اس شخص کا بھی اعتماد کھو چکی ہے۔

جب وہ ٹیلی فون تک آئی تو اس کی ٹانگیں جانے کس کس احساس کے زیرِ تخت کانپ رہی تھیں۔ گو کہ وہ جانتی تھی کہ گھر پر اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے پھر بھی وہ اس حد تک عدم اعتماد کا شکار ہو چکی تھی کہ اسے اپنا آپ چوروں کی طرح مشکوک لگنے لگا تھا۔ شک عدم تحفظ اور ذلت وہ قیثے تھے جو اس کی خود اعتمادی کا خون کر چکے تھے۔ اسے اس گھر میں آنے کے بعد یہی احساسات وافر مقدار میں ملے تھے۔ حویلی کا نمبر ملا تے ہوئے اس کی انگلیوں میں ہی نہیں دل اور روح میں بھی لرزش اترنے لگی۔ دوسری جانب کھنٹی بجنے لگی تھی۔ اس کا دل اس کے وجود کے ہر حصے میں آ کر دھک دھک کرنے لگا۔ وہ نہیں جانتی تھی دوسری جانب کون فون اٹھاتا۔ اگر بابا سائیں ہوتے تو وہ بھی بات نہیں کر سکتی تھی۔

”ہیلو۔“ آخری کھنٹی تھی اور ایمان مایوسی کا شکار ہونے لگی تھی۔ جب کال رد ہوئی اور اس کی سہمی ہوئی سماعتوں نے سکند کی ٹھہری ہوئی آواز کو سنا تھا اور جیسے دل یکدم کسی اپنے کے احساس کو پا کر شدید ترین بھراہٹ کا شکار ہوتا چلا گیا۔ وہ ہزار خواہش کے باوجود منہ سے آواز نکالنے سے قاصر رہی کہ آنسوؤں کا گولا سا گلے میں چھنس گیا تھا جبکہ دوسری جانب سکندر ہیلو ہیلو کرتا اس سے قبل کہ جھلا کر فون بند کر دیتا وہ گھبرا کر سسک کر اسی خوف سے بول پڑی تھی۔

”مس..... سکندر..... پلیز سکندر فون بند نہ کرنا۔“ الفاظ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکلے اور آدھے سے زیادہ فقرہ بھراہٹ کے باعث شاید دوسری سمت اپنا مفہوم پہنچانے میں بھی ناکام رہا۔

”کون..... ایمان بی بی.....؟“ سکندر کی سرسرائی ہوئی آواز نہ صرف سرگوشی میں دھل گئی تھی بلکہ اس میں بلا کی غیر یقینی

استغاب کا رنگ بھی گہرا تھا۔ جواب میں ایمان خود پر ضبط کھڑی تھی۔ ”مجھے بتاؤ سکندر وہاں سب کیسے ہیں؟ بابا جان لااریب اور..... اور امامہ وہ ٹھیک ہے نا؟“ دل میں لٹانے والا شدید خوف ہراساں کر ڈالنے والے اندیشے اضطرابی کیفیت میں دھل کر آنسوؤں کی صورت سے بے دریغ برس پڑے۔ جبکہ دوسری جانب لائن پر اتنا سنا تھا جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو۔

”سکندر کچھ تو بولو خدا کے واسطے مجھے بتاؤ وہاں سب خیریت ہے نا؟“ وہ متوحش زدہ اسے پکارتی سوال پر سوال کرنے لگی۔

”مجھے یہ کہنے کا حق تو نہیں ہے ایمان بی بی کی کتاب کو یہاں فون نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن یہ ضرور ہے اگر بابا سائیں یا لاریب بی بی کو پتا چل گیا تو.....!“

”تم کسی سے بھی میرے فون کا کچھ نہ کہنا۔ مجھے تم صرف امامہ کے بارے میں بتاؤ وہ ٹھیک تو ہے نا؟“ کتنی بے قراری تھی اس کے لہجے میں ایسی تڑپ اور وحشت کہ سکندر کا دل بھی کانپ اٹھا۔

”جی وہ ٹھیک ہیں شادی ہوگئی ہے ان کی۔“ سکندر کا لہجہ و انداز ٹھہراؤ لیے ہوئے تھا ایمان پر البتہ خیر بھلی بن کر گری تھی۔

”شادی..... امامہ کی؟“ وہ ششدر رہ گئی تھی۔ اسے یقین ہی نہ آیا تھا۔

”کس کے ساتھ ہوئی شادی؟“ وہ ٹھٹھک کر پوچھ رہی تھی۔

جواب میں اس نے سکندر کے سر تاہ بھرنے کی آواز سنی۔

”وقاص سائیں کے ساتھ۔“ اور ریسیدر ایمان کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے جا گر لے لگا تھا وہ ایک دم جان کنی کے عالم میں آ گئی ہو۔ آسمان ٹوٹ کر اس کے سر پر آ گرا تھا اور قدموں تلے زمین نہیں رہی تھی۔ وقاص..... جس کی غلیظ نظروں اور سوچوں سے اتنی خائف تھی وہ کہ اس سے بچاؤ کی خاطر ہی اس نے شریل کے ساتھ یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا کہ اس کے علاوہ تو اسے کوئی اور راستا سوچتا ہی نہ تھا بچاؤ کا۔ مگر وہ یہ فراموش کیوں کر گئی تھی کہ اس کا خلیزہ اس کی کسی جہن کو بھی بھگتا نہ سکتا تھا۔ بہن بھی وہ جسے اس نے ہمیشہ اپنی آنکھوں میں اس طرح چھپایا تھا کہ سرد گرم اس تک پہنچنے نہیں دیے تھے۔ اب اس کی وجہ سے اس پر اتنی بری افتاد ٹوٹ پڑی تھی تو اسے خود اپنے آپ سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ یہ آگاہی نہیں تھی کچھ تھا انجان لیا کچھ تھا اس سے بڑھ کر بھی کوئی قوت اظہار احساس ہو سکتا تھا کہ ازالے کی کوئی راہ بھی کھلی نہیں تھی۔ یہ نقصان عمر بھر کا تھا۔ طوفان آچکا تھا۔ قیامت برپا ہو چکی تھی۔

دل پر مال کے جتنے بھی موسم اترتے تھے ان سے اس نے دلہنہ نگاہ نہ لی۔ وہ فتح کا ارادہ لے کر میدان میں اتری تھی۔ تو اب

جیت کو اس کا مقدر ہوتا ہی تھا۔ یہ عشائیہ کی تقریب تھی۔ جو ساحر کی جانب سے دی گئی تھی۔ اسی میں فراز اور نندی کو بطور ہیر و ہیر وٹن پوری ٹیم سے متعارف کرایا گیا تھا اور فلم کے اسکرپٹ پر اظہار خیال کے علاوہ خاص طور پر نندی کو اس کے کردار کے متعلق اسرار و رموز سے آگاہ کیا گیا تھا۔ ویسے تو فراز بھی اس فیلڈ میں نیای تھا مگر نندی کو تو الف سے بے تک آگاہی نہیں تھی۔ اس کی سلیکشن کی وجہ سے اس کا حسن تھا۔ جس کی خاصی دھوم اور کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ خاص طور پر نوجوان لڑکے تو اس کی نگاہ التفات کی خاطر مرے جاتے تھے۔ عباس خود بھی نندی کے کام کے متعلق کورے پن کو جان گیا تھا کہ اسے نندی کو اچھا خاصا پالش کرنا پڑا تھا۔ عباس نے اسے فردا فردا سب سے ملوایا۔ وہ اس کے پہلو میں یوں چپک رہی تھی جیسے چاند کے گرد قطبی ستارہ دھمکا ہے۔ ہر نگاہ میں ستائش تھی ہر کسی نے ہی عباس کے انتخاب کو سراہا اور دلدی تھی مگر عباس کا پروڈیوسر آفاق سرحدی تو جیسے نندی پر بری طرح فریفتہ ہوا جا رہا تھا۔

”اگر میں تمہاری ہیر وٹن کو پہلے دیکھ لیتا تو لازماً اس نے چھو کرے کو ہٹا کر خود اپنا نام پیش کر دیتا ہیر وٹن کے لیے۔“ اس کا لہجہ عامیانہ تھا جس نے عباس کے ماتھے پر ناگواری کی شکن ابھاری۔ نندی سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا مگر وہ عورت کی عزت کرنا جانتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے آفاق کا یہ انداز پسند نہیں آ سکا۔ اس نے ہونٹ پیچ کر ایک نظر نندی کو دیکھا جو اس کے پہلو میں کھڑی اتنی آسودہ اور سرشار لگ رہی تھی کہ جیسے آفاق کی بات پر کان دھرا ہی نہ ہو اور یہ سچ بھی تھا۔ نندی کو اس کے سوانہ کچھ سنائی دے رہا تھا نہ دکھائی۔ اس کی نظر تو جب بھی عباس پر پڑتی تھی اس نے عباس کی نگاہ کو اپنے چہرے پر ٹھہرتے محسوس کیا تھا۔ اس نے خود کو داد دی تھی۔ ابھی شروعات تھی اسے یقین تھا وہ اس شخص کو بہت جلد تسخیر کر لے گی۔ وہ اس کی سوچ اور توقع سے زیادہ آسان ہدف ثابت ہوا تھا۔

پھر بعد کے مراحل بھی بہت تیزی سے طے پاتے چلے گئے۔ یہ فلم سائن ہونے سے لے کر اداکاری کے اسرار و رموز سیکھنے تک۔ یہ الگ بات کہ نندی کا ان کاموں سے کہیں زیادہ دھیان عباس میں انکار ہوتا تھا اس باس ہی موجود ہوا کرتا تھا۔ بظاہر نہ بھی اس کی جانب متوجہ ہوتا تو کیا فرق پڑتا تھا۔ عباس کا ٹیم ورک مضبوط تھا اور ورکرز بے حد محنتی۔ مگر نندی جو عباس حیدر کے لیے موسم کی ڈلی تھی جسے وہ جیسے چاہتا جیسی مرضی شکل میں ڈھال لیتا البتہ اس کے ورکرز کے لیے وہ بے حد مشکل کری ایٹ کرنے لگی تھی۔ اسے کسی کا نظر نہ کر دیکھنا اور کوئی سراہتا ہو فقرہ بھی آگ بگولا کر جاتا۔ پھر ایسے میں یہ تو انتہائی تھی کہ اس کے کیمرا مین نے نندی کا ہاتھ پکڑ کر کوئی بات کہنے یا سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اتنا آپے سے باہر ہوئی کہ زمین



آسمان ایک کرسے سے ہی تھی۔ کسرا میں کی اس نے اتنی توہین کی تھی کہ وہ بے جا رہ گویا کر رہ گیا تھا اس بات پر اس کے دیگر ساتھی اور ہمنوا بھی اٹھ کھڑے ہوئے جسے ایک ایٹو کھڑا ہو گیا تھا۔ نندنی کے اصل اضطراب اور رنج کا باعث ہی یہ بات تھی کہ صبح سے اسے عباس کی ایک جھلک بھی دیکھنے کو نہیں مل پاتی تھی۔

”کسے جرات کیسے ہوئی کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اسے سمجھا دو میں کسی ایسے دیسے گھرانے کی لڑکی نہیں ہوں کہ جس کی بھی مرضی چاہے ہاتھ پکڑ لے۔“ نندنی نے شدید غصے کی کیفیت میں جب کوئی دسویں بار یہی بات جتلائی تو کسرا میں شیراز کو بھی تپ چڑھ گئی تھی یعنی حد تک تذلیل کی۔

”اعلیٰ خاندان کی ہو یا پھر معمولی۔ اس فیلڈ میں آنے والی ہر عورت پبلک پر اپنی میں شمار ہوتی ہے اس کے متعلق ہر کوئی بہت آزادی سے رائے دینے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ اگر تم اتنی ہی پاکباز تھیں تو پھر یہاں نہیں آنا تھا، آئی سمجھ۔“ شیراز جس پل لال بھوکا چہرے کے ساتھ نندنی کو اس کی اوقات یاد دل رہا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب کسی کی بد وقت اطلاع پر عباس عجلت میں وہاں پہنچا تھا مگر تب تک معاملہ بہت حد تک سنگین ہو چکا تھا کہ شیراز کی اس واہیات بات کے جواب میں نندنی اتنی پھری تھی کہ اس نے طیش میں آ کر آؤ دیکھنا تاؤ شیراز کے منہ پر پھڑپھڑے مارا تھا۔ پورے ہال میں جیسے سناٹا چھا گیا ایک سکسٹی کام کرنے والی لڑکی سے وہاں کسی کو بھی اس درجہ جرات مندی کی توقع نہیں تھی۔ نندنی کا غصہ پھر بھی کم نہیں ہوا تو وہ ایک جھٹکے سے جانے کو مڑی مگر شدید کھڑے عباس حیدر سے ٹکرائی۔ دونوں کی نظریں یکبارگی ملی تھیں۔ ایک کی آنکھوں میں حیرت وغیرہ یقینی اور تاسف تھا دوسرے کی آنکھوں میں ہنوز غم وغصے کی کیفیت کی شدتیں اور حدتیں تھیں وہ ر کے بغیر آگے بڑھ جانے کو بھی جب عباس حیدر نے بے اختیار اس کا بازو کھینچ لیا۔

”آپ ایسے نہیں جائیں گی نندنی صاحبہ یہ معاملہ جس حد تک بگڑا ہے اسے سدھارنا میری ذمہ داری ہے شیراز آپ بھی آجائیں یہاں۔“ وہ یونہی بٹھہرے ہوئے لہجے میں کہتا نندنی کا بازو پکڑے کچھ فاصلے پر موجود کرسیوں کی جانب آ گیا۔ نندنی تو جیسے مسراناڑ تھی۔ اب اس کی کیا بوقت اور مجال تھی کہ وہ عباس کے سامنے اس کی مرضی کے برخلاف انہی بھی کر جاتی۔ عباس کے ہاتھ کے اچلتے ہوئے پریشاں لمس سے زندگی کی حرارت اس کے جسم و جاں میں اتر کر پھیل جانے لگی تھی۔ اس لمس نے ہی تو احساس زندگی سے واقفیت دی تھی۔ اسے ناز کرنے پر اکسایا تھا۔

شیراز بے حد خراب موڈ کے ساتھ کرسی سنبھال چکا تھا۔ عباس

نے دیگر لوگوں کو وہاں سے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ پھر نندنی کو بخیرید کر نکلتا بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی کرسی پر ٹپک گیا۔ نندنی حواسوں میں کہاں رہی تھی اس کے سامنے تو اب دھنک رنگ سجے تھے سراسر لال کا ایک جہان آباد تھا۔

”جی اب مجھے بتائیں کیا ہوا تھا؟“ وہ بیک وقت دونوں کو مخاطب کر چکا تھا۔ شیراز اس کی طرح نہ سحر زدہ تھا نہ ہی مسراناڑ کچھ نہیں کہہ پاتا۔

جسے اس نے ساری بات غصے میں کھول کر عباس کے آگے رکھ دی۔ پھر اس شدید لہجے میں نندنی کو گھورتے ہوئے بولا تھا۔

”ان سے پوچھیں سرکہ انہیں اتنا ذمہ خیر کسی چیز کا ہے؟ دولت و حسن نہ تو ان محترمہ کی ہی میراث ہے نہ ایسی انوکھی چیز کہ جس کی بدولت کوئی ان سے دب کر رہنے پر مجبور ہو جائے۔“ اس کے لہجے میں دہائی ہوئی نفرت تھی۔ عباس حیدر نے شخص ہنکارا بھرا تھا پھر سوالیہ نظروں کو نندنی پر جمادیا۔

”اب آپ کیا کہیں گی مس نندنی۔“ وہ منتظر تھا مگر نندنی کی چپ نہیں ٹوٹی۔ عباس کو غصا آنے لگا۔

”اس کا مطلب ہے مس بی ہوا آپ نے کیا ہے مس نندنی۔“ وہ چیخ کر رہ گیا۔ نندنی کے آنسو بہہ نکلے۔ عباس تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آنسو اس کے لہجے کی پیش کو نہ سہتے ہوئے بہے ہیں۔ اس کے لہجے کی معمولی تخی بھی نندنی کے دل کے ہزار ٹکڑے کر سکتی تھی۔

”میں ایسی لڑکی نہیں ہوں کہ کوئی بھی منہ اٹھا کر میرا ہاتھ پکڑے اور میں برداشت کر لوں۔“ وہ خاصی تاخیر سے بولی تب بھی اس کا لہجہ بھرا ہوا ہی تھا۔ عباس حیدر نے ٹھنڈا سا لمس بھر لیا۔

”دیکھیں یہ اس فیلڈ کا تقاضا ہے نندنی۔ اتنی بے تکلفی تو عام بات ہے۔ خیر اگر آپ ریزروڈ ہیں تو آئندہ یہ لوگ احتیاط کریں گے لیکن چونکہ آپ شیراز صاحب کے ساتھ مس بی ہو کر چلی ہیں تو آپ کو سوری کہنا چاہیے انہیں۔“ عباس حیدر کے نرم لہجے میں کہنے پر نندنی نے شدید قسم کی ناگواریت محسوس کی۔

”ممہ..... بگر.....!“

”اگر مگر کی گنجائش بالکل نہیں ہے مس نندنی۔ میرے لیے میرے پینل کا ہر میسر اتنی ہی اہمیت اور عزت افزائی کا حامل ہے جتنی آپ یا مسٹر فرناز۔ میں کسی کو بھی کسی کی عزت نفس مجروح کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ سوری کریں شیراز سے۔“ اب کہ اس کا لہجہ حکم آمیز تھا۔ نندنی کے بازو کے احساسات بکھر کر رہ گئے۔ اس نے ٹکے کٹا دی کی اس کے نزدیک حیثیت نہیں تھی کہ وہ سوری کہتی مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ ساحر کے حکم کی اپنہ تھی۔ سو اس نے بھی شیراز سے معذرت طلب کی تھی تو ریشمی پلکوں سے کچھ ستارے ٹوٹ کر عزت



نفس مجروح ہونے کے باعث کرشل جیسے گالوں کی ملامت پر بکھرتے کم ہو گئے۔ عباس حیدر سگریٹ سلگاتے لمحہ بھر کو متوجہ ہوا تھا۔ مگر مشکل میں جا پڑا۔ یہ منظر ایسی ہی کشش سمونے ہوئے تھا کہ وہ سحر زدہ سال سے نکلے گیا۔ منہ بند گلاب کی کٹی پریشانی اوس کا گرنا اسے یہی خیال آیا تھا۔

”اس اوکے مجھے امید ہے آپ آئندہ ہمارے ساتھ کتا پریت کریں گی۔“ شیراز نے رسانیت سے کہتے اس کی معذرت کو قبول کیا اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ تب عباس بھی جیسے اس ٹرانس سے نکل آیا۔

”آپ چائے پیئیں گی تندنی۔“ عباس نے اس کی گہری یاسیت کو محسوس کر کے ہی نرمی سے مخاطب کیا تھا۔ تندنی نے چونک کر اسے دیکھا پھر سرگوشی میں ہلاتے ہوئے پلکیں جھٹکالیں۔

”مجھے چلنا چاہیے بہت دیر ہو گئی ہے۔“ وہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا دل اتنا بھاری تھا کہ رونے کی خواہش بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اس بوجھ کو جلد از جلد اتارنا چاہ رہی تھی۔

”چلیں میں ڈراپ کر دوں آپ کو۔“ عباس نے سگریٹ بجھائی اور کرسی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تندنی نے غیر یقینی میں متلا ہو کر اسے دیکھا پھر جیسے اس کے چہرے پر روشنی ہی چھائی چلی گئی۔ اسے صاف لگتا تھا عباس حیدر اسے خصوصی اہمیت سے نوازتا ہے۔

”میں کسی کے پرسنل میٹرز میں انٹرسٹ نہیں رکھتا ہوں تندنی مگر پتا نہیں آپ کے ایٹی ٹیوڈ کو دیکھ کر مجھے کتنا ایسا کیوں لگتا ہے کہ آپ کو دولت و شہرت میں سے کسی چیز کی نہ خواہش ہے نہ حاجت شوبز میں بھی آپ کی دلچسپی مفقود ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی آپ نے پھر بھی میری آفر کو کیوں قبول کیا۔“ جس پل وہ اس کے ہمراہ اسٹوڈیو کے گیٹ سے نکل کر پارکنگ میں آ رہی تھی عباس حیدر نے بہت الجھن آمیز انداز میں کہا تھا اور جواب میں تندنی کے اندر موسم سرما کی ہواؤں کی سرسراہٹ ہونے لگی تھیں۔ کاش وہ جواب میں وہ ساری پیتا سنا پانی جو اس کی ایک نظر کے خراج میں اسے بھٹکتی پڑی تھی۔ اسے رونا سا آنے لگا۔ بے بسی کی یہ کیسی انتہا تھی کہ وہ سامنے تھا۔ صدیوں کی تلاش کا حاصل مگر وہ اس کا نہیں تھا وہ کہہ نہیں سکی کہ یہ اس کی عیاشی نہیں تھی شوق بھی نہیں تھا۔ یہ تو اس کی مجبوری تھی۔ زندگی نخل کی تیج پھولوں کا بستر ہوتی ہے۔ انسان انسانوں سے ملتا ہی رہتا ہے مگر کوئی خاص ہوتا ہے۔ جس کی نظر کا طلسمی احساس آپ کی زندگی کو یکسر بدل دیتا ہے۔ پھر ستاروں کا اک نیا جہان متعارف ہونے لگتا ہے۔ انسان ایک لمحے میں اڑ کر اس جہان میں پہنچتا ہے جہاں کی تہذیب رکھ رکھاؤ میں بس یارمن کا حکم چلتا ہے۔ اس کی پنشن آبرو پر نظر آس جا کر بے بسی ہے وہی

طلب کا باعث..... وہی غرض کا مرکز۔

”آئی ایم سوری شاید آپ کو میری یہ بے تکلفی بھی پسند نہیں آسکی۔ میں نے ایک بات جو محسوس کی وہ کہہ ڈالی آپ پر جواب دینا لازم نہیں ہے۔“ عباس حیدر خفیف سا ہو گیا تھا جواب کی بات کے باعث اسے تندنی کی سوچوں تک بہر حال رسائی نہیں تھی۔ شیراز والے معاملے میں وہ اس کی شدت پسندی سے آگاہ ہو چکا تھا۔ آخر وہ بھی مرد تھا۔ اس کی یہ جسارت بھی تندنی کو گراں گزر سکتی تھی۔ تندنی نے چونک کر بلکہ ہڑ بڑا کر اسے دیکھا اور بے تحاشا شرمسار نظر آنے لگی۔

”نہیں پلیز ایسی بالکل بھی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ محسوس کریں پلیز۔“ جھکے سر کے ساتھ خفت زدہ انداز میں اس کی لٹی کرتی ہوئی تندنی نے عباس حیدر کو پھر سے اپنے رویے سے الجھا ڈالا تھا۔ اسے یکدم احساس ہوا تھا تندنی کا رویہ اس کے لیے خصوصی اہمیت لیے ہوئے ہے۔ وہ اس کے ساتھ تلخ اور سخت لہجے میں بات نہیں کرتی جو وہ اپنے ساتھیوں کے لیے اس کا محسوس کر چکا تھا۔ اس کی وجہ اس نے اپنے عہدے کا برتر ہونا لیا تھا۔ اس کے امتیاز کا باعث ہی ہو سکتا تھا۔ وہ اس کے علاوہ کچھ اور سوچنے پر آمادہ نہیں تھا۔

”جہاں تک میں نے آپ کو سمجھا ہے آپ صرف ریزرو نہیں شائی بھی ہیں۔ لڑکیوں میں ان خوبیوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے جب میں خواتین کو اس نعمت سے سرفراز پایا ہوں۔ اپنی ویز۔ میں پوری کوشش کروں گا ہمارے کام کے دوران کم از کم آپ کے احساسات و جذبات مجروح نہ ہوں۔“ عباس کا لہجہ دوستانہ اور اپنائیت آمیز تھا۔ تندنی جواب تک سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس بات پر عجیب سے احساسات کا شکار ہو گئی۔ اس کے ہاتھ ہر داہنی کلائی کا وہ حصہ تھا جہاں عباس حیدر کا لمس اترتا تھا۔ وہ اسی کیفیت اسی مدھوشی میں گم رہنا چاہتی تھی مگر اسے قدم قدم پر دھچکے لگتے تھے۔

”صرف کام کے دوران؟“ اس کے شکر فی ہونٹ کا پنے تھے لہجہ کو کہ مدھم تھا مگر اتنا ضرور تھا کہ عباس سن لیتا جیسی وہ کاغذ سے جھٹک کر بے اعتنائی سے مسکرا دیا۔

”ظاہر ہے آپ خود کو اس مووی کے بعد ہم تک تو محدود نہیں رکھیں گی۔ دیکھیں میرا کام کرنے کا ایک الگ انداز ہے۔ میں اپنی فلم کے لیے نئے چہرے متعارف کراؤں گا۔ ہمارا ساتھ تو بس یہی ہوگا۔“ عباس نے لمحے کے ہزار ہویں حصے میں اس پر پھر اس کی اوقات واضح کر کے رکھ دی تھی۔ تندنی کا رنگ بھیک پڑنے لگا۔ اس کے اندر سے لڑتا حزن پورے ماحول پر چھاتا محسوس ہونے لگا۔ یہاں تک کہ عباس نے بھی اس حزن کو محسوس کر لیا جیسی قدرے

وہاں سے اسے دیکھا تھا۔

”خیریت آپ کو میری بات بری لگی یا پھر میں آپ کے بازو کو زبردستی سختی سے پکڑ چکا ہوں۔“ اس کے نمبر تر لہجے میں خفیف سی شرارت کا رنگ اتر آیا تھا اور نگاہ اس کے ہاتھ پر تھی جو ابھی تک اپنا بازو تھامے ہوئے تھی۔ گوکہ عباس نے مزاح کے رنگ میں کہی تھی۔ اس کے باوجود تندنی کے رنگ دے دے میں ایسی سنسنی پھیلی کہ وہ لکھنٹ سرخ پڑتی چلی گئی تھی۔ شرم و حیا گریز اور خفت کا ایسا خوب صورت سنگم اس سے قبل شاید ہی عباس کی نگاہ سے گزرا ہو۔ وہ چند ثانیوں کو سہی مگر اپنی نظروں پر اختیار کھو بیٹھا۔ معاوہ سنبھلا اور دانستہ کھٹکھٹا اسے یکدم احساس ہوا تھا ان کے بیچ اس کے ناچا ہے ہوئے بھی معنی خیزیت دہائی ہے اور یہ سراسر اس کے ہی فقرے کی بدولت تھا۔ جیسی اس نے معاملے کو سرسری رنگ دینا چاہا۔

”مطلب آپ کی طبع نازک پر ناگوار گزرا ہوگا۔ آف کورس شیراز صاحب کی طرح ہوں تو میں بھی ایک مرد اور وہ بھی بالکل غیر تو اختیار تو لازم تھی مگر غصے میں مجھے کچھ خیال نہیں رہا۔“

”اس اوکے مجھے برا نہیں لگا بالکل بھی۔“ وہ مدھوش تو تھی ہی بے اختیاری میں اپنے دل کی بالکل صحیح عکاسی کر گئی۔ اس بار کی پر دھیان دیے بنا کہ عباس اس بات سے آخڑ کیا نتیجہ اخذ کرے گا۔ ہوا بھی یہی تھا۔ عباس صرف چونکا نہیں ٹھٹکا بھی۔ اس نے قدرے گہرائی سے تندنی کے تاثرات کا از سر نو جائزہ لیا۔

”بے خودی سرشاری طمانیت کے ساتھ جھینپ وہ کتنی آسودہ لگتی تھی مگر کیوں؟“ عباس نے خاموشی سے اس بات پر غور کیا۔ کیا وہ شیراز کی طرح غیر مرد نہیں تھا اس کے لیے؟ ہاں البتہ وہ شیراز کی طرح عام سانو جوان نہیں تھا۔ وہ دلکش تھا مگر انگریز تھا۔

”آپ کا گھر آچکا ہے تندنی صاحب۔“ گاڑی کے رکنے کے بعد بھی جب اس نے تندنی کے وجود میں کوئی تحریک محسوس نہ کی اور اس کی بے خودی کو ہنوز پایا تو عباس نے کسی قد جھٹلاتے ہوئے مگر پر تش انداز میں اسے مخاطب کیا تھا۔ تندنی ہڑ بڑا کر سیدھی ہوئی اور اس کے چہرے کی بے اعتنائی کو محسوس کرتی خفت سے سرخ پڑ گئی۔ گاڑی سے اترتے ہوئے اس نے عباس کو اندھا آنے اور چائے والا وعدہ یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔ جسے عباس نے اسی بے رخی سے ٹھکرایا جو اس پل اس کے چہرے اس کی آنکھوں سے پھٹک رہی تھی۔ تندنی کے قدم جیسے ہی زمین پر آئے عباس نے ایک جھٹکے سے گاڑی بڑھا دی تھی۔ تندنی کچھ مضطرب سی فراتے بھرتی لمحہ بہ لمحہ ہوتی گاڑی کو خالی نظروں سے نکلتی رہی۔



پڑا ہے واسطہ محسن محبت کے یزیدوں سے

یہاں ہم اپنی آنکھوں میں بھی پانی رکھ نہیں سکتے اس نے ایک سرآہ بھری اور ہونٹ جھنجھک کر آنکھوں کی نمی کو اندر اتار لیا۔ سرخ بناری ساڑھی اس کے بخار زدہ جسم پر چھ رہی تھی۔ مگر وہ لباس بدل کر خود کو آرام دہ حالت میں نہیں لاسکتی تھی۔ یہ دقاص کا حکم تھا۔ وہ اسے جی سنوری اچھی لگتی تھی۔ اس کی طبیعت آج بھی ٹھیک نہیں تھی۔ مگر دقاص کو اس کا احساس کہاں تھا۔ شادی کی پہلی رات سے ہی دقاص نے اسے اپنے ہر انداز سے جتلا دیا تھا کہ وہ اس کے نزدیک پیر کی جوتی سے برتر اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کا رویہ شدید ہتک آمیز تھا۔ امامہ جس سنہرے خواب کی ڈور سے بندھی یہاں تک چلی آئی تھی وہ چھنا کے سے ٹوٹ گیا تھا۔ یہ وہ دقاص تو کہیں سے بھی نہیں تھا جو اسے سنے دکھاتا تھا۔ جس کے بھاری لہجے میں اتنی تاثیر تھی کہ وہ عموماً کا فرق بھلائے اس کی رفاقت اور ہمراہی کی خواہش کرنے لگی تھی۔ اس کی معصومیت اس کا بھولین دقاص کی پختگی اور کڑھکی کے سامنے خاک میں مل گیا۔ اس کی رفاقت کی محض ایک رات میں وہ اپنا لڑکپن اپنا بچپن اور جوانی پھلانگ کر جیسے یلکھت بڑھاپے کی سرحد پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ اگر واقعات بے رحم اور حالات سفاک ہوں تو ذہن صدیوں کا سفر بھی منٹوں میں طے کر جایا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا تھا۔ وہ ان چند راتوں میں اتنی بڑی اتنی مجبور ہو گئی تھی کہ کدھ کو بردوں میں چھپنا شوہر کے بھید و راز خفیہ رکھنا اسے سب آ گیا تھا۔ جیسی تو اس نے فون پر لاریب سے رابطہ کر کے اسے دھوکا دینے کی بھی کوشش کی تھی اور خود کو ہر لحاظ سے خوش ظاہر کر کے دکھایا کہ جانتی تھی لاریب اس کی وجہ سے کس عذاب سے دوچار ہے۔ ولیمہ کے دن جو اس کی اجازت صورت دیکھ کر وہ گئی تھی اس کے بعد اسے سکون ملنا بھی کہاں تھا۔ اس نے دقت گزاری اور دل کے اندر گونجتے سناٹوں سے نجات حاصل کرنے کو کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ شام کی برقی ہوائیں کوئی دور کے پار وسیع لان میں لگے درختوں کے پتوں کو بھی ٹھٹھار رہی تھیں۔ فضا کی نمی اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ رات کو بارش ہوگی۔ اس کے اندر ویسا ہی کہہ اتر آیا جیسا باہر فضاؤں میں اتر رہا تھا۔ اس نے بے دلی سے کھڑکی بند کی اور آکر بیڈ پر لیٹ گئی۔ آتش دان جل رہا تھا مگر سردی سے پھر بھی جسم آکڑا جاتا تھا۔ اس نے اپنے اوپر کپل جھنجھکیا۔ تلخ اندھیرے میں آتش دان کی تاریکی آتش روئی بہت خواب ناک لگی رہی تھی مگر حیات اسے چونکا نے کا باعث تھی وہ دقاص کی کمرے میں موجودگی تھی۔ جانے وہ کس پل کمرے میں آیا تھا کہ اسے خبر نہیں ہو سکی تھی۔

اس کے پہلو میں براجمان سگریٹ ہونٹوں میں دبائے وہ



اسے کتنی گہری اور بھرپور نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ امامہ کا بخار کی حد توں سے دکھتا ہوا چہرہ کچھ اور بھی لودینے لگا۔ وہ گڑ بڑا کر تیزی سے سیدھی ہوتا جاہتی تھی مگر وقاص نے اپنا مضبوط آہنی بازو اس کے اوپر رکھ کر اس کو کشش کو ناکام بنا لیا۔ امامہ کی نظریں جھکی تھیں اور ریڑھ کی ہڈی میں سر لہر دوڑنے لگی۔ چہرہ بھی متغیر ہو چکا تھا۔

”ڈرنی کیوں ہو مجھ سے..... پسند نہیں کرتی تم بھی اپنی دلوں بہنوں کی طرح مجھے؟“ وقاص کے سر دلچے میں غراہٹ دہاتی تھی۔ امامہ کا دل لرز نے لگا۔ اس کی دھاڑ پر وہ حواس باختہ ہو کر زور سے سر کو نفی میں دائیں بائیں ہلانے لگی۔

”نہ..... نہیں۔“

”کیا نہیں..... یعنی پسند نہیں کرتی ہو مجھے؟“ وہ چٹکھڑا تھا اور امامہ نفی چہرے کے ساتھ رو پڑی۔

”نہیں..... میرا مطلب ہے ایسی بات نہیں میں تو آپ سے محبت.....!“

”بس.....!“ وہ حلق کے بل غرایا اسے بے تحاشا نفرت زدہ نظروں سے گھورنے لگا۔

”جھوٹ نہیں بولنا مجھ سے مجھے مکاری سے دھوکے سے شدید نفرت ہے۔“ اس نے جھپٹ کر امامہ کا سراپہ چہرہ اپنے نولادی پنجے میں دبوچ لیا۔ امامہ خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپنے لگی۔ وقاص جیسے اس کی بے بسی اور ہراسگی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ کافی دیر بعد جب اس نے امامہ کو اپنے پنجہ جنوں سے آزاد کیا تو امامہ غمگین اور نیم جان ہو رہی تھی۔ وقاص کے چہرے کی کڑکلی میں البتہ ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔

وہ اپنے کسی بھی عمل میں شرمندگی تو دور کی بات زیادتی کا احساس تک نہیں رکھتا تھا۔ اسے صرف ایمان کی چٹکے میں حرکت کا طیش ہی نہیں تھا بلکہ لاریب کا متکبرانہ رویہ بھی آگ بگولہ کیے رکھتا۔ ان سب تلخیوں کا بدلہ چکانے کو ہی اس نے امامہ کا انتخاب دانستہ کیا تھا۔ تو وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ لاریب اور ایمان کی وہ بیک وقت دھمکتی رگ تھی۔ اس کی ایک اور اہم اور خاص وجہ بھی تھی جس کی وہ قبل از وقت امامہ کو نہوا بھی لگانا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم اپنے مقصد کے حصول سے پہلے تو ہر گز بھی نہیں۔



اواس لہجوں اجازتوں

میرے نسل سے دور بھاگو

یہ نیند مجھ سے بزدل ہے کیوں؟

اس دکھ کو مجھ سے ہی پیار ہے کیوں؟

یہ لوگ جو میرے دہا بر ہیں

یہ میری سوچوں سے بے خبر ہیں

یہ مجھ سے کہتے ہیں تیلیوں پر

جگنوؤں پر کتاب لکھوں

کہ چاہتوں کا نصاب لکھوں

انہیں میں کیسے بتاؤں کہ اب

بہار موسم گزر چکا ہے

اواس بے گل خزاں کا موسم

میرے دل میں اتر چکا ہے

میرے قہقروں کا خوشبودوں کا

وہ دور کب کا گزر چکا ہے

اب تو جینا وبال اپنا

نندوب درنگ و جمال اپنا

تھا جس کو تھوڑا خیال اپنا

وہ شخص کب کا پھٹ چکا ہے

اچھی بھلی خلتی گاڑی کو اس نے یکدم بریک لگا کر روک دیا۔

اس کی خالی نظریں اس چوراہے پر ٹکی تھیں جہاں تینوں اطراف

سیڑکیں نکل رہی تھیں۔ چوتھے کنارے اس کی گاڑی کھڑی ہوئی

تھی۔ یہ جگہ شہر کی حدود کو ختم کرتی اور گاؤں کی اراضی کا آغاز کرتی

تھی۔ ایک طرف ان کی حویلی کو جاتی سڑک تھی دوسری طرف تاپا

سائیں کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ سڑک کے ساتھ کھیتوں کا وسیع

سلسلہ تھا پھر اس کے آگے باغات شروع ہو جاتے تھے۔ بچپن سے

لے کر جوانی تک اس نے جانے کتنی مرتبہ ان فاصلوں کو پاتا تھا۔ تاپا

سائیں کی حویلی میں اس کے لیے سب سے زیادہ کشش کا باعث

عباس حیدر کی موجودگی ہی ہوا کرتی تھی جو اس کے قدموں کو کشاں

کشاں دیاں لیے جاتی۔ ابھی وہ سرے سے نظر نہ آتا۔ کبھی قسمت

یاوری کرتی بھی تو وہ بس چوری چوری اسے دور دور سے دیکھا کرتی

اور بس۔ بات تو وہ بہت ہی کم کرتا تھا اس سے یہ اس کی وہ سنہری عمر

تھی جس کا دورانیہ چودہ پندرہ سال کی عمر سے انیس سال تک محدود

تھا۔ پھر خواب جھلس گئے اور دکھ اس کی جھولی میں آ پڑے اس سے

بھی پیچھے اگر وہ جانی تو تاپا سائیں کی حویلی میں امامہ اور ایمان کے

ہمراہ وہ بہت چھوٹی عمر میں بابا جان کے ہمراہ جاتی رہی تھی۔ جب

ان کی ماں کی وفات کو زیادہ وقت نہیں بیتا تھا اور تائی ماں نے ان کے

سر دل پر اپنی مامتا بھری چادر کو ڈال کر انہیں اپنی آغوش محبت میں

سمیٹ لیا تھا یہی وہ دن تھے جب بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کا

بار اٹھایا تھا اور اسے نو عمر بیٹوں کی نسبت ان پانچ لوٹا ٹھ سال کی عمر

کی بچیوں سے بالترتیب طے کر دی تھی۔ لاریب تب آنے والے

ہر دکھ و سکھ سے بے نیاز اکثر تائی جان کو چمکے دے کر امامہ کی انگلی



پکڑے کھیتوں اور باغات کی جانب جا نکلتی۔ کبھی بھٹے توڑ کر لاتی کبھی کچے کچے سنگترے اس کی فطرت میں عجیب بے چینی تھی جو کبھی اسے سکون نہ پہنچا دیا کرتی۔ حویلی کے دونوں اطراف تب خالی میدان ہوا کرتے تھے۔ پھر باغات اور باغات کے اختتام پر قبرستان۔ اسے یاد تھا ایک بار اس سے امامہ کھوئی تھی وہ سرخ سرخ سیب توڑنے میں ایسی لگن ہوئی تھی کہ امامہ کو فراموش ہی کر دیا۔ جب خیال آیا تو امامہ کہیں نہیں تھی۔

سات سالہ لاریب نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ باغ کا رکھوالا آواز سن کر بھاگا آیا اور صورتحال جان کر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑی گئی تھیں۔ اس کو تباہی پر جس میں اس غریب کا معمولی سا بھی حصہ نہیں تھا اس کے باوجود اسے دار پر چڑھایا جاسکتا تھا مگر خیر اس طرح گزری کہ تھوڑی سی تلاش بیکار کے بعد امامہ مل گئی تھی۔ لاریب نے ہی اسے سب سے پہلے دیکھا تھا۔ وہ میدان سے بھاگی آرہی تھی۔ ننگے پیر دھول اڑاتی چیختی اس کا فراک اس کے پیروں میں بار بار الجھتا تھا جو بے حد گندا ہو رہا تھا۔ دھول مٹی سے الی لاریب نے لپک کر اسے بازوؤں میں بھر لیا اس کے پیچھے بھاگ کرتے کتے کو غصے کے عالم میں آدھی اینٹ کا ٹکڑا اٹھا کر مارا تھا۔ امامہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ مسلسل رونے سے ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔

”یہ ڈاگ مجھے مار دیتا جو آگ آپ نہ آتیں۔“ امامہ اس سے لپٹی ہوئی سسک رہی تھی۔ لاریب نے اسے سمجھ لیا۔

”ڈرو نہیں میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔“ تب اس نے کتے بڑے پن سے اسے لپی دی تھی۔

”مگر اب.....!“ امامہ کو اس کی ضرورت ہے۔ یہی لگ رہا تھا اسے۔ وہ اکیلی ہے اور خوفزدہ بھی۔ لاریب کی آنکھیں جھپکی چلی گئیں۔ بنا کچھ مزید سوچے اس نے گاڑی کا رخ پھیر دیا آدھے گھنٹے کے مزید سفر کے بعد اس کی گاڑی بڑی حویلی کے بلند آہنی پھانک سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ وسیع وعریض حویلی کے سرسبز لان کے آغاز میں ہی پورچ تھا اس کی گاڑی سرخ بجری کی روش پر دیگر گاڑیوں کے پاس جا کر رک گئی۔ دروازہ کھول کر وہ اپنے اڑی بے نیاز پر اعتماد انداز میں باہر نکلی اور اندرونی حصے کی جانب آگئی۔ راستے میں ملنے والی ملازمتیں اسے بہت مؤدب انداز میں سلام کر رہی تھیں۔

لاؤنج کے صوفوں میں سے ایک پر تائی جان عذرا بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے میز پر کینوؤں اور سیبوں کی باسکٹ تھی۔ دوسرے صوفے پر مہر واپا براجمان تھیں۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا کینو چھپتے ہوئے ان کی نگاہ جیسے ہی اس پر اٹھی یکدم چمکتے ہوئے

خوشگوار قسم کی حیرت ان کی آنکھوں میں اتر آئی۔

”ارے لاریب چندا..... تو نامیری جان تم تو راستہ ہی بھلی گئیں کیسی ہو؟“ لپک کر اٹھتے ہوئے وہ پر جوش انداز میں اس کے گلے لگی تھیں۔ لاریب کا انداز البتہ لیادہ ہی تھا۔

”میں ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں تائی جان؟“ اس نے جیسے چرا مروت نبھائی تائی جان جو حسرت زدہ نظروں سے اسے تنک رہی تھیں۔ سر و آہ بھر کر لیکر انداز میں مسکرائیں۔

”شکر ہے مالک کا تم ٹھیک ہو..... بابا کیسے ہیں تمہارے؟“ وہ لمول تھیں اور بہت مدہم انداز میں بات کرتی تھیں۔ انداز ایسا ہوتا جیسے ان کا بیٹا نہیں وہ خود اس کی مجرم ہوں۔ کبھی وہ وقت بھی تھا جب وہ اسے اپنی اولاد سے بڑھ کر محبت دیا کرتی تھیں۔ سب کچھ بدل گیا تھا صرف عباس حیدر کے بدل جانے سے۔ لاریب کا دل عجیب سی اذیت کا شکار ہونے لگا۔

”میں امامہ سے مل لوں۔“ مہر واپا کے اصرار کے باوجود وہ وہاں بیٹھے بغیر پلٹ کر باہر نکل گئی۔ راہداری کے موڑ پر اس کا ٹکراؤ غیر متوقع طور پر وقاص حیدر سے ہوا تھا۔ سفید کلف شدہ کرتا شلو اور سیاہ دیسٹ کوٹ خوفناک مونچھوں کی صفائی کے باعث وہ انسانی طبع میں قدرے بہتر نظر آ رہا تھا مگر آنکھوں کی سرخی پہلے سے بڑھی ہوئی لگتی تھی۔ لاریب کو اس کی معنی خیز مسکان نے ہی جربز کیا تھا اس پر اس کا انداز گفتگو۔

وہ انہیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم ان کو بھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

دونوں بازو سینے پر لپیٹے وہ کچھ اس انداز میں پھیل کر کھڑا ہوا تھا کہ لاریب اس سے ٹکرائے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔

”راستے سے ہوا امامہ سے ملنے آئی ہوں میں۔“ لائی تا کواری کو دبائے وہ جبر کرتے ہوئے رمان سے کہہ رہی تھی۔ اس کے باوجود کہ وقاص کا چہرہ پتھر یلا تھا۔

”اور اگر میں نے ملنے دوں؟ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ تم مجھ سے ملنے نہیں آ سکتی تھیں کبھی بھی۔“ لاریب کے اعصاب کو زبردست شاک لگا تھا۔ اس نے بے اختیار چونکتے ہوئے خائف نظروں سے وقاص کو دیکھا۔

”کیا مطلب؟ تمہیں اندازہ نہیں شاید کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ بھڑک اٹھی تھی۔ جواب میں وقاص کے ہونٹوں پر زہر سے بھیجی مسکان پھیل چلی گئی۔

”اس لیے کہ وہ اب میری ملکیت ہے چاہوں تو تمہیں اس کی شکل کو بھی تریسا دوں کبھی بہت اجادہ داری تھی تمہاری اس پر لوہہ مجھ سے چھپا نہیں تھا۔ انجام دیکھ لیا اپنی خواب گاہ میں جایا ہے میں نے

تمہاری کمزوری کو۔“ وہ لاریب کی سرد مہری کے جواب میں پھر کر بولا۔ لاریب سن کھڑی رہ گئی۔

”جان تمہارا میں کہہ دیتی ہوں کہ تمہاری وہ۔ اب میری مٹھی میں ہے چاہوں تو اسے اگلا سانس نہ لینے دوں مگر بے فکر رہو اسے جان سے نہیں ماروں گا۔ بہت سے حساب نکلتے ہیں تمہاری طرف انتظار کرنا میری جوابی کارروائی کا۔“ وہ پھنکار رہا تھا اور لاریب..... لاریب کا وجود ہر لمحہ بے جان ہوتا جا رہا تھا۔ وہ عباس حیدر کا بھائی تھا۔ شکل و صورت میں اس کا پاسنگ بھی نہیں تھا۔ مگر قد و قامت چال ڈھال اور نقوش میں کہیں اس کی جھلک بھی آتی تھی مگر مزاج اور عادات میں اس سے سوا کچھ۔ وہ صرف بے نیاز اور کھنڈر تھا۔ یہ بے حس اور سفاک بھی۔ اس نے صرف لاریب کو ہی توڑا اور پامال کیا تھا۔ وقاص نے تو اس کے ساتھ امامہ کو بھی نہیں بخشا تھا۔ خود پرتو وہ سب سہہ جاتی کہ مرنے لگی تھی ہی امامہ مگر امامہ.....

”دیکھو وقاص تمہاری دشمنی مجھ سے ہے نا ہی امامہ سے۔ تمہیں ایک باجو نے دھوکا دیا ہے تم.....!“

”تم نے کچھ نہیں بگاڑا؟“ وہ حلق کے بل غر لیا تو لاریب کی جان ہوا ہونے لگی تھی۔

”تمہاری نگاہوں میں جو ہنک اور شک ہوتا تھا وہ کوڑے مارتا تھا مجھے اگر میں امامہ سے عام سی سرسری بات بھی کرتا تو تم کتنا اور ری ایکٹ کیا کرتی تھیں۔ اتنا لوڑ تھا میرا کریکٹر تمہاری نظروں میں کہ میں گھر کی عزت میں نقب لگانے سے نہیں چوکتا۔“ اشتعال آمیز انداز میں وہ اسے سرخ نظروں سے گھورتا ایک سے بڑھ کر ایک سنگت سوال اس کے سامنے رکھ رہا تھا۔ لاریب ساکن کھڑی تھی۔

”شادی تو میں تمہارا غر و توڑنے کو تم سے کرتا مگر لاریب بی بی اب جو شکست تمہیں دی ہے۔ یہی برداشت نہیں کر سکو گی تم۔“ لہجہ لہجہ سلگو اور تڑپوگی مگر خلاصی نہیں پاؤ گی کیا سمجھیں؟“ اس نے مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ لاریب کی تائید جاری۔ لاریب پھرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی تو گویا وہ کھل کر بلا آخر سامنے ہی گیا تھا۔

”ایک تیر سے دو شکار کرنے والا غنیمت کہلاتا ہے مس لاریب شاہ اولہ میں اسی عقل مندی کا مظاہرہ کر چکا ہوں۔ کیسے اس کا اندازہ تمہیں بہت جلد خود ہو جائے گا۔ جب تم خود اپنے آپ سے بھی نظرس چار کرنے کے قابل نہیں رہو گی۔ میں بتاؤ گا شک کرنا کتنا بڑا بڑا ہے تمہیں وقاص حیدر پر۔“ لاریب حواس باختہ سی کھڑی اس کے کئی چہرے کی سفاکی کو تپتی رہی۔

”جاؤں لو میری بیوی سے بھی کیا یاد کرو گی کہ تمہیں مایوس نہیں

لوٹایا۔“ سامنے سے ہٹ کر اسے راستہ دیتے ہوئے وقاص نے دانستہ اسے بھڑکانا چاہا تھا مگر لاریب کی صلاحیتیں مفلوج اور منجمد ہی رہی تھیں۔

”سنو اس سے پوچھنا ضرور کہ میں اس سے آخر کتنی گہری محبت کرتا ہوں کہ اس کا دل مجھ سے اتنی سی جدائی پر بھی آملو نہیں ہو پاتا کہ جا کر اپنے بڑھے بیمار باپ اور راہنمائی بہن سے ہی مل آئے۔“ کتنی کھجائے ہوئے اسے خبیث نظروں سے دیکھتا ہوا پھر جتانے سے باز نہیں آیا۔ لاریب کے ساکن چہرے پر تغیر پیدا ہوا تھا۔ اس نے آنسوؤں سے چھلکتی آنکھوں کو لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر نکالیا۔

”کیا کروں یا۔ وہ ہے ہی اتنی پیاری کہ اسے محبت کرتے جی نہیں بھرتا۔ اسے بھی میری محبت اتنی پسند ہے کہ.....!“ لاریب نے اس کی پوری بات نہیں سنی اور تقریباً دوڑتے ہوئے راہداری عبور کر لی۔ امامہ کے کمرے میں وہ بغیر دستک کے داخل ہوئی تو اس کے چہرے پر اتنی سرخی تھی جیسے کسی نے وہاں آگ دہکا ڈالی ہو۔

امامہ جو کھل تہہ کرنے کے بعد بیڈ شیٹ کی شکنیں نکال رہی تھی آہٹ پر مڑی اور اسے رد برد پا کر چند ثانیوں کو اسے جیسے اپنی بصارتوں پر یقین نہیں آ سکا تھا۔ وہ لپک کر اس کے گلے لگ گئیں۔ لاریب نے اسے بازوؤں میں سمجھ لیا تھا۔

”آپ رو رہی ہیں بھو؟“ امامہ ہراساں ہو کر پوچھا۔ لاریب نے اسے آنسو لوٹنے مگر صورتحال یہ تھی کہ وہ جتنا خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی اسی قدر بکھرتی جا رہی تھی۔ آنسو بارش کی طرح برس رہے تھے۔ عجب بے کسی کا عالم تھا۔

”مجھے معاف کر دیں بھو یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ نہ میں یہاں شادی کروانے کی ضد لگانی نہ آپ کو اس مشکل سے دوچار ہونا پڑتا۔ میں جانتی ہوں یہاں قدم قدم پر عباس بھائی کی یادیں بکھری ہوئی ہیں اور یہ سب آپ کے لیے بہت اذیت ناک ہے۔“ امامہ اس کے آنسو لہنے ہاتھ کی نرم انگلیوں سے سمیٹتی ہوئی اپنی سمجھ کے مطابق یہ نتیجہ اخذ کر سکتی تھی اور یہ اندازہ بھی اپنے اندر بلا کی کاٹ اور وحشت سمیٹے ہوئے تھا۔ لاریب پر چھائی اذیت کی گھٹاؤں میں مزید گہمیرا اتر آئی۔

”بابا جان تمہارے نہ آنے کی وجہ سے بہت اب سیٹ ہیں امامہ ایک بار تو چکر لگایا ہوتا۔“ وہ موضوع اس قدر جان لیوا تھا کہ لاریب نے بات بدلنا مناسب خیال کیا۔

”میں ضرور آؤں گی بھو آپ پریشان نہ ہوں بابا جان کو بھی میری طرف سے تسلی دیجیے گا۔ ویسے میں ہر لحاظ سے مطمئن اور خوش ہوں۔ بس فی الحال وقاص نہیں چاہتے کہ میں حویلی جاؤں تائی



جان نے بھی انہیں سمجھایا تھا مگر وہ خفا ہونے لگتے ہیں۔ "نظریں جھکائے اپنا مجرم قائم رکھنے کو ایک کے بعد دوسرا جھوٹ بولتی وہ لاریب کو بہت بڑی بڑی لگی۔ جانے کس خیال کے تحت اس کی ہیکلی آنکھیں کچھ اور بھی نمی سمیٹ لائیں۔ تانی جان نے اس کے لیے چائے پر خصوصی انتظام کرایا تھا اور مہر دیا آپا کے ہمراہ وہیں اس کے ساتھ آن بیٹھی۔ لاریب پر اٹھنے والی ان کی نگاہوں میں زیاں اور حسرت کا احساس چھلکتا تھا۔ جیسے عباس پورے خاندان میں اپنی وجاہت و خوب روئی کے باعث مشہور تھا۔ اسی طرح لاریب کا حسن و جمال بھی یکتا تھا۔ تانی جان تو برملا کہا کرتی تھیں۔ "اللہ نے دونوں کو بنایا ہی ایک دوسرے کے لیے ہے۔ چاند سورج کی جوڑی ہے میرے بچوں کی۔ بس خدا نظر بد سے بچائے۔"

مگر اب انہیں لگتا تھا ان کے بچوں کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی تھی۔ عباس کی صورت بھی دیکھنے کو رستی تھیں ان کی آنکھیں جبکہ لاریب کی شکل جیسے کسی نے مسکراہٹ اور زندگی کے رنگ چھین لیے تھے۔ مہر دیا آپا اور تانی جی کے اصرار کے باوجود اس نے چائے کے علاوہ کسی دوسری شے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ بجلت میں کپ واہس رکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"میں اب چلتی ہوں امام بہت خیال رکھنا تم اپنا۔" وہ جانے کو تیار ہوئی تو امام کے ساتھ مہر دیا آپا بھی بے چین ہو گئی تھیں۔

"اتنی جلدی کیوں بیٹا تم نے تو کھانا بھی نہیں کھایا۔"

"معذرت تانی جان کالج سے واپسی پر ادھر آ گئی تھی۔ بابا جان کو تو پتا بھی نہیں ہے پریشان ہو رہے ہوں گے۔" اس نے جواباً رساں سے کہا تھا مگر تانی جان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تو فون کر کے بتا دو تا بیٹے کتا پ ادھر ہو۔ تم کون سا روز روز آتی ہو۔ ابھی بھی امام کی خاطر ہی چکر لگایا ہے۔ تمہارے تو کسی بہن کے ساتھ ہی کچھ وقت اور گزار لو۔ اس سے تمہارے لیے وقاص کو تو اللہ ہی ہدایت دے۔ اتنا ہٹ دھرم ہے کسی کی نہیں سنتا۔ اٹھی کھو پڑی ہے بالکل۔" تانی جان کے انداز میں بیک وقت نرمی و غصہ تھا۔ اس سے قبل کہ لاریب انکار کرتی اس کا سیل فون مدھر سروں میں گنگناٹے لگا تھا۔ لاریب نے اپنے جینڈ بیک سے سیل فون نکال لیا۔ اسکرین پر بابا سائیں کا نمبر تھا اس نے تیزی سے کال ریسیو کی۔

"آپ خیریت سے ہیں بی بی صاحبہ بابا سائیں پریشان ہیں۔" اس نے سکندر کی آواز سے تو بے اختیار گہرا سانس لیا۔

"بابا جان کون دو میں ان سے بات کر سکتی ہوں۔"

"کیا مطلب؟ کوئی پریشانی کی بات ہے بی بی صاحبہ تو.....؟"

"واٹ نان سنس سکندر؟ تناہ حق سمجھا ہوا ہے مجھے؟ خیر تمہارے جان کو کہ میں بڑی حوصلی میں تانی جان اور امام کے ساتھ ہوں۔ شام تک جاؤں گی۔" درستی سے بات کرتی وہ بات کو سمیٹ کر فون بند کر کے کھٹکے لگی۔ تو تانی جان قدرے سہیلیکس ہوئی تھیں۔

نندنی نے ہاتھ میں پکڑے ہرے فوٹوں کی گڈیوں کو دیکھا پھر یونہی بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ محتاط مگر فکر مندانہ نظر عباس حیدر کے چہرے پر ڈالی تھی۔

"کیا آپ نے سب کو ایڈوانس پے منٹ کر دی ہے؟" عباس نے کاندھے جھٹکے تھے۔ گویا اثبات میں جواب دیا۔ نندنی نے پھر ہونٹوں کو باہم سمجھ لیا۔

"سرنی اچال اپنے پاس رکھیں میں کام مکمل ہونے پر.....؟"

"مس نندنی آپ اپنے گھر میں خصوصی اہمیت و حیثیت دہکتی ہوں گی عین ممکن ہے مگر میرا اصول ہے کہ میں کسی کو کم یا زیادہ توجہ دینے کا قائل نہیں ہوں۔ اگر آپ مجھ سے ایسے خصوصی رویے کی توقع رکھتی ہیں تو میں معذرت خواہ ہوں۔ میرا خیال ہے آپ میرا پوائنٹ آف ویو سمجھ گئی ہوں گی اور آئندہ اسی لحاظ سے میرے ساتھ تعاون کریں گی۔" اس کا لہجہ معمول سے ہٹ کر بے حد سخت اور براہم تھا۔ نندنی نے قدرے خائف ہو کر متوحش نظروں سے اس کے پتھر لے تاثرات والے چہرے کو دیکھا تھا۔ مغرور سی کھڑی ناک پر نگاہ اچی تو از خود اس کے حاکمانہ مزاج اور سخت دلی کا احساس دلی میں جا گزیرا ہو گیا۔ ہمہ وقت فراخ پیشانی کا احاطہ کیسے کھنے والی ٹشمن اس کے جاگیر دارانہ موڈ کی واضح غماز تھی۔ اس وقت وہ جارحانہ موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ نندنی کا رنگ اڑ سا گیا۔ اسے ڈھونڈنے سے بھی اپنی خطا نہیں مل سکی جو اسے براہم کرنے کا باعث بنی ہو۔ اس کے باوجود اگر وہ غصے میں تھا تو نندنی کی اسرا سبکی بھی انتہا درجے کو چھونے لگی تھی۔ عباس نے ایک نظر اس کے رو دینے والے تاثرات کو دیکھا اور کوئی وضاحت دینے بغیر ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ وضاحت دینے والی بات بھی بھی نہیں۔ غصہ کہیں کا تھا نکلا نہیں تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس نے اپنے دور کرنے کی باتیں سن لی تھیں۔ اس کے اور نندنی کے بارے میں دی گئی آڑوں اور رائے جسے سننے کے بعد عباس کو اپنے چہرے سے بھانپ نکلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

اس کے بیشتر ساتھیوں کے خیال کے مطابق عباس ضرورت سے زیادہ نندنی پر مہربان تھا اور ایسا صرف اس کے غیر معمولی حد تک بہکا دینے والے حسن کی وجہ سے تھا۔ ان لوگوں کو عباس کی وہ مٹی اور ڈھیل جو عباس نے نندنی کو آموزا اور صنف مخالف ہونے کی بنا پر

احرام کی خاطر دی تھی وہ انہیں عباس کی اس میں انوالومنٹ نظر آرہی تھی۔ عباس جتنا بھی سچ پا ہوا تھا مگر مصلحتی خاموشی اختیار کر لی۔ وہ اس معاملے پر بول کر اسے ہٹ ایڈوانس نے کاروائی نہیں رکھتا تھا۔ ویسے بھی اگر دیکھا جاتا تو ان لوگوں کی یہ باتیں اتنی بے جا بھی نہیں تھیں اس سے قبل تک عباس کا رویہ خاص طور پر سادگی لڑکیوں سے بے حد رکھائی اور سرد مہری لیے ہوتا تھا۔ تو اس کی وجہ صرف عریضہ ہی نہیں تھی کہ وہ اسے شکایت کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کسی بھی لڑکی کو خصوصی اہمیت دے کر اسے اپنی جانب سے خوش فہمی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا نہ ہی اس کی نڈل اور ڈر کر سکتا تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ تب تک معاملہ دھرا تھا۔ تب وہ بطور ایکسٹرا کام کرتا تھا۔ اب صورتحال تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ ڈائریکشن کے شعبے میں تھا تو یہ بے اعتنائی و سرد مہری اس کے لیے کسی طور بھی کامیابی کی ضمانت نہیں بن سکتی تھی۔ وہ اس بات سے آگاہ تھا جیسی صرف خواتین کے ساتھ ہی نہیں سبھی کے ساتھ رویہ تبدیل کر لیا تھا مگر اس کے ساتھ اس کی تبدیلی کو صرف نندنی کی حد تک محسوس کر سکے تھے۔ مگر عباس کا مزاج کافی براہم ہو گیا تھا اور غصے کے وقت وہ ہر مصلحت بالائے طاقت رکھ دیا کرتا تھا۔

"یار جتنی حسین سے تا وہ انڈین بیوٹی یہ جاو چلنا ہی تھا شکر کرو محترمہ ہندو ہیں ورنہ عین ممکن ہوتا کلم دول کے ساتھ ان کے دل کی بھی ہیر وڈن بن جاتی۔" کسی دل جلے نے فقرہ کسٹا تھا جس کے جواب میں مشترکہ تہقہ کتنی دیر تک گونجتا رہا۔ وہ بالمشکل خود پر ضبط کرتا پلٹ گیا تھا مگر یہ ضبط یہاں نندنی کے آگے جھٹک گیا تھا۔ دوسری سمت نندنی تھی جس نے اس کی بات کا اتنا اثر قبول کیا تھا کہ خود کو سنبھال نہیں سکی تھی۔ اگلے تین دن بھی جب وہ رہبرسل کی خاطر اسٹوڈیو نہیں پہنچی تو شیراز کی اطلاع پر عباس کو جھنجھلاتے ہوئے کسی مگر اس سے رابطہ کرنا پڑا تھا کہ شیراز نے بتایا تھا وہ ان کا فون ریسیو نہیں کر رہی ہیں۔ عباس کے ثرائی کرنے پر اس کا نمبر بند ملا تھا۔ عباس کو گھر واپسی پر مجبوراً سبھی مگر اس کی جانب بھی کھڑے کھڑے ناپڑا تھا۔ مگر وہ اس پر ایک نگاہ ڈال کر ہی ششدر ہونے لگا۔ وہ کھنڈ تین دن میں صدیوں کی سرریض لگنے لگی تھی۔ البتہ اسے لاہور پا کر جو چمک جو خوشی اس کے چہرے پر لہرائی وہ بھی کچھ کم حیران کن نہیں تھا۔

"خیریت..... کیا ہوا آپ کو؟" اس کے بوکھلا اٹھنے پر عباس اسے لیٹے رہنے کا اشارہ کرتا بیڈ سے کچھ فاصلے پر دھری کر رہی پر پریشان سا لگ گیا۔ جواب میں نندنی کی آنکھوں میں اس کی اس بے نیاز و بے مہری کے انداز نے ہی بھر دی۔

"تھنک آؤٹ! بس ٹھنڈ لگ گئی تھی تو نمپر چڑھ گیا۔" عباس

کی خود پر جی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں اس نے اندر کا سارا کرب چھپا کر ہستکی سے جواب دیا۔ وہ اس سے شکوہ کا حق تو رکھتی ہی نہ تھی۔ بھلا غلام آقا کتے کے جرات شکوہ کر بھی کیسے سکتا ہے شاید یہی عشق ہے آداب غلامی کی ساری تفصیل خود بخود از بر ہو جاتی ہے۔

"آپ کو دوا لینی چاہیے تھی۔ احتیاط بھی بے حد ضروری ہے۔ میں کام میں مزید تاخیر پسند نہیں کرتا مس نندنی۔ آپ کا سیل بھی آف تھا اسی باعث گھر پر آنا پڑا ہے مجھے۔ اب آپ کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس تو کرنا چاہیے۔" وہ جھنجھلا رہا تھا اور نندنی خائف ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے محض لمحہ بھر کو پلکیں اٹھا کر ایک نگاہ عباس پر ڈالی تھی۔

"آئی ایم سوری۔ میری وجہ یہ ہے آپ کو زحمت اٹھانا پڑی۔" یہ معذرت نندنی کے لیے لازم و ملزوم تھی مگر دل اس کی اس درجہ بے اعتنائی کو بہر حال سہار نہیں پا رہا تھا۔ جیسی اسے خبر تک نہ ہوئی اور بے مائیگی کے مظہر آنسو پلکوں کی بازو پھلانگ کر گالوں پر اتر آئے۔ عباس حیدر نے کسی درجہ حیرانی میں مبتلا ہو کر اس بن بادل برسات کو دیکھا مگر اس پر نگاہ ڈال کر وہ شدید غل نہیں دے سکا کہ اس کی نگاہ پھر اس کے چہرے کی جکڑ لینے والی ملاحظت اور سحر انگیزی میں اٹک گئی تھی۔

گلابی رخسار سردی کے باعث سرخ ہو رہے تھے۔ بالکل قد حادی انار کی طرح۔ سیاہ شال لیے وہ بے بسی کی تصویر نظر آتی بھی اپنے اندر بلا کا سحر سمونے ہوئے تھے اور گویا رچی جیتی جاگتی قیامت تھی۔ اتنا فسوں خیز حسن تھا ہی جکڑ لینے کی صلاحیت سے مالا مال عباس کے دل پر بھی قدرتی سا اثر ہوا۔ غصہ حسن کی تابانی کی شعاعوں میں جل کر خاک ہوتے دیر نہیں لگی۔ عباس حیدر کو اندازہ تک نہ ہوسکا مگر عباس کی نگاہ نے اختیار سے باہر ہوتے بھر پور انداز میں اس کا چہرہ جانچا تھا۔ معاذ کھانا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر قدرے سیدھے اور نرم لہجے میں کہنے لگا۔

"اس اوکے پلیز آپ رونا بند کر دیں۔ بی کیئر فل نیکسٹ ٹائم بلکہ اگر آپ کی طبیعت میں تا حال بہتری نہیں ہے تو میرے ساتھ چلیں میں آپ کو کسی ایچھڈ اکثر کو دکھاتا ہوں۔" وہ نہ صرف اس سے مخاطب تھا بلکہ مسلسل اسے نگاہ کی زد پر بھی رکھے ہوئے تھا۔ وہ بے خبر تھا۔ اپنی نگاہ کی تاثیر کی چارہ گری اور فوگری سے۔ بس ایک نگاہ التفات اور پھر کسی دوا دارو کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ یہ اس کے لہجہ کا جادو تھا جو اسے زندگی کے حوالے کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔ یہی لہجہ تھا جس نے اسے زندگی سے مایوس ہونے پر اکسایا تھا۔ اب وہی لہجہ تھا جس کا کمال یہ تھا کہ وہ لحوں میں ہشاش بشاش



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش  
یہ فائدہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے  
ہم خاص کیوں ٹھیں :-

✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک ✧  
✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ✧  
ہر پوسٹ کے ساتھ ✧  
✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ✧  
ساتھ تبدیلی ✧  
✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج ✧  
✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن ✧  
✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ ✧  
✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ویڈ نہیں ✧

## We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہے

← **وَابْتَغُوا لَكُمْ** کے بعد اسٹاپ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan



Like us on  
**Facebook**

fb.com/paksociety



[twitter.com/looksocialtv](http://twitter.com/looksocialtv)

ہوتی۔ مان اور تقاضا کا احساس ہوتا۔ عباسؑ ہنسی سے منہ دیا تھا۔  
 ”میری توجہ تم نے دیکھی کہاں ہے ابھی؟“ اس کا لہجہ معنی خیز  
 ہو گیا تھا اور عریضہ چھپ کر اسے گھڑ بھی نہ پائی۔

”اتنی شدت ہے آپ کی محبت کے سب رنگوں میں ابھی جناب کا خیال ہے یہ پوری توجہ کا عالم نہیں ہے تو پھر کیا کہنے ہوں گے اس توجہ و محبت کے“ اس کے چلبلا اٹھنے سے عباس حیدر ہنس چلا گیا تھا۔ مگر پھر سنجیدہ ہو کر بات بدل ڈالی۔

”یارت تم بھی چلو تا بھور بن میرے ساتھ شوٹ پر ریلی میں یور  
ہونے سے بچ سکتا ہوں۔“ اس نے کل رات اچانک عریضہ پر زور  
ڈالنا شروع کر دیا تھا جواب میں عریضہ نے کانوں کو ہاتھ لگا کر توجہ  
کرنی شروع کی پھر ساتھ ہی اس پر گرفت بھی کر لی۔

”اتنی ٹھنڈ میں رہنے دیں اور کیا اب لے آئیں گے مجھے شوہر کے لوگوں کے سامنے؟“ عباس اس معاملے میں بہت محتاط تھا۔ ابھی تک اس کے قریبی دوست بھی عریشہ سے مل نہیں سکے تھے۔ عریشہ کا خیال تھا اگر اس کا بس چلے تو وہ اسے پردہ کرنا شروع کر دے۔

”ٹھنڈ کی پروانہ کرو، فل، ہیننگ ماحول ہوگا وہاں اور ڈنٹ دوری  
تم اب بھی کسی کے سامنے تھوڑا آؤ گی، بس چلو۔“  
”اتنی سردی میں بچوں کو ٹھنڈ لگ جائے گی تو بہت مسئلہ  
ہوگا، عباس۔“

”اس کا مطلب ہے تم نہیں جانا چاہتی۔“ عباس کے گھونٹنے پر وہ مسکرا دی۔

”مجدوری ہے نا جان سمجھا کریں۔ البتہ میں آپ کی ہیر و من کو ضرور دیکھنا چاہوں گی جس کے حسن جہاں سوز کے چرچے ہر پھیل گئے ہیں مگر آپ اس کی رونمائی کسی پر نہیں کرار ہے۔“ عرویش کی بات کے جواب میں عباس کے چہرے پر عجیب سا تاثر پھیلا چلا گیا۔

”میری نہیں صرف میری فلم کی ہیروئن..... اوکے“ اس نے  
 نخوت بھرے انداز میں اسے ٹوکا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)



اور تازہ دم تھی چہرے کی رونق آنکھوں کی چمک لوٹ آئی تھی۔ جب عباس وہاں سے جانے کو اٹھا تو تندنی نے اسے اگلے روز آنے کا وعدہ کر کے مطمئن کر دیا تھا۔

”تم نے دیکھا زینب، وہ صرف نام کا نہیں حقیقتاً ساحر ہے..... ہے تا؟“ عباس کے جانے کے کچھ دیر بعد جب زینب اس کی طبیعت پوچھنے آئی تب بھی وہ اسی ٹرانس کے زیر اثر کھوئی کھوئی سی بولی اور زینب چونکہ جو اسکی۔

”کس کی امات کر رہی ہو؟“

”ساحرائے تھنہ نام نے نہیں دیکھا؟“ لورینب نے گہرا سانس بھر کر سرگونی میں جنبش دی۔

”اب تم بہت بہتر ہونڈی۔ شکر ہے خدا کا۔“ زینب نے اس کا ٹیپر چیک کرنے کے بعد بے اختیار سکھ کا سانس لیا اور نڈی آنکھیں مونڈ کر شانت سی مسکرا دی۔

”اسی لیے تو ہوں۔“ زینب نے اس خودکلامی پر چونک کر اور کسی قدر الجھ کر اسے دیکھا، البتہ کچھ پوچھنے سے گریز نہ کرتا تھا۔

”تمہارے لیے سوپ بنایا ہے میں نے“ کہہ تو لےاؤں۔“ پور  
 ندنی نے شخص اس کا دل رکھنے کی غرض سے سرکواشات میں ہلا دیا۔  
 زیب کے اٹھ کر باہر جانے پر وہ پھر سے عباس حیدر کو سوچنے لگی۔  
 پوری توجہ پوری جزئیات کے ساتھ۔



عباس نے مسکلاتے ہوئے بال بنا کر میسر برش نیبل پر اچھالا اور پلٹ کر بیڈ کی جانب آ گیا۔ عریضہ دونوں بچوں کو دائیں بائیں لٹائے بے خود پڑی تھی۔ بکھرے بال مستانہوا چہرہ درود بچوں کی ذمہ داری اور دیگر مصروفیات نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ گوکہ عباس نے گورنس کا انتظام کیا ہوا تھا مگر رات کو بچہ بھی بچے عریضہ کے ساتھ ہی ہوتے تھے۔ عریضہ خود بھی بچوں کے ساتھ ہر بل اپنی جان ہلکان کسے کہتی تو کبھی کبھار عباس کو بھی جھنجھلاہٹ ہونے لگتی تھی۔

”یہ کیا مصیبت ہے تم تو صرف انہی کی ہو کر رہ گئی ہو۔ میں تو ترسنے لگا ہوں کہ بات بھی کر سکوں۔“

”انہی کی بھی اسی لیے ہوئی ہوں جناب کہ یہ آپ کے ہیں  
عباس آپ کی وجہ سے ہی ان سے محبت کرتی ہوں۔“ وہ مسکرا کر  
اسے اس محبت کی اہمیت دفا سے آگاہ کر رہی تھی۔ عباس نے سر  
آہ بھری۔

”خود پر بھی توجہ دیا کرو؛ مجھے اچھا نہیں لگتا تمہارا خود کو نظر انداز کرنا۔“

”آپ ہیں نا مجھ پر توجہ دینے اور خیال رکھنے کو“ اس کے پاس ہر بات کا جواب حاضر ہوتا۔ اس کی مسکراہٹ میں بازی





مجھے خکلائی  
امریک

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ ملے پاکستان سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، سپریمڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کرنے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور ایچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ویڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

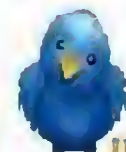
**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



یہ ساری عمر کس آستفتی میں رائیگاں کردی  
اُسی کو یاد رکھا ہے جسے دل سے بھلانا تھا  
وہ جب اوجھل ہوا تو ہم بھی اپنے آپ سے چونکے  
اُسے آواز دینا تھی اُسے واپس بلانا تھا

عید الاضحی عید الاضحی عید الاضحی عید الاضحی عید الاضحی عید الاضحی عید الاضحی عید الاضحی عید الاضحی عید الاضحی

### گزشتہ قسط کا خلاصہ

وقاص کی آنکھوں میں انتقام کی بھڑکتی آگ دیکھ کر لاریب امامہ کے حوالے سے کافی تشویش کا شکار ہو جاتی ہے۔ پریشانی کے باعث اسے نیند نہیں آتی اور اس کی طبیعت بھی کافی ناساز ہوتی ہے جب ہی وہ ٹیلٹ کی تلاش میں کچن میں آتی ہے۔ جہاں پہلے سے موجود سکندر چائے بنا رہا ہوتا ہے۔ وہ زبردستی اسے چائے کے ساتھ ٹیلٹ دے کر آرام کی تلقین کرتا ہے۔ جب ہی لاریب سکندر سے ایمان کے بارے میں استفسار کرتی ہے اور اسے تلقین کرتی ہے کہ وہ ایمان کو ڈھونڈ کر اسے بتائے کہ کس طرح اس کی وجہ سے امامہ کی زندگی تباہ ہوئی۔ زینب کو نندنی کا ساحر کی بات مان لینا پسند نہیں آتا اور وہ دبے لفظوں میں اسے اس بات کا احساس بھی دلاتی ہے۔ جس پر وہ زینب سے مزید بدگمان ہو جاتی ہے۔ فراز اپنی کامیابی کی خوشی میں سب گھر والوں کو ٹریٹ دیتا ہے۔ جبکہ ایمان گھر والوں کے بدلے روپے کی وجہ سے گھر پر ہی رک جاتی ہے۔ جب ہی اسے اپنے غلط فیصلے کا پچھتاوا ناگ بن کے ڈسنے لگتا ہے۔ سب کی غیر موجودگی کے باعث اسے حویلی کال کرنے کا خیال آتا ہے اس کی کال اتفاق سے سکندر ریسو کرتا ہے جواباً وہ جو کچھ ایمان کو بتاتا ہے اس پر ریسو اس کے ہاتھ سے جا گرتا ہے اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ فلم سنا سن ہونے کے بعد نندنی کا زیادہ تر وقت شوٹنگ پر گزرتا ہے وہ لوگوں کے عامیانہ رویوں کی عادی نہیں ہوتی۔ اس لیے سب سے لیے دیے انداز میں رہتی ہے کیمرامین اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے جس پر وہ شدید رد عمل کا اظہار کرتی ہوئی ایک ایٹو کھڑا کر دیتی ہے جو کہ ساحر عباس کی آمد کے بعد ہی حل

### اب آپ آگے بڑھیں

☆☆☆.....

عباس حیدر بہت آرام دہ حالت میں نیم دہا ناگواری سے کہتا اٹھ بیٹھا۔  
”حد ہے یا تم سے بھی کم از کم تمہیں تو یہ بات نہیں چاہیے۔“ اس کا چہرہ غصے سے دبک اٹھا۔ عریضہ پہلے جھپٹے ہوئی پھر خفت زدہ سی لگی۔

”بھئی یہ کائنات انداز ہے بات کرنے کا آپ کیوں ڈبیلی سوچتے ہیں بلکہ آپ نے ڈبیلی سوچا ہی کیوں؟“ آخر میں اس کا لہجہ تنکھا اور ترش ہونے لگا۔

”وہاں بھی لوگ ایسی ہی فضول بات کرتے ہیں۔ بس مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”اچھا چھوڑیں یہ بتائیں آپ اس لڑکی کو اتنا چھپائے کیوں رکھ رہے ہیں۔ جبکہ اخبارات اور ٹی وی چینلز پر آپ کی آنے والی مودی کا ابھی سے ڈنکا بجا بنا شروع ہو گیا ہے لوگ پر یقین ہیں کہ فلم سپر ہٹ ہوگی مگر آپ نے اس لڑکی کو کسی سے متعارف نہ کرا کے سسپنس پھیلایا ہوا ہے۔“ عریضہ کی بات کے جواب میں عباس کے ہونٹوں کی تراش میں مبہم سی مسکان اتر آئی۔ جب بولا تو اس کا لہجہ مخصوص قسم کی بے نیازی لیے ہوئے تھا۔

”یہ تو میری پرانی عادت ہے۔ میں اس لڑکی کی رونمائی کراؤں گا بھی نہیں جب تک یہ فلم آن ایر نہیں ہو جاتی۔“ عریضہ نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی نظروں میں چھین اور شک کا عنصر تھا۔ جیسی عباس حیران ہوتا اسے نکتے لگا۔

”واٹ ہینڈ؟“ اس کے استفسار پر عریضہ کے چہرے پر زہر خند پھیل گیا۔

”اس احتیاط کی وضاحت کرنا چاہیں گے آپ؟ یاد ہے آپ کا یہ رویہ صرف میرے لیے مخصوص تھا۔ کسی اور لڑکی کا آپ کو اس طرح اہمیت دینا مجھے اچھا نہیں لگا عباس۔“ صاف گوئی اور شک کا یہ انداز عباس کا مود کا کافی آف کر گیا۔  
”کم آن عریضہ تم ایک معمولی لڑکی کو خود سے کیوں کمپیر کر رہی ہو؟“ اس نے تاسف سے سر جھٹکا۔

”آپ غور تو کریں یہ کام میں نہیں آپ کر چکے ہیں۔ میں نے تو بس آپ کو احساس دلایا ہے اس بات کا جس کے متعلق شاید آپ کا گمان بھی نہیں تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ غیر معمولی حسن اس طرح کے کرشمے دکھائی دیتا ہے۔“ عریضہ کا لہجہ کافی تلخ اور بے لحاظ تھا۔ عباس تو دکھ کی شدت سے چور ہونے لگا۔

”تم شک کر رہی ہو مجھ پر؟“ اس نے با مشکل خود کو اس سوال کے پوچھنے کے قابل بنایا تھا۔

”عباس میں جانتی ہوں میں خوبصورت نہیں ہوں کسی

بھی لحاظ سے آپ کے قابل نہیں تھی مگر آپ نے.....“  
”اف عریضہ یہ کیا فضول بات شروع کرتی ہو تم۔“ اس نے ناگواریت سے اسے جھڑکا مگر عریضہ کے آنسو بہتے چلے گئے۔

”آپ بھلا کیسے اندازہ کر پائیں گے میری اس مشکل کا جو آپ سے شادی کرنے کے بعد میری جان کو آگنی ہے۔ خوبصورت لڑکی ہی خوبصورت شوہر ڈیزر کر سکتی ہے۔ ورنہ ہر کوئی باتیں ہی بناتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے اس ان میچ کپل کے لیے کہ میں نے آپ پر کوئی جادو کر دیا ہے۔“ عریضہ کی بے بسی عروج پر تھی۔ وہ واقعی سچ کہہ رہی تھی لوگوں کے نوکیلے تبصرے اسے اتنا نارچ کرتے تھے کہ اس نے عباس کے ساتھ کہیں آنا جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو اس بات پر بھی شکرا دا کرتی تھی کہ دونوں بچے اس پر نہیں گئے تھے۔ عباس کی طرح ہی خوب صورت تھے۔

عباس عریضہ کو روتے پا کر سارا غصہ بھول گیا۔ اس میں کیا شک تھا کہ وہ اسے اذیت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ عباس کو یہ بھی خیال ہی نہ آ سکا تھا کہ عریضہ اس معمولی بات کو لے کر اس قدر زہنی دباؤ میں بھی آ سکتی ہے۔

”تمہیں ضرورت کیا ہے لوگوں کی بے نیکی فضول باتوں پر کان دھرنے کی۔ بے وقوف ہو بالکل۔“ عباس نے ہزار جتن کر کے اس کا دھیان بنایا تھا اسے ساتھ لگائے تھکتا رہا پھر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اپنی لود پتی نظروں سے نکتے ہوئے پوری سچائی سے گویا ہوا تھا۔

”کیا تمہیں میری محبت میں بھی کوئی کمی محسوس ہوئی؟“ جس تمہیں اتنا چاہتا ہوں عریضہ کہ تمہاری خاطر میں نے وہ کام بھی کیے ہیں جن کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تم مجھے عزیز ہو جیسی میں اس کام کے نزدیک بھی نہیں جاتا جو تمہیں پسند نہیں تمہیں لوگوں کو نہیں مجھے دیکھنا چاہیے۔ لوگوں کی عادت ہوتی ہے وہ کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتے۔ اور سنو اگر وہ لڑکی نندنی..... اس کے حوالے سے تمہیں خدشات ہیں تو انہیں جھٹک دو وہ میرے لیے ایک اداکارہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ مجھے اگر شو بزم سے وابستہ لڑکی کو اپنانا ہوتا تو تم میری بیوی نہ ہوتیں۔“

”اگر میں کہوں آپ نندنی کو نظر انداز کر دیں تو آپ ایسا کر لیں گے عباس؟“ عریضہ کو جانے کیا سوچھی تھی کہ اس







میں وہاں آئی ہے۔

”کاش..... اے کاش میں نے اس وقت تمہیں ہوتا عباس! شاید تم مجھے پرچم کھالیتے تو میں آج اتنی دھکی اور ادھوری نہ ہوتی تمہاری ہمدردی میں دی گئی تھی مجھے کسی تمنے کی اعزاز سے کم نہیں لگ سکتی تھی۔“

زوردار جھٹکا لگا اور اس کے منہ سے بے اختیار کراہ نکلتی تھی۔ اسے چونک کر دیکھا لاریب کا سارا چہرہ آنسو سے تر تھا۔ وہ اسے جب داپس لینے آیا تو سب سے خوشی اسے دیکھ کر امانہ ہی ہوئی تھی۔

”شام ڈھل رہی تھی سکندر بھائی! حویلی پہنچتے ہو جاتی مجھے ان کی فکر رہی تھی آپ نے بہت اچھا لینا گئے۔“

”مجھے بابا سائیں نے بھیجا ہے۔“ سکندر نے لاریب کے سامنے اپنی پوزیشن ظاہر کرنا چاہی جو اسے نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”اتنی فرمانبرداری اور سعادت مندی نہ شوکیا کرو میرے سامنے سمجھے۔ تمہاری اچھائی کو اچھی طرح جانتی ہو گاڑی میں بیٹھنے کے بعد زور سے دروازہ بند کرتے لاریب نے اپنی برہمی ظاہر کی تھی۔

”شو کرنے کی ضرورت نہیں ہے مجھ میں الحمد للہ ساری خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔“ اس نے مسکراتے دبائی تو لاریب کی جان جل کر خاک ہونے لگی۔

”اچھا! مثلاً کیا کچھ کر سکتے ہو تم بابا جان کے کہنے سکندر نے احتیاط سے موز کا ٹاپھر اس کے چہرے کو نظروں سے دیکھا تھا اور اسی سکون سے گویا ہوا۔

”سب کچھ جو بھی وہ مجھے حکم دیں آپ کو اتنا بھی نہیں کرنا چاہیے میرے خلوص پر۔“ جواباً اس کا انداز بھی جلاتا ہوا تھا۔ لاریب واقعی چپکس گر رہی تھی۔

”گڈ..... تو تم سب کچھ کر سکتے ہو بابا جان کے کہنے پر؟“ لاریب نے رخ اس کی جانب پھیر کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے گویا اسے آزمائش میں مبتلا کرنا۔

”آزمائش شرط ہے۔“

”اب اگر کسی غیرت مند باپ کی اولاد ہو گے تو پھر گے نہیں اس بات سے بتاؤ مجھے بابا جان کے کہنے پر دے دو گے؟“ اس نے بہت سکون آمیز انداز میں

طرح سے عباس کو ہنسی خوشی رخصت کرنے اور دعاؤں سے نوازنے کا ایک انداز تھا۔ تب ہی لاریب نے اڑتی اڑتی یہ خبر بھی سنی تھی کہ بتایا سائیں کی خواہش عباس کا نکاح کر کے بھیجنے کی تھی ہر باب کی طرح وہ بھی بیٹے کو پابند کرنا چاہتے تھے کہ وہ وہاں کوئی غلط انتخاب نہ کر بیٹھے۔ یہ بات اسے وقت پر پہنچ گئی تھی جب مہر واپا بڑی رازداری سے ایمان کو بتا رہی تھیں کہ تم دعا کرو ایسا ہو جائے عباس آمادہ نہیں ہے نا۔ اور چودہ سالہ لاریب کا دل دھک سا رہ گیا تھا۔

عباس کی لائق بے اعتنائی کے بعد یہ بہت بڑا رنج اور سبکی سے دو چار کر دینے والا انکشاف تھا۔ وہ کئی کئی ٹوئیز تھی پہلی محبت کا تازہ احساس گویا وہ من پسند کھلونا تھا جس کے دسترس میں آنے سے قبل ہی دور ہونے کا امکان بھی پیدا ہو گیا۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی ایسی کون سی جادو کی چھڑی کھمٹے کہ سب کچھ حسبِ نشا ہو جائے یہی شدید خواہش اسے اس دربار تک لے آئی تھی۔

مگر واپسی پر اس کا سامنا بالکل غیر متوقع طور پر عباس حیدر سے ہو گیا تھا۔ وہ عباس کو دیکھ کر گنگ ہونے لگی تھی۔ نو جوانی کے جو بن کا سنہرا پن لے حسن اور سحر انگیز سر پانٹھکا دینے کی حد تک شاندار تھا۔ اس پر گریش بلیک سوٹ میچنگ ٹائی بے حد قیمتی ریسٹ وائچ اس کا معیار اس کا انداز سرتاپا شاہانہ تھا۔ وہ واقعی کسی ریاست کا شہزادہ لگتا تھا۔ لاریب کے اندر اس کی ملکیت کا احساس نخر بھرتا چلا گیا۔

”تم..... کیا کر رہی ہو یہاں پر.....؟“ عباس کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ بے حد خفا ہوا۔ اس کا کجہ سرد تھا۔

”مم..... میں یہاں دیا جلائے آئی تھی۔ منت مانگنے..... اس کی دراز پر بھی پٹلیں جھک گئی تھیں اور ان میں لرزش اتر آئی تھی۔

”واٹ..... ریش یہ باتیں تم نے کہاں سے سیکھ لیں؟“ یونوائٹ خواتین کا مزاروں پرانا نسخہ ہے گھر چلو اور آئندہ مجھے کبھی یہاں نظر نہ آنا۔“ اس نے لاریب کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ کھینچ لیا تھا۔ یہ جانے اور سوچے بغیر کہ وہ کیا منت مانگنے آئی ہے اس بات پر بھی دھیان دیئے بغیر کہ اس کے لمس نے لاریب کے پورے بدن میں جیسے بجلیاں کوندی تھیں۔ وہ اتنی کنفیوز تھی کہ ہزار کوشش کے باوجود اس پر اپنے دل کا حال بیان نہ کر سکی کہ وہ اس کو پانے کی خواہش

بجھے تیر سکندر کے وجود میں پوست کر دئے تھے۔ سکندر کا صرف چہرہ تغیر نہیں ہوا وجود کسی شدید جھک کی زد میں آ گیا تھا۔ اس نے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں کو تر کر کے کچھ کہنا چاہا مگر اسے بے حد کیلی نظروں سے تنگ لاریب نے قطعی انداز میں ہاتھ کھڑا کر کے اسے ٹوک ڈالا۔

”اونہ..... مکرنا نہیں تم عہد کر چکے ہو سکندر کچھ اپنی مراد آجی کا ہی خیال کر لو۔“

تفصیل آمیز لوجہ صرف طنز یہ نہیں تھا سرد پن اور نو کیلی کاٹ بھی لئے ہوئے تھا۔ سکندر کے چہرے پر آن واحد میں کتنے رنگ آ کر گزر گئے۔ گاڑی اس نے روک دی تھی۔ نہر کا پل تھا آہنی ہیوی گرل کے پار پل کے نیچے نہر کا گرد لاپانی بہت روانی اور جوش سے بہتا دکھائی دے رہا تھا۔

”اب پر نہر کنارے لگے درختوں کا سبز عکس ڈالتا تھا۔“

”بابا سائیں اس حقیقت سے لاعلم ہیں جب وہ کچھ جانتے نہیں تو.....“

”اس بات کو چھوڑ دو سکندر یہ تمہارا نہیں میرا مسئلہ ہے سمجھے؟“ لاریب نے اسے جھڑک کر رکھ دیا۔ عجیب مشکل میں سکندر کی جان آپڑی تھی۔ لاریب اسے منتظر نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”اگر آپ بابا سائیں کے سامنے یہ حقیقت بیان کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں تو پھر مجھے بھی ان کے حکم پر سر جھکانا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوگی کہ آپ نے زبردستی مجھے اپنے سر کا تاج بنایا تھا۔ اس میں جتنا بھی ناگواری و مجبوری کا عنصر ہوگا آپ کی طرف سے میں اس سے غرض نہیں رکھتا تھا۔ حیثیت بدلی تھی تو تقاضے فطرت کے عین مطابق تھے مگر بابا سائیں کی حیثیت میرے لیے آج بھی مالک و حکمران کی سی ہے۔ میں اسی باعث ان کا کہا نہیں ٹال سکوں گا چاہے مجھے اپنے جذبات اپنے دل اور اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی کیوں نہ ہارنی پڑے۔“ سکندر نے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد یوں آنکھیں بند کر لیں جیسے بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا ہو خود کو۔ جبکہ اس کے برعکس لاریب کے اندر شام غریباں اتر آئی تھی۔ بے مائیگی اور سبکی کا احساس اتنا شدید تھا کہ اسے اپنے وجود میں زہر دوڑتا محسوس ہونے لگا تھا۔ یعنی وہ اتنی اہم اتنی خاص تھی ہی نہیں کہ کوئی اس کی خاطر بغاوت یا سرکشی پر اتر آتا۔ عباس حیدر

کے بعد وہ سکندر جیسے بے حد عام سے مرد کے لیے بھی اتنی ہی بے حیثیت بنے مایا تھی کہ وہ اسے کسی بھی احساس زباں کے بغیر آسانی سے چھوڑ سکتا تھا۔ یعنی حد تک ذلت و تذلیل کی اس کا وہ مرد و مہر و محل اٹھا تھا۔

گلے کچھ دنوں میں اس کا عباس حیدر کے ہمراہ شوٹنگ پر جانے کا پروگرام تقریباً کنفرم ہو چکا تھا۔ عباس ان سب کو اپنی تیاری مکمل رکھنے کا کہہ چکا تھا۔ ننڈی اسی سلسلے میں شاپنگ کے لیے معروف مارکیٹ آئی تھی۔ خریداری کے دوران وقت گزرنے کا اسے احساس ہی نہ ہوا۔ جب مارکیٹ سے باہر آئی تو تیزی سے پھیلتی شام کی سیاہی اور تیز چلتی ہوائیں بارش کی آمد کی خبر دے رہی تھیں۔ ابھی اس نے چند قدم کا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ٹپ ٹپ برسی بوندوں نے اسے کچھ اور بھی پریشان کر ڈالا۔ ماحول میں پھیلی مٹی کی سوندھی مہک اور کھٹکھروں کی طرح بجتی ہوائیں اس سے موسم کی دلفریبی و دلکشی بڑھا رہی تھیں۔ اک تو اتر سے گرتی پھوار گویا سماں باندھ رہی تھی۔ خوبصورتی کا رعنائی کا اس نے بالوں سے شفاف بوندوں کو جھٹکا اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنا چاہا مگر بوندوں کے تسلسل نے اس کوشش کو ناکامی سے دو چار کر ڈالا۔ بھاگ کر کسی سایہ دار جگہ پر پناہ لیتے بھی وہ اچھی خاصی بھگ چکی تھی۔ پریشانی کا باعث صرف یہی نہیں تھی بلکہ اس بل ایک اور افاد بھی آن پڑی۔ تیز رفتار بانیک پر سوار موسم کا لطف اٹھاتے من چلے نو جوان لڑکوں کو اس خراب موسم میں تنہا لڑکی مفت کی تفریح اور مال غنیمت محسوس ہوئی تو اس کی جانب لپک آئے۔

”ہائے..... بیوی کو مین..... آ جاؤ..... اگر لفٹ چاہیے۔“

بانیک کو اس کے گرد بڑے خوفناک انداز میں گھما کر چکر کھاتے ہوئے ان میں سے ایک نے بانیک لگائی۔ ننڈی کا دل اندر کر حلق میں آ گیا۔ اگر وہ بروقت اچھل کر فاصلے پر نہ ہو گئی ہوتی تو بانیک سے ٹکرانے کے باعث اوندھے منہ پڑی ہوتی۔ بچت تو اب بھی نہیں ہوئی تھی۔ توازن برقرار نہ رہنے کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے شاپنگ بیگز چھوٹے تھے جنہیں اٹھانے کو بھی تو گلے میں لینا ایسا کمزور سا مختصر اسکارف بھی پھسل کر بارش کے پانی میں گر کر اپنی اہمیت ہی



گنوا بیٹھا۔ ان آوارہ لڑکوں کے قبہبوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ نندنی شرم سے کٹ کر رہ گئی۔ بے بسی اور سبکی کا احساس اسے ادھیڑ ڈالنے کو کافی تھا۔ اسے قطعی سمجھ نہیں آ سکی اس صورتحال سے کیسے بچے۔

”اوائے کھڑے منہ کیا دیکھتے ہو پکڑو اسے۔“

ان میں سے ایک نے باقی ساتھیوں کو مکروہ اشارہ کیا جو نندنی کی گھبراہٹ کو دودا تشہ کر گیا۔ انہیں اپنی جانب لپکتے دیکھ کر وہ ہدک کر فاصلے پر ہوئی اور اس سے قبل کہ کوئی دفاعی انداز اپنانی سیاہ مرسدیز کے ٹائر ان سے کچھ فاصلے پر بہت زور سے چرچہ آئے۔ پھر کوئی غلٹ بھرے انداز میں نکل کر قہر آلود انداز میں اس کی جانب لپکا۔ لڑکے بروقت ہوش میں آئے اور اگلے لمحے بائیک لے آئے۔ نندنی نے آنسوؤں سے جل تھل پللیں اٹھا لیں تو عباس حیدر کو روبرو پا کے جیسے زمین میں گر گئی تھی۔

”چلنے کا ارادہ ہے یا پھر آپ کسی مزید ایسے فلمی سین کے کمری ایٹ ہونے کی منتظر ہیں؟“ عباس کا موڈ بے حد خراب تھا۔ چہرے و آنکھوں کا استہزائیہ تاثر آگ بن کر نندنی کے جسم و جاں کو جلا کر خاکستر کرنے لگا۔ اس حد تک ذلت کا تو اس کے پاس تصور بھی نہیں تھا۔ عباس کے ہمراہ وہ گاڑی میں آ بیٹھی تب بھی عباس کے چہرے پر شدید قسم کی ناپسندیدگی و ناگواری تھی جبکہ اس کے برعکس نندنی کی خوشنما آنکھیں باہر موسم کی طرح تسلسل سے برس رہی تھیں۔ عجیب پچھلا دینے والی صورت حال بھی۔ ڈل گولڈن نازک کڑھائی سے سناپ اور نیوی بلیو بے حد اسٹائش اسکرٹ میں ملبوس وہ بے حد نازک مگر چاندنی سا روپ لیے لڑکی اپنے اندر کچھ ایسا غلطی تاثر دلکشی اور سحر انگیزی رکھتی تھی کہ عباس حیدر کا شدید ترین اشتغال بھی دھیرے دھیرے اپنا اثر کھو گئے۔

”آخر ضرورت کیا تھی آپ کو اس طرح گھر سے اکیلے باہر آنے کی؟“ اس نے میٹھونندی کی جانب بڑھایا نندنی نے جھکی آنکھوں سے اس کے بڑھائے سفید مہکتے ٹشو کو دیکھا اور بہت آہستگی سے تمام لیا۔

”سوری..... میں آئندہ احتیاط کروں گی۔“ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے غلطی کا اعتراف اور معذرت یہ فرمانبرداری کا بے مثال اور اعلیٰ ترین مظاہرہ تھا۔ جیسی عباس نے کچھ

چونک کر اسے دیکھا۔ اسی کی جانب ملتی نظروں سے نندنی کی اس سحر انگیزی دلکشی و رعنائی کو کچھ اور بھی اجاگر کر گیا تھا۔ سرخی مائل گلابی ہونٹ، جگنوؤں کی مانند چمکیلی روشن آنکھیں، بلاشبہ وہ چلتی پھرتی قیامت تھی۔ عباس کی نظر کا اٹھنا پھر ٹھہر جانا نندنی نے محسوس کیا تو اس کا چہرہ گلابی ہو کر دکنے لگا۔ عباس احساس ہوتے ہی چونکا اپنی لپک کا زور بے بدلا کچھ دیر بعد وہ بولا تو لہجہ کافی سرزد تھا۔

”دیکھیے محترمہ! آپ اپنا اچھا برا خود بہتر سمجھتی ہیں آپ کی جگہ کوئی اور بھی لڑکی ہوئی جسے میں جانتا بھی نہ ہوتا تو اس کی مدد کرنا بھی میرا اخلاقی فرض تھا بلکہ سچ پوچھیں تو جب ان فضول لڑکوں کے نرغے میں آپ کو پایا تو میں ہرگز نہیں جانتا تھا کہ میری آپ سے ملاقات ہونے والی ہے۔“ عباس کا ہرگز ارادہ نہیں تھا اسے یہ بات جتلانے کا مگر اب مقصد اس پر اس کی حیثیت واضح کرنا تھا کہ وہ اپنی نظروں کی بے اختیاری اور اس بے اختیاری کے جواب میں نندنی کی کیفیت کو نوٹ کر کے عجیب سی خجالت محسوس کر رہا تھا۔

نندنی کا چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ اس نے بے اختیار لرزتی نم پللیں اٹھا کر عباس کا بے حد کشش اور وجہ یہ چہرہ دیکھا۔ سیاہ لباس میں ملبوس دراز قامت بے حد شاندار نظر آتا عباس اسے اس سے بھی زیادہ برے طریقے سے جھٹکا تو بھی اس کا دل برامانے کی یوزیشن میں نہیں تھا کہ اتنا ہی مجبور تھا اس کی محبت میں۔ یہی عشق ہے یعنی اپنی مرضی اپنی سوچ، حتیٰ کہ اپنی ذات سے بھی دستبرداری، اتنا کورخصت کہنے کا وقت یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ خود کو نظر انداز کر کے کا آئنا ز بھی یہیں سے ہوتا ہے۔

گاڑی رکی تو وہ ہوش کی دنیا میں لوٹی اور اتنی خائف ہوئی کہ اسے دیکھنے کی بجائے کھڑکی سے باہر دیکھا اور رگلے لمحے آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھیلتی چلی گئی تھیں۔

عباس اسے زینب کے گھر نہیں لایا تھا بلکہ اس کی گاڑی اپنی عظیم الشان رہائش گاہ کے سامنے کھڑی تھی۔ نندنی نے چونک کر اسے دیکھا مگر وہ اس کی جانب متوجہ نہیں تھا۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے وہ گیٹ کھلنے کا منتظر تھا نندنی کی پریشانی گھبراہٹ سے اسے قطعی کوئی سروکار نہیں تھا۔

”یہ..... یہ میرا گھر نہیں ہے۔“ گیٹ کھل گیا، عباس گاڑی بڑھا کر پورٹیکو میں لایا۔ نندنی کی بے قراری کچھ



بڑھی جب عباس نے گاڑی کا دروازہ ان لاکڈ کرنے اور پھر سیٹ بیلٹ کھولتے ہوئے بہت سکون آمیز انداز میں اسے دیکھا پھر اسی رسان سے مخاطب کیا جس کا مظاہرہ وہ اس وقت ہر انداز سے کر رہا تھا۔

”میں جانتا ہوں مس نندی کی آپ اپنی دوست کے پاس قیام پذیر ہیں۔ جس قسم کی آپ جذباتی کیفیت میں تھیں مجھے نہیں لگتا تھا آپ خود کو اتنی جلدی نارمل کر پاتیں۔ مجھے مناسب محسوس نہیں ہوا کہ آپ کی دوست آپ کے متعلق کچھ غلط اندازہ قائم کر لیں۔ یہاں لانے کی وجہ یہی ہے کچھ دیر رکیں جائے لی لیں نارمل ہو جائیں گی تو میں آپ کو چھوڑاؤں گا اگر آپ کو مجھ پر اعتماد ہو تو۔“ اتنی طویل وضاحت اس قدر اپنائیت آمیز انداز یہ کیئرنگ اسٹائل کیا وہ واقعی اسے اتنی اہمیت دے چکا تھا کہ اس کی دل جوئی یا پھر عزت نفس کی حفاظت کی خاطر اتنا حساس ہو کر سوچے؟ اسے یقین نہیں آ سکا اور جب یقین آیا تو اس کی آنکھوں میں تحیر کی جگہ ہستا ہستا مسرت کے جتنا اترنے لگے۔

”مالی پلچر.....!“ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ درآئی عباس نے کچھ حیران نظروں سے اس عجیب لڑکی کو دیکھا جس نے آج اسے نہ صرف حیران کیا تھا بلکہ بہت زیادہ الجھا بھی دیا تھا۔ جب وہ اسے ملی بھی تو بے حد کنفیوژن تھی۔ پھر اس کے بعد بتدریج گھبراہٹ و وحشت کا احساس اس پر بغیر کسی وجہ کے رونا اور اس کے بعد کسی اہم بات کے بغیر گلاب کی مانند کھل اٹھنا وہ بلاشبہ بہترین اداکارہ لگی تھی اسے۔ کم از کم وہ تو یہی سوچ پایا تھا۔ اپنے ہمراہ گاڑی سے نکل کر اندرونی حصے کی جانب بڑھتی نندی کو اس نے پھر ترچھی نظروں سے دیکھا جس کے چہرے پر خوشی کا تاثر چاندنی بن کر پھیلا ہوا تھا۔

”حاجراں انہیں گیسٹ روم میں لے جائیں۔ اس کے بعد انہیں عریضہ کا کوئی لباس پہننے کو دے دیجیے گا بارش کی وجہ سے ان کا لباس گیلیا ہو چکا ہے۔“ راہداری کے موڑ پر رک کر اس نے ملازمہ کو آواز دی اور کچھ ہدایات دیں پھر پزل نظر آتی نندی کی جانب متوجہ ہوا۔

”مس نندی آپ ان کے ساتھ جائیں ابھی کچھ دیر میں آپ کو اپنی وائف سے ملواتا ہوں۔“ عباس کا لہجہ نارمل تھا مگر نندی دھک سے رہ گئی تھی۔ پتہ نہیں اس کی بیوی کس

مزاج کی تھی اور اس سے کس انداز میں ملتی۔ عباس چلا گیا ملازمہ منتظر کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اسی پل جیسے سدا ترنگ اور خمار جاتا رہا اس کی جگہ عجیب سا سناٹا اسے گھیر لگا۔ وہ گم صم کھڑی رہ گئی۔ جانتی بھی تھی وہ شادی شدہ ہے پھر بھی اب اس لمحے یہ بات یہ سوچ گویا کند چھری لگی ہوئے بے حد بے دردی سے اسے ذبح کرنے میں مشغول تھی۔

”جلے بی بی جی۔“ ملازمہ جو اس کے تباہ کن سراپے کی حشر سامانیوں کے آگے مہبوت کھڑی تھی سنبھل کر یوں گدگداتی اسی پل چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوئی اور آواز بھر کے خود کو سنبھالا۔

”بھینکس..... بٹ مجھے ڈریس نہیں چاہیے صرف ایک شال لادیں کپڑے ٹھیک ہیں میرے۔“ عریضہ کا حوالہ ہی اسے رقابت کے جاں نسل احساس سے دوچار کر گیا تھا۔

عباس بیڈروم میں آیا تو عریضہ تیلی بال پشت پر بکھرائے ایزی چیئر پر جھولتی کسی میگزین کی برق گردانی میں مصروف تھی۔

”ہیلو سویٹ ہارٹ ہاؤ آر یو؟“ عباس نے نزدیک آ کر اس کا ماتھا چوما۔ عریضہ مسکرائی اور میگزین بند کر کے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”بہت دیر کر دی آج آپ نے۔“

”ہوں وہ ایک پرابلم کر می ایٹ ہو گئی تھی۔“ عباس نے کچھ بے زاری سے کہتے کوٹ اتار تو عریضہ پوری طرح اس کی طرف ایسے متوجہ ہوئی جیسے تفصیلات جاننے کی متمنی ہو۔

عباس جھک کر بچوں کو پیار کر رہا تھا اس کی نظروں کو محسوس کر کے گہرا سانس کھینچا۔

”بتاتا ہوں یار بلکہ ملواتا ہوں فریش ہونے دو مجھے۔“ وہ اسی بے اعتنائی سے کہتا پلٹ کر واش روم میں بند ہو گیا۔ کچھ دیر بعد بلیک ٹراؤزر اور گرے آدھے بازوؤں والی شرٹ پہنے ہاتھ میں تولیہ پکڑے باہر آیا تو اس کے ماتھے پر بکھرے گیلے بالوں سے پانی کے شفاف قطرے ٹپک رہے تھے۔

”افو ابھی بتائیں تا کسے اٹھا لائے ہیں ساتھ؟“ حاجراں بتا رہی ہے کوئی لڑکی سے بہت خوبصورت سی آپ نے اسے میرے کپڑے پہننے کو کیوں کہا؟ ابھی شال لے



کر گئی ہے وہ۔“ عریضہ کے لہجے میں از حد ناگواری و سرد مہری کا عنصر تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ خدشات، شک اور ہراس بھی خصوصی طور پر محسوس ہوتا تھا۔ جیسا کہ عباس نے آگے بڑھ کر اپنے اختیارِ انتہائی پر انداز میں تمام کر اپنے کسری مضبوط بلندیوں کے حلقے میں سمیٹ لیا۔

”کیا تم اس وجہ سے پریشان ہو کہ وہ لڑکی بہت خوبصورت ہے؟“ عباس نے بغور اس کی آنکھوں میں تجھانک کر سوال کیا تو عریضہ جھلاہٹ میں مبتلا ہو گئی تھی۔

”مجھے کیوں پریشانی ہوگی بھئی! میں اچھی طرح جانتی ہوں آپ صرف میرے ہیں مجھے کسی کی خوبصورتی سے کیا لینا دینا؟“ اور عباس حیدر جو اس کے اعتماد کی یہی بلندی دیکھنے کا خواہاں تھا سرشاری کی کیفیت میں ہنستا چلا گیا پھر اسی خوبصورت لہجے کے دوران اسے چھیڑتے ہوئے بولا تھا۔

”میں تم سے یہی بات سننے کی خواہش میں اسے یہاں لایا ہوں۔“ اس کے انداز میں بے پناہ شرارت غالب تھی۔ عریضہ اسے بے دریغ گھورنے لگی۔

”نندی گریواں! تم ملنا چاہتی تھیں نا اس سے میں نے کنیز کو ملکہ عالیہ کے دربار میں پیش کر دیا ہے۔“ عباس کا لہجہ ہنوز شرارتی اور شوخ تھا اس نے بالوں میں برش چلایا پھر اسے بازو کے حلقے میں لیے ڈرائنگ روم کی جانب آ گیا۔ جہاں مضطرب دے چین نندی اس کی منتظر تھی۔ اس نے عباس کے ہمراہ چلتی اس عورت کو دیکھا اس کی قربت کو محسوس کیا اور ان کے بیچ رشتے کے متعلق آگاہی کو پا کر اس کے چہرے پر سرسوں کا رنگ پھیلنا چلا گیا۔

عباس عریضہ کا تعارف کرا رہا تھا اور نندی کی سانسیں ہر لمحہ ہلکتی جارہی تھیں۔ وہ پھرانی ہوئی آنکھوں سے عریضہ کو دیکھ رہی تھی جس کی شکل جتنی بھی عام تھی مگر اس کا تعصب سب سے زیادہ چمکدار روشنائی سے لکھا گیا تھا۔ اسے لگا اس کے اندر بھڑک اٹھنے والی آگ نے کمرے کی ہر شے کو بھی اس کے ساتھ بھسم کرنا شروع کر دیا ہو۔ اس نے نظریں جھکا لیں اور اپنے آنسوؤں کو چھپانا چاہا۔

”اور عریضہ یہ.....“

”میں جانتی ہوں یہ نندی ہے مگر سچ یہ ہے کہ نندی کی

بجائے جلاوطن شہزادی لگتی ہے۔ ویسا ہی حسن و جمال اور ہی تمکنت اور دلکشی۔“ عریضہ ٹھٹھکی لاتی تھی۔ اس نے اعتماد سے عباس کی بات کاٹ دی تھی۔ وہ ایسے گناہ کی مرتکب ہوئی تھی جو نندی کے نزدیک سراسر گستاخی کے زمرے میں آتا تھا۔

”نندی! جیسا سنا اس نے کہیں بڑھ کر پایا آپ کو؟“ عریضہ نے اس کا رخسار چھو کر کتنی خوشی کتنے جوش سے کہا تھا۔ نندی نے ٹھنک کر اسے دیکھا اور ٹکڑو دیکھے گئی۔ اس کا چہرہ اس کی آنکھیں اس کے ہونٹ خوش بختی کی انتہا میں تھیں اس کے نزدیک عریضہ کے خدو خال میں اس کے لیے وہ نصیب کی ملکہ تھی۔ اسے وہ ملا تھا جس کی جاہ اور تہذیب رکھنے کے باوجود وہ تہی داماں تھی۔ اسے حیرت انگیز طور پر عریضہ سے حسد اور جلن محسوس نہیں ہوئی بلکہ اس پر بے حد حساب رشک آیا تھا۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی اور چہرہ ان حسین ہوسکتا تھا جسے عباس نے پیار سے دیکھا تھا۔ جسے عباس نے اپنی مہر محبت سے نوازا تھا۔

”پتہ نہیں ویسے سنا ہے حسن تو دیکھنے والے کی نگاہ سے ہوتا ہے اور میری نظر میں حسین ترین چہرہ اس دنیا میں صرف ایک ہے تمہارا چہرہ۔“ عباس کی آنکھیں عریضہ کو ٹھٹھکی دے لگیں۔ اس نے اس بل جیسے نندی کی موجودگی کو فراموش کر دیا تھا۔

نندی نے دیکھا عباس کی آنکھوں میں سچائی تھی۔ زندگی کی سب سے بڑی سچائی یعنی محبت..... عریضہ اس تعریف پر بے ساختگی کے اس مظاہرے پر نونیز لڑکی کی مانند شرمیلی اور عباس اسے وارفتہ نظروں سے دیکھتا تھا۔ نندی کو لگا کسی نے اس کے وجود میں زہر سے بھی لیسوئیاں گاڑ دی ہوں۔ یہ سب ناقابل برداشت تھی۔ جیسا کہ وہ یکدم اٹھ کر کھڑی ہو گئی عریضہ نے بوکھلا کر اس کا دھواں ہوتا چہرہ دیکھا۔

”ارے..... کہاں جا رہی ہو پیاری لڑکی! بیٹھو نا!“ چائے بھی نہیں پی تم نے۔“ نندی نے ہونٹ سختی سے چبھ کر آنسوؤں کا گولہ خلق سے نیچے اتارا اور متغیر چہرے کو جھکا لیا۔

”آئی ایم سوری! میں مزید نہیں رک سکتی۔“

پریشان ہو رہی ہوں گی۔“ اس نے جان چھڑانے کو

گھڑا دوتا گئے کی سمت قدم بڑھا دیئے۔ عریضہ نے کانڈھے جھٹکے تھے۔

”رکیں نندی صاحبہ! میں ڈراپ کر دیتا ہوں آپ کو۔“ عباس کی مداخلت پر وہ رکی ضرور مگر پلٹ کر اسے نہیں دیکھا بلکہ پیچھے میں جواب دیا۔

”تو ٹھیکس! آپ کو زحمت ہوگی میں چلی جاؤں گی۔“ نندی کی آواز میں کمی کا احساس گہرا ہوتا جا رہا تھا بلاشبہ یہ سب کچھ اس کی ہمت اور حوصلے سے بہت زیادہ تھا۔

”اگر آپ چاہتی ہیں کہ پھر سے اسی پجوشن کا شکار ہوں تو چلی جائیے۔ مجھے ہرگز اعتراض نہیں ہو گا۔“ نندی کو قدم بڑھاتے پا کر وہ جس طرح بھڑک کر بولا تھا اس انداز نے نندی کے تو اس سلب کے ہی تھے عریضہ بھی اچھا خاصا چوبیک کر اسے ٹکٹنے لگی تھی۔ اس کی نظریں کھوجتی ہوئی اوداؤں کے زندہ تھیں۔

”کیا ہوا ہے اس سے قبل؟“ اس کا لہجہ کھوجتا ہوا تھا مگر غصے میں مبتلا عباس محسوس نہیں کر پایا۔

”کیا ہو سکتا ہے اکیلی لڑکی خراب موسم اور ایسے مواقع کے متلاشی ادارہ مزاج لوگ۔“ عباس کا لہجہ زہر خند تھا نندی پتھرائی ہوئی سی کیفیت میں کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔

”آئی ایم سوری! میرا مطلب تھا کہ آپ کو زحمت.....“ اس وقت مجھے زحمت نہیں ہوئی جب میں آپ کو اس کرٹیکل پجوشن سے نکال کر لایا تھا؟“ اس کی معذرت نے عباس کے موڈ کو کچھ اور بھی شدید کر دیا تھا۔ نندی لا جواب خائف اور سر اسیمہ ہو گئی۔

”اچھا چھوٹیں! کیوں فضول میں اہمیت دے رہے ہیں۔“ عریضہ نے غمی سے کہا اور پلٹ کر اندر چلی گئی۔ عباس نے ایک نظر اسے دیکھا پھر قدم آگے بڑھا دیئے۔ نندی کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ اس کی تقلید کرتی۔ مگر اس طرح کہ اس کا دل گٹ رہا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود بھی وہ اس شخص کی امیدوں پر پوری نہیں اتر پاتی تھی۔ اس کے لیے یہ احساس بھی کسی شدید اضطراب کا باعث تھا۔

سورج ابھی پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا نہ ہی آسمان پر اڑتے پرندوں کے پروں پر ٹھکن وارد ہوئی تھی مگر وہ پھر بھی

ایمان نے محض سر کوئی میں ہلا کر تردید کی جواب نہ دے کر وہ

تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ یہ ممکن صرف وجود کی تحکون نہیں ذہنی اعصابی بھی تھی۔ ہر لحاظ سے ہی ہار گئی تھی وہ اس کی آنکھیں بھیکتی چلی گئیں۔ اس نے کمر وٹ بدلی اور ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑ دیں۔ نظر گڑبڑ میں دھڑکے الہم پر پھر سے ٹھہری ایک چھوٹی سی خوبصورت فرنگی میں ملبوس کلر فل بال کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

یہ امامہ تھی اس نے اگلی تصویر پر نگاہ کی جہاں چھ سالہ لاریب لہنگا سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان نظر آتی تھی۔ معصوم اور بے حد پیارے چہرے پر بسورتا ہوا تاثر تھا۔ ایمان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرے لگیں تو یہ عکس دھندلا سا گیا۔

اس نے ہچکی لی اور الہم دیکھتے ہوئے آنکھوں کا استین سے رگڑا۔ اب جو تصویر سامنے تھی اس میں امامہ تیلیاں پکڑ رہی تھیں۔ اس کی انگلی کی نرم پوروں پر تیلی کے رنگ اتر آئے تھے۔ وہ کتنی معصوم حیرت آنکھوں میں لیے اڑتی ہوئی تلی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑی ہوئی تھی مگر ان آنکھوں کی معصومیت بھری حیرت ہنوز قائم تھی۔ ایمان بری طرح سے سسکتے لگی۔ اسے لگا بچپن میں جو رنگ تلی کے پروں نے اس کے ہاتھوں پر چھوڑا تھا اس کی جگہ خون نے لے لی ہو۔ یہ خون امامہ کے ارمائوں کے ٹل کا خون تھا اور کرنے والی ایمان خود تھی۔ وہ تلی کو نہیں اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ پھر یہ حیرت رنج میں تبدیل ہوئی اور رنج شدید ترین نفرت میں ڈھل گیا۔ ایمان کے وجود پر لرزہ طاری ہونے لگا۔ جس پل ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرنا ہوا شرجیل بریف کیس اٹھائے اندر داخل ہوا تب تک ایمان کی حالت غیر ہو چکی تھی۔

آنسو..... سسکیاں پڑیں شرجیل کی سرسری طور پر اٹھی ہوئی نظر اس پر پڑتے ہی چونک کر بند ہو گئی۔

”ایمان..... کیا ہوا کہیں؟“ بیک صوبے نے تراچھا تا وہ سب کچھ بھلائے اس کی جانب بڑھا۔ ایمان کچھ جواب دیئے بنا روئے گئی تھی۔ وہ خزاں زدہ تے کی طرح کانپتی تھی اور گھٹ گھٹ کر روئی تھی۔ شرجیل کا سوال بھی اس وحشت اور قراری کی نذر ہو گیا۔ شرجیل نے ٹھنڈا سانس بھر کے اسے دیکھا۔

”پھر کسی نے کچھ کہہ دیا ہے؟“ وہ بے زار سا بولا۔ ایمان نے محض سر کوئی میں ہلا کر تردید کی جواب نہ دے کر وہ



اس کا سوڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی معاشرہ جیل کی نظر اس کی گود میں موجود البم پر پڑی تو صرف آنکھیں ہی نہیں سلکیں چہرہ بھی جیسے تانے کا بن گیا۔

”اوہ...“ یہ دیکھ کر آپ کے سوگ کی کتنی مرتبہ سمجھا چکا ہوں کہ اپنے بچپن کو یاد کر کے خوش پھیلاتا چھوڑ دو۔ اتنا ہی غلام تھا اس جدائی کا تو چلی جاؤ واپس روکا کس نے ہے؟ وہ غصے میں آؤٹ ہوتا ہوا زور سے چلایا۔ ایمان اس کے سوڈ کی تباہی کو دیکھتی بری طرح سہمی ہوئی نظر آنے لگی۔ اس کی پیشانی اس ذلت آمیز سلوک پر یوں جل اٹھی تھی جیسے چوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔

اسے اور کچھ نہیں سوچتا تو مضطربانہ انداز میں تصویروں کا البم ہی اٹھا کر دراز میں رکھنا چاہا کہ اس سے محترم کا پارہ ہائی ہوا تھا مگر شرجیل کو اس کا پھر سے خود کو نظر انداز کر کے تصویروں کی فکر کرنا بھڑکا کر بالکل آپے سے باہر کر گیا۔

”ادھر دو مجھے یہ ان کا بھی قصہ تمام کرتا ہوں اسی طرح جان چھوٹے گی۔“ شرجیل نے تصویروں پر چھٹا مارا اور اگلے چند لمحوں میں ایمان کی وہ آخری پونجی بھی ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر کارپٹ پر گر پڑی تھی اور خود شرجیل تنہا تھا ہوا داس روم میں جا گھسا تھا۔ ایمان ایسے پتھرائی ہوئی بیٹھی تھی جیسے سکتے ہو گیا ہو۔ اس نے منجھ نظر سے ٹکڑوں میں بدل جانے والی تصویروں کو دیکھا، کچھ دیر یونہی تکتی رہی کوئی اس کے دل کو ٹھنسی میں لے کر اتنی بے دردی سے بھیج رہا تھا کہ یہ تکلیف ناقابل برداشت ہوئی جانی تھی۔ اس کا سن ہوتا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگا اگلے لمحے وہ خود بھی لہرا کر کارپٹ پر ڈھیر ہو چکی تھی۔

”بچھڑ کر کے باہر آتے شرجیل کے اس تک پہنچنے سے پہلے وہ مکمل طور پر تھک چکی تھی۔ شرجیل نے سہٹائے ہوئے انداز میں اسے ہلکا کر دیکھا۔ نگاہ اس کے سر کے پچھلے حصے سے نوارے کی مانند پھونٹے خون پر ٹھک کر ختم گئی۔ اس کے حواس یکدم کام کرنا چھوڑنے لگے۔ ایمان کو بستر پر الٹا سیدھا لٹا کر وہ بوکھلایا ہوا یا ہر دوڑا پہلا سامنا ہی سمجھ سے ہوا تھا۔ وہ اسے حیرانی سے دیکھنے لگی۔

”خیریت ہے نا بھائی؟“ شرجیل نے تیز قدموں سے چلتے لمحہ بھر کو رک کر اسے دیکھا اور فوری نیل کو بلا کر لانے کا کہتا خود پھر واپس کمرے کی جانب دوڑا۔ نیل میڈیکل

کے فائل ایئر میں تھا۔ اس قسم کی ہنگامی صورتحال میں اس سے رابطہ کیا جاسکتا تھا۔ شرجیل واپس کمرے میں آیا تب بھی ایمان یونہی بے سدھ پڑی تھی۔ البتہ اس کے سمجھنے سے بچتے ہوئے خون سے بستر کی سفید چادر تیزی سے رنگین ہونی جاری تھی۔

”ایک آنکھیں کھولو۔“ شرجیل کی فکر مندی اور تشویش میں گھبراہٹ شامل ہونے لگی۔ جس وقت وہ جھک کر اس کا چہرہ تھپتھپا رہا تھا اسی بل نیل فرسٹ ایڈ باکس سمیت عجلت میں اندر داخل ہوا۔ ساتھ میں سمعیہ بھی تھی۔

”مائی گاڈ! یہ سب کیسے ہوا؟“ نیل بھی خون دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔

”مجھے لگتا ہے انہیں پھر چکرا آیا ہوگا کل بھی سڑھیاں اترتے ہوئے بہت بری طرح سے گرنے سے بچی تھیں۔“ سمعیہ بے حد دھمی ہو کر کہہ رہی تھی۔ شرجیل بھینچے ہوئے ہونٹوں اور خاموش نظروں سے نیل کو ایمان کی مرہم پٹی کرتے دیکھتا رہا۔

”سمعی تم پلیز دودھ گرم کر کے لاؤ۔“ نیل نے ایمان کے سر پر پٹی باندھ کر گرہ لگاتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے سمعیہ کو مخاطب کیا پھر متاسفانہ نظروں سے گم صدم کھڑے شرجیل کو دیکھا اور چہیتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کہاں سے دھکا دیا تھا آپ نے انہیں پورے چھ ٹائٹل آئے ہیں انہیں۔“ شرجیل کے اعصاب کو ٹانگوں کا سن کر نہیں اس الزام پر شاک لگا تھا۔ اس نے ناگواری چھلکانی نظروں سے نیل کو دیکھا۔

”واٹ مان سنس۔“

”نہا آپ کو میری بات اتنی بری کیوں لگی بھائی! حیرت ہے حالانکہ جو یہاں ان کے ساتھ سلوک ہو رہا ہے وہ.....“ ”تم آخر کیا کہنا چاہتے ہو؟“ شرجیل نے غراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی مانند دھکنے لگی تھیں۔ نیل نے جو بلا دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھا اور سر آہ بھری۔

”آپ کے بھائی پر چلانے کی آواز کچھ قبل میں نے خود ہی تھی مگر جائیں اس سے بھی ایک بار مار کر انہیں اس بار بار کی اذیت سے کیوں نجات نہیں دے دیتے آپ۔“ شرجیل کا رنگ یکدم پھیکا پڑا تھا۔

”آئی سوئیر نیل میں نے دھکا نہیں دیا اسے مجھے غصہ تھا جیسی کچھ شادوٹ ہو گیا باٹ.....“

”شادوٹ ہو گئے..... باٹ وائے؟ یاد رکھا کریں بھائی کہ انہیں یہاں اس مقام تک لانے والے بھی آپ تھے۔ یہ بھی مت بھولیں کہ آپ کی وجہ سے وہ یہ عذاب بھگت رہی ہیں ورنہ جو ان کا بیک گراؤ ٹھہرے یہ اس قسم کا بی بیویر ڈیزرو نہیں کرنی اور مزید یہ کہ عورت ہمیشہ مرد کے سہارے ہی مضبوط ہوتی ہے اگر آپ نے ان پر سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا تو چند دن میں ختم ہو جائیں گی۔ انہیں غور سے دیکھیں بھائی پھر فیصلہ کیجیے گا یہ ویسی ہی ہیں؟ جیسی آپ انہیں لے کر آئے تھے۔“ شرجیل کا جھکا سر اٹھنے کے قابل نہیں رہا۔ نیل اس سے کئی برس چھوٹا ہو کر اسے سمجھانے زاہ راست پر لانے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ وہ عرق ندامت میں ڈوبنے لگا۔

”عورت سے محبت بہت سے مرد کرتے ہیں مگر محبت کے ساتھ عزت بہت کم مرد کرتے ہیں۔ بھائی زندگی کا جو ڈھب سامنے ہے وہاں بھائی کو آپ سے محبت سے زیادہ عزت کی خواہش ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟“ نیل نے نرمی و اہستگی سے کہہ کر اس کا کندھا تھپکا پھر دو کا طریقہ استعمال سمجھا کر باہر چلا گیا۔ سمعیہ دودھ لیے چلی آئی اور ایمان کو بدستور بے خبر پا کر اس کی تشویش مزید بڑھ گئی تھی۔

”بھائی ٹھیک تو ہیں نا بھائی؟“ وہ جیسے روہانسی ہو کر پوچھ رہی تھی۔ شرجیل جو ہاتھوں پر سر گرائے جانے کس سوچ میں گم تھا چہرہ اٹھا کر اسے خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔

”آں..... ہاں..... ہاں آ جاتی ہے ابھی ہوش میں“ انکشن دیا ہے نیل نے۔“ اس کا لہجہ بھی اس کے ذہن کی طرح سن تھا۔ سمعیہ نے گہرا سانس کھینچا اور آگے بڑھ کر ٹرے میز پر رکھ دی۔

”چائے بناؤں آپ کے لیے؟“ سمعیہ کی نظریں سوالیہ تھیں شرجیل نے بے بدلی سے سر کوئی میں ہلایا۔

”نہیں دل نہیں چاہ رہا۔ بس جاتے ہوئے دروازہ بند کر جانا۔“

”لیکن چچی جان آپ کا پوچھ رہی تھیں۔“ سمعیہ کے دسے ہوئے انداز میں کہنے پر شرجیل نے ہونٹ بھیجنے۔

”اوکے..... آ رہا ہوں میں۔“ اس نے ایک نظر غافل نظر آتی ایمان کو دیکھا پھر سمعیہ کو اس کے پاس رکنے کا کہتا خواہٹھ کر باہر آ گیا۔ جس وقت وہ ماما کے پاس لاؤنج میں آیا انہیں تائی ماں کے گھٹنے سے لگدیکھ کر گہرا طویل سانس بھر کے رہ گیا۔

”مل گئی فرصت ماں کو سلام کرنے کی؟ آتے ہی بیوی کو مار بنا کے گلے میں ڈال کر بیٹھ جاتے ہو۔ یہ ہمارا رسم میں بھی ساتھ لے جایا کرو۔“ تائی ماں نے اسے دیکھتے ہی تیوری چڑھا کر طنز کا تیر چلایا۔ ماما بھی منہ پھلایے بیٹھیں ناراض لگ رہی تھیں۔

”آپ نے بلایا تھا ماما؟“ شرجیل کے انداز میں اکتاہٹ تھی۔ جسے محسوس کر کے ہی ماما رخ پا ہوئیں اور اسے جھاڑنا شروع کیا۔

”بننا وہیں سے کیوں نہ پوچھ لیا کام؟ آنے کی زحمت کرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔“ شرجیل صبر کا گھونٹ بھر کے رہ گیا وقت..... وقت کی بات ہوتی ہے بھی اس کے ماتھے کا خفیف سائل بھی ماما کی جان پر بنا دیا کرتا تھا۔ بڑا بیٹا تھا اس کا غصہ انہیں سہائے رکھتا مگر اب صورتحال الٹ تھی۔ پسند کی شادی اس کی آزمائش اور ٹھنکن امتحان ثابت ہو چکی تھی۔ وہ ان سے دہتا نہیں تھا۔ بس انہیں مزید اپنی طرف سے دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسے اپنی وجہ سے ماحول میں تناؤ اچھا نہیں لگتا تھا مگر ہمیشہ سے یہی طریقہ کار رہا ہے ڈھیل سرنگی اور دباؤ کو بڑھانی ہے ماما بھی اسے سرنگوں دیکھ کر اس پر چڑھائی بڑھائے جاتی تھیں۔ دبے ہوئے کودبانے میں ویسے بھی انوکھا لطف محسوس ہوتا ہے۔

”کدھر ہے وہ مہارانی؟ اتنی دیر ہوئی تمہیں گھر آئے کھانے بیٹنے کی اسے فکر نہ ہوئی تمہاری۔ ڈرا پوچھو یہی تربیت لے کر آئی ہے؟ بسا چکی پھر تو گھر۔“ ان کی رخ کلامی شروع ہو چکی تھی۔ شرجیل نے کانوں میں جیسے روٹی ٹھونس لی۔

”ان دیواروں سے نہیں تم سے مخاطب ہوں شرجیل! یا پھر لاڈلی کے متعلق کچھ خلاف مزاج سننا گوارا نہیں؟“ ان کا لہجہ برہم تھا۔ سرخ ہوئی رنگت کے ساتھ شرجیل نے لہجہ بھر کو ان کی جانب نگاہ اٹھائی۔ وہ اس کی ماں تھیں مگر اب انہیں اس کی پریشانی یا کسی اور مسئلے سے شاید کوئی غرض نہیں تھی بلکہ



اگر یہ کہا جاتا کہ وہ اسے خواجہ ٹینشن دینے لگی تھیں تو بھی بے جا نہ ہوتا۔

”اے بیٹا منہ میں کنگھیاں ڈال کر نہ بیٹھو کم از کم ماں کی بات کا جواب دے دو بیوی جتنی بھی سر چڑھی اور مغرور ہو مگر ماں سے بہر حال ریتے میں کم ہی ہے۔ آئی سمجھ؟ اور بیوی بھی وہ جو بھاگ کر آتی ہو اس کے لیے ماں کو ناراض کا ہے کو کرتے ہو؟ ایک چھوڑا سی ہزار ملیں گی۔“ تائی ماں نے پاں کی گھوری منہ میں دبا کر ہاتھ نچاتے ہوئے طعنے مارنے شروع کیے۔ ان کا انداز بھی آگ لگانے والا تھا۔ شرجیل کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ آخر ضبط کی بھی حد ہوتی ہے کوئی۔

”آپ چپ رہیں تائی ماں! میں آپ سے کوئی بات نہیں کر رہا اور ماما کو فارگا ڈسک ڈرام بھڑکایا کرس اگر صالحہ سے میں نے شادی نہیں کی تو اس کا مطلب یہ بالکل نہیں کہ آپ میری یہ بڑا تجویز کریں۔“ وہ پھنکار کر بولا کہ تائی ماں کا منہ کھلا رہ گیا۔ معاوہ سنبھلیں اور پھر جو اس کے لئے لیے کہ الامان۔ ماما بھی جھٹانی سے ہی پوری پوری ہمدردی نبھا رہی تھیں حالانکہ اللہ جانتا ہے ماضی میں شاید ہی بھی ماما کی تائی ماں سے بنی ہو۔ ہمیشہ تائی ماں نے ماما کو جوتے کی نوک پر رکھا تھا مگر اب انہوں نے ماما کو جانے کیا گیدڑ سنبھلی سنبھادی تھی کہ انہیں تائی ماں کی ہر بات درست لگنے لگی تھی۔

”میں کبھی نہیں بخشوں گی تمہیں شرجیل۔ مجھے اندازہ ہی نہ تھا کہ نوبت یہاں تک آچکی ہے۔“ ماما کے چلانے پر شرجیل شدید ترین اضطراب کا شکار ہوا۔

”میری بات تو سنیں ماما آپ۔“ انہیں اس طرح آ۔ پے سے باہر ہوتے دیکھ کر شرجیل بھی گڑ بڑایا مگر انہوں نے اسے کسی تغیر بھرے انداز میں زور سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

”خبردار ہاتھ نہیں لگاؤ مجھے اور آج کے بعد مجھ سے کلام نہیں کرنا۔ غضب خدا کا یہی عزت و توقیر رہ گئی تمہاری نظر میں اپنے بڑوں کی۔“ انہوں نے مگر مجھ کے آنسو بہانی جھٹانی پر ایک شرمسار نگاہ ڈال کر بیٹے کو دھتکارا تو شرجیل کا پہلے سے منتشر اور تناؤ زدہ ذہن مایوسی کی انتہا پر جاتا ہے تھا شاہجہان پیٹ لایا۔ شاید اسے ماں سے اس حد تک انتہا پسندی کی توقع نہیں تھی لیکن اس کے باوجود اصلاح اور

بہتری کا سارا بوجھ اس کے کندھوں پر تھا۔ اس کے سوا چارہ ہی کوئی نہ تھا کہ وہ بگڑے معاملے کو پھر سے سدھارنے کی کوشش کرتا۔

”آئی ایم سوری ماما! میں آل ریٹرن بائٹ اپ سینٹ ہوں! ایمان کو گرنے۔۔۔ شدید چوٹ آئی۔“ اسے اسچنگ ہوئی ہے اس کی تانہ مارا سے بھی میں معذرت کر لیتا ہوں۔ دراصل اسی پریشانی میں یہ۔۔۔“

”شباب اس ہے بیٹا! بہت خوب بیوی کو ذرا سی خراش مسمی تو تم تائی اور ماں سے مٹھا لگانے کھڑے ہو گئے کہ جی بیوی کی ٹینشن ہے۔ ارے شرم ہے تو ڈوب مرو چلو پھر پانی میں ارے لعنت بھیجتی ہوں میں ایسی حرام زادی پر جس نے اپنے دام فریب میں پھانس کر میرے بیٹے کو اندھا کر دیا عقل سے چھین لیا مجھ سے۔ دیکھنا بھگتے گی لازمی بھگتے گی۔ میری بددعا میں ہیں اس کے ساتھ۔ سکھ کا سانس لینے کو نہ ترے تو نام بدل دینا میرا۔“ ماما منہ پر ہاتھ پھیر کر آچل پھیل کے کوس رہی تھیں۔ شرجیل سنسنائی سماعتوں کے ساتھ کھڑا انہیں دیکھتا انہیں سنتا رہا۔ پھر پلٹ کر ٹوٹے ہوئے قدموں سے واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ ایمان کو ذرا دیر کو بوٹ آیا تھا پھر دواؤں کے زیر اثر غافل ہو گئی۔ غافل تو شرجیل بھی تھا ایمان سے خود اپنے آپ سے بھی ماما کے لہجے کی غفلت وخی کے ساتھ استہزا کا رنگ آگ بن کر دل کو تپاتا اور جسم کرتا جا رہا تھا۔ یہ رات بہت بھاری رہی تھی اس پر نیند تو کیا سکون بھی غارت ہو کر رہ گیا تھا۔

صبح فجر کی اذان۔۔۔ وقت اس کی آئی تھی تو اس سے کچھ دیر بعد ایمان۔۔۔ وجود میں جنبش ہوئی تھی۔ اگلے چند لمحوں میں وہ مکمل طور پر ہوش میں آ گئی۔ کمرے میں ٹائٹ پلپ کی حواریاں روتی اور مکتبہ اندھیرے کا سنگم تھا۔ وہ ساکن اپنی جگہ پر لیٹی رہی۔ اسے فوری طور پر کچھ بھی یاد نہیں آ سکا تھا۔ جی خواہیدہ ذہن کے ساتھ آنکھیں جھپکتی کچھ فاصلے پر موجود شرجیل کو دیکھے گئی۔ شرجیل کا چہرہ اس کے کندھے سے لگ رہا تھا۔ ایسی پلکوں والی بادامی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر سبز رواں سا پھیلا ہوا تھا جو اس کی وجاہت و خوب روی میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ نیم واپوٹ اور دراز قامت بھرپور مردانہ وجود اس نے اس ایک شخص کی خاطر پوری کائنات کو ٹھوکر ماردی تھی اور اس شخص نے اس کائنات

کی خاطر اسے ٹھوکر دیا پر رکھ لیا تھا۔ اس کا دل سکھنے لگا۔ دھیرے دھیرے۔۔۔ دماغ میں تیرتا غبار چھٹا تو اسے شرجیل کی پسلاؤ کی یاد آئی پھر اذیتوں کا لامتناہی سمندر تھا جس میں اس کا وجود چپکے لے کھا رہا تھا۔ اس کی انہی سسکیوں کے باعث شرجیل کی آنکھ کھل گئی تھی۔

”ایم۔۔۔۔۔“ وہ کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی آواز سننے ہی سن ہونے لگی جانے اب کیا قہر برپا ہو خوف اس کے وجود کو اپنی بے رحم پیٹ میں لینے لگا۔

”بہت زیادہ تھا ہو مجھ سے؟“ شرجیل نے پیش رفت کی اور درمیان میں اناصلہ گھٹا کر اس کے ساتھ آ لگا۔ اس کا بازو بہت نرمی سے اسے اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ شرجیل نے اس کا رشتہ آئیرے بغیر اپنا چہرہ اس کے کندھے پر رکھ کر اس کے چہرے کی جانب دیکھا جو آنسوؤں سے تر تھا۔

”آئی ایم۔ ساری فارویٹ ریلی ایکسٹریملی سوری ایم! مجھے اندازہ ہے میں تمہیں بہت ہرٹ کر چکا ہوں۔“ اس کے آنسو نرمی سے صاف کرتے ہوئے وہ بہت پشیمان لگ رہا تھا۔ ایمان نے حیران بلکہ غیر یقین نظروں سے اسے دیکھا۔ عرصہ بیتا وہ اس کا یہ روپ دیکھنے کی خواہش میں ترس گئی تھی۔ شرجیل نے ان نظروں کی حیرت کو انگاروں کی مانند اپنے بدن کو جھلساتے پایا تو مزید خفت کا شکار ہونے لگا۔

”ایسے مت دیکھو ایم! کہ مجھے اپنی غلطی اور زیادتی کا احساس مار ہی ڈالے۔“ شرجیل کے وجہ چہرے پر کرب آمیز بے بسی اترنے لگی ایمان بری طرح سے ہلک اٹھی۔ ذرا سی توجہ تھوڑا سا التفات اور محبت۔۔۔ ایمان کے تو گویا سب زخم ہرے ہیں۔

”آپ نے اسٹینپس پھاڑ دیے شرجیل! وہ آخری نشانی تھی میرے پاس میرے اپنوں کی۔ جو مجھے تھوڑی ڈھارس دیتی تھی۔“ وہ سسک پڑی شرجیل نے اسے بازوؤں میں بھر کے خود میں جذب کر لیا۔

”اگین میری ایم! پلیز معاف کر دو مجھے۔ پر اس میں تمہیں دھارا۔ لے چلوں گا۔ میں معافی مانگ لوں گا تمہارے بابا جان سے۔“ شرجیل نے اپنے تئیں اسے حوصلہ دینا چاہا تھا پہلانے کی کوشش کی تھی مگر ایمان ایسے نرمی جیسے اسے کانٹوں پر کھینٹا ہو شرجیل نے۔

”یہ ممکن نہیں ہے اب میں ساری کشتیاں جلا کر آئی

تھی۔ اب کچھ باقی نہیں رہا میرے لیے۔“ اس کی یاسیت اور دلگیری اس کی آنکھوں میں نہیں باقی تھی۔ اسے لگتا تھا اس کرب کو۔ ماما کا لاچار دل کسی بھی بل پھٹ جانے کو تیار ہو۔

”شرجیل وہاں کچھ بھی ویسا نہیں رہا یونو میرے جرم کی سزا امامہ کو سنا دی گئی میری جگہ پر امامہ کو سولی چڑھا دیا گیا۔ وقاص انسان نہیں ہے میں جانتی ہوں اسے پھر اب تو سبکی اور ذلت کے احساس سے بالکل وحشی ہو رہا ہوگا اور امامہ۔۔۔۔۔ اس کا تو کوئی بھی قصور نہیں تھا میں کیسے معاف کروں خود کو۔“ وہ ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپنے زار و قطار روئی تھی۔ شرجیل نے قدرے ابھی ہوئی متفکر نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں سمجھ نہیں سکا ایمان؟“ اس کی آنکھوں میں استعجاب اور تانی کا اثر تھا۔ ایمان نے آہوں اور سسکیوں کے درمیان سکندر سے ہونے والی اپنی فون کال کی تفصیلات بتا دیں۔ جسے سننے کے بعد شرجیل کے متفکر چہرے پر تغیر پیدا ہو گیا تھا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ مائی گاڈ یہ بالکل اچھا نہیں ہوا۔“ اس نے سرد آہ بھری ایمان کے آنسو ہنوز بہہ رہے تھے۔

”مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہی مجھے اب کیا کرنا چاہیے شاید ہمیں یہ جذباتی نہ مٹھانا ہی نہیں پڑا۔“ ہاتھوں میں پیشانی کے ال جاڑے شرجیل کی مایوسی کا عالم ایمان نے خوفزدہ نظروں سے دیکھا۔

”آپ کچھتا رہے ہیں شرجیل۔“ اس کی آواز میں خوف کی سرسراہٹ تھی اور چہرے پر زرد رنگ کی آمیزش بڑھتی جا رہی تھی۔

”کیا ایسی صورتحال میں بھی نہ چھٹاؤ گی؟ تم سے بھی کہیں زیادہ مشکل میں میری جان آ گئی ہے۔ ایمان تم اپنے گھر والوں کو چھوڑ آئی ہو ان کے مسائل ان کی ٹینشن ہر وقت تمہارے اعصاب پر سوار ہو کر تمہیں شکستہ کرتی ہے۔ جبکہ میں ہر ہر لمحوہ عذاب سہہ رہا ہوں۔ بس فیصلہ ہو گیا ہے میں اب یہاں نہیں رہوں گا ہم کہیں اور چلیں گے۔ ایمان۔“ اس نے اپنی بات کا تاثر دیکھے بغیر تندی انداز میں کہتے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایمان حواس باختہ بھی رہ گئی۔

”اکیسے؟“ اس نے پھنسی ہوئی آواز میں سوال کیا



شرجیل نرمی سے مسکرا دیا۔

”اکیلے کیوں! میں ہوں گا تمہارے ساتھ ایسی میں جانتا ہوں یہاں تمہیں کس اذیت سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ تم ان رویوں کی عادی نہیں ہو، میں تمہاری برداشت کا مزید امتحان نہیں لینا چاہتا، تم نے جو قدم بہت کی تکمیل اور فتح کے لیے اٹھایا اسے میں عبرت یا تحنت متفق نہیں بنانا چاہتا، میں تمہیں اپنی سہولیات جو یہاں میسر ہیں یا پھر جو تم وہاں چھوڑ آئی ہو اگر تمہیں نہ بھی دے سکوں تو بھی ایسی میں اتنا کما سکتا ہوں کہ ہم با نزت زندگی پورے سکون سے گزار سکیں۔“ ایمان جو اس نے پہلو سے لگی بیٹھی تھی سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کر ایک جھٹکے سے اس سے الگ ہو گئی۔ انداز میں خفگی اور گہرے کرب کا تاثر تھا۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ اسے شاک لگا۔ شرجیل بھی حیران ہوا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ سکا کہ اتنا ہر شے خریوں ہوئی ہے۔ والا نکلے شرجیل کا خیال تھا وہ یہ بات سن کر خوشی سے پاگل ہونے لگے گی۔

”تمہیں اچھا نہیں لگا؟“ شرجیل نے اس کی اضطرابی کیفیت کو دھیان سے دیکھا اور اسی حیرانی سے سوال کیا۔ ”اس میں اچھا لگنے والی ہی کون سی بات ہے آپ خود بھی تو سوچیں! کیا ایچ بے گاسب کی نظروں میں ہمارا؟“ ایمان جتنی رو ہانسی ہو کر کہہ رہی تھی شرجیل کو اتنا ہی شدید غصہ آیا۔

”کیا مطلب..... کیا چاہتی ہو ایمان آخر تم..... اور سب کون؟ اگر ان سے تمہاری مراد میرے پیرئیں ہیں تو اطلاعاً عرض ہے محترمہ انہی کے شاندار سلوک کی وجہ سے میں یہ سوچنے اور یہ فیصلہ لینے پر مجبور ہوا ہوں۔“ اس نے بے حد سرد مہر انداز میں جتلیا۔ ایمان گنگ ہونے لگی۔

”آپ اتنے غصے میں کیوں ہیں شرجیل..... مجھے بتائیں کیا بات ہوئی ہے؟“ وہ متوجش و جسی ہوئی شرجیل نے ہونٹ بھینچ لیے۔ پھر اس کے اصرار پر شرجیل کو ماما اور تائی ماں کی ساری باتیں اس کے سامنے گھول کر رکھنی پڑی تھیں۔

”اب کیا خیال ہے تمہارا؟“ اپنی بات مکمل کر کے شرجیل نے اس کے تاثرات کھوجتے ہوئے نا چاہتے ہوئے بھی طنزیہ انداز اختیار کیا ایمان نے گھٹا ہوا سانس بھرا

پھر زخمی انداز میں مسکرا نے لگی۔

”یہ سب آپ کے لیے نیا ہوگا۔ میں جب سے یہاں آئی ہوں ایک دن میں متعدد بار ایسا سلوک برداشت کر رہی ہوں۔“ اس کا دکھ کی آنچ میں لرزنا لہجہ بے حد مدہم تھا۔ شرجیل نے نظر پھیر لی۔

”ہاں تو میں نہیں چاہتا نا کہ تم یہ سب سہوائی ہم نے بہر حال کوئی جرم نہیں کیا۔“ وہ پھر سے غصے میں آنے لگا۔ ایمان خائف نہیں ہوئی۔

”مگر میں آپ سے متفق نہیں ہوں شرجیل! چاہے مجھے یہاں رہ کر کتنا ہی ہتک آمیز رویہ کیوں نہ برداشت کرنا پڑے۔“ جواب ایسا تھا کہ شرجیل حق درق رہ گیا تھا۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے ایمان سزا دینا چاہتی ہو خود کو؟“ وہ بھڑک کر بولا اور اسے تنبیہی نظروں سے پوں گھورنے لگا جیسے شک میں جتلا ہو جوٹ کا اثر دماغ پر نہ ہو گیا ہو۔ ایمان کے چہرے پر شکستگی پھیلنے لگی۔

”آپ نہیں سمجھیں گے..... جانے دیں۔“ ”کیا مطلب بے وقوف سمجھتی ہو مجھے؟“ پھر اسے ڈانٹنے لگا۔ ایمان نے روتا ہوا بھری۔ پھر نظریں اٹھا کر بولی۔

”میری حیثیت! اس گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کی ہے شرجیل! میں اس سلوک پر شاک کی بھی نہیں ہوں اگر خوش قسمتی سے ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہو تو پھر اسے چھپانے کی نہیں اصلاح کرنے اور سدھارنے کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے۔ میری فیملی میں میرا تاثر ایک غلط لڑکی کا پڑ چکا ہے یہاں بھی یہی صورتحال ہے۔ شرجیل میں اپنے بابا جان اور بہنوں کے دلالت سے بدگمانی کے داغ کو نہیں دھو سکتی مگر یہاں اپنے حسن سلوک اپنی خدمت گزاری سے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کر سکتی ہوں۔ مجھے ان سب کو بتانا ہے شرجیل کہ اگرچہ مجھ سے جذباتیت اور نادانی میں یہ غلط قدم اٹھایا گیا ہے مگر درحقیقت میں غلط لڑکی نہیں ہوں نہ میرا بیک گراؤ نڈا ایسا تھا۔“ شرجیل ہونٹ بھینچے اس کے آنسوؤں سے بھیکے چہرے کو گہرے دکھ کا شکار ہوتا دیکھتا رہا۔

”تمہاری سوچ مثبت ہے ایسی! مگر تم ان بے حس لوگوں کی نظروں میں اچھا بننے کی خاطر خود کو جتنی بھی اذیت دے لو مگر یہ نہ تو تمہارا جرم دھکیں گے نہ تمہیں قبول کریں گے۔ میں جانتا ہوں یہ بات۔“ ایمان بہت مشکل سے

نہ جانے کتنی شکایتیں ان سے نہ جانے کتنے گلے تھے ان سے جو ان کو دیکھا تو بھول بیٹھے سوال سارے جواب سارے

”آپ یہ بھی سمجھ سکتی ہیں میری محبت عشق کے درجے پر فائز ہو کر اتنی فیاض ہو چکی کہ قرب کی خواہش بھی تاجید ہو رہی ہے جہاں صرف نگاہ سیری مانگی ہے اتنا حق تو ادا کرنے دیں مجھے۔“ لجاجت اور یاسیت سے کہتے اس نے

مسکرائی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر تھپکا۔

”آپ پریشان نہ ہوں شرجی! میں ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہوں کہتے ہیں نا پھر پر بھی مستقل پانی کا قطرہ گرے تو سوراخ کر دیتا ہے یہ تو پھر انسان ہیں۔“ شرجیل نے ٹھکی ہوئی سانس بھری پھر اسے دیکھا۔ خنجر مگر متورم چہرہ کھلے بالوں کے درمیان بخار کی حد توں سے دکھتا ہوا مزید دلکشی سمیٹ لایا تھا۔ پیشانی پر بی بندھی ہوئی تھی وہ بظاہر دیکھنے میں جتنی نازک لگتی تھی مگر حوصلہ اور ہمت کمال تھی۔ شرجیل کے پاس جیسے مزید کہنے سننے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

نندنی نے بیک کی زپ بند کی پھر سیدھی کھڑی ہو کر زینب کو دیکھا جو فکر مند اور مضطرب لگتی تھی۔ نندنی آہستگی سے مسکرا دی۔ اسے اب زینب کے خلوص پر شبہ نہیں رہا تھا۔ اس کے قریب آنے کے بعد نندنی نے اس کا چہرہ بزرگانہ قسم کی شفقت کے ساتھ سہلایا اور گلا کھنکار کر بولی تو اس کے لہجے میں خفیف سی شرارت کا رنگ خود بخود چھلکا۔ آ یا تھا۔

کشتیاں یوں بھی ڈوب جاتی ہیں نا خدا کس لیے ڈراتے ہیں.....؟ اک حسیں آنکھ کے اشارے پر قافلے راہ بھول جاتے ہیں

”یہاں کچھ یہی معاملہ ہے زینب جی! مگر صرف میرے معاملے میں۔“

میں جانتی ہوں آپ فکر مند بھی ہیں اور پریشان بھی مگر زینب بات میری خوشی کی ہے یہاں شکایت ہی نہیں کڈو ررا دیکھیں۔“

نہ جانے کتنی شکایتیں ان سے نہ جانے کتنے گلے تھے ان سے جو ان کو دیکھا تو بھول بیٹھے سوال سارے جواب سارے

”آپ یہ بھی سمجھ سکتی ہیں میری محبت عشق کے درجے پر فائز ہو کر اتنی فیاض ہو چکی کہ قرب کی خواہش بھی تاجید ہو رہی ہے جہاں صرف نگاہ سیری مانگی ہے اتنا حق تو ادا کرنے دیں مجھے۔“ لجاجت اور یاسیت سے کہتے اس نے

زینب کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ پچھلے دنوں جو اس نے زینب سے بدکلامی کی تھی اس کے جواب میں زینب کا کل حلیہ اور بردباری کے ساتھ اعلیٰ ظرفی کے مظاہرے نے از خود نندنی کو اس کے رویے کی بدصورتی کا احساس دلادیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اس سے معافی مانگنے پر بھی مجبور ہو گئی تھی کہ ادھر کوئی شکایت اور شکوہ نہیں بلکہ کسریک انداز کی فراوانی تھی۔ نندنی نے جب اس کا گھر چھوڑ کر جانا چاہا تھا زینب نے کتنے رساں مٹھی محبت سے اسے سمجھایا تھا۔

”ٹھیک ہے نندنی! تم اپنی مرضی کے فیصلے کر لو جہاں چاہو رہو اور جاؤ مگر یہاں سے جانے کی بات نہ کرو نندنی! تم یہاں رہو گی تو ڈھارس رہے گی مجھے۔“ اس کے لہجے میں خلوص کی چاشنی تھی۔ نندنی نے ان احساسات کو دل سے قریب محسوس کیا اور اس کے گلے میں بازو محائل کر کے اس کے ساتھ لگ گئی تھی۔

”آپ میری براہ کرم کو سمجھیں پلیز! میں ساحر کو نہیں چھوڑ سکتی مجھے ایک کوشش تو کرنے دیں زینب! مجھے عمر بھر زیاں کا یہ احساس تو کچھ کے نہ لگائے گا کہ میں نے اپنے لیے ایک کوشش بھی نہیں کی۔“ وہ بے بسی بے چارگی کے احساس کے زیر اثر آ کر بھکی ہوئی آواز میں بولی تھی۔ زینب نے کچھ کہے بغیر اسے بر شفقت انداز میں تھکا اور پھر پیشانی چوم لی۔ وہ اس سے محض چند سال بڑی تھی مگر فہم و فراست اور انداز و اطوار میں اتنا ٹھہراؤ اس درجہ بردباری تھی کہ اس سے ملنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ نندنی نے بھی جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے جھک کر اس کے ہاتھ پر عقیدت مندانہ بوسہ ثبت کیا تھا۔

”تم خوشی سے جاؤ! فی ایمان اللہ! اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔“

سکندر اپنے دھیان میں مردان خانے سے نکل کر تیز قدموں سے پور ٹیکو کی جانب جا رہا تھا جب اس کی نظر لان میں چہل قدمی کرنی لاریب پر جا پڑی۔ اگر اس کی نگاہ ہمیشہ کی طرح اسے رو بہ روپا کے اختیار سے باہر ہوئی تھی اور قدم ٹھک کر رک گئے تھے تو اس کچھ نیا نہیں تھا وہ ساکن اور بے خود کھڑا اسے تکتا رہ گیا تو اس کی وجہ بھی لاریب کی اس کی جانب سے غفلت تھی جس کا بھرپور فائدہ اٹھانے کے



در پے تھا۔ سبز گھاس پر اس کا دھانی آچل اس کے پیچھے گویا ہاتھ باندھے کسی غلام کی طرح چلتا تھا۔ وہ کسی عمیق سوچ میں گم تھی۔ چہرے پر تفکر تھا اور ان گنت الجھنوں کا جال شہزادوں کا سا مہم اراق اور تمکنت رکھنے والی اس لڑکی پر اس کا سرکش نادان دل میل رہا کی کا خواہاں تھا۔

وہ جو کسی ہوشیار غارت کی طرح خاموش پراسرار اور جامد نظر آتی تھی پھر ایک معجزہ ہوا اور وہ نعمت خداوندی کی طرح اس کی پھیلی ہوئی جھولی میں ڈل دی گئی۔ وہ اس عنایت پر خوشی و انبساط سے اپنا دل بند ہوتا محسوس کرنے لگتا۔ وہ اب اس کی ہے یہ خیال ہی اس کے رویں رویں میں تخیرو فخر کا ارتعاش گردش گرانے لگتا تھا مگر اس کی ساحرانہ خوشبو کو وہ ڈھنگ سے محسوس بھی نہ کر پایا تھا کہ یہ خوش بختی غم ویاس تفکر اور گھبراہٹ میں ڈھلتی چلی گئی۔ اس پر ادراک ہوا تھا وہ لاریب بی بی کا محض اک جذباتی اور ناقابل قبول فیصلہ تھا جس پر وہ بہت جلد ندامت اور پچھتاوے کا بھی شکار ہو گئی تھی۔ لیکن کیا اس میں اتنا حوصلہ تھا کہ وہ خود کو اس طرح ہی دست تہی داماں کر لیتا وہ جو مصور کی بہترین تخلیق تھی اور اس کی محبت ہی نہیں زندگی کی اولین خواہش بھی تھی ایسی خواہش جو پوری نہ ہو تو زندگی کی ضرورت نہیں بلکہ اس سے دستبرداری آسان کام تھا۔

سکندر نے تھکا ماندہ طویل سانس اندر کھینچا اور نظروں کو اس کے چمکتے دیکتے چہرے پر نکا دیں۔ وہ تو بے خبری و بے نیازی کے ایسے خول میں بند تھی کہ اسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ سکندر کی روح محض ایک نگاہ اس پر ڈال کر لطف و سرور کی کیسے منزلیں طے کر جاتی ہے اس کا دل محض اس سے بے معنی بات چیت کر کے بھی شوق بیجان کی کیسے سرحدیں عبور کرتا ہے۔ اب پھر انوکھا اور جان لیوا مطالبہ کر کے اس نے سکندر کو اضطرار اور وحشت کے لامتناہی سمندروں میں دھکیل دیا تھا۔

معا لاریب کی اور گردن موڑ کر اسے دیکھا یہ یقیناً اس کی نگاہوں کی گستاخانہ گہری کا ہی تاثر تھا جسے محسوس کرنے کے بعد ہی اس کی پیشانی پر بل پڑنے لگے تھے۔ جبکہ سکندر فی الفور محتاط ہوا اور نگاہ کا زاویہ بدلتے ہوئے چہرے پر کسی قدر نخوت اور بے نیازی طاری کر لی۔

”بابا سائیں کہہ رہے تھے آپ کو شہر جانا ہے کسی کام

سے۔ میں گاڑی میں انتظار کر رہا ہوں آجائے۔“ اس کے تنے ہوئے چہرے پر محتاط نگاہ ڈال کر وہ بے حد مناسب الفاظ کے چناؤ کے ساتھ متوازن لہجے میں بات کر رہا تھا کہ لاریب کی ناراضی کا گراف نہ بڑھے لیکن شاید اس کی کوششیں کو بیاد نہیں ہونا تھا۔

”ہمارے کام تمہاری احسان مندی کے محتاج نہیں ہیں۔ تم جانتے ہو میں اکیلی بھی کرلوں گی۔“ وہ زور سے ہنکاری مچی۔ سکندر آہ بھر کے رہ گیا۔ وہ بابا سائیں کے کمرے میں آیا تو انہیں ٹرے سامنے رکھے اپنا منتظر پایا تھا۔ ”ناشتا کر لو بیٹے“ پھر تمہیں نکلتا بھی ہے۔ کوشش کرنا شام کو تاہم چرواہی ہو سکے۔“ انہوں نے ٹرے سینٹرل ٹیبل سے اٹھا کر اپنے اور اس کے درمیان میز پر رکھی۔ سکندر اتنا بے دھیان تھا کہ اسے خود اس بات کا احساس نہ رہا یہاں تک کہ اس کی جانب سے چائے منے کے منتظر بابا سائیں نے یہ کام بھی خود کیا۔ اس کے لیے بھی اپنے لیے بھی پھر مگ اور انڈے کے ساتھ ٹوسٹ کی پلیٹ اس کی سامنے رکھتے ہوئے اسے بغور دیکھا۔

”کوئی بات پریشان کر رہی ہے سکندر؟ ابھی کچھ دیر قبل تو بالکل ٹھیک تھے تم۔“ سکندر چونکا پھر اتنا خفیف ہوا کہ حد نہیں۔

”بابا سائیں! سوری!..... اچھولی میں.....“ اس کو بے ربط بے اوسان پا کر بابا سائیں نے مخصوص قسم کی نرمی و حلالت بھرے انداز میں اس کا کاندھا تھپک کر اسے ریلیکس رہنے کا اشارہ کرتے ناشتے کی سمت اس کا دھیان مبذول کر لیا۔

”کھا او پہلے..... ٹھنڈا ہو رہا ہے سب کچھ۔“ بابا سائیں لاریب بی بی ڈرائیور کے ساتھ شہر چلی جاتیں ہیں۔ مجھے یہاں زمینوں پر بھی کچھ کام تھا تو.....“ اس نے بے حد مناسب الفاظ کا چناؤ کر کے لاریب کی خواہش کی تکمیل چاہی تھی۔ جو کچھ جیسے ہو رہا تھا اس میں سوائے نقصان کے کچھ بھی ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ وہ لاریب کی ناراضی میں اضیافے سے خائف تھا۔ لاریب دبے والوں میں سے نہیں تھی یہ تو واضح ہو گیا تھا۔ وہ سودو زیاں سے مادر ہو کر فیصلے کرنے کی عادی تھی۔ اسے تو یہ تک پروا نہیں تھی کہ سکندر کے جسے میں نقصان آیا یا پھر لاریب



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



کے اپنے حصے میں جبکہ سکندر کو یقین تھا کشتی اس کی ڈوبنا تھی۔ خود کو بچانے کی کوشش میں ہی یہ کی گئی تدبیر تھی بابا سائیں نے اس کی بات سے تجاہل برتا اور ناشتے میں مشغول رہ کر اسے بھی کھانے کا اشارہ کیا تھا۔ ملازمہ برتن اٹھانے آئی تو بابا سائیں نے اسے لاریب کو بھیجنے کا کہہ دیا تھا مگر سکندر کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ بابا سائیں لاریب سے اس موضوع پر بات کریں گے وہ بھی اس کی موجودگی میں۔

”سکندر سے تمہاری کوئی تارافسکی ہے بیٹے؟“ لاریب کے کمرے میں آنے کے بعد بابا سائیں نے کس درجہ سکون سے یہ سوال کیا تھا۔ سکندر تو گڑ بڑایا ہی لاریب بھی بھونچکی رہ گئی پہلے اس نے بابا سائیں کو استعجالی نظروں سے دیکھا تھا پھر سکندر کو سکندر نے اس کی آنکھوں کی دلکشی کو تہو و غضب کی لپیٹ میں آتے دیکھا اور سر نہا بھری۔

”کیا مطلب بابا جان! میں کیوں کسی سے خفا ہونے لگی؟“ اس کے لہجے کی سرد مہری نے سکندر کے دل میں جیسے غیر محسوس انداز میں کوئی تیر پیوست کر ڈالا۔ وہ نگاہیں جھکائے بیٹھا رہ گیا۔

”دیکھو بیٹے میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے ذرا یور پر اعتماد نہیں ہے لیکن سکندر کی بات ہی الگ ہے میں اس کی آپ کے ساتھ موجودگی سے مطمئن رہتا ہوں آپ سمجھ رہی ہوتا بیٹے؟“ انہوں نے رسائیت سے کہا۔ لاریب نے ہونٹ کھینچے محض سرکوا ثبات میں ہلایا مگر آنکھوں کی سطح پر نمی پھیل چلی گئی تھی۔ کیسا مشکل وقت تھا اور بے بسی کا عجب مقام۔ اس کا دل چاہا آگے بڑھے اور بابا سائیں کے چوڑے سینے سے لگ کر بے تحاشا روئے اتنا کہ دل پر دھرا سارا غم دھل جائے۔ وہ انہیں بتا دے ان سے معافی مانگ لے ان سے کہے وہ اسے سکندر سے نجات دلا دیں۔ غلطی ہو گئی اس سے مگر اس غلطی کا بوجھ وہ عمر بھر نہیں اٹھا سکتی۔

”تو پھر جاؤ بیٹے! ابھی نکلو گے تو بھی شام ڈھل جائے گی واپسی پر۔“ بابا جان نے اس کا سر تھپکا۔ وہ انہیں معمول سے زیادہ خاموش زیادہ کمین محسوس ہوئی تھی۔ لاریب چپ چاپ اٹھ کر چلی گئی۔ سکندر جانتا تھا اب اس کی خیر نہیں ہے۔ لاریب کی خاموشی میں جو طوفان چھپے تھے وہ لازمی اس کی ذات کو درہم برہم کرنے والے تھے۔ وہ مضطرب اور بے حد متفکر انداز میں بیٹھا سوچوں میں گم تھا

جب بابا سائیں کی مدھم اور تھکن زدہ آواز پر چونکا۔

”میں لاریب کی وجہ سے بہت پریشان رہتا ہوں“ سکندر بیٹے! عباس حیدر کے اس جذباتی فیصلے نے مجھے کبھی کانٹیں چھوڑا۔ یعنی طور پر لاریب بھی اس طوفان کی زد میں آئی ہے۔ میں اس بات سے سکون نہیں پاتا اگر میری آنکھ بند ہو جائے تو اس کا کیا بنے گا؟ خاندان میں دور نزدیک اس کے جوڑ کا کوئی لڑکا بھی نہیں ایک تم ہو جس کی موجودگی ڈھارس بندھائے رکھتی ہے۔ وعدہ کرو سکندر اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم میری بیٹی کو بھرنے نہیں دو گے جب تک اس کی منزل نہیں مل جاتی ساتھ نبھاؤ گے۔“ بابا سائیں جانے کس اضطرابی کیفیت کے زیر اثر تھے کہ اس سے پہلی مرتبہ اس موضوع پر بات کر گئے تھے۔ سکندر تو جیسے پوری ہستی سمیت ہل کر رہ گیا۔

”آپ پریشان نہ ہوں بابا سائیں! اللہ بہتر کرے گا۔ اللہ پاک آپ کا سایہ رحمت ہمیشہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ آمین۔ امامہ بی بی کی طرح آپ لاریب بی بی کی بھی خوشیاں دیکھیں۔“ بے حد اپنائیت اور محبت سے کہتے سکندر نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھکتے ہوئے تسلی دی۔ بابا سائیں نے اس کے سانولے پرکشش چہرے پر برشفقت نگاہ ڈالی اور جیسے اس کا دل بہلانے کی غرض سے ہنس کرادیئے۔ سکندر کچھ دیر ان کی تسلی و شفای کے لیے وہاں بیٹھا رہا پھر انہی کے کہنے پر اٹھ کر پورچ میں آیا تو لاریب کو کڑے تیوروں کے ساتھ وہاں اپنا منتظر پایا۔

”کیا ضرورت تھی سیدھے صاحب ابھی بھی آنے کی؟“ انتقاد کر دیا ہوتا ملازمہ ہوں نا تمہاری کہ تمہارے حکم کی منتظر بیٹھی رہوں۔ اللہ اللہ کیا شان ہے تیری! کیسے کیسے لوگ کیسے کیسے تیور دکھا رہے ہیں۔“ وہ بن بادل برسات کی طرح برس رہی تھی۔ سکندر نے جب چاپ سب سنا اور جیب سے چابی نکال کر دروازہ ان لاگد کیا۔

(ہاہ کاش ابھی آپ واقعی میرا انتظار کریں جیسے کرنے حق ہے سچ کہتی ہیں آپ ماوام! جسرتوں کے مزار میں گئے میرے) سکندر نے سر نہا بھری تھی۔

”پچھلا دروازہ کھولو نہیں بیٹھنا مجھے آگے تمہارے ساتھ۔“ وہ زور سے پھنکاری تو سکندر نے بغیر کسی پس پیش کے تھیل کر دی مگر جس وقت وہ دروازہ کھول رہا تھا

لاریب نے اس کا ہاتھ متفرانہ انداز میں زور سے جھٹک کر خود کام کیا۔

”فصل فرمانبرداری کا ڈرامہ نہ کرو میرے سامنے اور شرم تو نہیں آئی ہوگی تمہیں بابا جان سے لگائی بجھائی کرتے۔“ وہ بلا آخر پھٹ ہی پڑی تھی۔ سکندر کو اس سے زیادہ برداشت کی امید بھی نہیں تھی ایک بے اختیار قسم کی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کو چھوا تھا۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں نے بابا سائیں سے اگر کچھ کہا تو وہ آپ کے مفاد.....“

”بکومت سمجھے؟“ وہ حلق کے بل غرائی پھر تنہی انداز میں انگلی کھڑی کر کے مزید گویا ہوئی۔

”مت سمجھنا کہ مجھے تمہاری کسی بات کا اعتبار ہے میں نے آج تک تم سے زیادہ نفس پرست انسان نہیں دیکھا جو اپنی خواہش کی تکمیل کی خاطر کسی حد تک بھی گر سکتا ہے۔“ وہ جیسے ایک بار پھر اس کی عزت نفس پر تازیانہ مار چکی تھی۔ ضبط و برداشت کا پیمانہ چھلکا اور سکندر کے ہاتھوں کی گرفت اسٹیرنگ ڈھیل پر سخت تر ہو گئی۔

”آپ کی مدگمانوں کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے لاریب بی بی لیکن اتنا ضرور کہوں گا بولتے وقت الفاظ کی سنگینی پر غور ضرور فرمایا کریں۔ مرد کی طاقت اور اختیار کے ساتھ مردانگی پر تازیانہ مارنے والی عورت کی جھولی میں ہار اور ذلت کے سوا کچھ نہیں آتا۔ پھر اہوا مرد بھی یاد نہیں رکھتا کہ اس کی اپنی اوقات کیا ہے یا عورت کتنی اعلیٰ مرتبت ہے۔“

”جھٹکی دے رہے ہو مجھے تم درحقیقت ہو کیا؟ اپنی اوقات سے نکل رہے ہو یقیناً۔“ سکندر کی بات سن کر تو وہ غم و غصے کی شدت سے پاگل ہی ہو اٹھی تھی۔ پھرے ہوئے انداز میں سکندر کی قمیص کا کالر پکڑ کر جس طرح اس نے پیچھے سے جھٹکا دیا تھا وہ بے حد اہانت آمیز احساس تھا۔ سکندر کا سانولا چہرہ سکی اور تذلیل کے احساس سمیت چند لمحوں میں کپٹنے ہی رنگ بدل گیا مگر اس نے کمال ضبط سے خود کو مشتعل ہونے سے روک رکھا۔ گاڑی کی رفتار مدھی کی اور نرمی سے اس کے ہاتھ سے اپنا کالر چھڑوا لیا۔

”یہ بات آپ بھی جانتی ہیں کہ میری پوزیشن دھمکی دینے والی نہیں ہے مجھ کو آگاہ کر رہا ہوں وہ بھی اس لیے کہ آپ بھی مت بھولیں ہاتھی اپنی طاقت کے زعم میں ہی

تم پیار کسی سے نہ کرنا  
اک عشق نگر کی وادی تھی  
جہاں پیار کی ندیا بہتی تھی  
کچھ دل والے بھی رہتے تھے  
جو پیار کی باتیں کرتے تھے  
جب بہار کے موسم آتے تھے  
اور پیار کے پھول کھاتے تھے  
مست۔ سلی شاموں میں  
پیار سے دودل ملتے تھے  
ایک روز وہ بستی اجڑ گئی  
پھر اک دل کو سوگ لگا  
جیون بھر کا روگ لگا  
دیوانے پھرتے رہتے ہیں  
اور ہر اک سے وہ کہتے ہیں  
اقرار کسی سے نہ کرنا  
تم پیار کسی سے نہ کرنا

نبیلہ یونس..... فیصل آباد

چیونٹی کی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن اس حقیقت سے بھی فرار ممکن نہیں کہ چیونٹی اگر انتقام لینے پر آئے تو ہاتھی کی جان بھی لے سکتی ہے۔ لی کیئر فل لاریب بی بی! مجھے آپ کو بارے دیکھنا بھی اچھا نہیں لگے گا۔“ لاریب کے چہرے پر مسخر پھیل گیا۔ اس نے جواباً کاٹ دار نظروں سے سکندر کو دیکھا جس نے گاڑی کی رفتار اب اس لیے مدھی کر دی تھی کہ راستے میں بار بار مال موٹی گائے بھینس اور بکریاں آ جاتی تھیں ان کے پیچھے ڈانگ کا ندھے نرر کھے نو عمر بچہ واہا تھا۔ گاؤں کے باسی اس وقت اپنے ڈھور ڈھور تندی اور جنگل کی طرف چرانے کی غرض سے لے جایا کرتے تھے۔ شام میں واپسی ہوتی تو جانور تازہ دم ہوا کرتے تھے۔ یہ ذہنی سکون تو انسانوں کے ساتھ جانوروں کا بھی بنیادی حق ہے۔ مگر یہ طے ہے کہ نصیب کے بغیر کچھ بھی میسر نہیں آتا“ چاہے وہ ذہنی و قلبی سکون ہو یا پھر محبت کی تح۔ لاریب نے یاسیت سے سوچا پھر گہرا سانس بھر کے سیٹ کی بیک سے سر نکا کرنا نکھیں موند لیں۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ ملے پاکستان سوسائٹی ڈاٹ کام کے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ویڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیرم کوالٹی، نارل کوالٹی، سپرینڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فرمی لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

(میں تمہیں کبھی بھی معاف نہیں کروں گی سکندر تم نے بہت دور تک میرا نقصان کیا ہے)

اس کی سوچوں میں کوئی بھری ہوئی شیرنی غرائی تھی۔ وہ ایک بار پھر شدت پسندی اور خود غرضی سے صرف اپنے متعلق سوچ رہی تھی۔



عباس حیدر اپنی نیم کے ہمراہ اسلام آباد رپورٹ پر اترتا تو صبح کا اجالا اس قدرنی حسن و جمال رکھنے والے شاہانہ مزاج شہر کے خدوخال کو اجالنے میں مصروف تھا۔ سرد ہواؤں کی کاٹ اور ہلکی بوند باندی ایک دم سے شروع ہوئی تھی اور سبزے سے ڈھکا ماحول بھگ کر اور بھی دلکش اور سحر انگیزی سمیٹ لایا تھا۔ یہاں سے انہیں مری کے تک مزید سفر کوچ کے ذریعے طے کرنا تھا۔ سارے مرد حضرات میں نندنی ایک اکیلی لڑکی تھی۔ عباس حیدر کو اسی خیال سے اس کی ہر لحاظ سے زیادہ فکر کرنی پڑ رہی تھی۔ ان کے لیے یہاں پہلے سے لکڑی کوچ کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ عباس نے ایک پار پھر کوچ کے ڈرائیور سے فون پر رابطہ بچال کیا تو اس نے تیس منٹ میں پہنچنے کی یقین دہانی کرائی تھی۔

”ہمارے پاس ابھی کچھ ٹائم ہے آپ لوگ چاہیں تو یہاں اپنی پسند اور ذوق کے مطابق وقت گزار سکتے ہیں۔“ وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ جواب میں سب ہی اپنی اپنی رائے سے نوازنے لگے۔ عباس اپنے بیل فون پر مصروف تھا کچھ ای میلز چیک کرتے ہوئے ان کی باتوں کو سرسری انداز میں ہی سن رہا تھا۔ دوسری سمت نندنی تھی گلابی کلر کے اسٹالس ٹاپ اور ویلوٹ کے بلیو لائٹ اسکرٹ میں ملبوس۔ بے حد خوبصورت اور فینسی جرسی میں ملبوس اپنی تمام تر بجا بہت دلکشی اور سحر انگیزی کے ساتھ صرف عباس کی سمت متوجہ تھی۔ جس کا اونچا لمبا قد اور شہزادوں جیسی وجاہت و خوب روی کے باعث سیاہ پینٹ کوٹ میں سب سے نمایاں سب سے پرکشش لگ رہا تھا۔ اس کی کھلتی ہوئی سرخ و سفید رنگت سردی کے باعث جیسے دکھتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ بلاشبہ وہ کسی تھہرے ہوئے فطری منظر کی مانند حسین دلکش اور سحر طراز لگ رہا تھا۔

نندنی اس کی غفلت اور بے خبری کے عالم میں بھی اسے نگاہ بھر کے نہیں دیکھ پائی تھی کہ رعب حسن اسے تاب نہیں

لانے دیتا تھا۔ کبھی کبھار اس کے دل میں عجیب انوکھی خواہش مچنے لگتی کہ اس جادوگر آنکھوں والے سحر طراز چمکیلی آنکھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر انہیں بند کرے پھر دل کی خواہش کے مطابق جی بھر کے اس کی صورت پائے۔ اس کے چہرے کے سب ہی نقوش کو ازیر کر جن پر رعب و دبدبے کے باعث اس کی نگاہ اٹھ نہیں تھی۔ یہ خواہش جتنی دیوانگی لیے تھی اس سے بڑھ کر کتنی بے جا رنگی کا احساس لیے ہوئے۔ وہ بھلا اتنی خوش کہاں تھی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

”آئی تھنک آپ کو سردی لگ رہی ہے مس حیدر اس خیال کے تحت وہ از حد ملول ورنجیدہ سر جھکائے بیٹھی تھی نارسائی کے احساس سے نبرد آزما نہ ہال جب عباس حیدر اسے تنہا پا کر اس کی جانب چلا آیا تھا۔ نندنی نے چونک کر اٹھایا۔ عباس حیدر اسی کی سمت متوجہ تھا۔ یہ نظریں جتنی بھی سادہ اور عام نوعیت کی ہوتیں مگر نندنی کے لیے بے حد خصوصی اہمیت کی حامل ہوا کرتی تھیں۔ چونکہ صرف دل کی دھڑکنوں میں ہی بھونچال اٹھاتی تھیں بلکہ چہرے کو بھی دھنک کے سب رنگوں سے گل رنگ کر دیا کرتی تھیں۔ نظروں کا یہ تصادم اس کی جان پر بنا گیا۔ شیشا کر نظریں جھکا گئی۔

”خیریت آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟“ اس کے سرخی میں ڈوبے چہرے اور ہلکوں کی حیا آمیز لرزش کو عباس نے کیا خاک سمجھنا تھا جیسی کسی قدر نظر بھرے انداز میں سوال کیا تھا۔ نندنی توجہ کے اس سہرے خوش گماں جال میں پھنسی چلی گئی۔

”جی جی بس کچھ سردی کا ہی احساس تھا۔“ وہ باطنی ہی التماسیدھا جواب دے سکی۔ عباس کی نظریں بدستور اس پر جمی ہوئی تھیں۔

(جاری ہے)



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ تمام پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے
- ✧ کی سہولت کی تین مختلف
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف
- ✧ سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریمڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✧ ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے
- ✧ کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور ایچھے پرنٹ کے
- ✧ ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

محجہ شہ کمالی  
ام مرتیم



شب جہراں ستاتی ہے اداسی گھیر لیتی ہے  
تمہاری یاد آتی ہے اداسی گھیر لیتی ہے  
تمہاری یاد کی کوئل جو دل کے اجڑے گلشن میں  
کوئی نغمہ سناتی ہے اداسی گھیر لیتی ہے

### گزشتہ قسط کا خلاصہ

کے لیے ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ عباس اسے گھر ڈراپ کرتا ہے اور وہ ناچاہتے ہوئے بھی مان جاتی ہے۔ جبکہ عریشہ کے لیے یہ صورتحال بہت عجیب ہوتی ہے۔ ایمان اسکے ہوئے امامہ کی تصویریں دیکھ رہی ہوتی ہے جب ہی شرجیل آ جاتا ہے اور غصے میں الیم پھاڑ دیتا ہے جس پر ایمان شدید صدمے سے دوچار ہو جاتی ہے اور وہیں ڈھیر ہو جاتی ہے۔ شرجیل جب واش روم سے آ کر ایمان کی یہ حالت دیکھتا ہے تو فوراً نیل کو بلا لاتا ہے نیل ایمان کی ڈریسنگ کرتے ہوئے شرجیل کو اس کی غیر ذمہ داری غصے پر کافی شرمندہ کرتا ہے جب ہی اس کی ای اسے بلا کر کافی طنز و غصہ کرتی ہیں۔ تانی اور ای کی باتوں پر وہ مزید ڈسٹرب ہو جاتا ہے اس کا ایمان کی ذرا سی سائیڈ لینا ہی اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ صبح جب ایمان ہوش میں آتی ہے تو وہ اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کرتا ہے کہ وہ الگ گھر لینا چاہتا ہے مگر ایمان اسے منع کر دیتی ہے کہ وہ اب اس کی والدہ سے اس کا بیٹا نہیں چھین سکتی۔ بلکہ محبت سے ان کا دل جیتنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے فی الحال شرجیل کا معذرت کرنا اور اس کا نرم رویہ ہی کافی ہوتا ہے۔

لاریب سکندر کے ساتھ شہر جانے سے منع کر دیتی ہے مگر بابا سائیں کے اصرار پر سکندر خاموش ہو جاتا ہے پھر جب وہ لاریب سے پوچھتے ہیں تو وہ سمجھتی ہے کہ شاید سکندر نے اس کی شکایت کی ہے جس پر وہ سکندر سے مزید بدگمان ہو جاتی ہے۔ نندنی عباس اور باقی ٹیم کے ساتھ شوٹنگ کی غرض سے تادرن ایریا آ جاتی ہے عباس ایک بل کو اس کے صبح حسن کو

عریشہ عباس سے نندنی کو فی الحال میڈیا پر متعارف نہ کرانے کے بابت استفسار کرتی ہے اس کے لہجے میں شک کی آمیزش ہوتی ہے جس پر عباس جھنجھلا سا جاتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ فلم کٹان ایئر ہونے تک وہ اسے متعارف نہیں کرانا چاہتا جس پر عریشہ مزید بدگمان ہونے لگتی ہے اور عباس کو شدید دکھ ہوتا ہے۔ وہ اسے اپنی کم خوب صورتی کا حوالہ دے کر پریشر ایز کر رہی ہے اور روئے لگتی ہے جس پر عباس اپنا سارا غم و غصہ بھلا کر اس کی دلجوئی کرتا ہے۔ عریشہ اس پر حویلی کال کرنے کا اور اپنے والدین کو سنانے کا دباؤ ڈالتی ہے جس پر عباس چپ ہو جاتا ہے اسے وقاص کا اہانت آمیز رویہ یاد آتا ہے جو اس کی کال پر اس نے اس کے ساتھ اختیار کیا جب ہی عباس دوبارہ عریشہ کو اپنے ساتھ شوٹنگ پر چلنے کے لیے قائل کرتا ہے جس پر وہ انکار کر دیتی ہے اور عباس چلا جاتا ہے جس پر وہ اپنے مقصد میں ناکامی پر جھنجھلا کر رہ جاتی ہے۔ نندنی شوٹنگ کے حوالے سے شاپنگ کی غرض سے مارکیٹ آتی ہے جب ہی موسم خراب ہو جاتا ہے اور کچھ واہ لڑکے اسے تنگ کرنے لگتے ہیں اور اتفاق سے وہاں عباس آ جاتا ہے نندنی مارے شرمندگی کے زمین میں گڑھ جاتی ہے۔ عباس اسے اپنے ساتھ گھر لے آتا ہے اور عریشہ سے ملواتا ہے۔ عریشہ اس کی خوب صورتی کو دیکھ کر مزید عدم تحفظ کا شکار ہو جاتی ہے۔ جبکہ نندنی عباس اور عریشہ کی محبت و خوشگوار زندگی میں خود کو ان فٹ محسوس کرتے ہوئے دکھ سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ عباس کی آنکھوں میں عریشہ کا عکس اس

دیکھ کر ٹھٹھک جاتا ہے وہ پوری طرح اسی کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ عباس اس کے پاس چلا آتا ہے۔ وہ عباس کی خود پر جچی نظروں سے کنفیوژ ہو جاتی ہے۔  
(اب آگے پڑھیے)

عباس کے دیکھنے کے انداز میں فکر مند رہی اور تشویش تھی۔ جب وہ بولا تو یہی تاثر اس کی نظروں کے ساتھ لہجے میں بھی اتر آیا تھا۔

”ابھی جہاں جاتا ہے وہاں اس سے زیادہ سردی ہے آپ کو پر اہلیم ہو سکتی ہے فی الحال تو ہاٹ کافی منگواتا ہوں۔ یقیناً آپ بہتر محسوس کریں گی۔“ فکر مندانہ انداز میں کہتا وہ ہاتھ میں موجود سیل فون پر نمبر پیش کرنے لگتا۔ نندنی جو اسے منع کرنا چاہتی تھی کچھ سوچ کر ارادہ ملتوی کر گئی۔ یہ تو جہیہ کیئرنگ انداز اس کے دل کے نخلستان پر برسنے والا اُبر رحمت تھا۔ وہ کفرانِ نعمت کی مرتکب کیسے ہو جاتی..... اگلے چند منٹ بعد بھاپ اڑاتا مگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ نندنی نے گریز اس نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ کافی نہیں لیں گے کیا؟“ عباس جو ای زلویے سے کھڑا ہنوز سیل فون پر مصروف تھا قدرے چونک کر متوجہ ہوا۔ ”نہیں..... کیونکہ مجھے آپ جتنی سردی نہیں لگتی۔“ وہ مسکرا کر نرمی سے بولا۔ لہجے میں خفیف سی شرارت تھی۔ نندنی جھینپ کر رہ گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی مگر اس حیا آمیز مسکراہٹ نے اس کے دلکش چہرے کو ایسا انوکھا نکھار اور سحر انگیزی عطا کی تھی کہ عباس حیدر کی نگاہ لہجہ بھر کو ٹھٹھک کر اس کے چہرے پر جچی رہ گئی تھی۔ احساس ہونے پر اس نے فی الفور نگاہ کا زلویہ بدلا۔

(یہ لڑکی بہت خوب صورت ہے عباس اس قدر قیامت خیز حسن ایمان ہلا سکتا ہے۔ قسم سے پہلے اسے مل کر جتنا بھی مہبوت ہوئی تھی مگر اب ڈرنے لگی ہوں کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اسے اپنی مودی سے نکال دو) اسے عریشہ کی بات شدتوں سے یاد آئی۔ جو اس نے پچھلی رات بڑے پرتشویش انداز میں کہی تھی اور عباس ناصر جیران بلکہ بے حد خفا بھی نظر آنے لگا تھا۔

”میں تمہاری بات کا مینڈ بھی کر سکتا ہوں عریشہ۔“ دوسرے لفظوں میں یہ مطلب تھا کہ اسے اس پر اعتبار نہیں ہے۔ اسے یہی بات چڑانے اور مشتعل کرنے کا باعث بنی تھی۔

”بات یہ نہیں ہے عباس دیکھیں میری جگہ پر خود کو رکھ کر سوچیں بار بار کا ملنا ایک ساتھ رہ کا کام کرنا یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ پر یہ چیز اثر انداز نہ ہو۔“ عریشہ کی اپنی رٹ تھی اور عباس اتنا جھنجھلایا ہوا تھا کہ زندگی میں پہلی بار اس سے باقاعدہ جھگڑنے لگا۔

”مجھے افسوس ہوا عریشہ کہ تم نے مجھے اتنا عام سا مرد سمجھا لیکن میں ثابت کرنا چاہوں گا کہ میں نہ تو چھپھورا ہوں نہ ہی دل پھینک۔ میرے نزدیک حسن خوب صورتی نہیں جذبات اور محبت اہم ہیں۔ خیر تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔“ وہ زندگی میں پہلی بار اس سے سنجیدگی کے ساتھ خفا ہوا تھا۔ عریشہ کی باتوں سے اس کا دل اتنا بوجھل ہوا تھا کہ وہ اسے اپنے احساسات نہیں سمجھتا سکتا تھا۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ اسے لاریب سے ملواتا پھر اسے شاید اندازہ ہوتا کہ اس نے عریشہ کی خاطر کیسی بے مثال چکا چوند خوب صورتی کو ٹھکرا کر اس کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے دل میں پہلی بار عریشہ کی جانب سے شکوکہ آیا تھا۔

”وین آگئی ہے ساحر بھائی آپ لوگ آ جائیں۔“ شیراز نے اس کے پاس آ کر کہا تب عباس خفیف سا چونکتا ہوا اس کے ساتھ ہولیا۔ ناشتا راستے میں وین روک کر ریسٹورنٹ سے پیک کروالیا گیا تھا۔ وین کا سفر ایک بار پھر شروع ہوا کوچ بارہ کھوسے ہو کر موٹروے پر فرانے بھرنے لگی تھی۔ عباس نے ناشتا بھی نہیں کیا۔ وہ سب سے الگ تھلگ بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ شعوری طور پر وہ ابھی تک عریشہ کی اس بدگمانی کے حصار سے نہیں نکل سکا تھا۔ اس نے کتنے جتلاتے ہوئے انداز میں اسے کہا تھا۔

”اس لڑکی میں اتنی صلاحیت ہوگی عباس جیسی آپ زندگی میں پہلی بار میری کوئی بات جھٹلا رہے ہیں۔ میرے ایک بار کہنے پر آپ نے فلموں میں کام نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے بتائیے میری ویلیو ڈاؤن ہوئی ہے یا پھر اس لڑکی



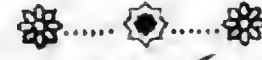
کے حسن کا جادو سرچڑھ کر بولنے لگا ہے۔“ طنز و تمسخر سے ڈوبی آواز میں چھپی کاٹ عباس کے جاگیردارانہ خون کواگ میں نہلانے کو کافی ثابت ہوئی تھی۔

”تم اپنی سوچوں میں آزاد ہو عریضہ جودل چاہے قیاس کر سکتی ہو۔“

بات ذات کے پندار اور انا کے ساتھ عزت نفس کی بھی تھی۔ وہ وضاحتیں پیش کیوں کرتا۔ وہ جھوٹا نہیں تھا۔ اس کے دل میں کوئی چور بھی نہیں تھا عریضہ کی تنگ سوچ کے اس رخ نے اسے صرف ہرٹ ہی نہیں بلکہ اذیتوں کے سمندریوں میں ڈوبنے ابھرنے کو چھوڑ دیا تھا۔ دوسری جانب عریضہ تھی اسے کہاں تو قیاس تھی اس سے ایسے رویے کی وہ تو جیسے سلگ کر آدھی رہ گئی تھی جیسا ناراضی کے اظہار کو منہ پھلا لیا۔ خاموش تو عباس بھی تھا۔ ایک عجیب سا دھندلا میز غبار تھا جو اس کے دل کو ڈھانپتا جا رہا تھا۔ عریضہ نے کبھی اس کے مسائل سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ عباس کی بے تحاشا محبت و اہمیت کو اس نے حق سمجھ کر وصول کیا تھا ہمیشہ اس کے جذبات و احساسات کو سمجھ کر ان کے مطابق رد عمل کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید وہ ان لوگوں میں شمار ہوتی تھی جو تحفے کو پا کر تحفہ دینے والے کی محبت کے جذبوں کو نہیں سمجھتے بلکہ یہ سوچنے لگتے ہیں ان میں ہی کوئی خصوصیت یا اہلیت تھی کہ انہیں یہ چاہت اور محبت دی گئی۔ یہ لوگ برتری کے احساس سے لبریز خودی کے زعم میں مبتلا خود کو ہمیشہ اعلیٰ و برتر اور خاص سمجھتے ہوئے دوسروں کو خود سے کم تر درجے پر دیکھا کرتے ہیں۔ عباس کو اتنی سی بات سمجھنے میں بھی بہت وقت لگا تھا۔ اب جبکہ سمجھ لی تھی تب بھی وہ اس حقیقت سے نظریں چرانے کا متمنی تھا اور خوش گمانی کے احساس کو دل میں جگہ دیے بیٹھا تھا وجہ اس کی عریضہ سے محبت تھی۔

اس کی نظریں سیل فون کی اسکرین پر بار بار آس لیے اٹھتی تھیں۔ اسے عریضہ کی جانب سے پیش رفت کی خواہش تھی وہ پہلی بار اس سے خفا ہوا تھا۔ اس خفگی کے اظہار میں بھی مان پوشیدہ تھا کہ وہ اسے اس کے نظریے کو سمجھے گی اور اسے منالے گی۔ رات بھر وہ اس کا منتظر رہا تھا صبح گھر سے روانہ ہوتے

ہوئے بھی یہ آس نہیں ٹوٹی تھی۔ شاید یہ آس کبھی نہیں ٹوٹی تھی۔ مگر انتظار کی کیفیت بڑی ظالم شے ہے۔ جاں کسل لمحہ لمحہ پکھلاتی ہوئی تو کبھی اتنی سفاک کہہ کر فٹ میں دبا کر جامد کر ڈالنے پر کمر بستہ وہ بھی جامد ہو رہا تھا اور بے خبر تھا کہ کچھ فاصلے پر موجود زندگی پوری جاننا سے اس کی چاہت متوجہ اس کے اضطراب کی گواہ اور اس سے زیادہ بے چین و بے قرار بھی تھی۔



ساری خریداری ہو چکی تو واپسی کو مڑتے اچانک لاریب کو بابا سائین کی دواؤں کا نسخہ یاد آیا تھا جسے آتے ہوئے وہ خصوصی طور پر بیگ میں رکھ کر لائی تھی کہ ان کی دوائیں ختم ہونے کے قریب تھیں۔

”یہاں فارمیسی پر کچھ دیر کو گاڑی روکنا۔“ اسے مانا چاہتے ہوئے بھی سکندر کو مخاطب کرنا پڑا کہ اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ مگر لہجہ ضرورت سے زیادہ برہم اور تلخ تھا۔ سکندر نے ٹھنڈا سانس بھر کر اس حکم کو سنا اور گاڑی کی رفتار دہشی کر دی۔ اس وقت وہ اسپتال سے کچھ ہی فاصلے پر تھے۔

”لائیں مجھے دیں نسخہ۔“ اس نے رخ پھیر کر لاریب کو مخاطب کیا جو سر جھکائے بیگ کھنگال رہی تھی۔ اس بات پر مشتعل انداز میں سر اٹھا کر اسے گھورا۔

”تم غمگین لاریب اپنے اس عہدے سے معزول ہونے والے ہو مسٹر بہتر ہوگا اپنی کارکردگی کو سمیٹ لو۔“ تعارت زدہ انداز میں ہونٹ سکیز کر تنبیہ کرتی دواؤں کو کھول کر وہ ایک جھٹکے سے اتر گئی۔ سکندر دم بخور رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں یلکھت بے تحاشا جلن اور دھواں بھر گیا۔ وہ ہونٹ بھیجنے سا کن بیٹھا رہ گیا۔ اسپتال کی وجہ سے یہاں معمول سے زیادہ رش تھا۔ لاریب دوائیاں لے کر واپس گاڑی میں آن بیٹھی۔ سکندر نے بامشکل خود کو سنبھالا اور احتیاط سے اس رش سے گاڑی نکال کر پھر سے منزل کی جانب ڈال دی۔

مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مستحکم تھی کہ اس کا پہلے سے مضطرب ذہن لاریب کے موڈ کی تباہی کو دیکھتے ہوئے کچھ اور بھی انتشار کا شکار ہو چکا تھا۔ سیل فون کی تسلسل سے ہوتی گنگناہٹ نے اسے چونکا دیا۔ ذرا سا غور کرنے پر جان سکا

تھا یہ لاریب کے سیل فون کی رنگ ٹون تھی۔ لاریب اپنے دھیان میں بیگ کی زپ کھول کر سیل فون نکال رہی تھی مگر اسکرین پر روشن وقاص حیدر کے نام نے اس کی اجلی پیشانی پر شکنیں نمودار کی تھیں۔ بھلا وقاص حیدر سے کیوں کال کر رہا تھا؟ اسے لگا لازمی کوئی بے سرو پا بات ہوگی۔ حسب سابق کوئی دل جلانے والا فقرہ ہوگا۔ اس نے خراب موڈ کے ساتھ کال ڈسکنک کر دی۔ اس کا پہلے سے خراب موڈ اس وقت وقاص کی فضولیات کا بار نہیں اٹھا سکتا تھا۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ بیل پھر سے بجنے لگی تھی۔ لاریب نے کسی خیال کے تحت کال ریسیو کر لی۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ امامہ کی طبیعت کچھ بہتر نہیں تھی۔

”ہیلو امامہ..... تو.....!“ اس کی متفکر پر تشویش آواز کو دبانے کا باعث وقاص حیدر کا بلند آہنگ قہقہہ تھا۔ صاف لگتا تھا وہ اس کی پریشانی کو محسوس کر کے ہی حظ اٹھانے میں مصروف ہوا تھا۔

”فون میں نے کیا ہے اور تمہیں کیا ہے تو تمہاری ڈیڑر سسڑ کا تذکرہ کر کے منہ کاذا افتہ تو خراب نہیں کرنا چاہوں گا نا جان من۔“ اس کا ہرکا ہوا انداز لاریب کو شدید ناگواری سے دوچار کر کے رکھ گیا۔

”ہوش میں ہو تم دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟“ لاریب نے اسے جھانڈا اگر وہ سامنے ہوتا تو سر پھاڑنے سے بھی گریز نہ کرتی۔ اتنا ہی غصا رہا تھا اسے۔

”صحیح کہتی ہو ڈارلنگ! ہوش صرف شراب ہی تو سلب نہیں کرتی۔ محبوب ہستی کی غمگین ملنے والی بھرپور اور دغریب قربت کا تصور بھی چھین سکتا ہے۔ تم بالکل ٹھیک سمجھی ہو۔ جان بہاراں۔“ وہ لہک کر بول رہا تھا یقیناً وہ حواسوں میں نہیں تھا۔ اتنا بے لگام اور گستاخ تو وہ کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ لاریب کا وجود جیسے طاقتور یادوں کے زیر اثر بھٹک سے اڑ گیا۔ اس نے لمحے کے ہزار ویں حصے میں سیل فون کو کان سے ہٹا کر لائن کاٹ دی اور خود کو اس کی بے ہودہ بکواس کے اثر سے نکالنے کی سعی کرنے لگی تھی کہ اس بل پھر زور و شور سے فون گنگنا اٹھا۔ لاریب نے جھنجھلا کر کال کاٹی تھی۔ یہ

طے تھا کہ اب وہ اس کی کوئی بکواس نہیں سن سکتی تھی۔ کچھ رشتے سوائے شرمندگی اور ذہنی اذیت کے کچھ نہیں دیتے۔ وقاص کا شمار انہی میں ہوتا تھا۔ وہ سیل فون کو سائلنٹ پر لگا کر بیگ میں واپس رکھنے والی تھی جب اسکرین چمکی اور وقاص کا ٹیکسٹ موصول ہوا لاریب نے ہونٹ بھیجنے اور تیج کھول لیا۔ ”تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتیں او کے فائن سویٹ ہارٹ آرام سے واپس گاؤں پہنچو۔ یہاں میں بہت شدت سے تمہارا منتظر ہوں۔ آج ہر رکاوٹ ہٹا دی ہے تمام راستے صاف ہیں ایسے خوب صورت انداز میں تمہارے حسن کو خراج تحسین پیش کروں گا کہ تم خود بھی بھول نہیں سکوں گی۔“ لاریب کا چہرہ یوں جل اٹھا جیسے یلکھت کسی نے منہ پر تیزاب پھینک دیا ہو۔ اس نے تیزی سے ٹیکسٹ ڈیلیٹ کر دیا مگر وجود پر رینگنے والی چیونٹیوں کی سرسراہٹ کا احساس بڑھتا جا رہا تھا گو کہ وہ وقاص کی گھشیا باتوں کو اہمیت نہیں دینا چاہتی تھی مگر دل گہرے اضطراب میں تھا۔

وہ وقاص کی سوچوں کی آلودگی سے آگاہ تھی۔ جانتی تھی کہ کتنا بے باک ہے یہ بھی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ مگر کیا وہ رشتوں کے تقدس اور نزاکت کو فراموش کر کے اس حد تک گر سکتا تھا؟ وہ اس متعلق فیصلہ نہیں کر پارہی تھی۔ جان عجیب مصیبت میں انکی جا رہی تھی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر وحشت زدہ نظروں سے سکندر کے چوڑے جوڑ اور مضبوط شانوں کو دیکھا اور اس سے گاڑی کی رفتار بڑھانے کی تاکید کی۔ ابھی اچھا خاصا سفر باقی تھا اور شام تیزی سے ڈھلتی جا رہی تھی۔

”خیریت..... فون کس کا تھا آپ پریشان ہیں؟“ سکندر اس کی جنبش آبرو سے اس کے اندر کو پالیا کرتا تھا پھر اب کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کے اضطراب سے لاعلم رہتا۔ ”تم اپنے کام سے کام رکھو سمجھے زیادہ پرسنل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ سکندر کی اپنائیت بھی اسے شعلہ فشاں بنا گئی تھی۔ اس درجہ تو بین آ میز انداز پر سکندر کو ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتا پڑتا تھا۔ ہونٹوں کو باہم بھیجنے اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ پچارو جس وقت گاؤں کی حدود میں داخل ہوئی مغرب ہونے ہی والی تھی۔ فضا میں دھندلا غبار خلی اور



عجیب سی یا سیت کھلی ہوئی تھی مگر خود کو بالمشکل سنبھالے بیٹھی لاریب کا چین و قرار اس وقت بالکل رخصت ہو گیا جب اس نے وقاص کی مخصوص جیب کو اس چوراہے پر اپنا منظر پایا تھا۔ سیاہ قیمتی سوٹ میں ملبوس جیب کے کھلے دروازوں سے ٹیک لگائے خبیث مسکراہٹ کے ہمراہ وہ اسے شیطان کا دوسرا روپ نظر آیا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ تو اس کا مطلب وہ محض بکواس نہیں کر رہا تھا وہ واقعی اپنے ایلیسی منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہ رہا تھا۔

”سکندر گاڑی کا رخ موڑ دو ہری اب۔“ اخطاری کیفیت کے زیر اثر وہ سیٹ سے اٹھ کر سکندر کی جانب جھکتی ہوئی کچھ ایسے غیر معمولی لہجے و انداز میں چیختی تھی کہ اس کے لہجے میں چھپی سراسیمگی وحشت اور خوف سکندر کو ٹھنکا کر رکھ گیا۔ کچھ بھی کہے بغیر اس نے محض حکم کی تعمیل کی تھی۔ وقاص کو وہ بھی دیکھ چکا تھا اور اس سے قبل لاریب کی فون کال کے بعد کی بے قرار اور اخطراب کو بھی۔ ضروری نہیں بات کو سن کر ہی سمجھا جائے۔ معاملے کی گیم ہر تار کا وہ پہلے سے اندازہ کر چکا تھا۔ لاریب جیسی لڑکی خواخواہ اس حد تک بے اوسان نہیں ہو سکتی تھی۔

”گاڑی کی رفتار اور تیز کرو سکندر وہ ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔“ لاریب کی ساری توجہ وقاص کی جیب پر لگی ہوئی تھی جہاں وحشت بھری کیفیت میں وہ اسے بار بار ایک ہی تاکید کرتی تھی۔ سکندر کے اعصاب بے حد چوکنے لگے۔ وہ بہت مشاقی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ گاڑی کے سائیڈ مرر میں وقاص کی مسلسل تعاقب میں آتی جیب کو بھی وہ دیکھ سکتا تھا۔ پتا نہیں اس سفر کا انجام و اختتام کیا ہونا تھا جو اچانک ہی اندھا دھند انداز میں حوصلے کی مخالفت میں جاری ہو گیا تھا۔ سورج ڈوب گیا اور تاریکی گہری ہوتی چلی گئی۔

گاڑی تنگ پٹی سڑک کے بعد یکے بعد دیگرے کئی موڑ مڑ گئی۔ اب وقاص کی جیب نظر نہیں آ رہی تھی۔ نگاہ کے سامنے لامحدود وسعتوں تک پھیلے کھیتوں کے سلسلے کے ساتھ بے تاب دامن تھی۔ یہاں اب سفر جاری رکھنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ کچھ سوچ کر سکندر نے یکدم بریک لگا کر گاڑی بند کر دی

اور دروازہ کھولتا سرعت سے باہر نکلا۔ لاریب کو اس کی سوچ اور حکمت عملی کی بھلا کیا خبر ہو سکتی تھی۔ جیسی اس کا منہ اس حرکت پر کھلا رہ گیا۔ سکندر نے اس کی جانب کا دروازہ کھولا اور آؤ دیکھنا تاؤ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تحسین لیا اور اپنے ساتھ تقریباً کھینچتے ہوئے وہ اندھا دھند کچے رستے پر بھاگنے لگا۔ لاریب کے حواس اب بالکل ہی جواب دینے لگے تھے۔ وہ ایک طرح سے اس کے ساتھ ہسٹنٹی ہوئی جا رہی تھی۔ ایک جوتا بھی اس کے پیر سے نکل گیا۔ یہ سب اتنا اچانک اس قدر غیر متوقع عمل تھا کہ اس کی جیسے ساری صلاحیتیں ہی بے کار ہو کر رہ گئی تھیں۔

”یہ کیا حرکت ہے..... آریو میڈ؟“ معاوہ خود کو سنبھال کر حلق کے بل چیختی۔ مگر سکندر کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس کی بات کا جواب دیتا۔ اس کی بھرپور کوشش تھی وقاص کے وہاں پہنچنے سے قبل کسی طرح بھی فصلوں میں خود کو محفوظ کر سکیں۔

وہ بچہ نہیں تھا صورتحال سے اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ وقاص سے اس وقت لاریب کی عزت کو خطرہ لاحق ہے اپنی پوزیشن سے تو آگاہ تھا ہی۔ اس وقت وہ نہتا بھی تھا جبکہ وقاص بھینسا تمام تیاری کے بعد ہی میدان میں اتر اہوگا سکندر اگر اپنی جان پر بھی کھیل جاتا اسے وقاص کے شیطانی منصوبے سے نہیں بچا سکتا تھا۔ موجودہ صورتحال میں اس کے خیال کے مطابق یہ ہی بہترین دفاعی عمل تھا۔ لاریب کی وقتی خفگی کی اس وجہ سے اس نے زیادہ پروا نہیں کی اور یونہی اسے تقریباً کھینچتا آگے بڑھتا رہا وہ لازماً اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتا مگر براہوا اس گڑھے کی وجہ سے جس میں عین اس بل اس کا اٹھا ہوا پیر جا پڑا تھا اور وہ توازن قائم رکھے بغیر سنبھلے بنا اس گڑھے میں گرنا چلا گیا ساتھ ہی لاریب بھی کیونکہ اس کا ہاتھ سکندر کی مضبوط آہنی گرفت میں تھا۔ یہ سب کچھ بے حد غیر متوقع اور قیامت خیز تھا کہ دونوں میں سے کوئی ایک بھی حواس بحال نہیں رکھ سکا۔ لاریب تو وحشت کے شدید احساس سمیت بے اختیار چلائی بھی تھی۔ بلبلاؤ سکندر بھی گیا تھا کہ سطح پر گرتے ہی اس کا سرپوری قوت سے نیچے کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا تھا اتنی شدت

سے کہ ایک لمحے کو آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا مگر اسے بر وقت ہوش میں اوشاپڑا تھا لاریب کا نرم دناڑک سر اپا جواس کے حواس جھنجھنا کر رکھ گیا تھا وہ اپنی جھونک میں اس کے اوپٹا کر گری تھی۔ سکندر کا آہنی سینہ اس کے نرم و گداز بوجھ کے نیچے دب چکا تھا۔

لاریب کا چکرایا ہوا دماغ جیسے ہی ٹھکانے پر آیا اور اس ناگوار پوزیشن کی ساری تلخی کا احساس جاگا اس نے تڑپ کر فاصلہ بڑھانا چاہا مگر ناکام رہی۔ سکندر کے وجود سے اٹھتی سگریٹ اور آفرشیو لوشن کی مخصوص مہک لاریب کے پہلے سے منتشر حواس کو مزید خطا کر کے رکھ گئی۔ وہ اس کے انتہائی قریب تھا اس کی گرم سانس لاریب کے چہرے پر بھاپ بن کر لگ رہی تھیں۔ اس لمحے سکندر کے لیے بھی خود بر قابو رکھنا انتہائی دشوار تھا۔ گویا یہ اس کی زندگی کا سب سے قیمتی مگر نازک اور آزمائشی لمحہ تھا۔ چند ثانیوں کو تو اسے سب کچھ بھول گیا تھا۔ مگر اگلے لمحے اس کے ذہن کو خفیف سا جھٹکا لگا۔ لاریب بے تاب مچھلی کی مانند تڑپ کر فاصلے پر ہو گئی اور تھر آؤد موڑ کے ساتھ اس پر چڑھائی کر دی تھی۔ اس کا چہرہ تپنے لگا یوں جیسے آگ سلگ اٹھی ہو جیسی اسے پھٹکارتے ہوئے وہ اس کی موجب نازک صورتحال کو بھی فراموش کر گئی ہو۔

”کیا منصوبہ ہے تمہارا..... ساتھ ملے ہوئے ہونا وقاص کے تم بھی؟“ اس کا گریبان پکڑ کر زوردار جھٹکا دیتے ہوئے وہ پھٹکاری۔ سکندر سر میں اٹھتی شدید تکلیف کی پروا کیے بغیر سرعت سے سیدھا ہوا اور کچھ کہنے بغیر تیزی سے ہاتھ بڑھا کر لاریب کا منہ سختی سے بند کر دیا۔ لاریب کے تو جیسے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔

”پلیز لاریب..... کو انٹ پلیز۔ وہ لوگ تعاقب میں ہیں ہمارے۔ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ ہم یہاں ہیں تو خود سوچیں چھوڑیں گے ہمیں؟“ لاریب کے زخمی پرندے کی مانند پھڑ پھڑاتے وجود کو نرمی سے سمیٹتا ہوا وہ اتنے رساں سے کہہ رہا تھا کہ لاریب کا خوف کی زیادتی سے بند ہونے کو قریب دل ذرا سا سنبھلا۔ بات اڑے حواس ہونے کے باوجود پلے پڑی تھی۔ جیسی نڈھال انداز میں مزاحمت ترک کی

اور اس کا ہاتھ اپنے منہ سے ہٹانے کو اپنا ہاتھ آگے کیا۔ سکندر نے اس کے مقصد کو سمجھا تو بینا تامل نا صرف اس کے منہ سے ہاتھ ہٹایا بلکہ اسے اپنی گرفت سے بھی آزاد کر دیا۔

”ہو سکے تو سیل فون بھی آف کر دیں۔ وہ گاڑی کو خالی پا کر فون کے ذریعے ہماری تلاش کرے گا۔“ کسی قدر تاؤ سے باہر آتے سکندر نے سرگوشی کی۔ لاریب کو اس کی قربت کا احساس ہوا تو کچھ اور سرک کر دور ہوئی۔ یہ شاید کوئی پرانا کنواں تھا جواب زیر استعمال نہیں رہا تھا۔ جیسی حادثے سے بچنے کی غرض سے کسی نے اس کے منہ پر جھانڈ جھنکار رکھ کر اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ مگر وہ اپنی لاعلمی اور اندھیرے کے باعث خطا کھا گئے تھے۔ لیکن یہ بھی غنیمت تھا اس طرح گویا وہ بے حد گھاگ دشمن کی نظر سے پوشیدہ ہو گئے تھے۔ لاریب نے سکندر کی تاکید کے مطابق سیل فون بیک سے نکال کر آف کر دیا تھا۔

وہ کتنی حراساں اور بے کل لگی تھی اسے۔ خوفزدہ ہرنی جیسی بے حد نازک لڑکی۔ سکندر کا بس نہیں چلا اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں سمیٹ کر سینے سے لگا کر سارا خوف سمیٹ لے۔ مگر وہ اس پر قادر کہاں تھا۔ تمام تر احتیاق حاصل ہو جانے کے باوجود ان فاصلوں کو قائم رہنا تھا کہ حیثیتوں کی خلیج بہت گہری تھی۔ سکندر کے اندر جنگ چھڑی تھی تو دوسری جانب وہ بھی کچھ کم خوف زدہ اور بے چین نہیں تھی۔ اس کے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ وقاص کا خوف اس کے غلیظ ارادوں کا ہوا بن کر لاریب کے اعصاب کو ناکارہ کرتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر قبل کے اس کے الفاظ جیسے اسے دیکھتے کوئلوں پر گھسیٹ رہے تھے۔ بدن جھلس رہا تھا عدم تحفظ کا ایسا احساس جاگا تھا کہ وہ سہم سہم کر سانس لیتی تھی۔ معا اس کی جان حلق میں آن پھنسی اور ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہریں سرسرا نے لگیں۔ دور سے گاڑی کے بھاری انجن کی آواز سنائی دی۔ پھر ساواں بتدریج نزدیک تر آ گئی۔

”یہیں کہیں ہے وہ بد بخت گاڑی یہاں ہے تو وہ لازمی اسے لے کر فصلوں میں چھپا ہوگا۔ ڈھونڈو اسے مجھے ہر صورت چاہیے وہ ورنہ میں تمہارے ٹکڑے چیل کوؤں کو کھلا



دوں گا۔ پہلے بھاری قدموں کی بھاگتی دھمک ابھری تھی پھر وقاص کی نشہ سے لڑکھڑاتی جہان زدہ آواز نے لاریب کا رہا سہا دم بھی نکال دیا تھا۔ وہ اتنی بے اختیار سکندر کے قریب سرک کر اس کی شرٹ کار کے نزدیک سے مٹیوں میں بھیج کر ننھی بچی کی طرح لرزتی اس سے چپک گئی۔ سکندر اس انہونی اور اچانک افتاد پر سچ معنوں میں جیسے دھکتے تندور میں جا پڑا جس نازک جذباتی کشمکش کا وہ شکار تھا اس پر لاریب کی یہ قربت گویا چنگاری پر تیل ڈال کر لاؤ بھڑکانے والی بات تھی۔ وہ سر تا پا لڑا تھا۔ لاریب اس کی وحشتوں سے بے خبر خود کو اس کے کتنا نزدیک لے آئی۔ وہ خزاں زدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی اور اضطرابی کیفیت کے زیر اثر اس کے کاندھے سے اپنا چہرہ رگڑ رہی تھی۔

”میں نے سارے کھیت اور فصلیں چھان ماری ہیں سرکار وہ دونوں کہیں نہیں ہیں۔“ سکندر نے اس غضب کی آزمائشی کیفیت میں کمدار کی خوف سے لرزتی آواز سی تھی جواب میں وقاص آپے سے باہر ہوتا دھاڑتا رہا تھا۔ آدھا گھنٹہ مزید وقاص نے وہاں طوفان برپا کیے رکھا تھا وہ طیش میں چیخا اور پھنکارتا رہا تھا۔ سکندر جیسے بل صراط پر چل رہا تھا۔

اسے کبھی یہ دعویٰ نہیں رہا تھا وہ فرشتہ صفت انسان ہے مگر وہ کسی کے جذبات و احساسات کے مخالف چل کر محض نفس کی غلامی میں فریق ثانی کے اعتماد کی دھجیاں بکھیر کر انسانیت کی سطح سے گرنے کا بھی قائل نہیں تھا۔ بھلے لاریب سے اس کا قانونی و شرعی رشتہ استوار تھا مگر یہ بھی طے تھا کہ لاریب ایک مرد کی جانب سے عزت کے خوف میں مبتلا ہو کر اس کی قربت میں پناہ ڈھونڈنے آئی تھی۔ وہ اس کا اعتماد کیسے بے مول کر دیتا۔ اسے تو بس جس احساس نے قیامت کی اذیت سے دوچار کیا تھا وہ یہی تھا کہ لاریب کے نزدیک وہ آج بھی اتنا غیر اہم تھا کہ وہ وقاص سے خائف ہو کر اگر تحفظ کی خواہش میں اس کی جانب آئی بھی تھی اس کی مردانگی اس کے جذبات کو خاطر میں لائے بغیر۔

”خود کو سنبھالیں اب وہ لوگ جا چکے ہیں میرا خیال ہے اب ہمیں بھی نکلنا چاہیے۔“ لاریب کے نوخیز سراپے کو

رعونت زدہ انداز میں جھٹک کر خود سے دور کرتا ہوا وہ اسے سرد انداز میں کہتا اٹھ کر کھڑا ہوا تھا کہ لاریب جو اس کی پناہ میں سب کچھ فراموش کیے ہوئے تھی جو یکدم بڑبڑا کر سیدھی ہوئی اور خود کو سنبھال کر اپنا دوپٹا کھینچا جوتھر بنا ڈھلک چکا تھا۔

”یہاں سے تو نکلنا بھی آسان نہیں ہوگا“ میرے خدا..... اب کیا کریں؟“ اپنی جیب سے سیل فون نکال کر اس کی تاریخ آن کیے کنوئیں کی چکنی اور پانچ فٹ اونچی دیوار کا جائزہ لیتا ہوا جھنجلا کر کہہ رہا تھا۔ لاریب نے ایک خفت زدہ نگاہ اس پر ڈالی اس کے ذہن پر اپنی کچھ دیر قبل کی حرکت کی شرمندگی کا غبار پھیلا ہوا تھا۔

(شٹ ایسا بھی کیا خوف پتا نہیں کیا سمجھ رہا ہوگا خود کو اب طرم خان کی اولاد) وہ بے دردی سے ہونٹ چل رہی تھی۔ سکندر پہلے کسی نہ کسی طرح خود باہر نکلا پھر ہاتھ پکڑ کر لاریب کو اوپر کھینچا۔ لاریب کو صاف محسوس ہوا اس نے یہ عمل کس درجہ سرد مہری اور مشینی انداز میں انجام دیا تھا۔ ایک بل کو ایسا لگا تھا جیسے وہ اسے وہیں چھوڑ کر خود چلتا بنے گا۔ انسٹلٹ سے کہیں زیادہ گہرا احساس حیرت زدگی کا تھا۔ اسے خاک سمجھ نہیں آ سکی سکندر کا موڈ اس قدر تباہی کے دہانے پر کیونکر پہنچا ہوا ہے۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے سکندر اگر وہ لوگ کہیں چھپ کر بیٹھے ہوئے ہمارے باہر نکلنے کے منتظر ہوئے تو.....!“ گاڑی کی سمت بڑھتے اس نے نا چاہتے ہوئے بھی اپنا خدشہ ظاہر کیا۔ سکندر چلتے ہوئے ٹھٹھک کر رکا۔ اس امکان کا خدشہ تو اسے بھی لاحق تھا مگر اس وقت یہ رسک بھی ضروری تھا۔ بہر حال رات یہاں گزاری بھی نہیں جاسکتی تھی۔ پیچھے کھیتوں کا وسیع سلسلہ تھا۔ عقب میں بل چلی ہوئی زمین اور کچھ ٹنڈ منڈ درخت اور سامنے کچھ فاصلے پر موجود ان کی گاڑی تھی۔ سر جھٹک کر سکندر نے قدم بڑھا دیے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اس کے سر سے بہتے گاڑھے خون پر لاریب کی نظر جا پڑی تھی۔ جو بہہ کر گردن کے ساتھ اس کی سفید براق قمیص کا ایک حصہ بھی داغ دار کر چکا تھا۔ وہ یکدم ساکن ہو کر رہ گئی۔

”تم زخمی ہو سکندر یہ چوٹ کیسے لگی تمہیں؟“ اس کی تشویش بڑی قابل دید تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو سکندر اس

خصوصیت بھری توجہ و محبت کے مظاہرے پر قربان بھی ہو سکتا تھا۔ مگر اس وقت اندر کوئی احساس نہیں جاگا۔ وجہ یہی تھی وہ اپنے ساتھ ساتھ پوری دنیا سے بھی روٹھا ہوا لگتا تھا۔ جیسی کان دھڑے بغیر گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ گاڑی اشارت کر کے دیکھی تو اندازہ ہوا۔ وہ غیبت انسان جاتے ہوئے کمینگی دکھایا تھا۔ گاڑی کے تمام تار پھٹ چکے تھے۔

”دھت.....!“ باہر نکل کر جائزہ لیتے سکندر کے اعصاب پر جھنجلاہٹ ظاہر ہونے لگی۔

”کچھ پوچھ رہی ہوں تم سے سکندر کیا ہوا ہے تمہیں؟“ اس کی بے نیازی و لاتعلقی کو دیکھتی لاریب کا ضبط رخصت ہو گیا تھا۔ جیسی ڈیپٹ کر بولی۔ خطرہ ٹل جانے کا احساس اسے اچھا خاصا ریلیکس کر گیا تھا۔

”یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے مادام صد افسوس اتنی سی چوٹ سے مرنے سے بھی رہا ہوں۔“ سیل فون جیب سے نکال کر ڈرائیور کریم بخش سے رابطہ بحال کرنے کی کوشش میں مصروف وہ اتنے جھلائے ہوئے انداز میں بولا تھا کہ لاریب حق دق رہ گئی۔ سکندر مطلق دھیان دیے بنا اپنے کام میں مصروف رہا تھا۔ پہلے اس نے کریم بخش کو گاڑی لے کر آنے کا کہتے ایڈریس ذہن نشین کر لیا پھر بابا سائیں کو کال کر کے انہیں مختصر گاڑی خراب ہونے بتاتے تاخیر پر پریشان نہ ہونے کی تاکید کرتا رہا۔

”آپ بس آدھا گھنٹہ انتظار کریں بابا سائیں ہم ان شاء اللہ پہنچ رہے ہیں۔“ اس نے وقاص کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ لاریب کی تسلی کے لیے یہی کافی تھا۔

”یہ لودو والگا لوزخم پر خاصا گہرا لگتا ہے۔ ابھی تک بلیڈنگ ہو رہی ہے۔“ لاریب نے بابا سائیں کے لیے جو ادویات خریدی تھیں ان میں احتیاطاً پانڈین اور کاشن کو بھی شامل کر لیا تھا جو وہ گھر میں ہمہ وقت رکھا کرتی تھی۔ اس وقت یہی کام آئی تھی۔ سکندر نے سیل فون جیب میں رکھتے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا پھر دونوں چیزیں لے کر ڈیش بورڈ پر پینج دیں۔ منہ سے کچھ نہ کہنے کے باوجود اس کے تاثرات پھاڑ کھانے والے ہو رہے تھے۔ لاریب کی طبع نازک پر جیسے

کاری چوٹ پڑی۔ اس نے بے ساختہ اسے گھورا تھا۔ ”مجھے نہیں معلوم تمہارا دماغ کس بات پر خراب ہے۔ مگر یہ زخم بے پروائی کا متقاضی ہرگز نہیں ہے لاؤ میں ڈریسنگ کر دیتی ہوں۔“ اس نے صرف کہا نہیں بلکہ زبردستی سکندر کا سر تھام کر اپنے زانو پر رکھا اور ہاتھ کی انگلیوں سے ٹول کر زخم تلاش کر کے بال ہٹا کر متاثرہ جگہ کا جائزہ لیتی زخم کی ڈریسنگ میں مشغول ہو گئی۔ جبکہ سکندر کے تو جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ اب بھلا بھی مجال اس میں کہ اس ساحرہ کے حکم سے سر تابی کر سکتا۔ لاریب نے اسپرٹ میں روئی بھگو کر پہلے زخم صاف کیا پھر دو الگا کر روئی کو زخم کے کھلے منہ پر رکھ دیا۔ سفید پٹی کو نرمی سے لپیٹ کر گرہ لگاتے ہوئے اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”زخم گہرا ہے سکندر میرا خیال ہے اسلینجک ہوگی ڈاکٹر کے پاس ضرور جانا سن رہے ہو؟“ اسے گم صم پا کر لاریب نے اسے کاندھے سے پکڑ کر خود سے پرے ہٹایا۔ سکندر کی نظر محض لمحہ بھر کو اس سے ملی تھی۔ کیا کچھ نہ تھا اس ایک نظر میں۔ محبت، طلب، نارسائی، کرب، بے بسی۔ لاریب نے پورا نہیں تو کسی حد تک ضرور جان لیا تھا۔ اس نگاہ کے تقاضوں کو جیسی خائف ہوتے فی الفور نظر کا زاویہ بدل ڈالا۔ اسے یکدم ہی جیسے اپنے اور اس کے بیچ رشتے کا احساس جاگا تھا۔ جیسی مضطرب ہوتی رخ پھیر گئی۔ خاموشی کا گہرا احساس تمام تر معنی خیزی کے ساتھ ان کے بیچ تھر تھرانے لگا۔ لاریب کا دل خدشات لیے دھک دھک کر رہا تھا۔

”کیوں فکر مند ہوتی ہیں بی بی صاحبہ محافظ لیرے نہیں ہوتے وہ اپنا آپ داؤ پر لگا کر بھی اپنا فرض نبھایا کرتے ہیں۔“ اس کا لہجہ ہر خند تھا۔ لاریب کے سارے جسم کا خون سمٹ کر چہرے پر آ گیا۔ سکندر کا یہ جلتا ہوا انداز اسے زمین میں گاڑھ کر رکھ گیا تھا۔ کتنا چاہا تھا اس نے اپنے مخصوص آتش فشانی موڈ کے ساتھ اس کا سامنا کرے مگر اسے شدیدنا کامی کا شکار ہونا پڑا۔ سکندر پھر فون پر مصروف تھا۔

”کریم بخش کہاں ہوتے؟“ کریم بخش نے جانے کیا کہا تھا کہ وہ کھٹاک سے اپنی جانب کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔



”نیچے تشریف لائے کریم بخش گاڑی لے آیا ہے۔“  
لاریب نے اترنے سے قبل گردن موڑ کر نیچے دیکھا کچھ  
فاصلے پر گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمک رہی تھیں۔ وہ بے اختیار  
نیچے اتر آئی تھی۔



وہ مسکڑی ماحول کی خوب صورتی کو اندر اتار رہی تھی۔  
ہلکے ہلکے سبزے سے ڈھکے پہاڑ ارد گرد کے ماحول کو خوبانہ کی  
تاثر عطا کر رہے تھے۔ شام دھیرے دھیرے ختم ہو کر رات  
میں تبدیل ہو رہی تھی۔ انہیں یہاں بھور بن کے ہوٹل میں  
قیام کا یہ تیسرا دن تھا۔ پرسوں علی الصبح وہ یہاں پہنچے تو ہر کسی  
نے تھکان کے باعث آرام کو ترجیح دی۔ نندنی کو ایسے میں بھی  
کہاں چین تھا۔ محض ایک گھنٹے کی نیند لے کر وہ چہل قدمی کو  
باہر نکل آئی تھی۔ ماحول کی دل کشی اور خوب صورتی نے جیسے  
اسے جکڑ لیا۔ خوب پیارے سے رنگوں کے مظہر کوٹ ٹوپی  
میں ملبوس وہ ارد گرد کا نظارہ کرتی سرخوشی کی کیفیت میں چہل  
قدمی کرنے میں مصروف تھی۔ اسے ماحول کی اجنبیت سے  
بالکل بھی خوف نہیں آیا۔ ریست ہاؤس کے سامنے سیاہ مرزک  
جو شہر تک جاتی تھی سامنے گھاس کا میدان اور اس کے اختتام  
پر آسمان سے ہم کلام ہوتے پہاڑ دائیں جانب ٹیڑھا مڑا  
راستا پگڈنڈیاں پہاڑ نیم تاریکی اور خوشبو کے ساتھ سبزے  
کی باس انجان پھولوں کی دل بھاتی مہک خوفناک دریا ایک  
گمان کی صورت دکھائی پڑتا تھا۔ وہ کچھ مگن تھی ہوتی کیوں  
نہ مہوت کرنے کا سارا سامان تھا قدرتی خوب صورتی سے  
لے کر عباس حیدر کی ساحرانہ قربتوں سمیت۔

موسم کے تیور یک دم بدلتے تھے بے نیاز و مفرور محبوب  
کی طرح۔ وہ تو حیران ہو کر بل بل روپ بدلتے موسم کے  
تیور دیکھ رہی تھی۔ ابھی تیز دھوپ تھی اگلے چند منٹوں میں  
آسمان پر بدلیاں پھر آسمان تاریک شفاف نیلم کی طرح لگتا۔  
دھوپ کم ہوتی تو منظر سائے کی چادر اوڑھ لیتا۔ ہر شے ہی  
رنگ بدل دیتی۔ گھاس کے کتنے رنگ تھے ہر صبح قدرت گردو  
نواح کے نئے روپ پیش کرتی۔ پھر وہاں کے رہائشی لوگوں کا  
خیرہ گن حسن پٹھے پرانے کپڑوں میں کی سختیاں سہتے وہ

جیسے گدڑی میں لعل چھپے تھے مگر یہ سب کچھ مل ملا کر بھی عباس  
کے چہرے کے آگے ماند پڑ جاتا تھا۔ وہ ایسا سورج تھا گویا  
جس کی آب و تاب ہی ہر منظر کو اجالتی ہے۔

کل رات عباس اور اس کے دیگر ساتھی موج مستی کے  
موڈ میں تھے۔ انہوں نے علاقائی لوگوں کے عشائیے میں  
ان سے گیت سنے تھے۔ آگ کا الاؤ روشن تھا اور اس کے  
اطراف وہ سب براجمان تھے۔ ایسے میں نندنی کی نظریں یا  
تو عباس حیدر کا گھیراؤ کر رہیں ہوتیں یا پھر جھکی رہتیں۔ وہ بے  
خبر اور مگن تھی مگر عباس جو اتنے سارے مردوں کی موجودگی  
میں اکیلی نندنی کا وہاں بیٹھنا پسند نہیں کر رہا تھا اس وقت کچھ  
اور بھی مضطرب ہونے لگا تھا۔ جب اس نے پروڈیوسر آفاق  
کی نظروں کا حصار نندنی کے گرد بندھتا محسوس کیا تھا۔ حیران  
تو عباس پہلے بھی تھا جب آفاق نے انہیں آج سہ پہر جو ان  
کیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو پیڑ گھنے میں دلچسپی  
نہیں رکھتے بس پھل کھانے والے ہوتے ہیں۔ وہ خواری کا  
قائل نہیں تھا۔ جتنا بڑا ریکس تھا اس قدر سہل پسندی اس کے  
مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔ اس کڑے موسم میں اس طرح  
آ کر کام میں دلچسپی لینا تو ہر گز سمجھ نہیں آتا تھا۔ عباس کو اپنی  
اس الجھن کا سرا اس وقت ہاتھ آیا جب اس نے آفاق کو نندنی  
کے گرد چلاتے پایا تھا۔ بات اگر یہاں تک رہ جاتی تب بھی  
قابل قبول اور برداشت تھی۔ آفاق کی بے باکی بڑھی تھی اور وہ  
نندنی پر زور معنی اور کسی حد تک چپ فھرے بھی کسے لگا  
تھا۔ آفاق کی پوزیشن ایسی نہیں تھی کہ عباس کھل کر اسے  
سرزنش کرتا کر بھی لیتا۔ وہ بہر حال نندنی کے حوالے سے کسی  
اسکینڈل کو انورڈ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ عریضہ تو پہلے  
ہی اس سے اچھی خاصی بدگمان ہو چکی تھی۔ اسی معاملے کو  
لے کر جی بھی وہ چپ سادھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکا تھا۔

”میں تو اسی صورت ڈانس کروں گا اگر کوئی حسین ہمراہی  
میسر آئے۔“ شوخ گانے کی دھن پر جب ان کے کئی ساتھی  
اٹھ کر محو رقص ہوئے تو کسی نے عباس اور آفاق کو بھی آفر کی تھی  
عباس تو مسکرا کر ٹال گیا مگر آفاق نے پھر پٹوی چھوڑ دی۔  
اس کی ہوس زدہ نظروں کا مرکز نندنی کے علاوہ کس کا وجود



ہو سکتا تھا۔

”مس نندی! میرا خیال ہے آپ کو جا کر آرام کرنا چاہیے۔ رات بہت ہو گئی ہے۔“ عباس کسی طرح بھی اب خود پر جبر نہیں کر سکا اور نندی کو وہاں سے اٹھانے پر ٹل گیا۔ نندی تو چونکی تھی ہی آفاق بھی بری طرح جڑ بڑھ گیا۔

”پاکل ہو سا حزیار چرخوں میں روشنی بجھانے کی بات کر رہے ہو۔“ وہ صاف بہکا ہوا تھا۔ عباس نے اندر ہی اندر تلملا کر اس کی بات نظر انداز کر دی۔

”جائے نندی، کل ہمیں شوٹ کرنی ہے۔ آپ فریش ہو سکیں گی۔“ اب کہ اس کا لہجہ کڑا اور سخت تھا۔ نندی گڑ بڑا کر لکھت اٹھ کھڑی ہوئی۔ عباس کا بگڑا ہوا موڈ جتنے بھی پردوں میں پوشیدہ تھا مگر وہ بے خبر نہیں رہ سکی۔

”آئیے میں آپ کو کمرے تک رہنمائی کر دوں۔“ آفاق بھی اٹھا تھا عباس نے بروقت اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

”ابھی تو محفل عروج پر ہے۔ بھنگڑا نہیں ڈالیں گے آپ۔“ وہ جیسے زبردستی مسکرایا تھا۔ لحاظ اور پردہ برقرار رہنا چاہیے تھا۔ یہی بہتر تھا ان تینوں کے حق میں۔ عباس جانتا تھا آفاق بھی یقیناً سمجھتا تھا جیسی ڈھیلا پڑ گیا۔ نندی تیز قدموں سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ لائٹ جلا کر اس نے بستر پر جاتے جاتے کھڑکی کی جانب دیکھا۔ پردے تھے ہوئے تھے۔ اس نے گہرا سانس کھینچا اور بیڈ پر آ گئی جب ہی اس کے فون کی میچ ٹون گنگنائی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر بے دھیانی میں سچ کھولا مگر عباس کا نام دیکھ کر اسے جیسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ سکا۔ دل کی دھڑکنوں میں اٹھل پھٹل سی ہونے لگی۔

”اپنے روم کی کھڑکیاں اور دروازہ اچھی طرح بند کر لیں۔ کوئی بھی ہو دروازہ نہیں کھولے گا صبح سے پہلے“ عجیب ہدایات تھیں۔ وہ تو جیسے ششدر ہو کر رہ گئی یہ حیرانی تمام ہوئی تو اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے لبریز ہونے لگے تھے۔ اس نے کچھ سوچا پھر نچلا لب دانتوں تلے داب کر ساری لائیں بجھا دیں۔ اس کے بعد کھڑکی کے آگے تار پردہ ذرا سا سرکایا گاں وندو سے نیچے لان کا منظر بالکل واضح تھا۔

روشنیوں سے چمکی سبز گھاس کے قطعے دو فٹ اونچی سفید کھڑکی کی گرل نما حد بندی اور آگ کے لاؤ کے گرد وہ دنیا بھر کی حسین ترین چہرہ۔ اس شب اس نے ہر خوف ہر احساس سے ماورا ہو کر اسے جی کر دیکھنے کی خواہش پوری کی تھی۔ یہاں تک کہ عباس وہاں سے اٹھ کر چلا بھی گیا مگر وہ مہسوت سی بعد میں بھی وہیں کھڑی رہی۔



ٹیرس کی ریلنگ کے اوپر دونوں ہاتھ جمائے وہ سانسے میں ڈوبے ماحول کو تک رہی تھی۔ آسمان بالکل تاریک تھا اور ستارے بے حد روشن۔ نشیب میں آبادستی کے کسی گھر میں روشنی چمکتی نظر آتی تھی۔ سواؤں کی شوریدہ سری عروج پر تھی جو اس کے بالوں اور شمال کو اڑائے جاتی تھی۔ یہ موسم کی شدت ہی تھی کہ ہر سواتی جلدی سناٹا چھا گیا تھا اور نہ ابھی رات کے صرف آٹھ ہی بجے تھے۔ آج دن میں اس نے یہیں سے کھڑے ہو کر سنو فائنگ میں انجوائے کرتے اپنے دیگر ساتھیوں کو دیکھا تھا۔ عباس کی اس رات کی تنبیہ کے بعد وہ سب کے ساتھ بیٹھنے سے گریز برتنا کرتی۔ سب لوگ نیچے شغل میں مصروف تھے۔ فراغت کا ان کے پاس آج آخری دن تھا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ جی بھر کے مگن تھے۔ فراز سنو مین بنانے کو سب سے زیادہ شور ہنگامہ کر رہا تھا۔ جس سے سب ہی محفوظ ہو رہے تھے۔ جب سب کے سنو مین تیار ہوئے تو سب سے زیادہ شاندار فراز کا ہی تھا۔ جس کی بلا جھجک سب نے تعریف بھی کر دی۔

”یہ اتنا چارمنگ اس لیے ہے کہ میں نے ساحر بھائی کا تصور ذہن میں رکھ کر بنایا ہے۔ ساحر بھائی اپنا ٹوپا دیں۔ یہ ایک دم سج جائے گا۔“ فراز نے عباس کے سامنے بے حد تعظیم سے جھکتے ہوئے دونوں ہاتھ پھیلائے تو عباس خفیف سا ہو کر مسکرایا اور اپنی سرحدی کیپ سر سے اتار کر اس کی جانب بڑھا دی۔ فراز نے نیا ہوا کا بلند و بانگ نعرہ مارا یوں جیسے دنیا فتح کر لی ہو اور بھاگتا ہوا اپنے سنو مین کی جانب آ گیا پھر بہت نزاکت سے کیپ اسے پہنائی اور بڑے اسٹائل میں اسے سیلوٹ پیش کیا۔ تقریباً سبھی اس کی حرکتوں

سے لطف اٹھا رہے تھے۔

”ارے ظالم کوئی میری تصویر ہی بنادے میرے شاہکار کے ساتھ۔“ وہ بسوڑا تو کتنے ہی ہاتھ حرکت میں آئے اور اپنے اپنے سیل فون کا کیمرہ آن کر دیا۔ فراز سخریوں کی طرح مختلف پوز دینے لگا معاً وہ مچلا۔

”جب تک سنو مین کو کچھ بھی نہ ڈالی تو تصویر کا حسن مکمل نہیں ہوتا اجازت ہے ساحر بھائی؟“ وہ شوخی سے آنکھیں نیچا کر بولا۔ ایک بار پھر قہقہہ پڑا ساتھ ہی فراز نے سنو مین کو دبوچ لیا۔ چونکہ یہ قدم کچھ زیادہ ہی جذباتیت میں ڈالا گیا تھا جیسی سنو مین دھڑام سے گر کر اس کے قدموں میں برف کا ڈھیر بن گیا۔ فراز تو جیسے دھک سے رہ گیا۔ یہ ٹوٹا تو اس کا غصہ دیکھنے والا تھا۔ وہ شدید طیش میں برف ٹھوکروں سے اڑانے لگا۔ عباس کی ٹوپی ایسے میں کب اس کے پیروں تلے آئی کب سسلی گئی اس کا دھیان ہی کہاں تھا۔ مگر نندی بے اختیار چیختی تھی اور پھر یونہی غصے سے چلاتی نیچے دوڑی آئی۔ اس کا پیروں کو چھوتا میکی نما لباس اس کے جوتے کی ایڑی تلے آ کر مسلا جانے لگا مگر اس کو پروا ہی کب تھی۔ اس کی آنکھیں غم و یاس کی مظہر تھیں تو چہرہ دکھ کی تصویر۔ اس نے پہلے جھک کر ٹوپی اٹھائی جھاڑی اور سینے میں بھینچ لی۔ اس کا چہرہ سفید تھا۔ سب حق دق رہ گئے تھے۔ ایسا سناٹا چھا گیا جیسے وہاں کوئی ہو ہی نہ نندی البتہ اسی ہیجان زدہ کیفیت میں فراز پر گرج برس رہی تھی۔

”شیم آن یو سر کی عزت اور تم نے اسے اپنے گندے بے ہودہ پیروں میں روند ڈالی۔“ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے جل تھل تھیں۔ صرف فراز ہی گنگ نہیں تھا دیگر لوگ بھی سکتے زدہ تھے اس کا رد عمل ہی ایسا انوکھا اور شدید تھا۔ اتنی عام سی بات اور ایسا قہر خود عباس بھی بھونچکا رہ گیا تھا جیسی وہ صورتحال کی گیمبھرتا کے خیال سے خود آگے بڑھا۔

”ہوں..... ہوں اس اوکے مس نندی“ کیا ہو گیا لائیں مجھ دیں کیپ۔“ عباس کو خود کو سنبھالنا پڑا کہ جن آنکھوں میں حیرت اور غیر یقینی تھی۔ ان میں اب معنی خیزیت تھی۔ وہ نظریں نندی اور عباس کو فسانے کھڑتی نظروں سے دیکھتی

تھیں۔ عباس نے آگے بڑھ کر اتنے نازل انداز کو اختیار کیا جیسے اس کے نزدیک یہ غیر معمولی بات ہو اور بڑا واقعہ ہی نہیں۔

”نہ..... ہر گز نہیں..... اب یہ اس قابل نہیں کہ آپ اسے پہنیں۔“ نندی کا لہجہ دکھ بھرا تھا۔ اس کی آنکھوں کی نمی ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ کیپ کو اس نے ہنوز سینے سے بھینچا ہوا تھا۔ عباس میں ہمت نہیں تھی کہ اطراف میں موجود نگاہوں کی معنی خیز کھنکاردوں کو برداشت کرتا۔ خاص طور پر آفاق کی نظریں جیسے انگارے تھیں دیکھتے ہوئے۔

”واٹ ٹان سنس مس نندی لی ہو یو سیلف۔“ بچی نہیں ہیں آپ۔“ ٹاؤ گیٹ لاسٹ فارم میر۔“ وہ دبے ہوئے لہجے میں اتنا دم ہم بولا تھا کہ نندی ہی سن پائی۔ نندی کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا۔ وہ کچھ دیر سا کن کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر ایک لفظ کہے بغیر پلٹ کر بھاگ گئی تھی۔

”بے چاری عام سی لڑکی! حسن شے ہی اتنی ظالم ہے یار۔“ آفاق اس کے نزدیک آ کر پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہوتا ہوا تاؤ دلانے والے انداز میں بولا تھا۔ عباس کسی طرح بھی خود پر ضبط نہ کر سکا تو اس پر بھی چلا اٹھا۔

”شٹ اپ آفاق صاحب کو ہیٹ میں ہر گز کوئی بے ہودگی برداشت نہیں کروں گا اوکے؟“ اس نے انگلی اٹھا کر کہتے اسے گھور کر دیکھا اور لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے بعد بھی وہ کھولتا رہا سب سے زیادہ غصہ ہی اسے نندی پر تھا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ چہل قدمی کو نکلا تھا۔ واپس ریٹ ہاؤس آیا تو نندی کو ٹیرس پر کھڑے پا کر اس کے قدم لچھ بھر کو تھمے تھے پھر وہ ہونٹ بھینچے اس کی جانب پیش قدمی کر گیا تھا۔

نندی نے بے اختیار گردن موڑی۔ وہ اس کے سامنے اپنے طلسمی سراپے کے ساتھ موجود تھا۔ عباس اس کے یوں غیر متوقع طور پر متوجہ ہونے پر تھوڑا سا حیران ضرور نظر آیا مگر کچھ کہاں نہیں وہ کہاں جانتا تھا نندی اس ایک شخص کے قدموں کی چاپ سن کر بھی اسے پہنچانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ عباس مضبوط قدموں سے چلتا اس سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گیا تھا۔ اس کا انداز بے حد سنجیدگی اور گیمبھرتا لیے



ہوئے تھا۔ نندی کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

”پوچھ سکتا ہوں نندی صاحبہ یہ احتمالہ حرکت کیوں کی آپ نے؟“ اس کی سرد بے حد ہم آواز میں تنبیہ کا رنگ اتنا گہرا تھا کہ اسے نظر انداز کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ نندی کی رنگت متغیر ہوئی۔

”میں حیران ہوں آپ کو اتنی سوجھ بوجھ بھی نہیں کہ اس قسم کا رویہ آپ کے لیے مشکلات کھڑی کر سکتا ہے۔ پہلی فلم کے شوٹ کے بعد اگر خدا نخواستہ اسکیٹل بن گیا تو پورا کیریئر داؤ پر لگ جائے گا۔ آپ کو اپنا نہیں تو میرا خیال کرنا چاہیے تھا۔ میں ہر گز بھی اس قسم کا اسکیٹل انورڈ نہیں کر سکتا۔“ آخر میں وہ اپنی برہمی کو کسی طرح بھی ظاہر ہونے سے روک نہیں سکا۔ نندی ہنوز خاموش تھی کسی مجرم کی طرح سر جھکائے گم صم۔ البتہ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ کر نکھرنے لگی تھیں۔ عباس کی جھنجھلاہٹ بڑھی۔

”سن رہی ہیں کیا کہہ رہا ہوں میں آپ سے؟“ وہ بھڑکا تھا۔ نندی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے محض سر ہلایا پلکیں ابھی بھی نہیں اٹھی تھیں۔ آنسوؤں میں البتہ روانی آ گئی تھی۔ عباس نے سر آٹا بھری۔

”رات جو میں نے نیکسٹ بھیجا تھا وہ پڑھا تھا آپ نے؟“ عباد کی آواز میں پھر سے سرد پن غالب آنے لگا۔ نندی کی ساری حیات جاگ اٹھیں۔ وہ جیسے پوری جان سے متوجہ ہوئی سر ہلا کر رہ گئی اور عباس کا غصہ اس کے اثبات میں جواب ملنے پر ہی آسمان کی وسعتوں پر پرواز کرنے لگا تھا۔

”یہ اثر لیا ہے آپ نے اس بات کا۔“ وہ پھنکارا اور اسے آنچ دیتی نظروں سے گھورنے لگا۔ نندی کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے سرا سمہ ہو کر عباس کو دیکھا جس کی رنگت شدید غصے کے باعث لال ہو رہی تھی۔

”کیوں کھڑی ہیں اس طرح رات کے وقت اکیلی کمرے میں جائیں پلیز۔ میرے لیے مشکلات کو مت بڑھائیں۔“ وہ چیخ گیا تھا اور نندی اپنی آنکھوں میں اترتی دھند کی پروا کیے بغیر پلٹ کر اندھا دھند اپنے کمرے کی جانب بھاگی تھی اگلی صبح وہ ناشتے کے لیے بھی باہر نہیں آئی تھی۔ تقریباً

گیارہ بجنے کو تھے۔ جب عباس کو خود اس کا خیال آیا تو اس کی جانب چلا آیا۔ اس کی دستک کے جواب میں نندی نے دروازہ کھولا اس کا چہرہ ستا ہوا اور پوٹے پوٹے جھلکتے تھے۔ وہ دروازے سے ہٹ گئی تو عباس گہرا سانس بھرتا اندر چلا آیا۔

”آئی ایم سوری رات میں آپ سے مس بی ہو کر گیا ایکچولی میں کچھ آپ سیٹ تھا تو.....“ عباس کی وضاحت اور معذرت نے نندی کو ایسے تڑپا کے رکھ دیا جسے کسی نے چابک رسید کیا ہو۔

”اٹس اوکے..... پلیز نو ایکسکوز۔“ اس نے بھڑکی ہوئی آواز میں ٹوکا۔ بھلا یہ محبت کے اصولوں کی خلاف ورزی نہیں تھی۔ وہ دیوتا ہو کر داسی کتا گئے جھکتا ہے اچھا لگ سکتا تھا۔ عباس نے ایک نظر بغور اسے دیکھا۔ کل کے آف وائٹ لباس میں جس پر شکنیں پڑ چکی تھیں۔ بال پشت پر بکھرے تھے مگر اس بے ترتیبی میں بھی بلا کی خوب صورتی کے باعث ایک حسن تھا۔

”اگر آپ نظریں اٹھا کر کسی کا چہرہ دیکھ لیا کریں تو اس سے اور کچھ نہ سہی کم از کم یہ تو ہوگا کہ آپ لوگوں کے رویوں اور تاثرات کو پہچان کر اپنا بروقت بچاؤ کر سکیں گی۔“ عباس حیدر کا لہجہ اصلاحی تھا۔ نندی نے بے ساختہ ٹھٹھک کر الجھ کر اسے دیکھا مگر اسے پہلے سے متوجہ پا کر اس کی غم لانی پلکیں جیسا ہار انداز میں لرز کر لی الفور جھک گئیں۔

”مم..... میں سمجھی نہیں؟“ وہ واقعی گڑبڑا گئی تھی۔ عباس نے تناؤ کی کیفیت میں مبتلا ہوتے اسے دیکھا اور سر آٹا بھری۔

”آفاق صاحب سے احتیاط کیا کریں۔ وہ کچھ اچھے اخلاق کے مالک نہیں ہیں۔ میرا کام آپ کو مطلع کرنا تھا باقی آپ خود بہتر سمجھتی ہیں۔ میں ناشتا بھجوا رہا ہوں کر لیجئے گا۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ رے کے بغیر پلٹ کر چلا گیا۔ نندی غم سے متفکر کھڑی تھی۔



”میم آپ کی طبیعت ٹھیک ہے تو شوٹ کی تیاری کریں۔“ ساحر صاحب نے پوچھا ہے۔ نندی اپنے کمرے میں بھی بیٹھ پر دراز متفکرانہ سوچوں میں الجھی ہوئی جب اس کے سیل پر

ہاں کے اسٹنٹ شیراز کی کال آئی تھی۔ اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ اسے قطعی اس بات کی سمجھ نہیں آئی تھی کہ ایسا کیا کرے جو یہ ناگوار سلسلہ نہیں رک جائے۔ یہ کام اس کی بات فطرت اور مزاج کے جتنا بھی خلاف تھا مگر اس نے محض ہاں کی قربت کی اندھی خواہش کی تکمیل کی غرض سے سراب پہنچا کیا اور واقعی جیسے کسی دلدل میں آ پھنسی تھی۔

عباس نے جس انداز میں اسے آفاق کے حوالے سے آگاہ کیا اور پھر ساری ذمہ داری اس پر ڈال کر بری الذمہ ہو گیا۔ عاواہ احساس جتنا بھی حقیقت کے فریب ہو مگر اذیت سے بھر پور تھا۔ عباس کی ذات میں واقعی وہ اتنی گمن تھی کہ ارد گرد کیا ہو رہا تھا سب فراموش کر ڈالا۔ امیر کبیر مگر بھاری تن و توش کا ایک آفاق اسے اپنی حریصانہ نظروں کے ساتھ شدید قسم کے عدم تحفظ کے احساس سے دوچار کیا تھا۔ یہ ذہنی ہیجان ہی تھا کہ وہ بیمار پڑ گئی تھی۔ اتنا شدید بخار تھا کہ اگلے روز اسے اپنا ہوش نہیں رہی تھا۔ وہاں اس کی بیماری کے حوالے سے سب کا یہی خیال تھا کہ موسم کی شدت کو برداشت نہیں کر پائی اور ٹھنڈ لگ گئی۔ کئی گھنٹوں کی غفلت کے بعد اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں باک نیا غبار پھیلا ہوا تھا اس کا ذہن بے دار ہوا تو ساتھ ہی پھر وہی شناس اس کے احصاب پر چلتا درہونے لگی جس نے اس نوبت تک پہنچایا تھا۔

”ارے ارے ریلیکس مس نندی! اینڈ ٹیک اٹ ایزی۔“ اسی لمحے اس کی خبر گیری کو اتنے والا عباس اس کی پھر سے بند ہوئی آنکھوں سے اس کی بے ہوشی کا اندازہ لگا کر ہی بے ساختہ گہرا کر ٹوک گیا۔ اس حیات آمیز آواز میں اتنی قوت تھی کہ نندی کا بوجھل ہوتا ذہن جھٹکا کھا کر جاگا اور اس نے بے ساختہ گردن موڑی تھی۔ زندگی جیسے تمام تر دلکشی کے ساتھ بائیں کھولے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ گئی۔ وہ خواب و نظروں سے عباس کو کتنی اپنی خوش بختی کا خود کو یقین دلانے لگی کہ ابھی وہ مکمل طور پر باری نہیں ہے۔ ابھی زندگی کی سب سے اہم وجہ اور بنیاد موجود ہے۔ عباس مجسم حقیقت بنا ال کے رو برو تھا۔

”بہت پریشان کر کے رکھ دیا آپ نے۔ اب الوداع

کہیں اس بیماری کو پلیز دکھائیں نمپر پچر ہے ابھی۔“ عباس نے کہا اور ہاتھ بڑھا کر اپنے ہاتھ میں اس کی کلائی تھام لی اور نندی کی جیسے نبض تھم گئی تھی جسم الگ پسینے سے شرابور ہونے لگا۔ لمس تھا کہ انگارہ جس نے پورے وجود کو دھکا ڈالا تھا۔ اگر عباس مزید چند سیکنڈ بھی اپنا ہاتھ نہ ہٹاتا تو لازمی وہ اپنی جان سے گزر جاتی۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ اعصاب لرز رہے تھے اور ضبط آندھیوں کی زرد پرائے پتے کی طرح لڑتا تھا۔ نارسائی کا احساس اس پل جان لیوا حد تک سفاک اور بھیانک تھا۔ جبکہ دوسری جانب عباس اپنے لمس اپنے قرب کی تباہ کاریوں سے یکسر بے خبر اسی متوازن لہجے میں مخاطب تھا۔

”کیسا محسوس کر رہی ہیں اب آپ خود کو؟“ اور نندی کو اپنا آپ دار پر چڑھا ہوا محسوس ہونے لگا۔ کیا بتاتی وہ اسے کیسے بتاتی۔ اس کا بس ہی کیا تھا۔ یہی بے بسی کا شدید احساس تھا جس نے اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھرنے کے بعد چھلکا دیں۔ اس میں تو تاب نہیں تھی کچھ بولنے کی۔ اسے اپنے احساسات پر کنٹرول ہی نہ رہا تھا۔ دل اتنا شاک تھا کہ دھماکے مار کر رونے کا طلبگار ہو رہا تھا۔ اس پر اپنے اس پاگل پن سے خائف ہوتے اس نے عیاں نہ ہونے کے خوف سے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ اسے ڈرتا اس نازک ترین لمحے میں آنکھیں اس کی خواہش کی مجنونیت کے آگے ہار کر دل کا حال عیاں نہ کریں۔ یہ بھی شکر ہوا تھا کہ عباس حیدر کی توجہ بٹ گئی۔ اس کے سیل پر کال آ رہی تھی۔ وہ اس سے معذرت کرتا پلٹ کر باہر چلا گیا اور نندی خود سے اڑنے کو تنہا رہ گئی۔

”میم پلیز ٹیل می! ساحر صاحب کا کہنا ہے کہ اگر آپ تھوڑی سی ہمت کریں تو کچھ سین فلتاے جاسکتے ہیں۔ ایکچولی آج سنو فائنگ زوروں پر ہے۔“ شیراز کی کال دوبارہ آئی تھی۔ شیراز اس کی خاموشی سے اکتا کر اپنی بات پر زور دینے کو عباس کا حوالہ دے رہا تھا۔ نندی نے سر آٹا بھری۔ اس نے جانا تھا اب وہ انکار کی پوزیشن میں نہیں رہی ہے۔ انکار کی صورت عباس کی خفگی کا سامنا ہوتا جسے وہ ہرگز سہنے کا یار نہیں رکھتی تھی۔ اسے ہاں کہنی پڑی اور پھر وہ اٹھ کر اپنی



تیاری میں مشغول ہو گئی تھی۔ یہ سین اسے تنہا ہی اوکے کروانے تھے۔ یہ ایک امیر کبیر لڑکی کی کہانی تھی جو اس علاقے میں بغرض سیاحت آئی ہے۔ یہیں اس کی ملاقات فرار یعنی ہیرو سے ہوئی تھی۔

وہ خاصی بے بسی سے تیار ہوئی تھی۔ میک اپ آرٹسٹ شہلا صدیقی تھیں جنہیں عباس نے نندی کی شادی اور گریزاں نیچر کو مد نظر رکھتے ہوئے یہاں آنے کے بعد ہائر کیا تھا۔ اس تعاون کے لیے نندی چاہ کر بھی اس کی مشکور نہیں ہو سکی تھی کہ اس کے اعصاب پر تو مووی کے کئی بولڈ سین اور آفاق کی حریصانہ نظروں کا پہاڑ جیسا بوجھ دھرا ہوا تھا۔

”مجھے لگتا ہے آپ خود کو فریش نہیں پاتیں نندی“ یہ آپ کا پہلا پراجیکٹ ہے جو واضح رہتا ہے آپ صاحب کے لیے کر رہی ہیں۔ یونہی وہ اتنے لگی ہیں کہ مٹی کو بھی ہاتھ لگاتے ہیں تو سونا بن جاتی ہے۔ اس مووی کے نوے فیصد چانسز کلک کر جانے کے ہیں پھر بھی آپ بالکل ایکسائینڈ نہیں ہیں۔“ شہلا صدیقی کی حیرت اپنی جگہ بجا تھی۔ نندی اب اسے کیا جواب دیتی۔ محض مضحکہ سانس کرتی۔

”انچولی میں ابھی خود کو فریش اینڈ ایکٹیوٹیل نہیں کرتی اور کوئی بات نہیں ہے۔“

”آپ بہت امپریسیو اینڈ فیسیٹیک حد تک حسین ہیں۔ میک اپ اور کی تو بس فارمیٹی نبھانا پڑتی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کو اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ اس کی تعریفوں میں رطب السان ہو چکی تھی۔ تب ہی نندی کی تیاری مکمل ہوئی۔ نندی کے چہرے پر البتہ کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ وہ اسی سپاٹ انداز میں اٹھ کر باہر آ گئی۔ بے ولی اور یاسیت اس کے ہر انداز سے عیاں تھی۔ وہ اس بل بلیو جینز پر وائٹ ٹاپ اور بہت ساری پائٹس والی تیز گلابی رنگ کی بہت اسٹائلش جیکٹ میں ملبوس تھی۔ سر پر گلابی ہی اوئی ٹوپی تھی جس کے اطراف سے لہراتے اس کے سلی بال شانوں اور کمر پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ الٹرا ماڈی لڑکی دکھائے دیتی تھی مگر اس کی جاذبیت اور معصومیت اسے کسی نازک سی گڑیا کی طرح دکھا رہی تھی۔ عباس نے دانستہ اس سے نگاہ

ہٹائی۔ سامنے بل کھاتی سڑک تھی۔ دائیں جانب اس کے چھوٹے پہاڑ اور بائیں جانب گہری کھائیاں اور ڈھلوانی تھیں۔ نندی جو اتنی بلندی سے دیکھنے پر ایک لیکر کی صورت نظر آتی تھی۔ آسمان نیلا تھا۔ چمکیلا بلور جیسا۔ مگر گھنے درخت اس کے اچالے کی راہ میں حائل تھے کہ وہ اپنی روشنی زمین تک پہنچا سکتا۔ اس کے ارد گرد بادلوں جیسی تاریکی تھی۔ کبھی کوئی ڈھیت کرن چوں پر ناچ اٹھتی تھی کبھی بس۔ وہ سب اس منظر سے لطف اندوز ہوتے آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ عباس نے گہرا سانس کھینچا اور سبزے کی باس اور پھولوں کی مہک کو محسوس کرنا چاہا۔ یہاں تو سبزے کا بھی رنگ اور ہی تھا اور عجیب پھول جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے بلکہ پھولوں کے رنگ بھی نئے تھے۔

عریشہ کی اس کے معاملے میں اپنائی گئی ہیٹ دھری ہو کر بے بسی اسے ہر لمحہ اذیت دینے میں مصروف تھی۔ بھلا اس سے قبل کب اس نے بے مائیگی کے احساس کو چکھا تھا۔ برداشت کرنے کا ہنر آتا۔ اس نے گہرا سانس بھرا اور کمر کی سے باہر نگاہ کی جہاں قدرت کی صنائی ہر سو بکھری پڑی تھی۔ ترچھی چھتوں والے گھر پہاڑوں سے گرتے برف کی صورت جسے جھرنے اور مختلف رنگوں کے فلک بوس پہاڑ خوبانی اور اخروٹ کے درختوں کی یہاں بہتات تھی مگر ہر شے کو برف کی چادر بہت نرمی سے ڈھانپتی جا رہی تھی۔ وینڈ اسکرین پر وائٹ گرتی برف کو ہٹانے میں مصروف تھے۔ مزید پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد گاڑی روک دی گئی۔

”یہاں سے آگے پیدل جانا ہوگا“ ساحر بھائی؟“ یہ اس کے کہنے پر عباس جو اپنے خیالوں میں محو تھا چونک کر متوجہ اور گہرا سانس بھرتا اپنی طرف کا دروازہ کھولنے لگا۔ باہر نگاہ اس نے جگہ کا جائزہ لیا۔ یہ نیچے واوی کو جاتا ٹیڑھا میڑھا تھا جس پر پھسلن ہو رہی تھی کہ ارد گرد پھیلی گھاس پر گری برف نے راستے کو مزید دشوار بنا دیا تھا ایک جانب گہری اور تھک گھائیاں تھیں دوسری جانب بہت بڑے اور اونچے پہاڑ تھے جو آسمان کے سروں سے ہم آغوش تھے۔

”راستہ تنگ ہی نہیں خطرناک بھی ہے لہذا دھیان سے

دیکھو؟“ عباس نے سر سے برف جھاڑتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو اکیڈا کہا تھا۔ پھر یہ جھوٹا سا قافلہ اس سرسبز راستے پر ہلکا تھا۔ سبھی بے حد چمکے ہوئے تھے ہر قدم بھونک بھونک کر رہتے تھے۔ شیراز ہی یہاں سب کو گائیڈ کر رہا تھا۔ باقی سب اس کے پیچھے تھے۔ نندی سب سے آخر میں تھی۔ وہ اتنی اپ بٹ اور غائب و ماغ ہو رہی تھی کہ ویسی چابک دستی اور احتیاط کا مظاہرہ نہیں کر پا رہی تھی جو اس راستے پر چلنے کے لیے ضروری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا دو سے تین مرتبہ پیر ہلاک ہو رہا تھا۔ سنبھل گئی تھی۔ چوتھی مرتبہ یہ بے احتیاطی اسے گویا لے ڈوبی تھی۔ اس کا پیر پھسلا تو وہ خود کو چاہنے کے باوجود سنبھال نہیں سکی اور دل خراش چیخ کے ساتھ ہزاروں لڑکی گھائی میں نیچے دھکتی چلی گئی۔



سکندر سونے کی تیاری تقریباً مکمل کر چکا تھا۔ دھیمے سروں میں دروازہ بجا کر لاریب نے اندر قدم رکھا۔ سکندر کی حیرانی اس کی پھیل جانے والی آنکھوں سے عیاں تھی۔ ”مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے تم سے زیادہ وقت نہیں ملے گا۔“ آنکھیں چارہ ہونے پر اس نے اپنے مخصوص تنفر بھرے انداز میں اپنی آمد کی وضاحت پیش کی۔ سکندر نے گہرا سانس بھر کر سر ہانے پڑی اپنی ٹھٹھائی اور سمجھنے لگا۔ ”ڈاکٹر کے پاس گئے تھے تم؟“ بیڈ سے کچھ فاصلے پر موجود کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ اپنے مقصد کی بات کریں۔“ اس کا چہرہ ہنوز پات تھا۔ لاریب کو عجیب سی توہین محسوس ہوئی۔ (بھاڑ میں ماؤ میری طرف سے پتا نہیں خود کو سمجھنے کیا لگا ہے) وہ جل گئی مگر لعنت بھیجنے والے انداز میں اسے دیکھا اور سر جھٹک کر نوک اس احساس سے نکالا۔

”میں وقاص کی گھٹیا حرکت کی وجہ سے پریشان ہوں۔ تشویش کی بات تو ہے نا اسے اتنی جرأت آخر ہوئی کیسے سکندر وہ اس سے پہلے بھی ایسی چیپ حرکت کر چکا ہے۔ یاد ہے جب وہ میرے بدلے میں امامہ کو پکڑ چکا تھا

یہیں میرے کمرے کے باہر.....!“ وہ اپنے مخصوص انداز میں بات کر رہی تھی جبکہ سکندر کے پتا نہیں کتنے زخم ادھر گئے تھے۔

”آپ کے خیال میں یہ بھولنے والی بات ہے؟ شک آپ نے مجھ پر کیا تھا بلکہ الزام لگایا تھا اسی طرح رات کے وقت تعقیب کرنے آئی تھیں نا؟“ سکندر نے اپنی سرد نظریں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ اس کا لہجہ و انداز پھنکارتا ہوا تھا۔ لاریب کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزرا۔ اس نے بے ساختہ انداز میں نظریں چرا لیں۔

”ہاں بس وہ غلطی تھی میری میں تب وقاص سے اتنی گھٹیا حرکت کی توقع نہیں کرتی تھی۔“ اس نے بلا خراعت راف جرم کر کے سکندر کے ہونٹوں پر زہر خند بکھیر دیا تھا۔

”غلطیوں کا سلسلہ موقوف کیوں نہ ہوا پھر؟“ اس کا لہجہ آنچ دینے لگا تھا۔ لاریب نے چونک کر ناہم نظروں سے اسے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ کچھ کہتی وہ اسی برہم انداز میں پھر گویا ہوا۔

”وقاص سے آپ کو ایسی حرکت کی توقع نہیں تھی اور مجھ سے تھی۔ کیا آپ مجھے اتنا ہی گرا ہوا انسان سمجھتی ہیں؟“ لاریب کا رنگ فق سا ہو گیا اس نے گڑ بڑا کر اسے دیکھا تھا۔ سکندر نے یہیں اکتفا نہیں کیا۔

”اور گستاخی معاف محترمہ میں بہر حال انسان ہوں۔ فطری تقاضوں سے مبرا نہ سمجھیں مجھے۔ اس قسم کی بے احتیاطی کسی دن مہنگی نہ پڑ جائے آپ کو۔ مزید یہ کہ اس قسم کے معاملات میں سارا تصور ساری غلطی مرد کی ہی نہیں ہوا کرتی۔“ سکندر کا اشارہ اس طرح رات کو اس کے پاس چلنے کی طرف تھا۔ لاریب نادان نہیں تھی کہ سمجھ نہ پاتی تھی جبھی احساس ذلت اور سکی کے ساتھ ساتھ خجالت سے بھی منجمد ہو کر رہ گئی۔ چہرہ ایسے دہک اٹھا جیسے کسی نے آگ سلگا ڈالی ہو۔

”ٹھیک ہے میں صبح بات کروں گی تم سے تم اچھے خاصے گھٹیا ہو چکے ہو ویسے۔“ ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے وہ شدید غصے میں دل کی کیفیت کو الفاظ کا روپ دے گئی تھی۔ جو



اسے مہنگی پڑی۔ سکندر کو تو جیسے پتنگے لگ گئے تھے۔ جیسی وہ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا اور لاریب کی کلائی وحشی انداز میں دیو بج کر اپنے مقابل کیا۔

”میرا خیال ہے آج آپ کو شرافت اور گھٹیا پن کے درمیانی فرق کو اچھی طرح سمجھائی دوں۔“ اس کے شخص ایک زوردار جھٹکے کے نتیجے میں لاریب کسی پلاسٹک کی گڑیا کی مانند ہوا میں لہرا کر بستر پر منہ کے بل جا گری تھی۔ سکندر کے فقرے کی ذومعینیت اور بلا کے زہریلے پن نے اس کے چہرے کو سرا سمکی کا اشتہار بنا دیا تھا۔ دھڑکنوں میں جیسے طوفان برپا ہو کر رہ گیا۔ سکندر کے چہرے پر وحشت آمیز غیض بھرے تاثرات تھے اور تیور جد سے بڑھ کر جارحانہ۔

”مم..... میں مذاق کر رہی تھی سکندر..... پلیز مجھے جانے دو۔“ اس کا سارا اعتماد اور مظنہ سکندر کے غیض و غضب کے سامنے بل بھر میں رخصت ہو گیا۔ ثابت ہوا تھا وہ جتنی بھی بے نیاز اور روڈی تھی اندر سے عام سی لڑکی تھی۔ خطرے کے وقت پانی پر بلبل ثابت ہونے والی۔ مگر سکندر کا غم و غصے سے سلگتا دماغ اس وقت کسی مصلحت یا گنجائش کا متقاضی نہیں تھا۔ وہ طیش سے بھرا ہوا تھا جیسی اس پر جھک کر جارحیت بھرے انداز میں اس کا چہرہ اپنے بے رحم سخت فولادی ہاتھ میں جکڑ لیا۔

”تمہارے نزدیک میں سر سے پیر تک مذاق ہوں۔ میری عزت نفس میری مردانگی میری انا کسی کو بھی خاطر میں لانا تمہاری تو ہیں ہے۔ تمہارے نزدیک میں موم کا پتلا ہوں کہ تم جب جی چاہے جس انداز میں چاہو مجھے استعمال کرو اور پھینک دو۔ میں تمہیں بتانا چاہوں گا لاریب بیگم کہ میں انسان ہوں جیتا جاگتا۔ جذبات و احساسات سے مبرا نہیں ہو سکتا۔ تمہارے نزدیک یہ ایک بے معنی کھیل ہو گا مگر میرے لیے نہیں یہ میری زندگی اور موت کا معاملہ بن چکا ہے۔“ وہ اس کی ہراس سے پھٹ جانے والی غم آنکھوں کو گھورتا ہوا پھنکار کر بولتا رہا۔ لاریب کی اس کے خوفناک تیوروں کے آگے حواس باختگی کا عالم بھی عجیب بے بسی لیے ہوئے تھا۔ مارے سکی تو بین کے ضبط کا پارہ تمام ہوا تو ٹپ ٹپ آنسو اس

کی لابی پلوں سے ٹوٹ کر بکھرے اور سکندر کے ہاتھوں بھگو گئے۔ سکندریوں ٹھنڈا پڑ گیا جیسے کسی نے بھڑکی لیکھت پانی ڈال دیا ہو۔

”یہاں سے چلی جاؤ لاریب اور کوشش کرنا مجھے اس طرح سے ڈسٹرب نہ کرو۔ میں ایک بار پھر تم پر رحم نہیں کروں۔ حالانکہ نہ تو تم اس قابل ہو نہ مجھے اس کی خواہش ہے مگر..... ایک بات یاد رکھنا اب مجھ سے طلاق کا مطالبہ نہ کر ورنہ انجام کی ساری ذمہ داری تم پر عائد ہوگی۔“ اس نے سکندر کے سیدھا ہوتا ہوا وہ بے حد سرد انداز میں کہہ رہا تھا۔ لاریب وہ حال تھا کہ ”جان بچی سولا کھوں پائے۔“ وہ اٹھ کر دھند بھاگی۔ اس طرح کہ سکندر کو گمان گزرا وہ اس کی آخری بات خاص طور پر ڈھنگ سے سن بھی نہیں پائی۔ اس پر عمل کرنا تو دور کی بات تھی۔ توہین کا سلگتا ہوا احساس اسے خاکستر کرنے لگا۔ وہ بستر پر اوندھے منہ گرا تو گلابی خوش روپے سے چہرہ مس ہوا تھا۔ اس نے چونک کر سر اٹھا لاریب کا دو پٹا بستر پر پڑا تھا۔ جو وہ یہیں چھوڑ گئی تھی۔ عجیب سے احساسات سے مغلوب ہو گیا۔

”جب بھی آتی ہو شدید ترین کرب کے ساتھ اپنی کوئی کوئی نشانی چھوڑ جاتی ہو لاریب بی بی یہ بے پروائی تو ابھی بات نہیں۔“ وہ اٹھا تھا اور دوپٹا اٹھا کر الماری کے سب سے نچلے خانے میں اس کے سنہری جھمکے اور ٹوٹی ہوئی سونے چوڑیوں کے ٹکڑوں کے ساتھ رکھ دیا۔ اب طیش کی جگہ عجیب سادل گداز احساس تھا جو اسے جکڑ رہا تھا۔

(وہ پریشان تھیں مجھے ان کی بات تو تحمل سے سن چاہیے تھی۔ پریشانی بانٹنے کے بجائے میں اپنے کمریدنے میں لگا جاتا ہوں۔ یہ تو محبت کے ادب سے سراسر منافی ہے۔ پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے مجھے) لاریب نے انداز میں لائٹ بند کر کے بستر پر لیٹنے کے بعد کمرہ میں دلا خود اپنے اوپر خفا ہوتا رہا تھا۔



وہاں اس ویران اور سنسان جگہ پر لیکھت افرا تفریغ گئی تھی۔ حادثہ ایسا تھا کہ کوئی بھی شخص اعصاب کو گھٹیا

ہونے سے نہیں بچا سکا۔ لیکن عباس حیدر کی پریشانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ اسی لمحے تاریک اور گہری کھائی میں خود بڑکرنندی کو زندہ نکال لانے پر تلا ہوا تھا مگر اسے بڑی مشکلوں سے روکا گیا۔

”نیک اٹ ایزی ساحر بھائی“ مس نندی کو میں یہاں سے تارچ کی روشنی میں دیکھ سکتا ہوں مطلب یہ کہ وہ لڑھک کر بہت نیچے پستی میں جا گری ہیں۔ ہم یہاں سے انہیں احتیاط سے نکال سکتے ہیں مگر بے احتیاطی خطرناک ہو سکتی ہے۔“ شیراز جو پگڈنڈی پر لیٹ کر بھاری تارچ سے نیچے گھائی میں روشنی ڈال کر جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ اچھی خبر کے ساتھ پر جوش انداز میں اٹھا مگر عباس جھجلا سا گیا تھا۔ جیسی غصے میں اس پر الٹ پڑا۔

”کمال کرتے ہیں آپ شیراز صاحب معاملہ انسانی جان کا ہے۔ احتیاط کا دامن پکڑے بیٹھے رہیں تو کوئی جان سے بھی ہاتھ دھو سکتا ہے۔“ شیش آپ میں خود دیکھتا ہوں۔“ وہ اتنے جتنی دونوک اور قسطی انداز میں بولا تھا کہ پھر کسی کو کچھ بھی کہنے کی ہمت نہیں ہو سکی اور وہاں موجود ہر شخص نے حیرت و تحیر کے عالم میں دیکھا کہ عباس نے اپنی جان کو کھلے خطرے میں ڈال کر کھائی میں اترنے کے بعد نندی تک رسائی حاصل کی تھی۔ وہ سب اوپر حق دق ہی رہ گئے تھے۔

”ساحر بھائی آپ واپس چل کر نہیں آئے گا یہ سراسر رنک ہے آپ رکیں میں کرتا ہوں کچھ۔“ شیراز ہنوز اسی انداز میں لیٹا ہوا تارچ سے ان دونوں پر روشنی ڈال رہا تھا۔ عباس نندی تک پہنچنے میں تو احتیاط سے کام لے چکا تھا وہ تنہا تھا اور پتھروں کی آڑ اور سہارا لے کر نیچے اتر گیا تھا مگر واپسی پر نندی کے بے ہوش وجود کو لے کر یہ مرحلہ طے کرنا ہرگز بھی آسان کام نہیں تھا۔ ان کے پاس پیراشوٹ کی رسی اور دیگر ضروریات کی ساری چیزیں موجود تھیں جو کسی ایسے ہی حادثے کی صورت میں احتیاط رکھ لی گئی تھیں مگر عباس نیچے اترتے ہوئے اس احتیاط کو خاطر میں نہیں لایا تھا۔ دراصل وہ نندی کے ساتھ ہو جانے والے اس حادثے کی وجہ سے اتنی تشویش اور فکر مندی کا شکار ہو گیا تھا کہ حواس سلب ہو گئے

تھے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں اس بل ساتھ چھوڑ چکی تھیں۔ مگر اب نندی کی حالت کا جائزہ لینے کے بعد وہ قدرے ریلیکس تھا۔ جس قسم کا لباس نندی پہنے ہوئے تھی جسمانی چوٹوں سے تو بچت ہو گئی تھی ہاں البتہ چہرے کے ساتھ گردن پر کچھ خراشیں ضرور تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔ اور بے ہوشی کی وجہ خوف کی گہری علامت ہی ہو سکتی تھی۔ عباس نے احتیاطا اس کی دھڑکن چیک کی تھی جو نارمل تھی۔ اس نے بے اختیار سکون کا سانس لیا۔ چند لمحوں کے توقف سے اوپر سے رسی نیچے پھینکی گئی تھی جس کے ساتھ عباس کو اپنے ساتھ ساتھ نندی کو بھی باندھنا تھا تاکہ پیر پھسلنے یا پھر لڑکھڑانے کی صورت میں وہ کھائی کی تاریکیوں میں گرنے سے محفوظ رہیں مگر درحقیقت ٹھنٹھن اور اعصاب شکن مرحلہ یہی تھا۔ وہ جتنا بھی لائق اور بے نیاز رہتا تھا مگر ایک یکسر غیر انجان نوجوان لڑکی کو خود سے اتنا نزدیک لا کر رسیوں سے بندش کرنے کا تصور ہی اسے عجیب سی کنفیوژن میں مبتلا کر رہا تھا۔ محض ایک سال قبل جب وہ خود بطور ہیرو فلموں میں کام کرتا تھا تب اس کے لیے یہ بے حد معمولی اور عام بات تھی مگر عریشہ سے شادی کے بعد وہ بہت محتاط ہو گیا تھا۔ وجہ یہی تھی وہ عریشہ کو دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہ عادت اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ اب اس کے آس پاس ایسی کسی بات کا خیال بھی عجیب تھا۔ ایک لمحے کو وہ پچھتا یا بھی خواہ مخواہ جذباتیت میں خود نیچے اترنے کی جلدی کی یہ کام ذرا تحمل اور بردباری کے مظاہرے کے ساتھ کسی سے بھی لیا جاسکتا تھا مگر اب اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار بھی نہیں تھا۔

برف گرنے کی رفتار میں تیزی اور شدت آ رہی تھی۔ اوپر سے اس سے بار بار پوچھا جا رہا تھا اگر وہ ریڈی تھا تو پھر اس کو کھینچا جاتا۔ اس نے خود پر جبر کرتے ہوئے اس ناگوار کام کو انجام دینا شروع کیا۔ پہلے اس کو اپنے کمر کے گرد لپیٹ کر گرہ مضبوط کی پھر ہنوز بے سدھ پڑی نندی کے لودیتے سحر انگیز وجود کو ایک بازو کے حصار میں سمیٹ کر دوسرے ہاتھ سے اس کے ڈولتے جسم کو اپنے گھٹنے پر ٹکا کر اسے اپنے ساتھ باندھنا شروع کیا۔ یہ کام گرتی ہوئی برف اور اس کی کیفیات



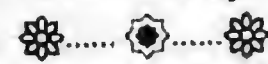
کی بدولت مزید دشوار ہو چلا تھا۔ اسے اس بلی شدت سے عریضہ کے ساتھ ہونے والی اپنی دھواں دھار لڑائی کا ایک ایک لفظ یاد آ رہا تھا جو محض اس کے حسن و خوب صورتی کے باعث اسے ریفرز کرانے کا ٹھان چکی تھی۔ پتا نہیں عریضہ کا ذہن اس قسم کی صورتحال تک رسائی حاصل کر سکا تھا کہ نہیں مگر وہ ضرور اس وقت خود سے نظریں چراتا مضطرب ہوا جاتا تھا۔ اگر عریضہ کو یہ سب پتا چل جائے تو وہ اس کی دلی حالت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ ری کو کھینچ لیا گیا۔ عباس پر انگڑاؤ ذہن کے ساتھ اوپر چڑھنے کی کوشش میں اتنی بار پھسلا کہ اوپر موجود انہی کی سمت متوجہ لوگ پریشان اور متفکر ہو گئے تھے۔ دوسری سمت نندی تھی جسے عین اس لمحے ہوش آ گیا تھا جب وہ اسے سنبھالے تقریباً کھائی کے سرے پر موجود اپنے ساتھیوں کا سہارا لے کر نیم پختہ سڑک پر گرنے کے انداز میں شکستہ سا بیٹھا تھا۔ نندی اس کے جسم سے بندش کی بنا پر وہ ایک طرح سے اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ وہ ہوش میں نہیں آئی تھی حواسوں سے باہر ہو گئی تھی۔

یہ قربت تو اس نے خوابوں میں نہیں سوچی تھی۔ بے اختیار ایک کراہ اس کے لبوں سے آزاد ہوئی اور عباس ان بندشوں کو کھولتا چونک کر اس کی سمت متوجہ ہو گیا۔ لیکن اس سرسری بے حد خجالت آمیز نگاہ کو وہ فی الفور چرا بھی گیا تھا۔ جبکہ نندی کی تو کچھ بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی بے کار ہو چکی تھیں۔ حالانکہ وہاں موجود دیگر لوگ اسے ہوش میں پا کر اس سے خیریت کے متعلق سوال کر رہے تھے۔ مگر وہ کچھ سنتی تو کہتی بھی کچھ۔ ایک عجیب سی دیوانگی کا قبضہ تھا اس کے حواسوں پر نظریں دیوانوں کی طرح عباس کے ایک ایک نقش کو ازبر کرنے کی کوشش میں تھیں۔ اس کے لیے عباس کے چہرے میں اتنی کشش اتنی جاذبیت تھی کہ صدیوں تلک بھی نظر نہ کر دیکھتی تو بھی نیت سیراب ہوتی نہ دل بھرتا۔

”تم لوگ کھڑے تماشا دیکھنے کے بجائے یہ بندشیں کھلو کیوں نہیں دیتے۔ میری جان مصیبت میں پڑی ہوئی ہے اور کسی کو احساس تک نہیں ہے۔“ وہ عباس حیدر کے غصے میں بیچ و تاب کھاتی سر داؤز پر جیسے خوابوں کی حسین راہگور پر

چلتے ایک دم کھولتے ہوئے بانیوں میں آن گری۔ اللہ عباس اس کی اس دیوانگی کو سمجھ کر جان کر ہی اتنا خفا ہوا تھا کہ بلا درلغ اپنے ماتحتوں پر برس پڑا تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔ جو کچھ جیسے بھی تھا نندی کے لیے بے حد تکلیف جنگ اور ذلت کا سبب تھا۔ وہ جیسے کسی سنہرے جال میں پھڑ پھڑاتی۔ عباس کی پرکشش آنکھوں میں قہر سامان تاثیرات اس کے علاوہ کس کے لیے ہو سکتے تھے۔ اس نے سمجھا تھا کہ دھڑکنوں میں جو بھونچال اٹھا ہوا تھا یکدم مٹ گیا۔ اس نے سمجھا تھا کہ پھیلا تھا کہ دل دھڑکنے بھی بھول گیا۔ شیراز نے آگے بڑھ کر عباس کی مدد کی تھی۔ جیسے ہی بندشیں ڈھیلی ہوئیں نندی سرعت سے فاصلے پر ہو گئی۔ اس کے تن بدن میں قیامت کی حد تک اور ملال تھا۔ دیکھا جاتا تو اس آگ میں عباس کا کچھ بگڑا نہیں تھا اور اس کا کچھ بچا نہیں تھا۔ واپس گاڑی تک آتے اس کے آنسو بے داؤز بہتے رہے تھے۔ شوٹ ایک بار پھر ملتی ہو گیا تھا اور عباس کا موڈ صرف اسی ایک بات کو لے کر تو اتنا قہرا لود نہیں ہو رہا تھا۔

”آئی تھنک آپ کو کوئی اندرونی شدید چوٹ آئی ہے میم۔“ فراز کو اس کے اس طرح زار و قطار رونے کی یہی وجہ سمجھ میں آ سکتی تھی۔ نندی کے دل پر کسی نے جیسے ہیر رکھ دیا۔ (چوٹ تو لگی ہے اور اتنی گہری جس کا علاج اب عمر بھر نہ ہو سکے۔ کیا کوئی برزخ سے بھی زندہ سلامت بچ کر نکلا ہے میں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا تھا مجھے ایسا فیصلہ کرنا ہی نہیں چاہیے تھا) اس کے آنسوؤں میں شدت اور روانی آ گئی۔ عباس کا موڈ اتنا خراب تھا کہ وہ باقی سب سے رخ پھٹ کر بیٹھا ہوا مسلسل کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ نندی کے لیے یہی رویہ تکلیف اور بے پناہ اذیت کا باعث تھا۔ جن آنکھوں میں اپنے لیے محبت کے چراغ جلتے دیکھنے کی خواہش تھی ان کے لیے بے زاری کو فت اور ناگواری واپس دیکھنا اس کے لیے اور مضبوط کی ساری طنائیں توڑ گیا تھا۔ اس کے وجود میں نہ رہا تھا۔ ایسا زہر جو ہر بل اس کے وجود کو نیلا کرتا جا رہا تھا۔



اک ہاتھ میں خوابوں کی دولت اک ہاتھ میں کاسہ لائے گیا

ہم خاک نشیں تیری چوکھٹ پر ایک سجدہ کرنے آئے ہیں تو مانے یا اب رد کر دے جو چاہے وہ حالت کر دے ہم دور سے چل کر آئے ہیں اک عرض تمنا لائے ہیں کوئی شہزادہ کسی جنگل سے آنے کا رستہ بھول گیا ایک شہزادی کے ہاتھوں میں جو پھول ہیں مرجھائے ہیں جو دور کہیں سے آتا ہے چپ چاپ چلا بھی جاتا ہے لے دیکھ کر کسی دن روزن سے جو تو نے خواب دکھائے ہیں کوئی صحرا پار نہیں بھٹکا کوئی دریا بیچ نہیں ڈوبا چھوٹے سچے قصے تو کچھ لوگوں نے پھیلائے ہیں اک عمر خلش تو رہنی ہے بس تجھ سے بات یہ کہنی ہے جب وقت گزر جائے تو یہاں کچھ لوگ بہت پچھتائے ہیں نندی نے اس غزل کو اپنی ڈائری میں نوٹ کیا۔ بار بار پڑھا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر روئے گئی۔ ہاں یہی انجام ہونا تھا اس کی وحشت بھری محبت کا نارسائی اور خواری کے ہاتھوں یہ انجام کہ..... وہ از خود یہ فیصلہ کرے۔ اس شخص سے دوری اختیار کر لے جسے اس نے ایک عمر کی آبلہ پاتلاش کے بعد کھوا اور پایا تھا مگر نہیں..... پایا ہی تو نہیں تھا یہی تو اذیت و اضطراب کی اصل وجہ تھی۔ اسے سردی کبھی پسند نہیں رہی تھی۔ وہ سرد موسم کو برداشت نہیں کر پاتی تھی۔ مگر عباس کی وجہ سے اس نے سرد موسم کو برداشت کیا تھا مگر وہ عباس کا سرد رویہ نہیں سہار سکی۔ اس کے روئے کی سرد مہری لہجے کی تپش روح کا جھلسا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کا وہ جامہ تاثر وہ تو جیسے برف میں دب جانے والی لاش کی مانند اکڑ گئی تھی۔ کتنا تکلیف وہ تھا مگر کچھ تھا ایسا بچ جس سے وہ نظریں چراہی نہیں سکتی تھی۔ نصیب کے بغیر کچھ نہیں ملتا چاہے جتنی بھی جدوجہد کر لی جائے۔ وہ اسے نہیں ملا۔ عباس کے لہجے کی تبدیلی اور آنکھوں کی ناگواری ہی تھی جس نے اس کی دنیا زیر و زبر کر ڈالی تھی۔ وہ سب کچھ سمجھ سکتی تھی بس یہی نہیں جو اس نے عباس کے چہرے پر عباس کی نظروں میں اپنے لیے احساس دیکھا تھا۔

محبت اور عزت میں چناؤ کا مرحلہ آیا تو دل کی تمام تر گریہ و زاری اور بربادی والتجا کو نظر انداز کرتے ہوئے اس

نے عزت کا انتخاب کر لیا تھا۔ یہ مرحلہ جتنا بھی کھٹن تھا مگر اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ جانے مزید کتنی دیر وہ بھگتی اور سسکتی رہی تھی پھر اٹھ کر واش روم میں گئی۔ اچھی طرح منہ دھو یا پھر چہرہ تولیے سے پونچھ کر باہر آ گئی۔ بیڈ پر پڑا اپنا اسکارف اٹھا کر اچھی طرح خود کو کور کیا پھر دروازہ کھول کر کمرے سے باہر قدم رکھ دیا۔ راہداری عبور کر کے عباس کے کمرے کے باہر آن رکی۔

”مجھے ساحر صاحب سے ضروری بات کرنی ہے کیا میں اس وقت ان سے مل سکتی ہوں؟“ اس نے اسی وقت کمرے سے باہر آتے شیراز کو مخاطب کیا تھا تو بھی اس کی آواز بوجھل تھی۔

”اوہ..... آئیے میم ساحر صاحب میٹنگ میں ہیں۔ میں ان کے آرڈر پر آپ کو ہی بلانے آ رہا تھا۔“ شیراز نے شائستگی سے کہتے اسے بے حد تعظیم دیتے ہوئے دروازے سے ہٹ کر راستہ دیا۔ نندی کچھ کہے بغیر دروازہ دھکیلتی اندر داخل ہو گئی۔ عباس سامنے ہی صوفے پر بیٹھا نظر آیا۔ اس کی صورت سے ہی بے پناہ سنجیدگی جھلک رہی تھی۔ دیگر لوگ آس پاس صوفوں پر براجمان تھے۔

”آئیے محترمہ مجھے آپ سے کچھ اہم بات ڈسکس کرنا ہے۔“ عباس نے رساں سے کہتے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ صاف لگتا تھا جو بھی بات تھی ابھی تک اس کے انتظار میں آسکا نہیں کی گئی تھی۔ نندی نے اس کی بات نظر انداز کی اور یونہی کھڑی رہی۔ گلا کھنکار کر اسے مخاطب کرنے سے قبل اس نے جھکی نظروں کے ساتھ سر بھی جھکا لیا تھا۔

”مجھے بھی آپ سے کچھ کہنا ہے۔ جو بے حد اہم ہے۔ مجھے امید ہے آپ مانتے نہیں کریں گے۔ آئی ایم سوری مجھے اندازہ ہے کہ آپ کا بہت لاس ہوگا مگر میں خیارہ بھینٹنے کو بھی تیار ہوں۔ معذرت خواہ ہوں میں آپ کی اس فلم میں کام کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ ایڈوانس کا چیک ہے ایک بار پھر معذرت۔“ اس نے جتنی بھی وقت سے یہی ٹکرا اپنا فیصلہ بہت واضح انداز میں پہنچا دیا تھا۔ کمرے میں یکنیت سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص اپنی جگہ دم بخود تھا۔ تھیر تو عباس بھی تھا جس کام



کی خاطر اس نے یہ ہنگامی میننگ کی تھی اور جسے کرتے وہ کسی حد تک کنفیوژ بھی تھا وہ اس چھوٹی سی عام سی لڑکی نے کتنے دھڑلے سے کر دکھایا تھا۔ اس کے سر پر دھماکہ ہوا تھا۔

”میرا خیال ہے مس نندی اس حادثے سے خوفزدہ ہو گئی ہیں۔“

”یہ سراسر حماقت ہے مسم پلیرز اس فیصلے پر نظر ثانی کیجیے۔ کیونکہ ایسے گولڈن چانس زندگی بار بار نہیں دیتی۔“

”محترم آپ اپنے پیروں پر خود کھباڑی مار رہی ہیں آپ کا وہ کیریئر جو ابھی شروع بھی نہیں ہوا خطرے میں جا پڑے گا۔ آپ جتنا بھی سرچشیں کہ سحر صاحب نے آپ کو نہیں نکالا بلکہ آپ نے خود ان کی فلم میں کام سے انکار کیا ہے کوئی ڈائریکٹر یا پروڈیوسر مان کر نہیں دے گا۔“ مختلف تبصرے اور مشورے یکا یک ابھرنے لگے۔ اس کے اس فیصلے کو سراسر جذباتیت اور بے وقوفی سے تعبیر کیا جا رہا تھا مگر وہ مطمئن اور مضبوط نظر آ رہی تھی۔

”میں چلتی ہوں گڈ بائے۔“ اس نے چیک وہاں رکھا اور عباس سے نگاہ ملائے بغیر تیزی سے پلٹ گئی۔ عباس شاکہ تھا معاوہ سنبھلا اور نندی کا صوفے پر بے پروائی سے ڈالا گیا چیک جھپٹ کر خود بھی اس کے پیچھے اس کے کمرے تک آ گیا۔ دستک کے جواب میں دروازہ کھولنے والی نندی اسے یوں لال بھبھو کا چہرے کے ساتھ رو رو پا کر دھک سے رہ گئی۔

”اس اچانک اور حتمی فیصلے کی وجہ جاننا چاہوں گا۔“ اس کا لہجہ خشک روکھا اور بے تحاشہ برہم تھا۔ نندی کا دل مٹھی میں آ گیا۔

”آئی ایم سوری فار ڈیٹ بٹ.....!“

”شٹ یور ماؤتھ محترم آپ کیا سمجھتی ہیں کہ.....!“

”میں جانتی ہوں میں آپ کے ساتھ بد عہدی کر رہی ہوں مگر.....!“

”مجھے ہر صورت اس فیصلے کا محرک جاننا ہے ایسے نہیں جاسکتی ہیں آپ۔“ وہ اس کی بات پھر سے کاٹ کر حلق کے بل چیخا۔ اسے یہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی جو کام وہ خود

کرنے جا رہا تھا ایک بار پھر صرف عریشہ کو منانے عریشہ کی خوشی کی خاطر وہ اگر کسی اور نے کر دیا تھا تو اس کی اتنا بڑا کامیابی کی ضرب کیوں لگی تھی۔

”کچھ پوچھا ہے میں نے آپ سے جواب دینے کی پابند ہیں آپ۔“ عباس کی آنکھوں میں خون سا اترنے لگا۔ نندی دہل سی تھی۔

”میں اس کی وجہ بتانے سے قاصر ہوں۔ میں جانتی ہوں میری وجہ سنا آپ کا بہت شدید نقصان ہو چکا ہے۔ میرا انگن رکھ لیں اصلی جواہر لگے ہیں اس میں کسی حد تک آپ کا.....!“ اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی کہ سبکی و تذبذب سے بھڑک اٹھنے والے عباس کا ہاتھ زنائے کے پتھر کی صورت نندی کے حواس چھین کر لے گیا تھا۔ اسے تو قیامت کی کہاں تھی عباس کے اتنے شدید رد عمل کی جیسی گال پر ہاتھ رکھے پتھرائی ہوئی سی کھڑی رہ گئی۔

”آپ خود کو بہت برتر سمجھتی ہوں گی اس دولت کی وجہ سے مگر ہر نقصان نہ تو پیسے سے بھرنے والا ہوتا ہے نہ ہی ہر شخص اس پیسے کے آگے بکنے والا سنا آپ نے؟“ عباس کی آنکھوں سے پھوٹتا دکھاتا آتش فشاں نندی کو بھسم کرنے لگا۔ اسے لگا وہ کسی بھی بل حواس کھوتی لہر اگر فرش پر جا گرے گی۔ مارے ذلت و رنج کے اس کا رنگ بالکل پیلا پڑ چکا تھا۔ عباس ہونٹ بھیچے کچھ دیر یونہی کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر پلٹتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ نندی کا پاپاں گال سرخ ہو کر انگلیوں کے نشان ابھار چکا تھا۔

اپنے کمرے میں آ کر عباس نے اپنے منتظر لوگوں کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ اس کا موڈ ایسا آتش فشاں ہو رہا تھا کہ کسی کو کچھ پوچھنے یا کہنے کی جرأت نہیں ہو سکی۔ عجلت میں ایک دوسرے کے پیچھے نکل گئے۔ عباس ہونٹ بھیچے کمرے کے وسط میں کھڑا رہا تھا۔ پھر اضطراری کیس کے زیر اثر آگے بڑھ کر سگریٹ کیس میں سگریٹ نکال کر سلگائی۔ کش لے کر دھواں نکھیرتے ہوئے بھی وہ بے حد مضطرب نظر آتا تھا۔ کل کے نندی کے حوالے سے اس واقعہ نے اسے خود اپنے آپ سے خفت زدہ کر دیا تھا۔ جیسی اس نے

عریشہ سے خود ساختہ جھگڑے میں موجود انا کو نکال دیا تھا تو اب صرف یہی نہیں تھی کہ اسے عریشہ کے خدشات درست لگتے تھے بلکہ وہ اپنے تئیں خود کو عریشہ کا مجرم بھی سمجھ رہا تھا۔ فیصلہ نندی کے خلاف ہوا تو اس نے عریشہ سے رابطہ کر لیا تھا حالانکہ اس سے قبل وہ ضد میں تھا اور عریشہ کی جانب سے پیش رفت چاہ رہا تھا۔

عریشہ کا اس سے رابطہ نہ کرنا اس کی بے حسی، کٹھن پن، ثنوت اور سرکشی کی علامت تھی جس نے عباس کو بہت ہرٹ بھی کیا تھا مگر وہ اس سے اتنی شدید محبت کرتا تھا کہ ان معمولی باتوں کو اہمیت دے کر دل میں رکھ کر بغض پال کر اپنی زندگی کی خوب صورتی کو زائل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے عریشہ سے رابطہ کرنا چاہا تو کافی دیر کوشش کے بعد سماعتوں کو عریشہ کی مراد روکھی آواز سننے کو ملی مگر وہ دل برائیں کرنا چاہتا تھا۔

”خیریت ہے نا عریشہ..... تم کال کیوں نہیں پک کر رہی تھیں میری؟“

”خیال آ گیا آپ کو میرا..... اس حسن کی شہزادی جوروں کی ملکہ کی ناز برداریوں سے نجات مل گئی؟“ عباس کا دل اس طنز پر خفت و تقعر سے بھرنا چلا گیا۔ وہ ہونٹ بھیچے اس کی خشکی سہتا رہا۔

”میں تمہاری اس ناراضی کی وجہ سے ہی عریشہ..... نندی کو اپنی فلم کی کاسٹ سے نکال چکا ہوں۔ میں اس بات کی پروا نہیں کر رہا ہوں کہ میرا کتنا نقصان ہوا۔ روپیہ پیسہ ایک طرف، میرا کیریئر میرا ایج ڈاؤ پر لگتا ہے۔ عریشہ میں تمہاری خوشی کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ موڈ تو ٹھیک کرو اپنا۔“ عریشہ کے برعکس اس کا لہجہ مدہم تھا۔ اس میں جو اہمیت جو خصوصیت کے ساتھ مان تھا وہ صرف عریشہ کے لیے ہی تھا۔ محبت کے سفر میں سارا برڈن اس کے سر ہوتا ہے جو اس کا بیڑہ اٹھاتا ہے جس نے چاہ کی ہوئی ہے وہ جانتا تھا جیسی کبھی بھی عریشہ پر کسی قسم کا کوئی دباؤ ڈالا تھا اس سے کوئی مطالبہ کیا تھا۔ وہ تو آج تک اس کی چاہت اس کی خواہش کے مطابق ہی خود کو ڈھالتا آیا تھا۔ اس وقت بھی اسے خوش کرنا ماننا چاہا مگر عریشہ کو کتنا احساس ہوا اور اس نے کسی حد

تک قدر جانی اس کا اظہار اس کے الفاظ سے بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔

”نکال دیا ہے تو میں کیا کروں؟ میری وجہ سے تو نہیں کیا اگر ایسا کرنا ہوتا تو اس وقت کرتے جب میں نے کہا تھا۔“ اس نے جی سے کہا اور اگلے لمحے فون کاٹ دیا۔ عباس کے وجہ چہرے پر ایک سایہ لہرانے لگا۔ عریشہ کی شدید ناراضی اس کی بے چینی کو بڑھاوا دے رہی تھی۔ وہ شکستہ ہو رہا تھا۔ اس کی ہمیشہ یہ خواہش رہی تھی کہ عریشہ اسے سمجھے اس پر اعتماد کرے تاکہ وہ اپنا کام پوری وجہ سے کر سکے۔ وہ جانتا تھا یہ شو بزم کی دنیا تھی جہاں رائی کا بھی پہاڑ بنتا تھا۔ یہ تو پھر بہت بڑی بات ہوئی۔ وہ خواہ مخواہ خبروں میں رہنے اور اسکیٹنڈ لائز ہونے کو سخت ناپسند کرتا تھا مگر عریشہ نے اس کے لیے ہمیشہ ایسے مسائل پیدا کیے تھے کہ وہ بار بار اپنے فیصلے بدلنے پر مجبور ہوا جاتا تھا۔ دوسرا شدید اور کاری دار اسے اس وقت سنبھلا رہا تھا نندی نے اس کے پورے ہینٹل کے سامنے انکار کا طمانچہ اسے مارا۔ یہ اس جیسے مشہور و معروف نامور ڈائریکٹر کی ذلت کی انتہا تھی۔ جس کی فلم میں کام کرنے کو شو بزم کے چمکتے ستارے بانگ و دہل اپنی خوش نصیبی گردانتے تھے ایک غیر معروف بالکل نئی آنے والی لڑکی نے اس کی فلم سائن کرنے کے بعد خود ہی رد بھی کر دی تھی۔ اس پر حد یہ کہ ایڈوانس کا چیک واپس کرتے اپنے پاس سے خیرات دینے کی بھی کوشش کی۔ وہ حواسوں میں رہتا بھی تو کیسے۔ گویا سبکی اور تفحیک کی بھی حد ہو گئی تھی۔ حالانکہ جب عریشہ کی ناراضی دور کرنے کو ہی سہی اس نے نندی کو اپنی کاسٹ سے نکالنے کا فیصلہ کیا تھا تو یہ زیادتی کا احساس اس کے دل پر کسی بوجھ کی طرح دھرا تھا۔

”سریم نندی واپس جا رہی ہیں۔“ اس کے سیکرٹری کا فون اس کے سیل پر بڑی اہم اطلاع کے ساتھ آیا تھا۔ جو اس کے اشتعال کو مزید بڑھا گیا۔

”تو یہ بات تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“ وہ جواباً پھاڑ کھانے کو دوڑا۔

”سر..... وہ.....!“



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ تمامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، ہارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”شٹ اپ“ وہ زور سے دھاڑا اور سلسلہ منقطع کر کے سیل فون اسی مشتعل انداز میں دیوار پر دے مارا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ مارے تذلیل کے وحشی اور پاگل ہوا جا رہا تھا۔



صالحہ ہال کمرے کے آف وائٹ مخملیں صوفے پر دونوں ٹانگیں اوپر رکھے چوڑی مار کر بیٹھی اپنی پاٹ دانا واز کا جادو جگا رہی تھی۔ ترچھی نظریں لاؤنج کے کھلے دروازے سے نظر آتے فراز پر تھیں جو ابھی کچھ دیر پہلے گھر پہنچا تھا۔ جھنجھایا ہوا۔ بے حد خفا اور ناراض ہر کسی کی بات کے جواب میں کانٹے کو دوڑنے لگتا۔

”افوہ آخر آپ کو ہوا کیا ہے برادر؟ اس ناراضی اور اچانک واپسی کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔ آپ تو شوٹ کے لیے نادرن ایریا گئے تھے نا؟“ نیل کالج سے واپس آیا تو اسے دیکھ کر نرمی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”ساری کسی کا دل توڑنے اور دکھانے کی سزائیں ہیں۔ عذاب تو بھگتنا پڑتا ہے پھر۔“ صالحہ نے مزہ لے کر کہا اور اٹھ کر دونوں کے قریب آگئی۔ فراز پر جمال ہے اثر ہوا ہو جیسے آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا لیٹا رہا۔

”صالحہ باجی آپ تو جائیں یہاں سے پلیز۔ بھائی کا موڈ آف ہے۔ ایسا نہ ہوا آپ پر اثر جائے سراغ نہ۔“ نیل نے اس بلا کو ٹالنا چاہا۔ جانتا تھا فراز کو اس سے کتنی چڑ ہے۔ اس کی موجودگی میں تو خاص طور پر ایک لفظ نہیں اگلے گا۔ جبکہ نیل کے پاس ٹائم کم تھا۔ اسے فریش ہو کر کھانا بھی کھانا تھا اور بھائی کی دل سوزی بھی کرنا تھی اس کے بعد اسپتال بھی سدھارنا تھا جہاں آج اس کی ڈیوٹی تھی مگر صالحہ نے مکھی اڑانے والے انداز میں ہاتھ ہلا کر بے نیازی سے دونوں کو دیکھا پھر بڑے بڑے ہنسے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔

”ارے مجھے کیوں پروا ہونے لگی ایک ناکام ارادوں کے مالک شخص کے غصے کی اونہ، گئے تھے موصوف مایہ ناز ہیرو بنے۔ سارے خواب ہی چکن چور ہو گئے۔ ارے ہر کوئی ساحر جیسا خوب صورتی اور قسمت کا بادشاہ نہیں ہوتا۔ مائی گاڈ کیا

حسن و جمال ہے ظالم کا۔ نظر تو اسے اسکرین پر ہی رہی چند ہیانے لگتی تھی۔ سنا ہے حقیقت میں اس سے کچھ چارمگ اور حسین ہے۔ تم نے تو دیکھا ہوگا فراز مٹانا آئیز واقعی گرین ہیں یا لینز یوز کرتا ہے؟ پتا نہیں کم بخت ایک بیوی کی خاطر کام کیوں چھوڑ دیا۔ اب تو اسکرین پر نظر نہیں آتا۔“ اشتیاق بے چینی، شوخی اور آخر میں جھنجھلاہٹ لیے اس کے لہجے کا اتار چڑھاؤ ان دونوں کے لیے کوفت اور بے زاری کا باعث تھا مگر رواداری کا تقاضا کہ خاموشی سے برداشت کیا جاتا۔ عقل میں بے شک سہی مگر عمر میں دونوں سے آگے تھی وہ۔

”آپ اپنے کمرے میں چلیں نا تھکے ہوئے ہیں کچھ دیر آرام کر لیں ماما سے کہہ کر چائے بھجواتا ہوں۔“ نیل نے نرمی سے کہا۔ ایک طرح اسے صالحہ کے تسلط سے نجات کی راہ بھائی۔ بات فراز کی بھی سمجھ میں آگئی تھی جیسی اٹھ کر کمرہ ہو گیا۔ اس پل شرجیل ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کیے بازو پر رکھے دروازے کے پاس سے گزرتا ان دونوں کو دیکھ کر حیران ہوتا رک گیا۔

”تم..... تم کب آئے فراز؟“ اس کے خوب رو چہرے پر حیرانی بھی چھپی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے مکمل اور شاندار تھا۔ فراز نے اسے دھیان سے دیکھا۔

”کیسے ہیں شرجیل بھائی؟“ وہ اٹھ کر اس کے گلے لگا تھا شرجیل نے محض سر ہلایا پھر اسے دیکھا گویا سوال اپنی جگہ قائم تھا۔

”ابھی کچھ دیر قبل، بھائی ٹھیک ہیں؟“ فراز کو اس بے امان نازک سی لڑکی کا خیال آیا جس کی آنکھوں میں بھی زندگی کی امید کا وہ بھی گواہ تھا۔

(جاری ہے)



مجھے ہے حکم ازاں

اس دل کے چند اثاثوں میں اک موسم ہے برساتوں کا  
اک صحرا ہجر کی راتوں کا اک جنگل وصل کے خوابوں کا  
ہم لوگ جنوں کے عام میں منزل کی طلب بھی بھول گئے  
اب دل کو بھلا سا لگتا ہے صحرا میں عکس سراپوں کا

ہے بے دھیانی میں سنو میں گر جاتا ہے ساتھ ہی ساحر کا کپ  
بھی اس کے پاؤں تلے دب جاتا ہے جس پر نندی بہت  
شدید رد عمل کا مظاہرہ کرتی ہے ساحر عباس سمیت سب ہی  
حیران رہ جاتے ہیں خاص کر ساحر اسے جھاڑ کر رکھ دیتا ہے  
شوٹ کی غرض سے پر خطر رستے پر ان سب کو پیدل سفر طے  
کرتا ہوتا ہے جس کے لیے کافی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے  
مگر نندی اپنی بے پروائی کے باعث گہری کھائی میں جا گرتی  
ہے اور اسے بچانے کے لیے عباس کھائی میں جاتا ہے کھائی  
سے نکلنے وقت نندی کی قربت اس کے لیے سخت بے زاری کا  
باعث ٹھہرتی ہے اور اس کی نگاہوں میں نفرت دیکھ کر نندی  
ڈھسے جاتی ہے وہ اسی وقت فلم نہ کرنے کا فیصلہ کر لیتی ہے  
اور اگلے روز سب کے سامنے وہ ساحر کو فلم کرنے سے انکار  
کر دیتی ہے جبکہ ساحر خود عریضہ کی خواہش کے آگے جھکتے  
ہوئے نندی کو فلم سے نکالنے کا سوچ رہا ہوتا ہے مگر نندی کے  
فیصلے پر وہ بھی حیران رہ جاتا ہے اور اس کی بدتمیزی پر اس سے  
باز پرس کرتا ہے اور اس کا ہاتھ نندی پر اٹھ جاتا ہے جو ابادہ سب  
چھوڑ کر چلی جاتی ہے عباس بھی شوٹنگ وائسٹاپ کرتا ہوا سب  
کو چلنے کا کہتا ہے۔ فراز خراب موڈ کے ساتھ گھر لوٹ آتا ہے  
جس پر صالحہ اور شرجیل سب اس سے استفسار کرتے ہیں کہ وہ  
اتنی جلدی واپس کیسے لوٹ آیا۔

(اب آگے پڑھیے)

”ٹھیک ہے اسے کیا ہوتا ہے“ شرجیل نے نخوت سے  
جواب دیا اور باہر نکل گیا۔ اس کے انداز سے صاف پتا چلتا تھا  
کہ دونوں کے بیچ پھر کسی بات پر جنگ کا طبل بجا ہوا ہے۔

گزشتہ قسط کا خلاصہ

عباس عریضہ کی خفگی پر دل گرنگی کے ساتھ ٹرپ پر روانہ  
ہو جاتا ہے وہاں رہ رہ کر اسے عریضہ کے رویے کی بدصورتی کا  
احساس ہوتا ہے اور وہ عریضہ کی جانب سے پیش رفت کا خواہاں  
ہی رہتا ہے۔ لاریب بادل یا خواستہ سکندر کے ساتھ خریداری  
کی غرض سے شہر روانہ ہو جاتی ہے۔ واپسی پر اسے وقاص کی  
دھمکی آمیز کال موصول ہوتی ہے جس پر وہ پریشان ہو جاتی ہے  
البتہ سکندر سے کوئی ذکر نہیں کرتی مگر جب گاؤں کی حدود میں  
وہ مخصوص چوراہے پر وقاص کی جیب کو منتظر پاتی ہے تو  
ششدر رہ جاتی ہے اور سکندر کو گاڑی تیز چلانے کا حکم دیتی  
ہے۔ وقاص ان کا پیچھا کرنا شروع کر دیتا ہے اور وہ اپنی جان  
بچانے کے لیے گاڑی کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ سکندر وسیع  
عسیتوں کے آگے بے باادز میں کے قریب گاڑی روک دیتا  
ہے اور وہ لاریب کو بچانے کے لیے پیدل چلنے کا مشورہ دیتا  
ہے۔ بد قسمتی سے وہ دونوں ایک کنویں میں گر جاتے ہیں جس کا  
فائدہ سکندر اور لاریب کو ہوتا ہے وقاص ان تک پہنچ نہیں پاتا  
گر جاتے جاتے گاڑی کے سب ٹائرز پنچر کر جاتا ہے۔  
سکندر بڑی مشکل سے اپنے نفس کو لگام دیتے ہوئے لاریب  
کو کنویں سے باہر نکالتا ہے پھر حویلی فون کر کے گاڑی منگواتا  
ہے۔ عباس نندی کے گرد پروڈیوسر آفاق کی ہوس زدہ نگاہوں کا  
تغاقب کرتا ہے تو الجھ کر رہ جاتا ہے۔ ساتھ ہی اکیلے میں وہ  
آفاق کی فطرت اور معاملے کی سنگینی سے بھی آگاہ کر دیتا  
ہے۔ لاسنو میں بنا کر سب کے ساتھ انجوائے کر رہا ہوتا ہے  
جب کہ وہ ساحر کی کپ لے لیتا ہے اور تصویریں بنانے لگتا

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ تمام پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



فراز کی سوالیہ بے تاب نظریں نیل کی جانب اٹھیں۔ وہ گہرا سانس بھرتا کاندھے اچکا کر رہ گیا۔

”مجھے ایمان بھائی پر بہت رحم آتا ہے نیل بے چاری رل گئی ہیں یہاں آ کر۔“ فراز نے متاسفانہ تبصرہ کیا۔ نیل تو اب اس قسم کے تبصروں سے بھی گریز کرتا تھا یہاں اس کی ہمدردی کو بھی مشکوک انداز میں لیا جانے لگا تھا۔ وہ ایمان کی مشکلات میں اضافے کا قائل نہیں تھا جیسی اس سے اپنائیت و ہمدردی کا مظاہرہ ترک کر دیا تھا۔

”آپ نے بتایا نہیں کیا وجہ ہوئی اچانک واپسی کی؟“ صالحہ کی انفارمیشن سے تو مجھے خطرے کی بھاری تھی۔ ساحر کی وجہ سے وہ کوئی فلمی میگزین یا پھر ٹی وی شو نہیں چھوڑتی جس میں اس کے حوالے سے کسی معمولی خبر کی بھی ذرا سا شک ہو لہذا بریکنگ نیوز تو ہوتی ہیں اس کے پاس۔“ وہ دونوں چلتے ہوئے فراز کے کمرے تک آ گئے تھے۔ فراز نے شکستہ انداز میں پھنچا ہوا سانس کھینچا۔

”بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔“ اس کے سر تا ہر کے کہنے پر نیل بھونچکا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”تفصیلات چائیس بھائی معذرت خواہ ہوں اس قسم کی مبہم باتیں سر سے کافی اوپر سے گزرتی ہیں۔“ وہ بلا جھجک اپنی نالائقی کا اعتراف کر رہا تھا۔

”انڈیا سے بتا دہونے والی حسین و جیل ہیروئن صاحبہ نے ساحر عباس کی مووی میں کام کرنے سے انکار کر کے میرا تو بیڑہ غرق کر دیا ہے یار۔ ساحر بھائی اتنے غصے میں تھے کہ سب کچھ داند آپ کر کے واپس آ گئے ہم بھی گھر نا سدھارتے تو اور کیا کرتے؟“ اس نے ٹھنڈی آہوں کے درمیان جو تفصیل دی وہ اچھی خاصی حیران کن اور ناقابل یقین تھی جو لوگ ساحر کی مقبولیت سے آگاہ تھے وہ نندنی کے اس اقدام کو حماقت سے ہی تعبیر کر سکتے تھے۔ نیل بھی ششدر تھا۔

”لیکن اتنے بڑے اقدام کے پیچھے کوئی وجہ بھی ہونی چاہیے۔“

”ضرور ہوگی دراصل ساحر صاحب کی خفگی سے ہر کوئی خائف ہے مگر یہ بھی طے ہے کہ یہ بات چھپ بھی نہیں سکتی دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

”افوہ..... افسوس ہوا اب کیا کریں گے آپ؟“ نیل کو اس سے ہمدردی محسوس ہوئی تھی کہ فراز کا چہرہ غم و یاس کی تصویر بنا ہوا تھا۔

”کیا بتاؤں میرے یار میرا تو آل ریڈی دماغ گھوما ہوا ہے۔“ فراز اپنے اوپر کبل کھینچتے ہوئے جیسے مارے بندھے جواب دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جارہی تھیں۔

”ٹھیک ہے آرام کریں آپ میں چلتا ہوں اللہ بہتر کرے گا۔ پریشان نہیں ہونا اوکے۔“ نیل اسے ہاتھ ہلاتا لائٹ اور دروازہ بند کر کے رخصت ہو گیا۔ فراز کا ذہن نندنی کے تصور پر جھنجھلا رہا تھا اگر اس کا بس چلتا تو وہ لازمی اس خوب صورت بلا کا گلا گھونٹ دیتا جس کی وجہ سے وہ کنویں کے پاس جا کر بھی پیاسا لوٹا تھا۔



”امامہ کہاں ہے؟“ وقاص حیدر آج بہت دنوں بعد حویلی آیا تھا۔ دھاڑ کی زوردار آواز کے ساتھ بیڈروم کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تو ڈسٹنگ میں مصروف ملازمہ دہل کر پیش اور اسے رو رو پا کر دل تھام کر رہ گئی۔

”سائیں چھوٹی مالکن بڑی مالکن کے ساتھ شہر گئی ہیں۔“ وہ گھکھکیا کر بولی اور کتر آکر سائیڈ پر ہوتے گویا اس گرائڈیل ہاتھی کو بیڈ تک رسائی کا راستا پیش کیا۔

”شہر..... وہ کیوں؟ اس کی ماں مر گئی ہے جس کا کفن خریدنا ہے اسے شہر سے۔“ جو تو سمیت بیڈ پر گر کر وہ آنکھیں موند چکا تھا مگر اس اطلاع پہ وہ دھاڑتے ہوئے بیٹھ گیا ملازمہ بے چاری کا پتہ پانی ہونے لگا۔

”مم..... مجھے نہیں پتا سائیں۔“ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

”تو تیرے خصم کو پتا ہوتا ہے کام کیا ہے تیرا یہاں مفت

کی روٹیاں توڑنے نہیں رکھا ہوا۔“ اس کے لئے ہاتھ کا تھپڑ اوپر عمر ملازمہ کے چودہ طبق روشن کر گیا۔ وہ تورا کر گری ضرور تھی مگر مارے خوف کے حلق سے آواز نہیں نکال سکی۔

”دفع ہوا اب اپنی منخوس شکل سمیت تریا کو بھیج چائے دے کر کہنا میرے پاؤں داب آ کر۔“ گرج برس کر وہ پھر اوندھے منہ بستر پر گر گیا۔ تریا مالی کی الہز نو خیز اور نو جوان لڑکی کا نام تھا آج کل وقاص کی نظر عنایت اس پر تھی گو کہ بابا جان کے خوف سے اس قسم کی عیاشیاں حویلی کے اندر نہیں کرتا تھا مگر کبھی کبھار بابا جان اور امامہ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر حویلی کے بند کمرے میں ایسی بددیانتی کا اس کے نزدیک لطف ہی الگ تھا۔ امامہ اور اماں جان کی واپسی شام ممکن ہو سکی تھی تب تک وہ شراب اور شباب کے نشے سے دھت خود سے بے خبر تھا۔

”مجھے لگتا ہے وقاص آ گیا ہے شکار سے واپس مجھے پتا ہوتا آج لوٹ آئے گا تو اسے بھیج دیتی تمہارے ساتھ۔“ بیڑمی ہڈیوں میں اب اتنا دم کہاں کہ اتنا طویل سفر کر سکوں۔“ پورج میں وقاص کی جیب دیکھ کر تائی جان نے بیک وقت خوشی و تاسف کا اظہار کیا تھا۔ دل تو امامہ کا بھی بے ہنگم انداز میں دھڑک اٹھا تھا آج کتنے دنوں بعد وہ اس سنگمر کی صورت دیکھ سکے گی۔ اس کی تمام تر کج ادائیگیوں کے باوجود دل تھا کہ اس کی جانب کھینچتا تھا۔ یہ محبت بھی بڑا خراب والا معاملہ ہے مذلت و رسوائی سے لے کر بے نیازی و کج ادائیگی کے تمام دوسرے کمر سبز و شاداب رہتا ہے۔

وہ ایک نئی ترنگ کے ساتھ کمرے میں آئی تھی مگر وقاص کی حالت نے اس پر پھر اس کی اوقات واضح کی تھی۔ اس کا دل یا سیت سے بھر گیا۔ بے مائیگی ہی بے مائیگی تھی۔ جانے کی دیر اس نے آنسو بہائے تھے۔ تب وقاص نے کروٹ بدلتے ہوئے سوتی جاگتی کیفیت میں اس کی موجودگی کو محسوس کیا تو کڑے انداز میں سوال کیا امامہ کا دل دھک سے دھک گیا۔

”میں نہیں گئی تھی اماں جان لے کر گئی تھیں چیک اپ

کے لیے۔“ اس نے صفائی پیش کی۔

”ان چونچلوں کے بغیر تیرا بچہ پیدا نہیں ہوگا کیا؟ یہ نخرے ناک کے راستے نکال دے تو۔“ اسے بالوں سے پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹختے ہوئے وہ لمحوں میں حیوانیت کا چولا چڑھانے لگا۔ امامہ کے چہرے پر کرب و اذیت رقم ہونے لگی مگر اس نے خود پر ضبط کے پہرے بٹھا دیے۔

”ٹھیک ہے میں آئندہ نہیں جاؤں گی۔“ اس نے تابعداری کا مظاہرہ کر کے اپنی جان چھڑانا چاہی مگر وقاص کا اٹھا ہوا ہاتھ تھپڑ کی صورت اس کی قوت گویائی چھین کر لے گیا۔ اس نے خوف سے وقاص کا غیض و غضب کا مظہر چہرہ دیکھا یوں جیسے اپنا تصور جاننا چاہا ہو۔

”اتنی ہی فرمانبردار ہونا تم میری۔“ وہ غرایا اور مٹھیاں بھیج کر غصہ ضبط کرنے لگا۔ امامہ ساکن پڑی رہی۔

”تیرے پچھلے تجھے یہاں پھینک کر بھول گئے نہ کبھی تو ادھر سدھاری نہ وہ تیری خبر کوائے ایسا کون سا جرم سرزد ہوا ہے تجھ سے۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ امامہ کی جلتی ہوئی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ یہ بات تو اسے بھی اپنے گھر والوں سے پوچھنی تھی۔ کتنا عرصہ ہوا لاریب نے بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا حالانکہ کبھی وہ وقت بھی تھا کہ جب لاریب کو سب سے زیادہ امامہ کی ہی فکر رہا کرتی تھی وقاص کے اٹھ کر کمرے سے چلے جانے کے بعد اس نے اپنا سیل فون اٹھا کر لاریب کا نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹیاں بھتی رہیں مگر وہ فون نہیں اٹھا رہی تھی امامہ جھنجھلا گئی کچھ خیال آنے پر اس نے سکندر کا نمبر ملا یا تھا۔

”السلام علیکم امامہ بی بی ٹھیک ہیں آپ۔“ سکندر کی مخصوص شفقت آمیز آواز اس کی سماعتوں میں اتری تو آنکھیں پھر سے پانیوں سے لبریز ہو گئیں۔

”وعلیکم السلام سکندر بھائی میں تو جیسی ہوں آپ چھوڑیں۔ یہ بتائیں بجو اور بابا جان کیسے ہیں آپ بھی بھول گئے مجھے۔ اب تو لگتا ہے اپنوں کی صورت دیکھنے کو ترس جاؤں گی۔“ گو کہ اس کا ہرگز ارادہ نہیں تھا شکوہ و شکایت کا وہ



بھی سکندر سے مگر اس کے انداز میں کچھ ایسی خصوصیت و محبت کا احساس ہوا کرتا تھا کہ وہ خود پر ضبط کھو کر زار و قطار رو پڑی۔ دوسری جانب سکندر اس کے انداز پر نا صرف گھبرایا بلکہ بوکھلا اٹھا۔ جنہی اسے پکارتا سمجھتا حوصلہ دیتا وہ اتنا بے ربط ہوا جا رہا تھا کہ امامہ کو خود کو سنبھالنا پڑا۔

”آپ کہیں تو میں ابھی آجاتا ہوں بابا سائیں کو لے کر یا پھر ممکن ہو سکے تو آپ یہاں تشریف لے لیں۔“ سکندر اس کے دل کی تسلی کی خاطر کہہ رہا تھا۔ امامہ مضطرب سا سانس کھینچ کر رہ گئی۔

”نہیں سکندر بھائی پلیر بابا جان کو کچھ کہہ کر پریشان مت کیجیے۔ سوری میں نے اپنی بے وقوفی کی بنا پر آپ کو پریشان کر کے رکھ دیا۔“ کتاب بدل گئی تھی وہ پہلے نادانی میں صرف اپنے دل کی کہا کرتی تھی مگر اب اسے اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کا خیال رہنے لگا تھا۔

”بجو میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہی انہی سے بات کرنی تھی مجھے۔“ اس نے دانستہ بات بدل دی۔ سکندر کی جواباً گہرا سانس بھرنے کی آواز سنائی دی۔

”میں دیکھتا ہوں غالباً وہ باہر ہوں گی اور سیل فون کرے میں۔ وہ خود آپ کو کال کر لیں گی۔“ سکندر کے تسلی آمیز انداز پر امامہ نے شکریہ ادا کرتے سلسلہ منقطع کر دیا۔



لاریب نے داش روم سے نکل کر بال تولیے کی قید سے آزاد کیے اور تولیہ بے پروائی سے صوفے پر پھینک دیا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے گرا بھی اس نے ہیر برش اٹھایا ہی تھا کہ دروازے پر دستک دے کر سکندر نے اندر قدم رکھا۔ لاریب نے گردن نہیں موڑی کہ آئینے میں اس کا عکس بہت واضح طور پر ابھرا تھا جسے رو برو پاتے ہی لاریب کی اجلی پیشانی پر ناگواریت ابھرتی تھی۔

”کسی کے کمرے میں آنے سے پہلے صرف دستک نہیں دی جاتی۔ اجازت کا انتظار بھی کیا جاتا ہے۔ اپنی سسٹم کس چیز کا نام ہے معلوم بھی نہیں ہوگا تمہیں۔“ اس نے ترشی سے

ٹوکا۔ چہرہ غنیض کی آنچ سے تیتھا کر کچھ اور بھی کشش اور دلکشی سمیٹ لایا تھا۔ نظروں میں تلخی بھی تھی اور تنبیہ بھی مگر سکندر پر مجال ہے اثر ہوا ہو۔ وہ اسی پر اعتماد پر سکون انداز میں جمنا ج کل اس نے خصوصیت سے لاریب کے سامنے اپنا لیا تھا اور وہ اس کے عین مقابل آن ٹھہرا پھر اس کی شعلے برسانی آنکھوں میں اپنی سر نظریں گاڑتے ہوئے اسی سرد مہر انداز میں بولا۔

”یہ تکلفات وہاں چلتے ہیں جہاں درمیان میں کوئی تعلق کوئی رشتہ نہ ہو۔ میاں بیوی کو اللہ پاک نے ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے۔ محترمہ میں دستک کا تکلف بھی نہ برتوں تو آپ کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔“ اس کا لہجہ و نظریں بدلتی ہوئی تھیں۔ لاریب نے رخ موڑ لیا۔

”کیوں آئے ہو؟“ اس نے جیسے جل کر پوچھا۔ سکندر جانے کس بات پر محفوظ ہو کر ہنس پڑا۔

”اس کا مطلب آپ کی سمجھ میں میری بات آگئی .... گڈ۔ اسی طرح فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتی رہیں تو زندگی سہل اور خوشگوار گزرے گی۔ قوی امید ہے کہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جب ہمارے بچے ہم سے اس حسین اتفاق کا راز پوچھیں گے۔ کیا خیال ہے آپ کا بتا دینا چاہیے اپنی نسل کی بہتری ہی ہوگی۔“ وہ یکدم انداز بدل کر چھیڑ چھاڑ کر آغاز کر چکا تھا۔ لاریب تو جیسے سرتاپا کسی ان دیکھی آگ میں جھلس گئی۔ یعنی بدتمیزی اور بے حجابی کے ساتھ گستاخی کی بھی انتہا تھی۔ اس کا بس نہیں چل سکا سکندر کا منہ نوج ڈالے۔

”اگر تمہیں اسی طرح کی گھٹیا بکواس کرنی ہے سکندر تو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ کس بات کا زعم ہے ختم نہیں؟ یوں بے ہودہ باتیں کر کے مجھے کیا جتانا چاہتے ہو کہ میں بے بس ہوگئی ہوں؟ ہرگز نہیں لاریب شاہ نا بھی بے بس تھی نہ ہوگی تم آخر ہو کیا؟ دو ٹوکے کے معمولی انسان یہ ہے اوقات تمہاری؟ سن لو میں نہیں ڈرتی کسی سے بھی۔ بابا جان کو میں خود بتاؤں گی اپنی غلطی کا اعتراف کر کے سولی بھی چڑھ جاؤں گی تم اپنی خیر مناد۔“ وہ اتنا مشتعل ہوئی تھی کہ نہ گنت ہر لمحہ سرخ اور گلے کی رگیں پھولتی جا

رہی تھیں۔ سکندر سکون سے سینے پر بازو لپیٹے کھڑا سدیکھتا رہا اس کے اعتماد میں ہرگز کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

”آپ کی بہادری کے اس مظاہرے کا منتظر رہوں گا میں بھی ضروری نہیں ہے اس مرتبہ بھی نقصان میرے حصے میں آئے۔ قسمت یاوری کرے تو میرا بیڈروم آپ کے اس حسین وجود کی روشنی سے جگمگا بھی سکتا ہے۔ خیر فی الحال تو آپ اپنا خون نہ جلائیں۔ اس وقت تو میں آپ کو امامہ بی بی سے متعلق بتانے آیا تھا۔ بہت پریشان تھیں آپ سے بات کرنے کی خواہاں بھی ہو سکے تو انہیں کال کر لیں۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ اس کے وحشت زدہ تاثرات پر اک گہری احتجاج بھری نظر ڈال کر پلٹ چکا تھا۔ لاریب اس کی بکواس سے لمحہ لمحہ کٹ کر گرنے کے عمل سے گزرتی آنسو اندر اتار رہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد کتنی دیر مٹھیاں بھینچے بھلتی ہوئی اسے گالیاں دیتی رہیں۔ بے بسی کا شدید احساس رگ جلاں میں خنجر اتارے جاتا تھا کس مصیبت میں جان پھنس گئی تھی۔ اس کا دل چاہا اپنے بال نوج نوج کر اوپچی آواز میں رونے۔ سیل فون کی بیپ پر وہ اس وحشت انگیز کیفیت سے بہو آئی اور بستر پر پڑے سیل فون کو دیکھا۔ اسکرین پر امامہ کا لنگ کے الفاظ جگمگ کر رہے تھے۔ اس نے سرد آہ بھری آواز سے بڑھ کر سیل فون اٹھالیا۔

”ماں امامہ..... کیسی ہو؟“ کوشش کے باوجود اس کا لہجہ و انداز تازگی اور بشاشت نہیں سمیٹ سکا۔ اندر کی ساری بے بسی اور یاسیت اس کی آواز میں بھی اتر آئی تھی۔

”مجھے چھوڑیں آپ کی فکر میں فی الحال تو ہلکان تھی بجو اسے فون کیسے آپ نے ریسو ہی نہیں کیے پھر سکندر بھائی سے بھی کہا آپ سے بات کر ادیں شاید بھول گئے ہوں سکندر امامہ فکر مند انداز میں تیز تیز بولتی چلی گئی۔ لاریب کے اندر محبت سے سکندر کے نام کا زہر پھیلا۔ اس کی رگ رگ ہلکتی ہوئی رہی تھی۔

”نیک ٹھیک ہوں امامہ..... خواہو پریشان نہ ہوا کرو۔“

”نیک ٹھیک آپ ٹھیک لگتی ہیں بجو نہ میں خود ٹھیک ہوں۔“

اس کا جوابا گلا بھرانے لگا۔ لاریب نے بے دردی سے ہونٹ کچل ڈالے۔

(یا اللہ کوئی ایسا معاملہ بھی بجائے زندگی میں جس میں خوشی کی کوئی رمزہ نہ گئی ہو میرے لیے)

”میں خود کو بہت تنہا محسوس کرتی ہوں بجو آپ یا پھر بابا جان بھی مجھ سے ملنے نہیں آتے۔ بھلے وقاص میرے تایا زاد ہی ہیں مگر اب شوہر ہیں طعنے دیتے ہیں مجھے آپ کو کچھ تو خیال کرنا چاہیے میری پوزیشن کا۔“ اس وقت امامہ جانے کس رو میں تھی کہ شکوہ کر گئی تھی۔ لاریب کا پہلے سے زرد چہرہ بالکل سرسوں کے پھول کی طرح سے ہو گیا۔

”تم فکر نہیں کرو امامہ بابا جان آئیں گے تمہاری طرف اور وقتاً فوقتاً تمہاری طرف چکر لگا لیا کریں گے۔“ اس نے بے ساختہ قسم کی تسلی سے نوازا مگر امامہ کی پھر بھی تشفی نہیں ہو پائی۔

”اور بجو آپ..... آپ کو بھی تو آنا چاہیے نا میرا دل اس بات پر روتا ہے بجو کہ ماں جان کے بعد ہم بہنوں میں بھی اتنی دوریاں حائل ہو گئی ہیں۔ مرے ہوئے کا صبر آ جاتا ہے مگر پچھڑے ہوئے کبھی نہیں بھولتے۔ میں آپ کو یا پھر ایسی باجو کو اپنے دل سے نوج کر کیسے پھینک دوں۔“ امامہ کو تو جیسے رونے کا بہانہ چاہیے تھا۔ لاریب کی جان پر بن گئی۔ اتنے فاصلے تھے کہ وہ اپنی ماں جان کے دکھ پر اسے سینے سے لگا کر تسلی دینے اس کے آنسو پونچھنے سے بھی قاصر تھی۔ اس نے کتنی دقتوں سے اسے چپ کرایا تھا۔

”تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کچھ دنوں کے لیے یہاں آ جاؤ۔“

”وقاص کبھی نہیں مانیں گے بجو آپ کو ہی میرے پاس آنا پڑے گا۔“ امامہ کے لا چاری ظاہر کرنے پر لاریب جواباً جھنجھوٹا ہوا خطر اب میں تھی اسی جھنجھلاہٹ میں اس پر خفا ہونے لگی۔

”تو بھڑا میں جھوٹو وقاص کو اسی لیے تمہیں منع کیا تھا کہ نہ کرو اس لعنتی سے شادی عمر بھر کی ٹینشن تمہاری وجہ سے میں بھی عذاب بھگت رہی ہوں مفت کا۔“ اس کے اس طرح خود



پر چڑھ دوڑنے پر امامہ کھلا ہٹ مزید بڑھ گئی۔

”آپ مجھ پر کیوں خفا ہو رہی ہیں..... میرا کیا قصور ہے؟“ وہ جیسے پھر سے رونے کی تیاری میں تھی۔

”تمہارا نہیں تو کیا میرا قصور ہے امامہ؟ حماقت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ مجھے اس واہیات سوچ کے مالک انسان کے گھٹیا پن کا کچھ حد تک تو اندازہ تھا لیکن وہ اس قدر پستی میں جا کرے گا یہ تو میرے تصور میں بھی کہیں نہیں تھا۔ تم سے شادی ہی اس نے اس لیے کی تھی کہ اس طرح مجھے اپنے زیر بار کر سکے مگر امامہ سن لو میں کبھی بھی اس کے مذموم ارادوں کو کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔“ برہمی و غمی کے ساتھ غم و غصے کا شکار وہ امامہ کو چند دن قبل کا وقاص کا بے غیرتی کا واقعہ سناتی چلی گئی۔

”اللہ نے بچایا ہے مجھے خود سوچو تمہاری حویلی آنا رسک سے خالی ہو سکتا ہے۔“ وہ چڑچڑے پن سے سوال کر رہی تھی جبکہ دوسری جانب امامہ شاکدہ ہو گئی تھی۔ یہ خاموشی و سناٹا لاریب کو پریشانی سے دوچار کر گیا۔ جیسی اس نے بار بار امامہ کو پکارتا تھا۔ اسے لگا لائن پہلے سے کٹ گئی تھی۔ امامہ نے اس کی پوری بات نہیں سنی مگر کسی ضروری بات کو اس سے کرتے آئے بابا سائیں ضرور انکشافات کی زد پر آئے دل تھام کر رہ گئے تھے۔



میں تو مدرسہ میں تھی سچ پوچھو تو مجھے یقین نہیں آتا تھا تم اتنی جلدی آگئی ہو واپس۔“ زینب کا چہرہ و آواز خوشی و اطمینان چھلکاتی تھی۔ نندی دکھ بھری آواز سے اسے دیکھتی خاموش بیٹھی رہی۔

”کچھ بتاؤ تو اتنی جلدی کیسے کام نہٹ گیا تمہارا مجھے تو اداس لگ رہی ہو بلکہ بیمار بھی۔“ اپنی کہتی زینب یکدم ٹھنکی اور اس کا پرسوز چہرہ تکتے ہوئے پریشان نظر آنے لگی۔ نندی کا دل تو ایسا آگینہ تھا جو ذرا سی ٹھنسی لگنے کی دیر ہوئی تڑختا تھا بکھرتا تھا ہمدردی کے پھائے زخموں پر رکھے گئے تو بجائے سکون کے تکلیف کی شدت سے بدن لرز اٹھا۔ آنکھوں کا آئینہ دھندلایا اور ٹپ ٹپ شفاف آنسو گلاب چہرے پر ایسے

بر سے جیسے شبنمی موتی نکھر گئے ہوں۔

”میں ہار گئی ہوں زینب ہر لحاظ سے شکستہ زندگی نے مجھے دکھوں اور مایوسی کے سوا کچھ نہیں دیا آپ مجھے بتائیں اگر وہ میرے نصیب کا حصہ نہیں تھا تو کیوں ٹکرایا مجھے۔ کیوں دوبارہ سے نظر آیا مجھے مزید دکھی کرنے کو میں کہاں تک اپنے ضبط اور حوصلے کو آزماؤں؟ میں نہیں لڑ سکتی مزید خود سے میرے لیے مرجانا ہی بہتر ہے۔“ ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپنے وہ بری طرح سے بلک پڑی۔ اسی طرح سسکتے ترپتے ہوئے اس نے وہاں پیش آنے والے سارے واقعات کہہ سنائے جو اذیت و تارسانی کے احساس سے لبریز تھے۔

”ساحر کی آنکھوں میں اپنے لیے بے زاری اور نفرت دیکھنا میرے ضبط و برداشت کی انتہا تھی۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔“ زینب کے چہرے پر اس بل کتنی بے بسی تھی۔ اس کا غم مٹانہ سکے کی اس کا درد کم نہ کرنے کی بے بسی۔

”حوصلہ کرو نندی اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہو کرتی ہے جیسے سمندر بہت وسیع ہوتا ہے مگر ہم اپنے چلو میں اتنا ہی پانی بھر سکتے ہیں جتنا ہماری ہتھیلی کی روک میں سما سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح اللہ کی رحمتیں لامحدود ہیں مگر ہم اتنی ہی پاسکتے ہیں جتنا ہمارا ایمان پختہ ہے۔ اللہ پر بھروسہ ایمان اور یقین قائم رکھو ان شاء اللہ ایک دن منزل پا لوگی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تمہاری مشکلات کا سانیوں میں بدلے تمہیں پتا ہے نندی سب سے مضبوط وہ لوگ ہی ہوتے ہیں جو اپنے ارادوں میں پختہ ہوں کسی بھی کام میں کامیابی کے لیے مضبوط لگن کا ہونا لازحد ضروری ہے۔ یہ لگن اگر روحانی راستوں پر چلنے کو اختیار کی جائے تو سبحان اللہ ایک واقعہ سناتی ہوں تمہیں۔ روحانی بزرگ خواجہ معین الدین چشتی انہوں نے بیس سال اپنے مرشد کے ہاں پانی بھرتا تھا اور بیسویں سال ان کے مرشد نے پوچھا تھا لڑکے تمہارا نام کیا ہے۔ آتش پر شوق قلب میں آگ دھک رہی ہوتی تو اصولی جواب یہ بتا تھا کہ بیس سال میں آگ کا نام پوچھنے کا خیال آیا مگر روشنی ہدایت کے خواستگار ہجر گزرا

نے اپنے ظرف و تابعداری سے اپنے روشن مستقبل کا پتا دیا اور مودبانہ عرض کیا۔ ”معین الدین“ بیس سال بھی بے نام رہنے والے اپنے رہنما کی نظر التفات کا انتظار کرتے ہیں اور شرح صدر کی خاطر بیس سال صرف پانی بھرتے ہیں۔“ اور نندی جو واپس اٹھ گیا جانے کا فیصلہ کر چکی تھی گنگ بیٹھی اس کا منہ تکتے گئی۔ اسے خود پر شرم آئی۔ وہ اتنی کمزور تھی یہ تھی اس کی محبت؟ بس اتنی سی آزمائش اور پھر راہ فرار یہ محبت تو نہ تھی یہ اخلاص تو نہ تھا یہ عشق تو نہ تھا۔ جس میں کوئی چور دروازہ نکلتا ہی نہیں ملے ہوا تھا وہ واپس نہیں جائے گی چاہے اسے کامیابی ملے نہ ملے۔ وہ اسی شہر اسی ملک کی نضاؤں میں رہے گی جن میں عباس کی سانسوں کی مہک شامل تھی۔ اسے یہاں سے نہیں جانا چاہیے عمر بھر بھی عباس اسے نگاہ التفات کے قائل رہے مگر وہ محبت میں گستاخی کی مرتکب نہیں ہو سکتی۔



”السلام علیکم کیا حال ہے بیگم صاحبہ؟“ عباس حیدر نے کلاس وال کے ساتھ کھڑی بارش کا نظارہ کرنی عریضہ کو پیچھے سے آ کر کندھوں سے تھام کر نرمی سے لگایا اور اپنا سر اس کے کندھے سے نکا دیا۔ عریضہ نے تاز بھری خفگی سے اسے دیکھا پھر کسمسا کر اس کے حلقے سے نکلنے کو مچلی۔

”ابھی تک خفا ہو؟“ عباس نے مسکراہٹ دبا کر اس کی ہانک کو شرارت و اپنائیت بھرے انداز میں دبایا۔ عریضہ نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا۔

”زیادہ فریٹک ہونے کی بالکل بھی ضرورت نہیں۔“ وہ ہنسی اور نخوت زدہ انداز میں اسے جھٹک دیا۔ عباس کو یہ دیکھ کر میز انداز برا لگا تھا مگر اظہار نہیں کیا یہ سچ ہے محبت میں انسان بہت ساری ناگوار باتوں کو سہنے کا ظرف حاصل کر لیا کرتا ہے۔

”میں وہ کام کر چکا ہوں مادام جس کے لیے آپ نے مجھے یہ پابندیاں لگائی تھیں۔“ عباس نے پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے گھوم کر کہا۔ عریضہ کی نظریں ہنوز مشکوک تھیں۔

”کوئی ثبوت؟“

”کیا اب میری زبان کا بھی بھروسہ نہیں ہے؟“ عباس کو واقعی دکھ ہوا تھا۔ عریضہ نے بڑا ضروری نہیں سمجھی اور اس ڈھٹائی سمیت سر کو نفی میں جنبش دینے لگی پھر جتلا کر بولی تھی۔

”امی کہتی ہیں مرد پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ آستین کا سانپ بن کر جب چاہے ڈس لے۔ خاص طور پر حسین مرد کی تو حفاظت اور بھی کٹھن کام ہے۔ آپ تو پورے پاکستان کی عورتوں کے دلوں میں دھڑکتے ہیں۔ کوئی آپ کے دل میں بھی دھڑک سکتی ہے۔“ عباس نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور مسکرا کر ٹال گیا مگر وہ عریضہ تھی جس نے اس کے سیکرٹری سے تصدیق کرنے کے بعد باری باری دیگر اراکین سے بھی بات کی تھی۔ اس دوران عباس ہونٹ بھینچے خود پر ضبط کے کڑے پہرے بٹھاتا رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آئی عریضہ شروع سے ایسی کھٹورتھی یا اب ہو گئی تھی۔

”تھینک یو ویری مچ عباس آپ واقعی بہت اچھے ہیں۔“ اپنی تسلی کے بعد وہ پھر وہی عریضہ بن گئی ہنس مکھ نرم گداز محبتیں لٹاتی ہوئی۔ عباس کے لیے اس کا یہ روپ بے حد تکلیف کے ساتھ رنج کا بھی باعث بن رہا تھا۔ شریک سفر کی ذہنی ہم آہنگی بہت سارے مسائل سے نجات دلا سکتی ہے مگر اس کے نصیب میں یہ سکھ یہ سکون نہیں آ سکا تھا۔

”کیا ہوا چپ کیوں ہیں جناب؟“ عریضہ کو اس کی خاموشی ناگوار محسوس ہوئی۔ عباس سر داہ بھر کر رہ گیا۔

”بہت تھکا ہوا ہوں عریضہ ملازمہ سے کہہ کر چائے بنوا دو۔ بچے کہاں ہیں؟“ فریش ہونے کے خیال سے واش روم کی سمت جاتے وہ رک کر اسے سوالیہ نظروں سے تکتے لگا۔ ”سور ہے ہیں دونوں میں کہتی ہوں چائے کا۔“ عریضہ نے بچوں کے کاٹ کی جانب اشارہ کیا اور انٹر کام کارے سیور اٹھا لیا۔ عباس واش روم میں بند ہو چکا تھا۔ ہاتھ لینے کے بعد باہر آیا تو گیلے بال ماتھے سے جھٹکتے ہوئے اس نے پہلے جھک کر دونوں بچوں کو پیار کیا پھر پلٹ کر بستر میں جا گھسا۔

”مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی عباس۔“ جب وہ



چائے کے بڑے بڑے گھونٹ لے رہا تھا تو نیند کے خمار سے اس کی سحر انگیزی آنکھوں کی دلکشی مزید بڑھتی محسوس ہو رہی تھی۔ عریشہ کے مخاطب کرنے پر اس نے سوالیہ نظریں اٹھائیں پھر طمانیت سے مسکرایا۔

”بات تو مجھے بھی کرنی ہے تم سے ذرا یہاں آؤ۔“ بلاوا خاص تھا انداز میں شوخی و شرارت تھی صاف ظاہر تھا وہ کچھ دیر قبل کی تمام ناگواری بھلا چکا تھا۔ وہ ہمیشہ یونہی اس کی جانب سے بہت جلدی دل صاف کر لیا کرتا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ اس کا دل اس کی جانب سے میلا ہوتا ہی نہ تھا۔

”اونہہ..... کوئی بد تمیزی نہیں چلے گی۔“ عباس کی پیش رفت پر وہ مصنوعی ناز سے چلانے لگی۔

”اسے بد تمیزی نہیں محترمہ روئیں کہتے ہیں کیا سمجھیں۔“ عریشہ نے مصنوعی حقلمندی سے گھبرا اور منہ بنا لیا مگر عباس من مانی کے موڈ میں لگتا تھا۔

”پتا ہے کتنی لمبی جدائی کاٹی ہے یار خفا مت ہونا پلیز۔“ اس کے گال کو شرارت بھرے انداز میں چھو کر وہ ہنسنا تو عریشہ اسے دیکھنے لگی۔ اس کی سحر انگیزی اور دلکشی کمال تھی بے خودی سی چھانے لگتی تھی عریشہ پر اسے اتنے نزدیک دیکھ کر۔

”کچھ منواؤ گی تو ماننا بھی پڑے گا جان عباس کا روبرو زندگی لو اور دو کے اصول پر ہی چلتا ہے۔“ عباس کی وارفتگی میں بھی بلا کی احتیاط اور نرمی پنہاں ہوا کرتی تھی۔ وہ ایسے چھوٹا تھا اسے جیسے بلور سے بنی ہوئی ہو۔

”مگر میں آپ کو اپنے بارے میں کاروباری نہیں سمجھتی تھی۔“ عریشہ نے ناراضی جھلانا ضروری سمجھا۔

”یہ کاروبار تو محبت کا کاروبار ہے۔ جتنا انویسٹ کروں گا اس سے بڑھ کر نفع پاؤں گا۔ دیکھ لو ہر حکم تمہارا چلتا ہے سب کچھ تمہارا ہے حالات و واقعات گواہ ہیں ہم آپ کے سامنے ہارے ہوئے ہیں۔“ عباس کا لہجہ گواہ تھا اس کے لیے اس بار میں بھی خوشی و طمانیت کے ساتھ فخر و انبساط بھی ہے۔ عریشہ کی خود پسند خود غرض اور حاکمانہ فطرت کو تقویت کی ڈور ملی تھی مگر بظاہر وہ ٹھنک گئی تھی۔

”کیسے مان لوں میں ثبوت بھی مانگتی ہے ہر گواہی۔“ بات ایسی تھی کہ عباس کا متحیر ہونا عین فطری تھا اس نے سر اونچا کر کے عریشہ کا چہرہ جانچنے کی کوشش کی انداز میں خفیف سی ٹھنک کا احساس تھا۔

”عریشہ میں کتنے ثبوت فراہم کر تو چکا ہوں۔ پھر بھی.....!“ وہ سخت شامی ہو چکا تھا عریشہ نے بے اعتنائی کے ساتھ کاندھے جھٹکے اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”یہ چھوٹی موٹی معمولی باتیں اتنی اہمیت کی حامل ہی کہاں ہیں عباس صاحب سمجھ لیں آپ مجھ ان لالی پاپ سے نہیں بھلا سکتے۔ میری ڈیمانڈ آپ کے حوالے سے پہچان ہے آپ کے خاندان میں اپنا مقام حاصل کرنا ہے جانتے تو ہیں آپ۔“

عباس یکدم ٹھنڈا پڑ گیا۔ عریشہ کی اس حد تک برتی گئی خود غرضی و بے حسی اسے تاسف میں مبتلا کرنے لگی وقت اور حالات گواہ تھے کہ اس نے اپنے کیریئر کی خاطر ہی سب کچھ داؤ پر لگایا تھا اور عریشہ نے اس سے اس کا کیریئر چھین لیا تھا۔ اک مرتبہ نہیں عباس کو اس کی خاطر دوبارہ یہ قربانی دینی پڑی تھی مگر وہ پھر بھی خوش نہیں تھی وہ اس کے احساسات کو سمجھے بغیر بس اپنی منوانے کی خواہش مند تھی۔ وہ جتنا بھی انا پرست تھا مگر اس نے عریشہ کی خاطر یہ بھی کیا تھا لیکن اسے اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی اور وقاص نے اس کے سارے راستے بند کر دیے تھے تو گنجائش ہی کہاں رہ گئی تھی۔ عریشہ کو پھر بھی اس بات کا اس کی مجبوری کا احساس نہیں تھا۔

”میں کوشش کر چکا عریشہ تمہاری یہ خواہش ضروری پوری ہو مگر یہ کام میرے بس سے باہر کا ہے کیا تم اب اس بات کو لے کر میرے ساتھ مس بی ہو کیا کرو گی؟ تمہیں پتا بھی ہے میں ناراضی برداشت نہیں کر سکتا تمہاری۔“ اس کے چہرے سے کتنی بے بسی جھلک رہی تھی۔ عریشہ کو اس کی یہ بے چارگی زہر لگی۔

”آئی ایم سوری عباس صاحب! اطلاعات عرض ہے کہ میں مزید آپ کی اس من گھڑت فرضی مجبوری کے جھانسنے میں نہیں

آؤں گی سن لیں یہ ناراضی اتنی دیر تک ختم نہیں ہوگی جب تک آپ میرا مطالبہ پورا نہیں کر دیتے۔“ وہ نہایت بے نیازی سے کہتی اس کے ہاتھ جھٹک کر وہاں سے چلی گئی۔ عباس حیدر رنج حیرت اور غیر یقینی سے ششدر بیٹھا رہ گیا تھا۔



”کیا ہو گیا ہے عائشہ کی بچی! ار یہ ہوں میں ار یہ شاہ! بچانا کتا کر سر پھاڑوں تمہارا۔“ فراز شاپنگ آرکیڈ میں کھدوم پھر کر خریداری میں مصروف تھا جب اپنی پشت سے آئی اس دانت کچکچاتی آواز پر یونہی بے ارادہ گردن موڑ کر دیکھا! بلیک جینز پر لمبی دھانی قمیض دوپٹے میں ملبوس ہاتھوں میں شاپنگ بیگز اٹھائے وہ ہینڈ سیٹ کے ذریعے فون پر بات کرتی الزامہ اور خوش روی لڑکی تھی۔ جس کی خصوصیت اس کے گولڈن براؤن کرلی بال اجلی بے داغ سفید رنگت اور براؤن آنکھیں تھیں۔ وہ حسین ہی نہیں حسین ترین لڑکی تھی۔ فراز کی سرسری انداز میں انھی ہوئی نگاہ پلٹنے کے معاملے میں بے بس ثابت ہوئی۔

”میں تمہاری برتھ ڈے سیلیبریٹ کرنے کو یہاں خوار ہوئی پھر رہی ہوں اور محترمہ ابھی تک نیند کے مزے لوٹ رہی ہیں۔ میں کہتی ہوں ساری تیاری میرے پہنچنے سے پہلے کر رکھو ورنہ میں آ کر حشر کروں گی تمہارا۔“ وہ اسی خونخوار انداز میں مخاطب تھی۔ اب البتہ رک کر کاندھے پر لٹکتے بیک میں آدھے سے زیادہ منہ گھسائے کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ فراز نے گہرا سانس بھرا اور سر پر ہاتھ پھیرتا سیدھا ہو گیا۔ وہ محترمہ کی ایک شاپ میں گھس گئی تھی۔ فراز کو اپنے لیے کچھ پسند نہیں آ سکا تھا۔ دراصل اس کا ذہن الجھاؤ کا شکار تھا وہ بے حد قہر مند تھا۔ بنے بنائے کام میں آ پڑنے والی رکاوٹ نے اسے مایوسی اور بے بسی کا شکار کر دیا تھا۔

کچھ دیر مزید سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے بعد اسے ایک محسوس ہوئی تو برگر کارنر پر چلا آیا۔ ریسٹورنٹ کا داخلی علاقہ مستعد و مودب نظر آتے باوردی گارڈ نے اس کے لیے ٹاکیو فراز کی نگاہ جس بل اس کی خوش آمدیدی مسکراہٹ

میں ابھی اسی لمحے کوئی اس کی جلیسی بے خیالی کا شکار اندر سے باہر آتا وجود اس سے ٹکرایا تھا۔ فراز تو جیسے بھنا کر رہ گیا۔

”آؤج! اندھے ہونم اتنی بڑی بڑی آنکھوں کی موجودگی کے باوجود محض لڑکیوں سے ٹکرانے کا شوق ہی ایسی تھوڑا کلاس حرکتوں پر اتر آتے ہو۔“ وہ نازک مزاج محترمہ تو جیسے پنبے جھاڑ کر اس کے پیچھے بڑی تھی۔ نظریں ملامت بھری تھیں۔ فراز نے بچ دتا ب کھاتے ہوئے بے حد غصے سے اسے دیکھا تو جیسے ٹھنک گیا یہ تو وہی محترمہ تھیں جو شاپنگ آرکیڈ میں زور و شور سے اپنی دوست پر لعنت ملامت کر رہی تھیں۔

”نیچے کرو اپنی آنکھیں! ورنہ نکال کر ہتھیلی پر دھروں گی۔“ ار یہ شاہ ایسی ونسی لڑکی نہیں کہ جس کا جی چاہے آنکھیں پھاڑ کر اسے گھورنے لگے۔“ وہ تھکے چوتھوں اکھڑے درشت تیوروں سے بولی تھی۔ فراز تو اس شعلہ جوالہ کو دیکھتا رہ گیا مگر اس کے الفاظ ضرور اسے تلملا کر رکھ گئے تھے۔ یعنی حد تھی غرور اور ناز کی۔

”دیکھیے محترمہ اپنا راستا تاپے میں ہرگز بھی جان بوجھ کر آپ سے نہیں ٹکرایا۔ حد ہے خوش نہیں کی۔“ فراز نے جواباً بغیر کسی لحاظ کے تڑخ کر کہا اور تن فن کرتا اس کے تاثرات کے پروا کیے بغیر آگے بڑھ گیا۔

”دنیا لو فروں سے بھری پڑی ہے مگر یہ ذرا مختلف کمینہ ہے۔“ اپنے پیچھے دانت چبا کر کہے گئے تبصرے نے کانوں سے دھواں نکال دیا تھا۔ وہ چاہتا تو پلٹ کر اسے ایسا جواب دیتا کہ وہ اپنی بات پر پچھتائے بغیر نہیں رہتی مگر اس کی نساوینت کا لحاظ کر کے چپ رہا۔

”فراز کہاں ہو یا تم؟“ ابھی وہ آرڈر کرنے کے بعد سیدھا ہو کر بیٹھا ہی تھا جب اس کے سیل فون پر شر جیل کا ٹیکسٹ آیا۔

”گھر سے باہر ہوں بھائی! خیریت۔“ اس نے جوابی ٹیکسٹ ارسال کیا اور ویٹر کو اپنے سامنے میز پر کھانا چختے دیکھنے لگا۔

”آج ایمان کو چیک اپ کے لیے جانا تھا یار میں



مینگ میں ہوں تین گھنٹے سے پہلے فارغ نہیں ہو سکتا۔ اس دوران اس کا اپائنٹمنٹ نکل جانے کا تم لے جاؤ گے اسے؟“ شرجیل کا اصرار اسے مجھے میں ڈال گیا تھا۔ اس نے گہرا سانس بھر کر پھر ٹیکسٹ ٹائپ کیا۔

”جی بھائی ٹائمنگ بتا دیں مجھے۔“ شرجیل نے ٹائم بتا دیا تھا۔ فراز وہاں سے اٹھا تو اس کے پاس ایک گھنٹہ ابھی باقی تھا۔ وہ آسانی سے گھر پہنچ کر ایمان کو ٹیکسٹ لے جاسکتا تھا۔ جی ٹی روڈ سے آگے سڑک کے سائیڈ پر وائٹ کروڈا کے انجن پر جھکی کھڑی وہ وہی لڑکی تھی جسے آج کی تاریخ میں وہ دوسرے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ کھلے ہوئے بونٹ اور اس کے چہرے کی جھنجلاہٹ از خود بتاتی تھی کہ گاڑی میں کوئی خرابی پیدا ہو چکی ہے۔ فراز نے کچھ سوچا پھر اپنی گاڑی اس سے کچھ فاصلے پر جا کر روک دی۔

”ہیلو میم..... میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟“ اس نے گلا کھنکارتا تو اریبہ نے بے طرح چونک کر اسے دیکھا اور جیسے شناسائیت کا عکس اس کی گہری سنہری آنکھوں میں بھی اتر آیا تھا۔

”تیسری مرتبہ کا ایک ہی دن میں ہونے والا یہ ٹکراؤ بے معنی نہیں ہو سکتا۔“ جی میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔“ وہ دانستہ مسکرایا۔ اس بل وہ قنوطیت کے اس حصار سے بھی نکل آیا تھا جو اسے جکڑے ہوئے تھا۔ جی بھی لہجہ خوشگوار تھا اریبہ کے انداز میں بھی قدرے نرمی اور رسانییت جھلک رہی تھی۔

”گاڑی اشارت نہیں ہو رہی شاید کچھ فالٹ آ گیا ہے۔“ مدہم انداز میں کہہ کر اس نے نظریں کترالیں۔ فراز نے اس کی بڑھائی چابی پکڑی اور پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد گاڑی اشارت ہو گئی تھی فراز جانے کیوں ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا۔

”مس اریبہ ہم دوبارہ مل سکتے ہیں؟“ وہ گاڑی سے باہر آیا تو اسے گہری نظروں سے تکتے اہم سوال کیا تھا۔ اریبہ بے طرح چونکی۔

”اس احسان کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔“ اس نے تیکھے

انداز میں سوال کر کے فراز کو بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

”یہی سمجھ لیں آپ۔“

”لیکن میں اس قسم کی لڑکی نہیں ہوں مس اریبہ ٹرسٹ می چلیں بس اپنے گھر کا ایڈریس دے دیں۔“ اب کے اس کے لہجے میں سنجیدگی اور متانت تھی۔ اریبہ نے پہلی بار اسے بغور دیکھا پھر گھوڑنے لگی۔

”وہ کس لیے دیکھیں.....!“

”آپ غلط سلط انداز سے قائم نہ کریں مجھے ضروری کام ہے آپ سے.....!“

”مجھے کسی قسم کے کام کے لیے بھی آپ کی ضرورت نہیں ہے اوکے لڈ بائے فار ایور۔“ وہ اسے جڑا کر کہتی ہاتھ ہلا کر رخصت ہو گئی۔ فراز ہلنق ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر خاصے خراب موڈ کے ساتھ واپس اپنی گاڑی میں آن بیٹھا تھا۔ اس لڑکی کا مغرور اور دلکش چہرہ بار بار اس کے تصور کے پردے پر لہرا کر اسے ڈسٹرب کر رہا تھا۔

”حیرت ہے کیا کوئی اتنی جلدی بھی کسی پر اثر انداز ہو سکتا ہے؟“ وہ بار بار اچھٹے سے سوچتا رہا۔ اگر پہنچا تو ایمان کچن میں اتنی مصروف تھی کہ گویا سر کھانے کی بھی فرصت میسر نہیں تھی۔

”آپ تیار نہیں ہوئی ابھی تک بھابی؟“ وہ بے حد جھنجلا سا گیا۔

”کہاں جانا ہے؟“ اس سے قبل کہ ایمان اس کے پلے میں کچھ ڈالتی ممانے آ کر خاصے غصیلے انداز میں سوال کیا تھا۔ فراز متوقع تفتیشی پریڈ سے ہی بےزار ہونے لگا۔

”بھابی کو چیک اپ کے لیے اسپتال جانا ہے شرجیل بھائی بڑی تھے مجھے سوچنا ہے یہ کام۔ بھابی میں نے ٹیکسٹ چھوڑا تھا آپ کے نمبر پر پھر بھی تیار نہیں ہوئیں آپ۔“ وہ پہلے ممانے کو جواب دے رہا تھا پھر ایمان کو مخاطب کر لیا انداز بے حد سرسری قسم کا تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا معاملہ گہیر ہو۔

”مما یہ کام شذر یا سمیعہ کر لے گی نا بھابی کو لے

جاؤں میں؟“ اس نے نرمی و رسانییت کے ساتھ دانستہ محبت کا مظاہرہ کرتے ممانے کے گلے میں بازو جمائے کیے تھے۔ ان کے کچھ وترش تاثرات اس کی حرکت کے جواب میں قدرے ڈھیلے پڑ گئے۔ انہوں نے جیسے طوعاً و کرہاً سر کو اثبات میں بلایا۔

”چلیں بھابی کو ٹیک..... ٹائم بہت کم ہے۔“ اس نے دانستہ جلدی بچادی۔ ایمان خاموشی سے باہر نکل گئی۔

”مسکراہٹ اور نرم بول آدھی مشکلات کو تو لازمی آسانی میں بدل سکتے ہیں یونو؟“ ایمان تھکی تھکی بڑمردہ سی آ کر اس کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھی تو فراز نے بلکے بھٹکے انداز میں کہتے گفتگو کا آغاز کر دیا ایمان جواب میں کچھ کہے بغیر محض سردا ہ بھر کر رہ گئی۔

”کیا ہوا پسند نہیں آئی میری بات؟“ فراز بہت متفکر سا اس کا چہرہ جانچ رہا تھا۔

”کیا کہوں فراز بھائی سوائے اس کے کہ رشتوں کی تہدیلی بھی بہت اہم کردار کرتی ہے ماں ہیں وہ آپ کی یہ محبت و نرمی بالکل فطری انداز کی ہے آپ کے لیے ان کا دل جتنا بالکل مشکل کام نہیں بلکہ یہ دل تو آپ کا جیتا ہوا ہی ہے۔“ اس کے لہجے میں یاسیت تھی فراز کو اس سے دلی امدادی محسوس ہوئی۔

”لیکن پیاری بھابی جی یہ بات تو مانیں گی سیانے کہہ گئے ہیں پھر پر بھی پانی کا قطرہ مستقل گرے تو سوراخ ہو جاتا ہے ہماری والدہ ماجدہ تو پھر انسان ہیں۔“ اس کا شریرانہ انداز دل جوئی کی نرمی سموئے ہوئے تھا ایمان آنکھوں کی می سمیت نظریں جھمکا گئی۔

”کسی کام کا بیڑا اٹھانا ہو تو سب سے پہلے ہمت حوصلوں کو مضبوط قوت ارادی کی ضرورت پڑا کرتی ہے۔ میرے پاس یہ باتیں وافر مقدار میں موجود نہیں لیکن بیک وقت اتنے بھائیوں پر لڑنا پڑا کہ کال پڑ گیا وجود میں ان خزانوں کا ہارا ہوا ٹھکانہ کیسے کوئی محاذ سر کر سکتا ہے؟“ اس کے انداز کی افسردگی اہلکندگی کی مایوسی و ناامیدی کی جانب اشارہ کرتی تھی۔

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی بھابی قسم سے آپ نے ہمیں بہت مایوس کیا۔ میں تو سوچ رہا تھا پسند کی شادی کر کے آپ کی پارٹی کو کمک فراہم کروں گا مگر آپ.....!“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر تاسف سے سر جھٹکا ایمان البتہ چونکی تھی پھر جیسے پر خلوص مشورہ دیتے اصلاحی انداز میں بول پڑی۔

”آپ تو کانوں کو ہاتھ لگا لیں پسند کی شادی نہیں کریں گے۔“ اس نصیحت پر فراز بدک سا گیا اور خاصے روٹھے ہوئے انداز میں اسے ٹکا۔

”کم از آپ سے مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ دشمن کے قبیلے کے افراد جیسی باتیں کریں۔“ ایمان اس کے انداز کی خفگی اور شکایتی پن پر دھیرے سے ہنس دی تھی پھر گہرا سانس بھر کر کھڑکی کے پار دیکھا اور کاندھے اچکا دیے۔

”ہمدردی کی بدولت کہہ رہی تھی۔ نہیں چاہتی ہوں کوئی اور غریب اس بل صراط آچڑھے جسے تنہا اسے عبور کرنے کی مشقتیں سہنی پڑیں۔“ اس کے انداز میں بیت جانے والی اذیتوں کا تاثر نرم ہونے لگا۔ فراز متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا تھا۔

”محترمہ خاصی پناخہ قسم کی چیز ہیں مخالف محاذ کی شکست یقینی ہے۔“ فراز نے اریبہ کا تصور کر کے مزایا جبکہ ایمان اس کے پر یقین انداز سے ہی اچھی تھی۔

”کیا آپ کسی کو پسند کر چکے ہیں فراز بھائی؟“ اور فراز دھیرے سے ہنستا چلا گیا۔

”ہاں نہیں ابھی کچھ کہہ تو نہیں سکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ موصوفہ باتوں سے الگ لگی ہیں۔“

”اوہ..... پھر تو سمجھیں پھنس گئے آپ یہیں سے آغاز ہوتا ہے اس حادثے کا۔“ وہ افسردگی سے کہہ رہی تھی فراز نے کاندھے اچکا دیے۔ گویا کہہ رہا ہوں دیکھی جائے گی۔

بے زاری پڑمردگی یا سیت نے جیسے اس کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ یہ خیال یہ سوچ یہ احساس ہی جان لیوا ہوتا تھا کہ اب اس کی زندگی میں عباس کی ہمیشہ رہ جانے والی کی آنکھیں ہری ہے۔ وہ اس سے کبھی دوبارہ نہیں مل سکتی۔ ملنے کا آخری بہانہ بھی



اس نے خود ختم کر ڈالا تھا۔ کبھی کبھار تو یہ قنوطیت اس حد تک بڑھتی کہ وہ خود اپنے آپ کو کوسنے لگتی۔ زینب نے کتنا چاہا تھا وہ اس کے ساتھ مدرسہ جانا شروع کر دے مگر اس کا دل ہی کہیں نہ لگتا تھا۔ آج بھی وہ زینب کے مجبور کرنے پر اس کے لیے کچھ کتابیں لینے کے واسطے آئی تھی ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے اس نے مارکیٹ کی جانب پیش قدمی کی ہی تھی جب اسے ٹھٹھک جانا پڑا۔

”ایکسیوز میس نندنی۔“ اس نے جانا اس کے قدموں میں موٹی آہنی زنجیر آ پڑی ہے۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ مڑ کر دیکھے بناوہ جان سکتی تھی پکارنے والا عباس حیدر کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ وہ ساکن کھڑی رہی یوں جیسے سمرائز ہو گئی ہو جبکہ عباس خود تیز قدموں سے چل کر اس کے مد مقابل آ گیا تھا۔ نندنی کی پلکوں پر ڈھیروں بوجھ آگرا اور دھڑکنوں میں اک خوشگوار طوفان برپا ہو گیا۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی خوش بختی تھی کہ وہ باب جسے وہ اپنے طور پر بند سمجھ رہی تھی کھلا ہوا تھا۔ اس کا دل چاہا ہر مصلحت بھلا کر خوشی سے رقص کرے جھومے گائے۔

”کیسی ہیں آپ؟“ عباس کی نظریں اس پر تھیں اور وہ سرتاپا بگتی جا رہی تھی۔ خوش گمان خوش فہم اور سرشار مگر عباس نے اس کی خاموشی اور نظریں اٹھا کر نہ دیکھنے کو کچھ اور سمجھا اس لحاظ سے بولا تھا۔

”آپ کو اس ناراضی کا حق حاصل ہے۔ آف کورس اس وقت میں بہت مس بی ہو کر گیا تھا آپ سے۔“ وہ خفت زدہ انداز میں گویا تھا۔ نندنی نے گھبرا کر لمحہ بھر کو نظر اٹھائی مگر وہ کوئی وضاحت نہیں کر سکی۔ عباس حیدر کھدر کے لباس میں ملبوس تھا۔ نندنی کے دل نے بلا جھجک اعتراف کیا تھا کہ اس سے قبل کسی پر سفید رنگ اتنا جتنا ہوا کبھی نہیں دیکھا گیا ہوگا۔ اس نے یہ رنگ پہن کر گویا اس کی شان بڑھادی تھی۔

”اٹس اوکے۔“ اس کا لہجہ مدہم تھا اور جس کے لیے اتنی مہربانی ہوئی تھی وہ اپنی دلربائی سے آگاہ تک نہ تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کی ایک نظر عنایت ہوئی ہے اور سارے

گلے شکوے مدح نندنی کے آگے اپنی حیثیت کھو بیٹھے۔ ”مجھے آپ کی طبیعت بہتر نہیں لگتی، خیریت؟“ یہ اس کی نفیس انصاف پسندانہ سوچ کا ہی کمال تھا کہ اسے سر راہ رو برو پا کر وہ اس سے معذرت کیے بغیر نہیں رہ سکا مگر اب ذرا سا غور کرنے پر وہ اپنے حلیے اپنے چہرے کی ماند ہوئی چمک دمک سے جیسے برسوں کی مریض محسوس ہوئی تو اظہار تشویش کیسے نہ کرتا کہ وہ شگفتہ و نوخیز گلاب کی مانند نظر آتی لڑکی کا ایک جیسے خزاں کی زد پر آ چکی تھی جبکہ نندنی کا دل اس سوال کے جواب میں آنسوؤں کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ کیا بتانی وہ اسے عشق کی بیماری کسی خرابے سے کم تھی یا بھر و نارسائی کا احساس سرطان کی طرح رگوں کو گیدتا تھا۔ یہی تو سب سے بڑے عذاب تھے جان کے۔

”جی بس پچھلے دنوں طبیعت اپ سیٹ رہی آپ ٹھیک ہیں۔“ وہ چاہتی تھی تو اس سے بے نیازی نہیں برت سکتی تھی۔ اب تو پھر وہ اس کی طرف متوجہ تھا مہربان تھا۔

”الحمد للہ بالکل ٹھیک ٹھاک۔“ عباس کا لہجہ جواباً آسودگی اور خوش گواری لیے تھا۔ نندنی نے رشک آمیز نگاہ اس پر ڈالی اور بک شاپ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ عباس اس کے ہمراہ تھا۔ نندنی کو حیرانی نے آن لیا۔ ”مجھے آپ کی کچھ چیزیں لوٹنا تھیں۔ آپ وہ چیک اور جیولری وہیں ہونٹ میں چھوڑ گئی تھیں شکر ہے آپ سے ملاقات ہو گئی آپ ابھی اپنی فریڈ کے ہاں ہی مقیم ہیں نا؟“ عباس نے اب کے مقصد کی بات کی تھی۔ نندنی نے چونک کر اسے دیکھا۔

(میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ میرے نزدیک ان چیزوں کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں ہے سات سمندر پار کر کے میں جس کو ہر مقصد کی تلاش میں آئی تھی وہ مجھے کبھی نہیں مل سکتا۔ میری بد نصیبی طے شدہ ہے)

”آپ کو شاید یوں میرا ہر راہ ملنا پسند نہیں آ سکا۔“ عباس نے اس کی خاموشی اور گریز سے یہ ہی نتیجہ نکالا تھا۔ نندنی جیسے تڑپ کر بلبل کر رہ گئی۔ (اب میرے لیے کیا ہیں میں کبھی آپ کو نہیں بتا سکتی۔

کاش اے کاش زندگی نے حالات نے اور وقت نے میرے ساتھ یہ کھیل نہ کھیلا ہوتا میں اتنی نامراد نہ ٹھہری ہوتی) اس کی آنکھوں میں اتنی نمی اتری تھی جس نے گلے میں بھی آنسوؤں کا پھندا بنا دیا جسے بڑے ضبط سے حلق سے اتار کر وہ کسی نہ کسی طرح بولی تھی۔

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے آپ کو غلط محسوس ہوا۔“ جواب دینا ضروری تھا۔ نظر اندازی چاہے مجبوراً ہو گستاخی میں شمار ہوتی تھی۔ وہ گستاخی کی مرتکب کیسے ہو جاتی۔ اسے جانے کیا کچھ یا نا یا جو بیک وقت تکلیف و راحت کا سامان تھا۔

”مجھے آپ کی طبیعت ہرگز بہتر نہیں لگتی۔ آئیے میں ڈراپ کروں آپ کو۔“ بکس کا شاپر اٹھا کر وہ چلتی ہوئی پارکنگ لاٹ کی سمت آگئی تھی جب عباس نے اسے پیشکش کی نندنی نے ہونٹ بھیج کر کھولے۔

”سوری آپ کو زحمت نہیں دینا چاہتی اجازت دیجیے۔“ نندنی نے شائستگی سے انکار کر کے اسے الوداعی نظروں سے دیکھا۔ عباس کے تاثرات بدل گئے۔

”اوکے..... ایز یوش۔“ لہجہ بلا کا خشک اور کھردرا ہو چکا تھا نندنی کا دل بھاری ہونے لگا۔ روڈ پر آ کر اس نے ٹیکسی روکی اور خود کو پچھلی سیٹ پر گرادیا۔ عباس ہونٹ بھیجے گاڑی کا ٹاک کھولتا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر سر جھٹک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اس کے خیال میں اس نے اپنی زیادتی کا ازالہ کر دیا تھا۔



سر لا مکاں سے طلب ہوئی  
سوئے ملتھن وہ چلے نبی  
کوئی حد ہے ان کے عروج ہے  
بلغ العلا بکمالہ

نندنی کتابوں کا بنڈل اٹھائے سنگ مرمر کی چوڑی مریضیاں چڑھ کر مدرسہ کے ہال کمرے میں داخل ہوئی تو ٹیبلو پٹے کے ہالے میں نوخیز شگفتہ چہرے کی مالک کم عمر مہرہ اپنی خوش الحان آواز میں نعتیہ اشعار پڑھنے میں

مصروف تھی۔ نندنی کی توجہ اس کے الفاظ کی تاثیر نے کھنچی تھی حالانکہ آخر میں عربی زبان کا فقرہ اس کی سمجھ سے بالاتر رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ بے نیازی سے آگے نہیں بڑھ سکی اور بے اختیاری کی کیفیت میں وہیں کھڑی ہو کر پوری توجہ سے اسے سننے میں مصروف رہی۔ یہ بالکل غیر شعوری طور پر سرزد ہونے والا عمل تھا۔ جس کے متعلق اسے خود بھی پوری طرح آگاہی نہیں تھی۔ وہ سحر انگیز آواز رکھنے والی لڑکی پڑھ رہی تھی۔

رخ مصطفیٰ کی یہ روشنی  
یہ تجلیوں کی ہما بھی  
کہ ہر ایک چیز چمک اٹھی  
کشف الدجا بجمالہ

وہ لڑکی ایک جذب کی کیفیت میں جھومتی تھی۔ اس کے چہرے آنکھوں میں اتنا اطمینان اور آسودگی کی کیفیت تھی کہ نندنی گم صم ہو کر اسے تنگ چلی گئی۔ (کیا کوئی اتنا مطمئن اور سرشار بھی ہو سکتا ہے اگر ہو سکتا ہے تو کیسے؟) وہ حیران سی سوچے گئی۔

یہ کمال حق محمدی  
کہ ہر اک پہ چشم کرم رہی  
سر حشر نعرۂ امتی  
حسنت جمیع الخصالہ

زینب نے دور سے نندنی کی اک جھلک دیکھی تھی۔ جیسی سرخوشی کی کیفیت میں اٹھ کر اس کی جانب آئی مگر وہ جیسے کسی اور ہی جہاں میں گم لگی تھی۔ زینب نے ایک نگاہ دوسری نعتیہ اشعار پڑھتی صائمہ پر ڈالی اور دانستہ خود بھی خاموشی اختیار کیے رکھی۔ وہ نندنی کا ارتکاز توڑنا نہیں چاہتی تھی۔

بخدا ہے عشق محمدی  
میرا ذکر و فکر ہے بس یہی  
صلو علیہ والہ  
صلو علیہ والہ

صائمہ نے اشعار مکمل کیے اور اپنا سپارہ کھول لیا۔ اب وہ



ہل کر اپنا سبق دہرا رہی تھی۔ زینب نے نرم مسکان کے ساتھ نندی کو دیکھا وہ جیسے کسی ٹرائس سے باہر آ کر جھپٹی ہوئی لگ رہی تھی۔

”میرے کمرے میں آ جاؤ زینب کے انداز میں محبت تھی بولنے کے انداز میں بھی ہاتھ پکڑ کر گے بڑھ جانے کے انداز میں بھی کبھی نندی کو لگتا وہ سراپا محبت ہے۔ محبت کی مٹی سے گوندھ کر بنایا ہوا جو۔“

”میں نے سوچا انہیں ان کے اصل مقام تک پہنچاؤں۔“ نندی نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کتابوں کا بٹل اس کی جانب بڑھایا اور لکڑی مسکراہٹ سمیت کہا۔

”بہت اچھا کیا میری خواہش تھی تم یہاں ضرور آؤ۔“ زینب کے لہجے میں خلوص تھا نندی رواداری سے مسکرا دی۔ پھر نظر گھما کر اطراف کا جائزہ لیا۔

”عمارت تو بہت خوب صورت ہے مجھے پسند آئی۔“ زینب سادگی کے اس مظاہرے پر یکدم ہنس پڑی تو نندی حیرانی سے اسے تنکے لگی تھی۔

”تم بیٹھو میں تمہارے کھانے کو کچھ منگواتی ہوں۔“ زینب اسے کمرے میں چھوڑ کر چلی گئی۔ نندی اسے روکنا چاہتی تھی مگر زینب نے اسے موقع نہیں دیا۔

”اندھیروں میں رہنے والے روشنی میں جائیں تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور اگر روشنی میں رہنے والے اندھیروں میں آ جائیں تو ٹھوکر لگا کرتی ہیں۔ ماحول سے مانوس ہونے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔“ نندی سرسری انداز میں اس نشست گاہ کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب اک

نسوانی آواز اس کی سماعتوں میں اترنے لگی۔ موضوع والفاظ ایسے تھے کہ وہ یکدم پوری طرح متوجہ ہوئی۔

”میں نے پڑھا تھا کہ لوگ فریب کے نام پر لڑیں گے جھگڑیں گے حتیٰ کہ اس کے لیے جان تک دے دیں گے۔ مگر اس پر عمل نہیں کریں گے اور آج بد قسمتی سے یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ کیا قرآن پاک یہ کہتا ہے کہ جو کفر کی تاریکیوں سے نکل آئے اسے دھتکار دو۔ جو اللہ اور اس کے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر اپنے پیاروں کو چھوڑ آئے اسے دھتکار دو۔“ بآ سہرا کر دو؟

اسلام کا نام لے کر اپنے مفاد کے لیے کسی کا کبھی نہ پورا ہونے والا نقصان کر دو۔ کیا یہ انعام اسلام قبول کرنے والے کا؟ یہ صلہ ہے ان کی قربانی کا؟ کیا اسلام یہ کہتا ہے کہ صبح اٹھ کر نماز پڑھو اور بیٹیوں کو جنم دے کر چھوڑ دو؟ پھر یہ کیسے مسلمان ہیں جو رشتہ بھی توڑتے ہیں اور خود کو مسلم بھی کہلاتے ہیں۔ نیک اور پرہیزگار کہلاتے ہیں۔ مسلمانوں! ہوش کے ناخن لو حدیث کا مفہوم ہے جو رشتے توڑ دے وہ ہم میں سے نہیں سوچیں ہم کہاں جا رہے ہیں۔ صرف نماز روزہ حج زکوٰۃ میں دین مکمل نہیں ہو جاتا۔ ہمیں حقوق العباد بھی نبھانے ہوں گے۔ انسان کو اشرف المخلوقات ایسے ہی نہیں بنایا گیا کہ اسے ان تمام آزمائشوں سے گزار کر ہی اللہ نے پرہیزگاری کی سند سے فیض یاب کرنا ہے۔ اللہ پاک ہمیں اسلام میں پورے داخل ہونے کی توفیق عطا فرمائے صرف کچھ جزو کو اختیار کرنے سے دین مکمل نہیں ہو سکتا۔“ زینب اندرائی تو اس کے ہاتھ میں موجود چھوٹی ٹرے میں موجود گلاس میں اتار کا تازہ جوس تھا۔

”مجھے پتا ہے تم چائے دن میں بس اک بار پیتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر نندی کو گلاس پیش کیا۔ نندی نے ایک سپ لے کر سوچتی نظروں سے زینب کو دیکھا تھا پھر یکدم اسے مخاطب کر لیا۔

”مجھے اپنے اللہ کے بارے میں کچھ ایسا بتاؤ زینب جو دل کو بیڑھا دے سکے کہ جو وہ کر سکتا ہے وہ کوئی اور نہیں بلکہ تم کہتی ہو نا سب کچھ ہی کر سکتا ہے تمہارا اللہ۔“ اس کا اضطراب اس کے لہجے سے اس کے الفاظ سے عیاں تھا۔

زینب مسکرا دی۔

”بلاشبہ اللہ ہی کائنات کا خالق و مالک اور حقیقی بادشاہ ہے۔ اسی کے اختیار میں ساری خدائی ہے۔ یوں تو اللہ کی بے شمار صفات ہیں مگر اس کی ایک صفت جس کے متعلق میں تمہیں بتانے لگی ہوں وہ رزق پہنچانے کی قدرت ہے۔“

زینب نے پڑھا تھا کہ لوگ فریب کے نام پر لڑیں گے جھگڑیں گے حتیٰ کہ اس کے لیے جان تک دے دیں گے۔ مگر اس پر عمل نہیں کریں گے اور آج بد قسمتی سے یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ کیا قرآن پاک یہ کہتا ہے کہ جو کفر کی تاریکیوں سے نکل آئے اسے دھتکار دو۔ جو اللہ اور اس کے

”بلاشبہ اللہ ہی کائنات کا خالق و مالک اور حقیقی بادشاہ ہے۔ اسی کے اختیار میں ساری خدائی ہے۔ یوں تو اللہ کی بے شمار صفات ہیں مگر اس کی ایک صفت جس کے متعلق میں تمہیں بتانے لگی ہوں وہ رزق پہنچانے کی قدرت ہے۔“

زینب نے پڑھا تھا کہ لوگ فریب کے نام پر لڑیں گے جھگڑیں گے حتیٰ کہ اس کے لیے جان تک دے دیں گے۔ مگر اس پر عمل نہیں کریں گے اور آج بد قسمتی سے یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ کیا قرآن پاک یہ کہتا ہے کہ جو کفر کی تاریکیوں سے نکل آئے اسے دھتکار دو۔ جو اللہ اور اس کے

کی شان یہ ہے کہ وہ سمندر میں مچھلیوں کو رزق پہنچاتا ہے۔ کیا اس قادر مطلق کا ہی کمال و شان نہیں جو اس کام پر قدرت رکھتا ہو جو جانتا ہو جو علم رکھتا ہو اور واضح رہے سمندر میں صرف مچھلیاں نہیں ہے اور بھی آبی مخلوقات ہیں۔“ اس نے اپنی بات مکمل کر لی۔ اس کے ہونٹوں پر نفخ بھری مسکان تھی۔ نندی نے سوچا بھی تھا سمجھا بھی تھا جانا بھی تھا جیسی اس کے خدوخال میں ہیجان سادتا نے لگا۔

”تم سچ کہتی ہو زینب میں مان لوں گی اپنے اسی سب کچھ کر لینے کی قدرت رکھنے والے اللہ سے کہ وہ مجھے اس نقص کا ساتھ دے دے میں نہیں رہ سکتی اس کے بغیر آج پھر میں نے اسے دیکھا آج پھر میں نے جانا۔ میں ادھوری ہوں نا مکمل نا آسودہ میں کبھی اس اذیت سے نہیں نکل سکوں گی۔ اپنے اللہ سے کہو نا۔“ وہ ہسٹریک ہوتی اسے جھنجھوڑنے لگی۔ اس پر پوری طرح دیوانگی طاری ہو رہی تھی۔ زینب نے بے قراری سے اسے تھام لیا۔ اسے خود سے لگایا اور اس پر سورۃ اخلاص اور آیتہ الکرسی پڑھ کر پھونک ماری۔

”یہ کل کائنات اللہ کی ہی تخلیق کردہ ہے۔ ہمارا ایمان کمال ہے کہ خشکی و تری میں کوئی پتا بھی اللہ کے حکم کے بغیر نہیں کر سکتا۔ جس کو جو بھی ملتا ہے کم یا زیادہ وہ اللہ کی طرف سے ہی ملتا ہے میں اس سے دعا مانگوں گی۔ وہ دینے کی شان رکھتا ہے دیکھو یہاں میں اک بات ضرور واضح کرنا چاہوں گی۔“ زینب نے اس کے سسکتے بلکتے دھڑکے ہاتھوں کے گھیرے میں لیے کر نرمی و محبت سے

بجانا شروع کیا تھا۔ نندی جواب تک رو رو کر بڑھ حال ہو چکی تھی اور بھر بھری مٹی کی ڈھیر ہو چکی تھی نم پلکیں اٹھا کر خوفزدگی کے عالم میں اسے تنکے لگی۔

”وہ بادشاہ ہے مالک کل ہے بے نیاز، چاہے تو عطا کرے چاہے تو نہ کرے ہم اس کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے اس کے زیر فرمان زیر تابع اور عاجز جو ہیں اس نے

”وہ بادشاہ ہے مالک کل ہے بے نیاز، چاہے تو عطا کرے چاہے تو نہ کرے ہم اس کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے اس کے زیر فرمان زیر تابع اور عاجز جو ہیں اس نے

”وہ بادشاہ ہے مالک کل ہے بے نیاز، چاہے تو عطا کرے چاہے تو نہ کرے ہم اس کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے اس کے زیر فرمان زیر تابع اور عاجز جو ہیں اس نے

”وہ بادشاہ ہے مالک کل ہے بے نیاز، چاہے تو عطا کرے چاہے تو نہ کرے ہم اس کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے اس کے زیر فرمان زیر تابع اور عاجز جو ہیں اس نے

سے مانگنے سے منع فرمایا۔ ہمیں مانگنا تو اسی سے ہے مگر زبردستی کوئی نہیں میری دعا ہے خدا تمہیں دائمی سکون اور خوشی سرفراز فرمائے، آمین۔“ زینب نے اسی پرسکون انداز میں بات ختم کر دی وہ ساکن بیٹھی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ بے بسی بے قراری اس کے ہر انداز سے چھلک چھلک جاتی تھی۔

”آپ بہت نیک ہیں زینب پرہیزگار بھی میں نے سنا ہے ایسے لوگ اللہ سے بہت قریب ہوتے ہیں اللہ ان کی بات نہیں ٹالتا۔ میرے لیے دعا کریں زینب۔ میرے لیے اپنے اللہ کو منالیں اس سے مجھے عباس کو لے دیں میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جینے اور مرنے کے بیچ کی یہ تکلیف بہت شدید بہت جان لیوا ہے آپ اپنے اللہ سے کہو نا وہ میری اس اذیت کو ختم کر دے فارگاڈ سیک زینب۔ فارگاڈ سیک۔“ وہ دھیرے دھیرے حواس کھور ہی تھی۔ اس کی بلک

میں ذبح ہوتے جانور کی سی پھڑ پھڑاہٹ کا احساس اور کرنا کی تھی۔ نندی نے اسے سنبھالنا چاہا تھا مگر وہ کمزور دل کمزور اعصاب کی مالک لڑکی اس کے ہاتھوں سے بھر بھری مٹی کی مانند پھینسلتی جا رہی تھی۔ وہ بدحواس ہو کر رہ گئی۔

”سکندر.....“ بابا سائیں کی پکار پر سکندر جو کچھ فاصلے پر کھڑا پاپ لگائے پودوں کو سیراب کرنے میں مصروف تھا چونک کر متوجہ ہوا۔ بابا سائیں بے حد سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

سکندر نے ٹل بند کیا اور پاپ ایسے ہی چھوڑنا بخلت میں سبزے کی بازو پھلانگ ان کے عین سامنے آ گیا۔

”خیریت بابا سائیں آپ مجھے پریشان لگ رہے ہیں طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟“ انہوں نے جواب میں اسے کچھ دیر خاموش نظروں سے ایسے دیکھا جیسے اس کے چہرے اس کی آنکھوں سے کچھ پڑھنے کچھ اخذ کرنے کی کوشش میں ہوں۔ سکندر فطری طور پر کنفیوژ ہوا تھا۔ پہلا خیال ہی لاریب کی جانب گیا۔ (کہیں محترمہ وہ حماقت کر تو نہیں گزریں؟)

”لاریب کو وقاص کب سے اس طرح پریشان کر رہا ہے

”لاریب کو وقاص کب سے اس طرح پریشان کر رہا ہے

”لاریب کو وقاص کب سے اس طرح پریشان کر رہا ہے

”لاریب کو وقاص کب سے اس طرح پریشان کر رہا ہے



سکندر؟“ انہوں نے بے حد متفکرانہ انداز میں سوال کیا۔ سکندر بے ساختہ چونک اٹھا۔ جو معاملہ وہ سمجھا تھا وہ اگر نہیں بھی تھا تب بھی بات تو تشویش ناک ہی تھی۔ اس نے مضطرب نگاہ بابا سائیں کے گہیر چہرے پر ڈالی اور ہونٹ بھیج لیے۔

”میں پرسکون تو پہلے بھی نہیں تھا مگر اب تو جیسے راتوں کی نیندیں بھی حرام ہو گئی ہیں کس سے کہوں بھلا اللہ ہی رحم فرمانے والا ہے۔ بیٹے میں چاہتا ہوں لاریب کا جتنی جلدی ہو سکے عقد کروں۔“ بابا سائیں بے حد پریشانی و بے قراری کے عالم میں پیشانی مسل رہے تھے۔ سکندر لب بستہ کھڑا تھا۔

”آپ سمجھتے ہیں یہ مسئلہ کا حل ہے؟“ سکندر نے بلا آخر لب کشائی کی۔ وہ انہیں کیا بتاتا۔ اس مسئلے پر تو وہ بھی ان کے جیسی ہی بے قراری اور لاچار محسوس کرتا تھا۔ بس نہ چلتا تھا وقاص کو صفحہ ہستی سے مٹا دے یا پھر لاریب کو لے کر خود کہیں غائب ہو جائے۔

”ہاں بیٹے بالکل حل ہے۔“ بیاہتا عورت محفوظ بھی ہوتی ہے اور مضبوط بھی پھر وقاص کی نیچر سے اتنا تو میں بھی آگاہ ہوں۔ وہ شادی شدہ عورت میں دلچسپی نہیں رکھے گا۔“ نا چاہتے ہوئے بھی ان کا لہجہ زہرا لود ہو گیا تھا۔ سکندر اپنی جگہ جھلس کر رہ گیا۔ عصر کی اذان ہوئی تو بابا سائیں نماز کے لیے اٹھ گئے سکندر اتنا الجھا ہوا تھا کہ وہیں بیٹھا رہا۔

”تم کیا کر رہے ہو یہاں پوری حویلی میں ڈھونڈ لیا۔“ لاریب اچانک اس کے سر پر آ کر غرائی۔ سکندر نے اس شعلہ حوالہ بنی دشمن جاں کو سرخ نظروں سے دیکھا۔

”بابا سائیں کو وقاص کے حوالے سے فضول حرکت بتانے کی کیا ضرورت تھی آخر؟“ وہ جل کر بولا لاریب کی ہنوسیں تن گئی تھیں۔ چہرے سے ناگواریت کا واضح اظہار جھلکا۔

”دماغ ٹھیک ہے میں کیوں بتانے لگی۔“ وہ بد مزاجی سے ترخ کر رہ گئی۔

”پھر انہیں کیا از خود الہام ہو گیا؟“ جواباً سکندر کا لہجہ طنز سمیٹ لایا۔ بے حد جھنجھلا رہا تھا وہ۔ لاریب نے اس بد مزاجی پر اسے محض گھورنے پر اکتفا کیا۔ یہ ضرور تھا کہ اس کی آنکھیں اس انکشاف کے بعد اضطراب سمیٹ لائی تھیں۔ وہ کم مہم کسی خیال میں کم ہونے لگی تھی۔

”بابا سائیں آپ کی شادی کا فیصلہ کر چکے ہیں ان کا خیال ہے کہ اس طرح آپ کی عزت محفوظ ہو سکتی ہے۔“ سکندر بہت دھیان سے اسے نکلتا ہوا گویا آگاہ کر رہا تھا۔ لاریب نے بے طرح چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تفلر اور بے کھلی یکدم دہائی تھی۔

”میں پھر تم سے کہوں گی سکندر خاموشی کے ساتھ درمیان سے ہٹ جاؤ۔ یہی بہتر ہے تمہارے لیے۔“ خاصی تاخیر سے بولی تھی تو اس کا لہجہ بھی اس بیجان اور بے قراری کی زد پر آ چکا تھا مگر اس کا مطالبہ ایسا ضرور تھا جو سکندر کو آپ سے باہر کر کے رکھ سکتا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اس کے مقابل آ کر کینہ توز نظروں سے اسے گھورتا پھنکارتی ہوئی آواز میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔

”یعنی بزدلی پر افسار رہی ہیں مجھے میں ایک مرد ہوں یہ حرکت زیب نہیں دیتی مجھے سمجھیں آپ اور اختیارات کو ختم کرنے کے بجائے میں ان کا دائرہ بڑھا بھی تو سکتا ہوں۔“ محترمہ آپ کی شادی کے لیے مرد کی ضرورت ہے نہ؟ الحمد للہ ہر لحاظ سے مکمل ہوں۔ آپ نے خود سلیکٹ کیا تھا مجھے وہ بھی زبردستی یاد کریں۔“ اس کا انداز قہر آمیز تھا۔ لاریب نے اپنے اندر اذیت اور بے بسی کو اترتے محسوس کیا تو سرد آہ بھر کر چہرے کا رخ پھیر گئی۔

”تمہارے منہ میں نہیں لگنا چاہتی۔“ وہ تلخی سے کہتی وہاں سے چلی گئی مگر تب سکندر کے گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ سابقہ جذباتیت و انتہا پسندی کے بعد اب وہ اس قسم کی بھی حماقت کر گزرے گی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ لاریب واقعی اس جھنجٹ سے نجات چاہتی تھی جیسی اس نے دل کڑا کیا تھا اور رات اس وقت ان کے کمرے میں

چلی آئی تھی بابا سائیں نماز کی فراغت کے بعد سونے کی تیاری میں تھے اسے دیکھ کر حیران ضرور ہوئے البتہ مسکرا کر اس کا استقبال کیا تھا۔

”آؤ بیٹے بیٹھو۔“ لاریب بے حد زور سے جیسی ٹانگوں کی لرزش پر قابو کی غرض سے فوری طور پر نشست سنبھال لی اس کے باوجود اس کی ٹانگوں کی لرزش نہیں تھکی۔ وہ تخت پاتختہ کا عزم لے کر ضرور آئی تھی مگر اسے یہ بھی یاد تھا جب ایمان کی وہ بے وقوفی ان پر کھلی تھی تو بابا سائیں زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا ہو گئے تھے ایسا اب بھی ہو سکتا تھا خدا نخواستہ مگر لاریب کے پاس اب اس کے علاوہ کوئی اور راستہ رہ بھی نہیں گیا تھا۔ اسے آج نہ سہی کبھی نہ کبھی یہ کڑوا گھونٹ بھرنا ہی تھا۔ اس وقت کا جو کتنا ہی کڑا سہی سامنا کرنا تھا۔ اپنے طور پر اس نے سکندر پر ہر طرح دباؤ ڈال کر دیکھ لیا اور جواباً اس کی بے لگاری بد معاشی نے ہی درحقیقت اسے اتنا زچ کر دیا تھا کہ وہ یہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ یہ خیال ہی دل میں آگ لگاتا تھا کہ سکندر فتح حاصل کرے گا۔ وہ اسے کسی قیمت پر بھی خود سے جیتنے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”بابا جان مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ پلیز میری بات کو ذرا تحمل سے سنے گا اور یہ پہلو ہرگز نظر انداز نہ کیجئے کہ اگر مجھ سے نادانی ہوئی ہے تو وہ میری کچی عمر کی غلطی تھی آپ یہ سوچ کر مجھے معاف کر دیجیے گا پلیز کہ غلطی انسانوں سے ہی ہوا کرتی ہے۔ بابا جان یہ بھی یاد رکھیے گا کہ پہلی غلطی پر اگر معافی نہ ملے تو غلطی کرنے والا سنبھلنے کے بجائے گرنے والوں اور شدید نقصان اٹھانے والوں میں شمار ہو سکتا ہے۔“ خاصی دیر تک حوصلے اور الفاظ مجتمع کرتے رہنے کے بعد اس نے بلا خرمہید باندھی تھی تو اس کی آواز پر رقت طاری ہوتی چلی گئی۔ بابا سائیں تسبیح کے دانے گراتے مشفقانہ نظروں سے اسے دیکھتے رہے پھر مسکرا کر محبت سے اس کا سر تھپکا۔

”میری بیٹی اتنی سمجھ دار ہے کہ اس سے غلطی نہیں ہو سکتی مجھے یقین ہے۔“ انہوں نے اس محبت سے گویا اس کا حوصلہ

اس کا دل بڑھایا تھا لاریب کے وجود پر جیسے کسی نے چابک سے ضرب لگائی تھی۔ اس کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئیں۔ اس محبت اس اعتماد پر۔

”نہیں بابا جان ایسا ہو چکا ہے میں نے کہا نا میں تب بہت نادان تھی۔ اچھے بھلے کی کمیز سے ماورا۔“ اس نے شد و مد سے اپنی بات پر زور دیا اور پلکوں کی روشنی بارڈھ پھلانگ کر گالوں پر اتر آنے والے نسوؤں کو اس ناراضی کے عالم میں پونچھ کر صاف کیا۔ بابا سائیں محض مسکرائے پھر سر کو اثبات میں ہلانے لگے۔ گویا اس کی بات سے اتفاق نہ رکھتے ہوئے بھی تسلیم کر لیا ہو۔

”آپ بولو بیٹے یہ تو میں سننے کے بعد فیصلہ کروں گا درحقیقت آپ سے غلطی ہوئی بھی ہے یا نہیں۔“ ان کی مسکراہٹ ویسی ہی تھی مطمئن اور پر شفقت لاریب کا دل غم سے بوجھل ہونے لگا۔ (یا اللہ میرے بابا جان کو بلند حوصلہ ہمت اور صحت و زندگی عطا فرما میری اس ہرٹ کر دینے والی بات پر انہیں کم سے کم تکلیف سے دوچار کرنا آئین)

اس نے دل ہی دل میں گڑ گڑا کر اپنے مالک کل سے التجا کی تھی بابا سائیں کچھ حیران اور سوالیہ نظروں سے اس کے تذبذب کو دیکھ رہے تھے۔ لاریب کا سر بھرمانہ انداز میں جھک گیا۔ وہ پھنسی ہوئی آواز میں کہنا شروع ہوئی تو اسے دیکھ کر لگتا تھا وہ ضبط اور اذیت کے کڑے مراحل سے گزر رہی ہے۔

”جب عباس نے شہر جا کر شادی کر لی تو میں بہت زیادہ ہرٹ ہوئی تھی بابا جان۔ میں اس سے غیر معمولی حد تک احتجاج تھی اس باعث شدید دھچکا مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور..... اور میں نے ضد انتقام اور نفرت کی انتہا کو چھوتے محض عباس پر کچھ ثابت کرنے کی اندھی خواہش میں خود بھی یہ قدم اٹھا لیا۔ بابا جان میں نادان تھی پاگل اور بے وقوف ہی تھی کہ بنا سوچے سمجھے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ برباد تو میں نے ہی کیا خود کو۔ وہ تو ہمیشہ میری اس بربادی سے بھی غافل رہے گا۔ اپنی خوشیوں میں مگن جس کے لیے میرا وجود بے معنی تھا



میرے احساسات و جذبات بے مایہ تھے۔ اس کے لیے میرا فیصلہ میری بربادی کیسے قابل توجہ ہو سکتی ہے۔ وہ سسک تو رہی تھی یکدم پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس کا گم آج بھی تازہ تھا۔ اس کی تکلیف آج بھی ناقابل برداشت تھی۔ اس کی کسک اس کی بے چینی اسے آج بھی حواسوں سے ماورا کر دیتی تھی۔ بابا سائیں پتھر کے بت کی طرح ساکن بیٹھے اسے تڑپتے بلکتے دیکھتے رہے۔ خاصی تاخیر سے لاریب نے خود ہی ذرا سا سنبھالا اور پھر سے کہنا شروع ہوئی۔ یوں لگتا تھا آج وہ دل کا ہر بوجھ اتار دینا چاہتی ہو۔

”مجھے معاف کر دیں بابا جان۔ میں نے آپ کو دھوکہ دیا میں نے خود اپنے ساتھ ظلم کیا۔ مجھے اعتراف ہے مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں آپ کی مجرم بھی میں آپ کے سامنے اپنا جرم ظاہر بھی کرنا چاہتی تھی۔ مگر حالت کے بدلتے رخ نے مجھے بزدل بنادیا مگر بابا جان میں.....!“

”کون ہے وہ..... جس کے ساتھ تم نے نکاح کیا؟“ پتھر کا بت تڑخا تھا اس میں دراڑیں پڑ گئیں۔ پھر وہ ریزہ ریزہ بکھرتا چلا گیا۔ ان کی آواز بھی ان کے وجود کی طرح شکستہ تھی۔ لہجے سے نونے اعتماد اور بے یقینی کی اذیت چھلکتی تھی لاریب کی جھکی نظروں پر جیسے ٹنوں کے حساب سے شرمندگی کا بوجھ آ کر گرا۔ اس نے خود کو آبلہ پا پھر دیکھتے کوکلوں پر کھڑے پایا۔

”سکندر..... بابا جان میں نے بارہا اس سے طلاق کا مطالبہ کیا مگر وہ گھٹیا انسان.....!“

”لاریب آپ جائیں اپنے کمرے میں۔“ بابا سائیں جیسے یکدم ڈھے گئے تھے۔ انہوں نے یوں اس کی بات کاٹ دی جیسے مزید کچھ سننا نہ چاہتے ہو۔ ان کے بوڑھے غم زدہ چہرے پر اس مختصر دوری میں اذیت و کرب کے اتنے رنگ اترے تھے جنہیں حساب میں لانا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ لاریب نے ہم کر خانف نظروں سے انہیں دیکھا۔

”بابا جان مم..... میں.....!“

”یہاں سے جاؤ لاریب..... فی الحال مجھے تنہا چھوڑ

دو۔“ ان کی آواز گھٹی ہوئی اور سرد تھی۔ لاریب کو ان کے مبہم تیوروں سے خوف آنے لگا۔ وہ ان سے ان کی طبیعت کے متعلق سوال کرنا چاہتی تھی مگر حوصلہ نہیں ہو سکا۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان کے حکم کی تعمیل میں کمرے سے نکل جائے۔

(میں نے اپنی زندگی میں خود سے صرف اک بار شکست تسلیم کی ہے سکندر حیات اور وہ آخری شکست عباس کے حوالے سے تھی۔ تم بھول جانا کبھی میں تمہارے سامنے کھٹنے ٹیکوں گی۔ اگر میرے خواب چکنا چور ہوئے ہیں تو تم کیسے خوش رہ سکتے ہو۔ مجھے اپنانے کا سوچ رہے تھے تمہاری اتنی اوقات تھی نہ ہی حیثیت میری غلطی کو میری مستقل سزا بنانا چاہتے تھے۔ میں نے اس ناسور کا خاتمہ کر ڈالا) وہ بے حد مطمئن تھی یہ جانے بغیر کتا سندھ کیا ہوتا ہے۔

”تیار ہو تم؟“ عباس نے میگزین بند کر کے عریشہ کی جانب توجہ کی جو بلیک ساڑھی میں اس کے سامنے تھی اور گویا اس کے حواسوں پر چھانے لگی تھی۔ بڑی مشکل سے منت سماجت کے بعد وہ اس کا موڈ بحال کر پایا تھا۔ وہ بھی اس وعدے کے ساتھ کہ کل وہ خود حویلی جا کر بابا اور اماں جان سے معافی مانگ کر صلح کی بات کرے گا عریشہ کی خاطر وہ کچھ بھی کر سکتا تھا کر چکا تھا تو یہ کیوں نہیں۔

”اسامہ کو لے لیں ساتھ طبیعت کچھ بہتر نہیں اس کی۔“ عریشہ کے کہنے پر عباس نے فی الفور سر کوئی میں ہلا دیا۔ ”نہیں یار ہم جلدی واپس آ جائیں گے ڈنٹ وری“ اس کے صاف منع کرنے کے باعث ہی عریشہ اٹھلا کر بٹسنے لگی تھی۔

”سیدھی طرح کہہ دیں صرف میرے ساتھ جانا چاہتے ہیں۔ ویسے اطلاع عرض ہے وہ آپ کا بیٹا ہے جناب۔“ ”تم تو اچھی خاصی سمجھ دار ہو بھلے بیٹا ہو مگر اسے بھی کباب میں ہڈی نہیں بننا چاہیے میں آج صرف اپنی بیوی کی کمپنی کو انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کے چمک کر کہنے پر

عریشہ بے تحاشا ہنس پڑی اور عباس جیسے اس کی ہنسی کی جھنکار میں گم ہونے لگا تھا۔ یہی بے خودی کا عالم گاڑی ڈرائیور کرتے ہوئے بھی رہا تو عریشہ نے ٹوکنا ضرور سمجھا۔

”اتنا ردیفنگ ہونے کی ضرورت نہیں فی الحال دھیان سے ڈرائیور کریں۔“ جس بل عباس نے اسٹیرنگ پر دھرا ہاتھ اٹھا کر اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر ہونٹوں سے چھوا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اس کا دھیان سامنے سے چوکا تھا۔ یہی غلطی تھی جس کا نتیجہ سامنے آ گیا تھا شراب کے نشے میں دھست ٹرک ڈرائیور بریک لگانے کی کوشش میں بری طرح سے ناکام ہوا۔ ٹرک کار کو روندنا چلا گیا۔ ایک قیامت خیز دھماکا ہوا جس کی آواز سے فضا میں اڑتے طائر ٹھٹھک گئے۔ ماحول میں انسانی چیخوں کی کرناک دہشت بھری آواز کچھ دیر گونجی پھر ہر سموت کا سناٹا پھیل گیا۔

اس کی نیند بہت بے سکونی اور بے قراری لیے ہوئے تھی۔ اس بات کی کچھ فاصلے پر موجود تنبیج پر ڈھتی زینب بھی گواہ تھی۔ اس کی طبیعت کی خرابی کے باعث زینب نے معمولی غذا زبردستی کھلانے کے بعد دوادے کر سلایا تھا اور خود عشاء کی نماز میں مشغول ہو گئی۔ عبد اللہ بھی سوچکا تھا۔ زینب نے نماز کی ادائیگی کی پھر سبج لے کر بستر پر آ گئی۔ عبد اللہ کے ریشمی بال پیار سے سہلاتے ہوئے اس کی توجہ بار بار بھٹک کر نندنی پر جاتی تھی۔ لانی پلوں والی غلافی آنکھوں کے بوجھل پونے لڑتے تھے۔ معاوہ نیند سے ہر اس زدہ چیخ کے ساتھ بیدار ہوئی تو زینب کو تنبیج چھوڑ کر اس کی جانب بھاگنا پڑا۔ نندنی کا سانس دھونکی کی مانند چلتا تھا تو آنکھوں اور چہرے پر وحشت و سراسمگی کا ایسا تاثر کہ زینب بھی پریشان نظر آنے لگی۔

”نندنی، کیا ہوا گڑیا، خیریت؟“ اس کے خزاں زدہ پتے کی مانند لڑتے کانپتے وحشت چھلکاتے وجود کو زینب نے اس وقت بانہوں میں زبردستی سمیٹا تھا جب وہ ننگے سر ننگے پیر اٹھ کر حواس باختہ سی دروازے کی جانب بھاگی تھی۔

”تم خواب میں ڈر گئی ہو نندنی..... ریلیکس۔“ اسے خود سے لپٹ کر زار و قطار روتے پاکر زینب نے اس کی ڈھارس بندھانی چاہی۔ نندنی نے آنسوؤں سے جل تھل آنکھوں کے ساتھ اک نظر زینب کو دیکھا اور بے اختیار بلک پڑی۔

”ساحر کہاں ہے زینب..... ساحر ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے زینب مجھے اس کے پاس لے چلو ابھی۔“ عجیب مطالبہ ہوا تھا۔ اس پر اس کی غیر ہونی حالت زینب چکر اکر رہ گئی جیسے سوچ سمجھ ساتھ چھوڑ جائے۔

”تم نے ساحر کے متعلق کوئی برا خواب دیکھا ہوگا نندنی، خود کو سنبھالو پلیز۔“ زینب نے ہاتھوں سے نکلتی نندنی کو زبردستی خود سے لگا کر تھپکا جس کی وحشتوں اور سراسمگی کا کوئی انت ہی نہیں تھا۔ زینب کی اس تسلی پر بجائے سنبھلنے کے وہ بے تحاشا غصے میں آ کر ہڈیانی انداز میں چلانے لگی۔

”آپ مجھے لے کر جا نہیں چاہتی تو ٹھیک ہے میں خود چلی جاتی ہوں۔ مجھے پتا ہے ساحر کے گھر کا۔ مجھے یقین ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بہت تکلیف میں ہے میں جانتی ہوں۔ غیض و تنفر کی جگہ پھر سے بے چارگی اور بے بسی و کرب نے لے لی وہ پہلے سے بھی بڑھ کر شدتوں سے اور اونچی آواز میں روئی تھی۔ زینب نے گھبرا کر اسے پھر سے پکڑ کر خود سے بھینچا۔

”اس وقت اکیلی کہاں جاؤں گی نندنی۔ تمہیں رستوں کی بھی پہچان نہیں ہے سوٹ ہارٹ پلیز سنو میری بات تم ایسا کر ڈو ساحر کو کال کرو نمبر ہے نا تمہارے پاس اس طرح بغیر بتائے کسی کے گھر جانا وہ بھی اتنی رات کو کچھ مناسب نہیں لگتا۔“ زینب نے اسے نرمی اور لجاجت سے سمجھایا تھا نندنی متوحش نظروں سے کچھ دیر اسے تنگ رہی پھر لپک کر آگے بڑھی اور بستر کے سرہانے پڑا سیل فون جھپٹ کر اٹھا لیا۔ عباس کا نمبر سرچ کرتے اسے ڈال کرتے اس کا وجود ہی نہیں اس کی انگلیاں بھی کپکپا رہی تھیں۔ گھبراہٹ اور دہشت کے احساس سے مغلوب ہوتی حیات کو با مشکل سنبھالے وہ بار بار اس کا نمبر ٹرائی کرتی تھی۔ جس کی ٹھنٹیاں



بجی تھیں مگر کال ریسیونہ ہوتی تھی۔ نیل کا بچنا زندگی تھی امید تھی مگر نیل کا بچ کر بند ہو جانا اضطراب اور عذاب تھا۔ ہوالیہ نشان تھا۔ وہ ہجان زدہ کیفیت کے زیر اثر دیوانگی کے عالم میں بار بار نمبر ملائے گئی۔ اس کے دل میں ہر سو خوف و ہراس کا راج تھا اسے لگتا تھا اس پاگل کر دینے والی صورتحال میں وہ ہر گز بھی حواس بحال نہ رکھ پائے گی۔ عباس کا کال ریسیونہ کرنا ہی اس کے واہیات کو مزید جگہ دے رہا تھا۔ وہ جیسا بھی ہے ٹھیک ہو بھلے وہ میرا نہ ہو مگر سلامت رہے وہ کتنا ترپ ترپ کر سوچے گی۔

”ہے..... ہیلو ساحر..... کہاں ہیں آپ؟ خیریت سے ہیں نا پلیز مجھے بتائیں آپ ٹھیک ہیں؟“ معاذ ینب نے اس کے چہرے پر ڈولتی وحشت میں اس کا ایک ننھا جگنو چمکتا دیکھا مگر یہ ایک لمحے کی ہی بات تھی۔ اگلے پل وہ سفید لٹھے کی طرح بے رنگ ہوتی چلی گئی تھی۔ یوں جیسے پتھر اگئی ہو۔

”نندی.....!“ زینب ہس کی حالت سے ہی تشویش میں مبتلا ہو کر چیخی اور ایک کبر اس کی جانب بھاگی آئی مگر وہ ریلی دیوار کی طرح اس کے بازوؤں میں بکھرتی چلی گئی تھی۔



انہوں نے زاویہ بدل کر اپنی ہمتوں کو مجتمع کیا اور اٹھ کر آہستگی سے بیٹھ گئے۔ سینے میں شدید درد تھا۔ فضا سے جیسے آکسیجن کھینچ لی گئی تھی۔ کیسا احساس تھا گھٹن میں مبتلا کر دینے والا وحشت کے صحراؤں میں بھٹکا دینے والا ایمان کے بعد امامہ اور اب لاریب بھی۔ ان کا دل چاہا وہ بلند آواز سے روئیں۔ اتنا کہ کچھ تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

”یا اللہ ان آزمائشوں میں مجھے سرخروئی عطا فرما انصاف کے ساتھ اپنی رضا کے ساتھ۔“ ان کا آنسوؤں کے سمندر میں ڈولتا دل رب کے حضور پیش ہو کر گزر گزرا نے لگا نہیں یاد تھا ایمان کے بعد جب لاریب کی پیدائش ہوئی تو ان کی شریک حیات کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر کر چمک گئی تھی۔

”کیا ہوا حاجرہ! آپ اس طرح کیوں روئیں؟“ انہوں

نے کتنی حیرانی سے استفسار کیا تھا۔

”مجھے دکھ ہے میں آپ کو بیٹے کی خوشی نہیں دے پائی۔ جانتی ہوں بیٹا باپ کے لیے کسی طاقت مضبوطی اور سہارے کی حیثیت و اہمیت کا حامل ہوا کرتا ہے۔“ تب انہوں نے لاریب کی پیشانی چوم کر حاجرہ بیگم کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ بے حد نرمی و محبت سے رکھ دیا تھا۔

”ہماری اماں اللہ بخشے کہا کرتی تھیں اولاد مرد کے نصیب سے ملا کرتی ہے۔ یہ میرا نصیب ہے حاجرہ اور رب کی رحمتیں۔ میں ان سے شاک یا پھر بے زار کیسے ہو سکتا ہوں۔ میری بس یہ خواہش ہے کہ ہم ان کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ان کے فرائض و حقوق سے بخیر و خوبی سبکدوش ہو جائیں۔ اللہ ان کے نصیب اچھے کرے۔ اللہ سے بیٹا چاہیے آپ کو تو وہ بھی مل جائے گا۔ یہ بیٹیاں بھی ہماری شہزادیاں ہماری کائنات ہیں۔“ تب یہ بات انہوں نے مسکرا کر اور بھرپور آسودگی کے ساتھ پورے یقین سے کہی تھی۔ ماضی میں کئی بات اور لہجے کی بازگشت کی گونج ان کی سماعتوں میں پھر سے اتری تو پلکوں پر موجود آنسو بے تابی سے ٹوٹ کر گریبان میں گم ہونے لگے۔

(مجھے معاف فرما دے میرے مالک میں تیرا گناہ گار بندہ ہوں اس مشکل وقت میں مجھے اپنے پاس سے درست فیصلے کی طاقت و ہمت اور فہم عطا فرما آمین) آدھی رات کا وقت تھا جب وہ جائے نماز پر کھڑے ہو کر نماز استخارہ ادا کرنے میں مشغول تھے۔ زندگی کے اس عجیب موڑ پر آ کر جب ان کی ساری ذہنی صلاحیتیں بے کار ہو گئی تھیں۔ وہ اپنے رب سے مشورہ کی سعادت حاصل کرنے اس کے دربار میں حاضر ہو چکے تھے۔



لاریب نے ساری رات جیسے کانٹوں پر بسر کی تھی۔ مجال ہے جو پلک بھی چھپکی ہو۔ بے قراری کا عالم یہ تھا کہ بستر سے اٹھ کر کمرے میں چکرانے لگتی تھی۔ تقریباً آدھی رات کو اس نے دروازہ کھولا اور قدم باہر رکھ دیا۔ راہداری خاموش

سنسان تھی۔ دور کہیں سے چوکیدار کی مدہم سیٹی کی آواز کے ساتھ گیدڑوں اور جھینگڑوں کی آوازیں رات کے مخصوص ماحول کا تاثر قائم کیے تھی۔ لاریب کا دل ذرا سا سہا مگر اگلے لمحے وہ تارل تھی۔ اس کا رخ بابا سائیں کے کمرے کی جانب تھا اس وقت تک وہ لازمی بستر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ وہ برسوں سے انہیں باقاعدہ تہجد کی ادائیگی کرتے دیکھ رہی تھی۔ راہداری کا موڑ مڑتے اسے قدموں کی چاپ ہتھوڑوں کی مانند اعصاب پر برستی محسوس ہوئی تو کچھ سوچ کر جوتے وہیں اتار دیے۔ بابا سائیں کے کمرے کے دروازے کی چکی درز سے روشنی پھوٹ کر باہر آ رہی تھی۔ اس کا دل ذرا سا سنجھل گیا تاب گھما کر دروازہ دھکیلا حلق پریشانی اور خوف کے باعث سوکھا جا رہا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے ذرا سی گردن اندر گھما کر کمرے کا جائزہ لیا۔ بابا سائیں جائے نماز پر حالت رکوع میں کھڑے تھے۔ سفید داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ یہاں تک کہ آنسو قطرہ قطرہ ٹپک کر جائے نماز پر گرتے لاریب نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اس کا دل یکدم جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ ڈالا۔

(میں خود کو کیسے معاف کروں گی بابا جان آپ کی اذیت کا خیال اب شاید مجھے کبھی کھل کر سکھ کی سانس بھی نہیں لینے دے گا) اس نے اسی آہستگی سے دروازہ بھیڑا اور پلٹ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وضو کر کے نماز پڑھی پھر قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہو گئی۔ اس کے بعد حسب معمول لان میں چہل قدمی کے خیال سے باہر آئی تھی مگر کچن کے آگے سے گزرتے ہوئے اسے سکندر کی جھلک نظر آئی تھی۔ اس کے قدم بے اختیار تھم گئے۔ کچھ سوچا پھر باورچی خانے کی چوکھٹ پر آن کھڑی ہوئی۔ سکندر بہت گن انداز میں چائے بنانا نظر آیا۔ کچھ فاصلے پر ملازمہ برتن مانجھ رہی تھی۔

”شیشا باہر جاؤ تم مجھے سکندر سے بات کرنی ہے۔“ لاریب کی سرد جلد اور ٹھہری ہوئی آواز سن کر ہی خود میں گن و مست سکندر نے چونکتے ہوئے گردن موڑی۔ نیلے بے حد اسٹاکش گرم سوٹ اور خوب صورت سی شال میں ملبوس اس

کی اجلی رنگت میں مگلا بوں کا سا عکس گھلا ہوا تھا۔ تیکھی کھڑی ناک اور پورے چہرے پر حکمرانی کرتی ہوئی دلنشین آنکھیں جن سے غرور جھلکتا رہتا تھا۔ وہ سر تا پا حسین تھی وہ سراپا قیامت تھی ملازمہ سب کچھ ادھورا چھوڑ کر حکم کی تعمیل میں نکل گئی۔

”بہت ہو چکی عیاشی اور بد معاشی اب تم یہاں سے چلنے کی تیاری پکڑو سمجھے؟“ اس کے لہجے میں نفرت بھی تھی اور حقارت بھی۔ سکندر نے چولہا بند کیا پھر اسے مڑ کر کینہ نواز نظروں سے دیکھتا ہوا ناگواری سے ٹوک کر بولا۔

”تمیز سے بھی بات کر سکتی ہیں آپ۔“ وہ بھڑکا تھا اور

لاریب تسخیر سے ہنستی چلی گئی۔

”میری مجبوری یہ ہے کہ سکندر حیات صاحب کہ میں مراتب و حیثیت کے مطابق اہمیت دینے کی قائل ہوں۔ جو جس رویے کا اہل ہوگا اسے وہی مل سکتا ہے۔“ اس کی حسین آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ سکندر نے ہونٹیں بھیجنے لیے لاریب کا یہ ہنک آمیز رویہ بھی کبھار اس کی برداشت اور ظرف سے بہت بڑھ کر ضبط پر مجبور کر دیا کرتا تھا یہ نیک چہرہ تیکھی بد مزاج لڑکی اپنی تمام تر محبت کی بے بسی سمیت بھی اسے آتش فشاں میں ڈھالے لگتی تھی۔

”بہت اکڑنے لگے تھے تم میری ایک غلطی کی وجہ سے اب میں تمہارے قدموں تلے سے زمین کھینچ رہی ہوں تم اپنے ٹھکانے یعنی پستیوں میں اترنے کو تیار ہو جاؤ۔“ وہ دل جلاتی مسکان سمیت کہہ رہی تھی۔ یہ وہ ہر گز لاریب نہیں تھی جو بابا سائیں کے سامنے سسک سسک کر اپنی غلطی کا اعتراف کر رہی تھی یہ وہ لاریب بھی نہیں تھی جو عباس کی رنجش اور بے وفائی کے زخم دل پر لیے بے اماں پھرتی اور روٹی ترپتی تھی۔ یہ وہ لاریب تھی جو اپنے سے کتر لوگوں کو حقیر سمجھتی اور انہیں ذلیل و خوار کرنے کا حق اپنے پاس محفوظ سمجھتی تھی۔ وہ خدا کو بھولے ہوئی تھی۔ جیسی بہت پرسکون انداز میں بہت بڑے بڑے فقرے کہتے اسے خدا سے ذرا سا بھی خوف محسوس نہیں ہو



رہا تھا۔ سکندر بچنے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ ان سنی کیے رخ پھیرے چائے چھان کرگ میں نکالتا رہا۔

”جاننا نہیں چاہو گے کیا کیا ہے میں نے؟“ لاریب کو سکندر کا سکون بد مزہ کر گیا تھا جیسی خار کھائے انداز میں تلملا کر اسے مخاطب کیا۔

”آپ کو اگر بتائے بغیر قرار نہیں ہے تو ٹھیک ہے کہیں میں سن رہا ہوں۔“ سکندر کے جواب نے اسے سنج پاتو کیا تھا مگر اسے اپنی نظروں کے سامنے ہارتادیکھنا چاہ رہی تھی۔

”رات میں نے بابا جان کو اپنی غلطی بتلا کر معافی کی درخواست بھی پیش کر دی ہے۔ اب ذرا سوچ سمجھ کر ان کے سامنے جانا عین ممکن ہے وہ تمہیں دیکھتے ہی اپنی گن کی ساری گولیاں تمہارے سینے میں اتار کر اس گستاخی کی معمولی سزا اور انجام سے دو چار کر دیں۔“ وہ حظ لینے والے انداز میں کہتی اس کے چہرے کو متبسم نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ رات

بابا سائیں کے سامنے اس نے اعتراف کیا تھا کہ تب وہ نادان تھی بے وقوف تھی حالانکہ حقیقت یہی تھی کہ وہ اب بھی نادان تھی بے وقوف بھی تھی اور جد سے زیادہ جذباتی تھی آج بھی وہ صحیح فیصلے کی قوت حاصل نہیں کر پائی تھی۔ وہ عیاس کو خود سے چھڑ جانے کے بعد جس بے حواسی کا شکار ہوئی تھی وہ اس پر آج بھی مسلط تھی۔

سکندر کی ساتتیس سائیں سائیں کرنے لگیں۔ بے جان ہوتے ہاتھ سے چائے کا گگ چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔ سنہری چائے اور گگ کی گرچیاں اک ساتھ ماربل کے فرش پر بکھر گئیں۔ گرم چائے کے کچھ چھینٹے اڑ کر سکندر کے کپڑوں پر گرے۔ مگر وہ اتنا شاکد تھا کہ فی الوقت ہر احساس سے دور لگ رہا تھا۔ لاریب کے لیے اس کا رد عمل غیر متوقع ہرگز نہیں تھا۔ مسکراہٹ دبا کر اس نے شوخ نظروں سے سکندر کے غم و

یاس میں ڈوبے چہرے کو دیکھا پھر اسے چونکا نے ہوش میں لانے کی غرض سے اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں کے آگے لہرایا اور گویا اس کا مضحکہ اڑا کر ہنسی۔

”اچھو کیوں بن گئے ہو ڈیر سکندر کم آن بی بریو موت کو

سا منہ دیکھ کر اتنا بھی نہیں سمجھتے۔“ وہ سراسر اس کا تسخیر اڑ رہی تھی۔ سکندر نے سرخ چہرے کے ساتھ شدید کرب کو سہتے سختی سے اپنا ہونٹ دانتوں سے کچلا۔ خوف و خدشات پانی کے ریلے کی مانند اس کے وجود میں اترتے جا رہے تھے۔

لاریب کا کم ظرف اطمینان گواہ تھا کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر اس حد تک جا چکی ہے جو کسی کے لیے زندگی موت کا کھیل بن سکتا تھا۔ اسے سب سے زیادہ بابا سائیں کی فکر لاحق ہوئی تھی۔ ایمان کی اسی حرکت پر وہ جس طرح حواس کھو گئے تھے اب ان پر کیا ہوتی ہوگی یہی سوچ اسے اپنی اذیت اور نقصان سے بے نیاز کرنے کو کافی تھی۔ وہ اندھا

دھند ان کے کمرے کی سمت بھاگا تھا مگر اپنی سوچ اور پسند کے مطابق سوچنے والی لاریب نے اس کی غفلت پر بوکھلا کر تیزی سے اس کا بازو اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔

”اب کہاں بھاگ رہے ہو بزدل انسان میں حساب کتاب کے بغیر تمہیں روپوش نہیں ہونے دوں گی سمجھے تم۔“ وہ چیخ پڑی اور چونکہ ہر صورت اسے روکنے کی متمنی تھی مگر سکندر کی طاقت کے آگے بے بس ہو کر وہ اپنی سعی کونا کامی سے بچانے کی کوشش کے جنون میں مبتلا ایک طرح سے اس دھکم پیل کے نتیجے میں اس سے چپک کر رہ گئی تھی۔ سکندر جھنجھلایا

ہوا تھا جیسی اس کا ہاتھ پکڑ کر جارحانہ انداز میں دور دھکیلتا ہوا تیزی سے باہر چلا گیا۔ لاریب اس دھکے کے نتیجے میں لڑکھڑا کر کچن کی سلیپ سے ٹکرائی تھی اس کی کمر کی ہڈی پر چوٹ بھی آئی جس کی اس بل اس نے قطعی پروا نہیں کی تھی اور گرتی پڑتی اس کے تعاقب میں باہر بھاگی آئی۔ مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی تھی کہ سکندر کا رخ بابا سائیں کے کمرے کی جانب ہی تھا۔ پھر اس کی متحیر آنکھوں نے

سکندر کو ان کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جاتے پایا تو وہیں تھم گئی۔ اس کے غصیلے اور تنے ہوئے چہرے پر دھیرے دھیرے اطمینان اور آسودگی اترتی چلی گئی۔ اس نے گہرا سانس بھرا اور قدموں کا رخ پھیر لیا۔ اب اسے کسی قسم کی فکر کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے بھرپور یقین تھا محض چند گھنٹوں

کا کچھ نہیں ہو چکا ہوگا۔

کے اندر اس کے حسب منشا فیصلہ ہو چکا ہوگا۔

.....

سکندر جتنی پریشانی اضطراب اور بے قراری و غفلت میں بابا سائیں کے کمرے میں آیا تھا انہیں اس قدر اطمینان سے ایزی چیئر پر براجمان پا کر کچھ اتنا بری طرح بدحواس ہوا تھا کہ کچھ اور نہ سوچا تو اسی تیزی سے واپسی کو مڑا تھا۔ ایک لمحے کو ایسے لگا لاریب اس کے ساتھ کوئی سنگین مذاق کر چکی ہے۔ عجیب سا خجالت آمیز احساس اس کے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔ جیسی خفیف سی جھنجھلاہٹ نے اس کے اعصاب کا احاطہ کر لیا تھا۔

”آ جاؤ سکندر..... واپس کیوں جا رہے ہو؟“ دروازہ کھول کر چوکھٹ پر پڑنے والا اس کا قدم بابا سائیں کی ٹھہری ہوئی پر رسان آواز پر ساکن رہ گیا۔ اسے فوری طور پر خود کو سنبھال کر بابا سائیں کے سامنے رہنا دشوار ترین کام لگا تھا۔

”مجھے لگا تم کچھ پریشان ہو خیریت ہے؟“ ان کا لہجہ و انداز ہنوز نرم تھا۔ سکندر نے گہرا سانس بھر کے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

”جی..... جی بالکل میں چائے لے کر آتا ہوں۔“ اس نے وقتی راہ فرار ڈھونڈی۔

”پہلے کیوں نہیں لے کر آئے اور اتنی گھبراہٹ کیوں تھی تمہارے چہرے پر سکندر۔“ اسے لگا بابا سائیں کی زیرک نگاہیں اسے اندر تک پڑھ رہی ہیں۔ جیسی وہ اپنے اوسان بحال نہیں رکھ سکا۔

”کچھ نہیں بابا سائیں بس ایسے ہی۔“ وہ بوکھلا سا گیا۔ اس کا اعتماد اس بل پوری طرح زائل ہو چکا تھا۔ جب بابا سائیں نے یونہی اس کے چہرے پر نگاہ جمائے اسے اشارے سے اپنے پاس آ کر بیٹھنے کا حکم دیا تھا۔ بھلا سکندر کے پاس اس کے سوا کیا چارہ تھا؟

”تمہیں پتا ہے تا سکندر میں لاریب کی وجہ سے کتنا پریشان ہوں۔“ ان کی نظریں ہنوز اس پر جمی تھیں اس پر موزوں بھی وہ جس سے وہ اس بل سب سے زیادہ کتر رہا

تھا سکندر کا رنگ متغیر ہونے لگا۔

”لاریب نے رات خود مجھے وہ بات بتادی تمہیں لگتا ہے سکندر کہ تمہیں یہ بات اتنا عرصہ مجھ سے چھپا کر رکھنی چاہیے تھی؟“ انہوں نے سوال کیا اور سکندر کو لگا کمرے کی چھت اس پر آن گری ہے۔ وہ آنکھیں پھیلائے انہیں تکتا رہ گیا۔ اس کے گمان تک میں یہ بات نہیں تھی۔ بابا سائیں اتنے پرسکون انداز میں اس سے باز پرس کریں گے۔ وہ تو لاریب کی بات کو محض مذاق پر محمول کر رہا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سر دلہراتری وہ لب بستہ سا کن بیٹھا رہ گیا۔

”لاریب کا کہنا ہے کہ یہ نادانی و جذباتیت میں سرزد ہونے والی غلطی تھی جس پر اسے ندامت بھی ہے اور پچھتاوا بھی۔ تمہاری ذاتی رائے اس معاملے میں کیا ہے میں یہ بھی جاننا چاہوں گا۔“ بابا سائیں کی آواز اس کے اعصاب پر جیسے ہتھوڑے کی مانند ہی ضرب کاری کر رہی تھی۔ یہ سب کچھ جتنا اچانک اور غیر متوقع تھا وہ مضبوط اعصاب رکھنے کے باوجود خود کو بری طرح شکستہ خائف اور پشیمان محسوس کر رہا تھا۔ اس پر ستم بابا سائیں کی جواب طلب انتظار نظریں۔ اسے خود کو سنبھال کر صورت حال کی گہیرا تا کو فیس کرتا ہی تھا۔ جیسی اس نے پہلے تھوک نکل کر حلق تر کیا پھر گلا کھنکھار کر خود کو بولنے کے قابل بنانے کے بعد جب گویا ہوا تو کچھ دیر قبل کی ساری عدم اعتمادی و تغیر سے نجات حاصل کر کے اپنے فطری سادہ مگر پر اعتماد اور مضبوط انداز میں واپس آ چکا تھا۔

”آپ کا شکوہ بجا ہے بابا سائیں میں بلاشبہ مجرم ہوں آپ کا اور ہر طرح کی سزا کا منتظر بھی اس سب کے باوجود میں خود کو آپ کا زیر بار اور احسان مند نہیں ملازم بھی سمجھتا ہوں۔ اس لیے آپ جو بھی سزا دیں گے میں پوری آمادگی اور خوشی سے اسے قبول کروں گا جہاں تک آپ کو نہ بتانے کا معاملہ ہے تو اللہ گواہ ہے میرے پیش نظر صرف آپ کو اس ذہنی شاک سے بچانا مقصود تھا دوسری اہم بات یہ ہے بابا سائیں کہ ساری غلطی سارا قصور میں لاریب بی بی پر نہیں ڈال سکتا مجھے اس جرم کے اعتراف میں زندگی کے

آپ کا شکوہ بجا ہے بابا سائیں میں بلاشبہ مجرم ہوں آپ کا اور ہر طرح کی سزا کا منتظر بھی اس سب کے باوجود میں خود کو آپ کا زیر بار اور احسان مند نہیں ملازم بھی سمجھتا ہوں۔ اس لیے آپ جو بھی سزا دیں گے میں پوری آمادگی اور خوشی سے اسے قبول کروں گا جہاں تک آپ کو نہ بتانے کا معاملہ ہے تو اللہ گواہ ہے میرے پیش نظر صرف آپ کو اس ذہنی شاک سے بچانا مقصود تھا دوسری اہم بات یہ ہے بابا سائیں کہ ساری غلطی سارا قصور میں لاریب بی بی پر نہیں ڈال سکتا مجھے اس جرم کے اعتراف میں زندگی کے

آپ کا شکوہ بجا ہے بابا سائیں میں بلاشبہ مجرم ہوں آپ کا اور ہر طرح کی سزا کا منتظر بھی اس سب کے باوجود میں خود کو آپ کا زیر بار اور احسان مند نہیں ملازم بھی سمجھتا ہوں۔ اس لیے آپ جو بھی سزا دیں گے میں پوری آمادگی اور خوشی سے اسے قبول کروں گا جہاں تک آپ کو نہ بتانے کا معاملہ ہے تو اللہ گواہ ہے میرے پیش نظر صرف آپ کو اس ذہنی شاک سے بچانا مقصود تھا دوسری اہم بات یہ ہے بابا سائیں کہ ساری غلطی سارا قصور میں لاریب بی بی پر نہیں ڈال سکتا مجھے اس جرم کے اعتراف میں زندگی کے

آپ کا شکوہ بجا ہے بابا سائیں میں بلاشبہ مجرم ہوں آپ کا اور ہر طرح کی سزا کا منتظر بھی اس سب کے باوجود میں خود کو آپ کا زیر بار اور احسان مند نہیں ملازم بھی سمجھتا ہوں۔ اس لیے آپ جو بھی سزا دیں گے میں پوری آمادگی اور خوشی سے اسے قبول کروں گا جہاں تک آپ کو نہ بتانے کا معاملہ ہے تو اللہ گواہ ہے میرے پیش نظر صرف آپ کو اس ذہنی شاک سے بچانا مقصود تھا دوسری اہم بات یہ ہے بابا سائیں کہ ساری غلطی سارا قصور میں لاریب بی بی پر نہیں ڈال سکتا مجھے اس جرم کے اعتراف میں زندگی کے

آپ کا شکوہ بجا ہے بابا سائیں میں بلاشبہ مجرم ہوں آپ کا اور ہر طرح کی سزا کا منتظر بھی اس سب کے باوجود میں خود کو آپ کا زیر بار اور احسان مند نہیں ملازم بھی سمجھتا ہوں۔ اس لیے آپ جو بھی سزا دیں گے میں پوری آمادگی اور خوشی سے اسے قبول کروں گا جہاں تک آپ کو نہ بتانے کا معاملہ ہے تو اللہ گواہ ہے میرے پیش نظر صرف آپ کو اس ذہنی شاک سے بچانا مقصود تھا دوسری اہم بات یہ ہے بابا سائیں کہ ساری غلطی سارا قصور میں لاریب بی بی پر نہیں ڈال سکتا مجھے اس جرم کے اعتراف میں زندگی کے

آپ کا شکوہ بجا ہے بابا سائیں میں بلاشبہ مجرم ہوں آپ کا اور ہر طرح کی سزا کا منتظر بھی اس سب کے باوجود میں خود کو آپ کا زیر بار اور احسان مند نہیں ملازم بھی سمجھتا ہوں۔ اس لیے آپ جو بھی سزا دیں گے میں پوری آمادگی اور خوشی سے اسے قبول کروں گا جہاں تک آپ کو نہ بتانے کا معاملہ ہے تو اللہ گواہ ہے میرے پیش نظر صرف آپ کو اس ذہنی شاک سے بچانا مقصود تھا دوسری اہم بات یہ ہے بابا سائیں کہ ساری غلطی سارا قصور میں لاریب بی بی پر نہیں ڈال سکتا مجھے اس جرم کے اعتراف میں زندگی کے

آپ کا شکوہ بجا ہے بابا سائیں میں بلاشبہ مجرم ہوں آپ کا اور ہر طرح کی سزا کا منتظر بھی اس سب کے باوجود میں خود کو آپ کا زیر بار اور احسان مند نہیں ملازم بھی سمجھتا ہوں۔ اس لیے آپ جو بھی سزا دیں گے میں پوری آمادگی اور خوشی سے اسے قبول کروں گا جہاں تک آپ کو نہ بتانے کا معاملہ ہے تو اللہ گواہ ہے میرے پیش نظر صرف آپ کو اس ذہنی شاک سے بچانا مقصود تھا دوسری اہم بات یہ ہے بابا سائیں کہ ساری غلطی سارا قصور میں لاریب بی بی پر نہیں ڈال سکتا مجھے اس جرم کے اعتراف میں زندگی کے

آپ کا شکوہ بجا ہے بابا سائیں میں بلاشبہ مجرم ہوں آپ کا اور ہر طرح کی سزا کا منتظر بھی اس سب کے باوجود میں خود کو آپ کا زیر بار اور احسان مند نہیں ملازم بھی سمجھتا ہوں۔ اس لیے آپ جو بھی سزا دیں گے میں پوری آمادگی اور خوشی سے اسے قبول کروں گا جہاں تک آپ کو نہ بتانے کا معاملہ ہے تو اللہ گواہ ہے میرے پیش نظر صرف آپ کو اس ذہنی شاک سے بچانا مقصود تھا دوسری اہم بات یہ ہے بابا سائیں کہ ساری غلطی سارا قصور میں لاریب بی بی پر نہیں ڈال سکتا مجھے اس جرم کے اعتراف میں زندگی کے



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ علامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### مجموعہ خاص کیوں نہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

بیٹی نے تو کبھی یہ اہمیت نہیں دی تھی (سکندر نے گلا کھنکھارا۔  
"پلیز بابا سائیں اس بات کو رہنے دیں میں خود کو اس قابل نہیں پاتا کہ خواہش کی جرأت بھی کر سکوں۔" اس کا سر ہنوز جھکا ہوا تھا اور چہرے پر عجیب تاثر بابا سائیں کے ہونٹوں پر جیسے مسکراہٹ کا شائبہ سا گزرا وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور اس کے مقابل آ کر کھڑے ہو گئے۔

"انسان کس قابل ہے یہ طے کرنا اس کا نہیں بلکہ اللہ کا کام ہے۔ مجھے یہ بتاؤ تم لاریب کی حفاظت کی خاطر کس حد تک جاسکتے ہو؟" عجیب سوال ہوا تھا اور اس سے زیادہ اور بھرپور فلسفیانہ خیالات کا شاندار اور پیارا اظہار سکندر نے حیرانی کا مظہر چہرہ اٹھا کر انہیں اچھی سے دیکھا۔  
"میں کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کرتا بابا سائیں مگر میری ہمیشہ کوشش رہی ہے انہیں جس حد تک ممکن ہو سکے خطرے سے بچاؤں باقی حفاظت کا اصل ذمہ دار تو اللہ کریم ہی ہے۔" وہ جتنا سنجیدہ نظر آ رہا تھا بابا سائیں کے چہرے پر اتنا ہی اطمینان اور فخر آ رہا تھا۔

"میں نے سوچا ہے سکندر لاریب کی ذمہ داری اور دیکھ بھال اپنے حصے سے نکال کر اب مستقل تمہیں سونپ دوں مگر یاد رکھنا سکندر یہ میرا تمہارا یا پھر لاریب کا نہیں اللہ کا فیصلہ ہے۔ جاؤ اپنے والدین کو اس فیصلے کی خوشی میں شریک کرو میری خواہش ہے یہ کام جلد پایہ تکمیل کو پہنچ جائے۔ ہاں یہ احتیاط ضروری ہے کہ نکاح کی سابقہ کارروائی ختم کر دی جائے۔ ہم تجدید نکاح کر لیں گے۔ لوگوں کی زبانیں بند رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے۔" سکندر شل اعصاب لیے ہونق کھڑا تھا جو کچھ سنا تھا وہ اتنا قابل یقین تھا کہ وہ کبھی تصور میں بھی نہیں لاسکا تھا۔ اس نے متحیر نظروں سے بابا سائیں کو دیکھا جو مطمئن تھے جبکہ سکندر کے چہرے پر آنکھوں میں بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔ وہ ٹکڑ ٹکڑ کی صورت دیکھتا رہا تھا۔

(جاری ہے)



اس مقام پر آ کر کوئی عار نہیں کہ میں ان کے لیے بہت عرصے سے ہی خصوصی جذبات رکھتا تھا۔ بابا سائیں مجھے اپنی حیثیت کبھی نہیں بھولی تھی۔ میں جذبوں کے آگے مجبور و بے بس ضرور تھا مگر خود کو کبھی ان بلند آہنی دیواروں کی قید سے نکلنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا جن میں میں نے اس انکشاف کے بعد خود کو محصور کر لیا تھا۔ لیکن بابا سائیں وہ کمزور لمحہ تھا جب لاریب بی بی کی نادانی نے جذباتیت کی انتہا پر جا کر مجھ سے وہ مطالبہ کیا میں چاہتا تو انکار بھی کر سکتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا تو اس کی وجہ یہی تھی شاید کہ میں خود کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ جس کیفیت میں لاریب بی بی تب تھیں اگر میں ان کی اس خواہش پر سر نہ جھکا تو شاید نہیں یقیناً حویلی کے حصے میں اس سے بڑھ کر نقصان آتا جس سے اب تک دو چار ہوا جا چکا ہے۔" وہ اپنی بات کہہ کر یکدم خاموش ہو گیا۔ یوں جیسے اعتراف گناہ کے بعد سزا کا منتظر ہو بابا سائیں نے ایک نظر اس کے ضبط کی کوشش میں بیٹھنے ہونٹوں کو دیکھا پھر متاسفانہ سانس بھری تھی۔  
"اب تم کیا چاہتے ہو سکندر؟" انہوں نے اس کا چہرہ ٹٹولا۔

"میں آپ کے فیصلے کا منتظر ہوں بابا سائیں آپ مجھے اپنا فرمانبردار یا نہیں گے۔"  
"اگر میں تمہیں کہوں لاریب کو طلاق دے دو یہ معاملہ جتنی رازداری اور خاموشی سے شروع ہوا تھا اسی خاموشی سے ختم کر دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔" سکندر کو ان سے سو فیصد یہی توقع تھی۔ اس کے باوجود اس کا دل پاتال میں ڈوبتا گیا۔ چہرے پر جوتار کی پھیلی وہ الگ۔  
"چاہتی تو لاریب بی بی بھی یہی ہیں مگر میں آپ کے حکم پر سر جھکا دوں گا۔"

"لاریب کو چھوڑ دو میں تمہاری مرضی جاننا چاہتا ہوں۔" انہوں نے بے حد غصے میں آ کر ڈانٹا۔ سکندر چند لمحوں کو ساکن سا رہ گیا۔ (کیا اس کی مرضی کی اتنی اہمیت تھی ان کی



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ تمامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے
- ✧ کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف
- ✧ سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✧ ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے
- ✧ کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے
- ✧ ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

محمد کرم خان  
اُمہریم



دل اک خون کے قطرے سے زائد نہ تھا مگر  
آنسوؤں نے اس کو بھی طوفان بنا دیا  
وہ قیس تھا کہ جس نے بیاباں کو گھر کیا  
ہم نے تو اپنا گھر ہی بیاباں بنا دیا

## گزشتہ قسط کا خلاصہ

بات کی تصدیق عباس کے نمبر پر فون کرنے سے ہو جاتی ہے۔ لاریب سکندر کے رویوں سے تنگ آ کر بابا سائیں کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہے کہ عباس کی شادی والے معاملے کو لے کر وہ سکندر سے نکاح کر چکی ہے جس پر بابا سائیں حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ وہ اس بات سے سکندر کو بھی آگاہ کر دیتی ہے جس پر سکندر خوف و پریشانی کے عالم میں بابا سائیں کے پاس جاتا ہے جس پر وہ اسے لاریب سے تجدید نکاح کے بارے میں کہتے ہیں جس پر سکندر بے یقینی کے عالم میں انہیں دیکھتا رہتا ہے۔

## اب آگے پڑھیے

☆☆☆.....

خوش بختی نے اس کے در پر چپکے سے دستک دے دی تھی اور وہ حیران کھڑا تھا۔

”مجھے پتہ ہے اب خوشی کے مارے اگلے کئی دن تمہیں نیند نہیں آئے گی مگر یہ خوشی کا اظہار بہتر ہے تم اپنی فیملی کے سامنے جا کر کرو۔“ اس کے حواس جو پہلے ہی مختل تھے بابا سائیں کے ہلکے پھلکے شریر انداز میں جھکی گئی بات پر خفت و شرمندگی میں ڈھل گئے۔

”معذرت خواہ ہوں بابا سائیں! مجھے لگتا ہے آپ نے حالات سے مجبور ہو کر یہ سمجھوتہ کیا ہے براہ کرم کسی کو آگاہ کرنے سے قبل اس کے نقصانات پر ضرور غور کر لیں۔ میں بہر حال خود کو اس تو قیرو اعزاز کے قابل

فراز کا ساحر کی سووی میں کام کرنے کا شوق نندنی کی بدولت پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتا۔ اپنے شوق میں آنے والی اس رکاوٹ کے سبب وہ انہیں کا شکار ہوتا ہے کہ اس کا ٹکراؤ اربہ نامی لڑکی سے ہوتا ہے جو اسے برا بھلا کہتی ہے مگر وہ اس میں ایک خاص کشش محسوس کرتا ہے۔ وقاص امامہ کے شہر جانے پر خاصا ناراض ہوتا ہے اور واپس آنے پر امامہ کو بھی اپنے عتاب کا نشانہ بناتا ہے وہ دیگر فتنہ ہو کر لاریب سے بات کرتی ہے مگر سکندر کے فون اٹھانے پر خاموش ہو جاتی ہے سکندر اس کا پیغام لاریب کو دینے کی غرض سے آتا ہے مگر لاریب اسے خوب برا بھلا کہتی ہے۔ امامہ سے ہونے والی گفتگو بابا سائیں خفیہ طور پر سن لیتے ہیں اور وقاص کے رویے پر خائف نظر آتے ہیں۔ نندنی ساحر کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد زینب کے پاس آتی ہے جس پر وہ اسے نہایت خوش اسلوبی سے سمجھاتی ہے لیکن نندنی صرف ساحر کو حاصل کرنے کی ضد کرتی ہے۔ عباس عریضہ کو منانے کی خاطر اپنا کیریئر داؤ پر لگا دیتا ہے مگر وہ پھر بھی خائف رہتی ہے۔ آخر کار عباس اس کی ضد مانتے ہوئے بابا جان اور اماں سے معافی مانگنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہی عباس اور عریضہ خطرناک حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں نندنی عباس کو لے کر خاصی پریشان ہوتی ہے اس کا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ ضرور کسی مصیبت میں ہے اور اس

نہیں پاتا۔“ وہ بے حد شکستہ اور اپنی حیثیت بے آگاہی کی بدولت بری طرح نکھرا ہوا تھا بابا سائیں نے غم کے مظہر بنے اس کے چہرے کو دھیان سے دیکھا پھر گہرا سانس بھر کے اس کے پاس آ کر بے حد محبت سے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

”تمہیں یاد ہے سکندر جب تم پہلی بار منشی صاحب کے ساتھ میرے پاس آئے کتنے سے تھے؟ میرا کوئی بیٹا نہیں تھا اور میری بیٹیوں کو بھائی کی خواہش شدید تھی۔ تم میں کچھ ایسا غیر معمولی پن تھا کہ میں کبھی تمہیں ملازموں والی حیثیت دے ہی نہ سکا۔ تم نے اپنے وجود سے میری بیٹیوں کے لیے بھائی کی کمی کو پورا کیا تو میں بھی بلا ارادہ بلا اظہار خود بخود تمہیں بیٹے کی جگہ پر قبول کرنا چلا گیا۔ مجھے بتاؤ کبھی میرے سلوک سے تمہیں لگا کہ یہ باپ بیٹے کے علاوہ مالک و ملازم جیسا سلوک تھا۔ نہیں ناں؟ اور دوسری اہم بات یہ کہ تمہیں صرف امامہ اور ایمان نے ہی بھائی سمجھا اور مانا تھا لاریب شروع سے ہی اس رشتے سے منکر رہی ہے۔ مجھے آج پتہ چلا وہ ایسا اس لیے کرتی تھی کہ اک دن تمہارا اس سے رشتہ تبدیل ہو جانا تھا۔“ ان کا انداز ہلکا پھلکا تھا گویا انہوں نے یہ فیصلہ کرنے سے قبل اس حقیقت کو ہر لحاظ سے قبول کر لیا تھا مگر سکندر پھر بھی مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔

”مگر اس فیصلے کے بعد آپ ہر طرف سے زیر عتاب آجائیں گے بابا سائیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ کے علاوہ اور کسی نے بھی مجھے اس حیثیت سے قبول نہیں کرنا۔ خاص طور پر لاریب بی بی۔“ سکندر صورتحال کی نزاکت کو اپنی طرح عیاں کر کے ان کے سامنے رکھ دینا چاہتا تھا۔ بابا سائیں نے اسی رسائیت آمیز انداز میں اس کا نشانہ تھکا۔

”مجھے دنیا کی پروا نہیں ہے سکندر۔ میں نے کہا نا یہ میرے رب کا فیصلہ ہے۔ استخارہ میں مجھے بہت واضح اشارہ ملا ہے اس کام کے مثبت ہونے کا۔ جہاں تک لاریب کا معاملہ ہے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں وہ

جذباتی ہے اپنے اچھے برے سے آج بھی لاعلم ہے سمجھ جائے گی وقت کے ساتھ ساتھ۔“ انہوں نے گویا اسے ہر لحاظ سے لاجواب ہی نہیں مطمئن بھی کر دیا تھا۔ سکندر کے پاس اب کہنے کو کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اگر یہ اللہ کا فیصلہ تھا اور بابا سائیں کی دلی آمادگی سے ہو رہا تھا تو پھر وہ خود میں ہر دیوار سے ٹکرانے کی ہمت رکھتا تھا۔ اس پریشانی سے نکلا تو قدرت کی اس درجہ فیاضی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے کنول کھلانے لگی۔



ناشتے کی ٹرے شرجیل کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے گریزاں نظروں سے اسے دیکھا۔ ٹائی کی ناٹ لگانے کے بعد وہ بہت مصروف انداز میں رسٹ وریج باندھ رہا تھا۔

”آج آپ آفس نہ جائیں شرجیل۔“ اس نے پہلو میں اٹھتی درو کی ٹیسوں کو دباتے ہوئے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا تو شرجیل نے ہاتھ روکتے ہوئے ابرو اٹھا کر اسے پتھکھے انداز میں دیکھا۔

”ہنہ۔۔۔۔۔ آفس نہ جاؤں تاکہ گھر میں ہونے والی فضول لڑائی ملاحظہ کروں تم میں بھی کچھ کلس نہیں تھے ورنہ اب تک صورتحال سنبھل چکی ہوتی۔ کام سے جی چرانا فطرت ہے تمہاری۔“ وہ بھڑک اٹھا تھا جیسی غصے میں اسے سخت ست سنانے لگا۔ وہ وہی زبان بول رہا تھا جو اسے سکھائی جا رہی تھی۔ جس کا بالآخر اس پر اثر ہو ہی گیا تھا۔ ایمان کا پیلا پڑنا رنگ کچھ اور زرد ہونے لگا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے شرجیل بہت درد ہو رہا ہے مجھے۔“ وہ کراہ کر کہتی یوں نیچے بیٹھ گئی جیسے کھڑے ہونے کی ہمت بھی ختم ہو گئی ہو۔ شرجیل نے ٹرے اپنی جانب گھسیٹے ہوئے کوفت بھری نظر اس پر ڈالی۔ اسے ایمان کا ہر لمحہ پسینے میں ڈوبتا چہرہ بھی نظر نہیں آیا۔

”اچھا زیادہ ایکٹنگ کی ضرورت نہیں ہے سمجھیں؟ ڈاکٹر نے جو ڈیٹ دی ہے ڈیوری کی اس میں ابھی پورا ایک ہفتہ باقی ہے۔ میری ضروری میننگ ہے رکنے سے



قاصر ہوں۔“ ٹرے غصے میں دھکیل کر اٹھتے ہوئے اس نے بے حدخی سے کہا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ ایمان کچھ لمحوں کو دھک سے رہ گئی۔ بے بسی اور بسکی کے ساتھ تکلیف کا اتنا شدید احساس تھا کہ وہ کسی طور بھی خود کو سنبھال نہیں سکی۔ ضبط کا بندھن ٹوٹا اور بے اختیار رونی چلی گئی۔ شرجیل کا رویہ پچھلے کچھ دنوں سے بے حد تکلیف دہ اور ہتک آمیز تھا۔ ایمان اسے آفس واپسی پر اکثر تائی ماں کے کمرے میں جاتا دیکھتی تھی۔ یہ انہی کی صحبت کا اثر تھا کہ وہ اس حد تک بد مزاج اور کھر در آور ہوا تھا۔ ایسے میں ایمان سوائے صبر کے اور کبھی کیا سکتی تھی مگر یہ مقام بہت زیادہ دہشت کے حصار میں مقید کر دینے والا تھا۔ اسے تائی ماں کی وہ دھمکی یاد تھی جو انہوں نے بے حد واشگاف انداز میں اسے دی تھی۔

”اس کھونٹے کو مستقل نہ سمجھ بیٹھنا لڑکی! شرجیل پر ہمیشہ میری صالحہ کا حق تھا مگر تم نے اس حق کو غضب کر لیا۔ یاد رکھنا میں اپنے دشمنوں کو رعایت نہیں دیا کرتی۔ ایسی جگہ پر لے جا کر ماروں گی کہ پانی کو تر سوگی۔“ ایمان کو لگتا تھا وہ اپنا کہا پورا کر دکھائیں گی۔ یہاں تھا ہی کون جو اس کے درد سے آگاہ تھا۔۔۔۔۔ ایک شرجیل تھا وہ بھی اپنا کہاں رہا تھا۔

”بھابی ماما بلا رہی ہیں کہہ رہی ہیں ناشتا کب ملے گا“ شذرا جو اسے پیغام پہنچانے آئی تھی اس کے چہرے پر جو کیفیت تھی ٹھیک کر اس کی صورت تکنے پر مجبور ہوئی۔ ”خیریت بھابی۔۔۔۔۔ آپ رو رہی ہیں؟“ اس نے سہم کر سوال کیا۔ ایمان کی حالت اتنی خراب ہو رہی تھی کہ جواب دینے کی ہمت بھی ناپید تھی۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے شذرا پلیز ماما کو جلدی یہاں بھیج دو۔“ لفظ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے آزاد ہوئے تھے۔ لہجے میں سرسراہٹ تھی شذرا تو خوفزدہ ہوتی اٹنے قدموں بھاگی اور سیدھا جا کر ہال کمرے میں دم لیا۔ جہاں اس بل ماما اور تائی ماں ایک ساتھ سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ اسے آندھی طوفان کی طرح آتے دیکھ کر تائی ماں

کے ماتھے پر تیوریاں چڑھیں۔ ”کہا تیں! آ رہی ہے پچھا کتنی کنہیں؟“ ان کے لہجے میں جہالت و نخوت تھی۔ ”وہ۔۔۔۔۔ چچی جان بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں بلکہ بہت زیادہ خراب ہے کہہ رہی ہیں آپ کو بھیجوں۔“ شذرا کی بات سنتے اور بدحواسی کو محسوس کرتے ہی تائی ماں کا ماتھا ٹھنکا۔ ان کی بے ساختہ نگاہ ماما سے ملی جو یقیناً ان کی طرح ہی معاملے کی تہہ تک جا پہنچی تھیں۔ جیسی کچھ عجالت میں اٹھی تھیں۔ لاکھ اختلاف سہی اسے ہر لحاظ سے ناپسند بھی کرتی تھیں مگر معاملہ اب کہ اپنی نسل کی بقا کا تھا۔ جیسی ان کے انداز میں انوکھا جوش و خروش اور خوشگوار سی فکر مندی دوڑ آئی۔

”ارے۔۔۔۔۔ اگر طبیعت خراب تھی تو شرجیل کو گھر روک لیتی۔۔۔۔۔ لو بتاؤ کیسی بے وقوف لڑکی ہے پتہ بھی ہے اس وقت گھر پر کوئی مرد نہیں ہوتا شذرا بیٹے تم نمبر ملاؤ بھابی کا کہو جہاں بھی ہے فوراً پہنچے۔“ ان کی پھرتی اور کیڑنگ انداز تائی ماں کو جلا کر خاکستر کر گیا تھا۔ انہوں نے پہلے جھپٹا مار کر سیل فون تک رسائی پا جانے والی شذرا کو پھٹکار کر فون اس سے چھینا اور اسے ڈانٹ کر وہاں سے بھگایا پھر تیکھے چوتھوں سے دیورانی کو دیکھا۔

”شاباش ہے بھی تم پر خوب صلہ دینے لگی ہو میری دن رات کی پڑھائی پٹی کا ثابت ہوا ہمیشہ سے عقل کی پوری ہو بیٹھو یہاں آرام سے خبردار جو ملیں بھی تو۔۔۔۔۔“ ان کا لہجہ صرف تحکمانہ نہیں تھا سفاکیت سے بھی بھرپور تھا ماما اچھی خاصی ہوتی ہو کر انہیں تکنے لگیں۔

”مم۔۔۔۔۔ مگر بھابی بیگم وہ۔۔۔۔۔ بچی۔۔۔۔۔ وہ شہنائیں۔“ ابھی نہیں آنے والا اس دنیا میں یاد کر ابھی پورے آٹھ دن ہیں۔ ڈاکٹروں نے اگلے مہینے کی تاریخ دی ہے۔ ان کا کاٹ دار لہجہ طنزیہ تھا۔ ماما ذرا سا کھسائی مگر پھر جیسے انہیں سمجھانا چاہا۔

”ڈاکٹر کی تاریخ حتمی تو نہیں ہو سکتی ناں بھابی بیگم یہ تو اللہ کے کام ہیں طبیعت زیادہ خراب ہے بہو کی ہسپتال تو

لے جانا پڑے گا۔“ وہ یکدم گھبرائیں کہ ایمان کی گھٹی گھٹی چٹکنا اب یہاں تک بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ وہ بار بار انہیں اور تائی ماں کو پکار رہی تھی اس کی آواز میں ذبح ہوتے جانور کی سی بلک اور اذیت آتی جا رہی تھی۔ قریب تھا کہ ماما جنہائی کی پروا کیے بغیر وہاں سے بھاگ کر بہو کی داور سی کو پہنچیں تائی ماں نے ان کا ارادہ بھانپتے ہوئے چھٹ کر ان کا بازو پکڑ کر اپنے پاس گھسیٹ لیا پھر انہیں سنبھلنے کا موقع دینے بغیر آنکھیں نکال کر ان پر غرائیں۔

”میں نے ہنسی گولیاں کبھی نہیں کھیلیں ہیں شہنائے بیگم! شرجیل کو میں ہمیشہ سے صالحہ کے لیے پسند کرتی تھی اس لڑکی سے جان چھڑوا کے مجھے صالحہ کا بیاہ ہر صورت شرجیل سے کرانا ہے اور تو دم نہیں مار سکتی پتہ ہے کیوں۔۔۔۔۔؟ اب آج سے ذرا اٹھائیں سال پیچھے چلی جا“ جب آفاق اپنی پسند کی ہوئی عورت کو شادی کر کے اس گھر میں لایا تھا۔ وہ ہمارے سر کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا ایک دولت مند عورت کا اکلوتا بیٹا۔ جس نے محض مرد کا سہارا پانے کو ہمارے سر سے شادی کی تھی۔ یہ کہانی تو یاد ہوئی تھی مگر میں یاد دہانی کو دہرا دیتی ہوں یہ ساری جائیداد جاگیریں عیش و عشرت ہمارے سر کو اسی بیوی سے شادی کرنے کے باعث میسر آئے تھے کہ ہماری ساس تو اللہ بخشے کب کی بیستین ہوئی تھیں جو اب جی کو اس عقد سے کوئی روکتا۔ امیر کبیر بیوی بھی جلد چل بسی تو ہمارے سر نے بڑا انصاف کیا۔ اپنی جائیداد ساری اولادوں میں بانٹی اور امیر کبیر بیوی کا سارا حصہ اس آفاق کے نام کر دیا۔ ساتھ میں وصیت نامے میں لکھ دیا کہ ان کی موت کی صورت میں اٹھارہ سال سے پہلے آفاق کے حوالے نہیں کیا جائے گا اور وارث اس میں سے کھا سکتے ہیں دستور لکھ کے مطابق۔ وہ خود تو مر کھپ گئے مگر اس سنبولے کو لکڑی سے سینوں پر مونگ دیتے چھوڑ کر جب وہ اٹھارہ کا ہوا تھا تو انہی دنوں بیاہ کر آئی تھی مگر تیرا بیاہ ضرور آفاق کے کارنامے کے بعد ہوا تھا۔ وہ بھی کچھ زیادہ ہی اتاؤ لا نکلا تھا ناں کی طرح عیاش اور ماں کی طرح نفس پرست جیسی

تو اپنے لیے کوٹھے سے ہی زانی اٹھا لایا تھا نکاح کر کے۔ اونہ گندا خون شامل کرنا چاہتا تھا ہماری نسل میں۔ جونہ مجھے گوارا تھا نہ تیرے بھرا (تاؤ جی) کو جیسی وہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا یاد ہے نا تجھے بھی تو بھی تو شامل تھی۔“ بات ادھوری چھوڑ کر انہوں نے ٹھٹھہ لگایا ان کا ہڈیانی قہقہہ اور ایمان کی دم توڑتی ملکتی نقاہت زدہ آواز۔۔۔۔۔ بے بسی سفاکیت اور خوف و ہراس کا عجیب انوکھا سنگم تھا۔ ماما فنی چہرے کے ساتھ دم سادھے بیٹھی تھیں۔

”سلو پوائزن دیا تھا ہم نے ان دونوں زن خصم کو مگر حرام کی جی پھر بھی اس سنبولے کو مرنے سے پہلے جن گئی۔ دونوں کی موت تو بظاہر ٹریفک حادثے میں ہوئی تھی مگر ہم جانتے ہیں حقیقت کیا تھی جس دن جنازے اٹھے اسی رات کو اس سنبولے کا بھی سر چل کر کام نہ پنا تھا پر۔۔۔۔۔ کم ذات نوکرانی دغا دے گئی۔ کوئی پوچھے کہاں کا انصاف کیا ہماری تھالی میں کھا کر چھید کرنے سے باز نہ آئی۔ ایسی اڑچھو ہوئی کہ آج تک بھید نہیں ملا۔ خیر لعنت بھیج اس داستان پر سا لہا سال بیت گئے مگر کبھی اس حوالے سے کوئی بڑی خبر سننے میں نہیں آئی۔ اللہ کرے وہ نوکرانی اس چھوٹے گھر کے ساتھ ہی کہیں غرق ہو گئی ہو۔ خیر اب کی بات کرتے ہیں ابھی کی اس لڑکی کا ایسی ہی حالت میں ٹیٹا دانا ہے یا پھر کوئی اور حل سوچیں؟“ ان کی گفتگو کا انداز پیشہ ور قاتل کی طرح تھا۔ اپنی لومڑ جیسی مکار نظروں کو ان کے چہرے پر نکائے وہ مشورہ چاہ رہی تھیں ماما جھر جھری لے کر جیسے بھیا تک ماضی سے حال میں لوٹ آئیں حال جو ماضی سے کم ہی بھیا تک تھا۔

”آ۔۔۔۔۔ آپ مجھ پر الزام لگا رہی ہیں بھابی بیگم! میں اس قتل کے فعل میں شامل نہیں تھی۔ آپ کی باتیں اتفاقاً سن لی تھیں تو آپ نے مجھے جان سے مار دینے کی دھمکی دے کر خاموش رہنے کا کہا تھا۔ کیا کرتی پھر میں؟“ اپنی صفائی اور بے گناہی کا ثبوت فراہم کرتیں وہ رو ہا سی ہو گئی تھیں۔ تائی ماں ان کے گڑبڑانے پر مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہنسیں پھر ان کے کاندھے پر چپت لگائی۔



”کہا ناگہرانے کی بات نہیں وہ بات قابل پکڑ ہے ہی نہیں اب کی بات کر آج کی۔“ ان کی آنکھوں میں بھیڑیے کی سی چمک تھی۔ ایسی چمک جو شک کو سامنے پا کر درندگی کی علامت بن جایا کرتی ہے۔ ماما کو اس بل مہج معنوں میں ان سے خوف محسوس ہوا۔

”بھابی بیگم یقین کریں میں آپ کی ہر بات مان لوں گی مگر اس وقت بچی کو اسپتال لے جانے دیں وہ مرجائے گی ورنہ۔“ وہ گڑگڑائیں اور اپنا ہاتھ ان سے چھڑوا کر ایمان کے کمرے کی جانب بھاگیں جہاں اب موت کا سانسنا اور خاموشی طاری ہو چکی تھی۔



زینب غم سے نڈھال بے حال اور سراسیمہ نندنی کے ہمراہ اسپتال پہنچی تو وہاں اک قیامت کا سماں تھا۔ عباس حیدر کی اہلیہ اس حادثے میں موقع پر جاں بحق ہو چکی تھی جبکہ خود عباس حیدر موت وزیست کی کشمکش میں ہوش و خرد سے بیگانہ اپنے اس عظیم اور ناقابل تلافی نقصان سے بے خبر تھا۔ اللہ کا وعدہ ہے وہ اپنے بندوں کو ان کی برداشت سے بڑھ کر نہیں آزماتا، تکلیف جب ضبط اور برداشت سے بڑھے تو پھر بے خبری طاری ہو جاتی ہے گویا عباس کے لیے اس وقت بے ہوشی بھی غنیمت تھی۔ یہ خبر جیسے جیسے پھیلی اسی لحاظ سے ہاسپٹل میں خبر رساں کمپنیوں اور ٹی وی چینلوں کے نمائندوں کا جم غفیر اکٹھا ہو گیا۔ لمحہ بہ لمحہ کی سنسنی خیز خبریں نیٹ ورک کے ذریعے براہ راست پہنچانی جا رہی تھیں۔ دوسری جانب عباس تھا جس کی جسمانی و ذہنی حالت شدید خطرے کے زیر اثر تھی۔ حادثہ اتنا شدید اور بھیاںک تھا کہ ریسکویٹیوں نے موقع پر پہنچ کر تباہ شدہ گاڑی کے پارچے کاٹ کر اندر سے خون میں لت پت اجسام کو باہر نکالا تھا۔ عریضہ کو ختم ہوئے بھی ایک گھنٹہ بیت چکا تھا جبکہ عباس کے سینے میں انکی سانسون کی مالا کی بے ترتیبی کو دیکھ کر لگتا تھا کسی بھی بل ٹوٹنے کو ہے۔ خون آلود زخموں سے انا جسم اور چہرہ جو قدرت کی صنائی کا عظیم شاہکار تھا اس بل پہچان میں بھی

دقت سے آتا تھا، مگر اس وقت اس کے لواتھین میں کوئی بھی نہ تھا کہ عریضہ کے والدین اس کی بخش لے کر جلائیے تھے جیسے عباس سے کوئی تعلق واسطہ نہ ہو۔ اس کے اپنے باپ کا تڑپتا ہاتھ دعا مانگنے والا نہ تھا دوپٹے سے آنکھیں پونچھتی منہ ہی منہ میں تسبیحات پڑھتی ماں نہ تھی جاں نثار مددگار بھائی نہ تھا والہانہ انگلیاں بہن موجود نہ تھی بس ایک نندنی تھی جس کی حالت غیر تھی اور جس نے محض ایک نگاہ عباس کو دیکھا تھا تو چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ عباس کی حالت ہی ایسی تھی جب اسے آپریشن روم سے باہر نکالا گیا سفید بیڈوں میں جکڑا وہ ساکن اور بے خود نظر آتا تھا اس کی خون آلود بسی پٹلیں عارضوں پر ایسے ساکن تھیں جیسے اب کبھی نہ اٹھنے کا تہیہ کر چکی ہوں اس کی حالت دیکھ کر نندنی کی چیخیں نکل گئیں۔

”وہ زندہ تو رہے گا نا؟ میں پاگل ہو رہی ہوں مجھے حوصلہ دو مجھے یقین دلاؤ زینب ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔ اتنا شدید ایکسیڈنٹ ہو تو کوئی نہیں بچتا مگر اسے بچنا چاہیے تم کہتی ہو نا مارنے والے سے بچانے والا ملاقات در ہے وہ رحم کرنے والا ہے اس سے کہو مجھ پر رحم کرنے زینب اپنے اللہ سے کہو وہ اسے بچالے۔“ وہ منتشر ہو رہی تھی ٹوٹ رہی تھی بکھر رہی تھی۔ زینب نے اسے بانہوں میں جکڑ کر بھیجا اور اس کا وحشت چھلکا تا آنسوؤں میں ڈوبا چہرا چوم لیا۔

”حوصلہ کرو نندنی اسے کچھ نہیں ہوگا وہ زندہ رہے گا اگر تمہاری ہلکی کا نام ساحر ہے تمہاری خوشی کا عنوان ہی ساحر ہے تو تمہاری ہلکی اور خوشی کے لیے دعا مانگنا میرا فرض ہے میں ابھی وضو کر کے دعا مانگتی ہوں مجھے اللہ پر بھروسہ ہے وہ تمہیں اس نقصان سے ضرور بچالے گا۔ بس تم حوصلہ نہ ہارنا۔ تم مایوس نہ ہونا۔“ زینب نے اسے تسلی دی تھی مگر وہ جانے کب غم سے نڈھال ہوتی اس کے بازوؤں میں ڈھسے گئی تھی۔



اس کے اعصاب پر خوف و ہراس کا غلبہ تھا ایسا

وحشت جس کا کوئی شمار نہیں تھا۔ بکھرے بے ترتیب بال، پھیلا ہوا لباس، سو جھی آنکھوں والی خود سے بے پروا نندنی یہ لڑکی تو جیسے کوئی جوگن تھی ایسی جوگن جس کے سامنے اس کا سارا جہان لٹنے کو تھا اس کے حواس قائم رہتے بھی تو کس طرح؟ یہ چوبیس گھنٹے اس پر قیامت کی طرح بھاری تھی۔ اس کے سر پر سورج سوا نیزے پر تھا تو بیروں کے نیچے پل صراط وہ ہر لمحہ کٹ کٹ کر جہنم میں کرتی تھی۔ اور اذیت سے بے حال تھی۔ عباس حیدر ہنوز انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ نندنی پچھلے چوبیس گھنٹوں سے ہی بنا کچھ کھائے پیے ہر ہر لمحہ تڑپ اور بلک رہی تھی۔ اسے بے قراری اور وحشت ہی ہو سکتی تھی اس خیال سے کہ وہ اسے کھودے گی۔۔۔۔۔ اسے جسے وہ کتنے سالوں سے مسلسل تلاش کرتی رہی تھی۔

وہ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے رو رہی تھی اب تو جیسے آنسو بھی ختم ہو گئے تھے اس کے غم کی وسعت کے آگے اپنی شکست تسلیم کر کے شرمندہ تھے ساتھ نہ بھانے پر۔۔۔۔۔!

بائیس گھنٹے گزر گئے پھر تیسواں گھنٹہ بھی گزرا اور چوبیس واں اختتام پذیر ہونے لگا۔ نندنی کے اعصاب پر خوف و وحشت کا احساس اپنے سر پہنے گاڑھنے لگا اور جسم ایسے لرزتا تھا جیسے تیغ کی مریضہ ہو وہ جلے پیر کی بلی کی مانند اٹھ کر کوریڈور میں پھرنے لگی۔ یہاں سے وہاں وہاں سے یہاں قرار کہاں تھا؟ یہ ایک آخری گھنٹہ بھی گزرتا تو پھر بس کہانی ختم، آس ختم، زندگی ختم، ہر سو اللہ میرا یوسی ویرانی، وحشت۔۔۔۔۔! کیا وہ بچ پائی عباس حیدر کو اپنے سامنے مرتے پا کر؟ یہ دنیا کا سب سے دردناک کام تھا اسے جدا کرنا اس کی آنکھیں بے بسی کے لہجہ کو پھر سے بہنے لگیں آنسو کے خشک ہو جانے والے جھٹے پھر سے پھوٹ نکلے وجود خوف کے احساس سمیت ملف تلمے دفن ہونے لگا۔

تو کیا میں اس اذیت کو سہنے یہاں آئی تھی کہ اس

زندگی سے بھی عزیز تر شخص کو لمحہ لمحہ ریت کی طرح پھسل کر زندگی ہارتے دیکھوں؟

”موت سے بدتر ہے یہ عالم میرے اللہ اللہ اللہ“ معاوہ ٹھٹک گئی۔ اس کی نگاہ بھی ٹھٹک گئی جس کے سامنے اللہ کے پاک اسمائے حسنہ تھے ہاسپٹل کی شفاف راہداری کی شفاف دیوار پر لکڑی کی خوبصورت منقش تختی پر روشنی کا منبع بنے ہوئے۔

”اللہ۔۔۔۔۔“ اس نے خود کو یقین دلایا اس کی زبان سے بھی یہی لفظ نکلا ہے اور نظر نے بھی اسی نام کو چوما ہے وہ جو زینب کا خدا ہے زینب کہتی ہے وہ سب کا خدا ہے یہاں تک کہ میرا بھی ہر کسی کا چاہے کوئی مانے یا نہ مانے تسلیم کرے نہ کرے مگر اس کی بادشاہی، شہنشاہی اور مملکت سے انکار نہیں اس کی مملکت سے کوئی نکل بھی نہیں سکتا۔ مجھے ایک بار تو زینب کے اللہ کو بھی آزمانا چاہیے اس سے بھی مانگنا چاہیے خود کیا پتہ۔۔۔۔۔ وہ میرا منتظر ہو زینب تو یہی کہتی ہے۔۔۔۔۔ وہ اپنے بندوں کا ہر وقت منتظر رہتا ہے میں بھی تو اس کی کچھ لگتی ہوں نا اس کی پیدا کی ہوئی زینب کہتی ہے وہ اپنے ہر ایک بندے سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے۔“

”اللہ۔۔۔۔۔!!!“

اس نے سوچا اس نے پکارا اسے جس پر اس نے پہلی بار یقین کر لیا چاہا تھا اسے جس پر وہ پہلی بار بھروسے پر قائل ہوئی تھی۔ وہ جو اپنے نام سے دکھتا تھا جھلکتا تھا اپنے پاس بلاتا تھا مسکراتے ہوئے پیارے جہاں اجنبیت تھی ہی نہیں جہاں جھجک تھی ہی نہیں جہاں اپنائیت ہی تھی اور بے پناہ محبت جس کا محض تصور ہی دل کی تقویت کا باعث تھا۔ اس کے احساس سے ہی چاہت کی خوشبوئیں اور انجانی مسرت کی لہریں نکل کر انسان کو محسوس کر لیتی ہیں صرف دل میں اتر کر سارے راز پا جانے ہیں سارے مقصد جان جاتے ہیں دھڑکن کو سنبھالتے ہیں اندھروں کو مٹاتے ہیں وہ بھی بے خود ہونے لگی تڑپنے لگی گڑگڑانے لگی۔



”تو زینب کا رب ہے تو میرا بھی رب ہے یہ زینب کہتی ہے میں بھی کہوں گی مگر تب جب تو میری ماں لے گا..... میں آج پہلی بار آئی ہوں تیرے پاس تو مجھے خالی نہ لوٹا بس عباس کو بچانے اسے کچھ نہ ہونے دینا میں اسے اس طرح مرتے نہیں دیکھ سکتی تو جانتا ہے میں اکیلی ہوں بالکل بے بس اگر عباس کو کچھ ہوا تو میں بھی مار لوں گی خود کو۔ مجھے زندگی کا سامان زندگی کی خواہش تو مہیا کر۔“ گھنٹوں مرگری وہ زار و قطار رو رہی تھی اسے خبر نہیں تھی اللہ سے دعا کیسے مانگتے ہیں اس نے بھی دعا مانگی ہی نہ تھی وہ سر تا پا لرزتی تھی اور گریہ وزاری کے دوران زینب کی امی سے سنی وہ مناجات بھی دہرائی تھی جو اس نے انہیں کام کاج کے دوران ایک سوز کی کیفیت میں پڑھتے اتنی بار سنا تھا کہ اس کے فقرے اسے زبانی یاد ہونے لگے تھے۔ اس کی ہچکیاں بندھنے لگیں مگر وہ اسی بے قراری سے پکارتی تھی۔ تو کیا کوئی معجزہ نہ ہوگا؟

ہمارے سب خواب وقت کی بے رحم آنڈھیوں میں جل بھیجیں گے؟

دو نیم دریا چاہ تاریک فالتش سرد و جاں نوازی کے سلسلے ختم ہو گئے کیا؟  
تو کیا کوئی معجزہ نہ ہوگا؟

خدائے لم یزل  
تیری سجدہ گزارستی کے سب یکنوں کی التجا ہے  
کوئی تو ایسی سمیل نکلے کہ

وہ گھنٹوں کے بل دوزانوں ہو گئی ہاتھ دعا کے انداز  
میں پھیل گئے آنسو لڑیوں کی طرح ٹوٹ کر نکھرتے اور  
پھیلے ہاتھوں کی اوک کو بھرتے تھے۔

مجھ سے منسوب گل زمینوں کی سب عظمتیں پھر سے  
لوٹ آئیں  
وہ چاہتیں وہ محبتیں وہ رفاقتیں پھر سے لوٹ آئیں!

خدائے لم یزل!  
خدائے لم یزل!  
وہ اضطرابی کیفیت کے زیر اثر بلکتی رہی اور اسی بے

قراری سے اپنی پیشانی سجدے میں جانے کے بعد فرش پر ٹیک دی۔ وہ زینب کے اللہ سے عباس کی زندگی مانگ رہی تھی اس کے بدل میں وہ اپنی اطاعت کا وعدہ اس سے کر رہی تھی اس کے علاوہ اسے فی الحال اور کچھ بھی درکار نہیں تھا۔ پھر اس کے وعدے کو سچے رب نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اس کے ایک قدم کے جواب میں اس نے باقی کا تمام فاصلہ خود ختم کر دیا۔ رحمت کی عنایت ہوئی تھی اور اسے مالا مال کر دیا گیا۔

نندنی کو یہ خبر ملی تو اسے خوشی سے سکتے ہوتے ہوتے رہ گیا۔ وہ ہنستی تھی..... روتی تھی چہار سو روشنی تھی اجالا تھا خوشبو تھی وہ پھر سجدے میں گر گئی اس نے جانا یوں خود کو اس مالک حقیقی کے آگے جھکا دینے میں کیسی لذت کیسا کیف کیسی آسودگی ہے جس کے سامنے دنیا کی برکت بچ ہے اس نے یہ بھی جانا زمین سجدے کے لیے اتنی خوبصورت پہلے بھی نہ تھی تن میں شکر کا ایسا دھماکا بھی پہلے بھی نہ تھا۔



وہ سکتہ زدہ آئی سی یو کے بند دروازے کے آگے کھڑا تھا اس کی خوف سے پھیلی آنکھوں میں کسی حادثے کا واہمہ گھات لگائے بیٹھا نظر آتا تھا اور دل اتنا سہا ہوا تھا کہ رک رک کر دھڑکتا تھا۔ فراز کی اطلاع پر جب وہ حواس باختہ ہسپتال پہنچا تو ایمان کو آپریشن کے لیے لے جایا جا چکا تھا۔ فراز کے لیے جو تازہ صورتحال اس تک پہنچی وہ انتہائی مایوس کن تھی۔ ڈاکٹر نے اتنی تاخیر سے پہنچنے کے باعث شدید ملامت کرنے کے بعد کیس لینے سے انکار کر دیا تھا۔ فراز کی منت سماجت کے جواب میں کسی بھی نقصان کی ساری ذمہ داری انہی پر ڈال دی گئی تھی۔

”جو مریضہ کی حالت ہے اس کے پیش نظر اب کوئی معجزہ ہی انہیں بچا سکتا ہے۔ بہر حال دعا کریں کیونکہ ان کا کیس بہت زیادہ تاخیر کے باعث بگڑ چکا ہے۔ زہر اندر پھیلنا شروع ہو چکا ہے۔“ اہم معلومات فراہم کرنے کے بعد ڈاکٹر خوفناک پریشان رویہ میں چلی گئی اور فراز اسی بل

وہاں آنے والے شرجیل پر تمام ادب لحاظ بھلا کر بلا دروغ اس پر برس پڑا۔

”اب کیوں آئے ہیں آپ یہاں؟ آپ کا ہر کام چاہے وہ کتنی ہی معمولی نوعیت کا کیوں نہ ہو بھابی سے زیادہ اہم رہا ہے۔ ان کی ذات و زندگی سے بھی زیادہ پلیر چلے جائیں یہاں سے مجھے آپ کی شکل سے ہی وحشت ہو رہی ہے۔ آپ اس قابل ہی نہیں تھے کہ بھابی اس حد تک آپ کی خاطر چلی جاتیں۔“ وہ سرخ آنکھوں سے اسے گھورتا ہسٹریک ہوتا چلائے گیا۔ شرجیل اتنا شاکہ تھا کہ اس کی بات کا برامانے کی بھی یوزیشن میں نہیں رہا۔

”میری بات سنیں اگر بھابی کو کچھ ہوا تو اس کے ذمہ دار صرف آپ ہوں گے، سمجھے آپ؟“ وہ کسی طرح بھی اپنی آواز کی بھراہٹ پر قابو نہ رکھ سکا تو پلٹ کر تیز قدموں سے وہاں سے نکل آیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ اپنا سیل فون گھر پر بھول گیا تھا۔ آدھے راستے سے پلٹنا پڑا تھا تو سیدھا ہال کمرے کی جانب آیا کہ اس نے اپنا فون وہیں چھوڑا تھا مگر ماما اور تانی ماں کے بچ ہونے والی گفتگو نے اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ ثابت ہوا وہ لوگ صرف ظالم نہیں قاتل اور غاصب بھی ٹھہرے تھے۔

انکشافات کا بوجھ ہی کیا کم تھا کہ اس پر ایمان کی اس حد تک بگڑ جانے والی حالت وہ حواس بحال رکھتا بھی تو کیسے؟ ایمان تک جب وہ پہنچا وہ مکمل طور پر حواس کھو چکی تھی۔ جسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالنے کے بعد اس نے ماما کو بھی بیٹھنے کی مہلت نہیں دی کہ وہ اتنا ہی متنفر ہو رہا تھا ان سب سے۔ سچ کہا ہے کسی نے ”خواہش نام تمام رے تو دھیرے دھیرے جسم و جاں کو سلگاتی رہتی ہے لیکن اگر ہوئی پوری نہ ہو تو طوفان کھڑے کر دیا کرتی ہے۔“ غلط راستوں پر بھٹکا کر بے صبرے پن وحشی طرز عمل پر ہی منافقت کے ساتھ جارحیت کو بھی جنم دیتی ہے۔

اس گھر کے مکینوں کو اب انسانیت کے درجے پر رکھ کر بھی سوچنا اس نے اپنے لیے ناجائز قرار دے دیا تھا۔ وہ ڈسٹرب تھا اور بے مقصد سرکوں پر گاڑی دوڑائے پھرتا

تھا۔ معاہدہ فون کی گنگناہٹ پر اس کی توجہ کا ارتکاز ٹوٹا۔ اس نے اسٹیرنگ سے ہاتھ ہٹا کر کوٹ کی جیب سے سیل فون نکالا اسکرین پر ماما کا نام چمک رہا تھا اس کی پیشانی پر خچی بھرانہ گوارتا ٹرا بھرا۔

(اب بھلا آپ کو کس بات کی بے صبری ہے؟ موت کی خبر دینا چاہ رہی ہیں)

اس نے زہر خند سے سوچا اور سیل فون کو ڈیش بورڈ پر ڈال دیا۔ کم از کم اس وقت وہ ان سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

(مجھے بھابی کی خبر تو لینی چاہیے) خیال آنے پر اس نے گاڑی کا رخ پھر سے اسپتال کی جانب موڑ دیا۔ تیز ڈرائیونگ کا مظاہرہ کرتا ہوا وہ گاڑی کو لاگ کر کے تیز قدموں سے ہسپتال کے اندر چلا آیا۔ شفاف راہداری کا موڑ مڑتے اسے شرجیل کی جھلک نظر آئی۔ نرس گلابی کمر میں لپٹا ہوا بچہ اسے پکڑا رہی تھی۔ فراز کے قدموں میں مزید تیزی آ گئی۔

”شرجیل بھائی بھابی.....“ باقی کی بات اس کے منہ میں رہ گئی۔ شرجیل آنسوؤں سے بھیکے چہرے کے ساتھ بے قراری سے اس کے گلے لگا تھا اور جیسے ہر ضبط کھو گیا۔ فراز کا دل جیسے گہرے پاتال میں گرنا چلا گیا۔



اس نے مسکراتے ہوئے گاڑی کی رفتار ذرا سی بڑھائی پھر سرشاری کے احساس سمیت ہولے سے ہنس دیا۔ وہ خوش تھا تو خوشی کے اظہار میں بھلا کیا قیامت تھی۔ فتح کا احساس ہی کتنا کیف آ کہیں کتنا دلکش ہے سچ معنوں میں آج ہی تو جیتا تھا وہ۔

(تو طے ہوا محترمہ لاریب شاہ آپ ہمارے لیے ہی بنی تھیں) اس کے ہونٹ مسکائے اور آنکھیں کسی خوبصورت سوچ کے ساتھ چمک اٹھیں۔

(کیسا ہوگا وہ وقت لاریب جب تم تمام تر آدمیوں کے ساتھ مجھے اپنا آپ سوچو گی)

ہا..... خوشی سے کہیں میرا دل دھڑکنے نہ چھوڑ دے۔



وہ جھینپا اس نے گہرا سانس بھر کے آسمان کی جانب دیکھا اور تشکرانہ انداز میں مسکرانے لگا۔ آسمان پر کہیں کہیں آوارہ بدلیاں اڑتی پھرتی تھیں۔ تاحد نگاہ لہلہاتے کھیتوں میں تل کھاتی پلگڈنڈیاں اور ان پر کسیاں اور دیگر اوزار تھامے آتے جاتے کسان..... سروں پر چارے کے گھراٹھائے دوپٹے سے آدھے چہرے ڈھانپے کچھ دیہاتی خواتین۔

سکندر نے احتیاط سے موڑ کاٹا اور گاڑی کا رخ اپنے گھر کی جانب کر دیا۔ بابا سائیں کے حکم کے مطابق ابھی کچھ دیر قبل اس نے اپنے والدین کو مناسب الفاظ میں یہ خبر سنا دی تھی اماں کو تو یقین ہی نہ آتا تھا۔ کچھ لمحوں کو ان کا چہرہ اتار یک بھی پڑا تھا اور انہوں نے ہڑبڑا کر ثانیہ کو دیکھا جو دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ بڑے غیر محسوس انداز میں وہاں سے اٹھی تھی۔ البتہ بابا نے بے حد خوشی و مسرت کے ساتھ جوش کا اظہار کرتے اسے بڑے تپاک سے گلے لگایا۔

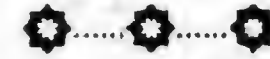
”میرے پتر تو تھا ہی اس قابل کہ اللہ تجھے یہ مقام یہ مرتبہ عطا فرماتا۔“ ان کے اس والہانہ پن پر سکندر جھینپ کر ہنس پڑا۔

”میری تو حیرانی نہیں مک رہی سکندر کے ابا۔ جو بھی ہے پر وہ لڑکی تو جیسے کوئی شہزادی ہے۔ خدا نخواستہ کوئی عیب تو نہیں پڑ گیا چوہدری صاب کی دھی میں جو.....“ اور اس خدشے کے جواب میں بابا نے جو اماں کو سنائی جوان کے لیے میں ڈالیں الامان سکندر کے روکنے کے باوجود بھی بابا گرجتے برستے ہی رہے تھے۔

”ہمارے سکندرے میں آخر کی کس بات کی ہے بے عقلے! اتنا پڑھا لکھا خوبصورت گھبرو پھر ساری عمر حویلی میں رہا ہے۔ انہی دوڑے لوگوں کے جیسا ہے اس کا رہن سہن پتر بنایا ہوا ہے اسے چوہدری صاب نے۔“

”بابا چلیں رہنے دیں کیوں غصہ کرتے ہیں؟ اماں کی بات بھی غلط تھوڑی ہے۔ میں کہاں ہوں لاریب بی بی کے قابل مگر قسمت کے کھیل بھی نرا لے ہوتے ہیں۔“

لاریب بی بی کے مرتبے کا لڑکا ان کے خاندان میں میسر نہیں تھا بابا سائیں کو اس وجہ سے سمجھوتہ کرنا پڑا ہے۔ لاریب بی بی کے کردار میں کوئی کمی نہیں ہے اماں۔“ فطری طور پر وہ اماں کی بات کی وجہ سے یکدم بجھ سا گیا تھا۔ یہ بھلا کیوں فراموش کر دیا اس نے کہ لوگ بھی اس بات کو ہضم نہیں کریں گے اور اگر عام لوگ قبول نہیں کر سکتے تو پھر لاریب کے متعلق ایسا سوچنا بھی حماقت ہے۔ وہ بابا کی طفل تسلیوں کے باوجود وہاں سے اٹھا تو اندر سے مطمئن تھا پتہ نہیں زندگی اسے کس موڑ کس دور اسے کی جانب دھکیلے جا رہی تھی۔



مجھے بھی دنیا یہ اس آئے میں بھول جاؤں تجھے دعا ہے وہ دھندلی آنکھوں سے کمپیوٹر اسکرین پر موجود عباس حیدر کی تصویر کو تک رہی تھی۔ ٹپ ٹپ کتنے آنسو اس کی ریشمی پلکوں سے ٹوٹے اور دوپٹے میں جذب ہوئے۔

”تو اندر جو سناٹا اور وحشت تھی یہ..... یہ وجہ تھی اس کی عباس! میں نے تمہیں معاف کیا۔ اللہ بھی تمہیں معاف کرے تمہیں پھر بھی کچھ نہیں ہونا چاہیے عباس اس کے باوجود کہ تم میرے لیے نہیں ہو مگر تمہیں پھر بھی حوادث دنیا ایدانہ دے میں تمہیں بددعا کبھی نہیں دے سکی اللہ گواہ ہے۔“ اس نے کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کیا اور اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھولا کہ عباس کو دیکھنے سے قبل احتیاطاً وہ دروازہ لاک کر لیا کرتی تھی۔

”بی بی صاحبہ آپ کو صاحب نے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔“ ملازمہ کی اطلاع نے اس کے شلت اعصاب کو کچھ اور بھی اضمحلال عطا کیا تھا اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ لازمی کوئی بہانہ کر دیتی مگر جانتی تھی اب بابا سائیں اس تک اس کی زندگی کا اہم فیصلہ پہنچانے والے تھے۔

”تم چلو آتی ہوں میں۔“ اس نے بھیگی آواز پر قابو پا کر رسائیت سے کہا۔ ملازمہ کے جانے کے بعد اس نے گہرا سانس بھرا اور خود کو سنبھالنے کی سعی کرتی ہو چھل

تہنک سے چلتی وہ ان کے کمرے کے دروازے پر آ کر ٹھہر گئی۔

”جی بابا جان!“

”یہاں آؤ لاریب! اور بیٹے جو کچھ میں کہوں اسے عمل سے سننا اور ٹھنڈے دل سے غور کرنا کہ میں نے اگر فیصلہ کیا ہے تو تمہارا باپ ہونے کی حیثیت سے مجھے اس فیصلے کا حق حاصل تھا۔“ لاریب نے اس تمہید پر کچھ چونک کر اور بے حد سہم کر انہیں دیکھا۔ گویا ان کے فیصلے کو جانتا چاہا ہو بابا سائیں اس وقت مارل اور بوسکون نظر آئے تھے۔

”آ..... آپ کیا کہنا چاہتے ہیں بابا جان؟ میں سمجھ نہیں سکی۔“ اس کی آواز میں ہراس اور خدشات کی یلغار صاف محسوس ہونے لگی۔ بابا سائیں نے نگاہ بھر کے اس کے خائف بے حد سہم چہرے کو دیکھا پھر اپنی جگہ چھوڑ کر اس کے سامنے آئے اور مسکرا کر اس کا گال نرمی سے تھپتھپایا۔

”سکندر اچھا لڑکا ہے تمہارا انتخاب ہرگز غلط نہیں تھا بلکہ مجھے یہ کہنا چاہیے مجھے اچھا لگا میری بیٹی نے میرا دھیان اس جانب مبذول کر دیا۔ ورنہ تم جانتی ہو میں تمہاری وجہ سے کتنا پریشان تھا۔“ لاریب نے دیکھا وہ مسکراتے تھے۔ جبکہ لاریب حق دق کھڑی تھی۔ اسے لگا اسے اس کی سماعتوں نے دھوکہ دیا ہے اگر ایسا نہیں ہے تو بابا سائیں اس کے ساتھ اس کی زندگی کا سنگین مذاق کر رہے ہیں۔ اس نے بہت کچھ سوچا بہت انداز میں اپنے آپ کو ڈھارس دینی چاہی مگر بابا سائیں کہہ رہے تھے۔

”آپ جانتی ہو بیٹے میں بہت بوڑھا بہت ناتواں ہو چکا ہوں جبکہ جو حالات ہیں ان کے مطابق میری بیٹی کو اس وقت مضبوط اور بھرپور آسروں کی ضرورت ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے میں جلد سے جلد باقاعدہ سکندر کے ساتھ آپ کی رخصتی کر دوں۔“ لاریب کا رنگ ایک دم سے اڑ گیا۔ چہرہ پھرانے لگا۔ تعجب بے یقینی صدمہ جیسے

ہر لفظ اس کی کیفیت بیان کرنے کو نا کافی تھے۔ صحیح معنوں میں اسے لگا پے در پے پڑنے والی افتاد نے اس کے حواس سلب کر لیے ہیں بابا جان کے اس سفاکانہ فیصلے نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لینے کے بعد سر پر آسمان بھی گرا دیا تھا۔ یعنی یک نہ شد دوشد سکندر کو شوہر کی حیثیت سے قبول کرنا دوسرے لفظوں میں لوجہ موت کی سزا ہی تو سنائی گئی تھی۔ اس پر ہسٹریائی کیفیت طاری ہونے لگی مگر کیا قیامت تھی کہ وہ اپنے غم و غصے اور نفرت کا اظہار کرنے سے قاصر رہی۔ اس کا وجود پتھر کا مجسمہ بن چکا تھا۔

”اتنی خاموش کیوں ہو بیٹے؟ کیا آپ کو میرا فیصلہ پسند نہیں آیا؟“ بابا سائیں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور وہ اس سکتے سے نکل کر یوں تڑپ اٹھی جیسے ذبح ہوتا جانور چھری تلے پھڑ پھڑاتا ہے۔

”بابا جان.....“ وہ بے ساختہ و بے اختیار بلک اٹھی۔ ”آپ کہہ دیں بابا جان آپ مذاق کر رہے ہیں۔ میری معمولی غلطی کی اتنی بڑی سزا نہ دیں مجھے۔“ وہ گھٹنوں کے بل ان کے پیروں میں گرتی فریاد کناں ہوتی بلند آواز سے رونے لگی۔ بابا سائیں نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”ہم فیصلہ کر چکے ہیں لاریب! یہ تمہاری غلطی کی سزا نہیں ہے یاد رکھو وقت و حالات کی نزاکت کے پیش نظر ایک بہترین اور اہم اقدام ہے لیکن بے فکر رہو تم رخصت ہو کر کہیں نہیں جاؤ گی اسی حویلی میں رہو گی۔ البتہ سکندر کے تمام حقوق تم پر واجب الادا ہو جائیں گے۔ اس کی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے۔“ وہ اس وقت فیصلہ سناتے ایک سخت گیر باپ تھے۔ لاریب وحشت چھلکانی نظروں سے انہیں سختی ان کے چہرے پر کسی نرمی کی گنجائش کھوجتی رہی مگر ناکامی کی صورت اسے پھرا کے رہے گئی۔ اگلے لمحے وہ تند خیز موج کی طرح اٹھی اور سر اٹھا کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”تو پھر سن لیں آپ بھی مجھے آپ کا یہ فیصلہ ہرگز



نے منت مانی تھی اگر سحر ٹھیک ہو جاتا ہے تو میں خود کو اللہ کے تابع کر لوں گی۔ تمہارے رب نے اس بات کو ثابت کر دکھایا ہے مجھے مسلمان بننا ہے زینب۔“ وہ بے حد ٹھہرے ہوئے پر رسان انداز میں گویا تھی۔ زینب نے ٹھنک کر اسے دیکھا اس کے لہجے میں کوئی ہچکچاہٹ کوئی تردد نہیں تھا۔ اس کے باوجود زینب فوری کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔

”کیا تم صرف منت پوری کرنے کے لیے مسلمان ہونا چاہتی ہو نندی؟“ اس اہم سوال پر نندی کھل کر مسکرائے گی۔

”مقصد صرف یہی تو نہیں ہے زینب! اب تو جیسے کوئی ابہام کوئی شبہ باقی ہی نہیں رہا ضروری تو نہیں ہے کہ میں اسلام کو مکمل طور پر سمجھنے کے بعد اس کو اختیار کروں اصل معاملہ ہی تسلیمات و اقرار و رضا کا ہوتا ہے۔ میں نے تمہارے رب کی طاقت اس کی سچائی کو مان لیا ہے کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی بات اہمیت کی حامل ہو سکتی ہے؟“ اس کی نظریں سوالیہ انداز میں زینب کے چہرے کا احاطہ کر گئیں۔ زینب نے مسکرا کر سر کو فنی میں جنبش دی۔

”بالکل نہیں اور یہ کہ خدا تمہیں یہ فیصلہ مبارک کرے آمین۔“ زینب نے بے اختیار ہو کر اسے گلے سے لگا لیا۔ نندی کی آنکھیں جانے کس احساس کے تحت ہلکتی چلی گئیں۔

وہ دونوں خاموش تھے۔ ان کے بیچ موت کی سی خاموشی قائم ہو چکی تھی۔ جیسے کچھ کہنے سننے کو باقی رہ ہی نہ گیا ہو۔ صدمہ اور تاسف ایسا تھا کہ الفاظ اپنی حیثیت اپنا احساس کھو چکے تھے۔ فراز کے چہرے پر صرف مہمیر ناراضی ہی نہیں تھی گہری اور خوفناک خاموشی بھی تھی جو کسی طوفان کا پتہ دیتی تھی۔ شرجیل ابھی تک سکتہ زدہ تھا۔ بچہ اس کی گود میں تھا اور بھوک کے ساتھ شاید ماں کی گود کی طلب میں بھی بار بار بلک کر رونے لگتا تھا۔ فراز ہر بار

قابل قبول نہیں ہے اس سزا کو عمر بھر کا روگ بنانے سے ہزار درجے بہتر ہے آپ زہر دے کر مار دیں مجھے۔“ ہجان زدہ آواز میں کہتے وہ تقریباً چلا اٹھی اور مزید کچھ کہے سے بغیر پلٹ کر کمرے سے بھاگ گئی۔ رابداری کے موڑ پر اسی سمت آتے سکندر سے زور سے ٹکرائی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں ایک کی آنکھوں میں گریز تھا دوسرے کی نفرت کی چنگاریاں جو بھسم کر ڈالنے کی طاقت رکھتی تھیں۔ لاریب نے اسی تنفر اسی حقارت آمیز انداز میں اسے زور سے دھکا دیا اور یا گلوں کی طرح دوڑتی رابداری کا موڑ مڑ گئی۔ سکندر ہونٹ پیچھے گم صم کھڑا تھا۔



اس نے آنکھوں سے بہتا سیل رواں ہاتھ کی پشت سے صاف کیا اور سو بے ہوئے پوئے بامشکل اٹھا کر آسمان کو دیکھنے لگی۔ زینب کے رب نے ایک بار پھر اسے مایوس نہیں کیا تھا۔ موت کو شکست دے کر عباس نے زندگی کی جانب قدم بڑھائے تھے۔ اب وہ خطرے سے باہر تھا۔ تب سے ہی جیسے نندی کو بھی زندگی کی نوید ملی تھی۔ ”اب تو کچھ کھا لو نندی“ مجھے ڈر ہے تم خود بیمار نہ بڑ جاؤ۔“ زینب اس کے ہمراہ آ کر بیٹھ گئی۔ وہ حجاب میں تھی اور اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی۔ نندی نے اب کے کوئی مزاحمت نہیں کی اور زینب کے بڑھائے نوالے ہستی سے منہ میں رکھنے لگی۔

”تمہارا خدا بہت مہربان ہے زینب! اس نے ایک بار پھر میری بات رد نہیں کی۔ اس نے ثابت کر دیا وہ وحدہ لا شریک ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے اسی کے حکم سے اسی کی مرضی کا پابند ہے۔ مجھے بتاؤ میں اس کا شکر یہ کیسے ادا کروں؟“ اس کا لہجہ مدہم تھا زینب نے چونک کر اسے دیکھا پھر مسکرا دی۔

”وہ دلوں کے حالوں سے آگاہ ہے نندی اگر تمہارے دل میں تشکر کے جذبات ہیں تو اللہ ان سے ہر گز بے خبر نہیں ہے۔“ زینب کا لہجہ نوز نرم تھا۔

”منت تو ہر مذہب کا حصہ ہوتی ہے نازیب! میں







آنکھوں میں دھند ہی اتنی اتر آئی تھی۔ وہ ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپنے بے اختیار سسک پڑی۔ اس کی کوئی دھمکی کوئی فریاد کارگر ثابت نہیں ہو سکی بابا سائیں کا فیصلہ تو جیسے پتھر پر لکیر تھا کتنا سرچٹا تھا اس نے۔

”میں نے کہا بابا جان آپ ایسا نہیں کریں گے۔“ وہ جتنی بار بھی ان کے رو برو آئی تھی اس نے ہر بار مختلف انداز میں یہی ایک بات کہی تھی مگر بابا سائیں کے چہرے کے تاثرات میں معمولی سی گنجائش کا تاثر بھی نہیں ملتا تھا۔ میں اسے کبھی اس حیثیت سے قبول نہیں کر سکتی بابا جان وہ میرا ساتھ ڈیز رو بھی نہیں کرتا خود سوچیں کہاں عیاس کہاں یہ.....“ اس کے لہجے کا تنفر و تحارت اتنی بھرپور تھی کہ بابا سائیں کو تاؤ آنے لگا تھا۔

”یہ مت بھولا کرو لاریب کہ عباس وہ ہے جس نے ٹھکرا دیا تھا تمہیں اب تو تمہیں اس کا نام بھی زبان پر نہیں لانا چاہیے اور سکندر..... سکندر بھی تمہاری اپنی چو اس اپنا انتخاب ہے۔“ وہ اتنی سخت بات سن کر انداز میں ہرگز نہ کرتے اگر وہ اپنی ضد پر اڑی نہ رہتی۔ لاریب کو دھچکا لگا۔ اس نے یوں انہیں دیکھا جیسے یقین کرنا چاہتی ہو جو اس نے سنا وہی کہہ چکے ہیں وہ۔ بابا سائیں نے نظریں چرائیں لاریب تو اس سبکی و تذلیل پر جیسے کٹ ہی گئی تھی۔

”تو اس کا مطلب آپ مجھے سزا دینا چاہتے ہیں؟ اس غلطی کی؟“ وہ حواسوں میں لوٹی تو اس نے رگوں میں خون کی جگہ انگارے اور پارہ دوڑتا محسوس کیا۔ اس کا سوال کڑا تھا۔ اتنا کڑا کہ بابا سائیں کو لگا وہ اس پر اپنی کمزوری آشکار کر کے اسے شہہ دینا نہیں چاہتے تھے جبکہ وہ جان بھی چکے تھے وہ اپنا نقصان کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

”چلو آپ ایسا ہی سمجھ لو مگر لاریب..... بیٹے میں فیصلہ کر چکا ہوں۔“ اس نے سنا اور وحشت زدہ سی ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے اندر بھڑکتی آگ فروزاں ہو کر اسے کچھ اور تیزی سے دھڑا دھڑ جلائے گی۔

”تو پھر سن لیں بابا جان مجھے ہرگز بھی آپ کی تجویز کردہ یہ سزا منظور نہیں۔ میں خود کشی تو کر لوں گی مگر یہ سب

نہیں ہونے دوں گی۔“ اس کے لہجے میں بغاوت سرکشی ہٹ دھرمی اور نخعی بھی تھی یہ طے تھا وہ اپنے ہاتھ پر توڑ کر خود کو اس قابل نفرت شخص کے آگے نہیں ڈال سکتی تھی۔ بابا سائیں نے اس دھمکی آمیز انداز پر بے حد چونک کر اسے دیکھا پھر یکدم غصے میں آ کر اس کی جانب بڑھے اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھ پائی ان کا ہاتھ اس پر اٹھ گیا۔

”ایسا ضرور کرنا تم مگر اس سے قبل تمہیں میری مری ہوئی صورت دیکھنا پڑے گی۔ لاریب میں سکندر کے والدین کو ہی نہیں اپنے حلقہ احباب میں بھی سب کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کر چکا ہوں۔ اس فیصلے سے مجھے ہٹانا میری موت کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ کاش میں اس شرمناک صورتحال کا سامنا کرنے سے بہت پہلے ہی مر گیا ہوتا۔“ غم و غصے اور ہجانی کیفیت کے باعث وہ سرتاپا کانپ رہے تھے اور لاریب نے جانا وہیں اس کی شکست فاش ہوئی ہے۔ آنکھوں میں آنسو لیے وہ اپنے کمرے میں بھاگ آئی۔ کیسا احساس تھا یہ جس نے وجود میں ان گنت سوئیاں گاڑ دی تھیں جن کی اذیت جاگنی کی اذیت سے کیا ہی کم ہوگی۔

(عباس حیدر اگر تمہیں میری زندگی میں شامل نہیں ہوتا تھا تو مجھے راستے سے بھٹکانے..... میری زندگی میں تمہاری آمد اتنی ضروری بھی نہیں تھی میں کیسے حیونوں تمہارے بغیر مجھے جینے کے سب ڈھنگ بھول گیا ہوں) اس کے وجود کے ایوانوں میں وحشت سرپختی پھرتی تھی۔ یہاں اس حقیقت سے صرف وہ آگاہ تھی کہ اس خونی حادثے میں عباس سے اس کی من پسند بیوی چھٹی گئی ہے اس کا دل خوش نہیں کی انتہا پر تھا کہ بلا خروہ لوٹ کر اس تک آ جائے گا۔ جبکہ یہاں محبت کا راستہ کالی دیواریں کھڑی کر کے پانا جا رہا تھا۔ اس کی تو ایک ہی تمنا تھی عباس کے انتظار میں رہنے کی۔

اس سے بڑا بھی کوئی المیہ ہو سکتا تھا کہ سفر کی تھکن اور گرد و سیٹے مسافر اپنا زخم زخم وجود لیے واپس لوٹا تو انتظار میں بیٹھی پلکوں کی چھاؤں نہ ملتی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر

دی لیکن وقت کی سیادوں نے زخمی چڑیا کے پر بے دردی سے کاٹ ڈالے تھے۔ اس کا وجود سوائے پتھر پتھر کر اپنے زخموں کو بڑھانے کے اور کسی شے پر قادر نہ رہا تھا۔ عجیب بے بسی بے کسی کا عالم تھا۔ اس کے آنسو بے آواز گر رہے تھے۔ وہ خود سے پتھری لگ رہی تھی۔ جب ہی دروازہ کھلا اور امامہ تقریباً خوشی سے چلائی ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئی۔

”بجو..... یہ کیا سن رہی ہوں میں اللہ اللہ! اتنی پیاری خبر میرا تو خوشی سے برا حال ہونے لگا۔ سکندر بھائی اور آپ..... اف اف اف کتنے اچھے لگیں گے دونوں۔“ وہ اس کا سر چومتے ہوئے گال چومتے چومتے رہ گئی۔ گویا ابھی ابھی ہی تو اس کی نظر لاریب کے پتھر بنے چہرے پر موجود آنسوؤں پر پڑھ رہی تھی۔

”کیا ہوا بجو آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟“ امامہ کی بے قراری کا عالم بھی خوب تھا۔

”مصلوب ہونے والوں سے یہ پوچھنا کہ وہ غمگین کیوں ہیں سفاکی کی انتہا ہی ہو سکتی ہے۔“ اس کا مننا کہ لہجہ امامہ کا کلیجہ شق کر کے رکھ گیا۔ اس نے تھرا کر لاریب کو دیکھا تھا۔

”میں سمجھی نہیں بجو!“ اس کی آواز میں کسی خدشے کے احساس نے لرزش پیدا کر دی۔ لاریب نے دانستہ ہونٹ بچھنے رکھے۔

”ابھی حویلی میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلا ٹکراؤ سکندر بھائی سے ہوا وہ تو بالکل نارمل لگے مجھے۔“ امامہ کی حیرت سے کہی بات پر لاریب کا زہر سے بھر ا دل کچھ اور بھی نفرت سمیٹ لایا۔

”وقاص نہیں آیا تمہارے ساتھ؟“ اس نے امامہ کا چہرہ جانچا اس کی مثال اس ڈوبتے انسان کی تھی جو تنکے کا ٹکڑا سہارا نہ سمجھتا ہے۔

(باہ کاش وقاص ہی کوئی خواجواہ کا شر پھیلا دے اور اس ظلم و جبر کے سلسلے کی روک تھام ہو جائے کوئی تو بچائے مجھے اس اندھی کھائی میں گرنے سے) اس کا دل

سک سک کر بے حال ہونے لگا۔ وقاص تو شکار کے لیے اپنے خاص دوستوں کے ساتھ علاقہ غیر گئے ہیں۔ ایک مہینہ سے پہلے واپسی ممکن نہیں۔ میں ایویں تھوڑا ہی نظر آ رہی ہوں آپ کو یہاں پر۔“

”دھت.....“ امامہ کی فراہم کردہ معلومات نے اسے بالکل ہی مضطرب کر ڈالا تھا۔ (تو ثابت ہوا عباس حیدر کہ تمہاری طرف کھلنے والا ہر دروازہ بند ہوا چاہتا ہے..... مجھے بتاؤ میں کہاں تک حالات سے لڑوں کہ اب تو ہمتیں بھی جواب دے رہی ہیں)

اس نے بے حد شکستگی محسوس کرتے آنکھیں بند کر لیں مگر صبر و قرار کہاں تھا۔ وہ تو کب کا کھو گیا تھا اور کھونے والی چیزیں ضروری نہیں واپس بھی مل جائیں۔

اس نے گہرا سانس بھر کے بے تاب نظروں سے عباس حیدر کو دیکھا جو تیزی سے رو بصحت تھا مگر اب اسے عریضہ کے حوالے سے سلی دلاسہ دینا دشوار امر ہو چکا تھا۔ وہ عریضہ سے فوری طور پر ملنے کا شدت سے خواہش مند تھا اس کی حالت کے پیش نظر اس سے یہ روح فرساں خبر چھپائی گئی تھی۔ ورنہ شاید وہ آج اس حد تک اہمرو نہ کر چکا ہوتا۔

”آپ کا بہت شکریہ مس نندنی..... اس تعاون کے لیے مشکور ہوں۔ اب میں بہتر ہوں اور اپنا خیال بھی رکھ سکتا ہوں آپ پلیز میری خاطر خود کو اتنی زحمت نہ دیا کریں۔“ اس کے لہجے کا تکلف بے حد تکلیف کا باعث تھا مگر وہ اسے کسی بھی معاملے میں ٹوکنے کی ہمت ہی نہ رکھتی تھی۔ حالانکہ آج کل وہ باقی سب کو نندنی پکارے جانے پر بڑی روانی اور اعتماد سے ٹوک دیا کرتی۔

”نندنی نہیں مائی نیم از فاطمہ! الحمد للہ میں اسلام قبول کر چکی ہوں۔“ مگر عباس حیدر سے یہ اہم بات کہتے وہ جھجک جاتی تھی ان سابقہ چند دنوں میں اس نے کتنے بڑے بڑے فیصلے کیے تھے۔ دائرہ اسلام میں



داخل ہونے سے لے کر عباس کے دونوں بچوں کو اپنی کفالت میں لینے تک صرف یہی نہیں اس نے زینب کا گھر چھوڑ کر اپارٹمنٹ کرائے پر حاصل کر کے وہاں رہائش اختیار کر لی تھی۔ یہ اپارٹمنٹ زینب کے مدرسہ کے بالکل سامنے تھا۔ اور زینب نے اس کی مدد کے خیال سے ایک بے سہارا عمر رسیدہ عورت کو مستقل فاطمہ کے ساتھ کر دیا تھا۔ اس سے پہلے فاطمہ کے اس طرح الگ ہونے کے فیصلے پر بھی زینب نے اختلاف کیا تھا مگر فاطمہ اب مزید اس پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی تبھی اسے طریقے سے قائل کر لیا۔

”میں آپ کی محبت اور احسانوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی زینب! سب سے بڑا احسان وہ ہے جو آپ نے مجھے یہاں لا کر کیا کہ میں نے اسی بدولت پہلے عباس پھر اللہ کو پایا ہے۔ آپ جانتی ہیں زینب میری منزل کچھ اور ہے..... میرے مسائل بھی بہت الگ ہیں مجھے اپنے لیے نہیں جینا میں بہت پہلے زندگی کو اس شخص کے لیے وقف کر چکی ہوں وہ نہ سہی میں تو اس سے محبت کرتی ہوں مجھے اس کی ضرورت جتنی کل بھی اتنی ہی آج بھی ہے۔ بلکہ یہ خواہش مزید بڑھ گئی ہے۔ جو لوگ زندگی میں لازم و ملزوم ہوں ان کو اپنا بنانے اور اپنے سے قریب رکھنے کے لیے ہمیں جس قسم کے بھی حالات کو فیس کرنا پڑے ہمیں کرنا چاہیے میں پیچھے ہٹنے کو گناہ کا درجہ دیتی ہوں یونو مجھے اس کے دیئے زخم بھی پھول محسوس ہوتے ہیں۔ جنہیں میں اپنی خوشیوں پر زیادہ فوقیت دیتی ہوں۔ مجھے ساحر کی اک اک ادا سے عقیدت ہے۔ چاہے وہ غصہ ہو نفرت ہو یا پھر بدگمانی بیگانگی یا پھر بے نیازی جو بھی ہو دل سے قبول ہے۔ یہ ایسی حالت دل کے ہاتھوں آخری حد تک مجبور اور لاچار ہونے کے بعد ہی آتی ہے۔ تب ہی ایسی خواری نصیب بن سکتی ہے۔ پھر روپے تڑپیں مگر سوائے اس کے کہیں اور قرار بھی نہیں فرار بھی نہیں پھر یہاں فرار چاہتا بھی کون ہے۔“ وہ دکھ سے ہنسی تھی اور زینب چپ کی چپ رہ گئی۔ فاطمہ اسے بتا نہیں سکی تھی کہ

عباس کی طرف سے دل کو ذرا تسلی ہوئی تو اسے پہلا خیال بھی اس سے وابستہ لوگوں کا آیا تھا تو اس کے گھر کی جانب بچوں کی خبر گیری کو اس کے قدم اٹھ گئے تھے۔ یعنی وہ واقعی خود کو فراموش کر گئی تھی اور وہاں جا کر اس نے عباس کے جگر گوشوں کی بے قراری دیکھی تو تڑپ اٹھی تھی۔ جنہیں ملازموں کو اچھا خاصا ڈانٹ کر رکھ دیا۔

”تم لوگ آخر سمجھتے کیا ہو کہ صاحب بیمار پڑ گئے تو گھر پر تم سب کی اجارہ داری ہو گئی؟ شیم آن یو کم از کم اس پیش و عشرت سے نکل کر اتنا ہی خیال کیا ہوتا کہ ان معصوموں کو یہاں تڑپانے کی بجائے ان کی گرینڈ مائک پہنچا دیتے۔“ اس نے بچوں کے کپڑے تبدیل کیے پھر انہیں فیڈ کرنے کے بعد ملازموں کی کلاس لگائی تھی۔

”میم ہم ایسا کر چکے تھے۔“ میم صاحبہ کی ڈیڑھ اور صاحب کی شدید بیماری کے باعث بچوں کو سنبھالنے کا اصل حق اور ذمہ داری بچوں کی مانی کی ہی تھی مگر میم صاحبہ کی والدہ نے بچے ایک منٹ کے لیے بھی رکھنا گوارہ نہیں کیے یہ کہہ کر کہ جب ان کی ماں ہی نہیں رہی تو غیر آدمی کی اولاد سے ہمارا کیا تعلق میم یہ نہیں ہمیں بتانا چاہیے آپ کو کہ نہیں مگر یہ سچ ہے کہ میم صاحبہ کی والدہ اور بھائیوں نے اس حادثے کے بعد سے وقفے وقفے سے یہاں آ کر گھر کی تمام قیمتی اشیاء کا صفایا کر دیا ہے ہم لوگ ذات بھلا کیا بول سکتے تھے مگر ذرا ملتے ہیں کل کلاں کو الزام ہم پر ہی آئے گا۔ آپ اچھی انسان معلوم ہوتی ہیں اس لیے آپ کو بتا رہے ہیں کچھ کیجیے؟“ ادھیڑ عمر ملازمہ جو بچوں کو سنبھالنے پر مامور تھی نے اہم اطلاع دی جس کی باقی سب ملازموں نے بھی تائید کی تھی۔ فاطمہ کے روٹنے کھڑے ہونے لگے تھے۔ کیا ایسا ممکن تھا؟ وہ بے یقینی کے جھنور میں ڈوبنے لگی۔

”یہ بچے اتنے چھوٹے ہیں میم کہ مجھ سے نہیں سنبھال سکتے۔“ بہتر ہو گا کہ آپ ان کے لیے گورنس کا انتظام کرادیں۔“ ملازمہ نے بھی صاف ہری جھنڈی دکھا دی۔ تب فاطمہ نے وہ فیصلہ کیا جو اس کے خیال میں ضروری تھا۔ عباس

کے ساتھ ساتھ اس کے بچوں کی اہمیت بھی بہت زیادہ تھی فاطمہ کے نزدیک۔ وہ ان سے چشم پوشی اختیار کر رہی نہیں سکتی تھی۔

”آپ جس طرح مجھ سے باقاعدگی سے ملنے آتی ہیں ہندی اسی طرح عریشہ کے پاس بھی جاتی ہیں؟ مجھے ڈاکٹر نے بتایا اس کی ٹانگوں میں فریکچر ہوا ہے میں نے ہزار بار کہا میں اب ٹھیک ہوں مجھے عریشہ کے پاس جانے دیں مگر مانتے نہیں۔“ عباس کی جھنجھلاہٹ زدہ بے زار آواز پر وہ اپنے خیالات سے چونکی اور یکدم خائف نظر آنے لگی۔ یہ وہ موضوع تھا جس سے کترانی وہ عباس کے سامنے آنے سے گریز برتا کرتی تھی۔ وہ دن میں پتہ نہیں کتنی مرتبہ ڈاکٹر ز سے عریشہ کے متعلق سوال کیا کرتا تھا۔ اس کی اتنی انیج منٹ کو دیکھتے ہوئے ہی ڈاکٹر ز فی الحال اسے کچھ بتانے سے گریزاں تھے۔

”جی..... جی آپ ابھی مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوئے ہیں اس لیے۔“ وہ گڑبڑا کر بے ربط ہو کر بولی عباس نے جھلاتے ہوئے زور سے سر جھٹکا۔

”میرا سیل بھی اب میرے پاس نہیں ہے عریشہ کے پاس بھی کہاں ہو گا نندنی ہمارے لیے دفون سیٹ خرید کر لادیں۔ مجھے ہر صورت عریشہ سے رابطہ کرنا ہے۔“ وہ اتنی قطعیت سے کہہ رہا تھا جیسے اب انکار سننا ہی نہ چاہتا ہو۔ فاطمہ نے بوکھلا کر سر ہلایا اور پلٹ کر وہاں سے نکل آئی۔ وہ یہ سوچ سوچ کر ملک ان بھی کہ عباس اس کر بناک اور سفاک حقیقت کو آخر کس طرح قبول کر پائے گا۔ اسے پھر سے اس کی فکر لگ گئی تھی۔ وہ پھر سے مضطرب تھی۔

ایزی چیئر پر وہ بے دم سی پڑی جھولتی تھی۔ ویران آنکھیں سامنے دوپار میرا دیزاں اداس منظر کی عکاسی کرتے پورٹریٹ پر ٹھہری تھیں۔ دروازے پر آہٹ ہوئی مگر اس نے مڑ کر آنے والے کو دیکھنے کی خواہش محسوس نہیں کی۔ ہر احساس ہی سینے میں دم توڑ گیا تھا۔

”دیکھیں تو بچوں میں کسے لے کر آئی ہوں۔“ امامہ کی

شوخ لہکتی آواز پر اس نے نم پلکوں کو غیر محسوس انداز میں پونچھا اور رخ پھیرتے جیسے شعلوں میں گھر گئی۔ امامہ سکندر کا ہاتھ تقریباً دوپٹے شرات چھلکانی نظروں سے لاریب کو دیکھتی گویا اپنے کارپائے پرداد کی منتظر تھی۔ گو کہ سکندر کے انداز میں سنجیدگی تھی اور صاف لگتا تھا وہ محض مروت و لحاظ میں امامہ کو آنے سے انکار نہیں کر سکا ہے۔ اس کی نظر محض لمحہ بھر کو لاریب کے بھیکے چہرے سے ٹکرا کر پھر جھٹک گئی۔

”رنگیلی بڑی مشکل سے قابو کر کے انہیں لائی ہوں۔ آ پ پوچھیں ذرا ان سے اپنا کرا کیسا ڈیکوریٹ کروا رہے ہیں؟ ویسے راز کی بات ہے یا آپ کے کمرے میں آئیں گے یا آپ ان کے کمرے میں منتقل ہوں گی ایک تیسرا آپشن بھی ہے۔ عین ممکن ہے بابا جان آپ دونوں کے لیے حویلی کے اوپر والے پورشن میں بیڈروم سیٹ کرادیں۔“ امامہ کھلکھلا رہی تھی۔ سکندر اس کی شرارت پر جھینپا اس کا سانولا پرکشش چہرہ یکدم لودینے لگا تھا۔ لاریب کی آنکھیں سلگنے لگیں۔

”کیا مطلب میں سمجھتی نہیں کیا یہ محترم گھر داماد بننے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟“ وہ زور سے پھنکاری۔ امامہ کے ساتھ سکندر نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔ وہ مل کھا کر اس کے مقابل آئی اور اس کی گریزاں نظروں میں اپنی سرد آنکھیں گاڑھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ایسی ہی بات ہے نا یقیناً؟“ اس کے لہجے سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ سکندر کو اس کا انداز اس کا رویہ ہنک آمیز لگا مگر خود پر جبر کر کے محض سر اثبات میں ہلایا۔

”بابا سائیں کا یہی حکم ہے۔“ لاریب کچھ دیر اسے کینہ تو نظروں سے گھورتی رہی پھر جب بولی تو اس کا لہجہ اس کے اندر کی ساری پیش سمیٹ لایا تھا۔

”انہیں منع کر دو اگر انہیں مجھے بیاہنا ہے تو پوری طرح رخصت کریں۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بچو؟ آپ جانتی ہیں

شوخ لہکتی آواز پر اس نے نم پلکوں کو غیر محسوس انداز میں پونچھا اور رخ پھیرتے جیسے شعلوں میں گھر گئی۔ امامہ سکندر کا ہاتھ تقریباً دوپٹے شرات چھلکانی نظروں سے لاریب کو دیکھتی گویا اپنے کارپائے پرداد کی منتظر تھی۔ گو کہ سکندر کے انداز میں سنجیدگی تھی اور صاف لگتا تھا وہ محض مروت و لحاظ میں امامہ کو آنے سے انکار نہیں کر سکا ہے۔ اس کی نظر محض لمحہ بھر کو لاریب کے بھیکے چہرے سے ٹکرا کر پھر جھٹک گئی۔

”رنگیلی بڑی مشکل سے قابو کر کے انہیں لائی ہوں۔ آ پ پوچھیں ذرا ان سے اپنا کرا کیسا ڈیکوریٹ کروا رہے ہیں؟ ویسے راز کی بات ہے یا آپ کے کمرے میں آئیں گے یا آپ ان کے کمرے میں منتقل ہوں گی ایک تیسرا آپشن بھی ہے۔ عین ممکن ہے بابا جان آپ دونوں کے لیے حویلی کے اوپر والے پورشن میں بیڈروم سیٹ کرادیں۔“ امامہ کھلکھلا رہی تھی۔ سکندر اس کی شرارت پر جھینپا اس کا سانولا پرکشش چہرہ یکدم لودینے لگا تھا۔ لاریب کی آنکھیں سلگنے لگیں۔

”کیا مطلب میں سمجھتی نہیں کیا یہ محترم گھر داماد بننے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟“ وہ زور سے پھنکاری۔ امامہ کے ساتھ سکندر نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔ وہ مل کھا کر اس کے مقابل آئی اور اس کی گریزاں نظروں میں اپنی سرد آنکھیں گاڑھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ایسی ہی بات ہے نا یقیناً؟“ اس کے لہجے سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ سکندر کو اس کا انداز اس کا رویہ ہنک آمیز لگا مگر خود پر جبر کر کے محض سر اثبات میں ہلایا۔

”بابا سائیں کا یہی حکم ہے۔“ لاریب کچھ دیر اسے کینہ تو نظروں سے گھورتی رہی پھر جب بولی تو اس کا لہجہ اس کے اندر کی ساری پیش سمیٹ لایا تھا۔

”انہیں منع کر دو اگر انہیں مجھے بیاہنا ہے تو پوری طرح رخصت کریں۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بچو؟ آپ جانتی ہیں

شوخ لہکتی آواز پر اس نے نم پلکوں کو غیر محسوس انداز میں پونچھا اور رخ پھیرتے جیسے شعلوں میں گھر گئی۔ امامہ سکندر کا ہاتھ تقریباً دوپٹے شرات چھلکانی نظروں سے لاریب کو دیکھتی گویا اپنے کارپائے پرداد کی منتظر تھی۔ گو کہ سکندر کے انداز میں سنجیدگی تھی اور صاف لگتا تھا وہ محض مروت و لحاظ میں امامہ کو آنے سے انکار نہیں کر سکا ہے۔ اس کی نظر محض لمحہ بھر کو لاریب کے بھیکے چہرے سے ٹکرا کر پھر جھٹک گئی۔

”رنگیلی بڑی مشکل سے قابو کر کے انہیں لائی ہوں۔ آ پ پوچھیں ذرا ان سے اپنا کرا کیسا ڈیکوریٹ کروا رہے ہیں؟ ویسے راز کی بات ہے یا آپ کے کمرے میں آئیں گے یا آپ ان کے کمرے میں منتقل ہوں گی ایک تیسرا آپشن بھی ہے۔ عین ممکن ہے بابا جان آپ دونوں کے لیے حویلی کے اوپر والے پورشن میں بیڈروم سیٹ کرادیں۔“ امامہ کھلکھلا رہی تھی۔ سکندر اس کی شرارت پر جھینپا اس کا سانولا پرکشش چہرہ یکدم لودینے لگا تھا۔ لاریب کی آنکھیں سلگنے لگیں۔

”کیا مطلب میں سمجھتی نہیں کیا یہ محترم گھر داماد بننے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟“ وہ زور سے پھنکاری۔ امامہ کے ساتھ سکندر نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔ وہ مل کھا کر اس کے مقابل آئی اور اس کی گریزاں نظروں میں اپنی سرد آنکھیں گاڑھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ایسی ہی بات ہے نا یقیناً؟“ اس کے لہجے سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ سکندر کو اس کا انداز اس کا رویہ ہنک آمیز لگا مگر خود پر جبر کر کے محض سر اثبات میں ہلایا۔

”بابا سائیں کا یہی حکم ہے۔“ لاریب کچھ دیر اسے کینہ تو نظروں سے گھورتی رہی پھر جب بولی تو اس کا لہجہ اس کے اندر کی ساری پیش سمیٹ لایا تھا۔

”انہیں منع کر دو اگر انہیں مجھے بیاہنا ہے تو پوری طرح رخصت کریں۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بچو؟ آپ جانتی ہیں



سکندر بھائی.....

”جانتی ہوں یہ آدمی غریب نادار ہی نہیں ہے“  
کھنڈر زدہ گھر کا بھی گمین ہے۔ جہاں سہولیات کا تصور  
تک نہیں ہے مگر بابا جان کے علم میں یہ بات تھی اس  
کے باوجود انہوں نے یہ سزا دی ہے مجھے۔ میں اسے ہی  
قبول کروں گی انہیں کہہ دو امامہ مجھے ان کی یہ خیرات  
قبول نہیں ہے جب سزا کا حکم سنایا جائے تو پھر اس کی  
صعوتوں پر نگاہ نہیں کی جاتی۔“ اس کا لہجہ نہایت سرد  
تھا۔ امامہ کو اس پل اس سے خوف محسوس ہوا اور سکندر  
ہونٹ بھیجنے وہاں سے جا چکا تھا۔ امامہ نے ہی یقیناً یہ  
بات بابا سائیں کو بتائی تھی جسکی اگلے کچھ لمحوں میں ہی وہ  
اس کے سامنے تھے۔

”یہ کیا حماقت ہے لاریب کیوں اس طرح تنگ  
کرتی ہو بوڑھے باپ کو؟“ وہ جیسے بے بس کھڑے  
تھے۔ لاریب کرب کے جاں گسل عذاب سے گزر کر  
بڑی دقتوں سے لہی۔

”بابا جان جہاں اپنی ساری منوائی ہیں ایک میری مان  
لیں۔ کچھ مانگ تو نہیں رہی آپ سے۔“ اس کے انداز  
میں ایسی دلگیری تھی کہ لہجہ بھر کو سہی مگر بابا سائیں بھی ڈمگ  
گئے مگر محض اک لمحے کو۔

”شاید اس طرح تم مجھے باز رکھنا چاہتی ہو اس فیصلے  
سے۔ ایسا ہی سہی تم سکندر کے ساتھ رخصت ہو کر اس  
کے گھر چلی جانا۔“ وہ جتنا بھی شکستہ تھے مگر لاریب کی  
اذیت اس کے کرب کا اندازہ پھر بھی نہیں کر سکتے تھے۔  
اس نے ایسی نظروں سے انہیں دیکھا جیسے آخری پونجی  
ہارنے والا جیتنے والے کو دیکھتا ہے۔ مایوسی دلگیری اور  
صدے کی آخری حد پر کھڑی تھی وہ۔ کیسا المیہ تھا وہ جیتنے  
کی خواہش میں مزید ہارنی مزید جیتی جا رہی تھی۔

”میں یہاں سے ایک پیسے کا بھی جہیز لے کر نہیں  
جاؤں گی۔ آپ کو آپ کی جاہ و حشمت مبارک ہو۔ رخصتی  
کے وقت کا جوڑا بھی سکندر کے گھر سے آئے گا اور میں  
..... میں کبھی پلٹ کر پھر کبھی اس حویلی میں نہیں آؤں

گی۔ ٹھیک ہے نایابا جان؟ قبر میں مردے کو اتارنے کے  
بعد اس کی واپسی کی امید رکھی بھی نہیں جاتی۔ بے حرمی کا  
خدا شہ ہوتا ہے اس لیے۔“ وہ ہنس رہی تھی۔ کیسا بیجان وہ  
آیا تھا اس کی ہنسی کی چھتک میں۔ بابا سائیں نے ایک  
اذیت سے غڈ حال ہوتے ہوئے اسے دیکھا۔ انہوں  
نے اس کے وجود میں اترے طوفان کے جھٹکے اپنے اندر  
محسوس کیے۔ ان کا چہرہ شدید رنج کے باعث دھندلا  
لگا۔ انہیں لگا وہ بہت سارا رونا چاہتی ہے۔ وہ اتنی ضدی  
اتنی خود سر ہو رہی تھی کہ انہوں نے اک تھکی ہوئی نگاہ اس پر  
ڈالی اور خود کو کچھ اور بھی بوڑھا محسوس کرنے لگے۔

”اپنے باپ کی بے بسی کو اگر آ زمانا مقصود ہے تو یہی  
سہی بیٹے۔“ انہوں نے اب خود کو سنبھالنے کی سعی بھی  
نہیں کی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتے پلٹ کر تیزی سے  
چلے گئے۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے کانپ تو وہ بھی  
رہی تھی سر تا پا یہ جدائی ایسی ہی وحشت زدہ کیفیت اور  
نقصان کا احساس ہے۔ جس کا تصور ہی دہلا جاتا ہے۔  
جس پر بیٹتی ہے اس کی اذیتوں کا کیا شمار یہ تو یعقوب سے  
نہ سہی جا سکی تھی یہ تو پھر عام انسان تھے۔

(تو پھر یہ طے ہوا جب نا حاصلی ہی مقدر ہے تو پھر  
کیوں نہ ناشاد بھی رہا جائے جب جلتا ہی نصیب ہے تو  
پھر وہ آگ صرف ہجر کی کیوں ہو ہم جل رہے ہیں تو پھر  
سارے جہان کو کیوں نہ جلا دیں۔ ایسا تو ضروری ہو چلا  
کرتا ہے نا۔ دل کو یہ اطمینان تو ہوگا سزا کے سخت اور سخت  
دار صرف ہم نہیں ٹھہرے جیتنے والوں کو بھی یہ کرب جہا  
چاہیے) وہ پور پور ہر ٹلی ہو رہی تھی۔

چہرے پر آسکین ماسک اور بازو میں لگی ڈرب سے  
ہی اندازہ ہو پاتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ ورنہ اس کی مٹھم ٹھٹھ  
سانسوں کے علاوہ زندگی کی کوئی رمق اس کے وجود سے  
نہیں ملتی تھی۔ اسے سختی شرجیل کی آنکھیں آنسوؤں سے  
بھرتی چلی گئیں۔

(کوئی ایسا بھی کرتا ہے ایسی! نہ شکوہ نہ شکایت اور

ایسی حامد خاموشی..... تمہاری یہی خاموشی مجھے ڈس رہی  
ہے پلیز اٹھ جاؤ وعدہ کرتا ہوں ابھی اس غلطی کو نہیں  
دہراؤں گا ایک موقع تو دو مجھے ازالے..... تلافی کا)

ضبط چھلکا تو وہ اس کا ہاتھ تھامے سک پڑا۔  
دروازے پر آہٹ ہوئی اور کوئی قریب آن روکا۔ شرجیل  
مگر اس احساس سے بے خبر ہی رہا تھا۔

”میں یہ غم برداشت نہیں کر پارہا ہوں ایسی اگر  
بھی صورتحال رہی تو مر جاؤں گا۔ میری زندگی بچانا  
چاہتی ہو تو ٹھیک ہو جاؤ جانتی ہونا میں کس قدر عادی  
ہو چکا ہوں تمہارا؟“

”جس طرح کھولتے ہوئے پانی میں اپنا عکس نظر  
نہیں آتا اسی طرح انسان کی شخصیت بھی آزمائش کی بھٹی  
میں جھلے بغیر کھل کر سامنے نہیں آتی۔ ہم کیا ہیں کیا  
کر سکتے ہیں اس کا صحیح اندازہ ہی مصیبت کی گھڑی میں  
ہوتا ہے۔ باقی سب خوش گمانیاں ہیں جو ہمیں اپنی ذات  
سے لائق ہوتی ہیں اور صاحب غم سے گھبرانا نہیں چاہیے  
کہ شرم ہی تو انسان کا استاد مکرم ہوتا ہے۔ منزل تک پہنچنے کی  
جاہ ہو تو زور اور اہل تو لینا پڑتا ہے کوئی بھی مرتبہ یا مقام بغیر درد  
بغیر تکلیف کے ممکن کہاں۔“ برسران دھیمہ گھیر لہجہ اور  
بے حد سبک انداز گفتگو شرجیل کو محض گمان ہی گزر سکا کہ  
وہ اسی سے مخاطب ہے۔

”ڈاکٹر ابراہیم احمد! کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“ سبز  
آنکھوں بالکل سفید رنگت چھوٹی وارھی دراز قامت وہ  
بے حد وجہ نہ جوان تھا جوشل و صورت سے فائز مگر  
لباس سے عرب کا باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ شرجیل نے شاید  
ہی اس سے پہلے کسی کو اتنا نور دیکھا ہو۔

شرجیل بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بہت احترام  
آميز انداز میں اس سے ملا تو وجہ اس کی شخصیت کا غیر  
معمولی حسن اور متاثر کن انداز گفتگو تھا۔

”نخل ہونے پر معذرت خواہ ہوں مگر آپ کو اتنا غم زدہ  
پا کر میں کچھ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔“ وہ نرمی سے وضاحت  
کر رہا تھا۔ شرجیل کے چہرے پر پھر سے غم ویاس کے

وہی سائے لہرانے لگے۔

”یہ شاید واقف ہیں آپ کی انہیں کیا ہوا ہے بتانا پسند  
کریں گے آپ؟ اگر مانتہ نہ کریں تو..... انچولی بیٹھے  
کے لحاظ سے میں بھی ڈاکٹر ہوں آج یہاں آنا ہوا ہے مگر  
عین ممکن ہے میں آپ کو کچھ بہتر مشورہ دے سکوں۔“  
ابراہیم احمد نرمی و درسانیت سے کہہ رہا تھا شرجیل نے سر کو  
اثبات میں جنبش دی۔



”تم اندر تو آؤ نا یار۔“ فراز اپنے دوست عالیان کو  
ڈراپ کر کے کسی ضروری کام سے جاتا تھا مگر عالیان  
اسے ہر صورت چائے پلانے پر مصر ہوا بیٹھا تھا۔ دونوں  
کانچ فیلورہ چکے تھے آج عرصے بعد اتفاقاً پھر ملاقات  
ہونے کی وجہ عالیان کی گاڑی کا دغا دے جاتا تھا فراز نے  
فطرت سے مجبور ہو کر اخلاقیات نبھائی تھیں۔

”سوری عالی یار پھر کبھی سہی اس وقت واقعی ضروری  
کام ہے۔“

”کام سے تو تم جاؤ گے ہی صرف پانچ منٹ  
آ جاؤ شاباش۔“ عالیان کے اتنے اصرار کے آگے  
فراز کو مزید انکار آ کورڈ لگا جیسی اس کے ہمراہ اس کے  
گھر کے ڈرائنگ روم تک چلا آیا۔ عالیان اسے بٹھا  
کر خود اندر چلا گیا۔ کچھ تاخیر سے وہ تو نہیں آیا البتہ  
چائے لے کر جو ہستی آئی اسے دیکھ کر فراز کو اپنی  
بھارتوں پر جیسے یقین نہیں آ سکا تھا۔

”آپ..... اریہ شاہ! اللہ اللہ کوئی جانتا بھی نہیں ہوگا  
کتنا ڈھونڈا آپ کو کسی نے۔“ اٹھ کر کھڑے ہوتے اس  
نے اپنی حیرت کو ازلی شوخی میں چھپا کر بڑے شرم انداز  
میں کسی حد تک بے تکلفی سے اسے مخاطب کیا۔ چونکی تو  
اریہ بھی تھی ذرا دھیان سے اسے دیکھنے کے بعد وہ بھی  
دیر سے سہی مگر پہچان کا مرحلہ طے کر گئی تھی۔ تبھی جیسے  
چوتھوں سے اسے گھورا۔

”تو تم میرا پیچھا کرتے یہاں تک پہنچ گئے؟“  
”ہائیں.....!“ اس سراسر الزام نے فراز کو ہونق



کر کے رکھ دیا۔



وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ہاتھ کی انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ تھا۔ جسے خیال آنے پر منہ سے لگا کر کش لے لیتا، بڑھی ہوئی شیو بکھرے بال اور شکن آلود لباس کہیں سے بھی تو یہ وہ شرجیل نہیں لگتا تھا جس کی ڈریسنگ اور وجاہت پر صنف مخالف کی جان جاتی تھی۔ فراز نے اس کا جائزہ مکمل کر لینے کے بعد سرد آہ بھری اور پلٹ کر زارون (شرجیل کے بیٹے کا نام زارون تجویز ہوا تھا یہ کام بھی سمعیہ نے کیا تھا۔ ورنہ شرجیل کو تو صحیح معنوں میں اپنی ہوش بھی نہیں تھی۔ رہ گئے باقی گھر والے تو وہ بے حس اور سفاکی کی دبیز چادر اوڑھے خواب غفلت میں گم تھے۔ نبیل اور شذرا کے ساتھ لے دے کے ممتا تھیں جو خیال رکھ لیں مگر کوئی کہاں تک کسی کا خیال رکھ سکتا ہے اگر کسی کو خود اپنی پرواہ نہ ہو) کے ننھے بلکتے وجود کو سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی سمعیہ کو دیکھا۔

اس دن سے زارون سمعیہ کی ہی ذمہ داری بن چکا تھا مستقل۔ حالانکہ تائی ماں نے بہت واویلا مچایا تھا کہ یہ چھٹا تک بھر کی لڑکی بھلا کہاں تھی اس قابل کہ بچے کی دیکھ بھال کر سکے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ ان سنی بھی سمعیہ نے ہی کی تھی۔ جیسی کسی نہ کسی طرح گاڑی گھسٹ رہی تھی۔ صالحہ بیگم جو شرجیل پر اجارہ داری کے خواب سجائے بیٹھی تھیں کو بہر حال کبھی اتنی توفیق نہیں ہو سکی تھی کہ کبھی بچے کو روتے پا کر فیڈر بنا کر ہی غریب کے منہ کو لگا دے۔

”شرجیل بھائی، ہم اس کا نام زارون رکھ دیتے ہیں مجھے بہت پسند ہے یہ نام۔“ چند دن قبل جب سمعیہ بچے کو گود میں لیے اس کے پاس آ کر بولی تب بھی وہ اسی خود فراموشی کی کیفیت میں مبتلا دھواں اڑانے میں مصروف تھا، کچھ فاصلے پر موجود فراز نے جواب میں خاموشی کو پا کر سراونچا کر کے پہلے شرجیل پھر سمعیہ کو دیکھا جو جواب نہ ملنے کے باعث پتھر پتھر جھل سی ہو چکی تھی۔

”ہاں بہت پیارا نام ہے یہی رکھ لیتے ہیں“ محمد زارون احمد۔ ”فراز نے فائل بند کر کے میز پر رکھ دی اور خود اٹھ کر سمعیہ کے پاس آ گیا اور جھک کر بچے کو پیار کیا۔

”ٹھیک ہے۔“ سمعیہ کے دکھ بھرے انداز پر فراز کی جلتاتی ہوئی نظریں شرجیل کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ گویا در پردہ احساس دلانا مقصود ہو کب تک اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے چشم پوشی کرتے اس معصوم نازک لڑکی پر بوجھ ڈالے رکھو گے، مگر ادھر بے نیازی و غفلت کا عالم ہنوز تھا۔ فراز نے ہونٹ بھیجنے کر طیش دبایا۔

”میرا خیال ہے ہمیں زارون کے لیے گورنس کا انتظام کر لینا چاہیے بھائی سمعیہ کی پڑھائی کا خرچ ہو رہا ہے۔ بہت اہم سال ہے یہ اس کا۔“ فراز نے شرجیل کے سامنے نشست سنبھالنے ہوئے زبردستی اس کی توجہ حاصل کی اور اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں سلگتی سگریٹ کھینچ لی۔ شرجیل کی جامد آنکھیں لمحہ بھر کو بے زار انداز لیے انھیں یوں جیسے مداخلت ناگوار گزری ہو۔

”جو تم مناسب سمجھتے ہو کر لو۔“ وہ ہنوز لا تعلق تھا اور لا تعلق ہی رہنا چاہتا تھا۔ جواب بھی جیسے جان چھڑانے کو دیا تھا۔

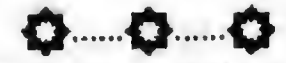
”مت بھولیں کہ یہ میری نہیں آپ کی ذمہ داری ہے۔ ایک نقصان کے اٹھا لینے کے بعد بجائے سنبھالنے کے آپ دوسرے نقصان کے اسباب پیدا کرنے شروع کر چکے ہیں۔ عقلمند انسان وہی ہوتا ہے جو غلطی سے سیکھے۔ بھابی کے ساتھ جو کچھ ہوا سراسر آپ کی نااہلی کی بدولت ہوا، یہ بچہ ہر لحاظ سے آپ کی توجہ و محبت کا مستحق ہے، لی کیئر فل اد کے؟“ اپنی بات کہہ کر وہ رکنا نہیں تھا لیکن اسے لگ رہا تھا اس کی ہر کوشش ناکامی سے دوچار ہے۔ شرجیل کے انداز میں ذرا جو فرق آیا ہو۔ خود ساختہ دکھان میں ڈوبا وہ اپنے اطراف سے غافل رہنا چاہتا تھا۔

”تم گئے تھے ملنے ساحر سے فراز؟ سنا ہے بہت حالت خراب ہے ابھی بھی اس کی میں نے تو لمحہ لمحہ کی تفصیلات ملاحظہ کی ہیں لی پر لیکن ساحر کو نہیں دکھا



رہے انچولی اس کا کوئی اسٹینٹ منٹ نہیں دیا جا رہا تھا۔ تمہاری بات اور ہے تم مل سکتے ہو ورنہ تو وی کے کسی نمائندے کو اس کے پاس بھی پھنکنے نہیں دیا جا رہا۔ سنا ہے اس کی بیوی کی موت کی خبر چھپائی گئی ہے اس سے پلیز تم اگر گئے تو مجھے بھی ساتھ لے جانا۔ بہت دل کرتا ہے اس سے ملنے کو۔“ صالحہ جانے کدھر سے نکل کر اس پر نازل ہو چکی تھی۔ فراز نے متاسفانہ نظروں سے اسے دیکھا کیسے لوگ تھے یہ اپنے گھر کو چھوڑ کر باہر جھانکنے اور دلچسپی تلاش کرنے والے۔

”بتاؤ نا؟ اتنے شوخ کیوں بن رہے ہو ہیرو بننے کے چانس بھی گئے اب تو..... ہا ہا ہا۔“ وہ اس کا مضحکہ اڑا رہی تھی۔ فراز نے جھلستی نظروں سے اسے دیکھا اور ہونٹ ہینچنے وہاں سے چلا گیا۔



سکندر نے دستک کے بعد اندر قدم رکھا تو بابا سائیں کو کمرے کے وسط میں ٹپکتے پا کر محتاط نظروں سے ان کا جائزہ لیتے گویا ان کے موڈ کا اندازہ کرنا چاہا۔

”آپ نے بلایا تھا۔“ کچھ تاخیر سے اس نے انہیں خود مخاطب کیا تو وہ یوں چونکے جیسے اسی بل اس کی موجودگی سے آگاہ ہوئے ہوں۔

”خیریت..... کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔“ سکندر کے انداز میں اضطراب تھا۔ سمجھ سکتا تھا جو بھی مسئلہ ہے لاریب کا پیدا کیا ہوا ہے۔

”آؤ سکندر! بیٹے آپ تو جیسے اب شکل دکھانے ہی آتے ہو۔“ وہ نا چاہے ہوئے بھی شکوہ کر گئے۔ سکندر کی خفت و خجالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”اماں اور بابا شادی کی وجہ سے خوش ہی اتنے ہیں بابا سائیں ہر جگہ باز اردوں میں مجھے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ حالانکہ متعدد بار کہا ہے اپنی پسند سے خریداری کر لیں۔“ وہ جھینپا ہوا سا وضاحت پیش کرتا بابا سائیں کو روٹین سے ہٹ کر بہت پیارا لگا تھا۔ جیہی نرمی سے مسکرا کر اس کا شانہ تھپکا۔

”خوش نصیب ہیں وہ والدین جنہیں یہ خوشیاں حاصل ہیں۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ لاریب مجھ سے الٹے سیدھے مطالبات منوار ہی ہے۔“ وہ جیسے ہرٹ ہوتے کہہ رہے تھے۔ سکندر نے سکون سے ان کی بات سنی پھر سرکوا ثبات میں جنبش دی۔

”آپ پریشان نہ ہوں بابا سائیں یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔“ سکندر نے خود کو کمپوز رکھا حالانکہ حقیقتاً وہ خود تشویش میں گھرا ہوا تھا..... سمجھتا تھا کہ وہ محض ضد میں آ کر یہ سب کر رہی ہے مگر اس مسئلے کا بہر حال کوئی حل بھی نہیں تھا سوائے اس کی ماننے کے۔

”اس اوکے بابا سائیں..... میں پورا گھر خاص طور پر اپنے کمرے کو اس مختصر سے ٹائم میں بھی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں ان کے شایان شان بنانے کا مجھ پر بھروسہ کریں بابا سائیں۔“ وہ بہترین بیٹا ہونے کا ثبوت فراہم کر رہا تھا۔ بابا سائیں کے دل سے آدھے سے زیادہ بوجھ سرک گیا۔

”جیتے رہو..... آباد رہو۔“ انہوں نے بے اختیار آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب دروازہ کھول کر تایا جان نے اندر قدم رکھا۔ اس منظر نے تو جیسے صبح معنوں میں ان کی آنکھیں سلگا کے رکھ دی تھیں۔

”مجھے تم سے ایسی توقع کبھی بھی نہیں تھی۔ عباس کی منگیتر تھی لاریب تم نے اس کی جگہ دی بھی تو کسے؟ کچھ تو حسب نسب کا خیال کیا ہوتا؟“ وہ غضبناک تھے آتے ہی برسنے لگے۔ بابا سائیں خود کو سنبھال کر سکندر سے الگ ہوئے اور ایک شرمسار قسم کی نگاہ سکندر کے دھواں ہوئے چہرے پر ڈالی۔

”تم جاؤ لڑکے یہاں سے مجھے بات کرنی ہے اپنے بھائی سے کچھ۔“ ان کا لہجہ حقارت اور غصے سے بھرپور تھا۔ سکندر جو ہونٹ ہینچے کھڑا تھا متغیر رنگت کے ساتھ تیزی سے پلٹا مگر بابا سائیں نے تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”سکندر بیٹے کی طرح ہے میرے لیے ہمارا کوئی بھی معاملہ اس سے الگ نہیں۔ آپ کہیے جو کہنا ہے اور

دوسری اہم بات یہ کہ عباس اپنی جگہ خود خالی کر کے گیا تھا۔ اب یہ میری مرضی ہے کہ میں اس کی جگہ کے سونپتا ہوں۔ میرے نزدیک حسب نسب سے زیادہ شرافت اور کردار اہم ہے۔ مجھے فخر ہے کہ سکندر ان خوبیوں سے مالا مال ہے۔“

”میں چلتا ہوں بابا سائیں کچھ دیر میں آتا ہوں۔“ سکندر کے لیے وہاں ٹھہرنا دو بھر ہو گیا تھا۔ جیہی وہ معذرت خواہانہ انداز میں کہتا تیزی سے مڑا۔

”تم بہت غلط کر رہے ہو بہر حال! مجھے کم از کم تم سے یہ توقع نہیں تھی کہ خود کو اتنا گرا لو گے ایک معمولی ملازم کو داماد بنا کر بیٹھ گئے ہو دنیا میں لڑکوں کی کی نہیں ہو گئی تھی۔“ دروازے سے نکلتے ہوئے بھی ان کا زہر ملا فقرہ کوڑے کی مانند اس کی روح پر ضرب کاری کر گیا۔ حیات بھی ایک مرض ہے اگر سمجھا جائے تو۔ جسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن سمجھانے میں شدید نا کامی کا سامنا ہوا کرتا ہے۔ یہ زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے صبر کی مانند ایک ڈھال بھی ہے۔ جہاں تعلق میں سچائی پیدا ہو جاتی ہے وہاں قناعت، راحت اور وسعت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر ایسا یہی تھا کہ یہاں تعلق میں یہ مقام نہیں تھا محبت نے صرف اسے خواری و ذلت کے احساس سے ہی دو چار کیا تھا۔

”بات سنو۔“ وہ اپنے دھیان میں تھا اتنا گم کہ لاریب کی راہداری میں موجودگی کو بھی محسوس کرنے سے قاصر رہا۔ اس پکار پر چونکا اور ٹھٹھک کر خالی نظروں سے اسے تنکے لگا۔ عجیب نظریں تھیں بیابانوں کی سی ویرانی سمیٹے۔

”تمہیں نہیں لگتا تم نے خود اپنے ساتھ زیادتی کر لی ہے؟“ سوال ہوا تھا اور سکندر کے ہونٹوں پر دنیا کی تلخ ترین مسکراہٹ اتر آئی۔

”اچھا..... نئی اطلاع ہے۔ ورنہ ساری دنیا کو آپ سے ہمدردی لاحق ہے کہ آپ ظلم کا شکار ہو رہی ہیں۔“ ”اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے بلاشبہ لیکن کسی مرد

کی بھی اس سے زیادہ بد نصیبی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کی شادی ایسی عورت سے کر دی جائے جو اسے پسند کرتی ہوتا عزت کے قابل جانتی ہو۔“ لاریب کا چلایا ایسا نشتر تھا کہ وہ کسی طرح بھی اپنے جذبات کو کنٹرول نہیں کر سکا سرخ ہو کر دپکتے چہرے کے ساتھ اس نے لہو رنگ آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”آپ شاید اس طرح مجھے طیش دلا کر اپنا مقصد حل کرنا چاہتی ہیں باقی تو ہر لحاظ سے نا کامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے نا آپ کو۔“ اس مرتبہ آگ لگنے اور آپے سے باہر ہونے کی باری لاریب کی جیہی وہ آتش فشاں لاوے کی طرح پھٹ پڑی۔

”میں اپنے سے کمتر لوگوں سے توقعات نہیں باندھا کرتی، نفس کی بے دام غلامی کرنے والوں سے تو بالکل نہیں۔ لیکن یہ طے ہے کہ میں تمہاری زندگی اجیرن کردوں گی یاد رکھنا۔“ احساس ذلت کے سبب اس پر جیسے خون سوار ہو گیا تھا۔ جیہی اس کا لہجہ اس حد تک ہتک آمیز ہو گیا۔

”محبت و نفرت کی جنگ میں ہمیشہ محبت کی فتح ہوتی ہے۔ ویسے ہی جیسے باطل کی جتنی بھی اجارہ داری قائم رہے مگر حق کو ایک دن پورے طمطراق سے چھانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ قانون قدرت ہے۔ ہم اپنی توانائیاں محبت پر صرف کریں گے فیصلہ وقت پر چھوڑ دیں گے۔“ جواباً سکندر نے جس درجہ تحمل سکون اور رواداری کا مظاہرہ کیا وہ لاریب کو چند لمحوں کو ہونٹ بنا گیا۔ معاوہ خود کو سنبھال کر خاصے تضحیک سے بھرے انداز میں مسکرائی۔ ”تم کچھ بھی کہو کچھ بھی کر لو لیکن یہ طے ہے کہ میں تمہیں کبھی عزت و محبت سے نہیں نواز سکتی۔“ وہ جتنی برہمی سے پھنکاری سکندر نے اسی قدر بے نیازی سے کاندھے جھٹک دیئے۔ اس سے قبل کہ وہ پلٹ کر وہاں سے جاتا تیا جان بہت جارحانہ انداز میں راہداری کے سرے پر نمودار ہوئے ان کا انداز جتنا غصیلہ اور قہر آمیز تھا ان کے پیچھے آتے بابا سائیں اسی قدر گڑ بڑائے ہوئے



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ علامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی مائیکرو ایف، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ابھی ٹوک دے  
وہ پہاڑ ہے.....!!  
کوئی بے قرار شجر نہیں  
دل غمزہ یہ بھی یاد رکھ  
تیرے پر نہیں.....!!

اس نے آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو نہیں روکا، نہیں پونچھا، وہ آنسو بہا بہا کر تھک گئی تھی مگر آنسو بہہ بہہ کر تھکتے تھے نہ ختم ہوتے تھے۔ اللہ جانے غم کا کتنا بڑا ذخیرہ تھا جس کا اختتام ہونے میں نہیں آتا تھا۔ آج بھی کسے سکتا تھا وہ جودل و جان اور زندگی سے بھی عزیز تر شخص تھا، اسی نے خود کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ عریضہ کے حوالے سے ملنے والی آگاہی نے کچھ اس انداز میں اس کے ذہن پر اثر کیا تھا ایسے نقوش چھوڑے تھے کہ وہ حواس سلامت نہیں رکھ سکا۔ بیجان کا وہ دورہ اتنا شدید تھا کہ وہ اس جدائی کے جاں گسل پاگل کر دینے والے خیال کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا اور خود کو ختم کرنے پر تل گیا تھا۔ یہ کیسی محبت تھی اس کی اس میں دیوانگی کا کیسا رنگ تھا کہ وہ اس کے بغیر زندہ رہنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کے حیرت انگیز لہر کی مانند بھرے وحشت چھلکاتے وجود کو قابو کرنے اور خود کو نقصان پہنچانے سے بچانے کی خاطر ڈاکٹر نے اسے مجبوراً دوا کے زیر اثر سلا دیا تھا مگر کب تک..... ہر بار ہوش میں لوٹ کر آنے پر اس پر وہی مجنونیت اور دیوانگی و بیجان زدہ کیفیت کا غلبہ اتنی شدت سے اثر انداز ہوتا تھا کہ ڈاکٹر کے لیے اسے مائل قرار دینا بھی مشکل ثابت ہونے لگا۔ اس دن فاطمہ کے پیروں تلے سے صبح کی طرح زمین سرک گئی تھی جس روز ڈاکٹر نے عباس کو اس صدمے کے اثرات اتنی شدت سے قبول کرنے پر آمادہ طور پر مائل قرار دے کر مینٹل ہسپتال میں ایڈمٹ کرانے کا حتمی فیصلہ دے دیا تھا.....!!

(جاری ہے)

ہر اسماں اور پریشان نظر آئے تھے۔  
تایا جان سکندر و لاریب کے بھونچکے چہروں کو نظر انداز کیے امامہ کو بلند آواز سے پکارتے آگے بڑھ گئے۔  
”میں اپنی بہو کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔ میرا نہیں خیال کہ تم اسے روکنے کی جرأت کرو گے یاد رکھنا یہ غلطی تمہیں بہت سیکھی پڑ سکتی ہے یہ طے ہے کہ میں اس کی موجودگی اس گندے ماحول میں برداشت نہیں کر سکتا۔“  
اگلے چند لمحوں میں وہ بدحواس شہنائی ہوئی امامہ کا ہاتھ پکڑے پھر وہیں آچکے تھے اور بے بس نظر آتے بابا سائیں پر آنکھیں نکال کر غرائے۔ وقت نے انہیں بہت سے گزند پہنچائے تھے مگر ان کی اکڑ اور تنفر کا وہی عالم تھا۔ بابا سائیں شاگرد کھڑے رہ گئے۔ ان کا یہ آخری طعنہ تو دودھاری تلواری طرح انہیں کاٹ کر رکھ گیا تھا۔ تایا جان جیسے آندھی طوفان کی طرح آئے تھے ویسے ہی چلے بھی گئے۔ سکندر نے فوری طور پر حرکت میں آتے بابا سائیں کو سہارا دیا جن کی حالت قابل تشویش ہو چکی تھی۔ وہ یونہی سہارا دیئے جلدی سے کمرے میں لے گیا۔ لاریب وہاں تنہا کھڑی رہ گئی تھی۔  
(تمہارے جرائم کی فہرست طویل تر ہوتی جا رہی ہے سکندر حیات جو تمہارے حق میں اچھا نہیں) دانتوں پر دانت جمائے انتہائی طیش کے عالم میں وہ سوچ رہی تھی۔



اسی خود فریبی کی آڑ میں بھلا کب تک  
شب غم سے بھاگو گے دور موسیٰ کے طور تک  
وہ جو چھپ کے بیٹھا ہوا ہے دل کے کواڑ میں  
وہی دکھ کہیں نہ کہیں سے نکلی گرائے گا  
وہ سیاہ رنگ پہاڑ ہے  
وہ تو بولتا بھی ہے چل بھی سکتا ہے بھاگ بھی  
دل غم زدہ ذرا بھاگ بھی  
اسے جاگ جاگ کے جھومتے ہوئے دیکھ بھی  
بڑی احتیاط سے غور کر  
اسے چھاؤں بننے سے روک دے



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ تمام پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)

مجھے خبر لائی

امیر



اب رقیب نہ ناح نہ غمگسار کوئی  
تم آشنا تھے تو تمہیں آشنائیاں کیا  
ستم پہ خوش کبھی لطف و کرم پہ رنجیدہ  
سکھائیں تم نے ہمیں کج ادائیاں کیا

#### گزشتہ قسط کا خلاصہ

سکندر بابا سا میں کے فیصلے پر بیک وقت خوشی و حیرانگی کے ملے جلے جذبات سے دوچار ہوتا ہے ایسے میں وہ بابا سائیں کو اس فیصلے کے نتیجے میں پیش آنے والے سنگین نتائج سے گماہ کرتا ہے مگر بابا جانی کے اطمینان کو دیکھ کر وہ بھی وقتی خوشی سے محروم ہوتا ہے ایمان طبیعت کی بگڑتی صورت حال سے شرجیل کو آگاہ کرتے ہوئے اسے آفس جانے سے منع کرتی ہے جواباً وہ اسے اس کا محض ڈرامہ قرار دیتے ہوئے دفتر چلا جاتا ہے شزا اسے ناشتا بنانے کے لیے بلائے آتی ہے مگر اس کی زبردست دیکھ کر ٹھنک جاتی ہے پھر ایمان کے کہنے پر وہ ماما کو جاکے بتاتی ہے جو فوراً فکر مندی سے گھبرا جاتی ہیں مگر تائی اماں انہیں اپنی سفاکی کی وجہ سے ایمان کو ڈاکٹر کے پاس جانے سے روک لیتی ہیں وہ انہیں گزر رہے ہوتے واقعات یاد دلا کے بلیک میل کرتی ہیں جو بابا ماما چپ ہو کے رہ جاتی ہیں جو بھی تھا آفاق والے معاملے میں وہ بھی ناؤ اور تائی جی کے ساتھ شریک تھیں جب ہی اتفاق سے فراز گھر آ جاتا ہے اور ان کی ساری باتیں سن کر گنگ مدہ جاتا ہے ماؤف ذہن کے ساتھ وہ ایمان کو ہسپتال لے کر بھاگتا ہے جو ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکی ہوتی ہے۔ مندی نڈر حال ہی حالت میں زینب کے ہمراہ ہسپتال پہنچتی ہے جہاں عریش کی موت کی خبر اور عباس کی خطرناک حالت دیکھ کر وہ مدد سے گنگ رو جاتی ہے۔ وہ زینب کو اپنے اللہ سے عباس کے لیے دعا کرنے کو کہتی ہے۔ عباس کو اس حالت میں 24 گھنٹے ہونے

ان کے گھر آتے ہی تمام افراد میں کھلبلی سی مچ جاتی ہے۔ ماما ایمان کو نہ پا کر فراز سے استفسار کرتی ہیں جو باوہ انہیں نہایت مخی سے ایمان کی کوڑے میں جانے کی بات بتاتا ہے تائی اماں فاقہ منہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے ماما کو دیکھتی ہیں جبکہ ماما احساس جرم سے سر جھکا کر رہ جاتی ہیں۔ مندی عرف فاطمہ عباس کے بچوں کی ذمہ داری بھی اپنے کندھوں پر لے لیتی ہے اسے حقیقتاً عریش کی والدہ کے رویے سے گہرا دکھ پہنچتا ہے ادھر عباس تیزی سے صحت کی جانب گامزن ہوتا ہے فی الحال اسے عریش کی موت کی خبر سے گماہ نہیں کیا جاتا مگر اب وہ بارہا عریش کے متعلق سوال کر رہا ہوتا ہے۔ فراز اپنے دوست عالیان کو ڈراپ کرنے اس کے گھر جاتا ہے جہاں اریبہ شاہ کو پا کے وہ خوشگوار حیرت کا شکار ہو جاتا ہے۔ شرجیل شکست خوردہ حالت میں اپنے حالات پر ماتم کن رہتا ہے ایسے میں سمعیہ ہی اس کے بیٹے کی ذمہ داری سنبھالتی ہے اور اسی کے کہنے پر بچے کا نام زارون رکھ دیا جاتا ہے فراز سمعیہ کی پڑھائی کے حرج کو دیکھ کے شرجیل پر مزید گرجتا ہے اور اسے گدنس کے انتظام کا کہتا ہے۔ تائی اماں بابا سائیں کے سکندر کو دلدل بنانے کے فیصلے پر شدید اختلاف کرتے ہیں ان پر اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے اور امامہ کو اپنے ساتھ واپس لے جاتے ہیں جبکہ لاریب سکندر کو مزید پیش دلانے کی کوشش کرتی ہے۔ عباس عریش کی موت کی خبر سن کر یحسان زہد کیفیت کے زیر اثر آ جاتا ہے ڈاکٹر ز کے لیے اسے نارل قرار دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ فاطمہ یہ سب سن کے گنگ رو جاتی ہے جب ڈاکٹر عباس کو مینٹل ہسپتال میں شفٹ کرنے کا کہتے ہیں۔

#### اب آپ آگے پڑھیے

”اب آپ کیا کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟“ فاطمہ کے منہ سے ٹھنکی ٹھنکی چیخ نکل گئی۔ اس کے سامنے دنیا الٹ رہی تھی۔ وہ اسے نہیں مانتا تھا۔ وہ اسے مل نہیں سکتا تھا۔ یہ خیال جس کچھ کم اذیت ناک اور وحشت زدہ نہیں تھا مگر وہ اس

حالت کو پہنچ جائے گا کہ زندگی سے منہ موڑ لے گا یہ حقیقت کند چھری بھی جو بے دردی سے رگ جاں میں اذیت کے ان گنت دنگے شکار کر رہی تھی۔

”پریشان نہ ہوں محترمہ! اوقات شدید ذہنی صدمہ عارضی طور پر ایسی کیفیت میں لے جاتا ہے بہتر علاج اور دیکھ بھال کی بدولت ذہن اس صدمہ کی کیفیت سے نکل کر پھر سے اپنی کھوئی ہوئی قوتیں بحال کر لیتا ہے یہ بیجانی کیفیت مستقل نہ ہوگی آپ بھی دعا کریں اللہ بہتر کرے گا۔“ ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ انداز میں تسلی سے نوازا تھا مگر فاطمہ اپنے دل کا کیا کرتی جس میں سرسراہتی وحشت اور گھبراہٹ کو کہیں ٹھکانہ نہ مل رہا تھا غم کا لامتناہی پہاڑ تھا جو اس پر اتار رہا تھا جس روز عباس کو ذہنی امراض کے اسپتال میں منتقل کیا گیا فاطمہ کو لگا عباس کی طرح اس غم سے ہار کر وہ بھی اپنا ذہنی توازن کھو دے گی۔ دل کو کسی طرح بھی قرار نہیں آ سکا تو ایک عرصہ بعد زینب کی جانب چلی آئی۔ جانتی تھی اس وقت زینب مدرسہ میں ہوا کرتی ہے۔ جامعہ کی شاعرا سفید عمارت کا آہنی دروازہ عبور کر کے وہ وسیع و عریض ہال میں پہنچی جس پر سفید قالین بچھے ہوئے تھے ان پر بہت سلیقے سے ڈیسک لگی ہوئی تھی۔ ڈیسکوں کے پیچھے سفید یونیفارم اور گلابی اسکارف میں لمبوس لڑکیاں بیٹھیں تھیں اور زینب انہیں لکچر دینے میں مصروف تھی۔ اس نے ایک نظر فاطمہ کو دیکھا اور مسکرا کر اشارے سے اسے وہیں بیٹھنے کو کہا اور اپنا لکچر جاری رکھا۔

”سب سے پہلے تو آپ لوگ یہ ذہن میں رکھیں یہاں آپ کو دین پڑھایا جا رہا ہے مذہب نہیں دین اور مذہب میں بہت فرق ہے۔ دین Religion کو کہتے ہیں اور مذہب عقیدے یا اسکول آف تھاٹ کو پڑھنے سے قبل ایک بات ذہن میں رکھیں اور گروہ سے بندھ لیں کہ دین میں دلیل صرف قرآن پاک یا حدیث سے ہی دی جاسکتی ہے۔“

فاطمہ بیٹھ چکی تھی مگر اس کے دل کی وہی حالت تھی اس کا دل چاہا زینب کو لکچر دینے سے روک دے اس کا دھیان











آپ کو کیوں یہ بات سمجھ نہیں آتی۔ کتنے دن ہوئے زارون کو سمجھ سنبھال رہی ہے۔ حالانکہ وہ چھوٹی ہے اور اس کی تعلیم کا بھی حرج ہو رہا ہے تاکہ اس کا احساس ہوا اس بات کا دوسری اہم بات یہ کہ ایمان کی طرف سے ساری دنیا بھی مایوس ہو جائے تو میں اس کی واپسی اس کی صحت یابی سے مایوس نہیں ہوں گا۔ اس کا جلتا ہوا لہجہ شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ انہیں اس پل بیٹے کی شاکی نظروں سے نظریں چار کرنا دشوار محسوس ہوا مگر ایک مجبوری تھی جس کے تحت وہ اس پر دباؤ ڈالے جا رہی تھیں۔

”تم بھی سمجھو بیٹے ابھی یہ صالحہ کی ذمہ داری نہیں ہے ذمہ داری بنے گی تو خود بخود۔“

”معاف کیجیے گا مئی۔“ شرجیل نے زہر خند لہجے میں ان کو ٹوک دیا۔

”میں کوئی رسک لینے کے موڈ میں نہیں ہوں جہاں تک شادی کی بات ہے تو سن لیں اول تو مجھے شادی کرنی ہی نہیں اگر اپنے بچے کی خاطر مجھے ایسا قدم کبھی مجبوراً اٹھانا پڑا تو قرعہ قال صالحہ کے نام کبھی نہیں نکلے گا۔ میرا سارا نقصان جن لوگوں کی بدولت ہوا میں انہی کی جیت کا سامان مہیا کروں۔ ایسا کبھی ممکن نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے آئندہ اس تکلیف دہ موضوع پر مجھ سے بات نہیں کریں گی۔“ اس نے بات ہی ختم کر دی۔ لہجہ دو ٹوک تھا قطعیت سے بھرپور۔ یہ شرجیل کی سوچ ہو سکتی تھی تاکہ اس کی نہیں محسوس کے مارے انہوں نے ماں بیٹے کے درمیان ہونے والی گفتگو کو چھپ کر سنا تھا اور نفرت کے زہر سے نیلی پڑتی چلی گئیں۔

(پچھتاؤ گے شرجیل تم میں دعوے سے کہتی ہوں کہ تمہیں اپنا تھوکا چاٹنے پر مجبور نہ کیا تو نام بدل دینا میرا میں نے تو بڑے بڑے فرعون سیدھے کر لیے تم کیا چیز ہو) وہ وہاں سے پٹیس تو ان کا شیطانی دماغ آئندہ کی منصوبہ بندی میں مشغول ہو چکا تھا۔

اس نے سگریٹ کا گہرا کش لیا۔ دل نہایت بوجھل

تھا۔ آج شدتوں سے اس کے دل نے تمنا کی تھی کوئی اس کا اپنا ہوتا ایسا راز داں جس کے گلے لگ کر وہ سارے نسو بہا دیتا۔ لاریب رخصت ہو کر یہاں آئی تو گویا غریب کی جھل میں ماہتاب اتر آیا تھا۔ واقعہ تو حیران کن ہی تھا لوگ اس کی قسمت پر رشک کرتے نہیں جھکتے تھے۔ سب جانتے تھے وہ وسیع جائیداد کے مالک اعلیٰ نسب شاہ صاحب کی بیٹی ہے۔ طبع نازک یہ کوئی بات گراں نہ گزرے جس میں اس شب بالخصوص اماں نے محلہ کی خواتین لڑکیوں بالیوں اور بچوں کو گھر میں آمد پر پابندی لگا دی۔

لاریب کو ایک طرح پنکوں کے سائے میں سکندر کے کمرے تک پہنچایا گیا تھا۔ جو جتنا بھی سجا سنوار لیا گیا تھا مگر اس پھولوں کی ملکہ حسن کی شہزادی کے شایان شان نہیں بن سکتا تھا۔ اماں دلہن کو کمرے میں پہنچا کر سکندر کو ڈھونڈتی ہوئی کچن میں آئیں تو اسے چو لہے کی جھجکتی آگ کے آگے بیٹھے راگہ کریدتے پایا۔ وہ کم مسم تھا اور ہرگز بھی خوش نہ لگتا تھا۔ اپنے کمرے کی مٹی کھڑکی سے ایک ٹک اسے دیکھتی تھانیکہ آنکھیں بھر بھرتے لگیں۔

”تو یہاں کیا کر رہا ہے سکندر نے چاہے کمرے میں دلہن انتظار کر رہی ہوگی۔“ یہ ایسی بات تھی جس پر سکندر کا سناٹوں میں گھرا دل قہقہہ لگانے کو چاہا۔ مگر خود اپنا مہنگا اڑانا دل گردے کا ہی کام ہو سکتا ہے اس نے جاؤ وہ بزدل ہے اتنا بزدل کہ اپنے زخم چھپا کر بس نہیں سکتا۔ اپنی ماں کی تسلی کی خاطر بھی نہیں۔

”یہ لے پکڑ پتر دلہن کو پہنا دینا۔ اب جا۔“ وہ دل کڑا کیے اپنے کمرے کی جانب چلا آیا۔ اس پل لاریب کے موڈ کا سامنا کرنا بھی کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ پتا نہیں وہ اتنا کم ہمت کیوں ہو رہا تھا۔ نئی زندگی کی شروعات کے پہلے ہی مرحلے پر اس پر ٹھکن اور اضطراب کا غلبہ تھا پہلے قدم پر ہی اسے دھوکا لگا۔ مصنوعی پھولوں اور سنہری پٹیوں سے کی گئی مسہری کی ڈیکوریشن اجڑ کر ایک بے ترتیب ڈھیر کی صورت چٹائی پر پڑی تھی۔ دیگر اشیا کا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا سکندر نے کوٹ کے مٹن کھولتے ہوئے

نظر کھما کر پورے کمرے میں لویا اس شہ سا ماں کو تھا شا جس کی یہ معمولی تپاہی وہ ملاحظہ کر چکا تھا۔ اس پل کھٹکا محسوس کر کے وہ بے اختیار ایزویوں کے بل گھوما اور اس کڑا کے کی سردی میں لاریب کو تازہ غسل کر کے باہر آگے دیکھا کر ششدر رہ گیا۔ گیزر کے انتظام کے بغیر اتنے بج بست پانی سے نہا کر اس نے اپنے اندر جلتی نفرت کی آگ کو بجھانے کی کوشش کی ہوگی۔ اس سوچ نے ہی اسے ہونٹ کھینچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”تو اپنے تئیں تم نے یہ اہتمام کر کے اس جگہ کو میرے قابل بنانے کی کوشش کی تھی کتنے احمق ہوتم۔“ لاریب نے تویہ اتار کر گیلے ہال جھٹک کر پشت پر گر آنے کے بعد مسہری کی داہنی جانب نیچے اپنی قسمت گوروتے کاغذی پھولوں کے ڈھیر کی جانب اشارہ کیا۔ سکندر ہونٹ بھینچے کھڑا رہا۔ وہ اسے یہ بتا کر خود کو مزید ہلکا نہیں کرنا چاہتا تھا کہ یہ اس کی خوشی میں دیوانے ہوتے اس کے ماں باپ کا شوق تھا۔

”یہاں کیوں آئے ہوتم؟“ ڈریسنگ ٹیبل سے بیٹھ کر ش اشاعہ کر وہ آتش دان کے قریب چلی گئی۔ اس کا نازک لچکتی ڈال جیسا بدن سردی کے باعث کپکپا رہا تھا اور ہونٹ نیلے پڑ چکے تھے۔ اس سوال پر سکندر نے بری طرح چوٹک کر اسے سنجیدہ نظروں سے دیکھا۔ البتہ پیشانی پر موجود تردد کی لکیریں ناگواری کے بلوں میں تبدیل ہو گئیں۔

”مطلب کیا ہے آپ کی اس فضول بات کا۔“ اس کے چاندی جیسے نظریں دنگش سراپے پر رخ و ترش نگاہ جما کر وہ جیسے لہجے میں استفسار کر رہا تھا۔ لاریب نے مسخرانہ ہنکا رہا۔

”اب جبکہ میں اس کمرے میں موجود ہوں تو تمہارا یہاں کوئی کام نہیں ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک اپنی حیثیت سے تو آگاہ ہو ہی اچھی طرح یا پھر کہو تو وضاحت کروں کہ تم۔۔۔۔۔“

”لاریب میں آپ کی بدتمیزیاں اور گستاخیاں بہت برداشت کر چکا۔ میرا ضبط نہ آزما میں تو ہی اچھا ہے۔“ سکندر کا انداز تنبیہ تھا۔

”جیسے دسمیلیں دینے کے بجائے بہتر ہوگا تم یہاں سے چلے جاؤ میں تمک چلی ہوں اور اب آرام کی خواہش مند ہوں جو ظاہر ہے تمہاری موجودگی میں مجھے میسر نہیں آ سکتا۔“ وہ جواباً تمک کر بولی۔ لہجے میں عزت نام کو نہیں تھی۔ سکندر کا دماغ اس حکمانہ و متکبرانہ انداز میں الٹ سا گیا۔ دل چاہا ساری مروت لحاظ بالائے طاق رکھے اور آج اسے اچھی طرح اپنی اہمیت سمجھا دے مگر اس پھولوں سے نازک تر چاندنی میں نہایا ہوا روپ رکھنے والی لڑکی میں اس خرد ماغی کے باوجود کچھ ایسا ضرور تھا جو سکندر کو بے بس کر جاتا تھا۔ وہ اس کے کتے کے ہمیشہ ہارنا آتا تھا تو وہ اس سے محبت کا جذبہ تھا۔ جو ایسا خالص تھا کہ اس کی خواہش اور چاہ کو الٹ جانے ہی نہیں دیتا تھا۔ بس ایک نظر اس کے حسین و دلربا چہرے پر پڑا تھی اور سارے مٹنی جذبے برف کی چادر میں جا چھپتے۔

”اے غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟“ وہ اس کی نظروں کی تپیش کو محسوس کرتے ہی بھوکی شیرنی کی طرح غرائی۔ سکندر کو اس ساری صورت حال کی گیسورتا کے باوجود اس کی اس آخری کانٹھس ہو جانے والی حرکت نے بے اختیار مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ جتنی بھی بہادر بنی تھی تو آخر ایک لڑکی ہی نازک اور کمزور۔ مرد کی طاقت اور طیش کے کتے کے ہلا خراپتی نسوانیت سمیت ہار مان جانے والی۔ ہٹنا بھی خوف اسے بھی لاحق تھا اس پل۔

”اپنی بیوی کو دیکھ رہا ہوں۔“ سکندر کا موڈ ایک دم بدلا جیسی شرارت سوچھی تھی۔ لاریب پہلے تو ہونٹ ہونٹ پھر جھلس کر رہ گئی۔

”بکو اس مت کرو سمجھے اور سنا نہیں تم نے یہاں سے جاؤ۔“ وہ اسے دونوں ہاتھوں سے دھکا دیتے ہوئے چیخی سکندر نے اس کی ہلکیاں ہی جکڑ لی تھیں۔

”چاہوں تو ایک منٹ میں تمہیں زیر کر لوں اپنے سامنے اور تم کچھ نہ کر سکو گی۔ یہاں تک کہ ہمیشہ کی طرح شور مچا کر بابا سائیں کو بلانے والی دھمکی بھی نہیں دے سکتی ہو اور تم جانتی ہو کیوں؟“ اس نے جلتاے



ہوئے لہجہ میں کہہ کر انہیں شہادت سے اس کی تھوڑی کو اوپر اٹھایا۔ لاریب جواب تک کسی ٹرانس میں تھی اس کیفیت سے نکل کر پھر پھڑا کر اس کی گرفت سے آزاد ہوئی اور تڑپ کر فاصلہ بڑھایا۔ سینے میں موجود دل اس کی گستاخانہ جرات پر بے طرح دھڑھڑا اٹھا تھا۔

”تو تم نہیں جاؤ گے؟“ اس نے پوچھی ہوئی آواز میں سوال کیا گویا خود کو مجروح کیفیت سے آزاد کرنا چاہا جس میں بھی تھوڑی دیر قبل وہ ناچا ہے ہوئے بھی گرفتار ہوئی تھی۔

”کیا فضول ضد ہے یا زچہ تو خیال کرو کتنا آکورو گئے گا میرا کمرے سے باہر جانا اماں بابا یا پھر ثانیہ سے مخفی نہیں رہے گا۔ ضروری ہے اپنی چپقلش کو یوں آشکارا کرے۔“

”مجھے سبق مت پڑھاؤ سمجھے۔“ وہ حلق کے بل چیخی اس طرح کہ سفید اجلی رنگت دہک اٹھی۔ سکندر اسے دیکھے گیا کتنی حسین تھی وہ مگر اس سے بڑھ کر سنگدل ہے جس خاتم۔ ”اگر تم نہیں جاؤ گے تو ٹھیک ہے میں چلی جاتی ہوں یہ طے ہے کہ میں تمہارے ساتھ ایک کمرے میں نہیں رہوں گی۔“ اپنی مثال بستر سے اٹھا کر اور جیتی ہوئی وہ اسی طیش کے عالم میں دروازے کی جانب لپکی تھی کہ سکندر بوکھلا کر اس کے راستے میں آ گیا لاریب نے بھنا کر کہنے تو زنگیوں سے اسے دیکھا۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو لاریب؟“ خواہ مخواہ ایٹھونہ بنائیں مجھ پر بھروسہ تو کرنا چاہیے آپ کو۔“ وہ جیسے بری طرح زچ ہو کر مفاہمت آمیزی سے کہہ رہا تھا لاریب نے اب کی مرتبہ اس کی بات کا جواب دینا بھی گوارا نہیں کیا اور کتر کر لکھنا چاہا تھا کہ سکندر نے سرعت سے اس کی کلائی پکڑ لی۔

”اگر یہ ناگزیر ہے تو پھر میں چلا جاتا ہوں آپ کو یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔“ اس کے لہجے میں جہاں بھر کی مخنی آ رہی تھی۔ اگلے لمحے وہ دروازہ کھولتا باہر نکل گیا تھا۔ لاریب نے جانے کب کا سینے میں اٹکا ہوا سانس بحال کیا اور دروازہ لا کڑ کرنے کے بعد بستر پر آ گئی۔ فضا میں کتوں کے بھونکنے کی آواز کے سوا ہر سوسنا طاری تھا۔

وہ لپکی ہی دیر بستر پر سائن پڑی رہی۔ (یہ تو ابھی شروعات ہے مسٹر سکندر حیات تم مجھے جیتنا چاہتے تھے مجھ پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہے تھے دیکھنا میں تمہارے پاس کچھ باقی نہیں رہندوں گی۔ کبھی یاد کرو گے کسی سے لکری تھی کہو سکتے دل بولنے کے ساتھ سوچ رہی تھی۔)

سکندر باہر آیا تو دونوں کمروں کے دروازے مضبوطی سے بند تھے اور کھڑکیوں سے تاریکی جھانکتی تھی۔ اس کا مطلب اماں بابا ہی نہیں ثانیہ بھی لیٹ چکی تھی۔ وہ اس خیال سے مضطرب تھا کہ ایسی کون سی جگہ لٹکا نہ کرے کہ رات بھی گزر سکے اور بھر م بھی رکھ پائے۔

معا بابا کے کھانسنے اور چار پائی کے چڑھانے کی آواز سن کر سکندر ہڑبڑا گیا۔ بابا یقیناً واش روم جانے کو اٹھے تھے۔ ان کے باہر آنے کی صورت میں ہونے والے سامنے سے خائف ہوتا وہ کچھ ایسے گڑبڑا کہ قریب ترین زینہ تیزی سے چڑھ کر بنا سوچے سمجھے اوپر چھٹ پڑا گیا۔ غضب کی سردرات میں ہوا میں جھکڑوں کی صورت پہنکاریں ماری محسوس ہوتی تھیں۔ اس نے کچھ سوچا اور آگے بڑھ کر اسنور کے طور پر بنائے چھت کے کونے میں موجود کمرے میں آ گیا۔ جس کا دروازہ بھی نہیں لگوا گیا تھا۔ اماں نے وہاں ترپال کا موٹا پردہ لٹکا کر اینٹوں سے دبا دیا تھا تاکہ ملی یا کہتے اسے مسکن نہ بنالیں۔ سکندر نے پورے گھر میں چونا پھروا کر مقدور بھر بساط کے مطابق فرنیچر بھی نیا ڈالوایا دیا تھا اور پرانا سامان یہاں رکھ دیا تھا۔ سکندر نے پردہ کھسکایا اور اندھا کر ایک چار پائی خالی کمر کے پٹنی کا ڈھکن اٹھا کر بستر نکالا اور رضائی نکلیہ نظر نہیں آ سکا اس نے صبر و شکر سے اسی پر قناعت کیا اور لائٹ آف کرنا بستر سنبھال کر لیٹ گیا۔

نیندا آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور دل میں دور تک پھیلا سناٹا۔ زندگی تن آسانی کا نام تو کبھی نہیں تھی کہ ہوش سنبھالنے کے ساتھ اس نے حقیقت کی مخنی اور محبت میں تار سائی کا عذاب بھگتا تھا مگر ایسی لا چاری وہ بے کسی بھی نہیں نصیب نہیں بنی تھی لاریب کا یہ رویہ بہت ہی شدید تھا۔ وہ

جاننا تھا یہ مجرم تا دیر قائم نہیں رہ سکے گا۔ پھر اس نے بچہ۔۔۔ آگے اس کا ذہن کا نہیں کرتا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی تو اندازہ ہوا سردی کا احساس شدید تر ہے اس کا وجود باقاعدہ کپکپانے لگا تو اس نے ٹانگیں سکڑ کر گھٹنے سینے سے لگا لیے اور نیا سکریٹ لٹکا کر خود کو پھر سے اس احساس سے چھڑانا چاہا مگر یہ آسان نہیں تھا وہ جانے کتنی دیر یونہی کانپتا اور لرزتا رہا پھر بلا خرفیندگی آشوش میں اتر گیا۔

لاریب نے آنکھیں مل کر خود کو نیند کے احساس سے آزاد کرنا چاہا اور بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تب ہی ماحول کی تبدیلی نے قسمت کی انتہائی کھٹکشی کا احساس بخشتا تھا جو آنکھوں کی جلن کے ساتھ ہی کوسوں بڑھا گیا ایک تڑپ کے عالم میں اس نے ہونٹ بچھینے سر بیڈ کی پٹی سے ٹیک دیا۔

بیڈ کی پائنتی کی جانب موجود کھڑکی کا پٹ کھلا ہوا تھا اور ہوا سے پردہ بار بار ہلکا تھا اور باہر برآمدے کے ساتھ محسن کا منظر بھی واضح کر جاتا۔ محسن کا سرخ اینٹوں کا فرش دھل کر صاف و شفاف ہو چکا تھا۔ آنگن میں چھن کے جانی دار پردے سے جھانکتی سرما کی زرد دھوپ کے ٹکڑے کیلئے فرش پر چپکتے تھے۔ معاذ یوزمی سے کوئی انداز یا اس بل ہوا سننے پردہ ہمارہ کر دیا۔ لاریب نے نگاہ کا زاویہ بدل کر اپنی بدلی ہوئی حیثیت و مقام پر یورپی سفاکی سے غور کیا تو آنکھوں کو بھینکنے سے بھاننا بس کی بات نہ رہی۔ اس نے ایک کرب و ملال کی کیفیت میں آنکھیں میچ لیں۔ برآمدے میں قدموں کی آہٹ ابھری پھر دروازہ کھول دیا گیا۔ دلہیز پر جھکا ہوا جلالہاگ کر اندر مس آیا اس باجائے کے ہمراہ اندر داخل ہونے والا سکندر ہی تھا۔ جس نے لاریب پر ایک نگاہ بھی دانستہ ڈالنا ضروری نہیں سمجھا اور آگے بڑھ کر

”آپ اٹھ گئی ہیں تو فریش ہو جائیں اماں ناشتے کا کہہ رہی ہیں۔“ اتنی مختصر بات کے دوران وہ دو سے تین مرتبہ چھینکا تھا لاریب بے تاثر نظروں سے اس کی چوڑی پشت اور مضبوط شانوں کو دیکھتی رہی۔ اس کا لباس تبدیل

ہو چکا تھا۔ ذات اس نے اپنی مرتبہ سکندر نو پینٹ ٹوٹ میں دیکھا تھا اگر دل میں اتنی نفرت و کدورت نہ ہوتی تو یہ تبدیلی اور اس کی دلکشی اسے متاثر کیے بغیر نہ ہوتی کدو ہرگز بھی نظر انداز کیے جانے والا نہیں تھا مگر بات تو ساری دل کی ہے۔ سارے فساد کی جڑ ہی یہی دل تھا۔ اس آخری بات نے اسے سر تا پا جھلسا کر رکھ دیا جیسی تڑخ کر بولی۔

”میں اب تک تمہارے ساتھ ناشتے نہیں کرتی رہی ہوں۔ خود کو مجبوراً بھی میرے وجود سے محدود کرنے کی ضرورت نہیں۔“ اس دلجو جھجکلائی پر سکندر نے بے حد کشمکش نظروں سے اسے دیکھا۔

”بے فکر ہیں مجھے اس حماقت کی قطعی ضرورت ہے نہ ہی حاجت میں ناشتا کر چکا ہوں آپ کو نہیں کرنا تو اماں کو منع کر دیتا ہوں اس زحمت سے۔“ عجیب لوندا حاسیدھا جواب تھا بالکل ہی غیر متوقع۔ لاریب ایک ملی کو تو ہونتی ہو کر رہ گئی۔ پچھلے تین دنوں سے وہ جس طرح احتجاجا بھوک ہڑتال پر تھی کہ بابا سائیں سے بات منوانے کو سب سے زیادہ اس گرگوار کر دیکھا تھا مگر نقصان تو ہو چکا تھا۔ اب بھوک کا احساس اتنا شدید تھا کہ معدے میں آگ ٹھن

”زبردستی و ناخوشی سے سبھی مگر نان نفقے کی ذمہ داری تو تم پر عائد ہو چکی ہے۔ ناشتے میں مجھے فریش کمھن کے ساتھ سلاکس اور ایلے ہوئے اٹھ چاہیے۔“ اس سے نگاہ ملائے بغیر وہ اپنے مخصوص مغرور انداز میں جیسے اپنے ملازم کو آرڈر کر کے خود واش روم میں جا چکی تھی۔ سکندر استہزائیہ مسکرایا پھر پلٹا تو اسی بل دروازہ کھٹکنا کر اماں نے قدرے جھجکا میز انداز میں اسے پکارا تھا۔

”سکندر بے پتہ۔۔۔۔۔!“

”آجائیں اماں۔“ سکندر نے سر آہ بھر کر نودب انداز میں کہا بلکہ خوف کے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

”پتہ تیری وہی اٹھ گئی میں نے تو ناشتا۔۔۔۔۔!“ اماں کی نظروں نے یہاں وہاں لاریب کو ڈھونڈا پھر سوالیہ نگاہوں سے اسے نکلتے بات اچھوری چھوڑ دی۔



”آئیے..... میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔“ واہ روم کی جانب اشارہ کر کے لاریب کی موجودگی سے آگاہ کرتا وہ ان کا ہاتھ پکڑے کچن میں چلا آیا۔ سکندر نے سینڈرگیس کے ساتھ چولہے کا بھی انتظام کر دیا تھا مگر اماں کو لکڑیاں جلا کر کام کرنے کی عادت تھی۔ کچن میں مٹی کے چولہے میں اس وقت بھی لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔ اماں کا اہتمام دیکھنے لائق تھا۔ وہ تو فجر کی پہلی اذان کے ساتھ ہی تیاری میں لگی تھیں۔ حلوہ پوری پائے کا سالن نان اور نجانے کیا کچھ۔ وہ ایک ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا۔ اس نے لاریب کے من پسند ناشتے کی ٹرے خود سے تیار کی تھی۔ یہاں تک کہ چائے بھی خود بنائی۔ فریج سے ڈبل روٹی کا پلٹ نکال کر سلاٹس پلیٹ میں جمائے ساتھ میں تازہ مکھن کی کٹوری چائے اٹل گئی تو اس نے فل سائز کا مگ اٹھایا چھان کر چائے مگ میں نکالنے کے بعد اس نے حیران نظر آتیں اماں کو دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔

”آپ کی بہو بھلے گاؤں کی پیداوار ہے مگر اس کا طرز زندگی گاؤں جیسا نہیں ہے۔ کچھ دیر ٹھہریں اور ثانیہ کو بھی بلوالیں میں یہ ناشتا محترمہ کو دے کر آپ کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔“ وہ پتا نہیں کیا چھپانا چاہ رہا تھا اماں تو کم مہم نظر آنے لگی تھیں۔

”محمد دے پتر میں لے کر جاتی ہوں یہ ٹرے۔“ انہوں نے گڑبڑا کر کہا۔ جہانم یہ تھیں بیٹے کی سمیر خاموشی و سنجیدگی پورے نہ سکی کچھ نہ کچھ معاملے کی بھٹک تو انہیں بھی مل گئی تھی۔ بہو اونچے مزا جوں والے گھر کی اولاد تھی۔ یہ خدمت ان کا حق تھا پر بیٹے سے نہیں کرانا چاہتی تھیں مگر سکندر کو بھلا کیسے گوارا ہو سکتا تھا وہ نہیں چاہ سکتا تھا لاریب اس کے علاوہ اس کے گھر والوں کے ساتھ بھی ایسا غلامانہ جھکا میز رویہ سلوک کی عادی ہو۔

”نہیں اماں آپ نہیں جائیں گی بس کچھ دیر رکیں میں ابھی آتا ہوں۔“ ٹرے اٹھائے رسائیٹ آمیز گیمبر سنجیدگی سے کہتا وہ اگلے لمحے کچن کی چوکھٹ پار کر گیا۔

کمرے میں آیا تو لاریب کو اس لمحے واہ روم سے نہا کر

نکلتے دیکھ کر وہ جیسے جھکا گیا تھا۔

(رات بھی اتنی سردی میں نہائی تھی پھر لب..... ایسی کون سی آگ ہے جسے بجھانے کی کوششوں میں سرگرداں ہے اور اگر ایسا ہے بھی تو کیا اس سرد پانی میں اتنی سخت ہے کہ اسے بجھا سکے)

”اگر ہاتھ لینا اتنا ضروری تھا تو بتا دیا ہوتا میں پانی گرم کر دیتا۔ اس طرح طبیعت بھی خراب ہو سکتی ہے۔“ ٹرے میز پر رکھتے وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔ تو لہے کی قید سے ہل آواز کرتے لاریب نے ناگواری سے اسے سدیکھا۔

”مجھے اپنی ضروریات کے لیے ذیما نڈ کرنے کی عادت نہیں ہے۔ اتنا احساس تھا تو پہلے انتظام کر رکھتے۔“ اس کا لہجہ ویسا ہی تھا سر ذنخ بست۔ سکندر نے ہونٹ کھینچتے ہوئے اس پر ایک محتاط نگاہ ڈالی۔ جھلکائی جھگڑائی بے حد شفاف رنگت اس ہل کچھ نیلی ہی پڑ رہی تھی۔

”یہ ناشتا رکھا ہے اس سے فراغت کے بعد واپس کی تقریب کے لیے تیار ہو جائیے۔ شہر سے میں نے بیوشن کو بلوار کھا ہے جہاں خود پر اتنا جبر کیا ہے تھوڑا سا اور سبھی اس الماری میں لباس کے علاوہ آپ کی ضروریات کا دیگر سامان بھی آپ کو مل جائے گا۔“ لاریب کے چہرے پر اٹھتے درشت اور نخوت بھرے تاثر کو دیکھ کر وہ پہلے ہی دفاعی و مفاہمتی انداز اختیار کر گیا۔ گویا تند خیز دریا کی لہروں کو کناروں سے باہر آنے سے پہلے ہی حفاظتی بند باندھ دیے۔ لاریب سر جھٹک کر بال سنوارنے میں مصروف رہی۔ دھلا دھلایا نو خیز جھمکا ہوا روپ دہنایے کی رعنائیوں سے بھرپور تھا۔ سکندر کے دل سے ایک ہوک اٹھی جس کی سرعت سے پلٹ کر باہر چلا گیا۔

لاریب نے برش میز پر پٹخا اور ہونٹ بھیجنے صوفے کے سامنے رکھی میز پر موجود ناشتے کی ٹرے کو دیکھا۔ مکھن سلاٹس چائے اٹھائے سب لوازمات پورے تھے مگر پھر بھی کہیں کوئی کی تھی اس کی نظریں سلاٹس پر پڑ گئیں۔ جس پر مکھن لگا شاید وہ بھول گیا تھا۔ وہ جو اس کے حوالے سے چھوٹی سے چھوٹی چیز پر خصوصی دھیان اور توجہ دیا کرتا تھا

اس کی آنکھیں جانے کسی جذبے کے تحت نمی سیٹ لائیں اور ذہنی رو بھگی اور کچھ سال پیچھے کا ایک منظر ذہن میں روشن ہونے لگا۔ تب جب اس کی جان کو اتنے روگ نہیں لگے تھے۔ اس کی سماعتوں میں ایمان کی خفگی چھلکائی آواز کی بازگشت دستک دینے لگی۔

”ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھی ہو لاریب نا تم بھی دیکھ لو چھ بج چکے ہیں اور ناشتا ابھی باقی ہے تمہارا۔“ اماں کے بیگ میں چند پوری کر کے زپ بند کرتے ہوئے وہ لاریب کی سمت متوجہ ہوئی تھی تو اسے من انداز میں مارنگ شوکی ہوسٹ کی باتوں میں کھوئے پا کر اسے کچھ اس طور غصا یا تھا کہ آگے بڑھ کر سب سے پہلے فی وی کا ہی سوچ کچ آف کیا تھا۔ لاریب کو مارنگ شوخ پسند تھے۔ جب تک اپنے کمرے میں تیار ہوتی یہ خشل دیاں جاری رہتا پھر رہی سہی کسر ناشتے کے دوران پوری کی جاتی۔

”تمہارا بس ہی نہیں چلتا ورنہ تو گاڑی میں بھی فی وی رکھوا لو اور کلاس روم میں بھی۔“ ایمان کے کھونڈنے پر بجائے شرمندہ ہونے کے وہ ڈھٹائی سے دانت نکالنے لگی تھی۔

”یہ تو کوئی اتنا مسئلہ ہے بھی نہیں۔ یونو عباس جو سیل فون یوز کرتے ہیں اس میں دیگر لاتعداد عیاشیوں کے ساتھ ایک یہ عیاشی بھی میرے مہر آ پانے بتلایا ہے مجھے۔“ ایمان کی معلومات میں اضافہ کرتے اس کے کم عمر نو خیز چہرے پر کیسی جھگڑا ہٹ آئی تھی ایمان اسے سختی رہ گئی تھی۔

”اچھا اسکول میں فرینڈز کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ عباس سے تمہارا بیوا الارشتہ بھی ہے اور یہ کہ وہ اسٹڈی کے لیے امریکا میں ہے۔“ ایمان کی تاکید پر اس کے امدد کیسا غضب کا احتجاج لٹا یا تھا مگر بحث کی نہ ہی وجہ پوچھی البتہ سمجھ ہی ضرور گئی۔

”ناشتا کرو بھی کیوں بیٹھی ہوئی ہو؟“ ایمان کے کہنے پر اس نے معصومیت کی انتہا پر جا کر آنکھیں پٹپٹا دیں۔

”کیسے کروں آپ نے سلاٹس پر مکھن لگایا۔“ ایمان

سر پٹنے والی ہوئی۔

”یہ کوئی اتنا مشکل کام تھوڑی ہے جو تم۔۔۔۔۔ لاریب بڑی ہو جاؤ اب میٹرک میں ہو۔“ ایمان کے ذائخے پر اس کا منہ بن گیا تھا۔

”مجھے مکھن لگا نہیں آتا میٹرک سے زیادہ چالپوس کام اس دنیا میں کوئی نہیں۔“ اس کے من گھڑت ارشادات شروع ہو چکے تھے۔ سکندر نے مسکراہٹ دبا کر اسے دیکھا پھر اس کے کٹے سے سلاٹس کی پلیٹ اٹھالی۔

”دیکھیں جو سکندر بھائی نے دو منٹ میں کر دیا یہ کام اب یہ ہر روز بتا کہ اس ذمہ داری کو نبھایا کریں گے مجھے پورا یقین ہے۔“ اماں کھلکھلائی اور بالکل درست آئندہ کا نقشہ کھینچا۔ ایمان البتہ ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گئی۔

”مگر واضح رہے سکندر یہ کام زیادہ سے زیادہ تمہاری شادی تک انجام دے سکے گا مجھے نہیں لگتا عباس تمہیں اتنا سر پر رکھے۔“ ایمان نے جیسے اس کی برین واشنگ کی تھی وہ بے نیازی سے لو لے لیتی چائے پیتی رہی۔

”تو پھر بجو آپ عباس بھائی کے بجائے سکندر بھائی سے شادی کر لیجیے گا۔ ساری زندگی آپ کے لیے خوش خوشی مکھن لگاتے رہیں گے۔“ اماں کے انداز میں وہی لالبا لی پن تھا جو اس عمر کا تقاضا ہوا کرتا ہے۔ سکندر اور لاریب کی نظروں کا تصادم ایک دم ہوا تھا۔ ایک جانب گڑبڑا ہٹ اور خجالت بھی دوسری جانب خفگی شکایت رنج اور شدید غصہ۔ وہ اماں پر برس پڑی تھی۔

”اچھا..... اچھا جھوڑو۔ سب جانتے ہیں نہ تو تمہاری شادی سکندر سے ہونی ہے نہ اسے یہ کام کرنا پڑے گا۔“ ایمان نے بروقت سینر فائر کراتے ہوئے کہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ پر وہ جیسے چونک کر کرناک اذیت انگیز حقیقت میں واپس لوٹ آئی تو آنکھیں آنسوؤں سے جھل جھل تھیں۔ جی انداز تے سکندر کا چہرہ اس کی نظروں دھندلا گیا تھا۔

”آئی ایم سوری میں بھول گیا تھا کہ الماری کی چابی میرے پاس ہے یہ رکھ لیں اور.....!“ اپنے دھیان میں



بولتا وہ اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہی ٹھٹھا متغیر رنگت آنکھیں برس پڑنے کو بے قرار تھیں سکندر یکدم ششکشی اور تھکاوٹ سے چور ہو کر رہ گیا۔

”کیوں آتے ہو بار بار میرا تماشا دیکھنے؟“ وہ حلق کے بل چیختی تمام تر کڑوی و مضمحل یادوں کا مرکز و محور وہی تھا۔ اسے سامنے اور فارح پا کر بھی بھلا دماغ نہ اٹھاتا تو کیا ہوتا۔ بھلا کیا دیا تھا اس کی محبت نے اسے۔ کالج کے برتن کی طرح ٹوٹ کر بکھرتا اور گیلی لڑکی کی مانند سلگ کر حواں ویتا اذیت کے کبھی ایک رنگ ایک انداز تھوڑی ہوتے ہیں۔ پھینچے ہونوں اور سرخ چہرے کے ساتھ وہ پلٹا تو پورا وجود اضطراب میں گمراہا تھا۔ لاریب باقاعدہ رو رہی تھی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خسارے میں تھے۔

اس نے آنسوؤں کی دھند کے پار اس شخص کو دیکھنے کی کوشش کی جس کی موجودہ حالت اس کا دل پھاڑنے کا سبب بنا کرتی تھی۔ باقاعدہ علاج تو جب کچھ بھی تو اس پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا ڈاکٹر زبایوس ہونے لگے تھے۔

”یہ اپنی دل پاور کو استعمال نہیں کر رہے ہیں مس فاطمہ کسی بھی مرض میں خفیلابی کے لیے پیشہ کا دل پاور کا استعمال بے حد اہم کر دار ہوتا ہے۔ انہیں شاکس بھی لگائے گئے ہیں ان کی کیفیت کچھ بہتر ہے مگر اسوسناک بات یہ ہے کہ یہ خود کو زندگی کی طرف نہیں لانا چاہتے۔ ان کی آنکھوں میں دیکھیں ہر امید ہر خواہش دم توڑ چکی ہے۔ ایسے مقام پر دعا کے علاوہ ایک ہی حل ہوتا ہے۔ پیشہ کو ان قریبی لوگوں سے ملوایا جائے جن سے اسے محبت ہو تاکہ انہیں زندگی کی طرف لوٹنے میں مدد مل سکے۔ آپ کو تو اندازہ ہوگا ان کی زندگی میں ان کی وائف کے علاوہ کون لوگ اہم ہوں گے۔“ جواب میں فاطمہ سر دآہ بھر کر رہ گئی۔ وہ کیا کہتی وہ اس کے متعلق بس اتنا ہی جانتی تھی جتنا عباس کو جاننے والے اس کے عام فہم۔

”جیسا کہ آپ کو بھی پتا ہے کہ انہوں نے پسند کی شادی کی تھی اپنے پیرئش سے تو ان کا کسی قسم کا کوئی رابطہ ہی

نہیں ہے۔ کل میں ان کے دلوں بچوں کو لے آؤں گی۔ مجھے امید ہے کچھ نہ کچھ بہتر نتائج ضرور ملیں گے ہمیں۔“ اور واپسی سے قبل وہ عباس سے ملنے آئی تو اس پر کشش جھللاتی رنگت والے شخص کی اداسی اس کے دل پر بر ملا راست اثر انداز ہونے لگی تھی۔

”مانتی ہوں عباس آپ کو عریشہ سے بہت محبت تھی مگر زندگی میں اس کے علاوہ بھی بہت ساری خوب صورتیاں ہیں اتنا تو میں بھی اپنے دکھ پر نہیں روئی تھی جتنا آپ رو رہے ہیں۔ میں آپ کو روتا نہیں دیکھ سکتی۔ میرا دل پھٹتا ہے۔ بس نہیں چلتا کیسے عریشہ کو لا کر آپ کے حوالے کر دوں وہ کر دوں جتا آپ چاہتے ہیں۔“ اس کے حسرت آمیز لہجے کی کرچیاں عباس کو کتنی چھبی تھیں یا پھر وہ یونہی اسے بدھیانی میں دیکھنے لگا تھا۔ وہ گشہ بچے کی طرح حیران ششدد تھی۔ بہت تکلیف دہ طوفان اس کے دل کا تھک کر آنکھوں میں پھیل گیا۔

”ساحر اسے دیکھیں۔ یہ بیٹا ہے آپ کا اسماء اور یہ آپ کی باری ذول آپ کو پتا ہے آپ کے بچوں کی کیر اچھے انداز میں نہیں ہو رہی آپ کی اس بیماری کی وجہ سے ان کا کون سا آپ کے علاوہ؟ ماں دنیا سے چلی گئی مگر آپ تو حیات ہیں آپ پر ان کے حقوق مان کی ذمہ داریاں لاگو ہیں آپ کو ان کی خاطر تو خود کو سنبھالنا چاہیے۔“ ڈاکٹر کا کہنا تادہی اور کسی حد تک سختی بھی لیے تھا۔ جو کم از کم فاطمہ کو بالکل اچھا نہیں لگا مگر اس وقت اس کے اندر سنبھالنا ہی دھڑکنے لگی۔ جب اس نے عباس کے سپاٹ چہرے کے تاثرات میں تبدیلی محسوس کی۔ دھیرے دھیرے اس کے تاثرات اور میں تغیر پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد کا جو اثر تھا وہ بے پناہ کرب و اذیت اور وحشت بھرا تھا۔ زندگی کل ل دھڑک اٹھا۔

”میں عریشہ کے بغیر زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ میں اس سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ اس کے بغیر مجھے زندگی نہیں چاہیے سنا تم نے۔۔۔۔۔ سنا؟“ وہ ایک دم اٹھا اور شدید ہڈیانی کیفیت میں دیوار کے پاس جا کر اپنا سر دیوار دیوار سے پھوڑنے لگا۔ فاطمہ کے حلق سے کربناک چیخیں نکلیں۔

پھر اگر اسے بروقت نہ پکڑ لیتے تو عباس اب تک اپنا آپ ضرور زخمی کر لیتا۔ فاطمہ پر ہنوز دہشت اور ہراس کا لہجہ تھا۔ وہ اس کا جنون دیکھتی رہی جو ڈاکٹر کے ہاتھوں سے پھر کر نکلا جاتا تھا۔ ایسا الہانہ بے خود جنونی اظہار وہ تو جی پاگل ہو گیا تھا۔ اسے لگا اس کے اطراف میں ایک بار پھر تاریکیاں ہوں۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

”میں تھک گیا ہوں ماں آزمائش سے مصیبتوں نے جیت جیت کر لیا ہے میرا“ شرجیل نے رقت آمیز آواز میں کہا اور سر ہاتھوں پر کر لیا۔ شگن آلود لیاں اور بڑھی ہوئی شہر کے ساتھ بکھرے بال لیے وہ واقعی مضطرب تھا۔ شرجیل اور وحشت زدہ اس کے سامنے بیٹھے ابراہیم احمد نے اس کے غم حال انداز کو دیکھا پھر ٹھنڈا سا بس بھرا تھا۔ ہتھال میں ہونے والی ملاقات آخری نہیں تھی۔ ابراہیم احمد سے شرجیل بعد میں بھی کئی بار ملا تھا۔ جیسی اس کی ذہنی کیفیت بھی ان دنوں اسے کی امدد کی سامع کی ضرورت ہمہ وقت رہتی تھی۔ ابراہیم سے وہ جب بھی ملتا تھا تمام الجھنیں تیر پریشانیاں اور اضطراب اس سے کہہ کر کسی حد تک خود کو بانجھس کرتا۔

محمد ابراہیم کی خوبی یہ تھی کہ وہ اس کی بات بہت جھل سے سنتا اور مفید مشوروں سے لواز کرتا۔ شرجیل کو اس کی سب سے اچھی بات یہی تھی کہ وہ اس کی کسی قسم کی بھی بات کو نہ مانتا تھا۔ البتہ جب اس کی ڈھارس بندھ جاتا تو انہوں پر پھلے رکھتا تو اتنی خوب صورتی سے غیر محسوس انداز میں اس کی کوتاہیوں اور غلطیوں کو بھی واضح کرنے کے ساتھ نصیحت کر جاتا۔ اب بھی وہ بولا تو اس کا لہجہ پر سکون بہتی ندی کی مانند ہوا اور متوازن تھا۔

”اللہ کے ہر کام کا طریقہ بہت فطری پن اور دلکشی لیے ہوئے ہے محمد شرجیل احمد۔“ وہ اسے باقی سب کی طرح صرف شرجیل کہہ کر کبھی مخاطب نہیں کرتا تھا۔ وہ اس کے نام کے ساتھ محمد اور احمد کا اضافہ کرتا تو شرجیل کو اپنا نام یکدم متبر باوقار اور خوب صورت لگنے لگتا۔ ابراہیم احمد نے اسے

حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

”جانتے ہو جب اللہ کسی کے دل میں قیام کرنا چاہتا ہے؟ تو وہاں پہلے کسی اور کو ٹھہرا کر دیکھتا ہے یا یہ مٹی اس کی محبت کے لیے کتنی زرخیز ہے اور جب اللہ کسی کو اس کی غفلت سے نکالنا چاہتا ہے تو اسے ٹھوکر لگاتا ہے۔ ٹھوکر سے مراد تم غم بھی لے سکتے ہو۔ غم کی شدت میں بہت کم لوگ ہیں جو وہاں بحال رہیں اور رب سے شاک ہونے کے بجائے شکر گزاری اور رضا مندی کے اظہار کو اپنا سر جھکا لیں پسندیدہ وہی ہیں جو اللہ کی رضا میں راضی بارضا رہنا جانتے ہیں۔ تم کوشش کرو اس مشکل گھڑی میں اگر خوشی اور سکون کو کھویا ہے تو اللہ اور اس کی رضا کو نہ کھوؤ اگر تم اس میں کامیاب ہو گئے تو یاد رکھو تم کھوئی ہوئی خوشی اور سکون کو بھی پالو گے۔“ ابراہیم احمد کا لہجہ داندازنا صحت تھا۔ شرجیل کم صدم ہو گیا۔

”آس اور امید کا تعلق اللہ کی ذات سے ہی ہونا چاہیے۔ اگر کچھ لینے والا“ وہی ہے تو یاد رکھو“ دینے والا“ بھی وہی ہے۔ حدیث رہانی کا مفہوم ہے اگر تم نے خود کو میری رضا کے تابع کیا تو تمہیں وہ بھی دوں گا جو تمہاری رضا ہے۔“ تو شرجیل احمد صاحب کیا بہتر ہے ہمارے لیے ہمیں اتنا سنیں تو ہے نا؟“ شرجیل نے چونک کر دیکھا۔ ابراہیم احمد کا روشن چہرہ مسکرا رہا تھا۔

بیشکی طرح وہ وہاں سے اٹھا تو دل کے بوجھ میں کمی محسوس کر رہا تھا۔ رات کا دورا سپر تھا جب اس نے علوی لاج میں قدم رکھا تھا۔ باوردی الٹ واقع من نے اس کی گاڑی پہچان کر گیٹ وا کیا۔ پورج کے شید میں لگی مرکزی لائٹ کی روشنی لوس میں پھیلی گھاں پہ منعکس ہو رہی تھی۔ اپنے کمرے کی جانب جاتے شرجیل کے قدم زاروں کا خیال آنے پر محرم گئے تھے۔ وہ آج دوپہر جب گھر سے نکلا تھا تو زاروں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ مٹی کا اصرار اس کی شادی کے لیے بوجھتا جا رہا تھا۔ جیسی زیادہ وقت گھر سے غائب رہنے لگا۔ اس نے رابرداری کے آخری کمرے کی جانب دیکھا۔ روشنی کھڑکی کے شیشوں اور دروازے کی چکی



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



دور سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کا مطلب واضح تھا سمعیہ لازمی جاگ رہی ہے۔ شرجیل آہستہ روی سے چلتا دروازے کے باہر آن کا اور دستک دی۔

”کون ہے؟ آ جاؤ۔“ سمعیہ کی مدھم مگر تھکان زدہ آواز سننے کو ملی تھی۔ شرجیل نے دروازے کو دھکیلا تو کھلتا چلا گیا۔ سامنے ہی سمعیہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی نظر آئی۔ گود میں زارون تھا۔ سمعیہ کا چہرہ ستا ہوا جبکہ آنکھوں میں رنجوں کی سرخیاں تھیں۔ صاف لگتا تھا وہ بچے کی وجہ سے بے راہی کا شکار رہی ہے۔ شرجیل کو عجیب سے تاسف نے آن لیا۔ وہ اپنی عمر سے بڑی ذمہ داری نبھاتی تھی۔ اس کا بیاہجان شرجیل کو زیر بار کر جاتا تھا۔ وہ گداز ہوتے دل اور تھکے آنکھوں سے عقیدت مندانہ مشکور و ممنون نظروں سے اسے دیکھتا پر سوز انداز میں مسکرایا۔

”مجھے لگتا ہے میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا مجھے زارون کو دیکھنا تھا سچی گڑیا۔“ سمعیہ گڑبڑا کر جھلی مسکراتی گئی۔ ”نہیں شرجی بھائی ڈسٹرب نہ کیسی؟ ابھی میں نے زارون کو دوا کی آخری ڈوز دی ہے۔ سو یا ہے تو سوچ رہی تھی کچھ پڑھ لوں۔“ معا کچھ خیال آنے پر چوٹی۔

”آپ نے کھانا نہیں کھایا ہوگا گرم کر کے لاؤں؟“ وہ اس کا جواب سنے بغیر آہستگی سے اٹھی اور گود میں سوئے زارون کو اسے حتمیانا چاہا۔ شرجیل نے نرمی و احتیاط سے زارون کو لیا جیسے اس کی نیند خراب نہ کرنا چاہتا ہو۔ یہی وہ لمحہ تھا جب دھماکے سے دروازہ کھول کر تائی ماں دھاڑتی ہوئی اندر آئی تھیں۔ ان کے پیچھے اور بھی کئی حیران نظر آتے چہرے تھے۔

”یہ لود کچھ لوانی آنکھوں سے مجھ پر تو یقین نہیں تھا نا تمہیں کہ دنیا بھر کی جھوٹی لگتی ہوں۔ اب کر لو فیصلہ کہ میں غلط تھی۔ یا یہ تمہارے معصوم بچے۔“ تائی ماں ان پر الزام لگا رہی تھیں یقیناً دلوں حق و حق رہ گئے۔ بلکہ سمعیہ کے تو پیروں تلے زمین کھسکنے لگی اور رنگ بے تحاشہ پیلا پڑ گیا۔ شرجیل الگ شا کڈ تھا۔ اس کے گمان تک میں یہ

بات نہ تھی کوئی اس پر اس انداز میں شک کر سکتا ہے۔ طرح اسے سمعیہ میں انوالو کر سکتا ہے۔

”ارے کتنی ہے یہ لڑکی شروع سے ڈرنا ڈال رہی تھی شرجیل پر کامیاب اب ہوئی ہے شرمی ذرا دیکھ اس کی دوپٹے کے اس ٹھسٹ کے سامنے تن کر کھڑی ہوئی ہے۔“ ”تائی ماں۔۔۔۔۔!“ شرجیل حلق کے بل غرایا۔ اس طرح کے اس کے ہاتھوں میں موجود سو یا ہوا زارون جاگا اور بے قراری سے رونے لگا۔ مگر اس کی جانب دھیان ہی کس کا تھا۔ ”مما پاپا تاؤ جی چاچی پچا (سمعیہ کے والدین) ہر نگاہ میں شک تھا۔ وہ کیسے سہہ جاتا۔

”جی مت جیج کر اپنے عیبوں پر پردہ ڈالے گا۔“ اب دنگے تھیں پکڑا ہے نا۔“ شرجیل کا کیا احتجاج تائی ماں کو ایک آنکھ نہیں بھلایا غصے سے آنکھیں نکالتیں وہ اسے دلوں ہاتھوں سے دھکا دے کر چلائیں۔ سمعیہ یوں گھٹنوں کے بل گری جیسے ٹانگوں نے جسم کا بوجھ سہنے سے انکار کر دیا ہو۔ اس بل دھکا کا مقام ہی تھا کہ اس کے ماں باپ نے بھی اسے الزامات کی بوچھاڑ سے بچانے کو ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ یعنی وہ بھی تائی ماں کے ہم خیال تھے۔

”چپ ہو جائیں تائی ماں ورنہ۔۔۔۔۔!“ شرجیل بھر درمیان میں چیخا۔ وہ اتنا مشتعل ہو رہا تھا کہ اس نے رونے ہوئے زارون کو اسی وحشت زدگی کے عالم میں بستر پر پھینک دیا اور خود پھر کر تائی کی جانب اتنے خطرناک تیروں سے بڑھا کہ اگر پاپا اور چاچو بروقت حرکت میں نہ آ کر اسے قابو نہ کر لیتے تو یقیناً وہ تائی ماں کا گلا دبانے سے بھی گریز نہ کرتا۔ سمعیہ تو تھر تھر کانپنے لگی۔ روتے ہوئے زارون کی سمت کسی کا بھی دھیان نہیں تھا۔ ہر کسی کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ چاچو اور پاپا شرجیل کو باہر لے گئے۔

”لے جاؤ اس کیسے کو اس کا فیصلہ کل کیا جائے گا۔ یہ طے ہے کہ میں اپنے گھر میں یہ گندا کام برداشت نہیں کر سکتا۔“ تاؤ جی نے پھنکارے ہوئے کہا۔

”اما۔۔۔۔۔!“ سمعیہ تڑپتی تھی اور جی جان کی جانب مگر وہ اسے متفرانہ نظروں سے دیکھتی جیسے سے پلٹ کر

تھی۔ سمعیہ من پڑنے لگی۔ اسے خوف محسوس ہوا اپنے انجام سے۔ وہ جانتی تھی اس کی ماں نے زارون کو اس کے سبب لے کر کتنی مخالفت کی تھی اور یہ مخالفت وہ تائی ماں کی یہ پڑی کر رہی تھیں کہ انہیں یہ گوارا نہیں تھا۔ سمعیہ شرجیل کو یہ مہول سپورٹ دے دے وہ من پسند پچھی کو کھانل کر کے اپنے پسندیدہ جال میں پھانسا چاہتی تھیں۔ ان کی اس گھر کے ہر فرد پر حکمرانی تھی۔ مگر نئی نسل کچھ مالک ذہنیت لے کر پیدا ہوئی تھی۔ وہ شرجیل ہو یا پھر فرار اور اب سمعیہ بھی وہ خود کو ہارتا کیسے برداشت کر سکتی۔ وہ اب بھی جیتنا چاہتی تھیں۔ چاہے کتنے ناجائز طریقے سے ہی کیوں نہیں۔ نہیں بغاوت کا سر کھلتا آتا تھا۔ اپنے عہد میں انہوں نے اپنے سے چھوٹے دیویوں اور دیوتاؤں پر نفسیاتی دباؤ کے تحت حکومت قائم رکھی تھی۔ مگر نو جوان نسل سے ماضی کے مارے عیب چھپے ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب منہ میں دنگے کے پچھے لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اسی لحاظ سے آج تک بھی تھی مزاج میں اور سرکشی کا عنصر بھی۔ مگر تائی ماں یقین تھا ذرا مشکل سے بھی مگر وہ یہ معاملہ بھی اپنے حق میں ہموار کر لیں گی مگر اس مرتبہ یہ ان کی بھول تھی۔ اسے ان تو کیا اس سے بھی اگلے دن وہ ہر داؤ استعمال کر کے ہار نہیں۔ مگر شرجیل کسی طرح بھی صیالی سے نکاح کے لیے اٹھ نہیں ہوا۔ بلکہ اس کا تنفر اس کی محنتی مزید بڑھ گئی تھی۔

”اگر آپ اس رات یہ سب کچھ نہ کرتیں میں تب بھی

جی صالی سے شادی نہ کرتا مگر اس کے بعد تو سوال ہی نہیں ہوتا آپ کا پاپا اس مرتبہ یاد رکھیں کسی آفاق علوی سے نہیں پڑا۔“ کیسا زہر ملا اور کاشا ہوا لہجہ تھا اس کا۔ ایک تائی ماں کو لگا تھا وہ ہار گئیں مگر یہ بھی تھا کہ انہیں ہار تسلیم نہیں کرتی تھی۔



اس نے بے حد خراب موڈ کے ساتھ تمام زیورات اتار دیے اور پھر دوپٹے بھی کوچ کر پھینک دیا۔ اسے نے بھی کب تھا۔ مگر بابا سائیں کا دلیر میں شریک نہ ہونا سے بری طرح توڑ گیا تھا۔ کتنی بری طرح بے لایا کر گیا

تھا۔ ٹھوں میں اتنی جتن سی جو بیان میں لانا سن غی نہ تھا۔ ”آپ بھی چاہتے تھے بابا جان کے مجھ سے آپ کی جان چھوٹ جائے تو پھر ایسے ہی کیوں اس کا کوئی اور طریقہ بھی تو ہو سکتا ہے کوئی ایسا طریقہ جتا آپ کو بھی ملال اور پچھتاوے سے دو چار کر دے۔“ اس کی سوچوں میں وحشت تھی سراسیمگی ہی سراسیمگی تھی۔ اسی جنونی کیفیت میں اس نے فروٹ کی نوکری سے چھری جھپٹ کر اٹھالی۔ ”کب یاد کر کے روتے رہے گا کہ آپ نے کبھی میرے میرے ساتھ زبردستی اور زیادتی کی انتہا کی تھی۔ ساری زندگی کی کسک نہ چھوڑ دی دل میں تو کیسے کا لاریب آپ کے لیے ہم کا سر چھسہ ہوگی جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔ جو کبھی تک کر نہیں بیٹھتا بلندی سے گرتا ہے شور کرتا ہے تکلیف دیتا ہے۔“ اس کی لانی پلکوں سے آنسو ٹوٹ کر بے قرار سے گریبان میں جذب ہوئے۔ وہ اس مجنونانہ کیفیت کے زیر اثر اس سے کل کہ خود کو نقصان پہنچاتی۔ دروازے پر ہونے والے کھٹکے نے اسے گھبرا کر پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگلے لمحے وہ ساکن رہ گئی۔ سکندر بابا سائیں کو سہارا دیتے کمرے میں لا رہا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں بیٹے آپ خوابوں پریشان ہو رہے ہیں۔“ وہ پچھلی مسکان کے ساتھ ٹوک رہے تھے مگر لاریب دیکھ چکی تھی ان کا لہجہ ان کے وجود اور چہرے کی طرح کمزوریوں کی زد پر آیا ہوا تھا۔ محض ایک رات میں وہ یوں پڑ گئے تھے جسے کسی نے سارا خون جسم سے نکال لیا ہو۔ لاریب گنگ سی انہیں دیکھتی چلی گئی۔

”بہت زیادہ خفا ہو بیٹے۔۔۔۔۔ ہے نا؟“ انہوں نے بہت جھل سے مسکرا کر دھک بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ لاریب آنسو ضبط نہ کر سکی جیسی ہونٹ بھیچے اور سرعت سے رخ پھیر لیا۔

(ایک دنیا کو مخالف کر کے آپ نے مجھے جنم دیا) کیا آپ کا یہ فیصلہ اگر اتنا ہی درست تھا۔ بابا جان تو خود کیوں ہمیں ہار رہے ہیں کاش میں بہت پہلے مر گئی ہوتی۔ نہ عباس مجھ سے چھٹانہ میں پاگل ہوتی نہ آپ کو



باجو کے بعد میرا بھی دکھ سہنا پڑتا) اس کا جسم دھیرے دھیرے کاٹنے لگا۔ چھری اس کی گرفت سے چھوٹ کر گری تب سکندر نے چونک کر پہلے اس کے پیروں میں پڑی چھری کو پھر اسے دیکھا اور سر دھانس کھینچ کر رو گیا۔

”لاریب بیٹے۔“

”میں مر چکی ہوں آپ کے لیے کیوں آگئے پھر آپ؟“ ڈوٹھا اٹھا کر شانے پر ڈالتی وہ بے حد تنگی سے کہہ گئی۔

”ایسے نہیں کہتے بیٹے آپ مجھے بہت تکلیف دے رہی ہو یہ تمہاری ناراضی کا ہی خیال تھا کہ طبیعت کی خرابی کے باعث دلیر پرائی تاخیر سے پہنچا ہوں تمام تر ہمت جمع کرنے کے باوجود۔“ وہ بولے تو ان کی آواز میں لرزش تھی۔ لاریب کے بہتے لسوؤں میں روپائی آگئی مگر نبردخ پھیرا نہ نہیں دیکھا۔ وہ دل سے جا رہی تھی کہ بابا سائیں کے گلے لگ جائے۔ بہت روئے کچھ تو دل کا بوجھ کم ہو کچھ تو بابا سائیں کا ملال کم ہو مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ خود کو معاف کر سکتی تھی نہ بابا سائیں کو۔ سکندر اور اس کا شوہر..... یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ حد کردی تھی بابا سائیں نے سزا سنانے والی۔ بابا سائیں اس کی جانب سے پیش رفت سے مایوس ہو کر خود اس کے سامنے آگئے۔ وہ کسی بے کلی سے روئی تھی۔ وہ جس کا دل ان کے لیے پتھر ہو گیا تھا۔ وہ تڑپ اٹھے اور اسے کسی چھوٹی سی بچی کی طرح اپنے سینے سے لگا لیا۔ لاریب کی تو جیسے حالت ہی غیر ہونے لگی۔ کیسے بلکنے لگی تھی وہ اپنے ہر نقصان پر۔

”آپ معاف بھی کر سکتے تھے مجھے کر سکتے تھے مگر آپ نے نہیں کیا آپ مار سکتے تھے مجھے اس اذیت سے نجات دلانے کو مگر آپ نے روز روز کی موت کو تجویز کیا میرے لیے۔“ ایک کے بعد دوسرا شکوہ زبان پر آ رہا تھا سکندر جیسے کند چھری سے ذبح ہو رہا تھا کچھ کہے بغیر وہ سرخ چہرہ لیے تیزی سے پلٹ کر باہر چلا گیا۔

”معاف تو کیا ہے تمہیں لاریب ورنہ ان معاملوں میں ہمارے یہاں چپ چاپ لڑکیوں کو قتل کر دیا جاتا

ہے۔ میں جبر لورز بردستی کا بھی قائل نہیں رہا۔“ ان کا لہجہ ہوا تھا مگر لاریب کو شدید دھچکا لگا۔ وہ تڑپ کر لان سے ہوئی۔

”جبر لورز بردستی؟“ وہ زہر خند سے ہنسی۔

”آپ کیا سمجھتے ہیں آپ نے من کی مراد دی ہے مجھے؟“ اس کے لہجے میں ٹوٹے کاٹے کی جھین تھی۔ بابا سائیں کا بھی دل ہلکا ہونے لگا۔

”بیٹے گنجائش رکھ کر سوچو آپ کو میرا یہ فیصلہ شدید لہجے بے جا نہیں لگے گا۔“ انہوں نے نرمی و محبت سے گویا اسے قائل کرنا چاہا۔

”نہیں ہے گنجائش دل میں قیامت تک پیدا ہو سکتی آپ کے اس چہیتے کے لیے۔“ اس کے لہجے میں صرف بغاوت نہیں تھی نفرت بھی تھی نفیجیک کا بہت گہرا عنصر بھی بابا سائیں کی اذیت دوہری ہونے لگی۔ انہوں نے جانا کم از کم ابھی وہ اسے ہرگز قائل نہیں کر سکتے جیسا کہنے بے بس نظر آنے لگے تھے۔

”مجھے لگتا ہے جو میری چار دن کی زندگی چلے سے بھی آپ مجھے چھین سے نہیں رہنے دو گی ٹھیک ہے تمہاری مرضی مگر لاریب اس بات پر ذرا مضطرب دل سے غور ضرور کرنا اس معاملے میں اگر کوئی بے قصور ہے تو وہ سکندر ہی ہے۔ مجھے وہ بہت عزیز ہے۔ آپ اگر اسے تکلیف میں جتا کر بھی گئی تو اذیت کا احساس مجھے تک لازمی پہنچے گا۔ اس لیے بھی کہ اس کے لیے اس آزمائش کا ذریعہ میں ہی بنا ہوں۔ محبت کرنے والی وفا شعار عورت سب سے بڑے سکون کا باعث ہوا کرتی ہے۔ یہ احساس مجھے ہمیشہ تمہاری مل کی قربت میں مسر آ یا ہے۔ تمہیں بھی ان کی بیٹی ہونے کی لاج نبھانا ہے بیٹے۔ اپنا خیال رکھنا خدا داغی خوشحال کے ساتھ تمہیں کم و فرست اور نیک ہدایت سے بھی نوازے جیتی رہو..... آمین“ انہوں نے اس کا سر تھپکا لہ پلٹ کر تھکے ہوئے قدموں سے باہر نکل گئے۔ لاریب کے اندر جیسا گسی بھڑک رہی تھی۔

(اس کا مطلب بابا جان کو مجھ سے زیادہ اس کو)

کے سمجھتی انسان کی ہر دہانہ ہے۔ تو پھر ٹھیک ہے میں اس کا چین حرام کر دوں گی)۔

سکندر بابا سائیں کو حویلی چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا ان کی طبیعت کی خراب کے باعث ٹھہرنا چاہتا تھا مگر انہوں نے اس کی کوئی چلنے ہی نہ تھی۔

”نہیں بیٹے یہاں بہت لوگ ہیں میرے پاس لاریب اکیلی ہے تمہارا انتظار ہوگا اسے۔“ بات ایسی تھی کہ وہ زہر خند ہوئے بغیر نہیں رہ سکا مگر بولا تو انداز اتنا نارمل تھا کہ بابا سائیں بھی شک میں پڑنے لگے۔

”اس لو کے بابا سائیں میں کال کر کے انہیں بتا دیتا ہوں مگر آپ کو اکیلے۔“ سکندر..... بیٹے ضد نہیں کرتے آپ جاؤ بس۔“ ان کا لہجہ حتمی تھا۔ سکندر کے پاس مزید کچھ کہنے کو نہ رہا۔ ملازم کو بلا کر اس نے بابا سائیں کا خصوصی خیال رکھنے کی تاکید کی پھر جب لوٹا تو اس کے قدموں سے ٹھکن لپٹی ہوئی تھی۔ گھر پہنچ کر اس نے کمرے میں جانے کے بجائے سیر حیاں چڑھ کر اپنے ٹھکانہ کا رخ کیا۔ ٹوٹا بدن اس پہلے کچھ اور بھی پیش اور بے سکونی سمیٹ لایا تھا۔ ابھی کمرے میں آ کر وہ بستر بچھا کر لیٹا ہی تھا تب ہی اس کا سیل فون سنٹا اٹھا۔ سکندر نے پوچھا کہ مرعت سے سیل فون نکالا اسکرین پر لاریب کا نام جگمگا رہا تھا۔ وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جہاں سکندر نے اسے دیگر سہولیات اسے فراہم کی تھیں ایک سیل فون بھی دیا تھا جانتا تھا لاریب اپنا فون حویلی چھوڑ آئی ہے۔ اس نے نا چاہتے ہوئے بھی کال ریسیو کی البتہ کچھ بولا نہیں تھا۔

”کہاں ہو تم؟“ سکندر تو بھونچکا رہ گیا اسے کال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

”بڑی جلدی خیال نہیں آ گیا آپ کو بہر حال یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔“ سکندر خود کو بھڑکنے سے نہیں روک سکا۔

”تم جہاں کہیں بھی ہو فوراً پہنچو۔“ مجال ہے جو ادھر اڑا ہوا ہو اس طہریہ کاٹ دار انداز کا۔ سکندر کی جھنجھلاہٹ نقطہ

عزیز پر جا پہنچی۔ یوں صبر پا گیا۔

”آئی ایم ساری میں نہیں آ سکتا۔ آپ کو جو بھی کہنا ہے صبح کیسے۔“ اس نے نرمی سے کہا کہ فون بند کرنا چاہتا تھا کہ اس کی پھنکار دے اور پریکٹکس کر گیا۔

”یاد رکھنا اگر تم فوری نہیں آئے تو میں تمہارے بابا سے شکایت لگانے لگی ہوں کہ تم گھر سے باہر ہو۔“ اس کی تیز غصیلی آواز پر سکندر سوائے ہونٹ ہینچنے کے کچھ نہ کر سکا۔

”دس منٹ ہیں تمہارے پاس پہنچ جاؤ ورنہ.....“ اس نے دھمکی آمیز انداز میں کہا کہ اگر قہر ادا ہو چھوڑ دیا۔ سکندر مل کھا کر رو گیا پھرنا چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر نیچے چلا آیا۔ کمرے میں پہنچتی لاریب نے تقیم کر غصیلی نظروں سے اسے دیکھا پھر طنز سے مسکراتے لگی۔

”کاش تم دو منٹ اور نہ آتے تو میں تمہارے کروات جا کر تمہارے بابا کو بتاتی۔“ اس نے دانستہ سکندر کو بھڑکانا چاہا تھا وہ بھڑکا تو ضرور مگر اسے جھلسانا ضروری خیال کیا جیسی آگے بڑھ کر ایک دم اس کی کمر میں بازو جھال کر کے اسے جارحانہ گرفت میں جکڑنا اپنے نزدیک تر کر لیا۔

”کون سے کروات..... بولو؟“ اس کی آواز دھمکی تھی مگر گھن گرج والی۔ لاریب جو اسے ذہنی اذیت دینے کا سوچے بیٹھی تھی سکندر کی اس درجہ فضول حرکت پر کٹ کر وہ گئی اور گرفت سے نکلنے کو زور سے پھڑپھڑائی کہ اسے اپنا مقصد تو بھول ہی گیا تھا مگر سکندر نے پہلے سے مضبوط گرفت کو کچھ اور بھی سخت کر دیا تھا۔ اس کے چہرے پر لذتی گھبراہٹ دھرا سکی کے ساتھ بے بسی سکندر کے اندر دلی تسکین کو ابھار رہی تھی۔

”نہ بتائیں کیوں بلایا ہے مجھے اس طرح سے وہ بھی اس کے باوجود کہ آپ نفرت کرتی ہیں مجھ سے پھر بھاڑ میں ایک بار کیوں نہیں ڈال دیتی مجھے۔“ وہ اس پر جھک کر غریبا اس کے لہجے سے آج آنے لگی دکھ کی سلتی ہوئی آج۔

لاریب کو تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔

”چھوڑو مجھے..... چھوڑو۔“ وہ مزاحمت ترک کر کے آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ سکندر نے اس کے چہرے



سے جی بے بسی و نا چاری کے رنجوں بود بھلا اور اندر تک رنجی ہو گیا۔ وہ جانتا تھا اتنا ہی ناپسند کرتی ہے وہ اسے بلکہ نفرت کرتی ہے اس سے۔

”ہمارا اسی طرح فاصلوں پر رہنا ہی بہتر ہے۔ ورنہ آپ کی نفرت تو شاید مجھے جلا کر خاک نہ کر دے میری محبتیں ضرور آپ کو چادوں شانے جیت گرا دیں گی۔ یقیناً ایسا تو بھی نہیں چاہیں گی نا آپ۔“ سکندر نے کچھ اس انداز میں اسے دونوں شانوں سے تمام کر خود سے قریب کیا کہ وہ بے بس سی اس کے سینے سے لگ گئی اور اس کی دھڑکنوں کو اپنی خوفزدہ دھڑکنوں میں مدغم ہوتا محسوس کرتی رہی۔ سکندر نے اسے جھٹکے سے چھوڑا تو وہ نیم جان سی وہیں بیٹھی چلی گئی۔ سکندر ہونٹ بھینچے سے دیکھتا رہا۔ وہ ایک بار پھر اس کے کتے کے شکست خوردہ گھڑا تھا۔ اس کی مرضی کے خلاف خود کو چلانے پر وہ تاج بھی قادر نہیں تھا۔ وہ آج بھی اپنے سے زیادہ اس کے دکھ پر مضطرب تھا۔ اسے آج بھی اپنے دکھ کے تے کے لاریب کا ہی دکھ بڑا لگ رہا تھا۔ ہر شکایت ہر شکوہ ہمیں دم توڑتا تھا۔ وہ واپس پلٹا تو اس کے قدموں سے یاسیت اور تسکین ہی نہیں بہت سارا ملال بھی لپٹا ہوا تھا۔

شرجیل نے بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک بڑھا دی تھی۔ مگر وہ حواسوں میں ہی نہیں تھا۔ دل و دماغ میں جیسے انکار سے بھر رہے تھے۔ فراز کی شادی سر پر تھی مگر گھر میں ایک نیا فساد برپا ہو چکا تھا۔ اس رات کا ڈرامہ کیا کم تھا کہ اس تمام شے کو انتہا تک پہنچانے کا عزم کرتے سمعیہ کا جھٹ پٹ رشتہ طے کر دیا گیا تھا۔ شرجیل کے لیے اختلاف و اضطراب کی وجہ یہی تھی جس سے سمعیہ کا رشتہ طے کیا جا رہا تھا۔ وہ چالیس سے اوپر کا آدمی تھا۔ پہلے سے دو بیویاں بھگتانی والا اوچھڑ عمر خزانہ صورت مرد جس کی اس کے برابر کی اولاد تھی۔ شرجیل کو یہ سراسر ظلم اور زیادتی لگی تھی۔ وہ یہ زیادتی برداشت نہیں کر سکتا تو مشتعل ہوا تھا۔

”سن میں آپ لوگ میں ہر لڑکی سمعیہ کے ساتھ ظلم نہیں ہونے دوں گا۔“ جس وقت وہ دندنا تا ہوا تاؤ جی کے سامنے آیا انہوں نے طنزیہ ہنکارا بھر کر اسے سر تا پیر معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر مسکرائے۔

”آگیا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔ اب تم کہو گے سمعیہ کا نکاح میرے ساتھ کر دو ہے نا؟“ حد تھی ٹھٹھیا پن کی۔

”اللہ کے لیے تاؤ جی کچھ تو اپنی عمر کا لحاظ کر لیں۔ میرے اور سمعیہ کے کذہنوں میں ایسی کوئی آلودگی نہیں ہے جیسا آپ نے اس رات کوئی رنگ دینے کی کوشش کی۔“ وہ بولا تو شدت غیض سے اس کا لہجہ زور رہا تھا۔ چہرے پر ایسے تاثرات تھے جو بے بسی کی انتہا پر جا کرتے ہیں۔ وہ جیسے روہانسا ہو رہا تھا اپنی اور اس معصوم لڑکی کی پوزیشنیں کلیئر کرنے کو اسے قطعی سمجھ نہیں آتی تھی ان شریکوں کی سازشوں سے سمعیہ کو کیڑا کر پھینکا جائے۔ وہ پیاری لڑکی جس نے اس وقت اس کا ساتھ دیا تھا جب اس کے گھر بھی بیگانے بن بیٹھے تھے۔ اس کی نیکی کا یہ عبرتناک انجام تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

”دیکھو لڑکے ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ بالکل درست ہے۔ لڑکی کا چال چلن ٹھیک نہیں۔ ایسا رشتہ بھی غنیمت ہے۔ بھلا کون ایسی آنکھوں دیکھی کسی لکھا ہے؟“ وہ کہنے سکون سے کہہ رہے تھے شرجیل نے اس آخری بات پر جیسے تھرا کر انہیں دیکھا۔

”کیا..... کیا مطلب..... آ..... آپ نے اس آدمی کو یہ بھی بتا دیا کہ.....؟“ الفاظ اس کے حلق میں پھنس گئے۔ تاؤ جی اسے طنزیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”کل کو بات کھلتی تو معاملہ خراب ہوتا وہ بھلا مانس انسان ہے پھر بھی مان گیا کہا نا آنکھوں دیکھی کسی.....؟“ وہ اپنے کارنامے کو فخر سے بیان کر رہے تھے۔ شرجیل کو ان سے زیادہ چاچو چاچی کے رویے نے شدید دکھ میں مبتلا کیا تھا جو بیٹی کی حالت اور پارسائی پر دھیان کرنے کے بجائے تاؤ جی اور تانی ماں کی باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کر رہے تھے اور مجال ہے جو اس کھلے ظلم کے

منظا ہرے پر احتجاج کا ایک لفظ بھی ان کی زبان سے نکلا۔ شرجیل نے اچھی طرح جانا یہ زرگزیدہ لوگ تھے تن آسانی جن کا شیوہ تھا۔ غیرت..... اتنا اور عزت جانے اب کی ان کے حیلوں کی دھول ہو چکی تھی۔ اس نے سادہ لی مگر اس کی خاموشی کے پیچھے کون سا سراپہ پھنسا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ اپنی قسمت کا فیصلہ سن لینے کے بعد سسک سسک کر بے حال ہوتی سمعیہ بھی۔

وہ تو آدمی رات کو جب دروازے سے بھٹتے سرگھڑا مہوینے کی غرض سے دروازے کو سونپی تھی کہ کسی کے بھنبھن کر جگا دینے پر ہڑبڑا کر اٹھی اور شرجیل کو دروازے پر پا کر اس کی آنکھیں حیرت سے زیادہ خوف سے پھٹنے لگی تھیں۔

”شرجی بھائی آپ.....؟“ اس کا خوف اس پل بہشت میں بدل گیا جب شرجیل نے کچھ کہے بغیر آگے بڑھ کر سرعت سے اس کے حیرت سے کھلے منہ پر اپنی منبوہ تعینکی جما کر گویا ہرا دروازے کا ہی گلا گھونٹ ڈالا۔

اس نے جلتی ہوئی آنکھوں کو بے دردی سے مسل کر آنسو پونچھنے چاہے۔ دل جیسے سسک سسک کر بے حال تھا گھر کی فضاؤں میں گھٹا گھٹا سوگ رہا جیسا تھا۔ کتنے دن ہوئے تھے اب تو اسے گھر لوٹنے بھی مگر اس کا کیا ہوتا کہ وہ زندگی کی طرف نہیں لوٹ رہا تھا لونا ہی نہیں چاہتا تھا۔ بدائی کا وحشت انگیز جاں گسل احساسِ رگ و جاں کو مسلتا تھا تو سرخ شعلوں کا بے درد لالہ اسے بھسم کرنے لگا۔ چہار سا گم ہی آگ تھی۔ من کو جلاتی آتی جاتی سانسوں کو دھکاتی۔ یہ خیال یہ سوچ اسے صبر نہیں آنے دیتی تھی کہ عریشہ اس دنیا سے اس سے ناخوش لگی ہے۔ وہ خفا بھی اس سے دلخ میں یا احساس ہی شرارے پھوڑتا تھا۔

جیس زردہ شام نے دھیرے دھیرے رات لوڑھ لی۔ معادروازے پر کھٹکا ہوا اور اگلے لمحے لائیں جل اٹھنے کے باعث یکنخت گمراہ شیوہ میں نہا گیا۔ عباس نے خون رنج آنکھوں کو قہر باز انداز میں اٹھایا۔ جیسے شرب کرنے والے کو جان سے مار دینے کا خواہش مند ہو۔ ملازموں

میں یہ جرأت صرف احسان بابا کی ہی ہوا کرتی تھی جیسے زندگی کی طرف لانے کو جدوجہد کرتے تھے وجہ یہی تھی۔ عباس نے خود بھی ان کی بزرگی کے باعث انہیں عزت و توقیر سے ہی نوازا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے اس کے خیر خواہ تھے۔ مگر دروازے پر احسان بابا کی بجائے فاطمہ تھی۔

”مم..... میں آپ کی طبیعت پوچھنے آئی تھی۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“ وہ ہٹکائی عباس نے جیسے سنا نہیں۔ وہ ایک تک فاطمہ کو تک رہا تھا عجیب نظر سے تھیں۔ خالی خالی کھوئی ذہن میں عریشہ کی آواز کی بازگشت اتر آئی۔ عباس کی آنکھیں بھی اور وحشت سے پھٹنے لگیں۔

”میں جانتی ہوں عباس وہ بہت خوب صورت ہے۔ دین ایمان ہلا دینے کی حد تک۔ میں نے خود محسوس کیا ہے۔ تم بھی اسے دیکھتے ہو تو تمہیں اپنی نظروں کی بے اختیار کا احساس نہیں رہتا۔ یعنی ملے ہو اس کا حسن تم پر بھی اس انداز میں اثر دکھاتا ہے جیسے کسی بھی عام انسان پر۔ یہی فطری چیز ہے تم کدھر سے خود کو اس معاملے میں الگ اور خاص کہتے ہو۔ مجھے اس بات کا ڈر ہے جی تو منع کرتی ہوں تمہیں۔“ اس کی ساتھوں میں عریشہ کی آواز کا شور تھا۔ اس نے کربہ میزی کے انداز میں ہونٹ کانٹے اور آنکھیں جھکا کر ان کی جلن ختم کرنے کو سختی سے بند کیا تو آنسو چکوں سے ٹوٹ کر۔ فاطمہ نے اس کی اندرونی کیفیت کو نہیں سمجھا البتہ اس کے آنسو دیکھ لیے تھے جی تڑپ کر آگے بڑھی۔ وہ عباس کی بے اعتنائی کے باوجود پیچھے ہی نہیں سکتی تھی۔

”میں یہاں سے گزر رہی تھی سوچا آپ کی خیریت دریافت کرنی چلوں۔“ عباس نے یوں یکدم آنکھیں کھول دیں جیسے کسی نے اس کے وجود پر چابک رسید کر ڈالا ہو۔ وہ یوں کرسی چھوڑ کر اٹھا جیسے پچھونے ڈس لیا ہو اور اسے سرخ آنکھوں سے گھورتا اس کے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔ ان کی آن میں اس کا چہرہ نگین بنا دینے لگا تھا۔

”آئندہ یہ زحمت مت کیجیے گا، سمجھیں؟“ اس کے دھیمے لہجے میں سرد غراہٹ اور غضب کا قہر پوشیدہ تھا۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ علامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریویو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے
- ✧ کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف
- ✧ سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، مارل کوالٹی، سپر سڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✧ ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے
- ✧ کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

یاد دہیہ سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آنیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

آ نکھیں ابو نکا رہی تھیں اور تو قتل کر دینے والے فاطمہ کو کہیں تو قتل تھی اس درجہ توہین آمیز سلوک کی۔ مارے گھر ابٹ کے اس کے ہاتھ سے پاؤں چھوٹ گیا۔ وہ خوف سے پھٹ جانے والی آنکھوں اور حیرت سے منم دا ہونوں کے ساتھ فحش چہرہ لیے اسے تک دی تھی۔

”آپ کی ذات پر کوئی حرف نہیں آیا مگر میرا..... میرا بہت ناقابل طافی نقصان ہو چکا ہے چلی جاؤ یہاں سے میں تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔“ اس کے اند باہر آگ دھکائی تھی۔

یہ پسائی تو موت تھی اما کی بھرم کی نسوانیت کی بھی۔ اس کی آنکھیں سمندر کا نقشہ پیش کرنے لگیں۔ ہونٹ کانپتے رہے۔ ایک لفظ کہے بغیر وہ لڑکھڑا کر مڑی اور اپنے ہی دوپٹے سے انجمتی کمرے سے نکل بھاگی۔ اس پیش رفت نے اسے ہمیشہ بے مایا ہی رکھا تھا۔

عباس جو خود پر ضبط کے پہرے بٹھاتا تھک گیا تھا واپس اپنی جگہ گرتے ہوئے گھٹنوں میں سر چھپا کر بچوں کے انداز میں بلکنے لگا۔ وراثت قیامت جیسی تھی۔ بھیا نک دردناک اور طویل عریشہ کے بعد اس کے پاس آنے والی مسلط ہونے والی ہر گھڑی قیامت میں تھی۔ وہ خود کو فراموش کر گیا تھا۔ وہ جینا بھول گیا تھا۔ اس نے جان لیا تھا۔ زندگی کی کسی خوشی پہ اس کا کوئی حق نہیں ہے اس نے عریشہ کو تاراج کیا تھا اس نے عریشہ کو کھو دیا تھا۔ اب کچھ باقی نہیں تھا۔ اب اسے کچھ چاہیے بھی نہیں تھا۔



ہم خواہوں کے بے پاری تھے  
ہراس میں ہوا نقصان بڑا  
کچھ بخت میں ڈھیروں کا لک تھی  
کچھ لب کے غضب کا کال پڑا  
کچھ اکھ لیے جمولی میں اور سر پر ساہوکار کھڑا  
جب دھرتی صحرانہ تھی ہم دریا دار یاد دے تھے  
جب ہاتھ کی ریکھا میں چپ تھیں اور سر شگیت میں  
کھوئے تھے

”مجھے نہیں لیتا ہوگا اسٹوروم میں کل رات امی نے دیکھ لیا مجھے میرا بہانہ شاید کام دکھا گیا دقتی مگر میں ان کے شک کو یقین میں بدلنا نہیں چاہتا۔ کچھ عرصہ برداشت کر لیں صورت حال قابو میں آئے تو میں لازمی کوئی انتظام کر لوں گا۔“ سکندر اس سے نظریں چار کیے مگر کچھ کر مونی پر بیٹھ چکا تھا اور جھک کر اپنے جوتے اتار رہا تھا۔ کمرے میں پھیلے سائے میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

(ان شاء اللہ ہائی آن سکندر علیہ)







مجله حکایت

اُم ری



اس کو فرصت نہیں وقت نکالے محسن  
ایسے ہوتے ہیں بھلا چاہنے والے محسن  
وہ اک شخص متاع دل و جاں تھا نہ رہا  
اب بھلا کون میرے درد سنبھالے محسن

گزشتہ قسط کا خلاصہ  
ڈاکٹر کی زبانی عباس کے مینٹل ہسپتال میں شفٹ  
کردینے کا سن کر فاطمہ کو اپنا ذہن پاؤف ہوتا محسوس  
ہوتا ہے۔ اس سے عباس کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی وہ  
دل میں بوجھل پن لیے زینب کے پاس چلی آتی ہے  
وہاں اس کی باتوں سے فاطمہ کے دل کو ڈھارس ملتی ہے  
اور وہ عباس کے بچوں کی ذمہ داری سنبھالتی ہے جبکہ  
دوسری طرف ساحر زندگی سے قطع تعلقی اختیار کیے  
عریشہ کی یادوں میں محو رہتا ہے عباس کو اس کیفیت  
سے نکالنے کی خاطر فاطمہ بچوں کو وہاں لاتی ہے لیکن  
اس کا شدید رد عمل اسے سخت اذیت دیتا ہے۔

دوسری طرف لاریب اپنے گستاخانہ رویوں اور  
طرز عمل کی بدولت سکندر کا جینا دشوار کر دیتی ہے وہ کسی  
طرح بھی سکندر کی کمرے میں موجودگی کو برداشت نہیں  
کرتی جس پر اسے لاریب کا بھرم رکھتے باہر رات  
گزارنا پڑتی ہے۔ ولیمہ کی رات بابا سائیں لاریب  
سے ملنے آتے ہیں لیکن تب بھی اس کا انداز وہی سرد  
مہری لیے ہوتا ہے۔  
شرجیل پر جب تائی اماں کی اصل حقیقت کھلتی ہے تو  
اس کے ہاتھ بچھتاؤں کے سوا کچھ نہیں آتا فراز کی  
باتیں سن کر اس کے اندر شدید اشتعال پیدا ہوتا ہے۔  
ایمان کے ساتھ اپنے ناروا سلوک پر وہ خود اذیتی میں  
بتلا رہتا ہے یہاں تک کہ اپنے بچے کو بھی فراموش کر  
بیٹھتا ہے۔ تائی اماں چاہتی ہیں کہ شرجیل صالح سے

لاریب اپنے ہونے والے نقصان پر ماتم کناں  
ہوتی ہے جب ہی سکندر اماں کا ذکر کرتے اس کے

پاس ٹھہرنے کی بات کرتا ہے جس پر لاریب عجیب  
خدشات کا شکار لیے اسے دیکھتی رہ جاتی ہے۔

اب آگے پڑھیے  
☆☆☆.....

یہ خاموشی سکندر کے لیے حیران کن ہی تھی۔ جیسی  
اس نے بے اختیار چہرہ اونچا کر کے اسے خاصے تئیر  
سے دیکھا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ سکندر نے شرارت  
آمیز انداز میں مسکراہٹ دبائی۔  
”کچھ بولیں گی نہیں یہ نازک ہونٹ تو زہرا لگتے“  
انگارے برساتے ہی اچھے لگتے ہیں۔ خاموشی کا  
مطلب طبع نازک کی ناسازی کی جانب اشارہ کرتا  
ہے۔ لاریب نے اس کو ہر افشانی پر بھی کمال ضبط کا  
مظاہرہ کیا اور اسی طرح خاموش بیٹھی رہی تھی پھر گہرا  
سانس بھرا اور بے مہر انداز میں گویا ہوئی۔

تمہارے ہاتھ لگے ہیں تو جو کرو سو کرو  
ورنہ تم سے تو ہم سو غلام رکھتے ہیں  
سکندر کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ معا  
اس نے خود کو سنبھالا اور اپنی جگہ چھوڑ کر پرسکون انداز  
میں بستر کے نزدیک آ رکا۔

”تو گویا آپ نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا“ ہتھیار  
پھینک دیے؟“ وہ پتا نہیں کیوں اتنا سنجیدہ تھا۔ لاریب  
اسے سرد نظروں سے دیکھتی رہی۔

”گڈ..... پھر تو آج سے سارے تکلفات ختم  
ہو جانے چاہیں۔ ساری دوریاں مٹ جانی چاہیں۔ کیا  
ہوا اگر غلام سہی مگر شوہر تو بن چکا ہوں نا۔“ سکندر کا لہجہ  
ہموار تھا۔

”فضول باتوں سے بہتر ہے کہ تم جا کر اپنی جگہ پر  
لیٹو۔“ اندر سے ہوتی ہوئی وہ بظاہر بہت درشتی سے بولی  
تھیں۔ انداز اتنا کترا ہوا اور خائف تھا کہ سکندر کو اس کا  
گریز اس کا خوف صاف محسوس ہوا۔

چلنیری جگہ ہے کون سی اس کا تعین بھی آپ ہی  
کریں گی۔“ اس کا لہجہ تلخ تر ہو چلا۔ لاریب نے

لرزتی پلکیں لمحہ بھر کو اٹھا کر اس کا آنچ دیتا چہرہ دیکھا  
پھر ہونٹ بھینچ لیے۔

”مجھے پریشان نہیں کرو پلیز۔ ورنہ آج تمہیں نہیں  
مجھے باہر جانا پڑے گا۔“ اس نے بے رحم لہجے میں جتلانا  
ضروری سمجھا۔ جبکہ سکندر کا چہرہ جانے کس احساس کے  
تحت سرخ ہو گیا۔

”میرا ضبط مت آزما میں لاریب لی لی۔ میں نہیں  
چاہتا کہ آپ کا بھرم ٹوٹے۔ میں وقتی طیش و اشتعال  
میں آپ سے کوئی گستاخی کر جاؤں اور اپنی محبت کو عمر بھر  
کے لیے کسی الزام کی زد پر رکھ دوں کچھ تو خیال کریں  
آپ کو نہ سہی مگر مجھے ضرور محبت ہے آپ سے۔“ اس  
نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا اور صوفے پر لیٹ کر فوری  
کروٹ بدل لی۔ اپنے اوپر اس نے وہی براؤن مردانہ  
شال پھیلا لی تھی جسے وہ اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کا دل  
عجیب سی وحشت بھری یاسیت کا شکار ہو چکا تھا۔ بھلا  
کوئی اختتام یا منزل تھی اس سفر لا حاصل کی۔ اسے لگنے  
لگا وہ انتظار اور صبر کرتا بلآخر جان سے گزر جائے گا۔ مگر  
وہ پتھر دل لڑکی بھی موم نہیں ہو سکے گی۔

”میرے سامنے اس فضول اور تھوڑا کلاس محبت کا  
ڈھنڈورا نہ پینا کرو سمجھے“ کھن آتی ہے مجھے، اتنی ہی  
نفرت کرتی ہوں میں تم سے اگر تم سمجھو اگر تم جان پاؤ۔“  
وہ بھیکے ہوئے بے گانگی چھلکاتے لہجے میں جتلانا  
ضروری سمجھ رہی تھی۔ سکندر تو بہن و سبکی کے ساتھ ساتھ  
اذیت کے شدید ترین احساس سمیت پتھرا سا گیا۔  
مارے تفحیک و ذلت کے اس کا چہرہ یلکھت پیرا پڑ گیا۔  
کسی درجہ سیفاک اور بے رحمی وہ بے حد خوب صورت  
نظر آنے والی لڑکی۔ اس نے اذیت کی برف اس پوری  
رات اپنے وجود پر گر گئی محسوس کی۔ ہزار ہا ضبط کے  
باوجود بھی وہ آنکھوں کو نم ہونے سے نہیں بچا سکا۔

اندرا آتش دان میں کوئلے دکتے تھے بالکل ویسی ہی  
تپش سکندر کے وجود میں اتر آئی تھی۔ وہ صوفے پر  
کروٹیں بدلتے تھک گیا تھا۔ جیسی نیچے چٹائی پر لیٹ





## سلسل اشاعت کے 36 سال

سچ بیتیاں اور جگ بیتیاں ایک دلچسپ سلسلہ دنیا بھر سے منتخب کردہ تحریروں کا مجموعہ جنہیں پڑھ کر آپ کا دل و ذہن روشن ہو جائے گا۔ نسلوں کو متاثر کرنے والا پاکستان کا واحد صاف ستھرا اور تفریحی جریہ وقت کے ساتھ ساتھ نئے آہنگ نئے رنگ اور نئے انداز میں قدیم اور جدید ادب کا امتزاج لیے ہر ماہ آپ کی دلیز پر

## تاریخ کی دلچسپی کے لیے خوبصورت سلسلے

خوشبوخن منتخب غزلیں، نظمیں۔ ذوق آگئی اقتباسات اقوال زریں احادیث وغیرہ معروف دینی اسکالر حافظ شبیر احمد سے اپنے دنیاوی مسائل کا حل جانیے

ہر ہفتے کی صحت میں دفتر سے بلا کر۔ فون 35620771/2

بھک سے اڑا گئی۔ جو بھی تھا جیسے بھی تھا سکندر کی مردانہ انار پر شدید چوٹ پڑی تھی۔ جیسی آنکھوں میں غضب کی حد میں سمٹ آئیں۔ کوئی پوچھتا کیا بھی بھلا لاریب کے نزدیک اس کی اہمیت۔ شخص کا ٹھکانا جو جسے ضرورت کے وقت وہ اٹھا کر سر پر بھی رکھ سکتی ورنہ وہ اس کی ٹھوکروں کی زد پر تو تھا ہی۔ دانتوں پر دانت جمائے وہ ایک لفظ کہے بغیر چادر سر تک تان کر لیٹ گیا۔ لاریب جس کا دل خوف سے بند ہو رہا تھا جسے کسی کے اس مظاہرے پر ششدر رہے گئی۔ کچھ دیر ساکن کھڑی اس کے خیمہ زن وجود کو تکتی رہی پھر ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چادر کا کونا کھینچا۔

”سکندر پلیر۔“ اس کا مدہم لرزنا لاجب آ میز لہجہ تھا۔ خوفناک رات کا سہم اور سانپ کی دہشت کا وحشت بھرا احساس اسے اس وقت سارا طغنے بھلائے ہوئے تھا۔ سکندر ایسے اٹھا جیسے کوئی طوفان ہو۔

”کیا سمجھتی ہو تم مجھے لاریب؟“ اسے خونخوار نظروں سے گھورتا وہ زور سے چیخا تو لاریب اس کے جارحیت بھرے انداز پر دم بخود رہ گئی۔

”نفرت کرنی ہو مجھ سے؟ گھن آتی ہے تمہیں مجھ سے تو پھر یہ گنجائش بھی کیوں؟ کیا سمجھوں میں اسے تمہاری عنایت یا بھیک میں دی گئی توجہ؟ یہ تو طے ہے نا کہ تم جذبات میں بے قابو ہو کر میرے پاس نہیں آئی ہو پھر بھی میں فرشتہ نہیں ہوں کہ اس آزمائش میں کوئی حد کر اس نہ کروں۔ سچی ہو تم اس سیدھی بات کو خود سے کیوں نہیں سمجھ جاتیں۔ کیوں مجھے آزمانے پر تلی ہوئی ہو؟“ وہ برس رہا تھا۔ اس کی مٹھیاں پیچھی ہوئی تھیں اور چہرہ سرخ اور تیور اتنے خونی کہ لاریب کو اس سے خوف آنے لگا۔ سکندر تیز تر تنفس کے ساتھ اسے اپنے سامنے سے دھکیلتا آندھی طوفان کی طرح کمرے سے نکل گیا۔ لاریب صدمے کی انتہا پر جا کر گنگ کھڑی تھی۔ دھیرے دھیرے حواس بحال ہوئے تو اس کی بات کا مسموم سمجھ میں آیا اور جیسے زمین میں گر گئی۔

نہیں ہونے دی۔ اس کے خراب موڈ سے بے خبر اس پل لاریب کے حواسوں پر بس سانپ کا خوف سوار تھا۔ ”اچھا..... چھوڑیں..... دیکھئے تو دیں مجھے۔“ سکندر کی جھنجھلاہٹ اور بڑھی تھی۔ کسی قدر غصے سے کہتے اس نے اپنا بازو چھڑوایا اور اسی غصے میں چند لمحوں کے اندر اس نے پورا کمر الٹ کر رکھ دیا۔ مگر سانپ کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

”سو جائیے ایسا کچھ نہیں ہے یہاں، وہم ہے آپ کا۔“ سکندر کے بے رخی سے بھرپور انداز میں بے اعتنائی کا تاثر گہرا تھا۔ لاریب خائف اور متذبذب کھڑی تھی۔

”اب کیا ہے؟“ وہ جیسے پھاڑ کھانے کو دوڑا۔ ”مم..... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہاں سے انداز میں جو تو بیچ دی گئی وہ سکندر کی جان جلا کر رکھ گئی۔

”بہت خوب.....! تو محترمہ اب آپ کے ڈر کا تعویذ میں کہاں سے جا کر لے آؤں؟ حکم کیجیے۔“ بے رحم کھر درا لہجہ لاریب کے اعصاب سن کر گیا۔ وہ تو بین کے احساس سے منجمد رہ گئی۔

”افوہ..... کہا نا کچھ نہیں ہے یہاں، چلیں لائٹ جاتی چھوڑ دیتا ہوں لیٹ جائیں۔“ سکندر کو ہی پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ پتا نہیں کیا تھا اس میں ایسا کہ وہ ہمیشہ بے بس ہو جایا کرتا مگر لاریب پر اس کا وہی لہجہ جس میں بے زاری تھی اس کے دل پر ایسی ضرب کاری کر گیا تھا جیسی وہ کسی طرح بھی خود پر قابو نہیں پاسکی۔ آنسو بے صبرے پن کا مظاہرہ کرتے برس پڑے۔ سکندر کی نظر اس بن بادل برسات پر پڑی تو سر پٹنے والا ہو گیا۔

”ملکہ عالیہ کیا گستاخی سرزد ہوگئی غلام سے اب؟“ جھجکتا ہوا لہجہ سماعتوں میں جیسے سیسہ پکھلانے کا باعث بنا تھا۔ لاریب کے آنسوؤں میں شلت آنے لگی۔ وہ ہونٹ بھیچنے سے تکتے لگا۔

”تم میرے ساتھ آ جاؤ وہاں بیڈ پر۔“ اس نے نظر اس چار کیے بنا لاریب نے جو فرمائش کی وہ سکندر کو

گیا۔ چٹائی کو فرش کی بجائے بستی نے سیلن زدہ کر رکھا تھا۔ یہ ٹھنڈک ایک تواتر سے اس کے جسم میں اتر رہی تھی مگر صوفے پر ٹانگیں سیڑ کر لیٹنا بھی کچھ کم تکلیف دہ نہیں تھا۔ کچھ ویسے بھی اس وقت ایک بے بسی اور خود اذیتی کا احساس بھی حاوی تھا جیسی ڈھیٹ بن کر لیٹا رہا۔ نیند ابھی گہری بھی نہیں ہوئی تھی کہ جب کسی احساس کے زیر اثر اسے پھر سے جاگنا پڑ گیا۔ ذہن خواہیدہ تھا وہ اس طرح آنکھ کھلنے کی وجہ سمجھنے سے قاصر ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ لاریب کی وحشت بھری چیخ پر اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑے ہونے پر مجبور ہوا۔ سب سے پہلے اس نے لائٹ آن کی تھی۔ پلٹ کر دیکھنے پر سب سے پہلی نظر بیڈ پر بیٹھی حواس باختہ چہرے والی لاریب پر پڑی جس کے کھلے بال بے ترتیب تھے اور چہرہ پر خوف و ہراس کا غلبہ سکندر نے فی الفور نگاہ بدل لی۔

”سانپ۔“ وہ پھر چیخی اور چھلانگ مار کر بستر سے اتری اور اس کے پہلو میں آ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کا نازک جسم طوفان کی زد پر آئی نازک ڈالی کی طرح لرز رہا تھا۔

”مم..... میں نے خود دیکھا۔“ اس نے سکندر کو یقین سونپنا چاہا جو پتا نہیں سانپ کا سن کر بھی کیوں بے نیاز اور بے گانہ بنا کھڑا تھا۔

”خود دیکھا..... اندھیرے میں؟“ سکندر کا سرد لہجہ طنز آمیز تھا۔ مگر لاریب اس مل حواسوں میں ہی نہیں تھی کہ اس کے لہجے کی کاٹ پر غور کر سکتی۔

”وہ..... وہ میرے ہاتھ پر رینگ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ جھٹکا تو.....!“ آنسوؤں سے بھیگی بے اوسان اور لرزاں آواز میں اسے آگاہ کرتی ایک دم ٹھٹکی اور خود خوفزدہ نظروں کو فرش پر متلاشی انداز میں دوڑانے لگی۔

”وہ مجھے کاٹ بھی سکتا تھا تم دیکھو تو؟“ یہیں کہیں ہوگا۔“ خوف سے کانپتی وہ غیر محسوس مگر لا شعوری طور پر

سکندر سے قریب ہوئی اس کے بازو سے چپک گئی تھی۔ سکندر نے جھنجھلاہٹ بھرے انداز میں اپنا بازو جھٹک کر اسے دور ہٹایا مگر لاریب نے اس کی کوشش کا میاب







کیے جانے کے قابل نہیں ہوتی مگر تم نے میرے امور  
جذبوں کو اتنی شدت سے پامال کیا ہے کہ اس توہین کا  
احساس مجھے اندر تک زخمی کر جاتا ہے۔“ وہ ناچاہتے  
ہوئے بھی شکوہ کر گیا۔ لاریب نے غصے سے اسے  
دیکھا مگر اس کی گہری بولتی نظروں کی تپش سے نظریں  
چرائیں۔ اس کی دیوانگی لاریب کے لیے اب کھلا خطرہ  
تھی۔ وہ حد بند یا لگاتے لگاتے بلکان ہونے لگی تھی۔

”اس طرح محبت کا پرچار نہ کیا کرو میرے سامنے  
کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ اس کا لہجہ زہر خند تھا اور سکندر  
نے ضبط کی کوشش میں آخری حد تک خود کو آزما دیا تھا۔

”مجھے یہ خوش فہمی کبھی لاحق نہیں رہی کہ میرے  
جذبے کبھی آپ پر اثر انداز ہوں گے۔ یا آپ کو کبھی  
اپنے رویوں پر ہی تاسف ہوگا۔ میں ہمیشہ اس بات پر  
متاسف رہا ہوں کہ آپ کے لیے تمام تر نیک  
خواہشات رکھنے کے باوجود آپ کے کسی کام نہیں  
آسکا۔“ اس بل سکندر کی سرخ آنکھوں سے جانے  
کیوں لاریب کو نگاہ چرانا پڑ گئی۔

بیل فون کی گنگناہٹ پر لاریب نے اپنی سوچوں  
سے چونک کر موبائل کی جلتی بجھتی اسکرین کو دیکھا۔  
جس پر سکندر کا نام بلیک کرتا تھا۔ لاریب بے تاثر  
نظروں سے اسکرین کو گھورتی رہی یہاں تک کہ گھنٹی بند  
ہو گئی۔ وہ اس وقت اتنی خفا تھی سکندر سمیت خود سے بھی  
کہ اس سے بات کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

”لاریب میں آج گھر نہیں آسکوں گا۔ آپ آتش  
وان جلا لینا اور کھانا وقت پر کھا لینا، پلیز۔“ مزید دو تین  
مرتبہ جب گھنٹی بج کر بند ہوئی اور لاریب نے فون نہیں  
سنا تو سکندر نے ٹیکسٹ کے ذریعے اسے اپنی بات  
پہنچائی۔ جسے پڑھ کر لاریب کے چہرے پر حقارت  
بھرے تاثرات اُٹ آئے۔ اگلے لمحے اس کی انگلیاں  
طیش کے عالم میں اس کا نمبر مار رہی تھیں۔

”جی حکم؟“ کال ریسیو ہوتے ہی لاریب کی سلگتی  
سماعتوں میں سکندر کی شریا دار گونجی تھی۔

”بات سنو..... تمہیں یہ خوش فہمی کس نے دلائی کہ  
مجھے تمہارے گھر آنے یا جانے سے کوئی واسطہ ہے۔ اگر  
تم قیامت تک بھی میرا انتظار کرو گے تو میں قیامت  
تک بھی پلٹ کر تمہاری جانب نہیں دیکھوں گی۔“ وہ  
پھنکاری تھی۔ اشتعال کی شدید کیفیت نے اس کا چہرہ وہ  
آنکھیں دہکا کر انگارہ بنا دیں۔ دوسری جانب سناٹا  
بولنے لگا۔ اتنا گہرا سناٹا کہ لاریب کو لائن کٹ جانے کا  
گمان گزرا۔

”ہیلو.....“ اس نے بے ساختہ پکارا۔ تب سکندر  
کے سر داہ بھرنے کی آواز ابھری۔  
”اور کچھ کہنا ہے آپ کو؟“ اس کا ٹھہرا ہوا لہجہ معمول  
کے مطابق تھا۔

”میں لعنت بھی نہیں بھیجتی تم پر میری بلا سے  
کبھی لوٹ کر نہیں آنا، سمجھے؟“ اس نے غرا کر کہتے  
فون بچ دیا۔

”پتر سکندر تو آج نہیں آسکے گا، دھی رانی آپ روٹی  
کھاؤ میں لا دوں؟“ لاریب نے کھٹکے پر پلٹ کر دیکھا  
تو اماں کو کھڑے پا کر اس کا پہلے سے خراب ہوا دماغ  
کچھ اور بھی نمی سمیٹ لایا۔

”مجھے نہیں کھانا، جب کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو  
خود لے لوں گی ہاتھ پیر سلامت ہیں میرے اور بات  
سنو..... بلا اجازت منہ اٹھا کر میرے کمرے میں نہ  
گھس آیا کرو۔ ماں ہوگی تم سکندر کی اور وہ میرے  
جوتے کی نوک پر رہتا ہے اس سے تم اپنی حیثیت و  
مقام کا تعین کر لو۔“ بے رحم بد لحاظ لہجہ جس میں سوائے  
تذلیل کے اور کچھ نہیں تھا اماں کا رنگ بتدریج پھیکا  
پڑ گیا۔ ان کے ہونٹ کچھ کہنے کی کوشش میں کانپے  
اور آنکھیں اتنی تیزی سے برسیں کہ لاریب بھی  
ششدر رہ گئی۔

”گستاخی معاف کر دو پتر، ہم تو نوکر ذات ہیں  
میں دوبارہ کبھی آپ کے کمرے میں نہیں آؤں گی۔“  
وہ بولیں تو ان کا لہجہ آنسوؤں کی نمی سے بھیگا ہوا اور

رقت آمیز تھا۔ اپنی میلی پرانی سی اوڑھنی سے آنسو رگڑ  
کر صاف کرتے وہ پلٹ کر کمرے سے چلی گئیں۔  
لاریب ہونٹ بھیچے سا کن کھڑی رہ گئی۔ اس بوڑھی  
عورت کے آنسو دل پر موجود غم اور بوجھ کو بڑھاوا  
دے گئے تھے مگر اس کی سوچوں میں ابھی بھی آگ  
جل رہی تھی۔

(میں تمہارا جینا حرام کر دوں گی سکندر، آخر تک  
تک برداشت کرو گے اور یہ بالکل صحیح طریقہ ہے تم  
سے جان چھڑانے کا) اس کا منتقم انداز اس بل بھی  
شدت پسندی لیے تھا۔



”ہوش کے ناخن لے ثانیہ۔ خبردار جواب میں نے  
تمہارے منہ سے کوئی بات سنی۔“ اماں بلا دروغ ثانیہ کو  
جھاڑنے میں مصروف تھیں۔ جسے ابھی تھوڑی دیر قبل  
ہی سکندر سا ہیوال سے لے کر آیا تھا۔ سکندر کی شادی کی  
رات ہی وہ خالہ کے ہمراہ سا ہیوال چلی گئی تھی  
کیوں..... وجہ سکندر بھی جانتا تھا اور اماں بھی مگر خالہ  
نہیں جانتی تھیں۔ جیسی حیران تھیں اور اماں یہی نہیں  
چاہتی تھیں ثانیہ مزید کوئی حماقت کرے۔ ان کی شدید  
ڈانٹ فون پر سن کر بھی وہ واپس آنے پر آمادہ نہیں تھی تو  
اماں نے سکندر کو ایسے لینے بھیج دیا تھا۔ جس کے نتیجے  
میں اب وہ یہاں تھی مگر ہرگز بھی خوش نہیں لگتی تھی۔  
لاریب نے چادر میں لپیٹی سانولی مگر پرکشش لڑکی کو  
سکندر کے ہمراہ آتے دیکھا تھا مگر وہ اسے جانتی نہیں  
تھی۔ سکندر کمرے میں آنے کے بجائے اماں کے  
پاس چلا گیا تھا۔ اب اندا کے کمرے سے ہی بولنے کی  
آوازیں آرہی تھیں۔ وہ لالعلقی بنی بیٹھی رہی۔

”اسے سمجھا دے سکندر نے مجھے دکھی نہ کرے۔“  
اماں اٹھ کر چلی گئیں۔ سکندر نے سر اٹھا کر ثانیہ کو نہیں  
دیکھا۔ البتہ اس کی حسرت بھری نظریں اس پر تکی  
تھیں۔ وہ اس کے غم سے نا آشنا بھی جیسی اسے رشک  
سے دیکھتی تھی۔

”تمہیں تمہاری محبت کی جیت مبارک ہو  
سکندرے۔“ اس کے ہونٹوں پر غم آلود مسکان تھی۔  
سکندر نے پھر بھی اسے نہیں دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔  
”بہت جلدی ہے تمہیں اپنی دلہن کے پاس جانے  
کی؟“ اس کے لہجے میں رقابت کی تپش تھی۔ سکندر نے  
عاجز نظروں سے اسے دیکھا۔

”اے جذبوں کو بے مول مت کرو ثانیہ۔ اگر اب  
تک خاموش رہی ہو تو پھر اب یہ خاموشی اور بھی ضروری  
ہے۔ مجھے ہرگز اچھا نہیں لگے گا اگر تم اپنا یہ بھرم کھو دو  
گی۔“ اس سے نگاہیں چار کے بنا کہہ کر تیزی سے باہر  
نکل گیا۔ ثانیہ سکتے زدہ بیٹھی رہ گئی۔ پھر یہ سکتے ٹوٹا تو اس  
نے اپنا موبائل فون اٹھا کر صفدر کا نمبر سرچ کیا اور کال ملا  
دی۔

”تم خالہ کو بھیج سکتے ہو صفدر۔ مجھے اب کوئی  
اعتراض نہیں ہے۔“ محض دو فقرے بولنے کے بعد اس  
نے ادھر کی سنے بغیر فون کاٹ دیا۔ یہ اس سے اگلے دن  
شام کی بات ہے جب اماں بہن کو رو برو پا کر حیران ہو  
رہی تھیں۔ مگر ان کا مدعا جان لینے کے بعد اگر انہوں  
نے فوری انکار کیا تھا تو وجہ اس کی نا اہلی تھی جو پورے  
خاندان میں مشہور تھی۔ نکما اور کام چور ہی نہیں وہ شرابی  
اور جواری بھی تھی۔

”آپا غصہ نہ کر ثانیہ سے بھی پوچھ لے۔ میں اپنی  
مرضی سے اگر آتی تو کئی سال پہلے کی آگئی ہوتی۔“ خالہ  
کی بات سن کر اماں کو لگا تھا زمین پھٹی ہے اور وہ اس  
میں سما گئی ہیں۔ انہوں نے خالہ کو جیسے تیسے ٹال دیا مگر  
ثانیہ کے پیچھے بڑ گئی تھیں۔

”مجھے شرم نہ آئی ثانیہ یہ کل کھلا کر آئی ہے تو وہاں۔“  
اور ثانیہ دکھ سے ہنس پڑی تو آنکھوں میں جھلملائی نمی  
اس کے گالوں پر اترنے کو بے قرار ہونے لگی۔

”نہیں اماں میں نے کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں  
کی۔ حرکت کرنی ہوتی تو یہاں کرتی۔ سکندرے کو  
پانے کو اب تو محض مسلط ہو جانے والے عذاب سے



چھکارے کی خواہش ہے۔“ اور اماں اس جواب پر دکھ کی اتھاہ گہرائی میں اترتی چلی گئی تھیں۔

”اسے روک لے سکندر نے بھلا کوئی خود بھی اپنے پیروں پر کلباڑی مارتا ہے؟“ شام کو سکندر کو ساری بات بتاتے اماں رو پڑی۔ اکلوتی مرادوں سے لی بیٹی کا روگ انہیں کھوکھلا کرنے لگا تھا۔ گم صم تو سکندر بھی ہو گیا تھا۔ اس کے پاس بھی کہاں حل تھا اس مسئلے کا اپنی اپنی جگہ وہ سب ہی دل کے ہاتھوں مجبور اور بے بس تھے مگر یہ بھی طے تھا کہ وہ ثانیہ کو اس حماقت کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ جہی وہاں سے اٹھ کر وہ چھت پر آ گیا جہاں ثانیہ ڈھلتی شام کی ملکچی دھوپ میں بیٹھی برندوں کو باجرہ ڈال رہی تھی۔ اسے دیکھ کر چونکی اور ڈھلکتا ہوا آنچل پھر سر پر رکھ لیا۔

”زندگی میں سب کچھ ہمارے لیے نہیں ہوتا ثانیہ ہماری قسمت کے فیصلے ہمیں نہیں الٹ کر کرنے کا حق ہے وہ جیسا کرے جو دے اسے لینا اور اسی پر راضی رہنا چاہیے۔“ وہ اس سے کچھ فاصلے پر گھڑا تھا۔ ثانیہ کا جھکا سر کچھ اور جھک گیا اور آنکھیں برس پڑی تھیں کچھ کہنے کی کوشش میں اس کے ہونٹ کپکپائے۔

”اماں خالہ کو انکار کر چکی ہیں اور.....!“

”تم انہیں منع کرو سکندر نے مجھے یہاں نہیں رہنا نہیں ہے اتنا حوصلہ مجھ میں اب۔“ وہ ضبط گنوا کر چیخی اور سکندر خائف ہونے لگا۔ کچھ کہے بغیر وہ اس کے پاس بیٹھا اور اس کا کانٹا ہوا ہاتھ سہلایا مگر ثانیہ کسی ایسی جذباتی کیفیت میں تھی کہ اس کا سہارا پاتے ہی ڈھے گئی۔ اس کے کاندھے سے سر ٹپکے وہ جس بل زارو قطار رو رہی تھی لاریب نے اسی بل زینہ طے کر کے اوپر قدم رکھا تھا۔ دونوں کو اس پوزیشن میں دیکھ کر وہ یکدم ٹھنک گئی۔ کیا تھا اس لمحے اس کی نظروں میں.....

استعجاب، غیر یقینی یا پھر گہرا طنز۔ گو کہ سکندر کے ساتھ ثانیہ بھی سنبھل گئی اور تیزی سے سکندر سے فاصلے پر ہو گئی مگر سکندر کے لیے شدید تشویش کا باعث لاریب کا

تلخ تاثرات لیے وہاں سے پلٹ جاتا تھا۔

”..... لاریب بی بی..... برا مانیں گی نا بہت؟“ ثانیہ حراساں تھی جیسے چوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔ سکندر نے گہرا سانس بھر کر خود کو کمپوز ڈکھا اور سر جھٹکا۔

”صفر کسی طرح بھی تمہارے قابل نہیں ہے ثانیہ اگر تم خود کو یہ سزا دو گی تو میں عمر بھر خود کو تمہارا مجرم سمجھتا رہوں گا۔“

”لاریب بی بی غصے میں تھیں پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا۔ آج تک کبھی ایسی کوئی حرکت نہیں ہوئی ہم سے اور آج.....!“ وہ متاسف اور بے حد متفکری ہاتھ مسل رہی تھی۔

”پریشان مت ہو چھوٹے لوگ اور معمولی باتیں ان کے معیار سے بہت نیچے ہیں۔“ سکندر کا لہجہ سخت اور کاٹ دار تھا ثانیہ کے چہرے پر دکھ پھیل گیا۔ وہ اسے ڈوبتی نظروں سے ٹکٹے لگی۔

”مگر تم معمولی نہیں ہو اس بات کا اندازہ انہیں کبھی نہ کبھی ہو جائے گا۔“ سکندر کے چہرے کی تلخ مسکان مزید گہری ہو گئی۔ کچھ کہے بغیر وہ نیچے اتر کر آیا تو لاریب کو محن میں کرسی پر بیٹھے بظاہر میگزین کی ورق گردانی کرتے پایا۔

”یہ لڑکی کیا لگتی ہے تمہاری؟“ اس کا مخاطب گھر سے باہر جاتا سکندر تھا۔ اس نے بے اختیار تھم کر اور کسی قدر خائف انداز میں لاریب کی شکل دیکھی۔ اماں بھی وہیں تھیں۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا کچھ بھی الٹی سیدھی ہانک دیتی۔

”کون ثانیہ؟ پتہ یہ بہن ہے سکندر کے کی۔“ اماں نے سکندر کی جانب سے جواب نہ پا کر جلدی سے وضاحت کی۔ سکندر نے لاریب کے چہرے پر ہنسنے آمیز مسکان کی جھلک دیکھی۔

”جو آپ بھی ہیں ویسا کچھ بھی نہیں ہے بہتر ہے دل میں کسی غلط فہمی کو جگہ نہ دیں۔“ وہ تیز قدموں سے

اس کے قریب آیا اور بے حد مدہم آواز میں اس طرح کہا کہ صرف وہی سن سکے۔ لاریب کے چہرے کے زہر خند تاثرات میں حقارت بھی سمٹ آئی۔

”نوا ریگو منٹ او کے بیوی سمجھ کر وضاحتیں پیش نہ کرو میرے آگے۔“ وہ مدہم مگر سرد لہجے میں غرائی اور ایک جھٹکے سے پلٹ کر وہاں سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سکندر بھی اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔

”شادی کیوں نہیں کر لیتے اس سے؟ ویسے بھی تم یہی ڈیزرو کرتے ہو۔“ وہ اسے دیکھتے ہی پھنکاری سکندر اسی سنجیدگی سے تکتا کچھ اور نزدیک آ گیا۔

”مجھے آپ سے یہی کہنا ہے لاریب صاحبہ کتا آپ کی دشمنی آپ کی نفرت مجھ تک محدود رہے تو بہتر ہے اپنی فیملی کا ہر فرد مجھے صرف عزیز نہیں ان کی عزت نفس بھی مجھے پیاری ہے۔ میں ہرگز آپ کو اجازت نہیں دوں گا کہ آپ انہیں کسی بھی لحاظ سے ہرٹ کریں۔ میرا خیال ہے آپ بات سمجھ گئی ہوں گی میری۔“ اپنی کہہ کر وہ رکنا نہیں جس سنجیدگی سے آیا تھا اسی سنجیدگی سے پلٹ گیا۔ لاریب تو گویا گنگ رہ گئی۔



کسی سے اس لیے بھی دشوار ہے خفا ہونا منانے آئے گا ہم کو بھی یار مشکل ہے

سکندر برآمدے کے پلر کے ساتھ بچھے تخت پر لیٹا ہوا تھا۔ ایک بازو آنکھوں پر تھا۔ خالہ کو صفر کے رشتے سے انکار اور معذرت کی جا چکی تھی جہی وہ خاصا ریلیکس تھا۔ اماں کچھ فاصلے پر دھونے والے کپڑوں کا ڈھیر لیے بیٹھی تھیں۔ بابا اپنی بکریوں کا چارہ کاٹنے جانے والے تھے اور درانتی کی دھار کو پتھر کے ٹکڑے پر رگڑ کر تیز کرنے میں مصروف تھے۔ آنگن دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔ فضا میں بابا کی درانتی کی رگڑ کی آواز پھیلی ہوئی تھی جس میں کچن سے ثانیہ کے کھانے پکانے کے دوران گاہے بگاہے اٹھتی برتنوں کی کھنک دب رہی تھی۔ یہی لاریب اپنے کمرے سے نکل کر محن میں آ گئی۔ اس

کے لمبے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

شعاعیں بکھیرتا نازک سراپا اور بے نیازی و نخوت کا مخصوص تاثر اسے مغرور اور بے تحاشہ دلکش بنا کر دکھاتا تھا۔ سکندر کی نگاہ اس پر ٹھہری تو دل سیرابی کی خواہش کی تکمیل سے نظریں نہیں چرا سکا۔ عجیب سی حسرت عجیب سی بے کسی اس کے دل پر وارد ہونے لگی۔

عجیب راز جنوں تھا جو میرے دل پر گھلا تیری گلی میں بھی آ کر قرار مشکل ہے ہمارا کون ہے اہل وفا کی بستی میں ملے گا کوئی ہمیں غمگسار مشکل ہے

اس کے لبوں سے سر آہ نکل گئی۔ کچھ خواہشیں کتنی بے مایا ہوتی ہیں مگر ان کی تکمیل کی چاہ ذلت و خواری کی اتھاہ گہرائی میں لے جا کر لمحہ لمحہ تر پانی بنے سلگاتی ہے اتنی ظالم کیوں ہوتی ہے محبت؟ اس کے دل نے کتنی المناکی کی کیفیت میں دماغ سے سوال کیا تھا۔

”لے بھلا اب یہ سکندر خود سو گیا۔ ہمیں کہاں یہ مشین چلائی آتی ہے۔ اس وقت بتی بھی تو چلا دیتا۔ کم نبٹ جاتا تھہ سے وی دھونے میں دیتا مجھے، کہتا ہے اماں تیری سہولت کی خاطر تو لایا ہوں مقصد گھر بھرنا اور سجانا تھوڑی تھا۔“ گیلے بالوں میں انگلیاں چلائی لاریب اماں کی آواز پر چونکی اور بے مقصد انہیں تکتے لگی۔ اس کے باوجود بھی کہ وہ اس سے مخاطب نہیں تھیں بابا سے کہہ رہی تھیں لہجے میں بیٹے کی محبت کا فخر اور مان بول رہا تھا۔ کیسی ہوتی ہے یہ محبت جھاڑ میں الجھ جانے والے نازک سے کپڑے کی مانند جسے جتنی مرضی احتیاط اور نرمی سے الگ کر دسورخ اور چھید پھر بھی ہو ہی جاتے ہیں۔ لاریب کا دل گداز ہونے لگا۔ یہ وہ عورت تھی جس کی وہ دانستہ قدم قدم پر تذلیل کرنے لگی تھی مگر وہ پھر بھی محبت و شفقت کا سمندر تھیں جس میں اس کی نفرت کی چند بوندیں اپنا وجود لمحہ بھر میں کھو بیٹھتی تھیں۔

وہی آنکھوں سے چھلکتی ماما بھری چاہ وہی خصوصی



لگاؤ بھرا بیٹھا انداز جس میں ایسی اثر پذیری تھی کہ لاریب کو اپنے عمل اپنے فعل پر نا چاہتے ہوئے بھی شرمندگی آن جھڑتی اس بل بھی جب وہ باہر آئی تو کسے انہوں نے اس کا آؤ بھٹکٹ کیا تھا۔ بیٹھنے کو کرسی پیش کی تھی۔ اتنے دن ہوئے تھے اسے یہاں رہتے مگر ان کا انداز پہلے دن کی طرح ہی والہانہ ہوتا تھا۔ وہ ان کی محبت کے آگے اپنی نفرت کو بے تاثر پانی تو اندر تک سناٹے پھیل جاتے تھے۔ سارے منصوبے ساری ترکیبیں خاک میں جا ملتیں۔

”تے رہن دے ضروری ہے ابھی کم کرنا تھکا ہوا آیا ہے لگ گئی ہے اکھ تو بے آرام نہ کر بڑی مہربانی۔“ بابا نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا اور درانتی کے ساتھ چارے کا کپڑا اٹھا کر نکل گئے۔ سکندر نے گہرا سانس بھرا اور کسکندی جھٹک کر اٹھنے کو تھا کہ یکدم اسی زاویے پر ساکن رہ گیا۔ اس نے حیرت سے لاریب کو اٹھتے اور اماں کے پاس جاتے دیکھا۔ پتا نہیں وہ ان کی مدد کر رہی تھی یا گائیڈ کرنے کی کوشش۔

”پہلے پانی اور سرف ڈال کر اسے آن کریں، ایسے۔“ اس نے خود مٹن کو گھمایا پھر کپڑوں کے ڈھیر کی سمت متوجہ ہوئی۔

”کلرز اور وائٹ کپڑوں کو الگ کر لیا کریں تاکہ رنگ خراب نہ ہو۔“ کپڑوں کے الگ ڈھیر بناتے ہوئے وہ باقاعدہ سمجھا رہی تھی اور اماں بوکھلائی جا رہی تھیں۔ اونچے گھرانے کی نازک مزاج بہو کے کرنے کے یہ کام تھوڑی تھے۔ ان کی بوکھلاہٹ اسی باعث تھی۔ مگر لاریب کسی اور موڈ میں تھی کہ دھیان دیے بغیر لگی رہی۔ شاید اس وقت موڈ بحال تھا اور دل پر رحم کا فطری جذبہ حاوی تھا۔ جیسا ان سے کی گئی زیادتیوں کا معمولی سا ازالہ کرنے میں ملن تھی۔ جھٹکنے کے باعث اس کے بے حد لمبے سلکی بال ڈھلک کر کاندھوں سے ہوتے آگے جھولنے لگے۔ ان کی اوٹ میں اجلا جھلملاتا ہوا چہرہ گویا چاند کے گرد سیاہ بدلیوں کا جھرمٹ

### جدید محدودیے

- جاتی وزارت کی شیردانی ہی تھی۔
- خرچ بڑھتا گیا جوں جوں کمائی کی۔
- ایک روٹی ساری دنیا میں گھمائی ہے۔
- کر چوری..... بھر تجوری۔
- شاعر کا منہ کھلے تو وہ محبوب مانگتا ہے۔
- سیاست دان کا منہ کھلے تو وہ ووٹ مانگتا ہے۔
- پولیس کا منہ کھلے تو وہ مکا کی صدا لگاتا ہے۔
- ڈاکٹر کا منہ کھلے تو وہ کثیر چار جز مانگتا ہے۔

انا خان مہوش..... رنگ پور

تھا۔ وہ مسحور ہونے لگا۔

”جب بزرگے گا تو مشین خود بخود رک جائے گی۔ پھر یہ کپڑے نکال کر دوسرے ڈال دیجیے گا۔“ وہ اگلی ہدایت دے کر پٹی اور واپس اپنی کرسی پر جا کر بیٹھنے کی بجائے اس کا رخ برآمدے کی جانب ہو گیا تھا۔ ارادہ کمرے میں جانے کا ہوگا مگر اس بل سکندر کی حیرانی و گڑ بڑاہٹ کی انتہا نہ رہی جب اس نے سکندر کے سر پر پہنچ کر ہاتھ بڑھایا اور اس کی آنکھوں پر دھرا بازو ایک جھٹکے سے کھینچا۔

”کیوں دیکھ رہے ہو اس طرح سے مجھے؟“ پتی گھورتی نظروں سے اسے دیکھتی وہ استفسار کر رہی تھی۔ سکندر کے گمان میں بھی نہیں تھا وہ اس کی اس چوری سے آگاہ ہو جائے گی اور استفسار بھی کرے گی۔ جیسی فطری طور پر کنفیوژ ہو کر رہ گیا۔

”مجھے بزدل مردوں سے شدید نفرت ہے۔“ اس کا لہجہ حقارت سے بھر پور تھا۔ وہ ایک بار پھر وہی سب ترین لڑکی تھی۔ جو اجنبیت کی اور نخوت میں مانی نہیں رکھتی تھی۔ سکندر کا چہرہ اہانت کے احساس سے سرخ ہو گیا۔ اس کے خیال میں لاریب کا فقرہ نہیں چابک تھا جو اسے بلبلا نے پر مجبور کر گیا تھا۔ لاریب اپنی

بات کہہ کر جا چکی تھی معاوہ یکدم اٹھا اور تلملانا ہوا اس کے چھٹا گیا۔

”کتنی کی شرافت کو اگر بزدلی گردانا جائے تو پھر اس غلط خیال کی تصح ضروری ہو جاتی ہے۔ میں محض آپ کی انا اور نسوانیت کا لحاظ کر رہا تھا مگر ضروری نہیں یہ لحاظ قائم رکھا جائے۔ مجھے لازماً اپنی پوزیشن کلیئر کر دینی چاہیے کم از کم ایک مرتبہ تو ضرور۔“ اس نے جاتے ہی لاریب کو پیچھے سے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر بے بس کرتے ہوئے اپنے مقابل کیا اور اس کی کسی حد تک حیران اور خوفزدہ ہو جانے والی نظروں میں اپنی آنکھیں گاڑھتا ہوا بے حد درستی سے بولا۔ لاریب کو اس اچانک پڑنے والی افتاد پر جتنے بھی پٹنگے لگے ہوں مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کے سرکش خود سرتیور لاریب کی جان نکالنے لگے تھے۔ شاید وہ اس کی بات کو اپنی مردانگی پر تازیانہ سمجھ بیٹھا تھا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے سکندر، ہوش میں تو ہو تم؟ چھوڑو مجھے۔“ وہ اس کے بازوؤں کے آہنی حصار میں پھڑ پھڑائی۔ جتنی بھی اندر سے خائف تھی مگر یہ طے تھا کہ اس کے سامنے کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا یہی تنفر سکندر کی سرکشی کو بڑھانے لگا۔

”تم یقین کرو..... تم مجھے غصے میں اور بھی اچھی لگتی ہو، یونہی..... یہ غصہ بھی آس دلاتا ہے امید جگاتا ہے کہ کبھی نہ کبھی تمہاری بے گانگی کو ختم کر دے گا۔ اس بے گانگی میں دراڑیں پڑتی ہیں تو آس اور امید کی روشنی مجھے اجالنے لگتی ہے۔ تاریکیاں تکلیف دہ نہیں رہتیں۔ مستقبل غیر واضح نہیں لگتا۔“ اس کے الفاظ کے برعکس اس کا لہجہ شوخ تھا اس قدر خنی و تنفر اس کے اندر اتر آیا تھا کہ اس کے ایک ہی جھٹکے کے نتیجے میں لاریب اچھل کر ستر پر گری ساتھ ہی سکندر بھی۔ لاریب خود کو چھڑانے جبکہ سکندر اس پر تسلط جمانے کی کوشش میں تھا اور فطری طور پر سکندر اس پر حاوی تھا۔

اس تصادم اور دھکم پیل کے نتیجے میں پہلے بیڈ کی

سائیڈ ٹیبل پر دھرا ٹیبل لیپ لہرا کر زمین بوس ہوا پھر گلدان گر کر ٹوٹا اور عین اس بل جب سکندر کے توانا بھرے ہوئے وجود کے آگے وہ برکتی چڑیا کی مانند مکمل طور پر اس کی تحویل میں جا چکی تھی باہر سے اماں کی پریشان کن اور گھبراہٹ زدہ آواز بند دروازے کے پیچھے سے اس تک پہنچی تھی۔

”سکندرے..... سکندرے پتر خیر تے ہے نا، کی ہو یا؟“ انہی کی آواز جیسے سکندر کو وحشت کے صحراؤں سے زبردستی کھینچ لائی۔ اس نے اپنے بازوؤں میں پھنسی خزاں زدہ ہتے کی طرح کانپتی وحشت جھلکائی لاریب کو ہونٹ پیچ کر دیکھا اور گہرا سانس بھرا۔

”یہ مت مجھے کہ چھوڑ رہا ہوں آپ کو رات کو پوچھوں گا۔“ اس کا لہجہ ہنوز تند خیز اور غصیلہ تھا۔ اسے تنفر بھرے انداز میں زور سے جھٹکتا آندھی طوفان کی طرح باہر نکل گیا۔ لاریب کتنی دیر تک اپنے بکھرے حواس بحال نہیں کر پائی تھی۔ بے بسی بے مائیگی کا سسکتا ہوا احساس آنکھوں میں خوف کے باعث ٹھہر جانے والے نسوؤں کو گالوں پر اتار لایا۔ اس کی دھمکی کو یاد کر کے اس کی سانسیں رکنے لگی تھیں۔

ہونٹ سختی سے پیچھے سر جھکائے وہ مٹی کے چولہے میں سلکتی آگ کو تپتی تھی۔ کچن کی فضا میں حدت آمیز ملگجا اندھیرا تھا۔ لائٹ اس نے دانستہ بند کر دی تھی۔ اماں اور ثانیہ نے کام کاج کے دوران اسے وہاں بیٹھے ضرور دیکھا تھا مگر ظاہر ہے ٹوکے یا وجہ پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکی تھیں۔ سکندر کچھ دیر قبل ہی گھر پہنچا تھا کھانا اماں نے اسے وہیں کمرے میں پہنچا دیا وہ خائف سی وہیں بیٹھی رہیں۔

”کیا یہ بنا دروازے کا اوپن کچن میری حفاظت گاہ بن سکے گا؟“ اس نے خود سے سوال کیا اور بے بسی کے نوکیلے تیر دل میں اترتے محسوس کر کے آنکھوں کو نم ہونے سے بچا نہیں سکی۔ زندگی لا چاری وہ بے بسی کے



کیسے انوکھے جاں گسل موڑ پر لے آئی تھی۔ باہر وقفے وقفے سے گونجتی آہیں مدھم پڑتی گئیں۔

گویا اماں اور ثانیہ کے سارے کام نبٹ گئے تھے۔ جیسے ہی ان کے کمروں کے دروازے بند ہوئے اسی لمحے کا منظر سکندر باہر آ جاتا پھر..... پھر اس کے بعد..... اس سے آگے بے بسی اور وحشت زدگی کے احساس کی ان کی داستان کا آغاز ہو جاتا۔ لاریب کا بس ہی نہیں چلتا تھا کہ بیرونی دروازہ کھول کر گھر سے ہی بھاگ جائے۔

”آہم.....!“ سکندر کی مدھم کھنکار پر وہ اپنی جگہ پر ایسے اچھلی جیسے سانپ دیکھ لیا ہو۔ سکندر کی گہری نظروں کا ارتکاز اس کی گھبراہٹ کو پار ہاتھا۔

”سو نے کا ارادہ نہیں ہے آج؟“ اس کا مدھم لہجہ صبح آمیز تھا مگر لاریب کو اس وقت وہ زہر سے بھی زیادہ برا لگ رہا تھا۔ اس نے خود کو غیر محسوس انداز میں سکڑا۔ وہ بری طرح خائف اور بے امان نظر آتی تھی۔ سکندر کو اس پر رحم آیا۔ وہ اس کے خوف سے اچھی طرح آگاہ تھا۔

”آپ اندر چلیں لاریب اگر میری موجودگی سے آپ ہرٹ ہیں تو پھر ٹھیک ہے میں نہیں جاتا بیڈ روم میں جسٹ ریلیکس۔“ اس کا گھبراہٹ بہت مدھم تھا۔ لاریب نے چونک کر بلکہ ٹھنک کر اسے دیکھا مگر اگلے لمحے نگاہ کا زاویہ بدل لیا کہ وہ پوری طرح متوجہ تھا۔

”آئی ایم سوری اس وقت میں بہت غصے میں تھا۔ مجھے بہر حال آپ سے ایسے بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔“ وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔ لاریب نے بے اختیار لابی پلکیں اٹھائیں، سکندر نظریں چار ہونے پر بے بسی سے مسکرایا۔

”اکیبن سوری میں کبھی کسی بھی معاملے میں آپ کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتا بلکہ اگر میرے بس میں ہوتا تو آپ کی سب سے شدید خواہش جان دار کربھی پوری کر دیتا۔ ہمیشہ یاد رکھیے گا۔ محافظ لیرے نہیں ہو سکتے۔ حالات نے آپ کو بے بس ضرور کیا ہے میں کبھی آپ کو

جبر اور ناپسندیدگی کے راستوں پر نہیں چلا سکتا۔“ وہ ایک بار پھر وہی سکندر تھا۔ دھیمہ پر خلوص اور خود پر ضبط و جبر کا قائل۔ لاریب پر پہلی مرتبہ اس کی شخصیت کا یہ رنگ کھلا یا شاید پہلی بار دل سے اس کی برداشت ہمت اور اعلیٰ ظرفی کی قائل ہوئی۔ اس کے مدھم لہجے میں کتنی تشنہ آرزوؤں کا قتل تھا یہ بھی عین اسی بل اس پر کھلا تھا مگر وہ اس آخری سوچ پر دانستہ دھیان لگانا نہیں چاہتی تھی۔ سکندر کے اشارہ کرنے پر اس نے اٹھ کر قدم بڑھائے جو دروازے کی چوکھٹ پر جا کر ختم گئے۔ اس نے پلٹ کر سکندر کو تذبذب کی کیفیت میں دیکھا۔

”تم کیا کرو گے اب؟“ سکندر کی ساری یاسیت اور بڑھرمردگی جیسے اندر سے اٹھ کر آنے والی شوخی و شرارت نکلتا گئے بھاپ بن کر اڑ گئی۔

”میں نے تو آج ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی سر کرنے کا گولڈن پلان بنایا تھا مگر..... اب ساری رات سگریٹ پھونکوں گا اور تصویر جانناں سے ہی دل بہلانے کی کوشش کروں گا۔ حالانکہ کامیابی کے چانسز کم ہیں۔“ اس کا چہرہ بھلے سنجیدہ تھا مگر آنکھوں سے شرارت کے رنگ چھلک پڑتے تھے۔ لاریب کا چہرہ جانے کس جذبے کے تحت بے تحاشہ سرخ پڑ گیا۔ حجاب آمیز خفگی کا شکار ہوتی وہ اسے ڈھنگ سے گھور بھی نہیں سکی اور اندر کھس کر زوردار آواز سے دروازہ بند کر لیا۔

وہ ہمدردانہ جذبات جو اس کے لیے دل میں جا گئے تھے اسی خیانت کی نذر ہو گئے۔ وہ مہر لگا چکی تھی اس سوچ پر کہ وہ گھٹیا انسان ہرگز بھی کسی ہمدردی کے لائق نہیں۔ دوسری جانب سکندر سیڑھیوں کی جانب بڑھتا اب ہلکا پھلکا ہو کر مسکرایا تھا۔ لاریب کا جھنجھلاہٹ غصے اور ناراضی کے گہرے تاثر سے سجا چہرہ اس کے تصور کے پردے پر لہراتا تھا۔ اس جھنجھلاہٹ نے بھی اس کی خوبصورتی پر اثر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس روپ میں بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کا سبب بن چکی تھی۔ یعنی

طے ہوا تھا حسن ہر عالم میں اثر دکھاتا ہے۔  
”میں تمہیں اپنی محبت سے ہی فتح کروں گا“  
لاریب، مجھے ہمت نہیں ہارنی۔“ وہ نئے سرے سے پر عزم ہوا۔ محبت انسان کو کبھی مایوس ہونے نہیں دیتی۔

گل رات کے تھکر اور غصے کے باعث وہ کھانا نہیں کھا سکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ صبح اٹھتے ہی پہلا شدید احساس بے تحاشہ بھوک کا تھا۔ اس نے کسلندی سے کروٹ بدلی پھر سر اٹھا کر ٹکجے اندھیرے میں وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ نونچ رہے تھے صاف مطلب تھا سکندر جا چکا ہوگا۔ اس کا ذہن بے حد ریلیکس ہوا۔ واش روم میں آ کر منہ ہاتھ دھونے کے بعد جوڑے کی شکل میں کھلے بال بیٹنی دروازے تک آئی تو کچھ خیال آنے پر مڑ کر بیڈ کے سرہانے پڑا دوپٹا اٹھا کر شانوں پر پھیلا لیا۔ سکندر بھلے چلا گیا تھا مگر بابا کی موجودگی کا امکان باقی تھا۔ وہ جتنی بھی خود سر بے لحاظ بنی تھی مگر فطری حیا اور تربیت کا اثر تھا کہ کبھی ان کے سامنے بنا دوپٹے کے نہیں گئی تھی۔ دروازہ اور برآمدہ بار کر کے وہ باہر آ گئی۔ آنگن خالی تھا البتہ کچن سے کھڑ پٹر کی آوازوں کے ساتھ اماں اور ثانیہ کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ لاریب صحن عبور کر کے دروازے پر آئی تو اماں کی نگاہ اس پر پڑی۔

”آؤ آؤ پتر! ماں سو داری صدقے جگ جگ جیو۔“ ان کا وہی مخصوص والہانہ سا استقبال تھا جبکہ لاریب سکندر کو وہاں براجمان پا کر جی بھر کے بدحرا ہو گئی۔

”اگر بیٹے کی خدمت اور لاڈ ختم ہو گئے ہوں تو میرے لیے بھی ناشتہ تیار کرو۔“ وہ جتنا کھسی تھی اسی لحاظ سے اس کا لہجہ بے زاری و ناگواری سے لبریز تھا۔ سکندر آہ بھر کر رہ گیا۔ یعنی حد بھی رقابت و جلیسی کی بھی جبکہ اس کے برعکس اماں اور ثانیہ کے ہاتھ پیر پھولنے لگے تھے۔ اس کے ماتھے پر آئی کئی شکنوں کے باعث۔

### شماثلہ قیوم

السلام علیکم! ڈیرا نچل اسٹاف رائٹر اور قارئین کرام کیسے ہیں! امید ہے تمام لوگ خیریت سے ہوں گے ہر ماہ بہت سی دوستوں، بہنوں کے بارے میں پڑھتی ہوں آج سوچا کیوں نہ میں آنچل میں انٹری دوں۔ مجھے شام لکھتے ہیں میری دوست مجھے بلی کہتی ہیں جی تو دوستو 7 دسمبر کو خوب صورت سے دن عیسیٰ خیل کے قریبی گاؤں شیخانوالہ میں جلوہ افروز ہوئی، ہم پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ میرا نمبر چھٹا ہے بہت زیادہ بولتی ہوں، فیورٹ کلر بلیک اینڈ پنک ہے۔ نئے نئے لوگوں سے ملنے کا بہت شوق ہے ہر کسی سے فری ہو جاتی ہوں اسی وجہ سے دھوکے بھی بہت کھاتی ہوں۔ فرینڈز بے شمار ہیں جن میں سونیا، ارسہ، راجیلہ، صوفیہ، فاطمہ، عارفہ، مسرت، نمرہ، انعم، بس، یہی کافی ہے اللہ حافظ۔

”کیوں نہیں پتر آپ بیٹھو تو سہی میں پراٹھا پکائی ہوں۔“ انہوں نے تیزی سے اس کے ناشتے کا اہتمام شروع کیا تو ثانیہ نے اسے پیڑھی پیش کی۔

”کیوں تکلیف کرتی ہو ثانیہ یہ اپنے کمرے میں ناشتا کریں گی۔“ سکندر کی رسان سے کئی گئی بات نے لاریب کا سارا موڈ ہی خراب کر دیا تھا۔

اس نے سکندر پر تپتی نظر ڈالی اور پیڑھی اس کے برابر پہنچ کر بیٹھتے ہوئے اس پر کچھ جتلانا چاہا تھا۔ عین ممکن ہے اس حرکت کے پس پردہ کوئی جذبہ رقابت کا یا پھر پیرے ملادی کا بھی ہو جس سے وہ فی الحال خود بھی انجان تھی۔ البتہ سکندر دم بخود رہ گیا تھا۔

”آج غالباً سورج مغرب سے نکلا ہے اور مغرب میں غروب ہوگا۔“ مسکراہٹ دبائے کہہ کر اس نے نوالہ منہ میں ڈالا۔ صاف اسے ہی نشانہ بنایا گیا تھا لاریب نے دانستہ نظر انداز کر دیا۔

”اس عزت افزائی کے لیے شکر گزار ہوں، اگر ساتھ بیٹھ سکتی ہیں تو پھر ناشتے میں شریک ہو کر اس



عزت افزائی میں کچھ مزید اضافہ کر دیں۔“ نوالہ توڑ کر اس کے منہ کی جانب بڑھایا۔ وہ مسکراہٹ دبا کر شریر انداز میں کہتا لاریب کو شپٹانے پر مجبور کر گیا۔ اسے یقیناً اماں کی موجودگی میں سکندر سے ایسی بے تکلفی کی توقع نہیں تھی۔ لاریب نے ایک نظر اسے پھر اماں کو دیکھنا چاہا مگر نظر ثانیہ سے ٹکرا گئی جو ساکن سی تھی اور اڑے چہرے کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھی۔ ساکن تو لاریب بھی رہ گئی۔ جو نہ گمان تھا نہ شک اس کا یقین ہو گیا تھا اسے۔

ثانیہ اور سکندر..... سکندر اور ثانیہ.....

عجیب احساسات تھے۔ اس نے پہلے نگاہ کا زوایہ بدلا پھر ناگواری کے احساس سمیت سکندر کا ہاتھ جھٹک دیا مگر وہ جانے کس دھن میں تھا اس مستی میں مسکرایا پھر اپنا کاندھا اس کے کاندھے سے زور سے ٹکرا دیا۔

”لکھ کے رکھ لو میں بزدل نہیں ہوں اماں کی موجودگی میں روئیں کرنے والا بزدل ہو بھی نہیں سکتا۔“ وہ ہنس رہا تھا آنکھوں میں لودیتی چمک اور شرارت تھی۔ لہجہ گو کہ سرگوشی سے مشابہ تھا اس کے باوجود لاریب کا خون کھول اٹھا۔ ثانیہ تیزی سے اٹھ کر بچن سے جا چکی تھی۔ لاریب کی نظروں نے اس کا دور تک پیچھا کیا۔

”یہ جی داری کی نہیں بے شرمی کی انتہا ضرور ہے نان سنس۔“ وہ جواباً دھیمی آواز میں غرائی اور ایک جھٹکے سے اٹھی مگر سن ہو کر رہ گئی جب اپنا ہاتھ سکندر کے سانولے بھاری ہاتھ میں جکڑا پایا۔

”تم کمرے میں آ کر ذرا بات سنو میری۔“ پوری قوت صرف کر کے ہاتھ چھڑانے کے بعد وہ پھنکار کر بولی اور جھٹکے سے مڑ کر چلی گئی۔ سکندر نے کن آنکھوں سے اماں کو دیکھا ان کا رخ چو لہے کی جانب تھا اور پورا دھیان پراٹھے بننے میں وہ کھسا سا گیا اسے لگا اماں جتنی غافل لگ رہی ہیں اتنی ہوں گی نہیں واقعی وہ کچھ زیادہ بہک گیا تھا۔

”اتنی جلدی اثر ہو گیا آپ پر بھی؟“ وہ اندر آتے ہی اسے شوخ نظروں کی گرفت پر رکھ کر بولا لاریب نے پلٹ کر اسے کیونہ توڑ نظروں سے دیکھا۔

”بکواس مت کرو۔“ وہ غرائی۔

”اس طرح کمرے میں بلوانے کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے؟“ سکندر ہنوز غیر سنجیدہ تھا لاریب کا دماغ خراب ہونے لگا۔

”ثانیہ کے ساتھ کس قسم کے تعلقات ہیں تمہارے؟“ وہ آنکھیں دکھاتے ہوئے بے حد کڑے تیوروں میں استفسار کر رہی تھی۔ سکندر یکدم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“ اس نے ٹیکھی نظروں سے اسے دیکھا لاریب زہر خند ہوئی۔

”بہتر ہے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو سمجھے؟“

”ویسے نہیں ہیں کم از کم جیسے آپ سے ہیں۔“

”اس کا مطلب گہرا اور چپ تعلق ہی ہے۔“

لاریب کی بات نے سکندر کو جیسے جہنم میں دھکیل دیا۔

”شٹ اپ۔“ وہ چیخا۔ لاریب حقارت بھری نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

”یو شٹ اپ۔ ڈونٹ شاؤٹ اوکے؟ اس کا پروپوزل آیا تم نے زیر دستی منع کر دیا کیا مطلب ہے اس کا؟“ وہ پھنکار رہی تھی۔

”صفدر ہرگز اس قابل نہیں تھا کہ ثانیہ کی شادی اس سے کی جاتی۔“ سکندر کو نا چاہتے ہوئے بھی اصل وجہ بتانا پڑی جس نے لاریب کے چہرے پر زہر خند پھیر دیا۔

”قابل تو تم بھی نہیں میرے لیکن ہو گئی شادی اس کی بھی ہو جانے دو۔“ وہ پتا نہیں آرڈر کر رہی تھی یا اس کی قسمت کا فیصلہ۔ سکندر کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔

”جب آپ نے خود کو دانستہ برباد کیا آپ کو کسی نے روکا نہیں تھا مگر میں ثانیہ کو کنوئیں میں چھلانگ لگانے

نہیں دوں گا۔ مرضی ہے آپ کی جودل کرے سمجھ لیں اس کا مطلب۔“ اپنی بات کہہ کر وہ رکنا نہیں چاہتا تھا مگر لاریب نے جھپٹ کر اس کا بازو دبوچ لیا۔

”تو پھر ٹھیک ہے تم کر لو اس سے شادی کم از کم گناہ سے ہی بچ جاؤ گے۔“ سکندر نے نہ صرف اپنا بازو چھڑایا بلکہ عجیب سی وحشت میں گھرتے اسے زور سے بیڈ پر دھکیل دیا۔

”آپ پاگل ہو گئی ہیں میرے پاس اس پاگل پن کا کوئی علاج نہیں ہے۔“ اس نے دبے ہوئے لہجے میں کہا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔ لاریب جیسے گری تھی ویسے ہی پڑی رہی۔ روتی رہی اسے پہلی بار اپنے رونے کی اپنے دکھ کی اصل وجہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

.....

بارشوں کے موسم میں  
تم کو یاد کرنے کی  
عادتیں پرانی ہیں  
اب کی بار سوچا ہے  
عادتیں بدل ڈالیں  
پھر خیال آتا ہے  
عادتیں بدلنے سے  
بارشیں نہیں رکتیں

فاطمہ نے سرد آہ بھری اور ایک نظر آسمان کو دیکھا۔ وہ ضروری سامان کی خریداری کے لیے مارکیٹ آئی تھی۔ تب بادل ضرور تھے مگر بارش شروع نہیں ہوئی تھی۔ اب بھیگتے ہوئے جانا انتہائی غیر مناسب بات تھی۔ اسے وہ گلابی شام یاد آئی جب ایسے ہی موسم میں وہ ابر رحمت بن کر اس پر چھا گیا تھا۔ موسم کی طرح برستا اور بادلوں کی طرح سے خفا خفا سا مگر کتنا اپنا لگتا تھا۔ وقت گزر گیا تھا مگر یادوں کا سنہرا رنگ اس کی ہتھیلیوں اس کی آنکھوں پر پھرا ہوا تھا۔

اس نے گہرا سانس بھرا اور کچھ سوچ کر روڈ کی بجائے اندرونی گلیوں کا انتخاب کرنا مناسب سمجھا کہ

موسم کی شدت کے باعث گلیوں میں رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ ٹریفک کے اژدھام سے بچتی بچاتی کسی نہ کسی طرح وہ سڑک کر اس کر کے فٹ پاتھ پر آ گئی۔ بارش اب پھوار کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ بادلوں کے باعث ماحول پر نیم تاریکی کا غلبہ تھا۔ موسم کی خنکی ایک تواتر سے جسم میں اتر رہی تھی۔ پر ہنگام بھگی شاہراہ سے وہ نسبتاً سنان سڑک پر آ گئی۔ اسٹیڈیم کے عقبی پارک میں بھیگتے سبزے کی یوا میں رچی بھرپور مہک کو گہرا سانس بھر کر اندر اتارنی وہ تیز قدموں سے چلتی جیسے سرتاپا ٹھٹھک کر تھم گئی۔

بلیک جینز پر ہاف سیلوٹی شرٹ میں ملبوس خود سے بے پروا کسی حد تک بھیگا ہوا وہ عباس حیدر ہی تھا۔ خوشی ایک سنسنی کے احساس سمیت اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اسے یوں غیر متوقع سامنے پانا اس کے لیے جیسے ایک معجزہ تھا۔ وہ سب کچھ فراموش کیے اسے دیکھتی رہی پھر اس کے برابر آ کر اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگی۔

عباس جو اس بھیگی رت میں سگریٹ سلگانے کی ناکام کوشش میں مبتلا تھا اس خاموش ہم سفر کی آہٹ محسوس کر کے چونکا۔ گردن موڑ کر کسی قدر بے تاثر انداز میں نگاہ بھر کر اس بے وقوف دیوانی اور پاگل لڑکی کو دیکھا۔ خوشی کا جھل مل کر تارنگ اس کے چہرے پر سونا بن کر بکھر رہا تھا۔ اس کے لبوں کی مسکان ایسی ہی بے اختیار تھی جیسی آسمان سے اترتی بوندیں، جبکہ عباس کی آنکھوں میں برہمی سمٹ آئی۔ اسے دیکھنا اذیت کے سمندر کی گہرائیوں میں ڈوبنا تھا۔ عریشہ کی بدگمانی عباس کو کانٹوں پر کھینچنے لگتی۔

”کیسے ہیں آپ؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ عباس کی آنکھوں کی بڑھتی جلن اور بھیجے ہوئے ہونٹوں پر اس کی نگاہ جانے کیوں نہیں جاسکتی۔ یا اس نے دانستہ تغافل برتا تھا۔ اس کی ذات سے اس کے سوالوں سے۔ اس کی ساری توجہ دائیں جانب بنی نرسری کے



سر سبز و شاداب پودوں پر تھی۔ اس کے باوجود فاطمہ نے ہمت نہیں ہاری اور گہرا سانس بھر کر اس شاندار قامت رکھنے والے خوب رو و جہہ انسان کو دیکھا تھا۔ جو خود سے اس درجہ بے پروائی و غفلت برتنے کے باوجود آج بھی دلوں کی دھڑکنوں کو منتشر کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔

”اگر آپ مجھے یہاں نہ ملتے تو بھی مجھے آپ کے گھر آنا تھا۔ اسامہ اور دیا کو آپ سے ملوانے کے لیے۔ میں سمجھتی ہوں بچوں کو آپ کی توجہ اور محبت ضرور ملنی چاہیے ورنہ وہ آپ کی پہچان بھی.....“ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ عباس کے چہرے کے بدلتے تاثرات نے اس کی زبان لڑکھڑا کر رکھ دی تھی۔ وہ پہلے چونکا پھر ٹھٹھکا تھا۔ اس کے چہرے پر آنکھوں میں واضح ناہمی کا تاثر تھا۔ جو اس کی ذہنی حالت تھی یقیناً وہ لاعلم تھا اس کے بچے کہاں اور کس حال میں ہیں وہ مسکرائی۔

”گیا کہنا چاہتی ہیں محترمہ مندی صاحب آپ۔“ وہ ہلکے سے غرایا۔ بارش اچانک تیز ہوئی۔ بوندیں اس کے بالوں کو بھگو کر اس کے چہرے سے پھسلتی گردن سے ہو کر گریبان میں جذب ہو رہی تھیں اسے دیکھنا فاطمہ کے لیے بیٹائی کا بہترین حق ادا کرنا تھا وہ مسکرائی۔

”بولو..... جواب دو میری بات کا۔“ وہ زور سے پھنکارا۔ صبح پیشانی پر شکن بھی مگر فاطمہ تو اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ جنہوں نے اس کی کلائیوں وحشت زدگی کے عالم میں جکڑی تھیں اور وہ جیسے مسمرائز ہو رہی تھی۔

”میرے بچے گھر نہیں ہیں۔ وہ کہاں ہیں یہ میں نہیں جانتا تم جانتی ہو تم جوان کی کچھ بھی نہیں لگتیں ہاؤ فنی۔“ وہ پھنکارا۔ وہ زہریلی ہنسی ہنسا اور رعونت بھرے انداز میں اس کی کلائیوں ایک ساتھ چھوڑ دیں۔ فاطمہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہوئی اور گرنے سے بچی۔ اب ان کے درمیان بارش کی بوچھاڑ مہین پر دے کی صورت

اسے لگا وہ بے وقعتی بے مائیگی کے احساس کے ساتھ ذلت کے لاد میں دھکیل دی گئی ہے۔

عباس کے ہمراہ برستی بارش میں وہ گھرنیک آئی تو سر تاپا کانپ رہی تھی۔ وہ اس کی ہمراہی میں یہاں آئی تھی۔ ایسی من چاہی ہمراہی جس کی اس کے دل نے بار بار خواہش کی تھی۔ ایک بار جب وہ اس کے ساتھ شمالی علاقہ جات گئی تھی تو اس نے سوچا تھا دل پسند من چاہا شخص ہمراہ ہو تو وہ بلا جھجک دیکتے کولوں اور کانٹوں سے لے راستوں سے بھی بنا کسی تکلیف کے ہنسی خوشی گزر جائے گی اور اب اس کے احساسات مختلف تھے۔

”تمہارے اس احسان کا بہت شکریہ آج کے حد میں اپنے بچوں پر تمہارا سایہ بھی گوارا نہیں کر سکتا۔“ بی گیسٹ ٹائم۔“ بستر پر کبل میں بولے دونوں بچوں کو جیسے تیسے اٹھاتا۔ باہر نکلنے سے قبل وہ اپنی سرخ دکھتی آنکھوں کو اس پر جما کر تحکمانہ انداز میں بولا تھا۔ ایسا تحکم جس میں تنبیہ بھی تھی اور پیر دہری بھی اس بل عباس کے لہجے میں اگر گھن گرج تھی تو آنکھوں میں چنگاریاں اس کے جانے کے بعد وہ گھٹنوں کے بل گر گئی۔

اسامہ اور دیا کے رونے کی آواز اسے بے بسی اور لا چاری کے ایسے گڑھے میں گرارہی تھی جس سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ ایک بار پھر اس کی خیر سگالی کی کوشش ناکامی سے دوچار ہوئی تھی۔ اس کا ہر جذبہ چاہے وہ کتنا ہی خالص اور پاکیزہ ہو بے کار جارہا تھا۔ وہ سب کچھ لٹا کر بھی تہی دست تہی داماں تھی۔

سناتا تھا ہم نے بچپن میں کبھی بھی یوں نہیں ہوگا کہ گندم بو کے جو کاٹو مرمم پہ جوانی میں حقیقت یہ کھلی ہے کہ بھلے کتنی خوشی بولو

محبت کی زمینوں سے دکھوں کی فصل اگتی ہے

سکندر نے اسے دیکھا اور ہونٹ بھیج لے۔ وہ کرسی پر بہت شاہانہ انداز میں براجمان تھی اور ثانیہ کسی کنٹرکی طرح اس کے قدموں میں بیٹھی اس کے پیروں پر کسی لوشن کا مساج کرنے میں مصروف اس کے چاندی جیسے بلوریں گداز پیروں پر ثانیہ کے ہاتھوں کی سانولی انگلیاں بہت زیادہ نمایاں تھیں۔ اس نے کچھ دنوں سے ثانیہ کے لیے لاریب کاروبار بہت ہتک آمیز محسوس کرنا شروع کیا تھا۔ وہ اسے کسی مالکن کی طرح حکم دیتی اور بات بات پر بے وجہ جھڑکتی تھی مگر آج کی یہ حرکت سکندر کو حد سے زیادہ متکبرانہ اور معیوب لگی۔

”ثانیہ۔“ اس سے برداشت نہیں ہوا تو وہ زور سے پکارا اٹھا۔ ثانیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ سکندر کو اس کے چہرے پر بے بسی محسوس ہوئی تھی۔

”ادھر آؤ۔“ وہ سرد آواز میں بولا لاریب کو اس نے سرے سے نظر انداز کر رکھا تھا جس کی جستانی نظروں کو محسوس کر سکتا تھا۔

”مم..... میں سکندر کے کی بات سن لوں بی بی صاحبہ۔“ ثانیہ لاریب کے آگے منمنائی۔ سکندر کا پارہ ہائی ہوا۔

”تمہیں اجازت کی ضرورت نہیں ہے ادھر آؤ فوراً۔“ وہ بھڑک کر چیخا۔ لاریب اسے گھورتی ہوئی یکدم ہنس پڑی۔

”یہ میری اجازت کے بغیر نہیں مل سکتی سکندر صاحب اسے اپنی حیثیت ازبر ہے۔ یقین نہیں تو کوشش کر کے دیکھو۔“ لاریب کے لہجے میں تعفرو غرور تھا۔ سکندر ششدر رہ گیا تا سف رنج و ملال اسے شکستہ کرنے لگا۔ اسے گمان تک بھی نہیں تھا لاریب اس درجہ پستی میں بھی گر سکتی ہے۔

”تم اندر آ کر بات سنو میری۔“ اب کے وہ بولا تو اس کی سرد آواز میں کوئی طوفان پوشیدہ تھا۔



”تم دیکھ نہیں رہے ہو میں پیڑی کیور کردار رہی ہوں۔ پھر رات کچھ کم نہیں ہوتی تمہاری باتیں سننے کو۔“

ثانیہ پر کچھ جتلانے کچھ ثابت کرنے اسے جلائے کی کوشش میں وہ کس راستے پر چل پڑی ہے۔ اسے قطعی احساس نہیں رہا تھا۔ سکندر بھک سے اڑ گیا۔ ثابت ہوا تھا وہ آج بھی اتنی ہی جذباتی اسی قدر راجح اور نادان تھی جتنی آج سے دو سال قبل۔ سکندر نے بھی ثانیہ کا چہرہ متغیر ہوتا دیکھا اور لاریب نے بھی۔ یعنی وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہی تھی۔ ثانیہ کے کانپتے ہاتھ اس کی ذہنی و قلبی حالت کے گواہ تھے۔ سکندر ایک جھٹکے سے پلٹ کر وہاں سے چلا گیا۔ لاریب مسکرائے گی۔ وہ پور پور زہریلی ہو رہی تھی۔



اس کے دل پر بوجھ تھا جسے وہ سگریٹ کے دھوئیں میں مدغم کرنے کا خواہش مند تھا۔ آج ثانیہ کی منگنی تھی۔ ٹھیک ایک ہفتے بعد شادی۔ یہ رشتہ گاؤں سے ہی آیا تھا۔ لڑکا فوج میں حوالدار تھا اور بارڈر پر پوسٹنگ تھی اس کی شکل و صورت عہدہ سب کچھ تھا۔ یہ سکندر کی بھرپور کوشش کا انعام اللہ نے عنایت فرمایا تھا تو اماں کی دعا میں مستجاب ہوئی تھیں مگر ثانیہ سنتے ہی تڑپ گئی تھی۔ کتنا احتجاج تھا اس کی آنکھوں میں اس کے چہرے پر کتنی اذیتیں رقم تھیں۔

”مجھے یہ شادی نہیں کرنی ہے سکندر نے تم ایسا تو نہیں کر سکتے ہو میرے ساتھ۔“ وہ اس کے سامنے بلک پڑی تھی جو اسے قتل بھیجنے پر کمر بستہ تھا۔

”تم کچھ نہیں بولو گی ثانیہ۔ یہی فیصلہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ میں تمہیں یوں ذلت برداشت کرتے نہیں دیکھ سکتا۔“ سکندر نے پہلی بار اس کے سامنے لاریب کے حوالے سے ناگواری ظاہر کی۔

”مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے سکندر نے میں تو ہر حال میں خوش ہوں۔ بس تم مجھے اس گھر سے نہ نکالو۔“ وہ پھر سکنتے لگی۔

”پلیز ثانیہ، میری مشکلات اور اذیتوں کو نہ بڑھاؤ اتنا تو کر سکتی ہوتا میرے لیے۔“ وہ جانے کس رو میں کہہ گیا تھا اور ثانیہ پہلے سکتے زدہ ہوئی پھر سرتا پاتسلیم و رضا بن گئی تھی۔ اس کے بعد اک لفظ بھی اس نے شکایات کا نہیں کہا اور منگنی کا دن آن پہنچا مگر سکندر کے دل پر جبر کا بوجھ تھا۔ اس نے دھواں بکھیرتے ہوئے دروازے کی آہٹ پر بے اختیار گردن موڑی۔ سفید پیروں کو چھوتے لباس میں سرتا پاروشی کا جگمگا تا عکس لے لاریب کسی آسمانی حور سے مشابہہ لگتی تھی۔ وہ تیار ہو چکی تھی۔ ایک عرصہ بعد اس نے خود پر توجہ دی تھی اور جیسے نکھیں چندھانے لگی تھیں۔

”ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟“ لاریب نے خود کو اس کی نظروں کا فوکس پایا تو صبح پیشانی پر بل ڈال کر پھنکاری۔

”دیکھ نہیں رہا، گھور رہا ہوں۔“ سکندر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور جتلا کر صبح کی۔ لاریب جو بال سمیٹ رہی تھی۔ ٹھنک کر رہ گئی۔ پھر اسے دیکھا اور یکدم ہلکھلا کر منس دی۔

”اوہ..... آئی سی تو غصہ آ رہا ہے مجھ پر مگر تمہاری اس لاڈلی کی شادی میں تو نہیں کر رہی۔“ وہ بہت بے رخی سے کہہ رہی تھی۔ سکندر نے گہرا کش لیا پھر دھواں اس کے منہ پر چھوڑا۔

”اب تو خوش ہوں گی آپ؟“

”میرے لیے وہ اتنی اہم نہیں ہے سمجھے؟“ لاریب نے پھنکارتے ہوئے کہا اور ناگواری سے ہاتھ سے دھواں ہٹانے کی سعی کرتی پیچھے ہوئی۔

”پھر اس پر یوں ثابت کرنے کی کوشش کیوں کرتی ہیں کہ آپ میں آپ کے لیے اہم ہوں۔ کس کو دھوکہ دے رہی ہیں آخر آپ؟“ وہ اٹھ کر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ لاریب نے اس بل اس سے نگاہ نہیں چار کی۔ وہ چار کر بھی نہیں سکتی تھی۔ ابھی صبح کی بات تھی جب وہ چھت سے نیچے سیڑھیوں پر آئی جانے لگی۔

لڑھک گئی تھی۔ ایک سے ذویا تین اسٹیپ شاید پیرمز گیا تھا۔ جیسی اس کی چیخ پر اماں کے ساتھ ثانیہ بھی گھبرا کر بھاگی آئی تھی۔

”کی ہو پاتر؟ سب خیراں کرے رب سوہنا سن (چوٹ) تو نہیں لگی کہیں؟“ اماں بے قرار تھیں۔ لاریب نے سکندر کو دیکھا تھا جو اسی بل وہاں آیا تھا مگر فیصلے پر لائق کا تاثر لیے کھڑا رہا۔

”اٹھ سکتی ہے پتر تھوڑا چل پیر میں پتر (تکلیف) تو نہیں۔“ اماں نے اسے سہارا دینا چاہا وہ چیخ پڑی۔

”نہیں چل سکتی میں درد ہے پیر میں۔“

”سکندر سے پتر توں آگے ہو پھر ڈھی رانی کو۔“

اماں نے گھبرا کر کہتے سکندر کو پکارا۔ ناچار اسے آگے آنا پڑا۔ اماں اور ثانیہ کی موجودگی میں لاریب کو سہارا دینا بھی عجیب لگ رہا تھا۔ اس پر لاریب کی نازک مزاجی۔

اس کے بازو پکڑنے کی دیر ہوئی وہ پوری کی پوری اس پر اٹھیر ہو گئی تو سکندر نے بوکھلا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ اس کی جانب نہیں ثانیہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سکندر کا سارا ہوا پھل کر اس کے چہرے اور آنکھوں میں آ گیا۔ کیسی نظریں تھیں۔ جتلانی ہوئی، جھلساتی ہوئی اور کم ظرف فحش کا احساس لیے۔ ثانیہ تو پتا نہیں کتنا جھلسی کتنا جلی سکندر ضرور سرتا پاتا آگ میں نہا گیا۔ لاریب سے اس تک گھٹیا پن کی اسے ہرگز بھی توقع نہیں تھی۔

”اٹھا لو نا مجھے کہا تو ہے نہیں چلا جا رہا مجھ سے۔“ وہ سکندر پر برہم ہوئی سکندر اس بے حجابی پر خود اس کی جگہ لاریب مرنے والا ہو گیا۔ بس نہیں چل سکا اسے ایک بار اٹھ کر لگا دے مگر اماں اس کے جھانے میں آسانی سے آ گئی تھیں۔ جیسی اس کی حمایت لیتے سکندر کو جھڑپ لگیں۔

”آئے ہائے سکندر نے توں چک (اٹھا) کیوں نہیں لیتا گڈی (گڑیا) سی کڑی ہے پھر بھی اتنا گھبرا گیا۔“ وہ اپنی سمجھ کے مطابق بولی تھیں۔ بہو نے بشری انہیں محسوس بھی کیسے ہو سکتی تھی۔ سکندر نے

ہونٹ بھیجنے اور خود پر جبر کرتے کسی ناگواری بوجھ کی طرح اٹھا ہوا ہے۔ سب سے تکلیف دہ امر یہ تھا کہ لاریب یہ سب کسی کی دل آزاری کی خاطر کر رہی تھی۔ نہ اس کی چاہت میں نہ اپنی خوشی سے۔ یہ محبت کی پامالی تو تھی ہی اس کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی شخصیت بھی مسخ ہو رہی تھی مگر انتقام اور نفرت کی آگ میں جھلستی وہ لڑکی احساس تک نہ رکھتی تھی۔

”یہ لیجیے اور اب بہتر ہے کہ شام تک کم از کم بستر سے نیچے قدم نہ رکھیے تاکہ کچھ تو بھرم رہ سکے آپ کا۔“ اسے کمرے میں لا کر بستر پر تقریباً پٹختے ہوئے اس نے انتہائی خفی سے کہہ اور اس کا وہ بازو بے حد ناراضی سے اپنے گلے سے نکالا جو لاریب نے محض ثانیہ کو دکھلانے کو بڑے ناز بھرے انداز میں تب اس کی گردن میں جمائل کیا تھا۔

”کیا مطلب..... اس بکواس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو تم کہ میں ڈرامہ کر رہی تھی؟“ وہ سرتا پاتھر بن گئی۔ سکندر کا انداز ہی اتنا توہین آمیز تھا۔ سکندر نے اسے ٹھنڈی برف ہوتی نظروں سے دیکھا۔

”بہتر ہے ہم اس موضوع پر بات نہ کریں۔ بس اتنا جان لیں کہ مجھے آپ سے اس حد تک ہلکے پن کی توقع نہیں تھی۔“ وہ کہہ کر جھٹکے سے باہر نکل گیا اور لاریب تلملا تو رہی تھی اور اب پھر وہ اس بات کے شفر کے ہمراہ ایک دو بجے کے مقابل کھڑے تھے۔

”وہ اور تم دونوں جاؤ بھاڑ میں۔ میرے منہ لگنے کی ضرورت نہیں سمجھے۔“ وہ پھر بے مہر تھی۔ سکندر کی آنکھوں میں موجود قہر و غضب نے بے بسی کی جگہ لے لی پھر یاسیت کی بھی کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر گہرا سانس کھینچا۔

”اگر آپ کی طرح میں بھی خود کو دھوکا دینا چاہوں تو آپ کی یہ توجہ کا احساس پر کشش ہے مگر میرا المیہ یہ ہے کہ میں اصل کے بجائے نقل کو پا کر خوش نہیں ہو سکتا۔ کچھ تو خیال کریں۔ آپ مجھے خوش نہیں دے سکتی ٹھیک



ہے مجھے غم تو نہ دیں۔“ وہ بے چارگی سے کہہ رہا تھا لاریب پاگلوں کی طرح ہنس دی۔  
”تم نے برباد کیا مجھے یاد ہے مگر تم کر چکے اب میری باری ہے۔ اب میں داؤ چلوں گی اور تم تر پوگے۔ معافی نہیں ملے گی سکندر حیات اتنا ہی تڑپاؤں گی جتنا تم نے مجھے رلایا ہے سنا تم نے؟“ وہ غراری تھی۔ سکندر بے دم ہوتا جا رہا تھا۔ یہ فرد جرم جو اس پر عائد ہوئی تھی وہ اس کا یقیناً سزاوار نہیں تھا مگر یہ بات جنونی ہوئی لاریب کو کون سمجھتا۔



وہی رت جگے پرانے وہی دکھ بھری کہانی میرے آنسوؤں میں شامل میری داستان پرانی سکندر نے بال بناتے ہوئے آئینے میں اس کے عکس کو بغور دیکھا پھر گہری سرد آہ بھری۔ ثانیہ کی شادی ہو چکی تھی۔ لاریب پھر سے بے حس لالعلق اور بے گانہ بن گئی تھی۔ اس نے برش رکھا اور پرفیوم کی بوتل اٹھاتے ہوئے کھنکھار کر اسے متوجہ کیا۔ جو بستر پر تقریباً نیم دراز سیل فون پر مصروف تھی۔

”شہر جا رہا ہوں کام سے کچھ چاہیے تو بتادیں۔“ میروں لیکن کے بے حد کھلتے ہوئے سوٹ میں اس کی گلابی اجلی رنگت لشکارے مار رہی تھی۔ بال لٹوں کی صورت بکھرے تھے اور دوپٹہ ہمیشہ کی طرح ندارد۔ پتا نہیں وہ اس کی قربتوں میں رہ کر بھی اس درجہ بے نیاز و غفلت کیسے اوڑھ لیا کرتی تھی۔ لاریب نے چونک کر اسے دیکھا پھر نخوت سے ناک چڑھا لی۔

”نو ٹینکس مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“ اس کا انداز و رویہ دل شکن تھا۔ سکندر کے دل پر چوٹ لگی۔

”چاہیے تو ہوگا“ ظاہر ہے انسان کی ضرورتیں ہمیشہ ساتھ رہا کرتی ہیں مگر آپ مجھ سے منگوانا نہیں چاہتیں۔“ وہ جتنا خود ترسی کا شکار ہوا لاریب اسی قدر بے زار۔

”جب ایک بات جانتے ہو تو پھر حقوں کی طرح

سوال کیوں کرتے ہو؟“ سکندر کے چہرے پر عجیب سا تاثر پھیل گیا۔

”آپ کی زندگی میں میری کبھی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ کبھی ہوئی بھی نہیں۔ پھر ہمارا ایک ساتھ چلنا اکٹھے رہنا اتنا ضروری تو نہیں ہے آپ کو مجھ سے جان چھڑالینا چاہیے۔“ وہ جتنا ٹوٹ رہا تھا اس لحاظ سے اس کے الفاظ سے مایوسی جھلک رہی تھی۔ انسان چلتا ہے تو کبھی نہ کبھی منزل بھی آ ہی جاتی ہے اسے لگتا تھا وہ لا حاصل سفر میں مبتلا ہے۔

”چاہتی تو میں بھی یہی ہوں۔ مگر حالات اس رنج پر آچکے ہیں کہ تم سے نجات بس موت کی صورت ہی ممکن ہے میری۔“

”اگر موت ہی ضروری ہے تو پھر آپ کی ہی کیوں مجھے آپ کے رستے صاف کر دینے چاہیں۔“ سکندر نے اس کی انتہا کے جواب میں خود بھی انتہا کر دی تھی سفاکی کی۔ وہ واقعی تھک گیا تھا۔ اس خود ترسی خود اذیتی کی زندگی سے کیا اس سے واقعی موت بہتر نہ تھی؟

”تو کیا ارادہ ہے پھر خود کشی کرو گے؟“ لاریب اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ مضحکہ اڑاتا ہوا مسخرانہ اثر لیے تھا۔ سکندر تمام تر خود اذیتی اور احساس کمتری کے باوجود اپنی جگہ اہل کر رہ گیا۔ رنگ کیسے سفید پڑ گیا تھا۔ سفاکیت اور بے رحمی کی اس سے بڑھ کر بھی کوئی صورت ہو سکتی تھی۔ لاریب جو اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ اس کی کیفیات کو بخوبی محسوس کر رہی تھی۔ ایک لمحے کو اسے ایسا لگا وہ کسی پل بھی رو پڑے گا مگر خیر گزری۔ وہ ہونٹ بھیجنے چہرے کا رخ پھیر گیا۔ دل جیسے آنسوؤں کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

”اتنی بے مہری اس قدر سفاکی یہ لڑکی ہے یا پھر..... اس کی بے حس کے آگے مجھے اپنا آپ آئینش میں ڈھلتا محسوس ہوتا ہے۔ ایسا غصہ جو سب کچھ ہنس نہس کر دینے کے درپے ہو۔ میں اسی کیفیت سے ڈرتا ہوں۔ کہیں میرے اندر کا طیش اور برہمی ظاہر ہو جائے

اور میں اسے ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھوں۔ وہ امید ختم کر دوں جو مجھے اب بھی ڈھارس دیتی ہے۔ جانے کیسا حصار باندھا ہے اس نے اپنے گرد کہ میری محبت میرا وجدان اس کے شعور تک پہنچ ہی نہیں پاتا۔“

”میں جا رہا ہوں دروازہ بند کر لیں۔“ وہ بولا تو اس کا لہجہ اندر کی ٹوٹ پھوٹ اور اذیت سے پاک تھا۔ لاریب نے اپنے نہیں دیکھا اور اپنے موبائل پر گیم کھیلتی رہی۔ کتنا فضول کام تھا یہ بھی مگر سکندر پر توجہ دینے اس کی بات سننے سے کئی درجے بہتر، سکندر جو اس کی ایک نگاہ کا خواہش مند تھا۔ بے حس کی بھیجٹ چڑھتا ہوا آخر پلٹ گیا تو تھکن کا شدید احساس اس کے قدموں سے لپٹا ہوا تھا۔ دروازہ پار کر کے وہ برآمدے میں آ گیا۔ یہ ہی وہ لمحہ تھا۔ جب غصے میں پھنکارتے کف اڑاتے وقاص نے بیرونی دروازہ ایک طوفانی ٹھوک سے کھولا اور اندر آن گھسا۔ سکندر اور وقاص دونوں کی یکساں نگاہ ملی تھی۔ کتنا قہر و غضب تھا اس کی شرابی آنکھوں میں سکندر کے لیے سکندر تو بھونچکا رہ گیا تھا اسے یہاں دیکھ کر۔

”اوئے..... کیوں کی اولاد تیری یہ جرأت کہ ہمارے خاندان کی لڑکی کے ساتھ عیش کرے۔ میں زندہ نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔“ اس سے آگے مغلظات کا ایک طوفان تھا جو وقاص کی زبان سے ابل رہا تھا۔ سکندر کہاں اس صورتحال کے لیے تیار تھا۔ جبھی اسے ریوالتور نکال کا نشانہ باندھتے نہیں دیکھ سکتا۔ خوفناک دھماکہ کے ساتھ پستل نے آگ اگلی تھی اور جیسے موت کا رقص ہر سو شروع ہو گیا۔ پہلی گولی سکندر کے بازو کا گوشت پھاڑتی شائیں کی آواز کے ساتھ دیوار میں جا گھسی۔ دوسری اس کے کاندھے میں لگی تھی۔ سکندر ایسے تیور کر زمین پر گرا جیسے کسی مضبوط درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ وہ اتنا کم حوصلہ نہیں تھا کہ یوں گرنا تو پھر اٹھ نہ پاتا۔ اسے اپنی جگہ پر ساکن کر دینے والی لاریب کی ہڈیانی

### ظاہرہ مہر

اسلام علیکم بادولت کو ظاہرہ کہتے ہیں جی تو جناب ستمبر کی ایک سہانی صبح اس دنیا میں تشریف آوری ہوئی (آہم)۔ امی ابو کی بہت لاڈلی ہوں پانچ بھائیوں کے بعد اس دنیا میں اپنے ماں باپ کے آنکھن کو مہرکانے آئی۔ پانچ بھائیوں کی اکلوتی اور لاڈلی بہن ہوں سب سے بڑے بھائی شہزاد ہیں جو کہ ماشاء اللہ سے شادی شدہ ہیں ان کے دو بچے احمد معیز ظاہر اور سعد یہ ظاہر ہیں۔ اس کے بعد فرہاد بھائی اور جواد بھائی ہیں۔ کلرز میں مجھے بلیک ڈانسٹ اور پنک پسند ہیں۔ کھانے میں آکس کریم بریانی اور رس ملائی پسند ہے۔ کھانے کے معاملے میں اتنے خیرے نہیں کرتی سب کچھ کھا لیتی ہوں۔ کپڑوں میں لانگ شرٹ اور ٹراؤزر پسند ہے۔ بی ایڈ کر چکی ہوں آگے ایم اے کرنے کا ارادہ ہے۔ رات دیر تک جاگنا اور چاند کو دیکھنا بہت پسند ہے چاندنی راتیں بہت اٹریکٹ کرتی ہیں۔ بارشوں کے موسم میں گرم گرم پکڑوں کے ساتھ چائے پینا بہت پر لطف لگتا ہے۔ شور شرابا بالکل پسند نہیں تنہائی اچھی لگتی ہے۔ لائٹ میوزک اور غزلیں شوق سے سنتی ہوں۔ پسندیدہ رائٹرز میں سمیرا شریف طور نا زیہ کنول نازی ماہا ملک ام مریم عمیر احمد میری پسندیدہ ہیں۔ دوست بہت ہیں مگر کبھی کسی کو اپنی کمزوری بننے نہیں دیا۔ گڑیا میری بیسٹ فرینڈ ہے اس کے علاوہ تزلیہ عاشی عینی نیٹاں مشی اور جن کے نام یاد نہیں تو مائنڈ مت کرنا پلیز کسی پر بھی حد سے زیادہ بھروسہ نہیں کرتی ایک دفعہ نتیجہ بھگت چکی ہوں۔ اپنی سب باتیں اللہ سے شیئر کرتی ہوں سب فرینڈز جہاں بھی غائب ہو رابطہ ضرور کرو اب اجازت چاہتی ہوں دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

چچیں بھیں جو صورتحال کو جاننے کی خاطر بھاگ کر باہر آتے ہی اس کے حلق سے نکلی تھیں۔ وہ کبھی وقاص کو مزید گولی چلانے سے باز رکھنے کو



چلائی تھی کبھی سکندر کو وہاں سے اٹھ کر اندر کمرے میں چھپنے کا کہتی اتنی دہشت زدہ اتنی بدحواس لگ رہی تھی کہ سکندر اپنی تکلیف اپنا بہتا خون بھلائے اسے دیکھے گیا۔ کچھ دیر قبل اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو اپنی سفاکی کے ہمراہ سکندر کے ذہن میں خنجر گاڑھنے لگی۔ موت کو پانے کے لیے خودکشی جیسی حماقت ضروری تو نہیں تھی۔ اس کے اور بھی رنگ اور بھی انداز تھے پھر یہی کیوں نہیں وہ جیسے وحشت کے صحراؤں میں چاہیہا۔

”ہٹ جاؤ وقاص در نہ میں مار ڈالوں گی تمہیں۔“

وقاص کے ریوالبور سے گولیاں ختم ہو گئی تھیں۔ شاید جیسی اس نے ریوالبور کو جیب میں اڑسا اور شلووار کا پانچواں اٹھا کر پنڈلی سے بندھا دو دھاری خنجر بھیج کر نکال لیا۔ گویا اس پر پوری طرح خون سوار تھا۔ لاریب کے حواس اس کے ارادوں کی خطرناکی کو بھانپ کر ہی پوری طرح اڑے گئے تھے۔ اس سے قبل وہ سکندر کی آنکھوں میں وہ کیفیت بھی دیکھ چکی تھی جس نے اسے لرزا کر رکھ دیا تھا۔ اگر ایک فل گرد نے کے طور پر لیے ہو اور دوسرا مرنے کو بخوشی تیار ہو تو پھر کسی کو قتل کرنا اتنا ہی آسان جتنا جگ میں موجود پانی کو گلاس میں اٹھیلنا۔ اب جو بھی کرنا تھا اسے خود کرنا تھا۔

اس نے اسی طیش و غیض بھرے انداز میں بلا درلغ اس کے سر کے نشانے پر پوری قوت سے کلہاڑی کا وار کر دیا۔ جو وقاص کے سر سے تو نہیں ٹکرایا کہ وہ بروقت خود کو سنبھال کر پیچھے کو جت ہوا تھا۔ مگر ٹھک کی زوردار آواز سے وقاص کی ٹانگوں کو ضرور نا کارہ کر گیا۔ لاریب نے پروا نہیں کی اور تیز قدموں سے پلٹ کر سکندر کی جانب آگئی جو اس کی کارکردگی بلکہ کارنامے پر دم بخود رہ گیا تھا۔ یوں جیسے وہ جو کچھ دیکھ چکا ہوں وہ محض نظر کے دھوکے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

”اپنے پیچھے سے کہو آ کر تمہیں لے جائے۔ ورنہ دوسرا وار ہرگز غلط نہیں ہوگا۔ میں کچھ بھی کر سکتی ہوں، اندازہ تو ہو گیا ہوگا تمہیں۔“ سکندر کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے بھی اس کا مخاطب وقاص ہی تھا۔ لہجہ جیسے شعلوں کی لپٹ میں آچکا تھا۔ اس نے وقاص پر چونکا ڈالی تھی وہ جھکتی ہوئی حقیر آمیزانکارہ صفت نگاہ تھی۔ وقاص کو صحیح معنوں میں اس سے ڈر لگنے لگا۔ جیسی ہمتیں مجتمع کرنا ٹانگ کو گھسیٹا کسی نہ کسی طرح رفو چکر ہو گیا۔ فائرنگ کی آواز دور تک سنی گئی تھی۔ آس پڑوس کے لوگ اپنے اپنے دروازے کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے مگر کسی کی ہمت نہ ہو سکی وڈیروں کے معاملے میں دخل دینے کی۔ یہ بھی شکر تھا کہ اس وقت اماں اور بابا ساتھ والے گاؤں رشتہ داروں کی فوٹکی پر گئے ہوئے تھے۔

”آپ یہ زحمت نہ کریں۔ اتنا زخمی نہیں ہوا کہ آپ کا سہارا لینے کی ضرورت پیش آئے۔ ویسے اس طرح وقاص سائیں کے اڑے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کام ختم ہو رہا تھا۔ جان چھوٹ رہی تھی اور آپ کو کیا چاہیے تھا۔“ سکندر جیسے بھڑبھڑ جل رہا تھا۔ پتا نہیں کس کس آگ میں جیسی اس کے ہاتھ جھٹک دیے اور خود اٹھ کر کمرے میں آ گیا۔ وہ جانتا تھا خدا اگر مشکل راستے نصیب میں لکھتا ہے تو پہلے اپنے بندوں کو ہمت اور حوصلہ کے ساتھ صبر و برداشت کی نعمت سے بھی نوازا

اضطراری کیفیت میں اس نے اطراف میں نگاہ دوڑائی تو برآمدے کے کونے میں کلہاڑی پر نظر پڑتے ہی وہ بجلی کی سی تیزی سے کلہاڑی جھپٹ کر اٹھائی وقاص کو مخاطب کر کے لاکارنے کے انداز میں چیختی تھی۔

وقاص جو سکندر سے کچھ ہی فاصلے پر ہی تھا چونک کر مڑا اور لاریب کو بکھرے بالوں کے ساتھ کلہاڑی اٹھاتے دیکھ کر بے ساختہ قسم کا ہتھکڑ لگانے لگا۔

”افوہ..... ڈاکورانی۔ کیا ایکشن ہے قسم سے مگر یار اپنے بد صورت شوہر کی خاطر اب کیا تم اپنی بہن کو بیوہ کر دو گی..... سہاگ اجاڑو گی اس کا؟“ اس کا لہجہ مسخر اڑاتا ہوا ہی نہیں حقارت سے بھی بھر پور تھا۔ لاریب کا چہرہ جانے کس جذبے کے تحت بے تحاشہ سرخ ہوا۔

بے۔ وہ بھی بے حوصلہ نہیں تھا۔ لہجہ گو کہ دھیمہ تھا مگر غضب کی ناراضی بے رخی اور پیش رکھتا تھا اپنے اندر۔ لاریب نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا دل جو اس بل کیسٹر کا پھوڑا تھا اذیت کے ساتھ اس کی کج ادائی پر بھی دکھ سے بھرنے لگا۔

”تم بابا جان کو کال کر کے کسی کو بلوالو۔ ڈاکٹر کے پاس فوری جانا از حد ضروری ہے بلڈنگ بہت ہو رہی ہے۔“ سکندر کمرے میں آ کر بے دم سے انداز میں بستر پر آگرا تو لاریب اس کی خود سے برتی بے پروائی پر گھبرا کر بولی تھی۔ سکندر کا سفید پڑتا چہرہ دیکھ کر صاف لگتا تھا۔ اس کی ہمتیں ختم ہو رہی ہیں۔ لاریب کی اس کوتکتی نگاہوں میں تشویش بھی تھی اور نفرت بھی۔

”تم اتنے آرام سے کیوں لیٹے ہو سکندر؟ میں نے کہا نا بابا جان کو.....!“ وہ یکدم چیختی مگر سکندر کو ساکن دیکھ کر خوفزدہ سی نزدیک آگئی۔ اس نے ہونٹوں کو باہم تختی سے اس طرح دبا رکھا تھا جیسے تکلیف برداشت کرنے کی جدوجہد میں مبتلا ہو۔

”سکندر.....!“ لاریب کا دل خوف سے بند ہونے لگا۔ کس قدر سہمی ہوئی لگتی تھی وہ سکندر کی خود سے بڑھتی ہوئی بے پروائی اسے سراسیمہ کرنے لگی۔

کسی بھی بات کو کہہ دینا جتنا آسان ہو سکتا ہے اسے ہوتے دیکھنا اتنا آسان ہرگز نہیں۔ اس نے کچھ دیر قبل اسے کھری کھری سنائی تھیں مگر تب ایسا گمان بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو جائے گا تو کیا بیتے گی اس بڑگولی اس کے جسم میں تھی اور یہ کتنا خطرناک تھا وہ جانتی تھی مگر سکندر دانستہ اسے دکھ سے دوچار کر رہا تھا۔

”اب کیا کروں میں، یہ تو سن بھی نہیں رہا میری؟“ وہ روپائی ہوئی۔

”تم مانو گے میری بات؟“ لاریب کی نظر اس کے زخموں سے آبخار کی مانند پھوٹنے لہو کے نوارے پر تھی۔ جو بستر کی چادر کو سرعت سے رنگین کرتا جا رہا تھا۔ وہ پھر بھی حواس نہ کھوئی۔ اس کی شرٹ کا گریبان پکڑ کر بے

سکندر نے جواباً اسے کچھ دیر عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔ پھر کچھ کہے بغیر ہاتھ اٹھا کر جیب سے سیل فون نکالنا چاہا۔ لاریب نے اس کا مقصد سمجھتے ہوئے خود اس کی خون آلود شرٹ کی جیب سے موبائل نکالا پھر اسے دوپٹے سے صاف کر کے تھمایا۔ سکندر نے جب تک نمبر ملایا۔ ملازم کو فوری طور پر آنے کی تاکید کی۔ لاریب اس دوران آنسو صاف کرتے ہوئے اس کی شرٹ کے مٹن کھول چکی تھی۔

”چپ کر کے بیٹھے رہو سمجھے میں جو کر رہی ہوں نا کرنے دو مجھے۔“ شرٹ فینچی سے کاٹ کر اس کے جسم سے الگ کرتے ہوئے وہ اس کے زخموں کو ہونٹ بھیجنے کر دیکھتی خون اپنے دوپٹے سے صاف کرنے میں مصروف تھی۔ جب سکندر نے جانے کس احساس کے تحت روکنا چاہا تھا کہ وہ ڈیٹ کر بولی۔ سکندر بس اسے دیکھتا ہی رہا۔ آخر کیا شے تھی وہ۔ وہ کبھی بھی کسی ایک خیال پر متفق نہیں ہو پاتا کہ وہ اپنا ایک الگ انداز الگ رنگ دکھانے لگتی۔

”اس ہمدردی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔“ اس کا لہجہ اس کی نظروں کی طرح آئینے لگا تھا۔ لاریب نے بے حد کرب سے گزرتے ہوئے اک نگاہ اسے دیکھا پھر ہاتھ کی پشت سے اپنی بہتی آنکھیں بے



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ ٹائمہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

دردی سے رگڑیں۔  
”جب عباس مجھے چھوڑ کر گیا اور میں نے تم سے نکاح کر لیا تو سب سمجھتے ہیں میرا ایک ہی نقصان ہوا تھا۔ عباس کو کھودینے کا نقصان۔ حالانکہ صرف وہی تو نہیں تھا۔ میں نے تمہیں شوہر بنایا تو اس سکندر کو کھودیا جو میرا دوست تھا۔ اتنا اپنا اتنا قربانی کہ ہر بات بلا جھجک اس سے کہا کرتی تھی۔ یہ ملال اور رنج بھی کوئی چھوٹا اور معمولی نہیں تھا۔ تم میری غلطی معاف کر سکتے تھے۔ پھر سے دوست بن سکتے تھے۔ سکندر مگر تم نے ایسا نہیں کیا۔ شاید کوئی بھی مرد شوہر بننے کے بعد دوستی کا رشتہ نہیں رکھ سکتا۔ وہ بس شوہر ہوتا ہے حاکم و جابر شوہر۔“ وہ زار و قطار روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ سکندر گنگ تھا۔ اپنے دکھ اپنے غموں میں مبتلا وہ اس کے مسائل اس کے اذیتوں سے بے بہرہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ اس نے تو اس سے محبت کی تھی۔ پھر یہ کوتاہی کیوں کی۔“  
”ایک ایک کر کے تم نے سارے دکھ مجھ سے علیحدہ کر لیے۔ میں کیسے اٹھائی یہ اتنے بھاری بوجھ جی منہ کے بل جاگری۔ مجھے گرتا ہی تھا۔ اس لیے کہ میں تنہا جی ہی نہ سکتی تھی۔ مجھے سہارے کی ضرورت تھی۔“ سکندر سے کچھ بولا نہ گیا۔ اس نے کچھ بولے بغیر لاریب کو تھا کہ خود سے لگا لیا۔ لاریب نے کوئی مزاحمت نہیں کی اس کے کاندھے پر سر رکھ کر روتی رہی۔



”بابا سائیں کوئی الحال کچھ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھے، میں خود بات کر لوں گا ان سے۔“ سکندر نزدیکی شہر سے ٹریڈنٹ لینے کے بعد واپس آیا تو گاڑی سے اترتے ہوئے اس نے ڈرائیور کو خصوصی تاکید کی تھی۔ ملازم نے محض سر ہلایا اور سلام کرتا گاڑی لے اڑا۔ لاریب جو بے تابی سے اس کی منتظر تھی لپک کر اسے سہارا دیا۔ سکندر کے ہونٹوں کی تراش میں مسکراہٹ بکھر گئی۔

”میں ٹھیک ہوں لاریب کیوں پریشان ہوتی



مجھے حکم اٹاں  
اُم مرتیم

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ تمام پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیگر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)



گزشتہ قسط کا خلاصہ

لاریب کو کمرے میں سانپ کی موجودگی کا وہم ہو جاتا ہے اسی خوف کی وجہ سے وہ سکندر کی اپنے کمرے میں موجودگی کو برداشت کرتی ہے جبکہ دوسری طرف سکندر اس کی مہربانی کے پیچھے چھپے چھپے مقصد کو جان کر نہایت ذلت محسوس کرتا ہے۔ اماں، سکندر کی غیر موجودگی کا لاریب کو بتانے آتی ہیں جس پر لاریب ان کے ساتھ انتہائی بدسلوکی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ثانیہ، سکندر کی شادی کے روز اپنی خالہ کے پاس چلی جاتی ہے اور پلاؤ خیر سکندر کے اصرار پر مجبوراً اسکا تاڑتا ہے۔ ثانیہ اپنے نفع و نقصان سے بے پروا ہو کر صفدر کے لیے خالہ کو ہاں کر دیتی ہے۔ جبکہ صفدر کسی طور بھی ثانیہ کے قابل نہیں ہوتا۔ ایسے میں سکندر اسے سمجھاتا ہے ثانیہ اس کی ہمدردی یا کراپنے آنسو روک نہیں پاتی اور اس کے کاندھے سے لگ کر سسک پڑتی ہے۔ یہ نظر لاریب کو طیش دلانے کا سبب بنتا ہے اور وہ سکندر پر ثانیہ کے حوالے سے مختلف الزامات کی بوچھاڑ کر دیتی ہے جس پر سکندر اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ ثانیہ کے رشتے پر سکندر کے انکار کو جواز بنا کر اس کی کسی بات کو خاطر میں نہیں لاتی جبکہ دوسری طرف ثانیہ کو دکھانے کی خاطر وہ سکندر سے خاص لگاؤ اور التفات کا مظاہرہ کرتی ہے جبکہ لاریب کے اس منافقانہ رویے پر سکندر ذلت کا شکار ہو جاتا ہے۔ لاریب سکندر اور ثانیہ کو لے کر اندر ہی اندر خائف رہتی ہے۔ جبکہ اپنے اس جذبے کو وہ خود بھی سمجھ نہیں پاتی۔ ادھر عباس عرشہ کے غم میں اپنے گھر بار اور بچوں کو بھی بھول جاتا ہے۔ جب ہی اس کی ملاقات فاطمہ سے ہو جاتی ہے۔ وہ

”مگر مجھے مسئلہ ہوتا ہے کیونکہ میں آپ کی طرح جذبات و احساسات سے مبرا نہیں ہوں۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا لاریب بی بی کوئی بھی مرد شوہر بننے کے بعد دوست نہیں رہ سکتا وہ بس شوہر ہوتا ہے۔ جسے عورت سے بس ایک مقصد ہوتا ہے، میں واقعی بزدل ہوں۔ اتنا بزدل کہ اس بات سے ڈرتا ہوں اگر اپنی اس غرض کو شوریدہ سری کی نذر کر دیا تو آپ کے نقصانات میں تو شاید اضافہ نہ ہو مگر میری محبت پر ہوس پرستی کا ٹیگ ضرور لگ جائے گا۔ دروازہ بند کر لیں۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکنا نہیں تھا

”آپ مجھے واپس چھوڑ آئیں شرابی بھائی میں اپنی فیملی کا ہر دینہ برداشت کر لوں گی مگر میں لوگوں کا آپ کے



حوالے سے کوئی الزام قبول نہیں کر سکتی۔ ہمیشہ بھائی سمجھا ہے آپ کو میں نے۔ وہ چند دنوں میں ہی ہمت ہار کر رو پڑی تھی اور شرجیل جو پہلے ہی پریشان تھا اور بھی ٹینشن میں مبتلا ہو گیا تھا۔

”دل چھوٹا نہیں کرتے گڑیا! اللہ پر بھروسہ کرو ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ بجلت میں وہاں سے اٹھ گیا۔ امریکا سے ابراہیم احمد کی اس کے لیے کال تھی۔ کتنے دنوں سے وہ اس سے رابطہ کرنے کی کوشش میں تھا مگر ناکامی ہو رہی تھی ابراہیم احمد کا نمبر بند جا رہا تھا۔

”ہاں ابراہیم احمد! میں شرجیل ہوں یا زکیہ کیسے ہو؟“ وہ سیل فون کان سے لگائے بالٹی میں آ گیا۔ دوسری جانب جو ابراہیم نے کہا وہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر گیا۔ ”وعلیکم السلام! سوری یار مجھے خیال نہیں رہا ہاں میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے ٹھہرنے کے دوران سگریٹ بھی سلگالیا تھا۔ گہرا کش لیتے اس کی آنکھوں میں یاسیت کی دھند اتر آئی۔

”میں کوئی امپر ومنت نہیں کوئی معجزہ ہی اسے ٹھیک کر سکتا ہے ابراہیم احمد۔“ ایمان کے ذکر کے ساتھ ہی اس کے گلے میں آنسوؤں کا ٹھکین گولہ پھسنے لگا تھا۔

”مجھے تم سے بہت ضروری کام آں پڑا ہے ابراہیم احمد جتنی جلد ممکن ہو سکے یہاں آ جاؤ۔“ وہ ایک دم موضوع بدل کر بے حد لجاجت سے بولا۔

”میں میں فون پر بات نہیں کر سکتا“ بس تم آ جاؤ پلیز۔“ اس کے انداز میں بے کلی واضطراب تھا پھر اس نے دوسری جانب کی بات سنتے کانڈھے جھٹک دیے۔

”کب؟ صورت حال بہت کبھی ہے ابراہیم احمد میں بہت بے چین ہوں پلیز جتنی جلدی ممکن ہو سکے“ اس نے اصرار کیا پھر الوداعی کلمات ادا کرتے ہوئے کال منقطع کر دی۔

”آج سامنے والی آنٹی آئی تھیں۔ ایمان بھائی کے متعلق کرید کرید کر سوال کر رہی تھیں۔ مجھے بہت آ کورڈ لگا۔“ وہ پلٹا تو زارون کو کانڈھے سے لگائے سمعیہ دروازے میں کھڑی تھی شرجیل کی آنکھوں میں پانی کا تار اُبھرا۔

”آ کورڈ کیوں کیا ایمان کو جانتی تھیں وہ خاتون؟“

”میں نہیں نہیں یہ لگتا ہے ہم مشکوک لوگ ہیں جن کا کوئی عزیز رشتہ دار تک نہیں، بھائی میں کن الفاظ میں سمجھاؤں آپ کو۔“ اس کے دواہنے انداز میں ہچکچاہٹ دہائی شرجیل نے نگاہ کا زاویہ بدلتے ہوئے ہونٹ بھی بچھینچ لیے۔

”یہ تھوڑا سا ٹھن وقت ہے سمعیہ! اسے تو ہمیں سہنا اور کاشانی پڑے گا۔ اللہ سے ہمیں اچھی امید رکھنی چاہیے۔ تم ریلیکس رہو گڑیا میں مزید کچھ بھی تمہارے ساتھ غلط نہیں ہونے دوں گا۔“ اس کا سر تھک کر کہتا وہ کتنا برو بار کتنا مشفق لگ رہا تھا۔ حالانکہ شرجیل کی نازک مزاجی اور بے نیازی کی ایک دنیا گواہ بھی مگر حالات نے اسے بہت تیزی سے تبدیل کیا تھا۔

”کھانا گرم کروں بھائی؟“ زارون کو کارٹ میں لٹا کر وہ اس کی جانب آ گئی۔ شرجیل کسی خیال میں تھا خفیف سا چونکا اور منع کرتے کرتے کسی خیال کے تحت سوال کیا۔

”تم نے کھا لیا؟“ وہ جانتا تھا وہ اگر منع کر دے گا تو سمعیہ بھی بھوک ہونے کے باوجود نہیں کھائے گی۔ اس کے سر کوئی میں ہلانے پر شرجیل نے سر دہا بھری۔ اسے سمعیہ کی بہت فکر رہنے لگی تھی اس کی وجہ سمعیہ کی خود سے بے پروائی تھی۔ وہ ایسے گلاب کے پھول کی مانند تھی جو پوری طرح کھلے بغیر ہی مرجھانا شروع ہو چکا تھا۔

”میں کھانا لگاتا ہوں تم اتنی دیر میں اپنا حلیہ درست کرو“ اس روز میں جو کپڑے لایا تھا تمہارے لیے کہاں ہیں وہ؟“ سمعیہ کے تلخ لباس اور بے ترتیب اچھے بالوں کو دیکھتا وہ یکدم پریشان ہوا تھا۔

”الماری میں ہیں اور ان کپڑوں کو کیا ہوا بھائی میں ٹھیک تو ہوں۔“ بے دلی سے کہتی وہ باہر لگی تو شرجیل تیزی سے اس کے پیچھا آیا۔

”تم ایسا سلوک کرو گی اپنی زندگی کے ساتھ تو مجھے اپنا فیصلہ غلط لگنے لگے گا سمعیہ! پلیز میری شرمندگی اور ہچکچاتاؤں کو مت بڑھاؤ۔“ آن کی آن میں وہ کس قدر ہمارا ہوا انسان لگنے لگا تھا۔ شاید اس کا اصل اب یہی تھا بس سمعیہ کی خاطر خود کو سنبھالے پھرنا تھا اس فیصلے نے سمعیہ

سے نہیں درحقیقت شرجیل سے سب کچھ چھپنا تھا۔ گھریا رشتے تاتے سہولیات۔ آج کل اس کے پاس معمولی جاب تھی ایسے میں اگر وہ بھی شرجیل کے لیے پریشانی کا باعث ثابت ہوتی تو یہ اپنائیت و محبت کے اصولوں کے سراسر منافی ہوتا۔

”آئی ایم سوری شرجی بھائی! میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا آئندہ شکایت نہیں ہوگی آپ کو آپ بیٹھیں میں کھانا لگاتی ہوں تھکے ہوئے آئے ہیں۔“ اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی کے ساتھ شرمندگی کا ملال بھی گھلا ہوا تھا۔ شرجیل معصومیت و سادگی کے اس مظاہرے پر جیسے دل سے مسکرایا۔

”سب سے پہلے یہ نوٹ کر لو مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ بھائی بہنوں کا مان ہوتے ہیں خاص طور پر کنواری بہنیں بھائیوں کی بہت اہم ذمہ داری ہوتی ہیں۔ بس اللہ پاک سے دعا ہے میں اس ذمہ داری سے احسن طریقے سے فارغ ہو جاؤں اور اتنا سا کام کر کے میں نہیں تھکتا۔“ تھکانے کا باعث اس باگڑیلی کی بسورتی شکل ہوتی ہے جاؤ جا کے چیخ کر تب تک میں تمہیں اپنے سکھڑا بے کا تھوڑا سا اثر ملدے گا ہوں۔“ شرجیل نے دانستہ اپنے لہجے کو آخر میں خوش گوار بنایا۔

”گڈ! پھر تو ایکی بھائی ٹھیک ہونے کے بعد مجھے دعائیں دیں گی۔“ وہ کھلکھلائی تو شرجیل بھی غم آنکھوں سے مسکرانے لگا۔

”اللہ تمہاری زبان مبارک کرے سمعیہ۔“ اس کا رواں رواں دعا گو تھا۔

”سکندر..... سکندر.....!“ وہ ابلیتی چائے چوبلی پر چھوڑ کر اس کے پیچھے بیرونی دروازے تک بھاگتی ہوئی آئی تو سانس پھول رہی تھی۔ سکندر نے اٹھتے قدموں کو روک کر جیسے طوعاً و کرہاً پلٹ کر اسے دیکھا۔

”کہاں جا رہے ہو تم؟“ حیرانی کا تاثر اس کی سحر طراز مفرد آنکھوں کی دلکشی اور حسن کو دوا تہہ کر گیا تھا۔ سکندر

نے فی الفور نگاہ کا زاویہ بدلا۔ وہ ان بے مہر آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبنا نہیں چاہتا تھا۔

”آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“ لاریب نے اسے گھورتا چاہا بلیک ڈریس پینٹ پر وائٹ اینڈ گرے لائننگ کی شرٹ میں بلبوں کا اندھوں پر مردانہ شال پھیلائے وہ کتنا بے مہر اور سرد لگ رہا تھا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں شاید تم یہ اہم بات بھول چکے۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولی تھی۔

”تو؟“ لاریب کی آنکھیں گویا اہل پڑیں۔ چہرہ غضب کی آنچ سے نمتانے لگا۔

”یہ بھی اب تمہیں میں بتاؤں کہ تمہیں اب کیا کرنا ہے؟“ اس کے بھڑک کر کہنے پر سکندر نے سر جھٹکا۔

”اس زحمت کی ضرورت نہیں ہے۔ راستے سے نہیں مجھے جانا ہے۔“ اس کا لہجہ نوزخ شک تھا۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا سکندر؟ کل تمہارا آپریشن ہوا ہے اور آج تم گھر سے باہر جا رہے ہو۔ دیکھو اگر بابا جان نے بھی بلوایا ہے تو فون پر صورت حال بتا دو انہیں کہ.....!“

”مجھے آپ کے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے۔ نہیں میرے راستے سے.....!“ اس نے جیسے ہی اسے سامنے سے ہٹا کر پیش میں جانا چاہا لاریب نے بے اختیار ہی اس کے ہاتھ دبوچ لیے تھے۔

”جذباتیت سے ہٹ کر سوچو گے تو ہی میری بات دماغ میں آئے گی نا وہ بد معاش کل یہاں زبردستی کھس سکتا ہے تو آج نہیں آئے گا کیا؟ سکندر اس کے ارادے تم سے مخفی تو نہیں۔ اکیلی ہوں گھر پر تمہارے والدین ہوتے تو اور بات تھی۔“ وہ رسائیت آمیزی سے کہہ رہی تھی لہجے میں پھر بھی نرم سی جھنجھلاہٹ اتر آئی تھی۔

سکندر کی ترسی ہوئی نظریں لاریب کے ہاتھوں پر جم گئی تھیں۔ جن میں ابھی تک سکندر کی کلائی دبی ہوئی تھی۔ بس کیا صرف یہی کافی نہیں تھا اس کے پیش اس کی برہمی کو اور اشتعال کو مٹانے کو۔ وہ یک ٹک گم صم دیکھتا رہ گیا۔ لاریب نے اچنبھے میں گھر کر اس کی سکتہ زد کیفیت دیکھی عجیب ہمارا



ہوا انداز تھا۔ نگاہ اس کی نظروں کے تعاقب میں جھکی تو لاریب نے کسی قدر سنبھل کر اپنے ہاتھ واپس کھینچ لیے سکندر ہونٹ جھینچے سر جھکائے پلٹا اور کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

”اتنا دیوانہ کیوں ہے؟ اس کی محبت کی شدت سے تو خوف آنے لگا ہے مجھے ایسا ضبط ایسی برداشت اور اس پر یہ دیوانگی کیا کروں میں اس شخص کا؟ نہیں کر سکتی میں اس روپ میں اسے قبول عباس کے سوا میں کیسے کسی اور کو یہ جگہ دے دوں.....“

بے بسی اور رنج و ملال کے اظہار پر آنسو گالوں پر اتر آئے تھے اسے سکندر کا دکھ افسردہ کر رہا تھا۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی اسے دکھ دینے پر مجبور تھی۔ چائے اہل کر گیتلی کے کناروں سے باہر آئی تب وہ چونکی اور دلگیر سے انداز میں چائے چھان کر گم میں نکالی انڈے وہ پہلے بال چکی تھی۔ سلاکس بھی گرم تھے۔ اس نے ٹرے تیار کی اور بے دلی سے کمرے میں آ گئی۔ سکندر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے کسی عینق سوچ میں گم تھا۔ آہٹ پر چونک کر متوجہ ہوا مگر اگلے ہی لمحے نگاہ پھیر لی۔ وہ اس بل جیسے اس کے سامنے سے بھی خائف تھا خائف تو لاریب بھی نہیں دونوں ہی ایک دوجے سے کتر رہے تھے۔

”ناشتا کرلو تم نے بابا جان کو بتایا؟“ ٹرے بیڈ پر اس کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے آہستگی سے سوال کیا۔ سکندر نے جواب نہیں دیا۔ سائیڈ پر پڑائی دی کاریمورٹ اٹھا کر اس نے ٹی وی آن کر لیا۔ سکندر کی پوری توجہ ٹی وی کی جانب تھی۔ گویا وہ اسے دانستہ نظر انداز کر رہا تھا۔ لاریب کو اس پر غصہ نہیں آیا یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے سکندر کی کیفیت کو سمجھا تھا۔

”میں کچھ پوچھ رہی ہوں سکندر۔“ لاریب نے اس کی توجہ حاصل کرنے کو ٹی وی بند کر دیا تھا۔ سکندر کا ضبط جواب دے گیا جیسی پھٹ پڑا۔

”کیا بتاؤں میں انہیں بد قسمتی سے میرے پاس انہیں بتانے کو کچھ بھی قابل فخر نہیں ہے۔“ اس کا لہجہ برہم تھا یہ بلا کی برہمی اس بات کی مظہر تھی کہ وہ شدید ذہنی کرب کا شکار

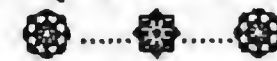
ہے۔ ورنہ وہ اس طرح اس سے بات نہیں کیا کرتا تھا۔ ”تم انہیں وقاص کی کمینگی کے متعلق بتاؤ اور.....؟“ اس کی بات سکندر کی طنزیہ نظروں کے باعث اٹھوڑی رہ گئی۔

”اور ان کی پریشانی میں اضافہ کروں بی بی صاحبہ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ پہلے بھی پھولوں کی بیج پر نہیں سوتے رہے۔ بابا سائیں بھلا کیا کر سکیں گے؟ آخر محترم وقاص حیدر ان کے صرف نتیجے ہی نہیں داماد بھی ہیں۔“ وہ بھڑکا تو پھر غصے میں بولتا چلا گیا۔

”داماد تو تم بھی ہو۔“ لاریب کے ٹوک دینے پر سکندر کے سلگتے اعصاب کو جیسے شاک لگا تھا۔ اس نے بے ساختہ چہرہ موڑ کر لاریب کو دیکھا۔ وہ پرسکون تھی سکندر کے وجود میں عجیب سا دروز ہر کی صورت تیزی سے پھیلتا چلا گیا۔ اس کا دل چاہا پوچھے تم مانتی ہو اس رشتے کو جب تم نے نہیں مانا تو یہ خود بخود اپنی اہمیت کھو گیا۔

”رشتے دل سے بنتے ہیں کاغذوں پر سائن کر دینے سے نہیں۔“ سکندر کا لہجہ زور تھا اور ترش تھا۔

”میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی مسٹر سکندر حیات بس اتنا جانتی ہوں مجھے وقاص کی یہ مطلق العنانی بالکل پسند نہیں آئی ہے۔ یہ بھی سن لو آئندہ اگر اس نے اس قسم کی حرکت کی تو میں اسے شوٹ کر دوں گی۔ لہذا اور اپنی زندگی کے انجام کی پروا کیے بغیر بہتر ہو گا تم بابا جان سے بات کر کے اس مسئلے کا کوئی حل نکال لو۔“ وہ جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ سکندر ناشتے کی سمت متوجہ ہا مگر انداز میں بد غبٹی اور بے دلی نمایاں تھی۔ وہ یہ سوچ کر پریشان تھا کہ بابا سائیں کو یہ گنہگار بات کس طرح بتا پائے گا۔ تین بیٹیاں تھیں مگر تینوں کی جانب سے ہی کڑی آزمائش دیکھنا پڑی تھی۔



گوشہ ذہن میں بے ربط خیالوں کا ہجوم چشم تنہائی سے چن کر وہی بے باک سے اشک لحوصل کے اس عہد فراموشی کو یاد کرتا ہے سسکتا ہے بلکتا ہے بہت آج بھی دشت مسافت کے کٹھن رستوں میں

جلتی بجھتی ہوئی بے نام رفاقت کی شعاع عارض وقت کی سرخی پر جھلک پڑتی ہے پھر سے ملنے کی یہ موہوم طلب اور تڑپ آج بھی ذہن کے گوشوں میں چمک اٹھتی ہے آج بھی سورج کے انگار جزیرے میں تو آنکھ کے نور میں تو دل کے سویرے میں تو اجنبی شام کی دم توڑتی برسات میں تو ہے لکیروں کی طرح ثبت میرے ہاتھوں میں میرے ہونٹوں کا نسیم میرے بدن رات میں تو ہم کلامی کا کوئی واقعہ گزرا بھی نہیں پھر بھی لگتا ہے موجود ہے ہر بات میں تو مجھ سے واقف ہی نہیں تیری طبیعت لیکن طرز انکار میں تو شیوہ گفتار میں تو

تو ہی تو ہے میرے افکار کی ہر شے میں پنہاں کبھی اقرار کا حاصل کبھی انکار میں تو کبھی سانس بھی نظروں کا سراب کبھی شبنم کبھی نکلت کبھی رنگ و خوشبو تو میری نیند میرا دکھ تو میرا صبح و شام تو مسرت تو میرا غم تو میرا سب کچھ ہے تو میرا کچھ بھی نہیں پھر بھی میرا سب کچھ ہے

وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی میوزک مدھرسروں میں بچ رہا تھا اور سنگر کی پرسوز آواز نے ماحول پر یاسیت کے ساتھ غم و یاس کے تاثر کو مزید گہرا کر ڈالا تھا۔ زینب نے بے بسی سے اس کے ہچکیوں سے لڑتے وجود کو دیکھا اور اس کا دل دکھ سے بھرتا چلا گیا۔ ابھی ملازمہ سے فاطمہ کے متعلق سوال کرنے پر کچھ روز قبل کی ساری صورتحال اور پھر فاطمہ کی وحشت اور بے بسی کی داستان اس تک پہنچ چکی تھی۔ محبت کے دشت کی آبل پائی نے اسے کہیں کا بھی نہیں رہنے دیا تھا۔ عجیب بے بسی کا عالم تھا کہ وہ بد نصیب لڑکی حالات کے تھپڑے کھانے کو تنہا رہ گئی تھی۔ کچھ مصیبتیں انسان کی اپنی خریدی ہوتی ہیں جو گلے کا کاٹنا بنا کر انکس جایا کرتی ہیں۔

زندگی بے ربط ہو کر رہ گئی تھی اور قسمت اس کے ساتھ عجیب کھیل کھیل رہی تھی۔ وہ شخص جو ہمیشہ اس سے بے نیاز رہا تھا وہ اب اسے بہت زیادہ دکھ دینے کا باعث بن گیا تھا۔ صرف مایوسی ہی مقدر تھی۔ ایسے میں کیا جواز رہتا تھا کہ وہ پھر بھی اس کی جانب آس مندانہ نظروں سے نکلتی مگر یہی تو بے بسی تھی کہ وہ پھر بھی پلٹ نہیں سکتی تھی۔

”فاطمہ۔“ زینب کے پکارنے پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ زینب کے دل پر چوٹ پڑی۔ وہ ان چند دنوں کے اندر صدیوں کی مریضہ دکھائی دیتی تھی۔ اچھے بے ترتیب بال، پیٹری زدہ خشک ہونٹ اور ملگجی لباس زینب نے تڑپ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

”کیا ہو گیا ہے فاطمہ خود کو سنبھالو۔“ زینب نے خفگی سے ٹوکا مگر اس طرح کہ غم کی شدت سے اس کا گلزارندھا جاتا تھا۔ ”میں نے ساحر سے کبھی کچھ نہیں مانگا زینبی۔ لیکن وہ پھر بھی مجھے خوش نہیں رہنے دیتا وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے زینب یہی احساس مجھے جینے نہیں دے رہا۔“ فاطمہ کے لہجے میں صدیوں کا کرب اور اذیت رچی ہوئی تھی۔ زینب نے اسے نرمی اور محبت سے تھکا۔

”اللہ سے اپنے لیے صبر کی توفیق مانگو فاطمہ اور یہ معاملہ بھی اللہ کے سپرد کر دو وہ اپنے بندے کی بہتر خبر گیری کرنے والا ہے۔ یاد رکھو اگر تم اپنے رب پر بھروسہ رکھتی ہو تو وہ بھی اس بھروسے کو ٹوٹنے نہیں دے گا۔ تم نے اسلام قبول کیا ہے فاطمہ تو اب اپنے مذہب کو جاننا اور ان تعلیمات پر عمل کرنا تمہارا فرض اولین ہے۔ میں اسی سلسلے میں آئی تھی تمہیں قرآن پاک کی تعلیم کا آغاز کرنا چاہیے اور نماز بھی سیکھو تا کہ فرض کی ادائیگی کے حوالے سے روز محشر شرمندگی سے بچ سکو۔“ زینب کا انداز ایسا دھیمہ اور پراثر تھا کہ اتنے دنوں سے فاطمہ پر طاری وحشت کو قہر آواز لگا۔

”اللہ کی یاد میں ہی دلوں کا سکون پوشیدہ ہے فاطمہ، ہاں آزمائش شرط ہے۔“ زینب کی نرم گوئی پر فاطمہ نے سرد آہ بھر کر اسے دیکھا۔

”میں اپنی کوتاہی پر شرمندہ ہوں زینب آپ کو یاد ہے

”میں اپنی کوتاہی پر شرمندہ ہوں زینب آپ کو یاد ہے



آپ نے کہا تھا اللہ فرماتا ہے جو میری رضا کو مقدم رکھے گا۔ میں اسے اس کی رضا سے نوازوں گا اور جو میری رضا سے کوتاہی برتے اسے اس کی خواہش میں تھکا دوں گا۔ مجھے تھکانا تو تھا ہی میں اصول فطرت کے خلاف چل کر کیسے من چاہا احساس پاسکتی تھی۔ زینب مجھے اب کے نہیں ہارنا ہے مجھے اللہ کی رضا اللہ کی اطاعت قبول ہے۔ میں آج تمہارے ساتھ چلوں گی۔ نماز سیکھنے کے لیے قرآن پاک سیکھنے کے لیے۔“ وہ زار و قطار روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور زینب نے طمانیت و آسودگی کے بھرپور احساس سمیت اسے گلے لگا کر تھکا اور فاطمہ کو لگا تھا اس کے اندر سرسراتی وحشت میں کمی آتی جا رہی ہے۔

اس کا چہرہ غم و غصے کی زیادتی سے بے حد سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں لال انگارہ تھیں اور ہاتھ تیزی سے مصروف عمل..... پہلے اس نے اپنے کمرے کی صفائی کی تھی۔ پھر واشنگ مشین کا سوچ آن کر دیا۔ کپڑے مشین میں ڈالے اور پائپ لگا کر جس وقت صحن کی دھلائی شروع کی عین اسی لمحے بیرونی دروازے پر دستک ہونے لگی۔

”اس وقت کون آ گیا؟“ اس کی سوچیں بھی دل و دماغ کی طرح جھنجھلائی ہوئی تھیں۔ باپ پھینک کر وہ اسی قہر آلود انداز میں دروازے کی جانب چلی گئی۔

”کون سی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے آخر تم پر؟“ وہ آنکھیں نکال کر تیش لہجے میں غرائی۔ سکندر نے حیرت زدگی کے عالم میں لاریب کو دیکھا جس کے ہاتھ میں جھاڑو تھی اور دوپٹا حسب سابق نثار۔ آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

”افوہ..... آپ کو کیا ضرورت تھی آخر اس مشقت میں بڑنے کی؟“ سکندر نے صاف ستھرے نگوں اور چلتی ہوئی مشین پر نگاہ ڈال کر دبے ہوئے انداز میں ٹوکا۔

”کیوں تمہارا ارادہ ملازم رکھنے کا ہے یا پھر اپنی بوڑھی ماں سے لینا چاہتے ہو یہ خدمتیں؟“ اس کا لہجہ پھنکارتا ہوا

تھا۔ سکندر نے جزبہ ہو کر اسے دیکھا۔

”ملازم بھی رکھ سکتا ہوں میں یہ کام آپ نے کبھی نہیں کیے تو جبر نہیں چاہتا میں آپ پر۔“ سکندر کی بات کے جواب میں لاریب مضحکہ اڑاتی ہنسی ہنسی تھی۔

”واہ..... ملازم اب خود بھی ملازم رکھنے لگے۔ بہت خوب اور جبر کی بات بھی کیا خوب کہی تم نے یہ خیال تمہیں اس وقت کیوں نہ آیا جب تم میری مرضی کے خلاف مجھے بیاہ کر یہاں لائے۔ اگر تم مجھے چپ چاپ چھوڑ دیتے تو بابا جان ان کا لے پانیوں کی سزا نہ سناتے مجھے۔ اب یہ اگر میرے اعمال کی سزا بنائی گئی ہے تو قبول ہے مجھے بس مجھے میری سابق حیثیت یاد نہ کرانا سمجھے؟“ شدید ہجوان تھا اس کے لہجے میں سکندر نے بے اختیار اسے تھامنا چاہا مگر وہ فوراً ہی فاصلے پر ہوئی اور بھاگ کر واشنگ مشین کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ سکندر نے خفت سے چورنگہ اماں اور بابا پر ڈالی جو اسی وقت واپس لوٹے تھے اور انہوں نے لاریب کی وہ ساری باتیں سن لی تھیں۔ سکندر نے نگاہ چرائی اور تھکے ہوئے انداز میں کمرے میں آ گیا۔

وہ جانتا تھا لاریب اس خود اذیتی کا شکار کیوں ہو رہی ہے۔ اسے سکندر سے گلہ تھا حالانکہ سکندر نے اس کے مجبور کرنے پر بابا سائیں سے وقاص والے معاملے پر بات کی تھی وہ کتنے فکر مند ہو گئے تھے یہ سنتے ہی پھر یہ انہی کا فیصلہ تھا کہ لاریب اور سکندر ان کے ساتھ جوبلی میں ہی رہیں گے یہ ضروری تھا۔ باقی کے تمام حفاظتی اقدامات بعد میں ہی عمل میں لائے جاسکتے تھے۔ جن میں بڑے بابا جان کو وقاص کے کروت سنا گا ہی دینے کے بعد وقاص کو لگام ڈالنے کا اہم کام بھی تھا۔ اس وقت وہ خود لاریب کو اپنے ساتھ لانے کے ارادے سے اٹھ گئے تھے حالانکہ سکندر نے منع کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔

”ایسا مت کریں بابا سائیں مجھے نہیں لگتا لاریب اس بات پر متفق ہوں۔“ وہ ہچکچا کر کہہ رہا تھا۔ لاریب کی ضد اور تنفر ملاحظہ کر لینے کے بعد وہ نہیں چاہتا تھا کہ بابا سائیں کو لاریب کے باعث مزید دکھ اٹھانے پڑیں مگر بابا

سائیں نے جواباً اس کا کاندھا تھپک دیا تھا۔

”تم پریشان نہیں ہو سکندر میں لاریب کو قاتل کر لوں گا۔ بہر حال عزت اور جان سے بڑھ کر نہیں ہوگی۔ سنا بی ضد اور انا۔“ مگر لاریب نے بابا سائیں کا خیال غلط ثابت کر دیا تھا جس وقت وہ گھر پہنچے لاریب دھوپ میں تخت پر بیٹھی چاول صاف کر رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر اس کی کیفیت عجیب دکھ بھری ہوئی تھی۔ کتنا شا کی بن تھا اس کی نظروں میں۔

”آج نہیں پوچھے گی میری بیٹی کہ کیوں آیا ہوں اور کیا بیٹھنے کو نہیں کہو گی؟“ وہ اس کی کیفیت کو سمجھتے تھے جیسا بے حد شفقت سے مخاطب کیا۔ لاریب نے کچھ کہے بغیر کرسی لا کر ان کے پاس رکھ دی اور خود ان کے سامنے ٹک گئی مگر یوں کہ نظریں ان سے نہیں ملائی تھیں۔ شاید اپنے آنسو چھپانا مقصود تھا۔

”بابا کو اپنی اس بیٹی پر سب سے زیادہ مان ہے جیسی آج ایک بار پھر ایک تقاضے کے ساتھ آیا ہوں۔“ انہوں نے جیسے تمہید باندھی اور لاریب تڑپ اٹھی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو پھیل کر گالوں پر اتر آئے۔ بابا سائیں کے دل پر گھونسا لگا تھا مگر وہ خود کو سنبھال لے رہے۔

”آپ کو یاد ہو بابا جان تو میں نے ایک بات کہی تھی مجھے مار دینے کے بعد مزید اذیت نہیں دیجیے گا۔ آپ سمجھتے ہیں آپ کو اب مجھ سے توقع رکھنی چاہیے؟ اگر پھر بھی ایسا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں میں پوری نہیں اتر سکتی۔“ اس کے دھیمے لہجے میں بھی بلا کا زہر اور نخی پوشیدہ تھی۔ بابا سائیں کا وجود جیسے سرد ہونے لگا۔

”وقاص کے حوالے سے تمہیں سب خبر تو ہوگی بات عزت کی حفاظت کی ہے لاریب بیٹی کیا اب مجھے تمہیں کھول کر سمجھانا پڑے گا۔ مگر کاندھا بہت ملن لیے ہوئے تھا۔

”اس کی ضرورت نہیں بابا سائیں سب کچھ میرے سامنے ہوا ہے میں اس کے باوجود یہاں سے نہیں جاؤں گی قبر میں دفن ہونے کے بعد مردے اپنی جگہ تبدیل نہیں کیا کرتے۔“ اس کے لہجے میں ہٹ دھرمی نہیں تھی بے بسی کے انتہائی درجے کی شوریدہ مری تھی۔ بابا سائیں گنگ

بیٹھ رہ گئے۔ یوں جیسے ہلنے کی بھی سکت نہ رہی ہو۔ ”یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے لاریب؟“ وہ بولے تو ان کی آواز جیسے گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ ”بالکل قطعی اور دو ٹوک پتھر پر لکیر سمجھ لیں۔“ لاریب نے مدہم مگر سرد انداز اختیار کیا بابا سائیں اس کی صورت دیکھتے رہ گئے۔

”بیٹے عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا بوڑھے باپ کی بے بسی کا کچھ تو خیال کرو۔“ وہ بے بسی کی انتہا کو چھوتے رو پڑے تھے لاریب نے ہونٹ پیچ کر نگاہ کا زور یہ بدل دیا۔ ”میں انسانوں کی حفاظت پر یقین نہیں رکھتی بابا جان حفاظت کرنا اللہ کا کام ہے اور اللہ ہر جگہ پر موجود ہے مجھے وقاص کے ڈراوے نہ دیں۔“ پھر بابا سائیں کو مایوس لوٹنا پڑا۔ سکندر نے ان کی ناکامی کو دل سے محسوس کیا تھا البتہ کوئی تبصرہ نہیں کر سکا۔ وہ ان کے دکھ میں مزید اضافہ کیسے کر دیتا۔ البتہ لاریب کو ضرور سرزنش کرنی چاہی تھی جس کے جواب میں اس کا شدید ترین رد عمل بھی سہنا پڑا۔ ”آپ کو بابا سائیں کے ساتھ اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”تم تو ان کی فیور کرو گے ہی ظاہر ہے تمہارا مقصد تو اسی طرح پورا ہو گا نا ان کی جائیداد پر قبضہ ہی تو کرنا چاہتے ہو تم یہ لالچ ہی تھا جس کی بنا پر تم نے میری زندگی جہنم بنا ڈالی مگر سکندر حیات میرا نام بھی لاریب ہے مرتے مرتے جاؤں گی مگر تمہیں اس مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔“ اس کے پھنکارنے پر سکندر کا چہرہ جانے کس جذبے کے تحت بے تحاشا سرخ ہوتا چلا گیا۔

”یہاں سے چلے جاؤ سکندر زور نہ عین ممکن ہے کہ میں اپنے ساتھ ساتھ تم پر بھی تیل چھڑک کر آگ لگا دوں۔“ وہ حلق کے بل غرائی اور سکندر نے یہی مناسب سمجھا تھا کہ اس کے سامنے سے ہٹ جائے آج تک بات بڑھا کر ملا بھی کیا تھا۔ وہ اس کے لیے بنی ہی نہ تھی وہ اس سے محبت کر رہی نہیں سکتی تھی۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد جب وہ اس کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھ رہی تھی تب سکندر کی نظر اس کے



ہاتھ کی جھلسی جلد پر جا بھری۔ اس نے بے اختیار مضطرب انداز میں لاریب کو دیکھا۔ جس کی سرخ اور بھکی آنکھیں گواہ تھیں کہ وہ جی بھر کر دل کا بوجھ ہلکا کر رہی ہے۔

”کیسے جلا ہاتھ میں منع کرتا ہوں کام سے۔“ سکندر نے بے قرار انداز میں کہتے اس کا ہاتھ پکڑ کر زخم دیکھنا چاہا مگر لاریب کا تنفر ہنوز تھا۔

”اپنے کام سے کام رکھو سمجھے مجھ سے ہمدردی کا کوئی تعلق نہیں ہے تمہارا۔“ سکندر ہنٹ بھینچے اٹھا اور تلاش بسیار کے بعد مرہم لے کر اس کے پاس کچن میں آ گیا۔ وہ جلن سے بے تاب ہوتی تل کھولے ہاتھ پانی کی دھار کے نیچے کیے کھڑی تھی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے۔ سکندر دوہری اذیت کا شکار ہوا کہ لاریب نے اسے دیکھتے ہی خود اذیتی کا شکار ہوتے تل بند کر دیا تھا۔

”لامیں مرہم لگا دوں وقتی آرام تو ملے گا پھر ڈاکٹر سے دوالاتا ہوں۔“ سکندر نے اس کا پشت پر چھپایا ہاتھ پکڑنا چاہا تو لاریب نے اشتعال میں آ کر اسے پوری قوت سے پیچھے کی جانب دھکیل دیا۔

”مجھے نہیں ہے ضرورت تمہاری ہمدردی و توجہ کی؟“ وہ چیختی تھی سکندر چند قدم پیچھے ہوا پھر لا چاری سے اسے دیکھتا رہا۔

”مجھے میری محبت کی اتنی کڑی سزا نہ دیں لاریب نہیں دیکھ سکتا میں آپ کی یہ حالت۔“ وہ بولا تو شدت جذب سے اس کا لہجہ رقت آمیز تھا لاریب نے جواب نہیں دیا چپ چاپ آنسو بہائے گئی۔ سکندر نے تذبذب کی کیفیت میں اسے دیکھا پھر آگے بڑھ کر دوا لگانے لگا۔ لاریب نے مزاحمت نہیں کی۔ شاید تکلیف کی شدت اور اندر کی توڑ پھوڑ کے آگے پوری طرح ہمت ہار رہی تھی۔ البتہ سکندر کے اس عمل سے آنسوؤں میں روانی ضرور آ گئی تھی۔ ٹپ ٹپ شفاف قطرے سکندر کے ہاتھ کو بھگو گئے تو اس کا ہاتھ اس زاویے پر ساکن ہو گیا تھا۔

اس میں اتنی ہمت نہ رہی کہ نظر بھر کر لاریب کا تکلیف ورن میں ڈوبا چرا دیکھ پاتا۔ البتہ اندر کی شوریدہ سر محبت کے

سامنے گھٹنے ٹیکتے جھک کر لاریب کے ہاتھ پر اپنے ہونٹ رکھ دیے تھے۔ لاریب ایک لمحے کو بھونچکی رہ گئی۔ وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کی مانند ڈھلک کر سکندر کے کاندھے سے لگ کر بلک اٹھی تھی۔ سکندر جو ایک لمحے کو اس عنایت غائبانہ پر ہک دق تھا اگلے لمحے اسے قیمتی اصول متاع کی مانند یاز دوں کے حلقے میں سمیٹ لیا تھا ایک طرف شدت غم تھی، بے بسی تھی دوسری جانب محبت کے صحراؤں پر ابر رحمت برسی تھی۔ لاریب کے ابلتے مچلتے آنسو سکندر نے ہونٹوں سے چنے تھے۔ وہ یکدم کتنا اہم کتنا خاص اور اصول ہو گیا تھا۔ پھر لاریب ہی حواسوں میں لوٹی اور ٹپ کر اس کے بازوؤں کے حصار سے نکلی۔ سکندر سے نظریں جراتے اس نے اپنا ڈھلک جانے والا دوپٹا سنبھالا اور رخ پھیر لیا۔ سکندر کی کیفیات انوکھی تھیں۔ دونوں کے درمیان معنی خیز خاموشی دہائی دونوں ہی اپنی اپنی کیفیت کے زیر اثر تھے۔

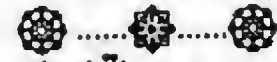
”تم بابا جان کو منع کر دینا وہ آئندہ یہاں کبھی نہ آئیں۔“ لاریب بولی تو اس کا لہجہ سپاٹ تھا وہ مکمل طور پر ان سحر انگیز لمحوں کی گرفت سے نکل آئی تھی۔ سکندر کو مگر سنبھلنے کے لیے صدیاں درکار تھیں۔

”کھانا کھا لیں پلیز۔“ سکندر پلٹ کر کمرے سے ٹرے اٹھا لایا۔ ٹرے سے دیکھ کر اس نے پہلے لاریب کو پیڑھی پر بٹھایا پھر خود اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ لاریب اس وقت چونکی تھی جب سکندر نے نوالہ توڑ کر اس کے منہ کی جانب بڑھایا تھا۔ چہرے پر ہی نہیں نظروں میں بھی لاجت آمیز گزارش تھی۔ جانے کیا ہوا لاریب کی آنکھیں پھر سے پانیوں سے چھلک گئی۔

”یہ شخص میرے اتنے ناراد سلوک کے باوجود اتنی محبت کیوں کرتا ہے جو جکڑ لینے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ اگر تو نے مجھے اس نعمت سے نوازا نہ ہی تھا تو پھر عباس کو کیوں نہیں دیا مجھے یہ جو ایک معمولی انسان ہے تو نے اس کی خواہش کو میری خواہش پر مقدم جانا کیوں؟ کیا مجھ سے تو محبت نہیں کرتا تھا کیا مجھوں میں میرے اللہ میرے دل کو عباس کی اتنی چاہ اتنا پاگل پن نہ بخشا ہوتا

جس نے مجھے کسی اور کے قابل رہنے ہی نہ دیا۔“

سکندر کا ہاتھ زور سے جھٹکتی پھوٹ پھوٹ کر روتی وہ اٹھ کر کمرے میں گئی۔ سکندر سر جھکائے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کے ناہم جال میں الجھتا رہا۔



موسم خنک اور دھوپ سنہری تھی کھڑکی سے سڑک کے منظر میں رواں ٹریفک میں زندگی کا ایک بھرپور احساس جاگ رہا تھا مگر اس کے اندر جیسے زندگی ہرگز رتے دن کے ساتھ دم توڑتی جا رہی تھی۔ وہ باقاعدگی سے زینب کے پاس جاتی تھی مدرسہ قرآن پاک پڑھنا نماز سیکھنا ہرگز آسان مرحلہ نہیں تھا وہ بھی اس صورت میں جبکہ وہ شخص ہر پل ہر لمحہ اس کے حواسوں پر مسلط رہتا تھا۔ وہ وضو کر رہی ہوتی عباس کی شبیہ اس کی آنکھوں میں آٹھرتی۔ وہ نماز کو کھڑی ہوتی تو زینب کو بار بار ٹوک کر اس کی صبح کرانا پڑتی۔ جب صبر کا مزید یار نہ رہا تو وہ زینب کے آگے سسک پڑی تھی۔

”میں بے بس ہو گئی ہوں زینب مجھے لگتا ہے اگر ایک دن اور مزید میں اسے نہ دیکھ پائی تو میرا دل دھڑکنے سے انکار کر دے گا۔“ اور زینب اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”تمہیں صبر کرنا چاہیے صبر سے اللہ کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے۔“ زینب نے اس کے آنسو پونچھے تو اس نصیحت پر سیل رواں میں مزید شدت آ گئی تھی۔

”صبر ہی تو تمام ہو گیا ہے زینب جب تک وہ مجھے ملا نہیں تھا میں اندر جا گئی وحشتوں کو کسی نہ کسی طرح سنبھال لیتی تھی مگر اب..... اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا میں یہاں سے واپسی پر ہر روز اس کے گھر کے آگے کھڑی رہتی ہوں۔ محض اس آس پر کہ اس کی ایک جھلک ہی دیکھنے کو مل جائے۔“ زینب نے سر دبا بھری۔

”قرآن کریم میں اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے۔ مدد حاصل کرو صبر سے اور نماز سے تمہارے لیے دلوں رستے کھلے ہیں خود کو اللہ کے حوالے تو کرو ہر بے قراری کو قرار مل جائے گا۔“ زینب اس کے سر کو تھپتھپاتا رہی تھی۔ فاطمہ نے

آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”کیسے کروں اللہ کے حوالے خود کو؟“

”وقت تہجد نماز ادا کرو پھر سجدہ میں جا کر اللہ سے رہنمائی مانگو، صبر اور شکر دونوں کا ہی بڑا اجر ہے۔ صبر مصیبت کو مالتا ہے اور شکر نعمت کو بڑھاتا ہے۔ اپنی زندگی میں اس کا تجربہ ضرور کر کے دیکھو ہمیشہ کامیاب رہو گی۔“ فاطمہ نے ہاتھ سے اپنے گال پر گڑ گڑا آنسو صاف کر دیے۔ ”میں کوشش کروں گی۔“ اس نے جھکے سر کے ساتھ کہا۔ اس کے انداز میں بے دلی تھی۔ مگر زینب نے جس جذبے کے ساتھ اس کا کاندھا تھکا تھا اس میں نہ بے دلی تھی نہ مایوسی بلکہ امید اور آس کا قوی یقین اس کے لمس میں جا گتا تھا۔ وہی یقین و اعتبار جو ایک کامل مسلمان کا ہر حال میں اپنے رب پر قائم رہتا ہے اور یہی یقین و اعتبار کامیابی کا بہترین ذریعہ ہے۔



کچھ پیچھی ٹھنڈ میں اڑتے ہوں اور رستہ بھی کچھ مشکل ہو کچھ دور افق پر منزل ہو ایک پیچھی گھاٹل ہو جائے اور بے دم ہو کر گر جائے تو رشتے ناتے پیارے سب کب اس کی خاطر رکتے ہیں اس دنیا کی ہے ریت یہی جو اڑتے ہو تو ساتھ بہت جو رک جاؤ تو تنہا ہو

اس نے گہرا کش بھرا اور دھوئیں کو بکھرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ عجیب سی فضا تھی جس زدہ یا پھر اس کے اندر ہی اتنا غبار چھا گیا تھا۔ جیتی ہوئی بازی عین موقع پر آ کر ہار دینا کیسے غڈ حال کر دینے والے احساس سے دوچار کر دیا کرتا ہے کنویں کے پاس آ کر تشنگی نصیب ٹھہرنا وہی جان سکتا ہے جو اس کیفیت سے دوچار ہو چکا ہو۔ اس کی حالت ہارے ہوئے جواہر کی سی تھی۔ وہ غم صم تھا بظاہر کتنا



مضبوط تھا وہ مضبوط ہی تو تھا۔ جو اس وقت بھی نہیں ڈر گیا تھا جب سارے گھر کا سکون درہم برہم ہو گیا تھا۔ شرجیل کا سمعیہ سمیت دو پوش ہو جانے پر۔

کتنے انتشار و اضطراب اور وحشت کا راج ہو گیا تھا علوی ہاؤس کے ہر یکین کے چہرے پر مکروہ مطمئن و سرشار ہی رہا۔ وہ واقعتاً شرجیل کے اس اقدام پر دل میں آسودگی محسوس کرتا تھا۔ شرجیل کا انداز کسی قدر مجرمانہ ضرور تھا مگر تھا بڑا بروقت اور ضروری۔ پھر وہی تھا جس نے سب سے زیادہ اپنی شادی کا غل اٹھایا تھا لڑائی جھگڑے طعنے اور الزامات کے باوجود علوی ہاؤس کے بزرگ شادی کو ملتوی کر کے دوسری مرتبہ لوگوں سے انگلیاں نہیں اٹھا سکتے تھے۔

سمعیہ کے متوقع سسرالیوں سے معدت کر لی گئی اور سمعیہ کے حوالے سے جھوٹی داستان بنا کر خود کو بری الذمہ کرنے کی کوشش بھی۔ مگر یہ سب کچھ ایسے ہی درانتی کے ایک طرف دھار دنیا کے دونوں طرف۔ کچھ ایسی ہی کاٹ سہنی بڑی تھی علوی ہاؤس کے یکینوں کو لوگوں کی زبانوں سے۔ سچ معنوں میں وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ مگر ڈھٹائی اور سینہ زوری میں بھی کمال درجے کا نام کما لیا تھا۔ جس پر داکے بغیر ختم ٹھونک کر دنیا کا مقابلہ کیا۔ پھر یہ فرازی کی دھمکیاں ہی تھیں کہ اس کی شادی میں تمام تر میس دھوم دھام سے ہوگی اور بارات اپنے مقررہ وقت پر ہی گئی اور دلہن کو رخصت کرا کر لے آئی۔ فرازا ایسے تھا جسے دنیا فتح کر لی ہو۔ محبت کو فتح کرنا دنیا کو فتح کرنا ہی تھا۔ مگر حجت ہر بار مقدر بنے ضروری نہیں وہ بھی عین موقع پر آ کر شرجیل سے دو چار کر دیا گیا۔

دلہن کی خاموشی اور کسی حد تک ناگوار تاثرات کو اس نے بھی محسوس کیا تھا مگر زیادہ اہمیت نہ دی۔ اریبہ کی نازک مزاجی سے آگاہ تھا جس بھی یہ سمجھا کہ وہ طویل رسومات کی ادائیگی کے باعث جھنجھلائی ہوئی ہے جلد عروسی تک اس کی رسائی بڑی مشکلوں سے اور بھاری ننگ دینے کے بعد ممکن ہو پائی تھی مگر بیڈروم میں قدم رکھتے ہی وہ سچ معنوں میں حیران رہ گیا۔

گلابی سلکی لبادے میں وہ چہرے پر کرسنگی کے تاثرات لیے ڈرینگ ٹیبل کے آئینے کے آگے کھڑی ہاتھوں پر کلینرنگ ملک کا مساج کرتی کہیں سے بھی چند گھنٹے قبل بیاہ کر لائی گئی دلہن نہیں لگتی تھی۔ اس پرستم اس کے کانوں پر لگا ہینڈ سیٹ وہ نہایت اطمینان سے مصروف گفتگو تھی۔ جس کا سلسلہ فرازی کی آمد کے بعد بھی نہیں تھا تھا۔

”کسی کی اتنی مجال ہے کہ مجھے کچھ کہہ سکے اور سنو یہ رات اہمیت کی حامل اس صورت میں ہوئی اگر اس بندھن کو میں نے دل کی آمادگی سے باندھا ہوتا۔“ فرازا پر ایک اچھتی ناپسندیدہ نگاہ ڈال کر وہ اپنی مخاطب سے کہہ رہی تھی۔ انداز حد درجہ درشت تھا۔ ہنگ کے احساس نے فرازا کا چہرہ دھکا ڈالا۔ وہ جیسے اپنی جگہ سے ہلنے کے قابل نہیں رہا۔

”کون ہے فون پر؟“ فرازا نے سیل فون اٹھا کر رابطہ منقطع کیا پھر خود پر جبر کرتے ہوئے فون سے بولا۔ اس کے لیے یہ احساس ذلت سے مار ڈالنے والا تھا کہ اس کی بیوی کسی تیسرے فریق کے سامنے سے دو کوڑی کا کرگئی ہے۔ ”اوسٹر ہاؤ ڈیر یو تم ہوتے کون ہو مجھ سے یہ سوال کرنے والے؟“ اریبہ اس جسارت پر بھڑک کر جھٹکے سے اٹھی اور اسی اشتعال میں اسے زور سے دھکا دیا۔ انداز میں نفرت و حقارت کا احساس اتنا گہرا تھا کہ فرازا تو دکھ اور صدمہ سے گنگ ہونے لگا تھا۔

”اریبہ..... بات کرنے کی تمیز ہے تمہیں اور یہ سب.....!“ فرازا نے ہونٹ بھیج کر اطراف میں متاسفانہ نظر ڈالی۔ اس کی ارامانوں سے کرائی گئی ڈیکوریشن کو کس بے دردی سے اجازت تھا اریبہ نے۔ مسہری کے گرد تے باریک جالی کے ریشمی پردے اور پھولوں کی لڑیاں بے ترتیبی سے کارپٹ پر ڈھیر تھیں۔ بیڈ کو جس پر اس مہارت سے گلاب کی پیتاں بچھائی گئی تھیں کہ بیڈ کو کا اصل رنگ چھپ گیا تھا۔ پتیوں سمیت سچ کر گول مول کر کے کونے میں پھینکا ہوا تھا۔ فرازا کے ارامانوں کا ہی نہیں دل کا بھی خون ہوا تھا۔

”ہاں بولو رک کیوں گئے تم پوچھو جو پوچھنا ہے؟“ وہ

بھری ہوئی موج کی مانند اس کے سامنے آئی تھی لہجہ انگارے برستا تھا۔ فرازا نے بے پناہ اذیت کا شکار ہوتے سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا اور ہونٹ بھیج لیے۔

”تم خود بتاؤ کیا وجہ ہے اس ساری بدتمیزی کی؟“ معا وہ سنبھل کر بولا۔ اس کے لہجے سے غضب کی آج آنے لگی تھی۔ وجہ تو ظاہر تھی مگر وہ پھر بھی اپنی ہر خوش فہمی کو دل سے نکال پھینکنے کے درپے ہو گیا تھا۔

”کیا یہ شادی تمہاری مرضی سے نہیں ہوئی؟“ اس کا برہم انداز اس بات کا مظہر تھا کہ وہ شدید ذہنی و قلبی کرب سے دو چار ہے۔

”یہ سوال کرنے سے بہتر تھا تم خود کو جا کر آئینے میں دھیان سے دیکھ لیتے۔“ اریبہ کا انداز تضحیک آمیز تھا اگلے لمحے وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی آئینے کے آگے لے آئی اور اسے دھکا سا دیا۔

”چلو اب دیکھو تو کیسے لگ رہے ہو میرے ساتھ کھڑے پہلوئے حور میں لنگور“ مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہتی وہ نفرتی قہقہہ لگانے میں مصروف تھی۔ اس کے ہر انداز سے سفاکی ٹپک رہی تھی۔ چاہے وہ الفاظ ہوں یا پھر لہجہ۔ فرازا بے وقوفی تحقیر اور سبکی کے احساس سے پتھر لیا ہوا کھڑا رہ گیا۔

اریبہ کے تاثرات سے وہ آغاز سے ہی جان گیا تھا وہ اسے پسند نہیں کرتی لیکن وہ اس حد تک اس سے نفرت کرتی ہوگی اگر اندازہ ہوتا تو کبھی اس حد تک اپنی تذلیل نہ کرتا۔ بے مائیگی سے کہیں زیادہ بڑھ کر شدید احساس دل پر پڑنے والی چوٹ کا تھا۔ ایک بھی لفظ کہے بغیر وہ سرعت سے پلٹ کر باہر آ گیا۔ راہداری عبور کی اور وحشت بھرے انداز میں اس نے سیر حیاں طے کی تھیں۔ نیچے ہال کمر تھا وسیع و عریض کمر اعلیٰ ترین فرنیچر سے مزین امپورٹڈ وال ٹیو وال کارپٹ اور قیمتی آرائشی سامان سے سجا ہوا مگر سنسان اور قبرستان جیسی خاموشی سمونے ہوئے۔

فرازا کو اس بل اپنا آپ بھی اس کمرے جیسا لگا۔ وحشت سے بھرا ہوا شدت ضبط کے باوجود آنسو نکلتے گئے۔ معادہ ٹھنک گیا۔ اطالوی طرز کے آئینے میں اس کا

سائڈ پوز نظر آ رہا تھا۔ بے حد قیمتی نفیس سوٹ میرون ٹائی سلیقے سے بنے بال خوشبوؤں میں مہکتا وجود اونچا لمبا قد غضب کی اسارٹنس لیے مضبوط سراپا متناسب نقوش، کہاں تھی کی؟ اس کے دل نے جیسے سسک کر اس تذلیل کے متعلق سوال کیا اور آنکھوں کی جلن بڑھ گئی۔

”تمہیں کیا پتا شزا مجھے ڈارک کامپلیکشن سے کتنی گھن آتی ہے بھوت لگتے ہیں ایسے لوگ۔ کتنا ترپنی میں گھر والوں کے آگے کہ مجھے ایسے شخص سے شادی نہیں کرنی چاہیے میں افریقی نظر آتا ہوں۔ میں اتنی گوری چٹی ہو کر کالا بھجنگ ہز بینڈ تو ڈیز رو نہیں کرتی مگر نہیں سنی کسی نے۔ بھائی کے امیر کبیر دوست کا رشتہ ٹھکرایا نہیں جاسکتا تھا تا ذات کی اتنی نفی ہوئی ہے تو میں اس بد صورت آدمی کو کیونکر اپنے شوہر کا درجہ دے دوں۔“ اریبہ کی سیسہ پتھلائی آواز پھر اس کی سماعتوں کو ناکارہ کرنے لگی۔ جب وہ پلٹ کر کمرے سے آ رہا تھا وہ پھر فون پر مصروف ہو چکی تھی اور یہ سب تو جیسے فرازا کو ہی سنانے کو کہا گیا تھا۔ فرازا کو لگ رہا تھا ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کے وجود میں دیکھتے آلاؤ میں اضافہ ہو رہا ہے اور پیش آتی ہے کہ جسم موم کی مانند پکھل پکھل کر ڈھیر ہوتا جا رہا ہو۔

وہ ساری رات اس ذلت بھرے احساس کے ساتھ تڑپا تھا مگر صبح وہ ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ ایسا فیصلہ جس نے اس کے کشیدہ اعصاب کو تھوڑی بہت تقویت بخش دی تھی۔

فاطمہ نے بہت آنسوؤں کو صاف کیا اور سر اٹھا کر دل گداز نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ جو حسن کا بے تاج بادشاہ کہلاتا تھا۔ عم کی آگ سینے میں جلانی اور خود کو سرتاپا جھلسا ڈالا۔

”بھلا ایسے بھی کرتا ہے کوئی؟“ اس نے سسکی بھرتے ہوئے عباس حیدر کو دیکھا جو جہازی سائز بیڈ پر بے سدھ پڑا تھا کتنی خواہش رہی تھی فاطمہ کی کہ اسے جی بھر کے دیکھے۔ اس کی دید کی چاہ میں ہی تو فاطمہ کی سانسوں کی ڈور بندھی ہوئی تھی۔ کتنی دعائیں مانگی تھیں۔ اس کے سر راہ مل جانے کی وہ ملتا تو تھا مگر ایسی حالت میں کہ اس کا دل روا تھا تھا۔



شراب کے نشے میں دھت خود سے غافل دے پروا، عباس لازماً اس گاڑی سے نکل جاتا اگر ڈرائیور چاہے کسی کا ثبوت دیتے بروقت بریک نہ لگا دیتا۔ فاطمہ کی نظر اچانک اور غیر ارادی طور پر اٹھی تھی۔ فاطمہ کے حلق سے نکلنے والی دلخراش چیخیں اتنی ہی بے اختیار تھیں جتنا کہ گاڑی کے بونٹ سے ہلکا سا ٹکرا کر گرتا ہوا عباس حیدر۔ خود سے بے نیاز ٹریفک کے اڑدھام سے بے پروا وہ اندھا دھند عباس کی جانب بھاگی تھی۔ اس کے لیے سب سے تشویشناک امر عباس حیدر کا گرنے کے بعد بے سدھ ہو جانا تھا۔

”آنکھیں کھولیں عباس آنکھیں کھولیں پلیز۔“ سڑک پر اس کے نزدیک گھٹنوں کے بل گرنے کے بعد اس نے وحشت زدگی کے عالم میں پکارتے اس کا سراٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ آواز سے خوف جھلک رہا تھا تو چہرے پر ہراس کا گہرا اثر۔ اس بل عباس کی فکر میں کھو کر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی وہ اسے ہوش میں لانے کی کوشش میں ملکان بٹا واز روئے گئی۔

اس شخص کی آنکھوں میں اس نے ہمیشہ خوبصورتی کو دیکھا تھا یا پھر قطعیت کو۔ یہ سارے عباس کے نہیں فاطمہ کے امتحان تھے۔ جسے وہ بولتے ہوئے کھوجاتا تھا رو پڑتا تھا۔ وہ جب بھیگی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھتا تو فاطمہ کا دل ٹھہر جاتا۔ بس نہ چلتا آگے بڑھے اور اسے سینے سے لگا لے۔ سارے غم سمیٹ لے مگر آج جو اس کی حالت تھی وہ دل میں خنجر گاڑنے کو کافی تھی۔ آخر وہ کیوں نہیں سنبھل جاتا آخر وہ کیوں جینا نہیں چاہتا۔

”اٹھ جائیں عباس“ پلیز ایسے مت کریں۔“ وہ گڑگڑائی تھی۔ اس پاس جمع لگ گیا تھا۔

”چوٹ تو اسے نہیں نہیں لگی ہے بی بی تیرا خاوند ہے یہ بندہ؟“ ایک ادھیڑ عمر مزدور ٹائپ آدی نے فاطمہ سے سوال کیا تھا۔ فاطمہ نے آنسوؤں سے دھندلائی مگر ہر اس آنکھوں سے ایک نظر مجمع کو دیکھا اور رو پڑی۔

”یہ بول بھی نہیں رہے فارگاڈ سیک نہیں کوئی اسپتال لے جائے۔“ وہ عباس کی خاطر یکسر انجان اور غیر لوگوں

سے مدد مانگ رہی تھی۔ عشق مجازی ایک بار پھر اسے رسوا و خوار کرنے پر تلا ہوا تھا۔

”اندرونی بیرونی کوئی چوٹ نہیں ہے تیرا خاوند“ (نثر کرنے والا) ہے شراب کی بدبو اس کے کپڑوں سے اٹھ رہی ہے۔“ وہی مزدور فاطمہ سے مخاطب تھا۔ فاطمہ ترتر ہوتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر بدحواس ہونے لگی اور باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کرنے لگی۔

”ہم نے پھنسا نہیں ہے پتر اسے گھر میں بند رکھا کر پولیس آج کل بہت چھاپے مار رہی ہے۔“ ایک بزرگ نے فاطمہ کی حالت پر پہنچ کر کہا۔ فاطمہ زار و قطار روٹی عباس کو پھر سے ہوش میں لانے کی غرض سے اس کا چہرہ تھپکنے لگی۔ مگر وہ یوں مطمئن اور پرسکون نظر آتا تھا جیسے دنیا پر لعنت بھیج کر کبھی نہ اٹھنے کے ارادے سے سویا ہو۔ فاطمہ کا دل خوف کی سرد پناہوں میں اترنے لگا۔ جیسے تیسے وہ اسے ٹیکسی میں ڈال کر گھر لائی تھی۔

ٹیکسی سے اس کے بیڈروم تک لانے میں احسان بابا کے ہمراہ دیگر ملازمین نے مدد کی تھی۔ فاطمہ اسے اس حالت میں چھوڑ کر جانے کا حوصلہ کہاں سے لاتی۔ اس کے ڈھلکے بازو کو سیدھا کر کے اس نے عباس پر کمبل پھیلایا۔ نگاہ اس کے گرد آلود جوتوں پر پڑی۔ فاطمہ نے آگے بڑھ کر اس کے حیر جوتوں سے آزاد کیے۔ سفید دودھیا پیر گرد سے اٹے تھے۔ جن سے خون رستا تھا۔ فاطمہ کے ضبط کا ہر بندھن ٹوٹ گیا۔

اس شخص کے لباس سے لے کر کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے بولنے چلنے پھرنے تک سے وقار نفاست اور بردباری جھلکتی تھی۔ آج وہ اس حد تک رحم آمیز حالت میں تھا کہ اسے اپنی پروا تک نہیں رہی تھی۔ احسان بابا کی آمد پر اس نے خود کو بامشکل سنبھالا۔ احسان بابا بھی اپنی نم آنکھیں جھپک رہے تھے۔ بھلا کون تھا جو عباس کی اس بربادی پر خوش تھا۔ احسان بابا اس بل فاطمہ کی مدد اور مسیحا پر مشکور تھے۔

”آپ پھر آئیں نہیں بیٹا“ بچے بیمار پڑ گئے ہیں آپ کے بغیر وہ بل گئے تھے آپ سے مگر صاحب اس بات پر

آمادہ نہیں کہ انہیں آپ کے حوالے کیا جائے۔ جو ملازمہ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے رکھی ہے اس کے انداز میں بہت سختی ہے۔ بچے چند دنوں میں ہی کملا گئے ہیں۔“ احسان بابا کی بات سن کر فاطمہ نے بے اختیار ہونٹوں کو باہم جکڑ لیا۔ عباس سے اسے ایسی ہی شدت پسندی کی توقع تھی۔

”میں بچوں کو دیکھ لیتی ہوں بابا“ آپ ان کا خیال رکھا کریں۔“ احسان بابا نے سر نہا بھری۔

”ہم نوکر ذات ہیں بیٹا روکنے ٹوکنے کا حق نہیں رکھتے۔ صاحب نے بیگم صاحبہ کا صدمہ اور جدائی ذہنی طور پر قبول نہیں کی ہے۔ وہ اس احساس سے ٹکنا نہیں چاہتے۔ اس ہو جانے والے نقصان نے ان کو مزید نقصان کے احساس سے بے نیاز کر دیا ہے۔ بہر حال میں بچوں کو لاتا ہوں آپ کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔“ احسان بابا پلٹ کر باہر چلے گئے۔ فاطمہ نے گہرا سانس بھرا اور یاسیت آمیز نظروں سے گردن موڑ کر عباس کو دیکھا۔

یہ شخص تو اس کے جسم کی طاقت اور آنکھوں کی روشنی تھی۔ جس کی لو سے زندگی کا چراغ جلتا تھا۔ کوئی کیا جانے وہ اس کے لیے کیا تھا۔

”ان قدموں میں تھوڑی سی جگہ دے دیں اپنی اس داسی کو عباس! قسم کھاتی ہوں اس محبت کی جس نے مجھے آپ کے علاوہ سب کچھ فراموش کر دیا۔ کبھی کوئی تقاضا نہیں کروں گی۔ ندی کنارے لگی وہ گھاس تو بننے دیں جسے آپ ڈوبنے سے بچنے کو سہارے کے طور پر پکڑیں یا تو آپ کو بچالوں گی اور اگر ایسا نہ کر پائی تو آپ کے ساتھ ٹوٹ کر خود بھی ڈوب جاؤں گی۔ ساتھ چل نہیں سکتے ساتھ مرنے کی اجازت تو دے دیں۔“

آنکھوں سے گرتے آنسو اس کا دامن بھگور رہے تھے۔ عجیب بے وقتی لیے تھا یہ نذرانہ محبت جس پر لٹایا جا رہا تھا

نہ اسے خبر تھی اور جو لٹا رہا تھا نہ اسے پروا تھی۔

”حی الفلاح“ حی الفلاح۔“ کھلی کھڑکی سے موذن کی دل گداز پکار سنائی دے رہی تھی۔ رب کا بلاوا تھا اور اس بلاوے پر لپکنے والے بندے بھی اس کے مقرر کردہ ہیں ہر

کسی کو ایسی توفیق کہاں۔ زینب کے رب کی نصیحت وہ اپنے عشق مجاز کے گے پھر بھول گئی تھی۔

عشق اگر انسان سے ہو تو سوائے بربادی و ذلت نارسائی کے کچھ نہیں۔ ہاں رب سے ہونے والے عشق میں دونوں جہاں کی کامیابی و کامرانی ہے۔ پتا نہیں فاطمہ کا شمار ان خوش بخت لوگوں میں ہوتا بھی تھا یا نہیں جو عشق مجاز سے ہی عشق حقیقی کے مرتبے کو پاتے ہیں۔

”تمہیں جو بھی لینا ہے لے لو میری طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ یہاں سے اس سوچ کے ساتھ چلی جاؤ کہ تمہیں لوٹ کر پھر اس گھر میں نہیں آنا۔ شادی جیسے بندھن میں، میں جبر اور زبردستی کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے اگر آپ کی ناپسندیدگی کا علم پہلے ہو جاتا تو نوبت یقیناً ان ناگوار حالات تک نہ پہنچ پائی۔ لیکن ابھی بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی چند دن کے بعد آپ کو ڈائریوس سپر موصول ہو جائیں گے۔“ جس بل فراز نے دوبارہ اپنے بیڈروم میں قدم رکھا کھلی کھڑکی کے رستے سورج کی روشنی بڑے سبک انداز میں کمرے میں در آئی تھی۔

اریبہ آج خاص طور پر تاخیر سے اٹھی تھی مقصد فراز سمیت تمام افراد پر اپنی ہٹ دھرمی واضح کرنا ہی تھا۔ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے کھلے رکھی بالوں میں انگلیاں پھیرتی وہ اپنی رات کی کارکردگی کو ذہن میں از سر نو تازہ کرتی خود کو داد دینے میں مصروف تھی۔

”تمہارے والدین آئیں تو یہ تمہارا مسئلہ ہے تم انہیں کس انداز میں یہ سب بتانا پسند کرو گی۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ آج کے بعد مجھے تمہاری شکل اس گھر میں نظر نہیں آنی چاہیے۔“ فراز نے اس سے نگاہ چار کرنے کی زحمت گوارا کیے بغیر کہا اور آگے بڑھ کر الماری کھول کر کھڑا ہو گیا۔ اریبہ بدحواس بیٹھی تھی۔ دل جیسے دھڑکنا بھولنے لگا

اوسان خطا ہی نہیں ہوئے حلق بھی خشک ہو کر رننے کے قریب جا پہنچا۔

ایک مشرقی لڑکی ہونے کے ناتے اس صورت حال



سے نبرد آزما ہونے کے بعد کی ذلت و سبکی کا ایک چھوٹا سا تصور بھی قدموں تلے سے زمین سرکانے کو کافی تھی۔ وہ ہٹ دھرم اور خود پسند ضرور تھی۔ ہمیشہ غصے میں الٹا سیدھا بول دینے کے بعد سوچنے والی۔ آج سے قبل معاملہ اس حد تک بگڑا نہیں تھا کہ وہ والدین کے گھر پر بھی۔ سارے ناز و خیر انہوں نے ہنس کر اٹھائے تھے مگر اب سامنے کھڑا اجنبی شخص اس کا شوہر تھا۔

ایسا شوہر جس سے تعلق استوار ہوئے محض چند گھنٹے گزرے تھے۔ وہ اس کی مزاج آشنا تھی نہ ہی عاقبتوں سے واقف غصہ اور نفی میں منہ سے نکالے الفاظ تو اب صحیح طور پر یاد بھی نہ تھے مگر ان کی سنگینی ضرور پھانس بن کر انکدہ ہی تھی۔ ”یہ حق مہر کی رقم ہے چونکہ طلاق میں اپنی مرضی سے دے رہا ہوں تو اس پر تمہارا حق ہے۔“ وہ پلٹا تو اس کے ہاتھوں میں نیلے نوٹوں کی بڑی گڈی تھی۔ جو اس نے بیڈ پر اچھال دی تھی اور پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ اریہ شکستہ زدہ سی بیٹھی رہی۔



”ہاتھ ٹوٹے ہوئے ہیں اچھی طرح نہیں کر سکتیں مساج؟“ وہ پھنکارا اور امامہ کی جان بڑھاہوتی چلی گئی۔ ”ک..... کیا ہوا تھا یہاں؟“ اس نے ہکا کر کہتے ہوئے وقاص کے گھٹنے سے ذرا اوپر لگے گہرے کٹ کو خوفزدہ نظروں سے دیکھا تو جواب میں وقاص کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا اور نہایت جارحانہ انداز میں امامہ کے بال مٹھی میں جکڑ کر جھکادیتے ہوئے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

”جس نے بھی یہ گھاؤ دیا ہے نا امامہ بیگم یاد رکھنا اس کے جسم کے اتنے ٹکڑے کروں گا کہ تم گھٹنے سے بھی قاصر رہو گی۔ عبرت کا نشان بناؤ الاول گا۔“ وہ غرار ہاتھ امامہ تھرا کر اسے سکتنے لگی۔

”ک..... کون ہے وہ؟“ اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ وقاص تنفر بھرے انداز میں ہنسا پھر حقارت زدہ انداز میں اسے پیچھے دھکیل ڈالا اور خود تکیے سے ٹیک لگاتے سگریٹ

سلا کر جیسے کسی تصور میں گم ہو گیا۔

”ہے کوئی چاندنی کی طرح روشن ٹھنڈی اور اجلی مگر مزاج میں بادلوں کی سی گھن گرج رکتی ہے بجلی کی طرح چمکتی ہے تو آنکھیں چندھیا نے لگتی ہیں اسے نمایاں ہونے کا بہت شوق ہے۔ منفرد سمجھتی ہے خود کو اور وقاص حیدر ہمیشہ منفرد اور ناقابل رسائی چیزوں کو ہی اپنی جھولی میں گراتا ہے۔ ہاتھوں سے مسل کر انہیں بے رنگ کرتا ہے۔ پھر پیروں کی ٹھوکروں میں روتا ہے اس کا غور بھی لمبا میٹ نہ کیا تو نام بدل دیتا۔“

”وقاص سائیں آپ کو بڑے صاحب نے یاد کیا ہے؟“ ملازمہ کی آواز پر وقاص نے بری طرح چونک کر ناگواریت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”سنو کوئی ضرورت نہیں ہے اس چوٹ کے متعلق کسی سے بھی کچھ بکواس کرنے کی سمجھیں۔“ اس نے جاتے جاتے مڑ کر امامہ کو تنبیہی نظروں سے گھورا۔ امامہ خائف سی ہو گئی جیسی فی الفور گردن کو اثبات میں ہلا کر اس کی تسلی کر دی۔ وہ کم صوم وقاص کو کمرے سے نکل کر جاتے دیکھتی رہی۔ پھر کچھ خیال آنے پر اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور سیل فون اٹھائے واش روم میں آ گئی۔ لاریب کے نمبر سے جواب نہ ملنے پر اس نے کانپتی انگلیوں سے سکندر کا نمبر ملا یا۔

”سکندر بھائی پلیز میری بجو سے بات کرادیں۔“ رابطہ بحال ہوتے ہی امامہ نے عجلت انداز میں کہا تھا۔

”میں تو گھر سے باہر ہوں۔ لاریب بی بی سے شام میں بات کرادوں گا یا پھر آپ ان کے نمبر پر کال کر لیں میں ان کا نمبر سینڈ کرتا ہوں آپ کو۔“ سکندر کے کہنے پر اس نے رابطہ منقطع کیا اور بے چینی سے موبائل کی اسکرین کو گھورنے لگی۔ محض چند لمحے توقف سے سیل فون کی اسکرین سکندر کے نام کے پیغام سے چمکی۔ جس میں لاریب کا نمبر موجود تھا۔

”اسلام علیکم بجو ٹھیک ہیں آپ میں امامہ۔“ لاریب کی تھکی ماندی افسردہ آواز سن کر امامہ نے رقت آمیزی کے عالم میں کہا۔ دوسری جانب یکھنت سناٹا چھا گیا۔ جیسی وہ

تھہرا کر بے اختیار پکاری تھی۔

”بجو..... بجو.....!“

”کیوں فون کیا ہے امامہ؟“ لاریب کی سرد آواز نے امامہ کو منجمد کر ڈالا۔

”آپ..... آپ کیسی ہیں اور مجھ سے خفا کیوں ہیں؟“ امامہ سب کچھ بھلائے رونے کو تیار تھی۔ دوسری جانب لاریب نے سختی سے ہونٹ بھینچے تھے۔

”کیا اب تم بھی مجھے پریشان کرو گی امامہ؟ تمہارے خیال میں باقیوں نے کوئی کسر چھوڑی ہے؟“ امامہ کی چمکتی سسکیوں کو سنتی وہ کریناک انداز میں کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

”جو جیسے ہوا بجو اسے قبول کر لینے میں کیا حرج ہے؟“ سکندر بھائی تو ہر لحاظ سے سائڈل انسان ہیں آپ کو کیا پتا بجو سمجھوتہ کیا ہے اذیت کیسا احساس ہے یہ کیفیات تو میں نے سہی اور محسوس کی ہیں وقاص حیدر کے سنگ اس کی چری قربتوں میں۔ ”وہ یونہی گھٹ گھٹ کر روتی کہہ رہی تھی۔ گویا اسے خوش بختی کا یقین سوچ رہی تھی۔ لاریب کے ہونٹوں پر در ماندگی سے بھری مسکان بکھری۔

”کیا وقاص آپ کے ہاں آئے تھے بجو مجھے بہت ڈر لگتا ہے یہ سوچ کر کہ جب انہیں پتا.....!“

”اسے پتا چل چکا ہے کچھ نہیں بگاڑ سکتا وہ میرا۔ تم بھی فکر کرنا اور ڈرنا چھوڑ دو۔“ لاریب کا انداز مخصوص تھا۔

”کیا کہا آپ نے..... وہ..... وہ.....؟“ ”ان معمولی اور فضول باتوں پر کڑھنا اور گھبرانا چھوڑ دو امامہ سب ٹھیک ہے ایک بات اور ہو سکے تو آ کر ایک بار بابا جان سے مل جاؤ طبیعت ٹھیک نہیں ہے آج کل ان کی۔“ ”کیا ہوا بابا جان کو بجو؟“ اس کی توقع سے کہیں زیادہ امامہ کی گھبراہٹ کا عالم ہی اور تھا۔

”پتا نہیں سکندر نے سرسری ذکر کیا تھا۔“ اس بار لاریب نے دانستہ لہجے کو بے نیاز کر لیا۔ امامہ کی سسکیوں میں شدت آنے لگی۔

”میں کسی طرح بھی آ جاؤں گی بجو وعدہ کریں آپ بھی آئیں گی اس بہانے آپ کو دیکھ لوں گی۔“ امامہ کے لہجے

نادان لڑکی

نہر کے کنارے بیٹھی ہے ایک لڑکی آنکھوں میں کا جل لگائے

ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے

جو چھوڑ کے آئی ہے اپنا گھربار

کر کے ماں باپ کی عزت کو تار تار

اپنی جنت کو چھوڑ کے آئی تھی جس کے سنگ

اس نے دیئے بھی تو فقط کچھ لکھوں کے رنگ

نہیں تھی کی جس نے پروا بے مول چاہتوں کی

اپنے گھر میں ملنے والی بے شمار راحتوں کی

گھربار سے ناتا توڑا تھا جس شخص کے لیے

اس نے تھا ماہاتھ تو وہ بھی فقط اپنے مطلب کے لیے

بٹھایا اسے نہر کے کنارے اور کہا میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں

حقیقت بتا کے ماں باپ کو کہیں ساتھ میں لے جاتا ہوں

نادان لڑکی بیٹھی کر رہی ہے اس کا انتظار

آنکھوں کا کا جل پھیل رہا ہے لگاتار

اپنی جنت کو چھوڑا تو خوابوں کے ہاتھوں دھوکا کھایا

اب سوچ رہی ہے وہ تنہا کہ کیا کھویا اور کیا پایا

اس کے پاس رہی نہ کوئی منزل کیسا رہا یہ سفر اس کا

اب کسی کو وہ کیا منہ دکھائی آخرو دنیا ہی تھا مقدر اس کا

ناصرہ جلال..... گجرات

میں اتنی لجاجت اتنی بے بسی بھی کہ لاریب فوری انکار نہیں کر سکی جیسی ٹال دیا۔

”ہاں کوشش کروں گی۔“ اس کے بعد اس نے امامہ سے بھی زیادہ بات نہیں کی امامہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔



”آپ نے بلایا بابا جان؟“ وقاص نے ہزار کوشش کی تھی چال کی لنگراہٹ کو ان کی نظروں میں آنے سے بچالے۔ یہ زخم بھر جانے کے باوجود بھی جیسے نہیں بھر رہا تھا۔ جتنی گہرائی کا زخم تھا وقاص کے اندر اتنی ہی نفرت اور تمللاہٹ بھر رہا تھا۔ وہ چل رہا تھا اس وقت کی خواہش میں جب وہ مکمل طور پر اس کی گرفت میں ہوتی۔ پرکٹی بے



بس لاچار چڑیا کے مانند پھر وہ ہمیشہ یاد رکھے گی کسی سے دشمنی کیسے لی جاتی ہے۔  
 ”خیریت بابا جان؟“ انہیں اپنی طرف متوجہ پا کر وہ قدرے سنبھلا اور زبردستی مسکراتے کی کوشش کی۔

”میں نے تمہیں سمجھایا بھی تھا وقاص کہ لاریب کا چھپا چھوڑ دو مگر تم.....!“ غصے کی زیادتی کے باعث انہوں نے بات ادھوری چھوڑی اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔  
 وقاص کے اعصاب کو صحیح معنوں میں شدید دھچکا لگا تھا۔ اس نے چونک کر انہیں دیکھا اور صورت حال کی گیمبھرتا کا اندازہ کرنا چاہا۔

”آخر ضرورت کیا ہے پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی۔ میں ایک بیٹا کھوپکا ہوں وقاص تمہاری جانب سے معمولی نقصان کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ تم سمجھتے کیوں نہیں؟“ ان کے غصے کے بلند ہوتے گراف کا اندازہ وقاص ان کے تیز غصیلے انداز سے لگا سکتا تھا۔

”دو ٹکے کا معمولی آدمی اس قابل نہیں ہو سکتا بابا سائیں کہ ہماری لڑکی.....!“

”یہیں ٹھہر جاؤ وقاص حیدر..... وہ لڑکی اب ہماری نہیں ہے سمجھے؟“ انگلی اٹھا کر انہوں نے بے حد سختی سے ٹوک کر غرانے کے انداز میں کہا وقاص سخت جربز ہوا۔

”مت بھولیں بابا جان کہ وہ عباس کی منگیتر.....!“

”یہ رشتہ ہماری جانب سے ختم ہوا تھا وہ لوگ پابند نہیں تھے کہ ساری عمر اپنی لڑکی کو بٹھا کر رکھتے۔“ بابا جان نے پھر اس کی بات کاٹی۔ برہم ترین لہجہ شدید اشتعال کا غماز تھا۔  
 وقاص کو اور غصہ آیا۔

”مگر ایک رشتہ ان کی جانب سے بھی توڑا گیا تھا اور.....!“

”اس کا ازالہ وہ لوگ کر چکے ایمان کی بہن اس وقت تمہارے نکاح میں ہے معاملہ ختم ہوا۔“ بابا جان کا لہجہ و انداز ہنوز تھا۔ وہ جیسے طے کر کے بیٹھے تھے کہ اس کے پاس نفرت کا کوئی جواز نہیں چھوڑنا۔ وقاص بری طرح سے لا جواب اور زچ ہوا۔

”آج کے بعد مجھے پتا نہیں چلنا چاہیے وقاص کہ تم نے کوئی مزید فضول حرکت کی ہے۔“ ان کے انداز میں سنگین دھمکی پوشیدہ تھی وہ ایسے شیر کی مانند نظر آ رہے تھے جو بوڑھا ہو جانے کے باوجود بھی جنگل میں اپنی طاقت و برتری کے باعث حکمرانی کے درجے پر فائز رہتا ہے۔

”اب جاؤ مجھے اور کچھ نہیں کہنا تم سے۔“ ان کے ہاتھ کے اشارے پر وقاص دانت بھینچے اٹھ کر واپس آیا تو اس کے قہر سامان تاثرات پر نگاہ ڈالتے ہی امامہ کا دل خوف کی شدتوں سے بند ہونے لگا تھا۔

”تمہاری اس سگی نے اپنے اس کچھ لگتے پر ہونے والے ظلم کی داستان کو اگر بڑھا چڑھا کر باپ کے سامنے پیش کیا تھا تو اپنا کارنامہ بھی ضرور بتا دیتی۔“ اس کا ہاتھ بے دریغ امامہ پر اٹھ رہا تھا۔ امامہ کے حلق سے کھٹی کھٹی چیخیں نکلتی چلی گئیں۔

”بتا دینا اسے میں اسے ایسے چھوڑنے والا تو نہیں ہوں میں بابا جان سے بھی نہیں ڈرتا سنا تم نے؟“ اس کے منہ پر مسلسل پھٹر برساتے ہوئے وقاص کے لہجے میں اڑدھے کی پھنکار اور بادلوں کی سی گھن گرج تھی۔ امامہ کا سہما ہوا دل ان دھمکیوں پر خوف کی اتھاہ گہرائی میں اترتا جا رہا تھا۔



اگر وہ میری آنکھوں میں مجسمہ دیکھ لے خود کو مجھے پورا یقین ہے کہ اسے میری محبت سے بلا کا عشق ہو جائے

اس نے گہرا مکش لے کر دھواں بکھیرا اور دھواں بکھیرتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر کھلا درجہ بند کر دیا۔ میر دیکھ کی چادر میں لپٹا چاند بھی نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا بھی دروازے پر کھٹکا ہوا اور لاریب چہرے پر اکتاہٹ و غفلت کے تاثرات سجائے اندر داخل ہوئی نظر آئی۔

”تمہیں ضرورت کیا تھی آخرا امامہ کو میرا نمبر دینے کی؟ اس طرح اگر تم سمجھتے ہو کہ مجھے میرے رشتوں کے حوالے

سے بے بس کر دو گے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔“ لاریب نے طیش میں کہتے اور مچی ہوئی اور منج اور میرون شمال اتار کر پھینکی جو منج سے گزر کر آتے ہوئے بارش کی بو چھاڑ کے باعث بھبھک چکی تھی۔

”سوئیٹر ہی پہن لیا کریں۔ یہ جاتی ہوئی سردی خاصی خطرناک ہوئی ہے۔ فلو اور بخار تو جیسے تعاقب میں رہتے ہیں۔“ وہ الماری سے اس کا سویٹر نکال کر اس کی جانب بڑھا چکا تھا۔ لاریب نے گردن موڑ کر سلگتی نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر سویٹر طیش کے عالم میں دور پھینک دیا۔

”ان تھوڑے کلاس حرکتوں سے تمہارا مقصد اگر مجھے اپنی جانب مائل کرنا ہے تو کوئی فائدہ نہیں ہے..... اوکے“ اور پلٹ کر آتش دان کے قریب جا بیٹھی۔ آنکھوں میں اترتی نمی کو وہ سکندر کی نظروں سے بچانا چاہتی تھی۔ سکندر نے بارے ہوئے انداز میں اسے دیکھا اور بے بسی سے ہونٹ کاٹ لیے۔

”میرا ایسا کوئی مقصد نہیں ہے آپ پریشان نہ ہوں امامہ بی بی نے خود آپ کا نمبر مانگا تو.....!“

”اسے الہام ہوا تھا کہ میرے پاس فون ہے؟“ اس کی تلخ آواز سکندر کی مدہم واز کو دبا کر رکھ گئی۔ سکندر لا جواب ہوا تھا۔  
 ”تم جانتے ہو میں اب کسی سے بھی کوئی تعلق کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتی۔“ وہ پھر چیخنی سکندر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ لمحے ان کے درمیان بنا آہٹ کے سرکتے رہے۔ وہ اس کے سامنے گیلی لکڑی کی مانند سلگ رہی تھی۔ کھل رہی تھی ختم ہو رہی تھی اور وہ بے بس تھا۔

اس کے نزدیک ہمیشہ اپنی خوشی سے بڑھ کر لاریب کی خوشی کی اہمیت رہی تھی۔ وہ اپنے خون کا آخری قطرہ بھی اس پر نچھاور کرتے شانت رہ لیتا۔ مگر بے بسی یہ تھی کہ وہ اس کے لیے اس کی خوشی کے لیے کچھ کرنے سے قاصر رہا تھا کہ یہ اس کی اوقات سے بہت بڑھ کے بات تھی۔ اپنی اپنی جگہ دونوں بے بس تھے۔



وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے ساکن بیٹھی تھی آنکھوں

سے آنسو قطرہ قطرہ تسلسل سے بہہ رہے تھے۔ ٹھکست کا سلسلہ ایک بار شروع ہوا تو پھر رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس روز عباس کسی طرح بھی حواسوں میں نہیں تھا جیسی تو اسے چند لمحے دان کر دیے تھے۔ جنہوں نے فاطمہ کے تاریک اور بے جان وجود کو جیسے سر تاپا اجال دیا تھا۔ وہ واقعہ جو اس کے ذہن کی تمام رگوں پر ان مٹ نقوش ثبت کر گیا تھا۔ ہجر سے لے کر وصل اور ذلت و سبکی سب کچھ تو تھا ان چند لمحوں کی کہانی میں۔

نجر کی اذان کے بعد ہی اس نے واپسی کا قصد کیا تھا۔ اسے خیال تھا وہ کتنے گھٹنے باہر گزرا چکی ہے۔ خالہ بشیراں (ملازمہ) اس کے لیے پریشان ہو سکتی تھی۔ پوری رات وہ گھر سے باہر ہی تھی۔ ایک انجی غیر محرم شخص کے ساتھ جودل کا لاکھ محرم ہی روح کا تعلق جتنا بھی گہرا ہو مگر بہر حال شریعت و اسلام کی رو سے وہ اس کا نامحرم ہی تھا۔ غیر محرم جس کے متعلق کتنی گہرائی میں جا کر سمجھایا تھا اسے زہن نے تاخیر سے سہی مگر اسے یاد آ گیا تھا اور وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جب بے خبر عباس کی لانی پلکوں میں جنبش ہوئی تھی اور اس نے کراہتے ہوئے کمرٹ بدلی جا ہی تھی۔

”عباس..... آریو اوکے؟“ بے اختیاری کی کیفیت میں جھک کر اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لیتے وہ جھجک کر ختم گئی۔ ایک حتمی فیصلے کے بعد یہ بے ایمانی تھی اس رب کے ساتھ جو عورت کو محدود رہنے کا حکم دیتا تھا اس نے خود کو سمجھایا۔ وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرے گی۔ نامحرم شخص کو تو دیکھنا بھی گناہ کے زمرے میں آتا تھا چھوٹا تو اور بھی بڑا گناہ ہے۔

اس نے سارے اسباق یاد کرنے چاہے جو زہن سے اسے پڑھایا کرتی تھی۔ مگر اس سے قبل کہ وہ پیچھے ہٹی وہ ہوا جو اس نے بھی سوچا بھی نہ تھا۔

”عزیزہ.....!“ وہ بننا آنکھوں سے پکارا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ فاطمہ جو پہلے ہی اندر چھڑی جنگ سے نبرد آزما تھی طوفان کی زد پر آ گئی۔ اس کا دل اتنی زور سے دھڑک اٹھا کہ جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو بے تاب ہو وہ



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ مثالی پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور ایچے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

چاہنے کے باوجود اس سے ہاتھ نہیں چھڑا سکی اور تھم کر رہ گئی۔ اس نے عباس کو دیکھا جو مکمل ہوش میں اب بھی نہیں تھا مگر وہ اس کے سامنے ہمیشہ کی طرح اپنا آپ گنوا چکی تھی۔ رعب حسن نظر بھر کے دیکھنے نہیں دیتا تھا۔ اس وقت بھی ایسی ہی جھجک اسے جکڑنے لگی۔ مگر اس کا وجہ یہ چہرہ اتنے قریب سے دیکھنے کا تجربہ بہت سحر انگیز احساس لیے تھا۔

وہ مکمل طور پر کبل میں چھپا تھا۔ صرف ذرا ساما تھا اور ابرو دکھائی دیتے تھے۔ ابرو کے مغرور کمان اور پورے ماحول پر چھایا اس شخص کا سراپا آج اس کے لیے کڑا امتحان تھا۔ جسے چوری چوری دیکھنا اس کے لیے مسلسل خوشی اور اعزاز کا باعث تھا۔ اس کا کس کوئی انگارہ تھا جس کی آنچ روح تک آتی تھی۔ اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ فاطمہ کے سن ہوتے دماغ نے شدت سے محسوس کیا تھا۔

”عریضہ کہاں چلی گئی تھیں؟ جانتی ہو کتنا ڈھونڈا میں نے تمہیں کتنا روایا ہوں کیوں جرم نہیں آتا تمہیں مجھ پر۔“ وہ جواب بھی پہلی قیامت سے نہیں سن سکی تھی کہ عباس کی دیوانگی نے ایک اور دار کیا۔ اس کے ہاتھ پر موجود گرفت سخت ہوئی اور انگلی لیے وہ اس کے محض ایک جھٹکے کے نتیجے میں اس کے اوپر گری گئی۔

طے ہوا تھا کہ وہ حواسوں میں نہیں مگر اس نے اچھی بھلی فاطمہ کے حواس بھی سلب کر لیے۔ عباس کی ہانپوں کا تنگ ہونا حصار اور پردت پناہیں وہ حواس بحال رکھتی بھی تو کیونکر۔ دوسری جانب عباس تو تھا ہی مکمل طور پر وحشت زدہ وہ کیسے بے قراری سے سسک رہا تھا۔ آہیں سسکیاں اور والہانہ بوسے وہ فاطمہ کے چہرے کے نقوش کو چومتا تھا۔ فاطمہ گنگ اور بھونچکی تھی۔ اس کا بے تحاشا دھڑکتا دل بھی جیسے دھڑکنا بھول بیٹھا تھا۔

”وعدہ کرو عریضہ بھی نہیں جاؤ گی پھر مر جاؤں گا میں تمہارے بغیر۔“ فاطمہ نے اس کے آنسوؤں کو بہتے دیکھا۔ اس کی آنکھیں ہنوز بند تھیں۔ وہ اس کے آنسو چھنے لگی۔ اسے سب کچھ بھولنے لگا۔ ذہن کی ہر وہ بات جو نامحرم کے حوالے سے کہی گئی تھی۔ اسے یاد تھا تو عباس کا رونا، تر پنا چلنا

”نہیں..... نہیں اس سے بڑھ کر نہ آج کوئی اور خوش نصیب تھا نہ ہی کوئی اس سے بڑھ کر امیر تھا۔“

(ان شاء اللہ بآئی آئندہ ماہ)





# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

محمد حنیف کیم اداں  
اُم مریم



بے حس ہیں یہاں لوگ، بھلا سوچ کے کرنا

اس دور میں لوگوں سے وفا سوچ کے کرنا

گل شاخ سے پھڑے تو کہیں کا نہیں رہتا

تم ذات میری خود سے جدا سوچ کے کرنا

### گزشتہ قسط کا خلاصہ

رہتی ہے۔ جب ہی عباس کے جسم میں جنبش ہوتی ہے اور وہ عباس کے قریب چلی آتی ہے جبکہ وہ فاطمہ کے روپ میں عریضہ کا تصور کرتے اسے اپنے قریب کر لیتا ہے ایسے میں فاطمہ اس کے طلسمی قربت کے خمار میں زینب کے ہر سبق کو فراموش کر بیٹھتی ہے۔ فرار اپنی ضد اور محبت سے مجبور ہو کر اریبہ سے نکاح تو کر لیتا ہے لیکن اریبہ کا خفا خفا انداز اسے سہا جاتا ہے اصل حقیقت اس وقت کھلتی ہے جب وہ تا صرف کرے کی آرائش نہیں کر دیتی ہے بلکہ فرار کی ذات کی توہین کرتے انتہائی ذلت آمیز سلوک کرتی ہے۔ وہ واضح الفاظ میں فرار کی ڈارک رنگت پر نفرت کا اظہار کرتی ہے جبکہ فرار اپنی اس تحقیر پر پتھر اجاتا ہے۔ بابا جان وقاص کے اس رویے کا ذکر تایا جان سے کرتے ہیں اور وہ جب وقاص کو بلا کر اس بارے میں اس سے پوچھتے ہیں تو وہ اعتراف کر لیتا ہے اسے لاریب کا سکندر کے ساتھ رہنا منظور نہیں ہوتا اس پر بابا جان خائف ہوتے ہیں لیکن وہ ایمان والے واقعہ کو لے کر بدلے پر اتر آتا ہے اور امامہ پر اپنے غصے کی انتہا کرتے سخت مار پیٹ کرتا ہے۔ امامہ لاریب سے بات کر کے وقاص کے ارادوں سے آگاہ کرتی ہے لیکن لاریب ہر خوف سے بے نیاز اس کی بات کو اہمیت ہی نہیں دیتی۔ فرار اپنی تحقیر و ذلت برداشت نہ کرتے ہوئے اریبہ کو طلاق دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے اسی غرض سے حق مہر کی رقم اس کے سامنے پھیلتے وہ اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کرتا ہے کہ اب وہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی جائے جبکہ اریبہ فرار کے اس اقدام پر بھونچکا رہ جاتی ہے۔

لاریب سکندر کے دوستی کے بڑھائے گئے ہاتھ کو تھامنے سے انکار کر دیتی ہے اس کے اپنے ہی خدشات اسے سکندر کی طرف سے غلط فہمی میں مبتلا کیے رکھتے ہیں۔ شرجیل سمعیہ کو گھر والوں کے عتاب سے بچانے کی غرض سے ابارٹمنٹ میں لے تو آتا ہے لیکن ان کی اس طرح موجودگی دیگر لوگوں کے لیے باعث حیرت ہوتی ہے ایسے میں شرجیل ابراہیم احمد سے سختی بات کرنے اور اسے پاکستان آنے کا کہتا ہے۔ لاریب سکندر کو مجبور کرتی ہے کہ وہ وقاص کے اس قاتلانہ حملے کے بارے میں بابا جان کو بتا دے جبکہ سکندر اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ آخر لاریب کی ضد پر مجبور ہو کر وہ تمام صورتحال سے انہیں آگاہ کرتا ہے جس پر بابا جان دونوں کو حویلی میں رہنے کا مشورہ دیتے ہیں جبکہ لاریب یہ سن کر شدید مشتعل ہو جاتی ہے اور سکندر پر بھی الزام عائد کرتی ہے کہ اس بہانے وہ بابا جان کی حویلی اور جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ بابا جان سمجھانے کی غرض سے لاریب کے گھر آتے ہیں لیکن وہ انہیں بھی مایوس ہی لواتی ہے۔ عباس کا تحقیر آمیز رویہ فاطمہ کی برداشت سے باہر ہوتا ہے وہ اس کی بے اعتنائی کا دکھ بہنے میں ناکام رہتی ہے ایسے میں زینب اسے صبر و ہمت کا درس دیتی ہے وہ اسے باقاعدہ نماز و قرآن سکھاتی اور دین کی طرف راغب کرنا چاہتی ہے تاکہ وہ اس عشق مجازی سے باہر آئے لیکن روڈ پر عباس کا ایکسیڈنٹ ہوتے دیکھ کر وہ اپنے ہوش و حواس پھر کھوئے لگتی ہے۔ فاطمہ عباس کو بمشکل ٹیکسی میں ڈال کر گھر تک لاتی ہے اور اس کے ہوش میں آنے کی منتظر

(اب آگے پڑھیے)

عباس نے آنکھیں کھولیں اور اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے بعد جیسے کوئی طوفان آ گیا۔ عباس نے فاطمہ کو پوری قوت سے دور دھکیلا تھا انداز میں اتنی حقارت تھی کہ فاطمہ سکی سے شل ہو گئی۔

”تنت..... تم..... یہاں..... یہاں کیسے؟“ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فاطمہ کا گلا گھونٹ دے۔ فاطمہ کا رنگ فق اور جسم خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپا رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے احسان بابا کھنکھارے۔

”صاحب! فاطمہ بی بی ہی رات آپ کو یہاں لائی تھیں۔ ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا نا آپ کا اس لیے۔“ عباس نے اس وضاحت کو جیسے سنا ہی نہیں اور فاطمہ کے حواس باختہ شرمندگی سے جھکے چہرے کو کھلتی نظروں سے دیکھتے احسان بابا کو اشارے سے باہر جانے کا کہا۔

احسان بابا نے فاطمہ کی کیفیت سے اپنے اندر بھی لا چاری اترتی محسوس کی۔ جسے دیکھ کر لگتا تھا وہ ابھی بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ عباس نے پھر اسے دیکھا اس کا چہرہ جانے کس احساس کے تحت سرخ تھا اسے فاطمہ کی صورت سے وحشت ہونے لگی۔

”میری غفلت اور بے خبری سے فائدہ اٹھا کر میرے بیڈروم تک رسائی حاصل کرنے والی عورت نفس کی کس حد تک غلام ہو سکتی ہے میں سمجھ سکتا ہوں۔ تم جیسی لاتعداد عورتیں ہیں جو میری وجاہت و خوبی کی خیرات سے اپنی جھولی بھرنے کو تیار رہتی ہیں۔ مگر میں مہن کھاتا ہوں تم جیسی فاحشہ عورت سے، چلی جاؤ یہاں سے اور آئندہ کبھی مجھے اپنی شکل بھی مت دکھانا۔“ اس کے لہجے میں اجنبیت اور کئی کا زہر اٹھا یا تھا۔

فاطمہ کو زینب کی ایک بات یاد آئی۔ اس کا دل زینب کے رب کے ایک حکم پر ہٹا ہو کر زخمی ہوتا چلا گیا۔ وہ گرنے کے انداز میں بستر پر بیٹھ کر گہرے سانس لینے لگی۔ نفرت کے زہریلے جملوں نے اسے نیم جاں

کر دیا تھا۔ اس نے چاہا وہ اپنی صفائی دے مگر اس لمحے تمام لفظوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کے چہرے پر احساس توہین کا واضح تاثر تھا آنکھوں سے خون پھیلنے لگا اسے لگا کوئی اسے کند چھری سے سزج کر رہا ہو۔

”یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔“ وہ چیخا اور رخ پھیر کر یوں بیٹھ گیا جیسے اس کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہ ہو۔

فاطمہ کی جان جیسے عذاب سے دوچار ہو گئی تھی۔ معافی کی خواستگار ہونے کے باوجود جیسے معافی کا اذن نہیں تھا۔ اسے لگا زندگی کی بساط پر آج صبح معنوں میں وہ ہار چکی ہے۔

”السلام علیکم! اس نے جھکے سر کے ساتھ اس ٹھہری ہوئی مگر تحمل آواز کو سنا تھا۔

”وعلیکم السلام! ابراہیم حیدر شکر ہے تم آگئے۔“ شرجیل نے والہانہ انداز میں اسے گلے لگایا۔

”مجھے شرمندگی ہے شرجیل احمد کہ میری وجہ سے آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ دراصل بہت اہم کام تھے ہمیں ترکی بھی جانا تھا۔ وہاں سالانہ اجلاس ہوتا ہے دنیا بھر سے اسکالرز جمع ہوتے ہیں۔ دین کے متعلق بہت گہرائی سے جاننے کا موقع بھی میسر آتا ہے، خیر آپ بتاؤ کیا مسئلہ تھا آپ مجھے پریشان لگتے ہیں۔“ اسی اپنائیت بھرے ٹہرے ہوئے انداز میں وہ بات کر رہا تھا۔

”آؤ گھر چلتے ہیں، پہلے کھانا پھر آرام اس کے بعد بات کریں گے۔“ شرجیل نے کہنے کے ساتھ ہی کرسی دھکیل کر اٹھنا چاہا تھا کہ ابراہیم احمد نے اس کی ٹکائی تھام لی۔

”تکلفات میں کیوں پڑتے ہو دوست، بے فکر ہو جاؤ نہ میں تمہارا ہوا ہوں اور نہ ہی بھوک میں مبتلا۔ البتہ تمہیں سننے کو بے تاب ضرور ہوں۔“ ابراہیم احمد کا انداز مخصوص نرمی بھرا تھا۔ گویا وہ بتا کہ اس کے تذبذب کو بھی پا گیا تھا۔ شرجیل اس کی فہم فراست سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

”یہ بات کہنا ہرگز آسان نہیں ہے، یوں سمجھ لو میں نے بہت مجبور ہو کر تم سے..... میرے پاس اس کے سوا کوئی



راستہ بھی نہیں ہے۔“ ابراہیم احمد کی گہری زیرک نظریں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔

”اس یقین کے ساتھ کہو شرجیل احمد کہ تمہارا ہر راز اس سینے میں دفن رہے گا اور اللہ رب العزت نے جتنی مجھے طاقت اور اختیار عطا فرمایا ہے اتنی مدد میں تمہاری ضرورتوں کا۔“ ابراہیم احمد کے انداز میں اپنائیت تھی۔ شرجیل کا گریہ کچھ حد تک کم ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔

”میں نے آپ کو کبھی اپنے بارے میں نہیں بتایا ڈاکٹر ابراہیم احمد مگر آج بتانا چاہوں گا میرا پورا نام محمد شرجیل علوی ہے اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد ہونے کے باطنے مجھ پر کچھ ذمہ داریاں تھیں مگر میں انہیں نبھانے کا مجھے اسٹوڈنٹ لائف میں ہی ایمان سے محبت ہو گئی اور.....!“ اس نے اپنی زندگی کا ہر روپ اس کے آگے رکھ دیا بے بسی اور دکھ اس کے انداز سے چھلک رہا تھا۔

”میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا ابراہیم احمد کہ میں اس بے گناہ معصوم لڑکی کو اس صعوبت خانہ سے نکال لاتا۔ سمیعہ ہر لحاظ سے پارسا اور پاک دامن ہے ڈاکٹر ابراہیم مگر وہ لوگ پھر بھی اسے سزا دینا چاہتے تھے۔ یعنی میری وجہ سے ایک اور لڑکی برباد ہونے جا رہی تھی۔ میں کیسے جانتے بوجھتے ایک اور ایمان کو حالات کے بے رحم پنجوں میں چھوڑ دیتا، تم بتاؤ صحیح کیا میں نے؟“ شرجیل نے اپنی مضطرب سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔

ابراہیم نے سوچ خیالوں میں گم رہا۔

”ابراہیم احمد سمیعہ کو یہاں لانے کے بعد مجھے لگتا ہے میں اسے مسائل سے نکالنے سے قاصر رہا ہوں۔ ہم جس معاشرے کا حصہ ہیں وہاں اس قسم کے رشتوں کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ سمیعہ جذباتی فیصلے کا شکار ہو کر بھی خوش نہیں ہے۔ ابراہیم وہ شاکی ہے مجھ سے جبکہ اللہ گواہ ہے میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔“ ابراہیم احمد نے ہنکارا بھرا پھر گویا ہوا تو لہجے میں سختی نہیں تھی۔

”اللہ تعالیٰ نے کچھ حدود اسی لیے مقرر کی ہیں آپ لاکھ انہیں بہن سمجھیں یا کہیں بہر حال وہ آپ کی بہن نہیں

ہیں۔“ شرجیل کا سر جھک گیا وہ متاسف ہوا تھا۔

”میں جانتا ہوں ابراہیم احمد، اسی لیے تو آپ سے رابطہ کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں میں کیا چاہتا ہوں آپ سے؟“ شرجیل احمد کے کہنے پر ابراہیم ٹھٹھک گیا۔

”پلیز آپ سمعیہ سے نکاح کر لیں۔ میرے پاس اس مسئلے کا اس کے علاوہ کوئی حل نہیں، میں سمعیہ کا ہاتھ کسی ایرے غیرے کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتا۔“ وہ اتنی لجاجت اور کچھ ایسے مان سے کہہ رہا تھا کہ ابراہیم یکدم ساکن و ساکت رہ گیا۔

”اصل مسئلہ تو تمہارے بیٹے کا ہے نا شرجیل احمد تو میرے خیال میں تم خود.....!“

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، بچہ سمعیہ کے پاس ہی رہے گا میں کہاں سنبھال سکوں گا اسے۔“ شرجیل نے غلٹ میں اس کی بات کاٹ دی۔ ابراہیم احمد کے پاس جیسے انکار کا جواز نہیں رہا۔

”سمعیہ بہت پیاری لڑکی ہے ابراہیم احمد، سکھڑ اور ٹیک اسے اپنا کر آپ کو روحانی مسرت ملے گی۔“ شرجیل کے لہجے میں بڑے بھائی کی سی محبت و جوش تھا ابراہیم نے محض مسکراتے پر اکتفا کیا یہ طے تھا کہ وہ اس اچھے اور مخلص انسان کو مایوس اور بد دل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ یہ حقیقت تھی کہ فی الحال اس نے شادی کے متعلق دور دور تک نہیں سوچا تھا مگر یہ بھی سچ ہے کہ وہ اپنی پلاننگ پر نہیں اللہ کی پلاننگ پر ایمان رکھتا تھا۔ جن مقاصد کے تحت وہ پاکستان آیا تھا اسے یقین تھا ایک دن اللہ انہیں بھی پایہ تکمیل تک پہنچا دے گا۔

یہ کیا کھیل کھیل رہے ہو تم لڑکے، ہنسا ہنسا کر رکھ دیا تم نے سب کو، یہ سب تمہارا اپنا کیا دھرا ہے سمجھے۔ بند کرو یہ ٹانگ اور جا کر اسے لے کر آؤ۔“ فراز نے انہی کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ تاؤ جی جلال میں آکر اس پر چڑھ دوڑے۔ یہ ان کی گونج وارا آواز کا ہی کرشمہ تھا کہ سب

اپنے اپنے کمروں سے نکل کر اس کی گوشلی کا براہ راست نظارہ کرنے آ گئے۔ فراز نے ان سنی کی اور اپنے کمرے میں جانا چاہا تھا کہ پاپا طیش میں اٹھ کر اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔

”فراز..... تم نے سنا نہیں بھائی جان کیا کہہ رہے ہیں۔“ ان کے انداز میں بے حد برہمی تھی۔ آنکھیں یوں سلگ رہی تھیں جیسے غصہ ضبط کرنے میں بے حال ہوں۔ فراز نے پرسکون نظروں سے انہیں دیکھا پھر سرد آواز میں بولا۔

”آپ یہی سمجھ لیں کہ اس معاملے میں میرے کان اور آنکھیں بند ہیں۔ میں اسے لینے نہیں جا رہا کیونکہ میں اسے طلاق دے رہا ہوں۔“ الفاظ تھے یا بارود کے گولے جس نے ہر سوجا ہی عیادی تھی۔ ہر فرد کا رد عمل بے حد مختلف تھا مگر تاؤ جی تو جیسے گرم توے پر جا چڑھے تھے۔

”کیا بکواس کر رہے ہو، دماغ درست ہے تمہارا؟“ انہوں نے غصے سے کہتے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

”تمیز سے بات کریں تاؤ جی، عزت صرف بڑوں کی ہی نہیں ہوتی اور طلاق و ریتا بند یا میرا ذاتی معاملہ ہے میں اپنے کسی عمل پر آپ کے آگے جواب دہ نہیں ہوں، سمجھے۔“ حقارت بھرا سرد انداز کسی کے بھی چھکے چھڑانے کو کافی تھا۔ وہ سب کو ششدر چھوڑ کر مضبوط قدم اٹھاتا وہاں سے چلا گیا۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے معمول کے کام نمٹائے اور سونے کے ارادے سے بستر پر لیٹ گیا۔

”تم میری سنگین غلطی تھیں اریبہ شاہ، مگر میں اپنی غلطی کو سدھارنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔“ نیند میں جانے سے قبل وہ یہی سوچتا رہا تھا۔

”آخرا یہاں ہوا کیا ہے فراز بیٹے کتاب اریبہ سے ایک ہی رات میں اتنے متغیر ہو گئے ہو۔ کچھ تو بتاؤ نا ہمیں؟“ اگلی صبح ملانے اسے گھیرنا چاہا تھا۔ وہ جانتا تھا سب کے ساتھ مما بھی اس بات کی خواہش مند ہیں کہ وہ اریبہ کو لے آئے۔ انہیں بھی اس سے زیادہ دنیا کی فکر تھی۔ وہ لوگوں کے طعنوں سے خائف تھیں۔ انہیں لوگوں کے سوالوں

سے ڈر لگتا تھا۔ مگر فراز نے یہ سارے جھنجٹ نہیں پال رکھے تھے۔

”تم ایسے تو نہیں تھے فراز تاؤ خرم ہو کیا گیا ہے تمہیں؟“ می کے روہا سی لہجے پر فراز نے عاجزانہ نظروں سے انہیں دیکھا پھر جھنجلا گیا۔

”می پلیز، مجھے فورس مت کریں میں کس کرب سے گزر رہا ہوں آپ کو اندازہ نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں کچھ ایسی وحشت اور افسانہ رقم تھی کہ می نے اس کے لیے چوڑے سوجو کو اپنے بازوؤں میں بھرنے کی کوشش کی۔

”تم کیا سمجھتے ہو میں پریشان نہیں ہوں ایک بیٹا چھوڑ کر چلا گیا دوسرا ٹوٹا ہوا نظر آ رہا ہے۔“ فراز ہونٹ بھینچے سرخ آنکھیں لیے کھڑا رہا۔

(میں کیا بتاؤں می کیا ہوا؟ آپ نے کبھی کسی کو اپنا پردہ ہٹا کر اپنی خامیاں آشکار کرتے دیکھا ہے میں کیسے خود کو عیاں کر لوں، وہ سب جو اس کی زبان سے سنا اس دن سے کٹ کٹ کر مر رہا ہوں۔ ذلت کا یہ کیسا احساس ہے جسے میں دوبارہ سوچنے کا تصور بھی محال سمجھتا ہوں۔ لوگ اتنے سفاک کیوں ہوتے ہیں کہ انہیں دوسروں کے جذبات و احساسات کی بھی پروا نہیں رہتی۔ اب میں خود سے اس کی باتوں کے باعث نظریں ملانے سے قاصر ہوں۔ کل اگر وہ آپ لوگوں کے سامنے زبان کھولے گی تو میں کیسے سامنا کروں گا سب کا) اس کا دل رو پڑا تھا۔

”تمہارے پیار بہت خفا ہیں بیٹا آپ کو کچھ تو خیال کرنا چاہیے۔ ایک رات کی بیا ہی دن کو طلاق..... نہیں بیٹے پلیز.....!“

”می پلیز، آپ اس معاملے میں نہیں بولیں گی اگر آپ نے مجھے فورس کیا تو میں خود کشی کر لوں گا۔“ ماما کا رنگ اڑ گیا وہ ہونٹ زردہ اسے دیکھنے لگیں۔

”اللہ کا واسطہ ہے فراز، دوبارہ منہ سے ایسی بات نہیں نکالنا، مرا جاؤں گی میں۔“ فراز نے انہیں بے ساختہ تھام لیا تو وہ اس کے سینے سے لگ کر زار و قطار رونے لگیں۔ شرجیل کی جدائی کا غم ابھی کہاں کم ہوا تھا کہ یہ آ زائش



شروع ہوگئی۔ کتنا مجبور تھا وہ، ان کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ بھی نہیں بھر سکتا تھا۔



”پریشانی بیان کرنے سے بڑھ جاتی ہے خاموش رہنے سے کم ہوتی ہے صبر کرنے سے ختم اور شکر کرنے سے خوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔“ اس کے ذہن میں کبھی کسی سے سنی بات پوری جزئیات سے روشن ہوتی تو آنکھوں کی سطح پھر سے نم ہوتی چلی گئی۔

”پتا نہیں میں صبر نہیں کر پا رہا یا شکر نہ کرنے کے باعث یہ حال ہے۔ خوشی کی خواہش تو تب ہو جب دل اس کی ضرورت محسوس کرے۔ جب ضرورت نہیں تو حاجت کیوں؟“ وہ ہونٹ کچل رہا تھا اس کا اضطراب ہر لمحہ بڑھ رہا تھا۔

”سر اسامہ بابا کو بہت سخت بخار ہے۔ دوا بھی دی ہے مگر ہوش میں نہیں آ رہے۔“ ملازمہ نے دستک دے کر اطلاع دی عباس بڑا کراٹھ گیا اور جیسے باقی سب کچھ بھول گیا۔ پھر اس کے بعد ڈاکٹر اور اسپتال کی ایک طویل اور اکتا دینے والی خواری شروع ہوگئی۔

”کیا آپ کی اپنی وائف کے ساتھ کوئی چپقلش چل رہی ہے مسٹر عباس، بچے کی یہ حالت ماں سے دوری کے باعث ہے۔“ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد دوا تجویز کرتے ہوئے جو بات کہی وہ خجربن کر عباس کے دل کو زخمی کر گئی۔ اگلے کئی ٹاپے وہ کچھ بول نہ سکا۔

”دیکھیے میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ کے درمیان جو بھی اختلافات ہیں انہیں اپنے بچے کی خاطر فراموش کر دیں۔ والدین اپنی اولاد کی خاطر بہت کچھ کر رہے ہیں یہ تو معمولی سی بات ہے۔“ اس کی مہیب چپ کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے نصیحت ضروری خیال کی تھی۔ عباس کی اورنگ لٹکھوں پر نمی پھیلنے لگی۔

”آپ کا اندازہ درست نہیں ڈاکٹر، میری سسر کا انتقال ہو چکا ہے۔“ وہ بولا تو اس کی آواز کا بوجھل پن بے حد نمایاں تھا۔ اندر کتنی ٹھنڈی دوا آئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ

اسے خود سے یہ اعتراف کرنا پڑا تھا کہ عریشہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ یہ اعتراف جتنا جاں گسل تھا اس سے بڑھ کر وحشت میں مبتلا کر دینے والا تھا۔

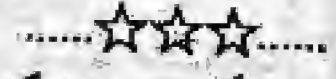
”اوہ..... بہت افسوس ہوا کب ہوا یہ سانحہ؟“ ڈاکٹر واحدہ سناٹے میں گھر گئی تھیں۔

”تقریباً تین ماہ ہو رہے ہیں۔“ عباس نے آہستگی سے کہا اس کا چہرہ ضبط کی کوشش میں بے تحاشا سرخ پڑ رہا تھا۔

”تین ماہ.....؟“ انہوں نے ٹھنک کر عباس کی شکل دیکھی۔

”نہیں مائی ایم شیوڑ وہ لڑکی تو تین چار ہفتے قبل اس بچے کو لے کر میرے پاس آئی تھی۔ غالباً فاطمہ نام ہے۔ ایک بچی بھی ساتھ تھی۔“ وہ حیران پریشان انداز میں کہہ رہی تھیں۔ ایک بار پھر عباس کو پوری شدت سے فاطمہ پر غصا آتا تھا۔ پتا نہیں وہ فضول لڑکی اس سے چاہتی کیا تھی۔ اس کا پیش سے برا حال ہو گیا۔

”میری سسر کا انتقال ہو گیا ہے وہ بچے کی گورنس ہوگی۔“ عباس نے رکھائی سے کہتے تغافل و بے نیازی کی حد کر دی۔ ڈاکٹر واحدہ اچنبھے کا شکار نظر آنے لگیں۔



”ایم سوری، اچنبھی بچے اتنے اچھڑتے تھے ان سے کہ مجھے مخالطہ ہو گیا۔ آپ کی سسر کا سن کر افسوس ہوا اللہ ان کی مغفرت فرمائے..... آمین“ عباس اسامہ کو سنبھال کر باہر نکل گیا ڈاکٹر واحدہ خفت زدہ سی مہر جھٹک رہی تھیں۔

اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر آ کر ڈرائیور کو کسی کا کرایہ ادا کیا۔ پھر گردن موڑ کر اس بلند آہنی گیٹ کی جانب دیکھا۔ شہر کے پوش علاقہ میں آئے سامنے بنے جنگلوں کی قطاریں اپنے مکیوں کی خوش ذوقی اور حیثیت کا تعین کرتی تھیں۔ کچھ دیر قبل ہی احسان بابا نے فون پر اسے اسامہ کی طبیعت کا بتایا تھا۔

”میں اس کے لیے دعا کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتی احسان بابا۔ مجھے معاف کر دیں میں بے بس ہوں۔“ جواب میں وہ رو پڑی تھی۔

”صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں اس دوران آپ آ کر اسامہ بابا کو دیکھ لیں مجھے پورا یقین ہے اسامہ بابا آپ کو دیکھ کر بہتر محسوس کرے گا۔ بن ماں کے بچے ہیں بیٹے ان کی نانی اور ماموں نے ہاتھ بچھ لیا ہے۔ میں مجبور ہوا آپ کو کہہ رہا ہوں بچے کی زندگی کو خطرہ ہے۔“ احسان بابا کی گھبراہٹ اور تشویش دیکھنے قابل تھی۔ فاطمہ نے آنسو پونچھے اور ریسیور کو دوسرے ہاتھ میں منتقل کر کے جھجک کر بولی۔

”میں تو آ جاؤں بابا لیکن عباس کو پتا چل گیا تو.....“

”کچھ نہیں کہیں گے وہ آپ کو، اسامہ بابا کی بیماری سے وہ خود بھی پریشان ہیں۔“ فاطمہ نے مزید سوچے بغیر کوچہ جاناں میں جانے کا قصد کر لیا تھا۔

”آپ آ گئیں بیٹے جاؤ میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ اس نے ابھی جولی دروازے کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ اس کے منتظر بابا کھل کر رہ گئے۔

”عباس تو نہیں ہیں نا گھر پر؟“ احسان بابا نے سر کوٹلی میں ہلا کر اسے تسلی دی اور اسے اپنے ہمراہ لیے بچوں کے کمرے میں آ گئے۔ دونوں بچے بستر پر لیٹے تھے۔ چہرے پر بے زاری کے تاثرات لیے گورنس موجود تھی۔ کمرے کے ترتیبی کا شکار تھا۔ بچوں کے حلیے بھی ابتر ہو رہے تھے۔ صاف لگتا تھا گورنس بچوں کی صحیح طور پر نہیں کر پا رہی۔ فاطمہ سے یہ سب دیکھا نہیں گیا۔ وہ ٹرپ اٹھنے کے انداز میں تیزی سے حرکت میں آئی تھی سب سے پہلے اس نے نیم غنودہ اسامہ کو اٹھا کر اس کا لباس بدلا پھر نیم گرم پانی سے بچے کے ہاتھ پیر اور منہ صاف کیا۔ اسامہ اسے پہچانتا تھا اسے رو رو پا کر اس کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ وہ اس سے ایسا چپکا کہ الگ ہونے پر آمادہ نہیں تھا۔ فاطمہ کو سارے کام سے گود میں اٹھا کر انجام دینا پڑے۔

”صاحب کو گھر سے گئے چند گھنٹے بھی نہیں گزرے کہ تم نے بچوں اور کمرے کی حالت بگاڑ کر رکھ دی آج میں لازماً تمہاری شکایت کروں گا۔“ احسان بابا فاطمہ کی مدد کرنے کے ساتھ گورنس کو بھی ڈانٹ رہے تھے۔

”کردینا شکایت، میں خود یہ کام چھوڑ رہی ہوں گورنس ضرور ہوں مگر تم لوگوں نے تو مجھے مشین سمجھ لیا۔“ گورنس بھی جیسے بھری بیٹھی تھی۔ احسان بابا کو اس کی زبان درازی ناگوار گزری۔

”بچہ بیمار ہے تمہیں یہ تو خیال کرنا چاہیے۔ اس طرح تو تم اس کی بیماری کو بڑھا رہی ہو۔ یہ کسی طور بھی اپنے کام سے دیانت داری نہیں ہے۔“

”مجھے سبق پڑھانے کے بجائے صاحب سے کہو میرا حساب کرویں نہیں کر سکتی میں یہ نوکری۔“ فاطمہ نے اسامہ کے ڈسٹرب ہونے کے باعث گھبرا کر احسان بابا کو بھی چپ کر لیا۔

”اسامہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بابا آپ انہیں باہر لے جائیں پلیز۔“ اس کے احساس دلانے پر احسان بابا سر جھٹک کر باہر نکل گئے۔ فاطمہ نے سارے دھونے والے کپڑے شب میں ڈال دیے اور یونہی اسامہ کو کاندھے سے لگائے جیسے ہی باہر آئی پہلا سامنا ہی عباس سے ہو گیا۔ جو تیز تیز قدم اٹھاتا اسی سمت آ رہا تھا۔ فاطمہ کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کے بڑے تیور دیکھتے اس کے قدم زمین سے اکھڑنے لگے۔

”احسان بابا! تمہاری کارکردگی کی بہت تعریف کر رہے ہیں۔ غالباً یہ سب کچھ تم کسی منصوبے کے تحت کر رہی ہو مقصد بتانا پسند کرو گی اپنا؟“ عباس نے فوراً ہی اس پر حملہ کیا۔ لہجہ گویا دکھتا انگارہ تھا جو چابک بن کر اس کے اعصاب پر برس رہا۔ وہ سرتاپا کلمے لگی۔

”بہت شوق ہے تمہیں بچے پالنے کا، گورنس اس کام سے اکتانگی ہے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا اگر اس کی جگہ تم لے لو۔ ہاں دو گنا معاوضہ تمہارا ضرور بنتا ہے کہ تم اس سے بہتر انجام دیتی ہو کام کو۔“ اس کے دھیمے لہجے میں بھی غضب کا قہر اور نمی پوشیدہ تھی۔

”واپس جاؤ بچوں کے کمرے میں آج سے تم اپنی سابقہ ہر حیثیت کو فراموش کر دینا۔ یہاں رہنے کے علاوہ ضروریات زندگی سے متعلق ہر شے تمہیں فراہم کی جائے



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ ٹائمہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پریم کوالٹی، ہارل کوالٹی، کمپیوٹر کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

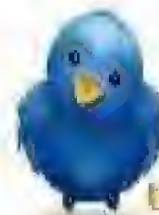
اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیگر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

گی۔ اگر یہ فریق قبول ہے تو رک جانا ورنہ میرے گھر کے آس پاس بھی کبھی نظر آئیں تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔ وہ غضبناک انداز میں کہہ کر اسی قہر سا ماں تاثرات کے ساتھ پلٹ کر چلا گیا۔ وہ ہونٹ بھیچنے اپنی بلبلائی انا کو دہرائی تھی۔

فاطمہ نے اس فرمان شامی کے مطابق واقعی اپنی سابقہ ہر حیثیت فراموش کر دی۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہ اندیا کی چند امیر ترین بزنس وومنز میں سے ایک کی اولاد ہے۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ امریکا میں اس باپ اور بھائی ایک باوقار مقام رکھتے ہیں۔ اسے صرف یہ یاد رہ گیا تھا کہ اس طرح اسے عباس حیدر کے قریب رہنے کا موقع میسر آ گیا ہے۔ وہ دن میں کئی مرتبہ بغیر کسی مشقت اور خواری کے عباس کو دیکھ لیا کرے گی۔ اب تک ہجر و فراق کی کٹھنایاں عبور کرتے اسے لگا پہلی مرتبہ اس کے قدم منزل کی طرف جانے والے راستے پر پڑے ہیں۔ وہ خوش ہونا چاہتی تھی اس کا یہ لامتناہی سفر رازِ بگاں نہیں گیا تھا۔ یہ دل کا فیصلہ تھا۔ یہی دل اسے تھک کر تسلی دیتا تھا۔

وعدہ وصل کی امید کے بر آنے تک ہم تیرے ہجر سے ہجرت نہیں کرنے والے

.....

پھر یوں ہوا کہ ساتھ تیرا چھوڑنا پڑا ثابت ہوا کہ لازم و ملزوم کچھ نہیں اس نے سرد آہ بھر کر نیلے آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھا شام ہونے پر پرندے واپس اپنے ٹھکانوں کی سمت عازم پرواز تھے۔ پرندوں کی اس اڑان میں بھی ایک خاص ترتیب تھی۔ اس نے نگاہ کا زاویہ بدل کر کما دکی فصل کو دیکھا جو بالکل تیار حالت میں کھڑی تھی۔ غروب ہوتے سورج کی آخری کمزور شعاعیں ان تک پہنچ کر ماحول کے اداس پن کو مزید اجاگر کر رہی تھیں۔ اس کی سرخ آنکھوں میں بے بسی کی صورت پھیلنے لگی۔ بات کتنی معمولی تھی مگر معمولی نہیں رہی تھی اور یہ سب کچھ لاریب کی شدت پسندی اور انتہا پسندی کے باعث ہی ہوا تھا۔ اس کی

طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسی خرابی طبیعت کے باعث اسے متلی ہونے لگی تھی۔ اماں سادہ لوح تھیں جہی انہوں نے اپنے طور پر جو اخذ کیا اس کے حساب سے لاریب کے سامنے خوشی و انبساط کا اظہار کر ڈالا۔

”رب سائیں کا کرم ہوا ہے پتر، سہاگن کے لیے بڑا بھاگوں والا ہوتا ہے یہ وقت جب اسے ماں بننے کی خوشخبری ملتی ہے۔ میں ابھی سکندر سے کہہ کر شیرنی مشکوئی ہوں۔“ ان کا لہجہ بھی ان کے چہرے کی طرح کھلا پڑ رہا تھا۔ اندر آتے سکندر نے یہ بات سنی تھی اور اپنی جگہ پر ہی ٹھہرنا ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا۔ لاریب کے موڈ کے پیش نظر وہ اماں کو ابھی سجاؤ سے سمجھانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ ہک دیک لاریب اس تحیر سے نکلی پھر جیسے سکی و خفت کا شکار ہو کر اماں پر برس پڑی۔

”واٹ..... آپ کو اندازہ ہے آپ کیا بکواس کر رہی ہیں؟“ وہ حلق کے بل چیخی۔ اماں اس درجہ بدتمیز انداز پر کسی طرح بھی چہرے کو پھیکا پڑنے سے نہیں روک سکیں۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں ایک لمحے میں خوشی کی جگہ آنسوؤں نے لے لی تھی۔

”نٹ اپ لاریب۔“ سکندر پھنکارا مگر وہ سن کہاں رہی تھی۔

”اپنے فضول اندازے سنبھال کر رکھیں۔ آپ کا بیٹا ہر گز بھی اس قابل نہیں ہے کہ میں اسے اتنی جرأت بخشوں۔ آئندہ سوچ سمجھ کر مجھ سے.....!“ اس کی بات ادھوری رہ جانے کا باعث سکندر کا اٹھا ہوا ہاتھ تھا جو پھنکری صورت لاریب کا چہرہ سرخ کر گیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹی اور جیسے پتھر کی ہوئی۔ اس کے بجائے اماں کے منہ سے خوفزدہ چیخ نکلی تھی۔

”تم بھی اپنی بکواس بند رکھو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں جان سے مار ڈالوں گا تمہیں۔“ وہ یکدم کتنا پھر گیا تھا۔ وہ حواس باختہ سی اسے دیکھنے لگی۔

”سکندر، او سکندر کی ہو یا اے، سنبھال اپنے آپ کو۔ ہوش کر۔“ اندر اپنے کمرے سے بابا بدحواس بھاگے آئے



تھے اور بے قابو ہوتے سکندر کو اپنے بازوؤں میں سنبھالتے غم و غصے اور رنج کی کیفیت سے دوچار ہوتے اسے لرزتی آواز میں ڈانٹا۔ اماں کو دیکھ کر لگتا تھا اس صورت حال کی سنگینی کو نہ سہتا ان کا نازک دل کسی وقت بھی دھڑکنے چھوڑ دے گا۔ ایسے ہی خوفزدہ قسم کے تاثرات تھے ان کے۔

”چھوڑ دیں بابا مجھے، میں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ بے غیرت نہیں ہوں میں یہ میرے والدین کو بے عزت کرتی رہے اور میں چپ کر کے سنتا ہوں کسی بھی بات کی کوئی حد ہوتی ہے۔“ وہ بابا سے خود کو چھڑاتا وحشت سے پھٹتی آواز میں چلایا۔ لاریب سکتے زدہ کھڑی اس کی آنکھوں سے پھوٹی چنگاریوں کو دیکھے جارہی تھی۔ بابا اسے ڈانٹتے زبردستی کمرے میں لے گئے۔ لاریب نے رخ پھیر لیا اور ٹوٹے ہوئے قدموں سے چلتی اپنے بستر پر آ کر ڈھلے گئی۔ تب سے پھرائی ہوئی آنکھیں سمندر بن گئیں۔ سکندر نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اس کے انداز میں اس کے لہجے میں کتنی نفرت تھی ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا حالانکہ لاریب نے ہر انتہا کو چھو لیا تھا مگر سکندر کی آنکھوں میں اس نے کبھی نفرت چھلکتی نہیں دیکھی تھی۔ وہ پہلی بار عباس کے نقصان پر نہیں روئی۔ وہ پہلی بار خالصتاً اپنے نقصان پر روئی تھی۔

”اپنے آپ کو سنبھال پتر، جوان مرد اس طرح نہیں حوصلہ ہارتے۔“ اس کے گالوں پر بکھرتے آنسو بابا کے ضبط و برداشت کا امتحان لینے کو کافی تھے۔ سکندر نے کچھ کہے بغیر اماں کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

”مجھے معاف کر دیں اماں، یہ سب کچھ میری وجہ سے سہنا پڑا ہے آپ کو۔“ وہ واقعی سسک اٹھا تھا۔

”نہ پتر ایسا نہ کہہ، بچی بھی دیکھی ہے اپنی جگہ پر میں نے کب برا مانا اس کی بات کا۔ پھر تیرا تو سرے سے کوئی دوش ہی نہیں۔ فکر نہ کر اللہ سائیں سب کچھ میرے چنگا کر دے گا۔“ وہ اسے تسلی دلا رہے خود روئے گئی تھیں۔ بابا سر جھکائے بیٹھے تھے۔

”کچھ ٹھیک نہیں ہوگا اماں میں نے اب ہر امید چھوڑ دی۔“ وہ حدود درج شکستہ اور مایوس تھا۔

”ایسا نہیں کہتے پتر، دل بڑا رکھ حالات ہمیشہ ایک جیسے کب رہتے ہیں۔“ اماں نے اس کا کامدھا تھپکا۔

سکندر ہونٹ بھیچے سرخ آنکھیں جھکائے بیٹھا رہا۔

”سکندر رے مجھے تم سے کچھ کہنا ہے پتر، میرا خیال ہے یہی مناسب وقت ہے کہ مجھے تمہیں بتادینا چاہیے۔“ بابا کے انداز میں کچھ تو ایسا تھا کہ اماں کے ساتھ سکندر نے بھی چونک کر انہیں دیکھا تھا۔

”پتر سب سے پہلے تو میری خود غرضی کو معاف کر دینا کہ آج تک تجھ سے پوری بات چھپائی۔“ وہ بے حد نادم ہوتے کہہ رہے تھے۔ سکندر نے ایک پل کو حیران نظریں اٹھائیں۔

”میں اپنے مفاد کے لالچ میں تیرے نفع نقصان سے بے غرض ہو چکا تھا مگر اب حالات کا تقاضا ہے کہ تمہیں تمہاری حقیقت بتا دوں۔“ اماں نے ٹھنڈا سانس بھر اور سر جھکا کر آنسو پونچھنے لگیں۔ سکندر نے سپاٹ چہرے کے ساتھ نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔

”کیا بتائیں گے بابا، یہی کہ میں آپ کی اولاد نہیں ہوں۔ آپ کے کسی رشتہ دار کی اولاد ہوں۔ یہ بات میں بہت پہلے سے جانتا ہوں مگر آپ نے والدین بن کر مجھے پالا ہے میرے لیے ماں باپ آپ ہی ہیں۔“ اس کا لہجہ انداز بے تاثر ہی تھا۔ بابا نے سر کو بھرمانہ انداز میں ہنسی میں جنبش دی۔

”میں نے آدھا بچہ تمہارے سامنے رکھا تھا وہ بھی اس لیے کہ میری خواہش تھی کہ تمہاری شادی ہم اپنی دھی ثانیہ سے کر دیں مگر قدرت کو ایسا منظور نہیں تھا۔ تمہارا لاریب بی بی سے جوڑ تھا اور میں سمجھتا ہوں وہی تمہارے قابل بھی تھیں۔“ سکندر تڑپ اٹھا۔ بابا کی تعریف بھی اس پل چابک بن کر لگی تھی۔

”سن سکندر رے میں آج بھی تجھے یہ بات نہ بتانا اگر بی بی تجھے اتنا ذلیل نہ کرتیں۔ وہ تجھے خود سے کمتر سمجھتی ہیں جبکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ تو خاندان اور حسب نسب میں

لاریب بی بی کے برابر کا ہی ہے۔ تمہیں میری رشتہ دار ضرور سمجھ دے کر گئی تھیں مگر تم اس کی نہیں اس کے کامیر کبیر مالک کی اولاد تھے۔ جن کا روڈ ایکسٹنٹ میں انتقال ہو گیا تھا اور تمہارے رشتے کے تایا چچا تمہیں راستے سے ہٹا کر اصل مالک بننے کی خواہش میں تمہاری جان کے درپے ہو گئے تھے۔ پتر وہ ملازمہ سب جان گئی تھی جیسی اپنے مالک سے وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے تمام بیویوں کے ساتھ تمہیں یہاں چھوڑ گئی۔ اسے یقین تھا وہ لوگ اس ہستی میں تمہیں ڈھونڈ نہیں سکیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ وہ آج تک تمہاری خاک کو بھی نہیں پہنچے۔“ بابا ایک کے بعد دوسری حقیقت منکشف کر رہے تھے اور سکندر بے تاثر چہرہ لیے بیٹھا تھا۔ بابا نے کچھ الجھ کر اسے دیکھا۔

”تجھے حیرت اور خوشی نہیں ہوئی؟“ وہ اس کے جامد تاثرات سے حیران تھے۔

”شاید میں سب احساسات کھو چکا ہوں بابا، میرے نزدیک کسی انکشاف کی کوئی وقعت اور اہمیت نہیں۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹے، تم وہاں جاؤ اپنا سب کچھ واپس لو یہ تمہارا حق ہے۔“ بابا کے کہنے پر سکندر ہر خند سے مسکرایا۔

”یہ سب اتنا آسان نہیں ہے بابا جتنا آپ نے مجھے لیا، پھر اس خواری میں پڑنے کا فائدہ اور جس کی خاطر آپ مجھ سے یہ سب کروانا چاہتے ہیں اسے میری حیثیت و مرتبے سے فرق پڑنے والا نہیں۔ وہ نفرت میری حیثیت سے نہیں مجھ سے کرتی ہے۔“ اس نے ہنسی سے کہا اور اٹھ کر وہاں سے چلا آ گیا۔ پھر وہ رات گہری ہونے پر بھی پلٹ کر گھر نہیں آیا۔ دل میں خواہش ہی کہاں باقی تھی۔ زندگی کا یہ ایسا مقام تھا کہ اس کا دل خود کشی کرنے کو جا رہا تھا۔ اسے زندگی میں بھی لاریب سے نفرت نہیں ہوئی مگر اس پل وہ لاریب سے نفرت محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنے احساسات پر شرمندگی تھی اسے اپنی محبت پر شرمندگی تھی۔

اس محبت نے کچھ نہیں رہنے دیا تھا۔ عزت نفس سے لے کر انا و وقار تک، وہ بالکل کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی نقصان ہو سکتا تھا کہ جس محبت کی خاطر اس

نے ہر نقصان کو فراخ دلی سے جھولی میں ڈالا تھا وہ بھی محبت اس کے پاس نہیں رہ سکی تھی۔

اس نے گیلے بال سلجھا کر دوپٹا اوڑھتے پرسکون انداز میں سوئے اسامہ اور دیا کو دیکھا۔ اس کی مسکان میں کتنا سکون اور آسودگی تھی۔ کیا کی بھی بھلا اب؟ زندگی مکمل تھی۔ مقصد تو محبت کی دید بھی جوں رہی تھی۔ اس کے جگر گوشوں کی قربت نے سرشاری و طمانیت کے اسے سدوا کیے تھے کہ وہ ہر لمحہ خود کو گمن و مست محسوس کیا کرتی۔ صرف بچے ہی نہیں وہ تو خود بھی صحت مند نکھری ہوئی اور خوب صورت لگنے لگی تھی۔ تکمیل انسان کو اسی طرح آسودہ کر دیا کرتی ہے وہ اکثر سوچ کر مسکرایا کرتی۔

”بی بی جی آپ کا فون ہے۔“ ملازمہ دستک دے کر انداز میں گئی گو کہ اس کی حیثیت بھی اب یہاں دیگر ملازموں سے مختلف نہیں تھی مگر ملازمین اس کی سابقہ حیثیت سے آگاہ تھے جیسی عزت و احترام دیا کرتے۔

”میرا..... کون ہے؟“ فاطمہ نے اچنبھے میں جھٹکا ہو کر ملازمہ کو دیکھا جس کے ہاتھ میں کارڈ لیس تھا۔

”زینب صاحبہ ہیں؟“ ملازمہ کی وضاحت پر فاطمہ خوشگواریت میں گھر کر بے اختیار آگے بڑھی اور کارڈ لیس لے لیا۔

”السلام علیکم، زینب کیسی ہیں۔ ایک آپ ہی ہیں جو مجھے نہیں بھولیں۔“ وہ فون کان سے لگاتے ہی چہکی جبکہ دوسری جانب زینب نے گہرا سانس بھرا۔

”وعلیکم السلام۔ میں ٹھیک ہوں الحمد للہ، تم ٹھیک ہو؟ فاطمہ ایک ہستی تھیں مجھ سے بھی زیادہ یاد رکھتی ہے، جو ایک لمحہ بھی تمہیں نہیں بھولتی۔“ فاطمہ کچھ دیر خاموشی اور حیران ہی کھڑی رہ گئی۔

”اسی کون کی ہستی ہے بھلا؟“

”اللہ..... اللہ بھی بھی اپنے بندوں کو نہیں بھولتا۔ ان کی ہر ضرورت ان کی ہر خواہش کو پورا کرنے والا وہی ہے۔ جواب میں بس وہ ہم سے اپنی اطاعت و عبادت چاہتا



ہے۔ محبت چاہتا ہے یہ تو حق ہے اس خالق کا۔“ زینب کا انداز نرم ضرور تھا مگر صاحبانہ تھا۔ فاطمہ کچھ بولنے کے قابل نہیں ہو سکی۔ وہ سمجھ نہیں سکی اسے زینب کی بات نے شرمندگی سے دوچار کیا ہے یا ناراض ہے۔ دونوں کے بیچ خاموشی بٹھ گئی جسے زینب نے توڑا۔

”تم نے اپنا گھر کیوں چھوڑ دیا، فاطمہ؟“ وہ اس بات پر ہرٹ تھی، اس کا لہجہ گواہی دے رہا تھا کہ اسے فاطمہ کا یہ اقدام پسند نہیں آیا۔

”کچھ تو بولو فاطمہ، مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ تم عباس کے گھر پر ہو۔“ زینب کے لہجے میں اترا دکھ فاطمہ کو اپنے دل میں اترا محسوس ہونے لگا۔

”میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا زینب، بچوں کی گورنس جاب چھوڑ کر جا چکی تھی۔“ اس نے رو ہانسی ہو کر کہا تو دوسری جانب زینب شاکہ کھ رہی تھی۔

”یعنی اب تم اس کے بچے سنبھالو گی، اپنے گھر پر یہ کام کرنا الگ بات تھی فاطمہ مگر.....“ زینب کے لہجے میں صرف دکھ نہیں رنج و ملال بھی تھا۔ فاطمہ دیکھ کر اسے مسکرا دی۔

”تم پریشان نہیں ہو زینب، میں یہ کام پہلے بھی کر چکی ہوں۔“ اس کا لہجہ بے بس تھا۔

”وہ تمہاری ہمدردی و محبت تھی فاطمہ! عباس صرف تمہیں نچا دکھانا چاہ رہا ہے وہ تمہاری بے بسی و لا چاری سے آگاہ ہو چکا ہے۔ چاہتا تو تمہیں تمہاری حیثیت کے مطابق بھی درجہ دے سکتا تھا۔“ زینب کو اب غصہ آنے لگا۔ یہ بے وقوف محبت کی ماری لڑکی خود کو کس درجہ پامال کر رہی تھی اور جس کی خاطر کر رہی تھی اسے احساس تک نہیں تھا۔

”زینب یاد کرو تم نے ایک بار مجھ سے کہا تھا میں اپنے تمام معاملے اللہ کے سپرد کر دوں، میں نے ایسا ہی کیا اب یہ راستے خود بخود کھل رہے ہیں۔ تم نے ہی کہا تھا کہ جو کام خود بخود ہو وہ رب کی منشا کے مطابق ہوتا ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ تم نے کہا تھا انسان کو سب کچھ حسب منشا نہیں ملتا۔

تقدیر کا ایک اشارہ ہماری سالوں کی پلاننگ پر پانی پھیر دیتا ہے۔ زینب تم نے ہی کہا تھا کہ ہمارے لیے رتبے اور مقام پروردگار خود متعین فرماتا ہے اور جو انسان جس رتبے کا اہل ہو اسے وہی رتبہ عطا کرتا ہے۔ مجھے کوئی شکوکہ نہیں ہے زینب، میں رب کی رضا میں راضی رہنا چاہتی ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ اللہ ہی میری بہتر خبر گیری کرنے والا ہے اور مزید یہ کہ اگر میں اپنے رب پر بھروسہ قائم رکھتی ہوں تو رب بھی میرے بھروسے کو ٹوٹنے نہیں دے گا۔“ اسے خاموشی سے سنتی زینب کچھ اور بھی خاموش اور گم صمم ہو گئی۔ وہ اسے کہہ نہیں سکی کہ وہ راستہ بدل رہی ہے قرآن کو یکھنا چھوڑ کر نماز کو پڑھنا چھوڑ کر وہ صرف دنیا کی خواہش دنیا کی زیست کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ یہ گھانے کا سودا ہے اسے لگا اس بات کو کہنے کا فائدہ ہی نہیں ہے۔ فاطمہ سمجھنے کی صلاحیت کھو چکی تھی۔ عمل کی قوت کہاں سے لاتی۔ اس کے حواس پرتاج بھی عباس ہی سوار تھا۔

”کچھ غم ایسے ہوتے ہیں جو حرام و حلال کا فرق بھلا دیتے ہیں۔ انسان کی سوچ پر شیطان کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ میں نفس کی اس حد تک غلام نہیں ہوں مجھ سے بڑے گناہ و ثواب کی تمیز آ چکی ہے۔ میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گی جو روز محشر مجھے اپنے رب کے سامنے شرمسار کر ڈالے۔“ وہ کتنے رساں سے کہہ رہی تھی زینب، ہستکی سے مسکرا دی۔

”خوش رہو فاطمہ، میں تمہاری اصلاح اور بہتری کی دعا کرتی رہوں گی میں کوشش کروں گی کسی دن تم سے ملنے بھی آسکوں تم بھی مدد سے آیا کرنا تمہارا قرآن اور حورارہ گیا ہے۔ اپنا خیال رکھنا فی امان اللہ۔“

”ضرور زینب، میں آؤں گی، فی امان اللہ۔“ اس نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا اور کارڈ لیس رکھنے کے بعد الماری کھول کر جائے نماز نکالنے لگی۔ زینب سے بات کر کے اسے عجیب شرمندگی نے آن لیا تھا۔ دنیا داری میں کھو کر وہ رب کی یاد سے فرائض کی ادائیگی سے غافل ہونی جا رہی تھی۔ جائے نماز قبلہ رخ بچھاتے اس نے ایک نظر پھر دونوں سوتے ہوئے بچوں کو دیکھا اور مطمئن ہو کر نیت

باندھ لی۔

آج اس کی نماز میں بھی ایک انوکھا سرور تھا۔ ایسی طمانیت جو روح تک کو اجال دے۔ وہ رب کی یاد میں اتنی مشغول تھی کہ دیا کے رونے کی آواز سے بھی بے خبر رہی۔ یہاں تک کہ اپنے کمرے کی سمت جاتے عباس کے قدم کو ریڈر میں ہی ٹھک گئے۔ وہ خراب موڈ کے ساتھ بچوں کے کمرے کی جانب آیا۔ عباس نے آگے بڑھ کر بچی کو اٹھایا پھر قہر بھرے انداز میں فاطمہ کا وارڈی تھیں۔

”نندنی..... نندنی.....“ وہ حلق کے بل چیخا تھا۔ دعا میں مشغول فاطمہ بڑبڑا کر ابھی اور اسے رو روپا کر جیسے اس کی جان نکلنے والی ہو گئی۔

”کہاں تھیں محترمہ آپ اس کا مطلب آپ کی کارکردگی بھی ناقص رہی۔ کیا سمجھوں میں اس کو تباہی کا مطلب؟“ وہ برسنے سے باز نہیں آیا تھا۔

”آئی ایم سوری میں وہ..... لائیں اسے مجھے دے دیں۔“ گڑبڑا کر بات ادھوری چھوڑتی وہ شیشا کر بولی۔ عباس نے قہر آلود نگاہ اس پر ڈالتے دیا کو اس کے حوالے کر دیا۔

”اسے سلانے کے بعد آپ کر میری بات سنے گا۔“ اس کا لہجہ بھی اس کے انداز کی طرح ترخا ہوا تھا۔ جتنی دیر وہ دیا کو سلاتی رہی اس کا دل عباس کے بلاوے میں الٹا ڈولتا رہا۔ دیا کے سونے کے بعد وہ بوجھل دل کے ساتھ بھاری قدم اٹھاتی عباس کے کمرے کے دروازے تک آئی تھی۔

”آجائیں، کھلا ہے دروازہ۔“ اس نے نم آلود جھلی کا دباؤ ڈال کر دروازے کو دھکیلا اور جھکی نظروں کے ساتھ کسی مجرم کی طرح اس کے سامنے جا ٹھہری۔

”زینب کون ہیں، جن کا آج فون آیا تھا آپ کے لیے؟“ فاطمہ نے اس بے معنی سوال پر لہجہ بھرکوا سے دیکھا۔

”زینب دوست ہے میری، میں انہی کے ساتھ اٹھایا سے یہاں آئی تھی پھر کچھ عرصہ ان کے یہاں قیام بھی کیا تھا۔“ فاطمہ پر جواب لازم تھا۔ حالانکہ وہ یہ جواب متعدد بار پہلے بھی دے چکی تھی مگر یہ تو وہ بھول جاتا یا پھر دانستہ نظر

انداز کرتا تھا۔

”تم یہاں کس مقصد کے تحت آئی تھیں؟“ عباس کی چبھتی نظریں فاطمہ کے خائف چہرے جم گئیں۔

”مجھے ہر صورت اپنی بات کا جواب چاہیے نندنی صاحبہ، یاد رکھو کہ تم اب ملازمہ ہو میری۔“ عباس نے اس پر اس کی حیثیت کو واضح کر کے گویا جتلیا یا۔ فاطمہ کا رنگ فنی اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہونے لگیں۔

”میں مسلمان ہو چکی ہوں اور میرا نام فاطمہ ہے۔“ وہ بولی بھی تو کیا۔ عباس اپنے پیش پر قابو نہ رکھ سکا اس کے لئے ہاتھ کا پھنر فاطمہ کے حواس چھین کر لے گیا۔ وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہوتی تھی۔

”میں تمہیں پولیس کے حوالے بھی کر سکتا ہوں تم اٹھ یا سنا آئی ہو تمہارے مقاصد غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ بہتر ہے سچائی اگل دو میرے سامنے۔“ وہ غرانے کے انداز میں کہہ رہا تھا فاطمہ ہراسمیکی کے عالم میں سسک پڑی۔

”مجھ پر شک مت کریں، میں غلط ارادے سے نہیں آئی ہوں۔ اللہ جانتا ہے میرا کوئی غلط مقصد نہیں ہے۔“ عباس نے مسلکتی نظروں سے اس کو دیکھا۔

”ٹھیک ہے جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔“ اس مڑدہ جانفزا کو سن کر بھی وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہی تھی کہ اس کی پوزیشن کلیئر ہوئی ہے یا نہیں۔ البتہ یہ احساس بھی کچھ کم طمانیت آمیز نہیں تھا کہ وہ بہر حال ملازمت سے نہیں نکالی گئی ہے۔



زندگی کی دعا نہیں دیجیے  
ضد نہیں کیجیے ڈوبنے دیجیے  
اپنی تشنہ لبی کا تقاضا ہے یہ  
پانیوں کے سفر پر چلیں جس گھڑی  
ساحلوں پر کوئی بھی ہمارا نہ ہو

سکندر نے بے دلی سے اس فائل اور تصاویر کو واپس بیک میں رکھا جن کے متعلق بابا کا خیال تھا اسے اس کی اصل حیثیت اور حقوق واپس دلانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس کے ہونٹوں پر بہت یاسیت آمیز



مسکان بکھری تھی۔ یہ بابا اماں کی ہی مسلسل سمجھانے بچھانے کی کوششیں رنگ لائی تھیں کہ وہ اپنی تلاش اپنی پہچان پانے کے لیے تمام تر مایوسی، بے دلی اور بے رغبتی کے باوجود یہ سفر اختیار کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا اور جب وہ جا رہا تھا سب سے پہلے حویلی میں بابا ساسا میں نے اسے خدا حافظ کہا تھا۔

”تمہارے بابا صحیح کہتے ہیں سکندر بیٹے تمہیں اپنی اصل شناخت ضرور حاصل کر لینی چاہیے۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ آج کے دور میں انسان کو اس کی شناخت سے نہیں اس کی مالی حیثیت و دولت کے بل بوتے پر عزت و تکریم سے نوازا جاتا ہے۔ جاؤ بیٹے خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔ اپنے والدین اور لاریب کی جانب سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں تمہارے بعد وہ میری ذمہ داری ہیں۔“ سکندر خاموشی سے چلا آ گیا کون جانتا تھا اس کا دل کتنا بوجھل اور افسردہ تھا۔ اماں بابا نے اسے امید اور خوشی کے ساتھ کامیابی کی دعاؤں سے بھی نوازا اور رخصت کیا۔ تب بھی کوئی جذبہ کوئی احساس اس کے اندر نہیں اٹھا۔ بیگ اٹھاتے جب وہ دروازے سے نکل رہا تھا جانے کس جذبے کے تحت اس بل کمرے سے نکل کر پلے سے لگ کر کھڑی لاریب کے پاس اس کے قدم تھم گئے تھے۔

”گو کہ یہ سفر آپ کی وجہ سے ہی اختیار کیا جا رہا ہے لاریب بی بی، مگر میں دیگر لوگوں کی طرح نہ تو خوش فہم ہوں نہ خوش گمان۔“ دونوں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ دونوں کے چہروں پر ملال تھا۔ سکندر نے سر داہ بھرتے ہوئے مزید کہا۔

”کامیابی کے نوے میں سے دس فیصد بھی چانس نہیں دیتا میں خود کو۔ آپ یہ بھی سمجھ سکتی ہیں حالات و واقعات نے مجھے پوری طرح سے مایوس اور بد دل کر دیا ہے آپ سے صرف اتنا کہنا چاہوں گا اگر میں ناکام ہو گیا اپنے مقصد میں تو پلٹ کر آپ کے پاس نہیں آؤں گا بلکہ آپ کو اس غیر اہم اور ناگوار تعلق سے آزاد کر دوں گا جو آپ کو شرمندگی دکھاؤا زماں کے سوا کوئی احساس نہ دے سکا۔“

میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ میری اس کوتاہی کو معاف کر دیجیے زندگی کا یہ ایسا مقام ہے جب میں آپ سے کسی چیز کا بھی خواہش مند نہیں ہوں یہاں تک کہ معافی کا بھی نہیں۔“ آخری فقرہ اس کے منہ میں تھا جب لاریب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر ہونٹ بھیچے تیزی سے بھاگتی اندر کمرے میں واپس چلی گئی۔ سکندر نے ساکن نظروں سے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا اور خشکی سے مسکرا دیا۔ اس کے قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ اس کے باوجود کہ اس کا سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔



فراز اپنے دھیان میں چلتا ہوا اندر آیا تھا۔ سیل فون اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔ وہ کسی آفیشل ڈیل کو طے کر رہا تھا مگر پہلی نگاہ ہی بیڈ پر بیٹھی اریبہ پر پڑی تو اس کے اعصاب کو جیسے شدید ترین الیکٹرک شاک لگا تھا۔ اس نے ناگواریت میں جھٹکا ہوتے سب سے پہلے رابطہ منقطع کیا پھر بیگ صوفے پر پھینکا قہر سا ماں تاثرات کے ساتھ اریبہ کو خائف چھوڑ کر تیزی سے پلٹ گیا اور باہر آتے ہی ماما کو لکڑیا چیتے ہوئے پکارا تھا۔

”کیا ہوا بیٹے خیریت؟“ ماما جولاؤخ میں ہی تھیں اس کی آواز پر بدحواس بھاگی آئیں۔

”یہ آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں اس مصیبت کو کمر میں لانے کے باوجود؟“ وہ دھیمے لہجے میں غرایا مگر غیض و غضب ایسا تھا کہ سانس نہ آتی ہر شے کو تباہ و برباد کر ڈالے گا۔ یہاں تک کہ ماما بھی شپٹا گئیں۔

”بیٹے اریبہ کو بھائی صاحب لے کر آئے ہیں اور.....!“

”کیوں؟“ وہ حلق کے بل چیخا۔ رنگت لہو کی طرح سرخ ہو چکی تھی۔

”وہ ہوتے کون ہیں میری زندگی کا فیصلہ کرنے والے میں اسے آج طلاق بھیج رہا تھا اور آپ.....!“

”بیکو اس بند کرو فراز، خبردار جیسا کہ یہ الفاظ اپنی زبان پر لائے۔“ تاؤجی اپنے کمرے سے نکل کر آئے تو فراز اسی

قہر بھرے انداز میں ان کی جانب پلٹ گیا۔

”بہتر ہوگا تاؤجی اگر آپ میرے معاملے میں نہ بولیں۔“ وہ انکھیں نکال کر بولا تاؤجی تنفر سے منس و بے۔

”اچھا، دوسری صورت میں کیا کر لو گے تم؟“ وہ چنچے تو فراز کا خون ایلنے لگا۔

”آپ قتل جیسا جرم کر کے بھی طلاق کو غلط سمجھتے ہیں وہ تاؤجی۔“ اس کا لہجہ حقارت آمیز تھا۔ تاؤجی جزبہ ہوئے۔

ان کا شدت سے دل جاہا کہ اس کی زبان کھینچ لیں۔

”بات کو سمجھنے کی کوشش کرو فراز، سمعیہ اور شرجیل کی کشمکش نے تم افسانے نہیں بنائے باقی کس قسم اپنی بیوی کو طلاق دے کر پوری کر دو۔ علوی خاندان تو ویسے ہی لوگوں کی زبان پر ہے۔“ انہوں نے پینٹر ابدل کر اس پر گرفت کرنی چاہی تو فراز زہر خند سے مسکرایا۔

”اس کا آغا آپ کے کارناموں کی وجہ سے ہوا تھا نہ آپ آفاق چاچو کو مارتے اور نہ.....!“

”خدا کا واسطہ ہے چپ کر جاؤ، ساری دنیا کو سناؤ گے تمہاری غلط فہمیوں کا بھی کوئی انت ہے بھلا؟“ تاؤجی جیسے روہائے ہو گئے تھے۔

”یہ اعتراف جرم تائی ماں خود کر چکی ہیں سمجھے آپ، غلط فہمی کو رہنے دیں اور دوسری بات یہ کہ اس عورت کو جیسے لے کر آئے ہیں ویسے ہی چھوڑ بھی آئیں۔ ورنہ میں ابھی اسی وقت اسے طلاق دے دوں گا۔ سنا آپ نے رکھ لیجیے گا پھر اسے یہاں جس حیثیت سے رکھنا ہوگا۔“ اس کے غصیلے انداز میں کچھ ایسی قطیعت تھی کہ وہاں موجود ہر شخص جیسے سکتے میں آ گیا۔ اریبہ جو اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کو وہاں آ کھڑی ہوئی تھی کچھ اس طور بدحواس ہوئی کہ بے اختیار روٹی ہوئی اس کے قدموں میں بیٹھ کر گر گزرنے لگی۔

”خدا کا واسطہ ہے فراز ایسا مت کیجیے۔ معاف کر دیں مجھے غلطی ہوئی مجھ سے پلیز معاف کر دیں۔“ آنکھی گلابی سا دھمی میں میچنگ زیورات سے سجی خوشبوؤں سے مہکی مگر زرد چہرے والی اریبہ کا یہ روپ فراز کو چند ثانیوں کو سبکی مگر ہک دھک کر کے دکھ گیا۔

”اب عقل کے ناحق لینا اور شوہر کے ساتھ سسرال کے ہر فرد کی خدمت کر کے اس گھر میں اپنی جگہ بنانا تمہارا کام ہے اریبہ، یہ کوشش ہر لڑکی کو کرنا پڑتی ہے تمہارے شوہر کو جو بھی تمہاری بات بری لگی کوشش کرنا اس کا ازالہ کر سکو۔“ اس کی ماں نے اسے تاؤجی کے ساتھ بھیجنے سے قبل سمجھانا ضروری خیال کیا تھا۔ وہ مشرقی ماں تھی بنی کا گھر بسانے کی خاطر عزت نفس کھیلنے کا ہی سبق دے سکتی تھی۔ گھر کا بننا آسان مگر رہنا اتنا آسان نہیں اسے سب یاد تھا۔ اب وہ خود کو منہ کر بھی اس گھر کو اجڑنے سے بچانا چاہتی تھی یہ عزم لے کر آئی تھی وہ۔

”یہ کیا بد میٹری ہے ہٹو یہاں سے۔“ فراز کو اریبہ کی یہ حرکت چراغ پا کر گئی تھی۔ جیسی پیچھے ہٹا وہ پھٹکار کر بولا۔ اریبہ کے آنسوؤں میں کچھ اور شدت آنے لگی ماما کو اس پر ٹوٹ کر ترس آیا تھا۔

”فراز بیٹے ایسے نہیں کہتے معاف کر دو بچی کو کم از کم ایک موقع تو دیتے ہیں۔“ ماما نے تنفر بیٹے کے آگے سفارش کی تھی وہ متفرانہ تاثرات لیے چہرے کا رخ موڑے یوں کھڑا تھا جیسے یہ بات سنی ہی نہ ہو۔

”اریبہ بیٹے آپ کمرے میں جاؤ جو بھی معاملہ ہے میاں بیوی اکیلے میں سلجھاؤ۔ سب کے سب تماشاکار گانے کی ضرورت نہیں۔“ بابا نے دوسری اہم بات فراز کو ہی جتلائی تھی وہ اس بات پر بھڑکا تھا۔

”یہ میرے کمرے میں نہیں جائے گی بیٹا، میں کہہ چکا ہوں تا میں اسے کسی قیمت پر بھی رکھنے کو تیار نہیں ہوں۔“ فراز نے جتنی برہمی سے کہا تھا بابا کو اسی قدر تاؤ آیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”تاؤجی سے کہیں اگر وہ اپنا مطالبہ منوانا چاہتے ہیں تو ایک مطالبہ میرا بھی ہے اگر انہیں قبول ہے تو میں بھی ان کی بات مان لیتا ہوں۔ ورنہ بھول جائیں کہ میں کوئی گنجائش رکھوں گا۔ مت بھولیں مجھے دنیا کی پروا ہے۔“ فراز نے سووے بازی پر اترتے ہوئے ساتھ ہی دمکی سے بھی نواز دیا۔ تاؤجی کے ساتھ دیگر افراد بھی چونک اٹھے۔



”کیسا مطالبہ؟“

”آفاق چاچو کے بیٹے کو ڈھونڈ کر اس کا حق اس تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ اس کو اس کی حیثیت سے قبول کریں۔“ فراز نے جتنے سکون سے کہا وہاں موجود ہر شخص کے اعصاب اسی قدر پراگندہ ہوئے تھے۔

”یہ کیا لگو اس ہے فراز تم کیوں آ خرائیک بے بنیاد بات کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو۔“ تاؤ جی اتنے برہم ہوئے تھے کہ عادت کے مطابق چنگھاڑنے لگے۔ فراز نے طنز پر مسکراہٹ سمیت انہیں دیکھا پھر مضبوط قدموں سے چلا ان کے مقابل آ کر ان کی آنکھوں میں اپنی سرور نظریں جما دیں۔

”اللہ کو گواہ بنا کر قسم کھائیں تاؤ جی کتا آپ نے ایسا جرم نہیں کیا؟ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ دوبارہ اس معاملے کو نہیں اٹھاؤں گا۔ لیکن جھوٹی قسم کھانے سے پہلے یہ بھی یاد رکھیے خدا کی لاشی بجاواز ہے اور ضرب اس کی اتنی کاری اور شدید کتا آپ سہہ نہیں پائیں گے۔“

”فراز چپ ہو جاؤ اللہ کا واسطہ ہے تمہیں۔“ پاپا نے وحشت زدگی کے عالم میں دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیختے ہوئے کہا۔ فراز نے نگاہ کا زاویہ بدل کر سرخ انگارہ ہونی آنکھوں سے انہیں دیکھا پھر بوجھل دل سے مسکرا دیا۔

”پاپا مجرموں کی فہرست میں آپ کا بھی نام درج ہے آج بھی وقت ہے، اصلاح ممکن ہے خدا اپنے بگاڑ کو توبہ سدا رہا لیں۔“ ماحول پر یکدم مہیب سناٹا چھا چکا تھا۔ ایسے کہ سوئی بھی گرتی تو آواز سنائی جاسکتی تھی۔ ایسے میں ماما کی گھٹی گھٹی سسکیاں گونجنے لگی تھیں۔ تاؤ جی کب کے وہاں سے جا چکے تھے۔ فراز کو ان کا متفرانہ انداز دیکھ کر صاف لگا تھا ان کا مہر زدہ دل ان باتوں کا اثر قبول کرنے سے قاصر رہا ہے۔ فراز نے ایک کے بعد ایک فرد کو وہاں سے کھٹکتے دیکھا تو دل پر بوجھ لیے اپنے کمرے میں آ گیا۔ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے ذہنی وگسی انتشار کے دوران اپنے ایک واقف کار کا نمبر ملایا تھا جو کسی اخبار سے منسلک تھا۔

”ہاں عبدالمکین کیسے ہو، فراز بات کر رہا ہوں یا۔“ اس نے نیچے سے ٹیک لگاتے داش روم سے برآمد ہوئی سوچی آنکھوں والی اریبہ پر نگاہ ڈالے بنا چہرے کا رخ پھیرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

”ہاں یہی سمجھ لو، اب بھی ضرورت کی خاطر ہی یاد کیا ہے تمہیں۔ نہیں کوئی اسکینڈل نہیں یا ایک اور کام ہے۔“ اس کا لہجہ سنجیدہ اور کسی حد تک متا ہوا تھا۔

”ہاں ایک خبر لگوانی ہے اس کی تفصیلات میں تمہیں ای میل کرتا ہوں ٹھیک ہے، یہ کام جلدی ہونا چاہیے۔“ اس نے کال منقطع کر کے سیل بستر پر پھینکا تو اریبہ جو اس کی فراغت کی منتظر تھی قدرے جھجک کر اس کے سامنے آ گئی۔

”فراز۔“ اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی کا غلبہ تھا۔ فراز کے کشیدہ اعصاب کچھ اور بھی تناؤ سمیٹ لائے۔ اس نے دانستہ اسے دیکھنے سے گریز کیا۔

”میری اس غلطی کو معاف کر دیں پلیز۔“ وہ پھر گڑ گڑائی۔ فراز نے سر و نظروں سے اسے دیکھا۔

”یہ تمہارا اصل روپ نہیں ہے اریبہ شاہ، خود کو یوں ضائع مت کرو کس خوف کے باعث آخر تم نے یہ انداز اپنایا ہے۔“ اس کا انداز زہر خند تھا۔ اریبہ سر جھکائے سسکیاں بھرتی رہی۔

”یہاں سے اٹھو اور کوشش کرنا مجھ سے مخاطب نہ ہو۔“ اس سے زیادہ میں تم سے نرمی پر خود کا مادہ نہیں کر سکتا۔ مجھ سے کسی قسم کی گنجائش کی بھی توقع نہیں رکھنا جنہیں عزت اس نہ آئے وہ ذلت کو خود اپنے اوپر مسلط کرتے ہیں۔ تمہارا شمار انہی لوگوں میں ہوتا ہے بہتر تو یہی تھا تم اس سمجھوتے پر مائل نہ ہوتیں۔ بہر حال یہ تمہارا پرسنل میٹر ہے۔“ اس کا لہجہ سرد تھا۔ اریبہ نے بے اختیار سکھ کا سانس بھرا۔ اس کی ماں نے درست کہا تھا کچھ پانے سے قبل کچھ کھونا ضرور پڑتا ہے۔ وہ کھونے والی شاید نہ بنتی مگر اس نے خود اپنے اوپر ظلم کیا تھا۔

غور و فکر اسے اس نہیں آ سکا تھا جی اگلے لمحے اس منہ کے بل گرا کر خدا نے اس کو غلطی کا احساس بخش دیا تھا۔

.....

”جس شخص کو اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہونے کی سمجھا جائے وہ زندگی میں کسی بھی واقعہ کے رونما ہونے کا شکوہ نہیں کرتا۔ صرف سر جھکاتا ہے تسلیم کرتا ہے اور فکر کرتا ہے۔ مصیبتوں کا مقابلہ صبر سے کرو۔ بلاشبہ یقین کی چنگلی اور اخلاق کا حسن جس انسان میں پیدا ہو جائے وہ ایک ہی وقت میں خالق و مخلوق دونوں کا محبوب بن جاتا ہے۔“

ڈاکٹر ابراہیم احمد وعظ میں مصروف تھے۔ شرجیل کی متبسم لودی نظریں اس پر فوکس تھیں۔ اسے سمعیہ کی خوش بختی میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں رہ گیا تھا۔ یہ ابراہیم احمد اور سمعیہ کے نکاح کی سادگی سے منعقد کی گئی تقریب تھی۔ جس میں شامل ہونے والوں کے لیے ابراہیم احمد نے یہ پر نور محفل سجائی تھی۔

”مجھے ہر لحاظ سے آپ پر فخر ہے ڈاکٹر ابراہیم احمد۔“ مہمان رخصت ہوئے تو شرجیل نے ایک بار پھر ابراہیم احمد کو گلے لگانے کے بعد ذور جذبات سے لرزتی آواز میں کہا تو ابراہیم احمد برادری سے مسکرایا تھا۔

”ایک بات بتاؤ گے یہ نا سمجھا کہ اپنی بہن تمہارے حوالے کی ہے اس لیے پوچھ رہا ہوں۔ ابراہیم احمد یہ سوال تو تمہیں دیکھ کر ہمیشہ میرے ذہن میں ابھرتا ہے مگر حالات کی گردش اور گپیہرتا نے بھی موقع ہی نہیں دیا پوچھنے کا۔“ شرجیل کی بات پر ابراہیم نے مسکرا کر اسے نرمی سے دیکھا۔

”میں سمجھ سکتا ہوں شرجیل احمد تم کیا کہنا چاہتے ہو یہی نا کہ میں شکل سے فائر لگتا ہوں مگر مسلمان ہوں، اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی اور شرجیل آہستگی سے ہنس دیا تھا۔

”اس کا مطلب تمہاری ذہانت پر بھی شک نہیں کیا جاسکتا۔“

”میں فائز ہی تھا شرجیل احمد، امریکا میں اپنی فیملی کے ساتھ تھا مگر پھر گردش حالات نے اس آشیانے کے ہر تنکے کو بکھیرنا شروع کر دیا۔ پہلے میری ماں پھر بہن بھی اس طوفانی ہوا کے چھٹروں کی زد میں آ کر مجھ سے بچھڑ گئی۔ میرے قادر کو ان دنوں کینسر کا جان لیوا مرض لاحق ہوا جب

لکھوں گا

زندگی کی کسی شام  
کبھی اپنی سوانح حیات لکھوں گا  
اپنے دل کی وہ ہر اک بات  
لکھوں گا

جو کبھی کہہ نہ سکا  
جو کبھی لکھ نہ سکا

اپنے دل کی ہر اک بات لکھوں گا  
مرا ذوق جنوں  
میری راتوں کی تنہائی  
کب تک درد کے صحرائیں  
مرے کام آئی  
لکھوں گا

زندگی کا فسانہ اور خوشیوں کے وہ پل  
جو کسی سے بانٹ نہ سکا  
پلکوں میں چھپا نسو  
آنکھوں میں سجے سپنے  
غم کا المذاہب اور ایسا  
تیرے جانے کے بعد  
لکھوں گا

بلال ایان..... کامل پور موسیٰ آنک

میں ہاؤس جاب ملل کرنے کے بعد باقاعدہ اسپتال میں ڈیوٹی انجام دینے لگا تھا۔ ڈیڈ اپنی زندگی سے مایوس ہوئے تو ان کی وائف انہیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ وہ اس قریب المرگ انسان کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ یہ صدمہ ان آخری ایام میں ڈیڈ کے لیے ناقابل برداشت تھا پھر انہی دنوں ڈیڈ کی صرف ایک خواہش تھی کہ تھرائن کتا خری بار دیکھنے اور ملنے کی۔ مگر میری می نے انکار کر دیا یہ کہہ کر کہ کیتھرائن انہیں چھوڑ کر بھاگ گئی ہے۔

یہ بات ناقابل یقین تھی مگر ہم می کو فز نہیں کر سکے جن دنوں ڈیڈ نے شدید مایوسی کی کیفیت میں اپنی بیماری سے دل برداشتہ ہوتے خودکشی کی میں بہت بکھر گیا تھا۔ یہ



صدمہ بہت شدید تھا میں شاید سنبھل تو جاتا مگر یہ سنبھلنا سدھار نہ کہلاتا۔ سدھار اللہ نے عطا فرماتا تھا جیسی سبب بھی اس نے پیدا فرمایا تھا۔ جہاں میری ملازمت تھی وہیں اسپتال میں، میں نے ایک اور کینسر کے مریض کو دیکھا۔ تمہیں پتا ہے شرجیل احمد اس شخص کا مرض لا علاج تھا۔ اسے پتا تھا عنقریب اسے مرجانا ہے مگر وہ بلا کا سیلف کنٹرول بندہ تھا میں نے کبھی اسے ٹپ کر بلکتے اور روتے نہیں دیکھا۔ جیسے میں نے بارہا ڈیڈ کوروتے دیکھا تھا۔ وہ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا۔ ایسی خراب حالت میں بھی وہ پانچ وقت کی نماز اپنے بستر پر ادا کرتے اور ان کی زبان ذکر خدا میں مصروف رہتی۔ ذکر و شکر کا ایسا دلنشیں امتزاج میرے لیے ناقابل یقین تھا۔ میں اسی حیرانی وغیرہ یقینی کی کیفیت میں اس مریض کے قریب ہوتا چلا گیا۔ وہیں سے مجھے دین اسلام کو جاننے اور مزید بہت کچھ معلوم کرنے کا تجسس پیدا ہوا جیسے جیسے میں اس سمندر میں اترتا گیا یہ تشنگی بڑھتی چلی گئی۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب میں نے اپنی پیدائش کا مقصد جانا اور خود کو اس رب کائنات کے سپرد کر دیا۔ اسی مقصد کی تکمیل کی خاطر تم جانتے ہو شرجیل احمد اللہ کے نزدیک بہترین انسان وہ ہے جو قرآن کو سکھے اور پھر دوسروں کو سکھائے۔ شرجیل احمد میں اللہ کے نزدیک ہونے کو اس کے بہترین بندوں میں شامل ہونے کی جدوجہد میں مصروف ہوں۔ وہ بندے جو اچھائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔“

”اللہ تعالیٰ تمہاری اس سعی کو قبول فرمائے ابراہیم احمد اور مقصد میں کامیابی عطا فرمائے۔“ شرجیل نے صدق دل سے دعا دی تھی ابراہیم مسکرایا تھا۔

”تم آمین۔ یہ بتاؤ تم نے سمعیہ سے ان کی مرضی تو پوچھی تھی نا شرجیل احمد نکاح سے پہلے۔“ شرجیل نے نظریں اٹھا کر اسے بھرپور اور شرارتی نظروں سے دیکھا اور پھر شریر انداز میں مسکرایا۔

”تم بتاؤ، تم جیسے شاندار اور مکمل مرد کو کوئی لڑکی انکار کر سکتی ہے؟“ اس کا لہجہ انداز ایسا تھا کہ ابراہیم جھینپ کر

رہ گیا تھا۔

”میں کبھی اپنے متعلق بہت زیادہ خوش گمان نہیں رہا۔ ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے تمہیں پوچھنا چاہیے تھا۔“ وہ جیسے خفا ہوا شرجیل نے بے حد محبت بھرے انداز میں اس کا کاندھا تھپتھپایا۔

”ڈونٹ وری، نا صرف پوچھ لیا تھا بلکہ تمہیں دیکھ بھی چکی ہے اور بہت خوش ہے۔ میرے مہربان دوست اب تم اپنے کمرے میں جاؤ باقی باتیں ان شاء اللہ صبح ہوں گی۔ آج زارون کو میں اپنے پاس رکھوں گا۔“ ابراہیم کی رنگت میں یکلخت سرخی ہی چھا گئی۔

”کیوں تکلیف کرتے ہو شرجیل احمد، ہمیں اس ننھے فرشتے سے کوئی پرالہم نہیں ہوگی۔“ اس کا باوقار انداز گفتگو اس کی طبیعت کی نفاست اور بروہاری شرجیل کو اس پر کچھ اور بھی پیارا آیا۔

”بہت دن ہوئے اپنی الجھنوں میں گم ہو کر میں نے اپنے بیٹے کو جی بھر کے دیکھا بھی نہیں ہے۔ آج اپنے ساتھ سلاؤں گا تو بہت پرسکون نیند آئے گی مجھے۔“ اس کی آواز پر نمی اپنا غلبہ پانے لگی۔ ابراہیم نے اس کا کاندھا محبت سے تھپکا۔



سمعیہ نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو باہم جکڑ کر گویا بڑھتی ہوئی بے چینی اور گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔ دل اتنا تیز دھڑک رہا تھا کہ وہ اس کی دھک دھک باآسانی سن سکتی تھی۔ قسمت کی اس یادری سپہ کتنا حیران تھی کیا وہ اتنی خوش بخت بھی ہو سکتی ہے اسے لگا تھا وہ یکلخت اندھیروں سے روشنی میں آگئی ہو۔ اسے اپنے اندر مہک اٹھنے والے گلابوں کا نازگی بھرا احساس شانت کرنے لگا۔ شرجیل کے بتانے پر کہ وہ اس کا نکاح اپنے نو مسلم دوست سے کر رہا ہے اس کے احساسات نارمل ہی رہے تھے مگر جب اس کے اصرار پر جھجکتے ہوئے اس نے کچن کی کھڑکی سے ایک نظر ڈاکٹر ابراہیم کو دیکھا تھا تو گنگ رہ گئی تھی۔

چھ فٹ سے نکلے قد مضبوط چوڑے وجود اور دلکشی و



خوب روئی میں بے مثال نوجوان کو دیکھ کر اسے خود اپنے نصیب پر رشک آنے لگا تھا۔ تمام خوف اور خدشے اسی ایک خوشی کے احساس میں دم ہو گئے۔ نکاح کے ایجاب و قبول کے مراحل طے کرتے کرتے اسے لگا کہ شرجیل کے ساتھ آنے کا اس کا فیصلہ ہرگز بھی غلط نہیں تھا۔ شرجیل کی فراہم کردہ اشیاء سے اس نے پوری توجہ سے خود کو آراستہ کیا۔ ڈل گولڈن کام سے مزین لاٹک شرت اور چوڑی دار پاچا سے میں وہ ہر قسم کا سنگھار کر لینے کے باوجود وہ اس یونانی دیوتاؤں کی سی آن بان رکھنے والے شخص کے سامنے کتنی ماند لگ رہی تھی۔

”السلام علیکم! آپ کیسی ہیں سمعیہ۔“ ابراہیم احمد کا لب و لہجہ اس کے انداز و اطوار کی مانند بردبار تھا۔ سمعیہ کا وجود باقاعدہ کپکپانے لگا۔

”شرجیل احمد بتا رہے تھے آپ کو اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر میں پوچھتا چاہوں گا آپ خوش ہیں سمعیہ؟“ وہ اس کے سامنے بیٹھ کر اس رسانییت سے بات کر رہا تھا جو اس کے لہجے کا خاصا تھا۔

”جی..... جی..... بہت خوش ہوں.....!“ سمعیہ کے لیے اب جواب لازم تھا۔ ابراہیم جو اسے بغور دیکھ رہا تھا اس کے چہرے پر کھل اٹھنے والے دھنک رنگوں کو محسوس کر کے اسے ہنسی سے مسکرایا اور ہاتھ بڑھا کر اس کا لرزیدہ حنائی ہاتھ تھام لیا۔

”میں اب تک سنگدل تھا چونکہ ابھی شادی کا خیال نہیں تھا جیسی کوئی مستقل گھریا ٹھکانہ نہ بنا سکا۔ کچھ میرے کام کی نوعیت اس قسم کی ہے کہ میں کسی ایک جگہ قیام بھی نہیں کر سکتا مگر اب ان شاء اللہ ایک گھر کی بنیاد ڈالوں گا آپ ساتھ دیں گی نا میرا؟“ اس کی بات کے جواب میں سمعیہ نے جھینپ کر سر جھکائے ہوئے گویا اپنے ساتھ کا یقین ہونا تھا۔

”مجھے اللہ کا یہ فیصلہ دل سے قبول ہے اللہ مجھے اس ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھانے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔“

”تم آمین۔“ سمعیہ نے زیر لب کہا تو ابراہیم کھل کر مسکرایا تھا۔

سکندر نے پر ملال انداز میں چلتے راہ میں آئے پتھر کو ہلکی سی ٹھوکر لگائی اور سر داؤہ بھری تھی۔ اس کی اس شہر کراچی میں ایک خاص حیثیت تھی۔ پھر ہر نبوت کی موجودگی کے باعث وہاں جا کر اپنی حیثیت تسلیم کرنا ہرگز بھی مشکل نہیں تھا۔ اس نے اس شاندار بلند عمارت کے آگے کھڑے ہو کر خود کو ایک نظروں دیکھا اور خود اذیتی کا شکار ہو گیا اندر جانے کے بجائے وہیں سے پلٹ آیا تھا۔

”نہیں، میں ایسا نہیں کروں گا کیوں کروں؟ کس کی خاطر، لاریب..... جس کو میری پھر بھی ضرورت نہیں ہوگی اور میں اپنی حیثیت پر نہ شرمندہ ہوں نہ ملول۔ یہ حساب کتاب میں کیوں کروں، میں اس معاملے کو اللہ کے سپرد کیوں نہ کر دوں، وہ ہے نا بہتر انصاف کرنے والا؟“ اس نے فیصلہ کر لیا تھا وہ جانتا تھا اگر وہ اس حیثیت کو پا جاتا اپنا آپ تسلیم کر دالیتا تو اس کو اس بوبت تک پہنچا دینے والے لوگ نا خوش ناشاد ہوتے۔ شاید اس کی خاطر بد دعا بھی مانگتے۔ وہ تو پہلے ہی بے چینی کے حصار میں تھا۔

”نہیں لاریب میں ایسا نہیں کروں گا اس لیے بھی کہ اس کے بعد کا مرحلہ پھر سے تمہاری جانب لوٹ کر آنے کا ہوگا اور میں تمہیں دوسری مرتبہ اس آزمائش سے نہیں گزاروں گا۔“ اس نے ہونٹ پیچھے اور ذہن سے اس کی آخری تلخ یاد کو مٹانے کی سعی کرنے لگا۔ جب وہ اس کے رخصت کے سے اس کی پوری بات سے بغیر ہی اندر چلی گئی تھی۔

”ثابت ہوا لاریب یہ سفر ایک لا حاصل سفر تھا۔ سراسر سراب کا تعاقب، تمہیں کبھی بھی میری ضرورت نہیں تھی۔“ اس کی پریش نگاہوں میں وہ منظر لوہے لگا۔ جب اگلی صبح وہ اس وقت کمرے میں داخل ہوا تھا جب لاریب گہری نیند کی آغوش میں تھی مگر سکندر کی نگاہ اس کے داہنے گال پر حبت انگلیوں کے نشان پر الجھ گئی تھی۔ سکندر کو لگا تھا لکھت کسی نے اس کا کچھ نوج لیا ہوا۔

غم و غصے کی ایسی کیفیت تھی جس میں وہ خود پر کنٹرول کھو کر اس پر ہاتھ اٹھا بیٹھا تھا۔ یہ ملال اتنا گہرا تھا کہ وہ کسی طرح بھی خود کو اس تک بڑھنے سے نہیں روک سکا اور جس پل وہ اضطرابی کیفیت کے زیر اثر جھک کر اس کے رخسار کو چھونا چاہ رہا تھا لاریب نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ لاریب کی نظروں میں سلگتا نفرت بھرا احساس تھا، سکندر کا دل پارہ پارہ ہوتا چلا گیا۔

”دور رہو مجھ سے۔“ وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔ اس کا مخصوص تنفر پھر انداز تھا۔

”آئی ایم سوری لاریب..... مم.....!“

”اس کی ضرورت نہیں ہے تمہاری جانب سے بس اس ایک انتہا کی کسر تھی۔ صدمہ شکر کہ تم نے وہ بھی پوری کر دی مجھے کبھی بھول کر بھی یہ احساس نہیں ہوگا کہ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے۔“ لاریب نے جواباً سرد مہری کی انتہا کر دی سکندر نے بے اختیار نظریں جمالیں۔

”ہمارے بیچ جو کچھ بھی تھا لاریب میں نے بھی آپ سے شکایت نہیں کی اور کچھ نہیں آپ کو کم از کم اتنا تو خیال کرنا چاہیے تھا نا کہ میرا بھرم قائم رہ جاتا۔“ وہ کتنی عاجزی سے کہہ رہا تھا جواباً لاریب ذہر خند سے مسکرانے لگی۔

”ہمارے بیچ کوئی وعدہ وعید نہیں تھا مگر سکندر پر حیات، میں تمہاری کبھی پابند نہیں رہی۔ اس کے لہجے میں کتنی تھی۔ سکندر کو خاموش ہو جانا پڑا۔

”سوال ہوا علم کیا ہے تو پتا ہے کیا جواب ملا؟“ عباس حیدر چلتے ہوئے رک گیا۔ یہاں منعقد ہونے والے اجلاس میں وہ یونہی بے ارادہ چلا آیا۔ بے قرار یوں کا کوئی انت نہیں تھا۔ ”دلوں کا قرار اللہ کی یاد میں پوشیدہ ہے۔“ اس نے از سر نو یہ بات سنی تھی اور دل میں ترازو ہوتی محسوس کی تھی۔ وہ مسلمان تھا جانتا تھا یہ بات پھر کیوں غافل رہا اسے شرمندگی نے آن لیا۔

”سچ کہا ہے کسی نے کچھ غم ہر احساس سے ماورا کر کے صرف نقصان در نقصان جھولی میں ڈال جاتے ہیں۔ بلال

صاحب کچھ غلط تو نہیں کہتے تھے۔ وہ اسے سر راہ مل گئے تھے۔ اتفاقاً یا حادثاتی طور پر بلال صاحب کا یقین کامل تھا کہ یہ ٹکراؤ معجزاتی طور پر ہوا تھا اللہ کے ہاں تو کب سے یہ سب یونہی ہونا طے تھا بس مقررہ وقت آیا تھا۔ وہ کتنے غیر محسوس انداز میں اس کی زندگی میں شامل ہوتے چلے گئے تھے کہ شروع میں عباس محض مروت میں اور بعد میں دانستہ بھی ان سے جان نہیں چھڑا سکا۔ دعوت حق کا انداز اتنا دل نشیں تھا کہ وہ حتیٰ سے ان کی کوئی بات جھٹلائی نہیں پاتا تھا۔ وہ کبھی اسے گھر میں جوائن کرتے کبھی کال کر کے کتنے سرسری انداز میں بتایا کرتے۔

”عباس میں جمعہ کی نماز کے لیے جا رہا ہوں سوچا تمہیں بھی ساتھ لے لوں۔ باہر انتظار کر رہا ہوں بس دس منٹ میں آ جاؤ۔ وہ اتنا لادین نہیں تھا کہ منہ پر جواب دے مارتا۔ لحاظ اور مروت میں شروع ہونے والی ان بے قاعدہ نمازوں میں دھیرے دھیرے باقاعدگی آتی جا رہی تھی تو اس میں خدا کے فضل و کرم کے بعد بلال صاحب کی کوششوں کا اہم کردار تھا اور وہ اس کامیابی کے بعد کتنی سرشاری سے اسے کٹر کہا کرتے تھے۔

”تمہیں پتا ہے عباس میں کتنا منافع بخش کام کر رہا ہوں۔ جو تمہاری نیکیاں ہیں ان میں میرا بھی حصہ ہے۔“ اور عباس محض کا ندھے اچکا کر رہ جاتا مگر زیادہ عرصہ تک وہ یہ مروت نہیں نبھا سکتا تھا۔

”میں معذرت خواہ ہوں بلال بھائی۔ میں ایسی نماز نہیں پڑھتا چاہتا جس میں رغبت ہے نہ دل جمعی۔ ایسی عبادت کی تو اللہ کو بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ سمجھ سکتے ہیں نا آپ۔“ اور جواب میں بلال صاحب کتنے بے نیاز انداز میں مسکراتے تھے۔

”یہ ہمارا تمہارا نہیں، اللہ کا معاملہ ہے یا ر اسی پر چھوڑ دو۔ ویسے بھی نماز کو اللہ نے فرض کیا ہے دل نہ بھی کرے تو فرض کی ادا نیکی تو ضروری ہے نا جس رب نے فرض کی ادا نیکی کی تو فتنہ بخش دی ہے وہی رب رغبت اور دلجمعی بھی عطا فرما دے گا۔“ اور عباس لا جواب ہو کر رہ گیا تھا۔ یعنی



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ ٹاڈہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ام ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، ہارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

دین پر چلنے کی توفیق صرف اسے ہی دیتا ہے جس سے اللہ محبت کرتا ہے۔ تم جانتے ہو عباس میں تمہارے علاوہ بھی دن میں کتنے لوگوں کو نماز قرآن اللہ کے احکامات کی تعمیل کی دعوت دیتا ہوں مگر ان میں سب کے سب دعوت کو قبول نہیں کرتے۔ اس راہ پر صرف وہی چلتے ہیں جنہیں اللہ چلانا چاہتا ہے۔ ہدایت انہیں ملتی ہے جو منتخب ہو چکے ہیں۔ مبارک ہو تمہیں، تمہارا شمار انہی چنے ہوئے لوگوں میں ہوا ہے۔ وہ غم کیسے بڑا ہو سکتا ہے جس میں اللہ کی محبت اور قربت پوشیدہ ہو۔ وہ مسکرا کر اس کی تائید چاہ رہے تھے اور آنسو عباس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ شاید فی الحال وہ یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ عریضہ کو کھو کر ملنے والی یہ ہدایت اسے کتنی مانوس اور پیاری لگی ہے۔

”علم یہ ہے کہ تم پر کوئی ظلم کرے تو اسے معاف کر دو، اگر تعلقات توڑے تو جوڑ لو، اگر کوئی آپ کو محروم کرے تو اسے نواز دو اگر کسی سے انتقام لینا ہو تو درگزر کر دو، غصے میں بھی ایسی بات نہ کرو جس پر بعد میں ندامت ہو۔“ بلال صاحب کہہ رہے تھے اور عباس کا دل گواہی دے رہا تھا ہاں دین کی اصل تعلیمات یہی تھیں۔ اس نے مسکرا کر سر کو اثبات میں جنبش دی اور پوری توجہ سے انہیں سننے لگا۔

”آپ کو پتا ہے، قریب کیا ہے؟ قیامت اور قریب قریب تر، موت۔“

عجیب کیا ہے؟

دنیا

اور عجیب تر

طلب دنیا

واجب کیا ہے؟

توبہ

اور واجب تر؟

گناہوں سے بچنا

(انشاء اللہ باقی آئندہ ماہ)



ملے ہوا تھا کہ اسے نماز سے مفر نہیں ہے۔

”قرآن پاک کی تلاوت بھی کیا کرو عباس کیا تم نہیں چاہتے کہ جنت کو خدا تمہارا نصیب بنا دے۔ وہ جنت جہاں ہر شے حسب خواہش ملے گی عریضہ سے جدا کی نے تمہاری یہ حالت بنا دی ہے تو اسے دوبارہ پانے کا خیال تمہیں اس کوشش پر نہیں آسکتا؟“ اور عباس نے جانا تھا ان کے پاس کتنے لاتعداد طریقے تھے اس راہ کی جانب رغبت دلانے کے۔

”تمہیں پتا ہے عباس جب کوئی مرجاتا ہے تو اسے سب سے زیادہ کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے؟ مغفرت کی دعا کی، ایصالِ ثواب کی، صدقہ جاریہ کی، کیا تم نے اپنی وائف کے لیے یہ سب کچھ کیا؟“ سوال ہوا تھا اور اس کے اندر بے کراں وحشت پھیلتی چلی گئی۔ کسی آتش فشاں لاوے کی مانند ہر شے کو جھلساتا اجاڑتا اذیت کا احساس تھا جو ہر سوس پھیل گیا تھا وہ بھی سرتاپا جھلس گیا۔ وہ تو اس بل خود سے بھی نظریں چار نہیں کر پا رہا تھا۔ کون جانتا تھا اس نے عریضہ کے غم میں کیا کیا۔

دین کو تو جیسے وہ پہلے ہی بھولا ہوا تھا اس نے تو دنیا کو بھی فراموش کر ڈالا تھا۔ وہ گھر اور بچے جن سے عریضہ نے بے تحاشا محبت کی تھی وہ ان سے بھی غافل ہوتا چلا گیا۔ صرف یہی نہیں شراب نوشی میں مبتلا ہو کر خود پر غفلت اوڑھ لی، یعنی گناہ درگناہ، اللہ کی ناراضی کا مزید سامان۔ اس رات فاطمہ سے اتنی قربت بھی اس حرام شے کی غفلت کا شاخسانہ تھا۔ صد شکر کوئی بڑی حد نہیں عبور کی۔ کتنا شرمندہ تھا وہ عریضہ سے اللہ سے، حالانکہ شرمندہ ہونے کا حق تو اللہ کے سامنے تھا اور ڈرنے کا بھی۔

کیسی انمول کیفیت تھی جن سے اس سے قبل وہ کبھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ اس روز اس نے پشیمانی کے لاتعداد آنسو بہا ڈالے تھے۔ کتنا حقیر تھا وہ مگر اللہ نے پھر بھی اسے نگاہوں میں رکھا ہوا تھا۔ کبھی فراموش نہیں کیا۔ اس کی تمام تر فراموشی کے باوجود وہ اسے یاد رکھے ہوئے تھا۔

”اللہ پاک اسے بھی دیتا ہے جسے پسند نہیں کرتا لیکن



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سلیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

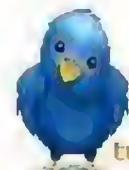
**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

مجھے کسے اذال  
احمد



خواب، خواہش، واہمہ ہے زندگی

ایک بھیانک حادثہ ہے زندگی

آج تک یہ مسئلہ سلجھا نہیں

میں خفا ہوں کہ خفا ہے زندگی

### گزشتہ قسط کا خلاصہ

اپنے بیڈروم میں فاطمہ کو دیکھ کر عباس شدید اشتعال کا مظاہرہ کرتا ہے جب ہی احسان بابا اس کے ایکسیڈنٹ اور فاطمہ کی موجودگی کا سبب بتا کر اسے تمام حقیقت بتاتے ہیں۔ فاطمہ عباس کی جانب سے لگائے گئے الزام پر خود اپنی ہی نظروں میں گر جاتی ہے۔ ابراہیم احمد کی وطن واپسی شرجیل اس کی مرضی سے سمعیہ کا نکاح کروا دیتا ہے۔ ابراہیم دراصل ایک فائر ہے اور اپنے والد کی خودکشی کے بعد بہن کی جدائی اور تلاش میں بھٹکتا شخص ہے جو دین اسلام قبول کرتا ہے اور اب ایک مذہبی اسکالر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ سمعیہ بھی اس کی ہمراہی میں انجانی خوشی محسوس کرتی ہے اور وہ دونوں زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ فراز کے طلاق دینے کی خبر پر تاؤ جی نہایت گرم ہوتے ہیں لیکن وہ انہیں اپنے معاملے میں دخل دینے سے صاف منع کر دیتا ہے۔ اریبہ کی واپسی کے لیے وہ آفاق چاچو کے بیٹے کی تلاش اور اس کی حیثیت تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے جس پر تاؤ جی مزید بھڑک اٹھتے ہیں۔ وہ خود ہی اریبہ کو گھر واپس لاتے ہیں جبکہ اریبہ بھی اپنے عمل پر نادم ہوتی ہے لیکن فراز کی طور سے معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اسامہ کی حالت بھرپور توجہ نہ ملنے کے باعث خراب ہو جاتی ہے تو احسان بابا فاطمہ کو گھر بلاتے ہیں لیکن اسی دوران عباس کی آمد پر فاطمہ بوکھلا جاتی ہے فاطمہ کی بچوں سے محبت کو دیکھتے عباس اسے اپنے بچوں کی گورنس کے طور پر گھر میں جگہ دیتا ہے لیکن جب مذہب کے فون کا اسے پتا چلتا ہے تو سختی سے فاطمہ سے تمام حقیقت

(اب آگے پڑھیے)

مشکل کیا ہے؟  
قبر میں اترنا

اور مشکل تر؟

عمل کے بغیر اترنا

”میرے بھائیوں ابھی وقت ہمارے ہاتھ میں ہے  
یعنی مہلت گزری نہیں ہے۔“

عباس مبہوت محفل پر لا تعداد افراد کی موجودگی کے باوجود سکوت طاری تھا۔ بلال صاحب کو اللہ تعالیٰ نے علم کی دولت سے خوب نوازا رکھا تھا۔ وہ اس خوب صورتی سے سزاو جزا کے معاملے کو پیش کرتے کہ دل آپ ہی اس جانب مائل ہوتا چلا جاتا تھا۔ عباس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا اور یقیناً دیگر سامعین کے ساتھ بھی۔

”اور جن لوگوں نے ہدایت پائی (اللہ نے) انہیں اور زیادہ ہدایت دی اور انہیں عطا کی پرہیز گاری۔“ (سورۃ محمد-15)

ان کی آواز میں ایک تاثیر تھی ایک جذب تھا جو براہ راست دلوں کو مسخر کرتا تھا بلکہ یہ تاثیر کلام اللہ میں تھی جو دلوں کو ہمیشہ سے اپنے آگے جھکا لی آتی ہے۔ بلال صاحب اب ان آیات کی تفسیر بیان کر رہے تھے۔ عباس کے سیل پر مسلسل وابہریشن ہونے لگی اس نے دانستہ توجہ نہیں دی۔ اس کا سارا دھیان بلال صاحب کی جانب تھا مگر فون کرنے والا بھی مستقل مزاج تھا۔ عباس کو سیل فون نکالنا پڑا۔ اسکرین پر احسان بابا کا نمبر روشن تھا۔ عباس اٹھ کر سائیڈ پر آ گیا۔

”خیریت احسان بابا؟“ اس کے لہجے میں فکر مندی تھی۔ وہ جانتا تھا احسان بابا اسے خواہ مخواہ کال نہیں کر سکتے۔ ”خیریت نہیں ہے صاحب“ آپ جلدی گھر پہنچیں فاطمہ بی بی سیڑھیوں سے گر گئی ہیں سر پر شدید چوٹ آئی ہے۔“ احسان بابا کے لہجے میں تشویش تھی۔ عباس کا موڈ البتہ خراب ہو گیا۔

”میں گھر آ کر کیا کروں گا بابا؟ آپ ڈاکٹر کو کال کریں یا اسے اسپتال لے جائیں۔“ اسے غصا رہا تھا۔ سیل فون جب میں رکھتے وہ واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

اس بات پر مطلق دھیان دے بغیر کہ اللہ نے حقوق

اللہ اور حقوق العباد میں حقوق العباد کو خود معاف کرنے کا بھی حکم نہیں سنایا۔ وہ فرماتا ہے جب تک میرے بندوں کے ذمہ تمہارے حقوق وہ خود معاف نہیں کریں گے میں بھی تم پر وہ حقوق معاف نہیں کروں گا۔ وہ علم کے سمندر میں اترنے جنت پانے کا طلبگار ضرور تھا مگر یہ حقیقت تھی کہ اس سمندر کے نایاب جواہر حاصل کرنے میں قاصر تھا۔ ایسا ہوتا ہے کہ ہم اپنے لیے آسان اور من پسند دین منتخب کرتے ہیں جو مشکل دشوار اور ناگوار محسوس ہوتا ہے اس سے چشم پوشی اختیار کر جاتے ہیں یہ چشم پوشی دانستہ گناہ ہے اور وہ اس کا مرتکب ہو رہا تھا۔



سورج کی کرنوں کی تپش آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ جب ٹپکتے ہوئے وقاص نے حویلی کے اندرونی حصے سے نکل کر پورچ کا رخ کیا اور گہرا سانس بھر کر پجارو کا دروازہ کھولا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر گنگناتے ہوئے اسے اشارت کی اور حویلی کے بلند آہنی گیٹ سے نکال لایا۔ ”ہاں کمدار کیا رپورٹ ہے؟“ جس وقت اس کے سیل فون پر گنگناہٹ ہوئی اس لمحے قریبی جامع مسجد سے بھی مغرب کی اذان کی پہلی پکار فضا میں گونجی تھی جس پر ہمیشہ کی طرح دھیان دیے بغیر وقاص اپنے من پسند مشغلوں میں گم رہا تھا۔

”اطلاع بالکل درست ہے چھوٹے سائیں وہ واقعی گاؤں چھوڑ کر جا چکا ہے۔ چھوٹی بی بی وہیں اس گھر پر اس کے بوڑھے والدین کے ہمراہ ہوئی ہیں۔ اس بات کو بھی ایک ہفتہ سے زیادہ ہونے کو آیا۔ مزید خبر یہ بھی ہے کہ چھوٹی حویلی سے آپ کے چاچا سائیں بی بی کو لینے بھی آئے مگر وہ گئی نہیں۔“

”کیسے جاتی کمدار اسے ہمارے کام جو آتا تھا۔“ وقاص نے مکروہ شیطانی قہقہہ لگایا۔

”اب میرے لیے کیا حکم ہے سرکار؟“

”آج رات اسے عزت و احترام کے ساتھ ڈیرے پر لے آؤ کمدار بس بہت کر لیا صبر مگر خیال رکھنا۔ رازداری



کے ساتھ احتیاط بہت ضروری ہے آگے میں خود سنبھال لوں گا میڈم صاحبہ کو۔ وہ موچکوں کو تازہ ہر خند ہوا۔



اس نے درو سے پھٹے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور آنکھیں سختی سے میچ لیں۔

”آپ کی طبیعت مجھے ابھی بھی ٹھیک نہیں لگتی فاطمہ بیٹے۔“ احسان بابا کی نظر اس پر تھی۔

”نہیں احسان بابا میں ٹھیک ہوں آپ پریشان نہ ہوں جا کر آرام کریں۔ دوائے گرم میں بھی سوتی ہوں۔“ اس نے محض ان کے لیے کہا تھا اور نہ حقیقت یہ تھی کہ اس کی طبیعت واقعی بہتر نہیں تھی۔

”میرا خیال ہے فاطمہ بیٹے مجھے حجاز کا آج یہاں آپ کے پاس بھیج دینا چاہیے۔ آج کی رات بچوں کو وہ دیکھ لے گی۔“ ان کی متشکر نگاہ اس کے زرد چہرے پر تھی۔

”آپ انہیں زحمت نہیں دیجیے بابا بچوں کی وجہ سے مجھے مسئلہ نہیں ہوتا۔“ اس نے نرمی سے کہتے بچوں پر پیار لگاتی نظر ڈالی۔ احسان بابا کسی قدر مطمئن ہوتے اسے دوا کے ساتھ دودھ لینے کی تاکید کرتے باہر چلے گئے۔

فاطمہ نے دوا پانی کے ساتھ نگلی اور خود بھی لیٹ گئی۔

تب خیال آیا کہ احسان بابا کے جانے کے بعد اس نے دروازہ اندر سے لاک نہیں کیا حالانکہ وہ جاتے ہوئے تاکید بھی کر گئے تھے۔ دروازہ لاک کر کے واپس آتے اس کا

دکھتا سر زور سے چکرایا تھا۔ بروقت بیڈ کا کونا تھام کر اس نے خود کو گرنے سے بچایا۔ تب اس کی نظر بچوں کے خالی فیڈر پر جا پڑی تو اس نے بے اختیار ہونٹ بھیج لیے۔ آج

طبیعت کی خرابی کے باعث اس اہم کام پر وہ دھیان نہیں دے سکی تھی۔ خانسامہ اس وقت اپنا کام مکمل کر کے اپنے

کمرے میں جا چکا ہوتا ہے۔ ناچار جیسے تیسے سہی اسے خود کچن میں آنا پڑا یہ الگ بات کہ وہ اس مختصر سے دور لیے میں دو سے تین مرتبہ چکرا کر گرتے پکچی تھی۔

کچن کی لائٹ جلا کر دودھ گرم کرنے کے دوران ہی اس نے فیڈر دھولیا تھا۔ ٹرے میں تینوں چیزیں رکھ کر وہ

جیسے ہی مڑی یکدم ہر سواندھیرا اچھا گیا۔ ٹرے چھوٹ کر فرش پر گر گئی ساتھ ہی وہ خود بھی زمین بوس ہوئی اگرچہ مضبوط توانا بازو اسے بروقت نہ تھام لیتے۔ فاطمہ کے جب تک حواس بحال ہوئے عباس اسے چھوڑ کر فاصلے پر جا کھڑا ہوا تھا۔ کچھ غصیلا کچھ جھنجھلایا ہوا انداز تھا۔

”اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں آپ؟“ اس نے شپٹائی ہوئی فاطمہ کو قہر آلود نظروں سے دیکھتے کوفت بھرے انداز میں سوال کیا۔ فاطمہ کا پہلے سے فق ہوا رنگ اور بھی پیلا پڑنے لگا۔

”مم..... میں دودھ گرم کرنے آئی تھی مگر.....!“ اس نے خفت زدہ انداز میں فرش پر پھیلے دودھ اور برتنوں کو دیکھا اور ہاتھ مسلے۔

”اور نہیں ہے دودھ؟“ عباس اس کی گھبراہٹ و شرمندگی سے یہی قیاس کر سکا۔ فاطمہ نے ہڑ بڑا کر اسے ایک نظر دیکھا اور پھر تاب نہ لاتے ہوئے تیزی سے نگاہ جھکالی۔ وہ قریب تھا متوجہ تھا۔ تمام تر جاذبیت دلکشی اور سحر انگیزی کے ہمراہ۔ اس سے بڑھ کر بھی اوسان خطا کرنے کا باعث کوئی بات ہو سکتی تھی۔ اس کا وجود مہک اٹھا۔

”ہے..... اور میں کر لیتی ہوں گرم؟“ وہ ہٹکائی تو عباس نے بے اختیار نوک دیا۔

”رہنے دیں آپ جائیں کمرے میں طبیعت ٹھیک نہیں ہے آپ کی؟“ اس کے دو ٹوک حکمانہ لہجے و انداز پر فاطمہ کی کیا مجال تھی انکار کرتی۔ فاطمہ کمرے میں پہنچی تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا عباس خود ٹرے سمیت موجود ہوگا۔

”آ..... آ..... آپ نے کیوں زحمت کی..... میں خود.....!“

”احسان بابا نے بتایا تھا چوٹ لگ گئی ہے آپ کو۔“ اب کے اس کا لہجہ پر رسان تھا۔ وہ خود کو یقین دلانا بھی چاہتی تو اس خوش بخشی پر ایمان نہیں لاسکتی تھی کہ وہ اس

ہمدردانہ انداز میں اس کی خیریت بھی دریافت کر سکتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک جوت سی جلی۔

”آپ کو اپنا خیال رکھنا چاہیے مس زندنی۔“ اس کے دل میں جل اٹھنے والی جوت نے اڑ کر اطراف میں ہر سو قندیلیں روشن کر دیں۔ اپنی جگہ وہ مسخوڑ بیٹھی تھی۔ اس کا دل چاہا چیخ چیخ کر ساری دنیا کو اس خوشی میں شریک کر لے اور کہے۔

”لوگوں سنو وہ تم گرنے نہیں ہے اسے میری پروا ہے دیکھو آج اس نے مجھے انمول کر دیا ہے“

اس نے آج پہلی بار میری خیریت دریافت کی ہے..... یک طرفہ محبت صرف ہجر و نارسانی بخشنے ضروری تو نہیں..... یہ محبت دان بھی کرتی ہے اور انمول بھی وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ کیسی خوشی تھی جس نے تکلیف کا سارا احساس تمام کر دیا تھا۔

”لائیں اسامہ کو مجھے دے دیں آج آپ ایک بچے کو سنبھال لیں کافی ہے۔“ عباس نے ہمدردی کے تاثر کے ساتھ جھک کر اسامہ کو اٹھایا۔ ایسا کرتے چند لمحوں کو سہی مگر وہ فاطمہ کے قریب تر آ گیا تھا۔ اس کے لمبوس سے اٹھتی اس کے وجود کی مسخوڑ کن خوشبو فاطمہ کے حواسوں پر چھائی چلی گئی۔ یہ لہجہ بھر کی بات تھی مگر وہ ان لمحوں کی گرفت میں صدیوں تک قید رہ سکتی تھی۔

عباس جا چکا تھا اس نے عباس کے الفاظ کو پوری جزئیات کے ساتھ از سر نو ذہن میں دہرایا اور مسکرا دی۔ اس کی بند مٹیوں میں ان گنت ستارے اور خوب صورت لمحوں کی رنگین تلیاں آ بسی تھیں۔ اس نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ اپنے ہاتھ سامنے کیے خوش رنگ لمحے سرک کر دور چلے گئے تھے مگر اپنے پیچھے یادوں کے دلنشین احساس اور خوشبو چھوڑ گئے تھے۔ جن کے آسروے وقت بہت آسانی سے کٹ سکتا تھا۔ اسے ایک بار پھر لگا اس نے غلط فیصلہ نہیں کیا تھا آسودگی و طمانیت کا بھرپور احساس اسے تھپک کر گہری نیند کی پرسکون وادیوں میں لے گیا۔



لاریب نے ٹھٹھک کر گردن موڑی کمرے میں جا رہا

خاموشی تھی اس نے مضطرب ہوتے کروٹ بدلی۔ سکندر کہیں نہیں تھا مگر ہر شے پر اس کی یاد کے نقش گہرے تھے۔ وہ حیران تھی اسے وہ یاد آ رہا تھا یا پھر وہ اس کی کمی محسوس کر رہی تھی۔ بے چینی کچھ اور بڑھی تو اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ سردیاں مکمل طور پر رخصت ہو چکی تھیں مگر رات کے دوسرے پہر خنکی کا احساس بڑھ جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ صحن میں سونے کو ابھی ترجیح نہیں دی جاتی تھی۔

”فرض تو مجھے کچھ بھی نہیں کرنا چاہیے حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے مگر میرے دل کو ایک یقین لاحق ہے کہ ایک دن آپ کی زندگی میں ایسا ضرور آئے گا کہ اگر آپ کو مجھ سے محبت نہ بھی ہوئی تو میری کمی ضرور محسوس ہوگی لیکن یہ ضروری نہیں کہ آپ کی اس کیفیت سے میں بھی فیض یاب ہو سکوں۔“ یہیں اسی پلر کے ساتھ ٹپک لگا کر سکندر نے یہ بات کتنے عجیب سے انداز میں کہی تھی۔ لاریب گم گم ہونے لگی۔ وہ جیسے خود سے بھاگ رہی تھی۔ جس بل وہ کمرے میں جانے کو مڑی اسی بل رات کے سنانے میں ایک غیر مانوس آہٹ ابھری۔ لاریب نے ٹھٹھک کر دیکھا اور اگلے لمحے جیسے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ چہرے کو نقاب میں چھپائے وہ کوئی لئیر تھا جو دیوار پھاند کر گھر میں گھسا تھا۔

”ک..... کون ہو تم.....؟“ اس نے چیخ کر کہنا چاہا مگر ہونٹوں پر مضبوط ہاتھ کی بے رحم گرفت نے اسے اتنی مہلت نہیں دی تھی اگلے چند لمحوں میں بے ہوشی کی دوانے اثر دکھایا تھا اور اس کا مزاحمت کرتا وجود ریشلی دیوار کی مانند ڈھلتا جا رہا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے جس جگہ خود کو پایا وہ اس کے لیے قطعی غیر شناسا تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر قیامت اپنے نزدیک وقاص حیدر کی موجودگی تھی۔ وہ تڑپ اٹھنے کے انداز میں تیزی سے سیدھی ہوئی اور اپنا ڈھلک جانے والا دوپٹا اٹھایا۔ وقاص اس کی گھبراہٹ و سراپیمگی سے حظ اٹھاتا قہقہہ لگانے میں مصروف تھا۔ لاریب اس کی جرأت کے مظاہرے پر سکتے میں مبتلا جب یہ سکتہ ٹوٹا تو اس کے اندر غمیض کا سمندر ابل پڑا تھا۔

”کچھ بولو گی نہیں؟“ وہ اسے تسخرانہ نظروں سے گھورتا



مصطفیٰ اڑانے والے انداز میں بولا۔

”تمہاری اس جرأت کا مطلب کیا ہے وقاص؟ جانتے ہو کیا کر چلے ہو اپنے ساتھ؟“ بلا خروہ ضبط کھو کر پھنکاری تھی۔ وقاص پھر قہقہہ لگانے لگا۔

”ہاں جانتا ہوں نیکی کر چکا ہوں اپنے ساتھ حسرت نہیں بنایا کرتا اپنی کسی خواہش کو۔“ وہ اس کی جانب لپکا اور اس کا چہرہ اپنے سخت فولادی ہاتھ میں دبوج لیا۔ لاریب بن پانی کے پھٹکی کی مانند تڑپی۔ پہلی بار خوف اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرطہ بن کر دوڑا۔

”مجھے چھوڑ دو وقاص تمہیں جو بھی کہنا ہے کہو میں سن رہی ہوں مگر.....!“

”مگر کیا.....؟ چھوڑ دوں گا نہیں آج سارے بدلے چکانے ہیں۔“ وقاص نے اسے کسی پلاسٹک کی گڑیا کی طرح اٹھا کر جہازی سائز بیڈ پر دے مارا تھا۔ اگلے لمحے وہ ایک ہی جست میں اس کے مقابل تھا۔ لاریب کے حلق سے بے اختیار خوفزدہ چیخ نکلی۔ اس سے قبل کہ وقاص اس پر جھپٹا لاریب اس کے قریب آنے سے قبل اٹھ کر اندھا دھند بھاگی تھی مگر زیادہ دور نہیں جا سکی وقاص نے پھر اسے قابو کر لیا تھا۔ اس نے جس درندگی اور وحشت سے اسے دبوچا تھا۔ لاریب کی قمیص کی آستین جو اس سے بچانی جھٹکے کے نتیجے میں دور تک چیرنی چلی گئی۔ لاریب نے ایک خوف کے عالم میں خود کو دیکھا اور شرم کے شدید احساس سمیت جیسے خود کو زمین میں گرھتا محسوس کیا۔

یہ وہی لاریب تھی جس نے اپنے شوہر کو بھی اتنی جرأت نہیں دی تھی کہاں وہ ایک غیر محرم کے رحم و کرم پر آگئی تھی۔ جب وقاص کی وحشت اور درندگی اسے ننگے کو بے تاب تھی اس سنسان ویران جگہ پر جہاں کسی کی مدد کی امید کا کوئی امکان نہیں تھا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ دل کی تمام شدتوں کے ساتھ اپنے خالق و مالک سے رابطہ بحال کرے۔

”مجھے اس وحشی سے بچالے میرے مالک اگر یہاں تو نے مجھے نہ بچایا تو مجھے یہ زندگی قبول نہیں ہوگی میں خود کشی

کر لوں گی۔“ وہ بری طرح سے ہلک رہی تھی۔ اسے گھسیٹ کر بیڈ تک لے جاتا وقاص یکدم تھرا کر مڑا اور اگلے لمحے یلکھت ڈھیر ہو گیا۔ اس کا گرائڈیل وجود جس طرح تورا کر گرا تھا اور جس شدت سے تڑپا تھا لاریب نے سنائے میں آتے ہوئے اسے ٹھنک کر دیکھا تو نگاہ اس کے پاس سے سرسرا کر گزرتے سانپ پر پڑی۔

وہ بے اختیار چیخی اور سرعت سے بیڈ پر چڑھ گئی۔ سانپ ہلک جھپکتے میں غائب ہو چکا تھا۔ مگر لاریب کے وجود میں دہشت، ہنوز پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے خود کو سنبھال کر ایک خوفزدہ نگاہ وقاص پر ڈالی جو بے کس اور جاں کنی کے عالم میں تھا۔ لاریب نے فی الفور نگاہ کا زاویہ بدلا اور اس انداز میں اس کا دل تشکر اور آنکھیں نمی سے بھرنے لگیں۔

اپنا دوپٹا سنبھالتی وہ ڈیرے سے باہر بھاگی۔ ماحول خوفناک سنائے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اطراف میں لگے دیو قامت درخت خوفناک لگ رہے تھے۔ اسے کچھ فاصلے پر وقاص کی گاڑی نظر آئی۔ گاڑی کی چابی کی ہول میں لٹک رہی تھی۔ یعنی اللہ ہر جگہ اس کی مدد کر رہا تھا۔ اس کے اندر تو انائیاں اور سکون بھرنے لگا۔ صبح ہونے میں ابھی بہت وقت تھا۔ اسے صبح ہونے سے قبل خود کو سیاہ سختی اور بدنامی کے اس غار سے نکالنا تھا۔ اس نے اندھا دھند گاڑی دوڑا دی۔ اسے یقین تھا جس رب نے اس کی یہاں اتنے خوب صورت انداز میں مدد کی ہے وہ آگے بھی اسے تنہا اور اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ اس کا یقین بے بنیاد بھی نہیں تھا۔



فراز نے ہاتھ بڑھا کر پہلے کیسٹ پلیئر کا والیوم بڑھایا پھر گاڑی کی رفتار بھی۔ مشہور و معروف شاہراہ پر رات کے اس پہر بھی ٹریفک کا اثر دھام تھا۔ آج اس کا گھر جانے کا موڈ نہیں تھا بلکہ اس کی پیچھے کی دنوں سے یہی روٹین تھی۔ جب سے اریبہ لونی تھی وہ گھر خاص طور پر بیڈ روم سے بھاگنے لگا تھا۔ تمام تر تعلق اپنا لینے کے باوجود فراز کو اس کا وجود کھٹکا رہتا۔ وجہ اس کی وہ تذلیل تھی جسے وہ جاننے کے باوجود بھلا نہیں پاتا تھا ورنہ کتنی بار معافی مانگ چکی تھی وہ

اس سے۔ معا گاڑی کے مائر زور سے چرچائے اگلے لمحے اسے یکدم بریک لگانی پڑی تھی۔ کوئی لمبا چوڑا وجود اس کی گاڑی سے ٹکرایا تھا۔

”اوہ شٹ.....!“ فراز بوکھلاتا ہوا تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

”یار خود کشی کا اتنا شوق تھا تو میرے بھائی کسی اور گاڑی کا انتخاب کرتے۔ تمہیں میں ہی نظر آیا تھا تھا نہ عدالتوں کے دھکے کھلانے کو۔“ وہ جھلاتا ہوا جا کر نوجوان پر جھکا جو سنبھل کر اسٹے کی کوشش کر رہا تھا۔ چوڑی پیشانی سے بہتا خون اس کے چہرے کو بھرتا جا رہا تھا۔

”افوہ..... اتنا خون اچھی خاصی چوٹ لگ گئی ہے تمہیں۔“ فراز نے گھبرا کر کہتے اپنے کوٹ کی جیب سے رد مال نکال کر زخمی نوجوان کی پیشانی کو صاف کرنا چاہا تو اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ پیچھے کر دیا۔

”آ جاؤ گاڑی میں بیٹھو میں دیکھتا ہوں اگر قسمت سے کوئی کلینک کھلا مل گیا تو مرہم پی کر ادیتا ہوں تمہاری۔“ اسے سہارا دیتے اٹھا کر وہ گاڑی کی جانب لانا چاہتا تھا کہ اس نے ایک بار پھر نرمی سے اس کا ہاتھ ہٹایا اور ٹوکتے ہوئے رسائییت سے گویا ہوا۔

”آپ کلٹی فیل نہ کریں جناب میں ٹھیک ہوں آپ جاسکتے ہیں۔“ فراز نے کشادہ دلی و بے نیازی کے اس عظیم الشان مظاہرے پر بے حد حیرانی سے آنکھیں پھیلا کر اس خوش اور سانولے سلونے نوجوان کو دیکھا جس کے حیکمے مگر سبک نقوش میں انوکھی جاذبیت اور دلکشی کا احساس جھلکتا تھا۔

”مجھے بھی سوشل ورک کا شوق نہیں ہے محترم۔ مگر آپ میری وجہ سے زخمی ہوئے ہیں اب یہ اخلاقی فرض ہے میرا کہ آپ کی مدد کروں اور آپ کے ٹھکانے تک پہنچا دوں۔“ فراز کے انداز میں کچھ ایسی بے ساختگی اور دوستانہ پن تھا کہ وہ اس کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھا۔

”کہاں سے بی لاٹک کرتے ہیں نام ہی بتا دیں کم از کم اپنا۔“ فراز اس کا اچھی طرح سرتا جا جائزہ لینے کے بعد اس سے کچھ مزید متاثر ہوا تھا مگر بات کرنے کا انداز وہی

بے تکلفانہ تھا جواب میں وہ جس طرح جھینپ کر مسکرایا فراز کے لیے یہ ایک دلچسپ نظارہ ہی تھا۔

”مسافر ہوں اور نام سکندر حیات ہے۔“ ”سکندر یعنی فتح کر لینے والا نام تو یونیک ہے سکندر اعظم صاحب اب تک کیا کچھ فتح کیا آپ نے؟“ فراز کا مخصوص موڈ بیدار ہو چکا تھا۔ اس آدی میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ فراز کو وہ پہلی نظر میں ہی اپنا اپنا سا لگا تھا۔ جیسی وہ اس سے بے تکان انداز میں بات چیت کرتا چلا گیا۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس کی گفتگو اس نے سکندر کے دل کو کس بے دردی سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ چہرے پر لرزے تار یک سائے کے ساتھ وہ آہستگی سے رخ پھیر کر کھڑکی سے باہر سڑک کے پار چمکتے سائیں بورڈ کو نکلنے لگا۔

”مبارک ہو ایک کلینک تو کھلا ملا آ جاؤ سکندر اعظم۔“ فراز نے گاڑی کلینک کے سامنے روک کر اپنے مخصوص بے تکلف انداز میں کہا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچا اتر۔ ”میں تمہیں اپنے گھر لے جاتا سکندر مگر میرا بھائی جو ڈاکٹر ہے نا آج اس کی ٹائٹ ڈیوٹی ہے اپنی دے پھر کبھی ملاؤں گا تمہیں اس سے۔“ وہ خود ہی بولے جا رہا تھا سکندر یوں خاموش تھا جیسے اب کبھی زبان نہیں کھولے گا۔

”کہاں جاؤ گے سکندر؟“ میں ڈراپ کر دوں کس ہوٹل میں رکے ہو؟“ مرہم پٹی کروانے کے بعد جب فراز اس کے ہمراہ کلینک سے باہر آیا تو پر خلوص انداز میں گویا ہوا۔ ”نہیں شکریہ خود چلا جاؤں گا میں آپ کا ایک بار پھر شکریہ۔“ سکندر نے سپاٹ انداز میں کہا اور قدموں کو مخالف سمت موڑ کر بے اعتنائی سے چل دیا۔ فراز تو اس کے انداز پر ہی ہنق و حق رہ گیا تھا۔

”ارے..... بات تو سن یار میرا نام فراز علوی ہے شرافت میرے ماتھے پر لکھی ہے۔ ارے سچ بچ اغوا نہیں کروں گا۔ آ جاؤ کر دوں ڈراپ کہاں آدھی رات کو کونوٹس کے لیے دھکے.....!“ وہ پکارتا رہ گیا مگر سکندر نے مڑ کر نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی جب ہی پلٹ کر دیکھنے والا پتھر کا ہو جاتا ہے۔ وہ یکدم ٹھنک کر ٹھم گیا اور جھٹکا کھا کر تیزی



سے پلٹا۔ دور بہت دور کھڑی گاڑی اپنی راہ لے چکی تھی۔ اس کی ہر لمحہ اندھیروں میں گم ہوتی ہیڈ لائٹس بھی بلا آخر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

سکندر کو زمین آسمان گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس نے لڑتی ٹانگوں پر قابو پانے کو قریبی پول کا سہارا لیا اور وہیں فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس کا بیک وہیں سیٹ پر دھرا رہ گیا تھا۔ وہ بیک جس میں اس کی شناخت کے بھی ثبوت تھے وہ خود کو ہواؤں میں ڈالتا محسوس کر رہا تھا۔



”مجھے تقریباً تمام اسلامی ممالک میں تبلیغی وزٹ پر جانے کا موقع میسر آیا ہے مگر جو اپنا پتہ و محبت مجھے پاکستان کے لوگوں سے ملی اس کا جواب نہیں۔ میں سمجھتا ہوں میرے قیام کے لیے بھی بہترین جگہ یہی ہوگی سعودیہ بھی مجھے پسند ہے اور امریکا تو خیر میرا جائے پیدائش ہے مگر شرجیل احمد ان دونوں جگہوں پر میں سمعیہ کو تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ تمہیں پتا ہے میں اکثر وزٹ پر ہوتا ہوں۔ پھر میری یہ بھی دلی خواہش ہے کہ میں ایک جامعہ تعمیر کراؤں۔ جہاں قرآن پاک کا علم دیا جاسکے۔ سمعیہ آپ بھی میرا ساتھ دیں گی نا اس کام میں؟“ شرجیل سے بات کرتے ہوئے ابراہیم احمد نے اچانک ہی سمعیہ کو گفتگو میں شامل کر لیا تھا۔ جو اس وقت چائے لے کر آئی تھی۔ سمعیہ نے مسکرا کر پوری آمادگی سے سرکواں بات میں جنم دیا۔

”میں زندگی کے ہر قدم پر آپ کے ساتھ ہوں ابراہیم احمد مگر مجھے قرآن پاک کو تلفظ کے ساتھ پڑھنا نہیں آتا۔ مجھے انتہائی شرمندگی ہو رہی ہے یہ بتاتے ہوئے کہ میں مذہب کے کبھی بھی اتنا قریب نہیں ہو سکی۔“ شرجیل زاروں کو دیکھنے کو اٹھا تو سمعیہ نے معصومیت سے کہا جواباً ابراہیم کی سنہری آنکھیں لودہ بن گئیں۔

”آپ نیت کریں سمعیہ اللہ مددگار ہوگا۔ ہمیں خدا کی زمین پر خدا کے دین کو پھیلانے کی کوشش کرنی ہے کہ یہی حکم خداوندی ہے۔ ہمیں صرف خود کو ہی نہیں سدھارنا ہمیں یہ سدھار خدا کے بندوں میں بھی پیدا کرنا ہے۔“

”ان شاء اللہ۔“ سمعیہ نے مسکرا کر اس کی تائید کی تو شرجیل بھی پوری آمادگی سے سر ہلانے لگا۔

”ابراہیم احمد اگر تم لوگ پاکستان میں بلکہ میرے ساتھ یہاں رہو تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی اس طرح میں اپنی جاب جاری رکھنے کے ساتھ تمہارے اس مشن میں بھی شریک ہو سکتا ہوں۔“

”کیوں نہیں مجھے بھی خوشی ہوگی۔ سمعیہ بہتر ہے آپ آج سے ہی کسی اچھے جامعہ کو جوائن کر لیں شرجیل احمد تو میرے ساتھ ہوتے ہیں۔“ ابراہیم احمد کے کہنے پر سمعیہ نے آمادگی ظاہر کرتے ہوئے شرجیل سے اداروں کو لے لیا۔

”آپ چائے لیں پلیز ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ سمعیہ پر نگاہ ڈالتے ہوئے ہر بار شرجیل کا دل خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جاتا۔ جس نے اسے آسمان میں سرخرو کر دیا تھا۔

”ابراہیم احمد اس روز آپ کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ آپ کو آپ کی بہن ملی پھر.....؟“ شرجیل کسی خیال کے آنے پر چونک کر متوجہ ہوا ابراہیم احمد ہنسی سے مسکرایا۔

”میں تلاش میں ہوں۔ جب اللہ کا حکم ہوگا وہ مل جائے گی۔“

”آپ کی مٹی نے بتایا کہ وہ پاکستان میں ہے؟“ شرجیل کا انداز پر سوچ تھا۔ ابراہیم احمد نے کاندھے اچکائے۔

”مگر میرا دل نہیں مانتا کیتھی بہت ریزروڈ اور شاکی گرل تھی۔ عام لڑکیوں سے یکسر مختلف۔ مٹی اس کی شادی اپنے اسٹیپ سن دیو سے کرنے کی خواہش مند تھیں۔ دیو معقول انسان تھا مگر کیتھی اسے پسند نہیں کرتی۔“

”آپ کی مدر ہندو ہیں اور قادر کرچن؟“ شرجیل کو اچنبھا ہوا۔

”جی..... مگر میں الحمد للہ مسلمان۔ مجھے کیتھی کی بھی اسی لیے تلاش ہے میں اپنی بہن کو بھی اللہ کی پہچان دے کر بھگنے سے بچانے کا متمنی ہوں۔ میں نے مٹی کو بھی قائل کرنے کی کوشش کی تھی مگر.....؟“ وہ خاموش ہو گیا اس کے خوبصورت چہرے پر تکلیف وہ تاثر آ گیا تھا۔ جب سریتا دیوی نے

اسے دعوت حق دینے پر دھتکارا تھا۔ ایسے ایسے کفریہ فقرے کہ ابراہیم کی روح تک اذیت سے بچ گئی تھی۔ اس نے جانے کتنی بار اللہ سے معافی طلب کی تھی مگر دل کا بوجھ نہیں اترتا تھا۔ وہ ان کی محبت میں ان کی بہتری کا خواہاں تھا مگر سریتا دیوی جو اپنے دھرم کے متعلق بے حد پوزے سوتھیں بیٹے کو مسلمان پا کر ان کے اندر ایسا ہیجان اترتا تھا کہ الامان۔ انہوں نے بیٹے کو گالیاں کوسنے اور بددعائیں دیتے دھکے مار کر وہاں سے نکال کر کبھی شکل نہ دکھانے کا حکم بھی صادر کر ڈالا تھا۔ شرجیل بہت محبت سے ابراہیم احمد کو دیکھتا رہا۔



”میں کیا کروں اب وہ سکندر اعظم تو مجھے ملتے نہیں۔“ آج مسلسل چوتھا دن تھا فراز کو بیک سمیت شہر بھر کی سڑکوں کی خاک چھانٹتے روزانہ وہ کتنا پیٹرول پھونک ڈالتا تھا امانت دار تک اس کی امانت پہنچانے کی خواہش میں مگر وہ تو جیسے گدھے کے سر سے سینک کی طرح غائب تھا۔

”نہ اتنا نہ پتا اور محترم اپنی زنبیل میرے پاس چھوڑ گئے۔“ وہ بری طرح جھنجھلایا تھا جب زنبیل نے دستک دینے کے بعد اندر قدم رکھا۔

”آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی مگر آپ دستیاب ہی نہیں ہوتے۔“ زنبیل کے انداز میں شکوہ تھا۔ فراز نے سگریٹ سلگاتے اسے اچھتی نگاہ سے نوازا۔

”ہاں بولو۔“ اس نے بے نیازی سے کہا۔

”کیا بولوں؟ اگر آپ کو خود احساس نہیں ہے تو.....!“ زنبیل کے انداز میں محسوس کیا جانے والا رنج و ملال تھا۔ فراز نے بھنوں میں اچکا کر اسے ناراض نظروں سے دیکھا۔

یاد ہو تو ایمان بھابی پر ہونے والے مظالم کے سب سے بڑے مخالف آپ ہی تھے۔ شرجی بھائی کو ان کی کوتاہی اور گھر کی بزرگ خواہش کو زیادتی کا احساس دلانے کی خاطر آپ نے جھگڑے بھی کیے تھے۔“ زنبیل کا لہجہ ناچاہتے ہوئے بھی سرد مہری اور طنز سمیٹ لایا۔ فراز کا ماتھا ٹھنکا اس نے کاٹ دار نظروں سے زنبیل کو دیکھا۔

”تو.....؟“ اس کی نظروں کی طرح اس کا انداز بھی سرد تھا۔

”اطلاعاً عرض ہے ہمارے گھر میں تاریخ کو تیسری مرتبہ دہرایا جا رہا ہے۔ آفاق چاچو کے بعد ایمان بھابی اور..... اور اب اریبہ بھابی کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ لیکن آپ کو تو میں خواہ مخواہ بتا رہا ہوں آپ کی ہی تو ایماء پر ہو رہا ہے یہ سب کچھ۔“ اس کے لہجے میں طنز کی گہری کاٹ تھی۔ فراز کے چہرے کی سرد مہری اور نخوت نے زنبیل کو دلی صدمے سے دوچار کیا تھا۔

”بھائی آپ کبھی بھی ایسے نہیں تھے۔“ زنبیل احتجاج کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

”کسی دن گھر پر رک کر دیکھیں ماما اور تائی ماں سمیت صالحہ بیگم بھی بھابی کو سارا دن کیسے نارچہ کرتی ہیں۔ بات بات پر طنز و تشبیہ اور ہتک کا نشانہ بننا پڑتا ہے انہیں۔ ایسا کون سا جرم سرزد ہوا ہے ان سے کہ آپ معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہیں اور اگر معاف نہیں کر سکتے تو ٹھیک ہے پھر طلاق دے دیں انہیں کم از کم اس جہنم سے تو.....!“ اس کی بات ادھوری رہ گئی چھانٹنے کی آواز پر زنبیل کے ساتھ فراز نے بھی چونکتے ہوئے پلٹ کر دیکھا تھا۔ اریبہ دروازے پر زرد چہرے لیے کھڑی تھی۔ چائے کے لوازمات سے بچی ٹرے میں بوس ہو چکی تھی۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے آگئی ہیں محترمہ ان سے پوچھ لو اگر یہ اس طرح نجات چاہتی ہیں تو میں ابھی.....!“

”پلیز‘ فارگاڈ سیک..... فارگاڈ سیک زنبیل بھائی۔“ فراز کی بات قطع کرتے ہوئے وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بلک اٹھی۔ جہاں فراز کے ہونٹوں پر جستانی ہوئی طنزیہ مسکان اتری تھی وہاں زنبیل دہری اذیت کا شکار ہو گیا تھا۔

”کسی بھی شے کو بے ہمدی سے توڑنے کی عادت پرانی سہی مگر اب اسے بدل ڈالو ورنہ نقصان اٹھاؤ گی سمجھیں۔“ فراز نے دانت کچکا کر اریبہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

”مجھے فکس ہے فراز بھائی آپ کا جو روپ میں نے آج دیکھا اس سے تو میں کبھی آگاہ نہیں تھا۔“ زنبیل اس بات کے لیے کہ آپ نے آج مجھے غلط فہمی سے نکال دیا۔ آج تک میں سمجھتا رہا علوی ہاؤس میں بسنے والے درندہ



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



صفت بے مہر انسانوں میں کوئی.....!“

”نبیل.....؟“ فراز نے بے اختیار ٹوکا تو نبیل اسے اجنبی مگر دکھ بھری نظروں سے دیکھتا دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ یوں جیسے کسی وضاحت کی ضرورت نہ ہو کچھ سننے پر آمادہ نہ ہو۔

”تم کچھ نہیں جانتے ہو نبیل۔ بہتر ہے اس معاملے میں انوالومت ہو۔“ فراز کا لہجہ سخت تھا۔

”بے فکر رہیں میں آئندہ آپ کو کبھی کسی قسم کی تکلیف نہیں دوں گا۔ شرابی بھائی کو ٹھوکر کھا کر عقل تو آئی تھی مگر آپ کے بارے میں کیا کہوں؟“ نبیل نے غصے سے پلٹ جانا چاہا مگر فراز نے اس کا ہاتھ دبوچ لیا۔

”میں نے کہا نا آنکھوں دیکھے رہی یقین نہیں کر لینا چاہیے پس پردہ حقائق کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں۔“ فراز کے لہجے میں کچھ ایسا کرب تھا کہ نبیل چاہنے کے باوجود اس سے الگ نہیں ہو سکا۔ وہ اس کے کاندھے سے اپنی نم آنکھیں رگڑتے ہوئے اپنے درد کی ہر کیفیت اس پر آشکار کرتا چلا گیا کہ دل بے انتہا بوجھل تھا۔ شرجیل تھا نہیں کہ وہ اس سے کہہ لیتا۔

”اب بتاؤ گے میں کس حد تک قصور وار ہوں۔“ نبیل نے سر نہ ہٹ کر تھکے ہوئے انداز میں سر جھکا لیا۔

”مانتا ہوں بھابی نے حماقت کی مگر وہ اتنی قصور وار نہیں ہیں جتنی سزا.....!“

”نبیل فی الحال اس کی فیورمت کرو میرے دل میں اس کے لیے ذرہ برابر بھی گنجائش نہیں نکل رہی۔“ فراز نے بے اختیار ٹوکا اور پھر سے سگریٹ سلگا لیا۔ پھر سکندر کے بیگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”ایک اور مسئلہ ہے جان براور۔“ اس نے سکندر کے متعلق مختصر آیتایا۔

”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے بھائی آپ اس زنبیل کو کھولیں کچھ نہ کچھ تو سکندر اعظم کا سراغ مل ہی جائے گا۔“

نبیل نے صرف کہا نہیں بیگ اٹھا کر زپ کھولی اور اسے بیڈ پر الٹ دیا۔ ایک مردانہ سوٹ ایک فائل اور کچھ دیگر اشیاء فراز نے فائل کھولی تھی اگلے لمحے اس کے چہرے کے

تاثرات بدلتے گئے۔ وہ حیران و ششدر آنکھیں پھاڑے اک کے بعد دوسرا صفحہ پلٹ رہا تھا۔

.....

”سن لیے بیٹے کے کروت؟“ بابا جان نے اماں جان کو گھورتے ہوئے پھنکاری ہوئی نظر وقاص حیدر کے چہرے پر ڈالی جو ہلدی کی طرح پیلا نظر آ رہا تھا۔

”عباس کو تو خواخواہ ہی نکالا تھا میں نے آج احساس ہوا ہے میں اس کے ساتھ نا انصافی کا سلوک کرتا رہا ہوں ایسی شرمناک حرکتیں تو نہ کی تھیں اس نے۔ اس نے تو سر جھکا کر رکھ دیا ہے میرا۔“ وہ اپنی چھڑی پر دباؤ ڈالتے غصے میں ٹہل رہے تھے۔

”جی تو چاہتا ہے اسے یہیں سڑتا رہنے دوں شکل نہ دیکھو دوبارہ۔“ وہ جیسے صبح معنوں میں روہانے ہوئے رہے تھے۔ اماں جان بس سر جھکائے آنسو بہا رہی تھیں۔ عجیب دورا تھا زندگی کا وہ لاچار بے بس ماں تھیں جو کچھ انہوں نے سنا اس پر انہیں یقین نہ آتا تھا مگر سارے کے سارے شواہد وقاص کے خلاف جاتے تھے۔ وہ خون کے آنسو روتی تھکتی نہ تھیں مگر پھر بھی درد کم نہیں ہوتا تھا۔ بابا جان کے فون کی گھنٹی نے کمرے کے خاموش ماحول میں ہلچل مچادی۔

”ہاں ولیکم السلام کیا بات ہے زلیخا؟“ اماں جان بے دھیانی میں ان کی بھاری آواز سن رہی تھیں۔

”اوہ..... کب ہوئی طبیعت خراب اچھا تم ڈرائیو کے..... بلکہ رکو میں بتاتا ہوں تمہیں۔“ انہوں نے رابطہ منقطع کیا پھر تیزی سے اماں جان کی جانب مڑے جفا آنسو بھری آنکھوں سے وقاص کے چہرے کو نکلے جا رہی تھیں۔

”امامہ کی طبیعت خراب ہے اسے اسپتال لے جانا پڑے گا۔ تمہیں وہاں پہنچنے میں تو ٹائم لگ سکتا ہے زلیخا سے کہو وہ ڈرائیو کے ساتھ اسپتال لے آئے ادھر سے ہم چلتے ہیں۔“ بابا جان کے لہجے میں فکر مندی تھی۔ اماں جان نے ایک نظر انہیں دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ بابا جان پھر سے فون پر مصروف ہوئے تھے۔

”ہاں زلیخا تم جی کو گاڑی میں لے کر اسپتال روانہ ہو

ہم تمہیں وہیں ملتے ہیں امامہ کا خیال رکھنا۔“ وہ زلیخا کو خصوصی تاکید کرنے میں مصروف تھے۔ دادا بننے کی متوقع خوشی ابھی سے ان کے چہرے پر جگمگاہٹ بکھیر رہی تھی۔

”چلو اٹھو۔“ فون بند کر کے وہ فوری جانے کو تیار ہوئے اماں جزیر نظر آئیں۔

”آپ چلے جائیں میں یہیں ہوں وقاص کے پاس۔“ ان کے انداز کی بے اعتنائی نے بابا جان کی بارعب کشادہ پیشانی پر بل ڈال دیے تھے۔

”یہ دودھ پیتا بچہ نہیں ہے بیگم صاحبہ اس وقت بچی کو آپ کی ضرورت ہے انھیں فوراً۔“ ان کے لہجے میں مخصوص سختی تھی۔ وہی تحکمانہ انداز جس کے آگے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہیں ہوا کرتی تھی۔

”میں وقاص کو زخمی حالت میں کیسے چھوڑ کر چلی جاؤں۔“ زندگی کا یہ دوسرا موقع تھا انہوں نے شریک حیات کے کسی حکم کے سامنے اطاعت کے علاوہ اپنی بات رکھنے کی جرأت کی تھی۔ اس سے قبل وہ عباس کی خاطر بھی لڑ چکی تھیں مگر اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوا تھا بابا جان نے بے حد جھلا کر خفا نظروں سے انہیں دیکھا مگر ان کے چہرے پر جو بے چارگی اور بے بسی رقم تھی اس نے ان کے اندر بھرکتے الاؤ پر جیسے پانی کے چھینٹے ڈال دیے۔ کچھ دیر ہونٹ بھیجنے کھڑے رہے پھر کچھ کہے بغیر پلٹ گئے۔ اماں جان نے بچے آنسو دوئے کے پلو سے صاف کیے۔ پھر وقاص کی جانب متوجہ ہوئی۔ جس کے انداز میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ ان کے دل کو دھچکا سالگا۔

”وقاص حیدر کچھ دیر میں تم باپ بننے کی خبر سنو گے۔“ اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر انہوں نے نری سے کہا مقصد اس کی خاموشی کو توڑنا تھا۔ جس میں انہیں پھر نا کامی کا سامنا ہوا تو خود پر ضبط کھو کر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

”ایسے کیوں ہو میرے چاند۔ کچھ تو بولو؟ ماں کا کلیجہ پھٹتا ہے تمہیں اس طرح دیکھ کر کم مجھے اس طرح مت آزماؤ وقاص۔ ساری دنیا کچھ بھی کہے مجھے یقین نہیں

میری نظروں میں تم آج بھی ویسے ہو بے عیب بے داغ مجھ سے نظریں نہ چراؤ۔“ وہ اس کے کشادہ سینے سے لگیں بلکہ رہی تھیں۔ وقاص کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ نکلے۔ کون جانتا تھا بھلا ان آنسوؤں ان آہوں کی اصل وجہ کیا تھی کیا خبر تھی کسی کو آج اس نے کیا سمجھا کیا جانا کیا پایا تھا۔

.....

پودے اور درخت ساکت تھے۔ لاریب نے سرد آہ بھری اور اپنے کمرے میں آگئی جس کی نیم تاریکی میں قدرے خنکی کا احساس تھا۔ مگر دل کی آج تک اس ٹھنڈک کی رسائی کہاں ممکن تھی۔ اس کی سماعتوں میں ایک جانی پہچانی آواز کی سراسر اہٹ اترنے لگی۔

”محبت کی حدوں کا تعین کون کر سکتا ہے۔ آپ میری محبت نہیں سہہ سکیں تو میری جدائی کو ضرور سہہ جائیں گی۔“ لاریب کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔

”میں نے تمہیں خود کھو دیا سکندر۔“ اس نے نیچے بیٹھنے کے بعد دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیے۔

”میں تمہیں کھو کر ہی تمہاری قدر جان سکی ہوں۔ میں ہمیشہ سے ایسی ہی ہوں بے پروا مگر تم نے کبھی میری حفاظت میری ذمہ داری سے ہاتھ نہیں کھینچا تھا..... تم مجھے کیسے تنہا چھوڑ سکتے ہو۔“ وہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔

”میں جانتا ہوں میں آپ کی زندگی کی کتاب کا ایسا دیباچہ ہوں جس کو اگر پھاڑ بھی دیا جائے تو کتاب کی کہانی پر فرق نہیں پڑتا۔ اثر کم ہوتا ہے نہ جیسی کا عنصر اسی لیے آج اس بے کار صفحے کو میں خود اپنے ہاتھوں سے پھاڑ رہا ہوں۔“ اس نے جانے سے قبل کتنی مایوسی کے عالم میں کہا تھا۔

”میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں سکندر مجھے وہ کتاب کبھی اچھی نہیں لگی جس کا انتساب کسی کے نام نہ ہو۔ جس کا پیش لفظ نہ لکھا جائے۔ تم تو عمر بھر کے انتظار پر یقین رکھتے تھے نا سکندر اتنی جلدی کیسے ہمت ہار گئے؟“ اس کے آنسوؤں میں دکھ اور کرب کے ساتھ احتجاج کا بھی رنگ تھا۔ اس نے بھلا سکندر کو اس قابل ہی کب سمجھا تھا کہ اس







لڑکی پر مہربان ہو اور صراطِ مستقیم پر مضبوطی سے قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے..... آمین۔“

”ایک بات کہوں عباس بیٹے میرا خیال ہے تمہیں فاطمہ سے نکاح کر لینا چاہیے اگر وہ رضا مند ہو تو مجھے لگتا ہے اس نے تمہارے بچوں کو بہت اچھے انداز میں سنبھالا ہوا ہے جو تم اتنے بے فکر نظر آتے ہو۔“ انہوں نے جتنے نارمل انداز میں کہہ کر اسے پرسکون نظروں سے دیکھا عباس حیدر کو اسی قدر شدید دھچکا لگا تھا۔ اس کا چہرہ خشکت سرخ پڑ گیا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بلال بھائی۔“ وہ اس صدمے سے نکلا تو بے حد اذیت کا شکار ہونے لگا۔

”کیا تمہیں میری بات پسند نہیں آئی؟“ بلال صاحب اس کی شکل دیکھ رہے تھے۔ جس پر تاریک لڑتے سائے تھے۔

”میں جانتا ہوں تمہیں اپنی بیوی کی جدائی کا صدمہ سہنا پڑا ہے مگر بیٹے ابھی نہ سہی کچھ عرصہ بعد تم ضرور اس موضوع پر.....!“

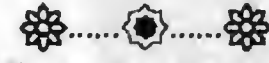
”بلال بھائی پلیز میں عریشہ کی جگہ ابھی تو کیا کبھی بھی کسی اور کو نہیں دے سکتا آپ کو نہیں پتا عریشہ میرے لیے کیا تھی اور میں نے اس سے کتنی شدید محبت کی۔ میں تو یہ سوچ کر حیران ہوا کرتا ہوں میں اس کے بغیر جی کیسے رہا ہوں۔“ بلال صاحب نے اس کی سبزا نکھوں کی سطح پر نمی کو پھیلنے دیکھا تو اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھے اور بے حد شفقت سے ساتھ لگا کر تھپکا۔

”یہی نظامِ قدرت ہے بیٹے اللہ کسی کو اس کی برداشت سے زیادہ دکھ نہیں دیتا۔“ وہ نرمی سے مسکرائے اور عباس نم آنکھیں جھکائے بیٹھا رہا۔

”خدا کی آزمائش کو سمجھو عباس حیدر اسے اپنے لیے سزا نہ بناؤ۔“

”یہ کیسے اندازہ ہو کہ یہ سزا ہے یا آزمائش اور میرے لیے ہی کیوں؟“ وہ بری طرح سے جھنجھلایا مگر بلال صاحب کے کھلے اور دہری نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

”جواب تو بہت آسان ہے عباس حیدر اللہ اگر آزمائش ہے تو ساتھ میں صبر و استقامت اور ایمان کی نعمت سے بھی نوازتا ہے۔ تمہیں اللہ نے اس اندھیرے سے ہی تو نکالا تھا جی تو تکلیف سے دوچار کیا۔ شکر کا مقام یہ ہے کہ تم ٹھوکر کھا کر گرنے والوں میں شامل نہیں ہوئے۔ تم نے اس رسی کو پکڑا ہے جو اللہ کی رسی ہے اس کے دوسری جانب جو ہے وہ بہت طاقت ور ہے۔ ہر شے پر قادر۔ عباس جہاں تک تمہارے اس شکوے کا تعلق ہے کہ میں ہی کیوں؟ تو ہم مخلوق ہیں ہم خالق سے یہ پوچھنے کی جرات اور تاب نہیں رکھتے کہ میں کیوں؟ اس بے نیاز کی مرضی ہے جو جس کے لیے جو چاہے فیصلہ کرے جو فرماتا ہے کہ تم مجھے عاجز نہیں کر سکتے مگر وہ رب ہے۔ وہ مالک ہے وہ بادشاہ ہے۔“



”سکندر اعظم تمہارا کیا خیال تھا کہ تم مجھ سے بچ کر بھاگ جاؤ گے؟“ اس سے قبل کہ مایوسی و دل گرتگی کا عالم انتہا کو چھوٹا ایک چمکتی ہوئی خوش باش آواز نے اس کی سماعتوں کو تھکا کر رکھ دیا۔ اگلے لمحے وہ ایک جھٹکے سے پلٹا اور غیر متوقع طور پر اس دن لڑکے کو رو برو پا کر گنگ ہونے لگا جس کی گاڑی میں وہ اپنی اہم ترین چیز بھول گیا تھا۔

”دیکھاؤ ہوٹل لیا تا میں نے تمہیں۔“ ادھر والہا نہ جوش اور وارفتگی کا عالم ہی انوکھا تھا۔ وہ ایسے اس سے لپٹا تھا جیسے صدیوں کی شناسائی کا دعویٰ دار ہو سکندر کی حیرانی میں مبتلا رہا۔

”مم..... میرا بیگ..... بیگ تھا آپ کے پاس۔“ سکندر نے اس کا جوش و خروش نظر انداز کرتے کسی قدر گریزاں انداز میں کہا۔

”بھئی سنا ضرور تھا دنیا مطلب دی او یا ز مگر تم سے ملنا توقع نہیں تھی مجھے۔“ وہ کیسے محل کر بولا تھا۔ سکندر کی تو آنکھیں پھٹنے لگی۔

”دیکھیے آپ کی مہربانی ہوگی اگر آپ میرا بیگ دے دیں اس میں میری کچھ اہم چیزیں ہیں۔“ سکندر نے کسی

قدر غصے میں کہتے اسے ٹوکا تو فرار کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

”مجھے اچھی طرح سے اندازہ ہے کہ اس میں آپ کا کس قسم کا اثاثہ ہے۔ سکندر حیات و لدا آفاق حیات علوی صاحب مگر آپ مجھے بتانا پسند کریں گے آپ کو یہ کام اتنی تاخیر سے کیوں سوچا؟“ فرار نے اپنی بات کے جواب میں سکندر کا منہ کھلتا اور رنگت پھینکی پڑتی دیکھی۔

”آئی ایم سوری یار کہ تمہارا بیگ کھول کر دیکھنا پڑا۔ مگر میرا سوال اپنی جگہ پر اہم ضرور ہے کہ میں منتظر ہوں جناب بقول شاعر

بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے  
بلکہ نہیں حق داتا آتے آتے.....“ وہ ایک بار پھر سنجیدگی چھوڑ کر اسی شوخ و شنگ موڈ میں آچکا تھا۔ شاید وہ فطرتا شوخ مزاج تھا مگر سکندر کی ہمتیں اس بل اس کا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔

”ک..... کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔“ اس نے متغیر رنگت کے ساتھ کہا تھا فرار زور سے ہنس دیا۔

”مطلب یہ کہ حسن اتفاق سے ہم آپس میں کزن ہوتے ہیں تمہارا مجھے پتا نہیں البتہ میں ضرور کھل اٹھا ہوں تمہیں پا کر۔“ سکندر پتھر لایا ہوا اس کی شکل دیکھتا رہا۔ جو اسے اس کی کہانی اپنی زبانی سنا رہا تھا۔



”الحمد للہ..... عربی کے الفاظ تین یا چار حروف سے بنتے ہیں۔ جنہیں ہم روٹ وڑ کہتے ہیں الحمد میں حمد سے حامد احمد حمید محمد محمود بناتے ہیں۔

حامد تعریف کرنے والا

احمد تعریف والا

حمید: خوب خوب تعریف والا

جب آپ قرآن کو لیٹرل ڈمیشن پر پڑھیں گے تو آپ بہت ہی لطف اندوز ہوں گے۔ جیسے سجدہ کا روٹ وڑ سجدہ ہے۔ اس سے مسجد ساجد اور سجدہ بنتا ہے۔“ شرجیل کے اصرار پر ابراہیم احمد جوان دنوں کی تبلیغی وزٹ پر نہیں تھا انیس قرآن پاک کو تلفظ کی درستگی کے ساتھ قرآن پاک

پڑھنا سکھارہا تھا۔ آغاز میں ابراہیم احمد کے طالب علموں میں صرف سمعیہ اور شرجیل تھے مگر بعد میں اس پاس کے گھروں سے بھی کچھ خواتین اور نوجوان لڑکے لڑکیوں نے آنا شروع کر دیا تو سمعیہ نے کمرے کے درمیان میں پردہ لگا کر خواتین و حضرات کی سہولت کی خاطر الگ الگ انتظام کر دیا تھا۔ اب ہر روز باقاعدہ کلاس ہوتی تھی۔

ابراہیم کے پڑھانے کا انداز آسان فہم اور دلچسپ تھا کہ شرجیل کا قرآن حکیم میں دلچسپی اور کھوج کا اشتیاق بڑھنے لگا تھا بھلا کون سا ایسا معاملہ یا مسئلہ تھا جو اس پاک کتاب میں حل نہیں کر دیا گیا تھا۔ اسے کبھی کی سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب میں پڑھی وہ اقتباس یاد آگئی جسے اس روز ابراہیم احمد نے بھی اس کے سامنے دہرایا تھا انہوں نے لکھا ہے۔

”جاہلیت کے دور کے بارے میں میں نے بہت کچھ پڑھا ہے قدیم و جدید فلسفہ سائنسی معاشیات سیاسیات وغیرہ ہر اچھی لا بریری دماغ میں اتار چکا مگر جب آنکھ کھول کر قرآن پاک کو پڑھا تو بخدا یوں محسوس ہوا جو کچھ پڑھا سب سچ تھا علم کی جزا اب ہاتھ آئی تھی۔ کانٹ بیگل مارکس اور دنیا کے تمام بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں۔ بے چاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں اچھے رہے اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں پھر بھی حل نہیں کر سکے ان بڑے بڑے مسائل کو اس کتاب قرآن پاک نے ایک ایک دو دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ میری اصل تحسن بس یہی کتاب ہے۔ اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے۔ حیوان سے انسان بنا دیا ہے تاریکیوں سے نکال کر روشنیوں میں لگائی اور ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا کہ زندگی کے جس معاملے کی طرف نظر ڈالتا ہوں حقیقت اس طرح بر ملا دکھائی دیتی ہے کہ گویا اس پردہ ہے ہی نہیں۔ مگر بڑی میں شاہ کلید کو ”ماسٹر کی“ کہتے ہیں۔ جس سے ہر نقل کھل جائے سو میرے لیے قرآن پاک شاہ کلید ہے۔“



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### مجموعہ خاص کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ام ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سلیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنگ نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

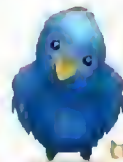
اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیگر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan

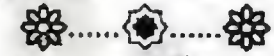
Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”ابراہیم احمد نے کہا تھا تم یقین کر سکتے ہو شرجیل احمد کہ بالکل یہی کیفیات میری ہیں۔ میں سید ابو الاعلیٰ مودودی کو بالکل برحق کہوں گا۔“ ابراہیم احمد قرآن پاک سکھاتے وقت قاعدوں کو بھی ذہن نشین کراتا تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ سمعیہ یا شرجیل کے ساتھ ساتھ دیگر لوگوں نے قرآن پاک پہلے نہیں پڑھا تھا ہاں مگر اس انداز میں نہیں پڑھا تھا جیسے پڑھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ شرجیل کو یہی احساس تو ہوا تھا کہ وہ کتنا غلط تلفظ کے ساتھ قرآن پاک پڑھتا رہا تھا۔ ابراہیم احمد کو قرآن پاک کی تلاوت کرتے سننے کے بعد قرآن پاک کو پھر سے سیکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ قرآن پاک کو صحیح ادائیگی کے ساتھ پڑھنا چاہتا تھا۔



اونچے پر بت نیلے ساگر  
پاگل بارش تم اور میں  
مہندی خوشبو کا جل آج کل  
بند تھیلی تم اور میں  
دور کہیں بارش میں بھیگی  
پہلی سرسوں تم اور میں

وہ سرشار تھی اس کا دل اک ترنگ میں گنگنا رہا تھا۔ نگاہ کے سامنے وہ دل کا مکین تھا اس کی آنکھیں ٹھنڈی تھیں۔ وہ دین میں جانے لگتی بار چوری چھپے اسے دیکھتی تھی اور گمن رہتی تھی۔ عباس کہیں باہر سے لوٹا تھا۔ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے وہ ٹھکے ہوئے انداز میں وہیں لاؤنج کے صوفے پر گرنے کے انداز میں لیٹ گیا تھا۔

جب تو چھیڑے زلفیں میری  
چندن خوشبو تم اور میں  
جنگل میں کوئی چھوٹا سا گھر  
مٹی کا چولہا تم اور میں  
ہر راہ ہر سو پھیلی خوشبو  
بارش بادل تم اور میں  
کندھا تیرا اور سر میرا  
پاگل ہی خوشبو تم اور میں

معا وہ ٹھٹک گئی۔ عباس کی انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ کا شعلہ کسی بل بھی اس کی انگلیوں کو جھلسا دیتا۔ فاطمہ بے خودی کی کیفیت میں آگے بڑھی۔ دیا سوئی ہوئی اس کی بانہوں میں تھی۔ اسے سنھا لے وہ ذرا سی جھکی اور عباس حیدر کی انگلیوں کے نیچ سے سگریٹ کا ٹکڑا نکال لیا۔ عباس کو آنکھیں کھول کر اور چونک کر اپنی سمت دیکھتے اس کی مسکان بیرونی جیسے پلک جھپکتے میں غائب ہو گئی۔ عباس کی نظروں میں پہلے حیرانی اتری تھی پھر غیر یقینی اور بے تحاشا طیش۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا تو تیزی سے پیچھے ہٹنے کی کوشش میں فاطمہ گرتے گرتے پچی تھی۔ اس سے قبل کہ مزید اپنا بچاؤ کر پاتی عباس نے اسے بے حد جارحانہ انداز میں کہنی سے پکڑ کر اپنے مقابل کھینچ لیا۔

”کیا کر رہی تھی تم؟“ وہ غرلا اور فاطمہ کا چہرہ فق ہوتا چلا گیا۔ ”کیوں کی یہ حرکت؟“ ”ہاؤ ڈیر یو؟“ ”کون ہو تم؟“ ”بتاؤ کس مقصد سے آئی ہو یہاں؟“ اس کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور گہری ہونے لگی۔ ”بتاؤ ورنہ میں تمہیں یہیں زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔“ وہ پھنکارا اس کے لہجے میں اتنی سنگینی تھی کہ فاطمہ کی جان ہوا ہونے لگی۔

”عباس حیدر.....!“ اس بار عب اور تنبیہی آواز میں ایسی لپک تھی کہ عباس نے ٹھٹکتے ہوئے پلٹ کر دیکھا اور جیسے حیرت غیر یقینی اور تعجب نے اس کے اعصاب کو سکتہ زدہ کر ڈالا تھا۔

”بابا جان۔“ اس کے ہونٹ کانٹے تھے اور ہاتھ بے جان ہو کر فاطمہ کے بازو پر گرفت ڈھیلی گر گیا۔ ”کیوں جھڑک رہے ہو ہماری بہو کو اس کی خاطر ساری دنیا کو ٹھکرا کر اب اس سے بھی جھگڑے کرتے رہتے ہو تم؟“ ان کے خفا خفا سے لہجے میں پتا نہیں تنبیہ تھی یا محبت کا رنگ وہ قطعی نہیں سمجھ پایا۔

(جاری ہے)









جب تصور مرا چپکے سے تجھے چھو جائے  
اپنی بر سانس سے مجھ کو تیری خوشبو آنے  
پیار میں ہم نے کوئی فرق نہ چھوڑا باقی  
جھیل میں عکس میرا ہو اور نظر تو آئے

### گزشتہ قسط کا خلاصہ

جلال صاحب کی نیک سیرتی عباس کے رویے میں مثبت تبدیلی کا سبب بن رہی تھی۔ فاطمہ کے ساتھ بھی اس کا رویہ بہتر ہوتا جا رہا تھا جبکہ فاطمہ کے دل کی سرزمین پر خوش گمانی کے بہت سے پھول کھل اٹھتے تھے۔ لاریب سکندر کی غیر موجودگی میں نہایت اداس رہتی ہے اپنے اس رویے کی وجہ خود بھی جاننے میں ناکام رہتی ہے۔ دوسری طرف وقاص لاریب کو اغوا کرنے اور اپنے عتاب کا نشانہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایسے میں تائید یابی ملنے پر لاریب وہاں سے روا فرار اختیار کرتی ہے اور یہ حادثہ اس کا سارا غرور خاک میں ملا دیتا ہے۔ دوسری طرف وقاص کے اس ٹکرہ فعل کا جب اس کے والدین کو پتا چلتا ہے تو انہیں کسی طور یقین نہیں آتا ایسے میں وقاص زندگی اور موت کی کشمکش میں جتنا خود اپنی ہی نظروں سے گر جاتا ہے۔ فراز اپنی تذلیل برداشت نہ کرتے ار یہ کو کسی طور معاف کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ نیل کے قائل کرنے پر وہ لاریب کی اصل حقیقت اس پر ظاہر کرتا ہے اسی پریشانی کے عالم میں اس کا ٹکراؤ سکندر سے ہوتا ہے وہ معذرت کرتے اس کی ڈریسنگ کراتا ہے جبکہ واپسی پر سکندر کا بیگ فراز کی گاڑی میں ہی رہ جاتا ہے۔ ابراہیم احمد سمعیہ کے ساتھ مل کر کلاسز کا آغاز کرتے ہیں جہاں وہ شریل اور دیگر بہت سے لوگ ابراہیم احمد کے ذریعے درس قرآن حاصل کرتے ہیں وہ انہیں مختصراً اپنی ماں کے خائف رویے اور اپنے مسلمان ہونے کا مختصر احوال بھی بتاتا ہے اور اپنی بہن

کے لیے فکر مند رہتا ہے۔ پاکستان میں اپنی بہن کی تلاش ابراہیم کا اہم مقصد ہے۔ فراز نیل کے کہنے پر بیگ کو کھولتا ہے۔ جب ہی تمام کاغذات کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے سکندر کوئی اور نہیں آفاق چاچو کا بیٹا اور اس کا کزن ہوتا ہے۔ یہ جان کر وہ سکندر کی تلاش میں لگتا ہے اور اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جبکہ دوسری طرف سکندر کو ان تمام حقائق کا علم ہو جانے کے بعد بھی کچھ خاص خوشی نہیں ہوتی۔ فراز کا رویہ اسے مزید الجھا دیتا ہے۔ لاریب اس حادثہ کا ذکر کسی سے نہیں کرتی لیکن دل ہی دل میں یہ خوف اسے ہکان کیے رکھتا ہے کہ اگر وقاص نے یہ سب کو بتا دیا تو وہ کہیں کی منہ پائے گی ایسے میں بابا جان کے بلانے پر وہ بلا عذر وہاں جانے کی حامی بھر رہی ہے۔ فاطمہ کے والدین انداز عباس کو ایک مرتبہ پھر حیرت میں مبتلا کر دیتے ہیں وہ ایک بار اسے پھر شک کی نگاہ سے دیکھتا اور اس کے عزائم جاننا چاہتا ہے۔ وقاص کے غلط رویے پر بابا جان کو اپنی غلطیوں اور عباس کے ساتھ کی گئی نا انصافی کا اندازہ ہوتا ہے وہ تلافی کی غرض سے عباس کے یہاں آتے ہیں لیکن عباس کو فاطمہ پر غصہ کرتے دیکھ کر اسے اپنی بہن کو ڈانٹنے سے روک کر اسے حیرت میں مبتلا کر دیتے ہیں جبکہ فاطمہ بھی گنگ رہ جاتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)



بابا جان دونوں کی کیفیات سے محفوظ ہو کر مسکراتے اور بچے سے تعلق مٹھاتے آگے بڑھتے ہیں۔



”ضرور سمجھانا مگر اس طرح نہیں جیسے ابھی سمجھا رہے تھے اور یہ ہماری پوتی کو تو دکھاؤ ادھر۔“ ان کے لہجے میں خفیف سی شرارت اور شوخی تھی۔

”ماشاء اللہ بہت پیاری ہے بالکل تم دونوں کا عکس۔“ وہ بے حد محبت سے کہتے بچی کی اجلی روشن پیشانی پر بوسہ ثبت کر رہے تھے۔ عباس کے چہرے پر اک رنگ آ کر گزر گیا۔

”عباس بیٹھو، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ عباس خطرہ کی کیفیت میں ان کے مقابل ٹک گیا۔

”جو کچھ ہو چکا اسے بھلا کر واپس چلو بیٹے مجھے اعتراف ہے کہ میں نے تمہارے معاملے میں گنجائش رکھ کر نہیں سوچا اور شدت پسندی سے فیصلہ کیا۔ اس حوالی پر، ہماری محبت پر جتنا وقار کا حق ہے اس قدر تمہارا بھی ہے۔ میں تمہیں تمہارے حق سے محروم کر کے اللہ کے ہاں مجرم نہیں بننا چاہتا۔ مجھے یقین ہے تم میری کوتاہی کو معاف کر دو گے۔“ وہ شرمسار لہجے میں گویا تھے اور عباس ساکن بیٹھا تھا۔

”ہم سب کو تمہاری ضرورت سے بیٹے، خاص کر تمہاری ماں کو۔ تمہاری جدائی نے اسے مستقل مریض بنادیا ہے اس وقت اس کی سب سے بڑی حسرت تم سے ہے۔ تمہارے بیوی بچوں سے ملنے کی ہے۔ میں محض اپنی انا کی تسکین کی خاطر تمہارے ساتھ تمہاری ماں کو بھی بہت تڑپا چکا ہوں۔“ بابا جان اپنے سینے اس کی خاموشی کو اس کی ناراضی سمجھ رہے تھے بھی فاطمہ اسامہ کو اٹھائے اندر آئی تھی۔ بابا جان نے وارنل سے پوتے کو نے نہایت محبت سے بار بار اسے چوما۔

”یہ دلی عہد ہے ہمارا، میرا شہزادہ۔“ ان کے چہرے پر روشنی ہی چھا گئی۔

”یہ نہ سوچنا بیٹی کہ ہم نے رونمائی نہیں دی آپ کو بس آپ تیار ہو جاؤ میں ساتھ لے کر چل رہا ہوں تم لوگوں کو بھلے تم دو بچوں کی ماں بن گئی ہو مگر اپنی سانس تندوں کے لیے نئی دلہن ہی ہوگی تمہاری اماں جان سب رکھیں کریں

”میں تو سمجھا تھا کہ جب میں تمہارے گھر پہنچوں گا تم اپنی کسی فلم کا گانا گاتے اپنی بیوی کے آگے پیچھے پھرتے نظر آؤ گے مگر یہاں آ کر پتا چلا کہ تم تو بالکل مجھی نہیں بدلے۔ کم از کم یہ ہی یاد رکھ لیتے کہ اس لڑکی کی خاطر تم نے ہمیں چھوڑا تھا ماشاء اللہ ہماری بیٹی سے تو چاند کا ٹکڑا۔ تمہاری پسند پر فیکٹ ہے بیٹے۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا اور اپنا ہاتھ فاطمہ کے سر پر رکھ دیا۔ فاطمہ کی بوکھلاہٹ کا عالم دیکھنے والا تھا۔ اس نے شہنا کر عباس کو دیکھا۔ جو گنگ کھڑا تھا۔

”کیا تم دونوں کو میرا آنا اچھا نہیں لگا؟“ اب کے انہوں نے قدرے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

”ایسا نہیں ہے بابا جان آپ اتنا اچھا لگتے ہیں کہ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔“ عباس کے لیے خود کو سنبھالنے میں مشکل ہو رہی تھی۔

”بس میرا دل کیا تم سے ملنے کو سوچا آیا۔ تم یہ بتاؤ کیا تم ہماری بہو کو ہر وقت اسی طرح سہائے رکھتے ہو؟“ عباس جوان کی اس غیر متوقع آمد پر چکر لایا ہوا تھا ان کے اس قیاس پر جتنا بھی جزبہ ہوا ہو مگر اس غلط فہمی کو دور نہیں کر سکا تھا۔

”اگر بے بابا جان نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے پلیز ریلیکس اور فاطمہ جان میں اسامہ کو بھی لا کر بابا جان سے ملوانیں۔ سواری میں بتانا بھول گیا یہ میرے بابا جان ہیں اور بابا جان دیا اور اسامہ ہمارے جڑواں بچے ہیں۔“ وہ فاطمہ سے نظریں چرائے نارنل انداز میں بات کر رہا تھا مگر فاطمہ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتی بے چینی خطرہ اب اور وحشت سے آگاہ تھی۔ وہ حواس باختہ سی تیزی سے کمرے سے نکل بھاگی۔

”شہر کی بے مہار لڑکیوں میں یہی خامی ہوتی ہے بزرگوں سے بات کرنے کی تمیز بھی نہیں سکھاتے والدین، دیکھو پہلی بار ملی ہے مجھ سے مگر سلام بھی نہیں کیا۔“ انہوں نے عباس سے شکوہ کیا۔

”سواری بابا جان میں سمجھا دوں گا اسے آپ بیٹھیں میں چائے بنواتا ہوں۔“ وہ جیسے کسی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔



گی تمہاری۔" وہ بے حد محبتاً میزانداز میں کہہ رہے تھے۔  
 "فاطمہ کھڑی کیوں ہیں آپ؟ جائیں بابا جان کے لیے اچھی سی چائے بنا کر لائیں۔" فاطمہ کچن میں آئی تو اس کے سینے میں بھیگتے کپکپاتے ہاتھوں سے ہر شے پھسل رہی تھی۔

"ساجد چائے تم بناؤ اور شرابی ٹی وی لاؤنج میں لے آنا فاطمہ آپ اندر کمرے میں آ کر میری بات سنیں۔" عباس اس پر سرسری نگاہ ڈالتا خانساں کو ختم دے کر پلٹ گیا۔ فاطمہ کو اپنی سماعتوں پر شبہ ہونے لگا۔

"آپ جائیے میم۔" خانساں کے احساس دلانے پر اس کا پہلے سے بے قابو دل کچھ اور بھی اچھل پھیل ہو گیا۔

"آپ نے کیوں بلوایا ہے مجھے؟" عباس نے مضحکہ اڑاتی نظروں سے اس کا حق ہو جانے والا چہرہ دیکھا۔ "گھبرانے کی ایکٹنگ کرنے کی ضرورت ہے بھلا اس قسم کی صورت حال کی خواہش میں ہی تو تم یہاں اپنی حیثیت و مقام بھول کر غلط فہمی ہو۔ اتنا ہی فریفت ہو گئی تھیں، مجھ پر تم اپنا گھر اپنی فیملی اور اپنا مذہب تک چھوڑ دیا تم نے کس کی خاطر.....؟ میری خاطر میں نے سوچا تمہاری اس خواہش کو پورا کروں۔" اک اک لفظ نہایت درشت لہجے میں کہتا وہ جیسے ہی فاطمہ کے قریب آیا فاطمہ کی رنگت لمحوں میں زرد ہو گئی۔

کسی بے دردی ہتھوڑے کی ضرب لگی تھی۔

یہ وہ شخص تھا جسے دیوتا بنائے وہ کسی دہائی کی طرح پوجی آئی تھی ہر لمحہ جس پر وہ خود کو تار کرتی آئی تھی۔ یہ تھا اس کا اصل روپ، اتنا گھٹنا کہ وہ اس کی محبت کی پاکیزہ دے داغ چادر کو آلودہ کرنے پر تل گیا تھا یا پھر وہ اسے اتنا لوز کریکٹر سمجھتا تھا کہ وہ کسی کے بھی بستر کی زینت بن سکتی ہے۔ فاطمہ کو لگا اس کا دل پھٹ رہا ہو۔



"اچھے اکتائے ہوئے اور بے زار کیوں نظر آتے ہو سکندر اعظم؟" فراز نے اس کے ہمراہ چلتے ہوئے شرابی نظروں سے اٹا دیکھا تھا۔

"اچھے خاصے پنڈ سم ہو یا، خود کو میں ٹھن کر آج صبح کی لڑکیاں شائنگ گروٹ پر سنائی پر ہی جان دیتی ہیں اتنے امیر ہونے والے ہو عنقریب تمہیں اسٹائل بھی آنے چاہیں۔" فراز نے اس سے پاکیا دانٹا گانٹھ لیا تھا۔ شہر کے نامور سٹائل سے مل کر ساری صورت حال واضح کر کے اس نے سکندر کو اس کا حق دلوانے کی قانونی کارروائی مکمل کر لی تھی۔

"کیا کروں یا، پنڈ و جو ٹھہرا۔"

"پنڈ و نہیں تم تو مجھے درویش لگتے ہو۔" فیس سابق قلمی ہیرو اور ڈائریکٹر ساحر عباس کو جانتے ہو یا، پرئس ہے وہ بندہ قسم سے۔ وہ بھی کسی گاؤں سے ہی تعلق رکھتا ہے مگر کیا پر سنائی ہے بس دیکھتے رہ جاؤ۔" فراز جس شد و مد کے ساتھ عباس کی تعریفوں میں رطب اللسان تھا سکندر اسے دیکھتا رہ گیا۔

"کیا ہوا چپ کیوں ہو گئے، شاید تم نے کبھی دیکھا نہیں انہیں، میں تو بہت فتن ہوں ان کا ہر ٹیلی۔"

"میں جانتا ہوں۔" سکندر نے کہا مگر فراز اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

"یعنی تم سووی دیکھ چکے ہو ان کی۔" سکندر مسکرا دیا۔ "تم غلط سمجھے میں نے ان کی سووی کبھی نہیں دیکھی۔ البتہ حقیقت میں انہیں دیکھا ہے، وہ واقعی بہت پنڈ سم ہیں۔" فراز ختم سا گیا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو سکندر؟" فراز کے لہجے و انداز میں ہنوز غیر یقینی تھی۔

"میں جس جاگیر دار فیملی کے ہاں ملازمت کرتا رہا ہوں، عباس..... میرا مطلب ہے ساحر بابا سا میں کے بچتے ہیں۔" اب کی مرتبہ فراز سے نگاہ دانستہ چار نہیں کی۔ اپنی زندگی کے نشیب و فراز کسی کمزور سمجھ کی گرفت میں آ کر وہ اس کے سامنے عیاں کر چکا تھا۔

"اوہ..... تو لاریب ان کی فیملی تھیں۔" فراز دیکھ کی لپٹ میں آ کر کھڑا رہ گیا۔ سکندر کی آنکھیں ابورنگ تھیں وہ ہنوز دوسری سمت چہرہ کیے ہوئے تھا۔ فراز نے اس کے غصہ کی کوشش میں دہکتے چہرے کو بے حد رنج کی کیفیت



تکٹے لگا۔ سکندر کی سرخ آنکھوں میں ماضی کے لرزے  
سایوں کا تکلیف دہ تاثر تھا۔ فراز نے بے اختیار اپنا ہاتھ  
بڑھا کر اس کا ہاتھ نرمی و محبت سے دبایا۔

"میرا خیال ہے ہم دونوں کو وقت ضائع کیے بغیر  
دوسری شادی کر لینی چاہیے تم کیا کہتے ہو؟" فراز کا مقصد  
اس کا موڈ بدلنا تھا مگر سکندر ایسے احساسات سے جلد باہر  
آنے کی پوزیشن نہیں تھا۔

"ذرا ہماری محترماؤں کو بھی تو پتا چلنا چاہیے کہ ہم ہرگز  
گرے پڑے نہیں، مجھے تو ہر روز کوئی نہ کوئی لڑکی آئی لو،  
دل یو میری می بولتی ہے، تمہیں بولتی ہے؟" فراز نے بے تکلی  
بانگنا شروع کر دی تھیں سکندر جھلا کر اٹھ گیا۔

"کیا بکواس ہے یاد اور سنو مجھے تم گھر کب تک لے کر  
چلو گے تمہارے تاؤ جی کا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔ وہی قاتل  
ہیں تا میرے بابا کے۔" فراز نے حیران کن نظروں سے  
اسے دیکھا پھر نرمی سے مسکرایا۔

"کیا تم اس گھل کا بدلہ لو گے سکندر؟"

"دل تو چاہتا ہے کہ پوری دنیا کو آگ لگا دوں۔" اس  
نے مشتعل انداز میں کہا۔

"تمہیں اپنے گھر والوں کو تو ضرور اپنی خیریت کی  
اطلاع دینی چاہیے پریشان ہوں گے وہ لوگ۔" سکندر  
نے اس بات کو سن کر یوں ہونٹ بیچنے جیسے اندر سے اٹھتی  
ناگواری پر قابو پایا ہو۔

"کل ہم اپنے وکیل کے ساتھ گھر چلیں گے کارروائی  
تو چند منٹ کی ہوگی شاید، ویسے اگر تم چاہو تو انہیں کورٹ  
میں بھی طلب کیا جاسکتا ہے۔" فراز نے اس کے ہمراہ  
گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کا ہدعا جانا چاہا۔

"انہیں میرا مقصد کسی کا تماشہ لگانا یا دل آزادی نہیں  
ہے۔" فراز اس کے چہرے پر عجیب سی لاجپاری پا کر بے  
ساختہ مسکرایا تھا۔

"مجھے تمہاری شرافت پر ہرگز کوئی شبہ نہیں سکندر، لیکن  
کچھ فیصلے بگاڑ کی روک تھام کے لیے بھی کیے جاتے ہیں۔  
یہ طے ہے کہ وہ لوگ ہماری کے حق تو نہیں ہیں۔" فراز

میں دیکھا اور سرفا ہ بھری۔  
"یہاں کا بارانی کیو بہت مشہور ہے آؤ آج میں  
کرتے ہیں۔" فراز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اونچی آواز میں  
کہا۔ اس کا ذہن حاضر سے کٹ کر کہیں نادانستگی میں گم  
ہونے لگا۔

"یونو سکندر مجھے ہونٹنگ بہت پسند ہے میرا پس چلے  
تو دن میں ایک بار لازمی کسی ہوٹل میں کھانا کھاؤں  
مگر..."

وہ اپنے حوروں جیسے دلکش شباب کے ساتھ اس کے  
سامنے بیٹھی تھی۔ سکندر تو اسے نگاہ بھر کر دیکھنے سے بھی  
خائف رہا تھا کہ کہیں وہ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے  
پھلتے جذبوں کو نہ پالے۔

"او ہو... کھاتے کیوں نہیں ہو؟" وہ خود بروسٹ  
سے انصاف کر رہی تھی۔ سکندر گڑبڑا کر رہ گیا۔

"شادی کے بعد میں تو لڑنا عباس کے ساتھ دل میں  
ایک بار باہر کھانا کھایا کروں گی۔ حالانکہ باجوہتی ہیں کہ  
میں انہیں زیادہ تنگ نہ کیا کروں لیکن انہیں ہی تو تنگ  
کرنے کا مزہ آیا کرے گا۔ وہ کتنے حسین خواب چاہتی تھی  
جن کا برملا اظہار سکندر کے سامنے ہی ہوا کرتا۔ اماں چھوٹی  
تھی اور ایمان بڑی۔ ایسی باتوں پر تو خاص طور پر سرزنش یا  
ڈانٹ سننے کو ملا کرتی جبکہ وہ ایسی عمر میں تھی جہاں صرف  
خواب سجا کر تسلی نہیں ہوتی۔ اس شخص کے حوالے سے کسی  
سے سب کچھ شیئر کرنے کو بھی دل چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ وہ  
وقت تھا جب عباس امریکا سے تعلیم حاصل کر کے واپس آیا  
تھا اور شہر جا رہا تھا۔ شو بیز کو بھی جوائن کر لیا تھا اور بابا جان  
نے اسے حویلی سے بے دخل کر دیا تھا۔ مگر لاریب کی  
امیدیں اور یقین تھا ہی اتنا بچتے جو نوٹے پڑا مادہ نہیں تھا۔  
جب یقین نونا تو وہ خود نوٹ گئی تھی۔ جو کچھ سامنے آیا اس  
نے وہ سب کچھ بھی توڑ ڈالا پھر سب سے زیادہ نقصان  
سکندر کے حصے میں کیونکر آتا۔ سب سے زیادہ قریب تو  
وہی ہوا تھا اس کے)

"سکندر...؟" فراز کے ٹوکنے پر وہ چونک کر اسے



کے لہجے کی کڑواہٹ نے سکند کو عجیب نا فہم سے احساسات کا شکار کیا تھا۔

”کیا تم اپنے رشتوں سے نفرت کرتے ہو فراز؟“  
”میں مجرم سے نہیں جرم سے نفرت کرتا ہوں لیکن جرم کی روک تھام کے لیے مجرم کو سزا ملنا ضروری ہے۔“ فراز کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ سکندر کو فراز علوی کا یہ روپ اور بھی پیارا لگا۔



”بیٹی مبارک ہو وقاص حیدر، مجھے امید ہے اب تم لازمی اپنی بے حجابیوں اور بے باکیوں کو لگام دے لو گے۔“ بابا کا لہجہ سن کر تھنا ترش ہو گیا تھا اور تنہی تھا۔

سکندر نے جس وقت انہیں وقاص کی اس مازیا حرکت کا بتایا تھا وہ گنگ ہونے لگے تھے اس صدمہ سے کہ وہاں وقاص نے جس لڑکی کو اٹھوایا تھا وہ کوئی اور نہیں لاریب تھی۔ انہیں لگا تھا زمین ان کے پیروں تلے سے کھسک گئی ہو۔ بات ایسی تھی کہ جسے زبان پر لانا دشوار تھا۔

”لو آگئی تمہاری ماں اب اصرار کرے گی تمہیں لے چلوں تمہاری بیٹی دکھانے۔“ بابا جان نے موضوع بدل دیا۔ وقاص جانتا تھا وہ بہت انا پرست ہیں۔ صرف ان کا نہیں لاریب کا اور اپنا بھی پردہ رکھیں گے۔ یہ بدنامی صرف وقاص کی ہی تو نہیں تھی لاریب کی بھی تھی اور انہیں یہی گوارا نہیں تھا۔

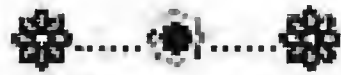
”اب کسی طبیعت ہے میرے چاند کی؟ جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ امام پوچھ رہی تھی تمہارا، بیٹی تو بہت ہی پیاری ہے، حویلی کے درو دیوار جاگ اٹھیں گے اس کی قاتقاریوں سے۔“ اماں جان بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔

”کب ڈسچارج ہو رہی ہے امام؟“ انہوں نے بیوی کو مخاطب کیا۔

”ڈاکٹر تو آج ہی ڈسچارج کر رہے تھے مگر وقاص کو کل ڈسچارج کیا جائے گا تو میں نے منع کر دیا۔ ہماری خواہش ہے بیٹا اور بھولیک ساتھ اپنے گھر خیر سے لوٹیں۔“

”ہے تو خوشی کا موقع، کیا خیال ہے بیگم صاحبہ اپنے باقی بچوں کو بھی نہ بلوائیں حویلی؟“ بابا جان کے کہنے پر

اماں جان کا چہرہ ایک دم جگمگانے لگا۔  
”اس سے انہی بھلا اور کیا بات ہو سکتی ہے مگر میرا عباس۔“ خوشی پر پھر یاس و ملال کا غلبہ چھانے لگا۔ بابا جان نے مسکراہٹ دبا لی وہ انہیں سر پر اتار دینے کا سوچے بیٹھے تھے۔



”کیا مصیبت آ پڑی ہے آخر تم لوگوں پر ذرا ذرا سے بچے نہیں سنبھالے جاتے؟“ بچوں کی چیخ و پکار پر عباس جھلایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ شیماکو دونوں بچوں کو چپ کرانے کی کوشش میں بلکان پا کر اس کا غصہ کچھ اور بڑھا۔  
”فاطمہ کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”پتا نہیں صاحب میں تو بچوں کے رونے کی آواز سن کر یہاں آئی تھی۔ بی بی صاحبہ تو کہیں بھی نہیں تھیں۔“ شیماکے جواب پر عباس کے ماتھے پر تاگواری سہٹ آئی۔  
”دیکھو اسے، یہیں کہیں ہوئی بلا کر لاؤ۔“ اس پر جھنجھلاہٹ ہو اٹھی۔

”کسی نے اسے کہیں جاتے ہوئے دیکھا؟“ عباس کی کیفیت عجیب تر ہونے لگی۔

”صاحبہ واج میں کہہ رہا ہے کہ اس نے آج صبح فاطمہ بی بی کو باہر جاتے دیکھا تھا۔“ احسان بابا کچھ دیر میں نئی اطلاع کے ساتھ چلتے۔

”ٹھیک ہے تم لوگ جا کر اپنا اپنا کام کرو شیماتم بچوں کا خیال رکھنا“ وہ غلٹ میں کہتا گاڑی کی چابی اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔ سارے راستے اس کا دماغ کھولتا رہا تھا۔

”فاطمہ صاحبہ ہیں گھر پر؟“ اس نے گاڑی پارکنگ میں روکی تھی اور اگلے چند منٹ بعد وہ اس کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ کال بیل کے جواب میں دروازہ ادھیڑ عمر خاتون نے کھولا۔ وہ اس سے قبل بھی ایک دو مرتبہ اسے فاطمہ کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔

”جی..... جی..... مگر ان کی طبیعت.....!“ ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ عباس اسے پیچھے کرنا اندر صس آیا تھا۔ ملازمہ بوکھلا کر اس کے پیچھا آئی۔



کرتے اس کے تن بدن میں تشکر اور نیاز مندی کا ایسا احساس ابھرا کہ وہ زمان و مکان فراموش کر کے وہیں بندے میں گر گئی۔ غیر یقینی و استعجاب کا مرحلہ بننا تو اسے اپنی خوش نصیبی پر پیارا آنے لگا۔ وہ جتنی سرشار تھی اس بندھن کے بندھنے پر عباس اسی قدر مضطرب اور بے کلم تھا۔

وہ اندر آ یا تو فاطمہ کے چہرے پر ایسی چمک اور تابانی اتری تھی جو اسے نظر لگ جانے کی حد تک پیارا اور دلکش روپ دینے لگی۔

”یہ محض ایک کاغذی رشتہ ہے۔ جو وقت کی نزاکت کے پیش نظر مجبوراً بندھا گیا ہے۔ واضح رہے کہ کاغذوں پر طے ہونے والے سوؤں کا تعلق دل و روح سے نہیں بندھا کرتا۔ عریشہ کے بعد کسی دوسری عورت کی گنجائش میری زندگی میں نہیں نکل سکتی۔ مجھ سے کبھی بھی کوئی توقع امید باندھنے کی کوشش نہ کرنا۔“ فاطمہ کو بھی اس سے بہت زیادہ توقعات نہیں تھیں اس کے باوجود عباس کا روکھا انداز اس کے سر سے بھرنے والے کلموں میں پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔

**قارئین کیلئے خوشخبری**

**آپ کا ہر ولعزیز ماہنامہ**

**پیکل**

اگست سے 320 صفحات پر مشتمل ہوگا جس میں آئینہ مشرق قلم کاروں کی تحریریں شامل ہوں گی

**قیمت 60 روپے**

”صاحب میری بات.....!“

”آپ کو پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے میں ان سے ضروری بات کرنے آیا ہوں۔“ عباس خاتون کی لٹنی کرانے کے بعد کچھ سنے بغیر فاطمہ کے کمرے میں چلا آیا۔

”ایسے چوروں کی طرح بھاگ کر آنے کا مقصد؟“

عباس کا لہجہ سرد تھا۔

”آ..... آپ..... مجھے غلط سمجھ رہے ہیں م..... میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔ مجھے جان سے مار ڈالیں مگر مجھے بری لڑکی نہ سمجھیں۔ مجھے چھوڑ دیں..... اللہ کے لیے میرا یقین کریں..... میں ہرگز ویسا کچھ نہیں کر سکتی جو آپ سمجھتے ہیں م..... میں مرجاؤں گی مگر.....!“ اس کے لہجے میں خوف تھا۔

”تم بھی غلط سمجھی ہو، میں ہرگز ویسا نہیں چاہتا جو تم سمجھی ہو۔“ عباس نے اس کا بازو جھٹکتے ہوئے کہا۔

”اگر تم رہنا دھونا بند کر دو مجھے کچھ اہم بات کرنی ہے تم سے۔“ عباس کی ڈانٹ پر فاطمہ نے سسکیوں کا گلا گھونٹنے کی ناکام کوشش کی۔

”جس وقت بابا جان آئے اس وقت کے خانے میں انہیں جو منظر نظر آیا وہ اسے ذہنی طور پر قبول کر کے اسی کے مطابق لبی ہو کر رہے ہیں۔ میں چاہنے کے باوجود ان کی غلط فہمی دور نہیں کر سکا۔ بات صرف سوری کر لینے سے ختم ہونے والی نہیں رہی۔ میں بہت کراٹھیکل پتھویشن میں پھنس چکا ہوں مجھے آپ سے ایک فیور چاہیے۔ آپ میرے ساتھ سپر میرج کر لیں ایکنیٹل میں بابا جان کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ میری بیوی نہیں ہیں.....!“ وہ اور بھی کچھ کہہ رہا تھا مگر فاطمہ کی غیر یقینی میں جتلا ہوتی سماعتیں اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھیں۔ اس نے جو کہا تھا وہ اتنا خوش فہم تھا کہ اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں رہا تھا۔

بلا آخر اس پر خدا نے مہربانی کر دی تھی۔ وہ یکدم خود کو کبکشاؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگی۔ اس کے بعد کا مرحلہ اک خواب کی کیفیت میں طے ہوا تھا۔ نکاح نامے پر سائن



تو آؤ۔ میں مناؤں تو نہ مانو۔ اپنے گناہگار کو تلافی کا ایک موقع تو تمہیں دینا چاہیے۔“ آنسو موتیوں کی طرح ٹوٹ کر اس کے گریبان میں گم ہونے لگے۔

”زارون کو تمہاری ضرورت ہے میری ساری دعا میں تمہارے نام ہو چکی ہیں میں ہر لمحہ اللہ سے تمہاری زندگی اور صحت مانگتا ہوں پتا نہیں کب قبول ہوگی یہ دعا۔“ وہ پھر بہت دنوں بعد اسی پہچان کا شکار ہوا تھا۔

”رٹیکس شرجیل، فیک اسٹ ایزی۔“ دروازے پر کھڑے ابراہیم احمد نے اس کی حالت خراب ہوتی محسوس کی تو تیزی سے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور کمرے سے باہر لے آیا۔

”خود کو سنبھالو شرجیل احمد، اللہ ہم سے زیادہ ہماری بھلائی چاہتا ہے۔“

”میں ٹوٹ رہا ہوں ابراہیم احمد اب مجھ سے اور برداشت نہیں ہوتا۔“ شرجیل نے ہاتھ سے گالوں پر پھسکتی نمی پونچھی۔

”اللہ بھی بھی ہمت سے بڑھ کر نہیں آزماتا کبھی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ ذرا سوچو ان کی خواہواستہ موت بھی واقع ہو سکتی تھی مگر اللہ نے تمہارے لیے امید کا ایک دیا جلتا چھوڑ دیا ہے۔ اپنے ایمان اور یقین کو مضبوط رکھو شرجیل احمد۔“ ابراہیم احمد بہت نرمی و محبت کے ساتھ اس کی ہمت بندھا رہا تھا۔

”مجھے بہت ڈر لگنے لگا ہے ابراہیم احمد اگر وہ بھی مجھے چھوڑ گئی تو.....؟“

”ایسا کیوں سوچتے ہو اللہ پر بھروسہ رکھو ان شاء اللہ بھالی بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”زارون اتنا بڑا ہو گیا ہے ابراہیم احمد مگر وہ اپنی ماں کی صورت اور لمس سے بھی نا آشنا ہے۔“ شرجیل کے لہجہ بھر کو رک جانے والے آنسو پھر سے رواں ہوئے اسے رہ رہ کر اپنی زیادتیاں یاد آ رہی تھیں۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا اللہ نے چاہا تو محمد زارون کو ماں کی محبت و شفقت بھی ضرور ملے گی۔“ ابراہیم نے مسکرا

”اور ہاں، یہ ذیل ہمارے بیچ ہوئی ہے اسے کسی تیسرے فریق تک نہیں پہنچنا چاہیے۔ دوسری اہم بات یہ کہ تمہارا قیام بچوں کے کمرے میں ہی رہے گا۔ اس بندھن کے بندھنے کی اصل وجہ میرے بچے ہی ہیں یا پھر بابا جان کی غلط فہمی، بہتر ہے کہ تم ان باتوں کو کبھی فراموش نہ کرو۔“ وہ پوری طرح اس کی اوقات اس پر واضح کر چکا تھا۔

وہ سارا دن عجیب گزرا تھا۔ تمام ملازم اس کی بدل جانے والی حیثیت سے آگاہ ہوئے تو اپنے اپنے انداز میں خوشی کا اظہار کرنے کے بعد مبارک باد دی تھی۔

”صاحب کا فیصلہ بروقت اور بالکل درست ہے مجھے بے حد خوشی ہے فاطمہ بیٹی۔“ احسان بابا کی شفقت و محبت پر اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

”بہتر ہوتا کہ صاحب چھوٹا مونا دلیر بھی کر لیتے مگر انہیں اپنے والد محترم پر یہ ظاہر نہیں کرنا کہ یہ نکاح ابھی ہوا ہے۔ شاید وہ کسی پر بھی نہیں ظاہر کرنا چاہتے۔ خیر ہم اپنے طور پر آج اس خوشی کو منائیں گے۔“ وہ مسکرا کر اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کر رہے تھے۔



پھڑے تو قربتوں کی دعا بھی نہ کر سکے اب کے تجھے سپرد خدا بھی نہ کر سکے تقسیم ہو کر رہ گئے خود گرجیوں میں ہم نام وفا کا قرض ادا بھی نہ کر سکے مازک مزاج لوگ تھے جیسے کہ آئینہ ٹوٹے پنجھ اس طرح کہ صدا بھی نہ کر سکے ہم غنڈہ رہے کہ کوئی مشق ستم ہو تم مصلحت شناس جفا بھی نہ کر سکے ایمان کو مسلسل ٹکٹی شرجیل کی آنکھوں میں غبار اترنے لگا۔ بھیختے ہوئے ہونٹ شدت جذبات سے لرز رہے۔

”توبہ ختم کر دی یہ تار خستہ کی ای؟ مان لیا کہ مجرم ہوں تمہارا تمہارا انتظار کرنی آنکھوں میں صحراؤں کی ریت اڑنے لگی ہے تم تو کبھی بھی ایسی ٹھوکر نہیں کہ میں بلاؤں



کر اس کا کاندھا پر امید انداز میں تھپتھپایا۔

.....

”تم نے اپنی تیاری مکمل تو کر لی ہے؟ عباس بیٹے؟“

بابا جان اس سے فون پر مخاطب تھے۔

”ایک گھنٹہ ہے تمہارے پاس میں پہنچ رہا ہوں۔ پھر اسٹھ گھنٹہ کے لیے نکلتے ہیں ٹھیک ہے؟“ عباس کا پہلے سے بوجھل دل ان کے اس الٹی میٹم پر مزید بوجھ سمیٹ ڈالیا تھا۔ عریضہ کی اس کے گھر والوں سے ملنے کی خواہش حسرتیں ڈھل گئی تھی یہ سوچ کر وہ حواس باختہ ہو رہا تھا۔ اسی لمحے فاطمہ وہاں چلی آئی تھی۔ دو آئی تو اپنی تیاری کا بتانے لگی مگر عباس کے چہرے پر جو وحشت چھلکاتے تاثرات تھے دیکھ کر وہ سب کچھ بھولنے لگی۔

”عباس.....!“ وہ چیختی اور ہراساں ہوتی خود کو اذیت دیتے عباس کی جانب لپکتی۔ عباس نے انہی وحشتوں کی فراوانی میں اسے چونک کر دیکھا تھا۔ اسے اس رات اپنے اوپر جھکی پریشان فاطمہ یاد آئی۔ اس ایک لڑکی کی ہی وجہ سے ہمیشہ اس کے نقصان ہوئے تھے۔ اس کے اندر وحشت تو کبھی ہی جنون اور نفرت کا طوفان اٹھ آیا وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا اور بنا سوچے سمجھے اسے اپنے ہاتھ کا زمانے دار پھینک دے مارا۔ فاطمہ ٹھنڈے بغیر صوفے پر جا گری۔ عباس کا قہر پھر بھی نہیں تھا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس تک آ یا۔

”میں نے کہا بھی تھا کہ اپنی اوقات مت بھولنا۔ اپنی حدود یاد رکھنا۔ میری ذات میں انوالو ہونے کی جرأت نہ کرنا۔“ وہ وحشت سے اسے دیکھنے لگی۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے بہتر ہوگا مجھے اپنی شکل نہ دکھاؤ۔“ فاطمہ کو اپنا ریزہ ریزہ وجود سمیٹ کر اٹھنا پڑا۔ طے پایا تھا کہ وہ کچھ بھی کر لے اس شخص کو جیتنے سے قاصر تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر بھی وہ کتنی دیر تک روتی رہی۔ معا اس کی ہچکیاں ٹھم گئیں۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”میں نہیں روؤں گی عباس حیدر۔ کہیں یہ آنسو میری محبت کی تدلیل نہ ثابت ہوں مجھے نہیں بھولنا چاہیے آپ سے محبت کی خواہش رکھنا میری اوقات

جب اسے بابا سائیں نے پیغام بھیج کر بلوایا تھا ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس کے پاس بھی ان کی تیار داری کا بہانہ تھا مگر جب وہ تندرست ہو گئے تو لاریب کے پاس رکنے کا کوئی بہانہ بھی نہیں رہا۔ اسے دھڑکا سا لگا رہتا بابا سائیں اس سے واپسی یا پھر سکندر کے متعلق کوئی سوال نہ کر لیں۔ سکندر کی اس طویل غیر حاضری کے حوالے سے بابا سائیں کے پاس کیا جواز ہے لاریب یہ بھی نہیں جانتی تھی مگر یہ طے تھا کہ اسے پلیٹ کروہاں نہیں جانا تھا۔ اب وہ کسی قیمت پر وقاص پر بھروسہ نہیں کر سکتی تھی۔

”لاریب۔۔۔ لاریب بیٹے۔“ بابا سائیں اسے پکارتے ہوئے آرہے تھے۔

”جی بابا جان۔“ اس کا لہجہ بوجھل مگر چہرے پر زبردستی کی مسکان تھی۔

”تمہارے بابا سائیں کا فون آیا ہے بیٹے، امامہ شہر کے اسپتال میں بے بیٹی کی نعمت سے نوازا ہے اللہ پاک نے اسے ہمیں چننا ہوگا آپ ذرا جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ بابا سائیں اپنی بات مکمل کر کے تیزی سے پلیٹ گئے۔ لاریب البتہ اپنی جگہ پر ساکت رہ گئی تھی۔ عجیب صورت حال تھی۔ ایک جانب بہن کی خوشی تھی دوسری جانب عزت کے درپے ہونے والا شخص کا سامنا اس کے قدموں میں زنجیریں ڈال رہا تھا۔

”بی بی جی بڑے سائیں آپ کو بلا رہے ہیں۔“ کچھ دیر میں ہی ملازمہ پھر ان کا پیغام لیے چلی آئی لاریب کو اٹھنا پڑا تھا۔ بعض معاملات میں انسان ناگواری کے باوجود مجبوریاں نبھانے کو خود کو مارتا رہتا ہے۔ لاریب کو بھی اس وقت ایسا ہی معاملہ درپیش تھا۔

”ٹھیک ہے تم چلو میں آتی ہوں۔“ لاریب کو تیاری میں دس منٹ لگے تھے آج اس نے دوپٹے کی بجائے چادر کا انتخاب کیا تھا۔ اس چادر میں اس کا نازک سراپا تقریباً چھپ گیا تھا۔



سے بہت بڑھ کر ہے۔" آنسو سختی سے پونچھتے ہوئے اس نے خود کو باور کرایا تھا۔

ملازمہ عباس کا پیغام لے کر آئی تو قاطعہ مارل انداز میں اٹھی جیسے کچھ دیر قبل اس کے احساسات مجروح ہوئے ہی نہ ہوں۔ عباس حیدر چونکہ اس کی دیوانگی سے آگاہ تھا نہ پاگل پن سے۔ تبھی کچھ جزبز کچھ خائف سا کچھ دیر بعد خود وہاں چلا آیا تھا۔ وہ اسے رو برو پا کر گھبرائی۔

"میں اور بچے تیار ہیں بس آ رہی تھی۔" اس کا لہجہ مارل تھا۔

"تم شادی کے بعد پہلی بار اپنے سسرال جا رہی ہو تیاری کرتے وقت اس بات کا خیال نہیں آیا تمہیں۔" وہ بولا تو اس کا لہجہ سرد تھا۔ قاطعہ نے اس کی ساحر نظروں کو اپنے گال پر پھینک کر سرخ نشان پر نمبر تے دیکھا اور جیسے لمحے کے ہزاروں حصے میں اس کی آنکھوں اور خفگی کی وجہ سمجھ گئی۔

"آئی ایم سوری، مگر میرے پاس میک اپ کا سامان نہیں تھا۔" اس نے بحرمانہ انداز میں کہا۔

"ہاں، تم ان مصنوعی سہاروں کے بغیر بھی اپنے مقاصد بڑی سہولت سے حاصل کر سکتی ہو۔" عباس کے اعصاب پوری طرح اضطراب کا شکار تھے۔

"میرے بندہ دم میں جاؤ، عریشہ کی چیزیں تمہاری ضرورت پوری کر دیں گی۔" قاطعہ کا دل ریزہ ریزہ ہو گیا مگر اسے حکم سے انحراف کی تاب نہیں تھی۔



سکندر نے آخری کش لے کر سگریٹ پھینکا اور والٹ سے لاریب کی تصویر نکال کر نگاہ کے سامنے کر لی۔ کاش تم اپنی صورت کی طرح دل بھی پیارا رکھتیں۔ اس نے ہونٹ پیچھے ہوئے لائٹ آن کیا۔ اگلے لمحے ماحول میں ایک حیران کن منظر ابھر لائٹ کا شعاعہ تصویر کا کوٹا نکل رہا تھا۔

برلجہ بڑھتے شعاعہ کی آج تصویر کو مکمل طور پر نکل کر سیاہ راکے میں تبدیل کر گئی۔ دروازے پر دستک کی آواز نے سکندر کو چونکا دیا۔ اس نے لائٹ بند کر کے بستر پر پھینکا تھا۔ اندر داخل ہوتے فراز نے اس کا دھواں ہوتا چہرہ دیکھا۔

"خیریت ہے نا؟" فراز کے لہجے میں تشویش تھی۔ "تم ابھی تک سوئے نہیں؟" فراز سے سوال کرتے وہ اندر ہوتی ٹوٹ پھوٹ سے دانستہ دھیان ہٹا چکا تھا۔ فراز کی گہری جائزہ لیتی نظروں الگ امتحان تھیں۔

"میں تو سوتا ہی دیر سے ہوں تم کیوں جاگ رہے ہو؟" فراز کے مسکراتے اور کیے گئے سوال پر سکندر نے زیادہ توجہ نہیں دی۔

"کہیں ہماری بھالی صاحبہ کی کمی تو محسوس نہیں ہو رہی آپ کو؟" اس کا لہجہ شرارتی ہونے لگا۔

"دیکھو فراز اگر تم ایسی ہی فضول کی باتیں آئے ہو تو جاسکتے ہو۔" فراز کا حیرت و غیر یقینی سے منہ کھلا رہ گیا۔ پھر جو ہنسنا شروع کیا تو ٹوٹ پھوٹ ہونے لگا۔

"کیا میں تمہیں شکل سے پاگل نظر آتا ہوں فراز؟" وہ درشت انداز میں ٹوک کر بولا۔

"سکندر اعظم تم ہو۔ اتنی جلدی بدل گئے یا پھر تمہاری اصل یہی تھی میں مستقبل کے آئینے میں جھانک رہا ہوں۔

مجھے لاریب بھالی پر رحم آ رہا ہے۔" سکندر نے اسے گھکھکے پراکتفا کیا۔

"میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں فراز۔ پلیز لی سیر لیں۔"

"میں بھی کہاں ہوں مذاق کے موڈ میں، یا آج پہلا دن ہے تمہیں لینڈ لارڈ ہوئے۔ تم نے اتنی جلدی نکالیں پھیر لیں۔ کل کو اگر تم مجھے ملو تو کہو گے کون فراز، میں تو کسی فراز.....!"

"فراز.....!" وہ چیخا۔ فراز نے سمجھنے اور ڈرنے کی شاندار اداکاری کی تھی۔

"تم چپ ہو گے یا نہیں؟" وہ پھر چیخا۔ فراز نے سعادت مندی کی انتہا کی۔

"کیوں نہیں جناب، نوکر کی تہنہ کی۔" وہ منسنا یا۔

"تم نہیں سدھر سکتے۔ بولو کیوں آئے ہو اس وقت؟ اب یہ نہ کہہ دینا بیوی سے بچنے کو مجھے تو بہت معصوم اور پیاری لگی ہے اریب۔ بلکہ سچ پوچھو تو میں



کے اپنی امت کو بھی اسی غنودرگز کو اختیار کرنے کا سبق دیا تھا۔ سکندر نے یہ کام خالصتاً رضائے الٰہی کے لیے کیا تھا۔ جس بھی وہ اس کا احسان کسی پر نہیں جتلاتا تھا۔ فراز بے قرار ہونے لگا۔

”یہ لوگ بہت کم ظرف ہیں سکندر تمہیں اور کچھ نہیں تو انہیں کم از کم اس گھر سے ضرور بے دخل کر دینا چاہیے، یہ تمہاری سوچ اور توقع سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں۔“

”اس اوکے فراز تم پریشان نہیں ہو، کچھ نہیں ہوگا۔“

”کیوں نہیں ہوگا سکندر، یہ لوگ آفاق چاچو کے ساتھ بہت غلط کر چکے۔“ وہ چیخا اور سکندر نے آہستہ سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا تھا۔

”ان کی عمر اتنی ہی تھی۔“ اس کا ضبط کمال درجے کا تھا فراز کا منہ کھل رہا گیا۔

”یعنی تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انہیں قتل کیا گیا؟“ فراز کے چیخنے پر سکندر کی رنگت میں سرخیاں کھل گئی تھیں۔

”یہ ان کا اور اللہ کا معاملہ ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا ہے فراز کہ میں ان لوگوں کو اس عمر میں بے ٹھکانہ کروں، اپنے بھائی کی جائیداد اور بزنس پر ان کا بھی حق ہے۔ میں انہیں اس سے محروم نہیں کرنا چاہتا۔“ فراز اسے یوں دیکھتا رہا تھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

”یعنی تم انہیں بزنس سے بھی الگ نہیں کر رہے؟“

”ہاں، میں ایسا ارادہ نہیں رکھتا۔ فراز وہ لوگ بوڑھے ہو چکے ہیں انہوں نے ایک عمر اس بزنس کو سنوارا اور اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کی ہیں اور کچھ نہ سہی تو یہ حق تو ہے ان کا۔“ اس کے رسائیست میز انداز پر فراز کو بے تحاشا تاؤ آیا تھا۔

”تم بے وقوف ہو سکندر، شاید تمہیں اس سب کی اس لیے پروا نہیں ہے کہ تمہیں یہ سب بنا محنت اور مشقت کے حاصل ہو گیا ہے۔“ فراز کے غصیلے انداز کے باوجود سکندر ہنس پڑا تھا۔

”اس آخری بات سے میں اتفاق ضرور کروں گا۔ لیکن

تمہارے متعلق مشکوک ہو چکا ہوں سچ کہو انہوں نے وہ سب کچھ تمہیں واقعی کہا تھا یا انرا م لگا رہے ہو؟“ سکندر کے سوال پر فراز پہلے سشدر ہوا پھر خیش میں اس پر گھونسا تان کر کھڑا ہو گیا۔

”اگر تم عمر میں مجھ سے کچھ سال بڑے اور اس ساری جائیداد کے اکلوتے وارث نہ ہوتے اور میں تمہارے ہی گھر میں کھڑا نہ ہوتا تو لگاؤ نہ کرتا۔ یا کچھ تو شرم کرو۔۔۔۔۔ تم میرے دوست ہو کر اس کی سائیڈ۔۔۔۔۔ بس کیا کہوں تم سے شکوہ کروں بھی تو کیسے کہ جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہو ادینے گئے۔“ وہ قطعی غیر سنجیدہ تھا اور جذباتیت کی بے مثال اداکاری کرنے میں مصروف تھا۔

”بے فکر ہو، یہ بدلہ میں لوں گا تو ضرور تم سے گھر اس وقت جب لاریب بھائی سے ملوں گا دیکھنا کیسے ان کے ساتھ مل کر تمہاری غیبتیں کرتا ہوں۔ تم نے ابھی میرے جو ہر نہیں دیکھے اور سنو۔۔۔۔۔ یہ تم سگریٹ کچھ زیادہ نہیں چنے لگے؟“ وہ اسے گھور رہا تھا سکندر اس آخری بات میں اپنے لیے محبت و اپنائیت کا رنگ چھلکتا محسوس کر کے مسکرا دیا۔

فراز اور وہ اس عرصہ میں بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔ ان کے بیچ بے تکلفی کی دیوار تو گری ہی تھی کوئی بات بھی ایسی نہیں رہی تھی جس پر پردہ ہو۔ فراز سکندر کے دل میں اتر گیا تھا۔

جس طرح بغیر کسی لالچ و غرض کے اس نے سکندر کے لیے اتنا کچھ کیا تھا وہ بلاشبہ قابل ستائش تھا۔ سکندر کو علوی باؤس میں لانے والا وہی تھا۔ سکندر کو اس کے اخلاص پر رتی برابر بھی شبہ نہیں رہا تھا۔ سکندر کو یاد تھا وہ دن جب وہ پہلی بار علوی باؤس میں اسے لایا تھا اور اس کے اصل حوالے سے متعارف کرانے کے بعد اپنے رشتوں سے اس کے حق کی خاطر لڑا تھا۔ وہ وقت بھی بہت نازک تھا سکندر کے لیے جب اس نے اپنے والدین کے قاتلوں کو سامنے پایا تھا مگر خود پر ضبط کیے رہا وہ اتنا اعلیٰ ظرف بھی نہیں تھا مگر اسے نبی کریم کی حیات طیبہ کے لاتعداد واقعات از بر تھے جب آپ نے بدلہ لینے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی معاف کر



سیلری اپنی مرضی سے لوں گا، صرف یہی نہیں تعلق مضبوط کرنا ہے تو اپنے بچوں کے میرے بچوں سے رشتے طے کرو ابھی سے، بولو شرط منظور ہے؟" وہ کھٹکھٹا کر کہہ رہا تھا۔ سکندر جھٹکا کھا کر اس سے الگ ہوا اور سے گھورا۔

"اچھا پارلنٹ بھجوان باتوں پر مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے تم سے۔" اس کا انداز ایسا تھا کہ سکندر کو اس پر توجہ دینی پڑی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے سکندر جس طرح تاؤ جی نے میرے تمہاری یہاں آمد پر اتنا دایلا کیا اور تمہیں آفاق چاچو کی اولاد تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا تھا تمام شواہد کو رد کرتے ہوئے اس کے بعد حکم سے اپنی خوشی اس بات کو اتنی فراخ دلی سے قبول کر لینا کچھ مبہم نہیں ہوا مجھے۔"

"ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔" سکندر کا ساادہ سا جواب فراز کی تسلی نہیں کر سکا۔

"میں پھر اپنی بات دہراؤں گا سکندر کہ تم ابھی انہیں نہیں جانتے ہو، وہ کسی بھی صورت اپنے گھالے کا سودا نہیں کرتے۔ تمہیں بتا چکا ہوں نا کہ انہوں نے شرجی بھائی کی سسر کو کن حالوں تک پہنچایا۔ یہ لوگ ابھی نہیں بدلے اور بدلیں گے بھی نہیں۔" فراز سکندر کو شرجی کے متعلق بھی مختصراً بتا چکا تھا۔ سکندر کے ذہن میں دور تک ایمان نہیں گئی جیسی وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔ دوسری اہم بات یہ کہ اسے ایمان کے شوہر کا نام پتا نہیں تھا۔

"تمہیں ہر بات کو نیکیو انداز میں نہیں سوچنا چاہیے فراز۔" فراز نے ہونٹ بھیجنے لیے۔

"تاؤ جی کی یہ مصلحت کوئی جانے کیوں مجھے خطرناک محسوس ہو رہی ہے۔ میں پھر کہوں گا تم ان سے الگ ہو جاؤ۔ پلیز میری اس بات کو سہ سہی نہ لو سکندر۔ میں کسی مزید نقصان کا تحمل نہیں ہو سکتا۔" فراز کے لہجے میں وحشت سی اتر آئی تھی۔

"تم مجھے تھوڑے ذمی لگتے ہو فراز لیکن بے فکر رہو، میں تمہاری بات پر سوچوں گا ضرور۔" فراز نے اس کی آمادگی محسوس کر کے ہی سکھ کا سانس بھر لیا تھا۔

بے فکر رہو۔ اب اس کا رویہ بار کو میں خود سنبھالوں گا اس کا سارا چارج میں اپنے کنٹرول میں لے رہا ہوں۔ تاؤ جی اور چاچو یہاں کام ضرور کریں گے مگر اس بزنس کی ہر ذیل میری مرضی سے طے پائے گی۔"

"دراصل میں نہیں چاہتا کہ تم نے مجھ پر جوائن مینٹ کی سے اسے اکارت کردوں۔ آخر تمہیں بتانا بھی تو ہے کہ تمہارا شاگرد کتنا قابل ہے۔" لیکن یاد رہے کہ اس فرم کے مینیجنگ ڈائریکٹر تم ہو۔ خبردار چھٹی کرنے کا کبھی سوچنا بھی مت ڈبل تنخواہ کاٹوں گا۔" اور فراز نے جواب میں آنکھیں دکھانا شروع کر دی تھیں۔

"میں تمہاری فرم میں ملازم نہیں ہوں گا سکندر۔" کچھ دیر بعد جب فراز نے سنجیدگی سے بات کی تو سکندر کو جھٹکا لگا تھا۔

"میرا شمار میری فیملی کے دیگر ممبروں کے باؤل لچی مردوں میں نہیں ہوتا۔ شرجی بھائی میں اور نیمل الحمد للہ تاؤ جی سے یکسر مختلف ہیں۔ جس روز شرجی بھائی کو اس ساری حقیقت کا پتا چلا تھا انہوں نے اسی روز سے آفس چھوڑ کر دیا تھا۔" اپنے چہرہ کی حفاظت کرتا فراز، سکندر کو بہت پیارا لگا تھا۔

"لیکن تم میری فرم میں میرے ساتھ کام کیوں نہیں کرنا چاہتے؟" سکندر کو جس بات پر سب سے زیادہ اختلاف تھا اس نے وہی سامنے رکھی۔

"میں میں نہیں چاہتا کہ ہمارا تعلق کسی وجہ سے خراب ہو۔" وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔

"کوئی تعلق خراب نہیں ہوگا بلکہ یہ تعلق مضبوط ہوگا ان شاء اللہ تم دیکھنا اور سنو تم وہاں میرے ماتحت نہیں ہوں گے۔ فراز تم محسن ہو میرے اور ہمیشہ میرے لیے خصوصی اہمیت کے حامل رہو گے۔" وہ جذباتی ہو رہا تھا جیسی انھوں نے اس کے گلے لگ گیا۔ فراز کو ہی اپنی جوان بدلتی پڑی۔

"تم تو سنجیدہ ہو گئے یاد میں مذاق کر رہا تھا مطلب یہ تھا کہ نہیں میری فیملی کے لالچی اور خود غرضی کے جراثیم مجھ کو بھی نلگ جائیں۔ خیر اگر تمہارا یہ اصرار ہے تو پھر سن او میں



کرتے ہوئے اسٹول پر چڑھ گئی۔ انداز میں غصیلان تھا۔  
جب تصویر نہیں اتری تو اس نے اپنی فطرت کے عین  
مطابق غصے میں آتے ایک کے بعد دوسرا جھنکا ایسے  
جارجانہ انداز میں دیا کہ لڑکھڑا کر اسٹول سے نیچے گری گئی  
مگر زمین پر نہیں سکندر کے تولاہ و مضبوط آہنی بازوؤں میں  
جس نے اسے سنبھالنے ہی دانستہ خود میں سمیٹ لیا تھا۔

”میں اسی لیے منع کر رہا تھا آپ کو مگر آپ سنی کہاں  
ہیں۔“ سکندر کے دھیسے لہجے میں بھی وارنٹی کی آنچ پھوٹ  
رہی تھی۔ آنکھوں میں اس ٹپ کتنے شوخ اور دلکش رنگ  
تھے۔ اس کے برعکس لاریب قریب قریب کی اس وحشت بھری  
آگ میں جل کر خاکستر ہوئی بری طرح سے تلملا کر اس  
کی بانہوں کا حصار توڑتی تڑپ کر قاصدے پر ہوتے ہی اس  
پر برس پڑی۔

”سٹاپ، تمہیں ضرورت کیا تھی آخر مجھے پکڑنے  
کی۔“ وہ بھری ہوئی شیرنی لگ رہی تھی جسے قابو کرنے کو  
کیسے دل چل گیا تھا سکندر کا جیسی اس کے مقابل رک کر پر  
شوق نظروں سے اسے تکتا متبسم ہوا۔

”اگر میں نہ پکڑتا تو آپ کو تو چوٹ لگ جاتی۔“  
”بکواس نہ کرو میں اگر آئندہ مر بھی رہی ہوں تو تم  
مجھے ہاتھ لگانے کی غلطی نہ کرنا سمجھے؟“  
”یہ حکم تو میں آپ کا نہیں مان سکتا۔ یہ غلطی تو کرنا ہی  
پڑے گی مجھے کبھی نہ کبھی آخر کو شوہر ہوں اب آپ کا۔“ وہ جتنے  
غصے میں تھی اس کے متضاد سکندر پر اس قید و شرارت بھرا خمار  
چھار ہاتھ۔ اس کے انداز میں لگاؤٹ بھی تھی اور جسارت بھی  
جس نے لاریب کے اشتعال کو اور بھی بڑھا ڈالا۔

”اپنی اوقات مت بھولو تم، سنا تم نے؟“ اسے دیکھتے  
ہوئے وہ حلق کے بل جیتی۔ اس مرتبہ سکندر نے اس کی  
بات کے جواب میں خاموشی اختیار کر لی اور آگے بڑھ کر  
تصویر اتارنے میں مشغول ہو گیا۔

”یہ لیجیے یہی چاہیے تھی نا آپ کو۔“ خوب صورت  
منبرے فریم میں جکڑی تصویر اس کی جزیب بڑھائے وہ  
کتنے رساں سے گویا ہوا تھا۔ لاریب نے تسلیاتی نظروں سے



”چاہ نہیں کہاں چلا گیا، یہی تو رکھا تھا۔“ اس نے  
جھنجھلا کر کہتے ہوئے زور سے دراز چینی مگر اگلے لمحے یکدم  
ساکن ہو کر رہ گئی۔ دراز میں موجود ٹوٹے ہوئے ٹوٹو فریم  
کے شیشے سے بھانکتی اپنی اور سکندر کی مشترکہ تصویر یادوں پر  
گری گری کو صاف کرنے لگی۔ کچھ دیر یونہی آنسوؤں سے  
لبریز نظروں سے تصویر کو تکتے رہنے کے بعد اس نے ہاتھ  
بڑھا کر احتیاط سے اسے باہر نکالا۔

سکندر کی مسکراتی آنکھوں میں کیسا تازگی بھرا خمار تھا  
یوں جیسے پوری دنیا فتح کر لی ہو۔ جبکہ وہ اس کے پہلو میں  
اس سے بالکل متضاد کیفیات کا شکار لگتی تھی۔ تمام تر آرائش  
و زیبائش کے باوجود جڑی ہوئی اور پرسوز۔ اسے نہیں معلوم  
تھا شادی کے دن یہ تصویر کس نے اور کس وقت کیجی تھی  
اس کی آنکھوں سے چلتے آنسو بے تابی سے پھر کر ٹوٹے  
ہوئے شیشے پر گرے اور نظروں ذہن کے ساتھ شیشے کو بھی  
دھندلا گئے۔ وقت پلٹ کر جیسے انہی لمحوں پر گرفت مضبوط  
کر چکا تھا۔

(”یہ... یہ کیوں لگائی تم نے یہاں؟“ وہ غرائی تھی۔  
یہ ان کی شادی کا دوسرا یا تیسرا دن تھا جب شام کو وہ کمرے  
داخل ہوئی اور دیوار پر خوب صورت فریم میں آویزاں اپنی  
اور سکندر کی تصویر دیکھ کر گویا آگ لگ گئی تھی۔ اس کی دھاڑ  
پر سکندر اچھا خاصا جریز ہو گیا مگر اس کی طرح اپنے جذبات  
بے قابو نہیں ہونے دیے۔

”آئی ایم سوری، آپ کو اچھا نہیں لگا تو میں اتار دیتا  
ہوں۔“ سکندر کے دھیسے انداز میں نرمی تھی۔ مگر لاریب کی  
تلملاہٹ کچھ اور بڑھ گئی۔

”تم کیوں اتارو گے بھلا۔ میرا دل جٹانے کی خاطر تو  
یہ کام کیا تم نے میں خود اتار لی ہوں۔“ اس پر الزام لگاتے  
اس نے کبھی سکندر کے جذبات و احساسات کو سمجھنے ان پر  
غور کرنے کی رحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔

”آپ رہنے دیں لاریب میں۔۔۔۔۔!“ اسے اسٹول پر  
چڑھتے دیکھ کر سکندر نے پھر مداخلت کی۔ مگر وہ ان سنی



دینے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ آسانشات کی فراوانی اور لامحدود اختیارات نے اسے فرعون کی عظمت اور رعونت میں جھکا کر دیا تھا اسے یاد ہی نہ رہ سکا تھا یہ دنیا ایک دھوکے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ تو ایک مہلت ہے۔ من مانی کرنا اور حکم چلانا ہی اس کا معمول تھا۔ زمین جیسے ہمیشہ کے لیے اس کی میراث تھی۔ جس پر وہ جیسے چاہتا اکر کر چل سکتا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ بہر حال اس کو ملنے والی ڈھیل کی کوئی حد بھی مقرر ہے۔ اس زمین پر اسے اختیارات سوچنے والا ہی اس کا اصل حقدار ہے۔

لاریب.....! جس کی بے رخی، بے اعتنائی اسے ناگوار گزرتی تھی جسے ملحق سکھانے اور اپنی تسکین کا ذریعہ بنانے کو وہ ہر معاشرتی، سماجی اور مذہبی حد بندی کو پھلانگنے کا تہیہ کر چکا تھا جتنا ہی شہ تھا کہ خدا کی لاشیں کسی بے آواز ہے کیا ہوا تھا پھر؟ وہ جو سمجھتا تھا اسے فتح حاصل کرنے سے کوئی روکنے والا نہیں۔ کیسے منلوں میں بے بس کروینے والے نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ طاقت اور اختیار کے زعم میں جتنا اس کا دماغ اس وقت شدید اذیت و کرب کے پاؤں اس خوف سے سن ہونے لگا کہ وہ یہاں اس دیرانے میں بے بسی اور بے بسی کی موت مارا جائے گا۔ لاریب اسے پلٹ کر دیکھے بغیر جا چکی تھی جبکہ کمدار کو اس نے خود وہاں سے واپس بھیجا تھا اس حکم کے ساتھ کہ اگر اس کی ضرورت پڑی تو خود کال کر کے بلوائے گا۔ پھر بھلا وہاں کون تھا جو اسے اس اذیت ناک عبرت انگیز موت مرنے سے بچا سکتا۔ اس نے بے چارگی اور مایوسی کی کیفیت میں کچھ دور گر جانے والے اپنے سیل فون کو دیکھا جو لاریب سے الجھنے کے دوران جانے کب جیب سے نکل کر فرش پر جا گرا تھا۔

اس کی وہ جسمانی طاقت جس پر اسے بے تحاشا غرور تھا اس وقت اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی وہ خود میں اتنی ہمت بھی نہیں پاتا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر سیل فون اٹھاتا اور اپنی مدد کا کوئی سبب بنا پاتا۔ اسے اندازہ ہوا وہ خود سے کتنی محبت کرتا ہے۔ اس نے جانا اسے موت سے کتنا خوف آتا

اسے کچھ دیر دیکھا پھر اسی مشتعل انداز میں فریم پکڑ کر زور سے دیوار پر دے مارا تھا۔ ایک چھٹکا ہوا اور اسے لگا صرف تصویر کا شیشہ نہیں بلکہ اس نے سکندر کا دل بھی ایسے ہی چکنا چور کر دیا ہو۔

”اٹھاؤ اسے یہاں سے مجھے نظر نہ آئے دوبارہ۔“ وہ آنکھیں نکال کر غرائی۔ اس نے فریم کو ٹھوکر ماری ٹھرا گئے لمحے خود ہلکا کر پیر پڑتی دوہری ہو گئی تھی۔ ٹوٹے ہوئے شیشے کی بے رحم نوکلی دھار اس کے پیر کے انگوٹھے کے میں اس بری طرح تھکی کہ وہ درد برداشت کرنے کو ہونٹ بھیج گئی۔

”زخمی ہو گیا آپ کا پیر۔“ سکندر سب کچھ بھٹا کر بے چین ہو کر پکسا پاتا تھا۔

اس کے ہونٹوں سے سسکی بکھری اور آنکھوں سے آنسو چل گئے۔ بے خیالی میں اس کا ہاتھ پھر زخمی ہوا تھا مگر شاب سکندر تھا نہ ہی اس کی بے چینی بھرا کیسے رنگ انداز۔ وہ بے قراری سے روٹی چلی گئی۔

”آ جاؤ سکندر۔۔۔“ اس کے آنسو اسی تواتر سے بہتے تھے۔

(بہت قریب سے چڑھا گئے ہو مجھ پر بہت چالاک تھے۔ جیتنا آتا تھا تمہیں اور بابا سائیں کہتے ہیں وہ مرد ہی کیا جو اپنی عورت کو جیت نہ سکے۔ میں تمہیں کیسے بتاؤ سکندر مجھے تمہارے علاوہ اب اور کچھ نہیں چاہیے) وہ مضطرب سی ہاتھ مل رہی تھی۔ اسے وہ کام یکسر بھول گیا تھا جو وہ کرنے آئی تھی۔ اسے بس سکندر یاد رہ گیا تھا اسے سکندر کی محبت یاد رہ گئی تھی۔



وہ پہلو کے بل سا کن لیٹا ہوا تھا مگر دل و دماغ میں ایک حشر پاتا تھا۔ اذیت و سختی اور شرمندگی ایسی جس کا کنارہ نہیں ملتا تھا۔ ندامت کے آشک برساتے آنکھ کھلتی نہیں تھی نہ دل کا ملال ڈھلتا تھا کیا تھا وہ؟

ایک سیاہ کار، بدکار، غلاظت میں پور پور ڈوبا ہوا انسان۔ جس نے رب کی رضا کے متعلق سوچنے اہمیت



کچھ لفظ کہنے ہیں گوہر سے  
ہذا طنز وہ تیر سے جو شہد میں بھگو کر بھی مارا جائے مگر  
پھر بھی اس کی چھین کم نہیں ہوتی۔  
☆ لوگ چاند پر پہنچنے کے لیے ہزاروں جتن کر لیں  
مگر دل تک پہنچنے کے لیے کچھ بھی نہیں کرتے۔  
☆ اگر آپ اپنے گھر کے باہر سختی پر عبارت لکھوا  
لیں کہ مجھ سے ملنے والے جھوٹ کے پاؤں اور نصیبت  
کے چہرے باہر چھوڑ کر آئیں تو یقیناً سمجھیں آپ سے  
ملنے کوئی نہیں آئے گا۔

ہذا لفظ لکھنے پڑھنے سے کچھ نہیں ہوا احساس کی  
شدت ان کو براثر بنائی ہے۔  
☆ جس گھر میں عورت دھمی رہتی ہے اس گھر میں  
خوشیاں مہمان کی طرح دستک دے کر آتی ہے جنہیں نہ  
پھینکا جاسکتا ہے اور نہ اپنایا جاسکتا ہے۔  
☆ جس ظل..... کوٹ چو غلط

لہذا دے میں چھایا مگر پھر ایک معجزہ ہو گیا اسے اذن رہائی  
اذن مغفرت مل گئی تھی۔ یہ بخشش کرنے والے کی ایسی ہے  
بہا عنایت تھی کہ وقاص اپنی سابقہ روش پر شرمسار ہوتا خود  
سے نگاہ ملانے کے قابل بھی نہیں رہا۔

”کیا تھا وہ اس قابل؟“ دو خود سے سوال کرتا اور آنسو  
زار و قطار بہنے لگتے۔ اس نے رحمان کی رحمت کو جانتا تو  
اندر سے گم صدم ہوتا چلا گیا۔ عجیب تھی یہ خفت و خجالت جس  
نے اسے باقی ہر احساس سے بے نیاز کر ڈالا تھا۔

”زمین پر جو کوئی ہے فنا ہونے والا ہے اور باقی رہے گی  
صاحب عظمت احسان کرنے والے تیرے رب کی ذات  
تو تم اپنے پردہ گاری کون کون کی نعمت کو جھٹاؤ گے۔“

کھلی گھڑکی سے ایک خوش الحان آواز ہوا کہ دوڑیں پر  
اڑتی اس تک پہنچنے لگی۔ وقاص کی وہ عظمت اور بے حسی  
ٹوٹنے لگی جو ان دنوں اس پر ماحول سے اپنوں سے اپنی  
ذات تک کے لیے چھا گئی تھی۔ اس کی سماعت چوکی اور  
پوری توجہ سمیٹ لائی۔ ماں جان نے اس کی مستیابی کی  
خوشی میں قسم القرآن کروایا تھا قاری صاحب کی آواز میں

ہے۔ اس نے زندگی میں پہلی بار بقاء کی ہوش و حواس مایوسی،  
بے بسی اور بے چارگی کی انتہا پر جا کر خود کو گھٹ گھٹ کر  
روتے محسوس کیا۔ اس کے پاس زندگی بھر سب کچھ ہمیشہ  
وافر مقدار میں رہا تھا۔ اسے ہاتھ پھیلائے، مانگنے کی بھی  
ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اسے کبھی رب کا اس کی  
دی گئی نعمتوں پر شکرا ادا کرنے کا خیال نہیں آ سکا تھا۔ مگر اس  
پل اس نے زندگی میں پہلی بار خود کو رب سے ہمکلام  
ہوتے گڑ گڑاتے محسوس کیا۔

”مجھے بچالے، اس وقت کوئی نہیں ہے جو مجھے نے  
اس وقت کوئی نہیں ہے جو مجھے دیکھے اس وقت کوئی بھی  
نہیں ہے جو مجھے سنبھالے۔ میں جانتا ہوں تو مجھے سن رہا  
ہے، میں یہ بھی جانتا ہوں تو مجھے دیکھ رہا ہے میں یہ بھی  
یقین رکھتا ہوں کہ تو میرے دل کی بدلتی کیفیت سے غافل  
نہیں ہے اس وقت اگر کوئی مجھے بچا سکتا ہے تو وہ صرف تو  
ہے مجھے بچالے مجھے اس شرمناک موت سے دوچار نہ  
کر۔“ دو در در ہاتھ بالک رہا تھا ترپ رہا تھا اور سسک رہا تھا۔  
پیر سے اٹھتا درد کا تیز ریڈا جیسے کوئی طوفان تھا۔ جواگ کی  
طرح بڑھتا پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ پھر  
یہ تکلیف اس کے سینے سے گردن اور گردن سے حلق تک جا  
چکی وہ سہم گیا خوف سے سر د پڑنے لگا۔ اس نے نڈھال  
ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس مرحلے پر اسے فرعون کا انجام  
یاد آیا وہ انجام جو عبرت انگیز تھا اور جو ان کے قاری صاحب  
نے قرآن پاک پر حاتے ہوئے بہت تفصیل سے سمجھایا  
تھا جسے وہ اب تک بھولا رہا تھا مگر اب اچانک وہ تمام واقعہ  
اس کے ذہن میں پھر سے تازہ ہو گیا تھا۔

”تو کیا فرعون کی طرح میری بھی آخری وقت کی توبہ  
اللہ نے رو کر دی ہے؟“ اس نے سوچا اور اس کے حلق میں  
نوسیلے کاٹھے اُگے تھے۔ اگر ایسا تھا تو کچھ عجب نہیں  
تھا۔ یہی قانون قدرت ہے اللہ نے تو اپنا طریقہ پہلے سمجھا  
دیا۔ موت کو سامنے پا کر مانگی تھی توبہ قابل قبول نہیں وہ اب  
کیوں حراساں ہے اس نے اپنا وقت گنوا دیا تھا مایوسی نے  
اس کے وجود میں اپنے نیچے گاڑ دیے اور اسے اپنے سیاہ



بے اختیار اس کی جانب پلٹ گیا آج پہلی بار امامہ کو تنگے اس کی نظر میں نرمی بھی محبت و احترام کے ساتھ اپنے سلوک پر شرمساری کا جاں گداز احساس تھا۔

”آ..... آ..... آپ کیا درد ہو رہا ہے؟“ امامہ کی نظر اس کے ہنسیے ہوئے چہرے پر پڑی تو جیسے بے اختیار رت پ اگلی اور اس کا چہرہ ہاتھوں کے نرم پیرالے میں لے لیا۔

”نہیں، اب میں ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو امامہ؟“ وہ بولا تو اس کی آواز بوجھل تھی۔ اس کے دل کی طرح جہاں ملامت و یاسیت کا احساس گہرا تھا۔

”میں....؟“ امامہ کو کہاں تو قیہ تھی کہ وہ اس قدر نرمی و تحمل سے اس کی خیریت بھی پوچھ سکتا ہے جیسی گڑبڑالی تھی پھر سرکوا ثبات میں ہلادیا۔

”مجھے آپ سے معافی مانگنی تھی وقاص، میری تمام تر خواہش اور دعاؤں کے باوجود جینا نہیں ہوا اور....!“

”امامہ.... بس کمرہ پلیز۔“ وہ جیسے کراہ رہا تھا تازیانہ ہی ایسا شدید تھا یہ اس کے گناہوں میں سے ہی ایک گناہ تھا کہ وہ امامہ پر بیٹے کے لیے رباؤ ڈالتا رہا تھا۔ حالانکہ جانتا بھی تھا کہ وہ اس معاملے میں کسی درجہ بے بس ہے۔

”میں غلطی پر تھا ہر لحاظ سے، مجھے احساس ہو چکا ہے امامہ، کیا تم مجھے معاف کر سکتی ہو ان تمام زیادتیوں کے لیے جو میں تمہارے ساتھ کر چکا ہوں؟“ اس کے نرم ہاتھ اپنے لرزیدہ ہاتھوں میں لے کر انہی پر پیشانی نکائے وہ سسک اٹھا تھا امامہ کے تو جیسے اوسان ہی خطا ہو کر رہ گئے۔

(جاری ہے)



سوز و گداز اور کشش تھی۔

”اے مگر وہ جن وانس اگر تم سے ہو سکے کتا سانوں اور زمین کے کناروں سے نکل بھاگو تو (ذرا) نکل کر تو بھاگو۔ تم زور کے سوان نکل بھاگو گے (اور زور تم میں ہے ہی نہیں) تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔“

وقاص کو لگ رہا تھا کہ اس کا رب اپنے کلام کے ذریعے باقاعدہ جتنا دیا تھا کیا نہیں ہو چکا تھا اس کے ساتھ یہی معاملہ؟

خدا نے اسے اپنے آگے ہاتھ پیر باندھ کر گرایا تھا اور اس کی طاقت چھین لی تھی۔ وہ طاقت جو اسی نے عطا بھی کی تھی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور آنکھوں میں آنسوؤں کی طغیانی بڑھنے لگی۔ وہ حرف بہ حرف تلاوت سنتا اور ترجمہ پر غور کرتا اپنے اندر تبدیلی و تغیر رونما ہونا محسوس کرتا آنسو بہاتا رہتا۔

”مجرم پہچانے جائیں گے اپنی پیشانیوں سے پھر وہ پیشانیوں (کے بالوں) سے اور قدموں سے پکڑے جائیں گے تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ یہ ہے وہ جہنم جسے گناہ گار جھٹلاتے تھے وہ اس کے اور کھولتے ہوئے گرم پانی کے درمیان پھریں گے۔ تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔“

اس کے بعد مغفرت کا اذن تھا پھر انعام و اکرام کی خوش خبری۔ وہ سورہ رحمن کو پہلی بار دل رو ذہن کے در سے وا کر کے من رہا تھا اور جیسے اسی کلام کی خوب صورتی میں گم تھا جادو جنال میں گم تھا جب دروازہ کھلنے کی آواز ابھری مگر وہ چونکا نہیں یہاں تک کہ کوئی اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

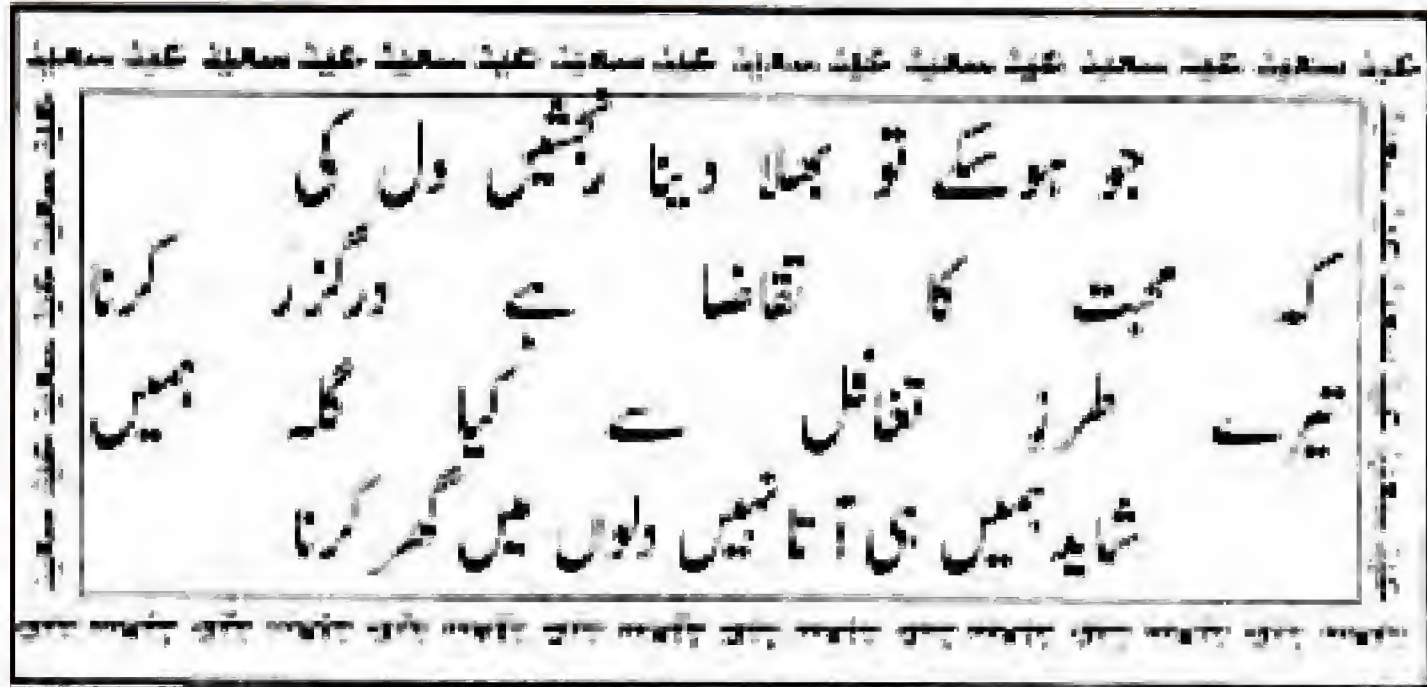
”وقاص.... آپ کی طبیعت کیسی ہے اب؟“ وہ اس کا کاندھا نرمی سے چھو کر استفسار کرتی اس کی توجہ کی طالب بنی ہوئی تھی۔ وہ.... جسے وقاص نے نہ کبھی نرمی سے چھوا تک نہ تھا نا محض طلب کیا تھا مگر وہ پھر بھی کسی مہربان سایہ دار بادل کی طرح تھی۔ اگر سمجھا جاتا اگر جانا جاتا تو یہ بھی اس کے رب کی اس پر خاص عنایت تھی۔ اس کی بے بہا نعمتوں میں سے ایک بے بہا اور خوب صورت ترین نعمت۔ وقاص



Digitized by RSPK







### گزشتہ قسط کا خلاصہ

بابا جان عباس سے اپنے گزشتہ تلخ رویے پر معذرت کرتے ہوئے اسے دلہن حویلی آنے کا کہتے ہیں وہ فاطمہ کو اپنی بہو تسلیم کر لیتے ہیں جبکہ دوسری طرف عباس بابا جان کو خود سے بدگمان ہونے سے بچانے کی خاطر انہیں عریضہ کی موت کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔ بابا جان ان سب کو حویلی لے جانا چاہتے ہیں جبکہ عباس تمام صورت حال پر گھبرا جاتا ہے اور اپنا تمام خسر فاطمہ پر اتارتا ہے اور اس پر الزامات کی بوچھاڑ کر دیتا ہے فاطمہ اس کے گھصا الزامات پر اپنے بچاؤ کے لیے گھرا جاتی ہے جبکہ صورت حال پر عباس اس سے بچہ میرج کرتا ہے اور اس تعلق کو مجبوری کے تحت ایک نام دیتا ہے جبکہ اس سے اس تعلق کو ٹھنکی رکھا جاتا ہے۔ فاطمہ اس راستہ پر انجالی خوش ہوتی ہے لیکن دوسری طرف عباس اس مجبوری کے بندھن کو چند دنوں پر مبنی قرار دے کر فاطمہ کو اس کی حیثیت خوب یاد دلاتا ہے۔ فراز کا نوٹی کارروائی مکمل کرنے کے بعد سکندر کو اس کا تمام حق دلاتا ہے ایسے میں تاؤ جی سخت کبیدہ خاطر ہوتے لاکھ انکار کرتے ہلا خراس کی حیثیت تسلیم کر لیتے ہیں سکندر نہ صرف تاؤ جی کو معاف کر دیتا ہے بلکہ تمام برتنس بھی ان کے حوالے کر دیتا ہے جس پر فراز خاصا برہم ہوتا ہے اور اسے تاؤ جی کی اصل فطرت اور نقصان پہنچانے کے حوالے سے آگاہ کرتا ہے لیکن سکندر ان تمام معاملات پر یکسر توجہ نہیں دیتا۔ دوسری طرف فراز یہ جان کر حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ سکندر نہ صرف ساحر

کو جانتا ہے بلکہ اس کے ساتھ سکندر کا قریبی تعلق بھی ہے دونوں کے درمیان بڑھتے تعلقات تکلفات کی تمام دیواریں گرا دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ فراز بھی اور یہ کو لے کر تمام حقائق سے اسے آگاہ کر دیتا ہے دونوں کو اپنا دکھ سناٹھا محسوس ہوتا ہے۔ شرجیل لکھن کے ہوش میں نہ آنے پر سخت رنج ہو جاتا ہے ایسے میں ابراہیم احمد اس کا حوصلہ بڑھاتا ہے اور ایک ایمان سے اپنے سچ رویوں کی معافی مانگتے ہوئے اس کی غلطی کرنے کا کہتے ہیں۔ وہاں کے اسٹاک ہولڈر بابا جان لاریب کو بھی ساتھ چلنے کا کہتے ہیں جبکہ دوسری طرف لاریب بابا جان کی خوشی کی خاطر وہاں کا سامنا کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے جبکہ بابا جان ان تمام باتوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔ دوسری طرف وہاں کے صرف بابا جان کے سامنے بلکہ خود اپنی ہی نظروں میں گر جاتا ہے زندگی اور موت کی اس کشمکش کے دوران اسے اپنے تمام گناہوں کا اندازہ شدت سے دیتا ہے اور وہ سچے دل سے رب کے حضور معافی مانگتا ہے اور شاید اسے معافی کا اذن مل جاتا ہے بھی وہ ایک بار پھر انہوں کے درمیان موجود ہوتا ہے اب اس کا رویہ پہلے سے یکسر مختلف ہوتا ہے بابا جان کی سرزنش اور ان کا تشفی انداز محسوس کرتے وہ خود بھی یہ بات کسی کے سامنے دہرانے سے گریز کرتا ہے جبکہ بابا جان بھی اپنی عزت اور نام کی خاطر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ وہاں اپنے سابقہ رویوں پر اہلہ سے بھی معافی مانگتا ہے اور اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیتا ہے جس پر لہاس اس کے رویے پر گنگدہ جاتی ہے۔



## باب آگے پڑھیے

\*\*\*

"پلیز وقاص، ایسا مت کہیں مجھے کوئی شکوہ نہیں آپ سے میرے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کا کوئی مقام ہی نہیں کتا آپ ٹھیک ہو گئے ہیں۔" لہامہ خود بھی رو پڑی تھی اور اس کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہوئے وہ اعلیٰ غمری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

وقاص کو ایک بار پھر خدا کی رحمت اور اپنی بخشش ہو جانے کا یقین ملا تھا۔ اس نے جانا اللہ نے ہر ہر لحاظ سے اس پر ایک بار پھر اپنی عنایات کی بارش برسات کر دی ہے اس کے بے قرار دل کو ممانیت بھرے احساس نے نرمی سے چھوا تو سابقہ خدا متوں کے احساس سمیت اس کا دل رب دو جہاں کے آگے فریاد کنناں ہوا تھا۔

وہ شکر گزار تھا ہدایت کا ایک لمحہ خدا نے اسے عنایت فرمایا اور اسے دونوں جہاں میں عنایت اور کامیابی عطا فرمادی، اس کا دل اس کا وہاں رواں رہا ہے۔ یہی تھا کہ رہا تھا۔

"اے ہمارے رب نہ پھیرنا ہمارے دلوں کو۔" اس کے کہنے پر تو نے ہمیں ہدایت دی اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت اسے شکوہ تو سب سے بڑا عطا کرنے والا ہے۔"

\*\*\*

"عباس بھائی آپ کی مسرت تو بالکل بار بار ڈول لگتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر کوئی یہ کہہ ہی نہیں سکتا کہ یہ شادی شدہ ہیں۔ جبکہ آپ نے انہیں دو دو بچوں کی اماں جان بنایا ہوا ہے۔" عباس کی چھوٹی بہن تھی ذریعہ النساء جو خود بھی شادی کے بعد ابھی خامی فرم رہے ہو رہی تھی جیسی اسے فاطمہ کی نزاکت و اساتذت پر رشک آ رہا تھا۔ عباس محض ایک نظر ہی اس پر ڈھل سکا۔ فاطمہ کی اس ٹیپ چھپ ہی نہ رہی تھی۔ جگمگاتا ہوا روپ سروپ اور چہرے کی سحر انگیزی اس کے باوجود عباس نے نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔

"نہرے بھی صاف لگتا ہے کہ عباس نے جی جان

سے سنبھال کر رکھا ہے اپنی بیوی کو اور رکھنا بھی چاہیے آخر کو پسند کی شادی کی ہے۔" مہرے پانے بھی گلا کا پتلا تھا۔ فاطمہ کے پہلے سے گلابی پڑتے چہرے پر جیسے کمال ٹھہر گیا تھا۔ "نہجی میں نے تو یہ پہلی لڑکی دیکھی ہے جو شادی کے اتنے عرصہ بعد اور دو بچوں کی ماں بن کر بھی ایسی باتوں پر اتنا شرماتی ہے۔" نہجی کے کہتے ہی سب کی توجہ فاطمہ پر مبذول ہو گئی۔ فاطمہ جو پہلے ہی نرمی تھی کچھ اور بھی پزل ہو گئی۔ عباس کا ضبط نہیں تک تھا وہ ایک تھکے سے لگا۔

"ارے..... کہاں جا رہے ہو بیٹا، منھوٹاں۔" اماں جان کی گود میں اس وقت اسامہ تھا اور وہ اس کے کاندھے ٹھانے میں مصروف تھیں مگر عباس سے بھی غافل نہیں تھیں۔

"میں وقاص سے مل رہی ہوں، بابا جان بتا رہے تھے کہ ان کی طبیعت بہتر نہیں۔" عباس کو راہ فرار کا بہانہ چاہیے تھا۔ "نہجی یہ بھی کہ حراج و عادت کی تفاوت کی بدولت میں بڑھاپا لگ رہی ہوں کی آپس میں کبھی نہیں مل سکی تھی۔" عباس دھیمہ انرم خواہ و رحم دل انسان تھا جبکہ وقاص اس کے برعکس تھا۔

"ہاں بیٹا ضرور، لہامہ بیٹا بھائی کو لے جاؤ اپنے کمرے میں وقاص کے پاس۔"

اماں جان کے کہنے پر لہامہ فرمانبرداری سے اٹھ کھڑی ہوئی اس کی گود میں اس کی چند دلوں کی جی تھی۔

"ایمان کی جگہ تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے بہت حیرانی ہو رہی ہے لہامہ، وقاص تو ایمان کے ساتھ۔" عباس اپنی حیرت ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکا لیکن پھر کچھ احساس ہونے پر بات ادھوری بھی چھوڑ دی لہامہ کے چہرے پر ایک کرسٹاک سایہ پڑا کر معدوم ہو گیا۔ گہرا سانس بھرتی وہ دکھ سے سکرانے لگی۔

"آپ کے جانے کے بعد یہاں بہت ساری تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں بھائی بہت نقصان بھی ہوئے مگر اب ان کا مائل کچھ کم ہونے لگا ہے۔" وہ بھی منڈل ہونے لگے ہیں۔ مجھے کسی بات کا تا سبب نہیں رہا، میں بہت خوش



ہوں۔" گو کہ اس کا مقصد عباس کو کچھ بھی جتنا نہیں تھا۔ اس کے باوجود عباس کو چپ لگ گئی تھی۔ وہ اسی گم صمیری کیفیت میں وقاص سے ملا۔ جسکی وقاص حیدر کا بکسر بدلا ہوا انداز بھی اسے نہیں چوٹکا۔ اس کے اندام آگ سی جل اٹھی تھی۔ وہ کس کس نقصان پہا نسو بہا تا۔

\*\*\*

"سب ٹھیک ہے بابا جان، میرے خیال میں تو اب کسی چیز کی بھی کمی نہیں ہے۔" لاریب چیزیں بیڈ پر پھیلائے بیٹھی تھی اور بابا سائیں کو دیکھا رہی تھی جو اس کی بیٹی کے لیے اس نے خریدی تھیں۔ لاریب کے پچھلے کئی دن ہی شاپنگ میں صرف گزرے تھے۔

"ہاں بیٹا ٹھیک ہے بلکہ سب بہت اچھا ہے۔ لیکن گڑیا کے ٹوپے اور چوڑیاں بھول گئی ہو آپ، وہ بھی کل لے آئے۔" بابا سائیں کی نظر ایک کی ڈھونڈ لائی تھی لاریب سر تھام کر بیٹھ گئی۔

"بابا جان پلیز، اب بس کریں، پھر کبھی سی۔" اس کے جھٹکے ہوئے احتجاجی انداز پر بابا سائیں شفقت بھرے انداز میں مسکرائے پھر اسے ٹوک دیا۔

"میری کسی بیٹی کو اللہ نے پہلی اولاد کی خوشی دکھائی ہے۔ کتنا ترسا ہوں میں اس وقت کے لیے۔" لاریب نے یہ خوشی تمہاری جانب سے بھی ضرور نصیب کرے گا۔" بابا سائیں کا سر تھپک کر محبت سے کہہ رہے تھے اور لاریب کے اندر کا خالی پن یکا یک بڑھتا چلا گیا تھا کتنی کوشش کی تھی اس نے خود کو کمپوڈ کر کے کی مگر کامیاب نہیں ہو سکی۔ وہاں سے اٹھ کر وہ اپنے کمرے میں آئی تو سینے میں موجود درد میں اضافہ ہو رہا تھا بستر پر گرنے کے انداز میں بیٹھتی وہ اپنے اند کو بچتے خالی پن کو محسوس کرتی بھیگی پیٹیں جھپکتی رہی ماضی کا ہر ایک لمحہ پھر کنگ دینے لگا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟"

وہ میسر پر سر ہواؤں کی شوریدہ سری کو سہتی ایک بار پھر خود اذیتی کا شکار تھی جب سکندر نے اسے شمال اوڑھا کر برافروختہ کر دیا تھا تب اس کی توجہ اس کا التفات اسے

یونہی جھلسایا کرتا تھا۔

"اگر میں کہتا آپ اندام جائیں یہاں ٹھنڈ بہت ہے تو آپ ظاہر ہے بات نہ مانتیں۔"

"جب تمہیں اپنی حیثیت اپنی اوقات کا اچھی طرح اندازہ ہے تو پھر کیوں کرتے ہو بار بار خود کو ذلیل۔" شمال اتر کر اس کے منہ پر مارتے ہوئے وہ ایک بار پھر اس کی عزت نفس پر حملہ آور ہوئی تھی۔ سکندر کا سا ٹوٹا چہرہ اس کی غصہ کی سرخیاں سمیٹ لایا مگر زبان سے ایک لفظ نہیں کہا تھا اس نے آج اسے اندازہ ہوا تھا اس نے کتنا ضبط آڑا ہوا تھا سکندر کا اور وہ کس درجہ قہقہہ مزان انسان تھا۔

"فصل ہے تھوڑی یہ چاہی ہی، قیامت تک بھی لگے رہو تو میرا دل نہیں جیت سکتے۔ مجھے کبھی تمہاری ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ سب سے پہلے سے کہا تھا مگر اب گرتے ہوئے آنسو خود اس کی بات کی نفی کر رہے تھے وہ گھٹ گھٹ کر کہتا تھا۔

"مجھے تمہاری ضرورت ہے سکندر، میں نے غلط کہا تھا۔" لاریب نے دیر وہ یونہی سسکتی رہی۔ پھر کسی خیال کے تحت لاریب سے اپنا سیل فون ڈھونڈا اور سکندر کا نمبر ڈائل کر دیا۔ نمبر بند ہونے کی اطلاع پر اس کا جوش سے بھر جانے والا دل یکھٹ ویران ہونے لگا۔

"نمبر کیوں بند ہے اس کا اللہ کرے سب خیریت ہو۔" اس کے دل میں پہلی بار اس کے حوالے سے تشویش نے سراٹھایا جو گزرتے وقت کے ساتھ اتنی بڑھی کہ وہ کسی طرح بھی بابا سائیں پر یہ فکر مندی ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکی۔ جسکی ماضی کے دوران اس نے بظاہر سرسری انداز میں تذکرہ چھیڑا تھا۔

"آپ کا سکندر سے رابطہ ہے بابا جان؟" اور چائے کا مگھونٹ بھرتے بابا سائیں ٹھٹک گئے تھوڑے بیٹی کی بدگمانی سے آگاہ تھے جسکی یہ فکر اندازہ وہ بھی سکندر کے لیے نہیں بہت اچھا لگا تھا۔

"نہیں، لیکن وہ جانے سے قبل مجھ سے مل کر گیا تھا۔" ان کے جواب نے لاریب کی کسی طور بھی تسلی نہیں کر سکی تو



مضطرب سی ہوتی اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گئی۔

"کتنے دن ہو گئے ہیں بابا جان، اسے آپ کو اپنے موجودہ حالات سے آگاہ کرنا چاہیے تھا مجھے پتا ہے وہ اپنے خاندان کی تلاش اور جائیداد وغیرہ کی وصولی کی خاطر گیا ہے آپ کا کیا خیال ہے یہ سراسر حقیقت نہیں۔ برسوں پہلے ہی بات گواہ سر نو اٹھانا اور اپنی حیثیت تسلیم کرانا ہرگز اتنا آسان کام نہیں ہے۔ محض چند لاکھ کی وراثت کی خاطر اس طرح اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا سمجھداری نہیں تھی۔" بابا سا میں اس کا چہرہ غصے سے سرخ پڑتا دیکھ کر مسکراتے رہے۔

"لیکن بیٹے بات صرف وراثت کی تو نہیں تھی اصل نقاشہ اس کی اپنی پہچان کا تھا اس کی فیملی نے اسے بے نام و نشان کر کے رکھ دیا تھا۔" ان کی بات سن کر لاریب نے ہونٹ نیچ کر گہرا سانس بھرا۔

"پھر بھی بابا جان، جان سے بڑھ کر تو کچھ قیمتی نہیں ہوتا آج لوگ محض چند ہزار کی خاطر کسی کا قتل بڑی آسانی سے کر دیتے ہیں۔ اب اسے پہچان کی ضرورت ہی کیا تھی۔" اس کی جتنی جرات گھبراہٹ کی طرف جاتے ہوئے "ضرورت تھی بیٹے، اسے اس حیثیت کے ساتھ تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔" لاریب نے خوف سے دیکھا اور ان کی شاکی نظروں کی تیش کٹے کے نہیں کٹی۔ اس کا چہرہ خجالت و خفت کے احساس سے جھل اٹھا تھا۔ پھر اسی شام وہ اس بے چینی کے ہمراہ سکندر کے گھر چلی آئی۔ طولی اماں صحن میں بیٹھیں کونڈی میں مرچیں کوٹ رہی تھیں۔ اسے رو پرو پا کر جیسے ان کے چہرے پر رونق سی آگئی۔ وہ بڑے والہانہ انداز میں اسے ملنے کو انھیں مگر پھر جھجک کر وہیں ختم بھی گئیں۔

"ماں صدقے، میری دھڑی رانی آئی ہے، بیٹھو پتر۔" انہوں نے لپک جھپک اندر کمرے سے کھینچ نکال کر چار پائی پر بچھایا یہ بھی خاص خاص مہمان کے سوا گت کا ایک عقیدت بھرا والہانہ انداز ہوا کرتا تھا گاؤں میں۔ لاریب عجیب سے احساسات کا شکار ہو کر رہ گئی۔

"آپ کے یہاں آنے سے صرف میرا گھر میرا مقدر ہی روشن نہیں ہوا ہے لاریب، اماں اور بابا کو بھی جیسے کوئی انہوں نے خزانہ مل گیا ہے۔" کبھی آپ نے ان کے چہروں کو غور سے دیکھا ہے؟ ان سے یہ خوشی سنبھالی نہیں جاتی ہے اور وہ آپ کی کسی کڑشل کی عثیا کی طرح اس لیے بھی حفاظت کرتے ہیں کہ انہیں آپ کے جذبات و احساسات کی بھی پروا ہے۔ کبھی اپنے خود ساختہ دکھوں سے نکل کر اپنے اطراف میں ڈھک تو ڈالیں آپ کو اندازہ ہوگا کتنے لوگوں کی خوشی آپ کے چہرے کی مسکان سے وابستہ ہے۔ میں خود آپ سے کوئی تھنا نہیں کرتا مگر میرے والدین کے ساتھ آپ عزت سے بیٹھ تو آ سکتی ہیں نا۔"

سکندر نے ایک گلابی جاڑے کی شام اسے گلیہر لایا۔ اس میں جلا پا کر کتنے دل سوز انداز میں کہا تھا اور جواب میں اس سے بے بھاد کی سی ملی تھیں۔

اس نے تمہارے والدین کی خوشیوں اور عزت افزائی کا شکریہ ادا کر رکھا ہے کبھے وہ میری نہیں تمہاری امداد ہی ہیں۔"

"کیا ہوا پتر بیٹھو، میں چائے بنااتی ہوں، سکندر کے ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تسلیم ہی سے دولہائی لینے گئے ہیں کب سے انتظار کر رہی ہوں۔" کم صم کھڑی لاریب اماں کی آواز پر چونکی اور انہیں شانوں سے تھام کر رمان سے واپس پوچھ گئی پر بٹھا دیا۔

"چائے رہنے دیں اماں مجھے طلب نہیں اور بابا کو کیا ہوا ہے؟"

"سکندر کا غم کرتا ہے اتنے دنوں سے تاپ چڑھا کے لیٹا ہوا ہے۔ جذباتی ہو کر بیچ تو دیا ہے پر اب کہتا ہے غلطی ہو گئی وہ تو بہت خطرناک لوگ تھے۔ جب سے گیا ہے سکندر کا ایک بار بھی ٹیلی فون نہیں آیا۔" وہ ہاتھ مسل کر رہ گئیں اور لاریب کا دل دھک سے سدھ گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ بے جان سی ہو کر وہیں بیٹھ گئی۔ اسے سکندر کے وہ الفاظ یاد آئے جو اس نے دم رخصت لاریب سے کہے تھے۔ کتنا ٹوٹا ہوا اور مایوس لگتا تھا اور اس ٹوٹے ہوئے ماں و باپ



کے ساتھ وہ کوئی محاذ سر کر بھی کیسے سکتا تھا۔ اسے بے چینی و  
 حلال کے ساتھ خوف کا احساس بھی گھیرنے لگا۔  
 ”تمہاری اس شستگی اور تکلیف کا باعث میں ہی بنی  
 ہوں، سکندر، اگر تمہیں کچھ نقصان پہنچا تو میں کبھی خود کو  
 معاف نہیں کر سکوں گی۔“ اس کے آنسو بے آواز بہتے جا  
 رہے تھے۔



سکندر نے گہرا کش لے کر دھواں فضاء میں بکھیرا  
 اور سگریٹ باہر میز پر پھینک دیا۔ عجیب سی بے دلی  
 اور یاسیت اس کے اندر گھر کرتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی  
 بحرمانہ احساس بھی وہ کم از کم اماں بابا کو اپنی خیریت کی  
 اطلاع ضرور دینا چاہتا تھا مگر یہ بھی جانتا تھا وہ لوگ  
 لازماً لاریب کو اس خوشی کی خبر میں شامل کریں گے اور  
 وہ یہی نہیں چاہتا تھا۔

”آج آفس جانے کا ارادہ نہیں ہے مغل اعظم۔“ فرراز  
 اس کے کمرے میں یونہی بنا اجازت آیا کرتا تھا اور جب  
 سکندر نے اسے ٹوک کر اپنی کیٹس کا احساس دلانا شروع کیا تو  
 جواب میں وہ دانت کھوس کر بولا تھا۔

”میں جانتا ہوں میری جان تم ابھی منگل پر جس روز  
 قابل احترام لاریب صاحبہ تشریف لے آئیں گی۔“ فرراز  
 سے ہم تمہارے خلوت کدے میں شہنشاہ کے مطابق  
 دروازہ بجا کر اجازت ملنے پر قدم رنجہ فرمایا گیا ہے۔  
 کیونکر فکر کرتے ہو میرے شہزادے۔“ اور سکندر گہرا سانس  
 بھر کر خاموش رہ گیا۔

”دل تو یہی چاہ رہا ہے یار، طبیعت کچھ اپ سیٹ  
 ہے۔ آج تم مجھ پر استاد کی جھانڈنے کے بجائے خود ہی  
 آفس دیکھ لینا۔ میں کرتا بھی کیا ہوں سوائے تمہارے  
 احکامات کی تعمیل کے۔“ سکندر کے بے زاد کن انداز پر فرراز  
 اسے آنکھیں نکالتا گھورتا رہ گیا تھا۔

”اب کیا کہوں یار تم سے، سوائے اس کے کہ  
 ”شرم تم کو مگر نہیں آتی۔“ فرراز بولتا چلا گیا تو سکندر کی  
 ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

”ہاں تو آج یہ زحمت تم کر لینا۔ میں آرام کر لیتا  
 ہوں۔“ اس نے فرراز کے پھوٹے ہوئے کمال پر اپنی  
 آنکھیاں بھائی تھیں۔ فرراز نے غصے میں آ کر اس کا وہی  
 ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیا۔

”زیادہ بہانے مت بناؤ سمجھ تم آفس چل رہے ہو۔“  
 ”تم بھی سن لو میں تمہاری بیوی نہیں ہوں کہ جس  
 کے ساتھ تم اس طرح کی حرکتیں کرو اور اس پر رعب  
 جھاڑو سمجھ۔“ سکندر نے مصنوعی غصے سے کہا اور اسے  
 دروازے کی جانب دھکیلا تو فرراز نے جھپٹتے ہوئے  
 اسے گھونسا رسید کر دیا۔

”حکومت تمہاری ہے میں اپنی بیوی کو کتنی گھاس  
 ڈالتا ہوں۔“ وہ جھپٹتا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا تو

”سنو تمہارے گھر کے لیے تمہاری لاریب صاحبہ کی ایک  
 بڑی لورا کچھ تیار کی ہے۔“ اس نے بھی بے یار چھوٹی دالی سے میری  
 شادی کر اور اسے سن کر اپنی بڑی جائیداد میں سے مجھے بھی  
 کچھ دے گا۔“ فرراز نے کہا وہ دالیوں میں دواں گاتھیں۔ وہ  
 فرراز کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا کہ یہ ہاتھ

”اب امام کی شادی ہو چکی ہے۔“

”اوہ۔“ فرراز نے منہ اڑکا لیا تھا۔ تب ہی سکندر کی  
 نظر کھٹ دروازے کے پار کھڑی لاریب سے جا ملی جس کا فق  
 چہرہ دیکھ کر وہ اندازہ لگا سکتا تھا وہ ان دونوں کی مذاقت میں  
 کتنی بات بھی دل پر لے چکی ہے۔

”ارے بھائی۔۔۔ آئیے نا۔“ سکندر فوراً سنبھلا اس  
 کے چہرے پر لاریب کی دل آزادی کے خیال نے خفت بکھیر  
 دی تھی۔ فرراز نے اس کی بات سن کر ہی گردن موڑی تھی مگر  
 لاریب کو روک دیا کہ اس کی تیوی جڑھٹے لگی۔

”ہنسی شکر یہ، سکندر بھائی میں۔“ لاریب نے  
 ایک جھجکی ہوئی نظر فرراز پر ڈالی اس کا اعتماد فرراز کے  
 چہرے کے کبیدہ تاثرات نے بالکل ختم کر دیا تھا۔ سکندر  
 کو اس لڑکی پر رحم آیا۔

”جی۔۔۔ جی فرمائیے۔“ وہ پوری طرح سے متوجہ ہوا  
 اور نرم لہجے میں کہا کہ گویا حوصلہ بڑھایا۔







آواز ملتی میں گھٹنے کی وجہ عباس کی تختیر میز انداز میں خود پر  
اشتی نظر میں تھیں۔

"اؤو... بھئی، من لیا آپ لوگوں کی انڈر اسٹینڈنگ کو  
تھیک ہے آپ کو ضرورت نہیں ہوگی مگر بھائی جان یاد کریں  
اماں جان قاپ کی شادی کا کتنا ارمان رہا تھا آپ کی دلہن  
کے حصے کا زیورات بھی سنبھال کر رکھا ہوا ہے مہلوں نے۔  
انہی رسموں کے بھانے دیں گی آپ کو پھر یہ تو ان کے دل  
کی بڑی معمولی سی خواہش ہے چھوٹی بہو کو دلہن کے روپ  
میں دیکھنے کی۔ آپ کا کیا جائے گا اگر وہ اپنی خواہش پوری  
کر لیں گی۔" وہ عباس کا بازو پکڑ کر لجاہت سے منانے کی  
کوشش کر رہی تھی۔ عباس زمیں سے کچھ کہے بغیر خاموش  
سے پلٹ کر چلا۔

"شیریں! یہ کیا ہے؟" وہ کچھ عجیب سے ہو گئے  
جس کا آپ کو نہیں پتہ ہے؟ میں یا صرف پیار ہی کرتے  
ہیں؟" اس نے سر ادا ز پر فاطمہ بٹش کر گئی۔

"مجھے تو یہ پتہ ہے بھائی کے موڑ سے خائف ہو کم آن  
اور خود ہی اماں جان بھال کر لیں گی۔ تم یہ  
پہن کر آؤ جلدی سے۔" زمیں کی بے تکلفی  
موت پر تھی۔ اس نے لمحوں میں آپ جناب سے تم  
تک کا سفر طے کیا تھا۔

"اماں جان نے ان رسموں کے لیے رات کا وقت اس  
لیے رکھا کہ بچے سو جائیں بہت تنگ کرتے ہیں۔ پھر اس  
میں بھائی جان کا بھی قاعدہ ہے۔" اس نے شوخ انداز میں  
کہتے ہوئے فاطمہ کو آنکھ ماری تھی۔ فاطمہ نے تو شرم سے  
روٹوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ لیا۔

"آپ کی بیٹی ادا میں میرے بھائی کو لے ڈوبی ہیں  
یقیناً۔" زمیں نے میروان بٹاری ساڑھی نکال کر اسے  
تھمائی۔ فاطمہ ایک دم سے جھجک گئی۔ عباس کے سامنے  
اس سچ و سچ سے جانے کا خیال ہی اسے پریشانی میں مبتلا  
کرنے لگا۔ جیسی اس نے ساڑھی واپس رکھ کر کوئی اور لباس  
لینا چاہتا مگر زمیں شور مچانے لگی۔

"اؤو فاطمہ بھائی، کیا کرتی ہو بھئی۔ اماں سے مار

کو بھی فراموش کر ڈالوں گا جو اپنے بچوں کی وجہ سے  
میں نے قبول کی ہے۔" فاطمہ احساس شرمندگی و ذلت  
سے ٹڑھ کر رہ گئی۔

"تم بچوں کے ساتھ بیڈ پر سو جاؤ۔" وہ کارپٹ پر اپنا  
بستر بچھا رہی تھی جب عباس نے اندر آ کر اسے نوکا۔ دل  
کسی خوش فہمی کے احساس سمیت زور سے دھڑکا۔

"اور آپ؟" ما چاہتے ہوئے بھی اس کی زبان  
بے اختیار ہی میں پھسل گئی۔

"میری فکر میں باکان ہونے کی تمہیں ضرورت  
نہیں۔" زمیں سے کہہ کر وہ صوفے پر جا بیٹھا۔ اسی لمحے  
دروازہ بجاتھا۔

"لیس آؤن۔" عباس سگریٹ سگ رہا تھا۔

"بھائی جان آپ کو اور بھائی کو اماں جان با رہی ہیں۔  
بگے ایسا کریں آپ جائیں بھائی کو میں تیار کر کے  
وہاں لاتی ہوں۔" زمیں مسکراتی زمیں اندر آ کر بولی تھی۔

عباس نے الجھ کر استفہامی نظروں سے اسے دیکھتے جھک  
کر سگریٹ آتش ٹرے میں بجھا دیا۔ وہ اپنی ماں کی طرف  
کے علاوہ بھائی اور باپ کے سامنے بھی احتراماً اسو کوکھ

نہیں کرتے تھے۔ فاطمہ اس کی عادت و اطوار کی شگفتگی  
خاصیت کی بدولت دل میں اس کے لیے جتنی بھی  
عقیدت محسوس کرنے لگی تھی۔

"آئیے بھائی کوئی اچھا سا شوخ اور برا سا جوڑا  
نکال کر پہن لیں۔ پھر میں آپ کو تیار کر لی ہوں۔"  
زمیں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے اپنے بے  
تکلف لہجے میں کہا۔

"ان فضولیات میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے  
زمیں، میں نے اماں جان کو منع کیا تھا کہ۔"

"کیوں ضرورت نہیں ہے بھائی جان؟" زمیں اس کی  
بات کاٹ کر سخت احتجاجی انداز میں بولی جبکہ فاطمہ جو  
بہر حال ہر بات سے بے خبر تھی مہربانی کے موڑ کی  
تا گواریت کو پا چکی تھی اور خائف ہوئی جانی تھی۔

"زمیں آپا عباس تھیک کہتے ہیں ان۔" اس کی



جوڑی بالکل چاند سورج سے مشابہ ہے۔" ہاری ہاری دونوں کی پیشانی چومتے وہ خوشی سے حلی پڑ رہی تھیں۔ عباس کا چہرہ ایک دم حواں دھواں ہو گیا۔

کسی اذیت کے بل صراط سے گزرتے اس نے ہونٹوں کو باہم بھینچا تھا۔ جب زمہ کی اس پر نظر پڑی۔

"اٹو، بھائی جان اب تو موڈ ٹھیک کر لیں دیکھیں کتنا حسین بنا کر لائی ہوں آپ کی بیوی کو ایک طرح سے آپ کو میرا احسان مند ہونا چاہیے کہ آپ کی بیوی کوئی نوٹی نہیں بلکہ یوں سمجھیں آج ہی آپ کی شادی ہوئی ہے۔"

زمہ نے کہا تو باقی سب بھی ہنس دیے۔

"تھیں اب مسکرا بھی دیں جانتی ہوں آپ کے من میں تو لڑو پھوٹ رہا ہے ہوں گے۔" زمہ نے شوخ انداز میں کہتے ہوئے اس کے بال بگاڑ دیے۔ عباس نے ہنسنے لگا تو کنٹرول کیا۔

زمہ نے کہا تو باقی سب بھی ہنس دیے۔ "تھیں اب مسکرا بھی دیں جانتی ہوں آپ کے من میں تو لڑو پھوٹ رہا ہے ہوں گے۔" زمہ نے شوخ انداز میں کہتے ہوئے اس کے بال بگاڑ دیے۔ عباس نے ہنسنے لگا تو کنٹرول کیا۔

"تمہاری دلہن کے ہاتھ چوڑیوں سے کیوں خالی ہیں عباس چلو یہ نگین اور چوڑیاں پہناؤ اسے۔" اماں جان نے عباس کو سرزنش کی۔

"یہ چوڑیاں اور نگین ہماری خاندانی نشانی ہے بیٹے انہیں کبھی بھی ہاتھوں سے نہ اتارنا ہمارے ہاں بھویوں کے ہاتھ نوٹے نہیں رہتے۔" اب وہ فاطمہ سے مخاطب تھیں۔ یہ سمجھتیں اس کے وجود پر عباس کے لگائے نشتروں پر جیسے پھاہد کھدی تھیں۔

"چلو عباس بیٹے پہناؤ اپنی دلہن کو یہ۔" اماں جان نے فاطمہ کی فرمانبرداری کے مظاہرے پر نہال ہوتے پھر سے اس کی پیشانی چولی۔

"مم..... میں..... کیسے پہناؤں اماں جان، مجھے بھلا ان کاموں کا کیا تجربہ؟" وہ کسی طرح بھی اب کے اپنی بڑھی اور جھنجھلاہٹ نہیں چھپا سکا۔

پڑوائیں گی مجھے، ان کے خیال میں تو یہ لباس بھی بہت ساوہ سا ہوگا۔ مگر کیا کروں تمہارے سارے کپڑے ہی ساوہ سے ہیں چلو اب یہی قناعت لیکن لوہر ہورہی ہے وہاں تو سب منتظر بیٹھے ہیں۔" زمہ کی غلٹ بچا دینے پر فاطمہ کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ چپ چاپ اس کی مان لیتی، زمہ نے اس کے لمبے بالوں کو سمیٹ کر چولی ہٹائی اور اس کے بعد اس کا میک اپ کرنے لگی۔

"گو کہ تمہیں اس کی ہرگز ضرورت نہیں ہے مگر کبھی کبھار تھکاتے نبھانے پڑتے ہیں۔" زمہ کی ستاؤی انداز میں اس کے لیے نئی تعریف چھلک رہی تھی۔ فاطمہ اپنی گھبراہٹ کا شکار تھی کہ مسکرا بھی نہ سکی اسے عباس کا متوقع رد عمل ابھی سے کنفیوژ کر رہا تھا۔

"رکیں آپ، میں سر پر کوئی ساکاف لے لوں۔" فاطمہ کو کھلے سر سب کے سامنے جاتے جھجک آ رہی تھی زمہ نے فوراً ٹوک دیا۔

"ارے ساڑھی کے ساتھ کون سر ڈھانچتا ہے؟" وہاں کوئی غیر تھوڑی سی چلو آؤ۔" وہ اسے پکڑ کر اپنے سینے کا موقع دیے بغیر ہاتھ پکڑ کر ہل کرے میں لے آئی۔ جہاں رات کے اس پہر بھی ان کا ساں تھا۔ ساری آرائشی لائیں روشن تھیں۔ حویلی کے باہر اس وقت یہاں جمع تھے۔ اتنی چہل پہل کی کہ باقاعدہ کسی تقریب کا انعقاد ہو۔

فاطمہ کی آمد کے ساتھ خوشگوار قسم کی ہلچل مچ گئی۔ سب نے اپنے اپنے انداز میں اسے دیکھا۔ اماں جان نے انھیں کمراس کی بلا میں لیں اور اسے تمام کر بے حد محبت کے ساتھ کسی حد تک خاموش اور خفا نظر آتے عباس کے پہلو میں بٹھا دیا۔ فاطمہ کے وجود میں جیسے برقی مدورائیت کر گئی تھی اور دل اپنی رفتار بھولنے لگا۔ عباس کے احساسات کی اسے خبر نہیں تھی مگر وہ ضرور اس بل جیسے اُمول ہوئی تھی ہر لحاظ سے۔

"ماشاء اللہ، دیکھیں عباس کے ابا ہمارے بچوں کی



"ارے ویسے ہی جیسے پہناتے ہیں اتنا عرصہ ہو گیا شادی کو کیا تم نے اسے کبھی چوڑیاں نہیں پہنائی ہوں گی۔ شرماتے کیوں ہو یہ رسم ہی ہے۔" اماں بیٹے کی جھنجھلاہٹ محسوس کیے بغیر محبت سے مسکرائے نکلیں۔ عباس زچ ہو گیا۔

"یہ خود پہن لیں گی اماں جان، فاطمہ آپ پہن لیں۔" اس کے لہجے کی جھنجھلاہٹ کو فاطمہ نے سمجھ لیا تھا۔ "اتنی چھوٹی نکستی ہیں دیکھنے میں یہ پھر شادی کو بھی اتنا عرصہ بیت گیا آپ اسے ابھی تک آپ کیوں کہتے ہیں آخر؟" زمینی کے اختلاف کی وجہ بہت عجیب تھی۔

"رعب حسن ہی اتنا ہے کیا کرے کوئی۔" جواب زمینی کے شوہر تنویر نے دیا تھا۔ عباس مجلس کر رہ گیا۔ فاطمہ کی تو جیسے جان ہوا ہوئی تھی۔

"اتنا حسین روپ اس پر یہ ادا میں ہمارے بھائی بے چارے تو اب تک خواب و خیال کے سلسلے میں جھکتے ہوں گے۔" فاطمہ نے زمینی حریف کو ہر افشانی کر دی تھی۔

فاطمہ کا رنگ یکدم سرخ پڑ گیا۔

"اس طرح ڈرڈر کر کیوں دیکھتی ہیں آپ کی جھکت ہیں جناب، ڈٹ کے دیکھیں بلکہ فرمائش کریں کہ چوڑیاں اپنے ہاتھ سے پہنا کر آپ کو فاطمہ محبت سے روکنی اسے نگاہ اس کی خیر نہیں ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے عباس ہم سب۔" اسے جان چھڑا رہا ہے۔ دیکھو ذرا اس کی دلہن اتنی بیماری لگ رہی ہے کہ یہ تہائی چاہتا ہے۔" مہر آ پائے تو جیسے انتہائی کروی۔ خواتین کے ساتھ مرد حضرات بھی ہنسنے لگے بہت خوشگوار اپنا بیت آمیز ماحول تھا۔

عباس ایک جھٹکے سے اٹھا اور تیز قدموں سے وہاں سے چلا گیا۔

"ارے۔۔۔۔۔" صرف اماں جان بوکھلائی تھیں۔ باقی سب کی ہلکی سی اضافہ ہوا تھا۔ فاطمہ سن پڑنے لگی۔ دل اندر ہی اندر گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ "دیکھا، کہا تھا میں نے۔" مہر آ پا کا اپنے قیاس پر سو

فیصد یقین اب بھی قائم تھا۔

"چلاؤ دیکھیں تمہارے کمرے میں چھوڑ دوں لیکن یہ چوڑیاں تم اسی سے پہننا ہمارے سامنے شرمناک ہوا تھا۔" مہر آ پائے اسے اٹھاتے ہوئے کہا تھا زمینی زور سے ہنسی۔

اماں جان نے بیٹی کو اس بے حجاب مذاق پر گھورا تھا۔ باپ اور بھائی کی موجودگی کے ساتھ وہ بہنوئی کا بھی لحاظ نہیں کر رہی تھی۔ مہر آ پا فاطمہ کو اس کے کمرے کے دروازے پر چھوڑ کر چلی گئیں۔ فاطمہ کو کمرے میں جانا اور عباس کا سامنا کرنا دنیا کا دشوار ترین کام لگ رہا تھا۔ دل کڑا کر کے دروازے کے چینل پر دباؤ ڈالا اور دروازہ وا کیا۔ اندر تو بہر حال جانتی تھی۔ یہاں کھڑے رہ کے بھی گزارا نہیں ہو سکتا تھا۔ اندر آ کر اس نے ہاتھ میں موجود چوڑیوں اور کنگن کے کیس کو دست پر لایا اور اپنے کپڑے لینے تیزی سے آگے بڑھی۔ پہلی دھڑکن والی روم کا دروازہ کھولتا عباس اس کی طرف سے نکلا۔ صورت حال گھبرائی ہوئی تھی کمرے کے دروازے پر دو دروازے ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ دونوں نے شیشا نظر میں چرائیں اور کھڑا کر رکھا چاہا کہ عباس نے یکدم جھپٹ کر اس کی کلائی جکڑ لی۔ فاطمہ کے سر پر جو دم میں خوف کی سرطہ دوڑتی چلی گئی۔

"آج کے بعد میں تمہیں دوبارہ میری روم سائڈ میں نہ دیکھوں، سمجھیں؟" اس نے سر دھچکے میں کہا۔

"اپنی بیماری کر رکھو، تمہیں صبح واپس جانا ہے یہ سب کچھ عریضہ کے لیے تھا اگر وہ نہیں پاسکی تو تمہارے لیے بھی نہیں ہونا چاہیے۔" اس کا لہجہ ہنوز سرد تھا۔ عباس نے تحفہ زدہ انداز میں اس کا ہاتھ جھٹکا۔ فاطمہ زرد چہرہ لیے دھڑکن والی روم میں چلی گئی۔ جب وہ باہر آئی تو عباس بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔

عباس نے نگاہ اٹھانے کو ہاتھ بڑھایا تو چوڑیوں کے کیس سے نکل گیا۔ اس نے بھنوں میں اچکا کر پہلے چوڑیوں کے ڈبے کو پھر فاطمہ کی طرف دیکھا اس کی نظریں دھکی ہوئی تھیں۔

"کماں کی بات سنی تھی تم نے، یہ خاندانی زیور ہیں



انداز اس کے اندر لاؤ دہکانے لگا۔ اسے ایک جھگڑے سے اپنے سامنے سے ہٹاتا وہ تیزی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔



اس نے جائے نماز تہہ کر کے رکھی اور غیر محسوس انداز میں آنکھوں کی نمی پونچھی۔ سکندر سے نہ ہونے والے رابطے نے اس کے اندر عجیب سے سناٹے اچھڑا دیے تھے۔ ہر نماز میں اللہ سے اس کی خیریت و عافیت کی دعا مانگتے اپنی کوتاہیوں کا احساس اس کی آنکھیں نم کرنے لگتا تھا۔ اس نے کچھ سوچا پھر بابا سائیں کے کمرے کی جانب چلی آئی۔

"ابن انداز جاؤں بابا جان۔" دستک دینے کے بعد اس نے سرائیں انداز میں اجازت چاہی تو بابا سائیں نے خوبصورت مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا۔

"بہت خوشی ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ مجھے میری دعا میں دیر کی گئی ہے جسے میں کچھ عرصہ پہلے کھو چکا تھا۔" اسی بار بار دہرائی دل سے محض ان کی خاطر مسکرا دی۔

"کبھی کبھار مجھے لگتا ہے بابا جان آپ نے مجھے اپنی دواؤں میں سب سے زیادہ محبت و اہمیت دے کر باقی دواؤں کی حق تلفی کر دی ہے مگر پھر خیال آتا ہے محبت میں کمی بیشی میں ذاتی اختیار نہیں ہوتا۔ اسی لیے اس معاملے میں اللہ نے بھی رعایت دے رکھی ہے مگر بابا جان انصاف کے تقاضوں کو ضرور ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے کہ حکم خداوندی یہی ہے اس کے متعلق ضرور سوال ہوگا۔" بابا سائیں اس کی بات پہری توجہ سے سن رہے تھے۔ اس کے خاموش ہو جانے پر سرائیں کمر بنچیدگی و حساسیت سے دیکھا ان کی نظریں سوالیہ انداز لیے تھیں۔

"آج میری بیٹی بہت اہم بات کر رہی ہے مجھ سے بھی جانے انجانے میں غلطیاں ہوتی ہیں جن کا بسا اوقات ہمیں خود بھی اداک نہیں ہوتا میں اللہ سے توفیق مانگتا ہوں۔"

"پہلے تو اس پوائنٹ پر میں بھی غور نہیں کر سکی تھی بابا جان مگر آج اچانک ہی یہ بات میرے ذہن میں آ گئی

ہمارے اتنی بے پروائی سے بچھٹکنے کا مقصد کیا ہے؟" عباس نے اشتعال میں آتے چوڑیاں اٹھا کر کارپٹ پر پھینک دی تھیں۔ فاطمہ اس کے کمرے پر بوکھلائی تیزی سے آگے بڑھ کر کھڑے جانے والی چوڑیاں انکشی کر رہی تھی۔ مگر اس کوشش میں ادھ بے جوڑے میں لینے ہل دھیرے دھیرے کمرے کی مازک کمر اور شانوں پر رشیم کے لمبھوں کی مانند بکھر گئے۔

اس کی جانب متوجہ عباس تمام تر نفرت کے باوجود اس حسین منظر کی سحر انگیزی و دھڑکن کی زد میں آنے سے خود کو بچا نہیں۔ کاوہ بنا ٹپکس جیسے گم صم سے تکتا چلا گیا۔

"یہ وہاں کیوں رکھ رہی ہو کیا کہا تھا اماں نے اتنی جلدی بھول گئیں؟" فاطمہ کو چوڑیاں اور نگلیں بھی ساڑھی کے ساتھ بیگ میں رکھتے پا کر وہ اسے بے اختیاری کی کیفیت میں کہہ گیا تھا۔

"ان کی بات کی یہی اہمیت ہے تمہارے نزدیک پہنچ نہیں۔" اس کا انداز ڈپٹے والا تھا۔ فاطمہ کے چہرے پر جانے کس جذبے کے تحت روشنی سی چھا گئی۔ عباس نے چپ چاپ نگلیں کا ڈبہ بھی اس کی گود میں ڈال دیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے نگلیں کا ڈبہ کھینچ کر باہر نکلائی میں موجود چوڑیاں بکھر گئیں۔ بابا سائیں جو اس سے نظریں چار رہا تھا چونک کر متوجہ ہوا، اسے نگلیں میں جلا پا کر گہرا سانس بھر کے کہہ گیا۔

"اٹوہ..... یہ ایسے نہیں پہنے جاتے مان سنس۔" نگلیں سے طبع آزمائی کرتے فاطمہ کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔ جیسی عباس نے نگلیں سے کہتے اس کے ہاتھ سے لے کر نگلیں کا لاک کھولا اور نگلیں اسے پہنا دیے اس کی نگاہ بار بار بہک رہی تھی۔ وہ تو جیسے مشکل میں پڑ گیا تھا۔

دوسری جانب فاطمہ بھی جو اس درجہ مہربانی و عنایت پر حیران نظر آ رہی تھی۔ وہ حواسوں میں رات ہی بھی تو کیونکر وہ جاوگتا کھوں والا ہے حد حسین نفس ایک دم روپ بدل کر اسے خوابوں کی نگری میں لے گیا تھا۔ معا عباس اس سحر سے آزاد ہوا اور اس کا ہاتھ چھوڑ کر پیچھے ہٹا۔ فاطمہ کا بے خود



جان، اس لڑکے کا نام شرجیل علوی ہی تھا جس سے انہوں نے شادی کی، کراچی سے ہی لی لاگ کرتے ہیں وہ لوگ۔" اس کا انداز خود کلامی کا ساتھ بابا سائیں خاموش سے اسے دیکھنے لگے۔

"بابا جان میں سکندر کے والدین کو یہاں حویلی میں لانا چاہ رہی تھی وہ لوگ وہاں تھا ہیں اور سکندر کی غیر موجودگی کے باعث اس بھی۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے بیٹے میرا نہیں خیال کہ تمہیں میری اجازت ملنی چاہیے تھی انہیں اپنے ساتھ ہی یہاں لے آتیں مگر وہ اب ذمہ داری ہیں تمہاری، بات صرف ان کی ادائیگی کی نہیں ہے مجھے تو اپنی بیٹی بھی اداس لگتی ہے۔ سکندر کو رونا لگے گا اس تبدیلی کا تو بہت اچھا لگے گا اسے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے چٹکے انداز میں کہہ کر ماحول کو یکدم بدل دیا۔ لاریب کو کہاں تو قہقہے لگنے لگیں اس کی بات سن کر جبرائیل، دلی پھر اس قدر جھنجھلا کر کچھ کہے پھر اس نے ان کے کھنکھارے پر اپنا سر رکھ دیا اس کا دل اس کی بات پر ایک اداسیاں سمیٹ لاتی تھیں۔

وہ جب گیا تو مجھ سے بہت خفا تھا بابا جان، مجھے تو لگتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر ہم سے رابطہ نہیں کر رہا۔" اس کے لیے میں خدشات تھے۔

"نہیں بیٹا، وہ ایسے چھوٹے ظرف کا مالک نہیں ہے، اپنے مسائل میں الجھا ہوا ہوگا وہ کام ہرگز بھی آسان نہیں تھا۔"

"آپ اس کی فہم نہ کریں بابا جان، میری بات ہے جا نہیں ہے ایسی بھی کیا مصروفیات کہ ایک فون نہ کیا جاسکے۔" وہ صرف شاکی نہیں ہوئی، جھنجھلائے بھی لگی۔

"چلو ٹھیک ہے جب آئے گا تو میں اس کے کان سمجھوں گا۔ آخر اس نے میری بیٹی کی پریشانی کا خیال کیوں نہیں کیا، اسے فون کرنا چاہیے تھا۔" ان کا انداز ایسا تھا کہ لاریب پھر ہنس کر گئی بابا سائیں مسکراتی آسودہ آنکھوں سے اسے دیکھتے رہے۔

"بیٹا کیا ابھی بھی آپ کو لگتا ہے کہ میرا وہ فیصلہ غلط

تو.....؟" وہ جیسے کچھ کہتے ہوئے ہنسی پکپکاتی۔

"ایمان بھوگور میری غلطی میں بہت معمولی سا فرق تھا مگر انہیں ہم نے نہ معاف کیا نہ گنجائش نکالی بابا جان اگر آپ مجھے سکندر کے ساتھ رخصت کر سکتے تھے اس رشتے کو قبول کرتے ہوئے تو پھر.....؟" بابا سائیں کے چہرے پر لڑتے تغیر کو دیکھتی لاریب نے یکدم اپنی زبان روک لی۔ بابا سائیں جبرائیل مسکرائے اور اسے بات جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ لاریب نے کچھ کہنے سے قبل اپنی جگہ چھوڑی اور ان کے سامنے زمین پر گھٹنے فیک کر بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

"مجھے آپ سے بہت محبت ہے بابا جان۔ میں یہ نہیں کہتی کہ جو کچھ بھوگور نے کیا وہ ٹھیک تھا یا آپ نے ان کے ساتھ کوئی زیادتی کی۔ میں تو صرف یہ کہتی ہوں کہ میرے دوران کے عمل میں.....؟"

"میں سمجھ سکتا ہوں لاریب بیٹے اور مجھے فخر ہے اس بات پر کہ میری بیٹی اتنی اعلیٰ ظرف ہے کہ نہ صرف اپنی کوتاہی یا غلطی کو تسلیم کرتی ہے بلکہ مجھے گائیڈ کرنے کی کوشش میں بھی مصروف ہے۔ بیٹے میں آپ کو یہ بتاؤں وہ لوگ کہ ایمان کو تو میں کب کا معاف کر چکا ہوں۔ یاد تو مجھے بھی بہت آتی ہے وہ دل ان کے لیے کھلی رہا ہے۔" وہ بڑے تڑپتا ہے جیسے تمہارے یا امامہ کے لیے لیکن اس نے کہنے کے بعد کبھی پلٹ کر خبر ہی نہیں لی میں آخری بار ہونڈا بھی تو کہاں؟" لاریب نے دیکھا ان کی ہونڈی آنکھوں میں آنسو لڑاں تھے لاریب کا دل غم سے بوجھل ہو کر پھٹنے کے قریب ہو گیا۔

"بابا جان اگر میں انہیں ڈھونڈ لوں تو آپ انہیں.....؟"

"میں اسے معاف کر چکا ہوں مگر آپ اسے ڈھونڈو گی کسے؟" بابا سائیں کی حیرانی اپنی جگہ قائم تھی۔ لاریب کے پرتمذت چہرے پر مبہم ہی مسکان بکھری۔ البتہ آنکھوں میں آنکھوں نے وہاں ہونڈا قائم تھا۔

"میں انٹرنیٹ کے ذریعے سب پتا لگا لوں گی بابا



"اگرے..... نہیں کیا ہوا، مجھے لگتا ہے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" امامہ نے گھبرا کر کہا۔ عباس خود بھی متحیر نظر آیا کہ ہر کسی کی سواہ نگاہوں کو خود پر اٹھنا محسوس کر کے وہ بری طرح جربز ہو چکا تھا۔

"مجھے تو لگتا ہے عباس کی دلہن کے پاس ہمارے لیے کوئی خوشخبری ہے، ہے نا عباس۔" اماں جان نے اٹھتے ہوئے عباس کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ ان کے لہجے میں خوشی بھی تھی اور معنی خیز بھی۔ عباس پہلے تو سمجھا نہیں مگر جب سمجھا تو صرف پکرایا نہیں تھا بلکہ اس کا دل چاہا تھا قاطر کا گھادادے۔

"کھانا عباس، واقعی یہی بات ہے لیکن ابھی تو تمہارے دونوں بچے بھی خاصے چھوٹے ہیں۔" مہرآپا نے سواہ کے ساتھ ساتھ احساس دلایا تھا۔ عباس بھٹکے سے کسی کھیت کر اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا قاطر کے پاس چلا گیا۔ سرد و سفاک نظروں سے گھورنے لگا۔ جو اماں جان کے قریب و غریب سواہوں کی زد پر آئی کچھ بات بکھینچتی نظر آتی تھی۔

"ارے بیٹا! اتنا گھبرا کیوں رہی ہو۔" اماں جان اس کی سرخ پڑتی رنگت اور نظروں کے اتارے روہانے انداز کو دیکھتی ہوتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ عباس بھی حیران تھا۔

"آپ بتاتی کیوں نہیں ہیں ہوا کیا ہے آپ کو؟"

تلخا کر کہتے اس نے قاطر کا کانہا اس سختی سے دبوچا تھا کہ قاطر کی آنکھوں میں نمی دھاتی۔

"انہو..... کیا ہو گیا ہے عباس بیٹا، ایک تو پہلے ہی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اس پر آپ نے ڈانٹا شروع کر دیا۔"

اماں جان کو قاطر کی آنکھوں میں مچلتی نمی نے بے چہرہ کیا تھا جیسی وہ لاڈلے بیٹے کی بھی کھینچائی سے باز نہ دیکھیں۔

"اس ساگ میں ویسی بھی کی آمیزش بہت زیادہ تھی میں ویسی بھی نہیں کھا سکتی۔ بس اس وجہ سے وہ میسنگ ہوئی مجھے۔" الفاظ اس کے حلق سے پھنس کر نکلے تھے۔

"ہاں بیٹا وہ ساگ ویسی بھی میں ہی بنا ہے۔ مجھے نہیں پتا تھا آپ نہیں کھا سکتیں۔ خیر چھوڑو آؤ کچھ اور کھا لو۔" وہ

تھا؟" لاریب کے چہرے پر اس سوال نے خفیف سے سرخی بکھیر دی۔ وہ مجھے سر کے ساتھ ہسٹکی سے مسکرا دی۔

"مجھے اندازہ ہے بابا جان میں اپنی حماقتوں اور جذباتیت کے باعث سب کو بہت پریشان کر چکی ہوں۔ بھلا وہ فیصلہ غلط کیسے ہو سکتا ہے جسے اللہ نے درست قرار دے دیا۔ لیکن ہم اپنی سوچوں میں اتنا آگے نکل چکے ہوتے ہیں کہ خدا کی مصلحت کو نہیں سمجھ پاتے۔ وقت کے ساتھ ہر چیز اعتدال پر آتی ہے تو بگاڑ درست ہو جاتے ہیں اس نادانی پر اللہ مجھے معاف فرمائے۔"

"جتنی رہو بنی خوش رہو آباؤں ہو۔" بابا سائیں نے نہال ہو کر اس کی پیشانی چومی تو لاریب آنکھیں موند کر مسکرائے لگی۔



"یہ ساگ لو بچے خاص طور پر تمہارے لیے بنوایا ہے میں نے ساتھ میں مکئی کی روٹی اور مکھن پسند ہے نا تمہیں؟" اماں جان کی ساری محبت و توجہ گویا عباس حید کے لیے وقف ہو چکی تھی عباس نے نرمی سے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ساگ کی ڈش لے لی۔

"اماں جان قاطر سے بھی پوچھیں گا اور ہے مجھے مہرآپ کے اسی لاڈلے سپوت کی لاڈلہائی میں۔" زہی کو چٹکا! سو جھاتا تھا۔ اماں جان نے مسکراتے ہوئے خود قاطر کے لیے پلیٹ میں ساگ نکالا۔ قاطر نے اسے لیے۔ ڈش انوکھی اور عجیب تھی اماں جان کے صرار پر ہی اس نے بعض ان کا دل رکھنے کو دو چار نوا لے نہ ہر مار کیے تھے وہ بھی طوعاً و کرہاً جس کا نتیجہ سامنے بھی آ گیا۔ اس کا دل شدت سے متلایا اور بکاٹی سی آنے لگی۔

"مجھے لگتا ہے قاطر کو ساگ پسند نہیں آیا آپ کا۔"

زہی ہنس رہی تھی۔ اماں کے ساتھ دیگر افراد خانہ نے بھی حیرانی کے ساتھ قاطر کو دیکھا جس کے چہرے پر بے چارگی رقم تھی۔ اگلے لمحے زور سے آنے والی ابکاٹی نے اسے منہ پر ہاتھ رکھ دیاں سے اٹھ کر واش روم کی جانب بھاگنے پر اکسایا تھا۔ سب ہی بک دک بیٹھدے گئے۔



"زسی چپ ہو جاؤ پلیز، کبھی موقع مل بھی دیکھ لیا کرو۔" لب کے اسے خوب نے ہی ڈپٹا تھا زسی کا تو غصہ سا تو یہ آسمان پر جا پہنچا۔

"ہاں، ہاں اور ڈانٹیں مجھے سب کے بچ بٹھا کر ابھی تعریفیں کر رہی تھی لب کی۔" خوب سر ہٹا کر بیٹھ گیا۔

"مہر و بیٹے آپ فاطمہ کو اس کے کمرے میں چھوڑ آؤ طبیعت ٹھیک نہیں ہے فوراً آرام کر لے گی۔" اماں جان نے ماحول بدلنا چاہا۔

"جینا آپ بچوں کی فکر نہ کرنا میں سلا لوں گی اپنے پاس۔" فاطمہ بوکھلائی یعنی عباس کی مزید ہراسی کا سامان ہو رہا تھا۔

"نہیں میں جان میں بالکل ٹھیک ہوں پھر بچے مجھ سے کسے آپ کو۔"

"کوئی شک نہیں ہوتے ہم آپ بس جا کر آرام کرو جاؤ شاہناز۔" زسی نے لب سے نوک دینے پر فاطمہ وہاں سے اٹھ کر آئی۔ فاطمہ نے ڈرے ڈرے انداز میں اندر قدم رکھا۔ لب نے ہی مرحلے پر ٹھٹھک کر قہقہہ لگایا عباس سگریٹ کے لیے کمرے میں شامل رہا تھا۔

"آجائے محترمہ، رک کیوں نہیں، بتانا پسند کریں گی کہ اس قدر فضول اور تھرو کا اس حرکت کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" اسے دیکھتے ہی وہ غصہ بنا کر ہو کر اس کی جانب لپکا۔

"میری سوچ سے بھی کہیں بڑھ کر گھسیا عورت ہو تم مجھے تاسف ہے اس وقت پر جب میں نے اپنے بچوں کی خاطر قہم سے نکال کیا۔ ورنہ تم ہرگز بھی اس قابل نہیں تھی۔" اس کا لہجہ لہانت آ میز تھا۔ عباس کے لیے بہت آسان تھا اس کے کردار پر حملہ کرنا وہ کس اذیت سے گزرتی تھی وہ جانتا ہی نہ تھا۔ عباس کے دھکے کے نتیجے میں وہ لڑکھڑا کر صوفے پر گر گئی۔

دھیرے دھیرے اس کا تپا ہوا دماغ اور کھنچے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑے تو اپنے رویے کی بد صورتی کا احساس بھی جاگا تھا۔ چونکہ وہ ایسے جاہلانہ طرز عمل کا عادی نہیں

نہی سے کہتی اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس پھیل سکتا نہیں۔ عباس ان سے بھی پہلے اپنی جگہ پر واپس آ چکا تھا۔ اسامہ اب اس کی گود میں تھا جبکہ بابا جان کے پاس تھی۔

"لو کہ بہو نے میرے خیال کی تردید کر دی مگر بیٹے بہتر ہوگا آپ ٹیسٹ وغیرہ کرا لینا۔"

"مجھے لگتا ہے بھائی اگر ایسی بات نہیں بھی ہے تو اماں جان کرا کے دم لیں گی۔" زسی ٹھٹھکا کی تھی مگر اس کی یہ نہ پھاڑ کر ہر بات کہہ دینے والی عادت نے جہاں فاطمہ کو کل رنگ کر دیا تھا وہیں عباس جیسے صحیح معنوں میں کاتنوں پر جا کر اٹھا۔

"شٹ اپ زیب، اتنی بڑی ہو گئی ہو مگر تمہیں ابھی تک بڑوں کے ساتھ بیٹھ کر بات کرنے کی تمیز نہیں آئی۔" وہ غصے میں کہتا اٹھ کر چلا گیا۔

"بس مجھے ہی ڈانٹنا، میں نے کون سی گستاخی کر دی بھلا؟" زسی منہ لٹکا کر بیٹھ گئی تھی۔

"بالکل ٹھیک کہا ہے تمہیں تو بوڑھی ہو کر بھی عقل نہیں آئے گی۔ امامہ کو دیکھا ہے ابھی خامسی چھوٹی ہے تم۔" ماشاء اللہ بچی میں ایسی سمجھداری اور معاملہ فہمی ہے کہ امامہ آتا ہے ایک تم ہو۔" اماں جان نے بھی بلااد ملحہ نہ کیا۔

"بھئی اب آپ امامہ سے میرا معاملہ سنیں اسے آپ نے وقاص بھائی جیسے جلا دیا ہے۔" امامہ نے وقاص کے تھنک گاؤ بہت پولاٹ پچر کے مالک کے ہاتھ بٹے بات پر ڈانٹتے نہیں۔ "زسی نے پھر بے ٹکان کہہ تھا۔ اماں جان اسے گھورتی رہ گئیں۔ جبکہ وقاص کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ جسے کبھی امامہ خاموش نہیں دوسکی۔

"وقاص ہرگز ایسے نہیں ہیں زسی آپا آپ کو ان کے بارے میں کوئی خط بھی لائق ہے یقیناً۔" وقاص نے جو تک کر امامہ کو دیکھا جو اس وقت جذباتی کیفیت کے زیر اثر تھی۔ زسی کو اہلہ امامہ کی یہ حمایت ناگوار خاطر ہوئی تھی جیسی نخوت سے بول پڑی۔

"ارے واہ، بڑی فحور ہو رہی ہے شوہر کی یاد نہیں جب.....!"



رنگارنگ کہانیوں کے آراستہ دلچسپ حیرت

AANCHALPK.COM

تازہ شماره شائع ہو گیا ہے



ایک نئی کہانی، ایک نئی کہانی، ایک نئی کہانی

ذہنی زبان

عالمی سرشاروں کے پس منظر میں وطن پرستوں کے لیے بطور خاص تیار شدہ ایک دلچسپ ناول

جلیقہ سنگھ

جلیقہ کے صفحات میں محض سرور میں پہنچنے کی دلی

AANCHALNOVEL.COM

قارئین کی دلچسپی کے لیے خوبصورت سلسلے

خوشبو خوش، منتخب غزلیں، انھیں۔ ذوق آگئی اقتباسات  
اقوال ذریعہ احادیث وغیرہ معروف دینی اسکالر کا فظ  
شہیر احمد سے اپنے دنیاوی مسائل کا حل جانے

پہنچنے کی صورت میں رہیں آگئی (021-35620771/2)

تھا۔ جیسی ندامت نے جلدی آن لیا۔ گوکہ اس سے قبل بھی وہ اس کی توہین کر چکا تھا مگر آج کے الفاظ بہت سنگین تھے۔ عباس کا دل عجیب سی پشیمانی سمیٹ لایا۔ بہر حال اگر وہ مجرم بھی تھی تو عباس کو ذیہ نہیں تھا کہ اس طرح اس کی کردار کشی کرتا۔

”فاطمہ.....!“ دعا کے بڑھاپہ سسکتی ہوئی فاطمہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس کے لہجے میں واضح ندامت اور بے بسی تھی۔

فاطمہ شدید غیر یقینی کے احساس سے دوچار ساکن و سامت رہ گئی۔ عباس نے اس کے کاندھے پر دباؤ ڈالا اور رخ اپنی جانب پھیر لیا۔

”آئی ایم ساری، میری وجہ سے تم ہرٹ ہو گئیں مجھے اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا۔“ وہ بولا تو اس کا لہجہ بوجھل تھا۔ فاطمہ گنگ ہونے لگی بھلا یہ ممکن تھا کہ وہ اسے منائے اس کے احساسات کی پروا کرے۔

”میں نے ہرگز کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا، واقعی وہ کھانا کھا کر میری۔“ عباس نے اس کو دیکھا جواب دینے کی بھلائی کرتی ہوئی ہنسنے اور بھی خاص سیسے اور اس کی رہتی تھی۔

”مجھے یقین ہے تم ہرگز بات نہیں کرتے۔“ عباس نے ملائمت سے نو کاٹور میں کھانا بجا کر کھڑا ہوا معاویہ چونک گیا۔

”بچے کہاں ہیں؟“ اس کی متلاشی نظریں واپس فاطمہ پر تان پھریں۔

”اماں جان کے پاس ہیں کہہ رہی تھیں اپنے پاس سلائیں گی۔“ عباس نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر الوی مسکان کا جھلکاؤ ٹھنکس اتے بے تحاشا خوب صورت بن رہا تھا۔

”لاریب کیسی ہو بھئی، شکر ہے تمہاری شکل دیکھنے کو ملی، تمہیں پتا ہے عباس بھائی بھی آگئے ہیں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رنجی اتنے کیوت ہیں ان کے بچے اور



میں آ یا کرتی چلی گئی۔ جہاں امامہ کے چہرے پر طمانیت اور فتح مندی لہرائی تھی۔ وہاں بابا سائیں گہرا سانس بھرتے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ زمہی کا منہ ٹٹکتے لگا مگر اس نے لاریب سے کبھی شکست نہیں تسلیم کی تھی پھر اب کیسے کر لیتی۔

”اوہ۔۔۔ سکندر وہی نا جو سانوالا سا تھا تمہارا ملازم؟“

اس کے لہجے میں بلا کی سرد مہری اور بے رحمی تھی لاریب کو اس سے یہی توقع تھی جیسا بغیر گھبرائے اسی اطمینان و اعتماد سے مسکراتے لگی۔

”ہاں بالکل وہی ہے، لیکن وہ وہ حقیقت ملازم نہیں تھا میری وجہ سے بنا ہوا تھا کراچی میں اس کے فادر کا بہت وسیع کاروبار ہے۔ آج کل وہ وہاں ہیں ہوتا ہے ہماری کھلی کے سخت اصولوں کے بعد اس نے اس طرح گویا بابا جان کا اعتماد حاصل کیا تھا اور پھر مجھ سے شادی ہو جانے کے بعد اپنے اصل گھر واپس لوٹ گیا۔“ گے گا تو ملاؤں گی آپ سے کبھی۔“ لاریب نے منہ توڑ جواب پر زمہی کا منہ حیرت کی بناؤں کے ساتھ کھلا رہ گیا تھا۔ مہر واپا جواب تک زمہی کو گھورنے پر آمادہ کر رہی تھیں گویا منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔ امامہ اور بابا سائیں الٹے ضرور لاریب کے جھوٹوں کے پادے پر جبر بڑھتے۔ انہیں لاریب کی یہ غلط بیانی جبر بڑ پسند نہیں آتی تھی۔ وہ جانتے تھے خاندان میں اس قسم کی باتیں بچھی نہیں رہتی ہیں کیا فائدہ اس طرح جھوٹ کھڑنے کے بعد میں شرمسار ہونے میں کیا رکھا تھا۔

”اوہ۔۔۔ آئی سی۔۔۔۔۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا تمہاری اسٹوری تو خاصی فلمی قسم کی نکلی ہے۔ آئی تھنک سکندر صاحب پرانی فلموں کے دسیا تھے۔ جیسی ایسی صورت حال بنائی۔ ویسے یہ سب تو فلموں میں بھی منضم نہیں ہوتا۔“ زمہی نے بھی طنز کے انداز میں شروع کر دیا۔

”محترمہ! اظہار عرض ہے کہ فلموں کی کہانی بھی زندگی سے مشروط واقعات سے بنائی جاتی ہے اور میری تو صرف کہانی فلموں سے ملتی ہے تمہارے بھائی صاحب نے تو فلموں میں بھی کام کر کے جھنڈے گاڑ دیے زیادہ متاثر وہی نکلتے ہیں فلموں سے۔“ لاریب نے اس

بیوی، میں نے تو ایسا حسن کبھی دیکھا ہی نہیں، بس سمجھاؤ بری لگتی ہے۔“ لاریب امامہ کے پاس ہی بستر پر بیٹھی تھی۔ گھر میں بچی تھی جسے وہ پیار کر رہی تھی۔ بابا سائیں کے علاوہ کمرے میں مہر واپا بھی تھیں جب زمہی نے آتے ہی ہولنا شروع کیا تھا۔ لاریب جو پہلے ہی خائف اور مضطرب نظر آتی تھی جلد نے والے اس انداز پر چہرہ کچھ ایسے پھیکا پڑا کہ چاہنے کے باوجود خود کو فوری طور پر نہیں سنبھال سکی۔ عباس حیدر کی یہاں آمد اس کے لیے اتنی غیر متوقع تھی کہ جیسے سوچنے بجھنے کی صلاحیتیں ہی کھو گئی تھیں۔

”بابا جان خود مٹا کر لائے ہیں انہیں، تمہاری بھی تو شادی ہو گئی ہے نا، خوش ہو تم اپنے شوہر کے ساتھ؟“ وہ آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ امامہ اور بابا سائیں خاموش تھے مگر ان کے چہروں پر تکلیف دکھائی دیتی تھی۔

”اللہ کا شکر ہے بچو بہت خوش ہیں سکندر بھائی کے ساتھ ویسے زمہی آپنی بچو کے لیے یہ اطوار ہرگز اہم نہیں ہے، کیوں بچو؟“ امامہ نے خود کو سنبھالا تھا اور کسی قدر تسکین انداز میں زمہی کو جتلاتے ہوئے لاریب کی تائید چاہی۔ لاریب کی بے بسی اشتعال میں ڈھلنے لگی۔ وہ بے اختیار زمہی شروع سے اسے ناپسند کرتی ہے سرف یہی نہیں وہ عباس سے اس کی پسندیدگی اور دہائی سے بھی زیادہ تھی جب عباس سب کچھ چھوڑ چھوڑ کر گیا تھا اس کے لیے اس کے غم و غصے کے برعکس زمہی ہی تھی جسے یہ سوچ کر خوش ہو رہی تھی کہ یہ رشتہ اب برقرار نہیں رہے گا۔

”امامہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں مجھے عباس سے اب کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ یہ نسبت ہمارے بڑوں کی طے کر رہی تھی جسے انہوں نے خود توڑ دیا۔ میرے لیے فکر کی کوئی بات نہیں تھی کہ میری شادی عباس سے نہ ہو سکی بلکہ میں تو پسند سکندر کو کرتی تھی بابا جان نے میری اسی پسندیدگی کو مد نظر رکھتے ہوئے سکندر سے میری شادی کی۔“ زمہی کے تمسخر اڑاتے لب و لہجے نے اس کے اعصاب کو ہلکا کر دیا۔ امامہ کے ساتھ وحشت کا بھی شکار کر ڈالا تھا۔ یہ ذلت کا احساس تھا جس سے مشتعل ہوئی وہ بنا سوچے کچھ جوم



مادر وطن

سنو

اے مادر وطن کے جوان بیٹو  
کیوں اتنی فلیں برست رہے ہو  
یہ تمہاری ماں ہے  
تمہارا گھر تمہاری جنت  
اس کو غیروں کی ٹاپاک نظریں  
اک عرصے سے آلودہ کر رہی ہیں  
جوان بیٹوں کے ہوتے ہوئے  
ماں کی پاکیزگی کیوں دھندلا رہی ہے  
تمہاری انا اور تمہاری غیرت  
کیوں اتنی گہری سو رہی ہے  
غور کرو اوہ عظمت رفتہ کی شہری کمری  
کیوں اپنی رشتی کھو رہی ہیں  
یاد نہیں ہے  
یہ وطن تم کو کیوں ملا تھا؟  
وہ عشق تھا مصطفیٰ کا  
جواس جہاں میں ہی  
جنت تم کو دے گیا تھا  
مگر تم تو شعلہ دم!  
حسن دنیا میں ڈوب  
جنت اپنی کھو رہے ہو  
تمہاری ماں تمہاری بہنیں  
وہ تمہارے سائے  
کشمیر میں جو لڑ رہے ہیں  
اپنے پیارے وطن کی خاطر  
اک اک کر کے مر رہے ہیں

وہ بکھو وقت کے فرعون سارے  
تمہاری جنت میں دھندلا رہے ہیں  
سنو تم کو میں یاد دلا دوں  
تمہاری رنگوں میں بہتا خون  
مصطفوی ہے حیدری ہے  
اے مادر وطن!

تو دل نہ چھوڑ  
یہ تیرے بیٹے ہیں جہاں جی بھی  
حیدری لکوا رکھتے ہیں  
غزنوی لکھا رکھتے ہیں  
خانی اور غوری کی مادر کھتے ہیں  
پھر پھر یہاں سے  
خوش و آلاؤں کا ہے  
بہار و جاں نثار ہے ہیں  
یہاں پر ہر پرتوں کے محافظ  
ایمان کی آج جلا رہے ہیں  
ہے اس کی رقتوں پر یقین  
اور ساتھ ہمارے اس کی دعا  
جو ہے سید المرسلین اور رحمت الملائکین  
اے مادر وطن!  
تو دل نہ چھوڑ  
وہ وقت اب جلد ہی آئے گا  
جب شہیدوں کا لہر نکلے گا  
اور سارے ہند پر  
صرف تیرا ہی پرچم لہرائے گا  
عظمیٰ شاہین رفیق..... فیصل آباد

"تم تو لڑنے ہی لگ گئیں، اچھا میں چلتی ہوں، بھئی  
تمہیں تو میرا یہاں آنا شاید پسند نہیں آیا۔" بھئی مسکراہٹ  
کے ساتھ کہتی وہ باہر نکل گئی کمرے میں اس کے پیچھے  
ایک نکتہ سنا آتا آیا۔  
"تم نے اس کا نام کیا رکھا ہے الماما؟ ویسے شکر ہے یہ

کے ساتھ ساتھ عباس کے بھی نیچے اور بیڑا لے تھے اس کا  
انداز جتنا ہوا بے لک اور پتھر یا تھا کہ زخمی چکرا کر رہ  
گئی۔ مہرہ اٹھ کر پھلی گئی تھی۔ زخمی کو پورا یقین تھا کہ وہ  
ایاں جان کو بلاتے گئی ہے۔ جیسی اس نے ان کی آمد سے  
قبل ماحول سازگار بنانا چاہا۔



شکل میں تم پر گئی ہے۔" اس خاموشی کو بھی لاریب نے ہی توڑا تھا۔ وہ اندر سے جتنے بھی انتشار کا شکار تھی بظاہر خود کو سنبھالے رہی۔

"بہنا آپ کو کیا ضرورت تھی زریب سے اس طرح جھگڑنے کی؟" بابا سائیں کے دھیمے طولے لہجے میں بھی اضطراب تھا لاریب تڑپ اٹھی۔

"میں نہیں وہ جھگڑ رہی تھیں مجھ سے بابا جان، دیکھا نہیں کیسے ہر بات جھلا رہی تھی؟" اس کے روہانے ہو جانے پر امامہ نے بے اختیار اس کا ہاتھ سلی آمیز انداز میں تھکا۔

"لیکن بیٹے آپ نے سکندر کے متعلق جو کہا وہ غلط ہونے پر ہی زمینی گنتی باتیں۔۔۔۔۔"

"بابا جان میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا ہے سکندر کی یہی اصل حقیقت ہے میں نیٹ سے سرچ کر چکی ہوں اس کے متعلق کہیں تو آپ کو بھی دے دوں اس کے آفس کا ایڈریس۔" وہ بولی تو اس کا گلا کھڑا رہا تھا لہذا آنکھوں میں آنسو اتنی تیزی سے اترے تھے کہ جنہیں گالوں پر بہنے سے وہ کسی طور بھی نہیں بچا سکی جبکہ بابا سائیں کے ساتھ امامہ بھی ششدر و غیر یقین منشی کی بیٹھی رہ گئی۔

"کیا کہہ رہی ہیں بھو، مطلب یہ واقعی کیا ہے؟" امامہ نے شدت جذبات سے اسے پکڑ کر ہونٹوں کی زبان سے وہ کیا بتائی انہیں کہ سکندر سے کسی قسم کا رابطہ نہ ہو سکے

کی صورت میں اس نے کسی خیال کے تجسس بابا سے سکندر کے والد کا نام پوچھا تھا۔ مزید کچھ معلومات کے ملنے کے بعد نیٹ سے سرچ کر کے سکندر کا پتہ لگانا ناممکن کام کہاں تھا۔ مگر اسے ڈھونڈ لینے کی ساری خوشی کسی سر و جذبے نے دبا کر ختم کر دی تھی۔ اسے سکندر کے آخری الفاظ یاد تھے۔

"اگر میں اپنی شناخت اور پہچان نہ پاسا تو پلٹ کر نہیں آؤں گا اور آپ کو آزاد کر دوں گا۔" یہی وہ بات تھی جس نے اسے اتنا ہرٹ کیا تھا لیکن سکندر نے اگر اپنی پہچان پانے کے بعد بھی اس کی طرف رجوع نہیں کیا تھا تو اس کا مطلب واضح تھا کہ اسے اس کی

ضرورت نہیں رہی تھی۔

"بھو اگر آپ کو پتا چل چکا تھا تو آپ نے سکندر بھائی سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟" لاریب نے دل گیر سی کیفیت میں اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

"مجھ سے بات ہی تو نہیں کرنا چاہتا وہ امامہ جیسی تو اپنا پرانا نمبر بند کر دیا میری وجہ سے ہی وہ اپنے والدین کو بھی اگنود کر رہا ہے پھر بھلا مجھے کیا ضرورت ہے اس سے بات کرنے کی۔" وہ اتنی مضطرب اور بے گل تھی کہ رو پڑی بابا سائیں سے مزید برداشت نہیں ہو سکا جیسی اٹھ کر اس کے سر پر اپنا ہاتھ نرمی سے رکھ دیا۔

"سکندر کے متعلق آپ نے بہت غلط فہمیاں پال رکھی ہیں بہنا وہ ذات و جانیدار کو رشتوں پر ترجیح دینے والا انسان نہیں۔" اسے میں خود بخود متکروں گا اس سے۔"

"آپ بابا سائیں کو کس گے بابا جان، میرے لیے اس کی تو جیسا خیرات ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔" بابا سائیں نے اس کے ہاتھ سے ساتھ لگا کر تھکا۔

"اب اسے کبھی میری بیٹی کی خوشی آپ یہ بتاؤ۔" وہ پتہ ایمان کا کہا تھا نیٹ سے پتا کرنے کا کیا پتا؟" اس نے اس پر لاریب یکدم ہی خفت کا شکار ہوئی سکندر کا خیال آنے پر وہ ایمان کو بھول گئی تھی۔ سکندر سے ملنے والی یاسیت و اضطراب ہی ایسا شدید تھا کہ اسے بعد میں کچھ یاد ہی نہ رہ سکا تھا۔

"میں آج کروں گی پتا ڈونٹ وری بابا جان۔" وہ بے دلی سے کہتی آنسو پونچھ رہی تھی۔ بابا سائیں نے نرمی سے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

"اچھا میں ذرا بھائی جان اور بچوں سے مل لوں۔" وہ کمرے سے نکل گئی۔ امامہ نے ہنسی کو کاٹ میں لٹایا اور ایک دم لاریب کے گلے لگ گئی۔

"کتنی خوشخبریاں مل رہی ہیں ایک ساتھ، سکندر بھائی کی تو مجھے بہت خوشی ہے اللہ مبارک کرے انہیں یہ بچو والا کیا قصہ ہے آخر؟" وہ کھٹکھٹاتی ہوئی پوچھ رہی تھی۔ لاریب نے اپنی اور بابا سائیں کے درمیان ہونے والی



اسٹوڈنٹ

صاحب اب تو اسٹوڈنٹ کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے  
ہم نے ایک صاحب سے پوچھا "کیا آپ اسٹوڈنٹ  
ہیں؟" تو انہوں نے جواب دیا "نہیں جناب یہ تو ہمدی  
میں مجھے اوپر والا نہیں بند کرتا یا نہیں رہا۔"

البتہ اب کوئی اسٹوڈنٹ یہ کہے کہ اس پر کوئی کیس  
درج نہیں تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ پابندی سے کالج نہیں  
جاتا ہوگا آج کل دنیا میں دو طرح کے طالب علم مشہور  
ہیں ایک وہ جو قابلیت کی وجہ سے جانے جاتے ہیں اور  
دوسرے وہ جو اپنی قابلیت کی وجہ سے ہیں، جب ہمیں  
پتا چلا کہ طالب علم نے طالبان کے نام سے کابل پر قبضہ کر لیا  
تو ہم یہ سمجھ کر امتحان ملوثی کروانا چاہتے ہیں لیکن  
انہوں نے صاحب کو دلا ایک ہی کام کیا وہ یہ کہ  
انہوں نے کالج بند کر دیا۔

(نوٹ: جمہوریت، انٹرویو، ریسٹ)

مرسلہ نورین القدر اودھال

فاطمہ نے اس کی عجیب و غریب کیفیات کو محسوس کیا وہ  
اس بات پر بھی چل ہو چکی تھی کہ لاریب نے اس کا بڑھا ہوا  
ہاتھ پکڑنا گوارا نہیں کیا تھا۔ اسے لاریب کی نظریں بھی  
عجیب لگیں وہ کنفیوژڈ ہونے لگی۔ لاریب اسے دھیان سے  
دیکھتی رہی جس عورت کو اس نے عباس کے صبر و استقامت  
میں دیکھا تھا وہ عام سے خدوخال کی عام سی عورت تھی  
عباس سے عمر میں برابر یا ایک دو سال چھوٹی جبکہ یہ لڑکی  
نہ صرف عمر میں عباس سے بہت چھوٹی تھی بلکہ حسن و  
نزاکت اور حقیقت کا ایسا شاہکار تھی کہ سچ معنوں میں نگاہ  
چند صیائی جانی تھی۔

"وعلیکم السلام، معذرت خواہ ہوں پہچان نہیں سکی آپ  
کو؟" لاریب کو ایک ہل کو لگا تھا وہ غلطی پر ہے ضروری نہیں  
تھا یہی عباس کی بیوی ہو جیسی اس نے کسی قدر مروت کا  
اظہار کیا تھا۔ جواب میں فاطمہ کے جذبہ نظر چہرے پر  
خفیف سی خجاست لہرائی۔

مٹکٹو مختصر تھا وہی۔ الماس کی آنکھیں مارے خوشی کے تھلکتے  
کے قریب ہو گئی۔

"ہم بچو سے مل سکیں گے نا وہ مجھے کبھی نہیں بھولیں  
جب وہ ملیں گی میں ان سے بہت سارا جھگڑا کروں گی ان  
سے کبھی بات نہیں کروں گی انہیں پتا بھی تھا میں انہیں کتنا  
پیار کرتی ہوں پھر بھی چھوڑ گئیں مجھے۔" وہ رو پڑی لاریب  
نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"یہی تمہاری غلطی تھی امامہ اتنی محبت نہ کر تیں ان سے  
کہ ان کے حصے کی سزا تک نہ گنتے کو تیار ہو جاتیں، وقاص  
جیسا درندہ صفت انسان جسے۔۔۔!"

"بچو پلیز، مجھے وقاص کے متعلق آپ سے کچھ کہنا  
ہے۔" اس کی بات کاٹ کر وہ لاجت سے بولی۔

"مجھے اس کے متعلق کچھ نہیں سنا امامہ۔" لاریب کا  
سرد انداز قطعی طور پر دو ٹوک تھا۔

"کیوں؟" امامہ کے لہجے میں غضب کا احتجاج  
اتر نے لگا۔

"وہ بالکل بدل گئے ہیں بچو، ہر لحاظ سے۔" وہ۔۔۔!"

"اجازت دو امامہ چلتی ہوں ابھی تالی بجانا ہے  
ملنا ہے مجھے، اللہ حافظ۔" امامہ کے بے بسی چہرے نے  
چہرے پر نگاہ ڈالے بنا وہ نگوشت سے کتنی کمر بستہ تھی  
نئی۔ میٹر حیاں اتر کر ہال کے میز آئی جو پہلا نمراؤ ہی  
فاطمہ سے ہوا۔ نیوی بلیو کلمے کے عام سے لباس میں بھی  
اس کی چاندنی جیسی نقرئی رنگت کا اجالا جیسے ہر سو  
جگہ گاہٹ بکھیر رہا تھا۔

"السلام علیکم! آپ لاریب ہیں نا، مجھے زسما آ پانے  
بتایا تھا کہ آپ آئی ہیں میں آپ سے ہی ملنا رہی تھی۔"  
وہ اسے دیکھ کر بے حد خوش دلی سے مسکرائی۔

لاریب تو اسے دیکھتی رہ گئی۔ احساسات پر جیسے کسی  
نے بے پردی سے گولہ باری کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں  
جلن تھی اور وہ دوسری بار پھر ہار گئی تھی اس کی سینڈ چوائس  
بھی وہ قرقر نہیں پاتی تھی اس کے اندر عجیب سا ہنگام برپا  
ہونے لگا کیا وہ اتنی بے ملیا تھی اس کا دل تڑپ رہا تھا۔



کچھ کہے بغیر تقریباً بھاگتے قدموں سے درباری کا موزمڑ  
گئی۔ عباس گہرا سانس بھر کر آگے بڑھا یا۔

ہل کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کا پہلا سامنا  
لاریب سے ہوا تو چکر لایا ہوا مضطرب ذہن یکدم غوطہ سا لگا  
کر جیسے شرمندگی کی اتھاہ گہرائی میں گرنا چلا گیا۔  
یہاں آنے کے بعد وہ سب سے زیادہ لاریب اور پابا  
سامنے کے سامنے ہی تو خائف تھا۔ اس کے خیال میں وہ  
انہی کا سب سے بڑا بھرم تھا۔

”لاریب.....؟“

اسے دھواں ہوتے چہرے اور چھلکتی آنکھوں کے  
ساتھ تیزی سے رخ پھیر کر جاتے پا کر وہ بے اختیار پکارا  
لاریب کے نام جسے زمین نے جکڑ لیے۔ یہ خیال یہ سوچ  
وحشت میں جٹا کر دے والی برادر تک خالی کر کے رکھ گئی  
تھی کہ اس کا دل آج بھی اس فضا کا اس حد تک غلام تھا۔  
اب تو اس کا دل بولا جا رہا تھا اس نے چاہا وہ اس کی  
پھر کوئی اور چیز لے کر آئے گا۔ بڑھ جائے۔ مگر یاس کے بس کی  
چیز نہیں تھی۔

”آئی ایم ساری لاریب۔“ عباس نے ایک قدم بھی  
مڑید آگے نہیں بڑھایا وہ جھکے سر بو جھل دل اور بو جھل آواز  
میں کہہ رہا تھا لاریب ایسے لمبا لائی جیسے بے خبری میں اسے  
چابک چٹا مارا ہو۔

”سوری، فارواث عباس صاحب۔“ اس نے چپتے  
ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کا دل چاہا تھا عباس حیدر کا  
مگر بیان پکڑ کر ہنسنے لپٹا ایک ایک نقصان گنوائے اور  
پوچھنے تم کر سکتے ہو ذرا؟

کون جانتا تھا اس نے کیسی اذیت سے لبریز زندگی  
گزری تھی۔

(نن شام اللہ باقی آئندہ حصہ)



”اور سوری مجھے خیال نہیں رہا بتانے کا میں فاطمہ  
ہوں، فاطمہ عباس حیدر۔“ اور لاریب کا دل یکفخت جھاز  
میں الجھ گیا۔

”تو ثابت ہو گیا عباس تمہاری زندگی میں، میں کہیں  
نہیں تھی۔ میری منجائش کبھی بھی نہیں تھی۔ مجھے اپنا تے نہ  
سکی مجھ سے اپنی زیادتی کی معافی مانگنے نہ سکتے تھے نہ۔  
شاید مجھے صبر آ جاتا۔“ فاطمہ کو اس کے چہرے کے اتار  
چڑھاؤ لہو آنکھوں کی وحشتوں نے ہی پریشان کیا تھا جیسی  
اس کا ہاتھ ہمدردانہ انداز میں تھپک کر نرمی سے پولی تھی۔

”خیریت، مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔“ وہ سستی  
منتظر ہو کر کہہ رہی تھی۔ لاریب نے وحشت چھلکا لائی  
ظہروں سے اسے کچھ دیر دیکھا تھا پھر بولی۔

”تو تم بیوی ہو عباس کی، گند، مگر کون سی دوسری کہ  
تیسری؟ پہلی بیوی تو مر چکی نا اس کی کیا بھنتی ہو تم کہ  
یہاں سب لاعلم بیٹھے ہیں۔“ اس نے بھلکتی نظروں سے  
اسے گھورا۔ فاطمہ نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

”بات سنو محترمہ، کم از کم میں بے وقوف نہیں ہوں  
سمجھیں۔“ لاریب کی غراہٹ میں جھپی دمکلی آواز تھی۔  
فاطمہ کے ہوش اڑا گئی۔ وہ لاریب کے سامنے حریف بن گئی۔  
نصیر کی اور بھاگتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی۔ عباس  
اسے دھیان میں رہا تھا جیسی دونوں کا فخر ہو رہا تھا۔  
جتنا بھی بھنایا مگر اسے گرنے سے چاہیے کہ اس کا دل پڑا۔

”دھیان سے، خیریت ہے سب، خوفزدہ کیوں ہو؟“  
اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہی عباس چونک اٹھا تھا۔  
فاطمہ نے خوفزدہ آنکھوں سے اسے دیکھا اور سسک کر  
بے اختیار اس کے سینے میں منہ چھپا لیا نا اذبا اکل کسی  
معصوم بچی جیسا تھا۔ اس بل وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی  
ورنہ ایسی جرأت کا مظاہرہ بھی نہ کر لی۔ عباس خود اتنی دقیقہ  
گیا تھا۔

”دماغ ٹھیک ہے فاطمہ آپ کا، کوئی آگیا لو مگر تو کتنا  
آکھڑ گئے گا۔“ فاطمہ بھی جیسے اس ٹرائس سے نکل کر  
بڑ بڑائی اور غفلت سے سرخ پڑتی تیزی سے پیچھے ہٹتی اور







یونہی امید دلاتے ہیں زمانے والے  
کب بنتے ہیں بھلا چھوڑ کر جانے والے  
تو کبھی دیکھ جھلتے ہوئے صحرا میں درخت  
کیسے جلتے ہیں وفاؤں کو نبھانے والے

ایمان اور اس کا عمل قدرے مشترک تھا لہذا بابا جان کو اسے بھی معاف کر کے حویلی میں آنے کی اجازت دے دینی چاہیے ایسے میں بابا جان اس کی بات سے اتفاق کرتے ایمان سے رابطہ کرنے کو کہتے ہیں لاریب انٹرنیٹ کے ذریعے ایمان تک رسائی حاصل کرنا حاجتی ہے ایسے ہی وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سکندر کے متعلق بھی معلومات حاصل کرتی ہے۔ حویلی میں فاطمہ کو نوڈیوا وزن ہو جاتا ہے لیکن اماں جان اور دیگر افراد اسے کسی خوشخبری سے منسوب کرتے ہیں عباس فاطمہ کے اس عمل پر اسے انتہائی سخت سنا تا ہے اور اس کی کردار کشی سے بھی باز نہیں آتا کچھ بریں میں جب اسے اپنے الفاظ کی سنگینی کا احساس ہوتا ہے تو وہ نرمی سے فاطمہ کو سنبھالتے اس سے معافی کا طلب گار ہوتا ہے۔ لاریب امامہ کی خوشی کی خاطر حویلی آتی ہے تو وہاں عباس کی بہن کے ذریعے اسے عباس اور فاطمہ کے بھیجے آنے کی اطلاع ملتی ہے۔ وہ لاریب کو سکندر کے حوالے سے طنزیہ باتیں سناتی ہے جس پر لاریب بھی سکندر کو لے کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کر کے اسے حیرت میں ڈال دیتی ہے اور مزید یہ کہ وہ بہت اچھے اور کھاتے پیتے گھر آنے کا چشم و چراغ ہے کہہ کر اسے بالکل خاموش کر دیتی ہے۔ لاریب کی اس غلط بیانی پر امامہ اور بابا جان خاصے حیران رہ جاتے ہیں جب ہی اس کی ملاقات فاطمہ سے ہوتی ہے لیکن وہ اسے پہچان نہیں پاتی کیونکہ وہ عباس کے ہمراہ عریضہ کو دیکھ چکی تھی جب ہی وہ فاطمہ کے سامنے اس بات کا اظہار کرتی ہے جواب میں فاطمہ کا چہرہ زرد ہو جاتا ہے اور وہ کوئی جواب دینے بنا وہاں سے ہٹ جاتی ہے۔ جب ہی عباس کی نظر

گزشتہ قسط کا خلاصہ  
وقاص کا سیکر بدلا ہوا انداز امامہ کو ورطہ حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے اپنی بیٹی اور وقاص کے بدلاؤ کو لے کر وہ نہ صرف اسے معاف کر دیتی ہے بلکہ ان مشکل حالات میں وقاص کا بھی حوصلہ بڑھاتی ہے۔ بابا جان کے کہنے پر عباس فاطمہ اور بچوں کے ہمراہ حویلی آ جاتا ہے جہاں وہ اپنے گھر والوں کی فاطمہ سے محبت دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتا رہتا ہے ایسے میں اسے عریضہ کی یاد اور بھی زیادہ متاتی ہے۔ دوسری طرف وقاص کے ہمراہ ایمان کی بجائے امامہ کو دیکھ کر وہ گنگ رہ جاتا ہے اماں جان مختلف رسول کی ادائیگی کے بعد فاطمہ کو باقاعدہ اپنی بہو تسلیم کر لیتی ہیں خاندانی زیور سے سونپ کر وہ اپنی خوشی کا اظہار کرتی ہیں ایسے میں عباس انتہائی مضطرب رہتا ہے۔ فاطمہ کے یزوریات ایک طرف رکھتے پر وہ اسے ڈپٹتا ہے کہ یہ تمام زیورات پہن کر رکھے اور اماں جان کو کسی بات کی جھنگ نہ پڑنے دے وہ خود نگن فاطمہ کی کلائی میں پہناتا ہے جبکہ فاطمہ اس عنایت پر حیران رہ جاتی ہے۔ امامہ کی بیٹی سے ملنے کی خاطر بابا جان لاریب کو بھی چلنے کا کہتے ہیں وہ وقاص کا سامنا نہیں کرنا چاہتی لیکن امامہ کی خوشی کے لیے بابا جان کی بات مان لیتی ہے۔ دوسری طرف سکندر کی لا تعلقی اور رابطہ نہ کرنے پر وہ انتہائی بے چین رہتی ہے سکندر کے والدین سے بھی رجوع کرتی ہے لیکن وہاں سے بھی سکندر کی خبر نہیں مل پاتی فرار ازیرہ کی کوئی بات سننے پر آمادہ نہیں ہوتا ایسے میں سکندر اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ اس کی بات بھی رد کر دیتا ہے۔ لاریب بابا جان سے ایمان کو معاف کر دینے کی بات کرتی ہے اسے لگتا ہے کہ



”شرجیل احمد میں چاہتا ہوں اس بار تبلیغی جماعت کے دورے میں تمہارا نام بھی شامل کرا دوں۔“ وہ لوگ کھانے میں مصروف تھے جب ابراہیم احمد نے اچانک اسے مخاطب کیا۔ شرجیل بری طرح چونکا۔

”میں.....؟“ اس نے انگشت شہادت سے اپنے سینے کی جانب اشارہ کیا تو آنکھوں سے واضح حیرانی مترشح تھی۔

”ہاں بالکل، کیا اس میں کوئی مضائقہ ہے؟“ ابراہیم مسکراتا تھا مگر شرجیل کی حیرت تمام نہ ہوئی۔

”لیکن میں تو ابھی کھینے کے مرحلے میں ہوں ابراہیم احمد۔“

”تم مطالعہ سے بھی اتنا نہیں جان پاؤ گے شرجیل احمد جتنی تیزی سے تم اس دورے کے دوران دین کو جان پاؤ گے وہاں اجتماعات میں پوری دنیا سے اسکالر جمع ہوتے ہیں میں سمجھتا ہوں تمہیں وہاں کھینے اور عمل کے مواقع زیادہ میسر آ سکتے ہیں۔“

”تم بہت خوب صورت باتیں کرتے ہو، ابراہیم احمد۔“

”یہ اللہ کی عطا ہے۔ درحقیقت یہ ہمارے مذہب کی خوبصورتی ہے جسے اللہ نے اتنا خوب صورت مرتب کیا ہے کہ جو اسے جان لے مان لے وہ محو ہوئے بغیر نہ سکے شرجیل احمد ہمیں اسی خوب صورتی کو انہی دُکھ تو انین کو دنیا میں پھیلانا ہے یونہی خوب صورتی یہ لکھی ہمارے پاس اللہ کی امانت ہے۔“

”میں ضرور چلوں گا تمہارے ساتھ ابراہیم احمد۔“ اس کے لہجے میں استحکام تھا۔



فراز نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد لائٹس آن کیں۔ وہ بستر پر دراز ہوا تو بہت دنوں کے بعد دل کا درد تمام تر تنہائی کے احساس سمیت بڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ جچ تھا کہ وہ خود پر خول چڑھائے تھک گیا تھا۔ یہ غیر فطری زندگی جیسے ایک دھوکہ ہی تو تھا۔ ایسا دھوکہ جو وہ مسلسل خود کو دیے جا رہا تھا اس نے ہونٹ بھینچے اور

لاریب پر پڑتی ہوا سے دیکھ کر وہ اپنے تمام گزشتہ رویوں کی اس سے معافی طلب کرتا ہے جبکہ لاریب کا دل چاہتا ہے کہ وہ سامنے کھڑے اس شخص سے اپنے ایک ایک پل کا حساب لے۔

(اب آگے پڑھیے)



”مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے لاریب، مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا، پلیز معاف کر دیں مجھے۔“ عباس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

”آپ یہ سوچ کر دل پر بوجھ نہ لیں عباس، لاریب نام کی جس لڑکی کو آپ ٹھکرا گئے تھے اس کی شادی ہو چکی ہے۔“ انداز سرد تھا۔

”یہ تو بہت اچھی خبر ہے میرے لیے، اللہ آپ کو ہمیشہ آباد رکھے۔“ عباس واقعی ریلیکس ہوا تھا جیسے ذہن پر موجو کوئی بھاری بوجھ سرک گیا ہو۔

”آپ کو بھی مبارک ہو آپ کی دوسری شادی، میں آپ کی وائف سے یہی کہہ رہی تھی مگر وہ تو خوفزدہ ہو گئیں، شاید آپ دونوں کا یہ خیال ہے کہ یہاں اس راز سے کوئی واقف نہیں۔“ عباس نے چونک کر اسے دیکھا۔ لاریب کے چہرے پر آگ سلگ رہی تھی عباس کے حواس سلب ہوئے اور ہونٹ سل کر رہ گئے۔ لاریب نے اس کی کیفیت کو پوری جزئیات سے محسوس کیا اور پھر بے ساختہ ہنس دی۔

”ارے آپ تو پریشان ہو گئے، میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا نہیں تھا، میں آپ کی پوزیشن اور بھرم کو ہرگز خراب نہیں کروں گی۔“ عباس کی خاموش نظروں میں اپنی جنونی آنکھیں گاڑ دھوے ہنسنے لگی۔

”میں پریشان نہیں ہوں لاریب یہاں واقعی سب لا علم ہیں، میں نے بتانا مناسب نہیں سمجھا۔“ وہ اپنے ازل پر اعتماد اور واشگاف انداز میں بات کر رہا تھا جبکہ لاریب منجمد ہوئی جا رہی تھی۔ اک لفظ مزید کہے بنا وہ ابھی کو مڑ گئی۔





آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔  
”مسلکی بی بی چائے بنا کر لاؤ اور مہاسے کہنا میرا سردبا دس بہت درد ہے۔“ دردازہ کھلنے کی آواز پر وہ یونہی بند آنکھوں کے ساتھ بولا۔

جواب میں خاموشی طاری رہی، پھر کوئی اس کے سر ہانے پاوے کے جھونکے کی مانند آکر بیٹھ گیا۔ اعصاب پر سحر طاری کرتی ہوئی مسور کن خوشبو اور نرم مسکائی کا ماتھے پر اترتا ہوا ٹھنڈک بھر دل فریب لمس فراز کو آنکھیں کھولنے پر مجبور کر گیا۔ اس نے ٹھنک کے نظر گھمائی اور اریبہ کو رو برو پا کر اس کے اعصاب پر بجلیاں کوند نہ لگیں۔

”تم.....؟“ وہ حلق کے بل چیتا ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
”نکل جاؤ یہاں سے۔“ اس کے صھاڑنے سے اریبہ وحشت زدہ ہوئی۔

”فراز..... میری..... بات.....!“ فراز کی نظروں کا دکھتا آتش فشاں اس کی زبان لڑکھڑا کر رکھ گیا۔  
”اٹھو یہاں سے، دفع ہو جاؤ۔“ فراز کے ہتک آمیز انداز میں بالکل کوئی گنجائش نہیں تھی مگر اریبہ آج بد دل ہونے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

”آپ مجھے جو بھی سزا دینا چاہتے ہیں دے لیں مگر فراز مجھے معاف کر دیں م..... میں.....!“ وہ مضطرب کھوکھو کر رو پڑی تو فراز کے تن بدن میں آگ دھک اٹھی۔ اس نے مختصر مدد سے اس کے گال پر پھنچ مار دیا۔

”تم نے سنا نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں میں شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا تمہاری۔“ اس کا انداز سخت جارحانہ تھا۔  
”بہیں سنا، جان سے مار ڈالیں میں بھی اب مرنا چاہتی ہوں یہ سزا قبول نہیں ہے مجھے جو آپ دے رہے ہیں۔“ وہ بھی جیسے حواسوں میں نہیں رہی۔ اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتی ہوئی پیمان زدہ آواز میں چیخنے لگی۔

”مجھے اس طرح اپنے قتل پر آمادہ کر کے تم چاہتی ہو میں تم سے نجات پا کر بھی نا آسودہ رہوں، اتنا شوق ہے تمہیں مرنے کا تو خود کشی کا کوئی حربہ کیوں نہیں آزمایا تم

نے؟“ اس نفرت نے اریبہ کو کھانڈ کر ڈالا۔ وہ سکتے زدہ سی کھڑی آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے اسے نکلتی رہی۔

”آپ بالکل درست کہتے ہیں مجھے آپ کو یہ تکلیف نہیں دینی چاہیے۔“ وہ بولی تو اس کی آواز ڈھنکی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ لہجے میں ایسی جتنی اور طبعی کیفیت اتر آئی تھی جو کسی منطقی فیصلے پر پہنچ کر خود بخود الفاظ دلچے میں جگہ البالیا کرتی ہے۔ فراز چونکا، اسے صاف لگا وہ کچھ ٹھان بیٹھی ہے۔ وہ کمرے سے جس تیزی سے نکلی تھی وہ انداز بے حد خطرناک تھا۔ فراز نہ چاہتے ہوئے اس کے پیچھے لپکا مگر جب تک وہ کچن میں اس کے پاس پہنچا وہ اس جنونی کیفیت کے زیر اثر تیز دھار چھری سے اپنا ہاتھ کاٹ چکی تھی۔ یہی نہیں اب وہ دوسرے ہاتھ کو بھی اسی طرح کاٹنے کی کوشش میں تھی مگر ہاتھ کا گہرا زخم چھری پر اس کی گرفت مضبوط ہونے نہیں دے رہا تھا۔ فراز تو جیسے دھک رہ گیا۔

”اریبہ.....!“ وہ زور سے چیخا اور تیزی سے لپک کر اس سے چھری چھیننی چاہی۔  
”چھوڑو اسے، پاگل ہو گئی ہو تم؟“  
فراز کے حواس بری طرح سے مختل ہو چکے تھے اریبہ بلک رہی تھی۔

”چھوڑو دیں مجھے..... مگر جانے دیں۔“  
فراز نے جیسے تیسے اس سے چھری چھین کر دور پھینک دی۔ اس کوشش میں وہ خود پسینوں پسینے ہو رہا تھا۔ اس کی نظر اریبہ کے زخم پر جمی جس سے پھوٹتا ہوا خون لمحوں میں اس کے گلابی لباس کو رنگین کرتا فرش پر بھی نقش و نگار بنا رہا تھا۔ فراز اس کی ذہنی حالت پر بری طرح بوکھلا ہوا تھا اس پرستم اس شور شرابے اور دھکم پیل سے صالہ اور تائی ماں کی وہاں آمد ہو چکی تھی گویا مفت کا تماشا لگ گیا۔ فراز کا بس نہیں چل رہا تھا کد زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

”ادہ..... ہو..... تو بے چاری شوہر کی محبت کو ترستی مظلوم لڑکی اب خود کشی کرے گی۔“ صالہ نے صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد ٹھٹھا لگایا۔ فراز محض خون کے کھونٹ کی کر رہ گیا اور اریبہ کی کلانی جکڑ کر اپنے ساتھ گھسٹا جوشاید





”میں بہت خوش ہوں زینب، میرا سفر رازیاں نہیں گیا، مجھے وہ سب ملا جس کی چاہ اور خواہش کی تھی میں نے۔ مگر اس خواہش میں پنہاں خوف کبھی کھل کر اس کا اظہار نہیں کرنے دیتا، میں امید رکھ رہی ہوں کہ میرا شاید مجھے اللہ کی ذات پر مکمل یقین نہیں تھا۔ اس نے میرا یقین کامل کرنے کو ہی یہ معجزہ دکھایا ورنہ میں کہاں تھی اس قابل کہ مجھے اتنے بڑے اعزاز سے نوازا جاتا۔ اس نے مجھے میرا مطلوب عطا فرما کر مجھ سے اپنا آپ تسلیم کرا لیا ہے زینب۔“ عباس حیدر اپنے دھیان میں اندر آنا چاہتا تھا مگر اسے فون پر نچوٹنگو پا کر جانے کس احساس کے تحت وہیں باہر ہی ٹھہم گیا اسے لگا ان پر دوس کی گرہ لگنے کو ہے جو اس پر اسرار لڑکی کے سبھی اسراروں کو ڈھانپنے اور چھپائے ہوئے تھی، تھا تو یہ غیر اخلاقی مگر وہ خود کو اس کا شوہر ہونے کے ناطے شاید اس میں حق بجانب پارہا تھا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے زینب کہ عباس مجھے کیا حیثیت کیا درجہ دیتے ہیں میرے لیے یہی کافی ہے کہ مجھے ان کا ہر لمحہ ساتھ اور ان کے نام کا معتبر حوالہ مل گیا ہے خود سوچو اگر میں ان کی قربت میں رہنے کی خاطر گورنر کی معمولی ملازمت قبول کر سکتی ہوں تو پھر اس کے سامنے تو یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔“ وہ کتنے مطمئن اور سرشار انداز میں کہہ رہی تھی۔ عباس کے چہرے پر پھیلی گیمہیں تاں کچھ اور اضافہ ہوا اور چہرے پر ایک تاریک سایہ را گیا۔ جبکہ فاطمہ اس کی موجودگی کے احساس سے بے خبر مگر ان انداز میں کہہ رہی تھی۔

تو نے انداز محبت دیکھا ہے انداز وفا نہیں دیتی پنجرہ کھول بھی دو تو کچھ پرندے اڑا نہیں کرتے عباس کے ضبط کی انتہا یہیں تک تھی، وہ ایک جھٹکے سے پلٹ کر وہاں سے چلا گیا۔

”کون ہے یہ؟ اس کا مقصد کیا ہے؟“ سگریٹ سلگا کر گہرے کش لیتا وہ مضطرب سا ٹھہل رہا تھا۔ تب ہی اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اسکرین پر بلال صاحب کا نمبر تھا۔

درد و تکلیف کے ساتھ مزاحمت کے دوران بھی ساری ہمتیں گنوا کر اب بڑا نظارہ آ رہی ہوں جیسے کسی بھی پل بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔

”اُونہ، ڈرامہ ہے سارا۔“ ثانی ماں نے ناک بھونچا کر حقارت کا اظہار ضرور سمجھا فرماز نے دروازے سے نکلنے جلتی ہوئی آنکھوں سے ان کو دیکھا۔

”کوئی اور کام بھی سہا پ لوگوں کو، ہر وقت کان آہٹوں پر لگائے بیٹھی رہتی ہیں کہ کون کیا کر رہا ہے۔“ وہ اتنا پ سیٹ اور غصیلانور ہا تھا کہ ان سے بچنے کھڑا ہو گیا۔

”ارے جاؤ جاؤ، ہمیں آنکھیں دکھانے کے بجائے اپنے اور اپنی بیوی کے کروتوت ملاحظہ کرو جب تم تماشہ لگاؤ گے تو کسی کے دیکھنے پر پابندی بھی نہیں لگا سکتے۔“ بے کہہ کیا دیا تم نے اپنی بیوی کو کہ یہ خوشی برہی آمادہ ہوئی۔“ صالحہ کے جملاتے ہوئے لہجے میں واضح مسخر تھا فرماز کا چہرہ تذلیل کے احساس سے بالکل سیاہ ہو گیا۔

اپنے دھیان میں اس جانب تیس مماس کی یہ حالت دیکھ کر دھک سے رہ گئیں۔

”کیا ہوا بیٹا؟ یہ..... اس پر یہ؟“ ان کے چہرے پر خوف تھا۔

”ارے ہوتا کیا ہے، جوانیاں نہیں سنبھالی جا رہی ہیں ان سے ذرا کسی کی بات بری لگی نہیں اور ہونے نہیں اپنی جان کے دشمن۔“ ثانی ماں نے ہاتھ بچا کر بلند آواز سے طعنہ بازی کی۔ فرماز ہونٹ سمیٹنے آگے بڑھ گیا۔ راہداری کے موڑ پر اپنے کمرے سے نکلنے سکندر کی نظر دونوں پر پڑی تو اسے جھکا لگا۔

”سکندر نیل ہوگا اپنے کمرے میں اسے بلانا پلیز۔“ فرماز اس سے نظریں جدا کر اور راہ پر گھٹائی اپنے کمرے میں جا گھسا سکندر کا کمرہ بھی ٹوٹا تھا۔ تیز قدموں سے وہ نیل کے کمرے کی جانب بھاگا تھا نیل نے صورتحال کو سنا اور سرد آہ بھرتے ہوئے میڈیکل باکس کے ہمراہ فرماز کے کمرے میں داخل ہو گیا جہاں ایک اعصاب شکن مرحلہ اس کا منتظر تھا۔



”کیا تم ایسا نہیں چاہتے؟“ سکندر جو اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا جیسے کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کو سوال کر گیا۔ فراز کے چہرے پر تذبذب چھانے لگا۔

”مجھے خود بھی نہیں پتا ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں، لیکن آج جب اس نے خود کو اس طرح سے زخمی کیا اور اپنی جان کے درپے ہو گئی تو مجھ سے اس کی تکلیف برداشت نہیں ہو سکتی۔“ بہت ایمانداری سے اس نے اپنا تجزیہ پیش کیا سکندر کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔

”تمہاری محبت پر خود ساختہ انا کا سیرا ہے فراز، بہتر ہو گا کہ تم اس انا سے دامن چھڑا دو ورنہ یہ کوئی بڑا پچھتاوا تمہارے دامن میں ڈال دے گی۔“ سکندر نے نرمی سے کہتے ہوئے سگریٹ سلگا لیا۔ فراز اسے پرسوں نظر دے دے دیکھتا رہا تھا پھر جب وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں آیا تو اریبہ کو سینے تک چادر پھیلائے آنکھیں موندے بستر پر دراز دیکھتا رہا رنگت ایسے سفید بڑھ گئی تھی جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ لانی پلکوں کی جھلریاں عارضوں پر ساکن تھیں۔ فراز کا دل کسی یاسیت کے حصار میں گھرنے لگا۔ اس کے چہرے پر نگاہ جمائے وہ اندر ہوتی اکھاڑ بچھاڑ سے نبرد آزما تھا جب اریبہ نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔

”پپ..... پانی.....!“ اس کے خشک ہونٹوں سے نقاہت زدہ آواز نکلی جسے فراز یا مشکل سن پایا تھا۔ اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر اس کے قریب آ کر اسے سہارا دے کر گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اریبہ کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو گویا پانی پینا بھول گئی۔

”پانی پیو اریبہ۔“ اس کے لہجے میں ملائمت تھی۔ اس کے باوجود اس نے ہاتھ سے گلاس ہٹا دیا اور چہرے کا رخ پھیر لیا۔ اس طرح وہ شاید ان آنسوؤں کو اس کی نظر سے چھپانا چاہتی تھی جو اس توجہ زنی کے باعث آنکھوں میں اٹھائے تھے۔

”کیوں ہیں آپ اتنے ظالم فراز، کم از کم مرنے تو دے سکتے تھے مجھے۔“ وہ جس طرح ٹوٹ کر بکھری اور روئی تھی وہ کیفیت اس کے ذہنی انتشار کو واضح کرتی تھی فراز

”السلام علیکم یک مین کیسے ہو؟“ ان کا لہجہ ہمیشہ کی طرح پرسکون تھا۔

”وہلکم السلام، الحمد للہ آپ ٹھیک ہیں بلال بھائی؟“

”اللہ کا احسان اور کرم ہر پل محسوس کرتا ہوں تمام تر گناہوں کے باوجود، یہ رحمت ہے اس کی اور خاص عنایت۔ میں گیا تھا تمہاری طرف تو پتا چلا کہ تم اپنے گاؤں گئے ہوئے ہو۔ ایک اور بہت پیاری سی خبر بھی تمہارے حوالے سے سننے کو ملی دل خوش ہو گیا بہت اچھا فیصلہ ہے اللہ مبارک کرے۔“ بلال صاحب کہہ رہے تھے اور وہ جیسے پاتال میں گرنا جا رہا تھا۔

”واپس آؤ تو مجھے ضرور بتانا۔ اس خوشی میں دعوت کروں گا تمہاری، فاطمہ بیٹی کو سلام کہنا خوش رہو ہمیشہ، السلام علیکم۔“ انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ عباس نے فون کان سے ہٹا کر کٹھی میں دبایا۔ اس کے وجہ بہ چہرے پر لہجہ بہ لہجہ سرفی بڑھ رہی تھی۔

(تو یہ تم تھیں جس کی خاصانہ بزدگانی نے مجھ سے میری خوشیاں چھین لیں میری عریضہ کو مجھ سے جدا کر دیا اجاڑ ڈالا میرے دل کو)

ہونٹ پیچھے وہ بھڑبھڑا رہا تھا۔ (اب میں تم سے جو بھی سلوک رکھوں اس میں حق بجانب ہوں گا)



”مجھے سمجھ نہیں آئی اب اس کی اس حرکت کا مقصد کیا ہے؟“ سکندر کے ہمراہ چلتے ہوئے فراز نے جھنجھاک کر کہا تھا اس جھنجھاکا ہٹ میں فکر بھی تھا اور اضطراب بھی سکندر آہستہ سے مسکرا دیا۔

”یہ سوال مجھ سے کرنے کے بجائے خود سے کرلو، فراز یہ جو درمیانی کیفیت ہوتی ہے نا بہت اذیت انگیز ہوتی ہے تم ایسے اس اذیت سے نکال کیوں نہیں دیتے بات معمولی تھی ختم ہو سکتی تھی۔ وہ معافی مانگ بھی چلی ہیں تم سے اگر تم خود کو اتنا اعلیٰ طرف نہیں پاتے تو پھر طلاق دے دو۔“ جتنے آرام سے سکندر نے یہ بات کہی تھی وہ اس قدر مضطرب ہوا تھا۔



رکھتا تھا مگر پھر بھی چنانچہ کیسے شاید وجہ یہ بھی ہو کہ میرا دل ایک کورا کاغذ تھا جس پر محبت کی تحریر آپ نے محبت کی۔ میں ان الفاظ کی مہک اور سحر سے خود کو بجا نہیں سکتی۔ وہ روتے ہوئے اپنی صفائی پیش کر رہی تھی یا محض اپنی راہ کے کاٹنے جن رہی تھی۔ جو بھی تھا فراز نے اس پر غور کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ بس تھوڑا سا فراخ دل ہو کر اس کے لیے گنجائش نکالنا چاہتا تھا۔

”ہمیں ان پرانی باتوں کو بھول کر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا چاہیے اریہ، کیا خیال ہے؟“ اس نے مسکرا کر بھنوں کو بخش دے کر اس کی تائید چاہی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اریہ کو غیر یقینی سے کہہ سکتے ہوئے لگا۔ وہ گنگ سی فراز کو تنکے لگی جس کے چہرے پر تازگی و روشنی تھی وہ بے اختیار آسودہ ہو کر مسکرانے لگی اور اپنا سر اس کے کاندھے سے ٹیک دیا۔



”کہیں جاری ہو بیٹے؟“ بابا جان نے اسے تیار ہو کر کمرے میں آتے دیکھا تو قدرے حیرانی سے استفسار کیا۔ ”جی بابا جان باجو سے ملنے دعا کیجیے گا کامیابی کی۔“ اس کے مسکرا کر کہنے پر بابا سائیں لحد بھر کو چپ رہ گئے پھر اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

”خدا ہمیں زندگی کے ہر نیک مقصد میں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے میری بچی۔“ ان کا گلا جیسے بھرا سا گیا لاریب ان کی یاسیت کی وجہ جانتی تھی جیسی خاموشی اختیار کئے رہی بلکہ رات ایک بار پھر انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”مجھے سکندر کا نمبر تو دو بیٹے میں خود بات کروں گا اس سے۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہے تو پھر اسے اپنے فرائض کی جانب سے کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔“ ان کی بات کے جواب میں لاریب کے چہرے پر تغیر بڑھنے لگا۔

”آپ کو انتظار کرنا چاہیے بابا جان، یہ احساس اسے خود سے ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ فرائض و ذمہ داریوں کو بھی

چند مایوس کو کچھ بولنے کے قابل نہیں ہو سکا۔ ”تم صحیح کہتی ہو تمہیں مرجانا چاہیے، کیونکہ جن سے نفرت ہوتی ہے ان کے ساتھ رہنے ان کو برداشت کرنے سے موت بہر حال بہتر رہائی ہے۔“ وہ ناچاہتے ہوئے بھی شام کی ہو گیا تھا اریہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”آپ میری اس غلطی کو معاف بھی کر سکتے تھے فراز، مجھے کب اعتراف نہیں ہے کہ مجھ سے جو غلطی ہوئی وہ شدید ترین نادانی تھی میری سراسر جذباتیت۔“ وہ رو پڑی تو فراز نے سر ہاتھ بھری۔

”مگر وہ نفرت نادانی نہیں تھی جس بباگ و دہل تم نے اظہار کیا تھا تم عام عورتوں کی طرح سمجھوتے کی بنا پر اپنی زندگی برباد کر تیں مجھے کبھی اچھا نہیں لگ سکتا۔“ وہ پھر اسی سر موڑ پتا لے لگا اریہ صرف عاجز نہیں ہوئی خوف میں بھی مبتلا ہونے لگی۔

”مجھے اس اعتراف میں عار نہیں کہ اس رات میں نے جو کچھ کہا وہ سچ پر مبنی تھا مگر اس وقت میں غصے اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا تھی۔ میری تعلیم اس اچانک شادی کی وجہ سے ادھوری رہ گئی تھی ماس کیو کیلکیشن کی ڈگری میرا جنون تھا فراز، جس کی راہ میں آپ حائل ہو گئے تھے ورنہ آپ کو یاد ہونا چاہیے اس سے قبل آپ مجھ سے ملے تھے تو میرا رویہ اتنا شدید اور منتقمانہ نہیں تھا۔ میں بے نیکی ہانک کر آپ سے جان چھڑاتا چاہتی تھی مگر وہ ایک کنواری لالہ بانی لڑکی کی سوچ تھی جسے شادی کی پہلی رات نے ہی پیچور بنادیا تھا اگلا دن اس کے لیے لاتعداد رویے اور انکشاف لے کر آتا تھا۔ فراز میں نے تب جانا تھا کہ میری ہر حیثیت ہر پہچان کا حوالہ آپ ہیں آپ کی عزت میری عزت قرار پاتی ہے۔ اگر میں آپ کو ڈی گریڈ کروں گی تو دوسرے لفظوں میں خود پر ذلت مسلط کر لوں گی۔ میں واقعی غلطی کر چکی تھی جس کا احساس مجھے ہر شخص نے دلایا۔ میں نے واقعی یہ زندگی سمجھوتے سے آغاز کی تھی۔ مگر آپ کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے نہیں پتا میں کیسے آپ کی محبت میں گرفتار ہوئی چلی گئی اس کے باوجود کہ آپ کا رویہ اس کی گنجائش نہیں



نہیں دلانا چاہتا تھا اور گاڑی وہیں چھوڑ کر اس کے ہمراہ حویلی کی جانب جانے والے راستوں پر قدم اٹھانے لگا۔ انہی راستوں پر ان کا ٹکڑا وقاص حیدر سے ہو گیا تھا۔ بلیک مرسدیز میں اپنی بارعب اور منکبر شخصیت کے ساتھ وہ اس کی جلن کا سامان کیے بغیر کیسے رہ لیتا۔

”کچھ لوگوں کو قسمت ایسے پہنچتی ہے کہ بے چارے خود کو سنہالے بغیر ہستیوں میں گرتے چلے جاتے ہیں جیسے تم، بے تالاریب؟“ وہ اس کے عین مقابل رک کر اس کا راستہ روک کے کھڑا تھا۔ سکندر نے ہونٹ بھیجنے لیے جبکہ لاریب سسکی نظروں سے چپ چاپ اسے دیکھتی رہی تھی۔ ”تمہارے پاس اگر گاڑی نہیں ہے تو آؤ میں ڈراپ کر دوں تمہیں پیدل چلنے کی کہاں عادی ہو تم اور لمبے سفر اس طرح کتنے بھی کب ہیں۔“ وہ مہرمن طریقے سے اس کا مضحکہ اڑا کر اس نے اپنی ہسکت کا بدلہ لینا چاہتا تھا اور لاریب نے اس پر تفرقہ آفرین نظر ڈالتے ہوئے سکندر کا بازو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ انداز میں استحقاق تھا گویا وہ وقاص پر ہی کچھ جھلانا چاہتی تھی۔

”آؤ سکندر، راستہ بدل کر چلتے ہیں انسانوں کو دیکھ کر کتوں کو بھونکنے کی عادت ہوتی ہے مگر انہیں پتھر مار کر زخمی کرنے والے احق کہلاتے ہیں۔ انسان اور جانور میں کوئی تو تفریق ہونا چاہیے نا۔“ اپنی بات کہہ کر وہ رکی نہیں تھی اور کتر اکروہاں سے چلی گئی تھی وقاص حیدر کی تمام تملہاٹ سے محفوظ ہوئی ہوئی مگر وہ جیسے ہی نگاہوں سے اجڑھل ہوا اس نے سکندر کا بازو چھوڑ دیا۔

”دیے تمہارے ہونے یا نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے؟“ اس کا لہجہ اس پل بایست کی لپیٹ میں آ گیا تھا دکھ کی آنچ سے پگھلتا ہوا اس کا دل چاہتا تھا سکندر سے کہے مجھے تم سے دیا تحفظ چاہیے جو کسی بھی شوہر کی موجودگی میں ایک بیوی محسوس کر سکتی ہے تم میرے ساتھ ہو تو یہ حصدا اتنا مضبوطا پتھر پور ہو کہ کوئی جھٹکا کھٹکا کر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اس کا دل چاہتا تھا سکندر سے کہ تم اگر جسامت میں مضبوط و توانا ہو تو پتھر حوصلوں کو بھی

زبردستی لاوا جائے تو بوجھ نہ بن جایا کرتے ہیں اور میں زبردستی خود کو کسی پر مسلط کرنا پسند نہیں کرتی۔“

”اسے اپنے والدین کو تو ضرور آگاہ کرنا چاہیے تھا اپنی خیریت سے مگر اس نے ایسا بھی نہیں کیا آپ کو سوچنا تو چاہیے اس پوائنٹ پر بابا جان کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے، دولت میں بھی تو بہت کنشش ہے بابا جان۔ عین ممکن ہے وہ اسی چکا چوند کے گے رشتوں کو فراموش کر گیا ہو۔ احسان سے لے کر حقوق و فرائض تک کو۔“ وہ اتنی تلخ بھی نہیں تھی جتنی ان دنوں ہو رہی تھی ایک چیز ہوتی ہے بے مائیگی جس کا احساس بہت شدید ہوا کرتا ہے۔ عباس کے بعد اب سکندر بھی اسے اس احساس سے روشناس کر رہا تھا۔ پورچ میں آنے کے بعد اس نے ڈرائیور کو ایڈریس کی چٹ پکڑانے کے بعد چلنے کا اشارہ کیا۔

سفر طویل تھا اور اسے اب ہر قسم کے انتظار سے وحشت ہونے لگی تھی۔ کتنا انتظار سہا تھا اس نے مگر سب بے کار لا حاصل، اس کا دل وحشتیں سمیٹ لاتا تھا بات اگر انصاف بے انصافی کی نہ رہتی اور اچھے برے سلوک پر جا کر کرتی تو کیا اس نے صرف سکندر کے ساتھ برا سلوک ہی کیا تھا؟ اس کے پاس ایسی یادیں بھی تھیں جب اس نے سکندر کو معتبر بھی کیا تھا۔ بابا جان کی خراب طبیعت کا جان کر اسے اپنی انا اپنی ضد کو پس پشت ڈالنا پڑا اس نے خود سکندر کو حویلی چلنے کا کہا تھا۔

”تھنک گاڈ یہ آپ کا بہت اچھا فیصلہ ہے لاریب جذباتیت اور انا و ضد میں کیے گئے بعض فیصلے سوائے چچھتاؤں کے کچھ چھوٹی میں نہیں ڈالتے۔ بابا سائیں آپ کو دیکھ کر یقیناً خوش ہوں گے۔“

وہ نون سائیز پر رکھتا ہوا بے حد سنجیدگ و ممانت سے بولا تھا لاریب نے اس کی بات کے جواب میں خاموشی اختیار کی اور اگلی صبح جب وہ جا رہا تھا تو لاریب اس کے ساتھ تھی۔

”میں گاڑی میں نہیں جاؤں گی۔“ عجیب تھی اس کی ضد۔ سکندر کو لمسی آنے لگی مگر وہ کوئی بات کہہ کر اسے غصہ



دارہ تہ نے اتنا سوچ کر دیا کہ اپنے والدین کے ساتھ میرے پیارے بابا جان کو کبھی گھسیٹ لیا اب میں تمہیں کیسے بتاؤں گی کہ میں تمہارے لیے کیا محسوس کرتی ہوں۔ میں نے سوچ لیا ہے سکندر میں ابھی تمہارے آگے محبت کے لیے دامن نہیں پھیلاؤں گی۔ اگر تم صبر کر سکتے ہو تو میں کیوں نہیں، اگر تم ضبط آزماتے ہو تو میں کیوں نہیں۔

”بی بی جی علوی لاج آگیا ہے، میرے خیال میں تو یہی ہے۔“ ذرا سیر کی آواز پردہ اپنے خیالات سے چونک کر باہر آئی اور سیدھی ہو کر جرائی سے کھڑکی کے شیشے کے پار دیکھنے لگی۔ اس کی نظر شہر کے پوش اپریا میں ایستادہ سبزے میں گھری اس شاندار عمارت پر جا ٹھہری جو اپنے مکینوں کے ذوق اور حیثیت کا احساس اپنی انفرادیت اور شاندار طرز تعمیر سے کرائی محسوس ہوتی تھی۔

(تو یہ ہے آپ کا ٹھکانہ باجو، کاش ہماری ملاقات بھی خوشگوار ثابت ہو)

”جی میم، میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟“ مگن سنبھلے مستعد نظر آتا دواج مین پجارو سے نکل کر اپنی جانب آنے والی خوش رودار اپنے حلیے سے امیر ترین دکھائی دیتی اس لڑکی سے مودب انداز میں ہمکلام ہوا تھا۔

”مجھے شرجیل علوی سے ملنا ہے یہیں ہوتے ہیں نا وہ؟“ اس نے گردن موڑ کر اسی بل دہان آ کر رکنے والی میردن ہنڈا اکارڈ کو دیکھا جس کا ہارن مسلسل بج رہا تھا لاریب نے دیکھا دروازہ کھول کر ایک سوئڈ بوئڈ لڑکا اس کی جانب پیش قدمی کر رہا تھا۔

”مائٹڈ مت کیجیے گا میم صاحب آئے ہیں میں گیٹ کھول کر آپ سے بات کرتا ہوں۔“ دواج مین مہذب انداز میں کہتا جیسے ہی پلٹنے لگا قریب آتے فزاد کو دیکھ کر سلام کیا فرازی کو توجہ لاریب پر مرکوز تھی۔

”آپ.....؟“ اس کے شائستہ انداز میں الجھن نمایاں تھی۔

”سر یہ شرجیل صاحب کے متعلق پوچھتی ہیں۔“ دواج مین نے جواب دینے میں غلط دکھائی بھی فراز نے اب کی

ایسا کر لو۔ تم میرے لیے دیے بن جاؤ سکندر جیسا عباس ہے جس کا وجود ہی شیر جیسا ہے وہ بہادر ہے با حوصلہ اور بارعب ہے اس سے محبت کا باعث صرف اس کی خوب صورتی و وجاہت ہی تو نہیں تھی اس کی یہ خوبیاں بھی ہیں جن کے بغیر مرد مرد دلگتا ہی نہیں۔

اس کا دل یہ بھی چاہتا تھا سکندر سے کہہ تم اس غلامانہ چولے کو اتار پھینکو میرے لیے۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ تمہیں ذرا خرکس بات کا ہے مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکی تھی۔ اندر ہلکورے لیتے درد نے اسے کچھ کہنے ہی نہیں دیا تھا۔ مگر اس کے برعکس سکندر نجانبہ اس بل کن کیفیات کا شکار تھا اس پر الٹ پڑا۔

”آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں مگر یہ بات آپ کو تب سوچنی چاہی تھی جب آپ نے مجھے اس منصب کے لیے چنا تھا یاد کریں انکار کی صورت میں تھپڑ سے توبیخ کی تھی آپ نے ایک ملازم سے زیادہ حیثیت جب آپ نے مجھے نہیں دی تو کوئی اور کیسے مجھے کچھ سمجھ سکتا ہے۔“ گفتار تیز تھا اس کا لہجہ اور لاریب نے سوچا کیا یہ شخص کبھی سمجھے گا مجھے؟ دکھ کا شدید احساس اس کی رگوں کو بھینچتا ہوا خون کے ساتھ ساتھ درد ڈھار رہا تھا۔ وہی احساس اب بھی آج بھی اس کے ساتھ تھا۔

(میں نے سوچا تھا سکندر ہر لحاظ سے غلطی پر میں ہوں تمہیں اپنے ساتھ اس سفر میں زبردستی شامل کرنے سے لے کر تمہیں اپنی زندگی کی تمام تر مشکل مراحل سے دوچار ہونے تک ہر بات کی میں ذمہ دار تھی میں نے تسلیم کیا میں زیادتیوں کے اس سلسلے کی سرکب ہوئی تھی۔ اس لاج حاصل بے مروت محبت نے مجھے ایسا ہی بے اوسان کر چھوڑا کہ مجھے غلط صحیح کی نیز ہی بھول گئی تھی۔ رویوں کو برتنے کے طریقے سے لے کر مزاج سے آشنائی پانے کا ہر اصول، میں نے سوچا تھا اب ازالہ کروں گی تمہاری راہوں میں اپنی پلکیں بچھاؤں گی۔ تمہارے نازاٹھاؤں گی تمہارا ہر شکوہ اور بدلے میں کی گئی کوئی بھی زیادتی کشادہ دل سے برداشت کروں گی، مگر تمہارا گریہ تمہاری پہلو جو تمہاری یہ کوتاہی جس کا



مرتبہ ٹھنک کر بغور لاریب کو دیکھا تھا۔

سے بھر نہ لگا۔

”کیا مطلب، آپ مجھے تفصیل سے بتائیں پلیز، ویسے آپ کی تسلی کی خاطر میں بتا دوں میں ایمان باجو کی بہن ہوں باجو کے لیے ہمارے گھر میں بڑی مشکلوں سے پھر گنجائش لگتی ہے اور.....!“

”کیا بہتر نہیں ہوگا کہ ہم کہیں بیٹھ کر بات کر لیں میں آپ کو اپنے گھر میں ضرور بلواتا مگر میرا ذہنی خیال ہے، ہم کہیں باہر بیٹھ کر زیادہ بہتر انداز میں بات کر سکیں گے اگر آپ مناسب سمجھیں۔“

فراز اس کی بات کاٹ کر جس بنجیدگی سے بولا اس نے لاریب کو کسی غیر معمولی صورتحال کا ادراک بخش دیا تھا جسے اس کا دل گہرائیوں میں گرتا چلا گیا اک لفظ کہے بغیر لاریب نے آبادی ظاہر کی تھی۔ اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر وہ نزدیکی ریسٹورنٹ میں چلے آئے تھے لاریب نے ڈرائیور کو گاڑی میں رکھنے کا کہا اور فراز کے ہمراہ اندر آگئی۔ اس کا وجود جیسے کسی انہونی کے خیال کے ساتھ ہی بے جان ہوتا جا رہا تھا۔

”پلیز جو بھی بات ہے جلدی کہیں۔“ خوف اس کے وجود میں سویاں گاڑ رہا تھا۔

”مجھے افسوس ہے میرے پاس ہرگز اچھی خبر نہیں ہے۔“ وہ بے حد افسردگی سے کہہ رہا تھا اور جو کچھ لاریب کے علم میں آیا وہ اتنا دل شگاف تھا کہ لاریب تمام ضبط تمام حوصلے گنوا کر ایک کمر انجان شخص کے سامنے ہی روئی چلی گئی تھی۔



عباس نے کمرے میں آنے کے بعد کوٹ اتار پھینکا۔ ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کر رہا تھا جب دروازہ بجا تھا عباس نے اجازت دینے کو کھنکھنکا بھرا اور ٹائی کوٹ کے ساتھ صوفے پر پھینک دی۔ بھی فاطمہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا، میری دوست ہیں زینب انہوں نے ہمیں آج کھانے پر بلایا ہے۔“ عباس کے دل

”آپ شرجیل بھائی کو کیسے جانتی ہیں آئی میں انہوں نے کوئی میسج دے کر بھیجا ہے آپ کو یہاں؟“ وہ کتنا بے چین لگنے لگا تھا۔ لاریب کے اعصاب کو حیرت بھرا جھٹکا لگا۔

”واٹ یو مین، میں تو خود ان کی تلاش میں یہاں پہنچی ہوں کیا وہ یہاں نہیں ہوتے؟“ لاریب کے انداز میں گھبراہٹ و پریشانی اتنی واضح تھی کہ فراز سردا ہ بھرتا سر کوٹنی میں ہلانے لگا۔

”کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں آپ شرجیل بھائی سے کس سلسلے میں ملنا چاہتی تھیں۔ اگر آپ بتائیں گی تب ہی میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں گا۔“ فراز کے عجیب و غریب جواب پر لاریب نے جھنجھلا کر اسے غصے سے گھورا۔

”آپ مجھے بتانا پسند فرمائیں گے آپ یہ انوسٹی کیشن کیوں کر رہے ہیں؟“ فراز اس کے جیسے چوتھوں کو محسوس کرتا قدرے حیران ہوا پھر قدرے غل سے بولا تھا۔

”شرجیل میرے بڑے بھائی ہیں کچھ مسائل تھے ان کے جن کی بناء پر اب وہ یہاں نہیں رہتے مگر وہ مسائل ظاہر ہے میں کسی اچھی سے شیئر نہیں کر سکتا آپ سمجھ رہی ہیں میری بات۔“ آخر میں اس کا لہجہ جیتلنا ہوا ہو گیا۔

”کیا وہ مسائل ان کی سرایمان کی وجہ سے کری ایٹ ہوئے تھے، کیا ان کی شادی کے بعد آپ کی فیملی نے انہیں ایکسپٹ کرنے سے انکار کر دیا تھا جس کی بناء پر انہیں یہ گھر چھوڑنا پڑا؟“ وہ قیاس کے گھوڑے دوڑا رہی تھی مگر اب کے فراز بڑی طرح سے چونک کر اسے سرتاپا تنگنے لگا۔

”کیسے جانتی ہیں آپ یہ سب، کیا آپ کا تعلق ایمان بھائی سے ہے؟“ لاریب دانستہ خاموش رہی فراز نے سردا ہ بھری تھی۔

”مجھے افسوس ہے کہنا رہا ہے کہ وہ معاملہ آپ کی توقع اور سوچ سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور پر تاسف ہے۔“ اس کے لہجے میں اترا ہوا تاسف و ملال ہرگز بھی نظر انداز کرنے والا نہیں تھا۔ لاریب کا دل خدشات کے خوف اور بے چینی



## فرزانہ سرور

السلام علیکم! جی تو دوستوں میں ہوں فرزانہ سرور ملتان کے ایک خوب صورت گاؤں میں رہتی ہوں۔ ستمبر کی 15 تاریخ کو اس دنیا میں تشریف لائی، ہم چار بہن بھائی ہیں میں سب سے بڑی ہوں مجھ سے چھ نئے دو بھائی اور ایک بہن ہے۔ جنوری کی شام بھلائے نہیں بھولتی، ہمارے ابو جان اس فانی دنیا سے ہمیشہ سے لیے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔ میں اپنی امی جان سے بہت محبت کرتی ہوں، خوبیاں تو بہت سی ہیں سب کا احساس کرتی ہوں کسی کو بھی پریشان نہیں دیکھ سکتی، رحم دل ہوں۔ بڑوں کا احترام کرتی ہوں، محبت کا جواب محبت سے دیتی ہوں۔ ہم میں برائیاں بھی کچھ کم نہیں غصہ حد سے زیادہ آتا ہے غصہ میں کسی سے بات نہیں کرتی جو کہوں فوراً بات پوری ہوتی چاہیے۔ خانہ کعبہ میں زیارت کروں مری کی سیر کرنے کی خواہش ہے اور اچھی افسانہ نگار بنوں جس کی کوشش جاری ہے۔ کھانے میں بریانی، قورمہ، نان چنےلے جا میں تو عید ہو جائے۔ پھلوں میں ناشپاتی، امرود، انار، سبز یوں میں کر لیے والی تورنی بھنی ہوئی اور سویٹ ڈش میں کسٹرڈ، کھیر، حلوہ پوری، رنگوں میں پنک کٹر..... شہروں میں اسلام آباد گاؤں میں اپنا گاؤں ہمارا لگتا ہے۔ پسندیدہ شخصیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، ابو اور چچا جان شامل ہیں۔ پسندیدہ سائنسز سیرا شریف، نازیہ کنول، نازی، عشنا، کوش، شاعر میں علامہ اقبال، وحی شاہ اور دوستوں میں شہناز حنیف۔ میں نے ایک ہی دوست بنائی اب تک اور ہمیشہ کے لیے..... آپنی عطیہ کنزوں میں بیسٹ کنزن ہیں۔ شرعی پردہ کرتی ہوں اور پانچ وقت کی نماز کی پابند ہوں اب اجازت چاہوں گی اللہ حافظ۔

بھائی ایڈمٹ ہیں ان کی حالت میں کوئی فرق نہیں آسکا بلکہ وہ پہلے سے کہیں زیادہ ایک لگ رہی تھیں میں نے اور

میں اس کے لیے نفرت مزید شدت اختیار کرنے لگی۔ ”کس خوشی میں ہے یہ صیاف؟“ وہ بولا تو لہجہ پر تش تھا فاطمہ نے اس پیش کو محسوس کرتے ہوئے گڑ بڑا کر نظریں اٹھائیں اور جیسے لمحوں میں زیر ہو گئی۔ ”ہاں خوشی تو ہوگی اسے۔ آخر وہ تمہاری دوست تھی تمہاری شاطرانہ چالوں کی کامیابی کا جشن تو منائے گی تمہارے ساتھ مل کر مگر میں تمہیں بتاؤں کہ میں اب مزید بے وقوف نہیں بن سکتا، تم نے جتنا لونٹا تھا لوٹ لیا مجھے نفرت ہے تم سے، شدید نفرت۔“ وہ بلند آواز سے کہہ رہا تھا فاطمہ سر پڑنے لگی۔

”مجھے تم سے نفرت ہے تم نے میرے ساتھ جو کیا وہ قابل معافی ہے ہی نہیں تمہیں مجھ پر ترس کیوں نہیں آیا، میری خوشیوں پر حاسدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے تمہیں یہ خیال کیوں نہ آیا کہ میں عریضہ کو بھول کر جینا بھول سکتا ہوں۔ تمہارا کچھ نہیں گزرا عریضہ ہی مجھ سے نہیں بچھڑی میری خوشیاں بچھڑ گئی ہیں میں خود سے بچھڑ گیا ہوں۔“ کتنے دنوں کا لاوا تھا جو اس طرح سے پھٹ کر لٹکا تھا وہ آنسوؤں میں ڈوب رہا تھا۔ فاطمہ اب بھی اس کے کرب اس کے آنسوؤں پر اپنا ہر دکھ ہر اذیت کو بھلائے تڑپ اٹھی تھی اور اس کی جانب پکلی، اسے سمیٹ لینے کو، اس کے آنسو پونچھ دینے کو۔ مگر وہ بے مادہ ہی کب تھا اسے یہ حق دینے کو جیسی بے حد نفرت و حقارت سے حاضر فاسد جھٹکا بلکہ دھکے مار کر کمرے سے بھی نکال دیا۔

”چلی جاؤ مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے اور کبھی ہوگی بھی نہیں۔“ وہ بالکل پاگلوں کی طرح چلا رہا تھا۔ فاطمہ بند دروازے کے گے سواری بنی کھڑی تھی۔ اپنی ذلت سے بے نیاز، اس کی تکلیف پر تڑپتی ہوئی وہ بھول گئی کہ وہ کس مقصد سے آئی تھی اسے بس عباس اور اس کا دکھ یاد رہ گیا تھا۔



”بس یار..... پھر کیا ہونا تھا وہ بہت بری طرح رونے لگی، اتنی پیاری لڑکی اور ایسا بڑا دکھ مجھے سچ میں بہت ترس آیا تھا اس پر پھر میں اسے وہاں سے اسپتال لے گیا جہاں



”بخار تو نہیں ہے کیا محسوس کر رہے ہو تم؟“  
”کچھ نہیں فرماؤ..... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں  
ہے۔ سرد رہے معمولی سا۔“ سکندر نے جیسے اسے ٹالا مگر  
فرزان کئی کر گیا۔

”میں ٹیبل سے کہتا ہوں آ کر تمہیں چیک کرے  
چائے بھی بھجواتا ہوں تمہارے لیے۔“

”فرزان آؤ! یار ٹیبل کو زحمت مت دینا بچہ رانی ہے  
بس البتہ چائے ضرور بھیج دینا میں اپنے کمرے میں  
ہوں۔“ رسان سے ٹوکتا ہوا داد گے بڑھ گیا فرزان کو وہ الجھا  
ہوا لگاؤں جیسے کچھ چھپا رہا ہو مگر اس نے کریدنا مناسب  
نہیں سمجھا وہ جانتا تھا سکندر اسے خود بتا دے گا۔



سکندر فرزان سے بہانہ کر کے اٹھا تھا ورنہ اسے آرام کی  
ضرورت ہوتی تو اپنے کمرے میں یوں بے چین بے قرار  
ٹہل نہ رہا ہوتا اس کے ذہن میں اس وقت بے حد غلی بے  
بسی کے ساتھ وحشت کا احساس بھی سرسرا رہا تھا۔ کل جب  
لاریب یہاں پہنچی تو یہ محض اتفاق تھا کہ وہ اپنے کمرے کی  
کھڑکی میں کھڑا تھا اس کی نگاہ سڑک پر اسی طرف آئی  
پجوار کو ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر پہچان گئی تھی آخر ایک  
عرصہ اس نے خود بھی اس گاڑی کو استعمال کیا تھا۔

مگر اس پل یہاں..... علوی لاج کے سامنے اسے  
رکتے پا کر سکندر کا دل ایک لمحے کے لیے اچھل کر حلق میں  
آ گیا تھا پہلا خیال اسے بابا سائیں کا ہی آ سکا تو کیا وہ  
اسے تلاش کرتے یہاں آپہنچے تھے؟ مگر بابا سائیں کے  
بجائے لاریب کو گاڑی سے برآمد ہوتے دیکھ کر تو اس کا  
وماغ ہی پکڑانے لگا یہ تو کسی طرح بھی اس کے وہم و گمان  
میں نہیں تھا کہ آنے والی لاریب بھی ہو سکتی ہے۔

گلابی لباس میں وہ خود بھی گلابی گلابی ہو رہی تھی نازک  
اور بے تحاشہ سین، ہمیشہ کی طرح اس کے اعصاب کو کھڑ  
کر اس پر سحر طاری کرتی ہوئی اپنے تئیں وہ اس سے بدگمان  
تھا کتنا تھا مگر اسے رو برو پاکے دل جس طرح زندگی  
کے احساس سمیت دھڑک اٹھا تھا وہ انداز سکندر کو اچھا نہیں

اس لڑکی..... اوہ میں اس کا نام پوچھنا تو بھول گیا، دراصل  
اس قدر لمبیر صورت حال تھی کہ خیال ہی نہ آ سکا تھا ہاں تو میں  
کہہ رہا تھا کہ خوب صورت تو یہی بھائی بھی بہت تھیں مگر  
ان کی بہن..... یا قسم سے میں نے شاید اس سے قبل کبھی  
انتہا مکمل حسن نہیں دیکھا..... ارے یاد آیا جب میں نے فلم  
سائن کی تھی تا سحر صاحب کی وہی تمہارے فیوژل عیاس  
حیدر صاحب ان کی مودی میں جو میرے ساتھ ہیر وڈن بھی نا  
وہ بھی اتنی ہی اتنی ہی حسین تھی۔ پتا ہے لوگ وہاں سحر  
بھائی اور نندنی کو ایک ساتھ دیکھ کر کیا سمجھتے تھے، سب کا  
خیال تھا کہ یہ ایک بہترین شاندار کپل ہے حسن و خوب  
صورتی میں ایسا مکمل کہ جیسے ایک دوسرے کے لیے ہی  
بنائے گئے ہیں۔ مگر یاد وہ تو محض ان کی فلم کی ہیر وڈن تھیں  
اور تھی بھی ہندو۔“ فرزان اپنی عادت کے مطابق بات کو کہیں  
سے کہیں لے جا رہا تھا سکندر بہت ضبط اور تحمل کا مظاہرہ  
کرتا اس کی بات سنتا رہا اسے ٹوکے بغیر۔

”ڈاکٹر نے ہمارے بے حد اصرار پر بھی شرجیل بھائی  
کا ایڈریس نہیں دیا مجھے نہ ہی ان کا کوئی کھانسی نمبر مجھے  
غصہ تو بہت آیا مگر ہے تو یہ روز کے خلاف بات صاف لگتا  
تھا شرجیل بھائی نے ہی منع کر رکھا ہے انہیں۔“ وہ متاسف  
سا کہہ رہا تھا۔

”لیکن بے فکر ہو میں انہیں ڈھونڈ نکالوں گا تمہیں بھی  
ڈھونڈ نکالا تھا ایک مزرے کی بات تو سنو تم مجھے ملے تھے نا،  
اس سے چند روز قبل میں نے تمہاری تلاش کے لیے اخبار  
میں اشتہار دیا تھا۔“ وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا معا ایک دم  
چپ کر کے اسے بغور سننے لگا۔

”کیا ہوا تم اتنے چپ کیوں ہو سکندر؟“ سکندر نے  
سگریٹ پھینک کر اپنی آنکھوں کے پوچھل ہوتے پوٹے  
انگشت شہادت سے دبائے۔

”کچھ طبیعت بہتر نہیں ہے بہت تھکن بھی ہو رہی ہے  
میرا خیال ہے مجھے آرام کرنا چاہیے۔“ وہ آہستگی سے کہتا  
اٹھا تو فرزانے تشویش میں جتلا ہو کر اسے دیکھا پھر ہاتھ  
بڑھا کر اس کی پیشانی چھوئی۔



لگا۔ اب وہ اس دل کو مزید اس لڑکی کی خاطر خوار ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ جیسی بے حسی کا لبادہ اوڑھتا کھڑکی سے ہٹ گیا۔

وہ اسے نہ دیکھ کر اس کے پاس نہ جا کر خود کو اپنے ضبط کو آزمانا چاہتا تھا مگر دل خوش فہم تھا کہ اگر وہ یہاں تک پہنچ گئی ہے تو اس تک بھی لازماً رسانی پائے گی آخر وہ اس کی خاطر تو آئی تھی، ایک ایک لمحہ صدی بن گیا۔ بالآخر ضبط چھلک گیا بے چینی بڑھی تو اسے اٹھنا پڑا کھڑکی سے گیٹ کے پار جھانکنے پر اسے پچھار نظر نہیں آ سکی اس نے پور نیو کی جانب نگاہ کی مگر وہاں بھی اس گاڑی کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس کی حیرانی پر اضطراب اور پشیمانی کا غلبہ چھانے لگا جیسی اسے راج مین سے پوچھنا پڑا اس کے بغیر چارہ ہی کہا تھا بھلا۔

”سردہ میم صاحب شریل صاحب کا پوچھ رہی تھیں پھر فراز صاحب کے ساتھ نہیں چلی گئیں۔“

”چلی گئی، فراز کے ساتھ؟“ اس کو حیرانی ہوئی۔

”جی سر بالکل، فراز صاحب اپنی گاڑی سے، میم اپنی گاڑی سے۔ میں نے ساتھ فراز صاحب انہیں کچھ بتانا چاہ رہے تھے۔“ راج مین نے حسب استعداد تفصیلات دے دی تھیں مگر سکندر کی بے چینی عجیب سی رقابت کا شکار ہوتی چلی گئی وہ اپنی کیفیت سے نگاہ چراتا ہوا واپس آیا تھا تب تک بھی اس کے ذہن میں ایمان اور شریل نہیں تھے اس کی ہر سوچ کی مضطرب اڑان لاریب سے شروع ہو کر لاریب پر ہی ختم ہوتی لیکن جب فراز نے اسے ہر بات تفصیل سے بتائی تب سکندر کے اعصاب پر انکشاف کا بھاری بوجھ گرا تھا۔

”اف..... تو ایمان بی بی کے ساتھ اتنا برا ہوا۔“ اس نے سر تھام لیا دل کتنا بوجھل ہوا تھا یہ سب جان کر، گویا ایمان سے وہاں ہی نہیں یہاں بھی گہرا تعلق نکل آیا تھا اور لاریب اس کی نہیں درحقیقت ایمان کی تلاش میں یہاں آئی تھی۔ ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں لاریب کے متضرر چھلکا تے تمام رد پے سامنے لگے۔ اس نے دانستہ فراز

سے اپنی تمام کیفیات کو چھپا لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا فراز لاریب سے اس کے حوالے سے گاہ ہو۔ ابھی تو اسے خود اپنے دل کی خبر نہیں تھی کہ وہ لاریب کے متعلق کیا چاہتا ہے بس اس میں تو ایک سناٹا تھا۔ دستک کی آواز پر اس نے ٹھہرنا موقوف کر کے خود آگے بڑھ کر دروازہ داکیا تھا مگر رو بردتائی اماں کو پا کر قدرے حیران نظر آنے لگا۔

”تم نے چائے مانگی تھی نا میں خود لے کر آئی اپنے بیٹے کے لیے سر میں درد ہے تو بادوں؟“ مسکراہٹ کے پھول نچھاور کر تیں وہ واری صدمے ہونے کو تیار تھیں۔ سکندر کے ذہن میں ان کے حوالے سے کبھی غیبی اور فراز کی تنبیہی باتیں گونجیں۔ شک اس کی فطرت میں نہیں تھا وہ بہت سادہ لوح انسان تھا ہر کسی کو اپنے دل کی صاف شفاف نگاہ سے دیکھنے والا مگر تائی ماں کے چالو سنا انداز سے اسے بھی بے راز ہی دکھاتا تھا محسوس ہوتی تھی۔

”نہیں بہت شکریہ آپ کا چائے کے لیے آپ نے زحمت کی۔“ مگ ان کے ہاتھ سے لیتا وہ رواداری سے بولا تھا مگر وہ اتنی آسانی سے جان چھوڑنے پر ہرگز آمادہ نہ تھیں۔

”ارے زحمت کسی بیٹا، اچھا تم چائے پی لو میں صالو کو بھیجتی ہوں وہ سرد پاؤں کی تمہارا؟“

”ارے نہیں چلیز میں بالکل ٹھیک ہوں تائی ماں آپ انہیں ہرگز نہ بھیجے گا۔“ وہ اتنا بول کھلایا کہ فی الفور انکار کر دیا پوری شد و مد کے ساتھ اور تائی ماں مسکراتے ہوئے پلٹ گئیں اس مسکراہٹ نے سکندر کو عجیب سا احساس بخشا وہ اس مسکراہٹ کا مطلب ہرگز نہیں سمجھ سکا۔ مگر اس وقت سر تھام کر رہ گیا جب جی بنی صالو اس کے سر پر آ کر سوار ہوئی تھی۔

سکندر اس کی خوشخوہا نظر نکا کر دیکھنے نظروں کے تیر پھینکنے ادائیں دکھانے والی عادت کو محسوس پہلے بھی کر چکا تھا مگر بہت خوبی سے نظر انداز کرتا رہا تھا۔ مگر آج مصیبت یہ تھی کہ وہ اس کے کمرے میں گھس آئی تھی اور اسے اس کام کی شہ اس کی ماں نے دی تھی جو اپنے نام کے بالکل برعکس



تھی۔ غم و غصے کے ساتھ ساتھ سکندر کو تاسف ملاں نے بھی کے خیال سے گھن محسوس کرتا تھا۔

ادھ مو کر لڑا۔



وہ اتنی ڈسٹرب اور بے قرار تھی کہ کسی طرح بھی بابا سائیں سے یہ بات نہ چھپا سکی۔ جسے سن کر ان کا چہرہ کیسے ہلدی کی طرح زرد پڑتا چلا گیا تھا اور ہونٹ نیلے ہوتے ایسے کانپنے لگے جیسے جگ میں مبتلا ہوں۔

”اللہ گواہ ہے میں نے بھی اسے بددعا نہیں دی میں نے کبھی اس کے لیے برا نہیں چاہا تم مجھے اس کے پاس لے چلو میرا دل رک رہا ہے لا ریب۔“ جب وہ کسی طرح بھی خود کو نہیں سنبھال سکے تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ لا ریب جو جانے کب سے ضبط کیے بیٹھی تھی ان کے ساتھ لگ گئی۔ دکھ سا نبھاتا تھا اور بہت بڑا بھی آنسو تھمتے تھے نہ ملاں ڈھلتا تھا۔ وہ سب اپنے اپنے طور پر اس سے خفا اور شاکی تھے اور وہ تنہا کیسی آزار کشوں سے گزر رہی تھی..... اور اب، اب جس انجام پر تھی اس سے آگے کیا ہونا تھا یہ تو کوئی بھی نہ جانتا تھا سوائے اللہ کے۔ جس لیے لا ریب خود بھی آنسو بہاتی بابا سائیں کو تسلی سے نواز رہی تھی امامہ اپنی بچی کے ہمراہ پہلی بار یہاں ان سے ملنے آئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں مسکان تھی اور چہرے پر ملنے والی خوشیوں کی جگہ گھٹ مگر ان پر نگاہ پڑتے ہی اس کے چہرے کی تازگی کی جگہ خوف و ہراس نے لی لے۔ بہم اتر آیا تھا اس کی آنکھوں میں۔

”بابا جان..... بھو.....!“ اس کے حلق سے گھٹی ہوئی آواز نکلی تھی اگلے لمحے وہ دوڑ کر آئی تھی۔ لا ریب نے اسے دیکھ کر خود کو سنبھالنا جا کر جیسے ضبط اور حوصلے کی ساری طمانیت چھوٹ گئی تھیں۔

”باجو تو ٹھیک ہے نا بھو.....“ آپ نے انہیں ڈھونڈا تھا۔“

امامہ کے دل نے جیسے دہل دہل کر از خود گواہی دے دی تھی لا ریب کو سسکیوں پر بند باندھنا دشوار ہونے لگا اس نے انہی سسکیوں اور ہچکچوں کے درمیان وہ دل فگار مرحلہ پھر سے طے کیا ایمان کے حوالے سے صورتحال جانتی امامہ

”میں کہہ چکا ہوں کہ میرا سر درد نہیں کر رہا آپ تشریف لے جائیں یہاں سے۔“ سکندر کے لیے یہ سب بہت ناقابل برداشت تھا جب وہ اس کے برابر اس کے بالکل ساتھ جڑ کر صوفے پر بیٹھ گئی تھی وہ ایک جھٹکے سے اٹھا کھڑا ہوا۔

”آپ تو شرمانے میں لڑکیوں کو بھی مات دے رہے ہیں۔“ وہ اس پر جھک کر کہہ رہی تھی۔ مگلا قابل اعتراض حد تک گہرا، دوپٹے کا بس تکلف ہی برتا گیا تھا۔ لہجہ ہرکا ہوا تھا سکندر شا کڈ ہونے لگا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کوئی لڑکی اپنی سوانیت کو پامال کرنی اتنا بھی ورکتی ہے۔

”آپ یہاں سے چلی جائیں ورنہ.....!“ ”ورنہ کیا؟“ وہ اسی بے باک انداز میں منس کر کہتی گویا اسے شہ دے رہی تھی۔ سکندر کا داغ سن ہونے لگا۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو اس بے باکی کے جواب میں جانے تھی اخلاقی حدیں پھلانگ جاتا مگر سکندر رنج و غم سے دیوانہ ہوتا اس پر ہاتھ اٹھانے سے خود کو روک نہیں سکتا تھا۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں ٹکڑے کر دوں گا تمہارے۔“ وہ اسے دروازے سے باہر کر کے کمرہ لاکڈ کر چکا تھا۔ اس کا داغ اور خون ابل رہا تھا صالحہ کے خیال سے ہی اسے گھن آ رہی تھی اسے اس مقام پر لا ریب یاد آئی۔ دوپٹے کا خیال وہ بھی کبھی نہیں کرتی تھی اس کے سامنے نکاح سے پہلے سے لے کر بعد تک بھی مگر اس کی اس بے پروائی میں بے حیائی کا عنصر کبھی بھی چھلکتا نظر نہیں آیا تھا اس کا انداز معصومانہ اور بے پروا ہوا کرتا تھا۔ صالحہ کی تو باڈی لینکونج ہی بے ہودہ تھی۔ لا ریب تو اس کی خلوتوں میں آ کر کبھی اس کی قربتوں میں بھی اس طرح نہیں بہکتی تھی جیسے یہ صالحہ بہکتی تھی۔ ہاں یہی فرق تھا ان دنوں میں اس سے محبت اور اس سے نفرت کی وجہ یہی بنیادی فرق بن سکتا تھا۔ ورنہ محبت تو اسے ثانیہ سے بھی نہیں تھی لیکن وہ اس سے صالحہ کی طرح نفرت کرتا تھا نہ اس



”تم لے کر گئے تھے نا انیس، ہم سے جھین کر۔ اگر سنبھال نہیں سکتے تھے تو کیوں کیا تھا یہ کام؟ ان کی حیثیت نہیں منوا سکتے تھے تو انہیں تختہ مشق کیوں بنوایا، مجرم ہو تم میری بہن کی خوشیوں کے تمہیں کوئی حق نہیں تھا، ہم سے ہماری بہن چھیننے کا۔“ وہ ہنس کر ہو چکی تھی ایمان کی تباہ کن حالت امامہ کی حد سے بے گزری طبعیت ان سب کا ذمہ دار وہی شخص تھا وہ اسے سامنے پا کر اپنے غم و غصے اور اشتعال پر قابو نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسے مجرموں کی طرح اپنی عدالت میں کھڑا کر کے خود بھی بلک اور تپ رہی تھی۔ جب ڈاکٹر کے ساتھ مل کر بابا سائیں نے اسے سنبھالا ڈاکٹر صاحب نے شرجیل کو پکڑ کر فاصلے پر کر دیا تھا وہ تب بھی خاموش تھا۔

”لاریب..... لاریب بیٹا کیا ہو گیا ہے سنبھالو خود کو۔“ بابا سائیں نے بے بسی کی انتہا پر جا کر کہہ آتے ہوئے انہوں نے معذرت خواہانہ نظروں سے سر جھکا کر لے کر آرزوہ نظر آتے شرجیل کو دیکھا تھا۔

”معاف کر دینا بیٹا، بہن ہے نا برداشت نہیں کر سکتی اتنے عرصہ بعد اسے دیکھا بھی تو اس حالت میں، ہم تو سمجھتے تھے وہ خوش ہوگی ہمیں کیا خبر تھی کہ وہ.....!“ ان کی آواز بھرا گئی، شرجیل نے غم سے نڈھال ہوتے انہیں دیکھا۔

”میں سمجھ سکتا ہوں آپ کو معذرت کرنے کی ضرورت نہیں یہ صرف ایمان کی انہیں میری بھی بہن ہیں آپ پلیز گھر چلیے میرے ساتھ چھوٹی سسر کی بھی طبعیت ٹھیک نہیں ہے آپ اتنا طویل سفر نہیں کر سکتے۔“ شرجیل کے انداز میں اپنائیت تھی۔

”نہیں شکر یہ بیٹا آپ کو زحمت ہوگی۔“ ان کو وہ شائستہ اطوار وجہ یہ نوجوان بہت بھایا تھا۔ دل میں جیسے کوئی خار چبھنے لگا (کاش وہ اس وقت انکار نہ کرتے اتنا کام مسئلہ نہ بناتے اور اپنی بیٹی کی خوشی کے مطابق فیصلہ کر دیتے شاید آج صورتحال اتنی تکلیف دہ نہ ہوتی) ان کا غم سے بو جھل دل پچھتاؤں کا شکار تھا۔

کا چہرہ پھرتا جا گیا۔ پھر وہ اس وقت تک ایسے ہی رہی تھی جب تک اس نے ایمان کو دیکھ نہیں لیا۔ اسے یاد آیا اس نے کہا تھا وہ ایمان سے بہت جھگڑے گی وہ اس سے کبھی نہیں بولے گی مگر ایمان نے ایسی کوئی نوبت ہی نہیں آنے دی۔ وہ خود ناراض ہو گئی تھی ان سب سے۔ اتنی ناراض کہ کسی کے بھی پکارنے پر آپکھ کھولی تھی نہ جواب دیتی تھی اس کی حالت دیکھتی امامہ کی دلخراش چینیوں و رو دیوار کو لرزائے لگیں وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

”با جو کوا نہیں بابا جان، میں انہیں ایسے نہیں دیکھ سکتی۔ آپ انہیں نہیں آپ ان سے خفا نہیں ہیں۔ بابا جان یہ آپ کو خفا کر کے کبھی خوش نہیں رہ سکتی تھیں۔ یہ اسی لیے ہم سب سے روٹھ گئی ہیں کہ آپ ان سے خفا تھے۔ بابا جان خدا کے لیے انہیں کہہ دیں آپ نہیں ہیں خفا ان سے۔ انہیں اٹھائیں بابا جان ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا میں مر جاؤں گی۔“ چیخ چیخ کر بے حال ہوتے اس کا گلا سوکھ گیا رو رو کر آنکھیں سو جھ کر گئیں۔ اس کی حالت ہر گز رتے لمبے غیر متروک ہوتی جاری تھی۔ انہیں صبح معنوں میں ایمان کی بھول کر اس کی فکر کرنی پڑی۔ ڈاکٹر کے مشورے پر اسے فوری طور پر سکون و درد کا کاجچیشن لگادیا گیا۔

”اب ہمیں چلنا چاہیے بابا جان، امامہ کی طبعیت بہتر نہیں ہے۔“ لاریب واپس بابا سائیں کے پاس آ گئی جو چند گھنٹوں کے اندر اپنی عمر سے دو گئے نظر آنے لگے تھے۔

”یہ شرجیل علوی ہیں مر بیضہ کے ہر بیٹہ انہیں میں نے بلوایا ہے یہ ضروری تھا کہ میں آپ کی آمد ان کے علم میں لاتا۔“ ڈاکٹر کے کرائے گئے تعارف پر لاریب نے تمام تر ذہنی انتشار و اضطراب کے باوجود بے اختیاری کی کیفیت میں گردن موڑ کر دیکھا سنجیدہ و متین دراز قامت بے حد خوب و سوانہ جوان کچھ فاصلے پر کھڑا حیران پریشان سا انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی لاریب کی آنکھیں سلگنے لگیں۔ بابا سائیں کا بازو چھوڑی وہ مشتعل انداز میں اس کی جانب بڑھی اور اگلے لمحے جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا تھا۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



اپنی سناے بغیر اسے کام نہیں کرنے دے گا۔  
”نہیں بھولوں گا ڈونٹ دی مگر تم وہاں بیٹھو انسانوں  
کی طرح۔“ سکندر کے جزبہ ہو کر ڈانٹنے پر وہ بے تحاشہ  
ہنستا چلا گیا تھا۔

”یار کیا ہر وقت دو اور دو چار کرنے میں لگے رہتے ہو  
پہلے ہی بہت مالدار ہو ماشاء اللہ۔“ اس نے ایک بار پھر  
اسے غصہ دلانے والی حرکت کی اور لپٹا پ باند کر دیا۔  
”یار یہ کیا کر رہے ہو تم؟“ سکندر چیخا تھا جبکہ فراز  
کاندھ سے اٹھتا ہنستا چلا گیا۔

”تم میری بات سنو گے نہیں اور میں کام نہیں کرنے  
دوں گا تمہیں۔“ اس کے اطمینان میں مجال ہے جو فرق آیا  
ہو سکندر نے جھلا کر اسے دیکھا۔  
”مت بھولا کرو کہ اس طرح کے خمرے تمہیں اریبہ  
بھائی سے اٹھوانے چاہیے۔“

”مجھے تو تم بھی اپنی بیوی کی طرح ہی پیارے لگتے  
ہو۔“ فراز نے اسے آنکھ ماری جس پر سکندر بدک سا گیا  
اور فراز کے قہقہے گویا چھت اڑانے لگے۔

”تم اپنا کارنامہ بتاؤ گے؟“ سکندر نے اسے دوسری  
کرسی پر دھکیل کر گویا جان چھڑانے کی ابتدا کی فراز اس کی  
بے بسی کو محسوس کرتا خط اٹھا کے مسکرانے لگا۔

”آج میں نے مناسب فاصلہ رکھ کر شرجیل بھائی کا  
گھر دیکھ لیا ہے۔ وہ اپنے سرسالی عزیزوں سے ملنے آئے  
تھے غالباً واپسی پر انہیں اپنے گھر لے گئے تھے مجھے لگتا ہے  
ان کی آپس میں صلح ہو گئی ہے۔“ سکندر فراز کے انکشاف پر  
یکدم ساکن ہو کر رہ گیا۔

(”تو گویا تم بھی آئی ہوگی اچھی شروعات ہے یہ آپ کو  
خوشیاں مبارک ہوں لاریب لی بی“)

”تمہیں کیا ہو جاتا ہے، گوٹے کا گڑھ کھا لیتے ہو بیٹھے  
بٹھائے۔“ فراز کے ٹھوکہ دینے پر وہ زور سے ہڑ بڑایا۔

”میں سوچ رہا ہوں تمہیں ان کا تعاقب کرنے کے  
بجائے مل لینا چاہیے تھا شرجیل سے۔“ وہ اپنی حاضروا می  
کا ثبوت فراہم کرنے کو بولا۔ فراز نے اٹھنے لمحے اس کی

”اس طرح کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں باباجان، ایمان  
کا گھر بے وہ آپ کی بیٹی کا، پلینز مجھے میری بانی کا شرف بخش  
دیں اور ایمان کی طرف سے بے فکر ہو جائیں مجھے اللہ پر  
پورا یقین ہے وہ بہت جلد ٹھیک کر دے گا اسے آپ کا دکھ  
مجھ سے الگ نہیں ہے اور اپنے نواسے سے بھی تو ملنا چاہیے  
آپ کو، زارون ایمان اور میرا بیٹا۔“ آخری فقرہ اس نے  
مسکرا کر کہا تھا۔ بابا سائیں نے چونک کر پہلے لاریب کو  
پھر اسے دیکھا تھا جس کے چہرے پر اس دوران پہلی بار  
روشنی سی پھوٹی تھی۔

”ہمیں چلنا چاہیے باباجان زارون سے ملنا چاہیے۔“  
بھگی آ نکھیں پونچھتی ہوئی وہ باصرار انداز میں گویا تھی کچھ  
دیر ٹل کی بذیلی کیفیت اب تبدیل ہو چکی تھی اس کے  
چہرے پر خفیہ سی شرمندگی کا تاثر اس کے چہرے کو نکھار  
بخش رہا تھا۔

”آئی ایم ساری شرجیل بھائی مجھے اس طرح نہیں کہنا  
چاہیے تھا، غصے میں مجھے..... آپ ٹھیک کہتے ہیں ہمارا دکھ  
سا بھجھا ہے۔“

جب وہ گاڑی میں بیٹھ رہے تھے لاریب نے اچانک  
شرجیل کو مخاطب کر لیا تھا اس کے لہجے میں اپنی جذباتیت  
میں سرزد ہونے والی حرکت پر شرمندگی کا گہرا تاثر تھا۔  
”اُس کے، ایک اٹ ایزی۔“ شرجیل کے انداز میں  
بڑے بھائیوں والی مخصوص رواداری تھی۔



”تمہیں پتا ہے آج میں نے کیا کارنامہ سرانجام دیا؟“  
سکندر کام میں مصروف تھا جب فراز نے اس کے کہیں کا  
دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

”میں مصروف ہوں مجھے اس سے بھی کوئی غرض نہیں  
کہ تم کیا جھک مارتے پھرتے ہو۔ خبردار جو تم نے یہ کہا مجھ  
سے، میں تمہارا محسن ہوں یاد رہے۔“ سکندر نے جب  
اسے جواب دے بنا اپنا کام جاری رکھا تو فراز آ کر اس کی  
کرسی کے تھے پر نکلتا ہوا جیسے اسے چھپنے کو بولا۔ سکندر  
ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا۔ جانتا تھا اب وہ کسی صورت بھی



”نہیں تم بالکل درست کہہ رہے ہو فراز۔“ وہ شکستہ اور نڈھال لگنے لگا تھا فراز کی اس کوتاہی آنکھوں میں اضطراب دوڑا۔

”بکومت سکندر ایسا فضول مت سوچا کرو۔“

”تمہیں یہ سب اس نے بتایا؟“ سکندر نے اسی کیفیت کے زیر اثر سوال کیا یوں جیسے اسی سوال کے جواب سے اپنی حیثیت اپنے مرتبے اور کم دغوی کا حساب طے کرے گا۔

”نہیں تمہارے گم صم انداز سے قیاس کیا تھا جو سو فیصد درست نکلا میں نے اس روز جھوٹ بولا تھا بھابی سے ان سے کا نام میں پوچھ چکا تھا۔“ اور سکندر کے چہرے پر لڑتے سائے جیسے ٹھہر گئے تھے اب وہاں مستقل تاریکی کا راج تھا ایک بار پھر بار اور شگفتگی اس کے حصے میں آ چکی تھی۔ وہ اب جانے کئی دیر تک بول نہیں سکتا تھا۔

”میں نے انہیں تمہارے متعلق بھی کچھ نہیں بتایا۔ لیکن اب سوچ رہا ہوں بتا دوں۔“

”تم ایسا کچھ بھی نہیں کرو گے فراز، میں کہہ رہا ہوں۔“ اس نے طیش کے عالم میں کہتے ہاتھ مار کر مہیتی اور نفیس الیش ٹرے میز سے نیچے گرا دی۔ فراز اس کا اشتعال دیکھتا رہا گیا۔

”کام ڈاؤن سکندر تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا یار، ریلیکس۔“ فراز نے اس کا کانڈھا تھپک کر نرمی سے سمجھانا چاہا۔ سکندر ہونٹ بھینچنے سرخ چہرے کے ساتھ دوسری سمت دیکھتا رہا۔ جیسے اپنے کھولتے دل دو ماغ پر قابو پانے کی سعی میں مصروف ہو۔



”صاحب.....!“ عباس گاڑی لاک کر کے پلٹا ہی تھا کہ ملازمہ کے پکارنے پر رک کر اسے دیکھنے لگا۔

”صاحب فاطمہ بی بی کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی ہے پلینز انہیں آ کر دیکھیں۔“ ملازمہ گھرائی ہوئی لگتی تھی عباس نے الچہ کر اسے دیکھا پھر سوال کا ارادہ موقوف کرتا اس کے ساتھ بچوں کے کمرے میں چلا آیا وہیں

اصلاح رد کردی تھی۔

”مجھے وہ وقت مناسب نہیں لگا تھا میں اب کسی بھی وقت ان سے الگ جا کر ملوں گا انہیں سمجھاؤ گا۔“

”تمہیں انٹیلی جنس سرمز میں ہونا چاہیے تھا۔ خوب نام کما تے۔“ سکندر نے تبصرہ کیا تو فراز ہاتھ جھڑا تانٹھ کھڑا ہوا۔ پھر کسی خیال کے لئے پریک دم مسکرانے لگا۔

”وہ پری دیش بھی ساتھ تھی آج سفید لباس میں تھی یار مجھے لگتا ہے تمام کلرز بنے ہی اس کے لیے ہیں جس رنگ کو پہن لیتی ہے جیسے خود پرناز کرنے لگتا ہے کوئی اتنا حسین کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟“ یہ تعریفی و توصیفی جملہ وہ بھی فراز کی زبانی سکندر کو ہتھوڑے کی ضرب بن کر لگے چہرہ تمام تر ضبط کے باوجود سرخ پڑ گیا۔

”شیم آں یو آل ریڈی شادی شدہ ہو تم۔“ وہ کسی طرح بھی خود کو اسے چھکارنے سے باز نہ رکھ سکا۔ فراز کو پردہ ای کہاں بھی بے شرمی سے دانت نکالتا رہا۔

”افوہ..... کیا شادی شدہ مرد کسی حسین ترین لڑکی کی تعریف نہیں کر سکتے؟“ اس نے اس کا جھنجھایا ہوا چہرہ دیکھتا لطف اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”تم جاؤ اب..... مجھے کام کرتا ہے اور سنو..... آئندہ اسے ایسی ویسی نظر سے دیکھنے کی ضرورت نہیں وہ بھی شادی شدہ ہے۔“ بے حد رکھائی سے کہتا وہ اپنے آگے دھری فائل کھول چکا تھا مگر فراز اسے ٹھک کے رکھ گیا۔

”یہ بات میں بھی جانتا ہوں آل ریڈی۔“ سکندر نے بے ساختہ نظر اٹھائی۔ فراز اس کی جانب متوجہ تھا نگاہ چار ہونے پر خوب صورتی سے مسکرایا تھا۔

”مجھے لاریب سکندر حیات سے مل کر بہت اچھا لگا تھا اس دن وہ واقعی اس قابل ہیں کہ اس کو عزت دی جائے مگر شاید وہ تم جیسا گھونچو ڈیز رو نہیں کرتی تھیں۔“ اس کے انداز سے پھلتی شرارت کے باوجود سکندر ہنسی و قہر گہیا تھا۔ اس آخری بات پر طیش میں آتا اس پر گھونسا تان گیا فراز نے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر نیچے کیا۔

”مذاق کر رہا تھا یار۔“



کرنا پڑے گا۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھیں سر پر، دماغ پر اثر ہے بخار کا انہیں کسی شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہونا پڑا ہے؟“ ڈاکٹر صاحب ہدایات دینے کے بعد سوال کر رہے تھے عباس کے ذہن میں کھٹ سے وہ لمحے روشن ہوئے جب وہ اس پر فرد جرم عائد کر رہا تھا اور فاطمہ کا زندگی کے احساس سے روشن نگہ کا چہرہ اتار بیکیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

”شاید..... میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ اس نے جس بے اعتنائی سے کاٹھ جھٹکے تھے اس انداز کو ڈاکٹر صاحب نے چشمے کی اوٹ سے بالخصوص دیکھا اور محسوس کیا تھا۔

”آپ شوہر ہیں ان کے عباس حیدر صاحب آپ کو خبر تو ہوئی چاہیے یہ میڈیسن منگالیں اور کوشش کیجیے گا انہیں ہر قسم کی ذہنی اذیت اور دباؤ سے محفوظ رکھ سکیں اور ہاں اگر ان دواؤں کے استعمال سے بھی ان کی حالت میں بہتری نہ آئی تو انہیں لازمی اسپتال ایڈمٹ کر انہیں اوکے؟“ ڈاکٹر نے اپنی تاکید کو پھر سے دہرایا اور بیگ اٹھا کر تشریف لے گئے۔ عباس نے تنفر بھرے انداز میں ان کا تھمایا نسخہ سائیز پر پھینک دیا۔

”مجھے افسوس ہے کہ مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں مجھے تمہاری سوکالذ محبت سے نفرت ہے اگر تم میرا جوگی تو ڈونٹ وری میں اپنے بچوں کے لیے دوسری گورنس ہائر کر لوں گا۔ آخر تمہاری وجہ سے ہی میں نے اپنی عریض کو بکھوایا ہے۔ عریض جو میری محبت تھی میری زندگی کی ہر خوشی تھی۔ مجھے تم سے کبھی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔“

وہ پراگندہ ذہن کے ساتھ پراگندہ سوچیں لیے باہر نکل گیا۔ اس بات کی پروا کیے بنا کہ فاطمہ کی مدہم ہونی سانسیں ہر لمحہ ڈھکی جا رہی ہیں۔

(جاری ہے)



فاطمہ کا اب بھی قیام ہوتا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ فاطمہ کو ہاتھ چہرہ چھوڑے، بستر پر بے سدھ ہے خبر پڑے کچھ کہہ چوکنے لگی نہیں رہ سکا۔ وہ سیاہ لباس میں تھی ماند پڑی رنگت، آنکھوں تلے گہرے ہوتے حلقے، وہ ان دو دونوں میں ہی جیسے آدھی رہ گئی تھی۔ اس آخری لمحوں کے بعد عباس نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ اسے اس کو دیکھنے کی خواہش بھی نہیں تھی۔ اس کے نزدیک اس کی حیثیت و اہمیت آج بھی اپنے بچوں کی گورنس سے بڑھ کر نہیں تھی۔

”بی بی صاحبہ کو دو دن سے بخار ہے مگر یہ دوا نہیں لیتی، ابھی بھی بخار بہت تیز ہے۔“ ملازمہ اے تیں اسے ہوش میں لانے کی تدابیر کرتے ہوئے فاطمہ کے ہاتھ سہلا رہی تھی مگر وہ تو یوں لٹی ہوئی تھی جیسے اب کبھی اٹھنے کا ارادہ نہ ہو۔

”پاپا..... ماما کو کیا ہوا؟“ اسامہ جو فاطمہ کی حالت کی بدولت وہیں بیڈ پر دوکا ہوا تھا اس سے لپٹ کر سہا ہوا بولا۔

عباس نے کوفت زدہ نظر فاطمہ پر ڈال کر اسامہ کو گود میں لے لیا۔

”کچھ نہیں بیٹے ابھی ٹھیک ہو جائیں گی۔“ پھر خشمگیں نظروں سے ملازمہ کو دیکھتے پچاس کے حوالے کیا۔

”آپ بچوں کو دوسرے کمرے میں لے کر جائیں کچھ خیال ہے کتنے پریشان ہو رہے ہیں یہ؟“ اس نے ملازمہ کو ڈانٹا ضروری سمجھا تھا۔ پھر کوئی کی جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے ایک بار کوفت سے بھری ہوئی نظروں سے فاطمہ کو دیکھا اور ڈاکٹر کا نمبر ملائے لگا۔ ڈاکٹر کو گھر بلا کے بھی وہیں بیٹھ گیا۔

(یہ بھی یقیناً تمہارا کوئی ڈرامہ ہوگا مگر تم کچھ بھی کرلو مجھے متاثر نہیں کر سکتیں) فاطمہ کے زردیاں چھلکاتے چہرے پر قہر آلود نظروں کو جمائے اس کی سوچوں میں بھی آگ لگی ہوئی تھی۔

”نمبر بچہ بہت ہائی ہے میں آنکشن دے رہا ہوں اس سے انہیں ایک گھنٹے تک افادہ نہ ہوا تو اسپتال میں ایڈمٹ



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

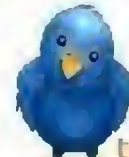
**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

محکم دلائل سے مزین



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY



تو کہ سمٹا تو رگ و جاں کی حدوں میں سمٹا  
میں بکھرا تو سمٹا نہ گیا تیرے بعد

یہ الگ بات ہے کہ افشا نہ ہوا تجھ پہ ورنہ  
کتنا محسوس کیا میں نے تجھے تیرے بعد

### گزشتہ قسط کا خلاصہ

حویلی میں لاریب سے سامنا ہونے پر عباس اپنے گزشتہ رویوں کی معافی مانگتا ہے جس پر لاریب اس کی دوسری شادی کی مبارک باد دیتے اسے حیران کر دیتی ہے۔ اس کے منہ سے یہ حقیقت جان کر عباس بوکھلا جاتا ہے کہ کہیں وہ فاطمہ کے متعلق باقی گھر والوں کو بھی آگاہ نہ کر دے۔ فراز کا تنفر سے بھرپور انداز اریبہ کو اذیت میں مبتلا کیے رکھتا ہے۔ فراز کے رویوں سے مایوس ہوتے وہ خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہے اس کے اس اقدام پر فراز مزید خائف ہو جاتا ہے جب ہی اریبہ اسے اپنے جذبات کی صداقت سے آگاہ کرتے گزشتہ رویوں کی معافی مانگ لیتی ہے اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرتی ہے۔ فاطمہ اور زینب کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو عباس سن لیتا ہے اور یہ اندازہ لگاتا ہے کہ فاطمہ کے حاسدانہ رویوں کے سبب ہی عریضہ زندگی کی بازی ہار گئی جبکہ فاطمہ ان الزامات پر ششدر رہ جاتی ہے۔ لاریب ایمان کی تلاش میں علوی ہاؤس پہنچتی ہے وہاں فراز سے سامنا ہونے پر وہ شرجیل کے متعلق استفسار کرتی ہے۔ دوسری طرف فراز یہ جان کر حیران رہ جاتا ہے کہ وہ ایمان کی بہن اور سکندر کی بیوی ہے وہ اسے تمام معلومات سے آگاہ کرتا ہے ایمان کے کوسے میں جانے کی خبر سن کر لاریب اپنا ضبط کھو بیٹھتی ہے۔ دوسری طرف سکندر نہ صرف لاریب کو علوی ہاؤس کے گیٹ پر دیکھ لیتا ہے بلکہ اسے فراز کے ساتھ جاتے دیکھ کر شدید صدمے کا شکار ہوتا ہے کہ وہ

(اب آگے پڑھیے)

وہ زینب کے گلے لگ کر رو رہی تھی زینب پریشان ہو کر اسے جب کرانے کے جتن کر رہی تھی۔ زینب کی آنکھیں بھی پھٹکنے لگی تھیں۔ ایسے شدتوں سے ٹوٹ کر وہ تب ہی روئی تھی جب عباس حیدر کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور وہ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔

”یوں بلکان مت ہو، کچھ تو بتاؤ ہوا کیا ہے؟“ زینب نے اس کا سر پھٹکتے ہوئے پیار بھرے انداز میں آنسو پونچھے۔

”مجھے لگ رہا ہے میں ہار گئی ہوں زینی، ان کا شک مجھے ہر لمحہ موت کے قریب لے جا رہا ہے۔“ وہ رقت آمیز لہجے میں بولی۔

”کیسا شک فاطمہ؟“ زینب پریشان ہوئی۔

”وہ مجھے عریضہ کا قاتل سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ میں نے ان کی خوشیوں کو غاصبانہ نظر سے دیکھا ہے وہ بہت زیادہ خفا ہیں مجھ سے زینب، مجھے وہ اپنی اسی ناراضگی سے مار دیں گے۔ میں ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی مگر میرا نصیب دیکھو میں نے انہیں زار و قطار روٹے اور تڑپتے دیکھا ہے، کاش عریضہ کی جگہ میں مر گئی ہوتی۔“ وہ ایک بار پھر ہلک رہی تھی، زینب کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس پانچل لڑکی کو کیسے سمجھائے۔

”تمہیں ایک بار کھل کر ساری بات عباس کو بتانی چاہیے فاطمہ، خاص طور پر یہ کہ تم اس کی خوشیوں کی دشمن کبھی نہیں رہی۔ تم اسے بتاؤ کہ تم اس کی خیر خواہ ہو اس کے بچوں کو روکنے نہیں دیکھ سکتیں اور اس وقت ان کی ذمہ داری قبول کی تھی جب ان کے خونی رشتے بھی منہ موڑ چکے تھے۔“ زینب کو غصہ نہیں آتا تھا یا فاطمہ نے اسے کبھی غصے میں نہیں دیکھا تھا مگر اس بل وہ جھنجھلائی ہوئی تھی اسے عباس جیسے میچور آدمی پر غصہ تھا مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ فاطمہ کی طرح عباس بھی اسیر محبت تھا۔ محبت بھی وہ جو کھو گئی تھی یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں اچھے بھلے ہوش مند انسان بھی حواس کھو بیٹھتے ہیں۔

فاطمہ اس کی بات سن کر جیسے سناٹے میں گھر گئی۔

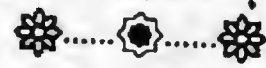
”یہ تو سراسر احسان جتلانے والی بات ہوئی زینب اور محبتوں میں احسان نہیں ہوتے، پھر اگر سچائی سے تجزیہ کیا جائے تو میں نے نہ عباس پر احسان کیا تھا نہ ہی بچوں پر میں نے درحقیقت خود پر احسان کیا تھا خود کو خوشی دی تھی۔ عباس سے وابستہ ہر چیز ہر رشتہ میرے لیے قابل محبت قابل احترام ہی تو ہے۔“ اس کے لہجے میں ایک جذب تھا ایک عقیدت مندانہ خوشبو بھرا احساس جو اتنا اثر پذیر تھا کہ سامنے والے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ پھر عباس

پراثر کیوں نہ ہوا؟

”چلو مانا پہلے کی بات اور تھی مگر فاطمہ تمہیں اب ضرور عباس کو اپنی شدتیں بتلا دینی چاہیے اور کچھ نہیں تو وہ تمہیں غلط سمجھتا تو چھوڑ ہی دیں گے نا۔“ فاطمہ اس کی بات پر دل سوز انداز میں مسکرا دی۔

”میرے نزدیک یہ میری محبت کی شان میں گستاخی ہوگی زینب کہ میں اسے آشکار کر کے اس کا بدل مانگوں، میں ایسا نہیں کر سکتی زینی اس لیے بھی کہ مجھ ان کے ہراس احساس سے محبت ہے جو پوری سچائی سے خالصتا میرے لیے ان کی زبان اور آنکھوں سے نکل کر مجھ تک پہنچتا ہے اور ایسا بھی تو ممکن ہے نا کہ میں انہیں سب کچھ بتاؤں اور وہ یقین نہ کریں۔ میری محبت مجھے اپنی اس بے حرمتی پر بھی معاف نہیں کرے گی کہ میں نے نفس کو اس عبادت میں شامل کرنے کی جرأت کی۔“ اس کا انداز ہنوز درویشانہ تھا اور زینب گنگ ہوئی اس کے چہرے کو دیکھتی رہ گئی۔

عباس دروازے کے باہر ہی ٹھٹھک گیا مگر یہ لمحاتی تاثر تھا اگلے لمحے وہ پھر اسی متغیر انداز میں سر جھٹک چکا تھا اس کے خیال میں یہ بھی فاطمہ کی سازش تھی محض اسے متاثر کرنے کی سازش، اس کا خیال تھا کہ وہ اسے دروازے کے پار دیکھ چکی ہے جیسی جذباتی ڈائلاگ بول رہی تھی۔



فراز گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا جب اس کا سیل فون مخصوص ٹون کے ساتھ گنگنا یا اس کے لبوں پر مسکان پھیر گئی۔ نمبر دیکھے بنا وہ جان سکتا تھا کہ فون کرنے والی اریبہ ہے۔ اس نے اسٹیرنگ سے ہاتھ اٹھا کر کوٹ کی جیب سے فون نکالا۔ ”جی جناب، خیریت ہمارے بغیر دل نہیں لگ رہا؟“ اس کا لہجہ شوخ و شنگ اور کھٹک دار تھا۔ اریبہ کی جانب سے غلط فہمی کی آخری پھانس جو انکی رہ گئی تھی وہ بھی خود بخود نکل گئی ہرگز رتا دن ثابت کر رہا تھا کہ اریبہ اس سے جھوٹ نہیں بولا رہی۔ اس کا محبت بھرا انداز اور چہرے پر فراز کی قربت میں پھونٹنے والی الوہی چمک بتاتی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے یہی یقین فراز کی آسودگی کا باعث تھا۔

آنجل

249

اکتوبر 2014

آنجل

248

اکتوبر 2014



”آپ اس وقت گھر آ سکتے ہیں مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ اریبہ سنجیدہ تھی۔

”نہیں یار اس وقت تو بالکل نہیں سکندر کے گھر جا رہا ہوں تمہیں پتا تو ہے اس نے گھر کی تمام ذمہ داری مجھے سونپی ہوئی ہے راجہ اندر صاحب اب جلدی میں ہیں بیوی لانے کو اس لیے دن رات ایک کروا رکھا ہے اس کے بعد ایک اور بہت اہم کام ہے مجھے۔“ اس کی تفصیلات کے جواب میں اریبہ نے ٹھنڈا سا سانس بھرا تو فراز کو شرارت سوچھی۔

”تم بے فکر رہو رات کو ناٹم برآ جاؤں گا تم سے زیادہ مجھے بے چینی ہوتی ہے تمہیں دیکھنے کی۔“ اس کے بہکے ہوئے شونخ انداز پر اریبہ شرمائی۔

”ٹھیک ہے پھر اب رات کو ہی ملاقات ہوگی۔“

”ارے، ارے..... رے سنو تو یار فون پر کر لو اگر اتنی ضروری بات ہے۔“ فراز نے بے اختیار ٹوکا تو اریبہ نے ہنستے ہوئے انکار کر دیا۔

”یہ فون پر کرنی والی بات نہیں ہے۔“

”کہیں تم مجھے پانچنے کی خوشخبری تو نہیں سنانا چاہ رہی ہو؟“ اس کے قطعی انداز پر فراز کو پھر شرارت سوچھی تو اریبہ جھینپتی ہوئی رابطہ منقطع کر گئی۔

فراز نے موبائل ڈیش بورڈ پر رکھا ہی تھا کہ سکندر کی کال آ گئی اس نے کال ریسیو کی۔

”تم ابھی تک آفس کیوں نہیں پہنچے فراز، پتا بھی ہے کہ کتنی اہم میٹنگ ہے بارہ بجے، چاچو اور تاؤ جی ایسے مواقع پر ایسے چپ سادہ لیتے ہیں کہ جیسے میری صلاحیتوں کی کمزوریوں کو لوگوں کے سامنے آشکارا کر کے انہیں مجھ پر ہنسنے کا موقع دینا چاہتے ہوں۔“ سکندر نے بے حد خفگی اور سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔

”میں آ رہا ہوں، مگر سن اب میرا سہارا لینا چھوڑ دے سمجھا، تیری طرح میں نے بھی امیر ترین بننے کا سوچ لیا ہے تیرے لیے ناٹم نکالنا مشکل ہو گا اب۔“ اس نے مسکرا کر کہتے رابطہ منقطع کر دیا۔

پندرہ منٹ کی مزید ڈائیونگ کے بعد وہ مطلوبہ

اپارٹمنٹس کی بلند بلڈنگ کے سامنے کھڑا تھا گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے وہ تیز قدموں سے چلتا لفٹ تک آیا اور مطلوبہ فلور کا بٹن دبا کر لفٹ میں داخل ہو گیا جس وقت وہ فلیٹ کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا اس کا دل بہت تیز دھڑکن شروع ہو گیا۔

شرجیل بھائی مجھ کو کچھ کر ساری ایکٹ کریں گے؟ اس نے مسکرا کر تصور کرنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی بند دروازہ کھل گیا فراز اپنے سامنے موجود شخصیت کو دیکھ کر حیران پریشان یہ سوچنے پر مجبور ہوا تھا کہیں وہ غلط جگہ نہیں آ گیا؟

اس نے گود میں سوئے زارون کو جھک کر پیار کیا تو آنکھوں میں اترے آنسو بے تابی سے لپک کر اس ننھے فرشتے کے گلاب جیسے گال بھگو گئے۔ وہ لوگ شرجیل کے بے پناہ اصرار کے باوجود وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرے تھے۔ واپسی کے وقت لاریب نے جانے کس جذبے سے مجبور ہو کر زارون کو سمعیہ کی گود سے لیتے ہوئے ایک بار پھر بے تحاشہ پیار کرتے ہوئے اچانک اور بے اختیاری کی کیفیت میں شرجیل سے اسے ساتھ لے جانے کی فرمائش کر دی تھی تب امامہ نے بھی فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”آپ فکر نہ کریں شرجیل بھائی ہم اسے بہت اچھے طریقے سے سنبھال لیں گے۔“ شرجیل مدہم سا مسکرا دیا تھا۔

”یہ بات نہیں ہے، میں تو یہ سوچ کر اللہ کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ ایک وقت تھا جب میرے بیٹے کے پاس توجہ و محبت کی بہت کمی تھی اور یہ جیسے لاوراٹ ہو گیا تھا مگر اب..... میں سمعیہ کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔“ وہ بے حد ممنون نظر آ رہا تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں شرجی بھائی اللہ نے جس طرح ہمارے زارون کو باقی رشتوں سے نوازا ہے بالکل اسی طرح اس کی ماما کی گود بھی اسے نصیب فرما دے گا اور زارون کو جانے دیں پلیز، ان رشتوں کا بھی بہت حق ہے اس پر۔“ سمعیہ کے کہنے پر امامہ کے رکتے ہوئے آنسو پھر

سہنے لگے۔ شرجیل نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔

”آپ کو پتا ہے گڑیا، ایمان سب سے زیادہ آپ کو یاد کرتی تھی۔ آپ کے لیے فکر مند ہوا کرتی تھی بابا جان اس نے وہ قدم میرے مجبور کرنے پر اٹھایا تھا میں نے اس کے پاس کوئی راستہ چھوڑا ہی نہیں تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ آپ سے بچھڑ کر کبھی خوش بھی نہیں رہ سکی۔“ شرجیل تمام تر حوصلے کے باوجود ان کمزور لمحوں میں بار بار بکھر رہا تھا۔

لاریب کو اس کی محبت اس کی وفا پر ذرہ برابر بھی شبہ نہیں رہا ماری کہانی جان لینے کے بعد وہ دل میں اس کے لیے بہت احترام محسوس کر رہی تھی کہ حالات کی نزاکتوں کے باوجود اس نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ اس لڑکی کو تحفظ بھی دیا تھا اور ایمان کے ساتھ وفاداری بھی نبھائی۔

”ہم زارون کو لے جا رہے ہیں بھائی، ساتھ میں سمعیہ بھی چلیں گی کیونکہ وہ اپنی اسی بوا کا عادی ہے اس بہانے آپ اور ابراہیم بھائی بھی ہمارے یہاں چکر لگائیں گے کیوں بابا جان؟“ لاریب نے اس دوران پہلی بار گفتگو میں شامل ہو کر فیصلہ بھی صادر کر دیا جس کا خیر مقدم کرتے ہوئے شرجیل کے ساتھ سمعیہ اور ابراہیم احمد بھی مسکراتے لگے۔

”یہ سو گیا ہے لاریب، اسے لٹا دیں ورنہ اس کی نیند خراب ہو جائے گی۔“ سمعیہ تو لیے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی بولی لاریب نے اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔

”جائے پیوگی سمعیہ، میں خود بنانے جا رہی ہوں بہت آئیٹل قسم کی۔“ لاریب نے زارون کو لٹانے کے بعد اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ لاکھ کوشش کرتی خود کو فریش ظاہر کرنے کی مگر ایمان کے حوالے سے خدشات اسے گہری لیت سے نکلنے نہیں دیتے تھے۔ صرف اس کے ہی نہیں مللاور بابا جان کے بھی جسدِ سوزا ہونے لگے تھے۔

”میں چائے بنا لائی ہوں، بس آ جائیں آپ لہی۔“ امامہ ٹرے اٹھائے اندھا ٹی، اس کی ہیکلی پلکیں بھی مٹا کر یہی گواہ تھیں۔

وہ لاریب اور بابا سائیں سے کہیں زیادہ اپ سیٹ تھی

وقاص اسے لینے آیا تو اس نے بے حد لجاجت آمیز انداز میں اس سے مزید یہاں ٹھہرنے کی اجازت مانگی۔

”مجھے کسی بھی لمحے سکون نہیں ہے وقاص میں وہاں جا کر بھی آپ کو پریشان کرتی رہوں گی آپ پلیز مجھے کچھ دن مزید یہاں رکھنے دیں اور دعا کیجیے گا کہ باجو جلد ٹھیک ہو جائیں۔“

اب وہ ہر دل کی بات بلا جھجک اس سے کہہ دیا کرتی تھی وجہ وقاص کی سر تا پا تبدیلی تھی۔ وہ ان زیادتیوں کی حطائی میں ہر دم کوشاں رہتا تھا جو اس نے کبھی امامہ سے روا رکھی تھیں۔

”جب باجو ٹھیک ہو جائیں گی تو میں ان سے لڑائی ضرور کروں گی اس بات پر کہ بچو نے اگر میری بیٹی کو پیار کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تو اس کی وجہ انہی کا بیٹا بنا ہے اور یہ بھی دیکھیے گا میں باجو سے ان کا بیٹا بھی ان سے چھین لوں گی پتا ہے کسے، میں نور (امامہ کی بیٹی) کی شادی زارون سے طے کر دوں گی، ابھی جب شرجیل بھائی آئیں گے میں زارون کو رنگ پہنا کر باقاعدہ نسبت طے کر دوں گی۔“ لاریب کی آنکھیں بے اختیار بھٹکتی چلی گئیں وہ امامہ کی کیفیت کو سمجھتی تھی بہانے بہانے ایمان کا ذکر کر کے دل بہلائے رکھنا اور مستقبل کے حوالے سے سنہرے سپنے سجا کر دل کو ڈھارس دینا مقصد تھا۔

”سمعیہ آپ ہمیں باجو کی وہ باتیں بتائیں نا جہاں آپ کے ساتھ اکتھے رہتے وقت وہ آپ سے کرتی تھیں۔“ امامہ کہہ رہی تھی اور لاریب اس کی بے کلی دیوانگی کو دیکھتی ہوئی کچلنے لگی تھی۔ سمعیہ پھر سے وہی باتیں سن رہی تھی جو ان دونوں میں وہ لاتعداد بار ان کے سامنے دہرا چکی تھی۔

فاطمہ نے جھک کر اٹھا کر ایک نظر اپنے ہمسفر کو دیکھا۔ آج اسے اسپتال سے ڈسچارج کیا گیا تھا۔ جتنے دن وہ وہاں ایڈمٹ رہی وہ اگر وہاں آتا بھی تھا تو فاطمہ سے ملنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا تھا، ڈاکٹر یا نرسوں سے اسے پتا



چلتا وہ آیا تھا شاید اتنا تھا تھا اس سے کہ شکل دیکھنے کا بھی روا  
دار نہیں تھا۔

کئی بار تو فاطمہ کو یہ سوچ کر اپنی دھڑکن رکتی محسوس  
ہونے لگی تھی اگر اس نے اس مقام پر جدائی کا فیصلہ کر لیا تو  
کیا کرے گی وہ، اسے یاد تھا جب کبھی بار بار سے پچھلا اس کا  
اصل نام ساحر نہیں عباس حیدر ہے تو اس نے بے اختیار  
کی کیفیت میں زینب سے اس کے نام کا مطلب جاننا  
چاہا تھا۔

”یہ دونوں نام شیر کی کیفیات کو ہی واضح کرتے ہوئے  
مطلب رکھتے ہیں۔ عباس اور حیدر بھی انہیں کیفیات کو  
اجاگر کرتے ہیں۔“ زینب کے انداز میں دوستانہ شرارت کا  
رنگ تھا، فاطمہ کتنا جھینپ گئی تھی اس وقت۔

”تمہیں یقین ہے زینب وہ مجھے مل جائے گا۔“ وہ  
بہت جلد سنجیدہ ہو گئی۔ اس کا دامن اس پل بہت مضبوطی  
سے تھام لیا تھا۔

”ہاں کیوں نہیں، میں اللہ سے ہمیشہ بہت اچھی امید  
ہی رکھتی ہوں اور اللہ ہماری جائز خواہشات کو بھی رو نہیں  
کرتا لیکن اگر وہ نندے تو ہمیں اس کی رضا کو اپنی مرضی پر  
مقدم ضرور رکھنا چاہیے۔“ زینب نے اپنے دھمے پر تاثیر  
لہجے میں کہا تھا پھر اسے دیکھ کر مسکرائی۔

گاڑی کو زوردار جھٹکا لگا تب وہ مانی سے حال میں  
واپس لوٹی تھی اس کی نظر کھڑکی سے باہر گئی سگنل گرین  
ہو چکا تھا آگے پیچھے گاڑیوں کی طویل قطاریں تھیں فاطمہ  
نے ایک نظر اس غافل و بے نیاز مسافر پر ڈالی۔

”ہائے..... ساحر بھائی، میں فراز علوی کیسے ہیں  
آپ؟“ اسے اپنے خیالات سے چونکا نے کا باعث جو  
مردانہ آواز بنی تھی اس نے چونک کر اس کی سمت دیکھا۔  
عباس حیدر کی جانب کھڑکی پر جھکا وہ خوش پوش نوجوان  
کتنے والہاں انداز سے عباس سے مصافحہ کر رہا تھا۔

”مجھے لگتا ہے آپ نے پہچانا نہیں۔“ فراز اس گھبراتا  
سے یہی قیاس کر سکا تھا۔

”میں پہچان چکا ہوں فراز کیسے ہیں آپ؟“ وہ اپنے

خصوصی انداز میں گویا ہوا۔

”فٹ فاٹ، ہاے یون۔“ معاً اس کی نگاہ فاطمہ پر پڑی تو  
بیکدم پہچان کا مرحلہ طے کرتا کتنا حیران نظر آنے لگا تھا۔  
”اوہ..... مس نندنی، ہاؤ آر یو؟ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی  
آپ سے دوبارہ ملاقات ہو سکتی ہے وہ بھی ساحر بھائی کے  
ساتھ آپ تو ہم سے بھی پہلے وہ کام چھوڑ چکی تھیں نا؟“ وہ  
بے تکلفی سے ہنستا ہوا ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہا تھا۔

”میرا نام فاطمہ ہے، میں اسلام قبول کر چکی ہوں۔“ وہ  
اس پر وقار انداز میں گویا ہوئی جو کسی بھی غیر مرد سے بات  
کرتے ہوئے اس کے لہجے میں خصوصیت سے رکھائی  
کے احساس سمیت اتر آتا تھا۔

”ماشاء اللہ، بہت مبارک ہو آپ کو، آج کل کہاں  
ہوتی ہیں آپ؟“ فاطمہ نے اس سوال پر بے چین ہو کر  
عباس کی طرف دیکھا مگر وہ بے نیاز ہی نہیں بے مہر بھی نظر  
آ رہا تھا۔

اس نے جھکی پلکوں کے ساتھ گویا اس پل اپنے ساتھ  
اس شخص کا بھی بھرم رکھا تھا جسے شاید اس بات کی بھی پروا  
نہیں تھی۔

”سگنل کھل گیا ہے فراز ٹیک کیئر۔“ وہ بھاری آواز  
میں بولا تب فراز ہڑبڑا کر سیدھا ہوا اور بہت عجلت میں  
دونوں کو دوش کیا تھا۔

”میں جانتا ہوں بہت شوق ہے تمہیں اس رشتے کی  
تشہیر کا مگر سنو، میں پسند نہیں کرتا اس بات کو، سو بی کیئر فل  
او کے۔“ اس کا لہجہ خوفناک حد تک روکھا تھا۔

”رشتوں کے تقدس کو پامال ہونے سے بچانے کو  
انہیں نام اور پہچان دینا از حد ضروری ہوا کرتا ہے عباس،  
ایک لڑکی ہونے کی حیثیت سے معاشرے میں میری  
پوزیشن کو مستحکم اور کلیئر رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے میں  
آپ سے بس ایک یہی تقاضا کرتی ہوں پلیز اس سے  
محروم نہ کریں مجھے۔“ اس نے جیسے عباس کی منت کی۔

”شٹ اپ، اب تم سبق پڑھاؤ گی مجھے؟“ وہ غریبا تو  
فاطمہ ہم کردہ گئی۔



”سمجھنے کی کوشش کر، ضد نہ کر میرے بھائی۔“ فراز  
سکندر کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر بیٹھا تھا مگر وہ بے  
اعتنائی سے اپنے کام میں محو رہا گویا اپنے کہے سے دستبردار  
ہونے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس کا گھر مکمل ہو چکا تھا سکندر آج  
دفینک کا ارادہ رکھتا تھا مگر اکیلا نہیں نیل اور فراز کے  
ساتھ۔ نیل کو تو خبر نہیں تھی البتہ فراز ضرور سکندر کو سمجھا  
سمجھا کر عاجز ہو گیا تھا تب سکندر نے کہا۔

”میں یہ گھر اس گھر کے دیگر کینوں کے لیے چھوڑ رہا  
ہوں مگر تم اور نیل ہی نہیں شرجیل بھائی بھی میرے ساتھ  
ہی رہیں گے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو فراز، میں رشتوں کو  
ترسا ہوا انسان ہوں ان محبتوں کو خاص طور پر کھوتا نہیں  
چاہتا جن کے اخلاص پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔“ اس پل وہ کتنا  
عاجز کتنا ٹوٹا ہوا لگنے لگا تھا۔

”اور جو تمہاری محباجوں والی بیوی کو تمہارا یہ اقدام پسند  
نہیں آیا اور انہوں نے اگر ہمیں ہمارے سامان سمیت اٹھا  
کر باہر پھینک دیا تو کتنی تو ہین ہوگی یار اندازہ تو کر۔“ اس کا  
احتجاجی رنگ لیے مصنوعی لہجہ اور غیر سنجیدہ انداز صاف لگ  
رہا تھا وہ بات مذاق میں اڑانا چاہ رہا ہے سکندر کے چہرے  
کے زاویے پھر بگڑنے لگے۔

”اسے میں اتنی جرات نہیں دوں گا کہ وہ میرے سر پر  
چڑھے۔“ اس کا لہجہ غضب کی نچی سموئے ہوئے تھا۔

”کیا ہو گیا ہے تجھے، اتنا غصہ کیوں کرنے لگا ہے؟“  
فراز نے پریشان کن نظروں سے اس کی شکل دیکھی۔

”تم بس مجھے یہ بتاؤ آج میرے ساتھ شفٹ ہو رہے  
ہو یا نہیں۔“ اس کے تیوں نوز تھے۔

”ٹھیک ہے جیسے تیری مرضی۔“ فراز کو شکست تسلیم  
کرنی پڑی۔

”محببتوں میں احسان نہیں ہوا کرتا فراز، یہ میری خواہش  
ہے اسے پورا کرو، چند سال بعد تم لوگ بے شک الگ  
ہو جانا کمپنی کی طرف سے تمہیں گھر اور گاڑیاں تو ملیں گی نا،  
اگر تم سمجھتے ہو تمہاری عزت نفس مجروح ہوئی ہے تو.....؟“

رنگارنگ کہانیوں کے آراستہ دلچسپ جریہ

AANCHALPK.COM

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے



نیل

درا کو بیکر کرنے والی اکیلی لکھنؤ، بچانے  
والے اوت کے قاتل کے حوالے ہونے والی سندھ تحریک

دید بان

عالی سائنس کے سب سے منظر میں مین پرستوں کے  
لیے بطور خاص ہر شہری ارشد کا ایک دلچسپ ناول

بلیٹ سکندر

ملاح کے سفوح میں مخمور سرزمین پنجاب کی لمبی  
دلگداز داستان جو کلاںک داستانوں میں شمار ہوتی ہے

AANCHALNOVEL.COM

قارئین کی دلچسپی کیلئے خوبصورت سلسلے

خوشبو بخشنے والی غزلیں، نظمیں۔ ذوق آگاہی اقتباسات  
اقوال زریں احادیث وغیرہ معروف دینی اسکالر حافظ

شمیر احمد سے اپنے دنیاوی مسائل کا حل جلیے

پیشہ کی صورت میں رجحان (2/35620771-021)

انجیل

253

اکتوبر 2014

252

اکتوبر 2014

انجیل



”ایسا کچھ مت سوچو سکندر، مجھے تمہاری محبت تمہارے اخلاص پر شک و شبہ نہیں ہے۔“ فراز کے متانت سے کہنے پر سکندر شکرانہ نظروں سے اسے نکلتا آگے بڑھ کر اسے گلے لگا چکا تھا۔

”یار میرے پاس تمہیں دینے کو بہت اہم خبریں تھیں تم نے اپنا رول ڈال کر دھیان ہی بنا دیا۔“ وہ پھر سے اپنے موڈ میں آچکا تھا سکندر نے اسے گھورا تو فراز ہنستا چلا گیا۔ ”تمہیں پتا ہے پرسوں میں کس سے ملا تھا؟“ اس نے چمکتی نظروں سے اسے دیکھا تو سکندر نے بے اعتنائی کے مظاہرے سمیت کانڈھکا۔

”شرجیل بھائی سے رٹلی امیرنگ سکندر وہ تو بالکل بدل گئے ہیں اور ایسا اللہ جانے ایسی بھائی کی وجہ سے ہوا ہے یا پھر ابراہیم بھائی کی قربت کا شاخسانہ ہے۔“ ”ایک منٹ..... ابراہیم صاحب کون؟“ سکندر نے اسے بے اختیار ٹوکا۔

”ابراہیم احمد سمعیہ کے ہزبینڈ ہیں سمعیہ ہماری وہی کزن یار جسے شرجی بھائی یہاں سے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ تمہیں پتا ہے ابراہیم صاحب فارز تھے اسلام قبول کیا ہے انہوں نے مگر یار وہ ایسے کامل مسلمان ہیں کہ انہیں دیکھ کر ہمارا ایمان تازہ ہو جائے، مجھے تھوڑی ہی دیر میں انہوں نے ایسی باتیں بتائیں کہ میرا پھر ان سے ملنے کو دل کر رہا ہے۔“ وہ بے حد اشتیاق سے کہہ رہا تھا۔ ”ہاں تو پھر مل لیتا، شرجیل کا رویہ کیسا تھا تمہارے ساتھ؟“

”ہم دونوں میں ہمیشہ بہت بے تکلفی اور محبت رہی ہے سکندر، شرجیل بھائی کو نہ مجھ سے پہلے کبھی شکایت تھی نہ اب ہے لیکن وہ میرے ساتھ یہاں آنے پر آمادہ نہیں تھے۔“ فراز کے لہجے میں ڈھیروں ملال اتر آیا تھا۔

”ارے ہاں سکندر یاد آتا، یار وہ ایک لڑکی تھی ناں، جسے فلم میں میرے ساتھ ہیروئن بننا تھا۔“ سکندر کی نا فہم نظروں کے تاثر کو دیکھتا وہ نرمی سے جھنجھلایا۔

”یار وہی ہندو لڑکی، جس کا تمہیں بتایا تھا کہ بہت

خوبصورت لگتی تھی ساحر..... مطلب عباس بھائی کے ساتھ کل میں نے پھر اسے عباس بھائی کے ساتھ دیکھا ہے کس حیثیت سے.....؟“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر سکندر کا تاثر قائم کرتے ہوئے کھلکھلایا۔

”ان کی مسز کی حیثیت سے قسم سے یار میں تو بھونچکا ہی رہ گیا اس حسین اتفاقی پر تمہیں پتا ہے وہ مسلمان ہو چکی ہیں جب وہ شوٹ پر تھیں ہمارے ساتھ تب بھی کئی بار ایسا لگا تھا جیسے ان کی دلچسپی کسی کام میں نہیں ہیں عباس بھائی میں ہے، جب وہ انہیں دیکھتی تو باقی سب بھول جاتی تھیں.....!“

”تم سوئے نہیں اب تک، یہ لو دودھ پی لو۔“ بغیر دستک کے اندر گھسنے والی تائی ماں نے فراز کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی تھی مگر اگلے لمحے جب سکندر سے مخاطب ہوئی تو لہجے میں شیرینی کھل چکی تھی۔

”یار اس دودھ کو ضائع کر دیا کرو مجھے لگتا ہے تائی ماں اس میں کوئی تعویذ گھولتی ہیں تاکہ تم خود کہہ کر ان کی بیٹی سے عقد کر لو۔“ فراز نے سکندر کے کان میں گھس کر جتنے راز دارانہ انداز میں کہا تھا سکندر کے لیے مسکراہٹ مضبوط کرنا محال ہو گیا۔

”یہ لوگ کبھی تمہیں تمہاری حیثیت سمیت قبول نہ کرتے سکندر اگر تمہارے پاس اس ساری جائیداد کے اصل کاغذات نہ ہوتے۔“ اسے فراز کی بات یاد آتی تھی۔

”تم کیا ہر وقت یہاں گھسے رہتے ہو، جاؤ اپنے کمرے میں سکندر بیٹے سے کچھ بات کرنی ہے۔“ تائی ماں کا لہجہ فراز کے لیے خاصا ہتک آمیز تھا ان کا یہی انداز سکندر کو گراں گزرتا تھا۔

”ایسی کون سی بات ہے جو آپ میری موجودگی میں نہیں کر سکتیں؟“ اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا فراز نے خود ہی حساب بے باک کر دیا۔

”جو بھی ہو تمہیں اس سے کیا تم جاؤ۔“ تائی ماں کا لہجہ انداز خاصا بدید تھا۔

”فراز کہیں نہیں جائے گا تائی ماں، میری کوئی بات

فراز سے چھپی ہوئی نہیں ہے، آپ کہیے جو کہنا چاہتی ہیں۔“ سکندر کا لہجہ بڑھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں پھر کسی وقت بات کر لوں گی۔“ وہ خود اٹھ کھڑی ہوئیں تو فراز نے مسکراہٹ دبائی۔

”پھر شاید آپ کو یہ موقع نہ ملے تائی ماں دراصل سکندر نے اپنا دوسرا گھر لے لیا ہے یہ وہیں رہے گا اب۔“ اس اطلاع نے واقعی تائی ماں کا رنگ فق کر دیا۔

”کیوں بیٹے ہم سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے؟“ وہ یک دم بہت ہی ہراساں ہو گئی تھیں۔

”جی ہاں، کوتاہی تو ہوئی تھی مگر اٹھائیس سال پہلے یا تو ہو گا آپ کو، سکندر نے اس جرم کی سزا آپ کو نہیں دی کیا یہ کافی نہیں ہے۔“ فراز کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ تائی ماں اس کی تاب نہیں لا پائی تھیں جسے گڑبڑا کر تیزی سے باہر نکل گئیں۔ فراز نے سر جھٹک کر گہرا سانس لیا اور سکندر کو اپنا خیال رکھنے کی تاکید کرتا خود بھی چلا گیا۔ سکندر اس ضروری بات کے متعلق سوچنے لگا جو تائی ماں اس سے کرنا چاہتی تھیں مگر تائی ماں نے اس الجھن سے بھی اسے جلد نکال دیا کہ فراز کے جانے کے محض پانچ منٹ بعد پھر ان کی آمد ہوئی تھی مگر اس مرتبہ وہ اکیلی نہیں تھیں تاؤ جی بھی ان کے ساتھ تھے سکندر الجھن زدہ نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔

”تمہاری تائی ماں بتا رہی تھیں تم جا رہے ہو یہاں سے، کیوں؟“ تاؤ جی نے اپنے مخصوص انداز میں استفسار کیا۔

”میں خود مختار ہوں بالغ ہوں میرا خیال ہے میں اپنے فیصلے خود کر سکتا ہوں۔“ جواب دینے کا انداز ایسا تھا کہ تائی ماں گڑبڑا گئیں جسے تاؤ جی کو سرزنش والا ٹھوکا مار کر خود بات سنبھالنا چاہی۔

”اگرے نہیں بیٹے آپ برا نہیں مناؤ بالکل آپ اپنی مرضی کر سکتے ہو میرا مقصد تو یہ تھا کہ وہاں اکیلے گھر میں آپ کو پریشانی کا سامنا ہو گا کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے کے سوسکے ہوتے ہیں گھر عورت کے وجود کے بغیر مکمل رہتا ہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ تم شادی کر لو لڑکی کی فکر کرنے کی ضرورت

نہیں اپنی سالہ ہے نا۔“ بلا خر تھیلے سے بی بی باہر آگئی تھی سکندر ناہم نظروں سے انہیں سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کی اس عزت افزائی کے لیے شکریہ، معذرت چاہوں گا تائی ماں میں آپ کی یہ آفر قبول نہیں کر سکتا دراصل میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔“ اس کی بات سن کر تائی ماں حیرانی سے اسے دیکھنے لگیں۔

”مذاق کر رہے ہو بیٹے؟“ انہیں پتا نہیں کیوں یقین ہی نہیں آیا۔

”نہیں میں ایسا کیوں کروں گا بھلا؟“ سکندر نے نرمی سے نرمی کی اسے اس بوڑھی عورت پر ترس آنے لگا۔ البتہ تاؤ جی یوں ہونٹ بھیچنے بیٹھے تھے جیسے کسی طوفان کو دباننا چاہتے ہوں۔

”ہوگئی تمہاری تسلی کرو الیا مزید ذلیل، اب اٹھو۔“ غصے سے کہتے وہ باہر نکل گئے۔

وہ سر جھکائے کنفیوژ سی سب کے درمیان بیٹھی تھی۔ سب جو اس کے سسرالی رشتہ دار تھے اماں جان دونوں بیٹیوں کے ہمراہ پہلی بار بیٹے کے گھر اجا یک چلی آئی تھیں، فاطمہ تو انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی مگر عباس خاصا جربز نظر آ رہا تھا پتا نہیں کیوں اس کیوں کا جواب بھی اسے جلد مل گیا تھا جب اماں جان نے فاطمہ کی حالت دیکھ کر عباس کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔

”تم نے بہو کا چیک اپ نہیں کر لیا نا عباس، کیا حالت ہو رہی ہے بچی کی۔“

”کر لیا ہے اماں جان، اب میں بالکل ٹھیک ہوں آپ فکر نہ کریں۔“ عباس کی ناگواریت کو محسوس کرتے فاطمہ نے گڑبڑا کر وضاحت اور صفائی پیش کی تھی مگر معاملہ سنورنے کے بجائے بگبیر ہونے لگا۔

”سچ بتانا عباس تم نے بچی کا ابارش تو نہیں کروا دیا، ارے مجھے تو پہلے ہی لگتا تھا میرا اندازہ غلط نہیں۔ خوف خدا تو جیسے آج کل کے نوجوانوں میں ختم ہو گیا ہے بہو کی چاہے جان چلی جاتی۔“



کے تعاقب میں آئی تھی۔



”جب میں خود مسلمان نہیں ہوا تھا تو اسلام کی سچائی کو بھی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ میں نے مذہبی اسکالر ابوظہر کو بھی بہت ذراچ کیا تھا۔ میں تقریباً ہر روز ہی ان کے پاس اپنے لا تعداد سوال لے کر پہنچ جایا کرتا۔ میں سلام پیش کرتا ہوں اس با حوصلہ اعلیٰ ظرف انسان کو جو کبھی مجھ سے یا میرے سوالوں سے جڑے ہوں۔ میں اکثر لمبی بحث کیا کرتا۔ وہ فراز سے محو گفتگو تھا۔

”آپ سے مل کر مجھے روحانی خوشی ہوتی ہے ابراہیم بھائی، مجھے شرجی بھائی نے بتایا تھا کہ آپ اپنی گمشدہ بہن کی تلاش میں ہیں کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں۔“ فراز کے لہجہ و انداز میں اس کے لیے سچی عقیدت و پیار تھا ابراہیم احمد نرمی سے مسکرایا۔

”جی ضرور کیوں نہیں، مگر میرے پاس اول تو کیتھی کی کوئی تصویر نہیں، دوسری بات یہ کہ میں اس کی تصویر اخباروں میں شائع کرانا مناسب نہیں سمجھتا۔“

”اس اوکے ابراہیم بھائی آپ بس مجھے ان کے مکمل کوائف لکھ کر دے دیں ہم اخبار میں اشتہار دے دیں گے۔ ویسے یہ کام نیٹ کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے۔“ فراز کے کہنے پر ابراہیم نے ٹھنڈا سا سانس بھرا۔

”میں کوشش کر چکا ہوں فراز کیتھی غالباً انٹرنیٹ پور نہیں کرتی اگر کرتی بھی ہوگی تو کسی اور نام سے میں نے کیتھی اور نندنی نام کی لا تعداد لڑکیوں سے رابطہ کیا مگر ناکامی رہی۔“

”کیا مطلب کیتھی اور نندنی، میں سمجھا نہیں۔ کیا آپ کو کسی نندنی کی بھی تلاش ہے؟“ وہ واقعی الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ نندنی نام پر اس کے حواس لرٹ ہو چکے تھے۔

”کیتھی کے دو نام ہیں محمد فراز احمد انچہ پٹی میرے فادہ اور مدد و مختلف مذاہب سے تھے دونوں نے ہمیں اپنے اپنے مذہب کے نام دیے تھے، کیتھی ان کا نام ممانے نندنی رکھا تھا۔“ ابراہیم مسکرا کر نرم انداز میں وضاحت دے رہا تھا

وہ اپنی سوچ اپنے یقین پر عباس کو بری طرح ڈانٹ رہی تھیں اور عباس..... اس کا بس نہ چلتا تھا کہ خود کہیں بھاگ جائے۔ معاملہ ایسا تھا کہ فاطمہ عادت کے مطابق عباس کی پوزیشن بھی کلیئر نہیں کر پار ہی تھی کہ شرم کے باعث زبان ہی تالو سے چپک گئی۔

”اماں جان، فارگا ڈسک آپ بالکل غلط سوچ رہی ہیں ایسا ہرگز نہیں ہے آپ کی لاڈلی محترمہ کو بخار تھا پچھلے دنوں اس وجہ سے ویک ہیں اور کچھ نہیں ہوا ہے کیا میں آپ کو اتنا گمراہ نظر آتا ہوں۔“ فاطمہ پر دہکتی نگاہ ڈالتا وہ وہاں سے چلا گیا۔

”مجھے لگتا ہے عباس خفا ہو گیا ہے اماں جان آپ بھی حد کرتی ہیں آتے ہی انہیں لتاڑنا شروع کر دیا۔“ مہر واپا نے اماں جان پر گرفت کی تو وہ کھسکی سی ہو گئیں۔

”ارے غلط نہیں بھی انسان کو یہی ہوتی ہے خیر میں خود منالوں کی اپنے بیٹے کو۔“ فاطمہ اٹھی تو انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”تم کہاں جا رہی ہو بیٹا۔“ ان کے انداز میں محبت تھی۔ ”آپ کے بیٹے کو دیکھیں گی ناب، اماں کے خراب کیے سوڈ کو بیوی ہی بحال کرے گی نا۔“ زینب نے حسب عادت شگوفہ چھوڑا تھا فاطمہ کی کندنی رنگت لمحوں میں دھک اٹھی اور چہرے پر دھنک بکھر گئی۔

”مم..... میں..... دیکھتی ہوں چائے کیوں تیار نہیں ہوئی..... ابھی تک اور بچوں کو دیکھوں اٹھ تو نہیں گئے؟“ وہ بوکھلا کر بولی تو زینب زور سے ہنس پڑی۔

”اگر تم یہ کہہ دیتی کہ میں عباس کو دیکھتی ہوں تو بھی ہمیں اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ آخر وہ شوہر ہیں آپ کے مگر یہ شرم و حیا بھی خوب ہے لیکن شادی کے اتنے عرصہ بعد بھی آخر کیسے شرمایتی ہو۔“ زینب کو اسے چھیڑنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ اس چھیڑ چھاڑ سے فاطمہ کے چہرے پر اترتے حجاب خفت اور گریز کے رنگ اسے بہت بھاتے تھے۔ فاطمہ کی جھینپ کچھ اور بڑھ گئی۔ جواب دیے بغیر وہ تیزی سے نکل گئی۔ البتہ ان تینوں کی دُغریب ہنسی کی آواز اس

اور فراز ایک دم حیران ہو گیا۔ ”کیا ان کا پورا نام نندنی گریوال تھا؟“ اس نے چونکتے ہوئے ابراہیم سے سوال کیا۔ اس سے قبل کہ ابراہیم احمد کچھ کہہ پاتا دونوں شرجیل کی بلند آواز پر گھبرا کر ملے تھے۔ جو فون پر بات کر رہا تھا اور اس کے چہرے پر اس پہلے کتنی پریشانی تھی۔

”آپ نے خیریت سے کال کی ہے نا ڈاکٹر صاحب پلیز بتادیں مجھے میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔“ وہ فنی چہرے کے ساتھ کہتا۔ بعد سا وہیں گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ ”آپ سچ کہہ رہے ہیں ڈاکٹر؟“ فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اس کے چہرے پر تغیر تھا اور آنکھیں اس پل سمندر بن کر ابل پڑیں۔ وہ یوکی سسکتا ہوا بے قراری سے سجدے میں گر گیا۔

”کیا ہوا بھائی مجھے بتائیں۔“ فارگا ڈسک مجھے بتائیں ایک بھابی تو ٹھیک ہیں نا؟“ وہ اس سے سوال کرتا کسی قدر سراسیمہ لگ رہا تھا شرجیل نے سجدے سے سر اٹھایا اور اسے گلے لگا لیا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ ”فراز، اللہ نے میری آزمائش ختم کر دی، ڈاکٹر نے ابھی بتایا ہے کہ امی کو مہ سے باہر آ چکی ہے۔“ وہ بھیگی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”مبارک ہو شرجیل احمد۔“ ابراہیم نے بڑھ کر شرجیل کو گلے لگاتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ شرجیل شدت جذب سے بے اختیار سسک اٹھا۔ اسے سمجھ نہیں آئی تھی اس احسان کے بدلے بک کر شکر کیسے ادا کرے۔

”چلیں بھائی اسپتال چلتے ہیں بھابی سے ملنے۔“ فراز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر خوشی سے لرزتی آواز میں کہا اور اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے۔

”ہوں بالکل اور ہمیں یہ خوشی کی خبر ایمان بھابی کے پیرنٹس کو بھی دینی چاہیے۔“ ابراہیم احمد کے کہنے پر شرجیل بھی نرم آنکھوں سے مسکرانے لگا محض چند منٹ بعد اس کی گاڑی اسپتال کی جانب رواں دواں تھی۔



اماں جان اور مہر واپا وغیرہ کی آمد سے یہ ضرور ہوا تھا کہ بچوں کو ہر دم وہ خود اپنے ساتھ لگائے رکھتی تھیں۔ بچے بھی مانوس ہو رہے تھے ورنہ تو سوائے فاطمہ کے وہ کسی کے پاس کم ہی خوش رہتے تھے۔ اب ذرا فرصت تھی تو فاطمہ نے رات کے کھانے کی تیاری اپنی نگرانی میں کرانا شروع کی۔ اس کے نزدیک عباس کے رشتے بہت اہم تھے جیسی وہ جی جان سے ان کی خدمت کرنا چاہ رہی تھی۔

”سلیم تم باہر جاؤ ذرا۔“

فاطمہ دروازے کی جانب سے رخ پھیرے کو کنگ ریج کے آگے کھڑی بریانی کا مصالحہ تیار کرنے میں مصروف تھی کہ عباس کی مخصوص آواز سن کر اپنا دل ٹھہرتا محسوس کیا۔ گوکہ وہ اس سے مخاطب نہیں تھا مگر پھر بھی وہ پوری حیات سے متوجہ ہونے سے خود کو روک نہیں سکی۔

”رات کو بیڈ روم میں آ جانا سونے کے لیے، میں نہیں چاہتا اماں جان کو کسی قسم کا بھی کوئی شک ہو۔“ اب کہ وہ اس سے مخاطب تھا۔ خشک و سپاٹ تحکم بھرا انداز لیے اس کے باوجود فاطمہ کو لگا تھا اس کے اطراف میں لا تعداد جگنو جگمگانے لگے ہوں۔

پھر اس وقت ہی نہیں وہ بعد میں بھی عباس کی موجودگی میں نہ پلکیں اٹھا سکی نہ اس سے نظر چار کر سکی۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا، عباس خامی و ریتک اپنی ماں اور بہنوں کے پاس بیٹھا رہا۔ جبکہ فاطمہ بچوں کے ساتھ دیگر کام بھی دیکھنے لگے لیکن اپنی نگرانی میں صاف کرا کر فارغ ہوئی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ عباس کے علاوہ اماں جان اور مہر و زینب بھی سونے کے لیے اپنے کمروں میں چلی گئیں۔

فاطمہ نے چونکہ بچوں کو ان کے کمرے میں ہی سلا یا تھا جیسی اس سمت آگئی تھی کہ انہیں لے کر عباس کے کمرے میں جائے گی مگر کمر خالی تھا یعنی عباس بچوں کو پہلے ہی کمرے میں لے گیا تھا خود فاطمہ کو چھپکچھاٹ اور حجاب نے آن گھیرا۔ اسے عباس کے کمرے میں جاتے جھجکا رہی تھی مگر جانا تو تھا اس نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ وہ سوچکا ہوگا اور واقعی جب وہ کمرے میں آئی عباس بے خبری کی



نہیں تھی کہ تم اس کی ہموار سانسوں کا زیر و بم اس کی گہری نیند کا پتا دیتا تھا اور ٹائٹ بلب کی ٹینگوں روشنی میں اس کے ساحرانہ نقوش کی دلکشی کو نگاہ کے رستے دل میں سمونی فاطمہ کی آنکھیں بے مائیگی کے شدید احساس سمیت بھیکتی چلی گئی تھیں۔ گو کہ اس بلاوے میں کوئی امید تھی نہ معنی خیزی محض ایک بھرم تھا دنیا داری کا تقاضا تھا۔

وہ رات کا ہی کوئی پہر تھا جب کسی احساس کے تحت وہ نہ صرف جاگ اٹھی بلکہ اپنے اوپر بھاری بھر کم بوجھ محسوس کرتے ہی اس کے حلق سے زوردار چیخ نکل گئی۔ جس کا گلا درمیان میں ہی اس کے ہونٹوں پر آہنی ہاتھ جما کر گھونٹ دیا گیا تھا۔

”میں ہوں عباس اور تمہارے حسن سے متاثر ہو کر ہرگز تمہارے پاس نہیں آیا بے فکر ہو، نیچے کیوں لیٹی ہو اندھیرے میں مجھے الہام ہوا تھا بھلا؟ چوٹ لگوادی مجھے۔“

عباس کی آواز غیض سے بھر پور تھی۔

”ضرورت کیا تھی تمہیں آخر اس فضول حرکت کی؟“ وہ اٹھ کر لائٹ آن کر چکا تھا۔

”آپ نے کہا تھا کمرے میں آ کر لیٹوں۔“ فاطمہ نے صفائی دی تو اس نے جواباً کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں تو نیچے لیٹنے کو تھوڑی کہا تھا صوفے پر لیٹ سکتی تھیں، بڑھتا تھا۔“ وہ اسی طرح بھڑک کر بولا۔

”آئی ایم سوری کہاں چوٹ لگی ہے آپ کو؟“ فاطمہ نے گریزاں انداز میں اسے ایک نظر دیکھا۔ عباس کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔

عباس واپس کمرے میں آیا تو دیا نے کسمسا کر رونا شروع کر دیا تھا۔ فاطمہ جو کم صدمہ بھیجی تھی چونک گئی، عباس نے اسے تیرپھی نظروں سے دیکھا۔ وہ دیا کو اٹھا کر کاندھے سے لگائے پھرتی اور ہنست رہی۔ عباس بستر پر جا لیٹا۔

اس کا خیال تھا فاطمہ دیا کے بہانے ضرور بستر پر اس کے برابر آئے گی اس کی توجہ حاصل کرنے کا فرسودہ طریقہ جو ازل سے ایسی نفس پرست عورتیں اپنے پسندیدہ مرد کو

دام میں جکڑنے کا زمانی آئی ہیں اس کے ہونٹوں پر زہر خند نکھرا۔ وہ سلگ رہا تھا اس کے پور پور میں نفرت بھی لیکن وہ منتظر ہی رہا مگر فاطمہ کی جانب سے ایسی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ دیا کے سونے کے بعد وہ اسے بستر پر لٹاتی خود واپس صوفے پر چلی گئی۔ لائٹ اس نے دوبارہ بند کر دی تھی۔ عباس اپنے اندازے کی غلطی پر حیران تھا۔

”تو کیا یہ وہ نہیں ہے جو میں اسے سمجھتا ہوں؟“ اس نے خود سے سوال کیا جواب میں اس کے اندر سناٹا چھایا رہا تھا۔ حالانکہ جواب تو تھا اس کے پاس جب اس نے فاطمہ کی آزمائش کرنی چاہی تھی اور وہ اتنی خوفزدہ ہوئی تھی کہ سب کچھ چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

شرجیل کو اس نے اس کا وعدہ یاد دلانے کو فون کیا تھا۔ مقصد شکوہ کرنا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ساتھ اپنے بیٹے کو بھی بھول گیا ہے مگر جو خوشخبری شرجیل نے اسے سنائی اس نے لاریب کو ہی نہیں حوصلی کو خوشی سے لبریز کر دیا تھا۔ امام تو اس خوشی میں بھی رونے لگی تھی اور بابا سائیں نے فوری صدقہ کرنے کا کہہ کر خود سجدہ شکر ادا کیا تھا اگلے چند منٹ بعد وہ لوگ ذارون اور سمعیہ سمیت کراچی روانہ ہو چکے تھے۔

”بہت مبارک ہو بیٹا، اللہ نے بہت احسان کیا۔“ دروازہ چونکہ شرجیل نے ہی کھولا تھا جمی بابا سائیں اسے گلے لگا کر خوشی سے کہا۔

”سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے بابا جان۔“ شرجیل کی آواز میں اظہار شکر تھا۔ لاریب اور امامہ وہاں رکنے بغیر تقریباً دوڑتی ہوئی اندر آئی تھیں جہاں ایمان سامنے ہی بستر پر ٹکیوں کے سہارے نیم دراز فراز کی کسی بات پر دھیس سے مسکرا رہی تھی۔ وہ بہت کمزور تھی مگر اللہ کا شکر تھا کہ اس کے تمام حواس سلامت تھے۔ انہیں روہو پا کر اس کی آنکھوں میں پھر سے نمی اتر آئی۔ لاریب اور امامہ نے ایک ساتھ لپک کر اسے محبت سے تھام لیا اور ملن کا یہ منظر بہت جذباتی تھی۔ فراز ایمان کے سامنے دھیرے دھیرے سارے حقائق رکھ چکا تھا یہی وجہ تھی کہ ایمان، لاریب اور

امامہ کے ساتھ بابا سائیں کو دیکھ کر حیران نہیں ہوئی تھی بلکہ ان کی منتظر تھی۔

”تم کیسی ہومانو ملی؟ بہت اچھا کیا تم نے شرجی بھائی کے ساتھ آ کر رہنا، ہم تو اتنے اچھے اور پیارے بہنوں سے محروم ہی رہتے۔“ فراز نے سمعیہ کا سر تھپکا جو ابراہیم احمد کی موجودگی کے باعث چھپنی شرمائی بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ اس کی بات پر جھینپ کر کچھ اور سرخ پڑنے لگی۔ وہ اس سے گھر کے ایک ایک فرد کا پوچھ رہی تھی۔

”سب ہی ٹھیک ہے انہیں بھلا کیا ہوتا ہے، انہیں کس کا مقام یہ ہے کہ وہاں صورتحال ہنوز وہی ہے کوئی تمہیں اچھے الفاظ میں یاد نہیں کرتا۔“ فراز کا لہجہ متاسفانہ تھا۔

”یہ دیکھیں آپ کا بیٹا کتنا پیارا ہے۔“ ایمان کو اس جذباتی کیفیت سے نکالنے کی غرض سے ہی لاریب نے اسے بابا سائیں کے کاندھے سے الگ کر کے اس کے آنسو پونچھے اور ذارون کو اس کی گود میں ڈال دیا۔ ایمان کچھ ٹاپے سا کن ہو کر رہ گئی۔

”یہ اتنا بڑا ہو گیا لاریب؟“ وہ حیرانی سے کہتی جھکی اور بچے کو پیار کیا۔

”ہاں، تم بہت عرصہ غفاری ہو مجھ سے امی۔“ جواب شرجیل نے دیا تھا ایمان کی آنکھیں پھر سے بھیسنے لگیں۔

”میں آپ سب لوگوں کی مجرم ہوں۔“ وہ بابا سائیں کا ہاتھ پکڑ کر کیوں سے لگاتی پھر سے سسکی۔

”ایسا نہیں سوچو بابا کی جان، آپ اپنے بابا کی بیٹی نہیں بیٹا بن کر رہا کرتی تھیں۔“ بابا سائیں نے نرمی و محبت سے کہتے اس کے کدے نشی بال سہلائے۔

”ہاں بالکل اور بیٹوں کی خطائیں باپ جلدی معاف کر دیا کرتے ہیں اس لیے آپ بالکل بھی دل پر بوجھ نہ لیں بس آج آپ رشتہ پکا کر بس اپنے بیٹے کا میری بیٹی نور سے۔“ بتا رہی ہوں انکار ہرگز نہیں سنوں گی۔“ امامہ نے بڑے انداز سے بڑے دھونس سے کہا تھا تو سب ہنس پڑے مگر ایمان چونک اٹھی۔

”ارے میری تھی پری تمہاری شادی ہوئی اور بیٹی بھی

ہے؟“ وہ کتنی حیرانی اور غیر یقینی سے امامہ کو دیکھ رہی تھی۔ جواب میں وہ معصومانہ انداز میں گردن اکڑا کر فرضی کارل کھڑے کرنے لگی تو لاریب کی ہنسی نکل گئی۔

”کس سے ہوئی تمہاری شادی؟“ ایمان نے اسے بے اختیار تھام کر اسے گلے لگا کر چوما، وہ بھینٹا اس کی یاد کو فراموش کر چکی تھی جو کبھی اس پر قبر بن کر ٹوٹی تھی۔

”وہ بھی میری طرح بہت خوب صورت ہیں ملاؤں گی آپ سے فی الحال تو ساتھ نہیں لانی انہیں، آپ بات نہیں بدل لیں اپنے بیٹے کا رشتہ دس مجھے۔“ لاریب اور بابا سائیں کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو ایک نگاہ دیکھتے امامہ نے بہت سمجھداری سے بات کو بدل دیا تھا۔

”ٹھیک ہے، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے اللہ پاک دونوں کے نصیب اچھے کرے، رشتہ تو طے کر لیا تم نے اب مجھے میری بہو بھی دکھا دو۔“ ایمان نے ہنستے ہوئے کہہ کر اس سے بچی کو لے لیا تھا۔ انداز میں شرارت تھی جس سے محظوظ ہوتے بھی ہنس پڑے۔

”تمہارے کتنے بچے ہیں لاریب؟“ ایمان نے ایک دم اسے مخاطب کیا۔ لاریب پہلے تو ہونٹ ہونٹ پھر اس کے صلیج چہرے پر خفت و خجالت کی لالی دوڑ گئی۔

”کیا مطلب، اگر تم دونوں یہ کارنامہ انجام دے چکی ہو تو ضروری نہیں کہ میں بھی.....!“ اس کی ادھوری بات پر دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

”بھئی اب میرا کیا قصور ہے اگر امامہ کا بچہ تھا تو میں سمجھی تم بھی.....!“ ایمان نے خفت زدہ انداز میں سرخ چہرے کے ساتھ وضاحت پیش کی۔

”لیں اس میں شرمندہ ہونے والی کیا بات ہے بھلا؟ شادی ہوئی ہے تو بچے بھی ہونے ہی ہوتے ہیں۔“ امامہ نے مسکراہٹ دبا کر بظاہر بے پروائی سے کہا۔

”ویسے باجوہ جو کی شادی مجھ سے بعد میں ہوئی ہے ابھی چند ماہ ہی ہوئے ہیں۔“ امامہ کی وضاحت پر ایمان کی متبسم نظریں پھر سے لاریب کی سمت گھومیں۔

”کس کے ساتھ ہوئی لاریب کی شادی؟“ اس کے



لہجے میں پر شوق سا بحس تھا۔  
”آپ کے خیال میں کس سے ہو سکتی تھی، یاد ہے باجو میں نے ایک بار آپ سے اپنا خیال ظاہر کیا تھا کہ سکندر بھائی بجو میں انوالو لگتے ہیں۔“ وہ چکتی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر شرارت لیے ایمان سے مخاطب تھی۔  
”ہاں، ہاں..... تو.....؟“ اس کے لہجے میں بحس تھا۔  
”تو یہ کہ بس وہی لے اڑے ہیں انہیں، ہمارا گمان بچ کر دکھایا انہوں نے۔“  
”رہی لاریب، یہ سب کیسے ممکن ہوا؟“ ایمان بھونچکی رہ گئی۔

”محبت کا کرشمہ ہے۔“ امامہ نے اسی شریر انداز میں لقمہ دیا پھر ایمان کی سمت جھک کر اسے رازدارانہ انداز میں تفصیلات سنانے لگی۔ لاریب نے ایمان کی آنکھوں میں اترتی حیرت کو محسوس کیا اور بے چین ہو کر نظریں چرائیں۔  
”تم خوش ہونا لاریب؟“ لاریب وہاں سے اٹھ کر جا رہی تھی جب ایمان نے کتنی بے چینی سے سوال کیا۔ لاریب نے ایک نظر اس کے سفید ہاتھ پر ڈالی جو اس کے ہاتھ پر آ کر ٹھہر گیا تھا۔ پھر محض سرکوا ثبات میں ہلا دیا وہ فی الحال اسے ہرٹ نہیں کرنا چاہتی تھی۔



اس نے خطرانی کیفیت میں پیشانی کے بالوں کو مٹھی میں دیوچا اور سر ہاتھوں پر گرا لیا۔ بے نام سی اداسی اور پابست تھی۔ فراز کے ذریعے اس تک بھی ایمان کی تندرستی کی خبر پہنچ چکی تھی۔ ہر سو خوشیاں بکھر گئی تھیں۔ پورا خاندان اکٹھا تھا سوائے اس کے کسی نے اسے نہیں بلایا کسی نے اسے یاد نہیں کیا، شاید نہیں یقیناً اس کی ضرورت نہیں تھی۔ فراز نے یہ تو بتایا ہی نہ تھا کہ وہ اس کا ذکر کر چکا ہے کہ نہیں اس نے ریوانگ چیر چھوڑی اور کھڑکی کی سلائیڈ نیچے کر کے باہر جھانکا۔ نیچے مصروف شاہراہ پر ٹریفک رواں دواں تھا زندگی اپنے پورے خطرناک سے جاری و ساری تھی۔

جو دو تو اس پر چھا گیا تھا اس نے لاریب کی وجہ سے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا اس کی آنکھیں شدتوں کی جلن سمیٹ

لائیں فون کی گھنٹی بج رہی تھی اسے پلٹ کر میز تک پہنچا۔ ”ہیلو..... نہیں میننگ کے لیے منع کر دیں.....“ کل یا پرسوں کا کوئی بھی ٹائم دے دیں ان کو.....“ ڈسٹرب می اوکے۔“ اس نے قدرے سختی سے اپنی سکرٹری کو کہا تھا۔ ریسپورنڈ کر سر اٹھایا اور اپنے سامنے موجود بابا سائیں کو دیکھ کر اسے اپنی بصداتوں پر دھوکے کا گمان گزرا تھا۔ جی چند ٹاپے تو ساکن کھڑا رہ گیا پلکیں تک جھپکے بغیر۔  
”کیسے ہو سکندر بیٹا؟“ وہ مسکرا کر کہتے آگے بڑھے تب سکندر کا یہ سکتہ ٹوٹا تھا۔ وہ بے اختیار ہو کر ان کی جانب آیا تو انہوں نے کھلے بازوؤں میں بھر کر اسے سینے سے بچھین لیا۔  
”مجھے یقین نہیں آ رہا بابا سائیں آپ میرے سامنے ہیں، میرے پاس۔“ اس کی بے خودی کا عجیب عالم تھا بابا سائیں نرمی سے محبت سے مسکرانے لگے۔  
”نہیں ڈھونڈنے میں ہی بہت وقت لگ گیا سکندر ورنہ میں تو بہت پہلے تمہارے پاس آ جاتا۔“ انہوں نے اسی محبت و پیار سے تھپکا تو سکندر ان سے الگ ہو کر چھپنی ہوئی مسکراہٹ سے انہیں تنکے لگا۔

”آئی ایم سوری بابا سائیں میں نے نالائق کی حد کر دی، پتا نہیں میں اس غفلت میں کیوں پڑ گیا تھا۔“ ان کی فراخ دلی نے اسے اتنا شرمسار کر دیا تھا کہ وہ از خود اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا نہ شکوہ نہ شکایت وہ کتنی محبت سے اسے اس کی کامیابیوں کی مبارک باد دے رہے تھے۔  
”کوئی بات نہیں بیٹا، میں جانتا تھا تم یہاں مسائل میں الجھے ہوں گے تمہارے والدین اور لاریب کو بھی یہی کہہ کر تسلی دیتا تھا۔ ہر حال مجھے خوشی ہے کہ اللہ نے تمہیں سرخو کیا ہمیشہ زندگی میں ہر مقام پر کامیابی پاؤ۔“ وہ اس کا کاندھا تھپتھپا رہے تھے، سکندر کا چہرہ ایک نام پر لوہے اٹھا۔  
”میں جلد آپ سے ملنے آؤں گا ایمان بی بی کے متعلق بھی مجھے پتا چلا ہے۔ آپ کو بہت مبارک ہو بابا سائیں۔“ انٹرکام پر چائے کا آرڈر کرنے کے بعد وہ

”انفہ احسان بابا آپ کو تو بالکل بھی مساج کرنا نہیں آتا۔ نیچے سے اوپر کو ہاتھ لے کر جائیں اور ذرا دبا کر بہت درد ہے مجھے۔“ فاطمہ عباس کے لیے دودھ کا گلاس رکھنے آئی تھی۔ جب وہ بستر پر لیٹا احسان بابا سے مخاطب تھا۔ شرٹ اور بنیان سے بے نیاز وہ تنکے میں منہ دیے اونڈھا لیٹا ہوا تھا اور احسان بابا ہاتھ میں کوئی دوا پکڑے مساج کرنے میں مصروف تھے۔ عباس کی بات سن کر قدرے خفت زدہ ہوئے۔

”صاحب دراصل میں نے ایسا کام کبھی نہیں کیا ہے تو تجربہ بھی بالکل نہیں ہے۔“ وہ کھسیا کر وضاحت دے رہے تھے۔

”ہاں بیٹے ضرور، میں انتظار کروں گا آپ کی بہت اہم باتیں ہیں میرے پاس۔“ ان کے لہجے میں اب کے ذمہ داری کا احساس دلانے والا انداز تھا۔ سکندر ایک بار پھر خفت کا شکار ہوا۔

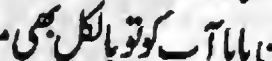
”آئیے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں، ابھی تو آپ ایمان بی بی کی طرف ہی ہوں گے نا؟“ چائے پینے کے بعد وہ جانے کو اٹھے تو سکندر نے اسی سابقہ انداز میں بڑھ کر انہیں تھاما تھا۔

”جیتے رہو بیٹا، نیچے ڈرائیور کے ساتھ وہ بچہ بھی ہے کیا بھلا سا نام ہے اس کا.....؟“

”محمد فراز علوی، بابا سائیں آپ کے اس نالائق بیٹے کا کزن ہوں غلطی سے۔“ اس وقت فراز نے اندر قدم رکھتے بے حد چپک کر کہا۔ سکندر گہرا سانس بھر کر رہ گیا تو گویا یہ اس کا کارنامہ ہے۔

(کتنے احسان کرو گے مجھ پر فراز علوی، میں تمہاری محبتوں کے کتنے قرض اتاروں گا بھلا۔ مگر اس بے غرض عنایت کا فائدہ نہیں ہے۔ لاریب کو آج بھی میری ضرورت نہیں میں جانتا ہوں)

اس کا دل بے انتہا بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔



”انفہ احسان بابا آپ کو تو بالکل بھی مساج کرنا نہیں آتا۔ نیچے سے اوپر کو ہاتھ لے کر جائیں اور ذرا دبا کر بہت درد ہے مجھے۔“ فاطمہ عباس کے لیے دودھ کا گلاس رکھنے آئی تھی۔ جب وہ بستر پر لیٹا احسان بابا سے مخاطب تھا۔ شرٹ اور بنیان سے بے نیاز وہ تنکے میں منہ دیے اونڈھا لیٹا ہوا تھا اور احسان بابا ہاتھ میں کوئی دوا پکڑے مساج کرنے میں مصروف تھے۔ عباس کی بات سن کر قدرے خفت زدہ ہوئے۔

”صاحب دراصل میں نے ایسا کام کبھی نہیں کیا ہے تو تجربہ بھی بالکل نہیں ہے۔“ وہ کھسیا کر وضاحت دے رہے تھے۔

”چلیں پھر آپ رہندیں۔“

عباس نے سیدھے ہوتے انہیں ٹوکا تو وہ چلے گئے تب ہی نگاہ فاطمہ پر اٹھ گئی تھی۔ جو اس کے غضب کی مردانگی سینے لیے جوڑے جوڑے نگاہ چرائے پلٹ کر اسی خاموشی سے جا رہی تھی۔ جب عباس نے بالکل غیر متوقع طور پر اسے پکارا۔

”بات سنو۔“ اس نے صرف کہا نہیں بلکہ اس کی کلائی بھی پکڑ لی۔

”کیا ثابت کرنا مقصود ہے کہ تم بہت پاکباز ہو؟“ وہ غصے میں پھر سا گیا تھا۔ آج تک بھلا ایسا کب ہوا تھا ایسا کہ کوئی اسے نظر انداز کر جائے وہ بھی فاطمہ؟

”بیٹھو یہاں مساج کرو میرے کاندھوں پر مسلز پر اہلم ہو رہی ہے مجھے۔“ اس کے ہاتھ چھوڑ کر وہ اس کے سامنے دوا پھینکتا ہوا بولا۔ وہ صرف اس کی قربت سے ہی نہیں اس کی پریش نظروں کی آنچ سے بھی پھیل رہی تھی۔ اس نے عباس کے لیٹنے کے بعد مساج شروع کر دیا تھا۔

مگر اس کے ہاتھوں کی لرزش اس کام کو مشکل بنا رہی تھی۔ عباس کی سانسوں کی تپش، وجود کی گرمی اور نظروں کا طلسم اس کے سر اپنے میں ذومعنی سنسنی پھیلا رہا تھا اور وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی اس طرح آخر وہ اسے کیوں حراساں کر رہا ہے؟ اسامہ نیند میں کسمایا تھا فاطمہ نے تیزی سے اٹھنا چاہا عباس نے سسکتی نظروں سے اسے تنکے پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ فاطمہ نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ ”بہت پسند ہوں نا تمہیں میں اور بہت محبت بھی کرتی ہو مجھ سے، پھر اب تو ہماری شادی بھی ہو چکی ہے اس طرح گریزاں کیوں رہتی ہوں مجھ سے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟“ ایک ایک لفظ انگارہ تھا اور ایک ایک جملہ کاٹ دار تھا۔ اگلے لمحے اس نے تنقیر آمیز انداز میں فاطمہ کو زور سے جھٹک دیا تھا۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے، میں اعنت بھی نہیں بھیجتا تم پہ سناتم نے؟“ وہ مٹھیاں بچھ کر چیخا۔



کے متوحش چہرے کو دیکھا اور تھکے ہوئے انداز میں خود کو بستر پر گرا دیا۔

”اگر ایسا ہی ہے جو تم کہہ رہی ہو لاریب تو وہ آیا کیوں نہیں، یہ غیر اہم بات تو نہیں تھی، ہم سب جمع ہیں تو اسے بھی آنا چاہیے تھا اصولاً۔“ اس کی آنکھوں میں ہنوز تشویش و فکر تھا۔ لاریب نے خود کو سنبھال کر اس کا گل محبت سے تھپکا۔ ”وہ آپ سے ہچکچاہٹا ہے شاید پرانے تعلق کی بنا پر۔“ لاریب نے نظریں چرا کر بات بنائی ایمان نے اذیت سے گزرتے آنکھیں موند لیں۔

”وہ اچھا انسان نہیں تھا لاریب بابا جان کو یوں امامہ سے اس کی شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔“ اس کی آواز میں شدید کرب کی آمیزش تھی لاریب کا دل بھرانے لگا۔ وہ اسے کیا بتائی بھلا وہ کیا کچھ نہیں سمجھتی تھی اپنی جان پر مگر اس نے خود کو سنبھالنا تھا اپنے لیے نہ بھی کسی اپنے رشتوں کی خاطر ضرور جی بولی تو اس کا لہجہ و انداز نارمل تھا بلکہ ڈھارس بندھاتا ہوا۔

”وقت سب سے بڑا استاد ہے باجو، امامہ کہتی ہے وہ یکسر تبدیل ہو چکا ہے۔“ لاریب نے اس کے ساتھ اپنی بھی تسلی کی تھی ایمان پوری آنکھیں دیکھتے دیکھتے رہی گویا سچ اور جھوٹ کی پرکھ کر رہی ہو اور لاریب اپنے سارے حوصلے زبانی خائف تھی۔

”کیا ہوا خیریت ایمان۔“ فراز اور شرجیل ایک ساتھ دستک کے بعد امدائے تھے۔ ایمان کو یوں بے دم انداز میں لیٹے اور لاریب کو پریشان پا کر شرجیل کی تشویش اور گھبراہٹ فطری تھی۔ ایمان نے گہرا سانس بھر کر خود کو کمپوز کیا۔

”میں ٹھیک ہوں جسٹ ریلیکس۔“ اس نے شرجیل کا چہرہ دیکھ کر مسکراتے کی کوشش کی۔

”کیا خیال ہے ہمیں باہر چلنا چاہیے بے چارے شرجی بھائی تو ڈھنگ سے ایسی بھائی کو دیکھ بھی نہیں سکے ہم مسلسل کباب میں ہڈی بنے ہوئے ہیں۔“ فراز سنجیدگی کے ساتھ لاریب سے مخاطب تھا۔

ابراہیم احمد عشا کی نماز پڑھ کر آیا تھا اور کچن میں اپنے لیے چائے بنا رہا تھا۔ لاریب کو وہ بہت اچھا لگتا تھا تو وہ خاموش رہتا اگر کچھ بولتا تو گویا الفاظ کی صورت میں موتی بکھرنے لگتے۔ اس کے خیال میں سمعیہ دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکیوں میں سے ایک تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو لاریب؟“ ایمان نے پیچھے سے آ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو لاریب گہرا سانس بھر کر مسکرا دی اور پلٹ کر امامہ کو دیکھنے لگی جو نور کو سلاتے ہوئے خود بھی غنودگی میں چلی گئی تھی۔

”یہ ابھی تک ویسی ہی ہے معصوم سادہ سی۔“ ایمان نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا پھر آگے بڑھ کر امامہ کو لٹانے کے بعد سر کے نیچے نرمی سے تکیہ کھدیا۔

”تم نے مجھ سے یہ کیوں چھپایا تھا لاریب کہ امامہ کی شادی وقاص سے ہوئی ہے؟“ وہ دھمی دھمی لاریب پھر ہر اسان ہونے لگی۔

”میں حیران ہوں اگر یہ میرا تاوان تھا تو امامہ خوش کیسے نظر آتی ہے۔ کیا وہ اتنی پیچور ہو گئی ہے لاریب کہ ہم سب کو بھلانے کو.....!“

”ایمان کی آنکھوں میں وحشت سی اتر رہی تھی۔ لاریب نے بوکھلا کر اسے دیکھا، پھر نرمی و محبت سے اسے تھام لیا تھا۔

”آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے باجو، یہ تاوان نہیں تھا اس بندھن میں وقاص اور امامہ دونوں ہی کی رضامندی شامل تھی امامہ واقعی خوش ہے ٹرسٹ می۔“

”تم مجھ سے جھوٹ تو نہیں بول رہیں نا لاریب؟“ ایمان نے اس کا ہاتھ ایسے پکڑا جیسے تسلی کی شدید طلب ہو وہ سر تاپا کانپ رہی تھی اور ہر لمحہ سرد ہوتی جا رہی تھی۔ لاریب کو سب کچھ بھول کر اس کی فکر ہونے لگی۔

”میں ایسا کیوں کروں گی باجو، کہیں تو ابھی وقاص سے آپ کی بات کرادوں اطمینان ہو جائے گا آپ کو۔“ لاریب نے بوکھلاتے ہوئے کہا تھا ایمان نے ایک نظر اس

”آپ مانتے نہیں کرنا لاریب، اسے فضول ہانکنے کی عادت ہے۔“ لاریب رواداری سے مسکرا دی۔

”رات بہت ہو چکی ہے میں خود بھی آرام کا سوچ رہی تھی باجو میں چلتی ہوں شب بخیر۔“ کہتے وہ کمرے سے نکل گئی۔ فراز تیزی سے اس کے پیچھے لپکا تھا مگر کوئی فائدہ نہ ہوسکا لاریب نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر لیا تھا۔

”آپ بہت بدل گئے ہیں شرجیل۔“ شرجیل نے عادت کے مطابق سونے سے قبل نوافل ادا کیے پھر بستر پر آیا تو زارون کو گود میں لٹائے پیار کرتی ایمان نے اسے مخاطب کیا۔ شرجیل لمحہ بھر کو اپنی جگہ جم گیا پھر چہرہ موز کر محبت لٹائی نظروں سے اسے دیکھا۔

”یہ بتاؤ یہ تبدیلی کیسی لگی تمہیں؟“ شرجیل نے اپنا بازو اس کے کاندھے پر پھیلا کر فاصلہ مٹایا۔ ایمان کے چہرے پر مسکان سورج کی کرنوں کی مانند جھلکانے لگی۔

”بہت پیاری، بہت خاص۔“ اس کا لہجہ بے ساختہ تھا۔

”جب تم نے مجھ سے ہاتھ چھڑایا تھا اور غافل ہو گئیں مجھے تنہا کر کے تو میں نے جانا تھا ایمان میں بھی تمہارے ساتھ بیٹھ کر چکا ہوں حالانکہ تمہاری یہ غفلت میری طرح دانستہ بھی نہیں تھی تم اس میں قصور وار بھی نہیں تھیں پھر بھی میں بہت ہرٹ ہوا میں نے خود کو بہت تنہا محسوس کیا اور

بہت اذیت کے ساتھ بہت زیادہ پچھتاوے میں بھی گھر گیا۔ ایمان یہیں سے میں نے سمجھا تھا تمہاری اذیت کو تمہاری تکلیف کو جو تم نے اس وقت سہی جب میں تم سے نظریں پھیر چکا تھا۔ میری غفلت تو دانستہ تھی اس لحاظ سے تمہاری تکلیف میں شدت رہی ہوگی میں ہی تھا جس نے تمہیں غلط راستے پر چلایا تھا۔ تمہاری مشکلات کا ذمہ دار بھی میں ہی تھا پھر اس پر مزید کم ظرفی و ستم ظریفی یہ کہ تم سے نکالیں بھی پھیر لیں بہت بڑا جرم سرزد ہوا تھا مجھ سے ایک میں ہر روز جینے مرنے لگا۔ زیادتی کا یہ احساس بہت شدید تھا میں خود سے بھی نظریں چار نہیں کر پاتا تھا وہ بہت

کٹھن وقت تھا ایسی حالات نے ہر طرف سے مجھ پر گرفت تنگ کر دی تھی مگر میں ہارنا نہیں چاہتا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ ہے کہ اللہ کو میری ہار منظور نہیں تھی۔ جیسی اپنے پرہیز گار بندے کو میرا غم گسار بنا کر بھیج دیا۔ ہر سواند میرا تھا جب ابراہیم احمد جگنو کی طرح اندھیروں میں جگمگا کر روشنی دکھانے لگا۔ یہ راستہ اللہ کا راستہ تھا جس پر میں نے قدم رکھا تو راستے آسان ہوتے چلے گئے بس مجھے اتنا پتا ہے ایسی اس کے بعد مجھے کبھی نہیں لگا کہ میں تنہا ہوں اللہ ہر لمحہ ہر پہل میرے ساتھ تھا۔ وہ خاموش ہوا تو ایمان کو بے آواز روتے پا کر اتنا بے چین ہوا کہ جھک کر اس کے بھیکے گالوں کو عقیدت بھرے انداز میں چوم لیا۔

”میں اس سلوک پہ تم سے شرمندہ ہوں ایسی جو نادانی میں تم پر ہوا.....!“ ایمان نے اپنا نازک ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھا تو بات ادھوری رہ گئی۔ دونوں یونہی بھینکتی آنکھوں سے ایک دوجے کو دیکھتے رہے تھے پھر شرجیل نے اسے گلے سے لگا لیا۔

”آپ آئندہ کبھی اس بات کو دوبارہ نہیں یاد کریں گے شرجیل ہمیں سب بھول جانا چاہیے۔“ وہ شرجیل کے کاندھے سے اپنی پھٹکی آنکھیں رگڑ رہی تھی۔

”مجھے اللہ نے سب حسب خواہش دیا ہے گویا مجھے میری اوقات سے بڑھ کر نوازا ہے مجھے اور کیا چاہیے۔“ وہ بھی آواز میں کہہ رہی تھی اور شرجیل کو ابراہیم احمد کی کئی بات یاد آنے لگی اس نے کہا تھا۔

”جب انسان کے جائز کام بنا کسی رکاوٹ کے ہونے لگیں اور زندگی میں سکون کا چاہے ہلکا سا ہی احساس جاگنے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے خوش ہے۔ پھر ایسے میں انسان کو اپنی شکرگزاری بڑھا دینی چاہیے۔“ اور اس کی زندگی میں تو کوئی تشنگی کوئی کمی رہی ہی نہ تھی پھر وہ شکر کیوں ادا نہ کرتا۔

”ہاں..... ہاں مجھے پتا ہے، ڈیونٹ وری میں پہنچ جاؤں گا۔“ فاطمہ بیڈ کی چادر بچھا رہی تھی جب عباس فون



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں:-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

پر بات کرتا اندر داخل ہوا اور فون کان سے ہٹا کر وہ وارڈ روم کی جانب بڑھا اور سیل فون بستر پر پھینک دیا۔  
”اسے چار جنگ پر لگاؤ“ اس کا لہجہ محکم آمیز تھا۔  
فاطمہ نے اپنا کام ادھورا چھوڑ کر حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس کا فون اٹھا لیا۔ فون کو چار جنگ پر لگا کر اپنے دھیان میں پڑی تو عباس حیدر کے فولادی وجود سے ٹکرائی۔ عباس کو اپنی سمت متوجہ پا کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔  
”میں محسوس کر رہا ہوں تم بچوں کی طرف سے غافل ہو رہی ہو، اس کی کوئی خاص وجہ؟“ اس فرد جرم نے فاطمہ کو متعجب کیا یہ سراسر الزام تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کی تردید کر سکی نہ اپنی صفائی پیش کر سکی۔  
”اب حقوق کی طرح میرا منہ کیوں دیکھنا شروع کر دیا، جاؤ اور سوئی دھاگہ لے کر آؤ میں جلدی میں ہوں اور شرٹ کا بٹن ڈھیلا ہے۔“ اس کی خاموشی و مبر کے جواب میں عباس کی جھنجھلاہٹ بھری تار تھی۔  
”شش..... شرٹ..... دے دیں۔“ وہ اس کی نظروں سے خائف ہٹا کر بولی۔ جواب میں عباس نے اسے غصے سے گھورا۔  
”کہاں تا نام نہیں ہے زیادہ میرے پاس۔“ وہ ناچار اس کے قریب آئی عباس کے تیور اس کی نظریں سب سے بڑھ کر اس کی حواسِ محسوس کر دینے والی طلسمی قربت ہی سارا کام خراب کرتی تھی۔ اب بھی انجام سامنے تھا اس کا ہاتھ بہکا اور سوئی عباس کے سینے میں جا لگی فاطمہ کی گھبراہٹ و سراسیمگی کا حال دیکھنے لائق تھا۔ غلطی بھی اس نے کی تھی اور جتنی بھی وہی تھی۔ وہ اتنا بوکھلائی کہ اپنا ہاتھ متاثرہ جگہ پر رکھ کر خون روکنا چاہا۔ اس کے ہر انداز سے ہی اضطراب جھلک رہا تھا۔  
”اوہ شٹ، بے ڈھنگی عورت، ہو پوری کوئی کام جو سلیقے سے کرنا آتا ہو تان سینس، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ اسے رونے کو تیار پا کر عباس نے بے حد خشونت سے کہتے اسے بے دردی سے ہاتھ مار کر پیچھے دھکیلا اور اپنا غصہ میز کو ٹھوکر مار کر اتارا۔

”آئی ایم ساری عباس مجھے پتا نہیں چلا پتا نہیں کیسے..... زیادہ لگ گئی ہے نا آپ کو کوئی دوا لگا دوں۔“ اتنی مضطرب اور بے چین تھی کہ سارے گریز اور احتیاط بھلائے اس کے پاس آئی اور اس کا بازو پکڑ کر گویا مٹانا چاہا۔ عباس نے جھٹکرا سے دیکھا۔  
”بلیوی عباس میں ایسا کبھی نہیں چاہ سکتی کہ آپ کو تکلیف دوں۔“ عباس کی نگاہ اس کے اجلے چہرے پر موجود بلا کی جاذبیت اور مسحور کن دلکشی میں ناچا پتے ہوئے بھی بھٹکنے لگی اسے چونکا نے کا باعث فون کی گھنٹی تھی۔  
”السلام علیکم.....!“ اس نے انجان نمبر سے آئی کال کو ریسیو کیا اور اپنے مخصوص دینگ انداز میں سلام کیا تھا۔ دوسری جانب کی بات سنتے ہوئے اس نے پلٹ کر ایک نگاہ آنسو پونچھتی بے گل سی فاطمہ پڑا لی۔  
”جی..... میں عباس حیدر بول رہا ہوں..... آپ کون؟“ دوسری جانب سے جو کہا گیا اسے سنتے ہی اس کی نگاہ میں تپش اترنے لگی تھی اس نے شخص ہنکارا بھر اور فون بند کر دیا۔ پھر پلٹ کر فاطمہ کے پاس آیا تو اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔  
”تم نے کہا تھا تم انڈیا سے ہو، ہے نا؟“ فاطمہ نے گھبرا کر محض اثبات میں سر ہلایا۔  
”مگر وہ جو تمہارے متعلق استفسار کر رہا ہے اس کا تعلق امریکہ سے ہے کون ہے یہاں براہیم؟“  
اس کی سائیس پھنکاریں مادر ہی تھیں اس کے سرد لہجے میں سخت گیر شوہروں کا سا استحقاق کرختی اور تلخی تھی فاطمہ کا رنگ بالکل نفی ہو کر رہ گیا۔ وہ کسی ابراہیم نامی شخص کو نہیں جانتی تھی اسے طبعی سمجھ نہیں آ سکی کہ وہ عباس کو اس بات کے جواب میں کیا کہے اس کا دل ہولنے لگا اور جیسے پاتال میں گرنا چلا گیا۔

(جاری ہے)







محکمہ اعلیٰ  
اداریہ

READING  
Section



چاہا ہے اس کو روح کی سچائیوں کے ساتھ  
زندہ ہوں اپنی ذات کی تنہائیوں کے ساتھ  
روکا نہیں تھا اس کو پچھرتے وقت بھی  
اپنی وفا پہ ناز تھا سچائیوں کے ساتھ

### گزشتہ قسط کا خلاصہ

فاطمہ تمام احوال زینب کو سناتی ہے کہ عباس اسے عریضہ کا قاتل سمجھتا ہے جبکہ دوسری طرف زینب یہ تمام باتیں عباس کو بتانے اور ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کا کہتی ہے لیکن فاطمہ اس سب کے لیے تیار نہیں ہوتی جبکہ دروازے کے باہر کھڑا عباس فاطمہ کی تمام باتیں سن کر بھی اسے سازش کا نام دے کر نظر انداز کر دیتا ہے۔ دوسری طرف فراز شرجیل کے گھر کے لیے روانہ ہوتا ہے اور وہاں پہنچ کر اس کا سامنا جس شخص سے ہوتا ہے وہ حیران ہی رہ جاتا ہے۔ امامہ اور لاریب زارون کو اپنے ہمراہ لے جانا چاہتی ہیں جس پر شرجیل انہیں اجازت دے دیتا ہے۔ اسپتال سے واپسی پر عباس کا سامنا فراز علوی سے ہو جاتا ہے وہ عباس کے ساتھ فاطمہ کو دیکھ کر چونک جاتا ہے اور یہ سن کر مزید متاثر نظر آتا ہے کہ فاطمہ نے اسلام قبول کر لیا ہے وہ ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر بے حد مسرور نظر آتا ہے جبکہ عباس کا لہجہ انتہائی سرد رہتا ہے۔ سکندر دوسرے گھر میں شفٹ ہونے کے لیے تیاری کرتا ہے لیکن ساتھ ہی فراز اور نبیل کو بھی اپنے ہمراہ رکھنا چاہتا ہے۔ فراز باتوں کے دوران سکندر کو ابراہیم احمد فاطمہ اور عباس کے متعلق بھی بتاتا ہے جبکہ سکندر بے دھیانی میں اسے سنتا رہتا ہے جب ہی ثانی اماں سکندر کے جانے کا سن کر حیران رہ جاتی ہیں وہ سکندر کو صالحہ سے شادی کرنے کا کہتی ہیں جبکہ سکندر اپنی شادی کا ذکر کر کے ان کے تمام ارمانوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ فاطمہ کی خراب طبیعت کا سن کر اماں جان اور عباس

کی دونوں بہنیں اچانک وہاں پہنچ جاتی ہیں اماں جان عباس کی بے پروائی پر اسے سخت سناتی ہیں جبکہ فاطمہ بوکھلا جاتی ہے ایسے میں عباس اپنا غصہ فاطمہ پر اتارتا ہے۔ ابراہیم احمد باتوں کے دوران فراز سے اپنی بہن کیتھی کی گمشدگی کا ذکر کرتے پریشان ہوتا ہے جب ہی فراز اس کی مدد کرنے کے ارادے سے تمام کوائف جاننا چاہتا ہے اور ابراہیم کے نام سے نندنی کا نام سن کر وہ چونک جاتا ہے کیونکہ نندنی گریوال سے تو وہ بخوبی واقف تھا جب ہی دوسری طرف ایمان کے ہوش میں آنے کی خبر سن کر ان کی بات درمیان میں ہی رہ جاتی ہے۔ بابا جان اور دیگر افراد بھی ایمان سے ملنے پہنچ جاتے ہیں جبکہ ایمان ان سب کو سامنے پا کر نہایت خوش ہوتی ہے۔ امامہ کی وقاص سے شادی کا سن کر اسے حیرت ہوتی ہے لیکن لاریب وقاص کے رویہ کی تبدیلی کا بتا کر اسے اطمینان دلاتی ہے جبکہ دوسری طرف لاریب کی سکندر سے شادی بھی ایمان کے لیے کافی حیران کن بات ثابت ہوتی ہے لیکن لاریب ایمان کو مزید پریشانیوں سے بچانے کی خاطر اپنے خوش ہونے کا تاثر دیتی ہے۔ سکندر ان تمام حالات میں خود ترسی کا شکار ہو جاتا ہے کہ اسے کسی نے بھی خوشیوں میں شریک نہیں کیا جب ہی بابا جان سکندر کے دفتر پہنچ کر اسے حیران کر دیتے ہیں۔ اس کا رونا مے کے پیچھے بھی فراز کا ہاتھ ہوتا ہے وہ ہی انہیں یہاں تک لاتا ہے۔ شرجیل کا یکسر بدلا ہوا انداز ایمان کو نئی خوشی فراہم کر دیتا ہے۔ دوسری طرف ابراہیم احمد کا فون عباس کو سخت اشتعال میں مبتلا کر دیتا



ہے۔ فون بند کر کے وہ کڑے تیوروں میں فاطمہ سے استفسار کرتا ہے کہ ابراہیم کون ہے اور امریکا نژاد یہ شخص اسے کس حیثیت سے جانتا ہے۔ فاطمہ عباس کے روپ میں سخت گیر شوہر کو دیکھ کر بوکھلا جاتی ہے اسے لگتا ہے کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ پول پائے گی کیونکہ ابراہیم نامی کسی شخص کو وہ جانتی تک نہ تھی۔

(اب آگے پڑھیے)



”وہ ملنے آ پاہوا ہے تم سے..... چلو۔“ عباس کے لہجے میں غیر معمولی سختی اور سرد پن تھا۔ اس نے اس کا بازو کہنی سے پکڑ کر اسے دروازے کی جانب دھکا دیا۔ فاطمہ لڑکھرائی۔ وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ اس پل اس کی ہر صلاحیت اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ عباس انتہائی جارحانہ طریقے سے تقریباً گھسیٹتا ہوا اسے ساتھ لایا تھا۔

”ابھی تمہارے سارے سچ اور جھوٹ کھل کر سامنے آ جائیں گے۔ لیکن یاد رکھو، اگر تم جھوٹی نکلیں تو میں جان سے مار ڈالوں گا تمہیں۔“ ڈرائنگ روم کے دروازے پر رک کر عباس نے اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ لہجہ انتہائی تلخ تھا۔ فاطمہ نے ہر اسان نظروں سے اسے دیکھا۔

اس کی نظر کسی مجرم کی مانند جھکی ہوئی اور رنگت زرد ہو رہی تھی۔ ابراہیم نے اس ڈری سہی مگر یکسر تبدیل حلیے والی اس نئی انوکھی کیتھرائن کو دیکھا جواب فاطمہ تھی۔ جس کا لباس خالصتاً مشرقی اور شرم و حیا کے سب تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ جو اپنے حسین و باوقار اور بے حد گریس فل ہم سفر کے پہلو میں کھڑی تھی۔ شعوری یا لاشعوری طور پر اس کے دل نے مشرف باسلام ہونے کے بعد اپنی ماں سریتا دیوی اور اپنی بہن کیتھرائن کا ایسا ہی تصور قائم کیا تھا اس کا دل بے اختیار اللہ کے آگے سر بسجود ہوا تھا۔ اس کی ایک تمنا تو اس تعریفوں والے رب نے مکمل طور پر پوری کر دی تھی۔

”کیتھرائن..... نہیں، نہیں فاطمہ، فاطمہ تم نے مجھے

پہنچانا نہیں میں ابراہیم احمد ہوں تمہارا بھائی، بھول گئیں تم؟“ وہ بے اختیار آگے بڑھا تھا اور جھکے سروالی خائف سی فاطمہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس پل وہ کچھ ایسا مشکور ایسا مسحور تھا کہ عباس کو یکسر فراموش کر گیا تھا جو ساکن کھڑا تھا۔ ابراہیم احمد کے الفاظ نے اسے خود اس کی نظروں میں عجب شرمندگی سے دوچار کر ڈالا تھا۔ اس نے الجھ کر ایک خفت بھری نگاہ فاطمہ پر ڈالی، وہ خاموش لب بھینچے دونوں بہن بھائی کا ملاپ دیکھتا رہا۔ جو واقعی اس وقت اسے فراموش کر چکے تھے۔

اس نے خوشی سے نہال ہوتی فاطمہ کو دیکھا شک و شبہ کی گنجائش ہی کہاں تھی اس شفاف لڑکی کا کردار بھی اس کی صورت کی طرح بے داغ تھا۔ وہ اس پر شک کر کے ہمیشہ شرمندہ ہوا تھا اور یہ لڑکی ہمیشہ کی طرح سر بلند باوقار کھڑی تھی۔

”ڈیڈ کیسے ہیں بھائی، مجھے سب سے زیادہ وہی یاد آتے ہیں۔“ اس نے پھر فاطمہ کو دیکھا جو ابراہیم کے بازو سے لگی بیٹھی تھی جیسے کوئی بے حد آسودہ اور بے فکر سی لڑکی ہو۔ تب ہی ابراہیم اس کی جانب متوجہ ہوا اور یکدم جھل ہوا مگر پھر تپاک سے اسے ملنے لگا۔

”آئی ایم سوری ایچولی اتنی ایکساٹمنٹ تھی کہ میں آپ.....!“ ابراہیم احمد نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے سلام کے بعد اسی خجالت آمیز انداز میں کہنا چاہا تو عباس آہستگی سے مسکراتا اس کا ہاتھ تھپک کر رہ گیا۔

”اس آل رائٹ میں سمجھ سکتا ہوں، تشریف رکھیے آپ۔“ ابراہیم احمد کی شخصیت میں کچھ ایسا وقار ایسا بدبہ اور مقناطیست تھی کہ عباس اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا کچھ دل پر جے میل کے دھل جانے کے باعث شرمندگی کا فطری سا تاثر بھی تھا۔ اس نے بہت گرجموش انداز میں ابراہیم احمد کا ہاتھ تھام لیا اور صوفے پر بٹھایا۔

”فاطمہ کے حوالے سے آپ سے ملنا مجھے روحانی مسرت سے ہمکنار کر رہا ہے، عباس صاحب! مجھے خوشی ہے میری بہن کا شریک حیات ایسا بھرپور اور شاندار ہے



”ہاں بالکل ہاتھ پیر باندھ کر ڈال دو مجھے اس شخص کے آگے تاکہ وہ پرانے بدلے تو چکا سکے۔“ اسے پتا نہیں کیوں اتنا غصہ آنے لگا تھا دل الگ بھرا جاتا تھا عجیب کیفیت تھی جسے وہ خود سمجھ نہ پاتی۔ غم نہ خوشی بس ایک خالی پن تھا، ایمان اس کی کیفیات سے بے خبر تھی جیسی دھیرے سے ہنس دی۔

”یہ بات تم سکندر کے علاوہ کسی اور کے لیے کہتیں تو میں یقین کر سکتی تھی۔“ اس اندھے یقین پر لاریب کے دماغ میں انکارے سے سلگے، اس نے بھنا کر اسے دیکھا۔

”مجھے سمجھ نہیں آتی آخر اس شخص نے کیا گھول کر پلا دیا ہے آپ سب کو؟“

”محبت کو سمجھتے ہیں ہم بس اتنی سی بات ہے بہتر ہے اب تم بھی سمجھ لو، ویسے ایک بات ہے سکندر بہت بدل گیا ہے ریلی، کل آیا تھا نا، میں تو حیران رہ گئی۔ اتنا گڈ لکنگ لگ رہا تھا کہ پہلی نظر میں پہچان ہی نہ پائی، خیر شاندار تو وہ ہمیشہ سے تھا مگر شخصیت پالشڈ ہونے کے باعث مزید چارمنگ ہو گئی ہے۔“ ایمان کے لہجے میں سچی ستائش کے رنگ تھے۔ لاریب نے دانستہ خاموشی اختیار کیے رکھی۔ ایمان کی اس بات سے تو وہ بھی سو فیصد متفق تھی۔ واقعی سکندر بہت تبدیل ہو گیا تھا ہر لحاظ سے اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے دیکھا تھا جانے کس جذبے سے مغلوب ہو کر بلیک پینٹ کوٹ میں ملبوس سانولی نکھری رنگت اور تیکھے کھڑے نقوش کے ساتھ غضب کی اسمارٹنس اسے پہلے سے بہت منفرد بہت الگ بنا رہی تھی۔ سب سے اہم چیز اس کی آنکھوں کی سرد مہری اور چہرے کی بے نیازی کا تاثر تھا۔ بہت سے منہی خیال تھے جو اسے بے چین کرتے تھے مگر وہ ہر بار سر جھٹک جاتی تھی۔

”ویسے ہے نا یہ مزے کی بات کہ ہم دیورانی جھٹانی بن گئی ہیں۔ شرجیل بتا رہے تھے سکندر کی خواہش ہے ہم سب مل کر ایک گھر میں رہیں۔“ ایمان کے مسکرا کر کہنے پر لاریب محض اسے دیکھ کر رہ گئی۔

شکر ہے اللہ کا، ورنہ میں واقعتاً اس کی جانب سے فکر مند تھا اللہ آپ کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے کتنا عرصہ ہوا آپ کی شادی کو؟“ ابراہیم احمد اپنے مخصوص انداز سے ہٹ کر گفتگو کر رہا تھا۔ فاطمہ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

”بہت زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا ہمارے دو بچے ہیں ماشاء اللہ فاطمہ بچوں کو ان کے ماموں سے نہیں ملوا میں گی آپ؟“ عباس حیدر کے جواب نے فاطمہ کو ششدر کر ڈالا تھا صاف ظاہر تھا کہ وہ اس پر بھی دوسری شادی والا معاملہ عیاں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ عجیب تھا یہ شخص کبھی مہربان تو کبھی سرے سے ہی نا آشنا۔

”سلیم سے چائے کا بھی کہہ دیجیے گا۔“ عباس نے نرمی سے ٹوکا۔



”ہم کل چل رہے ہیں گاؤں، وہیں سے باقاعدہ تمہاری رخصتی ہوگی سکندر کے ہمراہ۔ بابا جان نے بتایا ہے مجھے کہ تم بہت پر اہم کری ایٹ کرتی رہی ہو ان کے لیے۔“ ایمان کے کہنے پر وہ سر جھکائے بیٹھی انگلیاں مسلتی رہی، سکندر کل بھی آیا تھا یہاں ایمان کی خیریت دریافت کرنے وہ دانستہ یا نادانستہ سامنے نہیں آئی۔ اب پتا نہیں یہ جھجک گریز اور حیا تھی یا پھر شرمندگی کا کوئی تاثر، اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا سکندر اس کے متعلق کیا تاثر لے کر یہاں سے گیا ہوگا۔

”وہ اچھا انسان ہے لاریب، سب سے بڑھ کر بہت محبت کرتا ہے تم سے، محبتوں کی قدر تو کرنی چاہیے نایا پھر میں سمجھوں کہ تم ابھی تک!.....“

”پلیز باجو..... مجھے مزید کانٹوں پر مت گھسیٹیں۔“ اس نے کہا تو ایمان نے سر آہ بھری۔

”چلو تمہاری وجہ سے ہی سہی مگر سکندر کو اس کی اصل پہچان اور مقام تو مل گیا لیکن سن لو اب تم انہیں ہرگز بھی تنگ نہیں کرو گی۔“ ایمان اس کے ہمراہ مارکیٹ آئی تھی ضروری شاپنگ کے بعد اب اس کی برین واشنگ جاری تھی مگر اس آخری بات پر لاریب جھنجلا گئی تھی۔



رنگارنگ کہانیوں کے آراستہ دلچسپ جریہ

AANCHALPK.COM

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے



قندرزات

دنیا کو تسخیر کرنے والی انسانیت کو اپنی انگلیوں پر بچانے والے ذات کے قلندر کا حوالہ امجد جاوید کی قلندرانہ تحریر

دید بان

عالمی سازشوں کے پس منظر میں وطن پرستوں کے لیے بطور خاص ارشد علی ارشد کا ایک دلچسپ ناول

جہالت سکھ

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی دلگداز داستان جو کلاسیک داستانوں میں شمار ہوتی ہے

AANCHALNOVEL.COM

قارئین کی دلچسپی کیلئے خوبصورت سلسلے

خوشبو سخن: منتخب غزلیں، نظمیں۔ ذوق آگہی اقتباسات، اقوال زریں، احادیث وغیرہ معروف دینی اسکالر حافظ شبیر احمد سے اپنے دنیاوی مسائل کا حل جانے

پرچہ ملنے کی صورت میں رجوع کوٹ (021-35620771/2)

”ہاں، اب وہ اس قابل تو ہے کہ دوسروں کے فیصلے کر سکے۔“ اس نے سلگ کر سوچا۔

”مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے آؤ پہلے کچھ کھاتے ہیں۔“ ایمان نے اس کا ہاتھ پکڑا اور قریبی ریسٹورنٹ کی جانب بڑھ گئی۔ گلاس ڈور دھکیل کر اندر داخل ہوتے لاریب سے کوئی بہت عجلت میں باہر آتا زور سے ٹکرایا تھا کچھ ایسے کہ اس کے کان سے لگا ہوا سیل فون اس تصادم میں چھوٹ کر دور جا گرا۔ لاریب نے جھلا کر غصے میں سر اونچا کیا مگر منجمد ہو کر رہ گئی سکندر اس کے سامنے کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کی اس پر تپش نگاہوں کا ہی احساس تھا کہ لاریب کی لابی پلکیں لرز کر حیا پار انداز میں جھکی اور چہرے پر متمتاہٹ کی دھنک بکھرنی چلی گئی ایمان کی شرارت آمیز کھنکار پر سکندر صرف چونکا ہی نہیں خفت زدہ ہو کر رہ گیا تھا۔

”بھئی اب کیا کریں ہم ہماری کوشش تو پوری تھی دلہن کو اچھی طرح سے دلہا سے چھپایا جائے مگر سارا کام ہی چوپٹ ہو گیا۔“ ایمان کی مچلتی مسکان اور شریر نظریں لاریب کو پوری طرح کنفیوژ کرنے کا باعث تھیں جیسی اس نے غیر محسوس انداز میں ایمان کے وجود کی آڑ لی تھی۔ البتہ اس کے برعکس سکندر اس وقتی کیفیت سے نکل کر بے حد نارمل بلکہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا وہی گہبھر سنجیدگی جس میں کل بھی اس نے سکندر کو پایا تھا۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے اب؟“ ایمان سے محو گفتگو وہ بہت خوبی سے لاریب کو نظر انداز کر رہا تھا جس کی پلکیں لرزتی تھیں اور اوپر نہیں اٹھتی تھیں ایمان دھیرے سے ہنس پڑی۔

”یہ سوال تو تمہیں میرے بجائے لاریب سے کرنا چاہیے تھا کل بھی تم اس سے نہیں مل پائے تھے۔ موقع اچھا ہے کر لو اس سے دو باتیں۔“ سکندر نے دیکھا ایمان کی آنکھیں بھر پور شرارتی انداز میں جگمگا رہی تھیں وہ کم از کم اسے ہرٹ نہیں کر سکتا تھا۔

”یہ تو بہت مواقع آئے بھی اور آئیں گے بھی آپ



پیارے بچے وہ خود نیٹ اینڈ کلیں، ابھی کچھ دیر پہلے نہائی تھی غالباً جیسی ہلکی نمی لیے بالوں کا سیاہ آبشار پشت پر سیدھا گرتا اس کی دلکشی و سحر انگیزی میں اضافے کا باعث بن رہا تھا۔ وہ اسے دیکھے گیا۔ کیا تھی وہ بے حد عجیب و منفرد کم از کم اس کی سمجھ سے تو بالاتر تھی۔ اگر محض اس کی خاطر وہ ہر نقصان جھولی میں ڈال کر راستے کی ہر مشکل کو عبور کراتی تھی تو دریا کے پاس پہنچ کر یہ قناعت یہ صبر انوکھا تھا سمجھ میں قطعی نہ آنے والا کم از کم اس میں تو اتنا صبر نہیں تھا۔ اسے عجیب سا احساس گھیرنے لگا۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں تو اس نے رخ پھیرا اور کھڑکی سے ہٹ کر الماری کھول کر کھڑا ہو گیا۔ مہرون مخملیں جلد کے سنہرے رنگ سے مزین البم میں عریشہ کی لاتعداد تصویریں یادگار کی صورت میں موجود تھیں۔ اس کے دل کے داغ لودینے لگے۔ اس کی سحر طرازا آنکھیں سے آنسو گرنے لگیں۔

”میں تمہیں نہیں بھول سکتا عریشہ میں تمہاری جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتا۔“ عریشہ کی ایک ایک تصویر کو بار بار چومتا وہ پھر حال سے بے حال تھا وہ پھر خود کو فراموش کر رہا تھا۔

”میں تم سے شرمندہ ہوں میں نے تمہاری ناپسندیدگی کے باوجود اس لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا وہ میری خوشی کبھی نہیں تھی۔ وہ میری خوشی کبھی بن بھی نہیں سکے گی۔ وہ جیسے میری مجبوری تھی جیسے ہے ویسے ہی رہے گی۔ عریشہ پلیز میرے اس عمل پر مجھ سے خفا نہ ہونا۔“ وہ اسی وحشت کے حصار میں تھا جب اس کا سیل فون گنگنا نے لگا۔ عباس نے توجہ نہیں کی دل درد سے بوجھل تھا اور وجود میں نارسائی اور دائمی جدائی کا احساس اپنے نوکیلے پنجے گاڑ رہا تھا۔ فون پانچویں بار پھر بجنا شروع ہوا، اسے ناچاہتے ہوئے بھی اٹھنا پڑا۔

”السلام علیکم!“ اس نے کال ریسپونڈ کی مگر لہجے کی نمی اور تھکن پر قابو نہیں پاسکا نمبر انجان تھا۔

”وعلیکم السلام، ساحر کیسے ہو، ملنے آ رہا ہوں تمہیں گھر پر ہی ہونا۔“ دوسری جانب سے بڑے نخوت بھرے انداز

اپنا خیال رکھیے گا چلتا ہوں کچھ جلدی ہے۔“ وہ گھڑی دیکھ رہا تھا ایمان نے بھنویں اچکا کر لاریب کی طرف نظر کی جو جھکے سر جھکی پلکوں کے ساتھ گریزاں سی کھڑی تھی۔ اسے اپنی اس کیفیت پر جھنجلاہٹ بھی ہو رہی۔

”کیوں نہیں، لیکن بہتر ہوتا تم ہمارے ساتھ ٹھہرتے، سکندر میں لاریب کا ویڈنگ ڈریس بھی لے رہی ہوں اپنی پسند کا کٹر ہی بتا دو۔“ ایمان نے پھر اسے گفتگو میں گھسیٹا تو وجہ یہی تھی اسے ان کے معاملات کی گھبراہٹ کا اندازہ نہیں تھا سکندر جو معذرت کرنے والا تھا اس آخری فقرہ پر چونک کر متوجہ ہوا۔

”ان تکلفات میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے ہماری باقاعدہ شادی ہو چکی ہے شاید آپ کو پوری بات معلوم نہیں۔“ لاریب پر ایک جھنجلائی اور جھلستی نظر ڈال کر وہ بظاہر نارمل انداز میں کہہ رہا تھا تو ایمان کا ہی لحاظ تھا ورنہ اس کے لہجے میں جو سرد مہری تھی وہ لاریب ضرور محسوس کر سکتی تھی۔

”لیکن میں نے لاریب کو دلہن بنے نہیں دیکھا تھا اب ہم باقاعدہ دلہن بنا کر دیں گے تمہیں اپنی لڑکی۔“ وہ اسی مگن و سرشار انداز میں ہنس کر کہہ رہی تھی۔ سکندر نے ہونٹ بھیجنے لیے ایک بار پھر معذرت چاہی اور پلٹ کر چلا گیا۔ لاریب پر کوئی خصوصی نگاہ ڈالے بنا۔ لگتا ہی نہیں تھا یہ وہی سکندر ہے لاریب کے اندر پہلے حیرانی پھر سنائے اترنے لگے۔

”دیکھا تم نے کتنا گریس فل اور شاندار ہو رہا ہے اپنا سکندر، اب بالکل نچے گا تمہارے ساتھ، یہاں تک کہ تم پورے فخر سے اسے عباس حیدر سے بھی متعارف کرا سکتی ہو۔“ ایمان کی بات پر لاریب نے کسی کرب سے گزرتے ہوئے بے دردی سے ہونٹوں کو کچلا تھا۔



عباس کھڑکی میں کھڑا لاؤنج میں بچوں کے ساتھ مصروف فاطمہ کو دیکھ رہا تھا۔ دیا اس کی گود میں تھی جبکہ اسامہ اپنے کھلونوں میں مصروف، صاف ستھرے بے حد



”تشریف رکھیے۔“ سلام کا جواب دیتے اس نے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔

”اللہ کا شکر ہے تم اب ٹھیک ہو ساحر ورنہ چند ماہ قبل تو تمہیں دیکھ کر یہ کہنا محال تھا کہ تم پھر سے نارمل زندگی کی طرف پلٹ آؤ گے۔“ سعید صاحب کے انداز میں اس کے سحر انگیز سراپے کے لیے واضح ستائش کا رنگ تھا۔ عباس خاموش رہا اسے ان کی اس بات کے ساتھ بہت کچھ ایک ساتھ یاد آیا۔ اپنی دیوانگی بھری وحشتیں، ان لوگوں کی خود غرضی، بے حسی اور سفاکی اور کسی نازک سے وجود کی ہمدردی و محبت سے لے کر توجہ و بساط سے بڑھ کر قربانیاں بھی اس کی آنکھیں جانے کس احساس کے تحت جلیں، کس جذبے کے ساتھ سرخ تر ہوئیں، وہ منتظر رہا کہ وہ خود ہی اپنی آمد کے بارے میں بتانے کی زحمت کریں۔

”مجھے بچوں کی بہت فکر تھی ساحر، دراصل بچے اتنے چھوٹے ہیں کہ ماں کے بغیر نہیں رہ سکتے گورنس جتنی بھی اچھی سہی مگر بہر حال ملازمہ ہوتی ہے اور کبھی ماں ثابت نہیں ہو سکتی۔“ وہ تمہید باندھ رہے تھے۔ عباس ہونٹ بھینچے سنجیدہ نظروں سے انہیں تکتا رہا۔ حالانکہ اس کے اندر بہت کھولن تھی۔ اس کے پاس ان کی سنگدلی اور بے حسی کو جتانے کا یہ بہترین موقع تھا مگر عباس کے مزاج میں سطحی پن نہیں تھا وہ شروع سے اعلیٰ ظرفی کا قائل تھا یہ عادت اسے بہت سے مقامات پر شرمندگی سے بچا کر ایک ممتاز درجہ عطا کرتی رہی تھی۔

”میں علیحدہ کے متعلق سوچ رہا ہوں، دونوں بچے بہن کی اولاد ہیں اس کے گویا اپنے ہی بچے سیانوں نے کہا ہے ماں مرے ماسی جیسے تمہارا کیا خیال ہے؟“ اپنی بات کہہ کر وہ اسے تکتے لگے، ان کی بے شرمی، ڈھٹائی کمال درجے کی تھی عباس کا ضبط ہارنے لگا۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور آنکھوں میں سرخیاں گہری ہو رہی تھیں مگر وہ خاموش تھا سعید صاحب کو اس کی اس خاموشی سے الجھن ہوئی تھی۔

”کچھ کہو نا ساحر۔“ وہ اپنی جگہ جزبہ ہونے لگے۔

اور روکھے لہجے میں گفتگو کا آغاز ہوا تھا۔ عباس نے بے طرح الجھ کر سیل فون کان سے ہٹا کر از سرے نو نمبر دیکھا۔

”آپ..... معذرت خواہ ہوں آپ..... پلیز اپنا نام بتانا پسند فرمائیں گے۔“ اس کے بھاری لہجے میں ہچکچاہٹ درآئی تھی۔ دوسری جانب یلکھت گمبھیر سناٹا چھا گیا۔

”میں سعید احمد ہوں، عریضہ کا بھائی۔“ لہجے کے طنز میں سرد مہری بھی شامل ہو گئی۔ عباس کے چہرے کے تاثرات میں بہت تیزی سے تبدیلی رونما ہوئی تھی۔

”فرمائیے کیسے یاد کیا آپ نے؟“ اس کا لہجہ روڈ تھا۔ عریضہ کی موت اور اس کی غفلت کے بعد جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد ان رشتوں کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ اس نے ملازموں کے بتانے پر کہاں یقین کیا تھا۔

عریضہ کے ساتھ ساتھ اس کا ہر حوالہ بھی اس کے لیے معتبر اور اہم تھا۔ ہر عیب ہر شک سے پاک، جہی فاطمہ سے بچے واپس چھین کر اس نے اسی مان اسی زعم میں انہیں نہیال کے حوالے کرنا چاہا تھا۔ تب وہ باتیں تمام تر حقیقت کی گنجی کے ساتھ اس پر واضح ہو گئی تھیں۔ جنہیں کسی اور کی زبانی سن کر اسے یقین نہ آ سکا تھا۔ پھر اب دوبارہ سے بحال کیا جانے والا یہ رابطہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

”آ رہا ہوں تمہارے پاس، پھر بتا بھی دیتا ہوں۔“ اب کہ انہوں نے کسی قدر بے تکلف انداز اور صلح جو لہجے میں کہا تھا عباس نے سیل فون کان سے ہٹا کر رابطہ منقطع کیا اور فون میز پر ڈال دیا۔ سگریٹ سلگا کر کش لگاتے ہوئے وہ سعید صاحب کی اس اچانک آمد کے مقصد کو سوچنے پر مجبور ہوا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی ملازم نے سعید کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ عباس نے سگریٹ ایش ٹرے میں پھینکا اور اٹھ کر کھڑا ہوا۔

”السلام علیکم کیسے مزاج ہیں۔“ اسے ڈرائنگ روم کے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر سعید احمد اس سے بہت تپاک سے ملے اس کے برعکس عباس کا انداز لیا دیا اور سپاٹ تھا۔



اور سر پرست ہونے کی حیثیت سے ان کے متعلق ہر فیصلہ کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں بہتر ہے اب آپ تشریف لے جائیے۔“ سعید صاحب کا حکم بھرا مداخلت کرنا اندازاً اسے بھڑکا گیا۔ جبھی وہ طیش کو دبائے اتنی لمبی سے بات کر رہا تھا۔

”تم نے بہت غلط کیا ساحر، مزید غلط تمہارا رویہ ہے میں بخشوں گا نہیں تمہیں، بتا رہا ہوں بہت برا انجام سامنے آئے گا تمہارے یاد رکھنا۔“ سعید کے لہجے میں سفاکی در آئی تھی۔ مگر عباس متاثر نہیں ہو سکا۔

”بہتر ہے آپ یہ دھمکیاں کسی اور کو دیں، جائیے یہاں سے۔“ عباس ان کے انداز و اطوار پر بھر سا گیا تھا۔ سعید صاحب تن فن کرتے سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتے رخصت ہو گئے تھے عباس پلٹا تو اس کی سبز آنکھوں میں ہلکا سا تفکر چھلک آیا تھا۔ عریشہ کی ٹیبل کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے کسی بہتر حکمت عملی اور احتیاط کو اپنانا ضروری تھا۔ وہ اب مزید کسی نقصان کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

جس طرح نازک حالات میں ان لوگوں نے یہاں لوٹ مار کی تھی اس سے وہ اندازہ تو کر سکتا تھا ان لوگوں کے نزدیک رشتوں سے زیادہ دھن دولت اہم تھی۔ عریشہ سے بھی وہ اسی دوران مہنگے ترین تحائف وصول کرتے تھے۔ آئے دن منعقد ہونے والی برتھ ڈے اور اینورسری، نیو ایئر اور دیگر فضول پارٹیز میں۔ عریشہ اپنے بہن بھائیوں اور ماں کو نہ صرف ہولنگ کرائی بلکہ تحائف میں گولڈ کی چیزیں فراخ دلی سے دے دیا کرتی عباس نے کبھی ٹو کنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

عریشہ اس کے لیے سب کچھ تھی وہ معمولی گھر کا فرد نہیں تھا کہ ان باتوں کو ایشو بنا کر اس سے جھگڑا کرتا مگر اس وقت اسے برا ضرور لگا تھا جب عریشہ نے وہ قیمتی نیکلس بھی علیحدہ کو صرف اس وجہ سے دے دیا تھا کہ علیحدہ کو وہ پسند آ گیا تھا اس روز وہ عباس کے کہنے پر تیار ہوئی تھی تو عباس نے اسے وہی نیکلس پہننے کا کہا تھا۔

”یار چیزیں الماریوں میں بند کر کے رکھنے کو تو نہیں

”آئی تھنک آپ کو میری اور بچوں کی اتنی فکر کرنے کی اول تو ضرورت نہیں ہے پھر بھی آپ کی نسلی کے لیے بتا دوں کہ میں شادی کر چکا ہوں فاطمہ میرے بچوں کی بہترین ماں ثابت ہو رہی ہے آپ کو غالباً اور تو کچھ نہیں کہنا ہوگا۔“ سعید صاحب کے رنگ بدلتے چہرے کو اطمینان آمیز نظروں سے تکتا وہ جتنا پرسکون تھا سعید صاحب کو اسی قدر بے چینی نے آن لیا تھا۔

”کب کی تم نے شادی؟“ وہ شدید طیش میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”آئی تھنک یہ میرے پرسنل میٹر ہیں مسٹر سعید ضروری نہیں کہ میں انہیں تفصیلاً آپ سے ڈسکس کروں۔ سلیم مہمان کو چائے پیش کرو اور ان کے جانے کے بعد گیٹ اچھی طرح بند کر لینا۔“ اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے اس نے سعید صاحب کو ایک ساتھ بہت کچھ جتایا تھا۔ پھر خانسا ماں کو مخاطب کیا جو اس وقت چائے کے لوازمات سمیت پہنچا تھا ہتک اور ذلت کے شدید احساس نے سعید صاحب کو دہکا کر رکھ دیا۔

”بات سنو ساحر تم ایسے نہیں جاسکتے۔“ عباس کو اٹھ کر دروازے کی سمت جاتے دیکھ کر سعید صاحب ایک طرح سے اس پر جھپٹے تھے اور اس کے کوٹ کا کالر پکڑ کر کچھ ایسے جارحانہ انداز میں کھینچا کہ عباس جہالت کے اس مظاہرے پر گرتے گرتے بچا تھا۔

”واٹ نان سینس مسٹر سعید، آپ کو ایٹی کیٹس کا بھی لحاظ نہیں ہے۔“ وہ زور سے دھاڑا سعید صاحب نے جیسے سنا ہی نہیں حقیقتاً ان کی ذہنی حالت بگڑی گئی تھی۔

”تم ایسا نہیں کر سکتے اللہ جانے کس عورت کو نکاح کر کے اٹھا لائے ہو ہم اپنے بچے کسی ناقابل بھروسہ انجان عورت کے سپرد کیسے کر سکتے ہیں۔ تم ذرا تو عقل سے کام لو ساحر، چھوڑ دو اس عورت کو اور.....!“

”ایکسیوزمی مسٹر سعید ڈونٹ کر اس پور لمٹس اوکے، میں بتا چکا ہوں کہ یہ خالصتاً میرے ذاتی معاملات ہیں، اطلاعاً عرض ہے کہ وہ میرے بچے ہیں، میں ان کا باپ



تھا کہ اس کی تمام تر اعلیٰ ظرفی کے باوجود کم حوصلہ مفاد پرست لوگ اپنی روش سے باز نہیں آتے۔

”پہا.....پہا۔“ اسامہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے بھاگتا اس سے آ کر پلٹا تو عباس اپنی اذیت ناک سوچوں کے حصار سے نکلا اور خفیف سا چونکتے ہوئے اسامہ کو دیکھا پھر جھک کر نرمی سے اسے بانہوں میں بھر لیا۔ جو اپنی تو تلی زبان میں جانے کیا کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ابھی ایک سال کا ہوا تھا اور ممپا کے سوا کوئی لفظ بولنا نہیں سیکھ سکا تھا۔ عباس نے جھک کر اس کا گال چوما۔

”اسامہ بیٹے چپس بن گئے ہیں آپ کے آجائے۔“ فاطمہ اسے پکاری ہوئی اندر داخل ہوئی تھی مگر اسے عباس کی گود میں پا کر وہیں دروازے کے پاس تھم گئی۔

”بچوں کو پارک لے کر جانے کی ضرورت نہیں ہے چاہے کتنی بھی ضد کریں اس کے علاوہ گھر پر بھی محتاط رہنا، اوکے؟“ عباس اسامہ کو اٹھائے اس کے پاس آ گیا۔ اسے دیکھے بغیر اسامہ کو اسے تھماتے وہ سنجیدہ لہجے میں ہمکلام تھا۔ فاطمہ چونکی اور پریشان کن نظروں سے اسے دیکھا۔ یوں جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو مگر حوصلہ ناپید تھا۔

”کوئی آ کر بچوں سے ملنے کا کہے تو منع کر دینا چاہیے وہ کوئی بھی رشتہ دار ہو، سمجھ لیا۔“ عباس کی اگلی تنبیہ ایسی تھی کہ فاطمہ کے الرٹ ہو جانے والے حواس اضطراب بھی سمیٹ لائے اس نے بے چین ہو کر پھر عباس کو دیکھا۔

”سب خیریت ہے ناں؟“ عباس کو یہ سوال ناگوار گزرا تھا۔ جیسی تیز نظروں سے اسے گھورا۔ فاطمہ کو فی الفور اپنی غلطی اور بے مائیگی کا احساس ہوا تھا۔

”مجھے فضول سوال پسند نہیں ہیں جو کچھ کہا جائے بہتر ہے اس سے غرض رکھا کرو۔“ فاطمہ نے خفت زدہ چہرے کے ساتھ سر کو اثبات میں ہلایا اور اسامہ کو لیے پلٹ گئی۔ عباس کسی متفکرانہ سوچ میں مبتلا سگریٹ سلگا رہا تھا۔



چمن و باغ سب ہنس پڑے گل مسکرائے  
بہت بہت شکریہ آپ تشریف لائے

دیتا تمہیں، کم از کم ایک بار تو پہن کر دکھایا کرو مجھے۔“ اور جواب میں وہ کیسے بے فکرے انداز میں ہنسنے لگی تھی۔

”اب میں کیسے پہن سکتی ہوں عباس، وہ تو علیز نے لے لیا ہے۔“ اور عباس ٹھٹھک گیا تھا وہ سلور گولڈ کا ٹیکس تھا جس میں ڈائمنڈ لگے ہوئے تھے عباس نے کتنی چاہت سے اس کے لیے دی کے مہنگے ترین شاپنگ مال سے خریدا تھا اور عریشہ کے نزدیک اس کے لاکھوں کی مالیت کے محبت سے خریدے گئے تحفے کی اتنی سی قدر تھی کہ بہن کو تھما دیا تھا۔

”واٹ؟“ وہ حیرت سے چیخا تو عریشہ نکھیں پھیلا کر اسے کتنے غصے سے تنکے لگی تھی۔

”اس کی مالیت کا شاید اندازہ نہیں تھا تمہیں عریشہ کہ تم.....!“ مگر عریشہ نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی۔ کتنا بھڑک اٹھی تھی وہ یکدم۔

”کتنی ہلکی بات کر رہے ہیں آپ عباس، آپ کو شاید اندازہ نہیں ہے میں تو شرمندہ ہو کر رہ گئی ہوں علیہ سنے گی تو کیا سوچے گی بھلا میرے بارے میں کہ میرا شوہر جتنا مالدار ہے دل کا اتنا ہی کنجوس ہے۔ اف..... میری تو ساس نندیں بھی ساتھ نہیں کہ میں سمجھ لیتی یہ ان کے پڑھائے اسباق ہیں۔“ عریشہ کا رد عمل اتنا شدید تھا کہ بجائے خود شرمندہ ہونے کے اس نے عباس کو خواخوہ کی شرمندگی میں مبتلا کر ڈالا اور صرف یہیں پر اکتفا نہیں کیا تھا الٹا خود منہ پھلا کر بیٹھ گئی تھی۔ عباس کو ہی اسے جتن کر کے منانا بھی پڑا تھا۔

یہ عریشہ کا رویہ ہی تھا کہ چند ماہ بعد عریشہ کی والدہ نے چالیس لاکھ روپے ادھار مانگے داماد کو کاروبار کرانے کے بہانے تو عباس کو تمام تر ناگواری کے باوجود صرف عریشہ کی ناراضی سے بچنے کی خاطر رقم کا انتظام بھی کرنا پڑا تھا اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ بھی۔ اس کے باوجود اس کے دل میں عریشہ کی جانب سے بدگمانی نہیں آ سکتی تھی تو وجہ یہی تھی کہ اس کی خالص اور کھری محبت بدگمانی شکوک اور خچی کی گنجائش نہیں رکھتی تھی لیکن وقت اور حالات نے ثابت کیا



اس کا استقبال امامہ نے بے حد پر جوش اور شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ کیا تھا سکندر کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ بکھرتی چلی گئی۔

”کیسی ہیں آپ چھوٹی بی بی؟“ بابا سائیں سے ملنے کے بعد وہ اس کی سمت متوجہ ہوا تو اس کی روشن آنکھوں میں تبسم اتر رہا تھا۔

”الحمد للہ، آپ کے سامنے ہوں فٹ فٹ، آپ سنا ئے، ماشاء اللہ بہت بچ رہے ہیں۔“ امامہ نے اسے سر تا پا دیکھا بلیک ٹوپس میں اس کا دراز وجہہ سراپا بے حد اثر ٹیکٹو دکھائی دیتا تھا وہ محض انکساری سے مسکرانے لگا۔

”میں آپ کا شکر گزار ہوں بابا سائیں کہ میری غیر موجودگی میں آپ نے بابا اور اماں کا خیال رکھا۔“ سکندر کا بات کرنے کا وہی سابقہ انداز تھا۔ ویسا ہی قابل احترام لہجہ وہی جھکی ہوئی مودب نظریں وہ اب بھی ہر لحاظ سے وہی تھا۔ بابا سائیں کے ہر انداز سے اس کے لیے محبت چھلک رہی تھی وقت نے ثابت کیا تھا خدا کا یہ انتخاب بہترین تھا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں، یہ لاریب کی ذمہ داری تھی جو اس نے نبھائی میرا اس میں کردار بس اتنا ہے کہ تمہاری غیر موجودگی میں، میں نے بچی کو وہاں چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔“ بابا سائیں کے پر رسان انداز میں امامہ شرارتی انداز میں کھنکاری اور بھنووؤں کو جنبش دے کر اسے تکنے لگی۔

”تو اب آپ کو اگر شکریہ ادا کرنا ہے تو بجو کا کریں یا پھر گھر والی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے؟“ وہ ہنس رہی تھی سکندر محض مروتا مسکرایا تھا پھر اماں اور بابا سے ملنے کا کہتا وہاں سے اٹھ کر آ گیا اماں بابا کے قیام کے کمرے کی جانب بھی امامہ نے ہی اس کی رہنمائی کی تھی اور وہیں سے پلٹ گئی۔ دستک کو اٹھا سکندر کا ہاتھ اسی زاویے پر ٹھم گیا نیم وادروازے سے اندرونی منظر نظر آ رہا تھا۔

”میں نے آپ کا بیگ تیار کر دیا ہے اماں، بابا جان بتا رہے تھے سکندر آپ کو لینے آ رہے ہیں بابا نہ لیں تو آپ بھی تیار ہو جائیے گا۔“ بیگ کی زپ بند کر کے سیدھی ہوئی

وہ جیسے ہی پلٹی دروازے کی چوکھٹ پر سکندر کو کھڑے دیکھ کر جو رنگ اس کے چہرے پر اترے تھے وہ سکندر کو اپنی نظر کا دھوکہ محسوس ہوئے۔ بھلا اس کے روبرو وہ کیوں شرمانے لجانے لگی۔ اس کا تنفر اپنی جگہ قائم تھا۔ جیسی کچھ خاص تاثر دیے بغیر وہ بڑھ کر اماں سے ملنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

”آپ خفا تو نہیں ہیں نا اماں کہ اتنا عرصہ میں آپ سے رابطہ نہیں کر سکا۔“ لاریب کو نظر انداز کیے وہ پوری طرح سے انہی میں مگن تھا لاریب جھکی نظروں اور جھکے سر کے ساتھ ماں بیٹے کے لاڈ کا مظاہرہ دیکھ رہی تھی۔ اماں کے والہانہ انداز میں محبت بھی تھی خوشی و انبساط بھی وہ بار بار سکندر کی پیشانی چومتی اور دعاؤں سے نوازتی تھیں۔

”بابا کہاں ہیں؟“ سکندر کے سوال پر اماں نے واش روم کی سمت اشارہ کیا پھر لاریب پر نظر ڈال کر سکندر سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”بچی بھی چلے گی نا ہمارے ساتھ؟“ ”آپ کی طبیعت ٹھیک رہتی ہے نا اماں اور بابا کیسے ہیں؟“ سکندر نے دانستہ اس سوال کو نظر اندھ کر ڈالا تو لاریب کو عجیب سے توہین آمیز احساس نے جکڑ لیا۔ اسے پورا یقین ہوا وہ دانستہ ایسا کر رہا ہے اس نے نگاہ بھر کے اس کے پرکشش مگر سرد مہر چہرے کو دیکھا اور ہونٹ بھیجنے تیزی سے پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔

”بی بی جی۔“ راہداری عبور کرتے ہوئے اس نے ملازمہ کی پکار پر ٹھم کر گردن موڑی۔ ”جامعہ کی معلمہ عقیفہ خاتون آپ سے ملنے آئی ہیں، ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔“

لاریب نے گہرا سانس بھرا گاؤں میں لڑکے اور لڑکیوں کے ہائی اسکول کے ساتھ دینی تربیت کے لیے مدرسہ کی بھی تعمیر جاری تھی۔ یہ سب کام لاریب نے ہی شروع کرائے تھے۔ عقیفہ خاتون جامعہ کی معلمہ تھیں گاؤں کی وہ بچیاں جو قرآن پاک ناظرہ یا حفظ کرنے کی خواہش مند تھیں ان کے لیے عارضی طور پر کسی کرائے کے گھر میں



نے اس کا راستہ پھر روک لیا لاریب نے ایک پل کو حیران نظریں اٹھائیں۔

”بابا سائیں نے تمام جائیداد آپ تینوں کے نام کر دی ہے آپ کا حصہ مجھے دے رہے تھے مگر میں انکار کر چکا ہوں لینے سے، کیا اتنی سے بات یہ ثابت کر چکی ہے کہ مجھے آج ہی نہیں کبھی بھی آپ کی دولت و جائیداد سے کوئی غرض کوئی مقصد نہیں تھا۔“

سکندر جیسے ٹھان کر آیا تھا وہ اسے جتلا کر رہے گا ہر بات، اس کے خوفناک لہجے کی سنجیدگی نے لاریب کو صرف ہک دک نہیں کیا تھا ماضی کی کس شدت پسندانہ یاد نے وجود پر کوئی چابک بھی رسید کیا تھا وہ کسی قدر گم صم ہو کر یوں سکندر کو تنکے لگی جیسے اس سے اس بات کی توقع نہ کر رہی ہو۔ سکندر نے جواباً سر و نظروں سے اسے دیکھا۔

”مجھے سمجھ نہیں آرہی مجھے اس موقع پر آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے احسان مند ہونا چاہیے یا نہیں بہر حال آپ کی بدولت میں آج اس قابل ہوا ہوں کہ سر اٹھا کر آپ کے سامنے کھڑا ہو سکوں، مزید یہ کہ آپ مجھے باخوشی قبول کر سکیں۔“ اس کا لہجہ گہرا طنز سموئے ہوئے تھا۔ لاریب ہونٹ بھینچے منجمد کھڑی رہ گئی۔ وہ ہرگز بھی اسے اس رویے میں غلط نہیں سمجھ سکتی تھی۔ شعوری یا لاشعوری طور پر سارا اعتقاد ساری نئی سکندر کے اندر اس کے بے جا اور شدید سلوک نے بھرا تھا۔ اسے ان آخری لمحوں میں سکندر کی مایوسی و دلگیری نہیں بھولی تھی۔ جب وہ اسے چھوڑ کر اپنی شناخت پانے کو جا رہا تھا۔

”ابھی وقت گزرا نہیں ہے فیصلہ کیا جاسکتا ہے اگر میرے لیے گنجائش نہ نکلے تو اپنے وعدے کے مطابق آپ کی پسند کا فیصلہ کر دوں گا اچھی طرح سوچ کر مجھے آگاہ کر دیجیے گا۔“ اپنی بات اس سرد مہر انداز میں کہہ کر وہ پلٹ کر مضبوط قدم اٹھاتا چلا گیا تھا۔ لاریب دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ نقصان کا احساس بہت شدید تھا۔ جن آنکھوں میں اس نے ہمیشہ نرم جذبے دیکھے تھے ان میں حقارت و نخوت پانا بہت کٹھن تھا مگر اب یہ بھی طے تھا کہ اس

باقاعدہ آغاز کیا جا چکا تھا عقیفہ اسی سلسلے میں لاریب سے اکثر ملتے آتی تھیں۔

”تم چائے بنا کر بھیجوا ماں کے کمرے میں سکندر آئے ہوئے ہیں اور ادھر عقیفہ آپ کے لیے بھی۔“ ملازمہ نے سر کو اثبات میں ہلایا اور مڑ گئی۔ عقیفہ خاتون کے ہمراہ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی جو عربی ٹیچر کے طور پر ایلانی کرنا چاہ رہی تھی۔ لاریب کو پندرہ بیس منٹ وہاں لگے تھے جس وقت وہ انہیں رخصت کر کے واپس اپنے کمرے میں جا رہی تھی اماں کے کمرے سے نکلتا سکندر ایک دم اس کے پھر سامنے آ گیا۔

”بات سنو لاریب۔“ لاریب نے جیسے قدم بڑھانے چاہے سکندر نے ٹوکا تھا چہرے پر سنجیدگی کا مخصوص تاثر تھا۔ لاریب کا دل اچانک معمول سے ہٹ کر دھڑکا اور چہرے پر جانے کس جذبے کے تحت سرخی پھیل گئی۔ اس کی نظریں مستقل لاریب کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں لاریب کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔

”بابا سائیں کے اس فیصلے سے بے خبر تو نہیں ہوں گی آپ وہ آپ کو پھر میرے ساتھ بھیجنا چاہتے ہیں۔“ سکندر کا لہجہ اس کے چہرے کی مانند دبیز سنجیدگی کی پلیٹ میں آیا ہوا تھا البتہ تمام تر اعتماد کے باوجود لاریب کنفیوژ ہو رہی تھی۔ حیا کا بہت زور آور ریل اسے خود میں سٹمنے اور سرخ پڑنے پر مجبور کر گیا تھا۔

”میں اس مرتبہ آپ پر ہرگز جبر نہیں چاہتا، الحمد للہ میری حیثیت پہلے کی مانند نہیں ہے کہ میں کوئی بات نہ منوا سکوں آپ بتائیں اگر آپ کو اس فیصلے پر اعتراض ہے تو.....!“ سکندر کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ اس کے باوجود لاریب کو اس پل اس کا سامنا دشوار محسوس ہونے لگا وہ فطری طور پر حجاب کے حصار میں گھر گئی تھی۔

”مجھے ہرگز بھی کوئی اعتراض نہیں ہے شادی تو ہو چکی ہے ہماری، اب تو ایسا فارمیٹی کے طور پر بھی نہیں ہو سکتا۔“ اس نے جھکی نظروں کے ساتھ بے حد حقیقت پسندی سے جواب دیا تھا۔ وہ کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتی تھی کہ سکندر



نے راستہ تبدیل نہیں کرنا تھا اگر یہ قدرت کا انتخاب تھا تو اسے قبول کرنے میں ہرگز کوئی قباحت نہیں تھی۔



فاطمہ نے اپنے آس پاس گونجتے سنائے کو محسوس کیا اور بے دم سی ہو کر بیٹھتی چلی گئی۔ اس کے دونوں گال ایسے دھپک رہے تھے جیسے کسی نے آگ سلگادی ہو۔ ابھی کچھ دیر قبل عباس حیدر کا ہاتھ پھر اس پر اٹھا تھا کتنا وحشت آمیز غنیض بھرا مگر بے بس انداز تھا اس کا۔

”کہا تھا نا کہ کیئر فل رہنا مگر تم.....!“ اس نے سرخ رنگت سمیت دانت بھینچے۔

”یاد رکھنا اگر میرے بچوں کو معمولی سا بھی گزند پہنچا تو تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ اسے زور سے جھنجھوڑتا ہوا وہ کتنا حواس باختہ لگ رہا تھا۔ فاطمہ تو اتنی سہمی ہوئی تھی کہ جواب میں کوئی وضاحت کوئی صفائی بھی نہیں دے سکی۔ جبکہ عباس جیسے آندھی طوفان کی طرح آیا تھا۔ ویسے ہی راستے میں آئی ہر شے کو ٹھوکروں سے اڑاتا چلا بھی گیا فاطمہ تھر تھر کا پتی وہیں گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

کچھ دیر قبل اس کے گمان تک میں یہ بات نہیں تھی کہ اس پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ عباس کے جانے کے بعد اس نے معمول کے مطابق دونوں بچوں کو کھلانے کے بعد نہلایا اور انہیں لیے کچن میں آگئی تھی۔ اپنے لیے ناشتہ تیار کرتے وہ سلیم سے دوپہر کے کھانے کا مینوسٹ کر رہی تھی جب یکدم باہر شور برپا ہو گیا تھا۔

جس میں فائر کی آوازیں بھی شامل تھیں اس سے قبل کہ فاطمہ کچھ سوچ سمجھ سکتی ایک ہٹا کٹا آدمی ہاتھ میں ریوالور لیے وہیں کھس آیا تھا فاطمہ کی خوفزدہ چیخوں پر وہ حقارت زدہ تاثرات کے ساتھ اسے تکتے ہوئے سرد انداز میں غرا کر بولا۔

”سائیڈ پر کھڑی ہو جاؤ لڑکی، ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔“ فاطمہ کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے۔ جو خیال ان کے حوالے سے ذہن میں آیا وہ ڈکیتی کا تھا لیکن اس خوفناک مونچھوں والے کو بچوں کی جانب لپکتے دیکھ کر

فاطمہ کے وجود میں بجلیاں بھر گئیں۔

”چھوڑو میرے بچوں کو، خبردار جو ہاتھ بھی لگایا نہیں۔“ وہ چیل کی طرح جھپٹی تھی مگر اس آدمی کا کھینچ کر مارا ہوا طوفانی تھپڑ فاطمہ کو کسی بے جان شے کی مانند اچھال کر کئی فٹ دور پھینک گیا۔ وہ کچھ اس طور تیور کر گری تھی کہ حواس بحال نہیں رکھ سکی۔ پھر جب تک اس کے تخیل حواس قابو میں آئے نقصان ہو چکا تھا۔ وہ وحشی انسان روتے بلکتے بچوں کو لے کر غائب ہو چکا تھا تمام ملازمین سر اسیمہ جبکہ فاطمہ کی تو حالت ہی غیر ہونے لگی تھی۔ چند لمحے پتھرائی ہوئی نظروں سے اطراف میں دیکھتے رہنے کے بعد وہ ہذیانی انداز میں چلاتی ہوئی باہر کی جانب دوڑی تو ملازمہ نے بڑی مشکلوں سے اسے پکڑا تھا۔

”چھوڑو، وہ بچوں کو پتا نہیں کہاں لے گئے ہیں۔“ وہ حلق کے بل روتے ہوئے چیخی اس کا چہرہ سرا سمیکی کا اشتہار بنا ہوا تھا اور لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش کے ساتھ خدشات جھلکتے تھے۔

”سر کو فون کیا ہے میم، آتے ہوں گے وہ۔“ ملازمہ نے اپنے تئیں اسے تسلی سے نواز ا مگر اس کا ہولنا دل کسی طور بھی قرار نہ پاسکا عباس کی متوقع خفگی کا خیال ہی سوہان روح تھا۔

”گارڈ کی موجودگی میں وہ غنڈے اندر کیسے گھس آئے؟“ آواز اس کے حلق سے پھنس کر نکلی تھی خوف ہر لمحہ اس کے وجود میں اپنے نیچے گاڑ رہا تھا۔

”وہ گارڈ کو بھی زخمی کر گئے ہیں گولیاں لگی ہیں اسے احسان بابا اسپتال لے کر گئے ہیں۔“ فاطمہ کو ملازمہ کی اطلاع پر قدموں تلے زمین سرکتی محسوس کرنے لگی اگلے چند لمحوں میں جب عباس اس کے سامنے پہنچا تو اس کے فولادی چہرے کا خوفناک تلخ اور زہریلا تاثر دیکھ کر فاطمہ کی رہی سہی ہمتیں بھی جیسے جواب دینے لگی تھیں۔

”کیسے ہوا یہ سب تمہاری موجودگی میں کیسے لے گئے وہ میرے بچوں کو کہا بھی تھا میں نے کہ.....!“ وحشت آمیز جنونی انداز میں اس نے فاطمہ کی سنے بغیر اس کے



اٹھ کروا ش روم میں جاتے وہ ایک بار پھر اللہ سے مدد مانگنے  
اللہ سے فریاد کرنے والی تھی۔



ایک بار پھر اسے بہت دھوم دھام سے رخصت کیا  
جار ہا تھا۔ عداوتیں مٹ گئی تھیں تو دلوں میں پھر سے  
منجاش نکل آئی۔ بڑی حویلی سے اماں جان کے علاوہ ان  
کی بیٹیوں نے بھی اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ اس  
تقریب میں شرکت کی۔ لاریب سادگی چاہتی تھی مگر  
یہاں اس معاملے میں ایمان اور امامہ نے اس کی ایک بھی  
نہیں سنی جیسی اسے مہندی بھی لگائی جا رہی تھی اور دیگر  
سنگھار بھی۔

ہر آسائش پوری تھی مگر لاریب کا دل خوشیوں اور  
واہموں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ سکندر کا رویہ اسے تشویش کے  
ساتھ خوف میں بھی مبتلا کر رہا تھا۔ ایمان شرجیل کے ہمراہ  
جبکہ امامہ وقاص کے ساتھ موجود تھی۔ وقاص کا گریز اس کی  
جھکی نگاہیں اور شرمسار انداز امامہ کی سب باتوں کی  
صداقت کی گواہی دیتے تھے مگر وہ یقین کرنے پر آمادہ نہیں  
ہوتی تھی۔ وہ تو وہ ایمان بھی مضطرب تھی مگر دونوں میں سے  
کسی نے بھی وقاص کو کچھ جتلا نا ضروری نہیں سمجھا تھا۔  
اس کے ہاتھوں پیروں پر بنے مہندی کے نقش و نگار  
خشک ہو گئے تو لاریب ہاتھ دھونے اٹھ گئی۔ تو لیے سے  
ہاتھ خشک کرتی وہ باہر آئی تو کمر خالی تھا۔

اس کا سر بھاری سا ہو رہا تھا۔ چائے کی طلب محسوس  
کر کے وہ خود کچن کی جانب آ گئی تاکہ کسی ملازمہ کو چائے  
کا کہہ سکے مگر اس سے پہلے ہی راہداری کے موڑ پر وقاص  
سے بالکل غیر متوقع سا منہ ہو گیا تھا۔ اسے روبرو پا کر  
لاریب کے چہرے پر غمی و ناگواری ابھری جسے محسوس کرتا  
وقاص بے اختیار ہونٹ پیچ گیا۔

”پلیز لاریب میری بات تو سنیں۔“ لاریب تیزی  
سے واپس مڑی تھی جب وقاص نے بے حد اذیت سے  
گزرتے اسے پکارا مگر وہ ان سنی کرتی تیزی سے بڑھتی  
چلی گئی۔ وقاص اس کے پیچھے جانا چاہتا تھا کہ اپنے دھیان

چہرے پر بے درے تھپڑ رسید کیے تھے فاطمہ اس کی ناراضی  
کی توقع تو رکھتی تھی مگر اس درجہ اشتعال آمیز تنفر کی نہیں۔  
اگر مسلح گارڈ کچھ نہیں کر سکا تھا تو فاطمہ تو پھر ایک نازک سی  
بے حیثیت لڑکی تھی مگر یہ بات عباس کو کون سمجھاتا۔ اس کی  
نظروں کا دکھتا آتش فشاں فاطمہ کو لچھوں میں جلا کر خاکستر  
کر گیا تھا۔

”یاد رکھنا اگر میرے بچوں کو کچھ ہوا تو میں تمہیں بھی  
نہیں چھوڑوں گا۔“ اس کی سرد غراہٹ میں چھپی وحشت  
سختی، سختی اور جنوں خیزی فاطمہ کے حواس چھین کر لے گئی  
تھی۔ عباس کے چلے جانے کے بعد وہ کچھ دیر سراسیمہ  
کھڑی رہی تھی۔ آنکھوں میں موجود خوف جسم و جاں میں  
وحشت بھر رہا تھا۔ اس پل بات صرف خوف کی نہیں تھی  
وحشت بھی تھی بات اس طرح اس پر آئی تھی کہ تمام تر بے  
گناہی کے باوجود وہ مجرم گردانی جا رہی تھی۔

عباس واقعی اسے بچوں کے حوالے سے محتاط کر چکا  
تھا۔ وہ جتنی بھی لاچار بے بس تھی مگر مجرم تو تھی۔ خوف کے  
عالم میں وہ دیوار کے ساتھ نیچے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ دونوں  
بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹتے وہ کانپ رہی تھی۔ بے کسی کا یہ ایسا  
عالم تھا کہ ایک بار پھر چہار سو اندھیرا چھانے لگا۔ ایک  
تاریک دلدل، جس میں وہ ہر لمحہ نیچے دھنستی جا رہی تھی معا  
اس کی آنسوؤں سے چھلکتی متوحش نظریں ٹھٹھک گئیں۔  
سامنے دیوار پر سنہری سینری میں آویزاں آیت کریمہ اس  
کی توجہ اس اندھیرے میں چمک کر اپنی جانب مبذول  
کرا نے لگی۔

”اور مدد حاصل کرو صبر سے اور نماز سے، بے شک یہ  
بہت دشوار ہے مگر عاجزی کرنے والوں پر نہیں۔“

یہ تو اللہ کی دی ہوئی ہدایت اور ترغیب تھی اسے یکدم خدا  
یاد آیا وہ اللہ جو ہر مشکل میں ہر تکلیف میں ہی اسے یاد آتا  
تھا تو وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کے دربار میں حاضر ہوتی  
رہی تھی اور کامران لوٹی رہی تھی۔ وہ اللہ تو اب بھی موجود تھا  
اور یقیناً اس کا منتظر بھی وہی ہر بار اسے بھول جاتی تھی اس  
کے اندر ایک نئی توانائی اترنے لگی۔ وضو کے ارادے سے



میں کمرے کا دروازہ کھول کر ایمان زارون کو اٹھائے باہر آئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو یوں آمنے سامنے پا کر ٹھٹکے ایمان کے چہرے پر گھبراہٹ کے ساتھ ناگواری کا بھی تاثر ابھرا تھا جبکہ وقاص کی اضطرابی کیفیت بڑھتی چلی گئی تھی۔

”کیسی ہیں آپ، امامہ بتا رہی تھی آپ کی طبیعت.....!“

”میں اب بالکل ٹھیک ہوں، ایکسکوز می۔“ رکھائی کا بھرپور مظاہرہ کرتی وہ سائیڈ سے ہو کر گزرنا چاہتی تھی کہ وقاص نے پھر اسے بے چینی سے پکارا تھا۔

”مجھے آپ سے معذرت کرنی تھی ایمان اس سب پر جو.....!“

”اب اس کی اتنی خاص ضرورت نہیں ہے، وقاص حیدر، میرا ذاتی خیال ہے کہ تمہیں جو ہمارا نقصان کرنا تھا کرچکے میں نہیں سمجھتی اس سیاہی کو اپنے منہ پر مل کر بھی میں اپنا بچاؤ کر پائی، امامہ کی صورت وہ نقصان دوگنا ہو کر پھر میری جھولی میں آن گرا۔“ اس کا لہجہ جتنا بھی تلخ سہی مگر اس میں آنسوؤں کی نمی کا تاثر غالب آ گیا تھا۔ وقاص کی رنگت واضح طور پر پھمکی پڑی اور چہرے پر تغیر چھا گیا۔

”آپ حق بجانب ہیں یہ سب سوچنے پر، مگر مجھے صرف ایک التجا کرنی ہے آپ سے ایک موقع تو دیں نا مجھے میں پوری کوشش کروں گا ان تمام شکایات کو دور کرنے کی۔“ اس کے بچے لہجے میں کسی درجہ نرمی و خفت تھی۔ ایمان کو پہلی بار اس کے لہجے و انداز کی تبدیلی کا احساس ہوا تو چونک کر اسے بغور دیکھا تھا۔ وہ تو سرتاپا تغیرات کی لپیٹ میں تھا۔ لباس سے لے کر بولنے چلنے اور تاثرات سمیت۔ اسے یاد تھا وہ کس طرح گردن اور سینہ تان کر کھڑا ہونے کا عادی تھا۔ اس کی ایکسرے کرتی نظروں سے وہ پناہ مانگا کرتی تھی۔ جو اس وقت مستقل جھمکی ہوئی تھیں۔ اس کا لباس قیمتی ضرور تھا مگر اس میں سادگی تھی، چہرے کے تاثرات میں نرمی و حلاوت نے اس کی وہ خوب صورتی جو کڑھکی اور تنفر کے باعث دب جاتی تھی اجاگر ہو گئی تھی۔ وہ اس تبدیلی کی وجہ سمجھنے سے قاصر رہ کر بھی اس کے لیے دل

میں گنجائش رکھ کر سوچ رہی تھی۔

”موقع تو آپ کو مل گیا ہے وقاص صاحب امامہ سے شادی کر کے خود بخود۔ ہمارے لیے اس سے بڑھ کر کوئی اطمینان کی بات نہیں ہو سکتی کہ آپ امامہ کو خوش رکھیں اسے ہم سب نے نازک کلی بنا کر اپنے پاس رکھا تھا اب اگر وہ آپ کے پاس ہے تو ہماری امید اور خواہش کا مرکز آپ کو اللہ نے بنا دیا۔ یہی ریکویسٹ ہے خدا را اسے کبھی ہرٹ نہ کیجیے گا۔“ ایمان کے الفاظ نے وقاص کو گویا زندگی کی خوش خبری دی تھی وہ بے حد ممنون و مشکور انداز میں مسکرانے لگا۔

”آپ بالکل فکر نہ کریں اللہ نے چاہا تو میں آپ کی توقعات پر پورا اتروں گا، ان شاء اللہ۔“

”ٹھیکس وٹش یو گڈ لک۔“ ایمان نے مسکرا کر کہا اور آگے بڑھ گئی۔ وقاص کا دل اللہ کے حضور تشکر سے بھر گیا۔



بارہ گھنٹے کی مسلسل بھاگ دوڑ اور دوسری کے بعد جا کر پولیس سعید احمد کی تحویل سے دونوں بچوں کو نکلوانے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ اس دوران عباس کے اعصاب مسلسل کشیدگی کی زد پر رہے تھے۔ جیسے ہی ایس پی صاحب نے بچوں کو اس کے حوالے کیا وہ بے اختیار ریلیکس ہوا تھا باری باری دونوں بچوں کو اٹھا کر پیار کرتے وہ پولیس آفیسر کا شکریہ ادا کرتا کچھ ضروری کارروائی کے بعد واپس اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

بچے باپ کے پاس آ جانے کے باوجود سہمے ہوئے نظر آ رہے تھے عباس نے راستے میں گاڑی روک کر بچوں کو چپس چاکلیٹ اور جوس کے پیکٹ دلائے تھے تب جا کر وہ ذرا بہلے۔

”رضیہ بچوں کو ان کے کمرے میں لے جاؤ اور فیڈ کرانے کے بعد سلا دو۔“ عباس کمرے میں آیا تو فاطمہ اس وقت بھی جائے نماز پر بیٹھی ہوئی تھی اچلے دلکش چہرے پر ان چند گھنٹوں کے اندر زردیاں کھنڈ گئی تھیں عباس کو بچوں کے ساتھ آتے دیکھ کر اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں جیسے دیے جھلما گئے تھے وہ تیزی سے اٹھ کر جیسے ہی بچوں



جھلا کر کہا پھر کچھ دیر دوسری جانب کی بات سنتا رہا ایش گرے سوٹ میں غضب کی مردانہ وجاہتوں کے ہمراہ اپنے نے تلے انداز میں محو گفتگو یہ شخص ابھی بھی دل کی دھڑکنوں کو منتشر کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا تھا۔

”یہ بھی ممکن نہیں تھا اماں جان، پلیز اسے آخری کوتاہی سمجھ کر معاف کر دیں۔“ تھکے ہوئے انداز میں کہتا وہ بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔

”اوکے فائن، ٹھیکس اماں جان، جی جی، السلام علیکم!“ اس نے سلسلہ منقطع کیا اور سیل فون بستر پر پھینکا اور خود شرٹ کے بٹن کھولتا ہوا جیسے ہی مڑا فاطمہ کو ہنوز وہاں موجود پا کر اس کی آنکھوں کی سرخی جیسے لہو میں بدلنے لگی۔

”تم.....!“ اس نے دانت کچکچائے۔

”آخری بار معاف کر دیں عباس، وعدہ کرتی ہوں آئندہ اپنی جان پر بھی کھیل کر.....!“

”ان ڈائلاگ کی ضرورت نہیں ہے سمجھیں، اور یہ آنسو بھی مجھے رام نہیں کر سکتے تمہارے حسن کے ہتھیار کی طرح یہ بھی بے کار ہے اندازہ تو ہو جانا چاہیے تھا تمہیں۔“

کتنا کاٹ دار لہجہ تھا اس کا فاطمہ شرم سے کٹ مری بھی رنگت بالکل فق ہو گئی۔ پتا نہیں وہ ہمیشہ اس کا نظریہ اس کے جذبات سمجھنے میں کیوں اتنا قاصر رہا تھا۔

”اب جاؤ یہاں سے کب تک یونہی سر پر سوار ہوگی؟ جانتا ہوں جو حماقت کی ہے تم نے اس میں سب کشتیاں جلا آئی ہو، مستقل عذاب بن کر مسلط رہوگی مجھ پر مگر فی الحال تو جان چھوڑ دو۔“ وہ اتنا ذہنی طور پر اب سیٹ تھا کہ اس کی ہستی کو تاراج کر کے رکھ دیا اور احساس تک نہ کر سکا یہ تذلیل فاطمہ کو اندر تک ادھیڑ کر رکھ گئی تھی۔ ہر روز ایک نیا انداز اذیت کا ہر شب ایک نیا طریقہ سبکی کا ایجاد کرتا تھا یہ شخص کیا واقعی وہ اتنی ہی بھاری تھی اس پر؟

کیا واقعی وہ اتنا ہی بے زار تھا اس سے..... کیا وہ اس قدر نفرت کرتا تھا فاطمہ سے؟ وہ سوچتی رہی اور رونی ہوئی بے جان قدموں سے باہر آئی اور سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ عجیب خالی پن تھا اس کی نظروں میں جیسے کچھ لمحے قبل

کی جانب آئی عباس نے اس پر تند و تیز نظر ڈالتے ہوئے ملازمہ کو مخاطب کیا تھا جو وہیں موجود تھی اور فاطمہ کو کچھ کھانے پر اصرار کر رہی تھی جس نے خود پر تب سے پانی کا ایک گھونٹ بھی لینا حرام کر لیا تھا۔ فاطمہ عباس کے لہجہ و انداز کی سرد مہری و بے رخی کو محسوس کرتی اپنی جگہ پر ہی پتھر کی ہو گئی۔

”ان کا خصوصی خیال رکھیے گا، میں مزید کوئی کوتاہی برداشت نہیں کر سکتا۔“ بچوں کو فاطمہ کے پاس جانے سے روکتا وہ قطعیت بھرے حکم انداز میں رضیہ سے ہی مخاطب تھا۔ عباس کے تیوروں سے خائف ہوتی رضیہ روتے بلکتے بچوں کو لے کر چلی گئی جو فاطمہ کے پاس آنے کو مچلے رہے تھے۔

”تم کیوں کھڑی ہو اب یہاں؟ میں اور میرے بچے بھی تمہارے بغیر بہت اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔“ کوٹ اتار کر پھینکتے ہوئے عباس نے اس کے سکتے زدہ چہرے کو دیکھ کر تنفر آمیز انداز میں کہا اور گویا اس کو ایک بار پھر اس کی اوقات یاد کرائی فاطمہ نے آنسوؤں سے چھلکتی نظروں سے اسے ایک نظر دیکھا مگر اس کی کٹیلی نظروں کو محسوس کرتی ہونٹ بے دردی سے کچلتی رہی۔

”مجھے معاف کر دیں پلیز میرا قصور.....!“ اس کی بات ادھوری رہ گئی اس کا سیل فون گنگنا نے لگا تھا عباس نے اس پر قطعی توجہ دیے بغیر کال ریسیو کی۔

”السلام علیکم اماں جان۔“ فاطمہ نے وحشت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اس سے، اس کی کیفیات و اذیت سے آج بھی اتنا ہی بے نیاز تھا جتنا ہمیشہ نظر آتا تھا۔ تمام فاصلے آج بھی برقرار تھے۔

”یہاں میں کچھ مسائل میں گھرا ہوا ہوں اماں جان آئی ایم سوری میں نہیں آسکوں گا۔ بلکہ میرا وہاں نہ آنا ہی زیادہ بہتر ہے۔“ وہ بری طرح سے جھنجھلایا ہوا نظر آنے لگا۔ فاطمہ آنسو پوچھتی اسے دیکھے گئی۔

”آپ اتنی سی بات پر خفا کیوں ہوتی ہیں اماں جان، آپ کو کم از کم میرے مسائل کو تو سمجھنا چاہیے۔“ اس نے



آخری پونجی بھی لٹادی ہو۔

طرف سے بندے کو آگاہی ملتی ہے تو پھر گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھی جگنو جگمگانے لگتے ہیں۔ شمعیں جل اٹھتی ہیں۔ فاطمہ کے دل میں بھی یہی آگہی جاگ اٹھی تھی جیسی وہ ایسے چونک اٹھی جیسے گہری نیند سے جاگ گئی ہو۔ تاخیر سے سہی مگر بہر حال اس نے اپنی حقیقت پہچان لی تھی۔ اسے اس بات کی خوشی تھی رب نے اس کا شمار ان لوگوں میں نہیں ہونے دیا تھا جو ٹھوکر کھا کر گرنے والوں میں شامل ہو جایا کرتے ہیں۔



ہر سو گہما گہمی تھی، مختلف رسومات کی ادائیگی کے بعد اریہ اور سمعیہ اسے سکندر کے بیڈروم میں چھوڑ گئی تھیں، وسیع و عریض شاندار بیڈروم جس کا ماحول بے حد خوبناک لگ رہا تھا اس کے وجود کی روشنی سے بھی جگمگا اٹھا تھا گویا۔ لاریب نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے اطراف کا جائزہ لیا اور عجیب سے احساسات کا شکار ہو کر رہ گئی۔ رسموں کے دوران بھی اپنی کزنز کی ہنسی مذاق میں سکندر بے حد لیا دیا اور سنجیدہ محسوس ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی منہ پھٹ کزن نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں لگتا اور لاریب اس پل کتنی خائف ہو گئی تھی۔

لاریب نے سکندر کے بھی رشتہ داروں اور ایمان کے سرالیوں کو عجیب و غریب محسوس کیا تھا۔ ناک بھوں چڑھاتیں غیبتیں کرتیں عورتیں اور بد مزاج غصیلے مرد، وہ اب اندازہ کر سکتی تھی ایمان نے وہاں کس قدر کٹھن وقت گزارا ہوگا۔ وہ تو یہ سوچ کر خائف ہوئی جاتی تھی اگر سکندر نے ان عجیب و غریب لوگوں کو یہاں بھی اپنے ساتھ اس گھر میں رکھ لیا تو کیسے فیس کرے گی وہ ان سب کو جنہوں نے ایمان کو اس نوبت تک پہنچا دیا تھا مگر ان کو ذرا بھی جو شرمندگی یا ملال ہو، ایمان تندرست ہونے کے بعد ابراہیم احمد کے سمجھانے پر شرجیل کے یہاں ملنے گئی تھی مگر وہاں انہوں نے ٹھیک طرح بات کرنا بھی گوارا نہیں کیا، مگر ابراہیم احمد کی تاکید تھی کہ انہیں ان اہم رشتوں سے قطع تعلقی اختیار نہیں کرنی چاہیے اور ان کے حقوق بھی ادا

تھی دست، تھی داماں ایسے لاچار انسان کی طرح جس کے سر پر آسمان ہونہ ہی پیروں تلے زمین، کیا حماقت تھی کیا جنون تھا جس میں سب کچھ داؤ پر لگا دیا..... ہستی کا غرور، عزت نفس، وقار اور..... اور اپنے سب پیارے بس اس ایک شخص کی خاطر جس نے اسے ہمیشہ اپنے جوتے کی نوک پر رکھا تھا اور بار بار ٹھوکریں کھائی تھیں، اس کے لیے سب کچھ تباہ کر لیا احساس زیاں اس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ بہنے لگا۔

سب سے بڑھ کر اللہ کے احکامات اللہ کی خوشنودی، اللہ کی رضا عباس اور اللہ کے درمیان چناؤ کا جب بھی موقع آیا اس نے اپنی اس نادانی اس حماقت و جذباتیت میں جنوں خیزی میں ہر بار اللہ کے بجائے عباس کو چن لیا تھا کیسا گھائے کا سودا تھا یہ پھر بھی بھلا ذلت اس پر مسلط نہ ہوتی؟ اس کی آنکھیں زار و قطار بہنے لگیں۔ اسے یاد آیا جب مسلمان ہونے کے بعد اس نے زینب سے نماز اور کلام پاک سیکھنے کا آغاز کیا انہی دنوں اس پر عباس کے بچوں کی ذمہ داری آ پڑی تھی اس نے نماز اور قرآن کو چھوڑا اور سرخوشی کی کیفیت میں بچوں کو سنبھال لیا۔ یہ اس کے نزدیک بہترین کامیابی تھی صدیوں کا ہجر بھولنے کے بعد وصل کی جانب بڑھتا ہوا رستہ۔

پھر دوبارہ جب عباس کی جانب سے ذلت و رسوائی پانے کے بعد اس نے اللہ کی طرف پلٹ جانا چاہا، ایک بار پھر اس پر آزمائش آ پڑی، چاؤ کی آزمائش، اس نے پھر دنیا کو چنا اور دین کو چھوڑ دیا۔ بھلا اس سے بڑھ کر بھی اس کے لیے کوئی خوشی کامیابی اور کامرانی کی دلیل ہو سکتی تھی کہ عباس حیدر اس سے شادی کی خواہش لے کر آ گیا تھا وہ سپنا پورا ہونے جا رہا تھا جسے اس کی آنکھیں بھی دیکھنے سے ڈرتی تھیں وہ کیسے اچانک پورا ہونے جا رہا تھا۔ ایک بار پھر اس نے اللہ کی راہوں سے قدم واپس موڑ لیے ایک بار پھر اس کے ہاتھ میں اللہ کی رسی آئی مگر وہ گرفت مضبوط کرنے کے بجائے اسے چھوڑ بیٹھی..... مگر جب اللہ کی



ایسی تھی کہ تمام تر ضبط کے باوجود بھی لاریب کا دل اس درجہ سکی پر بھرا سا گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ اٹھی تو زیورات بج اٹھے۔ سکندر نے ناگواریت سمیت اسے دیکھا۔

”یہ چوڑیاں وغیرہ ابھی اتار کر رکھ دینا مجھے ان کی جھنکار سے ڈسٹرب کرنے کی ضرورت نہیں۔“ ایک اور آرڈر جاری ہوا نخوت بھرا حتمی انداز لاریب کی بے بسی کو اشتعال میں ڈھالنے لگا مگر ہونٹ بھینچے وہ ضبط کے کڑے مراحل طے کرتی چوڑیاں اتار کر رکھنے لگی۔ وہ سکندر کا بدلا ہوا رویہ محسوس کر چکی تھی اور سوچ کر آئی تھی اگر وہ انتقام پر اترا ہے محبت کو بھلا کر تو اب اس کی باری ہے۔ اپنی محبت سے اپنا ضبط آزمانے کی وہ اس انتقام کو لازمی سہہ جائے گی۔ اس محبت کی خاطر جس کا ابھی آغاز ہی ہوا ہے اور جسے ابھی بہت دور تک سفر کرنا تھا۔ اب یہ اس کی قسمت تھی کہ یہ سفر کتنا سہل یا پھر کٹھن ہوتا ہے۔

وارڈروب سے اپنے لیے نسبتاً سادہ لباس منتخب کرنے کے بعد اس نے ڈریسنگ روم میں جا کر اس دلہنا بے کے تمام آثار مٹا دیے تھے جن سے سکندر کو کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی اور ایسا کرتے اس کا دل خون کے کتنے آنسو رویا تھا۔ بے توقیری اور بے وقعتی کے احساس سمیت، یہ یکسر الگ قصہ تھا۔ وہ کچن کی سمت آئی تو اس کے چہرے پر اس کے اندر کی بربادی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ رات کے اس پہر بھی خانساں کچن میں مستعدی سے مصروف عمل تھا تو یہ یقیناً شادی کا موقع ہونے کی بنا پر ہی تھا۔

”جی میم آپ کو کچھ چاہیے تھا تو انٹرکام پر آؤر کیا ہوتا میں حاضر کر دیتا۔“ خانساں چند گھنٹوں قبل بیاہی دلہن کو کچن میں خدمت پر مامور پا کر تمام حیرانی بامشکل ہضم کر کے اپنے فرائض کو چابک دستی سے نبھانے میں مصروف ہوا تھا لاریب بو جھل دل سے مسکرائی۔

”نہیں شکریا آپ کا کافی میں خود بنا لوں گی۔“ وہ آگے بڑھ آئی۔ دس منٹ میں کافی تیار تھی لاریب ٹرے اٹھائے کچن سے نکلی اور دل ہی دل میں دعا گو ہوئی تھی خانساں کے بعد اس کا یہ راز اور کسی پر آشکار نہ ہو

کرنے چاہیے۔ خود ابراہیم سریتا دیوی کی اتنی شدید نفرت کے باوجود ان سے ملنے جاتا تھا اور فون پر بھی خیریت دریافت کیا کرتا سریتا دیوی کے تمام تر ناروا سلوک کے باوجود وہ سمیعہ کو بھی وہاں ان کے پاس لے جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

یہ سب باتیں لاریب کو ایمان سے ہی پتا چلی تھیں۔ دروازے کے باہر قدموں کی چاپ کو پا کر لاریب کا دل ہی اچھل کر حلق میں نہیں آیا ہتھیلیاں بھی پسینے میں بھیگ گئیں۔ اگلے لمحے سکندر اندر آ گیا مگر اس کی جانب نگاہ ڈالتے ہی وہ یکدم بھڑک اٹھا تھا کچھ ایسے کہ اسے بھی اس آگ میں گھسیٹ لیا۔

”یہ روایتی شادی نہیں تھی جو آپ اس طرح بیٹھی ہیں میں حیران ہوں آپ میں اتنی تبدیلی کی وجہ کیا ہے آخر، آپ تو تب بھی میری اس طرح منتظر نہیں ہوتی تھیں جب آپ کو ہونا چاہیے تھا یاد ہے آپ کو ہماری شادی کی پہلی رات؟“ اسے بڈ پر اپنے انتظار میں پا کر وہ تمام ضبط گنواچکا تھا لاریب کی آنکھیں ایسے جل اٹھیں جیسے ان میں کسی نے مٹھی بھر مرچیں جھونک دی ہوں وہ خاموش تھی۔ اس کا خوب صورت چہرہ ہر گزرتے لمحے متغیر ہوتا جا رہا تھا مگر سکندر کو ہر گز بھی اس سے کسی قسم کی ہمدردی محسوس نہیں ہوئی یہ لڑکی بہر حال کبھی بے بس نہیں ہو سکتی تھی کبھی ہار نہیں سکتی تھی وہ بھی اس کے آگے ابھی تو اس نے اسے بے بس کرنا تھا اسے ہرانا تھا۔

”میں جب تک باتھ لیتا ہوں تم اٹھ کر میرے لیے کافی بنا کر لاؤ میں سونے سے قبل کافی منے کا عادی ہوں۔“ اسے پلکیں جھکائے آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں ہلکان پا کر وہ زہر خند لہجے میں بولا جس نے ایک لمحے کو سہی مگر لاریب کو بھی ہونق کر دیا تھا۔ سکندر نے اس حیرانی اور استعجاب کو محسوس کر لیا تھا جیسی بولا تو اس کے خشونت زدہ لہجے میں تلخی و نفرت سمٹ آتا تھا۔

”کیوں، کچھ انوکھا کہہ دیا میں نے، یا پھر شادی میں کوئی گستاخی ہو گئی ہے؟“ اس کے لہجے کی برہمی اور حقارت



شاید نہیں یقیناً سکندر اس کی جانب سے کسی مزاحمت یا پھر احتجاج کی توقع کر رہا تھا مگر ایسی کوئی صورت حال نہ پا کر اس کے اندر جلتی آگ میں اضافہ ہوا جیسا اس کے ہر عمل میں جارحیت اور نلی گھلتی چلی گئی تھی۔



اسے اچھی طرح سے یاد تھا زینب نے کہا تھا کہ پریشان ہونا انسان کے انسان ہونے کی دلیل ہے لیکن پریشان رہنا انسان کے اللہ پر یقین نہ ہونے کی دلیل ہے۔ اسے اس اعتراف میں اب عار نہیں تھا کہ وہ اللہ پر اعتماد یقین اور بھروسے کو کامل نہ کر پائی صرف شرمندگی ہی تو نہیں تھی دکھ و ملال بھی تھا۔ اس نے آخر کس سراب کے پیچھے زندگی تباہ کر ڈالی تھی۔ اسے زینب سے سنی بات پوری جزئیات سے یاد آئی تو ہاتھوں میں چہرہ اڑھانے بلک پڑی۔

”مجھے معاف فرمادے مالک دو جہاں، مجھے معاف فرمادے۔“ دیر تلک آنسو بہانے کے بعد بھی دل پر دھرا بوجھ ہلکا نہ ہوا تھا آج یہ کیسا غم آن لگا تھا اسے، یہ تاسف اس پر مزید گہرا ہوا جب اس نے بے بسی اور بے اعتنائی کے سابقہ انداز کو بحال رکھے عباس کو اپنے پاس سے گزر کر وہاں سے جاتے دیکھا وہ دھندلاؤ نظروں سے اسے جاتے دیکھتی رہی اور اپنے غم کو شدت سے محسوس کرتی اور بھی ٹرپ گئی تھی۔

”جھڑکیاں دینے والا، رعب جمانے والا، دھمکیاں دینے والا بھول چکا ہوتا ہے کہ وہ بھی انسان ہے اور اسے اپنے جیسے انسانوں پر رعب جمانے اور جھڑکیاں دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہر نفلی استحقاق صرف غرور نفس کا دھوکہ ہے اور غرور انسان میں اس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک وہ بد قسمت نہ ہو، نصیب والے ہمیشہ عاجز و مسکین رہتے ہیں۔“ عباس حیدر کے ہر لمحہ فاصلہ بڑھاتے قدموں کو دھندلاؤ نظروں سے تکتے اس کے ذہن میں کبھی کی پڑھی ہوئی ایک بات روشن ہو کر جگمگانے لگی تو جیسے ہڑ بڑاسی گئی۔ ”مجھے اب مزید وقت ضائع نہیں کرنا۔“ اس نے

سکندر کو تو شاید ان نزاکتوں کا خیال تک نہیں تھا۔ اسے زیر کرنے کو اور بھی ایک سوا ایک طریقے تھے جن سے بھرم بھی قائم رہ سکتا تھا۔

”میں نے تمہیں صرف جیوڑی اتارنے کو کہا تھا وہ بھی چوڑیاں تم نے.....!“ وہ جھک کر ٹرے رکھ رہی تھی جب فریش ہو کر آنے والے سکندر نے گیلے بالوں میں ہاتھ پھیر کر نمی جھٹکتے ہوئے اس پر گہری پر حدت نگاہ ڈالی اور دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔ لاریب نے ہونٹ کچلے اور سیدھی ہو کر خاموشی سے پلٹنے کو تھی جب اچانک سکندر نے ہاتھ بڑھا کر اس کی لودیتی سفید کلائی پکڑ لی۔

”کسی کو سراہنے کے لیے آراش و سنگھار کچھ اتنا بھی ضروری نہیں یہ کام ویسے بھی باخوبی نبھایا جاسکتا ہے۔“ ہلکے سے جھٹکے سے اسے اپنے پہلو میں گرا تا ہوا وہ کسی قدر سرد آواز میں کہتا گویا اس کی تائید چاہ رہا تھا۔ لاریب کا رنگ پھیکا پڑا اور آنکھیں جھلملانے لگیں لیکن وہ بولی اب بھی کچھ نہیں تھی۔

”صرف ایک کافی کا مگ کیوں؟“ اس نے بھنویں اچکا کر سرد نظریں اس پر جمائیں، پھر ہنکارا بھرا۔

”محترمہ اگر آپ کو میرے ساتھ جا گنا ہے تو پھر اس کا انتظام بھی ہونا چاہیے تھا۔“ وہ اسے لمحہ لمحہ سلگا رہا تھا جیسے باقاعدہ پلاننگ کر کے میدان میں اترا ہو۔ دھیمے لہجے سے بھی اشتعال پھوٹ پڑتا تھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹی تھیں چہرے کی سرد مہر کیفیت لاریب کو منجمد کیے جا رہی تھی مگر وہ پھر بھی چپ تھی۔ یہاں تک کہ سکندر نے ہاتھ بڑھا کر استحقاق آمیز انداز میں اس کی کمر کے گرد حائل کیا اب وہ اس سے نزدیک تھی نزدیک تر، اس کی کمر کے گرد سکندر کا بازو کوئی آہنی شکنجہ تھا جو بے رحم ہوتا ہے یہ لس کوئی انگارہ تھا جس کی دھکتی آگ لاریب کا پورا وجود جلا کر خاکستر کر رہی تھی۔

”اب تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا آخر اپنی مکمل رضا مندی سے آئی ہو اب کی بار؟“ وہ مسکرایا تو لاریب کے حلق میں آنسو گرنے لگے۔



کے لیے اہم تھی۔

اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ روتے ہوئے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ مگر بے قرار دل کو کہاں قرار نصیب ہونا تھا۔ جائے نماز پر بیٹھی نو مسلم فاطمہ میں بلا آخر اس تبدیلی کا آغاز ہو گیا جس کی بدولت برسوں قبل اس سے طلب اور خواہش کا یہ سفر شروع کرایا گیا تھا..... ایسی تبدیلی جو وحشت کے صحراؤں سے نکال کر آغوشِ محبت میں سمٹ جانے والے کے اندر اترتی ہے۔ وہی تبدیلی جو اندھیارے منہ بند غاروں میں آبلہ یا بھٹکنے والوں کو روشنی و آزادی نصیب ہونے پر سرخوشی بخشتی ہے۔ وہ وعدوں کو پورا کرنے والا رب ایک بار پھر اپنا وعدہ نبھاتا تھا اس کے ایک قدم کے جواب میں ستر قدموں کا فاصلہ گھٹائے آج وہ اس سے کتنا قریب تھا کتنا نزدیک تھا کاش وہ دیکھ.....



وہ جھک کر بستر کی چادر بچھا رہی تھی اور اسے تکتی سکندر کی آنکھیں غضب کی حد میں سمیٹ لائیں۔ لاریب کا کتنا نارمل انداز تھا۔ حالانکہ سکندر نے اس پر شخص اپنی بڑائی اور نفرت جتانے کو کسی بھی ستم ظریفی سے گریز نہیں برتا تھا پتا نہیں وہ ایسا منتقم مزاج کیوں ہو رہا تھا کبھی لاریب کی اکڑ اور نخوت سے اس کی جان جلتی تھی اور اب اس کی خاموشی و فرمانبرداری گراں گزر رہی تھی۔

(یہ سمجھوتے کے سوا اور کیا تھا سمجھوتہ جو ہر اس جگہ پر ہوتا ہے جہاں محبت نہیں ہوتی) اس کے دل سے کشیف دھواں اٹھنے لگا۔

”ناشتہ یہیں لے آؤں آپ کے لیے؟“ لاریب نے اس کا پھیلا وہ سمیٹتے ہوئے اس سے نگاہ چار کیے بنا پوچھا تھا۔ اس کی سحر طراز آنکھوں کے حواسِ حصوں پر اتری سرخی اس کی شدت گریہ کی گواہی دیتی تھی۔

سکندر کے دل پر عجیب سی جھنجلاہٹ اترنے لگی۔ ایسا مجرمانہ احساس جس کو قبول کرنے سے ہی خائف تھا۔ وہ اب بھی بنا کوئی جواب دیے اس پر سلگتی نگاہ ڈال کر ایک جھٹکے سے باہر چلا گیا اور لاریب ہونٹ بھینچے سا کن کھڑی

سوچا اور وضو کے ارادے سے واش روم میں چلی گئی نماز ادا کرنے کے بعد اس نے دعا کو ہاتھ پھیلائے تو ایک بار پھر اس کی سماعتوں میں زینب سے سنے التجائیہ الفاظ گونجنے لگے جو وہ ہر نماز کے بعد مناجات کے طور پر پڑھا کرتی تھی۔

”اے اللہ میرے دل میں نور ڈال دے اور میری سماعت و بصارت میں نور ہو۔“ اس کی آواز کی دلکشی سوز اور گداز جیسے اس بل اس کا بھی دل رقت سے بھرنے لگا۔ آنکھوں میں مچلتی نمی چل چل کر گال بھگونے لگی اس کے ہونٹ باقاعدہ لرزنے لگے۔

”اور میرے دائیں اور بائیں نور ہو اور میرے اوپر اور نیچے نور ہو اور میرے آگے اور پیچھے نور ہو اور میرے لیے نور بنا دے۔“ ملازمہ دیا کو لے کر اس کے پاس آئی تو اسے جائے نماز پر بیٹھے دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے زار و قطار روتے پا کر حیران ہوئی۔ وہ دنیا و مافیاء سے بے خبر لگتی تھی۔ اسے ڈسٹرب کیے بنا ملازمہ پچی سمیت پلٹ گئی جبکہ فاطمہ بدستور گڑ گڑا رہی تھی۔

”اور میری زبان اور میرے اعصاب میں نور ہو اور میرے گوشت اور میرے لہو میں نور ہو اور میرے بال اور کھال میں نور ہو اور میرے نفس میں نور ہو اور میری ہڈیوں میں نور ہو اے اللہ مجھے نور عطا فرما۔“ اسے یہ بھی یاد آیا زینب کہتی تھی۔

”تیرا بہترین ہم نشین وہ ہے جو تیرے عیب جان کر بھی تیرے ساتھ ہے اور وہ تیرے پروردگار کے علاوہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔“ اسے لگا اس مقام پر جب عباس اس کا بن کر نہیں دیتا تھا جب اس نے اپنا ہر رشتہ چھوڑ دیا تھا اس مقام پر بھی وہ اکیلی نہیں کوئی ہے جو اس کے ساتھ ہے اور وہ اللہ کے سوا کون ہو سکتا تھا۔ وہ جو اس کی لغزشوں اس کی کوتاہیوں اس کی برائیوں سے بے خبر نہیں مگر پھر بھی ہر بار جب بھی وہ جو مانتی وہ اسے عطا فرماتا رہا تھا اس کا صاف مطلب تھا عباس کو اس کی ضرورت نہ ہو مگر اللہ کو اس کی ضرورت تھی وہ کسی کے لیے اہم نہیں ہو سکتی تھی مگر وہ اللہ



اقتباس

”جب اپنا بہت عزیز بہت پیارا بچہ جائے تو انسان اپنے جینے کے جواز اپنے زندہ رہنے کے بے معنی ہی سمجھ لیتا ہے۔ لیکن یہاں ڈھونڈنے لگتا ہے تاکہ اگر ان سے بھی وہ بچہ نہ ملے تو ان سے جینے کا جواز ان کی زندگی کا استفسار نہ مانگے اور مانگے تو وہ جھٹ سے بتائیں تیری یادیں کھیں، کچھ نشانیاں کھیں، کچھ وعدے تھے کچھ ذمہ داریاں کھیں جن کو نبھانے کے لیے جینا پڑا، مجبوری تھی سمجھا کرو۔“

اقصیٰ اشمل وفا.....

ڈاننگ ٹیبل پر سکندر سمیت سبھی کو موجود پایا تھا۔

”آئیے بھابی، صبح بخیر۔“ فراز نے اس کا پر تپاک استقبال کیا جبکہ شرجیل کے ہونٹوں پر حوصلہ افزاں پر شفقت مسکان چھلکی تھی۔

”ابھی تک سینک سلائی ہے کوئی امید تو نہیں لگتی سکندر بیٹا تمہاری بیوی کو، ارے یہ اب تو رخصتی رخصتی کا چونچلا ہی تھا ورنہ پتا ہے ہمیں بھی تمہارے ساتھ کئی مہینے کی ازدواجی زندگی گزار چکی ہے۔“ لاریب پر ناقہ انداز نگاہ ڈالتے ہوئے تائی ماں نے استفسار تو سکندر سے ہی کیا تھا مگر بلاشبہ ان کی اصل مخاطب ماما ہی تھیں جہاں سکندر جزبز ہوا وہاں لاریب کا چہرہ ایسے جل اٹھا جیسے وہاں کسی نے یکلخت آگ کا لاؤ روشن کر دیا ہو۔

”آپ کو آخر اعتراض کس بات پر ہے تائی ماں، یہ سکندر یا پھر لاریب بھابی کا شوق نہیں تھا۔ ہم سب نے دانستہ اس چھوٹی سی تقریب کا انعقاد کیا تھا ہلے گلے کی خواہش میں، جہاں تک سکندر کے باپ مننے کی بات ہے تو اللہ نے چاہا تو ہم یہ خبر بھی جلد ہی سن لیں گے کیوں سکندر؟“ لاریب کو سر جھکائے ہونٹ کچلتے آنسو ضبط کرتے پا کر فراز ہی اس کی مدد کو میدان میں کودا تھا اور بہت خوب صورتی سے اس کا دفاع کرتے آخر میں اپنے ساتھ بیٹھے سکندر کے کاندھے سے اپنا کاندھا ٹکراتے ہوئے گویا اس کی تائید چاہ کر مسکرا کر لگا۔ جس کے سپاٹ چہرے پر ابھی تک کوئی خاص تاثر نہیں اتر تھا۔

رہ گئی اتنی ساکن کہ اسے ایمان کے وہاں آنے کی بھی خبر نہیں ہو سکی تھی۔

”کیسی ہوسوٹ ہارٹ؟“ ایمان نے بے حد محبت سے کہتے اسے پیچھے سے اپنے بازوؤں کے حصار میں جکڑا تو لاریب نے گھبراتے ہوئے با سرعت پلکیں جھپک کر ساری کی اندر اتار لی۔

”سکندر کہاں چلا گیا، ناشتے کا بتاؤ یہیں لے آؤں؟“ ایمان کے سوال پر لاریب نے سر جھکا لیا۔

”بہو اب باہر آ جاؤ سب ناشتے پر تمہارے ہی منتظر ہیں ٹائم دیکھو ذرا، دس بج گئے ہم نے تو سنا تھا شہر کی لڑکیاں صبح دیر تک سونے کی عادی ہوتی ہیں مگر یہاں گاؤں کی تو اس سے بھی آگے نکلیں۔“ یہ تائی ماں تھیں اپنے مخصوص کرخت لہجے اور پاٹ دار آواز میں بات کرتی ہوئی اچانک مداخلت کر گئیں۔ ایمان تو خفت زدہ ہوئی ہی لاریب بھی سٹپٹا گئی۔

”آپ چلیے تائی ماں میں لاریب کو لارہی ہوں۔“ ایمان نے گھبرا کر ان کی تشفی کرانی چاہی تھی۔ وہ لوگ جتنے بھی کرخت اور بے حس سہی مگر ایمان پہلے کی طرح اب بھی ان کے ساتھ نرمی و فرمانبرداری کا رویہ رکھ رہی تھیں۔ حالانکہ اس کی صحتیابی اور اتنی بڑی بیماری کے بعد پھر سے جی اٹھنے کو تائی ماں سمیت کون تھا جس نے خوشی و اطمینان کا اظہار کیا ہو۔

”اونہ، لے کر آتی ہوں، بچی ہے یہ جسے گود میں اٹھا کر لاؤ گی دیکھو ذرا چونچلے۔“ تائی ماں نے ناک بھوں چڑھانی ضروری سمجھی اور دونوں کے پھیکے پڑتے چہروں پر زہر آلود نظر ڈالتی پلٹ گئیں۔ ایمان نے شرمندگی چھلکا پانی نظروں سے لاریب کو دیکھا جو خود بھی مضحکہ خیز کھڑی تھی اور جھل سی مسکرا دی۔

”تم مائنڈ نہیں کرنا ان کی عادت ہی کچھ ایسی ہے۔“ لاریب کے پاس اس بات کا بھلا کیا جواب تھا ایمان کے کہنے پر اس نے نسبتاً شوخ لباس پہنا تھا اور ہلکا پھلکا میک اپ کرنے کے بعد ٹیبل پر آئی تو ایمان کے علاوہ وسیع



نہیں تھا اس کی ناراضی کو خاطر میں لائے بغیر اگلا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ سکندر کو شاید اس کی یہ حمایت ہی پسند نہیں آئی تھی جیسی بری طرح برہم ہوا۔

”عین ممکن ہے فراز کہ مسز لاریب شاہ یہی ڈیزر کرتی ہوں بہتر ہے تم خاموش رہو۔“ اور فراز سکندر کے منجملہ چہرے کے سپاٹ تاثر کو دیکھتا کچھ دیر کو حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا اور سکندر اس بے اعتنائی سمیت گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا تھا مگر اس سے اگلی شام جب تائی ماں اور تاؤ جی کے ہاتھوں اماں اور بابا کو اپنی سادگی اور مخصوص دیہاتی انداز و اطوار کے باعث سبکی و حزمیت اٹھانا پڑی تو سکندر بہر حال یہ برداشت نہیں کر سکا اور کھلے صاف لفظوں میں انہیں اپنے گھر سے نکل جانے کا حکم سنا دیا تھا جس کے نتیجے میں جتنا بھی ہنگامہ ہوتا تاؤ جی نے اس بات کی جتنی بھی توہین محسوس کی مگر وہ لوگ وہاں سے جلتے جھکتے چلے ضرور گئے تھے۔

”سکندر پتر تجھے ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا وہ بھی ہماری خاطر۔ وہ غلط تھوڑی کہہ رہی تھی ہم ساری زندگی پنڈ میں رہے ہیں اتنے اچھے گھر میں رہنے سے برتنے کا ڈھنگ کہاں ہے ہمیں۔“ اماں جو تاؤ جی کی دھمکیوں اور تائی یاں کی واشگاف بددعاؤں اور کوسنوں سے سراپیمہ ہو چکی تھی صورت حال کو اتنا بگڑا ہوا پا کر روہا سی ہونے لگی۔ خود سکندر کی بھی غیض بھری ناراض اماں کے ساتھ ساتھ لاریب کو بھی وحشت کے سپرد کرنے لگی۔

”آپ لوگ جیسے ہیں اماں مجھے آپ پر فخر ہے اور یہ بات کوئی بھی نہ بھولے کیا آپ ان لوگوں سے ہر لحاظ سے بہتر ہیں۔“ سکندر کا انداز قطعی اور دونوک تھا اس کے بعد وہ وہاں رکا نہیں تھا اماں سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ جو کچھ ہوا تھا ان کے لیے بے حد تکلیف دہ تھا۔

”تو ہی کچھ سمجھا اسے دھیے وہ تو پاگل ہوا ہے۔“ اماں نے بے چارگی میں مبتلا ہو کر لاریب کی جانب دیکھا جس کے ہونٹوں پر اس مطالبے نے مجروح قسم کی مسکان بکھیر دی تھی تو آنکھوں میں بکھری ٹوٹے کانچ کی کرچیاں اپنی

”ارے میں کب کچھ اور کہہ رہی ہوں میں نے بھی یہی پوچھا ہے کہیں لہن بیگم ہمارے لیے پہلے سے ہی تو کوئی خوشخبری نہیں سنبھال کر بیٹھی ہوئی۔ جس طرح بے زار اور کم صم نظر آتی ہے ایسی حالت تو انہیں دنوں میں ہوتی ہے عورت کی۔“ تائی ماں ہار ماننے والوں میں کبھی شامل نہیں ہوا کرتی تھیں اس بار بھی معنی خیزیت سے کہہ گئیں تو لاریب کا سرخ چہرہ ضبط غم کے باعث کچھ مزید سرخ ہو کر لہو چھلکانے لگا۔ اس کا دل اس جس زدہ ماحول سے کچھ اس طور گھبرایا کہ وہاں سے بھاگ جانے کی خواہش شدید تر ہونے لگی۔ سکندر کی موجودگی میں اس انداز کی سبکی اسے روہانسا کر گئی تھی۔ اس پر اس کی خاموشی ستم پر ستم ہی تو تھا۔

”تو آج یہ بھی طے ہوا سکندر اعظم کہ تم اتنے ہی سنگدل بے حس اور ظالم ہو جتنا کہ تمہارے نام کا وہ بادشاہ جس نے اپنے شہر کو آگ لگا کر روشنی دیکھنے کی خواہش پوری کی تھی۔“ سکندر کو اسی بے اعتنائی و بے نیازی سے ناشتہ مکمل کر کے اٹھتے دیکھ کر فراز جو بے حد تلخ ہو چکا تھا اس کے پیچھے آ کر اسے جتلائے بغیر نہیں رہ سکا، سکندر نے سگریٹ سلگاتے بے حد سرد نظروں سے اسے دیکھا اور کچھ کہے بغیر گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

”اصولاً تو آج تمہارا ولیمہ ہونا چاہیے تھا وہ نہ سہی کم از کم گھر پر تو رک جاؤ یا ر، بھالی بے چاری کہاں تک اپنا بھرم رکھیں گی۔“ فراز نے اندر کی کھولن دباتے ہوئے بے حد جھنجلا کر کہا تب سکندر کا ضبط بھی جیسے ہارنے لگا اور چہرے پر غصے کا آثار نمودار ہو گئے۔

”تم چپ نہیں رہ سکتے؟“ اس پھٹکار زدہ تنبیہ پر فراز نے شاکی نظریں اس کے بے گانہ چہرے پر جمادیں۔

”اور کچھ نہیں تو کم از کم ان فسادی لوگوں کو ہی یہاں سے چلتا کر دو، سکندر تمہیں اندازہ نہیں ہے اس سے قبل ان لوگوں نے ایمان بھالی کی زندگی کو کیسے عذاب سے دوچار کیا ہوا تھا۔ ابھی تم نے دیکھا بھی کہ تائی ماں بھالی کو کیسے کہہ رہی تھی تمہاری خاموشی نے گویا شہہ دی ہے انہیں۔“ فراز عاجز ہو چکا تھا وہ ہمت ہارنے والوں میں سے بھی



خوب صورت دعا

اے اللہ!

جو میرے مقدر میں نہیں لکھا اس کی کوشش اور تمنا میں مجھے مبتلا نہ کر

جو تقدیر میں لکھ دیا ہے اسے آسان بنا دے۔

یا اللہ! مجھے اس کام کے لیے فرصت فراہم کر دینا جس کام کے لیے تُو نے مجھے پیدا کیا اور اس کام میں مشغول نہ ہونے دینا جس کی ذمہ داری تُو نے خود لی ہے۔

مجھے شکر کرنے کی توفیق فرما اور ایمان پر زندگی اور ایمان پر موت عطا فرما آمین۔

ایمان بٹ..... لودھراں

لظم

وہ جس نے

اس معصوم سی لڑکی کو

محبت کے نام پر لوٹا تھا

وہ انسان تھا

یا پھر کوئی

وحشی درندہ تھا

کوثر ناز..... حیدر آباد

وہ جس سے پیچھا چھڑانے کو وہ اس سے خواہ مخواہ الجھ پڑتا تھا۔ اس وقت بھی اس کیفیت کا شکار خواہ مخواہ اس کے گلے پڑنے لگا۔

”مجھے کیوں نماز کے لیے نہیں جگاتی، تمہاری ذمہ داریوں میں ایک یہ بھی ذمہ داری شامل ہے۔“ لاریب جو جائے نماز کو تہہ لگا رہی تھی اس اعتراض پر تحیر آمیز سرخ آنکھیں لمحہ بھر کو اٹھائیں اور پھر ریشمی پلکوں کو دوبارہ جھکا دیا۔

”صبح سے جگا دیا کروں گی۔“

ایک بار پھر نہ گلہ نہ شکایت اور فرمانبرداری کا مظاہرہ، یہ انوکھا دل ربا انداز جیسے لوٹ لے جانے والا تھا۔ سکندر چند ثانیوں کو حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا یہ تو اس نے بھی

سفاکیت کے ساتھ اسے مزید لہولہان کرنے لگیں کل رات جب وہ سونے سے قبل اس کے لیے بنا کہے کافی بنا کر لانے کے بعد گ اس کے سامنے رکھ رہی تھی تب اس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین سے نگاہ ہٹا کر کیٹیلی نظروں سے اسے سرتاپا دیکھا اور زہر خند لہجے میں بولا۔

”یہ پوچھ کر بنائی ہے؟“ وہ پھنکارا لاریب کس قدر گھبرائی، تب سکندر مزید حقارت سے گویا ہوا تھا۔

”ضروری نہیں ہے لاریب صاحبہ کہ میرا ہر رات آپ کے حسن کو خراج پیش کرنے کا ارادہ ہو۔“ سکندر کی پرکشش آنکھوں میں تحقیر و طنز کے زہریلے تاثرات درآئے تھے۔ دوسری جانب لاریب بھی جو اس درجہ سبکی و ذلت اور توہین کو سہتی شرم، غم و غصے اور بے بسی کے ملے جلے احساسات کے ساتھ جیسے خود کو زمین میں گڑھا ہوا محسوس کرتی سکتہ زدہ ہو گئی۔ عزت نفس اور انا پر لگایا گیا یہ تازیانہ اس کے وجود کے ساتھ ساتھ روح پر بھی ہر سو آبلے ڈال گیا تھا۔ جیسی شدت غم و رنج سے اس کی تمام صلاحیتیں ہی سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔

سکندر تو اپنے اندر کی آگ نکال کر پرسکون ہو گیا تھا مگر لاریب لمحہ لمحہ تڑپتی سسکتی رہی اسے یقین ہی نہ آتا تھا یہ وہی سکندر ہو سکتا ہے اتنا شقی القلب، ایسا منتقم مزاج اور اس حد تک سطحی سوچ رکھنے والا اس کی روح پر آبلے پڑ گئے تھے تو رگ رگ میں محشر برپا تھا۔ ایسے میں یہ سکندر کی بے رحمی کی انتہا یا پھر ڈھٹائی کی حد تھی کہ وہ پھر اس کی جانب پیش رفت کر چکا تھا۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ اس لمس میں نرمی تھی یا احساس میں بے پناہ دلکشی کا رنگ، اسے اس احساس سے محروم کرنے والا بھی وہ خود تھا۔ جب تک وہ جاگتا رہا تب بھی جب سو گیا اس کے بعد بھی لاریب نے منہ سے حرف شکایت نکالے بغیر بس خاموشی سے آنسو بہائے تھے۔

اگلی صبح جب سکندر کی آنکھ کھلی تو اسے جائے نماز پر دعا میں اس طرح سے سسکتے پا کر پھر وہی مجرمانہ انداز سکندر کے اندر سراٹھانے لگا تھا جس سے خائف تھا اور



نہیں چاہا تھا کہ اس کا تعلق ایسا ساٹ سر دمہر اور جلد ہو یہ کس ڈگر پر چل پڑا تھا وہ، بدلہ اتنا ضروری تھوڑی تھا انا کو سر بلند رکھتے وہ محبت کو کیسی پستی میں گرا رہا تھا اسے یہ سوچیں جیسے چابک رسید کرنے لگیں مگر یہ محض لمحاتی کیفیت تھی پھر اس کی سوچیں زہر سے بھرنے لگیں۔

(یہ اتنی نیک پروین اور سستی ساو تری نہیں ہے ہرگز بھی، نہ اس کا ضبط و حوصلہ اتنا بلند ہے میں دیکھتا ہوں کب تک خود کو مضبوط رکھتی ہے، دوسروں کی طرح اس نے بھی خود کو میرے سامنے اس لیے سرنگوں کیا ہے کہ آج میرے پاس حسب نسب کے ساتھ بے تحاشا دولت بھی ہے اس نے بھی مجھے یا میری محبت کو نہیں قبول اس نے بھی جاہ و حشمت کٹا گے سر جھکایا ہے اور حسب و نسب میں برابری کا شوہر تو بیوی کے ساتھ ہر طرح کا رویہ رکھ سکتا ہے اور بیوی کو برداشت کرنا پڑتا ہے)

وہ خود کو پھر صحیح سمجھنے لگا اس کی سوچیں پھر آتشیں ہو رہی تھیں۔

”آج پارلر جا کر بالوں کی کٹنگ کرا آنا مجھے پسند نہیں تمہارے اتنے لمبے بال۔“ آفس کے لیے تیار ہوتے اس نے جو بات کہی تھی اور جن تیوروں کے ساتھ کہی تھی اس نے لاریب کی اس بے نیاز یا دوسرے لفظوں میں اس کی جانب سے اختیار کیے صبر کو بھی لمحہ بھر کو سہی مگر بکھیر دیا تھا۔ اس نے چونک کر نظر اٹھائی۔ سکندر کی سرد نظروں میں کسی تلخ یاد کی چنگاری کی سلگن ابھی باقی تھی۔

لاریب اذیت کا شکار ہوتی نگاہ کا زاویہ بدل گئی۔ اسے یاد تھا بہت اچھی طرح سے کہ وہ اس کے ریشمی سیاہ گھنیرے بالوں کا کیسا دیوانہ تھا اور لاریب نے محض اسے اذیت دینے کی خاطر بال کٹوا دیے تھے اس کے احتجاج پر وہ اپنی نچی اس پرانڈ پلنے سے باز نہیں رہ سکی۔

”بات یہ نہیں تھی سکندر حیات کہ مجھے اپنے بال پسند نہیں تھے مگر اس کا کیا ہو کہ مجھے ہر وہ کام کر کے تسکین ملتی ہے جو تمہیں دکھ دینے کا باعث ہوتا کہ اندازہ تو کر سکو تم کہ تکلیف کیا ہوتی ہے وہ تکلیف جس میں تم نے اپنی خود

غرضی کے باعث گرفتار کر ڈالا ہے مجھے۔“

اور سکندر کا صرف چہرہ ہی دھواں دھواں نہیں ہوا تھا آنکھوں میں بھی اذیت کے رنگ بکھر گئے تھے تب وہ اسے بتا نہیں سکا تھا کہ وہ اس کی خود غرضی نہیں محبت کی انتہا تھی اور اب بالکل ایسے ہی لاریب بھی اس کے سامنے وضاحت کرنے سے لاچار رہی تھی۔

”تمہیں کچھ کہا تھا میں نے یا تمہارے نزدیک آج بھی میری بات کی سرے سے اہمیت نہیں ہے۔“ شام کو وہ آفس سے لوٹا تو نارمل تھا حالانکہ صبح جاتے ہوئے وہ ہرگز اتنا پرسکون نہیں تھا کہ اماں کو اس کا تائی ماں کی فیملی کے لیے کیا گیا فیصلہ ہرگز پسند نہیں تھا سمجھانے بجھانے کی کوشش کو ناکام دیکھ کر وہ اس پر جذباتی دباؤ ڈالنے لگی تھیں۔ تب اس نے ناچار ہار مان لی تھی۔ جب اماں نے کہہ دیا تھا کہ اب وہ انہیں یا ان کی بات کو بھلا کیوں کچھ گردانے لگا ظاہر ہے اب اس کے نزدیک ان کی اہمیت ہی کہاں ہے۔“ تب کتنا جھنجھلا گیا تھا وہ اور بے بس نظر آنے لگا تھا۔

”ٹھیک ہے میں معافی مانگ لوں گا ان سے اب خوش ہیں آپ؟“ وہ کتنا چڑچڑا ہوا تھا اور اماں اسی قدر مطمئن اور آسودہ لاریب کو اب اس نے کچن میں آن لیا تھا اس وقت وہ یہاں کھڑی سب کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ لاریب نے پلٹ کر دیکھا وہ اسے برہم نظروں سے گھور رہا تھا مگر یہاں آ جانے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ نہ وہ اس سے خائف ہوئی نہ اعتماد متزلزل ہوا۔

”اس لیے کہ مجھے بال نہیں کٹوانے تھے۔“ وہ بولی تو اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا سکون تھا وہ ذرا بھی خوفزدہ نظر نہیں آرہی تھی سکندر کا چہرہ اس صاف انکار پر بے تحاشا سرخ پڑتا چلا گیا جبکہ فشار خون بڑھتا دماغ میں ٹھوکریں مارنے لگا۔

(جاری ہے)





WWW.PAKSOCIETY.COM

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

محکمہ خزانہ

WWW.PAKSOCIETY.COM



ایک مدت سے مہری سوچ کا محور تُو ہے  
ایک مدت سے میری ذات کے اندر تُو ہے  
میں تیرے پیار کے ساحل پہ کھڑا ہوں تنہا  
میری چاہت مری الفت کا سمندر تُو ہے

### گزشتہ قسط کا خلاصہ

ہے عریشہ کی موت کے بعد بھی اس کے گہروالوں نے ایسے ہی اس کا اعتماد ریزہ ریزہ کیا تھا۔ مگر اب کے وہ تمام تعلقات ختم کرتے اپنے بچوں کو ان کی حاسدانہ نظروں سے محفوظ کر لیتا ہے۔ دوسری طرف فاطمہ کے ساتھ اس کا رویہ بچوں کے لوٹ آنے پر بھی وہی بد صورتی لیے ہوتا ہے وہ اس غلطی پر اسے معاف کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اپنی ذات کی اس تحقیر پر فاطمہ اپنے رب سے رجوع کرتی ہے اور اپنے رب کو بھول جانے پر صدق دل سے معافی کی خواست گار بن کر ایک نئی فاطمہ کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ جس کے دل میں اب صرف اپنے رب کی محبت ہے۔ وقاص اپنے گزشتہ رویوں پر ایمان سے معذرت کرتا ہے دوسری طرف ایمان بھی اس کے یکسر بدلاؤ کو دیکھ کر سابقہ رویوں کو درگزر کر دیتی ہے۔ رخصتی کے بعد لاریب ایک نئی زندگی کا آغاز کرتی ہے جس میں ہر صورت وہ اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن پہلے ہی موقع پر سکندر کا بدلا انداز اسے بہت کچھ باور کرا دیتا ہے۔ سکندر کسی طور اس کے گزشتہ رویوں کو معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا اسے یہی لگتا ہے کہ آج بھی لاریب کا بدلاؤ اس کا حسب نسب بدل جانے پر صرف ایک سمجھوتہ ہے۔ لاریب کی اس تبدیلی میں اسے محبت کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔ اپنی انا کو بلند رکھنے کی خاطر وہ اسے تحقیر کا نشانہ بناتا ہے۔ دوسری طرف وہ اپنے ضبط کو آزما تے اس کے ناروا سلوک کو خاموشی سے برداشت کرتی ہے۔

(اب آپ آگے پڑھیے)



ابراہیم احمد اور فاطمہ کو بہن بھائی کے بندھن میں دیکھ کر عباس اپنی بدگمانی پر نہایت شرمندگی محسوس کرتا ہے جبکہ دوسری طرف ابراہیم اپنی بہن کو محفوظ ہاتھوں اور مسلم گھرانے میں دیکھ کر نہایت خوش ہوتا ہے ایمان اور امامہ زبردستی لاریب کی رخصتی کی تقریب منعقد کر لیتی ہیں جبکہ سکندر کا سرد مہر رویہ لاریب کو خدشات میں مبتلا کیے رکھتا ہے۔ عباس فاطمہ کے ساتھ اپنی زندگی میں مطمئن ہونے کی کوشش کرتا ہے جب ہی عریشہ کا بھائی سعید احمد عباس پر دوسری شادی کے لیے دباؤ ڈالتا ہے اور اپنی بہن علیہ کا پروپوزل پیش کرتا ہے دوسری طرف عباس کے منہ سے انکار اور فاطمہ سے اس کی شادی کا سن کر شدید اشتعال میں آتے وہ نہ صرف دھمکیوں پر اتر آتا ہے بلکہ گن پوائنٹ پر فاطمہ سے بچوں کو چھین کر بھی لے جاتا ہے۔ ایسے میں عباس کا تمام غصہ فاطمہ پر اترتا ہے بچوں کے نہ ملنے پر وہ اسے زندہ نہ چھوڑنے کی دھمکی دیتا ہے جبکہ فاطمہ اس صورت حال پر اپنی غلطی تسلیم کرتے نہایت اذیت کا شکار رہتی ہے۔ سکندر نہایت برہم انداز میں لاریب کو فیصلے کا اختیار سونپتے سوچنے کی مہلت دیتا ہے تاکہ اس زبردستی کے رشتے کو مزید طول دینے کے بجائے یہیں ختم کیا جاسکے جبکہ سکندر کے منہ سے یہ باتیں سن کر لاریب ششدر رہ جاتی ہے سکندر کا یہ روپ اسے تفکرات میں مبتلا کر دیتا ہے۔ عباس اپنے اثر و رسوخ کی مدد سے بچوں کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ عریشہ کے گہروالوں کے اس رویے پر وہ انتہائی غنیض و غضب کا شکار نظر آتا



کی اس حرکت پہ کندن کی مانند دھک کر جھمکائی اسے کچھ اور بھی حسین اور دل فریب بنا گئی تھی۔

”ہوں..... ہوں چا کر کے تو بہانے ہیں ورنہ اصل مقصد تو اپنی مسز کو یہاں سے اڑانے کا تھا۔“ فراز نے ہنستے ہوئے پھر ٹکڑا لگایا تو سکندر دلکشی و دلی ویزی سے مسکرا دیا۔

”نئی نوپلی دہن کے بغیر بیڈروم کیسے کاٹنے کو دوڑتا ہے اندازہ تو ہو گا تمہیں۔“ اس فقرے میں سکندر نے فراز کو جیسے ایک ساتھ بہت کچھ جتلیا تھا اور لاریب کی جزبز کیفیت حجاب آمیز جھنجھلاہٹ کو خاطر میں لائے بغیر یونہی ہاتھ پکڑے ہال کمرے سے نکال لایا تھا مگر اس کے بعد وہ ایسا اجنبی تھا جیسے لاریب سے کوئی تعلق تھا نہ ہی وہ اسے جانتا تک ہو۔

”کب سے ہے تمہاری خراب طبیعت؟“ وہ ہاتھ لینے کے بعد واش روم سے نکلا تھا لاریب کو بیڈ پر بیٹھتے چھینکتے پا کر قدرے چونکا۔

”ابھی کچھ دیر قبل اچانک ہی زکام ہو گیا ہے۔“ رومال سے ناک پونچھتی لاریب ایک بار پھر چھینکتی تو سکندر نے آہستہ میں سے ہی اس کی ڈبڈبائی نظروں اور سرخ ہوتی ناک کو دیکھا تھا۔

”تم صوفے پر لیٹو فلو کے جراثیم بہت تیزی سے پھیلتے ہیں اور میرا بیمار پڑنے کا موڈ نہیں۔“ نخوت زدہ انداز میں کہتا وہ لاریب کو صرف خفت زدہ نہیں کر گیا تھا۔ عجیب سی یاسیت سے بھی دوچار کر گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ بیڈ سے اٹھی تو سکی کا کاٹ دار انداز اس کے اندر وحشت بھر رہا تھا۔

(مجھ سے اتنا دور مت جاؤ سکندر حیات کہ یہ فاصلے پائنا میرے بس کی بات نہ رہے) صوفے پر لیٹنے کے بعد سکندر کی جانب سے کروٹ بدلتے آنسوؤں پر باندھے بند ٹوٹ کر بکھر گئے تھے۔



عباس حیدر نے سرد آہ بھرے تصویروں کا البم بند کر کے رکھ دیا۔ جہاں ہر سو عریشہ کے حوالے سے یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ آج اسے کچھڑے اک سال پورا ہوا تھا

”یہ آپ کی نافرمانی نہیں ہے، سکندر! میں اللہ کی حکم عدولی سے بچنا چاہتی ہوں، میں اللہ سے جو وعدے کر چکی ہوں ان میں یہ بھی شامل ہے مجھے یقین ہے آپ مجھے فورس نہیں کریں گے۔ یہ یہ معاملہ اللہ کا ہے۔“ اگر وہ چند لمحوں کو نہ بولتی تو یقیناً سکندر کا ہاتھ اس پر اٹھ جاتا مگر اب وہ ساکن، متحیر غیر یقین کھڑا تھا۔ حواس جامد اور ہونٹ جیسے سل گئے تھے۔ ایک جھماکا سا ہوا تھا جیسے اور لاریب کی تبدیلی کا اسرار کھل کر واضح ہو گیا۔

سکندر وہاں سے پلٹا تو اس کا سر شرمندگی کے احساس سے جھکا ہوا تھا۔ لاریب نے اس کی خاموشی پر بے اختیار سکھ کا سانس لیا جب وہ چائے لے کر آئی سب کے ہنستے مسکراتے خوش باش چہروں میں سکندر اسے کم صم نظر آیا تھا گا بے یگا ہے اس پر نگاہ ڈالتی وہ اس خاموشی کے پیچھے اصل وجہ کھوجتی رہی۔

”ارے..... ارے..... اس طرح بار بار بھائی کو کیوں گھورتے ہو، سیدھی طرح سے کر لو جو بھی بات کرتی ہے۔“

سکندر کی لاریب پر اٹھتی نظر کو گرفت میں لیتا ہوا فراز یک دم شوخی بھرے انداز میں کہہ گیا جب کہ سکندر نے خفیف ہوتے رست داغ پر نگاہ کی تھی۔

”نا تم بہت ہو گیا ہے میرا خیال ہے سونا چاہیے۔“

لاریب نے ایک نظر ڈالی ما سے سکندر کی آنکھوں کے زیریں کنارے بے تحاشہ سرخ ہوتے محسوس ہوئے فراز معنی خیزی سے مسکرانے لگا۔

”تو جاؤ، سو جاؤ منع کس نے کیا ہے، بھابی البتہ یہاں رہیں گی ہم ایک بار پھر ان سے کافی بنوا کر پیسے گے کیوں بھابی؟“ فراز نے آنکھیں نچا کر کہتے لاریب کو بھی اپنا ہموا کرنا چاہا تو وہ بس بدلی سے مسکرا دی۔

”جہیں کس نے کہا کہ میں اپنی بیوی کو تمہاری چا کر کے پر مامور کروں گا، اٹھو لاریب۔“ سکندر نے صرف کہا نہیں ہاتھ بڑھا کر لاریب کی کلائی بھی تھام لی تو وہاں اسے محبت کا بے باک مظاہرہ سمجھتے ہوئے ہر سمت ہا ہو کارچ گئی تھی۔

نئی بلیو سوٹ میں بے تحاشہ دکتی لاریب کی رنگت سکندر



سنا گیا جسے ملازمہ سنبھالنے میں ہلکان بلکہ بے زار نظر آرہی تھی۔

”بچہ فاطمہ میم کے بغیر نہیں رہتے ہیں سر، اسامہ بابا بھی خاصا تنگ کر کے بڑی مشکلوں سے سوئے ہیں۔“

”کیوں، فاطمہ کہاں ہے، طبیعت ٹھیک ہے اس کی؟“ دیا کو ملازمہ سے لیتا وہ یہی قیاس کر سکا تھا۔

”سر فاطمہ میم اپنے بھائی کے گھر چلی گئی ہیں۔“ ملازمہ کی فراہم کردہ اطلاع نے عباس کو ہلک دک کر کے کھدیا۔

”کب..... اور بچوں کو چھوڑ کر؟“ اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا۔

”آج ہی بچوں کے بارے میں تو میم نے کچھ ہدایت نہیں دی۔“ ملازمہ کے جواب سے عباس کی تسلی نہیں ہو سکی۔ دیا کو چاکلیٹ تھما کر بہلانے کی کوشش کی مگر وہ ماما کی گردان کیے جارہی تھی۔ عباس چند منٹ میں ہی جھنجھلانے لگا کچھ سوچ کر اس نے فاطمہ کا نمبر ڈائل کیا مگر اس پر جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ ابراہیم احمد سے کبھی رابطہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ نہ اس کا کلنیک نمبر اس کے پاس تھا اس نے دیا کو واپس ملازمہ کے حوالے کیا۔

”جاؤ بیٹے اچھے والے کپڑے پہناؤ آپ کو ماما کے پاس لے کر چلتا ہوں۔“ دیا کا گال نرمی سے تھپتھا کر اس نے بچی کو تسلی دی تھی اور خود سیل فون سے وہ فراز کا نمبر مل رہا تھا۔



اس نے نرم مسکان کے پیچھے اپنا ہر دک پوشیدہ کر لیا تھا یہی وجہ تھی کہ سمعیہ کے ساتھ ساتھ ایمان بھی اس کے اندر کا بھید نہیں پاسکی۔ ابراہیم کچھ غلٹ میں تھا۔ جیسی اسے اپارٹمنٹ میں سمعیہ اور ایمان کے پاس چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا سمعیہ کے انداز میں فاطمہ کے لیے بے حد محبت تھی وہ بہت پیار سے پیش آرہی تھی۔

”مجھے اسی روز انہوں نے بتا دیا تھا جب وہ آپ سے مل کر آئے، میں خود بھی آپ سے ملنے آنا چاہ رہی تھی مگر لاریب کی شادی کی مصروفیت کی وجہ سے آنا نہیں ہو سکا

ایک سال..... کتنی صدیاں قید تھیں ان تین سو بیسٹھ دنوں میں وہ صبح سے ہی بے حد وحشت زدہ پھر تارہا تھا اور لقمہ بھی کل شام سے اس کے حلق سے نہیں اتر سکا تھا۔

”صاحب فون ہے آپ کا۔“ ایزی چیئر پر جھولتے بے کل سے عباس کو ملازمہ نے آ کر مخاطب کیا۔ ہاتھ میں کارڈ لیس تھا جو وہ اس کی جانب بڑھائے ہوئے تھی۔

”جو کوئی بھی ہے منع کر دو اسے مجھے کسی سے بھی بات نہیں کرنی۔“ وہ بولا تو اس کی آواز پٹختی ہوئی تھی۔

”سر یہ آپ کی مدر کی کال ہے بہت خفا ہو رہی تھیں مجھ پر کہ آپ کا فون کیوں بند جا رہا ہے مسلسل۔“ ملازمہ کے ہٹکا کر کہنے پر عباس کو ناچار فون لینا پڑا تھا۔

”السلام علیکم ماں جان۔“ وہ جیسے بادل نا خواستہ بولا۔

”وعلیکم السلام بیٹے کہاں گم ہو آپ، کتنے فون کیے مگر.....؟“

”خیر ماں جان؟“ ان کی متوقع ناراضی کے آگے بند باندھتے ہوئے اس نے اگلی بات چھیڑی۔

”بیٹے ایمان کی صحت یابی کی خوشی میں تمہارے چاچا سائیں نے اپنے گھر میں ختم القرآن کروایا ہے رشتہ داروں کی دعوت بھی ہے۔ تم آ جاؤ، دیکھو اب یہ مت کہنا کہ نہیں آ سکتا لاریب کی شادی پر بھی تم شریک نہیں ہوئے بالکل مناسب نہیں ہے یہ روپیہ نئی نئی تعلق میں بحالی آئی ہے وہ لوگ سمجھیں گے تم ملنا ہی نہیں جاتے۔“ ان کے انداز سے ہی لگ رہا تھا کہ اس کا انکار انہیں گوارا نہیں ہوگا عباس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”کب ہے دعوت؟“ وہ بے بس سا ہوا تھا۔

”کل شام کو اور سنو بیٹے اکیلے ہی نہ چلے آنا بہو اور بچوں کو ساتھ ضرور لانا ٹھیک ہے۔“ اپنی سنا کر اب وہ اس کی تائید کی بھی خواہش مند تھیں۔ عباس نے محض ہنکارا بھرا اور فون بند کر دیا وہ شام اور رات بھی گزر گئی۔ عباس صرف نماز کی ادائیگی کے لیے گھر سے نکلا تھا۔

”یہ دیا اتنا کیوں رو رہی ہے؟“ اگلے دن وہ ظہر کی نماز کے بعد گھر لوٹا تو بری طرح سے ہلکتی دیا کی آواز سن کر اس



سمجھوتے کی چکی میں خود کو پینا پڑ گیا تھا۔ ایمان سے یہ سب دیکھا نہیں جاسکا تو سکندر کے گھر سے واپس یہاں چلی آئی تھی۔ حالانکہ بابا سائیں کی خواہش تھی کہ وہ ان کے ساتھ رہے۔

”سکندر اور لاریب نے حویلی اور میری ذمہ داریوں کو بہت بہتر طریقے سے انجام دیا ہے، مینا، اب وہ اپنی زندگی اپنے طور پر گزارنے کا حق رکھتے ہیں۔ امامہ کو میں یہاں اس لیے بلوانا نہیں چاہتا کہ تمہارے تایا جان اور تائی جان اکیلے ہو جائیں گے کہ عباس تو مستقل شہر میں ہی رہتا ہے۔ ہاں تم سے ضرور کہوں گا کہ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اپنی اس بیٹی کے ساتھ میں نے دانستہ یا نادانستہ بھی بہت زیادتی کی تھی لیکن میں آپ کو مجبور بھی نہیں کرنا چاہتا آپ اپنی مرضی کا فیصلہ کر سکتی ہو۔“ اور جواب میں ایمان سسکیاں وہاتی ان کے بازوؤں سے لگ گئی تھی۔

”میں اپنی ذمہ داریوں کو نبھاؤں گی بابا جان، وہ ذمہ داریاں جنہیں میں لاریب کے کاندھوں پر ڈال گئی تھی۔ آپ کے ساتھ بہت سارا وقت گزارنے آپ کی خدمت کرنے اور آپ کی محبتیں پانے کی میرے اندر بھی بہت پیاس ہے شرجیل سے بات کرنے اور ان کی اجازت پانے کے بعد میں مستقل آپ کے پاس آ جاؤں گی۔“ اور بابا سائیں نے مسکرا کر اس کا سر تھپکا تھا شرجیل سے یہ معاملہ ڈسکس کرنے کے بعد جب اس نے اجازت مانگی تو شرجیل نے اسے اپنی رضا کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار سونپ کر گویا اس کا مان بڑھا دیا تھا۔ یہاں ایمان اپنا ضروری سامان لینے ہی رکی ہوئی تھی مگر اب فاطمہ سے ہونے والا سامنا اسے نکمیر نے اور مزید توڑنے کا باعث بن گیا تھا۔

”مجھے صاف لگتا ہے بھابی، میں مذہب سے بہت دور ہوں، یہاں آنے کا مقصد ہی بھائی سے گائڈنس لینا ہے سچ پوچھیں تو مجھے ابھی صحیح سے نماز بھی پڑھنی نہیں آتی۔“ ایمان چائے لے کر لوازمات سے کچی ٹرائی لیے اندر آئی تو اس نے فاطمہ کو کہتے سنا تھا۔ ایمان کچھ کہے بغیر

بہت اچھا ہوا آپ چلی آئیں۔ لیکن بچوں کو ساتھ کیوں نہیں لائیں، ابراہیم احمد بتا رہے تھے آپ کے دونوں بچے ماشاء اللہ بہت کیوٹ ہیں۔“ یہاں خری والی بات ایسی تھی جس کے متعلق فاطمہ کے پاس جواب نہیں تھا۔ جیسی اپنی جگہ پر بے چین ہو کر پہلو بدلا اور ایمان کو دیکھا جو قدرے کلم صم نظر آ رہی تھی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ اس نے دانستہ مسکراتے کی کوشش کی اس کا لورنہ حسن اس سوگوار تاثر کے ساتھ کچھ اور بھی سحر انگیزی سمیٹ لایا تھا ایمان نے ہڑبڑا کر خود کو با مشکل سنبھالا۔

”میں ٹھیک ہوں آپ کیسی ہو فاطمہ؟“ کوشش کے باوجود بھی وہ اپنے لہجے میں مخصوص بٹاشٹ اور خوشدلی نہیں بھرسکی، فاطمہ نے مسکرا کر اس کی بات کا جواب دیا اور چند مزید رسمی باتیں کی تھیں۔

”لاریب کی بہن ہیں ایمان بھابی، اس طرح تو آپ کا ان سے ڈبل رشتہ بنتا ہے۔“ سمعیہ جو پوری حقیقت سے بے خبر تھی بے تکلفی سے بولی فاطمہ کے حسین خدو خال میں خوشگواریت کا تاثر ابھرا یا یا اس نے شعوری طور پر پیدا کیا ایمان سمجھنے سے قاصر رہی، البتہ وہاں سے راہ فرار ڈھونڈنے کو یکدم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ اس نے مردمانی مسکرا کر کہا اور پلٹ کر کمرے سے نکل گئی اس کے اندر کی ٹھن بڑھ رہی تھی۔

لاریب سکندر کے ساتھ خوش ہے ایمان کا یقین اس وقت بکھر گیا تھا جب بات بے بات ایمان نے لاریب کی آنکھوں کا بھیگنا اور وحشت سے بھرنا محسوس کیا تھا کلم صم خاموش اور حراساں نظر آنے والی یہ وہ لاریب تو انہیں سے بھی نہیں تھی جس کی کھلکھلاہٹوں اور نازک مزاجی کے وہ سب گواہ تھے۔ اس نے صاف محسوس کیا تھا کہ وہ ایک سمجھوتے سے بھری زندگی گزار رہی ہے۔ اس جذباتیت میں اٹھائے گئے قدم کے بعد مستقل سمجھوتہ جو نازیر ہو چکا تھا وہ لاریب جو مزاج اور پسند کے برخلاف جوتے استعمال نہیں کر سکتی تھی اسے زندگی میں کیسے بڑے اور کٹھن



سکندر کی شادی کی تقریب میں تاؤ جی نے ابراہیم احمد کو دیکھ کر ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ سراسر بے حیائی کا مقام تھا کہ وہ لونڈا اٹھ کر کھلے عام ان کے گھر میں دندناتا پھرے جو ان کی لڑکی کو در پردہ بھگانے کا باعث بنا تھا۔ شرجیل کے وضاحت و صفائی میں دیے گئے بیان بھی سمعیہ پر عائد جرائم منانے میں ناکام رہے تھے۔

”یہ آپ کا گھر نہیں ہے تاؤ جی جہاں آپ کے اندھے قوانین چلیں گے، یہاں ابراہیم احمد کی اتنی ہی عزت ہے جتنی ایک گھر کے داماد کی ہونی چاہیے، مجھے ہرگز پسند نہیں کہ آپ ابراہیم صاحب کے لیے اس طرح گرج کربات کریں۔“ سکندر کے براہم انداز پر تاؤ جی چپ تو ہو گئے تھے مگر ناگواری اپنی جگہ پر قائم و دائم رہی تھی۔ ابراہیم احمد اپنی وجہ سے ہرگز بد مزگی نہیں چاہتا تھا۔ جیسا وہاں سے جانا چاہ رہا تھا مگر شرجیل نے اسے زبردستی روک لیا۔

”نہیں ابراہیم احمد، تم یہاں سے اکیلے نہیں جاؤ گے، اس لیے کہ سمعیہ سے شادی تم نے اپنی پسند سے نہیں میری خواہش کے احترام میں کی تھی تاؤ جی اگر ابراہیم احمد اور سمعیہ کے لیے یہاں جگہ نہیں ہے تو میں بھی یہاں نہیں رکوں گا نہ کبھی پلٹ کر یہاں آؤں گا۔ سمعیہ میری بہن اور ابراہیم احمد میرا قابل احترام دوست ہے۔“ شرجیل کا غصہ اس پل نقطہ عروج پر تھا۔ وہ اس بات پر نالاں تھا کہ تاؤ جی نے اپنی فطرت کا شر پھیلا کر اچھا بھلا ماحول مکدر کر کے رکھ دیا تھا۔

”شرجیل! آپ یہاں سے نہیں جاؤ گے، ابراہیم صرف آپ کے لیے نہیں ہم سب کے لیے اتنے ہی قابل احترام ہیں جنہیں ان کی یہاں موجودگی پسند نہیں آئی کھلی آزادی ہے، جانے کی۔“ سکندر جو ضبط اور برداشت کا دامن بہت کم چھوڑتا تھا اس پل بے حد طیش میں آچکا تھا۔ البتہ ابراہیم کو اس کے بات کرنے کا انداز پسند نہیں آ سکا تھا۔

”فیک اٹ ایزی سکندر بھائی، کنٹرول یور سیلف۔“ بزرگوں کے ساتھ اس انداز میں بات نہیں کرتے۔“ اس کا بات کرنے کا مخصوص نرم خوانداز تھا۔ پھر یہ ابراہیم احمد کا محل اور اعلیٰ ظرفی تھی کہ بگڑا ہوا معاملہ بتدریج سمجھنے لگا تھا ابراہیم

صوفے پر بیٹھ کر چائے بنانے اور دونوں کو پیش کی۔ ”جراک اللہ ایچی باجو۔“ ایمان نے چائے کا گم اس کی جانب بڑھایا تو اس نے بہت پیاری سی مسکان سے ایسے نواز تھا ایمان اسے دیکھتی کی دیکھتی رہی گئی۔ کتنی حسین تھی وہ، لہجوں میں دل جیت لینے کی صلاحیت سے مالا مال۔ اسے یقین ہوا اگر اس نے مزید ایسی ہی چند مسکراہٹوں سے اسے نواز تو وہ لہجوں میں پھل جائے گی تو کیا اس لیے عیاس اتنا دیوانہ ہو گیا اس کا؟“ وہ سوچتے ہوئے گم صمم ہو گئی تھی۔

”ہمارا بہت کم وقت ایک ساتھ گزرا ہے، میں ہمیشہ می کے پاس رہی جبکہ بھائی ڈیڈ کے ساتھ ہوتے تھے میں تو کبھی بگھار ڈیڈ کے پاس چلی جاتی تھی مگر بھائی کبھی انڈیا نہیں آئے اس کے باوجود ہماری بہت اچھی ذہنی ہم آہنگی تھی بھائی بہت محبت کرتے ہیں مجھ سے۔“ وہ کتنے مان و یقین سے کہہ رہی تھی۔

”آپ کچھ میں کیا لیں گی فاطمہ، مجھے بتادیں میں وہی بنالیتی ہوں۔“ مزید کچھ دیر کی گفتگو کے بعد سمعیہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”جھنگ اسپیشل بھابی پلیز، جو کچھ پکا ہے میں وہی کھالوں گی آپ میرے پاس بیٹھیں نا اور مجھے بتائیں آپ کی شادی بھائی سے کیسے ہوئی۔“ فاطمہ کے چاہت بھرے انداز میں کچھ ایسا اشتیاق تھا جس نے سمعیہ کو گلزار کر دیا۔ وہ سرخ پڑی اور ایک نظر ایمان کو دیکھا۔

”یہ سب ان کے شوہر نامدار کا کا نام ہے، انہی کے دوست ہیں آپ کے بھائی، بس پھر ہو گئی شادی۔“ سمعیہ چاہنے کے باوجود بھی فاطمہ کے آگے وہ تفصیلات نہیں رکھ سکی جسے اپنے والدین اور دیگر فیملی ممبرز کے سامنے فخر سے دہرانے پر اسے ملامت کے نشتر اپنے جسم و روح پر سہنے پڑے تھے۔

ان کے نزدیک گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کی جو حیثیت تھی وہی سمعیہ کی حیثیت تھی اس کے ان سے ملنے اور ان کے ہاں جانے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ لاریب اور



جب بات کر رہا تھا سمعیہ نے ایک ایک حرف سنا تھا اور جیسے مہبوت ہو کر رہ گئی تھی اسے لگا تھا فاطمہ کا یہاں آنا اور ابراہیم احمد کی محبت میں علم کی دولت حاصل کرنا بالکل درست فیصلہ ہے کال نکل کی آواز ابھری تو ایمان معذرت کرتی ابھی تھی مگر چند لمحوں کی تاخیر کے بعد وہ پھر واپس آ گئی۔

”فاطمہ عباس بھائی آئے ہیں۔“ یہ اطلاع ایسی تھی جس پر تمام تر غیر یقینی کے باوجود فاطمہ کا دل اتنی شدت سے دھڑکا کہ اس کی آواز فاطمہ نے خود سنی۔

”عباس.....!“ وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی ایمان اور سمعیہ نے دیکھا ایک لمحے میں جیسے اس کے چہرے پر ہزاروں بلب روشن ہوں لیکن ساکت و سانس ایسے کھڑی تھی جیسے خود بھی اس بات کا یقین نہ آیا ہو اگلے لمحے وہ کانپتی ٹانگوں اور تھمتاتے چہرے کے ساتھ کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئی تو اس کے روئیں روئیں میں انوکھی ترنگ اور سرستی پھیلتی چلی آئی تھی۔

”السلام علیکم!“ اس کی آواز میں ایک جوش و خروش اور بھرپور زندگی کا احساس تھا۔ عباس پر اس نے محض ایک نگاہ ڈالی تھی پھر اس کی لرزنی پلکیں جھک گئیں۔ اندھا ایسا سکون و اطمینان پھیلا تھا جیسے کہ کم شدہ چیز کے مل جانے کے بعد حاصل ہو سکتا ہے۔ تب ہی عباس اس کی جانب متوجہ ہوا دونوں بچے ایک منٹ کے ہزارویں حصے میں باپ کو چھوڑ کر فاطمہ کی جانب لے گئے تھے۔

”بناتائے منہ اٹھا کر یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی، وہ بھی بچوں کو چھوڑ کر۔“ وہ بری طرح تپا ہوا تھا۔ اندر کا وہ سارا غصہ اس نے لمحہ بھر کی تاخیر کے بغیر فاطمہ پر نکالا جس کو فٹ سے وہ پچھلے چند گھنٹوں کے اندر گزرا تھا۔ اس نے فاطمہ پر جو نگاہ ڈالی تھی وہ بے حد سنگین تھی۔ چہرے پر ایسا قہر اور کڑی دورستی تھی کہ فاطمہ لمحہ بھر میں سر دپڑنے لگی۔ اسے اپنی اس بے اختیار و کمزوری پر طیش سا آیا۔ جس کا مظاہرہ ابھی اس کا دل کر چکا تھا۔ تو یہ طے پایا تھا کہ ابھی بھی عباس کی صرف ایک معمولی سی کوشش اس کے دل و دماغ اور پورے وجود کو زیر و زبر کر سکتی تھی۔ یعنی وہ آج بھی اس پر اسی

احمد نے خود آگے بڑھ کر تاؤ جی سے معذرت کی تھی اور سکندر و شرجیل کے سخت رویوں پر انہیں سمجھانے کا فریضہ بھی انجام دیا تھا۔

”یار اس قسم کے لوگوں کے ساتھ نرمی و رومان کا فائدہ ہی نہیں ہے۔“ شرجیل ابراہیم کے قتل و بردہاری کے آگے پہلی بار جھنجھلاہٹ کا شکار نظر آیا تو ابراہیم احمد نے جواباً اسے اسی نرمی و ملامت سے ٹوکا۔

”یہ بہت غلط طریقہ ہے شرجیل بزرگوں کے متعلق بات کرنے کا دوسری اہم بات یہ کہ کسی کی برائی کو دیکھ کر اگر آپ خود بھی اچھائی کا دامن چھوڑ دیں گے تو اچھائی کا فقدان ہوتے ہوتے خاتم ہو جائے پھر آپ میں اور برائی کرنے والے میں فرق بھی کیا رہ جائے گا۔ بلکہ گہرائی سے سوچا جائے تو برائی کو دیکھ کر اچھائی سے دستبردار ہو جانے والے کا درجہ تو برائی پر قائم رہنے والے سے بھی کم تر سمجھ کر نظر آئے گا۔ کیونکہ ضروری نہیں برائی والا علم والا بھی ہوا گئی سے فیض بھی پا چکا ہو مگر اچھائی والے کو اللہ نے علم کی دولت سے ہی نہیں عمل کی سعادت سے بھی نوازا ہے، پھر بعد میں اگر ایسا رویہ اختیار کیا جائے تو خدا ہم سے راضی رہے گا؟“ وہ سوال کر رہا تھا اور شرجیل خفت زدہ کھڑا رہ گیا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو ابراہیم احمد ہمیں کبھی بھی کسی کو نچلے درجے کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے، کیونکہ اچھی سوچ بہتر عمل ہماری ذاتی خوبی و کارکردگی نہیں بلکہ خالصتاً اللہ کی عطا ہے اسی کا کرم ہے۔“ شرجیل نے اپنی غلطی تسلیم کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی اور ابراہیم احمد بے ساختہ مسکرانے لگا تھا۔

”بالکل امام غزالی فرماتے ہیں۔ سب انسان مردہ ہیں زندہ وہ ہیں جو علم والے ہیں۔ سب علم والے سوئے ہوئے ہیں بیدار وہ ہیں جو عمل والے ہیں۔ تمام عامل والے گھائے میں ہیں فائدے میں وہ ہیں جو اخلاص والے ہیں۔ سب اخلاص والے خطرے میں ہیں صرف وہ کامیاب ہیں جو تکبر سے پاک ہیں۔“

”تو شرجیل احمد کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ابھی تو ہمیں خود اپنے سدھار کے لیے بہت ریاضت و محنت درکار ہے۔“ وہ



کر اس کی آنکھوں سے پھوٹ پڑا۔

”السلام علیکم، کیسے ہیں عباس صاحب، فاطمہ جاؤ بیٹا اپنی چادر لے آؤ۔“ ابراہیم احمد سب کچھ سن لینے کے باوجود اسی محل و رمان سمیت کہتا عباس سے ملا تھا جو اس کے مزاج اور طبیعت کا خاصہ تھا فاطمہ دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ تیزی سے پلٹ کر کمرے سے نکلی تھی۔ جبکہ عباس بیٹھتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ نگاہ کا زاویہ بدل کر سگریٹ سلگانے لگا۔

”آپ جتنی بھی جلدی میں ہیں مگر چائے پیے بغیر میں ہرگز آپ کو جانے نہیں دوں گا۔“ اسامہ گوگود میں لے کر پیار کرتا ہوا ابراہیم عباس کے مد مقابل بیٹھ گیا۔ عباس اس کی غیر متوقع اچانک آمد سے صرف بے زار ہی نہیں جزبہ اور خائف بھی ہوا تھا کہ اس چپقلش کے متعلق فاطمہ کے بھائی ہونے کے ناطے اس کے سوال جواب سے گریزاں تھا ابراہیم احمد کے اتنے نارمل انداز پر بے ساختہ ٹھنک کر اسے بغور دیکھنے پر مجبور ہوا۔

چھوٹی چھوٹی ریشمی سہری داڑھی، سہری ہی آنکھیں اور بے تحاشا سرخ و سفید رنگت کا فالک مضبوط و توانا سراپا اور مخصوص لباس۔ وہ وجاہت خوروی اور مردانہ دلکشی کا شاندار بے مثال نمونہ لگتا تھا۔ اس کے انداز میں کچھ ایسی تمکنت و قار اور جاذبیت تھی کہ عباس کو اپنا سارا تناؤ زائل ہوتا محسوس ہوا۔

”بہت شکریہ آپ کا ابراہیم احمد میں کچھ جلدی میں ہوں تو.....!“

”چائے بالکل تیار ہے آپ کو پانچ منٹ بھی نہیں لگیں گے ویسے میں شرمندہ ہوں بنا آپ کی اجازت کے فاطمہ کو لے آیا غلطی فاطمہ سے بھی ہوئی اسے آپ کی.....!“

”اٹس اوکے۔“ بنا غلطی و قصور کے ابراہیم احمد کی معذرت اسے اتنا خفت زدہ کر چکی تھی کہ وہ مداخلت کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ یہ ابراہیم احمد کی اعلیٰ ظرفی کا بے مثل ثبوت تھا جو اس پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ جسے اس نے اپنے رویے کے ازالے کے طور پر اس کی وضاحت ضروری

شاہانہ انداز میں حکمران تھا وہ یعنی عباس حیدر۔ جبکہ وہ اللہ کی خاطر اس شخص سے پلٹ آنا چاہتی تھی اس کی اجارہ داری اس کی حکومت سے نکل جانا چاہتی تھی کیا وہ ایک بار پھر اس جرم کی مرتکب ہونے جا رہی تھی جو اس سے بارہا مرتبہ دانی میں جنون اور یوانگی میں سرزد ہوتا رہا تھا؟

”نہیں۔“ اس نے وحشت زدہ انداز میں خود اپنی سوچ کی نفی کی اور بچوں کو اپنی گود سے اسی وحشت بھری کیفیت میں نکال دیا وہ پہلے بے وقوف تھی لا علم تھی جنونی تھی اب وہ باشعور تھی لا علم تھی نہیں تھی اور جنون..... اس شخص سے وابستہ اب ہر جنون ختم ہو جانا چاہیے تھا اس نے صرف سوچا نہیں فیصلہ بھی کر لیا۔

”اٹھو، ابھی چلو میرے ساتھ، مس فاطمہ تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ میری زندگی میں میرے گھر میں انہی بچوں کی بدولت جگہ ملی تھی۔ اس ذمہ داری سے کوتاہی برداشت نہیں کر سکتا ہوں میں۔“ عباس اس کی سوچوں، اس کے فیصلے سے لا علم تھا جسے اسے مخصوص انداز میں گفتگو کر رہا تھا اس کا لہجہ پھنکار زدہ تھا۔ مگر اس نے خود کو سنبھالے رکھا وہ اب کسی قیمت پر ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ جسے اس نے یکسر بدلے لے انداز اور لہجے میں کہا۔

”مجھے کچھ دن یہاں رہنا ہے، بھائی کے ساتھ۔“ اس نے پہلے عباس کے چہرے سے نگاہ ہٹائی پھر مدہم مگر مضبوط لہجے میں کہا۔ اب وہ اپنے دل کو اپنے پیروں تلے کچلنے کا عزم رکھتی تھی۔ اس دل کے ہاتھوں بہت خواری سہہ لی تھی اب اور نہیں، عباس بھونچکا رہ گیا مگر اگلے لمحے وہ پھٹ پڑا تھا۔

”جو اس بند کرو فاطمہ، انکار کی ہمت بھی کیسے ہوئی تمہیں، اپنی اوقات بھول گئی ہو کیا تم؟“ وہ سراپا قہر و غضب تھا۔ فاطمہ کی رنگت چوکھٹ پر کھڑے ابراہیم احمد کو پا کر ہی متغیر ہوئی تھی اور کچھ نہ سہی مگر وہ عباس کی آخری پھنکار ضرور سن چکا تھا۔ ایسی ذلت..... وہ بھی برسوں بعد ملنے والے ہر معاملے سے انجان بھائی کے سامنے فاطمہ کو جیسے مین میں گاڑ کر رکھ گئی تھی اور بے مائیگی کا احساس نمی بن



خیال کی تھی اس کے باوجود کہ یہ اس کے شاہانہ مزاج کا حصہ بھی نہیں رہا تھا۔

”اچھ نکلی مجھے فاطمہ اور بچوں کو ہمراہ لے کر اپنے پیرئس کے پاس گاؤں جانا ہے ارجنٹ، فاطمہ بھی اس پروگرام سے آگاہ نہیں تھیں گاؤں سے واپسی پر میں خود فاطمہ کو آپ کے پاس کچھ دن قیام کے لیے چھوڑ جاؤں گا۔“ اس کا لہجہ انداز معذرتی تھا۔

”ضرور، مجھے خوشی ہوگی۔“ عباس کے اٹھنے پر ابراہیم احمد نے الوداعی مصافحہ کیا فاطمہ وہاں آچکی تھی۔

”مجھ سے ملتے آتے رہیے گا بھائی، مجھے آپ کی بہت ضرورت ہے۔“ جس لمحے ابراہیم نے فاطمہ کے سر پر ہاتھ رکھا وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتی اس کے شانے سے لگ کر آنسو بہانے میں کچھ ایسی مصروف ہوئی تھی کہ ابراہیم احمد بھی بوکھلا گیا تھا۔

”نہ رے خود کو سنبھالو، دو بچوں کی اماں بن کر بھی تم ایسے رو رہی ہو جیسے شادی کے بعد پہلی بار رخصت کر رہا ہوں تمہیں۔“ ابراہیم احمد کا لہجہ بظاہر جتنا بھی خوشگوار سہی مگر اس کی سحر طراز سنہری آنکھوں میں اضطراب صاف کروٹیں لیتا نظر آیا تھا۔ یہ وہی اضطراب تھا جو ایک بھائی کو بہن کی گڑبستی کے غیر پائیداری کے یقین کے بعد گھیرتا ہے۔ عباس کی ڈانٹ اور فاطمہ کے بچتے آنسو صاف ظاہر تھا اندر کوئی نہ کوئی کہانی ضرور تھی۔

”مما کیوں رو رہی ہیں، پاپا؟“ اسامہ نے بے قرار ہوتے باپ سے پوچھا۔ عباس نے ایک پریش نگاہ ہنوز ابراہیم کے ساتھ لگی کھڑی آنسو بھائی فاطمہ پر ڈالی اور گہرا سانس بھرا۔ ابراہیم نے ہی بچوں کی پریشانی کا احساس دلا کر فاطمہ کو سنبھلنے پر اکسایا۔

”میرے خیال میں کسی کا ہاتھ پکڑ کر مشکل وقت میں ساتھ بھانے کا عہد کر کے اس سے بے پروائی برتنا بالکل مناسب بات نہیں ہوتی۔“ جس وقت ابراہیم احمد پارکنگ میں موجودان کی گاڑی میں انہیں بٹھا کر الوداع کہہ کر خود چلا گیا عباس نے ترچھی نگاہ سے فاطمہ کو تکتے بالخصوص کہا اور

گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ لہجہ گمبیر تھا جس میں فاطمہ کو ہلکے سے شکوے کی جھلک بھی محسوس ہوئی تھی۔

فاطمہ جو رخ پھیرے ہوئے تھی جہاں کی تہاں رہ گئی اس نے بے اختیار گردن موڑی، عباس اس کی جانب متوجہ تھا اس وقت اس کی نظروں میں وہ مخصوص تختی تھی نہ کھر دیا پن۔

”بچوں کی ذمہ داری کو تم نے بخوشی قبول کیا تھا میں نے کسی قسم کا کوئی جبر نہیں کیا تم پر۔“ اس کی حیران نظروں کے جواب میں عباس نے گویا اس پر اپنی بات کی وضاحت کی اس کا لہجہ نرم تھا فاطمہ نے ہونٹوں کو باہم بھیج لیا وہ اس کے لہجے کی نرمی میں کھونے لگی جو آج خصوصیت سے محسوس ہو رہی تھی وہ سرد پن، وہ سپاٹ و خشک انداز لیا دیا اسلوب غرض نہ رکھنے والی بے پروائی۔ بے گانا تیور جو اس کے مزاج کی پہچان تھے مگر اس وقت سب کچھ نیا تھا انوکھا تھا اس کی نظروں میں ملائم کیفیت تھی۔ یہی اپنائیت یہی دل آویزی اسے پھر سے گھیرنے پھر سے جکڑنے کا باعث بننے لگی۔ مگر اب وہ اس دام فریب میں نہیں آنا چاہتی تھی۔

”مسلمان ہونے کے بعد مجھ پر صرف حقوق العباد نبھانے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوئی میں اللہ کے حقوق کو بھی باحسن نبھانے کی خواہش مند ہوں اور یہ اس صورت ممکن ہو سکے گا اگر میں اس کے متعلق معلومات حاصل کروں، بھائی کے پاس آنے کی اہم وجہ یہی تھی۔“ وہ پہلی بار عباس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اتنے مضبوط اتنے واضح اور مدلل انداز میں گویا ہوئی تھی کہ عباس پہلے حیران ہوا پھر نرمی سے مسکرانے لگا۔

”میں نے آپ کو منع نہیں کیا، مگر آپ کو بتانا چاہیے تھا مجھے اور بچوں کو ساتھ لے جاتیں۔“ جبکہ عباس کی بات کے جواب میں فاطمہ کے چہرے پر ہر خند سا پھیل گیا تھا۔

عباس اسے اور بچوں کو گھر کے گیٹ پر اتار کر خود کسی کام سے چلا گیا مگر فاطمہ کی سوچیں ہنوز اپنی جگہ پر قائم و دائم تھیں۔



ختم القرآن کی مقدس محفل اپنے اختتام کو پہنچی تو اس



انداز میں کہتا آخر میں طنز بھی سمیٹ لایا تھا۔ لاریب کی رنگت پہلے متغیر ہوئی تھی پھر پھمکی پڑتی چلی گئی ایک لفظ کہے بغیر اس نے ہونٹوں کو بے دردی سے کچلا تھا۔ سکندر اسے وہاں سے جانے کا اشارہ کرتا خود لمبے لمبے ڈگ بھرتا دوسری جانب نکل گیا۔ لاریب کے واپسی کو اٹھتے قدموں میں کرب اور ملال لپٹا ہوا تھا۔ اسے سکندر کا یہ اجنبی بے گانہ رویہ کند چھری سے کاٹتا تھا مگر وہ شاکی نہیں ہوتا چاہتی تھی اسے وہ سب بھی یاد تھا جو اس نے سکندر کے ساتھ کیا تھا۔ وہ بہتے آنسو پوچھتی واپس زنان خانہ کی طرف چلی گئی تھی۔



عباس اماں جان کے کمرے میں آیا تو دیا کو ان کی گود میں لیٹے دیکھ کر چونکا۔  
”بیٹی تو تمہاری سو گئی، اسے لے جانا اب کمرے میں ماما کی گردان کرتے بڑی مشکل سے سوئی ہے۔ دونوں بچے ماں کے ہی زیادہ عادی ہیں۔ فاطمہ پر بہت ذمہ داریاں عائد کر دی ہیں تم نے بیٹا گھر میاں بیوی کی باہم ذمہ داری اور توجہ کا متقاضی ہوتا ہے۔“ اماں جان دیا کو نرمی سے بستر پر لٹا تھیں اسے سمجھانے لگیں۔ عباس نے بھونٹیں اچکا کر انہیں دیکھا اور ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”اتنے چھوٹے جڑواں بچوں کو سنبھالنا اور دیکھ بھال کرنا جان جو کھم میں ڈال دیتا ہے حوصلہ ہے بچی کا اتنی کم عمری میں ماں بنی اور بچوں کو ایسے سنبھالتی ہے جیسے پتا نہیں کتنا تجربہ ہو اس کام کا۔ دراصل بہت محبت ہے بچوں سے۔“ اماں جان فاطمہ کے انداز و اطوار سے صرف مطمئن ہی نہیں بے حد خوش بھی نظر آ رہی تھیں۔ عباس پتا نہیں کس جذبے سے خائف ہوتا جزبہ نظر آنے لگا۔

”ہر ماں اولاد کی کیئر کرتی ہے اماں جان کیا وہ کچھ انوکھا کر رہی ہے؟“ اس کا انداز ایسا تپا ہوا تھا کہ اماں جان نے چونک کر اسے دیکھا پھر رسائیت سے ٹوکا۔  
”ہر ماں ایسی نہیں ہوتی عباس بیٹے زبانی کو تم نے دیکھا ہے بچوں کی پروا تک نہیں کرتی یہاں آتی ہے تو ملازمہ ساتھ ہے۔“ ان کا انداز شاکی تھا عباس یوں نظریں چرا گیا

کے بعد دعا مانگی گئی۔ مردوں کا انتظام مردانے میں تھا جبکہ خواتین کی طرف کا سارا انتظام ایمان دیکھ رہی تھی۔ فاطمہ کی خصوصی دعوت برزینب بھی مدعو تھی اور اس نے داعظ بھی کیا تھا زینب سے مل کر سب سے زیادہ امامہ خوش نظر آتی تھی۔ کھانے کے بعد جب چائے کا دور چلا تو مہمان آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے تب ہی سکھاں بابا سائیں کے پیغام کے ساتھ چلی آئی۔

”بی بی صاحبہ بڑے سائیں آپ کو بلا رہے ہیں۔“  
”ہاں آ رہی ہوں۔“ ایمان نے چائے کا گم واپس رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی اس کے اصرار پر لاریب اس کے ساتھ ہوئی تھی کہ ایمان اکیلی وہاں جاتے گھبراہٹ محسوس کر رہی تھی۔ جیسے ہی وہ دونوں ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچیں اسی لمحے سکندر باہر نکلا تھا آف وائٹ کمر کے نفیس کڑھائی کے شیفون لباس میں سلیقے سے اوڑھے دوپٹے میں لاریب کا بیلے کی ٹکلیوں سے بھی نازک سراپا اپنی تمام تر جاذبیت اور دلکشی کے ساتھ اتنا مکمل نظر آ رہا تھا کہ اس پر اٹھی سکندر کی نظر واپسی کا راستہ بھولنے لگی۔

”اندر کون کون ہے سکندر؟“ ایمان نے اسے دیکھ کر استفسار کیا۔

”سب ہیں، قابل احترام عباس حیدر سمیت۔“ سکندر نے بے حد سنجیدگی سے کہتے جس طرح لاریب کو دیکھا تھا وہ یکدم کنفیوژ ہو گئی تھی۔

”آپ ذرا میری بات سنیں۔“ سکندر نے صرف کہا نہیں ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی بھی پکڑی تو لاریب نے گڑ بڑا کر ایمان کو دیکھا جو نظر اندازی کا تاثر دیتی آگے بڑھ کر اندر داخل ہو گئی تھی۔

”میں ہرگز نہیں چاہتا ان دونوں بھائیوں کی موجودگی میں تم وہاں جاؤ، صرف ابھی نہیں، کبھی بھی ان سے تمہارا سامنا پسند نہیں کروں گا۔ یہ بات بہتر ہے کہ تم اچھی طرح اپنے ذہن میں بٹھا لو کیا بہتر ہوتا کہ جو وعدے تم نے اللہ سے کیے ان میں اس اہم بات کو بھی شامل کر لیتیں۔“ ایمان کی نگاہ سے لو جھل ہوتے ہی وہ اس کا بازو چھوڑ کر تحکمانہ



تھیں۔ اس کی نظریں سرسبز چمکتی گھاس پر ابراہیم احمد کے ہمراہ ست قدموں سے ٹہکتی فاطمہ پر جا بھری۔ ایک بے اختیاری کی کیفیت میں وہ کش لینا بھول کر اسے تکتا چلا گیا وہ چلتے ہوئے رکی تھی اور اپنا سر ابراہیم احمد کے کاندھے سے ٹکا دیا۔

ابراہیم کچھ کہتے ہوئے اس کے آنسو پونچھ رہا تھا۔ عباس نے جلتی آنکھوں سے یہ منظر ملاحظہ کیا اور ایک جھٹکے سے پلٹ کر اندر کمرے میں آ گیا۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ بھی اس میں قابل گرفت بات کوئی بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود عباس کے اندر طیش بڑھتا جا رہا تھا اگلا آدھا گھنٹہ مسلسل ٹہل کر اس نے اس کا لمحہ لمحہ انتظار کیا تھا اور اپنا خون جلایا تھا جیسی فاطمہ کے آنے پر وہ خود پر اختیار کھو بیٹھا۔

”مل گئی تمہیں فرصت اپنے بھائی سے لگائی بجھائی کر کے یہاں آنے کی۔“ اس وقت بھی فاطمہ کی پلکوں پر نئی کا احساس تھا اس کا فشار خون بڑھا چکا تھا۔

”بچے کیسے ہیں کس حال میں ہیں تمہیں اس سے کیا غرض بھلا، ہے نا؟“ وہ پھنکارا اور فاطمہ نے گہرا متاسفانہ سانس بھر کے سر جھٹکا۔

”میں بچوں کے ساتھ ہی تھی تھوڑی دیر ہوئی مجھے بھائی کے پاس گئے ہوئے۔“ وہ بولی تو اس کا لہجہ ہر قسم کی گھبراہٹ سے پاک تھا۔ اعتماد سے بھرپور کسی خوف سے بے نیاز عباس کو اسی یکسر تبدیل انداز و اطوار نے حیران کیا تھا۔ وہ حیرانی سے لکڑا تو آگ بگولہ ہونے لگا۔

”بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری، تم کیا سمجھتی ہو تمہارا بھائی آ گیا ہے تو بہت طاقت آگئی ہے تم میں، اب مقابلہ کرو گی تم میرا؟“ عباس کچھ ایسے بھرا تھا کہ ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے جارحانہ انداز میں اس کی کلائی پکڑ کر بے حد طیش کے عالم میں اسے اپنے مقابل کیا۔ فاطمہ نے حسب سابق خائف ہوئے بغیر کچھ دیر بے حد عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر کسی قدر سرد مہر انداز میں اس کے اپنے کاندھے پر جے مضبوط ہاتھ ہٹا دیے۔

”میں انسانوں پر بھروسہ اور اعتماد کرنے کی حماقت سے

جیسے بری طرح لا جواب ہو گیا ہو۔“  
”تم کیا فاطمہ سے خفا ہو گئی بات پر؟“ ان کے سوال پر عباس صرف چمکایا نہیں تھا پریشان ہو کر انہیں تنکے لگا۔ ایسے جیسے ان کے چہرے سے اصل بات کھوجنا چاہتا ہو اچھی خاصی خائف نظریں تھیں۔

”یہ بات کیوں کہیں آپ نے؟“ اس کے محتاط قسم کے سوال میں کتنے خدشے تھے اماں جان مسکرا دیں۔

”اس لیے کہ جو لڑکا اپنی پسند سے کسی لڑکی سے شادی کرتا ہے وہ اتنی جلدی اس سے اتنا لا تعلق اور بے نیاز نظر نہیں آتا جتنا تم اس سے لگتے ہو، بیٹا! فاطمہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کی طرح نہ تو فیشن کی شوقین ہے نہ ہی اس کھادور شوخ لگتی ہے مجھے تو وہ ہر بار سبھی ہوئی اور کم صم سی لگی کوئی تو مسئلہ ہے نا، کہیں تمہیں اب کوئی اور لڑکی تو پسند نہیں آگئی؟“ اماں جان کا آدھا قیاس بالکل درست تھا اذیت میں مبتلا کر دینے والا تھا وہ ہونٹ بھینچتا ہوا نظریں چرا گیا۔ اسے قطعی سمجھ نہیں آ سکی اس موقع پر اپنے ساتھ فاطمہ کا بھی پردہ کیسے قائم رکھے۔

”آپ کو مغالطہ ہوا ہے اماں جان، ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے، اب میں اٹھارہ بیس سال کا نو عمر لڑکا تو ہوں نہیں جو سر عام عشق و عاشقی کا مظاہرہ کرتا پھروں فاطمہ کا مزاج بھی کچھ سنجیدہ ہے دوسرے وہ بھی بچوں کی وجہ سے بہت مصروف رہتی ہے۔“ محض ان کی نسل کی خاطر عباس کو ٹوٹے پھوٹے جملوں کا سہارا لینا پڑا تھا۔ اماں جان جو اسے بغور دیکھ رہی تھیں اس کا کاندھا تھپک کر مسکرانے لگیں۔

”ایسی کوئی بات اگر ہے بھی بیٹے تو تمہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تم اب صرف شادی شدہ ہی نہیں ہو دو بچوں کے باپ بھی بن چکے ہو، فاطمہ کا خاص طور پر خیال رکھا کرو، بچوں کو لے جاؤ، نماز پڑھ لی ہو گی اس کی ماں نے۔“ اماں جان نے نصیحت کرتے ہوئے دیا کو اسے تھما دیا۔ عباس اپنے بیڈ روم میں آیا تو فاطمہ موجود نہیں تھی دیا کو بستر پر لٹانے کے بعد وہ سگریٹ سلگاتا بالکنی کا دروازہ کھول کر ٹیرس پتہ گیا حویلی کے باغ کی آرائشی لائٹس روشن ہو چکی



آ جانے پر بری طرح منگی وقاص بھی کتنا حیران سا سے دیکھ رہا تھا۔

”السلام علیکم کیسی ہیں لاریب؟“ وقاص کے شائستہ و مہذب انداز میں خلوص کی جاشنی تھی مگر لاریب کو اسے روبرو پانا ہی برزخ میں دھکیل گیا تھا پھر وہ اس کے اپنے آگے احترام جھکی نگاہیں ہوں یا پھر لب و لہجے کی تبدیلی پر غور کیسے کر سکتی تھی۔

”میرا راستہ چھوڑو، یہ میری بد قسمتی کی انتہا ہے کہ بچاؤ کی ہزار کوشش کے باوجود کہیں نہ کہیں تم سے ٹکراؤ ضرور ہو جاتا ہے لیکن بہتر ہوگا کہ تم ایسی صورت میں مجھ سے کلام نہ ہی کیا کرو۔“ ناگواری و سرد مہری چھلکا تا انداز وقاص حیدر کا چہرہ متغیر کر کے رکھ گیا۔

”میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں اور آپ سے معافی.....!“

”ایسا سوچنا بھی مت وقاص حیدر کہ میں معاف کروں گی تمہیں۔“ اس کی بات کاٹ کر وہ بے حد درشتی و نفرت سے پھٹکاری، وقاص حیدر کا چہرہ دھواں ہونے لگا۔

”میں واقعی شرمندہ ہوں لاریب اور جانتا ہوں جب تک آپ معاف نہیں کرو گی اللہ بھی.....!“ وقاص جیسے روہنسا ہوتا ہات اور پوری چھوڑ گیا۔ اس کی گردن ڈھلکی ہوئی اور نظریں ہنوز جھکی ہوئی تھیں جن پر طنزیہ نگاہ ڈالتی وہ کاٹ دار انداز میں بولی تو لہجے میں از حد حقارت سمٹائی تھی۔

”کیا ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تم بدل گئے ہو، یہ چکر تم امامہ کو تو دے سکتے ہو مگر مجھے نہیں، میں جانتی ہوں کہ تم دم سو سال تک بھی ٹکلی میں رہے تو بھی سیدھی نہیں ہو سکتی۔“

معا اس کی نگاہ ہال کمرے کے دروازے میں کھڑے سکندر پر پڑی تو وہ سب کچھ بھلائے اس کی جانب لپکی مگر سکندر شفر زدہ انداز میں اسے کوئی موقع دے بغیر تیزی سے راہداری کا موڑ مڑ گیا۔ اس کے پیچھے بھاگ کر آئی شیشائی سی لاریب کی آنکھوں میں جیسے یکدم گہرے اندھیرے چھا گئے تھے سکندر کو وہاں سے جاتے پا کر جی بھی بے اختیار دیوار کا سہارا لیا تھا۔

نکل آئی ہوں حیدر عباس صاحب مجھے نماز پڑھنی ہے جانے دیں مجھے۔“ اس کے تاثرات کی طرح اس کا لہجہ و انداز بھی سرد تھا۔ عباس حیدر تو صحیح معنوں میں دم بخود ہو گیا۔



سکندر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا سٹ وائچ کلائی پر باندھ رہا تھا جب اس نے کمرے کی چیزوں کو ترتیب دیتی لاریب کو منہ پر ہاتھ رکھے واش روم کی سمت بھاگتے دیکھا۔ سکندر کے ہاتھ اسی زاویے پر ساکن ہوئے تھے۔ اس نے بھنویں اچکا کر گردن موڑی، واش روم کے کھلے دروازے سے وہ واش بیسن پر جھکی نظر آئی تھی اور تے کرتے ہوئے حال سے بے حال بھی۔

سکندر نے بے اعتنائی کے بھرپور تاثر کے ساتھ نگاہ کا زاویہ بدلا اور اپنی تیاری مکمل کرنے لگا۔ لاریب کچھ توقف سے سٹھ حال ہی کمرے میں لوٹی تو سکندر کو وہاں نہ پا کر ایک یاسیت بھرا احساس اس کے اندر گھر کرنا چلا گیا تھا۔ یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اس کی حالت اور کیفیت سے لاعلم رہا ہو مگر اس کے باوجود اتنی نظر اندازی اور کھوپر پن درد میں اضافے کا باعث بننا تھا اس وقت بھی اس کی آنکھیں پانیوں سے بھرتی چلی گئی تھیں۔

”لاریب..... جلدی آؤ بھئی..... ناشتہ بالکل ریڈی ہے۔“ ایمان نے دروازہ تھپتھا کر باہر ہی سے آواز لگائی تھی۔ لاریب نے تیزی سے خود کو سنبھالا۔

”میرا ناشتہ یہیں بچھوادیں ہاجو۔“

”ہائیں وہ کیوں؟ ایسے مواقع روز روز تھوڑی آتے ہیں، سب جمع ہیں آ جاؤ شاباش۔“ ایمان اس کی بات سن کر ہی اندر آئی تھی۔ لاریب نے سر جھکا لیا تھا۔ مزید انکار کا مطلب اسے مشکوک کرنا تھا۔ وہ کم از کم اب اسے مزید اپنی وجہ سے دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”آپ چلیں، میں آتی ہوں۔“ اور ایمان مطمئن ہونے کا تاثر دیتی پلٹ کر چلی گئی۔ لاریب وہیں کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر آہستہ روی سے باہر نکل آئی۔ اپنے دھیان میں میٹر حیاں اترتے وہ ایک دم کسی کے سامنے



لاریب کا دل اس قدر تیزی سے ڈوبا جا رہا تھا ایمان نے جو  
ناشتہ بچھو لیا وہ بھی صحیح طریقے سے نہیں کر سکی۔

”سکندر کہاں ہیں، انہیں بلانا پلیز۔“ ملازمہ برتن  
اٹھانے آئی تو لاریب نے اس بے گلی میں جتا رہتے  
ہوئے کہا اور ایمان کے کہنے پر اس سمت آتا ہوا سکندر اس  
کے منہ سے اپنا نام سن کر زہر خند ہونے لگا۔

”سکندر.....!“ لاریب کی جیسی ہی اس پر نظر پڑی وہ  
اپنی جگہ تیزی سے چھوڑتی بے قراری سے اس کی جانب  
بڑھی تھی کہ سکندر نے سرو سے انداز میں ہاتھ اٹھا کر اس کی  
پیش قدمی کو روکا۔

”مگر تم کوئی آرگومنٹ دینا چاہتی ہو تو اس کی ہرگز  
ضرورت نہیں ہے۔“ سکندر کا پتھر یلا لہجہ سابقہ سرد مہری  
لیے خوفناک حد تک سنجیدہ تھا۔ لاریب نے ہراساں  
ہوتے پھر کچھ کہنا چاہا تھا کہ وہ پھر اسی شدید انداز میں اسے  
ٹوک گیا۔

”میں نے کہا نا کچھ مت کہو کہے بغیر بھی میں جانتا  
ہوں کہ تمہارے نزدیک میری کتنی اہمیت ہے۔“ سکندر کا  
برفیلہ لہجہ لاریب کو اندر تک توڑ کر رکھ گیا۔

”کیسا کچھ نہیں ہے سکندر میری بات تو سنیں۔“ بے بسی  
کی انتہا کو چھوتی وہ بلا خرو پڑی۔ سکندر نے برعکس پیشانی  
کے ساتھ ایک نظر اسے دیکھا۔ بے قراری سے مسکتی تڑپ  
تڑپ کر روتی یہ لڑکی ہرگز بھی اتنی بے مایا نہیں تھی کہ اس  
کے دل میں جی برف کو نہ پگھلا پاتی۔ مگر وہ پگھلنا نہیں چاہتا  
تھا جیسی رخ پھیر کر تیزی سے پلٹ گیا۔ لاریب بستر پر  
گری ملوڑا رو قطار روٹنے لگی۔



جس وقت فاطمہ ابراہیم احمد کے کمرے میں داخل  
ہوئی اسے ایک جذب اور سرور کی کیفیت میں نعتیہ اشعار  
پڑھتے پایا۔

”اسلام علیکم بھائی صبح بخیر۔“ اس کے متوجہ ہونے پر وہ  
دل سے مسکرائی اور ابراہیم احمد نے بڑھ کر اس محبت و تپاک  
سے اس کے سر پر بوسہ دیداد میں دس باران کا آپس میں

”مہرے دھیان سے سب خیریت ہے نا؟“ اسے پکڑ  
کر سہارا دینے والی ایمان تھی جس کی بڑی بڑی روشن  
آنکھوں میں اس کے لیے کتنی تسویش تھی۔ لاریب نے خود  
کو سنبھالنے کی سعی کی اور چمکی مسکان کے ساتھ رہداری کو  
جانے کس آس میں مبتلا ہو کر دیکھا جو سرے تک سنسان  
پڑی تھی۔ سکندر جانے کہاں تھا اور اس کے متعلق اللہ جانے  
کیا سوچ رہا تھا اس خیال سے بھی مرونا آنے لگا۔

”تم ناشتہ کرنے نہیں پہنچی تو مجھے پھر تمہاری تلاش میں  
دوڑنا پڑا۔ تمہاری طبیعت مجھے اب بھی ٹھیک نہیں لگ رہی  
ہے لاریب۔“ ایمان اس کی کمر میں بازو جمائل کیے اسے  
پھر سے کمرے میں لے آئی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں باجواب پریشان نہ ہوں۔“ ایمان  
اسے بستر پر بٹھانے کے بعد گہر پر تکیہ رکھ رہی تھی جب  
لاریب نے بوجھل آواز میں اسے تسلی دی۔

”تمہارا ناشتہ نہیں لے آتی ہوں ویسے تم نے چیک  
اپ کر لیا، مجھے لگتا ہے ہم دونوں کے بعد اب تمہاری باری  
ہے ملاں بننے کی۔“ ایمان نے مسکرا کر کہتے اس کا رخسار  
چھو، لاریب کا دل اس بات پر اچھل کر حلق میں آ گیا۔  
ایمان نے بے حد حیرانی سے اس کی فح ہوتی رنگت دیکھی۔

”یہ گھبرانے کی نہیں خوش ہونے کی بات ہے بھئی،  
خاص طور پر پہلی مرتبہ ملاں بننے کی خبر سن کر تو ہر لڑکی گلاب  
بن کر کھلتی ہے شرمیلی ہے ایک تم ہو کہ..... اچھا بتاؤ سکندر کو  
پتا ہے؟“ ایمان اس کے سر د پڑتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں  
میں لے کر محبت پاش انداز میں دہائی نرمی سے پوچھ رہی  
تھی۔ لاریب کی آنکھوں میں جانے کس احساس کے  
تحت نمی اترنے لگی۔ ایمان کی بات کے جواب میں اس  
نے محض نفی میں سر ہلایا۔ وہ اضطرابی کیفیت کے زیر اثر  
مسلسل ہونٹ چل رہی تھی۔

”آئی ایم شیورڈ، وہ بہت خوش ہو گا سن کر تم پہلی  
فرصت میں اس کے ساتھ جا کر ضروری ٹیسٹ کراؤ پھر  
کنفرم ہونے پر ہی ہم یہ خبر بابا جان کے علاوہ باقی سب کو  
سنائیں گے۔“ ایمان جتنی مطمئن اور سرشار لگ رہی تھی



اسے ڈسٹرب کر گیا تھا۔ ملازمہ اندر آئی اور دونوں بچے فاطمہ کے حوالے کر دیے جن کے چہرے ماں کو دیکھتے ہی کھل گئے تھے۔ فاطمہ نے دونوں کو پیار کیا اور اپنے دائیں بائیں ہٹھالیا مگر دیا اس کی گود میں چڑھائی تھی۔

”آپ کا ماما سے کھٹکٹ ہے بھائی؟“ فاطمہ نے ابراہیم سے سوال کیا۔ ابراہیم جو اسامہ کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کر رہا تھا اس بات پر چونک کر متوجہ ہوا بلکہ کنفیوژ ہونے لگا۔

”ہوں..... خیریت.....؟“ اس کے انداز میں گریز تھا جسے فاطمہ نے فوری نوٹ نہیں کیا تھا۔ فاطمہ دیا کے ریشمی بال سہلاتی آنسو ضبط کر رہی تھی۔

”کچھ دنوں سے بہت یاد آ رہی ہیں مجھے دل میں انہیں دیکھنے اور ملنے کی تڑپ سی اٹھتی ہے۔ آپ کو پتا ہے بھائی ہم ڈیڈ کے لیے نہ کچھ ایصال ثواب کر سکتے ہیں نہ مغفرت کی دعا، وہ ڈیڈ تھے ہمارے، حقیقی باپ۔ دل میں یہ جان کر بہت وحشت جاتی ہے بھائی کہ اگلی دنیا میں وہ ناکام انسان ہیں ان کی کبھی بھی مغفرت نہیں ہو سکتی۔ ڈیڈ کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکے مگر می..... می کو تو سمجھا سکتے ہیں نا؟“ کیا کچھ نہیں تھا اس کے روہانے لہجے میں، خواہش، شوق، حسرت، بے بسی، ابراہیم احمد بہت اچھے انداز میں اس کی کیفیات کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ خود بھی اس کیفیت سے گزر چکا تھا۔ اس نے بھی بالکل اسی انداز میں سوچا تھا مگر سیریتا دیوی اس موضوع پر بات سننے کی بھی روادار نہیں تھیں۔ کجا اسے سوچنا اس پر عمل کرنا وہ تو جان کر کہ ان کے بیٹے کے بعد بیٹی نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے ہسٹریائی کیفیت کا شکار ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے مکمل طور پر ابراہیم سے قطع تعلقی اختیار کر لی تھی وہ صحیح معنوں میں اس کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھیں۔

”بی بی صاحبہ آپ کو عباس سائیں بلارہے ہیں۔“ ملازمہ ایک بار پھر آئی تھی ابراہیم احمد نے نگاہ کا زاویہ بدل کر فاطمہ کو دیکھا جو آنسو پونچھ رہی تھی۔

”بات صرف سمجھانے سے نہیں بننے والی، اس مقام

سامنا ہوتا تو اس کا انداز یہی ہوتا تھا اتنی شفقت اتنی محبت دے رہا تھا اسے ابراہیم احمد کہ فاطمہ جو والدین سے لے کر عباس تک کی محبت کے لیے جنم جنم کی ترسی ہوئی تھی ابراہیم کی پر شفقت قربت نے ساری نفسی مٹا ڈالی تھی۔

”وعلیکم السلام، اللہ پاک تمہیں دین و دنیا میں بھلائی و عافیت اور کامرانی نصیب فرمائے، آمین۔“ ابراہیم احمد کی دعاؤں کے جواب میں وہ مسکرائی اور صوفے پر ٹک گئی۔

”بھائی نظر نہیں آ رہی۔“ اس نے کمرے میں نگاہیں دوڑانے کے بعد سوال کیا۔

”مسمعیہ ایمان بھابی کے ساتھ ہیں دراصل دونوں میں محبت بہت زیادہ ہے اور دوستی بھی سمعی کہہ رہی تھی بھابی اب یہیں رہیں گی تو جتنا وقت ساتھ گزار لوں کم ہے۔“ ابراہیم احمد کی مسکرا کر دی گئی وضاحت پر فاطمہ نے محض سر ہلایا پھر جیسے کسی خیال کے تحت بولی۔

”میں نے جب اسلام قبول کیا بھائی تو یہ حقیقت ہے میں اس کی کاملیت اور دلکشی سے واقف نہیں تھی مگر اب دھیرے دھیرے مجھ پر انکشاف ہو رہے ہیں بلاشبہ اسلام ہی بہترین مذہب ہے قابل عمل بھی، قابل تقلید بھی، قابل تحسین بھی۔“ ابراہیم احمد نے مسکرا کر اس کی تائید کی پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کا گال تھپکا۔

”جب می نے مجھے بتایا تھا کہ تم کسی مسلم لڑکے کی وجہ سے انہیں چھوڑ گئی ہو تو مجھے یقین نہیں آ سکا تھا لیکن تمہارا یہاں اس حیثیت سے ملنا ان کی بات کی صداقت کو ثابت کر گیا مجھے بے حد خوشی ہے فاطمہ کہ تمہیں تمہاری منزل مل گئی عباس حیدر واقعی ایسا شخص ہے کہ اسے چاہا جائے لیکن میں قیل کر رہا ہوں جیسے تم دونوں کے بیچ کچھ مسنگ بھی ہے، اس دن.....!“

”اس دن عباس کچھ غصے میں تھے بھائی اور غصے میں وہ یونہی بنا سوچے سمجھے بولتے ہیں۔“ فاطمہ نے پردہ ڈالا وہ ہرگز بھی ابراہیم احمد کو کچھ بتا کر اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی ابراہیم نے بغور اسے دیکھا ضرور مگر کیرا نہیں کیوں کہ فاطمہ نے جس طرح نظریں چرائی تھیں یہ انداز



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



کرنے لگی تھی اندر کے اضطراب سے گھبرا کر وہ کھڑا ہوا تھا۔ یہ کیا ہونے جا رہا تھا اس کے ساتھ، فاطمہ.....؟ فاطمہ بھلا کیوں اس کے لیے اہمیت اختیار کرنے لگی۔ اس کا دل اس خیال سے ہی تھمنے لگا ذہن بار بار بھٹک کر اس کی جانب جاتا تھا۔ یہ تیور بھلا کب اچھے تھے۔

پھر جب ابراہیم احمد کے گھر کے ڈرائیونگ روم میں وہ اس کے سامنے آئی تو عباس کی بے چینی سے منتظر نگاہ اس پر اٹھی اور ٹھہر گئی اندر ایسا سکون و اطمینان پھیلا جیسے کسی کم غمشتہ چیز کے مل جانے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ وہ کیسے کم صبر رہ گیا تھا۔ ایک بار اٹھنے والی نظر بے ساختہ اور بار بار اٹھ رہی تھی۔ ایسا اس سے قبل اگر ہوا تھا تو اسے خبر نہیں تھی وہ اپنے بدلتے احساس پر ششدر اور غیر یقین ہو چکا تھا۔ ایک عجیب سی دل ٹھکستی سی تھی جو اسے جکڑ رہی تھی۔ جیسی اس نے بلا وجہ اس پر برس کر اسے ذلیل کیا تھا۔ اس طرح وہ خود اپنی اسی کیفیت کی نفی کر رہا تھا خود کو کچھ باور کر رہا تھا جو ہو کر نہ دیتا تھا اور اس کی جھنجھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی ایسے میں سب سے زیادہ اس کے قہر کا نشانہ فاطمہ ہی بنتی تھی۔

اس کے لیے یہ ناقابل قبول تھا اس کے نزدیک یہ عریشہ سے بے وفائی تھی اس نے تمام عہد عریشہ سے باندھے تھے اس نے فاطمہ سے کب کوئی عہد باندھا تھا پھر بھی وہ اس کی جانب مائل ہونے لگا تھا۔ وہ اسے دیکھتا تو اس کے چہرے پر اٹھنے والی نگاہ کو ہٹا نہیں سکتا تھا۔ وہ جیسے خود پر قادر ہی نہیں تھا اس کے دل میں انوکھے احساس جنم لیتے تھے جو دل و روح پر رنگ نہج اور کرتے تھے۔ فاطمہ کا زور آور عشق کرشمہ سازی دکھلا رہا تھا عباس کو اس سے محبت ہو رہی تھی۔

”وہ ننگن کدھر ہیں جو اماں نے پہنائے تھے تمہیں کچھ خیال ہے کہ انہیں تمہاری کلائیوں میں نہ پا کر کتنی تکلیف ہوئی ہوگی انہیں۔“ وہ اسے متوجہ کرنے، اسے مخاطب کرنے کو اس قسم کے بے معنی سوال اٹھایا کرتا تھا۔

”میں کبھی نہیں اتارنی لیکن بچے ڈسٹرب ہوتے ہیں انہیں اٹھانی ہوں تو چھپتے ہیں انہیں۔“ فاطمہ نے اس سے

پر صرف دعا پر تکیہ ہے۔ بے شک اللہ بہتر ہے اپنے بندوں کے لیے مراتب و مقام طے کرنے والا اس کے گھر میں منظوری ہوئی تو ہماری یہ خواہش ضرور پوری ہو جائے گی۔ ہمیں بہر حال اللہ کی رضا کو اپنی رضا پر مقدم رکھنا چاہیے۔ اب جاؤ عباس بھائی منتظر ہیں تمہارے۔“ ابراہیم احمد کا لہجہ مخصوص ٹھہراؤ اور رساں لہجے ہوئے تھا۔

”مجھے می سے بات کرنی ہے بھائی، پلیز میری ان سے بات تو کرا سکتے ہیں آپ۔“ اس کا گلا بھرا رہا تھا۔ ابراہیم احمد نے نرمی سے اس کا گال سہلایا۔

”ان شاء اللہ ضرور مگر تم ان سے اس حوالے سے کوئی بات نہ کرنا یونہی بہت اسٹریس لیتی ہیں۔ میں نے کہا نا اس معاملے کو اللہ پر چھوڑ دو، وہ اپنے بندوں کے لیے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے۔“ ابراہیم کے سمجھانے پر وہ سر ہلاتی اٹھی اور ابراہیم احمد کو سلام کرتی دیا کو اٹھائے اسامہ کی انگلی پکڑے کمرے سے باہر آ گئی۔

”کہاں کی سیر ہو رہی ہے محترمہ، میں یہاں گھومنے پھرنے کے لیے نہیں آیا مجھے اور بھی کام ہیں اپنی تیاری کرو ہمیں فوری واپس چلنا ہے۔“

عباس جو کمرے میں ٹھہل رہا تھا اسے دیکھ کر کش لینا ترک کر کے گہرے طنز سے بولا اس کی یہ سحر طاری کرتی ہوئی نظریں کبھی فاطمہ کو سلگاتی پکھلاتی تھیں مگر اب وہ نارل نظر آ رہی تھی کسی حد تک بے نیاز، عباس کو اس کا یہی گریز یہی لائق خاریں کر چھپنے لگی، وہ جھنجھلایا کیوں کہ اب وہ فاطمہ کے سامنے بے بس ہو رہا تھا وہ اس کی جانب آخر کیوں متوجہ ہو رہا تھا؟ اس روز جب اسے پتا چلا تھا فاطمہ اپنے بھائی کے گھر چلی گئی ہے تو کیسی بے چینی اور عجیب سا خوف اسے گھیرنے لگا تھا یہ بے چینی، یہ خوف اس کے چھوڑ کر چلے جانے کے سوا اور بھلا کیا تھا وہ عریشہ کے بعد اسے کھونے سے کیوں خائف ہونے لگا، اسے اپنا آپ اس پل ایسے بچے کی طرح لگا تھا جو میلے میں تنہا رہ جانے کے خیال سے حراساں ہو۔ یہ اس کی عدم موجودگی کا ہی خیال تھا کہ اک عجیب سی بے چینی اس کے اندر سرایت



دلچسپی میں اپنے ہاتھوں میں ہاتھ موٹے پر نیم انداز کاہلی  
اس میں اس جتنی جتنی قیامت کو ایک نظر دیکھا اور  
دشمن آمیز غریب بھرے انداز میں اٹھ کر بے حد تنفر زدہ  
مسلک سے آیا کو اس سے پھینک لیا اور اس کی کاٹی بھٹ کر  
کھینٹ کر کھڑا کر دیا۔

”اٹھ جاؤ اس کمرے سے باہر مجھے دوبارہ تمہاری  
دل نظر نہیں آئی چاہیے۔“ وہ دماغی حواس میں نہیں تھا  
بھڑ بھڑ جلتا ہے بھی اسی آگ میں جلا کر خاکستر کر دینے  
کے وہ ہے۔ فحشونت برساتا ہوا سب سے ترین لہجہ فاطمہ کے  
اعصاب خوف سے منجمد کر کے رکھ گیا وہ جو پہلے دھچکے سے  
ہی نہیں تھکتی تھی اس حکم پر جیسے سانپوں کی زد پر آگئی، اس  
اچانک افتاد کی وجہ کیا خاک بختی۔

”کیا کہہ رہے ہیں؟“ وہ ہڑبائی اور بے حد خوف زدہ  
نظروں سے اسے دیکھا جس کے خوبصورت تنفر چمکاتے  
چہرے پر بچان کا کوئی رنگ نظر نہیں آتا تھا۔

”تم نے سنا نہیں، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ عباس  
عجالت میں دیا کو بیڈ پر تقریباً پھینک کر پھر اس کی جانب  
متوجہ ہوا اور اسے زور سے دھکا دیا۔ جس کے نتیجے میں وہ  
لڑکھڑا کر دووازے سے جا لکرائی اور اس ہراسی کے عالم  
میں سو پڑی۔

”مم..... میں کہاں جاؤں گی عباس یا آپ کا گھر تو  
نہیں ہے، مجھے یہاں اس طرح دیکھ کر سب کیا سمجھیں  
مے کچھ تو خیال کریں۔“ اس کے بے رحم بر فیلے درشت  
تاثرات فاطمہ کو اس کے گڑ گڑانے پر مجبور کر گئے باقی  
صرف ہاتھ جوڑنے کی کسر تھی۔

”یہ میرا نہیں تمہارا مسئلہ ہے۔“ وہ حلق کے بل چیخا۔  
فاطمہ کی حالت ہر لمحہ غیر ہوتی گئی۔ بستر پر جانا تو کجا  
اس سے اٹھ کر صوفے پر بھی نہیں بیٹھا جاسکا ذلت و رسوائی  
کا یہ سلسلہ پتا نہیں کتنا انداز تھا۔ گھٹنوں میں سر دیے وہ۔ پ  
آواز اٹھو بہائے گئی۔



اس دھوپ میں ہوتا رہوں تحلیل کہاں تک

انجل

نظر میں ہاں کہہ دیا تھا۔  
وہ اٹھتے سے ٹھٹھکی رہی وہ اب بھی اسی شدت  
سے سو رہی تھی وہ اس سے کچھ دیر گھومتا رہا پھر اٹھ کر  
تاثرات کے ساتھ پلٹ گیا۔ اس کے دل و دماغ میں جیسے  
گہرے اٹھ رہے تھے۔ فاطمہ کا یہ انداز اسے سراسر توہین  
آپڑھوساں دیتا تھا۔ اس طرح اس نے وہاں سے بات  
کی تھی وہ جتنا کہ پتا اس قدر جہان ان دتا لڑکتا اور ہرٹ دتا  
تھا یعنی سراسر تذلیل تھی اس کی۔ جسے وہ ہرگز بھی برداشت  
کر لے سے قاصر تھا۔

آج تک ایسا ہوا ہی نہ تھا کہ کوئی لڑکی اسے نظر انداز کر  
جاتے۔ وہ بھی فاطمہ.....؟ اس کی آنکھوں میں ہی نہیں  
اس کے ہر انداز میں وہاں نے ہمیشہ اپنے لیے ایک وارنٹی  
اور بے خودی محسوس کی تھی وہ بہت آواز میں فاطمہ کے رنگ  
ڈھنگ سے جان گیا تھا کہ وہ اس لڑکی کے لیے کس درجہ  
اہمیت رکھتا ہے وہ اس کی کتنی بڑی کمزوری ہے مگر وہ اس  
سے بدگوار ہوا تھا۔ یہ وہی کب بدلا اسے خبر ہی نہیں ہو سکی وہ  
اس انوکھے احساس کو ہی قبول نہ کر پا رہا تھا کہ فاطمہ کے  
بدلتے انداز و اطوار نے اسے سر تاپا سا کا ڈالا تھا۔ یہ تو پھوڑ  
اتنی شدید تھی کہ وہ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا وہاں آیا تو فاطمہ  
بستر پر بچوں کو سلائے میں مصروف تھی۔ بیڈ کے داہنی  
جانب اسامہ تھا پھر وہ بھی سینے پر دیا کو لٹا رکھا تھا۔ وہاں اس  
وقت خود سے ہیرا ڈالتا تھا اور دل حال بھی جیسی چپ چاپ  
آ کر اپنی جگہ لیٹ گیا۔ اب فاطمہ چند لمحوں کے فاصلے پر  
اس کے پہلو میں تھی۔ وہ بے خیال سی تھی مگر جیسے ہی اس کی  
موجودگی کو محسوس کیا یکدم اس کے چہرے پر تغیر سمٹ آیا  
وہاں کے لیے یہ توہین و سبکی کا باعث تھا مگر اس وقت انتہا  
ہوئی تھی جب فاطمہ بستر سے اتر کر صوفے پر جا بیٹھی۔

وہاں کو لگا اس کے وجود کو کسی نے دھکتے انگاروں سے  
داغنا شروع کر دیا ہو ہونٹ بھینچے وہ کچھ لمحوں کو سکتے زندہ رہ  
گیا۔ یہ ذلت و توہین کی گویا انتہا تھی اس کی مردانہ انا پر  
پڑنے والی نظر اندازی و گریز کی یہ جھوٹ بہت کاری تھی۔ وہ  
اس صدمے سے باہر آیا تو اس نے نائٹ بلب کے ہلکے



مدھم سا مسکرایا۔ فاطمہ کا دل ڈوبنے لگا یہ جان کر یہ سوچ کر اس کی مسکان فاطمہ کے لیے آج بھی اتنی جان لیوا تھی۔ بے اختیار وہ صرف نظر ہی نہیں رخ بھی پھیر گئی۔ وہ ہرگز بھی خود کو کمزور کرنا اس آگ میں جل کر بھسم ہونا نہیں چاہتی تھی۔

”تم ابھی تک مجھ سے خفا ہو، سوری فاطمہ میں پریشانی و اضطراب میں مبتلا ہو کر اکثر تمہیں ہرٹ کر دیتا ہوں۔“ دیا کو پچھلی سیٹ پر سوئے ہوئے اسامہ کے ساتھ لٹا کر وہ واپس اپنی جگہ پر آیا تو گاڑی اشارت کرنے سے قبل پوری توجہ اس پر مرکوز کر دی فاطمہ کا دل سینے میں ایسے پھڑپھڑانے لگا جیسے باہر آگرنے کو بے تاب ہو وہ سکتے زندہ بیٹھ رہی تھی۔

کمال کی مقناطیسیت رکھنے والا مرد جسے عورت کے حواسوں پر چھانے کے لیے ذرا سی بھی محنت نہ کرنی پڑتی ہو جس کے نرم لہجے اور خوش گو اور نظر کو خوش قسمتی کا پیمانہ سمجھا جاتا ہو اس کی جانب سے اس قسم کا اظہار حواس سلب کر لے تو عجب کیا ہے۔

”معاف نہیں کرو گی مجھے؟“

عباس نے کہا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے صبیح کال کو چومتی بالوں کی لٹ پکڑ کر نرمی سے اپنی انگلی پر لیٹی۔ فاطمہ تھر تھر کاہنے لگی۔ اس کی حواس باخشی کا عالم بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا وہ شاید اب اس طرح اسے جھکانا چاہتا تھا وہ یقیناً ہر صورت خود کو سر بلند رکھنا چاہتا تھا فاطمہ کو خود اپنے آپ سے خوف محسوس ہوا اس کا دل چاہا وہ زور زور سے روئے اسے کہے بلکہ باور کرائے اب اس شخص کو کوئی حق نہیں اسے راہ سے بھٹکانے کا۔

”اتنا ڈرتی کیوں ہو مجھ سے، یار شوہر ہوں تمہارا۔“ وہ بہت مطمئن قسم کی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہا تھا یوں جیسے وہ اندر کی جنگ کے سامنے شکست تسلیم کر کے کسی حتمی نتیجے پر پہنچ گیا ہو اور اس کے سامنے اس جھوٹی انا کو سر گول کر دینا چاہتا ہو۔

”اتنا عرصہ ہو گیا ہماری شادی کو اور مجھے اندازہ ہی نہ

اے عشق تیرے حکم کی تعمیل کہاں تک بکھرا ہے بدن گرد راہ شوق کی صورت لے آئی مجھے خواہش تکمیل کہاں تک لو آنکھ کا یہ آخری قطرہ بھی ہوا خشک صحراؤں سے بھلا لڑتی یہ جھیل کہاں تک

اس کا رخ کھڑکی کی جانب تھا لیٹڈ کروزر پوری رفتار سے سڑک پر فرار لے بھر رہی تھی اس کی سفید مرمری سی انگلیاں گود میں سوئی دیا کے ریشمی بالوں میں سرسرا رہی تھیں اور دل میں عجیب سے سناٹے کا راج، کیسے یقین کرتی بھلا وہ وقت کے پلٹنے کا ایسا کم از کم اس کی زندگی میں ممکن نہ تھا۔ عباس کی نظروں کا بے قراری و اضطراب کی کیفیت میں بار بار اس پر اٹھنا اور واپسی کا راستہ بھولنے لگنا اس کی توجہ بار بار بھٹکتی وہ بار بار غوطہ کھاتے دل کو سنبھالتی۔

(یا اللہ! یہ مجھے اس طرح کیوں دیکھتے ہیں اب، اب کیوں..... جبکہ مجھے ان کی طرف پلٹنا نہیں ہے اگر یہ ایک بار پھر میری آزمائش ہے تو مجھے بچالے اللہ پاک، اگر تو اپنے بدلے پھر سے مجھے یہ شخص دینا چاہتا ہے تو مجھے نہیں کرنا یہ سودہ، میں کمزور ضرور ہوں مگر تجھ سے محبت تو کرتی ہوں نا، مجھے نہیں معلوم یہ محبت اب بھی عباس کی محبت سے زیادہ ہے یا نہیں لیکن میں..... میں اب دھوکہ کھانا نہیں چاہتی نا کام ہونا نہیں چاہتی مجھے اس مزید خواری سے بچالے مجھے اکیلا نہ چھوڑو وہ دل ہی دل میں سسکتی تھی اور خود اپنے آگے ہار جانے سے ہراساں تھی۔

”دیا سوچکی ہے لاڈا اسے میں سیٹ پر لٹا دوں تھک گئی ہو گی تم بھی۔“ عباس نے اچانک گاڑی روکی تھی فاطمہ کے حیرانی سے متوجہ ہونے پر بولا اس کا لہجہ اپنائیت آمیز اور نرم تھا۔ ایسی نرمی لیے جس سے وہ آشنائی ہی نہ رکھتی تھی مگر کبھی بہت خواہش مند ضرور تھی فاطمہ جواب میں کیا اعتراض کرتی خاموش رہی دیا کو اس سے لیتے عباس کا ہاتھ اس کے بازو سے لکر لیا پھر ہاتھ سے مس ہوا۔

تب وہ خصوصیت سے اس کی جانب ہی متوجہ تھا فاطمہ کی رنگت میں کھلتی سرخی اور ہونٹوں کا بھینچنا محسوس کرتا



خود باہر چلی گئیں کہ آج ان کی مصروفیت عام دنوں سے کہیں زیادہ تھی۔

”میں نے اگر اس وقت یہ بات کہی تھی تو وہ حرف آخر تو نہیں ہونی چاہیے، خفا نہیں ہوئے پلیز۔“ وہ سر جھکانے خاموش اور غیر یقین بنی تھی جب عباس نے اگلی بات کہہ کر اسے مزید کم صدمہ کر دیا وہ حواسوں میں لوٹی تو پھر اس سے ہی نہیں خود سے بھی خوف زدہ ہو کر بھاگی تھی۔ سازشی ہاندھ کر ہالوں کو سمیٹتی وہ دوبارہ کمرے میں آئی تو عباس حیدر کی اپنی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ خود پر پر فوم کا اسپرے کرتے ہوئے اس نے فاطمہ کو خصوصی نظروں سے دیکھا۔ ایسی نظریں جو اسے رنگ جایا کرتی تھیں۔ دل دھڑکانے کا سبب بنا کرتی تھی۔ وہ کہاں کہاں کس کس مقام پر خود کو مضبوط کرتی۔ اس وقت وہ بالکل حواس باختہ ہو گئی تھی جب عباس نے اس کے کپکپاتے ہاتھوں کی ڈھیلی گرفت سے بار بار میکلس کی ہک کو پھسلتے دیکھ کر خود اس کام کو کر دیا تھا۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ وہ سرتاپا دھک تھی۔

اس نے دیکھا وہ آئینے میں اس کے مقابل کھڑا تھا آئینے نے گواہی دی ان دونوں کی جوڑی چاند سورج کی جوڑی ہے تک سک سے تیار و جاہت و مردانگی کا شاہکار اس پر امارت کا ترکا اور سب سے بڑھ کر اپنی خوبیوں سے آشنائی نے آنکھوں میں ایک احساس تفاخر ثبت کر دیا تھا وہ آج بھی بجلی کا لپکا تھا جو جسم کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا ایک ایسا کوئٹا تھا جو دل ہی نہیں جلاتا تھا روح بھی خاکستر کر ڈالتا تھا آج بھی اس کے چہرے پر نظر لگانا ایک امتحان تھا آج بھی ان آنکھوں میں نظر جمانا ایک انعام تھا۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود دل میں اس کی محبت زندہ تھی اس کی آنکھوں میں دھند چھانے لگی۔

”آپ جاییے میں آ جاؤں گی۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، عباس مبہم سا مسکرایا اس کی گہری متبسم نظر اس کے تغیر زدہ چہرے پر تھی وہ آج اسے پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا وہ اس کی بیگانی سے اس کے آگے نہیں جھکی تھی۔ وہ اس کی توجہ سے کیسے نہ پھسلتی۔ اس کی مردانہ انا ہر صورت اس

ہو سکا میری بیوی کے ہاتھ اتنے خوب صورت ہیں۔“ عباس نے مزید پیش رفت کی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے دھیسے لہجے سے وارنکی کی آنچ سی پھوٹ رہی تھی فاطمہ کی جان پر بننے لگی۔ یہ وارنکی اسے نہال کرنے کے بجائے سراسیمگی کی انتہاؤں تک لے جا رہی تھی وہ روہاسی ہونے لگی۔

یہ توجہ، یہ لوٹ لینے والا انداز یہ سحر انگیز قربت اور تنہائی وہ تو ازل سے اس کی شیدائی تھی جان دیتی تھی اس کی ایک ایک ادھر پر اسے اپنی ہار کا یقین کامل ہوا تو روح آنسوؤں کی روانی میں بہنے لگی۔ عباس کی وارنکی نے کیا کیا نہ یاد دلادیا تھا۔ تمام زخموں سے ٹانگے ادھر سے تھے۔ اب تو وہ اپنی محرومیوں اور تشنہ لبی پر راضی ہونے جا رہی تھی پھر وہ کیوں ابر رحمت بن رہا تھا۔

کل جب لااریب کے ہاں سے وہ لوگ گھر جانے کی بجائے بڑی حویلی آ گئے تھے۔ تب بھی عباس کے یکسر بدلے رنگ ڈھنگ نے اس کے لیے ایسے ہی حواس سلب کیے تھے۔ بابا جان نور کے عقیقے کے ساتھ اسامہ اور دیا کے بھی اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے جی بھی عباس کو بھی روک لیا تھا۔ ایسے میں اس تقریب کے موقع پر اماں جان نے انوکھی خواہش کا اظہار کر ڈالا تھا اس کے سامنے، وہی مہرون سازشی پہننے کی فرمائش جس کے متعلق عباس کی قہر آمیز تنبیہ اچھی طرح یاد تھی اسے جی بھی وہ اماں جان کے سامنے بہانے بناتی تھکنے لگی تھی اور بات بن بھی جاتی اگر انہی لمحوں میں عباس بھی کمرے میں نہ پہنچ جاتا۔

کچھ کہے بغیر وہ خاموشی و رسان سے ساری بات سنتا رہا تھا فاطمہ کو گمان تک نہ تھا اس کی ساری توجہ انہی کی گفتگو کی جانب ہے وہ تب حیران بلکہ ہونق رہ گئی تھی جب اس نے خاموشی سے وہ سازشی بیگ سے نکال کر فاطمہ کے سامنے بیڈ پر رکھ دی۔

”جھوٹ بولنا بہت غلط بات ہے فاطمہ اماں جان کی خواہش اتنی بے ضرر ہے کہ آپ کو ہرگز کوئی فرق نہیں پڑے گا اگر آپ اسے پورا کر دیں گی۔“ فاطمہ کو جیسے سکتہ ہو گیا اور اماں جان نہال، اسے جلدی تیار ہونے کا کہتیں



خود دارانا برست لڑکی کو اپنے قدموں پر جھکے اس کی توجہ کی بھیک مانگتے دیکھنے کی متنی تھی۔ وہ اس کے سامنے پتے پھینک رہا تھا۔ وہ یقین رکھتا تھا اس کی ناکامی کا۔

عباس نے نامل نہیں کیا ابھی کے لیے اتنا ہی کافی تھا مگر اسے دوبارہ بہت جلد موقع مل گیا پھر فاطمہ کا امتحان لینے اس کے حواس سلب کرنے اور سر اسٹمکی کی انتہاؤں پر لے جانے کا سیڑھیاں اتر کر آتے پیروں کو چھوٹی ساڑھی میں اس کی نازک ہیل الجھ گئی تھی وہ گرتے گرتے پچی تھی اسے پکڑنے والا عباس حیدر تھا جو اس کا ہی منتظر تھا اس کے کمرے سے باہر آتے وہ اس کے ہمراہ ہولیا تھا محض چند قدم پیچھے مگر فاطمہ اتنی الجھی ہوئی تھی کہ آگاہ نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن جب عباس نے اسے بروقت سنبھالا تب وہ گھبرا کر اسے تنکے لگی تھی عباس نے اسے اپنی برحمت پناہیں بخش دی تھیں گھبراہٹ کا باعث یہ بات نہیں تھی کہ عباس نے اسے سنبھالا تھا اصل گھبراہٹ اس بات پر تھی کہ عباس نے اسے سہارا دینے کے بعد اس کے سنبھال جانے کے بعد بھی نہ اسے چھوڑا تھا نہ فاصلہ بڑھایا حالانکہ اس سے قبل وہ جتنی بار بھی مجبوراً اس قسم کا اقدام کر چکا تھا ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا تھا مگر اب وہ جانے کیا ٹھانے ہوئے تھا۔ اتنی قربت اور اس کی جسم و جاں کو سلگانی حدت و تپش وہ جان سے جانے لگی جسمی کسمپاسی مگر عباس نے وہیمان کہاں دیا تھا وہ اسے یونہی تھامے ایک ایک سیڑھی اطمینان سے اتر رہا تھا۔

”ارے ارے..... خیریت، چوٹ لگ گئی نہیں کیا؟“ ہال کمرے تک پہنچتے زمینی سے ٹکراؤ ہو گیا جو اپنے بچوں کے پیچھے بھاگتی دوڑتی یہاں پہنچی تھی مگر عباس کو اس طرح فاطمہ کو سہارا دیے پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ فاطمہ کا جواب اور کوفت سے جھنجھلایا سرخ چہرہ دکھ کر انگارہ ہوا اس نے پوری قوت صرف کر کے خود کو اس کی گرفت سے زبردستی نکال لیا۔

”ہاں لگ ہی جاتی اگر میں نہ پکڑ لیتا۔“ عباس کا لہجہ متبسم تھا زمینی کھلکھلائی۔

”پھر تو آپ نے نیکی کی ان کے ساتھ، لگ بھی تو بہت پیاری رہی ہیں اس کلر میں نظر نہ لگ جائے میں اماں جان سے کہتی ہوں ان کی نظر اٹاریں۔“ فاطمہ جتنی خفت زدہ اور جزبزی تھی زمینی کو اسی قدر شرارت سو جھڑی تھی۔

”لوگ صرف میرون رنگ میں ہی حواسوں پر طاری نہیں ہوتے وائٹ کلر میں بھی کم نہیں جتے۔“ عباس کی فاطمہ کو کتنی نظریں یکا یک لودنے لگیں۔ فاطمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ عباس کی ساحر آنکھوں میں بھی وہ لمحہ جگمگا رہا تھا فاطمہ نے ہونٹ بھیج لیے وہ لمحہ تو اس پر بھی بھاری رہا تھا جب بلال صاحب کے ہاں دعوت کے لیے فاطمہ نے ہر انجام کی پروا کیے بغیر کتنے دل سے خود کو اس ستم گر کے لیے سنوارا تھا محض اس کی ایک ستائی نگاہ کی چاہ میں لیکن وہی نہیں مل سکی تھی اسے، عباس کا اسے وہاں ساتھ لے جانا ایک مجبوری ہی تھی کہ وہ بلال صاحب کو انکار نہیں کر سکا تھا وہ ان کا اتنا ہی احترام کرتا تھا لیکن فاطمہ کو دیکھ کر اس کا موڈ یکفخت سوانیزے پر جا پہنچا تھا حالانکہ یہ دوسری نظر تھی جس میں قہر و غیض تھا پہلی نگاہ اس پر ڈال کر وہ بھی حواس کھونے سا لگا تھا۔

ہالوں کو سمیٹ کر جھکے کچر میں جکڑتی فاطمہ نے آئینے میں اس کی جھلک دیکھی تو بے اختیار اس کی جانب گھوم گئی تھی تو اس کا فرش کو چھوٹا سفید رنگ کا فراک بھی ساتھ جکڑ لگا گیا تھا۔ عباس کو لگا تھا اس کا وجود ہی روشنی سے بنا ہو۔ صبح معنوں میں مہوت کر دینے والا منظر تھا گویا چاندنی زمینی پر اتاری ہو وہ حیران سحر زدہ سا اس کے سامنے کھڑا ہے دیکھتا تھا اور فاطمہ وہ جیسے اپنی کامیابی پر نازاں ہوتی چلی گئی تھی اس کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔

عباس چونک گیا اپنی بے خودی پر خفت زدہ اس کی اس جہت پر قہر و غیض سے بھرنے لگا۔ اس کے بعد جو منہ میں آیا وہ وہی بولا تھا۔ ہر لفظ آتشیں تھا جس نے ایک بار پھر فاطمہ کو بکھیرا توڑا اور ریزہ ریزہ کر کے پیروں میں پھینک دیا۔ وہ اس کے آؤر پر جا کر کپڑے بدل آئی تھی اور چاندی کے جیسی نازک ہیل ٹمپلیں سفید چپروں سے الگ کر کے



خاموش رہ رہی رہی۔ مگر عباس کا یہ انداز یہ اطوار اب اس کے لیے کم از کم قابل قبول نہیں تھا جیسا وہ سب ضبط گنوا کر بے قراری و وحشت بھرے انداز میں رو پڑی۔ اس کے آنسو بے تابی سے ٹوٹ کر نکھرے اور عباس ششدر ہونے لگا۔

”کیا ہوا؟“ اسے لگا اس کے سارے پتے بے کار گئے ہیں اسے حیرت کے بجائے غیر یقینی گھیرنے لگی کیا اس کے سارے قیاس غلط تھے؟ اس نے خود سے سوال کیا بلکہ قیاس کیا اسے یقین تھا فاطمہ مرنے ہے اس پر جان دیتی ہے پھر اب؟.....

”گھ..... گھر..... چلیں پلیز۔“ عباس کے ہاتھ اپنے کاندھے پر محسوس کر کے دہشت بھری جھرجھری لے کر بولی۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے فاطمہ۔“ عباس سب کچھ بھول کر پریشان نظر آنے لگا۔ فاطمہ کی گھبراہٹ اس کے لہجے پر دہری ہونے لگی۔ وہ لحوں میں زرد پڑ رہی تھی۔ عباس کی تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔ اس نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھائی۔ مگر اس سے پہلے فاطمہ کو بوتل تھمائی۔

”چند گھنٹے تو لو، طبیعت سنہلے گی تمہاری۔“

اس کے لٹی میں سر ہلانے پر وہ اصرار کہہ رہا تھا فاطمہ مزید انکار نہیں کر سکی مگر اس نے ایک گھنٹہ بھی نہیں لیا تھا اس کی بگڑتی حالت پر ہی عباس نے شہر کے مضافات کے نزدیک گاڑی کو روک دیا تھا۔

”باہر آؤ، تھوڑی دیر کھلی ہوا میں سانس لو، بہتر محسوس کرو گی خود کو۔“ عباس نے صرف کہا نہیں باہر نکل کر اس کی جانب کا دروازہ کھول کر اسے سہارا دے کر باہر آنے میں مدد بھی دی۔ مگر وہ اس کے ہاتھوں میں ہی پکھرتی چلی گئی کب سے ان کا تعاقب کرنی بلیک گاڑی سے فائر ہوئے تھے اور فاطمہ خون میں نہاتی چلی گئی!.....

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)



رکھ دی پھر کبھی نہ پہننے کے لیے۔

اس کی آنکھوں کی سرخی بتاتی تھی وہ رو کر آئی ہے، عباس کی ہمراہی کا فخر اس کی سنگت کے جبر نے معدوم کر ڈالا تھا اس روز اس کے اچھے ہارے بے بس ٹڈ حال انداز نے اس پر واضح کر دیا تھا۔ اس نے جان لیا تھا پورے ماحول پر سحر طاری کرتا سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس وہ شخص پورے کا پورا اس کا ہو کر بھی اس کے لیے نہیں تھا کبھی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

”آئیے، میں اماں جان کے پاس لے چلوں آپ کو، کچھ پڑھ کر دم کر دیں گی۔“ زہبی اسے اماں جان کے پاس لے آئی انہوں نے اس پر آئیہ الکرسی کا دم کیا۔ کتنے چاؤ تھے اس کے کتنے ارمان مگر وہ کم صم نظر آتی تھی اور عباس لمحہ بہ لمحہ اس کے ساتھ اس کی جانب متوجہ اور اس کی توجہ کا طالب مگر وہ کسی اور ہی جہاں میں گم لگتی تھی اس کی اس عدم توجہی کو سب کے ساتھ اماں جان نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ جیسا تو کتنا پریشان ہو گئی تھیں وہ شاید اس لیے انہوں نے اسے تنہائی میں بالخصوص سمجھایا بھی تھا۔

”تمہیں تو اپنی اولاد اور شوہر پر حق جتلاتا بھی نہیں آتا بیٹے، یہ غلط ہے۔“ وہ اس سے پہلے کتنا اس سے پوچھتی رہی تھیں اس کا عباس سے جھگڑا تو نہیں ہوا کوئی اور ایسا معاملہ مگر وہ ہر بات کے جواب میں سر نفی میں ہلاتی تھی۔ تب اماں جان نے گہرا سانس بھرا تھا۔

”عباس بہت شدت پسند ہے بیٹے، میں ماں ہوں اس کی جانتی ہوں وہ اس وقت تمہاری توجہ کا طالب ہے تمہیں اس پر توجہ دینی چاہیے دیکھو بیٹے بیوی اگر شوہر کی پروا نہ کرے اپنا حق نہ جتلائے پیار کی لڑائی نہ لڑے تو شوہر اپنے اندر کوئی خامی ڈھونڈنے لگتا ہے۔ وہ خود کو ایسے یتیم بچے کی طرح محسوس کرتا ہے جس سے اس کی ماں اور باپ کی محبت و شفقت چھین گئی ہو عباس میں بھی میں نے یہی کیفیت محسوس کی ہے میں مانتی ہوں تمہارے بچے چھوٹے ہیں تم بہت ذمہ دار ہو مگر بیٹے شوہر کو بھی نظر انداز نہ کرو۔“ وہ ہر بات سے انجان تھیں وہ انہیں بتاتی بھی کیا سو





محکم دلائل

احمد علی

READING  
Section





ہیں رنگ کئی ان کے پر پختہ نہیں ہوتے  
یہ لوگ بھی کیا شے ہیں شرمندہ نہیں ہوتے

گل کے رخ رنگیں پہ بھی آنسو ہیں صبح دم  
یہ کس نے کہا ہنستے ہوئے چہرے نہیں روتے

### گزشتہ قسط کا خلاصہ

بدلے کی آگ میں جلتا سکندر لاریب کو بھی اپنے طنزیہ جملوں کی بدولت جھلسائے دیتا ہے جبکہ لاریب اس کے ہر قسم کو اپنی غلطیوں کا ازالہ تصور کرتے خاموشی سے برداشت کر جاتی ہے۔ فاطمہ اپنے بھائی ابراہیم احمد کے گھر عباس کو بنا بتائے چلی آتی ہے اس کا مقصد ابراہیم سے دین کی آگاہی حاصل کرنا ہوتا ہے عباس اپنے بچوں اور خود سے برتی گئی یہ بے نیازی قطعاً برداشت نہیں کر پاتا اور وہاں پہنچ کر اسے سخت سناتا ہے جبکہ ابراہیم احمد عباس کا یہ روپ دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ ایسے عالم میں وہ فاطمہ کو اپنے ہمراہ حویلی لے جانا چاہتا ہے جہاں گھر والوں نے انہیں مدعو کیا ہوتا ہے۔ ایمان کا فاطمہ سے سامنا ہونے پر وہ اپنی بہن لاریب کے لیے مضطرب ہوتی ہے اسے لگتا ہے کہ اس لڑکی کی خاطر عباس نے اس کی بہن کو نظر انداز کیا تھا جبکہ فاطمہ کی خوش اخلاقی ایمان کی رائے بدل دیتی ہے۔ اس کی صحت یابی کی خوشی میں بابا جان حویلی میں چھوٹی سی تقریب کا انعقاد کرتے ہیں۔ جس میں سب لوگ ہی شرکت کرتے ہیں۔ سکندر وہاں عباس کو دیکھ کر مشتعل ہو جاتا ہے وہ لاریب پر عباس اور وقاص دونوں کے سامنے جانے پر پابندی عائد کرتا ہے جبکہ ناچاہتے ہوئے بھی لاریب کا سامنا وقاص سے ہو جاتا ہے وہ اپنے گزشتہ رویوں کی معافی طلب کرتا ہے لیکن سکندر یہ منظر دیکھ کر اشتعال میں آ جاتا ہے دوسری طرف لاریب اس کی بدگمانی

آنچل جنوری 236

READING  
Section

ایک طرف رکھتے وہ فاطمہ سے برملا اظہار بھی کرتا ہے جبکہ فاطمہ اس کے والہانہ انداز محبت پر حیران رہ جاتی ہے حویلی سے گھر واپسی پر ان کی گاڑی پر فائرنگ کر دی جاتی ہے جس میں فاطمہ شدید زخمی ہو جاتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

\*\*\*\*\*

یہ سب کچھ اچانک اور اتنا غیر متوقع تھا کہ عباس کسی طرح بھی اپنے حواس قائم نہیں رکھ سکا۔ بلیک کرولا دھول زانی سڑک کا موڑ مڑ چکی تھی۔ ایک دلخراش چیخ کے بعد فاطمہ کے ہونٹوں سے دم توڑتی سی چند کراہیں نکلی تھیں پھر وہ مکمل طور پر حواس کھو گئی تھی۔ عباس سکتہ زدہ کھڑا تھا اسے سکتے میں مبتلا کرنے کو یہی کافی تھا کہ عین موقع پر نشانے کی زد سے اسے دھکیل کر فاطمہ خود کیوں سامنے آ گئی تھی۔ یعنی وہ اس سے قبل اس گاڑی اور اس گاڑی سے فائر کرنے والوں کو دیکھ چکی تھی۔ یعنی وہ جاتے جاتے بھی آخری احسان اس پر کر گئی تھی۔

\*\*\*\*\*

”سکندر“ دودھ کا گلاس اس کے پاس میز پر رکھتے لاریب نے اسے پکارا۔ سکندر نے لمحہ بھر کو نگاہ اٹھائی۔ اس کا نزاکت سے بھرا سراپا اس کا وجود جیسے چاندنی کی کرنوں سے گندھا تھا۔ وہ ہرگز نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھی مگر وہ کر رہا تھا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے باجوہ کہتی ہیں چیک اپ کرانا چاہیے۔ صبح ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے؟“ اس کی نظریں یہ سوال کرتے جھکی ہوئی تھیں صرف نظر ہی نہیں وہ تو اپنا دل بھی جھکا چکی تھی مگر سکندر کا دل اب ہر جذبے سے گویا عاری تھا۔

”میرے پاس ان چونچلوں کے لیے وقت نہیں ہے۔“ وہ دل چاہے تو اماں کو ساتھ لے جاتا، ورنہ مرضی ہے تمہاری۔“ آف موڈ کے ساتھ اس نے زور سے کتاب بند کر کے سائیڈ پر رکھ دی۔ لاریب لمحہ بھر کو شرمندگی کے باعث گڑھی گئی مگر خود کو جلد سنبھال لیا تھا۔

”ٹھیک ہے میں کہہ دوں گی۔“ اس کے مدہم لہجے میں کہنے پر سکندر نے بھونٹیں اچکا کر اسے دیکھا اور زہر خند سے مسکرایا۔

”یہ بھی بتا دینا کہ ان کا بیٹا اب اس قابل ہو چکا ہے کہ تم اسے منہ لگانا پسند کرتی ہو۔“ اس کے سرد لہجے میں چھپی بھنکار لاریب کی پور پور کو زہر یلا کر کے رکھ گئی۔ اس کی آنکھیں تیزی سے جھکی تھیں وہ انہیں چھلکنے سے کس طرح بھی روک نہیں سکی تو انتہائی بے بسی کا شکار ہوتے رخ پھیر لیا اس کے باوجود سکندر بھڑک کر چیخ اٹھا تھا۔

”میرے سامنے یہ مگر مجھ کے آنسو نہ بہایا کرو۔“ وہ جیسے مرنے مارنے پر تل گیا تھا۔ لاریب کے اعصاب شل ہونے لگے۔ منہ پر ہاتھ رکھے سسکیاں دہاتی وہ جیسے ہی اٹھنے لگی سکندر نے تیزی سے حرکت میں آتے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے اس جارحیت بھرے جھٹکے کے نتیجے میں وہ دوبارہ بستر پر گر گئی تھی تو حواس جھنجھٹا اٹھے تھے۔

”بہت مظلوم بنتی ہونا، یاد کرو کبھی اس سے بھی زیادہ برا سلوک تم کر چکی ہو میرے ساتھ۔“ اس کی خوف سے پوری کھلی آنکھوں میں اپنی طنزیہ سفاک نظریں گاڑتا ہوا وہ بے رحم لہجے میں بولا تھا۔ لاریب کے چہرے پر بے بسی اور غم کی شدید کیفیت کا غلبہ چھانے لگا۔

”میں آپ سے شکایت نہیں کر رہی آپ کو حق حاصل ہے ہر طرح کا۔“ وہ بولی تو آواز میں بھراہٹ اتری ہوئی تھی۔ سکندر نے چونک کر اسے دیکھا اور جیسے دیکھتا رہی گیا۔ وہ سرتا پائے رنگوں میں رنگی ہوئی تھی۔

خاموشی..... لب بستہ..... راضی بارضا..... نہ گلہ نہ شکایت..... وہ ایسی کب تھی؟ وہ ایسی کبھی نہیں تھی پھر.....؟

سکندر کے اندر عجیب سے سوال اٹھے جن کا انتشار و اضطراب چہرے و آنکھوں سے چھلکنے لگا۔ وہ ہونٹ بھیچنے اپنے اندر ہونے والی جنگ سے نبرد آزما تھا۔

لاریب اٹھ کر داش روم میں گئی۔ کچھ توقف سے وہ کمرے میں لوٹی تو انداز پھر پہلے کی طرح نارمل تھا۔ سکندر نے اسے صبح کے کام نمٹاتے دیکھا۔ وہ اس کے

آنچل جنوری 237



کپڑے استری کر رہی تھی جو نے بھی خود پالش کرتی تھی۔ ناشتا بنا کر پیش کرتی، وہ عجیب سی نظروں سے اس کا جائزہ لیتا رہا مگر وہ کھس رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر جوار بھانے کی طرح پکتا تھا اور ایسی کیفیت میں وہ ہمیشہ اپنے ساتھ لاریب کو بھی جھلسانا فرض سمجھا کرتا۔

”اگر تم بہتر فیصلہ کر لیتی تو اس طرح تختہ مشق نہ بنتا پڑتا۔“ اس کا لہجہ مدہم مگر چھتا ہوا تھا۔ لاریب نے چونک کر اسے دیکھا اس کی نظروں میں کیسی بے بسی تھی۔

”اب کی بار میں نے خالص اپنی مرضی سے فیصلہ کیا ہے، بغیر کسی جبر کے۔“ اس کا مدلل دو ٹوک لہجہ ہر قسم کے شک و بناوٹ سے پاک تھا۔ سکندر کو پھر سے جھنجھٹا ہٹ نے گھیرا۔

”اپنے ان مظالم کا ازالہ کرتا چاہتی ہوگی۔“ وہ اسی تنفر سے بولا۔

”اس کے علاوہ بھی ایک وجہ تھی۔“ لاریب نے کھڑکیاں بند کر کے پردے برابر کیے اور اسی مضبوطی سے بولی۔ سکندر ٹھٹک کر اسے تنکے لگا۔

”اور وجہ؟“ اس کا انداز مسترمانہ تھا۔ مگر لاریب اس کا سوال نظر انداز کر گئی، سکندر کو جیسے یہ نظر اندازی آگ لگانے لگی۔

”بتاؤ کیا وجہ تھی؟“ وہ تلملا اٹھا اور اس کی کلائی پکڑ کر بے رحمی سے مروڑی، لاریب نے ساری تکلیف کو ہنزون کو باہم بھینچ کر برداشت کیا البتہ کوئی مزاحمت نہیں کی اس کی نظروں میں ہنوز سوال تھا۔

”اس بات کو چھوڑ دیں۔“

”بکواس بند کرو سمجھیں، جو پوچھا ہے اس کا ہر حال میں جواب چاہیے۔“ وہ تیوری چڑھا کر بے حد رکھائی سے بولا۔ لاریب بے بسی نظر آنے لگی۔

”میرے جیسی لڑکی محض ازالے یا سمجھوتے کی بنا پر ایسا قدم نہیں اٹھا سکتی، اس کی وجہ محبت ہی.....!“ اس کی بات سکندر کے اٹھے ہوئے ہاتھ کی بدولت ادھوری رہ گئی۔

لاریب محض ایک بل کو بھونچکی ہوئی کھلی گال پر ہاتھ رکھوہ

اگلے لمحے نظریں اور چہرہ اچھکا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ جبکہ سکندر شعلہ جوالہ ہی نہیں جنونی بھی نظر آنے لگا تھا۔

”بہت خوب، تو یہ ڈرامہ کرو گی اب تم میرے ساتھ اپنا مقصد نکالنے کو۔“ وہ حلق کے بل غرایا۔ لاریب کا پورا وجود آنسو بن کر بہنے لگا۔

”میں اسی باعث تمہیں بتانا نہیں چاہتی تھی سکندر، جانتی تھی تم یقین نہیں کرو گے۔ بلا آخر اس جذبے کی تذلیل بھی میں نے خود ہی کر لی۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

”کیا مقصد ہے اب تمہارا مجھ سے؟“ لاریب وہاں سے جانے کو جیسے ہی پلٹی سکندر نے جہان زندہ انداز میں کہتے اسے کاندھوں سے دیوچ کر اپنے مقابل کیا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں اس بل کتنی وحشت تھی لاریب کو عجیب سے دکھ نے آن لیا۔ اس کا بھی کاشد یدر وہ سکندر کے لیے کتنے نقصان کا باعث بن گیا تھا۔ اس کی اچھائیاں اس کی خوبیاں اسی طیش و غمی کی نذر ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ ذہنی اعتبار سے کم از کم اس کے حوالے سے تباہ ضرور ہو چکا تھا۔ نفرت و انتقام کے ساتھ بدگمانی کی آگ اسے بری طرح جلا کر خاک کر رہی تھی۔

”کیا مقصد ہو سکتا ہے، آپ بہت جینٹل ہیں خود سوچ لیں جو کچھ آج آپ کے پاس ہے وہ الحمد للہ مجھے ہمیشہ میسر رہا البتہ ہدایت نہیں تھی۔ عقل کا استعمال نہیں آتا تھا۔ وہ سیکھا تو اپنی اصلاح کرنے میں بھی دیر نہیں لگائی۔ غلطی کا احساس جاگا تو محبت کا وہ نوخیز پودا بھی سراٹھا کر لہلہانے لگا جو ہمیشہ سے تھا مگر میں ہی محسوسات سے بے بہرہ رہی تھی۔ جس سکندر کو میں عزیز رکھتی تھی وہ میرا غم گسار، میرا ہم نوا اور دوست تھا۔ جسے میں بطور شوہر قبول نہیں کر سکی، کیوں؟ وجہ سے آپ لاعلم تو نہیں ہوں گے۔ ان دنوں میں کسی ذہنی پسماندگی اور اذیت کا شکار تھی یہ اس کیفیت کے برعکس تھا سکندر آپ نے جس طرح مجھے سمجھا مجھے سنبھالا اور مجھے سنبھلنے کا موقع دیا یہ چیزیں ہی میرے دل میں آپ کی محبت اور اس رشتے کی گنجائش پیدا کر

تھیں۔ میں نے آپ کے ساتھ جوتا خری جھٹڑا کیا اس پر سب سے زیادہ پچھتائی ہوں میں بہت روئی ہوں، آپ کی کامیابی، آپ کی واپسی میرے لیے ایک انعام تھا۔ میں نے آپ کو شوہر کے طور پر قبول کیا تو پوری آمادگی کے ساتھ۔ جسے آپ کے تمام حقوق سے بھی آپ کو نوازا لیکن اب مجھے اندازہ ہوا اس روز جو بات میں نے جذباتیت میں کہی تھی مگر سچ کہی تھی۔ شوہر دوست نہیں ہوتا بھی نہیں۔ میں نے پہلے اپنا دوست کھویا تھا۔ جسے میں اب اپنا شوہر نہیں کھوتا چاہتی میری خاموشی میں بس یہی مصلحت یہی خوف ہے میں انتظار کر رہی ہوں اس وقت کا جب آپ کو میری باتوں کا یقین آ جائے گا۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ کی نہیں تیزی سے پلٹ کر کمرے سے باہر نکل آئی تو فراز کو دروازے کے باہر سکتہ زندہ کیفیت میں پا کر اسے شدید ترین جھٹکا لگا تھا۔ خفت اور شرمندگی جو بھی وہ الگ۔ اس سے ہی نہیں وہ اپنے آپ سے بھی نظریں چراتی وہاں سے بھاگی تھی۔ فراز نے متاسفانہ سانس بھرا اور کھلے دروازے سے اندر قدم رکھ دیا۔ سکندر بیڈ کی پاستی کی جانب دونوں ہاتھوں پر سر گرائے بیٹھا نظر آیا۔

”پچھتا رہے ہو؟“ فراز کے کاٹ دار طنز پر چونکتے ہوئے سراٹھا کر اسے دیکھا اور اگلے لمحے خفت و خجالت کے شدید ترین احساس سمیت نظر چراتی پڑ گئی تھی۔

”تم کب آئے؟“ وہ خود کو سنبھالنے کی سعی میں مصروف تھا۔

”تمہیں نہیں لگ رہا تم وقت برباد کر رہے ہو؟“ فراز کا لہجنا صحتانہ تھا جو سکندر کو آگ لگا گیا۔

”بکواس نہیں کرو، اس کی فحور کرنے آئے ہو تو جا سکتے ہو۔“

”ذرا سی گنجائش رکھ کر بھی سوچا جا سکتا ہے سکندر۔“ وہ لہجہ ہوا اور سگریٹ سلگانا سکندر خود بھی سلگ گیا۔

”نہیں ہے گنجائش بالکل بھی وہ جھوٹ بولتی ہے، میں جانتا ہوں ابھی ابھی عباس.....!“ معا یکدم ہونٹ بھینچ گیا فراز نے چونک کر اسے دیکھا کتنی اذیت تھی اس کے چہرے پر۔

”اگر تم پیچھے مڑ کر ہی دیکھتے رہے تو کبھی آسودہ اور خوش نہیں رہ سکو گے اگر بھابی نے کپڑا مارتا بھی کیا ہے تو تمہیں ان کے اس جذبے کی قدر کرنی چاہیے۔ یاد کرو جب وہ تمہاری زندگی میں آئیں عباس بھابی تب بھی ان کی زندگی میں تھے۔ اگر تب انہیں درمیان میں رکھنے والی وہ تھیں تو اب انہیں فراموش کر کے بھی وہ تمہارے پاس آئی ہیں سکندر اگر تم اس وقت اتنے اعلیٰ ظرف تھے تو یہ اعلیٰ ظرفی اب کہاں چلی گئی؟ کیوں اپنی زندگی میں اپنے ہاتھوں زہر گھولتے ہو بھابی کو غور سے دیکھا ہے تم نے..... یقیناً نہیں محض چند ہفتوں میں وہ آدھی بھی نہیں رہی ہیں اگر یہی صورت حال رہی تو عین ممکن ہے یہ شدت پسندی تمہیں کسی پچھتاوے میں مبتلا کر دے کیا تم کوئی نقصان انورڈ کر لو گے؟ یا تمہیں اقتدار کا نشہ اتنا زیادہ ہے کہ اس پر بہت آسانی سے محبت قربان کرنے کی ہمت پیدا ہو گئی ہے۔“ فراز ایک کے بعد ایک تیکھا اور سلگتا سوال اس کے سامنے رکھ رہا تھا اور وہ بھڑکتا جا رہا تھا۔

\*\*\*\*\*

جب تک فاطمہ کو ہوش نہیں آ گیا اور اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہو گئی عباس کتنا حواس باختہ نظر آتا رہا تھا۔ پولیس کو اپنا اسٹیشنمنٹ ریکارڈ کراتے اس نے صاف لفظوں میں سعید احمد کا نام لکھایا اور اس کی فوری گرفتاری پر اصرار کرتا رہا تھا۔

”آپ کو یقین ہے آپ نے خود دیکھا انہیں؟“ سب انسپکٹر کے سوال پر عباس نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔

”اس کے علاوہ میرا اور کوئی دشمن نہیں ہے۔ وہ میرے گھر پر کھڑے ہو کر مجھے شوٹ کرنے کی دھمکی دے کر گیا تھا۔ میں نے بتایا تھا آپ کو وہ میرے بچوں کو بھی گن پوائنٹ پر کڈ نیپ کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ میرے گھر کا قیمتی ساز و سامان لوٹ چکے ہیں کیا کچھ بتاؤ آپ کو؟“ عباس اتنا مشتعل تھا کہ وہ ساری باتیں بھی کھول دیں جن کے متعلق اس سے قبل وہ کسی سے بھی سننا پسند نہیں کیا کرتا تھا۔



پولیس نے سعید احمد کے خلاف ایف آئی آر درج کی اور عباس کو انصاف ملنے کی روایتی یقین دہانی کرانے کے بعد وہاں سے رخصت ہو گئی۔ تب ہی محمد شرجیل اور ابراہیم احمد پریشان چہروں کے ساتھ وہاں پہنچے تھے۔ تب وہ کتنا ہراساں اور خود کو سنبھالتا ہوا کتنا غمگین حال لگ رہا تھا۔

”فاطمہ کو کچھ نہیں ہونا چاہیے ابراہیم احمد، عریشہ کے بعد اسے بھی کھونے کا مجھ میں ہرگز حوصلہ نہیں ہے۔ میں خود بھی مرجاؤں گا اگر اب کچھ بھی غلط ہوا۔“ وہ تمام حوصلے اور ضبط گنوا تا ابراہیم احمد کے گلے لگ گیا تھا۔ ابراہیم احمد اتنا اپ سیٹ تھا کہ عریشہ کے نام پر اگر الجھا بھی تو کوئی سوال کرنے کا خیال نہ آ سکا۔

”حوصلہ کریں عباس بھائی، دعا کریں اللہ بہتر کرے گا ان شاء اللہ۔“ ابراہیم نے کاندھا تھپک کر جبکہ شرجیل نے الفاظ سے ڈھارس بندھائی تھی دوسری جانب عباس تھا جس نے بلاتخر ہار مان لی تھی۔ خود سے بھاگتے اور نظریں چراتے بھی تھک گیا اس نے تسلیم کر لیا وہ اسے کھونا نہیں چاہتا۔ ہاں وہ اس سے محبت بھی کرنے لگا ہے ہار جیت، ہرانا و غم بے معنی تھا جہی اس کا ذہن شرجیل کے الفاظ میں اٹکا۔

”دعا.....!“ وہ ٹھٹھک گیا۔

”ہاں مجھے دعا کرنی چاہیے، جب عریشہ مجھ سے چھنی میں اس قابل کہاں تھا کہ خدا سے اسے مانگ سکتا مگر تمہیں میں دور نہیں جانے دوں گا فاطمہ، اب کی بار میں اللہ کو منالوں گا۔“ وہ نم آنکھیں ہاتھ سے رگڑتے وہ ایک نئے عزم کے ساتھ وضو کر کے رب کے دربار میں حاضر ہوا۔

تو دعا کو ہاتھ پھیلاتے ہی دل کی کیفیت میں عاجزی و خشوع و خضوع اتر آیا۔

”اے سب فریادیوں کی فریاد سننے والے، میری فریاد سن لے۔“ وہ گڑ گڑاتا ہوا سسکتا ہوا دعا مانگ رہا تھا۔ فاطمہ کو ہوش آیا تو سب سے پہلے اس کے پاس وہ بھاگا بھاگا گیا، گولیاں فاطمہ کے کاندھے اور بازو پر لگی تھیں۔ زیادہ خون بہہ جانے کے باعث وہ بالکل زرد ہو رہی تھی۔

اس کے بستر پر ٹپک گیا اور اس کا ہاتھ اپنے مضبوط

الوداع دسمبر

الوداع.....

الوداع..... دسمبر

ایک بار پھر

لوٹ گیا

وہی تنہائیاں

وہی وحشتیں

وہی دکھ

وہی آس کے لمحے

پھر سے سوچ گیا

دسمبر.....!

یاد رکھنا تم

بہت وحشت ہے

تیرے نام سے اب

بس اتنا یاد رکھنا

کہ جب لوٹو دو بارہ

اپنے دامن میں

تنہائیاں

وحشتیں

دکھ

آس

اور.....

انتظار کے لمحے

مت لانا

اس دسمبر الوداع.....!

تحریم اشرف..... خانیوال

ہاتھ میں لے لیا مگر فاطمہ کو منہ پھیرتے دیکھ کر وہ کیسے دھک سے رہ گیا تھا فاطمہ نے آنکھوں کی نمی کو ہنہنہ پایا۔

”میں آپ کو دیکھنا نہیں چاہتی، میں کمزور ہونا نہیں چاہتی۔“ عباس کا بچھا ہوا چہرہ اس کا شکن آلود لباس، از خود اس کی پریشانی و اضطراب کا گواہ تھا۔ وہ اب ان احساسات کو ہی تو نہیں محسوس کرنا چاہتی تھی اسے سب سے بڑا خطرہ

اپنے ہار جانے کا ہی تو تھا۔

”بھائی۔“ وہ سسکی۔

”مجھے بھائی سے ملنا ہے۔“ وہ یونہی رخ پھیرے بولی تھی آواز میں کتنی بے چینی اور بھرا ہٹ تھی اس نے اپنا ہاتھ بھی عباس کے ہاتھ سے نکال لیا تھا اور عباس کے اندر زور کا چھنا کا ہوا تھا اور سب کچھ ٹوٹا چلا گیا وہ بہت کچھ کھو چکا تھا اب مزید کچھ کھونے کا تصور ہی اسے وحشت میں مبتلا کرتا تھا۔

”تم ٹھیک ہو اب فاطمہ آئی ایم سوری میری وجہ سے۔“

”بھائی نہیں آئے کیا؟“ وہ نقاہت سے چور آواز میں پچھ رہی تھی عباس کے حوصلے پھر مسمار ہوئے جنہیں وہ دفتوں سے سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ چپ سا ہو گیا اور اسے دیکھتا رہ گیا جو شاید اسے دیکھنا بھی چاہتی تھی۔ ہاں، اس نے اس لڑکی کی تذلیل کی انتہا بھی تو کر دی تھی لیکن وہ تو بہت با حوصلہ تھی۔ بہت اعلیٰ ظرف بھی اور..... اور اس سے محبت بھی تو کرتی تھی۔ پھر کیا ہوا کیا وقت اتنی تیزی سے گزر گیا کہ وہ اس کی جانب سے مایوس ہو گئی۔ یا اتنی خفا کے اب از خود کوئی گنجائش نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ جبکہ وہ خود گواہ تھا کہ وہ اس شعر کی عملی تفسیر تھی۔

جانے کس کس پر پڑی ہوں گی نگاہیں تیری میں نے جن جن کے تیرے شہر کے پتھر چوے ایسی ہی دیوانگی کا شکار تھی وہ اس کے معاملے میں مگر یہ بھی تو ج ہے ناں کہ ہر جذبہ ہر احساس جواباً ویسی ہی پذیرائی چاہتا ہے یہاں پذیرائی کیا ہونا تھی۔ یہاں تو ذلت کے لاتعداد قصے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آ سکی فاطمہ کے اس رویے کی یہ بے دلی تھی، مایوسی تھی یا پھر واپسی کے راستوں پر قدموں کا مڑنا۔ جو بھی تھا عباس کے اندر زبیاں کے احساس کو گہرا کرنے لگا۔

دوسری جانب فاطمہ نے محض ایک نظر میں اس کے چہرے کے کرب و اذیت کو پالیا تھا اور بے حد یاسیت میں گھرتے آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔ اس کا دل

کراہنے لگا تھا عباس کو اٹھ کر باہر جاتے دیکھ کر مگر وہ اسے روک نہیں سکی۔

”مجھے معاف کر دیں عباس، میں آپ سے ہرگز انتقام نہیں لے رہی، لے ہی نہیں سکتی مگر یہ زندگی کا ایسا مقام ہے کہ میں آپ کو چن کر اپنے اللہ کی نظروں سے نہیں گر سکتی۔“ اس نے دل میں کہا۔ وہ ایسا ہی کر رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا وہ اب کبھی عباس کو اللہ کے مقابلے پر جیتنے نہیں دے گی۔ وہ اس کوشش میں سردھڑکی کی بازی لگا رہی تھی۔ وہ خوش نہیں تھی مگر وہ خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”تم ٹھیک ہو گڑیا! کہیں درد تو نہیں ہو رہا؟“ ابراہیم احمد کی آواز پر اس نے اپنی سرخ آنکھیں کھولیں تو تب سے جمع شدہ آنسو کناروں سے پھسل کر بالوں اور ٹیکے میں جذب ہونے لگے۔

”مجھے گھر لے چلیں بھائی۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کتنی بے قراری سے رو پڑی تھی۔ ابراہیم احمد حیران ہونے لگا۔

”ابھی.....؟ ڈاکٹر اجازت نہیں دیں گے۔“

”ان سے نہ پوچھیں لیکن مجھے لے جائیں، وہ سب غیر محرم ہیں میرے لیے۔ جب مجھے ہاتھ لگاتے ہیں تو بالکل اچھا نہیں لگتا۔ آپ کو تو پتا ہے کہ کتنا بڑا گناہ ہے۔ زینب نے بتایا تھا کہ غیر محرم سے ایسے بچنا چاہیے جیسے غلاظت ہے، جیسے آگ سے۔“ اس کے انداز میں جھنی بھی شدت تھی مگر اس کی ضد بے جا نہیں تھی۔ ابراہیم احمد کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

”آپ زینب کو مطلع کر دیں بھائی۔ وہ میری ڈرینگ کر دیا کریں گی۔“ گھر آنے کے بعد اس نے مزید کہا تھا ابراہیم احمد اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”زینب یہ کام کہاں کرنی ہیں اپنی ویز میں کسی فی میل ڈاکٹر کا انتظام کر دوں گا عباس بھائی سے کہہ کر۔“

”آپ گھر کا چکر لگائیں بھائی بہت تھکن ہو گئی ہے آپ کو میری وجہ سے۔“ اس کی تمام تر توجہ کامرکز وہی تھا۔ عباس کو عجیب سا احساس گھیرنے لگا۔ وہ واقعی بدل گئی تھی۔



اس نے اس کے ساتھ ساتھ اس کے بچوں پر بھی توجہ نہیں دی تھی جو اس کے دائیں بائیں آ کر لپٹ گئے تھے اور ماں کی حالت دیکھ کر خاصے ہر اسماں تھے۔

”سیمما بچوں کو ان کے کمرے میں لے جاؤ۔“ اس سے برداشت نہ ہو سکا تو بول پڑا۔ ملازمہ کی تعمیل پر بچے اینٹھ گئے تھے اور فاطمہ سے چپکے جانے لگے۔ تب فاطمہ نے اشارے سے سیمما کو منع کیا اور بچوں کو مزید خود سے قریب کر لیا تھا۔

”مجھے ان سے کوئی مسئلہ نہیں ہے سیمما، نو مینشن۔“ سیمما سر ہلاتی پلٹ گئی تھی۔

”میں شام میں آؤں گا فاطمہ سمعیہ کو لے کر اپنا خیال رکھنا فی امان اللہ۔“ ابراہیم احمد عباس سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔

”سیمما ان کے لیے سوپ لے آؤ۔“ عباس کے کہنے پر ملازمہ جیسے ہی باہر جانے کو مڑی فاطمہ نے ٹوک دیا۔

”نہیں فی الحال تم مجھے وضو کراؤ، مجھے ابھی نماز پڑھنی ہے۔“ اس کی بات نے عباس کو بے حد حیران کیا اور جیسی وہ بے اختیار بول پڑا۔

”نماز؟“ سوالیہ انداز میں فاطمہ نے پہلی بار اسے براہ راست دیکھا۔

”کیوں، کوئی اعتراض ہے آپ کو؟“ اس کا لہجہ اس کا انداز کس قدر نرم و مٹھا تھا۔ عباس گڑ بڑا سا گیا۔

”میرا مطلب ہے کہ ابھی تمہاری طبیعت بہتر نہیں ہے تو بعد میں قضا نمازوں کی ادائیگی.....!“

”میں ہرگز اتنی بیمار نہیں کہ نماز چھوڑ دوں، نماز کسی بھی حال میں معاف نہیں ہے۔ یہ تو آپ کو بھی پتا ہوگا۔“ اس کا لہجہ گو کہ طنز نہیں تھا اس کے باوجود عباس شرمندہ نظر آنے لگا۔ وضو کرنے سے لے کر نماز ادا کرنے کا مرحلہ بہت گہرے ضبط اور تکلیف کا مرحلہ تھا مگر فاطمہ نے ہمت نہیں ہاری۔ عباس اسے دیکھتا اور داد دیتا رہ گیا تھا۔

”آؤ، یہاں لیٹ جاؤ اور کچھ کھاؤ۔“ وہ جائے نماز سے اٹھی تو عباس نے تیزی سے بڑھ کر اسے اپنی نرم

گرفت میں لے کر اپنی پرحدت پناہوں میں لے لیا۔ وہ یونہی نرمی اور احتیاط سے تھامے اسے بیڈ تک لایا تھا۔ فاطمہ سن ہو کر رہ گئی۔ کس حد تک اور کہاں تک وہ خود کو سنبھالے رکھتی اور بچاتی جبکہ عباس نے تو جیسے طے کر لیا تھا اس کی ہمتیں توڑنے کا شکست سے دوچار کر کے اسے بے بس کرنے کا عباس جو اسی کی سمت متوجہ تھا اس کی اسی حیرانی اور بے یقینی کے ساتھ جزبہ ہونے والے انداز کو سمجھ کر مسکراتے لگا۔

”میں چاہتا ہوں تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ، اس کے لیے مجھے تمہاری کیئر تو کرنا پڑے گی نا؟“ عباس کے مدہم گہمیر لہجے کا حصار اس کے گرد نہ ٹوٹنے والا دائرہ بن رہا تھا۔ وہ اس کی آنچ دیتی نظروں سے بہت سرعت سے چلنے لگی۔ جیسی بہت زیادہ گہمیرا ہٹ محسوس کرنے لگی اور اس کا حصار توڑنے کی کوشش کی۔

”میں خود چل سکتی ہوں، آپ چھوڑیں مجھے۔“ وہ جتنی وحشت اور بے چارگی میں مبتلا ہو کر بولی عباس اسی قدر ہرٹ ہوا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں فاطمہ، بیوی ہو تم میری۔“ فاطمہ نے دیکھا اس کے خوب رو بے حد پرکشش چہرے پر سرخی چھانے لگی تھی۔ پتا نہیں وہ اسے سمجھا رہا تھا یا احتجاج کر رہا تھا۔ وہ سمجھنے سے قطعی قاصر رہی۔

”میں نے انکار نہیں کیا مگر میں آپ کے اس رویے کی عادی نہیں ہوں۔ مجھے یہ توجہ نہیں چاہیے۔“ وہ پھٹ پڑی تھی۔ وہ کسی بھی طریقے سے اسے ہرٹ کر کے ہی سہی مگر اس کشمکش سے ٹکنا چاہتی تھی۔ عباس گنگ ہونے لگا۔ حیرت ہی حیرت تھی۔ یہ تو ہین و سکی کی انتہا تھی اس کے خیال میں وہ اسے جھٹلا رہی تھی اسے ٹھکرا رہی تھی جس کی خاطر اس نے خود در در کی خاک چھانی تھی اور ہر زیاں بہت حوصلے اور ہمت سے بڑھ کر اپنی جھولی میں ڈال لیا تھا۔

”میں جانتا ہوں تم مجھ سے خفا ہو، میں نے سلوک بھی ایسا کیا مگر فاطمہ مجھے ازالہ تو کرنے دو اس رویے کا۔“ عباس حیدر کے مخصوص دنگ لہجے میں التجا اور عاجزی اتر

آئی تھی۔ فاطمہ گھائل ہوتی چلی گئی اور دل جیسے بے اختیار سبک پڑا تھا سجدے میں گرنا ہوا۔

”اللہ، تجھ سے بڑھ کر بھی اپنے وعدوں میں کوئی سچا ہو سکتا ہے۔ ابھی میں پوری طرح تیری ہوئی نہیں اور دنیا کو تو نے میرے قدموں میں بھی بچھانا شروع کر دیا..... یہ شخص..... بھلا سوچا تھا کبھی میں نے ایسا لیکن یہ ہو رہا تھا بلکہ ہو گیا تھا معجزہ ہی تو تھا اور کرنے والا کون تھا اللہ کے سوا، کس غفلت میں ہے دنیا۔ اللہ کو چھوڑ کر ذلت کے کس خرابوں میں پڑی ہوئی ہے۔“ اس نے دل میں سوچا اور پھر اس کے آنسو بہنے لگے اس کی ہچکیاں بندھنے لگیں۔ عباس اسی قدر بے چین اور بے قرار ہوا۔

”آپ پریشان نہ ہوں، اللہ گواہ ہے، مجھے آپ سے کوئی شکوہ کوئی ناراضگی نہیں ہے۔“ وہ جھکے سر کے ساتھ بے حد عاجزی سے کہہ رہی تھی عباس پہلے حیران نظر آیا پھر کسی قدر مطمئن۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

”اگر ایسی ہی بات ہے تو بہت اچھی بات ہے۔“ وہ رکا اور ایک سوڈی سے بھر پور طویل سانس کھینچا۔

”بس اب جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ، پھر مجھے بھی تمہیں ایک بہت اہم بات بتانی ہے۔“ اس نے جھک کر فاطمہ کے ہاتھ پر ایک مہکتا بوسہ ثبت کیا اور اٹھ گیا فاطمہ تو بہت ہی شرمیلی رہ گئی۔



”لاریب.....!“ سکندر نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے سرگوشی سے ذرا بلند آواز میں اسے پکارا۔ کمرانیم تارک تھا اور ایئر فریشر کی خوشبوؤں سے مہکتا ہوا، سکندر کے پرسکون اعصاب پر خوشگوار بیت غالب آنے لگی۔

”شاید فراز گھامڑ پہلے ہی آگاہ کر چکا ہے اسے کہ میں منانے آیا ہوں اسے۔“ وہ اپنی سوچ پر مسکرایا اور پھر لاریب کو آواز دی تھی اور آگے بڑھ کر سوچ بورڈ سے کئی بیٹن دہائے نیم تاریک کمرالیکھت روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ وہ اپنے دھیان میں پلٹا مگر اپنے روبرو صالہ کو پا کر اسے دھچکا سا لگا۔ وہ بھلا اس کے بیڈروم میں کیا کر رہی تھی وہ بھی

لاریب کی غیر موجودگی میں۔

”وہ نہیں ہے یہاں، مجھے حکم کریں، کیا خدمت کروں آپ کی؟“ صالہ کے انداز مخصوص بے باکی لیے تھے گفتگو سے لے کر انداز و اطوار تک، خصوصی تیاری کے ساتھ نوک پلک سنوارے، سکندر نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا۔

”آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھرا۔

”لاریب..... کہاں ہیں لاریب!“ وہ زور سے پکارا مگر اس کی آواز مارے صدمے وغیرہ یقینی سے حلق میں گھٹ گئی۔ صالہ نے لپک کر صرف اس کا راستہ نہیں روکا بلکہ سارے فاصلے مٹا کر اس کے گلے لگ گئی تھی۔ سکندر کے اعصاب کھینچنے لگے۔ اس نے ایک جھٹکے سے پلٹتے ہوئے قہر بار نظروں سے اسے دیکھا اور خود سے الگ کرنا چاہا مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا کہ وہ یہ سب یقیناً کسی منصوبے کے تحت ہی کر رہی تھی۔

جیسی نہ صرف اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنا حلیہ بگاڑا بلکہ پلٹ کر دروازہ بھی بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ سکندر کو نوچتے کھسوٹتے اس سے لپٹ کر سٹریائی انداز میں چیخنے اور شور مچانے لگی تھی۔ سکندر کے لیے چونکہ یہ سب کچھ بہت غیر متوقع تھا جیسی اسے صورت حال کو سمجھنے اور حواس بحال کرنے میں کچھ وقت لگا اور پھر اس کے بعد وہ طیش میں آ کر ایسے پھرا کہ صالہ کی نسوانیت کی پروا کیے بغیر اسے دھنک کر رکھ ڈالا کچھ دیر بعد وہ اس کی اصلی چیخیں سن رہا تھا جن سے درود یوار لرزے جاتے تھے مگر سکندر کے ہاتھ دروازے کے پار ہونے والی دستک اور سراسیمہ شور کو سن کر بھی نہیں رک سکے۔

”جان سے مار دوں گا تمہیں فاحشہ گھنیا عورت، مجھ پر الزام لگاؤ گی، مجھ پر جو تھوکتا بھی پسند نہیں کرتا تم پر۔“ اس کی غراہٹوں میں وحشت درندگی، غم و تاسف کے علاوہ ایسا غضب ناک تاثر تھا کہ اس ڈرامے کا حصہ تائی ماں جو اپنے دیو، پیکل وجود کے دوچار دھکوں سے لاک توڑ کر دیگر اہل خانہ کے ساتھ اندر گھس آئی تھیں اور واویلا کرتے



ہوئے باقاعدہ سکندر کو کوئے لگیں۔

”ارے کوئی تو رو کے اس کو مار ڈالے گا میری بچی کو۔“ ان کے شور مچانے پر فراز اور نبیل جو سرخ چہرے لیے کھڑے تھے نا چاہتے ہوئے بھی آگے بڑھ آئے اور با مشکل بے قابو سکندر کو قابو کیا۔

”بس کرو سکندر، اتنا سبق کافی ہے۔“ فراز کی سرگوشی پر سکندر نے لہو چمکاتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ایک تو چوری اور پر سے سینہ زدوری، میں ابھی بلواتی ہوں تیرے لبا کو، ارے ہم تو ملنے کے واسطے آئے تھے کیا پتا تھا گھر کے محافظ ہی نقیب لگیں گے۔“ تانی ماں کی فریاد جاری تھی۔ صرف وہی تھیں جو صالہ کے زخم سہلا کر چیخ چلا بھی رہی تھیں۔ باقی تو ہر سوسنا تھا۔ سکندر نے لاریب کی جانب دیکھا جس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ وہ سخت مضطرب ہوتا اس کی جانب لپکا۔

”لاریب میں.....!“ لاریب نے سہم کر اس کی جانب نگاہ کی تھی پھر اگلے لمحے سسکیاں دباتی پلٹ کر بھاگی اور کمرے سے نکل گئی۔ سکندر نے اضطراب بھری نظروں کا رخ فراز کی جانب پھیرا جو تسلی آمیز انداز میں اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ چکا تھا۔

”ٹیک اٹ ایزی، میں دلاؤں گا بھابی کو تمہاری بے گناہی کا یقین۔“ اس کی تسلی کے باوجود سکندر کو گھیرنی وحشت میں اضافہ ہونے لگا۔ لہو رنگ آنکھوں کے ساتھ ہونٹ بیچنے۔ وہ پلٹ کر تیزی سے کمرے سے ہی نہیں گھر سے بھی نکل گیا تھا زندگی کو شاید ابھی اس کی اور آزمائش درکار تھی۔

\*\*\*\*\*

وہ بتدریج ٹھیک ہو رہی تھی۔ گاؤں سے اماں جان بابا جان کے علاوہ زمینی مہرو اور امامہ بھی اس کی خیریت دریافت کرنے آ چکی تھی۔ چھوٹی حویلی سے بھی ایمان بابا سامیں کے ہمراہ کل ہو کر گئی تھی۔ عباس ان دنوں بہت کم دکھائی دیتا البتہ اس نے فاطمہ کو کسی سے بھی کچھ کہنے سے منع کر دیا تھا۔ کراچی میں اس قسم کے واقعات عجیب لگتے

بھی کہاں تھے۔ عباس اس کیس کے سلسلے میں بھاگ دوڑ میں مصروف تھا۔

”آپ کو اتنا انوالونہیں ہونا چاہیے اس معاملے میں، ان لوگوں کا مقصد آپ کو ہی تو نقصان پہنچانا تھا۔“ فاطمہ چپ رہ نہیں سکی تھی یہ کہنے سے اس کی جانب سے آج کل ہر دم دل ہولتا ہی رہتا جب تک وہ گھر سے باہر ہوتا۔ فاطمہ کا دھیان اس کی جانب لگا رہتا۔ وہ گھر آ جاتا نظر کے سامنے ہوتا تو جیسے پوری دنیا کا سکون و امن آ جاتا تھا اس کے دل میں اس وقت بھی وہ وارڈ روب کے سامنے کھڑا اپنے کپڑے نکال رہا تھا۔ فاطمہ کی اس بات پہ کام ادھورا چھوڑ کر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ پھر وارڈ روب کا دروازہ کھلا چھوڑ کر اس کے پاس آ گیا۔

”تمہیں کیا ضرورت تھی فاطمہ مجھے سامنے سے ہٹا کر خود کو ان پلٹس کا نشانہ بنانے کی اگر تمہیں اس دن کچھ ہو جاتا۔“ عباس نے بات روک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ہونٹوں سے چومنے کے بعد نرم آنکھوں سے لگا لیا۔

”تم نے یہ کیوں نہ سوچا فاطمہ کہ میرا کیا ہے گا، عریضہ کو کھوکھری میں دیوانگی کی حدود کو چھوئے لگا تھا۔ مگر تمہیں کھو کر واقعی ہی.....!“ اس کی بات ادھوری رہ جانے کا باعث فاطمہ کا بے اختیاری کی کیفیت میں اس کے ہونٹوں پر رکھا ہاتھ تھا۔ کیسی تڑپ اور بے قراری تھی اس انداز میں آنکھوں میں جو وحشت ابھری تھی اس کا کیا شمار عباس نے اس کی آنکھوں میں لرزتے آنسوؤں کو دیکھا۔ کپکپاتے ہونٹوں کو پھر کچھ کہے بغیر تھوڑا سا اس کی جانب سرکا اور اسے گلے سے لگا لیا۔ یہ ایسی پیش رفت تھی جس نے فاطمہ کو سکتہ زدہ کر ڈالا۔

بھلا کبھی سوچا تھا اس نے..... یہ بے مہر شخص جس کی آنکھوں میں اس کے لیے صرف بیگانگی نفرت یا پھر نفی ہوتی تھی۔ کبھی اس طرح اس کا قدردان بھی بن جائے گا۔ اس کا دل رو پڑا۔ رواں رواں فریاد کناں ہونے لگا۔ وہ جتنا اس آزمائش سے بچنے کو ہاتھ پیر مارتی تھی اس قدر اس دلدل میں دھنس رہی تھی۔ اس کا دل پانی بن کر پھیلنے لگا

آنجل جنوری ۲۰۱۵ء 244

تھا..... اب اس مقام پر وہ اس شخص کو جھٹلا سکتی تھی اسے ہرٹ کر سکتی تھی؟

اس کے پورے وجود میں نہیں..... نہیں کی پکار مچنے لگی۔ شاید وہ اس قابل نہیں تھی کہ اللہ کے لیے کچھ کر سکتی۔ عباس جانے اسے کیا کچھ کہہ رہا تھا مگر وہ سنتی تو سمجھتی نا، اس کی دل تو رنج و غم اور آزمائش کے احساس سے دوچار تھا۔ اس سے بھی بڑا احساس خوف کا احساس تھا۔ معاً اس کے ذہن میں بے جاں ہوتے جسم میں توانائی آ گئی۔ اس کے وجود میں تحریک پیدا ہوئی۔ وہ ایک جھٹکے سے تڑپ اٹھنے کے انداز میں عباس کے بازو جھٹک کر تیزی سے پیچھے ہوئی اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا مگر وہ بولنا چاہتی تھی اس نے باوجود کہ شدت غم کے باعث آواز بہت بھاری تھی۔

”میں آپ کی غلطی فہمی دور کرنا چاہوں گی۔ اس دن یہ سب مائی چائس ہوا، میں ہوش و حواس میں ایسا کیوں کرنے لگی؟“ اس نے دانستہ عباس کو دکھ سے دوچار کیا۔ یاد آدھ جو نسبتاً بڑے غم سے معمولی تھا۔ وہ بس اب اس کے لیے اتنا ہی کر سکتی تھی۔ بات ایسی تھی کہ جس نے عباس کے چہرے کی رنگت ہی تبدیل نہیں کی ہونٹوں پر بھی چپ کی مہر لگا دی تھی۔ اس نے عباس کی صدمہ زدہ کیفیت کو دیکھا پھر اس بدگمانی کے سلسلے کو کچھ اور دراز کرنے لگی۔

”میری بات سنیں عباس، آپ کسی شدید غلط فہمی کا شکار ہیں، مجھے کبھی بھی آپ سے ایسی جنونی محبت نہیں رہی۔ جس کی بیس پر میں کوئی ایسا جنونی قدم اٹھاتی۔“ اس نے عباس سے نگاہ چار کیے بنا کہا۔ عباس اسے دیکھتا رہا۔ اس کی جگہ اس کی سحر طراز آنکھوں میں۔ وہی بے خبری، وہی اجنبیت، وہی بے نیازی و لاعلمی جو کبھی عباس نے اس کے لیے روا رکھی تھی۔

آج وقت نے پلٹا کر اس پر مسلط کر دی تھی۔ اس کی پیش رفت، پیش قدمی پھر بے کار گئی۔ اس کی قربت اس کی نگاہ عنایت نے بھی فاطمہ کو اسیر نہیں کیا کوئی فرق نہیں پڑا تھا اسے جیسے۔ عباس کچھ کہے بغیر ہونٹ بیچنے اٹھ گیا۔ باہر باکوئی میں آ کر سرگٹ سلگاتے ہوئے اس کے ذہن پہ

فاطمہ کی آواز خنجر بن کر ضرب کاری لگانے لگی۔ وہ ایک ایک لمحہ اس کی یادداشت کے پردے پر ڈولنے لگا۔ جب جب اس کی دیوانگی اس کی آنکھوں اس کے چہرے اور ہر ہر حرکت سے چھلکتی نظر آتی تھی..... مگر اب وہی فاطمہ تھی جو کچھ اور رویے کچھ اور انداز میں اس کے سامنے تھی کل صبح جب وہ کمرے میں آیا دیا اس کے پاس جانے کو رو رو کر ہلکان تھی۔

”اے لے جاؤ یہاں سے سیماء، میں تلاوت کے دوران ڈسٹرب نہیں ہونا چاہتی۔“ وہ ٹی وی آن کیے اسلامک چینل دیکھ رہی تھی۔ جہاں قرأت سکھائی جا رہی تھی فاطمہ باقاعدگی سے اس وقت قرأت سیکھتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی عباس اور بچوں سے بے رغبتی کے کئی مظاہرے تھے جو وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ چکا ہوتا تو کبھی یقین نہ کرتا وہ بچوں سے بے زار نظر آیا کرتی زیادہ وقت جائے نماز پر گزارنی یا پھر قرآن پاک کھولے اپنا سبق دہرایا کرتی۔ جو ناظم بچتا اس میں اسلامی کتب کا مطالعہ کرتی رہتی۔

عباس کے لیے سب سے تکلیف دہ امر بچوں کا نظر انداز ہونا تھا۔ جو ماں کی اس بے پروائی کے نتیجے میں ہر گزرتے دن کے ساتھ ڈسٹرب ہوتے اور بجھتے جا رہے تھے۔

”کیا میں نے تمہاری طرف رجوع کرنے میں اتنی دیر لگا دی فاطمہ کہ باقی کچھ نہیں بچا۔“ اس کے مضطرب ذہن نے تکلیف دہ سوچ کو جگہ دے کر اضطراب کو اور بڑھاوا دیا تھا۔ وہ وہیں ٹھہلتا ہوا سرگٹ کے کش لیتا رہا۔

مغرب و عشا ادا کر کے وہ واپس گھر لوٹا تو فاطمہ صوفے پر نیم دراز تھی۔ سر کے نیچے کشن اور گود میں دیا، اسامہ بیڈ پر سو رہا تھا۔ عباس کو سکون محسوس ہوا۔ کچھ کہے بغیر وہ آہستگی سے بڑھ کر اس کے سامنے آ گیا۔ فاطمہ زیر لب کچھ پڑھ رہی تھی۔ اسے محض ایک نظر دیکھا تھا۔

”اپنے کمرے میں چلو فاطمہ۔“ اس نے بے حد نرمی سے اسے مخاطب کیا تھا۔ فاطمہ نے اجنبیہ میں گھور کر اسے

آنجل جنوری ۲۰۱۵ء 245



دیکھا پھر سرکونی میں ہلانے لگی۔

”میرا کراہی ہے۔“

”یہ ہمارے بچوں کا کراہ ہے۔“ عباس کی مسکراہٹ بھی نرم تھی جو اس کے چہرے کو مزید نکھار رہی تھی۔ مزید حسین بنا کر دکھا رہی تھی مگر اب فاطمہ اسے دیکھا ہی کہاں کرتی تھی۔

”یہ بچے بھی آپ کے ہی ہیں، میں تو انہیں.....!“

”فاطمہ پلیز..... پلیز لیو دس حالانکہ مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے دیکھو میری بات سنو۔“ وہ رکا اور پھر اس کے قریب جا بیٹھا۔ پھر سرک کر اس کے لیے بھی اپنے قریب گنجائش نکالی۔

”یہاں میرے پاس آؤ۔“ فاطمہ اٹھی مگر اس کے پاس جانے کے بجائے واش روم میں بند ہو گئی۔ عباس اس کی ہر دم تیز ہوتی سسکیاں سنتا اپنے آپ کو الاؤ میں دہکتا محسوس کر رہا تھا۔

\*\*\*\*\*

اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور ہونٹوں میں دہکتا ہوا سگریٹ، وہ کسی کام سے باہر جا رہا تھا مگر پورج میں آ کر بے خیال سا کھڑا رہ گیا۔ یاد کرنے کے باوجود اسے سمجھ نہیں آ سکی اسے کہاں جانا تھا۔ گاڑی کی چابی اس کے ہاتھ میں تھی اور چہرے پر بے بسی کا تاثر چھلکتا تھا۔ فاطمہ کا رویہ اسے اتنا ہی ڈسٹرب کر چکا تھا وہ یہ سوچ کر وحشت زدہ تھا وہ کیوں بدل گئی۔ وہ یہ سوچ کر خائف ہوتا اگر وہ بھی اسے چھوڑ گئی؟ اس کی مثال اس بے سمجھ بچے کی تھی جو توجہ کا طالب بن کر ماں کے آپچل میں پناہ ڈھونڈتا ہے ایسے میں اگر اسے مہربان گود میسر نہ آئے تو بے امانی کی کیفیت وارد ہوتی ہوگی اس پر۔

وہ اتنا ہی غائب دماغ تھا جب آہنی گیٹ کے پار کسی گاڑی کا ہارن سنائی دینے لگا۔ عباس نے گردن موڑی سلور گرے ہنڈاسوک کھلے گیٹ سے اندر آتی اس سے کچھ فاصلے پر رک گئی تھی۔ عباس کی نظریں لاریب پر تھمے لگیں۔ فیروزی لباس میں اس کی گلابی رنگت کا نکھار

نگاہ کو چکا چونک رہا تھا۔ عباس نے نظر کا زاویہ بدل ڈالا۔ اس کے باوجود کہ اسے یہاں پا کر وہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”السلام علیکم! ہم لوگ فاطمہ کی عیادت کے سلسلے میں آئے ہیں۔ یہ سکندر کی والدہ ہیں میری ساس۔“ نزدیک آنے پر اس نے ہی سلسلہ کلام جوڑا تھا۔

”اندر تشریف لائیے، آپ کیسی ہیں آنٹی؟“ سلام کا جواب دینے کے بعد اس نے مشفق و بزرگ خاتون کو ہاتھ کا سہارا دینے کی غرض سے تھام لیا۔

”جیتے رہو بیٹے، بچی کی طبیعت تو ٹھیک ہے اب؟“ اماں اس غیر معمولی حسن و جمال کے حامل امیر کبیر اور ہارعب شخصیت کے مالک شاندار نوجوان کے اخلاق سے متاثر نظر آئیں بے حد محبت بھرے انداز میں گفتگو شروع کر رہی تھیں۔

”الحمد للہ بہت بہتر ہے پہلے سے، آپ ٹھیک ہیں لاریب۔“ عباس نے نرم روی سے جواب دیتے اچانک لاریب کو مخاطب کیا۔ جو خاموشی اور لیے دیے نظر آتی تھی۔ اس سوال پر چونک کر متوجہ ہوئی اور اسے دیکھتے ہوئے گہرا سانس بھر کر نگاہ کا زاویہ پھر بدل لیا۔ اب وہ اس شخص کے سامنے سے اسے دیکھنے سے اس لیے گریزاں رہا کرتی تھی کہ وہ سکندر کے حق میں بددیانتی نہیں چاہتی تھی۔

”الحمد للہ ہر لحاظ سے کرم ہے اللہ کا مجھ پر۔“ اس کا انداز کچھ جتنا ہوا محسوس کر کے عباس اندر ہی اندر وحشت کا شکار ہوا۔ جتنا بھی خود سے بھاگتا یہ احساس دامن چھوڑنے پر آمادہ ہی نہ تھا کہ بہر حال وہ اس لڑکی کا دین دار تھا مگر اس بل وہ اس کی اعلیٰ ظرفی کا بھی قائل ہوا تھا جیسی اظہار میں ممانعت نہیں تھی۔

”مجھے اچھا لگا ہے لاریب کہ آپ نے مجھے معاف کر کے کشادہ دلی کا ثبوت پیش کیا، جزاک اللہ۔“ اس کا اشارہ یہاں اس کے گھر آنے اور سابقہ باتوں کو فراموش کرنے کی جانب ہی تھا۔ وہ اتنا دم بولا تھا کہ لاریب با مشکل ہی سن سکی۔ اس نے بے اختیاری کی کیفیت میں

آنچل جنوری ۲۰۱۵ء 246

READING  
Section

عباس کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں مسنونیت تھی تشکر تھا لاریب نے ہونٹ باہم تختی سے دبائے اور جل اٹھنے والی نظروں کو جھکا لیا۔ زخموں سے ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں مگر وہ جذبہ اور حوصلے میں اب ماہر ہو چکی تھی۔

”میں اب واپس پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہتی، عباس حیدر، ورنہ اللہ گواہ ہے تم تو آج بھی وہی ہو کہ قافلے راہ بھول جائیں میں نے جانا میں نے مانا کہ جو ہونا تھا ہو چکا یہ بھی تسلیم کر لیا کہ تم میری بہت کڑی آزمائش تھے۔ جس نے میری ہستی تاراج کر کے رکھ دی۔ دوبارہ تعمیر کا عمل جاری ہے۔ ایسے میں بس نہیں چلتا تھا تمہارا سامنا نہ ہو۔ میں خوفزدہ ہوں کہ پھر سے ہار نہ جاؤں، یہ صبر اور برداشت بڑی وقت کے کام ہیں۔ ان وقتوں سے میں بے گزری کہ روح پر پڑے آبلوں سے ابھی تلک ٹیسیں اٹھتی ہیں۔“ عباس لاریب کی سوچوں سے بے خبر انہیں فاطمہ کے پاس اپنے بیڈ روم میں لے آیا تھا۔ تعارف کراتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مطمئن قسم کی مسکان تھی جبکہ لاریب ہنوز گم صم اور غائب دماغ لگتی تھی۔ جس روز صالحہ والا ہنگامہ ہوا اس روز سے ہی وہ حد سے زیادہ ذہنی طور پر تھی جیسی ایمان کی ایسی کیفیت میں ہی کال ریسیو کر کے وہ خود پر مزید خول نہیں چڑھا سکی۔

اور اسے کہہ دیا ڈرائیور بھیج دے وہ ملنے آنا چاہتی ہے۔ سکندر کو بتائے بغیر وہاں جانے کے بعد اسے اس جذباتی حرکت کا احساس ہوا تھا۔ بگڑا ہوا معاملہ مزید بگڑ سکتا تھا اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ سوچتی فرار کا فون اس کے لیے آ لیا تھا۔

”آپ کیوں اس طرح چلی گئی بھابی، آپ کو اندازہ ہے سکندر کن کراسس سے گزر رہا ہے کتنا آپ سیٹ ہے وہ۔“

”مجھے ان سے اور ان کے معاملات سے ہرگز کوئی فرض نہیں ہے۔“ وہ پھٹ پڑی تھی وہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی سوائے اس ایک بات کے۔

”دس ازناٹ فیئر بھابی، کن لوگوں کی باتوں میں آ رہی

ہیں آپ، جن کا مقصد ہی یہی ہے۔“ فرار کتنا عاجز ہو چکا تھا۔ پھر صالحہ کے حوالے سے ایک ایک بات کھول کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے آخر میں وہ بے حد عاجز ہو گیا تھا جواب میں لاریب خاموش تھی۔ فرار کو یہی خاموشی ٹینشن میں مبتلا کر رہی تھی۔

”آپ کو اگر میری باتوں کا بھی یقین نہیں تو ایکی بھابی سے پوچھ لیں، بڑی اماں اور صالحہ کے ہر کارنامے سے وہ بھی آگاہ ہیں صالحہ کی یہ کوششیں نئی نہیں ہیں نہ ہی حرکتیں۔ بھلا کون محفوظ رہا اس کے شر سے میں یا پھر شرجیل بھائی، سکندر کی جان تک کو خطرہ ہے ان لوگوں سے بھابی، یہ تو بہت معمولی واقعہ ہے جو کچھ میں ان سے ایکسپٹ کر رہا تھا۔“ اور پہلے سے مضطرب لاریب یہ سنتی مزید بے چینیوں بے قراریاں سمیٹ لائی، اب واقعی اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا کہ وہ ایمان سے اپنی سب حماقتیں کہہ ڈالتی اور جواب میں ایمان سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

”فرار بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے لاریب، مجھے حیرانی ہے تم میں اتنی سی بھی عقل نہیں ہے۔ سکندر کو ایسے حالات میں مورل سپورٹ دینے کے بجائے تم نے اسے اور بھی تنہا کر ڈالا۔“ وہ اسے ڈانٹنے پر مجبور ہوئی اور لاریب بجائے ہمدردی کے ڈانٹ سن کر روہا سی ہو گئی۔

”مجھے الہام تھوڑی ہوتے ہیں۔“ اس کے نروٹھے پن سے کہنے پر ایمان نے اسے بددلیغ گھورا۔

”نہیں الہام ہوتے تو گھر سے اس طرح منہ اٹھا کر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب تم شادی شدہ ہو لاریب، کچھ خیال رکھا کرو، فوراً واپس جاؤ، پتا نہیں کتنا ٹینس ہوگا سکندر۔“ اور لاریب گڑبڑا کر رہ گئی یعنی سارا کیس ہی اس پر الٹ گیا تھا۔ ایمان نے اسے واپس بھجوا کے دم لیا تھا۔ جس وقت وہ گھر پہنچی اماں اور اربہ ہی گھر پر تھیں۔ دونوں ہی اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھیں اور اٹھ کر اس کا پر جوش انداز میں ماتھا چوما۔

”میری بچی، شکر ہے آ گئی تو۔“

”سکندر ٹھیک ہیں؟“ اس کے سوال پر اماں نے سر د

آنچل جنوری ۲۰۱۵ء 247



آہ بھری۔

”بہت پریشان لگتا ہے عجیب عورتیں ہیں اللہ معاف کرے ایسی بے حیائی ہم نے تو دیکھی نہ سنی۔“ اماں کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھیں۔ لاریب انہیں دیکھے گئی۔

”آپ کو سکندر پر اتنا یقین ہے اماں؟“ اس کے سوال پر اماں کتنی طمانیت سے مسکرائی تھیں۔

”میری بچی اس کا لمحہ میرے سامنے گزرا ہے اس کے کردار کی تو میں قسم بھی اٹھا سکتی ہوں۔ تمہارے علاوہ اس نے تو کبھی ثانیہ کو بھی اس نظر سے نہ دیکھا تھا۔ حالانکہ ہماری خواہش یہی تھی۔“ اور لاریب ہونٹ بھینچ کر نگاہ کا زاویہ بدل گئی تھی۔

”امامہ دھی کے دیور کی گھر والی کو سنا ہے گولیاں لگ گئی ہیں۔ تمہارے سب رشتہ دار ہٹا لے مجھے گھر ہی معلوم نہ تھا۔ سکندر سے جتنی بار کہا ناں گیا تم لے چلو بیٹی مجھے وہاں جانا تو تمہارا بھی بنتا ہے۔“ لاریب ہاتھ لے کھانا کھا چکی تھی جب اماں نے آ کر اپنا مدعا بیان کیا لاریب سوچ میں پڑ گئی۔ سکندر کی اجازت کے بغیر وہ اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتی تھی۔

”آپ سکندر سے پوچھ لیں پہلے میں تب تک نماز پڑھ لوں۔“

”وہ منع تھوڑی کرے گا، خیر فون ملا کر بات کرادو میری۔“ لاریب نے ناچا ہے ہوئے بھی نمبر ملایا جو بند جا رہا تھا دو تین بار زرائی کرنے پر بھی وہی صورت حال لاریب نے آفس رابطہ قائم کیا مگر وہ آفس میں نہیں تھا۔

”آئے گا تو بتا دیں گے پتر، تو چل اس نے کیا کہنا ہے بھلا۔“ وہ نماز پڑھ چکی تو اماں کا اصرار پھر سے شروع ہوا بلکہ اتنا بڑھا کہ اسے ٹالنا مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا۔

”لاریب چائے لیں نا پلیز۔“ فاطمہ کی آواز پر وہ جو سکندر کے متوقع رد عمل کو سوچ کر خائف ہو رہی تھی بری طرح چونکی۔ فاطمہ اس کی جانب ہی متوجہ تھی۔ نگاہ چار ہونے پر مسکرائی۔ اس کے چہرے و آنکھوں میں سابقہ ملاقات کی کسی گئی کا شائبہ نہیں تھا لاریب البتہ اپنے اس

شدید رد عمل کو یاد کر کے خفت سے دوچار ہوئی۔

”شکریا آپ کا۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر مگ لے لیا۔ ”فاطمہ بہت اچھی کافی بناتی ہیں اگلی بار آپ آئیں گی تو فاطمہ خود کافی بنا کر آپ کو پلائیں گی ہے نا فاطمہ۔“ عباس کے گمبھیر لہجے میں مستقبل کے حوالے سے خوش آئند احساس تھا۔ لاریب نے دیکھا وہ فاطمہ کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ چائے لاریب کے حلق سے پھنس کر گزری، لاریب نے بے اختیار نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔

”یہ دوسری بار شادی کر کے بھی کتنا مطمئن اور گمن لگتا ہے اور میں..... مجھ سے اپنا ایک معاملہ بھی نہیں سنبھالا گیا۔ کوئی ہوگا مجھ سے بڑھ کر بھی کج فہم۔“ زیاں اس کے اندر بارش برسے لگا۔

عباس کی نظریں فاطمہ پر تھیں اور فاطمہ جب سے چہرے کا رخ دانستہ پھیرے ہوئے تھی۔ عباس کے دل کی عجیب کیفیات ہونے لگیں۔ یہ سچ تھا اب کہ اسے فاطمہ کی یہ بے رخی ہرٹ اور دکھی کرنے لگی تھی ذہن میں کبھی کی پڑھی نظم تلاطم برپا کرنے لگی۔ الٹ ہی کھیل ہوا تھا اس کے ساتھ بھی، انوکھا، غیر یقین اور عجیب تر اس کی نظریں عجیب سی یاسیت اور بے بسی لیے فاطمہ کے خدو خال میں الجھنے لگیں۔

عجیب خوگ ہے جاناں

یہ کیسا روگ ہے جاناں

بڑے بوڑھے بتاتے تھے

کئی قصے سناتے تھے

مگر ہم مانتے کب تھے

یہ سب کچھ جانتے کب تھے

کہ بہت پختہ ارادے کس طرح سے

ٹوٹ جاتے ہیں

ہمیں ادراک ہی کب تھا

ہمیں کامل بھروسہ تھا

ہمارے ساتھ کسی صورت بھی ایسا ہو نہیں سکتا

یہ دل قابو سے باہر ہو نہیں سکتا

مگر پھر یوں ہوا جاناں

نہ جانے کیوں ہوا جاناں

جگر کا خوں ہوا ایسا

تیرے بارو کی جنبش پر

تیرے قدموں کی آہٹ پر

گلابی مسکراہٹ پر

تیرے سر کے اشارے پر

عدائے دلربانہ پر

چہرے معصومانہ پر

نگاہ قاتلانہ پر

جھائے مجرمانہ پر

ادائے کافرانہ پر

گھائل ہو گئے ہم بھی

بڑے بے باک پھرتے تھے

ماں ہو گئے ہم بھی

سناوت کرنے آئے تھے

سائل ہو گئے ہم بھی

بڑے بوڑھے کی ان باتوں کے

قابل ہو گئے ہم بھی

اس کی نظریں بے خود تھیں وارفتہ تھیں اور جذبات کے شدید احساس سے دہکتی ہوئی تھیں۔ فاطمہ بنا دیکھے بھی ان کی پیش کا احساس رکھتی تھی۔ جیسی حد سے زیادہ کنفیوژ نظر آئے گی۔ اس کی بدلتی متغیر ہوتی رنگت لاریب سے ہوتی تھی۔ وہ دونوں میں بوکھلاہٹ اترنے لگی۔ عباس نے محسوس کیا اور بے ساختہ مسکرا دیا۔ یہ مسکراہٹ دل کی گہرائیوں سے سودگی کے بھرپور احساس سمیت اٹھی تھی جیسی اس کی ہنسی کا سرچڑھ کر بولتا تھا۔ فاطمہ کے بجائے لاریب کی نظر پڑی تھی اور دل جیسے دھک سے رہ گیا اس نے لمحے کے بارو میں جھے میں نگاہ کا زاویہ بدلا۔

”سکر..... سکندر صاحب تشریف لائے ہیں۔“ ملازمہ نے کرائی تھی عباس کے ساتھ ساتھ فاطمہ اور اماں کی خوش گوار حیرت میں گھر گئیں جبکہ لاریب کا دل جیسے

دھک سے رہ گیا۔

”میرے خدا..... سکندر یہاں کیوں آ گئے کیا انہیں پتا تھا کہ ہم یہاں ہیں اور اب.....؟“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے میں خود لے کر آتا ہوں انہیں۔“ عباس کے انداز میں خوشی تھی وہ مسکرا کر کہتا اٹھ کر باہر چلا گیا۔

”مجھے لگتا ہے سکندر بھائی کو پتا چل گیا تھا یہیں ہیں آپ بہت اچھی بات ہے اس بہانے میں بھی مل لوں گی ان سے آپ کی شادی پر کبھی نہیں آ سکے تھے ہم۔“ دوپٹہ اچھی طرح پھیلا کر اوڑھتی ہوئی فاطمہ اپنے مخصوص معصومیت بھرے دھیسے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ لاریب کو زبردستی کی مسکراہٹ دانستہ، ہونٹوں تک لانی پڑی، ورنہ حقیقت یہ بھی کہ وہ اندر تک خائف ہو چکی تھی۔

”یہ نیچے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین کر لیجیے کہ آپ کی مسز یہیں ہیں مگر ان کے انداز دیکھ کر ضرور یہ لگتا ہے کہ آنٹی انہیں گن پوائنٹ پر یہاں لے کر آئی ہیں۔“ عباس کا لہجہ اپنا نیت آمیز بے غلطی لیے ہوئے تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے تھے سکندر نے ایک نظر لاریب کے جھکی پلکوں والے گلابی چہرے پر ڈالی اور فاطمہ سے خیریت دریافت کرنے لگا۔

”پتر تجھے بھی آتا تھا تو بتا دیتے ہم اکیلے نہ آتے۔“ اماں کو اختلاج قلب ہونے لگا تھا۔ سکندر ہمہ سما مسکرایا۔

”کیا فرق پڑتا ہے اماں جی پریشانی تو نہیں ہونے دی نا آپ کی بہو کو ڈرائیونگ آتی ہو تو خود بخود بہت سے مسائل حل ہو جایا کرتے ہیں۔“ اس نے سرد انداز میں لاریب کو دیکھا، چہرے پر پتھر یلا جمود اور لہجہ برف میں ڈھلا ہوا تھا۔ لاریب کا رنگ واضح طور پر پھیکا پڑا۔ اس میں اس لمحے اتنی تاب بھی نہ رہی کہ سر اٹھا کر اسے ایک نگاہ دیکھ لے کچھ دیر مزید بیٹھنے کے بعد سکندر چائے کا خالی مگ رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ عباس اور فاطمہ کے روکنے کے باوجود وہ جانے کو تیار تھے۔

”بات سنیں سکندر۔“ عباس کے مخاطب کرنے پر

آنچل جنوری ۲۰۱۵ء 249

آنچل جنوری ۲۰۱۵ء 248

READING  
Section



سکندر جو کسی سوچ میں گم تھا چونک کر متوجہ ہوا عباس ان کے ہمراہ ہی کمرے سے آیا تھا انہیں الوداع کہنے کے لیے۔

”جی عباس بھائی۔“ سکندر ہر لحاظ سے اس سے متاثر نظر آ رہا تھا۔ چاہے وہ عباس کی رواداری ہو یا بہترین اخلاق و ملتسا رانداز، حالانکہ وہ مروتا بھی یہاں آنے کا سوچ کر کتنا اُپ سیٹ ہو رہا تھا اب عباس کے دوستانہ اپنائیت آمیز انداز نے اس کے ہر خدشے کو بے بنیاد کر ڈالا تھا۔

”یہ کارڈ رکھ لیں، سالانہ اجتماع سے دنیا بھر سے علماء اس میں شرکت کر کے اللہ کے دین کی تبلیغ کرتے ہیں۔ میری یہ خواہش ہے آپ اس نورانی محفل سے محروم نہ رہیں۔“ اس نے ایک کارڈ اس کی جانب بڑھایا۔ وہ اپنے مخصوص نرم خوانداز میں بات کر رہا تھا۔ سکندر نے بے اختیار کارڈ لے کر اسی وقت کھول کر دیکھا۔

”جی میں ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔“

”انشاء اللہ کہو سکندر، قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔“ نہ کہو میں کل یہ کام کرنے والا ہوں اور کہو ان شاء اللہ۔“ عباس کا لہجہ هنوز متوازن اور نرم تھا سکندر نے بے حد حیرت میں ڈوب کر اسے دیکھا وہ اسے یکسر تبدیل لگا تھا۔

”ان شاء اللہ..... ویسے آپ بہت بدل گئے ہیں۔“ سکندر کے لہجے و انداز سے ستائش چھلک رہی تھی عباس کے انداز کی عاجزی کچھ اور بھی گہری ہوئی۔

”شاید..... میں اللہ کے رنگ میں رنگنے کی کوشش و جدوجہد میں مبتلا ہوں اور یہ خواہش صرف اپنے لیے ہی نہیں بقول شاعر

حق نے کی ہیں دہری دہری خدمتیں تیرے سپرد خود تر پناہی نہیں اوروں کو تر پانا بھی ہے

خود سراپا نور بن جانے سے بھلا چلتا ہے کام تم کو اس خلقت کدے میں نور پھیلانا بھی ہے

”سکندر، اللہ نے ہمیں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے اور ہم بیٹھے ہیں وہ مقصد اس دنیا کی رنگینی میں کھو کر مقصد

کی تکمیل ضروری ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری ہے۔“ ”تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔“ ان کے ہمراہ پوریج تک آتا وہ کتنے خوب صورت الفاظ میں بول رہا تھا۔ وہ باتیں جو کم از کم لاریب نے اس کے منہ سے کبھی نہیں سنی تھیں نہ کبھی وہ اس سے سننے کی توقع رکھتی تھی۔

”آپ بالکل بدل گئے ہیں۔“ بے اختیاری کیفیت میں اس کے ہونٹوں سے یہ فقرہ پھسل گیا تھا۔ جس پر عباس چونکا پھر آہستہ سے مسکرانے لگا۔

”آپ ٹھیک کہتی ہیں لاریب، مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے جیسے میں صدیوں تک کسی بند ٹھٹھن زدہ کمرے میں قید رہ کر اب کھلی فضاؤں میں آیا ہوں۔ شاید نہیں یقیناً عم برداشت کرنے سے جسم و روح میں توانائی آ جاتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے اس نے صرف عم نہیں دیا برداشت کرنے کی ہمت سے بھی نوازا۔ اس خالق کائنات کا احسان مند ہوں کہ اس نے ٹھوکر لگانے کے بعد سنبھالا دے دیا۔“ اس کا لہجہ و انداز تشکرانہ تھا۔ سکندر ہاتھ ملا کر رخصت ہوا تب بھی عباس و ہیں گول ستون سے فیک لگا کر کھڑا وہاں ملتے پتوں کی آواز کو سنتا آسمان کی وسعتوں میں کچھ کھوجتا رہا تھا۔

”وہ عم باعث رحمت ہے جس کے عوض ہدایت نصیب ہوا اگر تمہیں کھو کر مجھے اللہ ملا ہے عریضہ تو آج مجھے بھلا بھی ختم ہوں میں نے جان لیا کہ اللہ کے ہر کام میں مصلحت اور ہماری بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے۔ میں سمجھ ہی نہ سکا تھا تمہارے جانے سے کتنے اہم کام منسوب تھے مجھے ہدایت ملتی تھی اور فاطمہ کو نور ایمان کی روشنی۔ میں نے خود کو اللہ کی رضا میں راضی کرنے کی کوشش کی ہے اللہ بھی ضرور مجھے میری خوشی سے نوازے گا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں تو وہ تمہیں مجھ سے الگ نہیں رکھے گا۔ اس دنیا میں ہمارا ساتھ اتنا ہی تھا مگر اگلی زندگی میں تمہارا مجھ سے ساتھ ان شاء اللہ دائمی ہوگا اور اللہ سے زیادہ کوئی اپنے وعدوں میں سچا نہیں۔“

\*\*\*\*\*

آنجل ✽ جنوری ✽ ۲۰۱۵ء 250

مہک میں سارے حروف دھوکے کر  
ثنائے رب جلیل لکھوں  
طویل تر سے طویل لکھوں  
جمال لکھوں جمیل لکھوں  
اسی کو اس کی دلیل لکھوں  
کہاں نہیں تھا کہاں نہیں ہے  
مجھے بتا وہ جہاں نہیں ہے  
ازل سے ہے تا ابد رہے گا  
وہ آپ اپنی سند رہے گا  
وہی تو ہے لا شریک و یکتا  
وہ سب کا خالق وہ سب کا آقا  
وہ سب کے اندر وہ سب کے باہر  
وہ سب سے اعلیٰ وہ سب سے برتر  
رحیم و رحمان صفات اس کی  
بڑی کریم ہے ذات اس کی  
چیل سرچ کرتے فاطمہ کے ہاتھ تھے حمد

باری تعالیٰ پیش کی جا رہی تھی۔ وہ پوری توجہ سے سننے لگی۔ پھر کوئی دینی پروگرام شروع ہوا تھا۔ ہوسٹ اپنے مہمانوں کا تعارف کر رہا تھا۔ اسکرین پر جو چہرے تھے ان میں ایک صورت جانی پہچانی تھی۔ سانولی رنگت میں کھلی مرنیاں صحت مند بارگش چہرا خوب روئی کے ساتھ انوکھی چمک لیے ہوئے تھا۔ اس کا ذہن الجھنے لگا شناسائی کا اس شدت سے دامن پکڑ رہا تھا۔

”جی ہارون صاحب سب سے پہلے آپ کو دعوت دی جاتی ہے حق کی بات کی۔“ اُنکر کہہ رہا تھا مخاطب وہ ہی شناسا صورت تھی۔ فاطمہ کا ذہن اس قطعی اجنبی نام میں الجھا۔

”ہارون.....؟“ جبکہ وہ گلا کھنکار کر محو کام ہوا تھا۔

”شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ رحمان وہ ذات جس نے تمہیں مٹی سے انسان بنایا..... وہ ذات جو تمہارے گناہوں کے باوجود تمہیں رزق دیتا ہے اور تم پر اپنی عنایتیں برساتا ہے۔ پھر

وہ قرآن حکیم میں ارشاد فرماتا ہے۔

”تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟“ اسی رب نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں مبعوث فرما کر اپنے بندوں پر احسان عظیم کی انتہا کر دی۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے ہر لحاظ سے رضائے الہی کے حصول کا مکمل نمونہ پیش کیا۔

بحیثیت اک قانون ساز..... بحیثیت ماہر معاشیات و اقتصادیات..... بحیثیت اک نج اک کمانڈر ان چیف..... بحیثیت اک معلم اخلاق..... بحیثیت اک معاشرہ

غرض کہ انسانی زندگی کے ہر پہلو سے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی قائدانہ صلاحیتیں اس مقام پر ہیں کہ انسانیت اپنی تکمیل کے لیے انہیں کمال کی انتہائی بلندیوں پر دیکھے گی۔ بلکہ مقام نبوت کی وسعتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسانی ترقی کے لیے دامن کھلا رکھیں گی۔ یہ لہجہ بھی ہرگز انجان نہیں تھا وہ سن چکی تھی وہ بارہا سن چکی تھی مگر کب، کیسے، یہ سمجھ نہیں آتی تھی اس کی الجھن بڑھنے لگی گرہ تھی کہ کھل کر نہ دیتی تھی یہی وجہ تھی کہ اس کی توجہ الفاظ سے ہٹ کر اس شناسائیت رکھنے والے لب و لہجے شکل و صورت میں ٹاک ٹوئیاں مار رہی تھی جبکہ وہ کہہ رہا تھا۔

”چودہ سو سال کی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی انسانی زندگی کے لیے اس سے بہتر سانچہ نہ تیار ہوا نہ ہو سکتا ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دنیا کے انقلابات نے ہزاروں کروٹیں بدلیں طبیعتوں اور مزاجوں کے پیمانے بنتے بگڑتے رہے۔ خطہ ارض مختلف رنگ و روپ مختلف تہذیب و تمدن اور مختلف انداز معاشرت میں تبدیل ہوتا رہا لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تہا زندگی سب کو اس آئی سب کی ضرورت کی تکمیل ہوئی۔“

اسے دھیان و الجھن کے ساتھ سنتی فاطمہ کے ادراک نے بلا خروہ الجھن سلجھالی۔ ذہن میں بنتے بنتے دائروں نے آخر کار اس شبیہ کو شکل کا روپ دے دیا۔ اس نے جان لیا، اسکرین پر نظر آتا بارعب نورانی چہرہ دیو کا تھا وہ دیو جو مکی

آنجل ✽ جنوری ✽ ۲۰۱۵ء 251



کا سوتیلا بیٹا تھا وہ دیو جو ہندو تھا۔ وہی دیو جو اس سے شادی کا خواہاں تھا۔ وہ دیو جو اس کی جنبش ابرو پر اپنی جان بھی لٹانے کو کمر بستہ نظر آیا کرتا تھا۔ ایک نئے انداز، ایک نئے رنگ روپ میں اس کے رو برو تھا مگر یہ کیسے ممکن تھا بھلا؟ اسے لگا اس کی بصارتوں نے اس کی سماعتوں نے دھوکہ کھایا ہے۔ وہ دیو نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر ایسا نہیں تھا اس کے سامنے ایک یکسر تبدیل حالت میں موجود وہ دیو کے علاوہ بھی کوئی اور نہ تھا۔ اسے ماننا پڑا اسے تسلیم کرنا پڑا مگر وہ گنگ ہو گئی تھی وہ سکتہ زدہ تھی۔ اس کی پتھرائی ہوئی نظروں کا مرکز اسکرین پر نظر آتا دیکھتا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے گھورتی رہی اس کی نظروں میں انڈین آری یونیفارم میں سینہ اور گردن تانے ہوئے دیو کی شبیہ ابھی بھی تازہ تھی۔

”سب کی کار سائی اور اپنی رہنمائی میں سب کو زندگی کی منزل مقصود تک پہنچا آئی۔“ فاطمہ کی آنکھوں میں اترتی دھند نے سامنے کا ہر منظر دھندلا دیا۔ وہ جانے کس جذبے کے تحت گھٹنوں میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔ دیو یعنی ہارون احمد کی بھرپور آواز ابھی بھی اس کی سماعتوں میں اتر رہی تھی وہ کتنے یقین کیسی بھرپور طمانیت سے گویا تھا۔

”وہ میرا ہی ہے جسے میں نے حالت مرض میں پکارا تو شفاء دے دی ذلت میں پکارا تو عزت سے نواز دیا۔ جہالت میں پکارا تو نور ہدایت سے منور کر کے رکھ دیا۔ راہ میں جب بھی بھٹکا صحیح راستہ دکھایا۔ غربت میں پکارا تو سخی کر دیا۔“ فاطمہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔ کیسا احساس ندامت احساس ملال جاگ اٹھا تھا ابھی کے ابھی جو اسے اندر ہی اندر کانٹے جاتا تھا اس نے پشیمانی میں گھر کر سوچا۔ ”دیو کتنے بڑے اور اعلیٰ مقام تک جا پہنچا کیا اس نے محبت نہیں کی تھی۔ یا اس نے ہجر نہیں کاٹا تھا مسلمان تو وہ بھی ہوا اور منزل پائی۔ مسلمان میں بھی ہوئی اور محض چند بے دھیان سجدوں اور ایک ایک کر پڑھے قرآن پاک کے چند لفظوں کے سوا دامن میں کچھ بھی قابل فخر نہیں ہے۔ کیسا ایمان ہے میرا کیسی تلاش سب بے کار گیا۔ مجھ میں اخلاص تھا ہی نہیں، میں آگے بڑھتی بھی تو کیسے۔“

آنچل ✽ جنوری ✽ ۲۰۱۵ء 252

READING  
Section

وہ پہلی بار اس شدت سے اس بے قراری سے اللہ کے سامنے نہیں روئی بلکہ اپنی نااہلی اور نا عملی پر رورہی تھی۔ اور رب کی بارگاہ میں تو ایک آنسو بھی خوف خدا سے بہہ جائے تو وقعت سے خالی نہیں ہوتا۔ سب سے جلدی راضی ہو جانے والی ہستی اللہ کی ہی پاک ذات ہے۔ ہماری ندامت کا ایک آنسو بھی اسے ہمارا بہت قریبی دوست بنا سکتا ہے اور جس کا سب سے قریبی دوست اللہ ہو اس کا کوئی کام کیسے رک یا بگڑ سکتا ہے۔



”چیک اپ کے لیے گئی تھیں تم ڈاکٹر کے پاس؟“ لاریب نے جس وقت دودھ کا گلاس لا کر اس کے پاس رکھا سکندر کے سوال نے اسے چونکا ڈالا۔ اس نے گردن موڑ کر سکندر کی جانب دیکھا۔ لیپ ٹاپ کے آگے بیٹھا ہونٹوں میں سلگتا سگریٹ لیے کسی مہینے بوتیک کا شلوار سوٹ پہنے جس کی آستین کہنیوں تک فولڈ تھی۔ لاریب کے لیے سکندر کا یہ روپ غیر شناسا مگر سحر انگیز تھا اتنا سحر انگیز کہ وہ کسی کے بھی سر چڑھ کر بول سکتا تھا۔ خاص طور پر صالحہ کے جی تو.....!“ اس نے ہونٹ بھیج کر سر جھٹکا بلکہ سوچ جھٹکی۔

”خاموش کیوں ہو، کچھ پوچھا ہے تم سے میں نے۔“ اس کی خاموشی کے جواب میں سکندر جھنجھلائے لگا۔ جیسی سگریٹ الیش ٹرے میں مسل کر اس نے قہر بھری نظروں کو اس پر جمایا۔ لاریب نے نگاہ کا زاویہ بدلنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہ کی۔

”گئی تھی۔“ وہ جیسے ناچار بولی اور پلٹ کر صوفے پر جا بیٹھی۔ جانتی تھی سکندر کا اگلا سوال کیا ہوگا۔ اس کی سوالیہ نظروں سے نظریں کتراتے وہ مضطرب بیٹھی رہی۔

”کیا کہا ڈاکٹر نے؟“ سکندر کا ضبط جواب دینے لگا تھا جیسے وہ دانت کچکچا کر ہی بولا تھا۔

”پازیٹیو ہے رپورٹ۔“ وہ اسی مشینی انداز میں بولی سکندر اس کے اس سپاٹ انداز پر ہونٹ بھیجنے پر مجبور ہوا تھا کچھ دیر اس کی جانب یونہی جھلستی نظروں سے تکتا رہا پھر

اپنی جگہ چھوڑ کر اس سے کچھ فاصلے پر آن ٹھہرا اور دونوں بازو سینے پر پلٹ لیے۔

”یقیناً تمہارے لیے یہ خوشی کی خبر نہیں ہوگی؟“ اس کا لہجہ بے باک سرد اور طنزیہ تھا۔

لاریب نے اپنی جگہ پر پہلو بدلا مگر کچھ بولی نہیں تھی سکندر کا طیش اور دکھ بڑھنے لگا۔

”اگر تم خوش نہیں ہو، تمہیں مجھ پر بھروسہ بھی نہیں ہے تو تمہیں پلٹ کر یہاں نہیں آنا چاہیے تھا میں نے نہیں بلوایا تھا اپنی مرضی سے اگر جا سکتی ہو تو واپس.....!“

”میں اس وجہ سے نہیں گئی تھی جو آپ سمجھ رہے ہیں۔“ سکندر کو اشتعال آمیز انداز میں بولتے پا کر لاریب نے

دلہن کے الفاظ دہرائے تھے یہی سمجھا تھا اس نے اسے بتلایا اس کے اس طرح بات زیادہ نہیں بگڑتی۔ مصلحت کا

نقصد یہی تھا مگر اس وقت سکندر پر اس کے نرم الفاظ و نرمی کا اثر دکھائی نہیں دیا تھا۔ جیسی ہونٹوں پر پھیلی زہر

آلود مسکان گہری ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر تلملاتے ہوئے انداز میں لاریب کو بازوؤں سے پکڑ کر جارحانہ انداز میں جھنجھوڑا۔

”پھر کیوں گئی تھیں تم بولو؟“ وہ چیخا تھا اس کی آنکھیں

آنکھیں سرخ ہو رہی تھی۔ لاریب کو بہانہ بنانا مشکل ثابت ہوا۔

”بابا جان سے ملنے کو.....!“

”جو اس نہیں کرو، جھوٹ مت بولو مجھ سے حقیقت تو

یہ ہے کہ تمہیں بھروسہ ہی نہیں ہے مجھ پر کبھی بھی نہیں تھا تم

پہلے ہی بے بنیاد مجھ پر شک کر چکی ہو اور اب تو.....!“

”ہاں..... کیا ہے میں نے شک یہی وجہ ہے اس لیے

مجھے دکھ ہوا تھا، بہت کرب سے گزری ہوں میں بھی بات کو لے کر.....!“ وہ چیخ پڑی۔ آنسو بے اختیار بہہ

پڑے تھے اس نے سسکی بھری اور منہ پر ہاتھ رکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے دانستہ سکندر کے چہرے سے نگاہ ہٹائی جو اس بل بے تحاشہ سرخ ہو رہا تھا۔

”میں کم از کم یہ بات ہضم نہیں کر سکتی، نہ برداشت اس

سے قبل یاد کریں میں نے آپ کی ہر نا انصافی ہر زیادتی پر خاموشی اختیار کی ہے اس لیے کہ میں واقعی ازالہ کرنا چاہتی تھی

اس زیادتی کے لیے جو کبھی آپ کے لیے تکلیف کا باعث بن چکی تھی۔“ اس کی بات کاٹ کر وہ گھٹے ہوئے انداز میں

کہہ کر پھر رونے لگی۔ وہ خود برجستہ تمام ضبط کھنکھاتی تھی۔

”کیوں برداشت نہیں کر سکتیں، جب تمہیں مجھ سے کوئی سروکار نہیں تو اس بات سے کیا غرض کہ میں کتنا با کردار

ہوں۔“ سکندر لہو رنگ اسے گھور رہا تھا وہ دکھ شگستگی اور اذیت سے چور ہو رہا تھا۔ لاریب نے تڑپ کر سہہ دیکھا۔

”کیوں غرض نہیں ہونی چاہیے محبت کبھی بھی اپنے نقصان سے بے غرض نہیں ہوا کرتی۔“ وہ شاید جذباتیت کی کسی رو میں کہہ گئی مگر سکندر سنائے کی زد پر آ گیا تھا وہ

کچھ دیر یونہی اسے دیکھتا رہا۔

”کون سی محبت؟“ اس کے سر سراتے لہجے میں کتنی تلخی

کتنی رکھائی تھی۔ جیسی لاریب بے تحاشہ اذیت کا شکار ہوئی۔ اس نے غضب ناک نظروں کو سکندر کے تلخ چہرے پر لگا کر اسے دل گداز نظروں سے دیکھا۔

”آپ کو اتنی سی بات سمجھ نہیں آتی سکندر کہ اگر مجھے آپ سے محبت نہ ہوتی تو مجھے اس سمجھوتے پر کبھی کوئی مجبور نا کر

پاتا جو میں نے آپ کے ساتھ کو قبول کر کے کیا۔ طبیعت پر جبر کبھی میرے مزاج کا حصہ نہیں رہا اور اس بات کے آپ

بھی گواہ ہیں۔“ سکندر لب بستہ رہ گیا۔ جو کچھ وہ کہہ رہی

تھی۔ وہ اتنا انوکھا اور دل گداز تھا کہ اس کا دھوکہ کبھی نہ بھی

مگر ایمان لانے کو دل کرنے لگا تھا۔ لیکن ایسا ممکن ہی کہاں

تھا۔ وہ اب خود فریبی کا ہی تو شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لاریب

نے اسے تذبذب کا شکار پایا اور اس کے کاندھے پر اپنا ہاتھ بے حد ملانست بھرے انداز میں رکھ دیا۔

”میں جانتی ہوں آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا

سکندر، میں ابھی اسی لیے اس اظہار کی قائل نہیں تھی۔ ویسے بھی میں زبانی کی بجائے عملی ثبوت دینے کو پسند کرتی ہوں مگر حالات کی تیزی سے تبدیل ہوتی صورت نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے۔“ وہ انتہائی عاجزی سے کہہ

آنچل ✽ جنوری ✽ ۲۰۱۵ء 253



رہی تھی۔ سکندر نے اس کی جانب دیکھے بغیر اس کا ہاتھ اپنے کاندھے سے جھٹک دیا۔ صاف ظاہر تھا وہ اس کی بات کا یقین نہیں کر پا رہا تھا لاریب کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ وہ ہونٹ کچلنے لگی۔

”اب بھی تمہاری کوئی مجبوری ہرگز نہیں ہے کہ تم یہ غلط بیانی کرو۔“ اس کے نرمٹھے انداز پر لاریب کی آنکھیں پھر سے پانیوں سے چھلک گئیں بے بسی کا کتنا گہرا احساس تھا اس وقت اس کے چہرے پر۔

”آپ بتائیں آپ کو یقین دلانے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے سکندر، وجہ یہی ہے کہ میں اپنی زندگی کو بدگیاہی اور شک کی نذر نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ کس درجہ مضطرب تھی سکندر نے یا چاہتے ہوئے بھی ایک نظر اس پر ڈالی، آخر کیا مجبوری تھی کہ وہ اسے ہر صورت منالینا چاہ رہی تھی۔ سکندر زچ ہونے لگا۔

”میری اجازت کے بغیر کیوں گئی تھیں تم عباس کی طرف؟“ اصل غصہ بلا آخر سامنے آ گیا تھا۔ لاریب چونکی۔

”تم جانتی ہوں میں تمہارا اس سے.....!“

”آپ نہیں چاہتے تو میں آئندہ کبھی بھی اس کے سامنے نہیں جاؤں گی، ویسے آپ کی تسلی کے لیے عرض کر دوں کہ میں ماضی کی ہر بات کو فراموش کر چکی ہوں۔

عباس حیدر اس سے وابستہ ہر بات کو بھی اور مزید کہ یہ اماں نے مجھے بے حد اصرار سے چلنے کا کہا تھا۔ یہ بھی واضح رہے کہ اماں ان تمام باتوں سے لاعلم ہیں سکندر میں انہیں منع نہیں کر سکتی تو اس کے پیش نذر صرف ان کا احترام تھا اس کے باوجود میں آپ کی اجازت کے بغیر جانا نہیں چاہتی تھی۔ آپ کا سیل آف تھا آفس میں آپ تھے نہیں۔“ ایک

کے بعد دوسری صفائی دیتی وہ اپنی بے گناہی اور سچائی ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ سکندر نے اسے پہلی بار قدرے دھیان سے دیکھا نیوی بلیو جدید تراش خراش کا لباس جس کا دوپٹہ کاندھے سے اس پل ڈھلک رہا تھا۔

گلابی مائل بے حد گوری رنگت، سحر طاری کرتے ہوئے دلکش نقوش سے سجا چہرہ ریشمی لانی پلکیں، نازک سراپا اور

لظم

یہ سال جو رخصت ہوا ہے کون جانے.....

ملن ہوا ہے کس کا کس سے کون کس سے جدا ہوا ہے

گئے دنوں میں.....

ٹوٹا ہے دل کس کا کس سے حق محبت ادا ہوا ہے

یہ تمنا تھی ہماری کہ.....

کسی حسین لمحے میں کسی انمول گھڑی میں

تم ہمیں، ہم تمہیں اپنا لیتے مگر.....

اسی حسرت میں دسمبر بھی بھیگی آنکھوں کے ساتھ الوداع ہوا ہے

عائشہ پرویز..... کراچی

نخلیں بال حسن و کشش کے جیسے جھرنے پھوٹتے تھے اس کے وجود سے وہ آج بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی۔

بلکہ سکندر نے جانا وہ آج بھی اس کے لیے اتنی ہی اہم اسی قدر خاص تھی بلکہ خود کو اس کے لیے مخلص ظاہر کرتی۔

اس کی محبت کا دم بھرتی وہ اسے پہلے سے ہمیشہ سے کہیں بڑھ کر کشش اور چارمنگ لگی۔

”شک بھی وہیں ہوتا ہے سکندر جہاں محبت ہوتی ہے۔ کم ظرفی اور تنگ دلی کا جذبہ بھی وہیں جنم لیتا ہے

جہاں محبت قائم ہو اور یہ کہاں لکھا ہے کہ اگر کوئی پہلے کسی کو کسی حوالے سے ناپسند کرے تو ساری عمر پسند نہیں کر سکتا۔ اسے آپ میری نادانی بھی تو سمجھ سکتے ہیں نا

سکندر، یاد تو کریں اب نہ سہی کبھی تو آپ کو مجھ سے محبت تھی۔ اس کے صدقے تھوڑی سی گنجائش نکال لیں

میرے لیے؟“ لاریب وضاحتوں اور صفائیوں میں اس حد تک مگن ہوئی کہ سکندر کی بدلتی نظروں کو محسوس نہ کر سکی۔

جن کا شاکی پن اور تلخی دم توڑ کر خوشگوار حیرت کے بعد شوخ رنگ اتر رہے تھے۔ اسے قولاً و فعلاً بدل جانے والی لاریب کہلاتا خریقین کرنا پڑا تھا۔

”تم ٹھیک کہتی ہو یہ ہرگز ضروری نہیں کہ کوئی ہمیشہ ایک جیسے جذبے رکھے ایک جیسی سوچیں سوچ حالات و واقعات کی تبدیلی فطری طور پر انسان پر اثر انداز ہوتی ہے

مجھ پر ہوئی تم پر بھی ہو سکتی ہے تم میری ساری بدتمیزی اور زیادتی اس لیے برداشت کرتی رہیں میں سمجھتا رہا تم خود کو سزا دے رہی ہو۔“ سکندر نے دھیمے لہجے میں کہتے اس کا

رخسار سہلایا۔ لاریب جو اتنی جلدی شاید اس کے مان جانے ہموار ہونے کی توقع نہیں رکھتی تھی بری طرح چونکی

وہ یوں اسے تکنے لگی جیسے تاثرات سے اندازہ کرنا چاہتی ہو وہ کس موڈ میں بات کر رہا ہے۔

”تم بہت ہرٹ کر چکی تھیں لاریب، بہت زیادہ میں کہاں تک کس حد تک ضبط سنبھالنے رکھتا یہ پیمانہ لبریز ہوا

وہ جتنی طور پر سہی مگر وہ محبت اس غم و غصے اور انتقامی کیفیت کی نذر ہو گئی۔ جو میں تم سے کرتا تھا۔“ وہ جیسے کسی عظیم نقصان

سے دوچار کہہ رہا تھا۔ لاریب نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے انداز میں تسلی بھی تھی عقیدت و محبت بھی۔

”میں سمجھتی ہوں مجھے ہرگز بھی آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“ اس کے انداز میں رساں تھانری تھی چاؤ تھا۔

سکندر اسے تکتا رہا پھر سرکونی میں جنبش دی۔

”مگر مجھے تم سے شکایت ضرور ہے لاریب تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں تم نے چپ چاپ میرے ستم کیوں سہے،

میں محبت کی بلندی سے چپٹی کی جانب عازم سفر ہوا تو خود کو جی بھولے ہوئے تھا۔ اب تو جیسے خود سے نظریں چار نہیں کر پاتا ہوں محبت یہ تھوڑی ہوتی ہے لاریب۔“ وہ ہنوز

نجیدہ و ملول تھا لاریب رواداری سے مسکرائی۔

”وہ سب وقت و حالات کے عین مطابق بالکل درست تھا کبھی میں بھی بہت سنا چکی تھی نا آپ کو۔“

”ہاں جیسی بہت غصہ تھا تم پر مجھے۔“

”مجھے معاف کر دیں۔“ لاریب کی آنکھیں جانے کیا

کچھ یاد کر کے بھڑائییں سکندر پر قدرتی سا اثر ہوا تھا۔

”اس کا بہتر حل یہی ہے کہ ہم پلٹ کر نہ دیکھیں میں خود بھی ماضی میں ہونے والی سب دکھ دینے والی باتیں

بھولنا چاہتی ہوں۔“ اس نے سیدھی لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ملکوتی چہرے پر ایسا ہی سکون اتر آیا تھا

جیسے صدیوں کی مسافت طے کرنے والے مسافر کو منزل پر پہنچ کر نصیب ہوا کرتا ہے۔ سکندر کی اسے تسکینی آنکھیں لو

دینے لگیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے جوڑے سے کھل کر نکھر جانے والے بال سیٹے۔

”خیر ماضی میں ہونے والی ساری باتیں ہی تو دکھی نہیں تھی تھوڑے بہت خوشگوار لمحات بھی تھے جب مختلف

کیفیات کے زیر اثر تم نے اپنے وٹھلیں وجود سے میری ویران و بے رونق زندگی میں رنگ بھرے تھے، بتاؤں کب

کب؟“ اس کا انداز شوخ و شنگ تھا تو لہجہ پھر پور مردانگی کے تاثر سے بھرا ہوا۔ لاریب پہلے تو سمجھی نہیں جب کبھی تو

کانوں کی لوؤں تک سرخ پڑ گئی۔

”جب وقاص ہمارا پیچھا کر رہا تھا اور ہم کنویں میں گر گئے تھے اس کے علاوہ جب بھی تم مجھے غصہ دلانی تھیں

ایک بار سانپ کا بھی وہم ستانے لگا تھا تمہیں اور اس وقت تو کمال ہو گیا تھا جب ثانیہ کو جیلنس کرنے کی خاطر

تم.....!“ وہ پٹری سے اترتا تو لاریب نے شرماتے ہوئے بے اختیار اس کے ہونٹوں پر اپنا نازک ہاتھ رکھ کر گویا اس کی

بے باکی کو لگام ڈالنی چاہی۔

”مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا آپ اتنے بدتمیز بھی ہیں اس وقت تو بڑے غصیلے موڈ میں ہوا کرتے تھے جناب۔“

حیا آمیز لہجہ سے کہتی وہ جھنجھلا سی گئی کہ اس کی نظریں ہی ایسی تھیں کہ وہ ڈھنگ سے اسے گھور بھی نہ سکتی تھی۔ سکندر

نے پہلے سر آدھ بھری پھر شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

”یعنی غصے کی وجہ بھی محترمہ کو سمجھ نہیں آ سکتی تھی۔ وہ بھی اب میں بتاؤں۔“ لاریب نے سر کھجایا اور شرارتی مسکان

سمیت اسے دیکھا۔

”بتائیں نا پلیز، ریشمی مجھے اب تک سمجھ نہیں آ سکی۔“



عجب بے چارگی تھی اس کے انداز میں سکندر نے ٹھنڈا اور طویل سانس بھرا۔

”محبت کرنا تھا تم سے ترستا تھا تمہارے لیے ظالم لڑکی تم میری کیفیات کو سمجھے جانے بنا میرے جذبات سے کھیلتی رہیں۔ خود ہی حد بندیاں لگاتی تھیں خود ہی بغاوت پر اکساتی تھیں۔ یعنی حد گئی تب بھی نیازی کی بھی اور بے رحمی کی بھی اطلاع عرض کر دوں محترمہ مجھے مکمل لاریب چاہیے تھی۔ وہ جو مجھ سے محبت کرتی ہو وہ جو مجھے قبول کرتی ہو۔“

”تو پھر مبارک ہو، اللہ نے آپ کے صبر کا بہترین پھل دیا۔ آپ کو حسب خواہش ملا ہے۔“ لاریب مسکرائی ہوئی کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ یہ سکندر نے اب جانا تھا۔

”آپ مجھ سے اب کبھی بدگمان نہ ہوئے گا سکندر، مجھے واقعی آپ سے محبت ہے۔“ لاریب کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ سکندر کی مسکان کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ لاریب کے چہرے پر قوس و قزح بکھرنے لگی۔

”مجھے تسلیم ہے، آپ کے ساتھ میرا سابقہ رویہ میری زیادتی ہے اور بدتمیزی کی انتہا بھی۔“

”نہیں لاریب، وہ تمہارا خالص پن تھا مجھے اس سے بھی محبت تھی۔ جیسی تو کبھی تمہارے ساتھ زبردستی کر کے تمہیں توڑا نہیں بکھیرا نہیں تم اتنی ہی عزیز تھیں مجھے۔“ سکندر کا لہجہ گنہگار ہوئے لگا اس پل وہ کتنا سنجیدہ تھا۔

”مجھے تو سمجھ نہیں آتی آپ کی اس درویشانہ محبت کی۔“

اس نے ناز سے ناک چڑھائی۔

”پھر سمجھ آ گئی جب رنگ ڈھنگ بدلا؟“ سکندر کا انداز معنی خیز ہوا اور لاریب کا چہرہ حیا آلود ہو گیا۔

”مجھے پتا چل گیا تھا اگر مقصد اب سیدھی طرح حاصل نہ ہوا تو خود کو تھوڑا خراب کر لوں۔“ وہ چھیڑنے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ لاریب اسی طرح سنجیدہ اسے دیکھے گئی تو سکندر کو مزید شرارت سوچھی۔

”ویسے اب سوچتا ہوں خواہ مخواہ ناظم برباد کیا۔ یہ دیدہ دلیری مجھے پہلے دکھانا چاہیے تھی کیا کر لیتی تم بھلا؟“

”یہی غلطی ہوتی پھر آپ کی۔ میں تب شدت پسند تھی

سکندر انتہائی سوچ کی حامل ایسی لڑکی جسے کسی بھی غلط ترین انجام کی پروا نہیں تھی۔ ایسے میں یقیناً خود کو کوئی شدید نقصان پہنچانی ابھی کہا نا آپ نے وہی میرا خالص پن تھا۔ تب پاگل بھی میں۔“

”یہ پاگل بن کبھی میرے لیے بھی دکھاؤ گی؟“ سکندر نے مصنوعی آہ بھری۔ لاریب کی مسکراہٹ یکلخت غائب ہوئی تھی۔

”آپ کے لیے ہی مخصوص ہے اب یاد کریں کتنے تو ہیں آمیز انداز میں بار بار مجھے بہت کچھ باور کرا چکے ہیں آپ مگر میں حرف شکایت زبان پر نہیں لائی۔ سکندر میرے نزدیک یہی محبت ہے۔ محبوب کو اس کی سب خویوں خامیوں سمیت قبول کرنا۔ وہ کوئی الگ تھوڑی ہوتا ہے۔ اپنی خامی بھلا کون عیاں کرنا پسند کرتا ہے۔ اپنے عیب تو ہر کوئی ڈھکتا ہے۔“ اس کی آنکھیں آن کی آن میں بھر کر چھلک گئیں۔

”اس لیے تو سوری کر رہا ہوں غصے میں جنونی ہوتے میں بہت تو بین کر گیا تمہاری۔“ اس کا لہجہ پر مال تھا۔ لاریب نے ہونٹ بھیج کر خود کو سنبھالا اور مسکرائے گی۔

”آپ صحیح کہتے ہیں ہمیں پرانی باتوں کو یاد نہیں کرنا چاہیے۔ دیانت داری سے دیکھا جائے تو زیادہ غلطی میری ہی تھی۔“

”لیکن پھر بھی مجھے.....!“

”جانے دیں سکندر بس آج سے ہمارے درمیان ان شاء اللہ اچھی باتیں ہی ہوں گی۔“ اس پل وہ شبنم میں نہائے گلاب کے پھول کی مانند شکفتہ اور کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ سکندر اسے دیکھتا رہا پھر مسکرا دیا۔ زندگی کا یہ رنگ خوب صورت تھا انمول تھا آسودہ تھا ماحول میں محبت رقص کرتی تھی۔ فتح کا احساس غالب تھا۔

(باتی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)







READING  
Section



خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ  
خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ  
اگر چہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں  
مجھے ہے حکم ہے ازاں لا الہ الا اللہ

ہو جاؤں اس فیصلے کو لیتے ہوئے میرے اندر کوئی خلش کوئی  
کھٹک نہیں ہے۔ میں مطمئن ہوں میں جانتی ہوں اللہ  
نے مجھے اس سفر میں اس سے کئی گنا بڑھ کر عطا فرمایا ہے  
جتنا میں نے چاہا اور خواہش کی تھی۔

آنجل میں طویل تحریر کی صورت میں چھپنے کی خواہش  
بھی اللہ نے پوری کر دی ہے احسان ہے مالک کا میرا  
آخری ناول ”ہم مصطفیٰ ﷺ ہیں“ تصوف کے  
موضوع پر ہوگا۔ میری تحریر کتابوں کی صورت آپ کو  
میری کمی محسوس نہیں ہونے دے گی مجھے یقین ہے  
میں ان لوگوں کی مشکور ہوں جنہوں نے میری تحریروں کو  
بڑھا اور پسند کیا ان کی اور زیادہ مشکور ہوں جنہوں نے  
مجھے محض برداشت کیا۔

اپنی تحریروں کے ذریعے میرا شعوری مقصد اصلاح رہا  
ہے اگر اس کوشش میں ایک فیصد بھی کامیابی حاصل ہوئی تو  
قلم اٹھانے کا مقصد پورا ہو گیا ہے میری آپ سے انتہا  
ہے آپ فاطمہ عباس، وقاص یا ابراہیم نہیں ہیں آپ  
لا رہے ہیں مجھے نہیں جس مگر پھر بھی خود کو سنوارنا ضروری ہے کہ  
ہم شوکر کھا کر سمجھیں؟ ہمیں ویسے بھی اپنی اصلاح کا بیڑا  
اٹھالینا چاہیے۔ یاد رکھیے تبلیغ بعد کا مرحلہ ہے پہلے اپنی  
اصلاح ضروری ہے کہ قرآن حکیم میں بھی یہ ارشاد ہائی ہوتا  
ہے جس کا مفہوم ہے۔

”اور تم دوسروں کو جو حکم دیتے ہو خود نہیں کرتے ہو۔“

میری آپ سے گزارش ہے کہ زندگی میں ایک بار  
قرآن پاک کو ترجمہ سے ضرور پڑھیں۔ جہاں رہیں خوش

ذیہ قارئین السلام علیکم!

دعا ہے اللہ ہمیشہ آپ پر مہربان ہوئے۔ آمین۔

اللہ کے فضل و کرم سے میں رب العزت کی مشکور ہوں  
عاجز ہوں کہ جس نے اس ناول کے ذریعے آنجل میں  
مسلسل پچیس ماہ تک مجھے آپ کے ہمراہ رکھا آپ کی  
راے میرے لیے بہت قیمتی اور خاص رہی ہے۔ وہ بھی جو  
آنجل کے خطوط کے ذریعے مجھ تک پہنچی اور جو میری محترم  
ریڈرز بہنوں نے ساتھ ساتھ فون کے ذریعے مجھ تک  
پہنچائی۔ ”مجھے ہے حکم ازاں“ آپ پڑھ چکے تھے تمہاری رائے  
اگلے ماہ بھی مجھ تک پہنچ جائے گی اللہ نے چاہا تو۔ آج  
آپ سے مخاطب ہونے کا مقصد آپ کا آنجل سٹیشن لکھنا  
ہے آپ کی اس ناول کی پسندیدگی پر آنجل اسٹیشن خاص  
طور پر قیصر آئی اور طاہر بھائی کو بھی جن کا تعاون رہا کہ میں  
اپنی اس تحریر کو مزید نکھاسنے کے لیے اسے دوسری مرتبہ  
لکھنے کی خواہش پوری کر سکی۔

آج اس طرح آپ سے مخاطب ہونے کا ایک اور  
مقصد بھی ہے قارئین کرام اور وہ یہ کہ میں ممکن ہے اس  
طرح میں آپ سے آخری مرتبہ مخاطب ہوں تو وجہ میرے  
کیریئر کا اختتام ہے۔ 20 اپریل 2013 کو جب میں یہ  
سطور لکھ رہی ہوں تو میرے پاس سلسلے وار صرف ایک ناول  
بچا ہے۔ دو سال بعد آپ اس خط کو پڑھ رہے ہوں گے تو  
میری شدید خواہش ہے اللہ اس آخری ناول کے لیے بھی  
کوئی بہت اچھا اور بہترین سبب پیدا فرماوے سادہ یوں میں  
پوری خوش اسلوبی کے ساتھ اس کام سے کنارہ کش

READING  
Section



رہیں میرے والدین بھائی بہنوں کے ساتھ ملک کی سلامتی کے لیے دعا ضرور کیجیے، والسلام

امہ مریم



### (گزشتہ قسط کا خلاصہ)

عباس پر چلائی جانے والی گولیوں کا نشانہ فاطمہ بنتی ہے جبکہ اسے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا دیکھ کر عباس اپنے لہسان کو بیٹھتا ہے۔ فاطمہ کو اپنی زندگی سے دور ہوتے دیکھ کر عباس کو شدید زیاں کا احساس ہوتا ہے جب ہی اس کا دل فاطمہ کی محبت میں چھو اس کی زندگی کے لیے دھڑکنا شروع ہوتا ہے۔ فاطمہ ہوش میں آنے کے بعد عباس نیا وارفتگیوں کو بالکل نظر انداز کر دیتی ہے۔ دوسری طرف عباس اپنی بوکھلاہٹ میں ابراہیم احمد کے سامنے غریبہ کی بات کر بیٹھتا ہے جبکہ ابراہیم احمد اس معاملے کوئی الحاح ملتوی کر دیتا ہے۔ دوسری طرف سکندر کا تلخ رویہ لاریب کو گھائل کیے دیتا ہے۔ اسے لاریب کی تمام باتوں کے پیچھے کوئی اور مقصد نظر آتا ہے جبکہ لاریب کے منہ سے اپنے لیے محبت کا سن کر سکندر ہمزک اختیار کرتا ہے۔ جسدان دونوں کے درمیان ہونے والی کشمکش اور سکندر کا جاہلانہ انداز فرائز کے علم میں آ جاتا ہے جب ہی وہ سکندر کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ سکندر فرائز کی باتوں پر عمل کرنے کا عزم کرتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہی صالحہ اپنے مکر و فریب کے حل میں سکندر کو الجھا دیتی ہے جبکہ وہ اس انتہائی نل پر شدید رد عمل کا مظاہرہ کرتے صالحہ پر ہاتھ اٹھاتا ہے گھر والے ہائی لمان اور صالحہ کی نفرت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ جبکہ لاریب کو بدگمان کرنے میں ہائی لمان یہ کرنے میں کامیاب رہتی ہیں۔ لاریب اس صورت حال میں گھر چھوڑ کر ایمان کے پاس چلی آتی ہے اور دوسری طرف ایمان کی زبانی سکندر کی حمایت کا سن کر مجبوراً اسے واپس آنا پڑتا ہے جبکہ لاریب کی بدگمانی سکندر کو مزید شکست سے دوچار کر دیتی ہے۔ فاطمہ کی طبیعت رفتہ رفتہ ٹھیک ہونے لگتی ہے لیکن اب وہ کسی طور بندوں کی محبت

میں اپنے رب کی محبت کو بھلا دیتا نہیں چاہتی یہی وجہ ہے کہ وہ عباس کو یکسر نظر انداز کرتی ہے دوسری طرف عباس اپنے گزشتہ رویوں کی فاطمہ سے معافی مانگتے نئی زندگی شروع کرتا ہے۔ عباس عریض کی موت میں خدا کی مصلحت سمجھتے خدا کی رضا میں راضی ہو جاتا ہے۔ لاریب لمان کے کہنے پر فاطمہ کی عبادت کے لیے آتی ہے جب ہی اس کا سامنا عباس سے ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف سکندر بھی عباس کی طرف متوجہ ہوتا ہے جبکہ سکندر کو وہاں دیکھ کر لاریب شدید خوف و خدشات میں گھر جاتی ہے۔ عباس کا یکسر بدلا ہوا انداز سکندر کو بہت متاثر کرتا ہے۔ دیو کوئی وی اسکرین پر عالم دین کی حیثیت سے دھندلے دیکھ کر فاطمہ شدید حیرت کا شکار ہوتی ہے۔ اس کی نئی شناخت ہارون کے نام سے سامنے آتی ہے جبکہ فاطمہ خوشگوار حیرت میں مبتلا رہتی ہے۔ لاریب کے منہ سے خوش خبری سن کر سکندر ایک مرتبہ پھر اس سے بدگمان ہونے لگتا ہے اس کو لاریب کا اپنی ذات پر شک کرنا بالکل پسند نہیں آتا جبکہ لاریب اپنے شک کو محبت سے تعبیر کرتے اپنے دل کا تمام احوال سکندر کو بتا دیتی ہے۔ عباس کے پاں جانے پر بھی وہ صفا کی دیتے لمان کو لے جانے کا ذکر کرتی ہے جبکہ لاریب کے منہ سے تمام حقیقت جان کر سکندر کی دل کی کیفیت بھی بدلنے لگتی ہے جب ہی وہ سابقہ تمام رویوں کو بھلا کر ایک نئی زندگی کے آغاز کا فیصلہ کرتے ہیں اپنے میں لاریب پوری سچائی سچائے سابقہ رویوں کی معافی مانگ لیتی ہے جبکہ لاریب کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کے رنگ دیکھ کر سکندر بھی لاریب کی محبت پر ایمان لے لےتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)



”اللہ تبارک و تعالیٰ ”یا ایہا الذین امنوا“ کہہ کر جن بندوں کو مخاطب فرما رہا ہے آخر ان میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ رب کا نعت انہیں برہم راست مخاطب فرما رہا ہے۔ جبکہ وہ اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے پیغمبر، نبی، رسول معبود کرتا رہا ہے اہل ایمان کو مخاطب کرنے کا مطلب



بندوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کی عبادت و اطاعت کے لیے اسلام کے سوا کوئی اور طریقہ عبادت اختیار نہ کریں۔

”اسی اللہ نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔ پہلے سے بھی اور اس قرآن میں بھی سورۃ الحج 78 اس آیت مبارکہ کے مخاطب وہ تمام افراد ہیں جو آغاز تاریخ انسانی سے توحید و آخرت و رسالت اور کتب الہی کو ماننے والے رہے ہیں۔

دعوت حق کو ماننے والی ملت پہلے بھی نوحی، ابراہیمی، موسوی، یا مسیحی نہیں کہلاتی تھی بلکہ ان کا نام بھی مسلم یعنی اللہ کے تابع و فرمان ہی تھا اور آج بھی مسلم اللہ کے تابع و فرمان اور مسلمان کہلاتے ہیں۔ ہر مذہب نے حسب ہدایت الہی سلامتی کی راہ کا تسنن کرنے کی کوشش کی ہے اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد پر اس کوشش کی تکمیل ہو گئی۔ چنانچہ قرآن حکیم میں رب کائنات نے یوں ارشاد فرمایا۔

”آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور تمہارے لیے دین اسلام کو میں نے پسند کیا۔“ سورۃ المائدہ

اس آیت مبارکہ میں تمام مسلمانوں اور تمام اہل ایمان کو یہ اطلاع دی جا رہی ہے کہ نبی آخری الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پہنچایا ہوا دین یعنی اسلام آج مکمل ہو گیا۔ اس اعلان الہی کا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ دین جس کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی جو مختلف اقوام اور مختلف ادوار سے ہوتا ہوا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہوا اور اپنی تکمیل کو جا پہنچا۔

دین کو مکمل کر دینے سے مراد اس نظام الہی کی تکمیل ہے جس سے انسانوں میں اللہ کی بندگی اور اس عارضی جائے قیام یعنی دنیا میں اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک مکمل نظام فکر، ایک مکمل نظام حیات سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ”ابراہیم نے کچھ توقف کیا تھا اور ہاتھ اٹھا کر اس نوجوان کو اشارے سے منع کیا جو

ہوا ایمان قہار وہ جو ہر ہے جس نے بندے کو اس کا اہل یا کہ اللہ جبارک و تعالیٰ بڑا راست مخاطب ہو کر اس کی رہنمائی فرما رہا ہے اس لیے ضروری ہے کہ سب پہلے یہ سمجھا جائے کہ ”ایمان“ کیا ہے اور ایمان کے لغوی معنی ماننے، مطمئن کرنا، تسلیم کرنے کے ہیں۔

امام رافضی صہبانی کے نزدیک اس کا مطلب زبان سے اقرار کرنا، دل سے تسلیم کرنا اور اپنے عمل سے ظاہر کرنا ہے ایمانی اصلاح میں ایمان کفر کی ضد ہے۔ قرآن حکیم کی آیات کے مطابق اسلام اور ایمان وہ الگ الگ مفہوم ہیں قرآن حکیم سے ایمان کی تفصیل معلوم کرنے سے پہلے ہم اسلام سے رجوع کریں گے کیونکہ ایمان لانے کے لیے دین اسلام کا قبول کرنا ضروری ہے۔“

ابراہیم احمد خطاب کردے تھے ہزاروں کے مجمع پر اس وقت سکوت کا ایسا عالم طاری تھا کہ گویا سانس لینے کی آواز بھی سنائی دے سکے عہاس کے داہنی جانب وقاص حید جبکہ بائیں طرف سکند حیات موجود تھا۔ سکند کے ساتھ شرجیل پھر فرزند نظر آ رہا تھا۔ یہ ایسا پلیٹ فارم تھا جہاں دلوں کے بغض و دہلا کر کوئی آگاہی دین کے شوق میں کشاں کشاں چلا آ رہا تھا۔ ہر کسی کی توجہ کا مرکز اُس کے پیچھے نظر آتا ابراہیم کا چہرہ تھا جس کے آگے بے شمار مانیک تھے۔

”قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر بنی نوع انسان کے مذہب کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ شروع سے انسانوں کا مذہب ”اسلام“ ہی رہا ہے۔ جیسا کہ سورۃ آل عمران میں حکم ہوا ہے۔

”بے شک اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔“

یعنی اللہ کے نزدیک انسان کے لیے صرف ایک ہی نظام زندگی اور ایک ہی طریقہ حیات صحیح و درست ہے وہ یہ کہ انسان اللہ تعالیٰ کو اپنا مالک و معبود تسلیم کرے اور اس کی ہی بندگی و غلامی اختیار کرے اس کی بندگی و اطاعت میں اپنی طرف سے کوئی اختراع و ایجاد نہ کرے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے جو ہدایت بھیجی ہے اس پر کسی بیسی کے بغیر اس طرح عمل کرنا اس کا نام اسلام ہے اور

READING  
Section



جمع سے اٹھ کر اپنے سیل فون پر اس کی مودی بنانے میں مصروف تھا۔

”ہمارے مذہب میں تصویر بنانے، بنوانے اور چھاپنے کی سختی سے ممانعت ہے۔“ اس نے نرمی و رومان سے آگاہ کیا تو ترجمانِ حقّت زوہ نظر آیا جیسی مودی کمرہ آف کیا۔ سیل فون جیب میں رکھتا اپنی جگہ پر واپس جا بیٹھا مگر فرارِ نمک سا گیا تھا اس کے چہرے پر واضح تغیر نظر آنے لگا۔ اسے یاد آیا وہ کیسے مودیز میں کام کرنے کے

جنون میں مبتلا تھا کتنا اچھا ہوا اللہ نے اسے اس گمراہی کے راستے پر چلنے کی نسیب کیا ضروری تھا وہ بھی دیگر لوگوں کی طرح ٹھوکر کھا کر زخم خوردہ ہو کر اللہ کی جانب راغب ہوتا ہدایت اگر بغیر کسی نقصان کے مل جائے تو اور بھی غنیمت ہے اس نے تشکر سے سوچا اور آسودگی سے مسکراتے لگا۔

”عباس بھائی کہتے ہیں اللہ نے اگر ہمیں ہدایت سے نوازا ہو تو پھر وہ خود ہی اپنے بندوں کے فیصلوں کا نگہبان بن جایا کرتا ہے۔ برائی سے روک دیتا۔ اچھائی کی طرف راغب کرنا اسی کا کام بن جاتا ہے اور یہ ایک عظیم خوش بخشی ہے کسی بھی انسان کی۔“ اس کے امداد طمانیت کا احساس مزید گہرا ہونے لگا اس نے پھر سے اپنی توجہ ایم اے ایم احمد کی جانب مبذول کی جو واعظ کا سلسلہ وہیں سے جوڑ چکا تھا جہاں چھوڑا تھا۔

”اب یہیں یہ سمجھنا ہے کہ دین یا مذہب اور اسلام ہے کیا مذہب کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمانِ کامل اور اس کی عبادتِ خالص ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی سورۃ فاتحہ میں ہم سے کہلوایا جا رہا ہے۔

”ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔“

تمام مذاہب میں عبادت کا جو بھی طریقہ رائج ہو ان میں مخاطب اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہی کیا جاتا ہے۔ دراصل سب مذاہب کی اصل اساس اللہ تعالیٰ کی ہی ذات واحد ہے۔ اس میں رد و بدل بعد کی بات ہے۔ اس میں حذف و اضافہ بعد میں لوگوں نے حسبِ مصلحت

کر کے مذہب کی شکل ہی بدل ڈالی۔ حضرت عثمان سے ایک حدیث مروی ہے کہ

”جو شخص اس حال میں مرا کہ اسے اس بات کا یقین تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ جنت میں داخل ہو گیا۔“

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی عبادت کرنا تو درکنار کسی اور کو اللہ کی صفات میں شریک کرنے کو خود ”قرآن مجید“ نے ظلم عظیم قرار دیا ہے شرک کو اس لیے ظلم کہا گیا ہے کیونکہ اس طرح انسان خود پر ظلم کر کے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب بن جاتا ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نائب اور خلیفہ کے مرتبے پر فائز کیا ہے۔ یہ اس کی اپنے بندوں سے بے پناہ محبت و شفقت کی دلیل ہے۔ اگر ہم احکامِ الہی سے کسی بھی طرح کی بغاوت یا انحراف کرتے ہیں تو خود سے اپنے آقا و مالک اپنے خالق سے بغاوت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہی ظلم عظیم ہے۔ قرآن حکیم میں تمام جن و انس کی تخلیق کی غرض و غایت اور ان کا مقصد حیاتِ اللہ کی عبادت و اطاعت ہی بتلایا گیا ہے۔

ایک مومن جب اسلام کی اس دعوت حق کو قبول کرتا ہے تو وہ ایک ایسی دنیا میں قدم رکھتا ہے جو اس کی دنیا ہے۔ جو سلامتی و فلاح کی دنیا ہے۔ جس میں کوئی حیرانی و پریشانی نہیں ہے۔ جس میں کوئی گمراہی و فساد نہیں ہے۔ یہاں ہر ذی روح کی تمام موجودات کے ساتھ ہم آہنگی ہے ایمان ایک ایسا عالم ہے جہاں نفسِ انسانی کے خفیہ ترین اسود و پوشیدہ ترین گوشے بھی اطمینان و سکون پاتے ہیں اور اجتماعی زندگی بھی پر سکون و مطمئن ہوتی ہے۔ سلامتی کے جس نظام میں مومن داخل ہوتا ہے اس سے بندے اور اس کے رب کے مابین تعلق کا صحیح تصور ملتا ہے۔ یہ نصابِ مالک و بندے اور اس کائنات کے ساتھ اس کے تعلق اور ہر چیز کا حکمت کے ساتھ پورا ہونا ثابت کرتا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کائناتی نظام کو ایسا بنایا ہے کہ یہ سب کا سب اور اس کی ہر ہر چیز انسان کی فلاح و بہتری



جوابی لہجہ لہانت میز کی تکی سے بھر پڑ تھا۔ عباس جو کچھ  
فاصلے پر کسی سے بات چیت میں مصروف تھا سکندر کی بلند  
بے لفاظی واز پر چونک کر متوجہ ہو گیا۔

”اوں ہوں سکندر حیات، بری بات ہے بہت۔“ اس  
نے نرمی سے ٹوکا اور دونوں کے قریب آ گیا۔ پھر اپنا ہاتھ  
نرمی اور سان آ میز انداز میں سکندر کے شانے پر رکھا۔

”ابھی ہمیں کس بات کی تاکید کی جا رہی تھی۔ بات  
سننے میں کیا حرج ہے بھلا؟“ اس کا انداز دباؤ ڈالتا ہوا تھا نہ  
ہی مجبور کرنے والی اور برتری جتانے والا اس کے برعکس  
اس میں عجیب نرمی و درسان کے ساتھ ساتھ انوکھا وقار تھا جو  
قابل کرنے میں اپنا ثانی نہ دیتا ہو۔ سکندر انکار کی پوزیشن  
میں نہیں رہا وقاص نے تفکرانہ نگاہ سے عباس کو دیکھا جو  
مسکرا کر اسے دیکھتا لیٹ کر وہاں سے ہٹ گیا۔

”مجھے معافی ہی مانگنی تھی تم سے سکندر، جس وقت میں  
نے تمہیں ہر وہ نازیبا بات کہی تھی میں کسی بہت بڑی غلط  
فہمی و گمراہی سے دوچار تھا مگر اب شرمندہ ہوں۔ دیکھو تم  
بھی جانتے ہو ناں کہ اللہ بھی اس وقت تک مجھے معاف  
نہیں کرے گا جب تک میں تم سے معافی نہ مانگ لوں۔“  
وہ کتنا عاجز نظر آ رہا تھا۔ کتابے بس، سکندر نے اچھپے میں  
بتلا ہو کر اسے دیکھا۔ کچھ عرصے سے اپنے بدلے ہوئے  
انداز و اطوار سے وہ حیران کر رہا تھا اسے مگر سکندر نے کبھی  
خاص دھیان ہی نہ دیا اور اس کی سابقہ حرکتوں کے باعث  
ہمیشہ کترا کر گزرا گیا تھا اس سے یہاں تک کہ یہ نوبت بھی  
نہیں آنے دی تھی جس کا موقع اسے اب بھی مل گیا تھا۔

”توبہ اور معافی وہی ہوتی ہے وقاص صاحب جو مانگی  
ہو۔“ اس کا لہجہ صاف طنزیہ تھا وقاص کا جھکا ہوا سر کچھ اور  
جھک گیا۔

”میں اللہ سے دعا کرتا ہوں۔ اے اللہ میرے دل کو  
اب کبھی نہ پھیرنا بعد اس کے جبکہ تو نے مجھے ہدایت بخش  
دی ہے اور میرا خاتمہ بالآخر بالایمان فرماتا۔ آمین۔“

اس کا بھرایا ہوا دم لہجہ تھا مگر سکندر کے دل کی دنیا کو  
تہہ ہالا کر گیا تھا۔ وہ پوری آنکھیں وا کیے خدا کی قدرت

کے لیے ہے اور مدح حیات ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو  
اپنا نائب اور خلیفہ مقرر فرمایا ہے اس لیے اس کی آسائش و  
آرام کی ہر ہر چیز کو اس کے تابع بنایا تاکہ وہ پوری یکسوئی  
سے اطاعت و بندگی میں مصروف رہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ  
تو نہایت مہربان نہایت شفیق ہے۔

گناہوں کو معاف کرنے والا..... توبہ قبول کرنے  
والا..... مصیبت زدوں کی پکار سننے والا ان کی مصیبتوں کو  
دور کرنے والا۔

وہ ذات باری تعالیٰ ہی ہے جس کے سایہ رحمت میں  
مسلمان مانوس و مامون رہتا ہے اللہ فرماتا ہے۔

”اے ایمان والو! شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو جو شخص  
شیطان کے قدموں کی پیروی کرے تو وہ تو بے حیائی اور  
برے کاموں کا ہی کہے گا اور اگر اللہ کا فضل و کرم تم پر نہ ہوتا  
تو تم میں سے کوئی بھی پاک و صاف نہ ہوتا لیکن اللہ جسے  
پاک کرنا چاہے کر دیتا ہے اور اللہ سب سننے والا جاننے والا  
ہے۔“ المذہب

اس کا بچہ خوش الحان اور انداز پر تاثر تھا۔ سکندر یک  
نک اسے دیکھتا رہا۔ اس کی سنہری اور کشادہ پیشانی جو  
بجدے کے واضح نشان سے ڈھکی تھی یہ نوجوان اپنے اندر  
بلاشبہ کوئی الونگی کشش رکھتا تھا اس کے منہ سے نکلی حق کی  
بات اس باعث بھی اچھی لگتی تھی کہ وہ با عمل نظر آتا تھا۔  
امام اہم احمد کے خطاب کے بعد دیگر علمائے بھی خطاب کیا  
اور آخر میں دعا ہوئی۔

”آج تمہاری ماہم میٹنگ تھی۔“ فرزانے اسے یاد دلایا  
سکندر نے کانٹے چکا دیے تھے۔

”یاد ہے مجھے۔“ وہ الوداعی انداز میں سب سے مل رہا  
تھا جب وقاص نے بھی اپنی چوڑی ہتھیلی اس کی جانب  
مصافحہ کی غرض سے بڑھائی۔

”مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے سکندر۔“ سکندر نے  
مصافحہ بھی جبراً کیا تھا چہرے کے ناگوار تاثرات اس انگلی  
پر گرائش پر کبیرے ہوتے چلے گئے۔

”مجھے تم سے ہر گز بھی کوئی بات نہیں کرنی۔“ اس کا

READING  
Section



کے اس مظاہرے کو شدید سادہ کیے جا رہا تھا یہ قاص تھا وہی.....؟ جو فرور و تکبر کا مجموعہ ہوا کرتا تھا۔ اللہ نے اس پر عتاب کی انتہا کر دی وہ سراپا تبدیل ہوا سامنے کھڑا تھا۔ سکندر کو بے انتہا بے حساب غماصوں نے آن لیا۔ اب بھلا وہ کون ہوتا تھا اسے نہ معاف کرنے والا وہ بولا تو اس کی آواز پر بھی خفیف سی لرزش تھی اس کے دل پر اتری کپکپاہٹ کی طرح۔

”میں نے بھی تمہیں معاف کیا تھا جس اللہ بھی تمہیں معاف فرمائے میرے لیے بھی دعا کرنا عبادت بلاشبہ ہر کسی کا نصیب نہیں بنا کرتی۔ اللہ مجھ پر بھی اپنی خاص عنایت فرمائے آمین۔“ وہ اس کا کندھا ٹھپک رہا تھا اس کے ہاتھوں میں بھی لرزش تھی اس کے دل اس کی آواز کی طرح بھلا کون ہوتا تھا وہ ان چند لمحوں میں تغیر کے کیسے عمل سے گزر گیا تھا۔



”آپ امینان سے نماز پڑھ لیں فاطمہ مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ ملازمہ کے جانے کے بعد وہ دیا کو کاغذ سے لگائے پھکتے ہوئے گل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ فاطمہ نے ایک نگاہ اس کے سنجیدہ نظر آتے چہرے کو دیکھا اور کوئی تاثر دے بغیر جائے نماز بچھا کر نماز میں مشغول ہو گئی۔ عباس دیا کو لے کر کمرے سے نکل کر ٹیرس پر ٹھہرا رہا۔

”آپ کہیں جو بھی بات کرنی ہے نماز پڑھ چکی ہوں میں۔“ اس کے لہجے میں معمولی سی عی تہدیلی تھی بے نیازی اور کھالی کا البتہ وہی عالم تھا۔ عباس نے سوئی ہوئی دیا کو جھک کر بستر پر لٹا دیا۔ سیدھا ہونے سے قبل ایک نظر اسے دیکھا۔ اتنی گلابی سوٹ میں ہم رنگ دودھ نماز کے اسٹائل میں لیٹے شعا میں نکھیرتے رنگ و روپ اور جگر لینے والی جاذبیت کے صرلہ وہ اتنی من موہنی لگ رہی تھی مگر اس کو کتنی عباس کی نظروں میں ستاش کی بجائے نظر نظر آ رہا تھا۔ اسے ایک بار پھر تاخیر کا مال گھیرنے لگا۔ اتنی تاخیر کہ اس کی ٹانگیں تازک کلی کا انتظار شاید مر جھا گیا تھا۔

اس کی نظروں نے فاطمہ کو جزیرہ کر دیا۔ اس نے بے اختیار لائی ٹکس جھکا کر ہونٹ بچھنے وہ اسے کیسے کہتی کہ مجھے معاف کر میرے ہم سفر تھے چاہنا میری بھول تھی کسی راہ پر جو ابھی نظر تھے دیکھنا میری بھول تھی کوئی نظم ہو یا کوئی غزل کہیں رات ہو یا کہیں سحر وہ کلی کلی وہ شہر شہر تھے ڈھونڈنا میری بھول تھی میرے غم کی کوئی ردا نہیں مجھے تجھ سے کوئی گلہ نہیں

دروازہ کھلنے کی آواز پر فاطمہ نے بے اختیار گردن موڑ کر دیکھا مگر عباس کو اندر آتے پا کر اس نے تیزی سے رخ بدل لیا تھا۔ اس بات کو سرے سے نظر انداز کیے لمحہ بھر کو ہونے والے نگاہ کے تصادم نے عباس کے ہونٹوں پر دوستانہ اور پر غلوں مسکان نکھیر دی تھی۔ جو خالقتا اس کے لیے تھی مگر وہ اب پیچھے نہ پلٹ کر دیکھنے کا عی تہیہ کر چکی تھی۔

”السلام علیکم افاطمہ طبیعت کیسی ہے اب؟“ عباس کا لہجہ انداز مر بیانہ تھا۔ اس کے باوجود جب وہ کمرے میں داخل ہوا فاطمہ ملازمہ پر رہنے میں معروف تھی وہاں خدیا کو وہاں سے کیوں نہیں لے جاتی۔

”یہ چپ ہی نہیں ہو رہی ہے میم، آپ کے پاس آنے کی ضد لگا رہی ہے۔“ فاطمہ نے عباس کا سلام اور سوال دونوں نظر انداز کیے تھے اور اپنی سر د نظروں کو اڑھیر پر جمایا۔

”کتنی بار کہا ہے تم سے، جب میں نماز پڑھ رہی ہوں پھل کھاد کھا کر مجھ سے بلا ستر جس ہوتی ہے۔“ اس کے

READING  
Section



میرا کوئی تیرے سوا نہیں یہی سوچنا میری بھول تھی اس کی آنکھوں میں نمی اتر رہی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کرتی بھی بے بس ہونے لگی تھی۔ کتنا مشکل تھا یہ سب، بہت مشکل، ماس کا دل کو دل کرنے لگا۔

”بازو کا زخم کیسا سہا ب؟ سو وینٹ تو ٹھیک سے ہوتی ہے نا؟“ عباس نے اس کی جانب پیش رفت کی اور اس کے مقابل صوفے پر بیٹھا۔ فاطمہ کے چہرے کی رنگت میں تبدیلی آئی۔ پہلے وہ خود میں کئی پھر یکھت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس پر وہ خود سے ہی سب سے زیادہ خائف تھی۔ جانتی تھی عباس کی مزید کوئی پیش رفت اسے ہر ادے کی وہ اس شخص کے سامنے کہاں ٹھہر سکتی تھی۔ وہ اب اللہ کے آگے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ یہ بچاؤ ضروری تھا۔ مگر اس وقت وہ دھک سے روکنی جب عباس نے بہت نرمی و ملامت سے اس کی کلائی تھام لی تھی۔

”بہت خفا ہو فاطمہ؟ آئی ایم سوری مجھے اسی موضوع پر تم سے کچھ کہنا ہے۔“ اس کے کس اور نظروں کی طرح اس کا لہجہ بھی نرم اور لودیتا ہوا تھا۔ فاطمہ کو اپنے جسم سے جان نکلتی محسوس ہونے لگی۔ گوشت پوست کا بدن گویا مومی مجسمہ تھا جو اس ساحر کی پیش کے آگے ہر لمحہ گھٹا جا رہا تھا۔ عجیب بدحواسی بھری مشکل آ پڑی تھی اس نازک مرطلے پر۔

”مجھے بھی آپ سے کچھ کہنا ہے، خیر آپ بتائیے؟“ لرزتی ہاتھوں کو اٹھا کر ایک نظر اسے دیکھتے فاطمہ نے جان بڑادی تھی لہجے کی کپکپاہٹ پر قابو پانے میں، عباس نے اس کے ہاتھ چھڑانے اور پھر سے فاصلہ بڑھانے کو گہری نظروں سے دیکھا اور چہرے پر دانستہ کوئی تاثر نہیں آنے دیا۔

”مجھے تم سے معذرت کرنی ہے فاطمہ اپنے رویے پر اپنی بدسلوکی کی جن دلوں یہ سب ہوتا رہا تم جانتی ہو میں کس درجہ پریشان اور ذہنی طور پر ٹھہرا ہوا تھا۔ اسی اضطرابی کیفیت کے زیر اثر اکثر تم سے مس بی ہو بھی کرتا رہا جو مجھے بہر حال زیب نہیں دیتا تھا۔“ اس نے لمحہ بھر کا توقف کیا اور گہرا سانس بھر کر خود کو ڈھیلا چھوڑتے سخت زردہ نظر

اس بڑا دل۔

”دراصل جن دلوں تم سے عریضہ کی ملاقات ہوئی وہ بہت ڈسٹرب تھی کچھ باتوں کو لے کر تمہیں میرے ساتھ دیکھا اور ساتھ کام کرتے پانا اس کی برداشت کا بہت بڑا امتحان تھا وہ بہت پھنسی ہوئی میرے معاملے میں پھر تمہاری بے تحاش اور غیر معمولی خوبصورتی بھی اسے خائف کرنے میں اہم کردار ادا کرتی تھی۔“ عباس نے لمحہ بھر کا توقف کر کے اس کے چہرے کو دیکھا جو سپاٹ تھا سر جھکا ہوا وہ کچھ بھی نتیجہ اخذ کرنے میں نا کام رہا تھا۔

”مجھے اس کے خدشات پر غصہ آتا تھا۔ اس کے خدشات میرے نزدیک غیر اہم اور بے بنیاد تھے۔ اس باعث متعدد بار ہماری رخ کلائی بھی ہوئی، فاطمہ..... عریضہ کی ڈنڈہ کے بعد ناگزیر یہی جب مجھے تم سے شادی کرنا پڑی تو مجھے لگنے لگا تھا میں عریضہ کے ساتھ شدید قسم کی بے وفائی کا مرتکب ہو چکا ہوں۔ تمہارے ساتھ شدید رویے کے پیچھے یہی سوچ کارفرما تھی۔ تم کہہ سکتی ہو مجھے ان دلوں خود بر اپنے جذبات و احساسات پر بالکل اختیار نہیں رہا تھا۔ لیکن اب مجھے اپنی غلطی کے ساتھ اپنی زیادتی کا بھی احساس ہو چکا ہے اور.....!“

”اٹس اوکے، مجھے آپ سے قطعاً کوئی شکایت نہیں ہے۔“ فاطمہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ عباس جو اسے بغور دیکھ رہا تھا آہستگی سے مسکرایا۔

”اگر شکایت نہیں ہے تو پھر خفا کیوں رہتی ہو مجھ سے؟“ اس کا انداز جلتا تا ہوا نہیں تھا۔ صلح جو تھا چھیڑتا ہوا اپنا ہیبت آمیز بھی۔ اس کے باوجود فاطمہ کی بوجیدگی میں کوئی فرق نہیں آ سکا۔

”میں خفا نہیں ہوں کسی سے بھی آپ سے تو بالکل نہیں کیوں کہ میں سمجھتی ہوں یہ سب احساس وہاں ہوتے ہیں جہاں محبت ہو، جہاں رشتوں کی اہمیت ان کی ضرورت کا احساس ہوتی ہو۔ ہمارے رشتے میں کبھی بھی ایسا کوئی مان کوئی استحقاق قائم ہی نہیں ہوا۔ میں نے مان لیا کہ وہ جذبہ میری حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔“ وہ کہہ رہی تھی اور

READING  
Section



امید سے دیکھا تھا اور تھک گئی تھی وہ..... جس کی آنکھوں میں فاطمہ کے لیے کبھی کوئی جذبہ نہ بھرا تھا ہاں مگر نفرت و بغض اور لہانت کے جذلوں کے سوا۔ اس نے سنا تھا وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے وقت کو پلٹے آج دیکھ بھی لیا تھا۔ آج صرف وہ بے بس نہیں تھی عباس بھی اس کے ساتھ خواہش و طلب کی اس کھٹن سرحد پر کھڑا تھا۔ اس کا دل بھرا یا اس کی آنکھیں بھی بھرا تیں اس کا دل چاہا اس شخص کو اپنا آپ مان کر دے وہ تو ازل سے دیوانی تھی اس کی مگر یہ زندگی کا ایسا مقام تھا جہاں اسے ہانا نہیں تھا۔ ایک بار پھر اس شخص کی جیت کا سامان کر کے ازل و ابدی بردباری اپنے دامن میں نہیں بیٹھتی تھی۔

"میں سمجھتی ہوں اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے عباس صاحب میں واپس اٹھ آیا جانے کا فیصلہ کر چکی ہوں میرا نہیں خیال آپ مجھے روکنے کا کوئی حق رکھتے ہیں مجھے پوری امید بھی ہے کہ آپ کو اپنے بچوں کے لیے کوئی اور بہت اچھی گورننس میسر آ جائے گی۔" اس نے جیسے تیسے بھی سہی مگر اپنی بات مکمل کر لی۔ اپنا مدعا اس تک پہنچا دیا۔ اس نے اس پل دانستہ عباس کی جانب نہیں دیکھا۔ اس نے کہا تھا وہ اپنا دل اپنے پیروں تلے چل ڈالے گی اس نے ایسا کر لیا تھا اس نے سوچا تھا اللہ کے مقابلے میں وہ کبھی عباس کو اب جیتنے نہیں دے گی اس نے اپنی سوچ پر عمل کر کے دکھا دیا تھا۔ اس نے نگاہ پھیر لی۔ ہر احساس ہر اذیت سے دانستہ روئی کی مانند دھنک کر بکھرتی روح سے۔

لہو لہان ہو کر رڑ پتے بلکتے دل سے ریت سے بھرتی نگار ہوتی آنکھوں سے بھی رگ رگ میں دوڑتی نارسائی کی فانی وحشی احساس سے بھی

اس نے کسی کا خیال نہیں کیا۔ بہت جی لی تھی وہ اپنی خواہش خاطر اس پر کچھ اللہ کا بھی حق تھا۔ اسے بہر حال مزید اپنے رب کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا تھا۔

مہاس جیسے کم کم ہتاج رہا تھا۔ معاہدہ چمکا اور جیسے ایک دم سے اس کے دلوں ہاتھ بے قرار سے آغاز میں تھا مہ لیے۔ "ایسا نہیں ہے فاطمہ تم غلط سوچتی ہو ہمارے رشتے میں مان اور استحقاق قائم نہیں ہوا مگر ہو تو سکتا ہے نا، بلکہ میں کرنے کا خواہش مند بھی تو ہوں۔ میری بات سنو فاطمہ میں پوری دیانت داری سے آج اعتراف کرتا ہوں کہ تمہاری ہر اسی میرے لیے بہت بڑا فخر ہے تم اتنی ہی باوقار اور مکمل لڑکی ہو میں بھی پہلی نظر میں ہی تم سے متاثر ہوا تھا۔ تمہاری دلکشی تمہارا رکھ رکھاؤ تمہارے آغاز و اطوار سے تمہاری بے تحاشہ خوب صورتی سے بھی۔ تم کسی بھی مرد کا خواب ہو سکتی تھیں فاطمہ میرا بھی آسانی سے تب ہی ہو جاتیں اگر تب میری زندگی میں عریضہ نہ چکی ہوتی وہ تمہارے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ ایک عام سی لڑکی تھی۔ عام سی سوانہیں اور خیالات رکھنے والی صرف ظاہر پر جان دینے والی مگر اس کا کیا ہوتا کہ مجھے صرف اسی سے محبت تھی۔ سارا دنیا سے بھی زیادہ اہم اس کی موجودگی اور غیر موجودگی میں مجھے کبھی کوئی اور عورت بھلی لگ ہی نہ سکی اور لگ بھی نہیں سکتی تھی۔ بس دل کا تقاضا اور خواہش ہی صرف عریضہ سے منسوب تھی۔ پھر اسے کھونے کا مرحلہ دیوانگی کی آخری حدیں تھیں۔ تمہارا اس سے موازنہ نہ کر دوں تو میں خود حیران ہوتا ہوں حیرانی تو یہ بھی ہے کہ میں آج بھی اسے پسینے دل میں موجود پاتا ہوں میں جانتا ہوں میں تمہیں اذیت دے رہا ہوں مگر یہ دل آج بھی پر طال جیتا اور غم کی مار سہتا ہے لیکن فاطمہ تمہاری الگ جگہ الگ مقام ہے میرے دل میں۔ میں نے جیسے جیسے تمہیں سمجھا تمہیں جانا تب مجھے اندازہ ہوا۔ کیا تم اتنی گنجائش بھی نہیں رکھتی فاطمہ کہ انسی کی میری کتابوں سے صرف نظر کر کے میرے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کر سکو؟ میں تمہیں تمہارا مقام تمہارے حقوق پورے انصاف کے ساتھ فراہم کروں گا۔ میں تم سے اتنی محبت کروں گا فاطمہ کہ تم سب تلخیاں مٹا دو گی۔" وہ کہہ رہا تھا وہ اس منہ اندہ نظروں سے اسے دیکھ بھی رہا تھا وہ جس کی طرف خود فاطمہ نے ہمیشہ اس اور



ایک قریبی ابراہیم نے دی تھی۔ ایک قریبی اسے بھی تو دینا چاہیے تھی۔ انہوں نے اپنی سب سے قیمتی سب سے عزیز ترین ہستی کو اللہ کی راہ میں قربان کر ڈالا تھا۔ آج وہ بھی سمجھ سکتی تھی اس کا شمار مسلمانوں میں ہوا ہے۔

اب اسے بھی ہارون کے سامنے اپنا آپ بچ نہیں لگ سکتا تھا۔ اس نے بلا خر خود کو مسلمان ثابت کر کے دکھا دیا تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکلی تو زمین اس کے قدموں تلے گویا دلدل تھی۔ آسمان جیسے اس کے سر کے اوپر ستارے گھومتا تھا۔ مگر اسے ہمت ہی تو نہیں ہارنی تھی۔ اسے ثابت قدم ہی تو رہنا تھا۔ جیسی اس نے پلٹ کر عباس حیدر کے قوت دیائی سے سلب ہو جانے والے تاثرات کو نگاہ بھر کے بھی نہیں دیکھا۔ وہ پتھر کی نہیں ہوتا چاہتی تھی۔ ابھی وہ اتنی کامل کہاں تھی وہ اپنی ریاضت زائل ہو جانے فیصلہ بدل جانے کے خیال سے ہی تو شدید خائف تھی۔



”آپ کا فون ہے سسر.....!“ لاریب کچن میں ناشتہ بنانے میں مصروف تھی۔ جب سکندر جنم پر بنیان پہنے اندر داخل ہوا۔ ہاتھ میں اس کا سیل فون تھا لاریب نے اگلے قدم کے نیچے آگے دھکی کر کے ٹوسر سے سلاؤس نکال کر دسر والا اور خود تیزی سے اٹھا اچھٹنے لگی۔

”ہا جو کیسی ہیں؟“

”الحمد للہ بالکل ٹھیک تمہاری البتہ فکر ہو رہی تھی۔ طبیعت سیسی ہے؟ دو مینٹنگ میں کوئی فرق پڑا؟“ ایمان کے لہجے و انداز میں بڑی بہن سے زیادہ ماں کی سی شفقت و محبت تھی۔ لاریب بے ساختہ مسکرائی۔

”جی، جی بالکل آپ زیادہ پریشان نہ ہوا کریں زاراوان اور شرجیل بھائی بابا جان سب ٹھیک ہیں؟“

”کریم ہے اللہ کا زاراوان یاد کرتا ہے جہیں میں نے اسے بتایا اس کا چھوٹا بہن بھائی آنے والا ہے۔“ ایمان کے لہجے میں اس کے حوالے سے شرارت رچی بسی تھی۔ لاریب کی رنگت گلابی ہونے لگی۔ اس نے فریج سے دودھ کا پکٹ نکالنے کے بہانے سکندر سے فاصلہ بڑھایا جس

کی جسامتیں بڑھ رہی تھیں۔ اس نے جوڑے میں لپٹے اس کے بال کھول دیے تھے۔

”سکندر تو ٹھیک ہے ہاتھ مارے ساتھ؟“ ایمان کے لہجے میں محسوس کیا جانے والا لنگر تھا۔

”باقی سب تو ٹھیک ہے لیکن محترم رعب بہت جھاتے ہیں مجھ پر دیکھیں ناشتہ مجھ سے بنواتے ہیں باقاعدہ آرڈر کر کے۔“ وہ معصومی آواز بھر کر بولی۔ سکندر نے کانوں کو ہاتھ لگائے پھر فون کے نزدیک منہ کر کے چیخا۔

”ہرگز نہیں یہ خود بناتی ہیں ضد کر کے کہتی ہیں محبت کا حق ادا کرنے دیں۔“ ایمان خنسنے لگی جبکہ لاریب اس کے یوں منہ پھاڑ کر اندر کی بات اگلے دینے پر بے تحاشہ سرخ ہو گئی۔

”اگر وہ تم پر رعب جتا بھی لے تو خیر ہے یاد کرو تم نے بھی دبا کر رکھا ہے۔“ ایمان کے ٹوکے پر لاریب نے سر تالا بھری۔

”پرانے ہی بدلے چکا رہے ہیں جناب، بس انداز محبت اپنا رکھا ہے تاکہ میں شکایت بھی نہ کر سکوں۔“ اس نے منہ پھلایا ہشاش بشاش خوب صورت ٹھٹھکا لہجہ اس کی مکمل آسودگی کا گواہ تھا ایمان کو بے پناہ تقویت ملی۔

”اللہ پاک تم دونوں کو ہمیشہ یونہی شاد و آباد رکھے، آمین۔“ ایمان نے ایسی ہی دعاؤں کے ساتھ فون بند کر دیا تھا۔ سکندر اسے تاز بھری نظروں سے گھومنے لگا۔

”کھارو شکایتیں لگاتی تھیں میری۔“

”آپ کو کیا بھی، میں اپنی بہن سے جیسے مرضی بات کروں۔“ لاریب نے کاندھے اچکائے گویا اسے اور زیادہ تاؤ دلاتا چاہا مگر سکندر مسکراہٹ دبائے اسے شوخ بے حد روشن نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ وہ نروس ہوئے بغیر نہیں رہی۔

”ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟“

”بیعتیں یہ قسم یہ مست لگا ہیں

حجاب اوڑھو کہیں کوئی اور پاگل نہ ہو جائے

سکندر کا لہجہ سرگوشی سے مشابہ تھا۔ لاریب اتنا



تر بات ہے۔ انسان خود ہی اللہ کے احکامات سے مدد کو ملنی کرتا ہے اور خواہی دولت نصیب بنے پر شا کی بھی اس کا ہوا پھرتا ہے۔ اپنی کوتاہی اپنی گمراہی اپنی بے حجابی سے آگاہی حاصل کیے بغیر قرآن پاک میں اللہ فرماتا ہے۔  
”بہت کم ہیں جو شکر ادا کرتے ہیں۔“

اس کا دل ایک ایک بات پر ایمان لاتا مکمل کر آنسو بننے لگا اور جب وہ پہلی بار سکندر کے ہمراہ حجاب اوڑھ کر گھر سے نکلی تو سکندر نے خوشگوار ریت میں جھٹا ہو کر مسکرا کر اسے دیکھا۔

”میں تو مذاق کر رہا تھا۔“  
”لیکن میں نے مذاق نہیں کیا اللہ کے احکامات کو بے پروائی اور مذاق کا نشانہ بننا بھی نہیں چاہیے۔“ جواباً وہ کتنی سنجیدہ تھی اور سکندر کی آنکھوں میں اس کے لیے پسندیدگی تو تھی ہی تو قیر اور ستائش بھی اتر آئی اور حویلی میں ہونے والے دو قاص سے سامنے نے لاریب کو اتنا بے عزت نہیں کیا تھا۔ جتنا سکندر کا اس سے مصافحہ کر کے خیریت دریافت کرنے نے کر دیا لاریب کے خیال میں اس وقت انتہا ہوئی تھی جب دو قاص نے اسے بھی مخاطب کیا۔

”میں اپنے سابقہ تمام رویوں پر شرمندہ ہوں لاریب پلیز مجھے معاف۔۔۔۔۔!“ اس کا ہر ہار بھی سول ہوتا تھا وہ عاجز ہوتی تھی وہ مشتعل ہوتی تھی جسی قدم بڑھا دے تھے کہ اپنا ہاتھ سکندر کی گرفت میں محسوس کر کے چونک اٹھی۔ سکندر صرف متوجہ تھا بلکہ اس کی نرم نگاہوں میں دو قاص کو معاف کر دینے کا بھی تقاضا تھا لاریب چند لمحوں کو کچھ بول نہیں سکی۔ اب کیا کرتی وہ؟ سکندر کے کہنے پر معاف کر دیتی اسے یہ ضروری تھا۔

”میں تمہیں اللہ کے لیے معاف کرتی ہوں دو قاص حیدر لیکن بہتر ہے آئندہ تم میرا راستہ کبھی نہ دو کنا۔“ اس نے پرسان انداز اختیار کیا اور آگے بڑھ گئی۔ دو قاص کی جھکی نظریں سکندر کے چہرے پر انھیں جن میں تشکرانہ جھک تھی۔ سکندر کچھ کہے بغیر اس کا کاندھا چھپکا لاریب کے پیچھے چلا گیا۔

جھینپی تھی کہ بے اختیار اس کے کاندھے پر مٹکا دے مارا۔ تھپ تک لاریب کو گمان بھی نہیں تھا کہ اگلے چند گھنٹوں میں وہ سکندر کی مذاق میں کبھی گئی بات کو اتنی سنجیدگی سے لے لے گی۔ اگر وہ قیمتی الفاظ اس کی سماعتوں میں اتر کر اثر نہ چھوڑ جاتے۔

لڑکیاں سکندر کی ریت کی طرح ہوتی ہیں۔ عیاں پڑی ریت مگر سال پر ہوتی قدموں تلے روندی جاتی ہے اور اگر سکندر کی تہ میں ہوتی کچھ بن جاتی ہے لیکن وہ دوا جو خود کو ایک مضبوط سیپ میں ڈھک لے وہ موتی بن جاتا ہے۔ جو ہری اس ایک موتی کے لیے کتنے ہی سیپ چتا ہے اور پھر اس موتی کو تھلیں ڈالیں میں بند کر کے محفوظ تجویروں میں رکھ دیتا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی جوہری اپنی دکان کے شوکیس میں اصلی جیوہری نہیں رکھتا مگر ریت کے ذرے کے لیے موتی بننا بھی آسان نہیں ہوتا۔ وہ ڈوبے بغیر سیپ کو کبھی نہیں پاسکتا۔ یہی مثال عورت کی ہے۔ اللہ نے عورت کو پردوں میں ڈھکی ہوئی چیز بنایا ہے۔ وہ اپنے آپ کو مہیاں کر کے خود کو جہنم کی آگ کا ایندھن بنا لیتی ہے۔ قرآن حکیم کی آیت کا مضمون ہے۔

”اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بی بیوں اور مسلمان عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے اوپر اس طرح پھیلا لیں کہ ان کی زینت ظاہر نہ ہو۔“

خلیب کی آواز اس کو ہر لمحہ قاصد پر جاتی محسوس ہورہی تھی۔ ہاتھ میں موجودی وی کار۔ عورت اس کی کمزور ہوتی گرفت سے پھسل کر گود میں گر گیا اور ساعتیں ساتیں ساتیں کرنے لگیں۔ بات ساری دل کی ہوتی ہے اگر دل گداز ہے تو اثر ہے اگر دل میں گداز نہیں تو کسی شے کا اثر لینا ممکن ہی نہیں صد شکر اسے گداز دل عطا ہوا تھا۔

اس نے جانا قدرت کے مرتب کردہ نظام اور اس کے قوانین میں ہی جتا اور سلامتی کے سارے مدار محفوظ ہیں اگر وہ انہی مرتب کردہ قوانین کو اپناتی تو کبھی بھی عباس حیدر کے طلسمی سحر سے جل کر خاک نہ ہوئی ہوتی۔ نہ دو قاص حیدر اس کی دلکشی کا سیر ہو کر اس کی زندگی کو مشکل بنانا کتنی عجیب

READING  
Section



شرمندگی سے بولنے لگی تھی وہ بایست و لکیری سے مسکرائی۔  
”مما پاس جانا، مماس پاس۔“ بچی فاطمہ کو قریب پاتے ہی  
بچل تھی زینب نے مسکراتے ہوئے بچی کو فاطمہ کی جانب  
بڑھایا تو فاطمہ نے جیسے بادل نا خواستہ ہی بچی کو لایا تھا۔

”آپ کیسے ہوا سامہ بیٹے؟“ زینب فاطمہ کو انٹرکام کی  
جانب جاتے دیکھ کر کارپٹ پر گھولنوں میں مگن ہوا سامہ کے  
پھولے لگال پیار سے چھو کر مسکائی تھی بچہ مسکرایا اور جھینپ  
کر نظریں بدل گیا۔

”سیما فوراً یہاں آ کر بچوں کو لے کر جاؤ۔“ انٹرکام پر  
سیما سے رابطہ بحال کرنے سے قبل فاطمہ نے دیا کے  
رونے کے متعلق پروا نہ کرتے ہوئے اسے صوفے پر بٹھا  
دیا تھا۔ ملازمہ کو مخاطب کرتے بھی اس کا لہجہ بدشت تھا۔  
زینب کچھ حیرانی کے عالم میں اسے نکلنے لگی۔

”کتنی مرتبہ کہا ہے بچوں کی کیئر کرنا سیکھو مگر تم دن  
بدن بد حرام ہوتی جا رہی ہو۔ لے جاؤ دونوں کو یہاں سے  
اور خانساں سے چائے کا کہہ دینا۔“ ملازمہ کی جھار کے  
بعد وہ زینب کی سمت متوجہ ہوئی تو اسے حق دق پا کر جانے  
کس احساس کے زیرِ تحت نظریں چرائیں۔

”بی بی جی نے آپ کے پاس سے.....؟“  
”یہ بہانہ بہت فضول ہے، سمجھیں جاؤ یہاں سے۔“  
وہ حلق کے بل چیختی تھی۔ ملازمہ کا رنگ اڑ گیا۔ وہ خائف  
ہوتی روتے بسودتے بچوں کو لیے تیزی سے کمرے سے  
نکل گئی۔ زینب تو بھونک لگی تھی۔ یہ سب کچھ اس کے  
لیے جتنا حیران کن تھا اس سے کہیں بڑھ کر تکلیف کا  
باعث تھا۔

”تمہارے زخم کیسے ہیں اب فاطمہ؟“ زینب خامی  
تاخیر سے بولی تو اس کا لہجہ از حد ہم اور بچھا ہوا تھا۔  
”ہوں جج بیڑ تم نے بہت عرصے بعد چکر لگایا  
زینبی۔“ وہ دانستہ مسکرائی تھی۔ زینب اسے خالی نظروں  
سے دیکھنے لگی۔

(فاطمہ ایسی کہیں ہو رہی ہے، کیا یہ بھی وہی عام سی  
روایتی سوچ رکھنے والی لڑکی تھی، جو بچوں کو میزگرہ بنا کر اپنے

”کہا تھا میں نے آپ سے، مسٹر بہت رعب  
جساتے ہیں مجھ پر ابھی ابھی کا کارنامہ سن لیں وقاص کو  
زبردستی معافی دلوائی ہے۔“ وہ امداد یا تو لاریب کو چلبلا کر  
ایمان سے کہتے سنا۔ سکندر نے سر داہ بھری اور دھپ سے  
اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

”اسے رعب نہیں، عاجزانہ التجا کہا جاسکتا ہے مادام،  
دیے بھی اگر ہم مذہب کو اختیار کریں تو اسے مکمل طور پر  
اپناتا چاہیے نہ کہ جزیہ جتنا من بھائے۔“ اس کا امداد نا  
مخاندہ تھا۔ ایمان نے تائیدی انداز میں سر ہلایا تو لاریب  
خفیف سی ہو گئی۔

”معاف کرنا خدائی وصف ہے لاریب اور اللہ معاف  
کرنے والوں کے درجات کی بلندی کا وعدہ کر چکا ہے۔“  
وہ بے حد نرمی سے کہتا گیا اور لاریب کی محنت بڑھنے لگی۔  
”اللہ پاک مجھے معاف فرمائے اور دین میں داخل  
ہونے کی توفیق بخشے آمین۔“

”آمین۔“ سکندر نے صدقِ دل سے کہتے اضافہ کیا  
تو تینوں ہی مسکرا دیے۔



”مما بھوک لدی۔“ جس وقت زینب نے ہلکی سی  
دھتک دے کر امداد قدم رکھا، بستر پر سوتی ہوئی دیا نے ہی  
سب سے پہلے اس کی توجہ حاصل کی تھی۔

”لوہ میری جان، بھوک لگی ہے آؤ خالہ کے پاس۔“  
اس نے لپک کر مصمم پیماری ننھی سی بچی کو ہانڈوس میں بھر  
کر اس کے آنسوؤں سے بھیستے رخساروں کو چناچٹ چوم  
لیا۔ تب ہی نگاہ فاطمہ پر جا پڑی تھی جو اس کی آواز سن کر  
دارِ دروب سے سر نکال کر متوجہ ہوئی تھی اور اسے سدھو پا کر  
گویا فاطمہ کے زرد چہرے پر بھتی آنگھوں میں ہلکا سا  
زخم کی کا اساس پھر سے جاگا تھا۔

”کیسی ہو فاطمہ؟ میں معذرت خواہ ہوں دوبارہ تمہاری  
مت کو نہیں آسکی۔ مجھے لگتا ہے طبیعت ابھی بھی ٹھیک  
نہیں ہے بہت کمزور ہو رہی ہو۔“ فاطمہ لپک کر جس بے  
تابی۔ بے فرامی سے اس کے گلے لگی۔ زینب اس قدر

READING  
Section



کر کے ہی دم لیا۔ میں نے بھی اس امر کو اللہ کا فیصلہ سمجھتے ہوئے قبول کیا ہے۔“ زینب تفصیلات بتا رہی تھی اور فاطمہ کی کیفیت عجیب تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

”آپ نے پوچھا نہیں دعا آپ سے کیوں شادی کر رہا ہے۔“ وہ اس انکشاف سے نکلی تو حیرت بھرا سوال کیے بغیر نہیں رہ سکی۔ زینب آہستگی سے سنس دی تھی۔

”پوچھا تھا فطری بات ہے مجھے بھی یہی خیال آیا تھا کہ وہ ازالہ کرنا چاہتے ہوں گے۔“ اسے جواب دیتی زینب جیسے انہی لمحوں میں گم ہونے لگی۔ جب اس نے ہارون اور امی بابا کے اصرار کے بعد یہی سوال کچھ دودھل سے ہارون احمد سے کیا تھا۔

”اٹھ پائیں جو کچھ ہوا ہارون صاحب اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا میں جانتی ہوں اور اس حادثے کو میں قبول کر چکی ہوں آپ ان میرڈ ہیں بہتر ہوگا کسی کنواری لڑکی سے شادی کر لیں۔“ زینب نے پردے کے پیچھے سے اپنی والدہ کی موجودگی میں بات کی تھی۔

”آپ ایسا ہرگز نہ سوچیں زینب کہ میں کسی ازالے کی نیت سے آپ سے شادی کا خواہاں ہوں میں تو نو مسلم ہوں جبکہ آپ اللہ کے فضل و کرم سے علم کی دولت سے مالا مال ہیں میرے لیے یہ بندھن ہرگز اعزاز یا کسی سعادت سے کم نہیں ہوگا اگر مجھ جیسے عام انسان کو آپ کی سنگت نصیب ہو جائے۔ آپ کے انکار کی صورت ظاہر ہے میں آپ کو ذرا نہیں کر سکتا میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ ساری عمر شادی نہیں کروں گا ہاں یہ ضرور ہے کہ مجھے آپ کا انکار بہت ہرٹ کرے گا میں سمجھوں گا آپ نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا۔“ جواب ایسا نہ تھا کہ زینب کے رونے میں روئیں میں عاجزی و انکساری بکھرتی چلی گئی اس نے جانا یہ اللہ کا فیصلہ ہے اس کے لیے اسے اللہ کے فیصلے سے بھلا کیونکر انحراف ہو سکتا تھا۔ استغاثہ میں واضح اشارہ ملنے کے بعد اس نے انکار نہیں کیا تھا۔ مٹھن کی رفاقت میں اس نے جتنا حسین وقت گزرا تھا اس کی یاد پھر سے ہارون احمد کی سنگت میں تازہ ہو کر مجسم ہونے لگی۔ ہارون احمد کا رکھ کھاؤ

مطلوب تک پہنچی اور پھر..... نہیں یہ وہم ہے میرا۔ فاطمہ ایسی بالکل نہیں، میں اس کی ان باتوں کی بھی گواہ ہوں جب انہی بچوں کی ہلکی سی تکلیف پر یہ ساری رات آنکھوں میں کٹ دیا کرتی تھی۔ اگر پیش نظر تب عباس کی محبت تھی تو اب بھی وہ محبت دم نہیں توڑ سکتی اس نے اپنی ہر سوچ کو جھٹاکر خود کو تسلی سے لوازا۔

”ہاں دراصل زندگی میں بہت کچھ تیزی سے تبدیل ہوا قاصد کہ میں چاہنے کے باوجود وقت نہیں نکال سکی۔“ زینب کے چہرے داغدار میں کچھ ایسا اٹوکھا تاثر تھا کہ فاطمہ چونک کر اسے سننے لگی تھی۔

”میں سمجھی نہیں؟“ وہ ابھمن کا شکر لگتی تھی زینب نرمی سے مسکرانے لگی۔

”ایک ہفتہ قبل بہت سادگی سے میرا نکاح ہو گیا ہے فاطمہ میں تمہیں لازمی بلواتی مگر تمہاری طبیعت کے پیش نظر ایسا نہیں کیا۔“ فاطمہ پہلے جتنی حیران تھی پھر اس اندر خوشگوار تاثر اس کے صبح چہرے پر پھیلتا چلا گیا تھا۔

”امیرنگ بہت مبارک ہو آپ کو، اسے آپ مٹھائی کے بغیر چلی آئیں۔“ وہ چمکی زینب جھینپ گئی۔

”مٹھائی ضرور لاتی مگر محمد ہارون نے منع کر دیا ان کی خواہش ہے فاطمہ کس آج رات کا کھانا تم اور عباس بھائی ہمارے ساتھ کھاؤ۔“ زینب کی شرمیلی مسکان نے اس کے نرم لود۔ پتے خند خال کے حسن کو اجاگر کر کے کیسا سحر انگیز تاثر دے دیا تھا وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

”کون ہارون، ہمارے دلہا بھائی؟“ وہ شرم مسکان کے ساتھ بولی زینب کے گلابی گال دکھائے تھے۔

”ہاں وہی فاطمہ مجھے ایک اور بات بتانی تھی تمہیں ہارون مٹھنی کے وہی ”دیو“ ہیں جو تمہاری ماما کے اسٹیپ سن تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ ماشاء اللہ سے مذہبی اسکالر ہیں پاکستان آنے کے بعد انہوں نے بڑی قوتوں سے مجھے ڈھونڈا اور نکاح کا پیغام دیا۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتی تھی فاطمہ مگر ہارون کی کوششیں ہا آدرا عادت ہوئیں انہوں نے امی اور بابا کے ساتھ مل کر مجھے قائل

READING  
Section



جانتی بھی تو کیسے؟“ وہ سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان رندھی ہوئی آواز میں بولی تھی۔ زینب نے تحیر آمیز آنکھوں سے اسے دیکھا مگر ٹوکا نہیں۔ وہ اس کی ساری بات سن لیتا جاتا تھی۔

”پھر اسی رب نے مجھے آگاہی بھی بخش دی زینب، جس نے بہت پہلے طے کر رکھا تھا کہ اس نے مجھ سے کب کیا کام لینا ہے۔ میں نے دیو کو ہارون کے روپ میں دیکھا تو میری آنکھوں کا بھی پردہ سرک گیا۔ اندھیرے چھپے اور روشنیاں جگمگانے لگیں۔ میں نے جانا زینب صرف میں ہی گھانے میں تھی صرف میں... ورنہ ہائی سب تو رحمان کی پکار پر لبیک کہہ رہے تھے مہاس کی محبت... اس کی سحر انگیز قربت کی چکا چوند نے میری آنکھیں ہی چند حیا ڈالی تھیں مگر میں خود کو مزید فریب نہیں دینا چاہتی۔ تم نے ہی مجھے بتایا تھا زینب کہ جب تک ہم اپنا سب سے قیمتی اور محبوب چیز اللہ کی راہ میں صدقہ نہیں کریں گے ہمارا ایمان کامل نہیں ہوگا۔ میرے پاس مہاس سے بڑھ کر کچھ بھی قیمتی نہیں تھا خرچ کرنے کو قربان کرنے کو۔“ وہ خاموش ہوئی تو اس کی ہچکیاں بڑھنے لگیں۔ زینب نے گہرا سانس کھینچا پھر اس کے لرزے ہاتھ پر اپنا ہاتھ نرمی سے رکھا اور اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

”بلاشبہ تمہارا جذبہ قابل قدر ہے فاطمہ مگر تم دین کو اب بھی پوری طرح سے نہیں سمجھ سکی ہو اپنی حالت کو دیکھو کیا ضرورت ہے بھلا خود پر اتنا جبر کرنے کی۔“ زینب کے الفاظ ایسے تھے کہ فاطمہ نے تڑپ اٹھنے کے انداز میں اسے دیکھا۔ وحشی دل کچھ مزید ہراساں ہو کر دھڑکا بے چینی بے تاب و اضطرابی کیفیت میں اس نے آنسو چھلکاتی سرخ آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا۔

”میں کبھی نہیں؟“ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور جواب میں زینب نے بے حد محبت سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

”مطلب یہ ہے فاطمہ کہ اسلام میں رہبانیت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ مہاس اور بچوں کو چھوڑ کر تم راہبانہ زندگی کی

تحمل و رسان اور عبد اللہ کے لیے محبت کچھ بھی تو عثمان سے مختلف اور الگ نہیں تھا اور بے شک اللہ ہی بہتر سے بہترین سے نوازنے والا ہے۔

”مجھے بہت خوشی ہوئی ہے یہ جان کر میں ضرور آؤں گی دیو... میرا مطلب ہے ہارون کو مبارک باد دینے اچھا ہے یہاں سے جانے سے قبل اس سے بھی مل لوں گی۔“ فاطمہ کے آخری فقرے نے زینب کو ٹھٹھکا کے رکھ دیا۔ ”تم کہیں جا رہی ہو فاطمہ مگر کہاں؟“ یہی وہ سوال تھا جو فاطمہ کے سارے ضبط اور حوصلے بہا کر لے جایا کرتا تھا مگر جواب تو دینا تھا زینب کی نظروں کا سوال کتنی بے قراری لیے ہوئے تھا آنکھوں سے پھر اہوا۔

”انڈیا بھی آئے پاس۔“ اس کی آنکھیں پھرتی تھیں۔ ”واپس کب تک آؤ گی؟ بچوں کو ساتھ لے کر نہیں جاؤ گی کیا کہیں اس لیے تو انہیں خود سے دور نہیں رکھ رہی ہو؟ تمہاری مٹی تو ٹھیک ہیں فاطمہ ہارون احمد نے تو مجھے ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔“ وہ اب حیران ہو رہی تھی۔ گویا اس اچانک فیصلے کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہو۔

”میں اب بھی واپس نہیں آؤ گی زینب، تم ٹھیک سمجھ ہو میں بچوں سے فاصلہ بڑھا رہی ہوں۔“ بات کے مکمل ہونے سے بھی پہلے اس کے آنسو بے تابانہ ٹھل کر گالوں پر اتر آئے تھے۔ یہ سچ تھا وہ زینب سے کوئی بات نہیں چھپا سکتی تھی۔ پھر مل پر پوچھ بھی اتنا تھا کہ حد نہیں، وہ اس بوجھ میں ضرور کی جا رہی تھی۔ زینب اس کی بات کے جواب میں ششدر تھی۔ جبکہ فاطمہ زار و قطار روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں اپنی نظروں میں گر چکی تھی۔ میں جانتی تھی میرا رب مجھ سے راضی نہیں ہے۔ اس مجنونانہ سفر میں اندھا دھند بھاگتی اللہ و میں مکمل طور پر فراموش کر گئی تھی۔ حالانکہ

اللہ نے آنکھوں کی خاطر ہی تو مجھے تمہارا ساتھ دیا تھا۔ تم میرے تودل پر مہر اور آنکھوں پر پردہ تھا۔ میں سمجھتی اور

READING  
Section



دیکھ بھال، شوہر کی فرمانبرداری اور اس کی موجودگی وغیرہ موجودگی میں اس کے مال و عزت کی حفاظت دیا سنتداری سے کرتے ہوئے پانچ وقت کی نماز اور جتنا سہولت سے ہو سکے قرآن پاک پڑھ لوگی فاطمہ تو وہی تمہارے لیے بہترین عبادت ہوگی۔ اللہ کا وعدہ ہے وہ اپنے بندوں پر ان کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ پھر آخر تم کیوں اضافی بوجھ لا دنا چاہتی ہو خود کو ریلیکس کرو فاطمہ اور دین کو سمجھنے کی کوشش بھی۔ "زینب کا لہجہ ویسا ہی تھا اثر انگیز دل موہتا ہوا اور ضمیر آؤ لیے ہوئے۔ فاطمہ مسرور بنی تھی۔ دل کا بوجھ یکھت سرک گیا تھا۔ اس نے بھکتی نم آنکھوں میں غیر یقینی بھر کے زینب کو دیکھا۔

"تم سچ کہہ رہی ہو ناں؟ اللہ ایسا کرنے پر مجھ سے خفا تو نہ ہوگا، میں عباس سے محبت کرتی رہوں اللہ اس بات پر خفا تو نہ ہوگا؟" اس کی آواز میں پھر سے خدشات لرزے لگنے زینب بے اختیار مسکرا دی۔

"ہرگز نہیں فاطمہ میں نے کہا نا یہ تو انین اللہ کے ہی مرتکب کردہ ہیں اللہ اپنی اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و محبت کے بعد شوہر کی اطاعت و محبت کو عورت پر لازم کرتا ہے۔ اللہ کے حقوق کے بعد شوہر کے حقوق اہم ترین ہیں۔ ہمیشہ یاد رکھو فاطمہ دنیا کے اندر دین نہیں مگر دین کے اندر دنیا ضرور ہے۔ کوئی شخص اللہ کو ماننے کی غرض سے پہاڑوں میں جا نکلا اور عبادات میں مشغول ہو گیا۔

اپنے پاس ایک خشک ٹہنی گاڑھ لی اس کا خیال تھا جب یہ ہری ہو جائے گی تو سمجھ لوں گا اللہ مجھ سے راضی ہوا یا برا برس بیت گئے مگر اللہ کے راضی ہونے کی خوش خبری نہیں ملتی تھی۔ ایک روز عبادت میں مشغول تھا کہ کسی مصیبت زدہ کی پکار پر دل میں خیال آیا اس کی مدد کرنی چاہیے اور چل پڑا مقصد میں کامیابی کے بعد لوٹا تو یہ دیکھ کر حیرت و خوشی کی انتہا نہ رہی کہ خشک ٹہنی ہری ہو چکی تھی۔ سویت ہارٹ اس واقعہ سے بھی سبق ملتا ہے اللہ دنیا میں اپنے بندوں کو بھیج کر ان کی آزمائش کرتا ہے اگر صرف عبادت کی جائے اور دنیا کو ترک کر دیا جائے یعنی حقوق العباد سے چشم

جانب ہی قدم بڑھا رہی ہو۔ بلکہ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے پہلو تہی کی مرتکب بھی ہو رہی ہو۔ جو اس رشتے میں بندہ جانے کے بعد اللہ نے تم پر لازم کر دیے۔ یہ قربانی نہیں ہے حقوق العباد سے چشم پوشی ہے۔ میں حیران ہوں تمہیں عباس بھائی نے کچھ نہیں کہا؟ فاطمہ اسلام تو بہت پیارا دین ہے مکمل ضابطہ حیات اس میں جائز اور حلال خواہشوں سے منہ موڑنے کا کہیں بھی حکم نہیں دیا گیا بلکہ ایمان ایک ایسا عالم ہے جہاں نفس انسانی کے خفیہ ترین امور اور پوشیدہ ترین گوشے بھی اطمینان و سکون پاتے ہیں اور اجتماعی زندگی پر سکون و مطمئن ہو جاتی ہے۔ سلامتی کے جس نظام میں تم داخل ہوئی ہو اسلام قبول کر کے فاطمہ اس میں تمہارا اور اللہ کے مابین تعلق کا صحیح تصور ملتا ہے۔ یہ نصاب اللہ اور تمہارے ساتھ اس دنیا کے ساتھ ہر ہر چیز کا حکمت کے ساتھ پورا ہونا ثابت رہتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کائنات کے نظام کو ایسا بنایا ہے کہ یہ سب اور اس کی ہر ہر چیز انسان کی فلاح و بہبود کے لیے ہے۔ قرآن حکیم کی آیت کا بھی یہی مفہوم ہے کہ "تم سکون حاصل کرتے ہو اپنے جڑے سے۔" فاطمہ اللہ نے ہر شے کے جڑے پیدا کیے ہیں۔ تمہارا جڑ عباس تھا یہ حکم خداوندی ہی ہے عباس کے حقوق تم پر فرض ہوئے حدیث کا مفہوم ہے۔

"اگر بیوی شوہر کے بلاوے پر انکار کرے تو ساری رات رحمت کے فرشتے اس عورت پر لعنت بھیجتے ہیں۔" اندازہ کر لو تمہارا طریقہ کار کتنا غلط تھا اور یہ سچے... فاطمہ یہ بہت معصوم ہیں اور تمہاری توجہ و محبت کے محتاج بھی اللہ نے ان کی تمام ذمہ داریاں تمہیں سونپ دی ہیں ماں بنی ہو تم ان کی ان کے حقوق ادا کرنا تم پر فرض ہے اور اللہ نے عورت کو مرد کی طرح باجماعت مسجد میں نماز کا حکم نہیں دیا اللہ جانتا ہے عورت کی ذمہ داریوں کو، عورت کو مگر سنبھالنا بچے پالنا ہے جسے اس مالک نے سہولت عطا فرمادی۔ مسجد جانے کی بھاگ دوڑ سے بچا کر گھر میں اطمینان سے نماز کی ادائیگی کا حکم عطا فرمایا۔ ان بچوں کی

READING  
Section



چیت کرنے میں مصروف تھا کچھ دیر بعد ہی اس کے پیچھے آیا تھا۔ لاریب نے اسے عاجز نظروں سے دیکھا۔  
"کیا کہوں میں آپ سے کل ایسا گھٹیا الزام لگایا آنے  
واسے دنوں میں کوئی اور ذرا مہم۔"

"تمہیں مجھ پر اعتماد ہے تالار یب پھر.....؟" سکندر  
پر عجیب سے اثر ہوا ہوا لاریب اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"میں کوئی مزید نقصان نہیں سبہ سکوں گی سکندر، ماضی  
میں جو ہوا وہی کافی ہے۔" اس کا اشارہ ایمان اور سکندر کے  
والدین کے ساتھ تاجی اور تائی ماں کا سلوک تھا۔

"لیکن لاریب لازمی تو نہیں جوان کا نصیب تھا وہی  
ہمارا بھی ہو۔"

"یعنی آپ انہیں وار کرنے کا پھر سے موقع فراہم  
کر رہے ہیں۔" اس کا انداز روٹھا ہوا تھا۔ سکندر مسکرا دیا۔

"نہیں میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کی  
بیروی کرنا چاہتا ہوں جس میں انہوں نے ہمیں تعلق اور  
رشتوں کو جوڑے رکھنے کی تاکید فرمائی ہے۔" بات ایسی تھی  
کہ اس کے بعد لاریب اپنی بات سامنے رکھنے کی جرأت  
ہی نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ یہ کسی سے اتنا ضرور کہا۔

"چاہے وہ جتنے مرضی رکھ دیں۔"

"یہ ان کی فطرت ہے لاریب ہمیں وہ کرنا ہے جس  
فطرت پر اللہ نے ہمیں پیدا کیا ہے جس کی ہمیں توفیق  
بخشی۔ الحمد للہ اللہ نے ہمیں ہم عطا فرمائی ہے ہم برائی کا

بدلہ اچھائی سے دے کر اچھائی سے برائی کا خاتمہ کیوں نہ  
کریں۔ بدلہ لے کر تو ہم کوئی کارنامہ انجام نہیں دیں  
گے۔" سکندر کے پاس ہر بات کا کھلا نہ جواب موجود تھا۔

لاریب کو چپ ہونا پڑا مگر اس کے خدشات غلط نہیں تھے  
کہ اس رات تائی ماں نے اپنی آمد کا گھناؤنا مقصد ظاہر  
کر دیا۔ دودھ میں انہوں نے زہر ملا کر سکندر کو ختم کرنا چاہا

تھا۔ یہ ان کی چالاکی اور بہت مہارت سے چال چلنے کی  
سازش تھی کہ بیٹی کو بھی اس میں شامل کرنا ضروری نہ سمجھا  
گلاں تیار کر کے انہوں نے رکھا ہی تھا کہ پیٹ میں اٹھتے

مروڑ نے انہیں دھس دھس تک جانے پر مجبور کر دیا اور اس

پوشی تو اس میں بھی رمنائے الہی کا اشارہ نہیں ہے کامیاب و  
کامران وہی ہے جو دلوں میں توازن رکھے ہاں یہ بھی  
فراشوش نہیں کرنا کہ اللہ کی محبت پر کسی اور محبت کو غالب  
نہیں آنا چاہیے۔ فرض نمازوں کی ادائیگی ضروری ہے نقلی  
عبادات سے بہتر حقوق اللہ کی خدمت و مدد ہے۔ زینب  
کے ایک ایک لفظ نے فاطمہ کے ذہن کے ہر تاریک  
گوشے کو گویا جگمگا دیا تھا۔

"اور ہمارے رب ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر اگر تو  
نے نہ بخشا، ہمیں اور نہ ہم پر رحم فرمایا تو ہم کھانا پانے والوں  
میں سے ہو جائیں گے..... اے ہمارے رب نہ پھیرنا  
ہمارے دلوں کو بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور  
ہمیں عطا فرمایا اپنے پاس سے رحمت اور ہم پر رحم فرما بے  
شک تو بڑا عطا فرمانے والا ہے۔" زینب کتنی عاجزی سے  
دعا مانگ رہی تھی اور فاطمہ کا دل پوری آمادگی سے تائین کی  
مہر لگا رہا تھا۔ کیسا قرار اترتا تھا اس کے اندر ہر الجھن ہر  
پریشانی کا آج مکمل خاتمہ ہو گیا تھا اس کے آنسو پھر سے  
بننے لگے مگر وہ باہمی تھی یہ تشکر کے آنسو ہیں۔

دل خدا کے حضور سجدہ ریز تھا۔ بلاشبہ اللہ سے بڑھ کر  
کوئی مہربان نہیں ہے شک اسلام سے بڑھ کر کوئی اور  
مذہب مکمل رابطہ حیات نہیں رکھتا۔ اس کا دل گواہی دیتا  
جا رہا تھا۔ اللہ کے حضور سجدہ شکر بجالاتا ہوا۔



"صالیہ یاد کر رہی تھی سب کو میں نے سوچا ملا لاتی  
ہوں حالانکہ یہاں کوئی سیدھے منہ بات کرنا بھی گوارا  
نہیں کرتا مگر میری بیٹی کا دل ہی اللہ نے محبت کی مٹی سے  
بنایا ہے۔" تائی ماں کی آمد پھر سے ہو چکی تھی اور گویا  
لاریب کو بتائی سنایا جا رہا تھا۔ لاریب گہرا سانس بھرتی  
شاک کی نظروں سے سکندر کو دیکھنے لگی جس نے اس کا ہاتھ  
دبا کر آنکھوں میں آنکھوں میں گویا یہ برداشت کرنے کی  
فراشوش تھا کی تھی۔

"یاد رکھیں رہا کرو تا تم۔" وہ چائے بنوانے کو ابھی تو  
سکندر جو بیک تائی ماں سے خوش اخلاقی سے بات

READING  
Section



بہت کٹھن اور دشوار ہیں مگر آج وہ پورے یقین سے کہتی تھی ان راہوں سے بڑھ کر دلکشی و طمانیت اور کہیں نہیں تھی اللہ کے راستے ہی سیدھے راستے تھے اور آسودگی سے بھرپور بھی۔ اس نے گہرا سانس بھر کر اس احساس کو دل سے محسوس کرنا چاہا۔

”پچا تب (کب) آئیں دیں (گے) ممّا۔“ اسامہ اس کی بانہوں میں چلا تھا فاطمہ کا دل بہت زور سے دھڑکا اس ستم گر کا تذکرہ بھی اس کے دل اور خون کی رفتار کو کئی گنا بڑھا دیا کرتا تھا۔

”بہت جلد آئیں گے جانو، ان شاء اللہ۔“ اس کا چہرہ حیا سے گلابی پڑنے لگا۔ اس روز جب اس نے عباس کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تھا وہ کتنا حیران و پریشان ہو گیا تھا اور اپنے طور پر اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی کم و بیش وہی باتیں جو بعد میں زینب نے بھی کہی تھیں اس سے لیکن تب وہ اتنی بدگمان تھی عباس سے کہ اسے لگنے لگا تھا وہ اتنا پرست انسان اسے اللہ کے راستے سے روک کر اپنی محبت کے جھوٹے دام میں پھانس کر رکھنا چاہتا ہے۔ جسکی تو اس نے کوئی بات بھی ڈھنگ سے اس کی نہیں سنی تھی اور عباس اس کے تاثرات سے ہی سمجھ گیا تھا جسکی مزید اصرار نہیں کیا۔

”ایز یو وٹش فاطمہ میں آپ سے اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق اور آزادی نہیں چھینوں گا نہ میں جبر کرنا چاہوں گا آپ پر مگر یہ بات سمجھی نہیں بھولنا کہ اس گھر کے ہی نہیں عباس حیدر کے دل کے دروازے ہمیشہ تمہیں اپنے لیے کھلے ملیں گے۔ میں اور میرے بچے اور یہ گھر تمہارے بغیر ادمورے رہیں گے۔“ اس نے اپنی بات کتنی آسانی سے کتنی سہولت سے کہہ دی تھی مگر فاطمہ کے اندر سرسراہی وحشت کا کہاں کوئی کنارہ تھا۔

(بھول جاؤ عباس حیدر، بھول جاؤ کہ اب تم مجھے ٹریپ کر لو گے میں اس سحر سے نکل آئی ہوں تمہارے اور میرے واسطے اب جدائی رہیں گے) وہ بھاگ کر دوسرے کمرے میں آ گئی تھی اور دوتی رہی

صدورت حال سے بے خبر صالح نے کمرے میں آ کر دودھ کا گلاس اٹھا لیا وہ دودھ کی شائق تھی اور ہمیشہ بہت رغبت سے پیتی تھی مگر اس گلاس کو پیتے ہوئے اس کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس کی یہ خواہش آخری بار پوری ہو رہی ہے۔

زہرا تاتیر تھا کہ جب تک تائی ماں واپس کمرے میں آئیں صالح کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بھی کئی منٹ بیت چکے تھے۔ انہوں نے پتھرائی ہوئی سکتہ زدہ آنکھوں سے اپنی مردہ بیٹی کو دیکھا جس کے منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی اور جسم ہر لمحہ نیلا پڑتا جا رہا تھا۔ یہ سکتہ لونا تو ان کی ہذیبانی چیخوں نے اتنے بڑے ہنگامے کے در و دیوار لرزائے شروع کر دیے تھے۔



فاطمہ نے دیا کو تھکتے ہوئے وال کلاک پر نگاہ ڈالی نو بج کر پچیسالیس منٹ ہو چکے تھے اسامہ بھی تک جاگ رہا تھا فاطمہ کو ابھی عشا کی نماز ادا کرنی تھی۔ آج اسے معمول سے بھی کچھ تاخیر ہوئی تھی تو وجدیاء کی طبیعت کی خرابی تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی وہ احسان بابا کے ساتھ دیا کو ڈاکٹر کے پاس سے لے کر آئی تھی۔

ابراہیم احمد بھی ساتھ تھے اور فاطمہ کے اطمینان دلانے پر ہی واپس گئے تھے۔

”بیٹا آپ بھی سو جاؤ اب۔“ اس نے اٹھتے ہوئے دیہ پر چادر درست کی جو سو چکی تھی۔ اسامہ گھر بھر کے کشنز کارپٹ پر ڈھیر کیے ان پر قلابازیاں لگانے میں مصروف تھا ماں کی ہزار پردہ بسودا تھا اور اپنا کھیل جاری رکھا۔ فاطمہ نے جھک کر اسے پیار کیا اور مسکرا دی۔

”بہت مزہ آیا۔“ اس نے اسامہ کو یقین دلایا تھا اسامہ چبکا اور خود بھی بے حد پیارے انداز میں چٹا چٹ اس کا گال چوم لیا اور منہ منی دونوں بانہیں پھیلا کر کھلکھلایا تھا۔

”بوت مجا آیا۔“ فاطمہ نہال ہو اٹھی تھی اور اسے بانہوں میں بھر کے والہانہ قسم کا پیار کیے گئی۔ زندگی میں کتنی ترتیب کتنا حسن آ گیا تھا اس نے کتنے دکھ سے سوچا تھا یہ رازیں

READING  
Section



تھی۔ اسے یاد تھا کبھی وہ وقت تھا جب وہ ان اشعار کی عملی تفسیر تھی۔

(میں تیری تلاش میں نکلوں یا اپنی تلاش میں جاؤں میری عقل بدل اور نظر سب کے سب تیرے کو پہنچے میں کھو گئے ہیں)

اور اس نے تب یہ بھی جانا تھا کہ تم ہوئی چیزیں دھوڑنا ہرگز آسان کام نہیں۔ صبح معنوں میں وہ خوار ہوئی تھی۔

زندگی کے بارہ سال میں صرف وہی لمحے اس کے دل و نظر میں ٹھہر گئے تھے جب اس سے سامنا ہوا تھا جب اسے دیکھا تھا ہائی زندگی تو اکارت تھی بے کار تھی۔ اسے کھویا تو یہ کالی رات جیسا وقت ٹھہر گیا۔ وہ حیران پریشان ہر شے کو خالی نظروں سے ملتی خود بھی خالی ہوتی رہی۔

کیسی ہوئی تھی اس کی زندگی۔ کوئی دین اہم تھا نہ کوئی موسم خاص۔ اس کی تمنائیں ہی مرگئی تھیں جیسے کوئی احساس ہی دکھ کے سوا باقی نہ رہ گیا ہو۔ کسی سکھ کا دور تک سایہ نظر نہ آتا تھا کھونے کے عمل کا دکھ ہی اتنا شدید تھا جو اسے پا کر بھی تمام نہا سکا۔

”اللہ گواہ ہے میں نے اللہ کے لیے عباس کو چھوڑا ہے۔“ اپنے ساتھ ساتھ وہ درو دیوار کو بھی یہ یقین سوچنا چاہتی تھی آنسو پھر بھی جانے کیوں دیوانہ وار بہہ چلے جاتے تھے وہ بار بار ہچکیاں بھرتی تھی۔

میں نے جان لیا یہ سفر شروع ہی اس لیے ہوا تھا کہ اللہ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا تھا۔ عباس تو ایک ذریعہ تھا ایسا عارضی ٹھکانہ جہاں کچھ عرصہ سستانے کے بعد مجھے بلا ختم گئے بڑھ جانا تھا ہاں اگر دنیا میں جنت مل جائے تو پھر مزید سفر سے کیا غرض۔ کچھ رویے کچھ فاصلے اس لیے بھی ہوتے ہیں کہ ہمیں نیند سے جگایا جائے اب تو جا کر مجھے محبت کا فلسفہ سمجھ میں آیا ہے۔ وہ بار بار خود کو برحق اور صحیح باور کرائے جاتی تھی لیکن پھر اللہ نے ہی زینب کے دل پر سے پھر اسے درست دین سے آگاہی بخشی تو جیسے

فاطمہ کا دل ایمان لے لیا تھا حرف با حرف سچائی تھی حکمت تھی فطرت بھی اس نے جان لیا اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا اب اسے عباس حیدر کا انتظار تھا جو اس یوز سے کسی تبلیغی جماعت میں گیا ہوا تھا اور جسے خبر نہیں تھی فاطمہ کے کسی بھی نئے فیصلے کی۔

”انہیں پتا لگے گا تو کیسا لگے گا؟“ وہ سوچتی اور لجا جاتی۔ عباس کی قربتوں کے متعلق سوچ کر ہی اس کے وجود میں سنسنی دوڑنے لگتی تھی۔

کیسا آسودگی سے لبریز اور کیف آگئی احساس تھا مکمل طور پر اس شخص کو پالینے کا اس کے اطراف میں دور دور تک خوشبو میں بکھر جائیں ستارے جگمگانے لگتے۔



سکندر لاج میں ہر سو سوگوار کی اور یاسیت کے بادل منڈلاتے تھے صرف تائی ماں کی ہی نہیں تاؤجی کی بھی حالت تشویشناک تھی وہ بات جو کسی پر بھی عیاں نہیں تھی غم و اشتعال اور صدمے کی شدت میں مبتلا تائی ماں بین ذاتی ہوئی خود اپنی زبانی بیان کرتی رہی تھیں۔

جس وقت جنازہ اٹھ رہا تھا ان کے حواس پر ایک بیان طاری ہوتا چلا گیا تھا۔ جیسی انہوں نے غم سے نڈھال تاؤجی کا گر بیان پکڑ کر طوفانی جھٹکے دیے تھے۔

”تم نے کہا تھا مجھے تم نے..... سکندر کو زبردے کر کام دکانا، وہ نہیں مرا، میری بچی مر گئی، وہ کھو..... دیکھو وہ جارہی ہے مجھے چھوڑ کر تم نے مذوالا اسے“ وہ خود اپنے بال نوچ رہی تھیں گال چٹکتی تھیں اور وہ سب کچھ کہہ رہی تھیں جو بھائی ہوش و حواس کبھی منہ سے نہ نکالتیں۔

”اگر کارنامہ انجام دے ہی لیا تھا تو کم از کم بیٹی کو بھی راز میں شریک کر لیتی دووہ اس نے خود کیسے پی لیا سالوں پہلے اس کے ماں باپ کھاتے سے ہٹایا آج تک بھانپ نہیں نکلی مگر تو.....!“ تاؤجی کے مذہبی انداز و لہجے نے بھی ثابت کر دیا تھا کہ یہ کیفیت رنج و غم صرف تائی ماں کے ہی حواس سلب نہیں کر گئے لازمی اکلوی بیٹی انہیں بھی ذہنی طور پر وقتی سہی مفلوج ضرور کر گئی تھی۔ ان کی آنکھوں سے لہو



نہکتا تھا اور شناسائیت کا کوئی رنگ ڈھونڈنے پر نہیں ملتا تھا۔ چہرے پر ایسی وحشت تھی کہ ایک نگاہ ان پر ڈالنا بھی امتحان تھا جیسے۔

اور ان انکشافات کی زد پر آئی لاریب چہرے پر اضطراب و وحشت اور گھبراہٹ سجائے ہر اسان تھی۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی سکندر کے بچ جانے پر شکر ادا کرے یا صالحہ تائی ماں وغیرہ کے انجام پر آنسو بہائے۔ تاؤتی دور تائی ماں اپنے اعمال کی سزا بھگت رہے تھے کہ وہ اوپر والا بہر حال بہترین منصف ہے بہت بڑا محاسب ہے یہ مقام عبرت تھا مگر اس کے باوجود اس ہل سکندر شرجیل اور فراز سمیت سب پادشاهیت کا شکار تھے۔

تائی ماں کی ذہنی حالت کے پیش نظر انہیں مستقل سکون اور ادویات کے زیر اثر سلایا جا رہا تھا مگر جب بھی جائتیں ہسپتالی انداز میں چیختیں اور صالحہ کو آوازیں دیتی تھیں۔ تاؤتی ایسے چپ تھے جیسے سکتے میں آگئے ہوں۔ سوئم کے بعد زندگی دھیرے دھیرے معمول پر آنے لگی تھی مگر تائی ماں اور تاؤتی کی حالت کیفیت کا عالم نہ ہو رہا تھا۔

"انہیں میں لے جاتی ہوں اپنے ساتھ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔" تاؤتی اور تائی ماں جن کی حیثیت بے کار فالتو پڑوں کی سی ہو گئی تھی ایمان نے ایسے میں خوش اسلوبی سے ان کی ذمہ داری قبول کرنی چاہی تو سکندر نے ٹوک دیا تھا۔

"تمہیں ایمان یہ لوگ نہیں رہیں گے۔ میں نہیں چاہتا اپنا گھر چھوڑ کر کہیں اور انہیں عزت نفس مجروح ہونے کا خوف ستائے۔ مجھے امید ہے لاریب تمہیں اعتراض نہیں ہوگا میرے فیصلے سے میں مستقل طور پر ان کی خدمت پر ملازم مامور کروں گا۔" سکندر کے لہجے میں رساں بھی تھا ٹھہراؤ بھی اور فیصلہ کن انداز بھی۔ لاریب نرمی سے مسکرا دی تھی۔

"آپ فکر نہ کریں انہیں مجھ سے ہرگز کوئی تکلیف اور پریشانی نہیں ہوگی، ان شاء اللہ۔" لاریب کے جواب نے فراز کے چہرے پر تفاخرانہ مسکان بکھیر دی۔ اس نے

جتلائے انداز میں سکندر کو دیکھا گویا کہ وہ ہاں میں کہتا تھا نا تو بہت خوش نصیب ہے ہر لحاظ سے۔

"آپ کا شکریہ زوجہ مگر میں تم پر یہ بار نہیں ڈالنا چاہتا۔ مجھے پورا یقین ہے تم یا اربہ بھابی بھی ان لوگوں سے اکٹھا ہٹ یا بے زاری محسوس نہیں کرو گی۔ میں نے اپنے سگے والدین کو نہیں دیکھا میرے لیے تاؤتی اور تائی ماں کی حیثیت اپنے والدین کی ہے۔" اس کے الفاظ نے اماں اور بابا کے چہرے پر روشنی پھیلا دی تھی۔ یہ اللہ کا فضل اور ان کی بہترین تربیت کا اثر تھا کہ آج سکندر ہر کوئی غر کر سکتا تھا۔

"آپ فکر نہ کریں سکندر بھائی ان شاء اللہ آپ کو ہم سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" اربہ کی تسلی پر سکندر نے نرمی سے اس کا سر تھپکا اور رساں سے مسکرا دیا۔

"مجھے معاف کرو دینی تم پر ظلم کرنے والوں میں شامل رہی ہوں اللہ مجھے معاف فرمائے اور سکندر بیٹے آپ بھی مجھے معاف کرو دماغی میں جو کچھ ہوا اس میں زیادہ نہ کہی تھوڑا میرا بھی حصہ رہا ہے۔" ماما تائی ماں کے انجام سے اتنی خائف تھیں کہ بیروں میں گر کر معافی طلب کرتی تھیں۔ ان کا کمزور وجود خزاں زدہ پتے کی مانند کانپتا تھا۔ سکندر اور ایمان نے گڑ بڑا کر انہیں سنبھالا تھا۔

"ایسی بات کر کے ہمیں گناہ گار نہ کریں ماما آپ اللہ سے معافی طلب کریں ہمارے دل میں ہرگز آپ کے لیے کوئی کدورت نہیں ہے۔" ایمان نے انہیں گلے لگا کر ان کے آنسو پونچھے تھے مگر صورت حال یہ تھی کہ جتنا وہ انہیں تسلی دیتی آنسو صاف کرتی وہ اس قدر بکھرتیں اس شدت سے آنسو بہتے تھے۔ انہیں قراتا تھا نہ سکون۔

"مجھے اپنے ساتھ لے چلو بیٹا، میں یہاں رہی تو لازمی بھابی بیگم کی طرح پاگل ہو جاؤں گی۔" وہ ایمان کے ہاتھ پکڑ کر سسکی تھیں شرجیل نے بڑھ کر انہیں ساتھ لگا لیا۔

"میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی اعزاز کی بات نہیں ہے ماما آپ ہمیں اپنی خدمت کا موقع دیں آپ چلیے ہمارے ساتھ چپا آپ بھی چلیں گے ہاں۔" شرجیل نے



خاموش کھڑے باپ و مخاطب کیا جن کے چہرے پر ہر خند پھیل گیا تھا۔

"میں ابھی اتنا چار اور فقیر نہیں ہوا اولاد کے در پر جا بڑوں و دودت کی روٹی کی راہ نکلتے کو..... اونہ۔" انہوں نے غصے سے کہا اور جیر جھٹکتے وہاں سے چلے گئے۔ شرجیل نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا تھا اور جبکہ کراں کے ہاتھوں پر بوسہ لیا۔

"آپ فکر نہ کریں ماما ہم پیار سے ملنے آتے رہیں گے۔" ایمان نے ماما کی ڈھارس بندھائی تھی وہ پچھلے انداز میں مسکرائیں یہ بیٹے ہے ہدایت جیسی اصول نعمت بھی ہر کسی کا نصیب نہیں بنا کرتی پتا نہیں پاپا کا شمار بھی ان پہنچے ہوئے لوگوں میں ہونا تھا یا.....!"

عباس حیدر کی فون کے ذریعے صالحہ کے انتقال کی خبر مل چکی تھی۔ جیسی داہی پر وہ گھر آنے کے بجائے پہلے سکندر کے ہاں گیا تھا۔ تعزیت اور عشا کی نماز کی ادائیگی کے بعد گھر لوٹا تو وجود میں فاطمہ کے فیصلے کے تمام تر سمجھوتے کے باوجود یاسیت کا احساس گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ فون پر بچوں سے بات ہوئی یا ملازموں سے اسے فاطمہ کے چلے جانے کی اطلاع کسی نے نہیں دی تھی۔ شاید وہ اس کی واپسی کے بعد یہ قدم اٹھانا چاہتی تھی۔

احسان، بابا اور دیگر ملازمین کے سلام کا جواب دیتا وہ اپنے بیڈروم میں آ گیا تھا ارادہ فریض ہونے کے بعد بچوں سے ملنے کا تھا مگر اندر داخل ہوتے ہی اسے خوشگواریت کے احساس نے چھو لیا۔ دیووں بچے صاف سترے تھے اور بیڈ پر سو رہے تھے۔ فاطمہ البتہ اسے نظر نہیں آئی اس نے گہرا سانس بھر اور کوٹ اتار کر ایک طرف رکھا۔ پھر بچوں کو جھٹک کر پیار کیا تھا بھی اس کی نگاہ کچھ فاصلے پر جائے نماز پر جمے میں سر رکھے فاطمہ پر پڑی تو دل آسودگی و طمانیت کے انوکھے و دغریب احساس سے ہلکا ہوتا چلا گیا۔

فاطمہ کا خشوع و خضوع اور بے خبری قابل رشک تھی۔ عباس کی نگاہیں گاہے بگاہے اس پر اٹھتی تھیں پھر

## شہزادی کوئل

آنجل اسٹاف اور قارئین السلام علیکم! جناب کیا حال چال ہے؟ پچھلے چار سال سے آنجل کی خاموشی قاری ہوں اب سوچا انٹری دوں تو جناب کو شہزادی کوئل کہتے ہیں۔ تاریخ پیدائش 4 اپریل ہے اشار پر یقین نہیں کرتی۔ دوست بتانا اچھا لگتا ہے آنجل میں دو فریڈ ہیں ایک سلمی گوری خان اور مائی کیوٹ سویٹ سسٹر جاناں! یہ میری دوست کم بہن زیادہ ہے۔ بارش پسند نہیں آنجل ٹیل شخصیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اگر ہم سب ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں تو دنیا و دین و آخرت میں بھی سرخرو کی مصل کر سکتے ہیں۔ لی وی بہت کم دیکھتی ہوں سبزیوں میں کدو کر لیتے جھنڈی پسند ہے اور چاول بھی بہت پسند ہیں۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں میں تیسرے نمبر پر ہوں میں اپنے بھائیوں سے بہت پیار کرتی ہوں۔ مازی آپنی عشنا کوثر سمیرا شریف طور پسند ہیں۔ اچھائیاں اور برائیاں تو ہر انسان میں ہوتی ہیں مجھ میں بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے اور عذاب قبر سے بہت ڈر لگتا ہے اپنی ماما سے بہت ڈرتی ہوں۔ عمرہ کرنے کا بہت شوق ہے اللہ ہر مسلمان کو عمرہ کی سعادت نصیب فرمائے آمین۔ ار یہ شاہ کرن وفا نیناں شاہ کو بہت بہت سلام او کے جی اللہ حافظ۔

شدید تھکان غالب ہوئی اور اگلے چند لمحوں میں وہ غنودگی میں چلا گیا۔ فاطمہ نے نماز مکمل کی۔ دعا مانگی اور اٹھتے ہوئے جیسے ہی رخ پھیرا عباس کو موجود پا کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

ایک بے اختیار قسم کی شرمیلی مسکان نے اس کے شکرگنی لبوں کا احاطہ کر لیا تھا۔ جائے نماز تہہ کر کے رکھتے اس نے مدہم آواز میں سلام کیا تھا۔ مگر جواب نداد۔ وہ حیران رہ گئی اور دھیان سے اسے دیکھا غضب کی مردانگی سمیٹے لسا چوڑا شاندار وجیہ تند و مند سراپا۔ نیم وا آنکھیں ذرا سے کھلے ہونٹ اور ہلکے خراٹے وہ اسے سوئے ہوئے



چہرا اٹھا کر کتنی محسوسیت سے اس کی تصدیق چاہی تھی۔  
عباس نے مسکراہٹ دبا کر فی الفور سر کو گتائی میں ہلایا۔  
”مجھے بھی یقین تھا کہ اگر یہ لڑکی مجھے نظر انداز کر رہی

ہے تو اس کے پیچھے کوئی اہم ہستی ہو سکتی ہے ورنہ میری  
فاطمہ مجھے کبھی ہرٹ نہیں کر سکتی۔“ عباس نے نرمی و محبت  
سے کہتے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پالے میں لیا اور  
مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔ فاطمہ جھینپ سی گئی اس کی توجہ  
اس کی قربت، اس کا لمس ابھی پوری طرح جیسے سرچڑھ کر  
بولا تھا وہ دھک کر مشک بوئی نہیں ہوئی تھی گویا سرتاپا رگوں  
میں نہانے لگی۔

”بہت تھک گئے ہیں آپ؟ میں کھانا گرم کرتی  
ہوں۔“ آواز اس کے حلق سے پھس کر نکلی تھی جو اس کے  
جواب اس کی گھبراہٹ کی گواہ تھی عباس پہلی بار یوں  
اپنائیت تمام تر توجہ اور استحقاق آمیز انداز میں اتنا قریب  
تھا۔ یہ گھبراہٹ اور راہ فرار کی کوشش عین فطری سی تھی جسے  
عباس نے سمجھا تھا اور انجوائے کیا تھا۔

”میں بالکل بھی نہیں تھکا ہوا بلکہ تمہیں اتنے پیارے  
یوپ میں دیکھ کر بہت فریش ہو چکا ہوں۔“ فاطمہ کی لانی  
پلکیں حیا بار انداز میں لرزنا انھیں اور تن بدن میں اس کی توجہ  
کے ارتکاز کے باعث سنسنی دوڑتی چلی گئی تھی۔

”میں بہت بری ہوں عباس خود کو اس مرتبے کے  
قابل نہیں پاتی۔ میں نے بہت تھک کیا آپ کو۔“ وہ ایک  
بار پھر جانے کیا کچھ یاد کر کے دوئی۔

”پلیز فاطمہ مجھے بہت خاص سمجھنا چھوڑ دو یہ درجہ یہ  
مقام تمہیں اللہ نے دیا ہے۔ اللہ بہتر ہے درجات طے  
کرنے والا ایک بات اور مجھے اپنی بیوی بار بار روٹی ہوئی  
بالکل اچھی نہیں لگد ہی۔ یا رکھن میری اماں کے ساتھ  
مزار کرمان سے شوہر کی اتنے دنوں بعد واپس پر استقبال کا  
کوئی اچھا سا طریقہ ہی سیکھ لیتیں۔ اگر تم مان گئی ہو تو آج  
ہماری گولڈن ناٹ ہوگی۔“ اس کی سرعت سے بہتی  
آنکھوں کو ایک جذب سے ہونٹوں سے چھو تا وہ ہلکے پھلکے  
انداز میں کہہ کر شریر انداز میں ہنسا تھا۔ فاطمہ کو جیسے ہی اس

شر کے ہی مشابہہ لگا تھا۔ فاطمہ اسے نکلتی رہی اور یونہی  
نکتے آنکھوں میں اترتی نمی کے باعث اس کا وجہ خود  
چہرہ اس کی نظر میں دھندلانے لگا تھا۔

کچھ کہے بغیر وہ جھکی اور بے حد محبت اور نرمی سے اس  
کے چہرہ جوتوں اور موزوں سے آزاد کرنے لگی۔ ہلکی ٹی  
لیے سنگ مرمر جیسے سفید مضبوط پیروں پر فاطمہ کے موی  
ہاتھوں کی گرفت سخت پڑنے لگی۔ آنکھ سے بہتے شفاف  
موتیوں نے ایک بار پھر اس دل کے شہنشاہ پر نذرانہ  
عقیدت لٹانا شروع کیا تھا۔ اگلے لمحے اسے جانے یا  
ہوا، بری طرح سے سسکتی ہوئی اس کے پیروں پر اپنا چہرہ  
رکھ چکی تھی۔

عباس کی غفلت مٹانے کا باعث اس کے لرزے نہ  
ہونٹوں کا لمس ہی تھا جسے اپنے پیروں پر محسوس کر کے وہ  
چونکا تھا اور خمارا لود لگابی ڈوروں والی آنکھیں کھول کر کسی  
قدراحت سے گردن اٹھائی اور جیسے فاطمہ کو اس حیران کن  
پوزیشن میں پا کر کھونچکا ہو کر رہ گیا۔

”فاطمہ.....!“ وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا اور اسے  
شانوں سے تمام کر اٹھانا چاہا مگر وہ روٹی ہی رہی تھی اور گویا  
اس کے پیروں سے سر نہ اٹھانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ عباس کا  
اضطراب بڑھا تو اس نے زبردستی اسے اٹھا کر اپنے مقابل  
صوفے پر بٹھالیا۔

”کیوں مدد رہی ہیں فاطمہ کچھ متائیں تو مجھے۔“ وہ کتنا  
پریشان تھا وہ کتنا حیران نظر آتا تھا جبکہ فاطمہ کی ہچکیاں اور  
سسکیاں نہ ختم رہی تھیں۔

”مجھے معاف کر دیں..... میں نے بہت بدتمیزی کی  
آپ سے۔“ اس کے رونے میں شدت آئی، عباس ایک  
گہرا سانس بھر کر رہ گیا۔

”مم..... میں غلط ہی کا شکار تھی عباس، مجھے ملتا تھا میں  
اللہ کو ناراض کر دوں گی۔“ آنسوؤں اور آنسوؤں کے درمیان  
وہ ایک ایک بات بتاتی گئی۔

”مگر ایسا نہ ہوتا تو میں کبھی آپ کی شان میں گستاخی  
کرتی بھلا؟“ اس نے آنسوؤں سے جل تھل آنکھیں اور

READING  
Section



### مشاہدات

یادیں: انسان کی بہترین دوست ہیں جنہیں دنیا کی وہی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔

زندگی: مانگا ہوا تحفہ ہے جسے واپس کرنا اذیت ناک خیال ہے۔

چاند: رات کا وہ خاموش مسافر ہے جو خود تو اندھیروں میں سفر کرتا ہے مگر دوسروں کے لیے قدم قدم پر نور بکھیرتا ہے۔

انتظار: بے قراری کا دوسرا نام ہے اور انتظار کی لذت سے وہی لوگ آشنا ہوتے ہیں جو شبِ ام سے لے کر طلوعِ صبح تک اس میں جلتے ہیں۔

امید: ایک ایسی ٹھنڈی اور سکون بخش وادی ہے جو اپنے پرسکون دامن میں انسان کو پناہ دے کر اسے مایوسی کے آقاہِ سمندر میں ڈوبنے سے بچاتی ہے۔

فائدہ سکندر حیات..... لنگڑیاں

نے اس کے چہرے کو اپنے نازک موی ہاتھوں کے پالے میں لے کر یقین دہانی سوچی تھی۔ عباس اسے دیکھتا دیکھتا رہ گیا کتنی آسودگی اور سرشاری اتر آئی تھی اس کے اندر۔

"بھئی سکس فار دس آئر، دادوں خود کو اپنی ذہانت پر کہ تم سے اتنی آسانی سے اظہار کرا لیا۔ ایسے تو جتنا تم شرمیلی ہو قیامت تک بھی شاید ممکن نہ ہوتا۔" وہ ہنستا ہوا گویا اپنے کارنامے کو بیان کر رہا تھا۔ فاطمہ پہلے جھنجھنی پھر حققت سے سرخ پڑتی تیزی سے اس سے الگ ہو گئی۔ حجابِ آمیز کوفت اور ناراضی کا عکس اس کے خدوخال کو انوکھی دکھائی بخشتا گویا جگمگا کے دکھ گیا تھا۔

"میں کھانا لاتی ہوں۔"

"ایسے نہیں فاطمہ، پہلے مسکراؤ۔" عباس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا فاطمہ کے چہرے پر خود بخود حجابِ آلود مسکان کا سنہرا عکس بکھرتا چلا گیا۔ وہ گریزاں بھی شرما رہی تھی۔ جیسی اپنا ہاتھ اس کی گرم جوش پر پیش گرفت سے نکالنا چاہا عباس کھل کر مسکرایا اور کسی قدر شوخ انداز

کی بات سمجھا کی وہ حیا سے دوہری ہوتی چلی گئی، اگلے پل اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔ عباس نے مسکراہٹ دبا کر اس جھنجھنی اور بے حد حسین فطری حجاب کے حصار میں گھری لڑکی کو دیکھا تھا اور ہنستے ہوئے اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹانے چاہے۔

"زہنی صبح کہتی تھی تمہاری یہ شرم و حیا اتنی خوب صورت ہے کہ میں جا ہوں بھی تو ان قاطع اندازوں کے حصار سے باہر نہیں جاسکتا۔" فاطمہ محبت و مان بھری گرفت میں اس رشتے کے احساس کے تحت بوکھلائی تو بھی ہی اس بات پر حیرانی کا غلبہ ایسا بھایا جس نے اسے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر اسے دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"آ..... آ..... آپ.....!" کتنی حیرانی و غیر یقینی تھی اس کے چہرے پر عباس بھر پور انداز میں مسکرایا۔ "میں اتنا بھی غافل نہیں تھا تم سے جتنا تم مجھے ہی رہی ہو، بلکہ صبح تو یہ ہے فاطمہ کہ میں شروع دن سے ہی تم سے غافل نہ ہو سکا۔ وہ تو جہاں محبت کی نہیں بھی تھی تب بھی کچھ تو ایسا تھا کہ میں عام لوگوں کی طرح تمہیں فراموش نہ کر سکا۔"

فاطمہ کچھ نہیں بولی، وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس کی بھرپور زندگی میں اسی اظہار کی کمی تھی جسے وہ بھی آج اللہ نے پوری کر دی تھی۔ وہ کس کس نعمت کا شکر ادا کرتی۔ عطا فرمانے والے نے تو اپنے خزانوں کے منہ کھول دیے تھے اس پر وہ مسکوتھی وہ سراپا عاجز تھی۔

"آپ فریٹش ہو جائیں میں کھانا لاتی ہوں۔" اس نے خود کو اس کی طلسمی قربت سے نکالنا چاہا مگر عباس آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔

"کھانے کے بہانے جان چھڑانا چاہتی ہو مجھ سے؟" اس کا انداز چھینرتا ہوا تھا۔ اس کے باوجود فاطمہ کی آنکھوں میں اس کے چہرے پر ایک ہیجان سادہ آیا تھا۔

"ایسا کیوں سوچا آپ نے؟ آپ جانتے ہی نہیں ہیں عباس آپ کا ساتھ کتنا قیمتی اور انمول ہے میرے لیے۔" عجب مدھمکھرا اور بے خود انداز تھا اظہار کا۔ فاطمہ



”اس بار تو کچی بات ہے میں ہی تم سے جیتوں گا۔“ اس کا بوجھل سرگوشیانہ لہجہ لاریب کو اس کے فقرے کی معنی خیزیت سے آگاہ کرتا تھا و حجاب سے لبریز کر کے رکھ گیا۔

”بسم اللہ الرحمن الرحیم، گو۔“ سکندر نے کہا اور دونوں ہی ایک ساتھ ہستے ہوئے بھاگے تھے۔ اسی پارک کے دوسرے کونے پر عباس حیدر فاطمہ کے ہمراہ تھا۔

”مجھے واقعی بہت شرمندگی ہوئی تھی فاطمہ جب میں بلال بھائی کے اس سوال کا مثبت جواب نہیں دے سکا تھا۔ میرا خیال ہے میری بیوی کو اتنا تو میرا خیال ہوگا کساگلی بار شرمندگی سے دوچار نہیں ہونے دے گی اور اس پیاری سنت کی ادائیگی میں میرا ساتھ نبھائے گی۔“ وہ مسکرا کر کہتا اس کی تائید چاہ رہا تھا۔ فاطمہ کی ریشمی لائینی جھکی لڑتی پکوں پر سب حسین رنگ حجاب کے رنگ تھے۔ عباس کی محبتوں کی بارشوں میں بھینکنے کے بعد وہ اب کہاں نگاہ بھر کے دیکھنے کی تاب رکھتی تھی۔ اس شخص نے تو ایک رات میں ہی سابقہ تمام کوتاہیوں کے ازلے کر دیے تھے۔ اس کی وارنٹگیاں یاد کر کے وہ حجاب اور حیات سے سمنٹی تھی۔ پکوں پر جیسے منوں بوجھ دھرا تھا اور دل اس مالک کائنات کے حضور سر بسجود تھا۔

”پہلے میری ایک بات سن لیں بلکہ پلیز مجھے اجازت دیں تاکہ میری یہ خواہش پوری ہو سکے۔“

”کون سی خواہش؟“ عباس نے نرمی سے استفسار کرتے اس کا نرمہ دلی کے کگلے جیسا ہاتھ پکڑ لیا۔

”جب میں قرآن پاک کو مکمل پڑھ لوں گی تو آپ اس کا غم پھیلانے کی مجھے اجازت دیں گے۔ حدیث کا مفہوم ہے نا بہترین لوگ اللہ کے نزدیک وہ ہیں وہ خود قرآن سیکھیں اور دوسروں کو سکھائیں۔ میں بھی یہی مرجہ یہی سعادت پانے کی خواہش رکھتی ہوں۔“ اس کے لہجے میں لاجت تھی عباس کھل کر مسکرا دیا۔

”میں روکنے کی جرأت کروں ایسا وقت خدا نہ لائے اللہ سے دعا ہے اللہ تمہیں یہ سعادت نصیب

میں گویا بہا تھا۔  
جھاؤ نظریں، چھڑاؤ دامن  
بدل کے دستہ بڑھاؤ انجمن  
تمہیں دعاؤں سے بھر بھی میں نے  
جو پالیا تو کیا کرو گے؟

فاطمہ کانوں کی لوؤں تک بے تحاشا سرخ پڑتی چلی گئی۔ عباس کی مسکراہٹ اور شرارت نے بھی اس کی اس کیفیت کے باعث طول پکڑا تھا۔

”میرے لیے اس سے بڑھ کر کیا خوش بختی کی علامت ہو سکتی ہے میرے مولا کہ تو نے فاطمہ کی ہدایت کا ذریعہ مجھے بتایا ہے۔ مجھے اب ہرگز بھی تیری رضا سے اختلاف نہیں۔ اگر دکھ تو نے دیا تھا تو مبر واستقامت اور پھر بھرپور زندگی بھی تیری ہی عطا ہے۔“ لباس تہدیں کرنے کے بعد وہ وضو کرنے والی روم میں چلا گیا۔ فاطمہ کے ساتھ نئی زندگی کے آغاز سے قبل وہ اپنے مالک کا شکر بجالاتا خود پر لازم سمجھتا تھا۔



”لاریب دوڑ لگاؤ گی میرے ساتھ؟“ حسب معمول وہ علی الصبح چہل قدمی کو باہر نکلے ہوئے تھے جب کلمہ طیبہ کا ورد کرتی لاریب نے سکندر کی بات پر حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔

سکندر نے کچھ توقف کیا اور ہمہ تن گوش لاریب کو دیکھ کر نرمی سے مسکرایا تھا۔

”یوں تو ایک مرتبہ بلال بھائی نے عباس حیدر سے پوچھا تھا تم نے اپنی بیوی سے دوڑ لگائی۔ ان کے جھینپنے اور کھل ہونے کے انداز سے ہی میں جان گیا تھا ایسا نہیں ہوا میں نہیں چاہتا مجھ سے سوال کیا جائے تو ایسی ہی شرمندگی سے میں بھی دوچار ہوں اس لیے دوڑ تو تمہیں میرے ساتھ لگانا پڑے گی۔“ اس کے انداز میں حکم تھا نہ جبر اس کے برعکس مان تھا، استحقاق تھا، محبت تھی۔ لاریب جھینپ کر رو گئی۔

سکندر نے مسکراہٹ دبا کر اسے دیکھا پھر اس کے سر پرے پر بھرپور اور مستحق خیر نگاہ ڈالی تھی۔

READING  
Section



فرمائے تا میں۔“

”تم آمین۔“ فاطمہ نے جذب سے کہا اور بھرپور طمانیت سے مسکرانے لگی۔

”اب دوڑیں؟“ عباس کے مسکرا کر پوچھنے پر فاطمہ سر کو اثبات میں ہلا۔ نے لگی۔ اگلے لمحے دونوں بھاگ رہے تھے مسکراتے ہوئے آسودہ مطمئن مطلوبہ جگہ پر پہنچنے سے قبل مخالفت سمت سے آتے لاریب اور سکندر کے سامنے دونوں کمر کئے پر مجبور کر دیا۔ چاروں کے درمیان سلام دعا کا تبادلہ ہوا تھا۔ عباس اور سکندر نے باہم قدموں کو بڑھایا تو وہ کچھ پیچھے رہ جانے والی لاریب کے مقابل آگئی تھی۔ جس نے عباس کی موجودگی کے باعث چہرے کو چادر کے نقاب میں چھپا لیا تھا اس کی تھلید میں فاطمہ نے بھی یہی عمل دہرایا۔ اس بلذنب کے الفاظ یاد آئے تھے۔ ”عورت چاند کی طرح نہیں ہونی چاہیے جسے ہر کوئی بے نقاب دیکھے۔ بلکہ مسلمان عورت سوچ جیسی ہونی چاہیے جس کو کھینے سے پہلے ہی آنکھیں جھک جائیں۔“

”آپ ٹھیک ہیں لاریب؟“ فاطمہ نے خود اس کی جانب پیش رفت کی تو لاریب مسکرانے لگی۔

”الحمد للہ، اللہ پاک کا ہر لحاظ سے احسان ہے، آپ کیسی ہیں؟“

”مجھے ہر بار ملاقات پر ایسا لگا جیسے آپ خفا ہیں مجھ سے اور.....“ لاریب کے نرم اور صلاح جو انداز نے ہی آج فاطمہ کو یہ سوال کرنے کا حوصلہ دیا تھا جو بالاریب روادری سے مسکرانے لگی تھی۔

”مجھے فحشوں ہے کہ شعوری یا لاشعوری طور پر میرے عمل سے آپ کو تکلیف پہنچی جسکی معذرت چاہتی ہوں، اللہ نے چاہا تو آپ کو اتنے ایسی حکایت بھی نہیں ہوگی۔“ وہ مسکرائی اور فاطمہ جھینپ گئی تھی۔

”آپ آئیے لاریب کی دن ہمارے گھر۔“ فاطمہ کی باتوں پر لاریب نے سر کو اثبات میں ہلایا۔

”کیوں روئے ناٹ، بلکہ آپ کی کافی ڈیو ہے، جو آپ کے شوہر نامہ نے آپ کی تعریف کرتے ہوئے ہمیں

غزل

ہاتھ سہلاتے ہوئے بہن بولی  
چاند بکھی ہے تو ساری رات ادی  
آنکھیں مڑکاتے ہوئے میں نے کہا  
خود کو ہی دیکھتی ہوں اس پار ادی  
دیکھنے کو تو دور لگتا ہے  
جونہی چلتی ہوں تو چلتا ہے ساتھ ادی  
گھڑی، دو ہل جو لوگ سوتے ہیں  
کھلتے ہیں ان پر عجب اسرار ادی  
جیسے دن رات کو بدلتا ہے  
راز ہوتے ہیں یونہی فاش ادی  
وجود اس کا تو اک ظلم ہے  
اور جاودہ کیا جو آئے ہاتھ ادی  
کہاں قیام کا تحمل ہے وہ  
یہی نسبت ہے اس سے خاص ادی  
میری منزل نہیں ٹھکانہ اس کا  
وہ جان لے گا بھی یہ بات ادی

انتخاب: شائستہ خان..... بصیر پور

پلانے کا وعدہ کر رکھا ہے۔“ لاریب کے انداز کی بے تکلفی و دوستانہ اپنائیت نے نا صرف فاطمہ کو مطمئن کیا بلکہ اس سے چند قدم آگے چلتے عباس کے ذہن و دل سے بھی آج جیسے پہلی بار بھاری بوجھ سر کا دیا تھا کہ اس کی وجہ یہی تھی جو طمانیت تھا سوگی آج عباس نے لاریب کے انداز میں محسوس کی تھی وہ اس سے کل ناپید تھی۔

(اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ یہ بات جاننے میں مجھے بہت وقت ضرور لگا مگر صد شکر جان گئی ہوں مجھے آج ہرگز کوئی شکوہ نہیں ہے تمہیں کھونے کا عباس سکندر جو اللہ کا منتخب کردہ تھا۔ میرے لیے مجھ دل و جان سے قبول ہے)

خود سے کچھ فاصلے پر چلتے عباس کو جنگی نظروں سے ایک نظر دیکھ کر لاریب نے سوچا تھا اور سکندر کے ہمراہ



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



پورے ماحول پر چھائی جا رہی تھی۔

خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ  
خودی ہے تیغِ فساں لا الہ الا اللہ  
یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے  
مستم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ  
عباس نے سنا اور خود بھی اپنی آواز کو اس آواز کے ساتھ  
شامل کر لیا اس پر ایک جذب کی کیفیت طاری ہونے لگی  
تھی۔

یہ مال و دنیا یہ رشتہ پیوند  
بتان وہم و گماں لا الہ الا اللہ  
یہ نغمہ فصل و گل کا نہیں پابند  
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ  
لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ  
اب فاطمہ بھی عباس کے ساتھ مل کر دہرا رہی تھی  
دونوں کے انداز میں عقیدت بھری ہوئی تھی۔

خو کر کھا کر سہی مگر وہ اپنی پیدائش کے مقصد کو پہچان کر  
اشرف المخلوقات کے درجے کو پا گئے تھے۔ وہ درجہ جو اللہ  
نے اپنے بندے کو خاص طور پر عطا فرمایا ہے مگر اسے بھاتا  
کوئی کوئی ہے کہ بلاشبہ اللہ کو مان لینا اصل بات نہیں کیونکہ  
اللہ اپنی شان اور قدرت سے خود کو متواضعی لیتا ہے۔ اصل  
بات تو اللہ کو منانے میں ہے انہوں نے اللہ کو منانے کی  
کوشش کی تھی اب ان کی یہی خواہش دوسرے مسلمانوں  
کے لیے بھی اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اللہ کے احکامات  
کو دنیا میں پھیلا دیتے تاکہ مقصد انسانیت پورا ہو سکے۔

(ختم شد)



اپنے الگ راستے پر ہوئی۔ عباس نے قدموں کو روک کر  
فاطمہ کو اپنے ہمراہ کیا اور مسکرا کر اسے روشن آنکھوں سے  
دیکھا۔ فاطمہ کی جھکی ٹپک اس توجہ پر پھر لرزے لگیں۔  
”وہ ہمدردی نہیں وہ ضرورتاً میں کی میرے ہاتھ کی کافی  
پینے۔“ عباس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”تم نے کہا تھا فاطمہ تمہیں روحنائی کے گفت کی  
ضرورت نہیں مگر میں تمہیں یہ گفت دینا چاہتا ہوں جانتی ہو  
وہ کیا گفت ہے؟“ فاطمہ نے چلتے ہوئے قسم کر اسے  
دیکھا۔ پھر سر کو اثبات میں ہلاتے اس کی چمکتی ہوئی  
آنکھوں میں جگنوؤں کے قافلے اترنے لگے تھے۔

”عمرہ کے نکت، ہم دونوں اماں جان اور بابا جان کے  
ہمراہ بیت اللہ شریف کی حاضری کو انکے ہفتے جارہے ہیں  
ان شاء اللہ کیسا لگا یہ گفت جان عباس۔“ اس کے تبسم لہجہ  
میں دلکشی کا رنگ اتر رہا تھا فاطمہ نے عقیدت مندانہ نہ  
نظروں سے اسے دیکھا اور عاجزانہ انداز میں اکساری سے  
مسکرائی تھی۔

”اپنی خوش بختی کا مجھے یقین تو آ رہا تھا حیدر مگر اب  
جیسے اس پر تعجب کی پختہ مہر ثبت ہو گئی ہے جزاک اللہ۔“  
وہ سراپا مشغور تھی عباس نے اس کا سر تھپکا اور قدم گھر کی  
جانب بڑھا دیے۔

”فاطمہ تمہیں اس بات پر کوئی اعتراض تو نہیں کہ میں  
تبلیغی مصروفیات کی بنا پر تمہیں برا پر نام نہیں دے پاؤں گا  
اور بچوں کی ذمہ داریاں بھی تمہیں ہی نبھانی پڑیں گی۔“  
فاطمہ نے بغیر کسی رد و کد کے پورے اعتماد کے ساتھ سر کوٹھن  
میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں حیدر، انشاء اللہ کبھی بھی نہیں یہ زندگی عارضی پناہ  
گاہ ہے اور سب سے اہم ہے وہ کام جس کی توفیق اللہ رب  
العزت نے، آپ کو بخش ہے۔ یہ حکم اللہ ہے اس سے  
روگردانی میں نجات ممکن نہیں۔“ اور عباس نے ایسے ایمان  
افروز جواب پر مطمئن ہو کر سرشار ہوتے اس کا ہاتھ تھام کر  
بوسہ ثبت کیا تھا۔ وہ دونوں یونہی ایک دوسرے کی ہمراہی  
میں آگے بڑھ رہے تھے جبکہ فضا میں گونجی آواز ہر لمحہ

READING  
Section

